محاضرات حدیث

ڈاکٹر محمود احمد غازی

محاضرات حدیث

ڈاکٹر محمود احمد غازی

الفیصل
ناشران و تاجرانِ کتب
غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

297.124 Mahmood Ahmad Ghazi, Dr.
Mahazrat-e-Hadees/ Dr. Mahmood Ahmad Ghazi.-Lahore: Al-Faisal Nashran, 2010.
480P.

1. Ahadees   I. Title Card.

ISBN 969-503-345-8

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں۔

اشاعت ششم..........مارچ 2010ء
محمد فیصل نے
آر۔آر پرنٹرز سے چھپوا کر شائع کی۔
قیمت:-/500روپے

AL-FAISAL NASHRAN
Ghazni Street,Urdu Bazar,Lahore.Pakistan
Phone : 042-7230777 Fax : 09242-7231387
http : www.alfaisalpublishers.com
e.mail : alfaisal_pk@hotmail.com

فہرست مضامین

پہلا خطبہ:

حدیث: ایک کا تعارف

علم حدیث کا تعارف	۱۵
حدیث کے لغوی معنی	۱۷
حدیث نبویؐ	۱۹
حدیث کی تعریف	۲۰
علم حدیث کا موضوع	۲۱
اصطلاحات	۲۲
حدیث اور سنت کا فرق	۲۳
سنت کی تعریف	۲۴
حدیث، اثر اور خبر	۲۶
علم حدیث: ایک بے مثال فن	۲۸
صحت حدیث پر شکوک کی حقیقت	۳۱
کتب حدیث کے بارے میں غلط فہمیوں کی حقیقت	۳۳
کتب حدیث کی اقسام	۴۱
سوال و جواب	۴۲

دوسرا خطبہ:

علم حدیث کی ضرورت اور اہمیت

سنت کی اقسام	۴۹
سنت فعلی	۴۹
سنت تقریری	۴۹
قرآن میں سنت کی سند	۵۱
حدیث کے مقابلہ میں دیگر مذاہب کے صحائف کی حیثیت	۵۴
کتاب الٰہی اور ارشادات انبیا میں بنیادی فرق	۵۶
سنت: وحی الٰہی کا عملی نمونہ	۵۷
قرآن وسنت کا باہمی تعلق	۷۵
محدثین کی اقسام	۸۳
سوال وجواب	۸۶

تیسرا خطبہ:

حدیث اور سنت بطور ماخذ شریعت

وحی کی اقسام	۱۰۲
کتب حدیث کی خصوصیات	۱۱۲
احادیث نبویؐ کی تعداد	۱۱۹
حُجیتِ سنت	۱۲۰
سوال وجواب	۱۲۷

چوتھا خطبہ:

روایت حدیث اور اقسام حدیث

روایت اور درایت	۱۳۵
متنِ حدیث	۱۳۶
علم روایت	۱۳۷

سماع	۱۳۷
قرأت	۱۳۸
اجازت	۱۳۸
مناولہ	۱۳۸
مکاتبہ	۱۳۹
اعلام	۱۳۹
وصیت	۱۴۰
وجادہ	۱۴۰
تحمل اور اداء	۱۴۱
راوی کی شرائط	۱۴۴
مقبول یا صحیح حدیث	۱۵۰
حدیث حسن	۱۵۰
ضعیف اور موضوع احادیث	۱۵۱
صحیح لعینہٖ اور صحیح لغیرہٖ	۱۵۲
حسن لعینہٖ اور حسن لغیرہٖ	۱۵۳
تواتر کے درجات	۱۵۴
حدیث مشہور	۱۵۹
خبرِ واحد	۱۵۹
مرسل حدیث	۱۶۳
منقطع حدیث	۱۶۴
معضل حدیث	۱۶۵
مدلّس حدیث	۱۶۵
معلل حدیث	۱۶۶
شاذ حدیث	۱۶۶

منکر حدیث	۱۶۷
متروک حدیث	۱۶۷
موضوع احادیث	۱۶۷
موضوع احادیث کی تخلیق کے اسباب	۱۷۰
سوال وجواب	۱۷۴

پانچواں خطبہ:

علمِ اسناد ورجال

صحابہ کرام اور سند کا اہتمام	۱۸۴
سند کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟	۱۸۶
احادیث کی روایت باللفظ کا اہتمام	۱۸۹
کیا روایت بالمعنی جائز ہے؟	۱۹۲
علم طبقات اور علم رجال	۱۹۵
طبقات پر اہم کتابیں	۱۹۹

چھٹا خطبہ:

جرح وتعدیل

جرح وتعدیل کی قرآنی اساس	۲۱۱
صحابہ کرام اور جرح کی روایت	۲۱۳
اسناد کی پابندی کی اسلامی روایت	۲۱۸
راویوں کے طبقات	۲۲۰
کبار تابعین کا زمانہ	۲۲۲
طبقات رواۃ کی افادیت	۲۲۳
علم رجال کی شاخیں	۲۲۶
جرح وتعدیل اور حسن ظن	۲۳۷
احادیث کی گنتی کا مسئلہ	۲۴۰

جرح وتعدیل کے مشہور ائمہ ۲۴۳
ائمہ جرح وتعدیل کے درجات ۲۴۶
سوال وجواب ۲۴۸

ساتواں خطبہ:

تدوین حدیث

کیا رسول اللہ ﷺ نے احادیث لکھنے سے منع فرمایا؟ ۲۶۷
تدوین حدیث حضورؐ کی حیات مبارکہ میں ۲۶۸
تدوین حدیث صحابہ کرامؓ کے دور میں ۲۷۶
تدوین حدیث تابعین کے دور میں ۲۷۸
تدوین حدیث تبع تابعین کے دور میں ۲۸۰
تدوین حدیث تیسری صدی ہجری میں ۲۸۱
سوال وجواب ۲۸۴

آٹھواں خطبہ:

رحلۃ اور محدثین کی خدمات

القاب محدثین ۲۹۱
رحلہ ۲۹۴
علو اسناد اور نزول اسناد ۲۹۵
علم حدیث کے لئے صحابہؓ کے سفر ۲۹۷
علم حدیث کے لئے تابعین کے سفر ۲۹۹
علم حدیث کے لئے تبع تابعین کے سفر ۳۰۵
اسفار محدثین کے مقاصد ۳۰۵
علم حدیث کے لئے سفر کرنے کا طریقہ ۳۰۸
علم حدیث کے لئے سفر کے آداب ۳۰۹
حصول علم حدیث کے لئے محدثین کی قربانیاں ۳۱۲

سوال وجواب	۳۱۹

نواں خطبہ:

علوم حدیث

علم حدیث کا آغاز اور ارتقاء	۳۲۷
علم حدیث کے موضوعات	۳۲۸
معرفت صحابہ	۳۲۸
صحابی کی تعریف	۳۲۹
فضیلت کے لحاظ سے صحابہ کے درجات	۳۳۰
طبقات صحابہ کرامؓ	۳۳۴
کبار صحابہؓ	۳۳۵
اوساط صحابہؓ	۳۳۵
صغار صحابہؓ	۳۳۶
صحابہ کرامؓ کی کل تعداد	۳۳۷
تابعی کی تعریف	۳۴۱
طبقات تابعین	۳۴۲
تابعین کے درجات	۳۴۳
تابعی اور تبع تابعی کا تعین	۳۴۶
ضعیف حدیث پر عمل	۳۵۰
علل حدیث	۳۵۶
علم حدیث کے آداب	۳۵۷
درس حدیث کی اقسام	۳۵۷
احادیث میں تعارض	۳۵۹
علم ناسخ اور منسوخ	۳۶۳
اسباب ورود حدیث	۳۶۵

دسواں خطبہ:

کتب حدیث— شروح حدیث

موطاامام مالکؒ	۳۷۱
مُصَنَّف عبدالرزاق	۳۸۱
مسندامام احمد بن حنبلؒ	۳۸۳
الجامع الصحیح ،امام بخاریؒ	۳۸۶
صحیح مسلم	۳۹۱
سُنَن ابوداوَد	۳۹۳
جامع ترمذی	۳۹۴
سُنَنِ نسائی	۳۹۸
سنن ابن ماجہ	۳۹۹
سوال وجواب	۴۰۲

گیارھواں خطبہ:

برصغیر میں علم حدیث

برصغیر میں علم حدیث کا پہلا دور	۴۱۵
برصغیر میں علم حدیث کا دوسرا دور	۴۲۰
برصغیر میں علم حدیث کا تیسرا دور	۴۲۰
شیخ عبدالحق محدث دہلوی	۴۲۱
شاہ ولی اللہ محدث دہلوی	۴۲۴
شاہ عبدالعزیزؒ	۴۲۷
حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی	۴۲۹
علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری	۴۳۰
مولانا رشید احمد گنگوہی اوران کے تلامذہ	۴۳۱
مولانا انور شاہ کشمیری	۴۳۲

فرنگی محلی علماء ۴۳۳

نواب صدیق حسن خان ۴۳۴

دائرۃ المعارف العثمانیہ ۴۳۵

سوال و جواب ۴۳۷

بارھواں خطبہ:

علوم حدیث – دورِ جدید میں

مستشرقین کی خدمات ۴۴۳

تاریخ حدیث پر ہونے والا کام ۴۴۵

مخطوطات ۴۴۷

علم حدیث پر نئے علوم کی روشنی میں کام ۴۴۹

احادیث میں سابقہ کتب کا ذکر ۴۵۵

نئے انداز سے کام کرنے کی راہیں ۴۵۶

تدوین حدیث غیر مسلموں کے لئے ۴۵۸

علم حدیث کی کمپیوٹرائزیشن ۴۵۹

انکار حدیث کا مقابلہ ۴۶۱

☆☆☆

پیش لفظ

قبل ازیں محاضرات قرآنی کے عنوان سے علوم قرآن، تاریخ قرآن مجید، اور تفسیر سے متعلق موضوعات پر بارہ خطبات پر مبنی ایک جلد طلبہ علوم قرآنی کی خدمت میں پیش کی جا چکی ہے۔ زیر نظر جلد اسی سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ اس میں حدیث، علوم حدیث، تاریخ تدوین حدیث اور مناہج محدثین سے متعلق موضوعات پر بارہ خطبات پیش خدمت ہیں۔

یہ خطبات ادارہ ''الھدیٰ'' کے تعاون سے ادارہ الھدیٰ ہی کے اسلام آباد مرکز کے وسیع ہال میں دیئے گئے۔ شرکاء میں راولپنڈی اور اسلام آباد کی بہت سی مُدرسات قرآن کے علاوہ الھدیٰ سے وابستہ خواتین اہل علم کی بڑی تعداد شامل تھی۔ خطبات کا آغاز ۷ اکتوبر، ۲۰۰۳ بروز پیر ہوا اور درمیان میں اتوار کا دن نکال کر ۱۹ اکتوبر ۲۰۰۳ تک مسلسل بارہ روز یہ سلسلہ جاری رہا۔ خواتین اسلام کی کثیر تعداد نے شرکت فرما کر مقرر کو عزت بخشی۔ علوم حدیث، رجال، جرح و تعدیل، حدیث کی اقسام اور ان کے احکام جیسے دقیق اور فنی مباحث کو شریک خواتین نے بڑی دلچسپی اور توجہ کے ساتھ سنا۔ ان کی اس دلچسپی سے اندازہ ہوا کہ خواتین کے دیندار تعلیم یافتہ طبقے میں دینی تخصصات کی کس قدر ضرورت اور کتنی شدید طلب موجود ہے۔

محاضرات قرآنی کی طرح ان محاضرات کی اصل مخاطب بھی وہ خواتین اہل علم ہیں جو قرآن مجید کے درس و تدریس میں مصروف ہیں۔ فہم قرآن اور تفسیر قرآن کے لئے سیرت وسنت کی ضرورت و اہمیت سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں ہے۔ مُدرسات قرآن کو علوم سیرت و حدیث کی اہمیت سے باخبر کرانا اور علم حدیث کی طلب اور شوق پیدا کرنا ہی ان خطبات کا اصل مقصد تھا جو

الحمداللہ بڑی حدتک پورا ہوتا محسوس ہوا۔خواتین کی ایک بڑی تعداد نے علم حدیث میں تخصص کے حصول کا عزم ظاہر کیا۔ایک باہمت خاتون نے اپنے کم سن بچے یحیی کو (یحیی بن معین، یحیی بن سعید اور یحیی بن یحیی جیسے ائمہ حدیث کا بار بار تذکرہ سن کر) حدیث کا عالم بنانے فیصلہ کیا۔اللہ تعالیٰ ان کے اس بابرکت ارادے کو پایہ تکمیل تک پہنچائے۔

محاضرات حدیث کا یہ سلسلہ مختصر نوٹس کی مدد سے زبانی ہی دیا گیا تھا۔ان کو صوتی تسجیل سے صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے اور کمپوز کرنے کا کام ذاتی دلچسپی، علم دوستی اور محبت کے جذبے سے میرے عزیز دوست جناب احسان الحق حقانی نے کیا۔انھوں نے یہ تمام خطبات ٹیپ ریکارڈر سے سن کر براہ راست کمپوز کر دیے۔اور اتنی حیرت انگیز تیزی اور صحت کے ساتھ یہ کام کیا کہ کہیں کہیں ناموں کی اصلاح کے علاوہ کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔اللہ تعالیٰ عزیز موصوف کو اس کام کا صلہ عطا فرمائے۔

محاضرات قرآنی کے کمزور پہلوؤں کے بارے میں جو گذارشات محاضرات قرآنی کے پیش لفظ میں کی گئی تھیں وہ محاضرات حدیث پر بھی صادق آتی ہیں۔ان کو یہاں دہرانا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ان خطبات میں جو جو کمزوریاں ہیں وہ صرف راقم سطور کی کم علمی، بے مائیگی اور کم ہمتی کی وجہ سے ہیں۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کمزوریوں سے درگذر فرمائے۔

میں جناب سید قاسم محمود کا شکرگزار ہوں جن کے توسط اور شفاعت حسنہ کی وجہ سے یہ کتاب بھی ''الفیصل'' کی طرف سے شائع ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی — ۱۷ ربیع الاول ۱۴۲۵ھ

اسلام آباد — ۸ مئی ۲۰۰۴

پہلا خطبہ

علم حدیث: ایک تعارف

پیر، 6 اکتوبر 2003

علم حدیث: ایک تعارف

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم وعلی اله واصحابه اجمعین

سب سے پہلے میں دل کی گہرائیوں سے ادارہ الہدیٰ کا شکرگزار ہوں، جنہوں نے مجھے یہ عزت بخشی اور یہ موقع عنایت فرمایا کہ حدیث نبوی اور سنت رسول ﷺ کے بارے میں یہ گزارشات آپ کی خدمت میں پیش کرسکوں۔

یہ خطبات، جن کی تعداد انشاءاللہ بارہ ہوگی، علم حدیث کے مختلف پہلوؤں سے بحث کریں گے۔ اس میں علم حدیث کے فنی مباحث پر بھی گفتگو ہوگی، علم حدیث کی تاریخ پر بھی گفتگو ہوگی، اور محدثین کرام نے احادیث رسول کو جمع کرنے، فراہم کرنے اور ان کا مطالعہ اور تشریح وتفسیر کرنے میں جو خدمات انجام دی ہیں، ان خدمات کا بھی اختصار کے ساتھ جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔

علم حدیث کا تعارف

آج کی گفتگو کا عنوان ہے علم حدیث: ایک تعارف۔ علم حدیث کے تعارف کی ضرورت اس لئے پیش آتی ہے کہ عموماً ہر مسلمان حدیث رسولؐ سے تو واقف ہوتا ہے، اس کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کیا ہے؟ اور اسلام میں حدیث کی اہمیت کیا ہے؟ لیکن بہت سے حضرات کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ فنی اعتبار سے علم حدیث کا کیا مطلب ہے؟ حدیث اور اُس سے ملتی جلتی اصطلاحات کا مفہوم کیا ہے؟ ان اصطلاحات کا استعمال اہل علم کے یہاں کن کن معانی میں ہوا ہے؟ یہ اور اس قسم کی بہت سی فنی تفصیلات ایسی ہیں جن سے بہت سے لوگ واقف نہیں

ہیں۔اس عدم واقفیت کے باعث بہت سے مسائل اور خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔قرآن مجید کی تشریح وتفسیر کا سوال ہو، فقہی احکام اور شریعت کے مسائل کا معاملہ ہو، یا شریعت کے احکام میں ترتیب اور باہمی ربط کا سوال ہو، ان سب چیزوں کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے علم حدیث سے فنی واقفیت بقدرِ ضرورت لازمی ہے۔

ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآن مجید ایک متعین کتاب ہے۔ پورا قرآن مجید اس کتاب کے اندر لکھا ہوا ہے۔اس سے باہر قرآن کا کوئی وجود نہیں ہے اور سارے کا سارا قرآن اس کتاب کے اندر سما گیا ہے۔لیکن حدیث یا سنت کے بارے میں ایسی کوئی ایک کتاب موجود نہیں ہے جس کے بارہ میں کہا جاسکے کہ حدیث یا سنت پوری کی پوری اس کتاب میں موجود ہے۔

احادیث کی تاریخ، تدوین اور روایت و درایت کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔خود احادیث کے بہت سے مجموعے ابتدائی صدیوں سے متداول چلے آرہے ہیں۔ بعد کی صدیوں میں مرتب ہونے والے بھی بہت سے مجموعے ملتے ہیں جن میں بہت سی احادیث مختلف موضوعات پر مختلف مقاصد کے لئے جمع کی گئی ہیں۔ان سب کتابوں سے سنت کا پتہ چلتا ہے۔ اس لئے جب تک اسلامیات کے طلبہ کو بالعموم اور قرآن مجید کے طلبہ کو بالخصوص اچھی طرح سے یہ معلوم نہ ہو کہ حدیث اور سنت کس کو کہتے ہیں۔حدیث کی جو کتابیں ہمارے سامنے ہیں ان سے استفادہ کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ حدیث کی کسی کتاب میں اگر کوئی حدیث لکھی ہوئی ہے تو اس کی روشنی میں قرآن پاک کو کیسے سمجھا جائے؟ جب تک ان سب امور سے گہری واقفیت نہ ہو اس وقت تک قرآن پاک کو کما حقہ سمجھنا بہت مشکل ہے۔ان تمام امور کو جاننے اور سمجھنے کے تفصیلی قواعد اور ضوابط مقرر ہیں جن پر گزشتہ تیرہ سو سال سے لوگ عمل کرتے چلے آرہے ہیں اور قرآن مجید اور ارشادات رسول کو ان قواعد وضوابط کی روشنی میں سمجھ رہے ہیں۔

یہ سمجھنا کہ قرآن مجید اور سنت کسی خلاً میں پائے جاتے ہیں اور بغیر کسی تسلسل کے آج جس کا جو جی چاہے، وہی معنیٰ قرآن مجید کی آیات اور الفاظ کو پہنا دے، یہ تصور درست نہیں ہے۔قرآن مجید ایک تسلسل کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے صحابہ کرام کو اس کے معانی ومطالب سمجھائے۔ صحابہ کرامؓ نے وہی معانی ومطالب تابعین کو سمجھائے اور اس طرح نسلاً بعد نسلٍ ایک طبقہ کے بعد دوسرا طبقہ اور دوسرے کے بعد تیسرا طبقہ اس کو سیکھتا گیا اور اس طرح یہ

رہنمائی ہم تک پہنچی ہے۔ اس لئے ماضی اور حال میں خدانخواستہ اگر کوئی خلا پیدا ہو گیا، یا ہماری فہم میں کوئی ایسا خلل آ گیا کہ جس میں ماضی سے ہمارا رشتہ کٹ جائے تو پھر قرآن مجید کے فہم میں بڑی غلطیاں پیدا ہو جانے کا امکان ہے۔ ماضی قریب میں خود ہمارے ملک میں بہت سی گمراہیاں اس لئے پیدا ہوئیں کہ بعض لوگوں نے سنت رسولؐ کے اس تسلسل کو، احادیث کے اس پورے علم اور فن کو اور قرآن مجید کی تعبیر و تشریح کے ان سارے اصولوں کو نظر انداز کر کے صرف اپنی عربی زبان دانی اور مجرد اپنی فہم کی مدد سے قرآن کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجے میں بہت سی خرابیاں اور کمزوریاں پیدا ہوئیں۔ اس لئے قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے علم حدیث سے واقفیت ناگزیر ہے۔ علم حدیث کی ضرورت اور اہمیت پر تفصیلی گفتگو بعد میں ہوگی۔ لیکن اس ابتدائی تمہیدی گزارش سے یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ علوم اسلامیہ میں بالعموم اور قرآن مجید کو سمجھنے میں بالخصوص علم حدیث کی اہمیت کتنی ہے۔

حدیث کے لغوی معنی

لفظ 'حدیث'، جس کو اس خاص فن کی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، عربی زبان میں بہت سے معانی اور مطالب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ عربی زبان میں حدیث کے معنی گفتگو کے بھی ہیں۔ حدیث کے معنی نئی بات کے بھی ہیں اور حدیث کے معنی کسی اہم اور قابل ذکر واقعہ کے بھی ہیں۔ نئی چیز، نئی بات، اہم اور قابل ذکر واقعہ، کوئی گفتگو یا کوئی کلام، اس کو عربی زبان میں حدیث کہتے ہیں۔ آپ نے رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مشہور ارشاد سنا ہوگا جس میں آپؐ نے فرمایا 'خیرُ الحدیثِ کتابُ الله'۔ ایک جگہ ہے 'احسنُ الحدیثِ کتابُ الله'۔ یعنی سب سے اچھی گفتگو، سب سے اچھا کلام اللہ کا کلام ہے۔ گویا حدیث اور کلام دونوں بعض دفعہ مترادف کے طور پر بھی استعمال ہوتے ہیں۔

جاہلیت کے زمانے میں عربوں میں آپس میں جنگیں ہوتی رہتی تھیں اور آپس میں اختلافات بھی ہوتے رہتے تھے۔ جب ایک قبیلے کی دوسرے قبیلے سے جنگ ہوتی تھی، تو جیتنے والا قبیلہ اپنی فتح کو ایک تاریخی جشن کے طور پر یاد رکھتا تھا۔ اس کی تفصیلات قبیلے کے خطیبوں، شاعروں اور عام لوگوں میں افتخار کے ساتھ محفوظ رکھی جاتی تھیں۔ ان واقعات کو ایامُ العرب کے

نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ یعنی عرب کے نمایاں یا تاریخی یا قابل ذکر دِن۔ ان ایام مشہورہ کو احادیث بھی کہا جاتا تھا۔ احادیث العرب؛ یعنی وہ تاریخی واقعات جو کسی قبیلے کی تاریخ میں قابل ذکر ہیں اور قبیلہ اظہار فخر کے طور پر اس کو بیان کرتا تھا۔

احادیث کا لفظ ''اُحدُوثۃ'' کی جمع ہے۔ لیکن محدثین کے ہاں ابتداء ہی سے عام رواج یہ رہا ہے کہ حدیث کی جمع احادیث استعمال کی جارہی ہے۔ اصل لغت کے اعتبار سے احادیث جمع ہے احـدوثـہ کی، اح دوث ہ، یعنی کوئی خاص بات یا کوئی ایسی نمایاں چیز یا Novel چیز، جس کو لوگ یاد رکھیں۔ اس کی جمع احادیث ہے۔

قرآن مجید میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ربانی ہے: فَجَعَلْنٰاھُم اَحادَیثَ و مزّقْناھُم کُلَّ مُمَزّق، ہم نے انہیں بھولے بسرے قصے بنادیا۔ گویا احادیث کے معنی کسی تاریخی واقعہ اور تاریخی قصے کے بھی آتے ہیں۔ حدیث کے معنی نئی چیز کے بھی آتے ہیں۔ آپ نے عربی زبان میں پڑھا ہوگا کہ حـدیـث عـهـدبالاسلام، نیا نیا اسلام میں داخل ہوا ہے۔ تو حدیث گویا قدیم کے مقابلہ میں نئی بات کو کہیں گے۔ یہ قدیم کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات قدیم ہے۔ ہمشہ سے ہے، ہمیشہ رہے گی۔ ازلی اور ابدی ہے۔ اس لئے اس کا کلام بھی ازلی اور ابدی ہے۔ قرآن مجید کلام قدیم ہے۔ اور اگر وہ کلام قدیم ہے تو گویا اس کے سیاق وسباق میں حدیث رسول کو کلام حدیث یعنی نیا کلام قرار دے دیا گیا۔ دونوں وحی الٰہی ہیں۔ دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ ایک کلام قدیم ہے جو قدیم سے چلا آرہا ہے۔ ایک کلام نَو ہے، جو رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے بعد، آپؐ کے زمانہ حیات میں آپ کے ذریعے انسانوں تک پہنچا۔ اس لئے بھی علم حدیث کو حدیث کہا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں حدیث کا لفظ لغوی معنی میں مختلف مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید کے لئے بھی استعمال ہوا ہے؛ فَلیأتوا بِحدیثٍ مِن مثلِہ۔ اس جیسی ایک حدیث، یا اس جیسا ایک کلام، یا اس جیسی گفتگو بنا کر لے آؤ۔ یہاں حدیث کا لفظ کلام اور گفتگو کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح سے خود حدیث پاک میں لفظ حدیث لغوی معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔

تاہم جب یہ لفظ یعنی علم حدیث ایک فنی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔تو اس سے مراد وہ تمام چیزیں یا وہ تمام امور ہوتے ہیں جن کا مقصد رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی، آپؐ کے افعال اور آپ کے احوال کی تحقیق کرنا ہے۔علامہ بدرالدین عینی ایک مشہور محدث ہیں، صحیح بخاری کے شارح بھی ہیں اور مشہور فقیہ بھی ہیں۔انہوں نے علم حدیث کی تعریف کی ہے کہ هُوَ عِلم یُعرَفُ بِہٖ أقوالُ رَسول اللهﷺ وافعالُهٗ واحوالُهٗ؛ یعنی علم حدیث وہ علم ہے جس کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کے اقوال، آپؐ کے افعال اور آپؐ کے احوال معلوم کئے جائیں۔

علم حدیث کی تاریخ میں محدثین کے درمیان شروع سے حدیث کی اصطلاحی تعریف کے بارہ میں ایک اختلاف چلا آرہا ہے۔ اور وہ اختلاف یہ ہے کہ کیا صرف رسول اللہ ﷺ کے اقوال، افعال اور احوال کا نام حدیث ہے یا صحابہ کرامؓ اور تابعین کے اقوال، افعال اور احوال کا نام بھی حدیث ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ صحابہ کرام کے اقوال اور افعال و احوال تو حدیث میں شامل ہیں لیکن تابعین کے اقوال، افعال اور احوال حدیث کے مفہوم میں شامل نہیں ہیں۔ کچھ اور حضرات کا کہنا ہے کہ تابعین کے اقوال، افعال اور احوال بھی حدیث میں شامل ہیں۔اس اعتبار سے علم حدیث کی تعریف میں تھوڑا سا فرق واقع ہوجائے گا۔جو حضرات صرف رسول اللہ ﷺ کے اقوال، افعال اور احوال کو حدیث قرار دیتے ہیں۔وہ اس کی وہ تعریف کریں گے جو ابھی میں نے عرض کی۔ جو لوگ صحابہ اور تابعین کے اقوال، افعال اور احوال کو بھی حدیث کے مفہوم میں شامل قرار دیں گے وہ اس کی تعریف میں صحابہ اور تابعین کے الفاظ بھی شامل کردیں گے۔

اس اختلاف سے یہ نہ سمجھئے گا کہ اس سے علم حدیث کے ذخیرہ پر کوئی فرق پڑتا ہے۔علم حدیث کا ذخیرہ وہی ہے، چاہے آپ یہ تعریف اختیار کریں یا وہ تعریف اختیار کریں یا کوئی تیسری تعریف اپنائیں۔اس لئے کہ جو حضرات صحابہ کرام کے ارشادات اور اقوال کو بھی حدیث قرار دیتے ہیں، وہ ان کو اس لئے حدیث قرار دیتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کے ارشادات سے رسول اللہ ﷺ کے اقوال اور احوال کا پتہ چلتا ہے۔صحابہ کرام کے اجتماعی طرز عمل سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ

ﷺ کا طرز عمل کیا تھا۔ صحابہ کرامؓ کے رویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا رویہ کیا تھا۔ مثال کے طور پر سیّدنا عبداللہ بن عمرؓ کا طرز عمل یہ تھا کہ وہ کوئی کام سنت رسولؐ سے ہٹ کر نہیں کیا کرتے تھے۔ ہر کام سوفیصد اُسی طرح کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے جس طرح رسول اللہ ﷺ نے کیا ہو۔ چاہے آپؐ نے وہ کام بطور سنت کے کیا ہو یا عادت کے طور پر، یا بطور ذاتی پسند ناپسند کے کیا ہو، جس چیز کا دین یا شریعت سے تعلق نہ بھی ہو اس کو بھی حضرت عبداللہ بن عمرؓ اسی طرح کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اب حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا اپنا فعل اس اعتبار سے تو اُن کا اپنا فعل ہے کہ ایک صحابیؓ کا فعل ہے۔ لیکن اس سے ضرور یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی خاص معاملہ میں کیا رویّہ اختیار فرمایا ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے رویہ سے حضورؐ کے رویہ کی بالواسطہ نشاندہی ہوتی ہے تو اس مفہوم کے اعتبار سے صحابہ کرام کے اقوال، افعال اور احوال بھی حدیث کا حصہ ہو جائیں گے۔ یہی کیفیت تابعین کی ہے کہ تابعین میں ہزاروں انسان اور ہزاروں مقدس لوگ ایسے تھے کہ جنہوں نے علم حدیث کی خدمت کی۔ لیکن ایسے بھی تھے جن کا علم حدیث سے زیادہ اعتنا نہیں تھا۔ وہ زندگی کی اور سرگرمیوں میں اپنے وقت کو لگاتے تھے۔ لیکن ان میں بہت سوں کے رویّے اور طرز عمل سے صحابہ کرامؓ کے طرز عمل کی نشاندہی ہوتی تھی۔ صحابہ کرامؓ کے طرز عمل سے رسول اللہ ﷺ کے طرز عمل کی نشاندہی ہوتی تھی۔ اس لئے علم حدیث کی تعریف میں یہ دونوں چیزیں بعض حضرات نے شامل کی ہیں۔

حدیث کی تعریف

یہ تو علم حدیث کی تعریف ہوئی، خود حدیث کی تعریف کیا ہے؟ جس کا علم، علمِ حدیث کہلاتا ہے۔ حدیث کی مختصر ترین اور جامع ترین تعریف یہ ہے جو ایک بڑے محدث نے کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کُلُ ما اُضیفَ اِلَی النبی علیه الصلوٰة و السلام ، فَھوَ حدیث ۔ ہر وہ چیز جو رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے نسبت رکھتی ہے وہ حدیث ہے اور علم حدیث میں شامل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے کون سی بات کیسے ارشاد فرمائی، حضورؐ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کوئی فعل کیسے فرمایا، آپ کا طرز عمل کیا تھا، آپ کی شخصیت، ذات مبارکہ، ہر چیز جس کی نسبت حضورؐ کی ذات گرامی سے ہے وہ حدیث ہے۔

یہ حدیث کی مختصر ترین تعریف ہے۔اس میں وہ چیزیں بھی شامل ہیں جن کی حضورﷺ کی ذات گرامی سے نسبت صحیح ہےاور وہ روایات بھی شامل ہیں جن کی نسبت حضورؐ کی ذات مبارک سے کمزور ہے،اور وہ روایت بھی شامل ہے جس کی نسبت حضورؐ سے، اہل علم کی نظر میں، درست نہیں ہے۔ بہرحال جو امر بھی آپؐ کی ذات گرامی سے منسوب ہوگیا، وہ حدیث میں شامل ہوگیا۔ پھر حدیث کے مختلف درجات ہیں جن پر ہم آگے چل کر بات کریں گے۔

علم حدیث کا موضوع

ہر علم کا ایک موضوع ہوتا ہے۔ معاشیات کا ایک موضوع ہے۔ سیاسیات کا ایک موضوع ہے، منطق اور فلسفہ کا ایک خاص موضوع ہے۔ ہر کتاب کا بھی ایک موضوع ہوتا ہے۔ محدثین نے یہ سوال اٹھایا کہ علم حدیث کا موضوع کیا ہے؟ علم حدیث کا موضوع محدثین نے ذاتُ الرسول علیہ السلام من حیث انہ رسول اللہ ،یعنی رسول اللہﷺ کی ذات گرامی اس حیثیت میں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔اس حیثیت سے کہ وہ اللہ کے فرستادہ ہیں، یہ علم حدیث کا موضوع ہے۔

بعض اہل علم کو اس رائے میں تامل ہوا کہ رسول اللہﷺ کی ذات گرامی کو حدیث کا موضوع قرار دیں۔ انہوں نے کہا کہ کسی شخص کی ذات طب کا موضوع ہوسکتی ہے۔ میڈیکل سائنس کا موضوع ہوسکتی ہے، علم حدیث کا موضوع کیسے ہوگی؟ لیکن وہ یہ بھول گئے کہ اس تعریف کے اخیر میں یہ شرط لگائی گئی ہے کہ من حیث انہ رسول اللہ،یعنی اس حیثیت سے آپؐ کی ذات مبارک کا مطالعہ کیا جائے کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ کے رسول ہونے کی حیثیت میں آپؐ کی ذات گرامی کا مطالعہ علم طب کا نہیں بلکہ علم حدیث کا موضوع ہے۔

بعض حضرات نے علم حدیث کا موضوع تھوڑا سا ہٹ کر قرار دیا ہے۔اس کا مفہوم بھی تقریباً وہی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ المرویات الحدیثیة من حیث الاتصال والانقطاع،وہ تمام روایات ومرویات (جو حضورؐ کی ذات گرامی سے منسوب ہیں) حدیث کہلاتی ہیں،اس اعتبار سے کہ ان کی سند رسول اللہﷺ تک براہ راست پہنچتی ہے یا درمیان میں کوئی انقطاع واقع ہوا ہے۔ گویا بالواسطہ ذات رسالت مآب تک پہنچے یا بلا واسطہ ذات رسالت مآبؐ تک پہنچے۔ دونوں صورتوں میں علم حدیث کا موضوع رسول اللہﷺ کی ذات گرامی بنتی ہے۔

اصطلاحات

آپ نے حدیث سے متعلق لٹریچر میں کئی الفاظ سنے ہوں گے۔ حدیث، سنت، اثر، خبر۔ یہ الفاظ الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں یا ان کا ایک مفہوم ہے؟ اس کے بارے میں محدثین میں ہمیشہ گفتگو رہی ہے۔ اور اس موضوع پر محدثین نے تفصیل سے کلام کیا ہے۔ لیکن آگے بڑھنے سے پہلے دو باتیں یاد رکھئے۔

پہلی بات تو یہ یاد رکھنی چاہئے جو صرف علم حدیث ہی میں نہیں، بلکہ تفسیر میں، اصول فقہ میں، تاریخ میں اور ہر فن میں مشترک ہے کہ کسی چیز کی حقیقت یا تصور پہلے جنم لیتا ہے اور اس کے بارہ میں اصطلاحات ہمیشہ بعد میں پیدا ہوتی ہیں۔ حدیث، تفسیر اور فقہ وغیرہ علوم کی اصطلاحات رسول اللہ ﷺ کے دور مبارک میں پیدا نہیں ہوئیں۔ صحابہ کرامؓ کے دور میں بیشتر اصطلاحات پیدا نہیں ہوئیں۔ تابعین اور تبع تابعینؒ کے دور سے ہی اصطلاحات سامنے آنا شروع ہوئیں اور جب فنی اعتبار سے اسلامی علوم وفنون مدون ہوئے، اس وقت زیادہ اصطلاحات مرتب ہوئیں۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ کے ارشادات مبارکہ میں بہت سے الفاظ ان اصطلاحی معنوں میں استعمال نہیں ہوئے جو بعد میں محدثین کے ہاں رائج ہوئے۔ اس لئے یہ حقیقت سامنے رہنی چاہئے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اگر ایک لفظ بعد میں محدثین یا مفسرین یا فقہا کے ہاں اصطلاحی لفظ بن گیا اور وہ حدیث رسولؐ میں بھی آیا ہے تو ضروری نہیں کہ وہ ان اصطلاحی معنوں میں آیا ہو۔ وہ لفظ کسی لغوی مفہوم میں بھی ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آپ نے دیکھا کہ 'فأتوا بحديث مثله، اس میں حدیث کا لفظ غیر حدیث یا غیر قرآن کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ اس لئے کہ حدیث رسول کی یہ اصطلاح بعد کی ہے۔ قرآن پاک میں یہ اصطلاح نہیں تھی۔ یہ بات تمام اصطلاحات کے بارے میں یاد رکھیں۔

دوسری چیز یہ یاد رکھیں کہ عربی میں ایک کلیہ ہے کہ لامشاحة في الاصطلاح۔ یعنی اصطلاح کے باب میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہئے۔ ہر شخص کو یا ہر گروہ کو اپنی الگ اصطلاحات متعین کرنے کا حق حاصل ہے۔ مثلاً آپ الہدیٰ میں یہ طے کریں کہ ہماری اصطلاح یہ ہے کہ اگر سفید لائٹ جلا دی جائے تو سب لوگ کلاس میں آجائیں اور ہری لائٹ جلا دی جائے تو کلاس سے

نکل جائیں، گویا ہری روشنی کا مطلب یہ ہے کہ کلاس ختم ہوگئی۔ کسی کو یہ اصطلاح اختیار کرنے پر اعتراض کرنے کی اجازت نہیں کہ آپ نے یہ اصطلاح کیوں رکھی؟ یا اس کا عکس کیوں نہیں رکھا؟ آپ کو یہ اختیار ہے کہ آپ اپنی سہولت کی خاطر جو اصطلاح چاہیں وہ اختیار کرلیں۔ آپ بطور اصطلاح کوئی لفظ مقرر کرلیں کہ جو باہر سے ٹیچر آئے گا اس کو معلم کہیں گے جو اندر کا ہوگا اس کو مدرس کہیں گے۔ اس میں کوئی اختلاف کی بات نہیں ہے۔

اس لئے اگر محدثین نے اپنی اپنی اصطلاحات اختیار کی ہیں تو اس میں کسی کو اعتراض کا یا شک وشبہ کا حق نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہر عالم یا غیر عالم کو اپنی اصطلاحات وضع کرنے کا حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مفسرین میں اور محدثین میں کچھ اصطلاحات کے بارے میں تو اتفاق رائے ہے۔ لیکن کچھ اصطلاحات کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض حضرات نے اس کا ایک مفہوم قرار دے کر اس کو استعمال کیا ہے اور بعض دوسرے حضرات نے کوئی اور مفہوم قرار دے کر استعمال کیا ہے جس کی تفصیل آگے وقتاً فوقتاً آپ کے سامنے آتی رہے گی۔

حدیث اور سنت کا فرق

سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ حدیث اور سنت میں محدثین نے کیا فرق رکھا ہے۔ حدیث اور سنت دو مشہور اصطلاحات ہیں۔ قرآن مجید میں سنت کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے اور حدیث کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ خود حدیث پاک میں حدیث کا لفظ بھی آیا ہے اور سنت کا لفظ بھی آیا ہے۔ حدیث اور سنت کے بارے میں علماء کے ایک گروہ کی تو رائے یہ ہے کہ یہ دونوں بالکل ایک مفہوم میں ہیں۔ جو حدیث ہے وہ سنت ہے اور جو سنت ہے وہ حدیث ہے۔ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک بڑی تعداد کی رائے یہ ہے۔

کچھ اور حضرات کا کہنا ہے کہ حدیث ایک عام چیز ہے اور سنت خاص ہے اور اس کا ایک حصہ ہے۔ حدیث تو ہر وہ چیز ہے جو رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک سے منسوب ہوگئی جس میں ضعیف احادیث بھی شامل ہیں اور موضوع احادیث بھی شامل ہیں، منکر اور شاذ احادیث بھی شامل ہیں جس کی تفصیل آگے آئے گی، اور سنت سے مراد وہ طریقہ ہے جو احادیث صحیحہ کی بنیاد پر ثابت ہوتا ہے، جو رسول اللہ ﷺ کا طے کیا ہوا طریقہ ہے جو آپ نے اپنی امت کو سکھایا، جو قرآن

پاک کے منشا اور معانی کی تفسیر وتشریح کرتا ہے اور جو دنیا میں قرآن پاک کے لائے ہوئے نظام کی عملی تشکیل کرتا ہے۔ اُس طریقہ خاص کا نام سنت ہے۔

سنت کی تعریف

پھر اگر سنت کی تعریف یہ ہو کہ وہ طریقہ جو رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے لئے قائم فرمایا، جس طریقے کو قائم فرمانے کے لئے رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، وہ طریقہ کیا صرف اور صرف رسول اللہ ﷺ کے طریقہ اور ارشادات سے ثابت ہوتا ہے، یا صحابہ کرامؓ کے ارشادات وافعال سے بھی ثابت ہوتا ہے؟ یا تابعین کے ارشادات سے بھی ثابت ہوتا ہے؟ جو اختلاف حدیث کی اصطلاحی تعریف کے بارہ میں تھا وہی اختلاف سنت کے بارے میں بھی ہے۔

امام مالکؒ، جو مشہور امام المحدثین ہیں اور امام الفقہا بھی ہیں۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ سنت میں رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرامؓ اور تابعین، ان تینوں کا طرز عمل اور ان تینوں کا طریقہ شامل ہے۔ آپ موطاء امام مالکؒ پڑھیں تو اُس میں بارہا، درجنوں نہیں، سینکڑوں مقامات پر امام مالکؒ نے ایک خاص عمل کو اپنی تحقیق میں سنت قرار دیا ہے اور دلیل دی ہے کہ فلاں صحابیؓ یہ طرز عمل اختیار کیا کرتے تھے۔ کبھی دلیل دی ہے کہ فلاں تابعی یہ کام کیا کرتے تھے۔ ایک جگہ لکھا کہ فلاں طرز عمل سنت ہے اس لئے کہ عبدالملک بن مروان کو میں نے یہ کام کرتے دیکھا۔ یہ امام مالکؒ کی رائے ہے۔

کچھ اور حضرات ہیں جو صرف رسول اللہ ﷺ کے طرز عمل اور طریقہ کار کو سنت قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک صحابہ کرامؓ کے طریقہ کار کو صحابہؓ کی سنت قرار دیا جائے گا۔ خلفائے راشدین کی سنت کو خلفائے راشدین کی سنت قرار دیا جائے گا، رسول اللہ ﷺ کی سنت قرار نہیں دیا جائے گا۔

کچھ دیگر حضرات کا کہنا یہ ہے کہ یہ دونوں اصطلاحات الگ الگ معنی رکھتی ہیں۔ علم حدیث کا الگ مفہوم ہے اور علم سنت کا بالکل الگ مفہوم ہے۔ سنت کی تعریف جن لوگوں نے حدیث سے الگ کی ہے وہ کہتے ہیں کہ طریقہ متبعہ کا نام سنت ہے یعنی وہ طریقہ جس کا اتباع کرنے کا حکم دیا گیا وہ سنت ہے۔

سنت کی اصطلاح اسلام سے پہلے سے چلی آرہی ہے اور حدیث کی اصطلاح اسلام نے دی ہے۔ حدیث کا لفظ تو ان اصطلاحی معنوں میں اور اس مفہوم میں استعمال نہیں ہوتا تھا جو بعد میں اس لفظ کو دیا گیا۔ لیکن سنت کا لفظ قریب قریب انہی معنوں میں اسلام سے پہلے سے چلا آرہا ہے۔ اگر آپ نے جاہلی شاعری کا مطالعہ فرمایا ہو، تو جاہلی شاعروں میں سے ایک مشہور شاعر ہیں جو معلقات کے شاعروں میں سے ایک ہیں، لبید بن ربیعہ العامری، ایک شعر میں ان کا کہنا ہے کہ۔

مِن مَعشَرٍ سَنَّت لهم اباؤهم
وَ لِكُلِّ قوم سُنة و إمامُها

میرا تعلق اس گروہ سے ہے جن کے اباواجداد نے ایک سنت مقرر کی ہے اور ہر قوم کی ایک سنت یعنی طریقہ متبعہ ہوتا ہے اور امام ہوتا ہے۔ یعنی میرے اباواجداد اتنے بڑے لیڈر تھے کہ ان کا طریقہ کار پورے عرب میں سنت بن گیا، اسلام سے پہلے کا طریقہ بن گیا۔ (یہاں سنت کا لفظ آیا ہے جو اسلام سے پہلے اسی مفہوم میں استعمال ہوتا تھا۔)

جو حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ حدیث اور سنت کے دونوں الفاظ دو الگ الگ معانی میں استعمال ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک مشہور محدث امام عبدالرحمٰن بن مہدی بھی ہیں۔ وہ امام مالکؒ اور سفیان ثوری کے بارے میں کہتے ہیں، (یہ سفیان ثوری مشہور محدث ہیں، اپنے زمانے میں امیر المومنین فی الحدیث کہلاتے تھے، یعنی حدیث میں مسلمانوں کے امیر۔ صف اول کے اعلیٰ ترین، عظیم ترین اور متقی ترین محدثین میں سے گزرے ہیں، ان کے بارے میں عبدالرحمٰن بن مہدی نے کہا کہ) سفيان الثوری امام فی الحديث، سفیان ثوری حدیث کے امام ہیں۔ والاوزاعی امام فی السنة، اور امام اوزاعی، جو مشہور فقیہ ہیں، سنت میں امام ہیں وَ مالك امام فيهما اور مالک، جو موطاء کے مصنف ہیں، دونوں کے امام ہیں، سنت کے بھی امام ہیں اور حدیث کے بھی امام ہیں۔ گویا انہوں نے ان دونوں کو بالکل الگ الگ مفاہیم میں سمجھا ہے۔

آپ نے حدیث کی اکثر کتابوں میں پڑھا ہوگا۔ ایک محدث جب کوئی حدیث بیان کرتا ہے اور اس حدیث پر روایت کے بعد درایت کے نقطہ نظر سے بحث کرتا ہے، جس پر آگے چل کر ہم بات کریں گے، تو وہ یہ کہتا ہے کہ هذا الحديث مخالف للقياس والسنة والاجماع،

اس حدیث کے ظاہر پر ہم اس لئے عمل نہیں کریں گے کہ یہ قیاس، سنت اور اجماع کے خلاف ہے۔ایک طرف حدیث ہے اور ایک طرف سنت ہے، گویا سنت اور حدیث کو وہ متعارض معنوں میں لے رہے ہیں۔ یہ مثالیں میں نے یہ ظاہر کرنے کے لئے دی ہیں کہ محدثین کا ایک گروہ حدیث اور سنت کو الگ الگ مفہوم میں سمجھتا ہے۔

قرآن مجید میں بھی سنت کا لفظ اللہ تعالیٰ کی سنت اور عادت کے لئے استعمال ہوا ہے۔ سنت الله فی الذین خلوا من قبل ، یہ اللہ کی سنت ہے جو پہلے لوگوں کے زمانے سے چلی آرہی ہے۔اللہ تعالیٰ کا جو خاص نظام ہے، جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، جس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی، جو اللہ کا اصول ہے وہ ہمیشہ ایک جیسا رہتا ہے۔اللہ کے اس اصول اور اللہ کے اس طریقے کے لئے بھی قرآن مجید میں سنت کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

مدینہ منورہ کو بعض لوگ دارالسنۃ قرار دیا کرتے تھے۔ یعنی سنت کا گھر، جہاں سے ساری سنتیں نکلی ہیں۔ یقیناً مدینہ منورہ دارالسنۃ تھا۔صحابہ کرامؓ جن کے پاس سنت کا علم تھا وہ مدینہ منورہ ہی میں رہتے تھے۔ مدینہ منورہ ہی سے سنت کے ذخائر نکلے ہیں۔ مدینہ منورہ ہی سے صحابہ کرامؓ دنیا کے گوشوں میں پھیلے، اس لئے مدینۃ السنۃ، مدینہ منورہ کا نام ہونا ایک بالکل فطری چیز ہے۔

حدیث، اثر اور خبر

حدیث اور سنت کے ساتھ ساتھ 'حدیث اور اثر' کی اصطلاح بھی استعمال ہوتی ہے، اَ ثَ ر۔ اثر کے لفظی معنی تو نشان اور آثار قدم کے ہیں۔ یا کسی بھی چیز پر کسی اور چیز کا نشان پڑ جائے اس کو عربی زبان میں اثر کہتے ہیں اور تاثیر کے معنی کسی پر نشان ڈال دینا۔ آپ نے کسی چیز پر اپنے انگوٹھے کا نشان ڈال دیا۔ اس عمل کو عربی زبان میں تاثیر کہتے ہیں۔ اثر کا لفظ بھی علمائے اہل حدیث کی نظر میں دو معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ محدثین کی ایک جماعت ہے جو صرف صحابہ کرامؓ اور تابعین کے اقوال وفرمودات کے لئے آثار اور اثر کا لفظ استعمال کرتی ہے اور آثار صحابہ وتابعین کی اصطلاح اسی مفہوم میں ہے۔ ایک اور جماعت ہے جو اثر اور حدیث کو ایک ہی مفہوم میں سمجھتی ہے۔ اس کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے ارشادات، اقوال وافعال اور اعمال اور صحابہ

وتابعین ان سب کے اقوال وافعال واعمال کو حدیث بھی کہتے ہیں اور اثر بھی کہتے ہیں۔

علم حدیث کی اصطلاح میں ایک اصطلاح ہے 'مرفوع'۔ مرفوع کے لفظی معنی ہیں 'وہ چیز جس کو بلند کیا گیا ہو' جس کو اٹھایا گیا ہو، بلند شدہ، انگریزی میں **Exalted**۔ اصطلاح میں اس سے مراد وہ حدیث ہے جو رسول اللہ ﷺ تک پہنچتی ہے، جس میں راوی رسول اللہ ﷺ کا اسم مبارک لے کر صراحتاً اس حدیث کو آپ کی ذات مبارکہ سے منسوب کرتا ہے۔ اس کو مرفوع کہتے ہیں۔

اس کے مقابلہ میں دوسری اصطلاح ہے موقوف۔ یعنی ٹھہرا ہوا، جو رک گیا ہو، انگریزی میں آپ **Halted** کہہ سکتے ہیں۔ یہ وہ روایت یا حدیث ہے جس کی نسبت صحابہ تک پہنچتی ہے، ان کے بعد آگے نسبت کوئی پیش قدمی نہیں کرتی۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ فلاں شخص نے مجھ سے بیان کیا، فلاں شخص سے فلاں نے بیان کیا، انہوں نے فلاں صحابیؓ کو یہ ارشاد فرماتے سنا اور پھر آگے وہ بات بیان ہوتی ہے۔ اس کے بعد آگے نہیں۔ اس بات کو موقوف کہتے ہیں جو صحابہ کرام پر جا کر رک جائے۔ جو لوگ حدیث اور اثر میں فرق کرتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ روایت اگر مرفوع ہو، رسول اللہ ﷺ کی ذات تک پہنچتی ہو تو اس کو حدیث کہا جائے گا اور اگر روایت صحابہ کرام یا تابعین پر موقوف ہو جائے تو اس کو اثر کہا جائے گا۔

یہی فرق ہے خبر اور حدیث کے درمیان۔ خبر کا لفظ بھی کتب حدیث میں کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ لغوی اعتبار سے خبر کا مطلب ہے اطلاع یا رپورٹ۔ ہر وہ اطلاع یا رپورٹ جو رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد، یا فعل یا کیفیت کے بارے میں اگر کسی نے دی، وہ اصطلاحاً خبر بھی کہلاتی ہے اور حدیث بھی کہلاتی ہے۔ یہ دونوں اصطلاحات **Inter-changeable** ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کے بدلے میں بھی استعمال ہوتی ہیں اور الگ الگ بھی استعمال ہوتی ہیں۔ یہ چار اصطلاحی الفاظ ہیں جن کو سمجھ لینا چاہئے یعنی حدیث، سنت، اثر اور خبر۔

اصطلاحات میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہئے۔ ہر بڑے محدث کا حق ہے کہ جو اصطلاح چاہے وضع کرے۔ لیکن جب ہم کسی اصطلاح کو استعمال کرنا چاہتے ہیں تو ہم پہلے یہ ضرور دیکھ لیں کہ ہم اس اصطلاح کو کس سیاق وسباق میں استعمال کر رہے ہیں اور کس مفہوم میں استعمال کر رہے ہیں۔ مثلاً ایک اصطلاح امام بخاریؒ کی ہے تو ہم امام بخاری کے سیاق وسباق میں امام بخاری کی اصطلاح کو استعمال کریں گے اور اپنی کوئی اصطلاح استعمال نہیں کریں گے۔ یہ

بات درست نہیں ہوگی کہ میں اپنی کوئی اصطلاح وضع کروں یا آپ اپنی کوئی اصطلاح وضع کریں اوراس کوامام بخاری کے سیاق وسباق میں استعمال کریں۔وہ امام بخاری کے نقطہ نظر کی صحیح ترجمانی نہیں ہوگی۔اس لئے ان چاروں اصطلاحات کامفہوم پہلے سے ہی ذہن میں واضح ہونا چاہئے۔

علم حدیث؛ ایک بے مثال فن

علم حدیث جس کے بارے میں علم بھی دن بہ دن کم ہوتا جارہا ہے اورلوگوں کی دلچسپی بھی روز بروز گھٹ رہی ہے۔اس میں مہارتیں دن بدن محدود ہوتی چلی جارہی ہیں۔اس علم سے دلچسپی خود اسلامیات کے طلبہ کی محدود ہوتی چلی جارہی ہے۔یہ انسانی تاریخ کا ایک انتہائی منفرداور بے مثال علمی کارنامہ ہے۔یہ ایک ایسا بے نظیر علم ہے جس کی مثال پیش کرنے سے انسانی تاریخ قاصر ہے۔اس پرتھوڑی سی گفتگوتو آگے چل کر ہوگی۔لیکن سردست اختصار کے ساتھ یہ ذہن میں رکھئے کہ انسانی تاریخ میں کوئی ایساعلم موجودنہیں ہے جس کا مقصد کسی ایک شخصیت کے اقوال وافعال کومحفوظ رکھنا اوراس کو ہرقسم کے شک وشبہ سے پاک کرکے اس طرح منقح کردینا ہو کہ پڑھنے والوں کوایسا یقین آجائے جیسا کہ آج سورج نکلنے کا یقین ہے۔جتنی یہ بات یقینی ہے کہ اس وقت سورج نکلا ہوا ہے اتنا ہی اس بات کویقینی بنادینا کہ یہ بات رسول اللہ ﷺ کے دہنِ مبارک سے نکلی کہ نہیں نکلی۔یہ کاوش انسانی تاریخ میں اپنی نوعیت کی منفرد کاوش ہے۔دنیا میں بڑی بڑی بڑی دینی شخصیتیں گزری ہیں۔آج بھی ایسی دینی شخصیتیں موجود ہیں اورتاریخ میں بھی موجودرہی ہیں جن کے پیروکاروں کی تعدادرسول اللہ ﷺ کے ماننے والوں سے زیادہ ہے۔حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جولوگ مانتے ہیں۔ان کی تعداداُن سے بہت زیادہ ہے جورسول اللہ ﷺ کو مانتے ہیں۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ماننے والوں میں یہودی بھی شامل ہیں عیسائی بھی شامل ہیں اورمسلمان بھی شامل ہیں۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ماننے والوں میں یہودی، عیسائی اور مسلمان تینوں شامل ہیں۔لیکن ان میں سے کسی بھی جلیل القدر پیغمبر کے اقوال وافعال اور ارشادات کومحفوظ رکھنے کاان کے ماننے والوں نے ایک لاکھواں اہتمام بھی نہیں کیا،ایک کروڑواں اہتمام بھی نہیں کیا جتنا اہتمام مسلمانوں نے رسول اکرمؐ کے ارشادات گرامی کومحفوظ کرنے کے لئے کیا۔اس پرآگے چل کرمزید تفصیل سے گفتگوہوگی۔نہ اس سے پہلے ایسے کسی فن کی کوئی مثال

ملتی ہے نہ آگے چل کر ایسی کوئی مثال دستیاب ہوئی ہے۔

انسانی عبقریت، یعنی انسانی **Genius**، کا اظہار دو طریقوں سے ہوتا ہے۔ یعنی کسی علم وفن میں انسان کی عبقریت کا اگر آپ جائزہ لیں تو دو انداز سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک انداز تو وہ ہے جس کو آپ تخلیقی عبقریت کہہ سکتے ہیں یعنی **Creative Genius**۔ تخلیقی عبقریت سے مراد یہ ہے کہ ایسی عبقریت کہ جس میں انسان اپنی عقل سے کام لے کر علوم وفنون کے میدان میں ایسے کارنامے انجام دے جو کسی اور انسان کی عقل میں نہ آئے ہوں اور انسانی عقل ان کو دیکھ کر حیران رہ جائے۔ مسلمانوں میں **Creative Genius** کا سب سے اعلیٰ نمونہ 'علم اصول الفقہ' ہے۔ اصول فقہ سے بڑھ کر کریٹیو جینئس کی مثال مسلمانوں میں نہیں ملتی۔ جینئس یا عبقریت کی ایک دوسری قسم بھی ہوتی ہے۔ جس کو ہم **Accumulative Genius** کہہ سکتے ہیں۔ یعنی معلومات اتنی کثرت سے اور اتنی وافر انداز سے فراہم کر دی جائیں کہ انسانی عقل اس کی کثرت پر دنگ رہ جائے۔ علم حدیث مسلمانوں کی **Accumulative Genius** کا بے مثال نمونہ ہے۔ انسانی تاریخ میں کوئی فن ایسا نہیں ہے جس میں معلومات کے انبار، معلومات کے پہاڑ اور معلومات کے سمندر اس طرح جمع کئے گئے ہوں جس طرح علم حدیث میں جمع کئے گئے ہیں۔ آئندہ گیارہ خطبات میں آپ کو اس کا تھوڑا سا اندازہ ہو سکے گا۔

یہ وہ چیز ہے جس کا اعتراف ایک بڑے غیر مسلم مستشرق ڈاکٹر سپرینگر (**Springer**) نے کیا ہے۔ آپ نے اس شخص کا نام سنا ہوگا۔ یہ ایک جرمن مستشرق تھا۔ ہمارے برصغیر میں بھی کافی عرصہ رہا۔ اس نے علم حدیث پر کام کیا تھا اور جب اس نے فن رجال کا مطالعہ کیا، (فن رجال پر آگے چل کر گفتگو ہوگی، یعنی علم حدیث کے راویوں کا علم۔) تو وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ ایک شخصیت کے احوال اور اقوال کو یقینی بنانے اور محفوظ رکھنے کے لئے چھ لاکھ انسانوں کے حالات جمع کئے گئے۔ چھ لاکھ انسانوں کے حالات اس لئے جمع کئے گئے کہ وہ چھ لاکھ انسان بالواسطہ یا بلاواسطہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی کو محفوظ رکھنے کے عمل میں شریک تھے۔ اس کی مثال مسیحیت کی تاریخ میں، یہودیت کی تاریخ میں یا کسی بھی مذہب کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ عیسائیوں سے پوچھا جائے کہ آپ اپنی دو ہزار سالہ تاریخ میں ان شخصیتوں کے نام بتائیے جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اقوال کو محفوظ رکھا ہو یا ہم تک پہنچایا ہو تو شاید اول تو ان کی سمجھ میں نہیں

آئے گا کہ آپ کا سوال کیا ہے، اور اگر سمجھ میں آجائے تو پچیس تیس آدمیوں سے یا شاید پچاس چالیس آدمیوں سے زیادہ کے نام آپ کو نہ دے سکیں۔ مسلمانوں میں چھ لاکھ رواۃ کے نام اس وقت محفوظ اور موجود ہیں۔

ابھی میں ساتھ والے کمرے میں بیٹھا تھا تو یہاں جو کتابیں رکھی ہوئی ہیں وہ اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہیں۔ رجال کی ان کتابوں میں کئی لاکھ انسانوں کے حالات محفوظ ہیں۔ صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارکہ کو دیکھا۔ ان کی آنکھیں اس شرف سے مشرف ہوئیں اور ان کے کان اس اعزاز سے معزز ہوئے۔ اس لئے سب سے پہلے ان کے حالات جمع کرنے پر توجہ دی گئی۔ آج صحابہ کرام کے تذکرے پر جو کتابیں ہیں جن کی تعداد ایک دو نہیں بلکہ درجنوں میں ہے، ان میں کم وبیش بارہ سے پندرہ ہزار صحابہ کرام کے حالات محفوظ ہیں۔ اس کی کوئی مثال آج تک کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ اور اُس وقت بھی نہیں مل سکتی تھی۔ کہ کسی بڑے سے بڑے انسان کے ساتھیوں کا اور اس کے اصحاب کا تذکرہ جمع کیا گیا ہو اور بارہ پندرہ ہزار افراد کا تذکرہ اس لئے جمع کیا گیا ہو کہ یہ فلاں شخص کے اصحاب اور اس کے ساتھی ہیں اور اِن سے اُن کے بارے میں کوئی معلومات یا کوئی رہنمائی مل سکتی ہے۔ اس نقطہ نظر سے آپ جتنا غور کریں، تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ انسانی تاریخ کا ایک انتہائی منفرد علم ہے، جس کی کوئی مثال دنیا کی تاریخ میں نہ مذہبی علوم میں ملتی ہے اور نہ غیر مذہبی علوم کی تاریخ میں ملتی ہے۔

مذہبی علوم کی تاریخ میں ایسی مثالیں تو موجود ہیں کہ کسی مذہبی شخصیت کے ارشادات کے مجموعے مرتب ہوئے ہوں۔ آج بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعض ارشادات بائبل میں موجود ہیں۔ یہ چار انجیلیں جن کو عیسائی مستند انجیلیں مانتے ہیں، یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمریاں اور ارشادات کے مجموعے ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ ان کی تاریخی حیثیت کیا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ ان کی کوئی Authenticity ہے کہ نہیں، یہ بات بہرحال سب مانتے ہیں کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اقوال اور ارشادات کے کچھ مجموعے ہیں۔ لیکن ان مجموعوں کی مدد سے اگر آپ حضرت عیسیٰؑ کے اقوال وارشادات کی کوئی فہرست مرتب کریں تو دوسو ڈھائی سو سے زیادہ ارشادات کا مجموعہ نہیں ملے گا۔ سارے ارشادات ملا کر ان کی تعداد دو ڈھائی سو سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اس کے مقابلے میں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی جو صحابہ کرام نے جمع کئے ہیں ان

کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ مسند امام احمد کم وبیش پچاس ہزار احادیث کا مجموعہ ہے۔ جس میں سے اگر مکررات نکال دیئے جائیں تو تیس ہزار سے زیادہ احادیث اور اقوال رسولؐ اس میں دستیاب ہیں۔ کنز العمال جو ہمارے برصغیر کے مشہور محدث علامہ سیّد علی متقی ہندی کی تصنیف ہے، اس میں انہوں نے باون ہزار ارشادات نبویؐ جمع کئے ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطی، جنہوں نے یہ طے کیا کہ اس وقت تک جتنے مجموعے احادیث کے موجود ہیں ان سب کو جمع کر کے ساری احادیث ایک ہی کتاب میں جمع کر دی جائیں۔ اس میں انہوں نے یہ تعداد ستر ہزار کے لگ بھگ پہنچائی اور وہ اس کام کو نامکمل چھوڑ کر رخصت ہوئے، مکمل نہیں کر پائے۔ ان کی کتاب 'جمع الجوامع' یا 'الجامع الکبیر' کے نام سے مشہور ہے۔

اس طرح سے جو بڑے بڑے مجموعے ہیں ان میں احادیث کی تعداد ساٹھ ہزار پینسٹھ ہزار، ستر ہزار تک دستیاب ہے، ان میں سے مکررات نکال دیئے جائیں تو اندازاً پچاس ہزار تک یہ ارشادات بنتے ہیں۔ اتنا بڑا مجموعہ دنیا میں کسی بھی انسان کے اقوال وارشادات کا، کسی مذہبی یا غیر مذہبی شخصیت کا موجود نہیں ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص کسی مذہبی یا دینی جذبہ سے بھی علم حدیث کو حاصل نہ کرنا چاہے، جو بڑے افسوس کی بات ہوگی، لیکن خالص علمی لحاظ سے بھی یہ مضمون اس کا متقاضی ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے اور دیکھا جائے کہ یہ منفرد واقعہ کیسے اور کیوں وجود میں آیا۔

صحت حدیث پر شکوک کی حقیقت

علم حدیث میں جو ذخیرہ سنت اور احادیثِ صحیحہ کا موجود ہے اس کی ثقاہت یعنی Authenticity کس درجہ کی ہے اس پر ایک الگ نشست اور گفتگو میں بحث کی جائے گی۔ لیکن اس غلط فہمی کو آج ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ذہنوں اور دلوں سے نکال دیجئے کہ علم حدیث کے ثبوت میں کسی بھی اعتبار سے شک وشبہ کی کوئی گنجائش پائی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں برصغیر میں بھی اور برصغیر سے باہر بھی ایسے کئی لوگ موجود ہیں جنہوں نے اردو، عربی، انگریزی، فارسی اور دیگر زبانوں میں علم حدیث کے بارہ میں شکوک وشبہات پر مشتمل کتابیں لکھی ہیں، جن کا مقصد ہی یہ ہے کہ علم حدیث کے بارے میں شکوک پیدا کئے جائیں اور مسلمانوں کا اس پر ایمان کمزور کر دیا جائے۔ اگر یہ لوگ بدنیتی سے ایسا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے، نیک نیتی سے

کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی غلطی کو درست کر دے۔ لیکن یہ بات یا تو پرلے درجہ کی غلط فہمی اور کم علمی ہے یا انتہائی بدترین قسم کی بددیانتی ہے جس میں علم حدیث کے بارے میں شک وشبہ کا اظہار کیا جائے۔

کسی بھی چیز کو محفوظ رکھنے کے جتنے طریقے ہو سکتے ہیں اور انسانی ذہن و دماغ میں آسکتے ہیں وہ سارے کے سارے سنت کو اور ارشادات رسول ﷺ کو محفوظ رکھنے کے لئے محدثین نے اور امت مسلمہ نے اختیار کیے اور ان سب ممکنہ طریقوں سے محفوظ ہو کر علم حدیث مرتب و منقح ہو کر ہم تک پہنچا ہے۔ دنیا کے کسی علم پر اتنے بڑے بڑے انسانی دماغوں نے اور اتنے غیر معمولی یادداشت رکھنے والے انسانوں نے مسلسل غور و خوض نہیں کیا جتنا علم حدیث پر غور و خوض ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے زبان مبارک سے نکلنے والے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف پر سینکڑوں پہلوؤں سے لاکھوں انسانوں نے غور کیا ہے اور یہ غور چودہ سو برس سے مسلسل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ ابھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ اس وقت بھی دنیا بھر میں جاری وساری ہے۔ اور نئے نئے اہل علم تسلسل کے ساتھ نئے نئے راستے اور نئے نئے رجحانات علم حدیث پر غور کرنے کے لئے سامنے لا رہے ہیں۔ جن پر میں سب سے آخری خطبہ میں ان شاء اللہ گفتگو کروں گا۔

اس لئے سب سے پہلے تو یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ علم حدیث اسی طرح کا مستند علم ہے جیسے کوئی بھی انسانی علم مستند ہو سکتا ہے۔ اس علم کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کی سنت اور آپؐ کی احادیث مبارکہ کو جس طرح محفوظ کیا گیا وہ اسی طرح قطعی اور یقینی ہے جس طرح قرآن حکیم قطعی اور یقینی ہے۔ حدیث وسنت قرآن حکیم کی طرح صرف ایک فرق کے ساتھ قطعی اور یقینی ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ اللہ کی طرف سے ہیں اور احادیث کے الفاظ اللہ کی طرف سے نہیں ہیں۔ قرآن مجید ایک خاص ترتیب سے رسول اللہ ﷺ نے محفوظ کرایا اور احادیث کو حضورؐ نے اس ترتیب سے محفوظ نہیں کرایا۔ صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارک میں قرآن مجید کو زبانی یاد کر لیا اور احادیث کو بہت سے صحابہ نے اُس طرح سے زبانی یاد نہیں کیا۔ اس لئے کہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس ایک فرق کے ساتھ احادیث اور سنت اسی طرح مستند اور محفوظ ہیں جس طرح کہ قرآن مجید مستند اور محفوظ ہے۔

کتب حدیث کے بارے میں غلط فہمیوں کی حقیقت

بعض لوگ یہ کہتے ہیں، آپ نے بھی سنا ہوگا کہ اس وقت احادیث کے جتنے مجموعے ہیں یہ سب کے سب بعد میں لکھے گئے۔ صحیح بخاری تیسری صدی ہجری میں لکھی گئی، صحیح مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، یہ سارے مجموعے تیسری صدی ہجری کے مرتب شدہ ہیں۔ یہ لوگ اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ محدثین نے وہ قصے کہانیاں جو بازار میں مشہور ہوتی ہیں، ایک جگہ جمع کر دیئے، مسلمانوں نے عقیدت مندی میں ان کو مان لیا اور اس کو بطور حدیث رسول ﷺ کے قبول کرلیا۔ یہ غلط فہمی کیوں پیدا ہوئی؟ کیسے پیدا ہوئی۔ اس پر تفصیل سے بات کریں گے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی غلط فہمی جس کی تائید میں بہت سی بے سروپا باتیں کی گئی ہیں ان میں سے کوئی ایک بات بھی درست نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا وہمی اور فرضی قسم کا خیال ہے، جس کی نہ کوئی علمی بنیاد ہے نہ عقلی بنیاد ہے۔ علماء اسلام نے خاص طور سے بیسویں صدی میں بہت سے علمائے حدیث نے اس غلط فہمی کو ہمیشہ کے لئے دور کر دیا ہے اور اس غلط فہمی کی اس طرح تردید کر دی ہے کہ اس کے بعد اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی۔

علم حدیث رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں وجود میں آچکا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو اپنے ارشادات کو سننے کی اور دوسروں تک پہنچانے کی ہدایت فرمائی۔ یہ حدیث آپ نے پڑھی ہوگی جس میں ارشاد فرمایا گیا کہ 'نضر اللہ امرءً سمع مقالتی فحفظھا ووعیھا و اداھا کما سمعھا' یہ روایت مختلف الفاظ میں مختلف صحابہ کرام نے نقل کی ہے اور تقریباً تمام محدثین نے اس کو مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس شخص کو سرسبز و شاداب رکھے جس نے میری بات سنی، اس کو یاد کیا، اس کو محفوظ رکھا اور اس کو آگے تک پہنچا دیا۔

یاد رکھیں کہ آپ بھی اس کی مستحق بن سکتی ہیں، جس نے میری بات سنی، اس کو یاد رکھا، اس کو محفوظ رکھا اور اس کو آگے تک پہنچا دیا۔ اگر کوئی شخص ایک حدیث بھی یاد کر کے اس نیت سے دوسروں تک پہنچا دے کہ وہ شادابی کی اس خوشخبری کا مستحق بن جائے تو ان شاء اللہ اس شادابی کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس روایت کے مختلف الفاظ آئے ہیں۔ مختلف الفاظ میں یہ حدیث بیان ہوئی ہے۔ بعض جگہ آپ نے فرمایا کہ 'رب مبلغ اوعی من سامع' اس کی مثالیں آپ کو بہت نظر آئیں گی۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آپ نے کسی کے سامنے حدیث

بیان کی، جس کے سامنے بیان کی اس نے آپ کی نسبت زیادہ بہتر طور پر اس کی حفاظت کی۔ یعنی آپ نے بیان کی اور پھر کسی وجہ سے آپ کو یاد نہیں رہا، جس سے بیان کی تھی اس نے یاد رکھا اور آگے سینکڑوں ہزاروں تک پہنچادیا جہاں تک آپ شاید نہیں پہنچا سکتے تھے۔ تو اس کا امکان ہے کہ آپ سے زیادہ بہتر انداز میں وہ لوگوں تک پہنچا سکے۔ ہوسکتا ہے کہ بعض ایسے لوگ جن کو پہنچایا گیا ہو وہ پہنچانے والے سے زیادہ حفاظت کرنے والے ہوں۔ ایک جگہ ارشاد ہوا کہ 'فرب حامل فقه الی من هو افقه منه' بعض اوقات ایسا ہوسکتا ہے کہ فقہ اور دانائی کی یہ بات، دین میں گہری سمجھ اور شعور کی یہ بات آپ نے کسی ایسے کو پہنچائی جو آپ سے زیادہ سمجھ رکھتا ہو اور وہ اس سے وہ معانی اور مطالب نکال لے جو آپ کے ذہن میں نہیں آئے۔ میں نے اپنی زندگی میں بارہا ایسی مثالیں دیکھی ہیں۔ کہ علم حدیث کا ایک خاص پہلو کسی جگہ بیان کیا گیا اور جس کے روبرو اور جس سے بیان کیا گیا اس نے اس سے وہ معنی نکالے جو بیان کرنے والے کے ذہن میں بالکل نہیں تھے۔

میرے ساتھ بھی ایک بار ایسا ہی ہوا۔ اے کے بروہی مرحوم ہمارے ملک کے مشہور دانشور اور قانون دان تھے۔ ایک مرتبہ ہم دونوں کسی معاملہ پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ میں نے ان کو اپنے نقطہ نظر کی تائید میں ایک حدیث سنائی جو انہوں نے پہلے نہیں سنی تھی۔ انہوں نے اس کو بڑا خوش ہو کر سنا اور اپنے پاس نوٹ بھی کر لیا۔ اگلے دن کسی موضوع پر ان کا لیکچر تھا۔ اس لیکچر میں انہوں نے اس حدیث کے معانی اور پیغام کو اتنی خوبصورتی اور جامعیت سے بیان کیا کہ میرے ذہن میں بے اختیار حضورؐ کے الفاظ گونجنے لگے کہ 'فرب حامل فقه الی من هو افقه منه'۔ بعض اوقات سنانے والا دانائی کی بات کی گہرائی تک اتنا نہیں پہنچ پاتا جتنا کہ سننے والا پہنچ جاتا ہے۔ حدیث رسول کی یہ بصیرت میں نے خود دیکھی ہے۔

ایک جگہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اور یہ ہم سب کے لئے ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ 'اللهم ارحم خلفائی' اے اللہ میرے جانشینوں پر رحمت فرما۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا کہ یارسول اللہ آپ کے خلفاء سے مراد کون لوگ ہیں؟۔ آپؐ نے فرمایا کہ 'الذین یأتون من بعدی' میرے خلفا سے مراد وہ لوگ ہیں جو میرے بعد آئیں گے۔ 'یروون احادیثی' میری حدیثیں روایت کریں گے۔ 'و یعلمو نها الناس' اور لوگوں کو سکھائیں گے۔ یعنی وہ لوگ جو میری احادیث کا

علم حاصل کریں اور اس کو لوگوں تک پہنچائیں، وہ میرے جانشین اور خلفاء ہیں اور ان کے لئے حضورؐ نے رحمت کی دعا فرمائی۔

اس دعا میں بھی ہم میں سے ہر شخص شامل ہوسکتا ہے۔ اور اگر مجھے تھوڑی سی تفصیل میں جانے کی اجازت ہو تو میں یہ کہوں گا کہ یہاں احادیث کا لفظ جمع کے صیغے میں آیا ہے اور عربی زبان میں کم سے کم تین کے عدد کو جمع کہتے ہیں۔ تو اگر کم سے کم تین احادیث کوئی یاد کر کے لوگوں تک پہنچادے تو شاید وہ اس بشارت کا مستحق بن جائے۔ عربی زبان میں جمع کی دو قسمیں ہیں۔ ایک جمع قلت اور دوسری جمع کثرت۔ جمع کثرت کا اطلاق کم سے کم نو پر ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ جتنا بھی ہو۔ اگر یہ جمع کثرت ہو تو تب بھی کم از کم نو حدیثوں کے لئے احادیث کا لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اگر تین یا نو حدیثیں بھی کوئی شخص یاد کر کے لوگوں تک پہنچادے تو یقیناً حضورؐ کے جانشینوں کے زمرے میں شامل ہوسکتا ہے۔

ایک اور جگہ حضورؐ نے بشارت دی اور وہ بشارت بھی ان تمام لوگوں کے لئے ہے جو قرآن اور سنت دونوں کا علم حاصل کریں اور اس علم کو لوگوں تک پہنچادیں تو اس بشارت کے مصداق بن سکتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ 'یحمل هذا العلم من كل خلف عدوله ينفون عنه تحريف الغالين وانتحال المبطلين و تاويل الجاهلين'۔ یہ علم یعنی یہ علم دین جو میں لے کر آیا ہوں اور جو قرآن وسنت کی شکل میں موجود ہے، اس کو ہر گروہ کے بعد وہ لوگ اٹھائیں گے جو سب سے زیادہ عدل والے ہوں گے۔ اردو زبان میں ایک لفظ استعمال ہوتا ہے پیڑھی، یعنی ایک نسل۔ تو خلف کے معنی ہے پیڑھی، ایک نسل۔ اور ہر پیڑھی میں جو عادل ترین لوگ ہوں گے وہ اس علم کے حامل ہوں گے، ان کے تین کام ہوں گے۔ اس علم میں غلو کرنے والے، انتہا پسندی اور شدت پسندی اختیار کرنے والے اس کو جو معنی پہنائیں گے ان سے اس کی نفی کرتے رہیں گے، ینفون عنه تحريف الغالين۔ آپ کو معلوم ہے کہ کچھ لوگوں میں ہمیشہ دین میں غلو اور انتہا پسندی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں غلو اور انتہا پسندی کو سختی سے ناپسند فرمایا ہے اور قرآن پاک میں غلو کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ دین کے معاملہ میں اس حد سے آگے جانا جو اللہ اور رسول نے مقرر کر دی ہے، یہ غلو ہے۔ تو یہ عادل علما غلو کرنے والوں کی تحاریف کی نفی کرتے رہیں گے، وانتحال المبطلين' اور باطل پرست لوگ جو چیزیں گھڑ گھڑ

کر منسوب کریں گے ان کی بھی نفی کرتے رہیں گے۔ یہ بھی ہر دور میں ہوا ہے۔ ہر دور میں ایسے باطل پرست لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کا نہ اسلام پر ایمان ہے اور نہ اسلام کے ساتھ تعلق رہا، لیکن چونکہ مسلمان دین سے متعلق بات پر مٹ مرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اس لئے وہ اپنے باطل خیالات کو دین کے نام پر لوگوں تک پہنچاتے رہتے ہیں۔ یہ عادل علما باطل پرستوں کی خود ساختہ ایجادات کو بھی دین سے دور کرتے رہیں گے۔ وتاویل الجاھلین اور جاہل لوگوں کی تاویل سے بھی۔ جاہل لوگ قرآن وسنت کی نصوص کو ایسی معانی پہناتے رہتے ہیں جو معنی قرآن وسنت کی مراد نہیں ہوتے، اور یہ لوگ وہ چیزیں تاویلات کے ذریعے قرآن وسنت میں شامل کر دیتے ہیں جو قرآن وسنت کا منشا نہیں ہوتا۔

آپ غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ گمراہی کن کن طریقوں سے آتی ہے۔ گمراہی کے بڑے راستے یہی تین ہیں: تحریف الغالین، انتحال المبطلین اور تاویل الجاھلین۔ اگر اہل علم موجود ہوں اور ان تینوں چیزوں کی تردید کرتے رہیں اور ان تینوں چیزوں سے مسلمانوں کو محفوظ کرتے رہیں تو علم دین اسی طرح منقح رہے گا جس طرح آج تک منقح چلا آ رہا ہے۔ قرآن مجید کی حفاظت کا تو اللہ نے وعدہ کیا ہے، لیکن قرآن مجید کی معانی اور تعبیر وتشریح کی حفاظت ہم سب کی ذمہ داری ہے اور قرآن مجید کی معانی اور تعبیر وتشریح کی حفاظت کے بہت سے طریقوں میں سے سب سے اہم طریقہ سنت اور حدیث کی حفاظت کا ہے۔ لہٰذا سنت اور قرآن مجید کی حفاظت کا ایک اہم میدان سنت اور حدیث کی حفاظت بھی ہے۔

حدیث اور سنت ایک منفرد فن ہے۔ اس کا آغاز، جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے، رسول اللہ ﷺ کے دور مبارک میں ہوا۔ حضورؐ کے ان ارشادات سے اندازہ ہوا کہ آپؐ کے ارشادات کو یاد رکھنا اور محفوظ رکھنا بڑی فضیلت کی بات ہے۔ صحابہ کرامؓ نے اس فضیلت کے حصول کے لئے رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ ہی میں اس کام کو شروع کر دیا تھا۔ صحابہ کرامؓ میں ایسے بزرگوں کی تعداد کم وبیش پچاس کے لگ بھگ ہے جنہوں نے احادیث کے تحریری ذخائر مرتب کئے اور صحابہ کرامؓ کے شاگردوں یعنی تابعین میں ایسے بزرگوں کی تعداد ڈھائی سو کے قریب ہے جنہوں نے احادیث کے مجموعے مرتب کئے اور تابعین کے شاگردوں یعنی تبع تابعین میں تو ایسے لوگ ہزاروں کی تعداد میں ہیں جن کے مجموعے تیار ہوئے اور ان میں سے سینکڑوں مجموعے آج ہمارے پاس

موجود ہیں اور دستیاب ہیں۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ حدیث زبانی روایت کی بنیاد پر چلی اور زبانی روایت کی بنیاد پر تین سو سال تک چلتی رہی اور بعد میں لوگوں نے جمع کر دیا، یہ بات درست نہیں ہے۔ اس پر تفصیل سے آگے چل کر بات کریں گے۔

لیکن ایک بات یاد رکھیں کہ کسی چیز کو محفوظ رکھنے کے جو طریقے ہو سکتے ہیں وہ سارے کے سارے علم حدیث اور سنت کو محفوظ رکھنے کے لئے اختیار کئے گئے۔ صحابہ کرامؓ میں سے پچاس کے قریب ایسے ہیں کہ جنہوں نے حضور ﷺ کی حیات مبارکہ ہی میں آپؐ کے ارشادات کو لکھا۔ ان لکھنے والوں میں حضرت ابو ہریرہؓ بھی شامل ہیں۔ ان میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، حضرت سعد بن عبادہؓ اور کئی ایک حضرات شامل ہیں جن کے بارے میں آئندہ گفتگو کی جائے گی۔ یہ حضرات رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی کو تحریر کیا کرتے تھے، زبانی یاد کیا کرتے تھے اور اس زبانی یادداشت کا وقتاً فوقتاً اپنے تحریری ذخائر سے موازنہ کرتے رہتے تھے۔ ان ذاتی ذخائر سے موازنہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہزاروں افراد ایسے موجود تھے جو تھوڑی سی بھی بھول چوک یا کمزوری، اگر پیدا ہوتی، تو اس کی نشاندہی کرنے پر ہر وقت کمربستہ رہا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ عرض کرتا ہوں جس سے اندازہ ہو گا کہ لوگ اس معاملہ میں کتنے حساس اور متشدد تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات کے ساتھ کوئی ایسی چیز منسوب نہ ہونے پائے جس کے بارے میں پورے یقین کے ساتھ یہ ثابت نہ ہو کہ حضورؐ کی زبان مبارک سے ایسا ہی نکلا تھا۔

حضرت ابو ہریرہؓ راویان حدیث میں سب سے مشہور ہیں اور آپ ایک طویل عرصہ تک حدیث بیان فرماتے رہے۔ منکرین حدیث کا سب سے بڑا نشانہ آپ ہی کی ذات گرامی رہتی ہے، اس پر بھی آگے گفتگو کریں گے۔ آپؓ مدینہ منورہ میں حدیث بیان فرمایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں مشہور تابعی، جن کو بعض لوگوں نے صغار صحابہ میں شامل کیا ہے، مروان بن حکم، مدینہ کے گورنر تھے۔ یہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے پہلے تھے۔ اپنی گورنری کے زمانے میں وہ کبھی کبھی حضرت ابو ہریرہؓ کے درس حدیث میں جا کر بیٹھا کرتے تھے۔ بعض احادیث انہوں نے سنیں اور یاد کر لیں۔ اس کے بعد گورنری سے معزول ہو کر کہیں اور چلے گئے۔ ایک طویل عرصہ کے بعد وہ خلیفہ بنے اور کچھ عرصہ بعد حج کے لئے آنا ہوا اور مدینہ منورہ میں حاضری ہوئی تو دوبارہ حضرت ابو ہریرہؓ کے درس میں جا کر بیٹھ گئے۔ ان کو خیال ہوا کہ شاید حضرت ابو ہریرہؓ سے حدیث بیان

کرنے میں کوئی بھول چوک ہو رہی ہے اور جو پہلے بیان کیا تھا آج اس سے مختلف بیان کر رہے ہیں۔ انہوں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے اس بارے میں کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ صرف یہ کہا کہ میں حدیث سننا چاہتا ہوں آپ ایک خاص مجلس میرے لئے بھی رکھ لیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے حامی بھرلی۔ اس پر خلیفہ نے ایک کاتب کی ذمہ داری لگائی کہ خاص محفل میں جب حضرت ابو ہریرہؓ حدیث بیان کریں تم ان کو چپکے چپکے نوٹ کرتے رہو اور کسی کو اس کا پتہ نہ چلے۔ جب یہ خاص مجلس شروع ہوئی تو حضرت ابو ہریرہؓ حدیث بیان کرتے اور کاتب لکھتے گئے۔ مروان بن حکم بعد میں اس تحریر کو اپنے ساتھ لے گئے۔

ایک سال کے بعد ان کا دوبارہ مدینہ منورہ آنا ہوا۔ اس موقع پر وہ اپنے ساتھ اس تحریر کو بھی ساتھ لائے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے کہا کہ وہ احادیث آپ دوبارہ بیان فرما دیجئے۔ انہوںؓ نے وہ احادیث دوبارہ بیان کیں۔ کاتب ایک ایک کرکے چیک کرتے رہے اور معلوم ہوا کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے نہ تو ایک حرف زیادہ کہا تھا اور نہ ہی ایک حرف کم کہا تھا۔ اس پر مروان نے کہا کہ مجھے شبہ ہوا تھا کہ شاید آپ حدیث سنانے میں کچھ بھول رہے ہیں تو میں آپ کی آزمائش کرنا چاہتا تھا کہ آپ کی یادداشت میں کوئی فرق تو نہیں آیا۔ اس لئے میں نے آپ کے درس کا ریکارڈ چیک کیا تو درست نکلا۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے یہ سن کر فرمایا کہ اگر ان میں ایک نقطہ کا بھی فرق نکلتا تو میں آج سے احادیث بیان کرنا چھوڑ دیتا۔ پھر خلیفہ کو لے کر اپنے مکان پر گئے۔ وہ سارے رجسٹر ان کو دکھائے اور کہا کہ یہ وہ کاغذات ہیں جو میں نے رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے سن کر لکھے تھے۔ میں ان کو روزانہ چیک کرتا ہوں، روزانہ یاد کرتا ہوں اور جب بھی کوئی حدیث بیان کرنے نکلتا ہوں تو پہلے اس ذخیرہ سے اپنی یادداشت کو تازہ کرتا ہوں۔

پھر آپؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کی محفل میں میری حاضری کا معاملہ یہ تھا کہ سارے صحابہ کرامؓ اپنے کاروبار وغیرہ کے لئے جا چکے ہوتے، کسی کے خاندان تھے، برادریاں تھیں اور زمینیں تھیں۔ میرا کچھ نہیں تھا۔ میں مسجد نبوی میں رہتا تھا، اور اصحاب صفہ میں سے تھا، نہ میرا کوئی روزگار تھا، نہ ملازمت تھی، رسول اللہ ﷺ نے کھانے کے لئے کچھ بھجوا دیا تو میں نے کھا لیا۔ جب بھی آپ ﷺ مسجد میں تشریف لاتے میں قریب جا کر بیٹھ جاتا تھا۔ ہر بات سنتا رہتا تھا۔ ایک دن میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ جب کچھ ارشاد فرماتے ہیں تو بعض اوقات مجھے یاد نہیں

رہتا۔ مجھے کوئی ایسا طریقہ بتائیں کہ مجھے یاد رہا کرے۔ آپؐ نے دو باتیں ارشاد فرمائیں۔ ایک تو کہا کہ ذرا اپنی چادر مجھے دو، میں نے اپنی چادر دے دی۔ آپؐ نے کوئی دعا پڑھی، چادر پر پھونک ماری اور ایسے گرہ لگائی جیسے کوئی چیز رکھ کر گرہ لگائی جاتی ہے۔ پھر فرمایا اس چادر کو سینے سے لگالو۔ ایک تو دعا کا یہ خاص طریقہ اختیار فرمایا۔ دوسرا آپؐ نے فرمایا کہ 'استعن بیمینک' اپنے دائیں ہاتھ سے کام لو، یا 'قیدالعلم بالکتابہ' یعنی علم کو کتابت کے ذریعے قید کرلو، محفوظ کرلو۔ اس طرح کے مختلف الفاظ آئے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں لکھنے لگا اور جو کچھ آپ فرماتے تھے میں جوں کا توں سب کچھ لکھ لیا کرتا تھا۔ اس کے بعد کوئی چیز میں بھولا نہیں۔ جو کچھ میں نے آپؐ سے سنا وہ میرے حافظہ میں بھی محفوظ رہا اور میں نے اس کو لکھا بھی۔ یہ سارا ذخیرہ رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ کے آخری ساڑھے تین سالوں کا ہے۔

یہ گویا صحابہ کرامؓ کے زمانہ کی ایک مثال ہے کہ علم حدیث کا آغاز ہوگیا تھا۔ یہ سلسلہ تابعین کے زمانے میں اور بھی دراز ہوگیا۔ تبع تابعینؒ کے زمانے میں مزید آگے بڑھا۔ پھر تدوین حدیث کا دور آگیا۔ علم حدیث کی تدوین پر ایک دن ہم الگ سے گفتگو کریں گے۔ جب یہ سارا ذخیرہ مرتب ہوگیا تو مختلف محدثین نے اس کو مختلف انداز سے ترتیب دیا، نت نئے مجموعے ہمارے سامنے آئے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ روز بروز احادیث کا کوئی نہ کوئی مجموعہ کسی نہ کسی نئے انداز سے سامنے آتا ہے۔

ان سارے مجموعوں میں جو موضوعات بیان ہوئے ہیں، ان کو ہم دس قسموں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ بعض محدثین نے ان دس موضوعات کو آٹھ میں تقسیم کیا ہے اور یہ ابواب ثمانیہ کہلاتے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ اس کی تعداد میں کمی بیشی کی جاسکتی ہے یہ کوئی متعین چیز نہیں۔ محدثین میں اکثر حضرات نے ان کو آٹھ موضوعات قرار دیا ہے۔ بہرحال احادیث کے بڑے بڑے موضوعات یہ ہیں:

۱) عقائد

۲) احکام

۳) آداب واخلاق

۴) رقاق، یعنی دل میں رقت قلب پیدا کرنے والی احادیث، جن سے تعلق باللہ اور

خشیت الٰہی پیدا ہو، دلوں سختی دور ہو اور نرمی پیدا ہو۔ صحیح بخاری اور حدیث کی تقریباً ہر کتاب میں آپ کو اس سے متعلق ابواب ملیں گے۔

۵) تفسیر، حدیث کی تقریباً ہر کتاب میں آپ کو تفسیر کے ابواب ملیں گے۔

۶) تاریخ اور سیَر، یعنی انبیا اور سابقہ اقوام کا تذکرہ اور واقعات

۷) شمائل، یعنی رسول اللہ ﷺ کی اپنی عادات و خصائل۔ اس کو لوگوں نے الگ کتابوں کی شکل میں بھی محفوظ کر لیا ہے۔ شمائل ترمذی مشہور ہے۔ حدیث کی تقریباً ہر کتاب میں شمائل پر الگ باب ہوتا ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کے بارے میں، آپ کے جسمانی وجود اور شخصی محاسن اور کمالات کے بارے میں، آپ کے عادات و خصائل، آپ کے لباس اور آپ کی ذات سے متعلق مختلف چیزوں کے بارے میں شمائل کے ابواب میں تفصیلات درج ہیں۔

۸) فتن، یعنی آئندہ جو فتنے آنے والے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو فتنوں سے آگاہ کیا تھا اور متنبہ کیا تھا کہ یہ راستے فتنہ کے راستے ہیں ان سے بچا جائے۔ ان راستوں پر چلنے سے جن خرابیوں کے پیدا ہونے کا امکان تھا ان کی آپ نے نشاندہی فرمائی۔

۹) مناقب اور مثالب، یعنی صحابہ کرامؓ کے مناقب اور فضائل۔ حضورؐ کے جو مخالفین ہیں ان کے مثالب اور ان کی کمزوریوں کی آپ نے نشاندہی فرمائی۔ اسی طرح سے آپؐ نے بعض قبائل کے مناقب بیان فرمائے۔ انصار اور قریش کے فضائل بیان فرمائے۔ مختلف اقوام کی ذمہ داریوں کی آپ نے نشاندہی فرمائی۔ بعض اقوام میں کوئی کمزوری ہے تو اس کی نشاندہی فرمائی تاکہ لوگ ان کی خوبیوں سے فائدہ اٹھائیں اور خرابیوں سے بچیں۔

۱۰) اشراط الساعۃ یعنی قیامت کی علامات۔ شرط علامت کو بھی کہتے ہیں۔ اگر اس کو شرط یعنی Condition کے معنوں میں لیا جائے تو یہ بھی ٹھیک ہے اور عربی زبان میں شرط علامت کو بھی کہتے ہیں۔

جن لوگوں نے اس کو ابواب ثمانیہ یعنی آٹھ ابواب میں تقسیم کیا ہے وہ یہ ابواب بیان کرتے ہیں۔

۱) عقائد

۲)احکام

۳) آداب اور شمائل

۴)رقاق

۵)تفسیر

۶) فضائل

۷)فتن اور اشراط الساعۃ

۸)علم

یہ آٹھ ابواب محدثین کرام نے بیان کئے ہیں۔ابواب آٹھ ہوں، دس ہوں یا کچھ بھی ہوں لیکن تقریباً یہی عنوانات ہیں جن میں علم حدیث کی کتابیں منقسم ہیں۔

کتب حدیث کی اقسام

علم حدیث کی کتابوں کی بھی الگ الگ قسمیں ہیں۔آپ نے سنا ہوگا کہ امام بخاری کی کتاب صحیح بخاری کہلاتی ہے۔امام مسلم کی کتاب صحیح مسلم، ابوداوٗد کی کتاب سنن ابوداوٗد، امام احمد کی مسند امام احمد اور امام طبرانی کی کتاب معجم طبرانی کہلاتی ہے۔معجم، مسند، صحیح، جامع اور سنن وغیرہ میں فرق کیا ہے، کل کی گفتگو کا آغاز اسی سے کریں گے کہ کتب حدیث کی ترتیب کیا ہے۔تاہم حدیث کی وہ کتاب جس میں ان تمام موضوعات پر احادیث بیان کی گئی ہوں اور ان سب موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہو وہ کتاب الجامع کہلاتی ہے۔الجامع وہ کتاب ہے جس میں ان آٹھ یا دس موضوعات کے بارے میں احادیث بیان کی گئی ہوں۔صحیح بخاری، صحیح مسلم اور ترمذی جامع ہیں۔ان تینوں میں آٹھ کے آٹھ ابواب آئے ہیں۔

بقیہ کتابوں کی ترتیب اور ہے جس پر کل گفتگو ہوگی۔

یہ علم حدیث کا ایک ابتدائی تعارف تھا۔کل علم حدیث کی ضرورت اور اہمیت پر بات کریں گے۔علم حدیث کی ضرورت و اہمیت ایک عام طالب علم کے لئے، پھر دینیات اور مذہبیات کے طالب علم کے لئے اور پھر قرآن مجید اور اسلامی علوم کے طلبہ کے لئے علم حدیث کی کیا اہمیت ہے۔علم حدیث کی عظمت کے بارے میں چند اشارے کل کی گفتگو کا عنوان ہوگا۔

لوگوں کی غلط فہمی کو کس طرح دور کیا جائے کہ آج احادیث کی کتابیں ضعیف ہیں۔

ان شاء اللہ اگلے دس بارہ دن کی گفتگو سے آپ کو اس سوال کے جواب میں خاصا مواد مل جائے گا اور پھر آپ کے لئے لوگوں کو یہ بتانا آسان ہو جائے گا کہ یہ غلط فہمی کیوں پیدا ہوئی اور اس کی بنیاد کیا ہے۔

جو لوگ حدیث اور سنت میں فرق کرتے ہیں وہ اس کی واضح تعریف کیا بتاتے ہیں؟

جو لوگ حدیث اور سنت میں فرق کرتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ حدیث سے مراد تو وہ روایت ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کے کسی قول، فعل یا حالت کی نشاندہی ہو۔ مثال کے طور پر صحیح بخاری کی پہلی حدیث ہے انما الاعمال بالنیات ۔ یہ رسول اللہ ﷺ کا ایک ارشاد گرامی ہے۔ لیکن سنت سے مراد وہ طریقہ متبعہ، جس کی آپ نے لوگوں کو تعلیم دی ہو اور جس کو آپ نے لوگوں کو سکھایا ہو۔ مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ نے یہ سکھایا کہ جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو کیسا طرز عمل اختیار کیا جاتا ہے۔ جب مسلمان پانچ وقت کی نماز ادا کرتے ہیں تو کیا کرتے ہیں۔ یہ جو مجموعی طور پر نماز کی ادائیگی کا حکم ہے یہ سنت ہے اور اس حکم کی تشریح اور توضیح کے لئے اگر کوئی انفرادی روایت آئی ہے تو وہ حدیث ہے۔ گویا حدیث تو وہ روایت یا رپورٹ ہے اور اس کے نتیجے میں جو طرز عمل سامنے آیا ہے وہ سنت ہے۔ یہ ان لوگوں کی رائے ہے جو حدیث اور سنت کو الگ الگ قرار دیتے ہیں۔

میرے ذاتی خیال میں وہ رائے زیادہ درست ہے، ممکن ہے میں غلطی پر ہوں، مجھے اپنی رائے پر زیادہ اصرار نہیں لیکن میرے خیال میں وہ رائے زیادہ درست ہے جس کے مطابق علم حدیث ایک عام لفظ ہے۔ اس میں سنت سمیت وہ ساری چیزیں شامل ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی ذات سے منسوب ہوں۔ ان میں وہ چیز بھی شامل ہے جو ثابت اور طے شدہ ہے۔ جس کے بارے میں تمام امت کا اتفاق ہے کہ حضورؐ سے اس کا انتساب درست ہے، جس کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں اور جس سے امت کے طرز عمل کی تشکیل ہوتی ہے وہ سنت ہے۔ جبکہ حدیث میں کچھ چیزیں ایسی بھی شامل سمجھی جاتی ہیں جو سنت میں شامل نہیں ہیں مثلاً ضعیف احادیث۔ محدثین نے کہا کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ حضورؐ سے اس کی نسبت کمزور ہے۔ حدیث تو یہ بھی ہے۔ کیونکہ اسے حدیث کہا گیا ہے، اگرچہ ضعیف ہونے کی وجہ سے وہ سنت میں شامل نہیں

ہے۔اس لئے حدیث عام ہے سنت خاص ہے۔ یہ میری ذاتی رائے ہے ممکن ہے کہ یہ غلط ہو۔ لیکن حدیث اور سنت کے فرق کے بارے میں یہ تین نقطہ ہائے نظر ہیں۔آپ کا جو چاہے اختیار کیجئے۔اصطلاح کی بات ہے اور اصطلاح میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہئے۔

خبر کے بارے میں دوبارہ بتادیں۔

خبر کے لفظی معنی تو ہیں اطلاع یا رپورٹ۔اردو میں بھی خبر کے یہی معنی ہیں۔آپ نے سنا ہوگا نیوز News کے لئے خبر کا لفظ بولا جاتا ہے۔لیکن علم حدیث کی اصطلاح میں خبر حدیث کے مترادف کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔یعنی ہر وہ روایت جو رسول اللہ ﷺ کے کسی قول، فعل یا عمل کو بیان کرتی ہو، وہ اصطلاحاً خبر کہلاتی ہے۔اس لحاظ سے خبر اور حدیث مترادف الفاظ ہیں۔ خبر رسول اللہ ﷺ کے قول کے بارے میں ہو مثلاً انما الاعمال بالنیات ، یا آپ کے کسی فعل کے بارے میں ہو جیسے آپؐ نے نماز میں طویل رکوع کیا۔یہ عمل کی روایت ہے۔حدیث بھی ہے خبر بھی ہے۔حدیث اور خبر قریب قریب مترادف الفاظ ہیں اور ایک معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

دوسرا خطبہ

علم حدیث کی ضرورت اور اہمیت

منگل، 7 اکتوبر 2003

علم حدیث کی ضرورت اور اہمیت

علم حدیث کی ضرورت اور اہمیت پر گفتگو دو عنوانات کے تحت ہوسکتی ہے۔ ایک عنوان جس پر آج گفتگو کرنا مقصود ہے وہ علم حدیث کی عمومی ضرورت اور اسلامی علوم وفنون میں بالخصوص اور انسانی فکر کے دائرے میں بالعموم اس کی اہمیت کا مسئلہ ہے۔ دوسرا پہلو بطور ایک ماخذ قانون اور مصدر شریعت کے حدیث اور سنت کی اہمیت اور مقام ومرتبہ کا ہے۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآن مجید اور سنت رسول مسلمانوں کے لئے شریعت اور قانون سازی کا اولین اور ابتدائی ماخذ ہے۔ سنت قرآن مجید کے ساتھ شریعت کا ماخذ کس طرح ہے؟ کن معاملات میں یہ ماخذ اور مصدر ہے؟ اس سے احکام کا استنباط کس طرح ہوتا ہے؟ اس پر قدرے تفصیل کے ساتھ کل گفتگو ہوگی۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے محدثین کرام کی غالب اکثریت کے نزدیک حدیث کی اصطلاح عام ہے اور سنت کی اصطلاح خاص ہے۔ سنت سے مراد وہ طریقہ یا وہ انداز اور ڈھنگ ہے جس پر کوئی انسان زندگی گزارتا ہے یا جس کے مطابق کوئی کام کرتا ہے۔ اچھے ڈھنگ کو بھی سنت کہا جاتا ہے اور برے ڈھنگ کو بھی سنت کہا جاتا ہے۔ عربی زبان میں سنت کا لفظ دونوں قسم کے انداز اور ڈھنگ کے لئے استعمال ہوا ہے۔

خود حدیث پاک میں بھی یہ لفظ انہی عمومی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک مشہور حدیث آپ نے پڑھی ہوگی؛ من سنّ فی الاسلام سنة حسنة ،جس نے اسلام میں کوئی اچھی سنت پیدا کی، یعنی اچھا ڈھنگ اختیار کیا، کوئی اچھی ریت ڈالی یا اچھا طور طریقہ نکالا اُس کو اِس کا اجر ملے اور جو لوگ آئندہ اس پر عمل کریں گے ان کا اجر بھی اُس کو ملتا رہے گا۔ لیکن ان کا اجر کم نہیں ہوگا۔ یہاں سنت کا لفظ اچھے طریقے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اسی حدیث کا دوسرا جملہ

ہے؛ومن سنّ فی الاسلام سنة سیئةً فعلیه وِزرُها وَ وزرُ من عمل بها اور جس شخص نے کوئی براطریقہ ایجاد کیا، سنة سیئة بُرا طریقہ، براڈھنگ یابری ریت ڈالی، تو اس کو اپنے کرتوت کا بھی گناہ ملے گا اور جو لوگ اس برے ڈھنگ کو اختیار کریں گے ان کے گناہ میں بھی یہ شخص شریک رہے گا۔ اس مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سنت کا لفظ عربی زبان میں طریقہ یا ڈھنگ یا ریت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

اسلامی شریعت کی اصطلاح میں سنت کے ایک معنی تو وہ ہیں جو پہلے بیان کئے گئے ہیں یعنی رسول اللہ ﷺ کا وہ طرز عمل جس کی رسول اللہ ﷺ نے دعوت دی، جس کو قائم کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ دنیا میں بھیجے گئے اور جو صحابہ کرام نے آپ سے سیکھ کر اختیار کیا اور نسلاً بعد نسلٍ مسلمانوں تک منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس طریقہ کو عربی زبان میں اور اسلام کی اصطلاح میں سنت کے لفظ سے یاد کرتے ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن وسنت دونوں شریعت کے ماخذ ہیں تو ہماری مراد اسی مفہوم میں سنت ہوتی ہے۔

لیکن سنت کے ایک معنی اور بھی ہیں جو تھوڑا سا ہٹ کر ہیں۔ اور ان دنوں کو الگ الگ سمجھ لینا چاہئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ محدثین کی اصطلاح میں سنت سے کیا مراد ہے یہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ محدثین سے ہٹ کر ایک اصطلاح علماء اصول کی ہے، ایک اصطلاح فقہائے اسلام کی ہے۔ علماء اصول کی اصطلاح وہ ہے جو ابھی میں نے عرض کی، یعنی رسول اللہ ﷺ کا دیا ہوا وہ طریقہ جس پر مسلمان عمل کرتے ہیں جو شریعت کے احکام کا ماخذ اور مصدر ہے، جو ہم تک تین طریقوں سے پہنچا ہے جس کی میں ابھی وضاحت کرتا ہوں۔

تیسرا مفہوم فقہا کے نزدیک وہ ہے جو آپ نے عام بول چال میں بھی سنا ہوگا کہ یہ دو رکعت سنت ہے، یہ تین رکعت فرض ہے، وہ تین رکعت واجب ہے۔ واجب اور فرض کے مقابلہ میں سنت کی جو اصطلاح استعمال ہوتی ہے وہ پہلے دو معنوں سے مختلف ہے۔ یہاں سنت سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کا وہ حصہ جو لازمی اور واجب نہیں ہے، جو فرض و واجب نہیں ہے۔ اس کو اگر اختیار کیا جائے تو اجر ملے گا اور نہ کیا جائے تو امید ہے کہ اللہ کے ہاں باز پرس نہیں ہوگی، یہ سنت کا تیسرا مفہوم ہے۔ ان تینوں مفاہیم کو ذہن میں الگ الگ رکھنا چاہئے۔

سنت کی اقسام

سنت کی تین قسمیں ہیں۔یعنی سنت ہم تک تین طریقوں سے پہنچی ہے۔ایک طریقہ تو ہے رسول اللہ ﷺ کے زبانی ارشادات گرامی کا جو صحابہ کرام نے سن کر بعینہ یاد کئے اور ہم تک پہنچائے۔حضورؐ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی' انما الاعمال بالنیات'، و انما لکل امرء مانوی' فمن کان ھجرتہ الی اللہ و رسولہ فھجرتہ الی اللہ و رسولہ ومن کانت ھجرتہ الی الدنیا یصیبھا او امرأۃ یتزوجھا فھجرتہ الی ما ھاجرالیہ 'یہ ایک مثال ہے سنت قولی کی، کہ آپ کی زبان مبارک سے ایک قول نکلا،صحابہ نے اسی طرح یاد کر کے دوسروں تک پہنچایا، دوسروں نے اس کو یاد کر کے آگے منتقل کیا اور یوں یہ ارشاد گرامی ہم تک پہنچ گیا۔یہ سنت قولی یا حدیث قولی ہے۔

سنت فعلی

سنت کی ایک قسم ہے 'سنت فعلی'۔یعنی صحابہ کرام نے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ یہ کیا کرتے تھے یا فلاں موقع پر آپؐ نے یہ کیا۔سنت قولی وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلنے والے الفاظ پر مشتمل ہو اور صحابہ کرام نے اسے بعینہ نقل کر لیا ہو۔سنت فعلی یہ ہے کہ ایک صحابیؓ نے حضورؐ کا طرز عمل دیکھا اور اپنی زبان میں اپنے الفاظ میں بعد والوں کے لئے بیان کیا۔یہ سنت فعلی ہے۔

سنت تقریری

سنت کی تیسری قسم 'سنت تقریری' ہے جس میں نہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی بیان ہوا ہے، نہ رسول اللہ ﷺ کا اپنا کوئی فعل یا عمل نقل ہوا ہے، لیکن دوسروں کا کوئی فعل یا عمل حضورؐ کے سامنے ہوا اور آپؐ نے اس کی ممانعت نہیں فرمائی اور اس کو ناجائز نہیں قرار دیا، یہ بھی سنت ہے۔ اس طرح کی سنت سے بہت سے معاملات حدیث میں ثابت ہوتے ہیں۔رسول اللہ ﷺ جب تشریف لائے تو عربوں میں بہت سے طور طریقے رائج تھے۔بہت سے معاملات پر عرب لوگ کاربند تھے۔ان معاملات اور طور طریقوں میں جس چیز کو رسول اللہ ﷺ نے شریعت کے خلاف

دیکھا اس کی ممانعت فرمادی۔ جس چیز کو شریعت کے خلاف نہیں پایا البتہ اس میں کوئی چیز قابل اصلاح تھی اس جز کی رسول اللہ ﷺ نے اصلاح فرمادی۔ اور جن معاملات میں کوئی بھی چیز قابل اعتراض نہیں تھی آپ نے اس پر کوئی اعتراض نہیں فرمایا وہ اسی طرح چلتی رہی۔ صحابہ کرام کرتے رہے۔ رسول اللہ ﷺ کے علم اور اطلاع سے اس پر عمل درآمد ہوتا رہا۔ یہ بھی سنت تقریری ہے۔

آپ نے سنا ہوگا کہ مضاربہ اور مشارکہ اسلام کے قانون تجارت کی دو اہم اصطلاحات ہیں۔ یہ کاروبار سے متعلق اسلام کے دو طریقے ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں کاروبار کے یہ طریقے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن پاک نے کہیں مضاربہ کا حکم دیا ہے یا سنت میں کہیں مشارکہ کی ہدایت کی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نہ قرآن پاک میں مضاربہ کا حکم ہے نہ سنت میں مضاربہ کا حکم ہے۔ اس کے اسلامی طریقہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نبوت کے منصب پر فائز ہوئے اور شریعت کے احکام نازل ہونا شروع ہوئے تو صحابہ کرام میں یہ دونوں طریقے رائج تھے۔ عرب میں اسلام سے قبل بھی مضاربہ اور مشارکہ پر عمل درآمد ہوتا تھا۔ ان دونوں کے علاوہ بھی تجارت کے بہت سے طریقے رائج تھے۔ لیکن ان میں سے دو کی مثال لیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان میں جزوی ہدایات کے ذریعے اصلاح فرمائی۔ بقیہ طریقے اسی طرح قائم رہے۔ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ مضاربہ اور مشارکہ سنت تقریری سے ہمارے سامنے آئے ہیں۔

ایک اور مثال عرض کرتا ہوں۔ صحابہ کرام کی ایک جماعت سفر پر روانہ ہوئی۔ وہاں ایک صاحب کو وضو کی ضرورت پیش آئی۔ انہوں نے دیکھا کہ پانی نہیں ہے تو تیمّم کر کے نماز پڑھ لی۔ ایک دوسرے صاحب کو بھی وضو کی ضرورت پیش آئی۔ انہوں نے بھی تیمّم کر کے نماز ادا کر لی۔ تھوڑی دیر میں پانی دستیاب ہوگیا۔ ان میں سے ایک صاحب نے، جنہوں نے تیمّم کیا تھا، وضو کیا اور وضو کر کے نماز دہرالی۔ پہلے صاحب نے نماز نہیں دہرائی۔ اگلے دن جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری ہوئی تو دونوں حضرات نے اپنا اپنا نقطہ نظر بیان کیا۔ ایک صاحب نے کہا کہ میں نے تیمّم کر کے نماز پڑھ لی تھی۔ چونکہ شریعت نے تیمّم کر کے نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے اس لئے میری نماز ہوگئی تھی، لہٰذا نماز کو دہرانے کی ضرورت نہیں تھی۔ دوسرے صاحب نے عرض کیا کہ میں نے سوچا کہ نماز کا وقت موجود ہے اور پانی مل گیا ہے اور وضو تیمّم سے زیادہ

افضل ہے، اس لئے میں نے وضو کر کے نماز دہرالی۔ آپ نے پہلے صاحب کو جواب دیا 'لقد اصبت السنة' تم نے سنت کے مطابق عمل اختیار کیا اور نماز نہیں دہرائی۔ دوسرے صاحب سے فرمایا کہ 'لك الاجر مرتين' تمہیں دوہرا اجر ملے گا۔ گویا آپ نے دونوں حضرات کے اس نقطہ نظر کو پسند فرمایا اور جائز قرار دیا اس لئے اب یہ سنت ہو گیا۔ سنت سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ جس شخص کو پانی دستیاب نہ ہو اور وہ وضو کے بجائے تیمم کر کے نماز پڑھ لے تو یہ کافی ہے۔ دوبارہ پانی ملنے کے بعد دوہرانا ضروری نہیں۔ لیکن اگر کوئی دہرا لے تو اس کو دوہرا اجر ملے گا۔ اس طرح کے اور بھی بہت سے واقعات ہمیں مل سکتے ہیں۔ حدیث میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ سنت تقریری سے کوئی چیز کیسے ثابت ہوتی ہے؟ ان دو مثالوں سے اس کا اندازہ ہو جائے گا۔

قرآن میں سنت کی سند

اس دور میں بعض حضرات کا کہنا ہے جو کہ بہت بڑی گمراہی ہے اور اسلام کے بنیادی تصور کے خلاف ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں اور دوسروں کو بھی یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ جو چیز سنت کی صورت میں مسلمانوں کے پاس اس وقت موجود ہے اس کی کوئی سند یا کوئی اتھارٹی قرآن پاک میں موجود نہیں ہے۔ یہ نہ صرف ایک بہت بڑی گمراہی ہے بلکہ ایک بہت بڑی فضیلت سے محرومی کی بات بھی ہے۔ اگر صرف قرآن مجید یا کوئی تحریری نوشتہ رہنمائی اور ہدایت کے لئے کافی ہوتا تو اللہ تعالیٰ کو انبیاء بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ آسمانی کتابیں اتار دی جاتیں اور اسی پر اکتفا کیا جاتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوا۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیا بھیجے گئے جن میں سے کچھ پر کتابیں بھی اتاری گئیں۔ کتابوں کی تعداد چند سو سے زیادہ نہیں ہے۔ ایک روایت میں ایک سو چار (۱۰۴) کتابوں کی تعداد بیان ہوئی ہے۔ ایک دوسری روایت سے تین سو چودہ (۳۱۴) کتابوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن انبیا علیہم السلام کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب ہے۔ گویا اصل چیز نبی اور پیغمبر ہے۔ کتاب کا اتارا جانا یا نہ اتارا جانا یہ اللہ کی مشیت پر ہے۔ جب مناسب سمجھا اس نے کتاب نازل فرمائی، اور جب مناسب نہیں سمجھا کتاب نازل نہیں فرمائی۔ اس لئے نبی اور پیغمبر کو اور ان کی رہنمائی کو کتاب سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ مزید برآں خود کتاب اللہ یعنی اللہ کی کتاب قرآن مجید میں درجنوں مقامات پر وہ ہدایات موجود ہیں جن میں بعض کا تذکرہ

آئندہ کیا جارہا ہے، جن میں پیغمبر کی سنت اور اس کی تفسیر وتشریح کوقرآن مجید کے سمجھنے اور اس پر عمل درآمد کے لئے لازمی قرار دیا گیا ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ 'الا انی اوتیت القرآن ومثله معه 'یادرکھو مجھے قرآن مجید بھی دیا گیا اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور بھی بہت کچھ دیا گیا ہے۔ قرآن سے ملتی جلتی اور بھی بہت سی ہدایات اور رہنمائی عطا فرمائی گئی ہے۔ لہذا یہ دونوں قسم کی رہنمائی جس کی مزید تفصیل ہم آگے چل کر دیکھیں گے، اللہ کی طرف سے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عطا ہوئی۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر نزول وحی کم وبیش چوبیس ہزار مرتبہ ہوا۔ بظاہر چوبیس ہزار مرتبہ اگر وحی نازل ہوئی ہو اور قرآن پاک کی ایک ایک آیت ایک مرتبہ بھی نازل ہو، اگر چہ بعض مرتبہ لمبی لمبی سورتیں ایک ہی مرتبہ کی وحی میں نازل ہوئیں، سورۃ انعام پوری ایک ہی وقت میں نازل ہوئی۔ سورۃ یوسف پوری ایک وقت میں نازل ہوئی۔ مکّی سورتیں اکثر چھوٹی چھوٹی ایک ایک وقت میں نازل ہوئیں تو اس سے زیادہ سے زیادہ چار پانچ سو مرتبہ کر کے پورا قرآن مجید نازل ہوسکتا تھا۔ یہ چوبیس ہزار مرتبہ وحی نازل ہونے کا کیا مفہوم ہے؟

امام ابوداؤد نے اپنی کتاب سنن میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر جبرئیل امینؑ قرآن لے کر بھی اترتے تھے اور سنت لے کر بھی نازل ہوتے تھے؛ کان جبريل عليه الصلوٰة والسلام ينزل على رسول الله ﷺ بالسنة كما ينزل عليه بالقرآن' جبرئیل امین سنت لے کر بھی اسی طرح اترتے تھے جس طرح کہ قرآن مجید لے کر اترتے تھے۔ و يعلمه اياه كما يعلمه القرآن 'اور جیسے آپ کو قرآن سکھایا کرتے تھے اسی طرح سنت بھی سکھایا کرتے تھے۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ چوبیس ہزار مرتبہ جو نزول وحی ہوا اس میں قرآن پاک کے ساتھ ساتھ سنت کا نزول بھی شامل ہے۔ اور جبرئیل امین نے سنت کے بنیادی احکام بھی رسول اللہ ﷺ کو سکھائے۔

اس لئے علم حدیث جو سنت کا سب سے بڑا ماخذ اور سب سے بڑا مصدر ہے اس کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے اور اس کی ضرورت واضح ہوجاتی ہے کہ یہ علم سنت کو بیان کرتا ہے۔ سنت کی تفصیلات علم حدیث کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں۔ سنت کا تحفظ اور سنت کی بقا کی ہر کاوش مسلمانوں کے لئے اسی طرح لازمی ہے اور بہت اونچی فضیلت رکھتی ہے جس طرح

قرآن مجید کا تحفظ اور اس کی بقا کی کاوش ہے۔قرآن مجید کی حفاظت کا تو اللہ نے وعدہ کیا ہے انـا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون ، لیکن اس وعدے کی جزوی تطبیق سنت پر بھی ہوتی ہے۔اس لئے کہ یہاں ذکر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ذکر میں قرآن مجید شامل ہے۔لیکن ذکر، یعنی یاد دہانی اسی وقت یاد دہانی ہوسکتی ہے جب اس کا مفہوم سامنے ہو۔اگر کوئی یاد دہانی ہو لیکن اس کا مفہوم کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔مثلاً کوئی شخص آپ کو کسی پرانی زبان میں یاد دہانی کا خط بھیج دے، پرانی سریانی یا رومن یا لیٹن زبان میں آپ کو خط لکھے اور آپ کو وہ زبان نہ آتی ہو تو یاد دہانی بے معنی ہے۔یاد دہانی اسی وقت بامعنی ہوگی جب آپ کی سمجھ میں آئے۔اس لئے اگر قرآن مجید کی تشریح اور توضیح موجود نہیں ہے تو یاد دہانی اور اس کے اثرات محدود ہو جاتے ہیں۔اس لئے یاد دہانی کو محفوظ رکھنے کے لئے جہاں اس کے متن کا تحفظ ضروری ہے وہاں اس کی تشریح وتعبیر کا تحفظ بھی ضروری ہے۔اور وہ تشریح وتفسیر کا تحفظ سنت کے ذریعے ہم تک پہنچتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے امت مسلمہ کو تلقین فرمائی کہ سنت کے تحفظ اور بقا کے لئے بھی اسی طرح کوشش کریں جیسے قرآن پاک کے تحفظ اور بقا کے لئے کرتے ہیں۔ایک جگہ ارشاد فرمایا: المتمسك بسنتي عندفساد امتي له اجر شهيد؛ کہ وہ شخص جو میری سنت کا دامن پکڑے ہوئے ہے، اس وقت جب میری امت فساد کا شکار ہو تو اس کے لئے شہید کا اجر ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ له اجر مأة شهيد، یعنی اس کو سو شہیدوں کا اجر ملے گا۔سو شہیدوں کا اجر اس لئے ملے گا کہ ایک شہید جس مقصد کے لئے جان قربان کرتا ہے وہ کیا ہے؟ وہ اسلام کی بقا اور اسلام کا تحفظ ہے، امت مسلمہ کا تحفظ ہے۔اگر خدانخواستہ سنتیں مٹ رہی ہوں، حدیث ختم ہو رہی ہو تو پھر امت مسلمہ کا وجود دینی بنیادوں پر باقی نہیں رہ سکے گا۔تو جن مقاصد کی خاطر شہید اپنی جان قربان کرتا ہے سنت کا تحفظ کرنے والا انہی مقاصد کو دوسرے انداز سے حاصل کرتا ہے۔ اس لئے اس کو ایک شہید یا سو شہید کا اجر ملے گا۔مختلف اسباب اور نیتوں کے لحاظ سے دونوں اپنے اپنے اجر کے مستحق ہوں گے۔

امام شافعی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ علماء حدیث اور علماء سنت کی اپنے اپنے علاقے اور زمانے میں وہی حیثیت ہے جو صحابہ کرام اور تابعین کی اپنے دور میں تھی۔صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کو ان کے دور میں عزت واحترام کا مقام کیوں حاصل تھا؟ اس لئے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی دی

ہوئی رہنمائی لوگوں تک پہنچا رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات ان کے ذریعے لوگوں تک پہنچ رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت کا علم ان کے ذریعے پھیل رہا تھا۔ لہٰذا آج ایک صاحب علم جو حدیث اور سنت کا علم رکھتا ہو اور اس کے ذریعے یہ علم لوگوں تک پہنچ رہا ہو تو گویا وہ وہی کردار ادا کر رہا ہے جو صحابہ کرامؓ اور تابعین اپنے زمانے میں ادا کیا کرتے تھے۔ اسی لئے امام شافعی نے ایک جگہ فرمایا ہے کہ 'اھل الحدیث فی کل زمانٍ کالصحابة فی زمانھم' کہ علمائے حدیث کی ہر زمانے میں وہی حیثیت ہوگی جو صحابہ کرام کی اپنے زمانے میں تھی۔ ایک جگہ انہوں نے فرمایا کہ 'اذا رأیت صاحب حدیث فکانی رأیت احدا من اصحاب الرسول ﷺ' اگر میں حدیث کے کسی عالم کو حدیث بیان کرتے ہوئے دیکھوں، اور خود امام شافعی ان میں شامل تھے، تو گویا میں نے رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابیؓ کو دیکھا جو علم حدیث بیان کر رہے تھے۔

یہ حدیث اور سنت کی دینی اور اسلامی اہمیت اور ضرورت ہے۔ اس پر ایک دوسرے نقطہ نظر سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وحی الٰہی جو قرآن پاک کی شکل میں ہمارے پاس ہے۔ اس میں بنیادی ہدایات اور کلیات بیان ہوئی ہیں جن میں سے بعض کا ذکر ہم ابھی کریں گے، لیکن ان ہدایات کا جو کتاب الٰہی میں بیان ہوئی ہیں جب تک عملی تشکُّل نہ ہو اس وقت تک ان ہدایات پر عمل درآمد بڑا دشوار ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حدیث اور سنت کی رہنمائی کے بغیر ان ہدایات پر عمل درآمد ممکن نہیں ہے تو شاید غلط نہیں ہوگا۔

حدیث کے مقابلہ میں دیگر مذاہب کے صحائف کی حیثیت

سابقہ آسمانی کتابوں کو دیکھیں۔ آج حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ناپید ہے۔ انؑ پر اتارے جانے والے صحیفے ناپید ہو گئے۔ انؑ کے ارشادات ہمارے علم میں نہیں ہیں۔ ان کی سنت کے بہت معمولی اور مبہم سے آثار ہیں جو اس لئے محفوظ رہ گئے کہ رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں وہ شامل ہو گئے، عرب میں ان کا رواج تھا اور رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے حکم سے ان کو شریعت کا حصہ بنا دیا۔ اس لئے وہ آج محفوظ ہیں ورنہ وہ اتنے بھی محفوظ نہ رہتے۔

حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ماننے والے آج کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ ان کی ایک ریاست بھی موجود ہے جس کے پاس بڑے بڑے وسائل ہیں۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ

السلام کی سنت موجود ہے کہ نہیں ہے۔ان کے ارشادات موجود ہیں کہ نہیں ہیں۔اس کے بارے میں یہودی بھی یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے۔ان کے پاس جو کچھ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نام سے منسوب ہے وہ ایک انتہائی غیر مستند، مبہم اور غیر تاریخی چیز ہے۔مختلف انداز سے اس کو مرتب کیا گیا ہے۔لیکن کوئی یہودی یقین سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ موسیٰ علیہ السلام ہی کے ارشادات گرامی ہیں۔

یہی حال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہے کہ آج یہ چار انجیلیں ان کے ارشادات کا سب سے بڑا ماخذ مانی جاتی ہیں۔اناجیل اربعہ کا نام آپ نے سنا ہوگا، جو عیسائیوں کے نزدیک مستند ہیں یا وہ ان کو مستند سمجھتے ہیں، ان میں حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشادات جگہ جگہ بیان کئے گئے ہیں۔ان کی سیرت بیان ہوئی ہے۔لیکن اگر آپ تاریخ کے ایک ایسے طالب علم کے نقطۂ نظر سے دیکھیں جو چیزوں کو میرٹ پر جاننا چاہتا ہو اور محض کسی عقیدت مندی کی بنیاد پر چیزوں کو نہ مانتا ہو تو آپ کو پتہ چلے گا کہ تاریخی اعتبار سے ان بیانات کی کوئی حیثیت نہیں۔اول تو وہ بیانات اتنے مبہم ہیں جس کی کوئی حد نہیں اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ اگر کوئی ان کی فہرست بنانا چاہے تو ان کی تعداد شاید تیس یا چالیس پچاس سے زیادہ نہیں بن سکتی۔پھر اگر ان بیانات کو درست مان بھی لیا جائے تو ان کی تاریخی Authenticity کیا ہے۔اس معاملہ میں عیسائی مورخین بھی خاموش ہیں اور دنیا کے دوسرے مورخین بھی خاموش ہیں۔جن لوگوں نے ان اناجیل کو بیان کیا ان میں سے کوئی بھی حضرت عیسیٰؑ کا معاصر نہیں تھا۔یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کو کس نے سب سے پہلے بیان کیا؟ کس زبان میں بیان کیا؟ کس جگہ بیٹھ کر اس کو مرتب کیا۔پہلے پہل اناجیل کا جو نسخہ مرتب کیا گیا تھا وہ کہاں ہے؟ ان میں سے کوئی چیز آج موجود نہیں ہے۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد کچھ لوگوں نے یہ چیزیں لکھیں۔ساٹھ، ستر یا پچھتر سال بعد لوگوں نے یہ چیزیں مرتب کیں۔ان ابتدائی تحریروں میں سے کوئی چیز بھی تحریری شکل میں آج موجود نہیں ہے۔ان میں سے ایک نسخہ کا بعد میں کسی شخص نے ترجمہ کیا تھا۔وہ ترجمہ کرنے والا کون تھا؟ یہ بھی معلوم نہیں۔وہ اس زبان کو جانتا تھا جس میں انجیل پہلے پہل لکھی گئی یا نہیں جانتا تھا؟ یہ بھی معلوم نہیں۔اس نے صحیح ترجمہ کیا؟ یہ بھی نہیں معلوم، مکمل ترجمہ کیا؟ یہ بھی نہیں معلوم۔اپنی طرف سے کچھ ملا دیا؟ یہ بھی نہیں معلوم۔کچھ چیزیں حذف کر دیں؟ یہ بھی نہیں معلوم۔

اس نے ترجمہ کر کے چھوڑ دیا۔ وہ ترجمہ دوڈھائی سوسال بعد کہیں سے دریافت ہوااور اس غیر مستند ترجمہ کے یہ سارے ترجمے ہیں جو آج عہد نامہ جدید کی پہلی چار کتابوں کی صورت میں موجود ہیں۔ یہ اناجیل اربعہ کی تاریخی حیثیت ہے۔

اس کے مقابلہ میں آپ دیکھیں سنت رسول اللہ ﷺ کو، جس کی تفصیل میں آگے چل کر مزید بیان کروں گا کہ اگر آج میں آپ سے یہ بیان کروں کہ یہ حدیث مبارک جو ابھی میں نے پڑھی انما الاعمال بالنیات وانما لکل امرئ مانوی میں آپ سے بیان کرسکتا ہوں کہ مجھ سے یہ حدیث کس نے بیان کیا۔ اس سے کس نے بیان کی اور میں رسول اللہ ﷺ تک پوری سند آپ کو سنا سکتا ہوں۔ اور انشاء اللہ آخری دن میں تبرک کے طور پر بیان بھی کردوں گا۔ پوری سند میں آپ کے سامنے بیان کردوں گا کہ صحاح ستہ کی احادیث میں کس روایت سے بیان کرتا ہوں۔ مسلمانوں کے علاوہ دنیا میں کسی اور کے پاس ایسی کوئی چیز موجود نہیں۔ دنیا کے لئے یہ بات ناقابل تصور ہے کہ ایسی کوئی چیز بھی ہوسکتی ہے؟ حضرت عیسیٰؑ تو بہت پہلے تھے۔ آج سے سودوسوسال پہلے کے کسی آدمی کا بیان اس سند کے ساتھ موجود نہیں کہ سند میں شامل ہر آدمی ایک تاریخی وجود رکھتا ہواور آپ کو اختیار ہو کہ ہر ایک کے بارے میں پوچھیں کہ یہ آدمی کون تھا؟ اور میری ذمہ داری ہو کہ میں تاریخ سے ثابت کروں کہ یہ فلاں صاحب تھے، فلاں جگہ پیدا ہوئے تھے یہ ان کا نام تھا اور یہ ان کا کارنامہ ہے۔ یہ چیز دنیا میں کسی کے پاس نہیں ہے۔ یہ صرف مسلمانوں کے پاس ہے۔

کتاب الٰہی اور ارشادات انبیا میں بنیادی فرق

اب وحی الٰہی کی طرف آتے ہیں۔ وحی الٰہی کا ایک خاص اسلوب ہے۔ قرآن مجید میں بھی یہ اسلوب ہے تورات میں بھی یہ اسلوب ملتا ہے، جو حصے تورات کے مستند باقی رہ گئے۔ اور جس حد تک انجیل میں استناد پایا جاتا ہے انجیل میں بھی یہ بات موجود ہے کہ انبیا علیہم السلام اپنی باتوں کو عمومی انداز میں بیان فرماتے تھے۔ کتاب الٰہی کے عمومی اصول ہوتے تھے۔ کتاب الٰہی میں عملی تفصیلات اور روزمرہ کے احکام نہیں ہوتے۔ اگر ایسا ہونے لگے تو کتاب الٰہی کی کم ازکم سو جلدیں ہوں۔ قرآن مجید کی سو جلدیں ہوتیں اگر یہ سب کچھ قرآن مجید میں لکھا جاتا کہ نماز میں ہاتھ

یہاں باندھو، رفع یدین کرو یا مت کرو، نماز میں کیا پڑھو، کیسے پڑھو۔ صرف نماز کے احکام اگر قرآن پاک میں لکھے جاتے تو موجودہ قرآن پاک سے شاید دس گنا زیادہ اس کی جلدیں بن جاتیں۔ پھر لوگ اس کو یاد کیسے رکھتے اور سمجھتے کیسے۔ اس لئے قرآن مجید کا اسلوب یہ ہے کہ اس میں عمومی ہدایات اور عمومی اصول بیان کئے گئے ہیں۔ ایسے ہی عمومی اصول توراۃ میں ہیں۔ یہی عمومی اصول انجیل میں ہیں۔ یہی بقیہ کتابوں میں ہیں۔

اب اللہ کی سنت یہ رہی ہے کہ ان اصولوں کے دینے کے ساتھ ساتھ انبیاء علیہم السلام کو دنیا میں بھیجا کہ ان کی سنت کو دیکھتے جاؤ اور عمل سیکھتے جاؤ۔ اگر کتاب الٰہی میں لکھا ہوا ہے کہ عدل وانصاف سے کام لو تو جو ان کا طرز عمل ہے وہ عدل وانصاف ہے، اس کے مطابق کام شروع کردو۔ اگر اس میں لکھا ہوا ہے کہ اللہ کی عبادت کرو تو جیسے یہ عبادت کرتے ہیں ویسے عبادت شروع کردو۔ اس طرح سے کتاب الٰہی کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ انبیاء علیہم السلام کے سالہاسال کی سنتوں کے نتیجہ میں سامنے آتا ہے۔ وہ ایک زندہ پائندہ وجود ہے۔ لوگ اس کو دیکھتے جائیں اور کتاب الٰہی پر عمل درآمد کرتے جائیں۔

سنت؛ وحی الٰہی کا عملی نمونہ

سابقہ انبیاء علیہم السلام کی اقوام نے ان کی سنتوں کو بھلا دیا۔ محفوظ بھی نہیں رکھا اور جتنا کچھ باقی رہا تھا اس کو بھی بھلا دیا اور یاد نہیں رکھا۔ اب صورت یہ ہے کہ ان کے ہاں صرف نعرے اور اعلانات ہیں۔ عمل درآمد نہیں ہے۔ میں ایک مثال آپ کو دیتا ہوں۔ عیسائیوں کے بارے میں آپ نے سنا ہوگا وہ کہتے ہیں کہ ہمیں دو اصولوں کی تعلیم دی گئی ہے اور ہم دو ہی اصولوں کے علمبردار ہیں۔ عدل وانصاف اور انسانیت سے محبت۔ عیسائیوں کی کتابوں میں اکثر جگہ آپ نے یہی لکھا دیکھا ہوگا۔ لیکن یہ بات کہ انسانیت سے محبت سے کیا مراد ہے؟ اس پر عمل درآمد کیسے کیا جائے گا؟ عدل وانصاف کی تعریف کیا ہے؟ اس کے عملی تقاضے کیا ہیں؟ جب تک عملی تشکیل کرکے لوگوں کی رہنمائی نہ کی جائے کہ عدل کس کو کہتے ہیں؟ اس وقت تک عدل کا لفظ بے معنی ہے۔ میں پوری زندگی تقریریں کرتا رہوں کہ عدل ہونا چاہئے۔ نہ میری زندگی میں عدل ہو، نہ آپ کی زندگی میں عدل ہو، تو یہ تقریر بے معنی ہے۔ یہ بات کہنے میں تو بہت اچھی لگتی ہے کہ کوئی تمہارے دائیں گال پر چانٹا مارے تو تم بایاں گال بھی سامنے کردو۔ کہنے کو تو بڑی اچھی بات ہے لیکن اس کی عملی

شکل کیا ہوگی؟ کیا بعض صورتوں میں استثنا بھی ہوگا یا ہر حالت میں ایسا کرنا چاہئے؟ کیا کسی قاتل کے سامنے، جب وہ تلوار سے وار کرے تو دوسرا کندھا بھی سامنے کردیں کہ 'ادھر بھی وار کردو' کہ یہی انجیل کا حکم ہے۔ چور ایک کمرے میں ڈاکہ ڈالے تو آپ دوسرا کمرہ بھی کھول دیں کہ یہاں بھی ڈاکہ ڈال دو۔ سوال یہ ہے کہ اس اصول پر کہاں عمل درآمد کریں گے اور کہاں نہیں کریں گے؟ کیسے عمل کریں گے؟ جب تک یہ تفصیل سامنے نہ ہو اس وقت تک یہ نعرہ محض ایک بے معنی بات ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سنت ان لوگوں نے محفوظ نہیں رکھی، گم کردی ہے۔ لہٰذا ان کے پاس سوائے اس مبہم نعرے کے اور کچھ نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سنت یہودیوں نے مٹادی۔ وہ کہتے ہیں کہ تم اپنے پڑوسی کے لئے وہی کرو جو اپنے لئے کرتے ہو، لیکن کیا یہودی اپنے پڑوسیوں کے لئے وہ کچھ کرتے ہیں جو کچھ اپنے لئے کرتے ہیں؟ آپ دیکھ لیجئے کیا ہو رہا ہے؟ اسرائیل میں کیا کررہے ہیں باقی جگہوں میں کیا کررہے ہیں؟ اس لئے کہ یہ نعرہ تو لکھا ہوا ہے۔ توراۃ میں اس موضوع پر ایک آدھ سطر کی تعلیم ہے۔ لیکن اس پر عمل درآمد کے لئے اس کے پیچھے کوئی سنت اور طرز عمل نہیں ہے۔

جو بات میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ سنت میں وحی الٰہی کی ایک عملی تشکیل فراہم کی گئی ہے۔ ایک جیتا جاگتا عملی نمونہ ہمارے سامنے رکھ دیا گیا ہے جس میں وحی الٰہی کے ایک ایک حکم، ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف کی پوری نقشہ کشی کردی ہے کہ اس پر عمل درآمد ایسے ہوگا۔ اب کسی لفظ کے بارے میں کوئی ابہام نہیں ہے کہ قرآن مجید میں کوئی لفظ کس لئے اختیار کیا گیا ہے؟ اور اس میں کیا کہا گیا ہے؟

اگر سنت کا یہ کارنامہ نہ ہوتا تو قرآن مجید کے اصول صرف نظری بیانات اور خوشگوار اعلانات ہوتے۔ قرآن مجید کے اعلانات بھی نعوذ باللہ مجرّد اعلانات بن کر رہ جاتے۔ جیسے توراۃ اور انجیل کے اعلانات محض لفظی بیانات ہو کر رہ گئے ہیں۔ جیسے بقیہ مذہبی کتابوں میں اچھی اچھی باتیں لکھی ہوئی ہیں۔ جس قوم کی بھی مذہبی کتاب اٹھا کر دیکھیں اس میں بڑے اچھے اخلاقی اصول بیان ہوئے ہیں۔ لیکن عمل درآمد کا معاملہ صفر ہے۔ وہ اس لئے صفر ہے کہ اس کے پیچھے کوئی عملی نمونہ نہیں ہے۔ عملی نمونے بلاشبہ موجود تھے، اللہ نے بھیجے تھے، لیکن ان کے ماننے والوں نے ان عملی نمونوں کی تفصیلات باقی نہیں رکھیں۔ عدل، محبت، مساوات، کرامت آدم یہ سارے اعلانات

جو قرآن مجید میں کیئے گئے ان کی عملی تشریح رسول اللہ ﷺ کی سنت کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ یہی وہ عصا ہے سنت رسول کا، جس نے اس کلیمی کو بنیاد فراہم کی۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

اگر یہ عصا نہ ہوتا تو وحی الٰہی اس طرح ایک عملی نمونہ کے طور پر ہمارے سامنے نہ آسکتی۔ ابھی میں نے عرض کیا کہ قرآن مجید میں اللہ رب العزت نے کتاب الٰہی کو محفوظ رکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحفظون۔ اور مشاہدہ بھی یہ ہے کہ قرآن مجید وہ واحد آسمانی کتاب ہے جو آج تک بعینہ اسی طرح محفوظ ہے جس طرح اللہ رب العزت نے رسول اللہ ﷺ پر اتاری اور رسول اللہ ﷺ نے صحابہ تک پہنچائی۔ اس میں ایک حرف، ایک شوشے اور ایک زبر زیر کا بھی فرق نہیں ہے۔ حتیٰ کہ صحابہ کرامؓ نے جس طرح لکھی آج تک اسی طرح لکھی جارہی ہے۔

آپ میں سے جن بہنوں کو قرآن پاک پر گفتگو میں شرکت کا موقع ملا تھا ان کے سامنے میں نے بعض مثالیں عرض کی تھیں۔ ایک جگہ لکھا جاتا ہے: والسمآ بنینـٰها باییدٍ وانا لموسعون۔ ایدِ میں لکھی جاتی ہیں دو 'ی'۔ اور پڑھی جاتی ہے ایک 'ی'۔ دو 'ی' کیوں لکھی جاتی ہیں، کسی کو نہیں معلوم۔ صرف یہ معلوم ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے جب قرآن پاک لکھا تھا تو یہ لفظ دو 'ی' سے لکھا تھا بس۔ آج تک اسی کی پیروی ہورہی ہے۔

ایک جگہ ہے سترھویں پارے میں 'وکذالك نجی المومنین نجی المومنین میں دو 'نون' پڑھے جاتے ہیں ایک لکھا جاتا ہے دوسرا نہیں لکھا جاتا۔ بعد میں پڑھنے والوں کی آسانی کے لئے اس کے اوپر ایک چھوٹے نون کے لکھنے کا رواج ہوگیا۔ لیکن یہ حرف آج تک اسی طرح لکھا جاتا رہا۔ یہ اس لئے کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے اسی طرح لکھا تھا۔

اس طرح کی مثالیں قرآن پاک میں اور بھی ہیں۔ جن سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کتاب الٰہی کے متن کے ساتھ ساتھ اس کا املاء اور ہجاء بھی محفوظ ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کتاب الٰہی کے تحفظ کے لئے اللہ رب العزت نے دس چیزوں کا تحفظ کیا۔ یہ دس چیزیں وہ ہیں جو قرآن پاک کے تحفظ کی خاطر محفوظ کی گئی ہیں۔

۱: سب سے پہلے تو خود قرآن پاک کا متن ہے جو ہماری اس وقت کی گفتگو کے موضوع سے باہر ہے۔ بہرحال یہ ایک قطعی امر ہے کہ قرآن پاک کا متن پوری طرح سے محفوظ

ہے۔

۲: پھر متن محفوظ ہو اور معنی اور مفہوم محفوظ نہ ہو تو متن کی حفاظت سے فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ میں نے مثال دی تھی کہ پرانے زمانے میں اسی علاقے میں جہاں آج ہم بیٹھے ہیں (اسلام آباد) یہاں کسی زمانے میں پراکرت زبان بولی جاتی تھی۔ پراکرت زبان ہو یا اردو ہی گو رمکھی رسم الخط میں لکھی ہو تو ہمارے اور آپ کے لئے بے کار ہے۔ دو سو سال پرانا متن ہو، ہزار سال پرانا ہو یا دو ہزار سال پرانا ہو، وہ ہمارے لئے بے معنی ہے۔ اس لئے کہ اس کے معنی اور مفاہیم مٹ گئے۔ اس کے برعکس اللہ نے قرآن پاک کے متن کو بھی محفوظ رکھا اور اس کے معنی کو بھی محفوظ رکھا جو سنت کی شکل میں ہمارے سامنے ہے اور ہماری اس گفتگو کا موضوع ہے۔

۳: اللہ رب العزت نے قرآن مجید کی زبان کو بھی محفوظ رکھا۔ قرآن مجید کی زبان بھی محفوظ ہے۔ قرآن مجید کی ہم عصر سب زبانیں مٹ گئی ہیں۔ جن جن زبانوں کو نزول قرآن کے زمانے میں انسان بولتے تھے آج ان میں سے کوئی زبان دنیا میں محفوظ نہیں ہے۔ سب مٹ چکی ہیں۔ صرف ایک قرآن مجید کی زبان موجود ہے۔ یہ ایک ایسا عجیب و غریب استثنا ہے جس کی لسانیات کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔ دنیا کی ہر زبان تین چار سو سال بعد بدل جاتی ہے۔ آج میں جو اردو بول رہا ہوں یہ اردو آج سے چار سو سال پہلے نہیں بولی جاتی تھی۔ تین سو سال کے بعد نہیں بولی جائے گی۔ تین سو سال بعد آنے والے شاید اس زبان کو نہیں سمجھ سکیں گے۔ لیکن عربی زبان واحد زبان ہے جو رسول اللہ ﷺ کی ولادت مبارکہ سے کم و بیش ساڑھے تین سو سال پہلے سے بولی جا رہی تھی۔ اس کی مثالیں موجود ہیں۔ گفتگو لمبی ہو جائے گی اس لئے میں نہیں دوہراتا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کی ولادت سے ساڑھے تین سو سال پہلے کی عربی زبان کے نمونے موجود ہیں اور آج ہم تک پہنچے ہیں، اور ان میں یہی اسلوب، یہی الفاظ اور یہی لغت استعمال ہوئی ہے جو احادیث اور قرآن پاک میں ہمیں ملتی ہے۔

۴: پھر اس کے ساتھ ساتھ قرآن پاک اور سنت پر جو اجتماعی عمل مسلمانوں کا رہا ہے، جسے تعامل کہتے ہیں یعنی نسلاً بعد نسلٍ لوگ عمل کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہ بھی پوری طرح محفوظ ہے۔ ہر دور کا عمل اور تعامل محفوظ ہے۔ جس کا نہ صرف مسلمانوں کے اجتماعی طرز عمل سے بلکہ مسلمانوں کے بعض دستیاب مطبوعہ ریکارڈ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ تعامل کس زمانے میں کیسا تھا۔

ایک مثال میں عرض کر دیتا ہوں۔قرآن پاک میں ہے اقیموا الصلوٰۃ ،درجنوں نہیں سینکڑوں جگہ آیا ہے کہ نماز قائم کرو لیکن کہیں بھی نماز کی تفصیل بیان نہیں کی گئی ہے۔رسول اللہ ﷺ نے نماز کے احکام اور طریقہ کار کو بیان فرمایا اور آپؐ اس تفصیل میں نہیں گئے کہ یہ فرض ہے، اور یہ واجب ہے، آپؐ نے صرف اتنا کہنے پر اکتفاء فرمایا کہ صلّو ا کما رائیتمونی اصلی جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو اسی طرح نماز پڑھنی شروع کر دو۔صحابہؓ نے اس طرح نماز پڑھنی شروع کر دی۔صحابہ نے آگے تابعین کو سکھایا، تابعین نے تبع تابعینؒ کو سکھایا اور ہر دور میں فقہائے اسلام اور محدثین اور مفسرین قرآن نماز کے احکام کی تفصیلات بیان کرتے رہے۔آج مسلمان اربوں کی تعداد میں نماز ادا کر رہے ہیں۔کروڑوں کی تعداد میں مسلمان باقاعدہ نماز پڑھتے ہیں۔اگر آپ کو یہ جاننے کا شوق ہو کہ کس دور میں مسلمان نماز کس طرح پڑھتے تھے تو اس دور کی کوئی کتاب، فقہ کی، حدیث کی یا تفسیر کی دیکھ لیں، معلوم ہو جائے گا کہ مسلمان بارہویں صدی ہجری میں ایسے کرتے تھے۔ساتویں صدی ہجری میں ایسے کرتے تھے، نویں صدی ہجری میں ایسے کرتے تھے، اگر چہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔آج جس طرح کر رہے ہیں یہ تعامل سے ثابت ہے۔لیکن مزید چیک کرنا چاہیں تو یہ سارا ذخیرہ موجود ہے اس کو چیک کیا جا سکتا ہے۔یہ تحفظ تعامل ہے جو قرآن مجید کے تسلسل کے لئے ضروری ہے۔

۵: پھر جس ماحول اور جس سیاق وسباق میں قرآن مجید نازل کیا گیا اس ماحول اور سیاق وسباق کی پوری تفصیل موجود ہے اور یہ حدیث کی صورت میں ہمارے سامنے آئی ہے۔سیرت اور حدیث کے ذخائر میں وہ پورا ماحول، اس کی منظر کشی اور نقشہ کشی کر کے ہمارے سامنے رکھ دی گئی جس میں قرآن مجید نازل ہوا۔جب حدیث کا ایک طالب علم حدیث کی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے۔سیرت کا طالب علم سیرت کی تفصیلات پڑھتا ہے تو اس کے سامنے چشم تصور میں وہ سارا منظر متشکل ہو کر آ جاتا ہے جس منظر میں قرآن پاک نازل ہوا، جس پس منظر اور پیش منظر میں قرآن پاک کے احکام وہدایات پر عمل درآمد شروع ہوا اور ایسی چیزیں جن کا بظاہر قرآن پاک یا حدیث پاک کے سمجھنے سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا وہ تفصیلات بھی صحابہ کرامؓ نے بیان کر دیں اور ان کو محفوظ رکھ دیا۔

حدیث کی اقسام پر آگے چل کر بات ہوگی، لیکن ابھی ضمناً ایک بات عرض

کر دیتا ہوں۔ایک قسم حدیث کی کہلاتی ہے'حدیث مسلسل'۔اس سے مراد وہ حدیث ہے جس میں ہر راوی نے کوئی خاص نقطہ یا کسی خاص کیفیت کے تسلسل کے ساتھ روایت کو بیان کیا ہو، اس کو حدیث مسلسل کہتے ہیں۔چنانچہ ایک حدیث کہلاتی ہے'حدیث مسلسل بالتشبیك 'تشبیک دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو اس طرح ایک دوسرے کے اندر پرو لینا، اس عمل کو تشبیک کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ تقریر فرما رہے تھے اور بیان فرما رہے تھے کہ 'جب انسان کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے دل سے ایمان اس طرح نکلتا ہے، اور جب توبہ کر لیتا ہے تو ایمان دل میں ایسے داخل ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے آپ نے دونوں کی ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے کے اندر پرو کر بتایا۔ جب صحابیؓ نے اس کو نقل کر کے بتایا تو انہوںؓ نے بھی ایسے کیا فشبك بین اصابعه' آپ نے دونوں انگلیوں کو پرو کر علیحدہ کیا اور کہا کہ ایمان اس طرح نکل جاتا ہے، پھر چوری کرتا ہے تو ایسے نکلتا ہے، پھر فلاں عمل کرتا ہے تو ایسے نکلتا ہے۔ پھر توبہ کرتا ہے تو داخل ہو جاتا ہے۔ اس حدیث کو حدیث مسلسل بالتشبیک کہا جاتا ہے۔اور صحابہ کرام کے زمانے سے لے کر آج تک اس حدیث کو بیان کرنے والے اس عمل کی نقل کر کے بتاتے ہیں۔اس عمل کو کر کے دکھانے اور بتانے کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور اگر کوئی نہ بھی کرے تو بھی بات سمجھ میں آجائے گی۔ لیکن اس سے ایک اضافی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ نفسیاتی اور جذباتی طور پر انسان اس ماحول میں چلا جاتا ہے جس ماحول میں رسول اللہ ﷺ اس بات کو بیان فرما رہے تھے۔ مسجد نبوی میں یا جس مقام پر حضورؐ اس کو بیان فرما رہے تھے تو روحانی طور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں وہاں موجود ہوں اور رسول اللہ ﷺ کے اس عمل کو صحابہ، تابعین اور تبع تابعینؒ اور حدیث کے طلبہ اور اساتذہ کے ذریعے میں دیکھتا چلا آ رہا ہوں۔ یہ ہے تحفظ ماحول کی ایک مثال۔ اس طرح کی مثالیں اور بھی سامنے آئیں گی یعنی وہ پوری کیفیت (Setting) جس میں حضورؐ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کوئی حدیث ارشاد فرمائی یا سنت کا کوئی نمونہ لوگوں کے سامنے رکھا اور قرآن مجید کی تعبیر و تشریح فرمائی تو اس ماحول کی تفصیلات کو بھی اللہ نے محفوظ رکھا اور آئندہ نسلوں کے لئے باقی رکھا۔

۷: جو شخصیت کتاب الٰہی لے کر آئی وہ اپنی جگہ خود ایک سمندر ہے، ایک موضوع ہے اور اگر زندگی رہی تو اس موضوع یعنی سیرت کے موضوع پر بھی خطبات کا ایک سلسلہ ہوگا، ان شاء اللہ۔ حاملِ کتابِ الٰہی کی سیرت کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی طرح محفوظ رکھا کہ جس سے زیادہ کسی

انسان کی شخصیت کی تفصیلات کو محفوظ رکھنے کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔

۷: انسان کے حاشیۂ خیال میں وہ امکانات اور تفصیلات نہیں آسکتیں جو سیرت کے واقعات کو محفوظ رکھنے کے لئے کی گئیں۔ زیادہ تفصیلات بیان کرنے کا موقع نہیں لیکن ایک چھوٹی سی مثال عرض کرتا ہوں۔

عربوں کے دل میں اللہ تعالیٰ نے یہ ڈالا اور بظاہر ہمارے خیال میں اسی لئے ڈالا کہ سیرت کے واقعات محفوظ رکھنے تھے، کہ اپنے قبائل اور برادریوں کے نسب کو محفوظ رکھیں۔ علم الانساب ان کے ہاں ایک باقاعدہ فن تھا۔ اس پر درجنوں کتابیں آج بھی موجود ہیں۔ علم الانساب کے نام سے ان موضوعات پر کتابیں لکھی گئیں کہ عرب قبائل کا نسب کیا تھا؟ کون کس کا بیٹا تھا، کس کا پوتا تھا، کس کا دادا تھا، کس کی شادی کہاں ہوئی، کس کی کتنی اولادیں تھیں، کس قبیلہ کی آپس میں کیا رشتہ داریاں تھیں۔ ان معلومات پر درجنوں کتابیں آج بھی دستیاب ہیں جو لوگوں نے وقتاً فوقتاً لکھیں۔

اب کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ عربوں کو ان موضوعات سے دلچسپی تھی، اس لئے ان کو ان چیزوں پر معلومات جمع کرنے کا شوق تھا، اس لئے انہوں نے انساب پر کتابیں لکھ دیں۔ بہت سے لوگ اپنے شوق کے لئے کتابیں لکھ دیتے ہیں۔ اس لئے ان لوگوں نے بھی لکھ دیں۔ لیکن محض یہ کہنا کافی نہیں ہے۔ جب ہم انساب کی ان کتابوں کا جائزہ لیتے ہیں اور ان کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایک عجیب وغریب بات سامنے آتی ہے، بہت عجیب وغریب۔ اتنی عجیب وغریب کہ اس کو محض اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔ وہ عجیب وغریب بات یہ سامنے آتی ہے کہ جتنی معلومات محفوظ ہوئیں وہ مرکوز ہیں رسول اللہ ﷺ کی شخصیت پر، حالانکہ جس وقت سے محفوظ ہونا شروع ہوئیں اس وقت تو حضورؐ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ چالیس سال تک کسی کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھا کہ یہ نبی ہوں گے اور نبوت کا سلسلہ اس طرح چلے گا اور پھر ایک امت قائم ہوگی اور اُس امت میں علوم وفنون کے بہت سے سلسلوں میں سے ایک سلسلہ یہ چلے گا کہ انساب کے بارے میں یہ معلومات جمع کی جائیں گی، یہ تو کبھی کسی کے تصور میں بھی نہیں آیا تھا۔ لیکن عربوں نے اپنے اپنے طور پر جو معلومات جمع کیں اور جو بعد میں کتابی شکل میں مدوّن ہوئیں اور آج جس طرح ہم تک پہنچیں، وہ سب رسول اللہ ﷺ کی شخصیت مبارکہ پر مرکوز ہیں۔ جس طرح ایک سرچ لائٹ ہوتی ہے۔ آپ پانچ ہزار واٹ کے ایک بلب سے روشنی کسی ایک نقطہ پر ڈالیں تو جس طرح سے وہ نقطہ چمکے گا اور

ایک ایک گوشہ اس کا روشن ہو جائے گا اسی طرح سے رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک کا ایک ایک گوشہ محفوظ ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے لے کر آپ کے پینتیسویں چالیسویں جدّ امجد عدنان تک اہم اور بنیادی امور سے متعلق ہر ایک چیز محفوظ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی دادیاں کون تھیں، نانیاں کون تھیں، پھوپھیاں کون تھیں۔ یہ سب معلومات علم انساب کی کتابوں میں ملیں گی۔ مثال کے طور پر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ کی دادی کا نام کیا تھا تو شاید آپ بتادیں۔ آپ میں سے اکثر بتادیں گے۔ اگر میں یہ پوچھوں کہ دادی کی دادی کا کیا نام تھا تو شاید آپ میں سے دس فیصد بتا سکیں اور اگر میں پوچھوں کہ دادی کی دادی کی دادی کا کیا نام تھا تو شاید ہم میں سے کوئی بھی نہ بتا سکے۔ کم از کم میں تو نہیں بتا سکتا۔ اسی طرح میری یا آپ کی نانی کا کیا نام تھا، سب بتادیں گے۔ نانی کی نانی کا نام شاید دو چار بتا سکیں۔ نانی کی نانی کی نانی کا کیا نام تھا شاید کوئی بھی نہیں بتا سکتا۔

رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ عجیب وغریب بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اجداد، آپ کی دادیاں، آپؐ کی نانیاں، آپؐ کے نانا اور آگے آپؐ کی پھوپھیاں اور آگے آپؐ کے چچا اور آگے ہر ایک کی تفصیلات پچیس پچیس اور تیس تیس نسلوں تک محفوظ ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی محفوظ نہیں ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کی محفوظ نہیں ہیں۔ ابوجہل، ابولہب کی محفوظ نہیں ہیں، خالد بن ولیدؓ کی محفوظ نہیں ہیں۔ یہ اسلام سے پہلے عرب کے بڑے بڑے لوگ تھے، انہی کا چرچا تھا۔ ان میں سے کسی کے بارے میں اس طرح کی معلومات محفوظ نہیں رہیں۔ جو محفوظ رہ گئیں وہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں محفوظ رہ گئیں۔

اس لئے میں یہ سمجھتا ہوں۔ اور میرا خیال ہے کہ میں حق بجانب ہوں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص مشیت سے عربوں کے دل میں یہ ڈالا کہ وہ نسب محفوظ رکھیں اور جس نسب کو عربوں نے زیادہ اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھا یہ وہ تھا جس کا رشتہ رسول اللہ ﷺ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ ملتا تھا۔

سیرت کے واقعات کے محفوظ رکھے جانے کی ایسی ایسی مثالیں ہیں کہ جن کی تفصیلات میں اگر میں جاؤں تو گفتگو موضوع سے آگے نکل جائے گی۔ رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے۔ مسجد نبوی میں ایک ستون سے ٹیک لگا کر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ آج بھی وہ جگہ محفوظ ہے اس کو 'اسطوانہ حنانہ' کہتے ہیں۔ اس کے بعد جب صحابہ کی تعداد بڑھنے لگی تو کسی نے تجویز پیش کی کہ

کوئی بلند جگہ ہو جس پر قیام فرمایا کریں اور وہاں سے خطبہ ارشاد فرمایا کریں۔ اس غرض کے لئے ایک صحابیؓ نے منبر ڈیزائن کیا کہ جس پر آپ بیٹھ بھی سکیں اور اگر کھڑے ہونا چاہیں تو کھڑے بھی ہو سکیں۔ چنانچہ وہ منبر بنا کر لے آئے۔ اب بظاہر اتنا کافی ہے۔ یعنی معلومات اور رہنمائی کے لئے اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ تفصیلات کہ یہ منبر کس لکڑی کا تھا، وہ منبر کس نے بنایا تھا، اس کا سائز کیا تھا، اس کا ڈیزائن کیا تھا، وہ لکڑی کس نے کاٹی تھی، کس جنگل سے کاٹ کر لائی گئی تھی، کہاں بیٹھ کر منبر بنایا گیا، اس پر لوگوں نے معلومات جمع کیں اور کتابیں لکھیں اور سیرت پر جو قدیم لٹریچر ہے اس میں تقریباً بیس کتابوں کا تذکرہ ملتا ہے جو منبر کے ڈیزائن اور اس کے بارے میں تیار ہوئیں۔ رسول اللہ ﷺ جوتا کیسا استعمال فرماتے تھے، نعل مبارک، اس کی شکل کیسی تھی، وہ چمڑے کا تھا کہ ربڑ کا تھا، کون بناتا تھا، کس سے خریدتے تھے، نعل مبارک ٹوٹ جاتا تھا تو کس سے مرمت کراتے تھے، اس پر کتابیں موجود ہیں اور ایک چھوٹا رسالہ اردو میں بھی دستیاب ہے۔ یہ اس شخصیتؐ کے حالات کا تحفظ ہے جو شخصیت حامل قرآن اور ناقل قرآن ہے، جس کے ذریعے قرآن ہم تک پہنچا۔

۸: وہ علوم جو رسول اللہ ﷺ کی شخصیت سے متعلق ہیں یعنی علوم سیرت، ارشادات اور سنت اور عمل سے متعلق تو سنت اور حدیث ہوگئی لیکن آپ کی ذات سے متعلق، آپ کی شخصی اور جسمانی حالات اور واقعات سے متعلق ان کی وسعتوں کو اگر بیان کیا جائے تو اس کے لئے میری اور آپ کی عمریں کافی نہیں ہیں۔ لوگ تسلسل سے جس طرح سے تحقیق کرتے آرہے ہیں، اُس کے نتیجہ میں جو نئے نئے معاملات اور مسائل سامنے آرہے ہیں اس کا صرف ایک ہی سبب معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے تحفظ کے لئے سنت کا تحفظ فرمایا، سنت کے تحفظ کے لئے صاحب سنت کا تحفظ فرمایا، صاحبِ سنت کی سیرت کے تحفظ کے لئے ہر وہ چیز جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اس سے متعلق تھی وہ محفوظ رکھی گئی۔

۹: پھر رسول اللہ ﷺ کے براہ راست مخاطبین تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے مخاطبین اور ہمراہیوں یعنی صحابہ کرامؓ کے حالات محفوظ رکھے گئے۔ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ کم و بیش پندرہ ہزار صحابہ کرامؓ کے حالات محفوظ اور موجود ہیں۔ اور جو صحابیؓ جتنے قریب تھے ان کے حالات اسی قدر تفصیل اور دقت نظر کے ساتھ محفوظ ہیں۔ انسان اپنے دوستوں کے ذریعے پہچانا جاتا ہے۔ یہ

ہر قوم میں ایک دلیل اور ایک کلیہ ہے۔ انسانی تاریخ کی بہترین شخصیتیں ہر اعتبار سے وہ ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہیں جنہوں نے حضورؐ کا ساتھ دیا۔ اس لئے قرآن اور صاحب قرآن کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ قرآن مجید پر اجتماعی طور پر عمل درآمد کیسے ہوا؟ سنت کی اجتماعی تشکیل کیسے ہوئی؟ حدیث کی رہنمائی کی روشنی میں امت نے کیسے جنم لیا؟ یہ چیزیں سمجھ میں نہیں آسکتیں جب تک کہ صحابہ کرام کے حالات محفوظ نہ ہوں۔ صحابہ کرامؓ کا تذکرہ محفوظ ہے اور کم و بیش پندرہ ہزار صحابہ کرامؓ کے حالات نام بہ نام اور نسل بہ نسل دستیاب ہیں۔

۱۰: ان صحابہ کرام کے حالات ہم تک کس طرح پہنچے؟ میں نے عرض کیا کہ چھ لاکھ افراد کے بارے میں معلومات محفوظ ہیں۔ چھ لاکھ افراد کے بارے میں یہ واقعات جمع کئے گئے کہ یہ کون لوگ تھے؟ کس زمانے میں پیدا ہوئے؟ ان کی شخصیتیں کس درجہ کی تھیں؟ ان کا علم و فضل کس درجہ کا تھا؟ اس پر علم رجال کے عنوان سے جب گفتگو ہوگی تو تفصیل سامنے آئے گی۔ علم رجال ایک ایسا فن ہے جس کی کوئی مثال دنیا کے کسی مذہبی یا غیر مذہبی فن میں نہیں ملتی۔ نہ مذہبی علوم میں اس کی مثال ہے نہ غیر مذہبی علوم میں اس کی کوئی مثال ہے۔ یہ دس چیزیں ہیں جو سنت کے تحفظ کی خاطر اور قرآن پاک کے تحفظ کی خاطر محفوظ رکھی گئیں اور اللہ کی مشیت اس کی متقاضی ہوئی کہ ان سب چیزوں کو محفوظ رکھا جائے۔

پھر محض ان کے محفوظ رکھنے پر اکتفا نہیں ہوا، بلکہ سنت نے اور احادیث کے ذخیرے نے ایک ایسا کردار ادا کیا۔ اگر آپ انگریزی میں کہنے کی اجازت دیں، تو میں کہوں گا کہ اس نے ایک ایسا(Cataclyst) کردار اداء کیا کہ جس نے ایک علمی سرگرمی (Intellectual Activity) کو ایک تحریک کی شکل دے دی۔ ایک فکری سرگرمی کو جنم دیا، ایک ایسے تعلیمی عمل کا آغاز کیا جو تسلسل کے ساتھ آج بھی جاری ہے۔ حدیث اور سنت کے یہ ذخائر اسلامی علوم وفنون میں نہ صرف مسلسل بقا اور تحفظ کی ضمانت ہیں بلکہ اس کی مسلسل توسیع اور وسعت بھی علوم حدیث اور علوم سنت کے ذریعے ہو رہی ہے۔

قاضی ابوبکر بن العربیؒ ایک مشہور محدث ہیں۔ مالکی فقیہ بھی ہیں اور مالکی فقہا میں ان کا ایک بہت بڑا مقام ہے، محدث بھی ہیں اور مفسر قرآن بھی ہیں۔ انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ تمام اسلامی علوم، جن کی تعداد اُس وقت ساڑھے سات سو کے لگ بھگ اندازہ کی جاتی تھی، یہ سب

اسلامی علوم سنت کی شرح ہیں اور سب کے سب بالواسطہ یا بلاواسطہ حدیث اور سنت کی تفسیر اور توضیح سے عبارت ہیں۔ اور حدیث اور سنت قرآن پاک کی شرح ہے۔ لہٰذا قرآن پاک، حدیث اور دیگر تمام علوم وفنون میں وہ رشتہ ہے جو درخت میں، اس کے تنے اور شاخوں میں اور پھلوں اور پھولوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ سارے علوم وفنون پھل اور پھول اور پتے ہیں، سنت شاخیں اور تنا ہے اور قرآن پاک وہ جڑ ہے جس سے یہ سارے علوم وفنون نکلے ہیں۔

یہاں تفصیلی مثالیں دینے کا موقع نہیں ہے، گفتگو طویل ہو جائے گی، لیکن چند مثالیں دینے پر اکتفا کرتا ہوں، جن سے یہ پتہ چلے گا کہ اسلامی علوم وفنون کا آغاز علم حدیث اور سنت کی بنیاد پر کیسے ہوا؟

مسلمانوں کا ایک بہت بڑا اور اہم فن ہے علم کلام۔ جس کو بعض لوگ انگریزی میں Scholasticism بھی کہتے ہیں اور جس کو آپ Theology بھی کہہ سکتے ہیں۔ علم کلام سے مراد وہ علم ہے جس میں عقلی دلائل کے ذریعے اسلام کے عقائد کو ثابت کیا جائے اور اسلام کے عقائد پر دوسرے مذاہب اور نظریات کے اعتراض کا جواب دیا جائے۔ اس کو علم کلام کہتے ہیں۔ اس پر صرف چند کتابیں ہی نہیں بلکہ پوری لائبریریاں اور کتب خانے موجود ہیں۔ لیکن اس علم کا آغاز جن مسائل سے ہوا وہ مسائل سب سے پہلے تفصیل کے ساتھ علم حدیث میں بیان ہوئے۔ جب محدثین نے احادیث کے اُن پہلوؤں پر غور شروع کیا جن میں عقائد بیان ہوئے تھے اور جب انہوں نے اُن احادیث کی تشریح کرنی چاہی تو ان مباحث کے نتیجہ میں علم کلام پیدا ہوا۔

ایک چھوٹی سی مثال عرض کرتا ہوں۔ مسلمان ہونے کے لئے ایمان لانا شرط ہے۔ ایمان اسلام کی لازمی شرط ہے۔ لیکن ایمان کس کو کہتے ہیں؟ اس سے کیا مراد ہے؟ اس کی تعریف کیا ہے؟ کیا محض دل میں یہ خیال ہونا کہ اللہ ایک ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ کے رسول ہیں، یہ کافی ہے؟ یا ایمان کے لئے اس سے زیادہ کچھ ہونا چاہئے؟ پھر اس سے زیادہ اگر ہو تو کیا ایمان میں کمی بیشی ہوسکتی ہے؟ ایک رائے اُس زمانے میں یہ سامنے آئی کہ ایمان میں کمی بیشی ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے وہ محدود و متعین ہیں۔ مثال کے طور پر امن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمومنون o کل امن باللہ وملئکتہ و کتبہ ورسلہ لانفرق بین احدمن رسلہ یہ جو ایمان مفصل یا ایمان مجمل ہے، یہ تو متعین ہے۔ اس میں

کمی بیشی کا مطلب یہ ہے کہ میں پانچ چیزوں کی بجائے چھ چیزوں کو مانتا ہوں۔ یا پانچ کے بجائے چار کو مانتا ہوں جو ایمان کی تحدید کے خلاف ہے۔ لہٰذا ایمان میں کمی بیشی تو نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ کچھ حضرات کا خیال تھا کہ ایمان میں کمی بیشی نہیں ہوسکتی۔ اس کے برعکس کچھ حضرات کا خیال تھا کہ ایمان میں کمی بیشی ہوسکتی ہے۔ اس لئے کہ قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے کہ جب کوئی نئی آیت نازل ہوتی ہے تو زادتھم ایمانا ، یعنی ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے، تو اگر ایمان بڑھ جاتا ہے تو گھٹ بھی سکتا ہے۔ اس پر محدثین کے ہاں لمبی بحثیں ہوئیں۔ امام بخاریؒ اس رائے کے قائل تھے کہ ایمان میں کمی بیشی کا امکان ہے۔ بعض دوسرے اہل علم اور محدثین مثلاً حضرت امام ابوحنیفہ اس رائے کے قائل تھے کہ ایمان میں کمی بیشی نہیں ہوسکتی۔

ان دونوں آراء میں کوئی تعارض نہ سمجھئے گا۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ ایمان میں کمی بیشی نہیں ہوسکتی، ان کی مراد ہے ایمان کی کمیت میں کمی بیشی، یعنی Quantity کے اعتبار سے ایمان میں کمی بیشی نہیں ہوسکتی، جو ایمان کا کم سے کم تقاضا ہے کہ اللہ کو اس کے رسول کو، کتابوں کو، روز آخرت کو، رسول اللہ ﷺ کی نبوت کو اور آپ کی تعلیم کو مانا جائے۔ اس میں کوئی کمی نہیں ہوسکتی۔ اس میں اگر کوئی ایک چیز بھی آپ گرادیں گے تو آپ مسلمان نہیں رہیں گے۔ اگر کوئی کہے کہ جی میں باقی چیزوں کو تو مانتا ہوں بس روز آخرت کو نہیں مانتا۔ یا مثلاً باقی تمام انبیاء کو مانتا ہوں ایک موسیٰ علیہ السلام کو نعوذ باللہ نہیں مانتا۔ اگر کوئی شخص ان میں کسی ایک چیز کو بھی کم کرے گا تو وہ مسلمان نہیں رہے گا۔ اگر کوئی چیز اپنی طرف سے بڑھادے کہ میں سب انبیاء کو مانتا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ فلاں صاحب کو بھی نبی مانتا ہوں جو بعد میں وارد ہوئے، ایسا کہنے والا بھی مسلمان نہیں رہے گا۔ اس لئے جو لوگ کہتے ہیں کہ ایمان میں کمی بیشی نہیں ہوسکتی وہ بالکل صحیح کہتے ہیں۔ کمی اعتبار سے، یعنی (Quantity) اور مقدار کے اعتبار سے ایمان میں کمی یا بیشی نہیں ہوسکتی، البتہ (Quality) معیار میں کمی بیشی ہوسکتی ہے۔

جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ ایمان میں کمی بیشی ہوسکتی ہے وہ کیفیت کے اعتبار سے کہتے ہیں کہ ایمان میں کیفیت اور شدت کے اعتبار سے کمی بیشی ہوسکتی ہے۔ ایمان کی Intensity یعنی شدت کے بہت سے درجات ہوسکتے ہیں۔ ایمان کی شدت میں ہمیشہ اضافہ ہوسکتا ہے۔ صحابہ کرام کو جو ایمان حاصل تھا وہ ہمیں اور آپ کو حاصل نہیں ہے۔ کسی اور کو بھی ایمان کا وہ درجہ

حاصل نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس پورے سلسلہ گفتگو میں ایک بحث اور پیدا ہوئی جس میں ایمان کی نوعیت پر ذرا فلسفیانہ انداز سے غور شروع ہوا۔ زیادہ گہرائی میں جا کر غور ہوا۔ اس سے علم کلام پیدا ہوا۔

یہ بات بڑی بنیادی اہمیت رکھتی ہے کہ جن اہل علم نے سب سے پہلے کلامی اور فلسفیانہ نوعیت کے یہ سوالات اٹھائے وہ اصلاً محدثین تھے۔ مثال کے طور پر امام بخاریؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور دوسرے محدثین نے ان سوالات سے بحث کی، کہ کلام الٰہی قدیم ہے کہ حادث ہے، یہ خالص عقلی اور فلسفیانہ مسئلہ ہے۔ لیکن امام احمد بن حنبلؒ نے یہ مسئلہ اٹھایا جو ایک محدث ہیں۔ ان مثالوں سے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ علم حدیث نے اور ذخیرہ حدیث نے ایک نیا رجحان مسلمانوں کے علوم وفنون میں پیدا کیا۔ اور اسلامی عقائد کی تعبیر، اسلامی عقائد پر اعتراضات کا عقلی انداز سے دفاع کرنے کی کوششیں ایک نئے علم کی تشکیل پر منتج ہوئیں جس کو علم کلام کہتے ہیں۔ جس میں مسلمانوں نے بڑے غیر معمولی کارنامے انجام دیئے۔

اس وقت علم کلام کی تاریخ میں جانا مقصود نہیں۔ لیکن متکلمین اسلام نے مسلمانوں کو اس گمراہی سے محفوظ رکھا جس گمراہی کا بڑے بڑے لوگ شکار ہوئے اور بڑے بڑے مذاہب اس گمراہی میں مبتلا ہوئے۔ ہر مذہب میں ایک چیلنج یہ درپیش رہا کہ معاملات میں اصل چیز انسانی عقل ہے یا وحی الٰہی ہے؟ مذہب اصل ہے یا عقل، بالفاظ دیگر انسان کے لئے ضابطۂ زندگی کی تشکیل میں وحی الٰہی فیصلہ کن ہے یا عقل کو فیصلہ کرنے کا حتمی اختیار حاصل ہے؟ کچھ لوگوں نے کہا کہ عقل ہی معاملات میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ ایسا کہنے سے مذہب کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ جیسے مغرب میں ہوا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ اصل فیصلہ کن عامل مذہب ہے۔ اس سے مذہب کو تو کچھ زندگی مل گئی، لیکن عقلیات کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور بالآخر مذہب بھی ختم ہوگیا۔ جیسے ہندومت ختم ہوگیا یا دیگر پرانے مذاہب ختم ہوگئے۔ متکلمین نے دونوں کو ایک ساتھ جوڑا۔ متکلمین نے عقل کے رشتے کو خالص دینی معاملات سے برقرار رکھا، دونوں کے تقاضے نبھائے۔ اور دینی معاملات کی عقلی تعبیریں کر کے ان دونوں میں وہ توازن پیدا کیا کہ مسلمانوں میں بیک وقت عقلی سلسلے بھی جاری رہے اور نقلی سلسلے بھی، یعنی نقل کی بنیاد پر جو سلسلے تھے، وہ بھی جاری رہے۔ اور ان دونوں میں کوئی تعارض پیدا نہیں ہوا۔ یہ نیا علم یعنی علم کلام علم حدیث کی دین ہے۔

فقہ مسلمانوں کے عملی رویہ کی تشکیل کرتا ہے، اور بتاتا ہے کہ مسلمانوں کی عملی زندگی انفرادی اور اجتماعی طور پر کیسی ہونی چاہئے۔ روزمرہ کے معاملات کو شریعت کے مطابق کیسے ڈھالا جائے۔ ایک مثالی اور متوازن اسلامی زندگی کیسے ہوتی ہے؟ اس کو فقہ کہتے ہیں۔ فقہ اور حدیث کو دو الگ الگ چیزیں مت سمجھئے گا۔ یہ بڑی کم علمی کی بات ہے۔ فقہ سے مراد یہ ہے کہ قرآن وسنت کی ان نصوص کو جو انسانوں کے عملی رویہّ کی تشکیل سے عبارت ہیں ان کو گہرائی کے ساتھ سمجھا جائے۔ اور گہرائی کے ساتھ سمجھنے کے بعد ان میں جو ہدایت اور رہنمائی دی گئی ہے اس کو مختلف صورت ہائے احوال پر منطبق کیا جائے۔ اس عمل کا نام فقہ ہے اور اس کے نتیجے میں جو ہدایات مرتب ہوئیں ان سے ایک نیا فن وجود میں آ گیا۔ لیکن اس فن کی بنیاد علم حدیث پر ہے۔ اور علم حدیث سے ہی یہ چیزیں سامنے آئیں۔

احادیث میں نماز کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ احادیث میں زکوٰۃ کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں۔ احادیث میں حج کے احکام بیان ہوئے ہیں، مناسک کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ احادیث میں خرید وفروخت کے احکام، نکاح وطلاق کے احکام اور وراثت و وصیت کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ یہ سارے احکام وہ ہیں جن سے وہ بنیادیں تشکیل پاتی ہیں جن کی عملی تفصیلات فقہائے اسلام اور محدثین کرام نے مرتب فرمائیں۔ اگر علم حدیث نہ ہوتا تو علم فقہ وجود میں نہ آتا۔

جو ابتدائی فقہا ہیں اور جن سے فقہ وجود میں آئی ہے وہ سب کے سب اصلاً محدثین تھے۔ امام مالکؒ، اصل میں محدث تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ اصلاً محدث تھے۔ امام شافعیؒ اصلاً محدث تھے۔ امام محمد بن حسن شیبانی اور امام ابو یوسف اصلاً محدث تھے۔ امام اوزاعی محدث تھے۔ امام ابو جعفر طبری محدث تھے، امام سفیان ثوری اور سفیان بن عیینہ محدث تھے۔ یہ سب وہ لوگ ہیں جن سے فقہی مسالک وجود میں آئے۔ اس لئے کہ انہوں نے احادیث پر اس نقطۂ نظر سے غور کیا کہ اس سے کون سے احکام نکلتے ہیں؟ جن محدثین نے اس نقطۂ نظر سے احادیث پر غور کیا کہ ان سے عقائد کون سے نکلتے ہیں۔ یعنی حسن بصری اور اس طرح کے اور بزرگ، ان کے غور وفکر کے عمل سے علم کلام مرتب ہوا، اور جن بزرگوں نے اس نقطۂ نظر سے غور کیا کہ احادیث سے احکام کون سے نکلتے ہیں۔ ان کی کاوشوں کے نتیجے میں فقہ مرتب ہوا۔

'اصول فقہ' یعنی وہ بنیادی اصول اور وہ بنیادی رہنمائی جس سے کام لے کر روزمرہ کے

فقہی احکام معلوم کئے جاسکتے ہیں یہ سارے کا سارا علم حدیث کی دَین ہے۔ علم حدیث اور سنت میں وہ احکام بیان ہوئے ہیں جن سے اصول فقہ کا علم نکلا ہے۔ اس سے پہلے میں نے عرض کیا تھا کہ مسلمانوں کی عبقریت اور Guenius کے دو عظیم الشان نمونے ہیں۔ ایک علم حدیث اور دوسرا علم اصول فقہ۔

علم حدیث اس نبوغ اور عبقریت کا نمونہ ہے کا جس میں معلومات اور معاملات کی وسعت پر دار و مدار ہو۔ اور اصول فقہ اس نبوغ اور عبقریت کا نمونہ ہے جس میں تخلیقی صلاحیتیں اور نئے نئے افکار و نظریات کو سامنے لانے پر معاملات کی بنیاد ہو۔ علم اصول فقہ نے علم کلام سے کہیں زیادہ عقل و نقل کے درمیان تطبیق پیدا کی ہے اور عقل اور نقل کے درمیان توازن پیدا کیا ہے۔ اس توازن و اعتدال اور جامعیت کی مثال دنیا کی کسی قوم کے مذہب یا علمی روایت میں نہیں ملتی۔ اور یہ بات آپ بلاخوف تردید نوٹ کرلیں کہ دنیا کی کسی قوم کے پاس نہ آج ایسا علم ہے، نہ ماضی میں تھا اور نہ ماضی بعید میں کوئی ایسا علم تھا۔ جس کو اصول فقہ کے مقابلہ میں رکھا جاسکے۔ جو بیک وقت خالص دینی علم بھی ہو، اس اعتبار سے اس کی اساس قرآن پاک اور سنت رسول پر ہو۔ اور بیک وقت اس کی بنیاد خالص عقلی اور تجرباتی معاملات پر بھی ہو جس کو عقل کا بڑے سے بڑا پرستار بھی عقلی بنیادوں پر غلط قرار نہ دے سکے۔ یہ مستحکم بنیادیں اصول فقہ کو علم حدیث سے حاصل ہوئیں۔ اس کی مثالیں میں دوں گا تو بات بڑی لمبی ہوجائے گی اس لئے میں صرف اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

دنیا میں اسلام سے پہلے بھی تاریخ کا تصور موجود تھا۔ اسلام سے پہلے تاریخ کی بہت سی کتابیں موجود تھیں۔ ایسی کئی کتابیں ملتی ہیں جن میں قوموں کی تاریخ بیان ہوئی ہے۔ یونانیوں میں بھی موجود تھیں ہندوستانیوں میں بھی موجود تھیں اور رومیوں میں بھی موجود تھیں۔ ہیروڈوٹس اسلام سے پہلے کا مورخ ہے۔ اس کی بیان کی ہوئی معلومات آج بھی دستیاب ہیں۔ اس کی Authentecity کتنی ہے، وہ کتنا مستند ہے یہ ایک دوسری بات ہے۔ لیکن اسلام سے پہلے کی تاریخ اور تمدنی معلومات کا ایک ذخیرہ بہرحال موجود ہے۔ ہندوؤں میں بھی اسلام سے پہلے کی کتابیں موجود ہیں جن میں کچھ تاریخی نوعیت کی معلومات بھی شامل ہیں۔ لیکن وہ چیز جس کو اسلام سے پہلے تاریخ کہا جاتا تھا، وہ کیا تھی؟ آج دنیا کا کوئی مورخ اسلام کے اس احسان کو

مانتا ہے یا نہیں مانتا۔ مانتا ہے تو بلا شبہ عدل وانصاف کی بات کرتا ہے اور نہیں مانتا تو بڑا احسان فراموش یا کم از کم ناواقف ضرور ہے۔ لیکن تاریخ کا صحیح تصور اور تاریخ کا وہ صحیح شعور جس طریقے سے مسلمانوں کو اور ان سے دنیا کو حاصل ہوا اس کا اولین مصدر و ماخذ علم حدیث ہے۔

اسلام سے پہلے تاریخ کا جو تصور تھا وہ یہ تھا کہ کسی قوم میں جو قصے کہانیاں مشہور ہیں ان کو مدون کر لیا جائے، جو رطب و یابس دستیاب ہے اس کو حقیقت مان لیا جائے۔ گویا جب تاریخ لکھنے بیٹھو تو عوام میں رائج قصے جمع کر لو، وہ سارے کے سارے بیان کر دو، اور نقل کر کے جمع کر دو۔ کوئی یہ پوچھنے والا نہیں تھا کہ ہیروڈوٹس صاحب! آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ماخذ کیا ہے؟ یہ چیز آپ نے صحیح لکھی ہے کہ غلط لکھی ہے؟ کس سے پوچھ کر، کس سے سن کر یا کن مآخذ کی مدد سے لکھی تھی؟ آپ سے کس نے بیان کیا؟ آپ وہاں موقع پر موجود تھے کہ نہیں تھے؟ آپ اس کے چشم دید گواہ تھے کہ نہیں تھے؟ اس وقت نہ یہ سوالات تھے اور نہ ایسا کوئی تصور تاریخ کے بارے میں موجود تھا۔

علم حدیث نے سب سے پہلے لوگوں کو یہ تصور دیا کہ جب کوئی واقعہ بیان کرو تو پہلے خود یہ اطمنان کرو اور پھر دوسروں کو یہ اطمنان دلاؤ کہ تم اس واقعہ کے عینی شاہد ہو۔ اگر عینی شاہد نہیں ہو تو جو عینی شاہد تھا اس کا حوالہ دو کہ مجھ سے فلاں شخص نے بیان کیا جو عینی شاہد تھا۔ پھر اس بات کا یقین دلاؤ کہ تم جس واقعہ کو بیان کر رہے ہو اس کو بیان کرنے میں تمہارا کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے؟ اگر اس واقعہ کو بیان کرنے میں تمہارا کوئی ذاتی مفاد ہے تو ہم تمہارے بیان کو قبول کرنے میں تامل کریں گے۔ اس لئے کہ ذاتی مفاد کی بنیاد پر آدمی بہت سی باتوں کو غلط طور پر نمایاں کر سکتا ہے اور صحیح باتوں کو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر دبا سکتا ہے۔

یہ تصورات سب سے پہلے مسلمانوں نے دیئے، سب سے پہلے اسلامی علوم وفنون میں یہ اصول پیدا ہوئے اور مسلمان مورخین نے ان کو مسلمانوں کی تاریخ پر منطبق کر کے دکھایا۔ انہوں نے مسلمانوں کی تاریخ ان اصولوں کی بنیاد پر مرتب کردی اور تاریخ نویسی کے اصول مقرر کر دیئے۔ یہ دنیا کو علم حدیث کی ایک ایسی بڑی دین ہے جس کے احسان سے دنیا کبھی بری الذمہ نہیں ہو سکتی۔ گزشتہ تین چار سو سالوں کے دوران مغرب میں بڑے بڑے فلسفی پیدا ہوئے، جو فلسفہ تاریخ کے مورخین مانے جاتے ہیں، جن کی کتابیں دنیا بھر میں پڑھی جاتی اور احترام کی نظر

سے دیکھی جاتی ہیں۔لیکن آج ان مورخین کو جو اعتبار حاصل ہوا ہے اس کی بنیاد کیا ہے؟ یہ اصول تاریخ ان حضرات کے ہاں کہاں سے آئے؟

مسلمانوں میں سب سے پہلے مورخین ابن خلدون اور علامہ سخاوی ہیں جنہوں نے اصول تاریخ نویسی اور فلسفہ تاریخ کو نئے انداز سے مرتب کیا۔ علامہ سخاوی اصلاً علم حدیث کے امام تھے ان کی ایک تصنیف ہے، جو فلسفہ تاریخ اسلامی کی ایک بڑی نمایاں کتاب ہے 'الاعلان بالتوبیخ لمن ذم أهل التاريخ '۔اس میں انہوں نے مسلمانوں کی تاریخ نویسی اور Historiography کے اصول بیان کئے ہیں جو سارے کے سارے علم حدیث سے ماخوذ ہیں۔

اگر آپ انگریزی میں پڑھنا چاہیں تو ایک چھوٹی سی کتاب میں ان مباحث کی تلخیص ہے Philosophical Interpretation of History۔ لاہور میں ایک بزرگ تھے پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم، یہ کتاب انہوں نے لکھی ہے۔مختصر کتاب ہے۔اس سے ذرا زیادہ تفصیل دیکھنا چاہیں تو ایک کتاب اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے شائع کی تھی Quranic Concept of History اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن پاک کی تعلیم کے نتیجے میں اور احادیث مبارکہ کی وضاحت کے نتیجہ میں جو تصور تاریخ پیدا ہوا، وہ کیا ہے؟ اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ علم حدیث کے علم تاریخ پر کتنے احسانات ہیں۔مزید اختصار درکار ہو تو مولانا شبلی نعمانی کی جو سیرت النبی ہے اس کی جلد اول کے مقدمے میں شبلی نے اس پر بحث کی ہے، وہ آپ پڑھ لیں تین چار صفحات کی بحث ہے۔اس میں اس بات کا خلاصہ آپ کو مل جائے گا۔ وہ ضرور پڑھ لیجئے گا۔سیرت النبیؐ،شبلی نعمانی، جلد اول،مقدمہ۔

اصول دعوت اور اسلوب دعوت ایک اہم موضوع ہے۔مسلمان اہل علم نے اس پر بیسویں صدی میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔یعنی یہ مباحث کہ دعوت کا اصول کیا ہے؟ جب دوسروں کو دعوت دی جائے تو کیسے دی جائے؟ دوسروں تک اسلام کا پیغام پہنچایا جائے تو کیسے پہنچایا جائے؟ بعد میں یہ پوری امت مسلمہ کا ایک انفرادی رویہ اور ایک طرز عمل بن گیا کہ وہ ہر جگہ اسلام کو لے کر گئے۔انہیں کار دعوت کے اصول اور اس باب میں جو رہنمائی ملی وہ احادیث سے ملی۔

تزکیہ و احسان یعنی انسان کو اندر سے کیسے پاکیزہ کیا جائے؟ انسان کے اخلاق کو اندر

سے کیسے سدھارا جائے؟ یہ مسلمانوں میں ایک بہت بڑا فن ہے۔ اس پر بہت سی کتابیں لکھی گئی۔ بعض کتابیں اچھی ہیں بعض اچھی نہیں ہیں۔ بعض کتابوں میں ایسا مواد بھی ہے جو اسلامی نقطۂ نظر سے نظر ثانی کا محتاج ہے۔ لیکن بہت سی کتابیں ایسی ہیں جن میں بڑی صحیح باتیں کہی گئی ہیں اور احادیث اور سنت کی تعبیر اس انداز سے کی گئی ہے کہ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انسانی مزاج اور اندر کی اصلاح کیسے ہوتی ہے۔ اخلاق و کردار سازی کیسے ہوتی ہے؟ اس کو علم تزکیہ اور احسان کہتے ہیں۔ یہ سارے کا سارا علم حدیث سے عبارت ہے۔ اور اس کی بنیاد ان احادیث پر ہے جن کو رقاق کہتے ہیں، جس کا میں نے کل تذکرہ کیا تھا۔ یعنی اندر سے دل کو کیسے نرم کیا جائے۔ ان احادیث میں جو رہنمائی ملتی ہے اس کو علمی انداز سے کیسے مرتب کیا جائے۔ اس سے ایک نیا فن پیدا ہوا۔

علم سیَر یعنی اسلام کا بین الاقوامی قانون، یہ سارا کا سارا علم حدیث کی دین ہے۔ شروع میں علم حدیث کے وہ علماء اور محدثین جن کو بین الاقوامی تعلقات اور قانون صلح و جنگ سے زیادہ دلچسپی تھی وہ احادیث کے ان حصوں کو زیادہ محفوظ رکھتے تھے اور ان احادیث کو زیادہ پڑھتے اور پڑھاتے تھے جن سے بین الاقوامی قانون پر روشنی پڑتی ہو۔ اس طرح مغازی اور غزوات رسولؐ پر الگ سے کتابیں وجود میں آنی شروع ہوئیں تو علم مغازی وجود میں آیا۔ علم مغازی وجود میں آیا تو علم غزوات میں جو احکام ہیں وہ وجود میں آئے تو قانون جنگ وجود میں آنا شروع ہو گیا اور دوسری صدی ہجری شروع ہونے سے پہلے پہلے بین الاقوامی قانون کے موضوع پر سیر کے نام سے ایک نیا فن وجود میں آ گیا جس کو علم سیَر کہتے ہیں جس کی بنیاد اصلاً احادیث رسول پر ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے بارے میں فرمایا تھا اور بجا فرمایا تھا کہ انا افصح العرب، میں عرب میں سب سے فصیح انسان ہوں۔ اللہ نے دنیا کی سب سے فصیح و بلیغ قوم کو قرآن کے تحمل کے لئے منتخب فرمایا۔ اور جو رسول بھیجا، اسے ایسے شہر میں بھیجا جو فصاحت و بلاغت میں اپنی جگہ معیار سمجھا جاتا تھا۔ جہاں کی زبان ٹکسالی سمجھی جاتی تھی، یعنی مکہ مکرمہ میں، اس قبیلہ میں بھیجا جس قبیلے کی زبان بڑی ٹکسالی سمجھی جاتی تھی یعنی قریش۔ اور قریش میں فصیح ترین انسان اللہ نے رسول اللہ ﷺ کو بنایا۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ کے ارشادات ماخذ ہیں فصاحت و بلاغت کے اصولوں کا۔ جن مفسرین اور محدثین نے قرآن پاک کے ساتھ ساتھ سنت اور حدیث کے ذخائر کا فصاحت و بلاغت اور ادبیت کے نقطۂ نظر سے جائزہ لیا۔ ان کی کاوشوں کے نتیجہ میں علم بلاغت کے قواعد

مرتب ہونے شروع ہوئے، اور یوں بلاغت کے نام سے ایک نیا فن وجود میں آنا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ ایک بڑا فن معرض وجود میں آ گیا۔

یہ وہ علوم وفنون ہیں جو براہ راست علم حدیث کی تاثیر کے نتیجہ میں مسلمانوں کے ہاں وجود میں آئے۔ لیکن علم حدیث کی اہمیت ان سے بھی بڑھ کر ہے۔ یہ علوم وفنون وجود میں آئے اور آج بھی ان میں وسعت آتی جارہی ہے۔ ہر آنے والا دن علم حدیث میں ایک نیا میدان ہمارے سامنے لے کر آتا ہے جس پر آخری خطبہ میں گفتگو ہوگی۔ ہر نیا آنے والا استاذ علم حدیث کا نئے انداز سے مطالعہ کرتا ہے اور نیا آنے والا ہر طالب علم نئے انداز سے مطالعہ کرتا ہے۔ علم حدیث کے نئے نئے گوشے روز بروز ہمارے سامنے آتے چلے جارہے ہیں۔ لیکن علم حدیث کی جو دیرپا اہمیت ہے جو دائمی، ازلی اور ابدی اہمیت ہے، وہ ہے بطور ماخذ تشریع اور ماخذ قانون کے، جس پر تفصیل سے گفتگو آگے چل کر ہوگی۔

قرآن وسنت کا باہمی تعلق

ماخذ قانون اور ماخذ شریعت ہونے کی حیثیت سے قرآن اور سنت دونوں میں اتنا گہرا باہمی تعلق ہے کہ وہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ قرآن مجید بنیاد ہے، سنت رسول اس بنیاد پر تعمیر کیا جانے والا ڈھانچہ ہے۔ قرآن مجید تنا ہے اور سنت رسول اس تنے سے نکلنے والی شاخیں ہیں۔ قرآن مجید ایک ایسا مرکز نور ہے جس سے شعاعیں نکل رہی ہیں اور وہ شعاعیں سنت رسول ہیں۔ قرآن مجید میں بنیادی اصول اور کلیات بیان کئے گئے ہیں۔ فقہی احکام کے اصول وکلیات جہاں جہاں بیان ہوئے ہیں جزئیات کے پردے میں بیان ہوئے ہیں۔ ان کلیات کی عملی تطبیق احادیث کے ذریعے ہوئی۔ اس عملی تطبیق کے نتیجہ میں مزید احکام نکلے، فقہائے اسلام نے ان پر غور کیا۔ غور کرنے سے مزید احکام نکلتے چلے گئے۔ جب دو قسم کے احکام کو سامنے رکھا گیا تو تیسری قسم کے احکام سامنے آ گئے، تیسرے اور دوسرے حکم کو سامنے رکھا تو چوتھا حکم سامنے آیا، چوتھے اور تیسرے کو سامنے رکھا تو پانچواں حکم سامنے آ گیا۔ یہ سلسلہ آج تک چلتا چلا جارہا ہے۔ اور ہر مرحلہ پر ان میں سے ہر حکم کی براہ راست وابستگی احادیث رسول اور سنت رسول سے ہے۔ کوئی حکم اور کوئی فقہی مسلک اس وقت تک قابل قبول نہیں ہے جب تک اس کو براہ

راست حدیث رسول کی سند حاصل نہ ہو۔ گویا احادیث رسول نے فقہی ارتقا اور قوانین فقہ کی توسیع کے عمل کو اس طرح سے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے جس طرح گھوڑے کی لگام سوار کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ انسانی تصورات کو پھیلنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ انسان کا ذہن ہر وقت کام کرتا رہتا ہے۔ انسان کا ذہن کسی افق کا پابند نہیں ہوتا۔ آپ رات کو آنکھیں بند کر کے لیٹیں اور سوچیں تو لگے گا کہ پوری کائنات کا افق آپ کے سامنے کھلا ہوا ہے۔ اس افق میں نہ زمین ہے نہ آسمان ہے۔ اس کی نہ حدود وثغور ہیں، نہ کوئی ابتداء نہ انتہا، نہ کچھ اور ہے۔ یہ ایک لامتناہی وسعت ہے جو آپ کے سامنے ہے۔ یہی وسعت انسان کی عقل میں ہوتی ہے۔ اگر اس لامتناہی وسعت کو کسی حد اور ضابطہ کا کا پابند نہ کیا جائے تو انسان کبھی مشرق کی طرف جائے گا کبھی مغرب کی طرف جائے گا اور اس کے سامنے کوئی راستہ متعین نہیں ہوگا۔ بار بار ایک ہی سفر کو طے کرے گا۔ اس لئے اس کی لگام کو کس کے رکھنا ضروری ہے۔ اس کو حدود کا پابند کر کے رکھنا ضروری ہے۔ یہ حدود کی پابندی اور یہ لگام کسنے کا عمل حدیث رسول ﷺ نے کیا ہے۔

قرآن مجید کے عمومی کلیات یا ہدایات وہ ہیں کہ اگر حدیث وسنت کا حوالہ ختم کر دیا جائے تو ان کی اچھی تعبیر بھی ہوسکتی ہے اور بُری تعبیر بھی ہوسکتی ہے۔ قرآن مجید میں خود ایک جگہ لکھا ہوا ہے 'یضلُّ به کثیراً ویهدی به کثیراً' کہ اللہ تعالیٰ اس قرآن کے ذریعے بہت سوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہت سوں کو ہدایت دیتا ہے۔ جو لوگ سنت اور حدیث سے ہٹ کر قرآن سے رہنمائی لینا چاہتے ہیں وہ گمراہ ہو جاتے ہیں اس لئے کہ قرآن مجید کی تعلیم ایک عمومی چیز ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں عدل کی تعلیم ہے۔ لیکن عدل سے کیا مراد ہے؟ عدل کیا چیز ہے؟ جب تک اس کو سنت کی شکل میں Concretise نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک آپ کا جو جی چاہے عدل کو معنی پہنا دیں۔

آج سے تقریباً ستر اسی سال پہلے برصغیر میں ایک صاحب پیدا ہوئے جنہوں نے کہا کہ قرآن مجید کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے حدیث اور سنت کی ضرورت نہیں ہے، چونکہ حدیث اور سنت میں بڑا اختلاف ہے اس لئے اس نے مسلمانوں میں فرقے پیدا کئے ہیں۔ ایک بزرگ اُن صاحب سے ملے اور ان سے کہا کہ یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ آپ مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر سنت اور حدیث کی وجہ سے اختلاف پیدا ہوا ہے تو قرآن کی بنیاد پر اتحاد ہو جائے گا۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ لیکن آپ ذرا یہ بتایئے کہ قرآن پاک میں نماز کا حکم ہے

'اقیموا الصلوٰۃ 'تو نماز آپ کیسے پڑھیں گے؟ اب تک تو ایک متفق علیہ شکل یہ رائج تھی کہ حدیث میں نماز پڑھنے کا جو طریقہ ہے اس طرح پڑھیں۔ لیکن یہ شکل آپ کے لئے قابل قبول نہیں اور اس کو آپ ختم کرنا چاہتے ہیں تو پھر نماز آپ کے طریقے سے پڑھی جائے یا ہر شخص اپنے دل پسند طریقے سے پڑھے؟ پہلے تو انہوں نے کہا کہ نہیں میں بتاؤں گا اقیموا الصلوٰۃ کا کیا مطلب ہے اور نماز کیسے پڑھی جائے۔ اس پر ان بزرگ نے ان منکر حدیث صاحب سے کہا کہ اگر رسول اللہ ﷺ کو یہ بتانے کا حق نہیں کہ نماز کیا ہے اور کیسے پڑھی جائے اور ان کے بتانے سے اختلاف ہوتا ہے تو پھر خود آپ کو کیا حق پہنچتا ہے؟ اور آپ کے بتانے سے اختلاف کیوں نہیں بڑھے گا؟ تھوڑی ردّ وقدح کے بعد ہی انہوں نے اپنا موقف بدلا اور کہنے لگے کہ نہیں ہر شخص اپنے ذوق کے مطابق پڑھے گا۔ اس پر ان بزرگ نے فرمایا کہ اس وقت تو مسلمانوں میں نماز پڑھنے کے تین یا چار طریقے ہوں گے، کوئی ناف کے اوپر ہاتھ باندھتا ہے کوئی نیچے باندھتا ہے، لیکن اُس وقت تو ایک ارب طریقے ہوں گے۔ کیونکہ ہر شخص اپنے طریقے سے پڑھے گا۔ تو جو چیز وحدت کا سبب بنی اس کو وحدت ہی کی خاطر آپ ختم کرنا چاہتے ہیں اس سے تو اتنا اختلاف پیدا ہو جائے گا جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

کہنا یہ ہے کہ قرآن مجید کی جو عمومی ہدایات اور احکام ہیں ان کی عملی تشکیل، اور یقینی تشکیل اور متفقہ اور متحدہ تشکیل اگر ہوتی ہے تو صرف اور صرف حدیث اور سنت کے ذریعے ہوتی ہے۔ کسی اور ذریعے سے نہیں ہو سکتی۔

دشمنان اسلام کی اور گمراہ فرقوں کی ہمیشہ یہ کاوش رہی ہے کہ حدیث اور سنت کا اور قرآن مجید کا تعلق منقطع کر دیا جائے۔ حضرت علی بن طالبؓ کے زمانے میں خوارج کے نام سے ایک فرقہ پیدا ہوا۔ جن میں اکثر وبیشتر بڑے کم علم لوگ تھے، وہ عموماً بدّو قسم کے لوگ تھے، زیادہ علم نہیں تھا۔ قرآن پاک تھوڑا بہت جانتے تھے۔ حدیث کے ذخائر سے واقف نہیں تھے۔ انہوں نے بعض معاملات میں حضرت علیؓ کے فیصلوں پر اعتراضات کئے اور ان کے خلاف جنگ شروع کردی۔ حضرت علیؓ نے خوارج سے گفتگو کرنے کے لئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو بھیجا، جو صحابہ کرام میں علم وفضل کے لحاظ سے بڑا اونچا مقام رکھتے تھے، اور قرآن فہمی میں 'ترجمان القرآن' کا لقب ان کو حاصل تھا، ان کو خوارج سے گفتگو کے لئے بھیجا اور یہ کہہ کے بھیجا کہ خوارج تم سے

قرآن پاک کے حوالہ سے بات کریں گے تو تم قرآن پاک کے حوالہ سے بات مت کرنا۔ اس لئے کہ قرآن پاک کے حکم میں تو متعدد تعبیریں ہوسکتی ہیں۔ لیکن جو صحیح تعبیر ہے وہ صرف حدیث اور سنت ہی سے ملے گی، اس لئے سنت کے حوالہ سے ان سے بات کرنا، قرآن پاک کے حوالہ سے بات مت کرنا۔ یہ ایک جلیل القدر صحابیؓ دوسرے جلیل القدر صحابیؓ کو مشورہ دے رہا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے جا کر خوارج سے سنت ہی کے حوالہ سے بات کی اور بہت سے خوارج کو ان کی گمراہیوں سے روکا اور نکالا۔ اس لئے علم حدیث کی اہمیت مسلمانوں کے لئے نہ صرف علوم وفنون کی خاطر بلکہ قرآن مجید کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے بھی ناگزیر ہے۔

اب میں اختصار کے ساتھ ایک چیز اور عرض کر دیتا ہوں۔ کل علم حدیث کے موضوعات کا تذکرہ ہوا تھا۔ علم حدیث کے آٹھ موضوعات مشہور ہیں، جن کی تفصیل بیان کرتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا کہ وہ کتابیں جو علم حدیث کے ان سارے موضوعات پر حاوی ہوں وہ کتابیں جامع کہلاتی ہیں جیسے امام ترمذیؒ کی کتاب جامع ترمذی کہلاتی ہے، یا صحیح بخاری الجامع الصحیح کہلاتی ہے۔

لیکن کچھ کتابیں ایسی ہیں کہ جن میں فقہی احادیث کو فقہی مسائل کی ترتیب سے بیان کیا گیا ہے۔ وہ کتب احادیث جن میں مسائل کی ترتیب فقہی ہو۔ مثلاً پہلے وضو کے احکام ہوں پھر نماز کے احکام ہوں، پھر زکوٰۃ کے احکام ہوں، پھر روزے کے احکام ہوں۔ اور صرف فقہی معاملات سے متعلق احادیث کو لیا گیا ہو، وہ کتابیں سُنَن کہلاتی ہیں۔ جیسے سنن ابوداؤد۔ سُنَن ابوداؤد کتب حدیث میں فقہی احکام کا ایک بہت بڑا مصدر وماخذ ہے۔

شروع میں جب احادیث مرتب ہورہی تھیں اور صحابہ کرامؓ احادیث کا سب سے بڑا ذخیرہ اور مصدر وماخذ تھے تو ہر تابعی کی کوشش ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ صحابہ کرام کے پاس حاضر ہوکر ان کی احادیث اپنے پاس نوٹ کرلے۔ اس لئے تابعین کے پاس احادیث کے جو مجموعے ہوتے تھے وہ صحابہ سے سنے ہوئے ہوتے تھے۔ مثلاً ایک صحابیؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے سنی ہوئی احادیث اپنے پاس نقل کرلیں۔ پھر حضرت عمرؓ سے سنی ہوئی احادیث نقل کرلیں۔ اس طرح شروع شروع میں جو مجموعے مرتب ہوئے وہ صحابہ کرام کی مرویات کے مجموعے تھے۔ لہٰذا جن کتابوں میں احادیث صحابہ کرام کی ترتیب سے جمع کی گئی ہوں ان کو مُسنَد کہا جاتا ہے۔ مسندوں میں سب سے بڑی کتاب مسند امام احمد ہے جس میں بہت بڑی تعداد میں

احادیث شامل ہیں۔ مسند امام احمدؒ کے ساتھ کچھ اور مسندیں بھی ہیں۔ مسند امام احمد تو ہے ہی، مسند ابوعوانہ ہے، مسند ابوداؤد طیالیسی ہے۔ یہ سب وہ ہیں جن میں صحابہ کی ترتیب سے الگ الگ احادیث جمع کی گئی ہیں۔ صحابہ کی ترتیب میں کیا اصول رکھا جائے اس باب میں بھی محدثین کے اپنے اپنے ذوق تھے۔ مثلاً امام احمد نے یہ ترتیب اس حساب سے رکھی ہے کہ اسلام میں ان صحابی کا درجہ کیا ہے؟ چنانچہ سب سے پہلے عشرہ مبشرہ کی احادیث درج کی ہیں۔ عشرہ مبشرہ میں سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ کی احادیث ہیں۔ پھر بقیہ عشرہ مبشرہ، اس کے بعد ترتیب کے ساتھ وہ دیگر صحابہ جوان کے خیال میں اسلام میں اونچا مقام رکھتے تھے۔ کچھ مسندوں کے مصنفین نے فیصلہ کیا کہ حروف تہجی کے اعتبار سے (Alphabetical) ترتیب رکھیں گے۔ کچھ مصنفین نے طے کیا کہ رشتہ داری کے حساب سے ترتیب رکھیں گے کہ جس صحابیؓ کی قرابت رسول اللہ ﷺ سے زیادہ ہوگی، اس کی احادیث پہلے ہوں گی۔ اس لحاظ سے بنی ہاشم کی احادیث پہلے ہوں گی۔ یہ ترتیب انہوں نے اپنی اپنی سہولت کی خاطر رکھی۔ لہٰذا مسند اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں احادیث کو صحابہ کی ترتیب سے بیان کیا گیا ہو۔

حدیث کی ایک کتاب ہوتی ہے 'مُعجَم' آپ نے سنا ہوگا معجم طبرانی کبیر، معجم طبرانی صغیر، معجم طبرانی اوسط، اور بھی کئی معجمیں ہیں۔ معجم سے مراد وہ احادیث ہیں جن میں مرتب کرنے والے محدث نے اپنے استاد کی ترتیب سے احادیث کو جمع کیا ہو۔ مثلاً آپ حدیث کے طالب علم ہیں، آپ نے دس اساتذہ سے احادیث پڑھیں اور ان کی حدیثیں آپ کے پاس ہیں۔ اب جب آپ ان کو کتابی شکل میں مرتب کریں گے تو آپ سب اساتذہ کی احادیث الگ الگ کر دیں گے، باب اول استاد الف کی احادیث ہیں، باب دوم استاد 'ب' کی احادیث ہیں۔ باب سوم استاد 'ج' کی احادیث ہیں۔ اس طرح کی ترتیب پر مشتمل احادیث کی کتاب کو معجم کہتے ہیں۔ اس میں بھی حروف تہجی کی ترتیب ہوسکتی ہے یا کوئی بھی ترتیب ہوسکتی ہے۔ معجم کے نام سے احادیث کی جو کتابیں ہیں ان میں طبرانی کی تین معجمیں زیادہ مشہور ہیں۔ پہلے امام طبرانی نے معجم کبیر لکھی۔ پھر امام صاحب کو خیال ہوا کہ یہ تو بہت بڑی ہے اس لئے اس کی تلخیص کی اور معجم صغیر لکھی، پھر خیال ہوا کہ یہ تو بہت چھوٹی رہ گئی تو ایک معجم اوسط لکھی جو درمیانے درجے کی ہے۔ یہ تینوں معجمیں چھپی ہوئی موجود ہیں اور دستیاب ہیں۔

کچھ کتابیں ایسی ہیں کہ جن کے مصنفین نے یہ چاہا کہ صرف ان احادیث کو یکجا کریں جو تمام محدثین کے نزدیک صحیح ہوں۔ اور جن میں روایتی اعتبار سے کوئی کمی بیشی نہ ہو۔ اس پر ہم آگے چل کر بحث کریں گے۔

اس طرح کی صحیح احادیث کو انہوں نے کتابی شکل میں مرتب کیا اس کا نام 'صحیح' رکھا گیا۔ امام بخاری کی کتاب کا نام 'صحیح' ہے، صحیح مسلم 'صحیح' کہلاتی ہے، صحیح ابن حِبّان 'صحیح' کہلاتی ہے، صحیح ابن خُزیمہ صحیح کہلاتی ہے۔ یہ وہ کتابیں ہیں جو الصحیح کے نام سے مشہور ہیں۔ امام بخاری کی کتاب الجامع بھی ہے اس میں آٹھوں ابواب ہیں۔ الصحیح بھی ہے کیونکہ انہوں نے ساری احادیث صحیح بیان کی ہیں اور اس میں غیر صحیح احادیث کو بیان نہیں کیا ہے۔

صحیح سے مراد یہ نہ سمجھئے گا کہ اس کا متضاد غلط ہے اور جو صحیح ہے وہ صحیح ہے باقی غلط ہیں۔ نہیں غلط یہاں مراد نہیں ہے۔ صحیح ایک اصطلاح ہے جس کا ایک خاص مفہوم ہے۔ اس پر آگے چل کر بات کریں گے۔ جو صحیح نہیں ہے وہ لازماً غلط نہیں ہے، غلط بھی ہوسکتا ہے، غیر غلط بھی ہوسکتا ہے۔

کچھ احادیث کی کتابیں ایسی ہیں جن کو مُستَدرَک کہا جاتا ہے۔ **مُستَدرَک** سے مراد وہ حدیثیں ہیں کہ جن میں بعد میں آنے والے کسی محدث نے کسی سابقہ محدث کی شرائط کو سامنے رکھ کر احادیث کا جائزہ لیا ہو اور ایسی احادیث جو سابقہ محدث سے رہ گئی ہوں ان کو ایک کتابی شکل میں مرتب کر دیا ہو۔ مثال کے طور پر امام بخاری کی الصحیح ہے، امام مسلم کی الصحیح ہے، ان دونوں حضرات نے یہ طے کیا کہ ہم اپنی کتاب میں صرف وہ احادیث جمع کریں گے جن کی پوری سند رسول اللہ ﷺ تک براہ راست پہنچتی ہو، جس کے درمیان میں کوئی خلا نہ ہو، جتنے راوی ہوں وہ سارے کے سارے اپنے حافظہ، عدالت اور اخلاقی پیمانہ کے معیار پر سو فیصد پورے اترتے ہوں۔ ہم اس میں کوئی ایسی حدیث بیان نہیں کریں گے جو مشہور احادیث اور سنتِ متواترہ سے متعارض ہو۔ اس طرح کی کچھ اور شرائط انہوں نے اپنے پیش نظر رکھیں۔ امام بخاری کی شرائط میں ایک اضافہ یہ بھی تھا کہ صرف اس راوی کی حدیث لیں گے جس کی اپنے استاد سے ملاقات باقاعدہ ثابت ہو۔ 'ثبوتِ لقاء' یعنی ملاقات کے ثبوت کی شرط رکھی۔ امام مسلم نے لکھا کہ ثبوت لقاء ضروری نہیں ہے امکان لقاء کافی ہے۔ یعنی اگر ایک محدث کسی ایسے محدث سے حدیث بیان

کررہے ہیں جو اس زمانے میں موجود تھے اور ان کے معاصر تھے اور اسی جگہ تھے اور اس کا امکان موجود ہے کہ ان کی آپس میں ملاقات ہوئی ہو، لیکن ان کی یہ ملاقات ہمارے علم میں نہیں آئی، تو میں ان کی حدیث کو تسلیم کرلوں گا کہ وہ صحیح حدیث ہے۔ اس لئے کہ وہ خود اخلاق و کردار کے اتنے اونچے معیار پر ہیں کہ ان کی روایت کو قبول نہ کرنا نامناسب ہے۔

مثلاً امام مالکؒ روایت کرتے ہیں امام زہری سے۔ امام مالکؒ اتنے اونچے درجہ کے انسان ہیں کہ مجھے یہ تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں کہ امام مالکؒ کی امام زہری سے ملاقات ہوئی تھی کہ نہیں ہوئی تھی۔ جب وہ روایت کرتے ہیں تو دونوں ایک زمانے میں تھے۔ امام زہری مدینہ بارہا تشریف لائے، حج کے لئے تشریف لائے، مدینہ منورہ میں ایک عرصہ رہے اس لئے اس کی تحقیق کئے بغیر کہ ان کی ملاقات واقعی ہوئی بھی تھی کہ نہیں ہوئی تھی میں ان کی روایت قبول کروں گا۔ اس لئے امام مسلم نے کہا کہ امکان لقاء کافی ہے ثبوت لقاء ضروری نہیں ہے۔ یہ تھوڑا سا فرق ہے امام مسلم اور امام بخاری کی شرائط اور معیارات میں۔ ان معیارات کی بنیاد پر دونوں نے اپنے اپنے مجموعے مرتب کئے۔ ان دونوں حضرات کے قریباً سو یا سوا سو سال بعد امام حاکم تشریف لائے۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ مختلف کتابوں میں بہت سی ایسی احادیث موجود ہیں جو ان دونوں محدثین کی شرائط پر پوری اترتی ہیں لیکن ان دونوں نے اپنی صحیح میں ان کا ذکر نہیں کیا۔ تو انہوں نے ایک نیا مجموعہ ان احادیث کا مرتب کیا جو مستدرک کہلاتا ہے۔ المستدرك على الصحيحين، لہٰذا مستدرک سے مراد وہ مجموعہ ہے جو کسی سابقہ محدث کی شرائط پر پوری اترنے والی احادیث کا بعد میں آنے والے محدث نے مرتب کیا ہو۔ جس کی شرائط پر ہوگی اس کی مستدرک کہلائے گی۔ صحیحین کی مستدرک، ابوداؤد کی مستدرک، ترمذی کی مستدرک، اس طرح مستدرک کے نام سے خاصی کتابیں موجود ہیں۔

ایک کتاب کہلاتی ہے 'مُستَخرَج'۔ اس کے لفظی معنی تو ہیں 'نکالی ہوئی'، لیکن 'مُستَخرَج' سے مراد وہ مجموعہ ہے جس میں بعد میں آنے والے کسی محدث نے کسی سابقہ مجموعہ کی احادیث کو نئی سند سے بیان کیا ہو۔ مثلاً موطا امام مالکؒ ہے۔ اس میں امام مالکؒ ایک حدیث بیان کرتے ہیں کہ 'حدثنا نافع عن ابن عمرؓ عن النبی علیه الصلوٰة والسلام' کہ میں نے امام نافع سے سنا، انہوں نے ابن عمر سے سنا اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا اور پھر حضورؐ نے یہ

بیان فرمایا۔ اب بعد میں آنے والا کوئی محدث یہی روایت کسی اور سند سے بیان کرے، روایت یہی ہو لیکن سند اور ہو تو گویا یہ سند زیادہ باوثوق ہو جائے گی۔ بات زیادہ قابل اعتماد ہو جائے گی کہ ایک سے زیادہ سندوں اور مختلف واسطوں سے ایک ہی بات آئی ہے تو بات زیادہ صحیح ہے۔ تو گویا پہلی کسی حدیث کو Reinforce کرنے کے لئے مستخرج کے نام سے کتابیں مرتب کی گئیں جو 'مُستَخرَج' کہلاتی ہیں۔

حدیث کی کتابوں کی بڑی بڑی اور مشہور قسمیں یہی ہیں۔ اور بھی کئی قسمیں ہیں جن کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں ہے ان میں سے ایک قسم جزء کہلاتی ہے۔ 'جُــــزءٗ' کے معنی ہیں حصہ، لیکن اصطلاح میں کسی ایک صحابیؓ کی احادیث، یا کسی ایک استاذ کی احادیث، یا کسی ایک موضوع پر پائی جانے والی احادیث کے مجموعوں کو جزء کہا جاتا ہے۔ امام بخاری کی کئی کتابیں 'جزء' کے نام سے موجود ہیں۔ بعض اور محدثین نے بھی کتابیں جزء کے نام سے لکھی ہیں مثلاً 'جزء حجۃ الوداع' جس میں حجۃ الوداع سے متعلق ساری احادیث یکجا کر دی گئی ہیں۔ اسی طرح کسی موضوع پر ساری احادیث ایک ہی جگہ پر جمع کی جائیں تو یہ مجموعہ بھی جزء کہلاتا ہے۔

ایک مجموعہ اربعین کا ہے۔ چالیس احادیث کا مجموعہ، بہت سے محدثین نے ایسے مجموعے مرتب کئے ہیں۔ اس لئے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو میری چالیس باتیں سن کر آگے دہرائے اس کے لئے بڑی بشارت ہے۔ اس بشارت کا مصداق بننے کے لئے محدثین نے چالیس احادیث کے مجموعے جمع کئے۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ یہ کام آپ بھی کر سکتی ہیں۔ اگر آپ یہ طے کریں کہ کسی ایک موضوع پر کتابوں کا جائزہ لے کر چالیس احادیث کا مجموعہ مرتب کر دیں تو آپ بھی اس حدیث کی مصداق ہو سکتی ہیں۔ مثلاً آپ یہ کر سکتی ہیں کہ ماں باپ کے حقوق پر چالیس احادیث، پڑوسیوں کے حقوق پر چالیس احادیث، طلب علم کے بارے میں چالیس احادیث، یا صفائی کی اہمیت پر چالیس احادیث جمع کر لیں، یا کوئی بھی دوسرا عنوان لے لیں اور اس پر چالیس احادیث جمع کریں، ترجمہ کریں، مختصر تشریح کریں اور چھپوا دیں یا کسی کو پڑھا دیں تو آپ اس حدیث کا مصداق بن سکتی ہیں۔ مختلف موضوعات پر اربعین کے نام سے چالیس احادیث کے سینکڑوں مجموعے ملتے ہیں۔ بہرحال یہ کتب احادیث کی بڑی بڑی قسمیں ہیں۔

محدثین کی اقسام

علم حدیث کے بارے میں آخری بات کہہ کے آج کی گفتگو ختم کرتا ہوں، علم حدیث سے جو لوگ وابستہ ہیں ان میں بڑی تعداد تو ہمارے اور آپ جیسے طالبان علم کی ہوتی ہے۔ جو طالب علم ہیں وہ تو کسی شمار قطار میں نہیں آتے، لیکن جن کا درجہ طالب علم سے ذرا آگے بڑھ کر ہے ان میں سب سے پہلا درجہ' مُسنِد ' کا ہوتا ہے۔مُسنِد کا مطلب ہے سند بیان کرنے والا، اَسنَدَ کا مطلب ہے سند بیان کی، اور یُسنِدُ سند بیان کرتا ہے۔ لہٰذا مسند یہاں اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ مسند کے معنی ہے سند بیان کرنے والا، یعنی حدیث کا وہ سنجیدہ طالب علم جو سند کے ساتھ حدیث کا مطالعہ کرے اور سند اور رجال اور متن ان سب چیزوں کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد آگے بیان کرے وہ مسند کہلاتا ہے۔ یہ سب سے پہلا درجہ ہے۔

اس کے بعد درجہ آتا ہے محدث کا، یعنی وہ شخص جس نے علم حدیث میں اتنی مہارت حاصل کرلی ہو کہ علوم حدیث کا بیشتر حصہ اس کے علم اور مطالعہ اور حافظہ میں محفوظ ہو، وہ محدث کہلاتا ہے۔

اس کے بعد حافظ کہلاتا ہے۔ ہمارے ہاں بعض علاقوں میں حافظ اندھے اور نابینا کو بھی کہتے ہیں اس حافظ سے وہ نابینا حافظ مراد نہیں ہے، یا قرآن کے حافظ کو بھی ہم لوگ حافظ کہتے ہیں۔ یہاں حافظ سے وہ بھی مراد نہیں ہے۔ بلکہ حافظ علم حدیث کی ایک اصطلاح ہے جو بڑے بڑے علماء بلکہ ائمہ حدیث کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ آپ کے اندازے کے لئے میں عرض کروں کہ ایک زمانہ میں حافظ ابن حجر عسقلانی گزرے ہیں جن سے بڑا محدث ان کے بعد سے کوئی پیدا نہیں ہوا، ان کو آج تک حافظ ابن حجرؒ کہا جاتا ہے۔ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ ایک زمانے تک حافظ ابن تیمیہ کہلاتے تھے۔ علامہ ابن قیمؒ آج بھی حافظ ابن قیم کہلاتے ہیں۔ اس درجے کے لوگ جیسے ابن تیمیہ، ابن قیم اور ابن حجر تھے وہ لوگ حافظ کہلاتے ہیں۔ وہ لوگ جو علم حدیث کے ذخائر کو اپنی یادداشت میں محفوظ کئے ہوئے ہوں اور علم حدیث کے علوم وفنون ان کی یادداشت میں محفوظ ہوں اور علم حدیث کا کوئی گوشہ ان کے مطالعہ سے خارج نہ ہو وہ اصطلاحاً حافظ کہلاتے ہیں۔

اس کے بعد درجہ آتا ہے' اَلحُجّہ ' کا۔ اَلحُجّـہ سے مختلف لوگوں نے مختلف معنی مراد لئے

ہیں۔ کسی نے کہا کہ جس کو تین لاکھ احادیث یاد ہوں وہ الحجۃ کہلاتا ہے۔ کسی نے کہا کہ جس کو پانچ لاکھ احادیث یاد ہوں وہ الحجۃ ہے۔ بہرحال احادیث کی یہ تعداد لاکھوں میں ہے۔ اس کے بعد درجہ آتا ہے الحاکم کا، الحاکم سے مراد وہ ہے جس کو ساری دستیاب احادیث زبانی یاد ہوں۔ جو بھی حدیث کا ذخیرہ اس وقت موجود ہے وہ سندوں کے ساتھ اس کو زبانی یاد ہو تو وہ الحاکم کہلاتا ہے۔

ان سب درجات کے بعد جو سب سے اونچا درجہ ہے وہ امیر المومنین فی الحدیث کہلاتا ہے۔ مسلمانوں نے جن بزرگوں کو امیر المومنین فی الحدیث کا لقب دیا ان میں حضرت سفیان ثوری، جن کا تذکرہ ہو چکا ہے، حضرت عبداللہ بن مبارکؒ، وہ اس درجہ کے انسان تھے کہ ایک ایک وقت میں لاکھوں انسان ان سے کسب فیض کے لئے آیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ان سے حدیث مبارک کی روایت سننے کے لئے لوگ جب جمع ہوئے تو دوران حدیث ان کو چھینک آ گئی۔ ان کے ہزاروں شاگردوں نے جب بیک آواز اور بیک وقت یرحمک اللہ کہا تو اس سے اتنا شور پیدا ہوا کہ لوگ یہ سمجھے کہ بغداد میں شاید فساد ہو گیا اور پولیس چوکس ہو گئی کہ کیا واقعہ ہوا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ عبداللہ بن مبارک کو چھینک آئی تھی تو ان کے شاگردوں نے یرحمک اللہ کہا تھا یہ اس کا شور ہے۔ عبداللہ بن مبارک کی محفل میں شرکت کرنے والے ایک شخص نے بیان کیا کہ عبداللہ بن مبارک جب حدیث بیان کر رہے تھے اور لوگ لکھ رہے تھے تو ایک ایک دوات کو آٹھ آٹھ دس دس آدمی استعمال کرتے تھے۔ اس کے باوجود دواتوں کی کل تعداد ۶۳ ہزار تھی۔ ایک مرتبہ ایسے ہی ایک موقع پر قرب وجوار کے ایک کنویں کا پانی خشک ہو گیا تھا کیونکہ اپنی دوات میں تازہ پانی ڈالنے والوں کی اتنی کثرت تھی کہ لوگوں کے بار بار پانی لینے سے کنواں خشک ہو گیا۔ دوات میں کتنا پانی پڑتا ہے؟ ایک چھوٹے برتن سے پچیس دواتیں تر ہو سکتی ہیں اور وہاں دوات میں پانی لینے والوں کی وجہ سے کنویں کا پانی خشک ہو گیا تھا۔ یہ عبداللہ بن مبارک بھی امیر المومنین فی الحدیث کہلاتے تھے۔

امام احمد بن حنبل بھی امیر المومنین فی الحدیث کہلاتے ہیں۔ امام بخاری اور مسلم ان دونوں کا لقب بھی امیر المومنین فی الحدیث تھا۔ اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ کس درجہ کے انسان کو امیر المومنین فی الحدیث کہا گیا۔ بعد میں امام مسلمؒ شاید آخری آدمی ہیں جن کو اس سلسلہ میں یہ لقب دیا گیا۔ ان کے بعد کسی اور محدث کو غالباً ایسا لقب نہیں ملا ہے سوائے حافظ ابن حجر عسقلانی

کے، جن کو علم حدیث کی تاریخ میں امیر المومنین فی الحدیث کا لقب دیا گیا ہو۔ حافظ ابن حجر عسقلانی کس درجہ کے انسان ہیں اس کا صرف اس بات سے اندازہ کیجئے کہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم ان دونوں میں زیادہ بہتر کتاب کونسی ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے موازنہ پر بھی بات کریں گے، لیکن اس نے یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں کی واضح اور بھاری اکثریت صحیح بخاری کو قرآن مجید کے بعد صحیح ترین کتاب سمجھتی ہے۔ اور مسلمانوں کی اکثریت یہی سمجھتی ہے، اغلبیت کا یہی نقطۂ نظر ہے۔ لیکن ابن خلدون نے یہ لکھا ہے کہ ابھی تک مسلمانوں نے صحیح بخاری کی شرح کا حق ادا نہیں کیا۔ جس شان کی یہ کتاب ہے اس شان کی کوئی شرح اس کتاب کی نہیں لکھی گئی اور یہ مسلمانوں کے ذمہ ابھی تک قرض ہے۔ یہ قرض ادا نہیں ہوا۔ جب حافظ ابن حجر نے بخاری کی شرح میں 'فتح الباری' لکھی تو بالاتفاق امت نے کہا کہ حافظ ابن حجر نے وہ حق ادا کر دیا جو امت کے ذمہ تھا۔

ایک حدیث ہے 'لا ھجرۃ بعد الفتح' فتح کے بعد یعنی فتح مکہ کے بعد ہجرت کی ضرورت نہیں رہی مفہوم یہ تھا۔ جب فتح الباری لکھی تو لوگوں نے کہا کہ لا ھجرۃ بعد الفتح یعنی اب شرح حدیث کے لئے گھر بار چھوڑنے کی ضرورت نہیں، اب فتح الباری لکھی جا چکی ہے۔

یہاں میں اپنی بات ختم کرتا ہوں۔ اگر کوئی سوال ہے تو اس کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

آپ نے چالیس احادیث کا مجموعہ لکھنے کی معلومات دی ہیں تو عربی متن درست طور پر سمجھ میں نہ آئے تو اس کا کیا حل ہو گا؟ جبکہ میں نے ایسا کرنے کی نیت کر لی ہے۔

کوئی بات نہیں آپ اردو زبان میں حدیث کی کوئی بھی کتاب لے لیں اور انگریزی میں کتاب لکھنی ہو تو انگریزی ترجمہ کے ساتھ کتابیں موجود ہیں، اردو میں کتاب لکھنی ہو تو اردو ترجمہ کے ساتھ کتابیں موجود ہیں۔ وہاں سے فوٹو کاپی لیں، وراس طرح چالیس احادیث کو جمع کریں اور نیچے جو تفسیر یا شرح لکھنی ہو وہ آپ لکھ دیں۔

کراچی میں ڈاکٹر بابر کے طرز عمل کے بارے میں وضاحت کریں کہ وہ تمام احادیث لیتے ہیں جن کا تعلق اخلاق سے ہو یا قرآن سے واضح موافقت رکھتی ہوں اور احکامات کو واضح کرتی ہوں۔

مجھے نہیں معلوم کہ ڈاکٹر بابر صاحب کون ہیں۔ میں ان سے واقف نہیں ہوں۔ وہ کیا فرماتے ہیں مجھے یہ بھی نہیں معلوم۔اس لئے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

Sir, with due respect please use easy language during the lecture

آپ چاہیں تو میں انگریزی میں بھی بات کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اردو میں انگریزی بولنا مجھے ذرا ناگوار ہوتا ہے۔اس لئے میں غیر ضروری طور پر اردو میں انگریزی الفاظ نہیں بولتا۔لیکن آئندہ کوشش کروں گا کہ آسان زبان میں گفتگو کروں۔

بُری سنت یا بری ریت نکالنا غلط ہے یہ سمجھائیے کہ کیا اچھی سنت جاری کرنا کیا سنت سے بڑھ کر یا بدعت سے مختلف ہے؟

پہلے یہ سمجھ لیں کہ بدعت کس کو کہتے ہیں؟ ہم جن معاملات میں شریعت کی رہنمائی میں کام کرتے ہیں وہ تین بنیادی چیزیں ہیں۔ایک میدان عقائد کا ہے۔ یہ وہ بنیادی اصول ہیں جن کا ماننا ہم سب کے لئے لازمی ہے، گویا جن چیزوں کا ماننا ضروری ہے ان کو عقائد کہتے ہیں۔ایک میدان عبادات کا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے نماز، روزہ، حج، تلاوت قرآن، نوافل، صدقہ وغیرہ۔ایک میدان معاملات کا ہے جسے ہر انسان انجام دیتا ہے چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ کھاتا پیتا ہے، سواری کرتا ہے، کپڑے پہنتا ہے، کاروبار کرتا ہے، تجارت کرتا ہے۔ جہاں تک بدعت کی بات ہے تو اس کا تعلق پہلی دو چیزوں سے ہے۔ معاملات یا عادات میں بدعت نہیں ہوتی۔اگر دین کے عقائد میں آج میں کوئی ایسا عقیدہ نکال لوں یا کوئی شخص نکال لے جس کی رسول اللہ ﷺ نے تعلیم نہیں دی، یا رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کے لئے جس چیز کی ضرورت نہیں ہے وہ بدعت ہے۔اللہ کی عبادت کرنے کا کوئی ایسا طریقہ اگر ایسا ایجاد کر لیا جائے جس کی حضورؐ نے تعلیم نہیں دی یا حضورؐ کے تعلیم دیئے ہوئے طریقے کے لئے جس چیز کی ضرورت نہ ہو وہ بدعت ہے۔

مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ نے الہدیٰ نہیں بنایا تھا۔اس طرح کے ڈیسک نہیں لگائے تھے جس طرح کہ آپ نے لگائے ہیں۔ایسا روسٹرم نہیں بنایا تھا۔لیکن ان میں سے کوئی چیز بدعت نہیں ہے۔اس لئے کہ یہ چیز دین کی تعلیم کے لئے آج کل کے ماحول اور زمانہ میں مفید یا ضروری ہے۔ جو چیز اسباب اور وسائل کی نوعیت کی ہو اور دین کی خدمت کے لئے ضروری یا مفید

ہو وہ بدعت نہیں ہے۔ جس کی ضرورت نہ ہو اور جس کی حضورؐ نے تعلیم نہ دی ہو۔ لیکن عبادات اور عقائد سے تعلق ہو وہ بدعت ہے۔ جو چیز حرام نہیں ہے وہ آپ کے لئے بالکل جائز ہے، آپ جتنی مرضی ہو اس میدان میں نئی نئی چیزیں لائیے۔ مکان بنانے کے نئے نئے طریقے ایجاد کریں۔ کاروبار کرنے کے نئے نئے طریقے ایجاد کریں۔ کپڑا اچھے سے اچھا بنوائیں، گھر کو اچھے سے اچھے طریقے سے ڈیکوریٹ کریں۔ اگر وہ حرام چیز نہیں ہے تو جائز ہے۔ گھر میں سونے کے برتن نہ رکھیں۔ اچھے سے اچھے برتن رکھنا جائز ہے۔ مردوں کے لئے ریشم نہ ہو تو اچھے سے اچھا کپڑا پہنیں، جائز ہے۔ مرد سونے چاندی کا زیور نہ پہنے، ریشم استعمال نہ کرے، کسی کے مذہبی شعائر کی پیروی نہ کرے، اس کے علاوہ ہر چیز جائز ہے۔ یعنی معاملات میں صرف حلال وحرام کی قید ہے۔ جو حرام ہے اس سے بچیں، باقی جتنا مرضی رزق حلال کمائیں، جو مرضی کریں۔

لیکن عقائد اور عبادات میں صرف اس حد تک رہیں جس حد تک رسول اللہ ﷺ اور شریعت نے اجازت دی ہے۔ اس سے آگے جانا وہاں جائز ہے جہاں جانا تعلیم پر مؤثر عمل درآمد اس کے لئے ناگزیر ہو جو حضورؐ نے سکھائی ہے۔ مثلاً حج کی تعلیم دی، حج فرض ہے۔ لیکن حج کے لئے اگر آپ جانا چاہیں تو آج ویزا لینا ناگزیر ہے، بغیر ویزا کے آپ حج پر نہیں جا سکتے۔ ویزا کے لئے پاسپورٹ ضروری ہے، پاسپورٹ کے لئے تصویر بنوانا ضروری ہے۔ تو یہ چیزیں عارضی طور پر ضروری ہو جائیں گی۔ اس لئے کہ ان چیزوں کے بغیر یہ عبادت ادا نہیں ہو سکتی۔ اگر ان سب کے بغیر حج کے حکم پر عمل ہو سکے تو پھر نہ پاسپورٹ بنوانا ضروری ہوگا نہ تصویر بنوانا نہ ویزا لینا۔ یہ چیزیں بدعت نہیں کہلائیں گی۔ اگرچہ خالص عبادات سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن بدعت نہیں ہیں اس لئے کہ عبادت کے لئے ناگزیر ہیں۔ عقائد اور عبادات سے متعلق جو چیز نہ ناگزیر ہو نہ حضورؐ نے اس کی تعلیم دی ہو، وہ بدعت ہے۔ مثلاً اگر میں آپ سے کہوں کہ کل سے آپ ساڑھے نو بجے کھڑے ہو کر چھ رکعات نماز پڑھیں جماعت کے ساتھ، اور روزانہ پہلی رکعت میں فلاں سورۃ پڑھیں، دوسری میں فلاں سورۃ پڑھیں اور سجدے میں یہ دعا کریں اور ایسا کرنا سب کے لئے لازمی ہے، تو یہ بدعت ہو جائے گی، یہ بدعت ہے اس لئے کہ مجھے ایسا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں آپ کو کسی خاص نماز کی تلقین کروں جو حضورؐ نے نہیں سکھائی۔ یا میں کہوں کہ چونکہ میں ۱۸ ستمبر کو پیدا ہوا تھا اس لئے آپ میری پیدائش کی خوشی میں اٹھارہ ستمبر کا روزہ رکھا کریں۔ یہ بدعت ہے

اس لئے کہ حضورؐ نے ایسے کسی روزے کی تعلیم نہیں دی۔

معاشرہ میں منکرین حدیث کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ عموماً لوگ ان سے متاثر نظر آتے ہیں، ایک سیدھا سادا انسان ان کے پروپیگنڈہ سے کس طرح بچ سکتا ہے؟

اس طرح بچ سکتا ہے کہ لوگوں کو علم حدیث کی تعلیم دی جائے جیسے کہ آپ یہ تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ لوگوں تک علم حدیث کے ذخائر اور رہنمائی پہنچائی جائے۔

اس اردو رسالہ کا نام بتادیں جس میں رسول اللہ ﷺ کے جوتے کا ذکر ہے؟

اس کا اردو نام مجھے یاد نہیں رہا۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ایک چھوٹے سے رسالہ میں اس کا ذکر ہے، جس کا عربی نام ہے، وہ اپنی کتابوں کا عربی نام رکھا کرتے تھے، لیکن رسالہ چھوٹا سا ہے، اردو میں ہے غالباً تیس چالیس صفحات کا ہے، آج سے تیس چالیس سال قبل چھپا تھا، اور کوئی پینتیس چالیس سال پہلے میں نے پڑھا تھا۔

چالیس احادیث مختلف موضوعات پر بھی جمع کی جاسکتی ہیں اور ایک موضوع پر بھی، آپ کو اختیار ہے۔ حدیث ہر جگہ رہنمائی کرتی ہے وہ سبجیکٹ وائز ہو یا الگ الگ ہو۔

جن لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ ہم سنت کو صحیح مانیں تو ہم اللہ کو نعوذ باللہ جھوٹا کہہ رہے ہیں، اللہ کہتا ہے کہ میں نے کھول کھول کر بیان کردیا ہے اور لوگ نماز کا طریقہ قرآن سے ثابت کرتے ہیں۔

ایک جملہ حضرت علیؓ نے ارشاد فرمایا تھا۔ جملہ بڑا زبردست ہے اور بہت سے معاملات پر صادق آتا ہے۔ جب خوارج نے آپ کے خلاف بغاوت کا فیصلہ کیا، تو یہ عنوان اختیار کیا کہ قرآن پاک میں آیا ہے کہ اِن الحکم الاّ للہ فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اللہ کو ہے اور آپ نے دو ثالث مقرر کردیئے، تو آپ نے قرآن پاک کی آیت کی خلاف ورزی کی۔ حضرت علی نے فرمایا کہ کلمة حق ارید بها الباطل، یہ جملہ تو حق ہے لیکن مراد اس سے باطل ہے۔ نیت اور عزائم برے ہیں جملہ درست ہے۔ تو یہ جملہ تو درست ہے کہ قرآن پاک میں ہر چیز کو کھول کھول کر بیان کردیا گیا ہے۔ لیکن نیت اس سے باطل ہے۔ قرآن پاک کوئی نظری یا مجرد یا Abstract کتاب نہیں ہے کہ کسی خلا میں نازل ہوئی ہو۔ بلکہ قرآن مجید ایک کتاب ہدایت اور ایک دستور العمل ہے جس کے ساتھ اس کا پڑھانے والا بھی بھیجا گیا تھا۔ خود قرآن مجید میں یہ لکھا ہوا ہے، کل اس پر بات کریں گے اور یہ بات واضح ہوجائے گی کہ یہ اعتراض بے بنیاد ہے۔

قرآن مجید میں ہے کہ لتبین للناس مانزل الیھم آپ پر یہ کتاب اس لئے نازل کی گئی ہے کہ آپ اس کتاب کو ان لوگوں کے سامنے بیان کریں جن کے لئے یہ اتاری گئی ہے۔ بیان سے کیا مراد ہے؟ اگر بیان انہی آیات کا دہرانا ہے تو یہ ایک بے کار عمل ہے جس کے لئے کسی نبی کو بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بیان سے مراد کیا تھی؟ کیا رسول اللہ ﷺ صرف آیات کے دہرانے پر اکتفا فرماتے تھے یا اس کی وضاحت بھی فرماتے تھے؟ اگر صرف آیات دہرانے پر اکتفا فرماتے تھے تو تحصیل حاصل ہے۔ سننے والا کسی سے بھی سن لے۔ میں آج قرآن پاک پڑھ لوں وہ کافی ہے، اور اگر آپ آیات قرآنی کی وضاحت بھی فرماتے تھے تو اسی وضاحت کا نام سنت ہے۔ پھر قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے کہ نبی کے چار کام ہیں۔ یتلوا علیھم ایاتہ، اس کی آیات تلاوت کرتے ہیں، ویزکیھم، لوگوں کا تزکیہ کرتے ہیں، گویا ان کو اندر سے ستھرا کرتے ہیں، ویعلمھم الکتاب اور کتاب کی تعلیم دیتے ہیں، والحکمۃ، اور دانائی سکھاتے ہیں تو یہ باقی تین چیزیں جو ہیں وہ ان میں شامل ہیں کہ نہیں۔ یتلوا علیھم ایاتہ میں تو وہ چیز شامل ہوگئی جو منکرین حدیث بتاتے ہیں۔ اگر قرآن بغیر حضور کی تشریح کے واضح تھا تو یتلوا علیھم ایاتہ کافی تھا، یہ یزکیھم حضور کیسے کرتے تھے؟ کوئی ہدایات دیتے تھے؟ زبان مبارک سے کچھ ارشاد فرماتے تھے یا خاموش رہتے تھے؟ تو وہ جو ہدایات تھیں وہ کیا ہیں؟ وہ قرآن پاک کے اس تزکیہ کی وضاحت ہیں یا نہیں ہیں؟ اور ویعلمھم الکتاب، تعلیم کتاب کیا ہے؟ وہ تلاوت آیات سے مختلف چیز ہے۔ اگر وہ تلاوت آیات سے کوئی مختلف چیز ہے تو یہ قرآن پاک کی تفسیر ہے جو حدیث میں آئی ہے، اور حکمت سکھاتے ہیں تو یہ تو کتاب کی تشریح سے بھی الگ چیز ہے۔ تو گویا خود قرآن پاک میں درجنوں آیات ہیں جن سے سنت کا شارح قرآن ہونا ثابت ہوتا ہے۔ جو لوگ ایک آیت لے کر باقی کا انکار کرتے ہیں وہ قرآن کے بھی منکر ہیں۔ وہ صرف سنت کے منکر نہیں، وہ قرآن کے بھی منکر ہیں۔ اور قرآن بھی ان کے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ غالباً قرآن کو توڑنا مروڑنا آسان ہے، سنت کو توڑنا مروڑنا دشوار ہے، اس لئے سنت کا انکار کرتے ہیں تاکہ پھر اسلام سے جان چھوٹ جائے۔

اگر ہم چالیس احادیث کا مجموعہ لکھنا یا یاد کرنا چاہیں تو کیا سند کے ساتھ یاد کرنا پڑیں گی؟

نہیں ضروری نہیں۔ آپ کی مرضی ہے اگر آپ بغیر سند کے بیان کریں۔ تو کسی مستند کتاب سے نقل کریں۔ غیر مستند کتاب سے نہ کریں اور سند بیان کرنا چاہیں تو آپ ضرور سند بیان کریں۔

حدیث کے متعلق جاننے کا بہت اچھا موقع ملا ہے۔ اللہ پاک آپ کو جزائے خیر دے، آمین۔ اس لیکچر کو لکھنے میں مشکل ہو رہی ہے۔ اگر آپ کی نظر میں کوئی خاص کتاب ہو جس کو ہم پڑھ سکیں یا کوئی اور طریقہ بتائیں جس سے ہم اصطلاحات کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔

اصل میں یہی طے ہوا تھا کہ یہ لیکچر ریکارڈ ہوں گے اور بعد میں ان کو ٹرانسکرائب کر کے میں ایڈٹ کروں گا تو شائع بھی کریں گے انشاءاللہ۔ اردو میں کوئی کتاب آپ دیکھنا چاہیں تو میں کل چیک کر کے بتادوں گا۔ میں اکثر اردو کتابیں نہیں پڑھتا ہوں۔ زیادہ تر عربی کتابیں دیکھتا ہوں۔ وہی بتا سکتا ہوں۔ لیکن اردو میں اس پر ایک تو ڈاکٹر خالد علوی صاحب کی بڑی اچھی کتاب ہے 'حفاظت حدیث'۔ اور ایک کتاب علوم حدیث پر ہے، ایک جلد چھپی ہے دوسری جلد چھپنے والی ہے۔ 'اصول حدیث پر بھی دو تین کتابیں موجود ہیں۔ ایک کتاب ہے نخبة الفكر، حافظ ابن حجر کی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ اور بھی کئی ہیں میں کل چیک کر کے آپ کو مزید کتابوں کے نام بتادوں گا۔

فقہی ترتیب سے کیا مراد ہے؟

فقہی ترتیب سے مراد ہے کہ فقہ کی کتابوں میں مضامین کو بیان کرنے کا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اس میں طہارت کے احکام ہوتے ہیں۔ پھر نماز کے احکام ہوتے ہیں۔ پھر زکوٰۃ اور روزہ کے احکام ہوتے ہیں۔ پھر حج کے احکام ہوتے ہیں۔ پھر نکاح وطلاق کے احکام ہوتے ہیں۔ پھر وراثت ووصیت، پھر معاملات اور خرید وفروخت لین دین، یہ ترتیب فقہ کی سب کتابوں میں رائج ہے اور امام مالکؒ کے زمانہ سے رائج ہے۔ احادیث کی وہ کتابیں جو اس ترتیب سے ہوں جن میں سب سے پہلے طہارت، نماز روزے کے احکام ہوں وہ سُنَن کہلاتی ہیں، جن میں یہ ترتیب نہ ہو وہ سنن نہیں کہلاتیں۔ مثلاً صحیح بخاری میں یہ ترتیب نہیں ہے۔ صحیح بخاری میں جو پہلا باب ہے وہ ہے باب كيف كان بدء الوحي على رسول ﷺ۔ کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی کا آغاز کیسے ہوا۔ سب سے پہلے یہ باب ہے پھر ایمان کا باب ہے پھر علم کا باب ہے۔ سنن ابن ماجہ میں پہلے علم کا باب ہے پھر بقیہ ابواب ہیں۔ ہر مصنف کی ترتیب الگ الگ ہے۔

اگر عورتوں کا محرم نہ ہو تو وہ گروپ کی شکل میں حج یا عمرہ کے لئے جا سکتی ہیں؟

یہ تو آپ کسی مفتی سے پوچھیں۔ لیکن فقہائے احناف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر کوئی

خاتون معمر ہیں اور اس کی حد انہوں نے پچاس سال مقرر کی ہے وہ بغیر محرم کے اس شرط کے ساتھ حج پر جاسکتی ہیں کہ ان کے ساتھ خواتین کی ایک بڑی تعداد ہو اور ان خواتین کے ساتھ ان کے محرم موجود ہوں۔ یہ تو فقہی جواب ہے۔ لیکن سعودی قانون کی رو سے بغیر محرم کے کوئی خاتون حج کے لئے نہیں جاسکتی اور ہمیں اس قانون کی پابندی کرنی چاہئے۔ میں تین سال حج کے انتظامات سے وابستہ رہا ہوں۔ میں نے حج کے انتظامات کو براہ راست دیکھا ہے۔ اس تجربہ کی روشنی میں میرا مشورہ یہ ہے کہ بغیر محرم کے کوئی خاتون کبھی حج پر نہ جائے۔ چاہے ان کی عمر کتنی ہی ہو اور شرعاً فقہا کسی نے اجازت دی ہو یا نہ دی ہو۔ بہتر یہی ہے کہ وہ محرم کے ساتھ جائے۔ میں نے ایسے ایسے واقعات اور مثالیں دیکھی ہیں کہ محرم نہ ہونے کی وجہ سے خواتین کو کتنی مشکلات پیش آئیں۔ یہ شریعت کا حکم ہے اور بہت رحمت وشفقت پر مبنی ہے۔ فقہائے اسلام میں سب نے لکھا ہے کہ اگر کسی خاتون کے ساتھ محرم نہ ہو یا اس کے پاس اتنے پیسے نہ ہوں کو وہ محرم کو بھی ساتھ لے جاسکے تو اس پر حج فرض ہی نہیں ہے۔ اپنے پاس پیسے موجود ہوں لیکن محرم موجود نہ ہو تو بھی خواتین پر حج فرض نہیں ہے۔ حج فرض تب ہی ہوتا ہے جب محرم بھی ہو اور اس کے لئے بھی پیسے ہوں۔ اپنے پاس پیسے ہوں اور محرم جانے کے لئے تیار ہو یا خاتون کے پاس پیسے ہوں کہ محرم کو لے جاسکے تبھی حج فرض ہوتا ہے۔ اس لئے اس اجازت سے فائدہ اٹھایئے اور اگر محرم ہو تو پھر جایئے اس کے بغیر بڑی مشکل پیش آتی ہے۔

سند کے ساتھ احادیث کو یاد کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ کوشش کی لیکن یاد نہیں رہتی۔

بڑی مشکل سے یاد ہوتی ہیں۔ میں نے بھی بہت کوشش کی لیکن مجھے بھی یاد نہیں ہوئیں۔ میں نے کسی زمانے میں کوشش کی تھی کہ صحیح بخاری مجھے سند کے ساتھ یاد ہو جائے لیکن یاد نہیں ہوئی۔ اللہ سے دعا کریں اپنے لئے بھی اور میرے لئے بھی، خدا کرے کہ ہم دونوں کو یاد ہو جائے۔

واٰخر دعوٰنا ان الحمدللہ رب العلمین۔

☆☆☆☆☆☆☆

تیسرا خطبہ

حدیث اور سنت بطور ماخذ شریعت

بدھ، 18 اکتوبر 2003

حدیث اور سنت

بطور ماخذ شریعت

اس سے پہلے دو نشستوں میں حدیث اور اس کی تعریف ، سنت اور اس کی تعریف ، حدیث اور اس کی اہمیت اور سنت اور اس کی ضرورت پر گفتگو کی گئی تھی۔ آج حدیث اور سنت پر اس اعتبار سے گفتگو کرنی ہے کہ یہ شریعت کا ماخذ ہے، قرآن مجید کی شارح ہے، وحی الٰہی کی تفسیر ہے۔ آج کی گفتگو کا مقصد یہ دیکھنا ہے کہ کلام ربانی کو سمجھنے میں اور شریعت کے احکام کی تفصیل بیان کرنے میں سنت اور حدیث کی اہمیت کیا ہے۔

گفتگو کو آگے بڑھانے سے پہلے ایک بنیادی بات ذہن میں رکھنی چاہئے۔ وہ یہ ہے کہ قرآن وسنت میں جو کچھ آیا ہے اس کو اصطلاح میں نصوص کہا جاتا ہے۔ نص کے لغوی معنیٰ تو عبارت یا Text کے آتے ہیں۔ لیکن اصطلاح میں نصوص سے مراد قرآن پاک اور سنت رسول کے Text یا عبارتیں ہیں جو دراصل شریعت کا ماخذ اور مصدر ہیں۔

نصوص کی دو قسمیں ہیں۔ کچھ نصوص وہ ہیں جن کو قطعی الثبوت کہا جاتا ہے۔ یعنی ان کا ثبوت قطعی اور یقینی دلائل کے ساتھ ہمارے سامنے ہو چکا ہے۔ قرآن مجید سارے کا سارا قطعی الثبوت ہے۔ احادیث اور سنت میں بھی خاصا بڑا حصہ قطعی الثبوت ہے۔ مثلاً سب کی سب متواتر احادیث اور سنن ثابتہ قطعی الثبوت ہیں۔ متواتر احادیث کی تفصیل آج کی گفتگو میں آئے گی۔ لیکن کچھ احادیث ہیں جو تواتر کے کسی درجہ تک نہیں پہنچیں وہ قطعی الثبوت نہیں ہیں اور ان کا درجہ قرآن کریم اور سنت متواترہ سے کم ہے۔ اس پر بھی آگے چل کر بات ہوگی۔ گویا کچھ نصوص ہیں جو قطعی

الثبوت ہیں اور کچھ نصوص ہیں جو ظنی الثبوت ہیں۔ جن کے بارے میں ظن غالب یہ ہے کہ یہ شریعت کا نص ہے۔

اسی طرح سے معانی اور مطالب کے اعتبار سے بھی ان نصوص کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ ہے جو قطعی الدلالت ہے۔ جس کے معنی اور مفہوم بالکل قطعی اور یقینی ہیں اور جن میں کسی اختلاف رائے کی یا کسی دوسری تعبیر کی گنجائش نہیں ہے۔ مثلاً قرآن پاک میں ہے اقیموا الصلوٰۃ، نماز قائم کرو۔ اب ہر شخص جو تھوڑی بہت بھی عربی جانتا ہے اور اسلام کی تعلیم سے تھوڑا سا بھی واقف ہے وہ یہ جانتا اور سمجھتا ہے کہ اقیموا الصلوٰۃ سے کیا مراد ہے۔ اس میں کسی دو تعبیروں کی گنجائش نہیں ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ کچھ نصوص ایسے ہیں جن میں ایک سے زیادہ تعبیروں کی گنجائش ہے۔ اور یہ گنجائش اللہ اور رسول نے ایک مصلحت سے رکھی ہے۔ جہاں اللہ اور رسول کی حکمت اور منشاء یہ تھا کہ شریعت کے احکام کو ایک سے زیادہ انداز سے سمجھا جاسکے وہاں انہوں نے ایسا اسلوب اور ایسا طرز بیان اختیار کیا جس میں ایک سے زائد تعبیرات کی گنجائش موجود ہے۔ قرآن مجید میں بہت سے الفاظ ہیں جو مشترک معنی کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن پاک فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ ترین معیار پر ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی ایسا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے عربی زبان میں ایک سے زائد معنی ہیں اور وہاں سیاق وسباق میں کوئی ایسا قرینہ بھی نہیں رکھا گیا جس سے ایک معنی متعین ہوسکیں تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ قرآن مجید کی کچھ نصوص کو ایک سے زائد انداز میں سمجھا جاسکے، جن میں ایک دو کی مثالیں میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔

اسی طرح سے حدیث پاک میں بھی ہے، رسول اللہ ﷺ کے ارشادات فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ ترین معیار پر ہیں۔ اس لئے کہ حضورؐ علیہ الصلوٰۃ والسلام افصح العرب تھے۔ کسی کا یہ تصور کرنا انتہائی بے بنیاد اور مہمل بات ہوگی کہ نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ بات تو واضح کہنا چاہتے تھے لیکن کہہ نہیں سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جس موقعہ پر جو بات ارشاد فرمانا چاہتے تھے آپؐ نے اس موقعہ پر وہی ارشاد فرمائی اور اس سے جو مفہوم نکلتا ہے وہی مفہوم حضورؐ کا مقصود تھا۔ یہ کہنا بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کہ رسول اللہ ﷺ تو کسی خاص حکم سے اپنے ذہن میں ایک خاص مقصد رکھتے تھے۔ لیکن چونکہ لغت کے اعتبار سے اس لفظ کے ایک سے زیادہ مفاہیم نکل سکتے تھے

اس لئے لوگوں نے اس کو اور طرح سمجھ لیا جو حضور ﷺ کی منشا کے خلاف تھا۔نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔جس چیز کو رسول اللہ ﷺ نے دوٹوک اور قطعی انداز میں ارشاد فرمانا چاہا اسے دوٹوک اور قطعی انداز میں ارشاد فرمایا اور جس چیز کے بارے میں حضورؐ کا ارادہ یہ تھا کہ اس کو لوگ اپنے اپنے انداز سے سمجھیں وہ بات حضورؐ نے اس طرح ارشاد فرمائی کہ لوگ اس کو اپنے اپنے انداز سے سمجھے۔

ان دونوں کی ایک ایک مثال میں آپ کو دے دیتا ہوں۔ ایک قرآن پاک سے اور ایک حدیث سے۔قران پاک میں ایک جگہ آیا ہے کہ اگر کسی شوہر اور بیوی میں اختلاف ہو جائے اور شوہر بیوی کو طلاق دے دے تو جب تک وہ مطلقہ خاتون عدت میں ہے اس وقت تک اس مطلقہ خاتون کے اخراجات اس کے شوہر کے ذمہ ہوں گے۔ یہ مشہور معاملہ ہے جس کو متعہ الطلاق کہتے ہیں۔ اس موقعہ پر ارشاد ہوا ہے کہ علی الموسع قدرہ و علی المقتر قدرہ، کہ خوشحال اپنی استطاعت کے مطابق اور نادار اپنی استطاعت کے مطابق۔متاعاً بالمعروف،اس علاقے اور اس زمانے کے معروف طریقے کے مطابق ضروری ساز وسامان دے۔ یہ الفاظ قرآن پاک میں آئے ہیں جن کے قطعی الثبوت ہونے میں کوئی شک نہیں۔لیکن موسع سے کیا مراد ہے؟مقتر سے کیا مراد ہے؟ یہ ہر زمانے کے لحاظ سے الگ الگ طے ہوسکتا ہے۔ایک غریب ماحول میں،ایک فقیر ملک میں دولت مند اور موسع کا مفہوم اور ہوگا اور نادار اور مقتر کا مفہوم الگ ہوگا۔ ایک انتہائی دولت مند ملک میں،مثلاً کویت میں اگر کہا جائے کہ دولت مند اپنی ستطاعت کے مطابق دے اور نادار اپنی استطاعت کے مطابق دے۔تو کویت کے ماحول میں نادار کے معنی اور ہوں گے پاکستان کے ماحول میں نادار کے معنی اور ہوں گے، پاکستان سے بھی زیادہ کوئی غریب فقیر ملک ہوگا تو وہاں نادار کے معنی اور ہوں گے۔

ایسا اس لئے رکھا گیا کہ اللہ کی مشیت اور منشا یہ تھا کہ چونکہ ناداری اور دولت مندی اضافی چیزیں ہیں اس لئے ان کو اپنے اپنے زمانے کے لحاظ سے سمجھا جائے اور اپنے اپنے زمانے کے لحاظ سے اس کے معنی متعین کئے جائیں۔اس کے لئے معروف کی قید بھی لگا دی جس سے یہ بات مزید واضح ہوگئی کہ اس کی بہت سی تعبیریں ممکن ہیں۔مثال کے طور پر پاکستان کے کسی دیہات میں اگر کسی خاتون کو یہ آزمائش پیش آجائے اور وہ متاع کا مطالبہ کرے تو غالباً یہ کافی ہوگا کہ اس کو رہنے کے لئے مکان دے دیا جائے۔اس مکان میں ضروری ساز وسامان ہو۔دو وقت

کھانے کا انتظام ہو، ناشتہ کا انتظام ہو، کپڑے ہوں اور ضروری ساز وسامان ہو۔ شاید اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں یہی معروف ہے۔ جو دولت مند ہوگا وہ پختہ مکان دے دے گا، غریب کچا مکان دے دے گا۔ دولت مند آدمی شاید گھر میں گھوڑا بھی رکھوا دے، تانگہ بھی رکھوا دے۔ غریب آدمی یہ چیزیں نہیں رکھ سکے گا۔

لیکن اگر یہی واقعہ کسی کے ساتھ پیرس میں پیش آجائے تو پیرس میں موسع اور مقتر کے معنی اور ہوں گے۔ وہاں مطلقہ خاتون یہ مطالبہ کرسکتی ہے کہ جو گھر مجھے رہنے کے لئے دیا گیا ہے اس میں ریفریجریٹر بھی رکھا ہو، اس میں سینٹرل ہیٹنگ کا نظام بھی ہو، اس میں ٹیلفون کی لائن بھی لگی ہوئی ہو۔ اس لئے کہ یہ چیزیں وہاں ناگزیر ہیں اور ہر آدمی کے پاس ہوتی ہیں۔ وہاں نادار سے نادار آدمی بھی ان چیزوں کے بغیر گزارہ نہیں کرسکتا۔ لیکن پاکستان میں کوئی نادار خاندان یہ مطالبہ کرے تو شائد وہ حق بجانب نہ ہو۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ شریعت کے احکام میں بعض جگہ اللہ کی حکمت ہی اس بات کی متقاضی رہی ہے کہ اس کے معنی اور مطالب کو زیادہ سے زیادہ عمومی انداز میں سمجھا جاسکے۔ اور ہر علاقے کے لوگ اپنے حالات کے لحاظ سے، ہر زمانے کے لوگ اپنے ماحول کے لحاظ سے اس کو سمجھ سکیں۔ یہ معنی ہیں ظنی الدلالت کے، یعنی جس کے معانی اور دلالت کے مفاہیم ظنی ہیں۔ آپ اپنے ظن غالب، فہم وبصیرت اور خیال سے شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے اس کے معنی اور مطالب متعین کرلیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کسی نے پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ ہم بدوی لوگ ہیں ریگستان میں سفر کرتے ہیں۔ ریگستان میں سب سے کمیاب چیز پانی ہوتی ہے۔ بعض اوقات ہم گزرتے ہیں، راستے میں کوئی تالاب یا گڑھا نظر آتا ہے، اس میں پانی جمع ہے، یا کسی پہاڑ کے دامن میں پانی جمع ہے۔ اب ہمیں نہیں معلوم کہ یہ پانی پاک ہے کہ ناپاک ہے۔ اس میں کسی درندے نے منہ تو نہیں ڈالا۔ کسی ناپاک جانور نے اس کو ناپاک تو نہیں کیا تو ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ تو آپؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا، مختلف احادیث میں مختلف الفاظ آئے ہیں، ایک حدیث کے الفاظ ہیں، الماء الکثیر لاینجس، کہ زیادہ پانی ناپاک نہیں ہوتا۔ ایک اور جگہ فرمایا کہ الماء الکثیر طھور لاینجسہ شئی، کہ زیادہ پانی پاک ہے کوئی چیز اس کو ناپاک نہیں کرسکتی۔ اب ذرا غور فرمایئے کہ یہ الفاظ کہ 'زیادہ پانی ناپاک نہیں ہوتا' رسول اللہ ﷺ جو افصح

العرب ہیں، آپ کی زبان مبارک سے ارادۃً اور سوچ سمجھ کر نکلے ہیں۔ یہاں آپ نے اسلام کی حکمت تشریع کے پیش نظر ایسے عمومی الفاظ استعمال فرمائے جن کی متعدد تعبیریں ممکن ہیں۔ آپؐ چاہتے تو مثلاً یہ فرمادیتے کہ پانی دس یا بیس رطل (ایک پیمانہ) ہوتو ناپاک نہیں ہوتا۔ لیکن آپ نے ماءالکثیر کے الفاظ استعمال فرمائے۔ ماءالکثیر سے کیا مراد ہے؟ کتنا پانی، جتنا کسی بڑے تالاب میں ہوتا ہے؟ اتنا پانی جتنا راول ڈیم میں ہے؟ اتنا پانی؟ یا اتنا پانی جتنا ایک ٹب میں بھرا ہوا ہے یا اتنا پانی جو ایک کولر میں بھرا ہوا ہے؟ ماءالکثیر کے مفہوم میں لغوی اعتبار سے یہ سب شامل ہیں۔

ہمارے شہر میں شاید ہم ماء کثیر کا یہ مفہوم قرار دیں کہ راول ڈیم کا پانی ماء کثیر ہے، اس لئے اس میں زیادہ پانی ہے۔ لیکن بلوچستان کے بعض علاقوں میں جہاں دس دس میل پانی نہیں ملتا، وہاں کے لوگوں کے نزدیک ایک مشک بھر پانی بھی بہت اور ماء کثیر ہے۔ بعض اور علاقے ایسے ہوں گے جہاں ایک مٹکا پانی بھی بہت زیادہ یعنی ماء کثیر قرار دیا جائے گا۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے جان بوجھ کر، سوچ کر اور حکمت کی وجہ سے یہ بات ارشاد فرمائی کہ ہر علاقہ کے لوگ اپنے حالات کے لحاظ سے اس اصطلاح کے معنی متعین کرلیں۔ چنانچہ امام ابوحنیفہؒ کے سامنے جب یہ حدیث اور اس کی تعبیر کا مسئلہ آیا تو وہ کوفہ میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں ایک طرف دریائے دجلہ بہتا تھا دوسری طرف فرات بہتا تھا۔ تو ان کے ذہن میں ماء کثیر کا جو تصور آیا وہ یہ آیا کہ اتنا بڑا تالاب کہ اگر کوئی ایک طرف سے اس کے پانی کو ہلائے تو اس کی لہر دوسرے کنارے تک نہ پہنچے۔ انہوں نے ماء کثیر کا یہ مفہوم سمجھا۔ اس کے برعکس امام مالکؒ جو مدینہ منورہ میں تشریف فرما تھے جہاں صرف دو کنویں تھے اور ان میں بھی ایک یہودی کا تھا، آپ نے سنا ہوگا، اس نے کنٹرول کیا ہوا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے پھر اس سے خرید کر وقف کر دیا۔ جہاں دو کنویں تھے ایک یہودی کا تھا اور پانی کی قلت تھی۔ امام مالکؒ نے ایک اور روایت کے الفاظ سے استدلال کرتے ہوئے کہا کہ دو ایسے بڑے مٹکے جو لوگ گھروں میں پانی کے لئے رکھتے ہیں وہ اگر پانی سے بھرے ہوئے ہوں تو یہ ماء کثیر ہے۔ انہوں نے اسی مقدار کو ماء کثیر سمجھا۔ اب آپ دیکھیں دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اتنا بڑا تالاب جس میں کم و بیش دس ہزار مٹکے آجائیں وہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک ماء کثیر ہے۔ اس کے برعکس امام مالکؒ کے نزدیک ماء کثیر وہ ہے جو دو مٹکوں میں سما جائے۔ یہ دونوں مسالک اپنی جگہ

درست ہیں اس لئے کہ حدیث کے الفاظ میں دونوں کی گنجائش موجود ہے۔ مدینہ میں ماءکثیر یہ ہے،کوفہ میں ماءکثیر وہ ہے۔

اس طرح کی احادیث اور آیات قرانی جن میں ایک سے زیادہ تعبیروں کی گنجائش ہو وہ ساری تعبیریں کم ازکم لغوی اعتبار سے بیک وقت درست ہوسکتی ہوں۔ضروری نہیں کہ ہر وقت درست ہوں۔ بلکہ درست ہوسکتی ہوں۔ان کے درست ہونے کے امکانات اور دلائل موجود ہوں۔یہ چیز ہے جس کو ظنی الدلالت کہتے ہیں،یعنی وہ نص جس کے معنی ومفہوم ظنی ہو۔

لہٰذا نصوص شریعہ کی چار قسمیں ہوگئیں۔ظنی الثبوت اور ظنی الدلالت دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملائیں تو چار قسمیں بنتی ہیں۔یہ چاروں قسمیں احکام شریعت کا ماخذ ہیں اور اسی ترتیب کے ساتھ ہیں۔سب سے پہلے وہ چیز جو قطعی الثبوت بھی ہے اور قطعی الدلالت بھی ہے۔جس میں قرآن پاک کی وہ آیات جو محکم ہیں اور سنت متواترہ اور احادیث ثابتہ میں جو محکمات ہیں وہ شامل ہیں۔پھر ان نصوص کا درجہ ہے جو قطعی الثبوت اور ظنی الدلالت ہیں۔پھر وہ نصوص ہیں جو ظنی الدلالت ہیں اور قطعی الثبوت ہیں۔پھر وہ نصوص ہیں جو ظنی الدلالت ہیں اور ظنی الثبوت ہیں۔یہ ترتیب ہے جس سے احادیث اور آیات دونوں سے احکام کا استدلال ہوتا ہے۔

یہ گفتگو بڑی تفصیل کی متقاضی ہے کہ ان چاروں درجات میں جب استنباط اور استدلال کا عمل شروع کیا جائے گا تو اگر ان دونوں میں کسی میں تعارض ہو تو اس کو کیسے حل کیا جائے گا۔لیکن ایک عام بات جو کامن سنس اور عقل عام کی بات ہے وہ یہ کہ جو پہلی والی Category ہے اس کو ترجیح دی جائے گی اور سردست دوسری والی کیٹیگری کو نظر انداز کر دیا جائے گا۔اس لئے جب سنت کی بات بطور ماخذ شریعت کے ہوتی ہے تو ہمارے سامنے چاروں چیزیں رہتی ہیں۔یہ چاروں چیزیں سنت میں بھی پائی جاتی ہیں۔قرآن پاک میں ان میں سے دو چیزیں پائی جاتی ہیں اور دو نہیں پائی جاتیں۔قرآن پاک سارے کا سار قطعی الثبوت ہے اس لئے ظنی الثبوت والی کیٹگری قرآن پاک میں نہیں پائی جاتی۔احادیث میں کچھ قطعی الثبوت ہیں کچھ ظنی الثبوت ہیں۔ قطعی الدلالت اور ظنی الدلالت قرآن پاک میں بھی ہیں اور حدیث میں بھی ہیں۔اس لئے ان چاروں کیٹیگریز کا انطباق احادیث پر زیادہ ہوتا ہے قرآن پاک کی آیات پر کم ہوتا ہے۔

کل ایک بہن نے سوال پوچھا تھا کہ منکرین حدیث یہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ قرآن

مجید کی موجودگی میں کسی اور رہنمائی یا کسی اور ہدایت کی ضرورت نہیں۔اس کے جواب میں آپ کے سامنے میں نے ایک حدیث بیان کی تھی کہ 'الا انّنی او تیت القرآن و مثلہ معہٗ یاد رکھو مجھے قرآن پاک بھی دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس جیسی رہنمائی اور بھی دی گئی ہے۔قرآن پاک کی متعدد آیات سے، جن کی تعداد سینکڑوں میں ہے، ان سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر نزول قرآن کے علاوہ بھی وحی ہوتی تھی جو سنت اور حدیث کی رہنمائی کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔

کل میں نے اس آیت کا بھی حوالہ دیا تھا جس میں رسول اللہ ﷺ کے چار فرائض کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یتلوا علیھم ایاتہ ویز کیھم و یعلمھم الکتاب و الحکمۃ، یہ جو آخری تین فرائض ہیں یہ تلاوت کتاب سے ہٹ کر ہیں، تلاوت آیات سے مختلف چیزیں ہیں۔تلاوت آیات تو قرآن پاک کا بیان کر دینا ہوا۔پھر یعلمھم الکتاب و الحکمۃ ویز کیھم یہ تین کام ہیں، ان کا طریقہ کار کیا تھا۔اس کے لئے رسول اللہ ﷺ جو ہدایات یا رہنمائی فرمایا کرتے تھے وہی رہنمائی کیا تھی؟ وہ رہنمائی سنت کی شکل میں آج ہمارے سامنے ہے۔

خود قرآن مجید میں تین چار مقامات پر قرآن کی تبیین کا فریضہ رسول اللہ ﷺ کے سپرد کیا گیا ہے۔ لتبیّن للناس مانزل الیھم، تا کہ آپ وہ تمام چیزیں ان کے لئے بیان کر دیں جو ان کے لئے نازل کی گئی ہیں۔یعنی قرآن پاک کی آیات اور مطالب کا بیان کرنا، بیان سے مراد محض تلاوت آیات نہیں ہے، بلکہ بیان کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کے معانی و مطالب کو بیان کر دیا جائے۔اس کے مقاصد کی تشریح کی جائے۔اس میں جو سبق پنہاں ہے اس کو روز روشن کی طرح واضح کر دیا جائے۔اس میں جہاں جہاں انسانی ذہن کی نارسائی کی وجہ سے الجھاؤ کا امکان پیدا ہو سکتا ہے اس ممکنہ الجھاؤ کو دور کیا جائے۔ جہاں جہاں غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے، اس غلط فہمی کے راستوں کو بند کر دیا جائے۔یہ ساری چیزیں بیان و تبیین میں شامل ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے جو بیان جاری ہوتا تھا، علماء اسلام نے اس کی قسمیں بیان کی ہیں۔ان میں سے بعض اقسام کا ذکر میں آج کی گفتگو میں کرتا ہوں۔ایک مشہور صحابیؓ ہیں حضرت عمران بن حصینؓ۔ وہ ایک مرتبہ اپنے حلقۂ درس میں کچھ مسائل بیان فرمار ہے تھے۔اس زمانے میں خوارج میں سے بعض جاہل اور انتہا پسند لوگ اس طرح کی باتیں کیا کرتے

تھے جیسے آج کل کے منکرین حدیث کرتے ہیں۔ان میں سے کوئی خارجی باہر سے آیا ہوا تھا۔اس نے آ کے کہا کہ 'لاتحدثنا بالاحادیث' آپ ہمیں احادیث نہ سنائیں حدثنا بالقرآن،قرآن پاک کی باتیں بتائیں۔حضرت عمران بن حصینؓ نے قدرے ناگواری سے فرمایا کہ میں قرآن ہی کی باتیں بیان کر رہا ہوں۔قرآن میں اگر نماز کا حکم ہے تو تمہیں کہاں سے پتہ چلے گا کہ ظہر کی رکعتیں چار ہیں،عصر کی چار ہیں اور مغرب کی تین ہیں۔یہ اگر میں سنت سے نہیں بیان کروں گا تو تمہیں کہاں سے معلوم ہوگا۔سنت سے بیان کروں گا تو یہ قرآن ہی کا بیان ہے۔یہ قرآن ہی کا درس ہے،قرآن سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔پھر آپ نے فرمایا کہ 'خذوا عنا' آج یہ ساری معلومات ہم سے لے لو،اگر تم نہیں لوگے تو پھر تمہارے اندر بڑا اختلاف پیدا ہوگا اور تم ایسے معاملات اور مسائل میں الجھ جاؤ گے جن سے نکلنے کا تمہارے سامنے کوئی راستہ نہیں ہوگا۔

وحی کی اقسام

آگے چلنے سے پہلے ایک اور چیز ذہن میں رکھیں، وہ سنت کی ایک خاص قسم ہے۔ حدیث کی بقیہ اقسام پر تو تفصیل سے کل بات ہوگی لیکن ایک قسم ایسی ہے جس پر آج بات کرنا ضروری ہے۔ہم نے یہ دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی دو طریقوں سے آتی تھی۔ایک وہ وحی ہوتی تھی جو وحی جلی کہلاتی ہے۔یعنی جس کے الفاظ ،جس کی عبارتیں ،جس کے کلمات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے تھے اور جس میں رسول اللہ ﷺ کا کوئی دخل نہیں تھا۔یہ وہ وحی تھی جس کے الفاظ اور کلمات معجز ہیں،جن کا اسلوب ،جن کا معیار،جن کی فصاحت و بلاغت معجزہ کی سطح تک پہنچی ہوئی ہے۔یہ وحی قرآن مجید کہلاتی ہے۔

اس کے علاوہ جو وحی ہوتی تھی وہ متعین الفاظ میں نہیں ہوتی تھی وہ سنت ہے۔جس کے صرف معنی اور مفاہیم حضورؐ تک منتقل ہوئے۔یہ وحی بعض اوقات جبرئیل امینؑ کے ذریعے سے نازل ہوئی۔بعض اوقات کسی اور ذریعے سے بھی نازل ہوئی۔حضورؐ نے خواب میں کوئی چیز دیکھی،یا ویسے اللہ نے دل میں کوئی چیز ڈال دی۔سنت حضورؐ تک پہنچانے کے لئے وحی خفی کی رہنمائی کے کئی طریقے تھے، جس میں وہ طریقہ بھی شامل تھا جس طریقے پر قرآن مجید نازل ہوتا تھا۔اس کے علاوہ بھی کئی طریقے شامل تھے۔بہرحال وحی خفی کہلاتی ہے یعنی جسے آپ انگریزی میں **Tacit Revelation** کہہ

سکتے ہیں۔ دوسری Express Revelation یا وحی جلی ہے، جو اپنے الفاظ کے ساتھ نازل ہوتی تھی۔ وحی خفی صرف معانی اور پیغام پر مشتمل ہوتی تھی جس میں الفاظ اللہ کی طرف سے نہیں تھے لیکن معانی حضورؐ پر نازل فرمائے گئے اور حضورؐ نے اپنے الفاظ میں اس کو بیان فرمایا۔

اس دوسری وحی یعنی وحی خفی میں ایک خاص قسم وہ ہے جو بقیہ تمام اقسام سے منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ تعداد میں بھی تھوڑی ہے، لیکن اس کا ایک خصوصی مقام ہے جس کے لئے اس کو 'حدیث قدسی' کہا گیا ہے۔ وہ دراصل اللہ تعالیٰ ہی کا کلام ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے ادا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ یا تو صیغہ واحد متکلم یا جمع متکلم میں ارشاد فرماتے ہیں، لیکن بیان کرنے والے رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اس کے الفاظ چونکہ رسول اللہ ﷺ کے ہیں اس لئے یہ وحی قرآن مجید میں شامل نہیں ہے، اس کی تلاوت نہیں ہوتی، وہ قرآن مجید میں نہیں لکھی جاتی، لیکن وہ اللہ کا کلام ہے۔ مثال کے طور پر صحیح بخاری میں ہے ما زال العبد یتقرب الیّ بالنوافل، میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرے سے قربت حاصل کرسکتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ جب وہ میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے تو میں ایک باع (اس فاصلے کو جو دونوں بازوؤں کو دائیں بائیں پوری طرح پھیلانے کے وقت ہاتھوں کی انگلیوں کے آخری سروں کے درمیان ہوتا ہے، اس کو عربی زبان میں باع کہتے ہیں، آپ کہہ سکتے ہیں کہ ڈیڑھ گز کا فاصلہ) اس کی طرف بڑھتا ہوں۔ جب وہ میری طرف آہستہ چلتا ہے تو میں لپک کے اس کی طرف چلتا ہوں۔ جو لپک کر میری طرف آتا ہے تو میں دوڑ کر اس کی طرف آتا ہوں' یہ ارشاد ربانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضورؐ نے صیغہ واحد متکلم میں ارشاد فرمایا۔ یہ حدیث حدیث قدسی کہلاتی ہے۔

احادیث قدسیہ کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ کل احادیث کی تعداد اگر پچاس ہزار ہو، جیسا کہ بعض لوگوں کا اندازہ ہے یا تیس ہزار ہو جیسا کہ کچھ اور لوگوں کا اندازہ ہے۔ تو ان میں سے چند سو احادیث ہیں جو احادیث قدسیہ کہلاتی ہیں۔ کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ ان کی تعداد تین سو کے لگ بھگ ہے۔ احادیث قدسیہ کے مجموعے الگ سے بھی شائع ہوئے ہیں۔ تقریباً ایک درجن مجموعے ہیں جن میں احادیث قدسیہ الگ الگ شائع کردی گئی ہیں۔ ایک مجموعہ میں ایک سو کے قریب احادیث ہیں، ایک دوسرے مجموعہ میں دو سو بہتر احادیث ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تعداد تین سو کے لگ بھگ ہے۔ یہ تین سو احادیث ایک طرح سے قرآن مجید سے ملتی جلتی

ہیں کہ اللہ کا کلام ہے اور براہ راست اللہ کی طرف سے ان کا بیان ہوا ہے۔ دوسری طرف یہ احادیث رسول سے ملتی جلتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو اپنے الفاظ میں بیان فرمایا۔ گویا ان حادیث کا درجہ قرآن پاک اور حدیث رسولؐ کے درمیان ہے۔ چونکہ ان دونوں کے درمیان ان احادیث کا درجہ ہے اس لئے ان کو احادیث قدسیہ کہا جاتا ہے۔

احادیث قدسیہ اور قرآن مجید کے درمیان گیارہ بنیادی فرق ہیں۔ پہلا فرق تو یہ ہے کہ قرآن مجید معجزہ ہے احادیث قدسیہ معجزہ نہیں ہیں۔ یعنی قرآن کے الفاظ اور عبارت کی فصاحت و بلاغت اور کلمات کی بندش و بلندی، یہ معجزہ ہے۔ احادیث قدسیہ میں ضروری نہیں کہ معجزہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ معجز ہونے کی حد تک بہت اونچا معیار ہو، ہوسکتا ہے کہ نہ ہو۔ قرآن مجید کی روایت بالمعنیٰ جائز نہیں ہے۔ روایت بالمعنیٰ سے مراد یہ ہے کہ قرآن مجید کے مفہوم کو آپ اپنے الفاظ میں بیان کردیں اور کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے۔ مثلاً آپ کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہٰذا کتاب لاشک فیہ، یہ عربی زبان میں میں نے روایت بالمعنیٰ کی ہے، یہ جائز نہیں ہے۔ یہ حرام ہے۔ مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ذالك الكتاب لاریب فیه ۔لیکن اگر میں اس مفہوم میں حدیث قدسی کو بیان کردوں تو یہ جائز ہے۔ کہ حدیث قدسی میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے پھر مفہوم کو اپنے الفاظ میں بیان کردوں اور نقل کردوں تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، یہ حرام نہیں ہے۔ اگرچہ افضل نہیں ہے۔ افضل یہی ہے کہ اصل الفاظ میں بیان کیا جائے لیکن حرام اور ناجائز نہیں ہے۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ قرآن پاک اگر کہیں لکھا ہوا ہو تو بیشتر فقہا کے نزدیک بے وضو اس کو ہاتھ لگانا جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر حدیث قدسی لکھی ہوئی ہو تو بغیر وضو اس کو ہاتھ لگانا جائز ہے، اگرچہ ادب کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

چوتھا فرق یہ ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت اس شخص کے لئے جائز نہیں ہے جس پر غسل فرض ہو، لیکن حدیث قدسی اس حالت میں بھی پڑھ سکتا ہے۔ اگرچہ ادب اور احترام کا تقاضا یہ ہے کہ نہ پڑھے۔ محدثین کرام نے علم حدیث کے انتہائی احترام کی جو مثالیں قائم کی ہیں ان کا تقاضا یہی ہے کہ بغیر وضو ارشادات رسول کو نہ پڑھا جائے۔ امام مالکؒ جب درس دیا کرتے تھے تو لوگوں نے بیان کیا کہ ان سے زیادہ اہتمام کے ساتھ علم حدیث کا درس کسی نے نہیں دیا۔ اللہ تعالیٰ نے

انہیں مال ودولت سے بھی نوازا تھا۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ وہ جس مکان میں رہتے تھے یہ وہ مکان تھا جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ صحابی کا تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مکان انہوں نے خریدا تھا اوراس میں رہتے تھے اور ایک مکان الگ سے خرید کر اس کو درس حدیث کے لئے مختص کیا ہوا تھا۔ وہ حضرت عمر فاروقؓ کا مکان تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے مکان میں درس ہوا کرتا تھا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مکان میں رہا کرتے تھے۔ اس مکان میں جب امام مالکؒ درس کے لئے تشریف لایا کرتے تھے تو پورے مکان میں خوشبوئیں بکھیری جاتی تھیں، سفید چادریں بچھادی جاتی تھیں، امام مالکؒ کی طرف سے لوگوں کی خدمت کرنے، پانی پلانے اور خوشبو لگانے کے لئے ملازمین مامور ہوتے تھے،۔ گرمی کے موسم میں وقفہ وقفہ سے خوشبو چھڑک دی جاتی تھی۔ امام مالکؒ پوری تیاری کے ساتھ وہاں تشریف لایا کرتے تھے۔ جس شان سے کوئی بادشاہ دربار میں آتا ہے اسی شان سے امام مالکؒ تشریف لاتے تھے۔ بہترین لباس پہن کراور خوشبو لگا کر تشریف لاتے تھے اور اتنے وقار سے درس حدیث دیا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ لوگوں نے دیکھا کہ درس حدیث دیتے ہوئے ان کا چہرہ سترہ مرتبہ متغیر ہوا، لیکن ان کے طرز عمل اور روانی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ جب گھر تشریف لائے تو کسی سے کہا کہ دیکھو میرے کپڑوں میں کیا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ بچھو گھس گیا تھا جس نے سترہ مرتبہ ان کو ڈنک مارا لیکن انہوں نے ادب واحترام کی خاطر اس مجلس کو موقوف نہیں کیا اور اسی روانی کے ساتھ درس جاری رکھا۔ احترام کا تقاضا تو یہ ہے۔ لیکن اگر کوئی آدمی جائز ناجائز کو جاننا چاہے تو وضو نہ ہونے کی حالت میں حدیث قدسی کی تحریر کو چھوسکتا ہے اور غسل نہ ہونے کی حالت میں حدیث قدسی پڑھ سکتا ہے۔ ایسا کرنا جائز ہے حرام نہیں ہے۔

پانچواں فرق یہ ہے کہ قرآن مجید کی نماز میں تلاوت ہوتی ہے، حدیث قدسی کی نماز میں تلاوت نہیں ہوسکتی۔ اگر کوئی شخص حدیث قدسی نماز میں پڑھ لے تو تلاوت کا جو رکن ہے اور فرض ہے، وہ ادا نہیں ہوگا۔ قرآن پاک کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جو شخص ایک حرف کی تلاوت کرے اس کو دس نیکیاں ملیں گی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، جن کا ابھی ذکر ہوا، انہوں نے فرمایا کہ 'لااقول الم حرف، پہلے انہوں نے حدیث بیان فرمائی کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جس نے قرآن پاک کے ایک حرف کی تلاوت کی اس کو دس نیکیوں کا ثواب ملے گا۔ پھر انہوں نے اپنی فہم بیان فرمائی کہ میں یہ نہیں کہتا کہ الم میں ایک حرف ہے، بل الف حرف ولام حرف ومیم حرف' الف الگ

حرف ہے لام الگ حرف ہے میم الگ حرف ہے۔ یہ خصوصیت صرف قرآن پاک کی ہے جو حدیث قدسی کو حاصل نہیں ہے۔ حدیث قدسی آپ پڑھیں تو اس میں اتنا اجر نہیں ہے جو قرآن پاک کی تلاوت میں ہے۔

ساتواں بڑا فرق یہ ہے کہ قرآن پاک وحی جلی ہے اور حدیث قدسی وحی خفی ہے۔ آٹھواں فرق یہ ہے کہ قرآن پاک روح امین یا جبرئیلؑ لے کر نازل ہوتے تھے۔ جبکہ حدیث قدسی کسی بھی طریقے سے آسکتی تھی۔ نواں فرق یہ ہے کہ قرآن وحی متلو ہے جس کی تلاوت ہوتی ہے۔ حدیث قدسی وحی متلو نہیں ہے۔ اس کی تلاوت نہیں ہوتی۔ دسواں فرق یہ ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ متواتر ہیں۔ ضروری نہیں کہ حدیث قدسی بھی متواتر ہو۔ اگرچہ ایک دو قدسی حدیثیں ایسی ہیں جو کہ متواتر بھی ہیں، لیکن اکثر احادیث قدسیہ متواتر نہیں ہیں۔ گیارھواں فرق یہ ہے کہ قرآن پاک مصاحف میں لکھا ہوا ہے اور یکجا موجود ہے، احادیث قدسیہ مصاحف میں نہیں ہیں اور کسی ایک سرکاری یا باضابطہ مجموعہ میں یکجا موجود نہیں ہیں۔

احادیث اور سنت کا جو ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے یہ درجنوں نہیں بلکہ سینکڑوں کتابوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتابیں جو آج کتب حدیث کی ہماری پاس موجود ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ ان کی ترتیب وتدوین کیسے ہوئی اس پر بعد میں بات ہوگی۔ لیکن اس وقت جو ذخیرہ جیسا کہ موجود ہے اس پر بات کریں گے۔ اگر ہم کسی بھی لائبریری میں جائیں تو وہاں جو کتابیں حدیث کی موجود ہیں وہ دو طرح کی ہیں۔ کچھ کتابیں تو وہ ہیں جو حدیث کی اصلی اور بنیادی کتابیں کہلاتی ہیں۔ اصلی اور بنیادی کتابیں وہ ہیں جن کو ان کتابوں کے قابل احترام اور جلیل القدر مرتبین نے براہ راست روایت کر کے مرتب کیا ہے۔ اور کچھ کتابیں وہ ہیں جن کی تعداد زیادہ ہے جو محدثین نے براہ راست روایت کر کے مرتب نہیں کیں بلکہ دوسرے مجموعے سامنے رکھ کر ان مجموعوں سے احادیث کا انتخاب کر کے ان مجموعوں کو مرتب کیا ہے۔

آخری کتاب جو براہ راست روایت کر کے مرتب ہوئی ہے وہ امام بیہقی کی السنن الکبریٰ ہے۔ امام بیہقیؒ اس اعتبار سے سب سے بڑے اور نمایاں محدث ہیں کہ ان کی کتاب آخری کتاب ہے جو براہ راست روایت کر کے مرتب کی گئی ہے۔ ان کے بعد براہ راست حدیث روایت کر کے مرتب کرنے والے دنیا سے ختم ہو گئے۔

امام بیہقیؒ کی وفات ۴۵۸ھ میں ہوئی۔ ۴۵۸ھ کے بعد جتنی کتابیں ہیں وہ ثانوی کتابیں ہیں۔ثانوی سے مراد وہ کتاب ہے جو کسی ایک یا دو تین قدیم تر مجموعوں کو سامنے رکھ کر کسی نے اپنا مجموعہ مرتب کیا ہو، تلخیص کی ہو، شرح کی ہو یا چند کتابوں سے ایک ہی موضوع کی احادیث نکال کر جمع کی ہوں۔ یہ تو ہوتا رہا ہے اب بھی ہوتا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔لیکن براہ راست روایت کر کے کہ محدث نے اپنے اساتذہ سے سن کر جمع کی ہوں، انہوں نے اپنے اساتذہ سے اور رسول اللہ ﷺ تک پوری سند بیان کی ہو پھر احادیث جمع کی ہوں، یہ کام آخری بار امام بیہقیؒ نے کیا ہے۔ان کے بعد کسی نے نہیں کیا۔

امام بیہقیؒ کی یوں تو بہت سی کتابیں ہیں۔لیکن سنن کے نام سے دو کتابیں ہیں۔ایک السنن الصغری کہلاتی ہے جو دو جلدوں میں ہے اور کم وبیش پانچ ہزار احادیث پر مشتمل ہے۔ دوسری طویل تر کتاب دس ضخیم جلدوں میں ہے، اتنی ضخیم جلدیں جو انسائکلو پیڈیا برٹانیکا کی سائز کی ہیں۔انہوں نے براہ راست یہ سارا ذخیرہ مرتب کیا ہے۔حدیث کی بنیادی کتابوں میں سب سے بڑی کتاب ان کی ہے، اپنے ماخذ کے اعتبار سے بھی اور اپنے تنوع کے اعتبار سے بھی۔ یہ سنن کہلاتی ہے کیونکہ فقہی احکام کی ترتیب پر ہے،لیکن اس میں حدیث کے تمام مباحث اور مضامین پر احادیث موجود ہیں اس لئے یہ سنن کبریٰ بھی کہلاتی ہے اور جامع بھی کہلاتی ہے۔لیکن سنن کبریٰ کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔

موطا امام مالکؒ سے لے کر اور سنن کبریٰ بیہقی تک آج ہمارے پاس کتب حدیث کا جو ذخیرہ موجود ہے یہ سب کا سب ایک درجہ کی احادیث پر مشتمل نہیں ہے۔ان میں مندرج احادیث کے درجات مختلف ہیں۔قرآن پاک سارے کا سارا ایک درجہ کا ہے۔وہ سب قطعی الثبوت ہے۔ الحمد سے لے کر والناس تک۔سب ثبوت کے لحاظ سے ایک ہی درجہ کا ہے۔اس کے ایک حرف میں کوئی فرق نہیں ہے۔اس کا زبر زیر سب ایک درجہ کی چیز ہے۔احادیث میں درجات ایک جیسے نہیں ہیں، بلکہ احادیث کے مختلف درجات ہیں۔

درجات کے اعتبار سے، صحت اور قبول کے اعتبار سے علماء اسلام نے کتب حدیث کے پانچ درجے قرار دیئے ہیں۔حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے تین درجے قرار دیئے ہیں۔ بعض اور محدثین نے چار درجے قرار دیئے ہیں۔ چار درجے ہوں یا پانچ درجے ہوں یا تین

درجے ہوں اصل حقیقت کے اعتبار سے ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے تین درجے قرار دیئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ درجہ اول میں وہ کتابیں شامل ہیں جن میں تمام احادیث صحیح ہیں اور مستند ہیں۔ کوئی ایک حدیث بھی ان میں ایسی نہیں ہے جو صحت کے اعلیٰ ترین معیار سے ہٹی ہوئی ہو۔ اس درجہ کی کتابوں میں صرف مستند اور صحیح احادیث ہی شامل ہیں۔ وہ تقریباً تمام محدثین کے نزدیک اتفاق رائے سے تین کتابیں ہیں۔ 'تقریباً' کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا کہ شاید ایک آدھ کا کوئی جزوی اختلاف ہوگا۔

احادیث کی یہ تین کتابیں صحت کے اعلیٰ ترین درجہ پر فائز ہیں۔ موطا امام مالکؒ، جس کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اصح الکتاب بعد کتاب اللہ ہے۔ کتاب اللہ کے بعد صحیح ترین کتاب بعض لوگوں کے خیال میں موطا امام مالکؒ ہے۔ امام شافعیؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ امام شافعیؒ جو بہت بڑے محدث بھی ہیں اور بہت بڑے فقیہ بھی ہیں وہ موطا امام مالکؒ کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیتے ہیں۔ موطا امام مالکؒ کے بعد صحیح بخاری کا درجہ ہے۔ جو مسلمانوں کی غالب ترین اکثریت کی نظر میں اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے، اللہ کی کتاب کے بعد صحیح ترین کتاب روئے زمین پر صحیح بخاری ہے۔ تیسرا درجہ صحیح مسلم کا ہے جو بعض اہل مغرب کے نزدیک اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ اہل مغرب سے مراد یورپ یا امریکہ والے نہیں ہیں، بلکہ اسلامی اصطلاح میں اہل مغرب سے مراد سپین، اندلس، مراکش، الجزائر اور تیونس کے علاقے ہیں۔ یہ مغاربہ یا اہل مغرب کہلاتے تھے۔ یہ پورا علاقہ دنیائے اسلام کے انتہائی مغرب میں تھا۔ اس لئے وہاں کے لوگوں کی رائے بیان کرنا ہو تو مغاربہ یا اہل مغرب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تو بعض اہل مغرب کی رائے ہے کہ صحیح مسلم اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔

یہ بحث ہمیشہ مسلمانوں میں چلتی رہی کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ ان تینوں میں سے کون سی کتاب ہے۔ جو حضرات موطا امام مالکؒ کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیتے ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ موطا امام مالکؒ میں جتنی احادیث آئی ہیں وہ ساری کی ساری مستند ترین اور صحیح ترین احادیث ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ امام مالکؒ ان تمام محدثین میں، جن کی کتابیں آج ہمارے سامنے ہیں اور عام مشہور و معروف ہیں، قدیم ترین مجموعہ حدیث کے مرتب ہیں، امام مالکؒ سے زیادہ قربت رسول اللہ کے زمانہ مبارک سے معروف صاحب تصنیف محدثین میں سے کسی اور

محدث کو حاصل نہیں تھی۔ علم حدیث میں ایک خاص اہتمام یہ کیا جاتا تھا کہ سند حتی الامکان چھوٹی سے چھوٹی ہو، یعنی راویوں کا بیان رسول اللہ ﷺ تک جتنا کم ہو اتنا اچھا ہے۔ ان میں اعلیٰ ترین سند وہ سمجھی جاتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ تک کم سے کم واسطے ہوں۔ اور جتنے زیادہ واسطے ہوں اتنا ہی سند نازل مانی جاتی تھی۔ سند عالی یعنی اونچی سند وہ سمجھی جاتی تھی جس میں کم واسطے ہوں۔ اس کے مقابلہ میں سند نازل وہ ہوتی تھی جس میں زیادہ واسطے ہوں۔ امام مالکؒ کی جتنی سندیں ہیں وہ باقی سب محدثین کے مقابلہ میں عالی سندیں ہیں۔ ثُلاثیات کتب حدیث میں انتہائی اعزاز کی بات سمجھی جاتی ہے۔ کتب حدیث میں ثلاثیات سے مراد وہ احادیث ہیں کہ جن کے مرتب کرنے والے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان صرف تین واسطے ہوں۔ تین سے زیادہ نہ ہوں۔ امام مالکؒ کی بیشتر سندیں ثُلاثی ہیں اور کچھ سندیں ثُنائی بھی ہیں جن میں صرف دو واسطے ہیں۔ ایک امام مالکؒ کے استاد اور ایک صحابیؓ۔ چنانچہ امام مالکؒ کی موطا میں بہت سی احادیث ملیں گی مالک عن نافع عن بن عمر۔ امام مالکؒ اپنے استاد نافع سے روایت کرتے ہیں، امام نافع اپنے استاد عبداللہ بن عمرؓ سے اور وہ رسول اللہ ﷺ سے۔ لہٰذا اس علو اسناد کی رو سے امام مالکؒ کی کتاب رسول اللہ ﷺ کے دور مبارک سے اقرب ترین کتاب ہے اور وہ اس لئے اصح یعنی صحیح ترین قرار دیئے جانے کے مستحق ہے۔

لیکن امت کی غالب ترین اکثریت کی رائے یہ ہے کہ صحیح بخاری اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ صحیح بخاری اصح الکتب بعد کتاب اللہ جن اسباب کی وجہ سے ہے ان اسباب پر ابھی گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن ایک بات ذہن میں رہے کہ موطا امام مالکؒ کی جتنی صحیح احادیث ہیں وہ ساری کی ساری نہیں تو ان کا بیشتر حصہ صحیح بخاری میں شامل ہوگیا ہے۔ اس لئے جب صحیح بخاری کو اصح الکتب کہا جائے گا تو موطا امام مالکؒ کی صحیح روایات خود بخود اصح الکتب بن گئیں۔ ایک دوسری وجہ موطا امام مالکؒ کو اصح الکتب قرار نہ دینے کی یہ بھی ہے کہ امام مالکؒ جب اپنی کتاب موطا تحریر فرما رہے تھے تو ان کا مقصد صرف اور صرف احادیث کا مجموعہ مرتب کرنا نہیں تھا بلکہ حدیث اور فقہ اور صحابہ اور تابعین کی سنت کو یکجا کرنا مقصود تھا۔ لہٰذا امام مالکؒ کی کتاب میں جہاں احادیث ہیں وہاں صحابہ کے اقوال بھی ہیں اور تابعین کے ارشادات اور آثار بھی ہیں اور اس موضوع پر امام مالکؒ کا اپنا مشاہدہ بھی شامل ہے کہ مدینہ منورہ کا عام طریقہ کیا تھا۔ تو گویا یہ ایک ایسی کتاب ہے

جس کا میدان یا دائرہ کار کتب حدیث سے ذرا مختلف اور بڑھ کر ہے۔ یہ خالص حدیث کی کتاب ان معنوں میں نہیں ہے جن معنوں میں حدیث کی اور کتابیں ہیں۔ اس میں احادیث کے علاوہ بھی بہت سے مباحث ہیں۔ امام مالکؒ کے اپنے فتاویٰ بھی اس میں ہیں۔ بعض جگہوں پر امام مالکؒ کے اپنے ارشادات بھی اس میں بیان ہوئے ہیں۔ تو گویا یہ فقہ اور حدیث دونوں کتابوں کا مجموعہ ہے۔ خالص حدیث کی کتابوں میں صحیح ترین کتاب صحیح بخاری ہے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک صحیح ترین کتاب صحیح مسلم ہے۔ بہر حال یہ تین کتابیں طبقہ اول کی کتابیں ہیں۔

طبقہ دوم کی کتابیں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی نظر میں چار ہیں۔ جامع ترمذی، سنن ابوداؤد، نسائی اور مُسند امام احمد۔ طبقہ دوم کی کتابیں وہ ہیں کہ جن کی بیشتر احادیث صحیح احادیث ہیں۔ اکثر و بیشتر احادیث سند کے اعلیٰ معیار پر پورا اترتی ہیں۔ کچھ احادیث ہیں جو صحت کے معیار سے ذرا کم ہیں۔ ان معیارات کا ابھی تذکرہ کرتے ہیں۔ اور بہت تھوڑی احادیث ہیں جو ضعیف ہیں یا جن کا ضعف بہت نچلے درجے کا ہے۔ ضعیف ہیں تو معمولی درجہ کا ضعف ہے اور زیادہ سنجیدہ انداز کا ضعف نہیں ہے۔ یہ درجہ دوم کی احادیث ہیں۔

درجہ دوم کی احادیث میں جو بنیادی خصائص ہیں وہ یہ ہیں کہ اگر چہ یہ صحیحین یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے درجہ تک تو نہیں پہنچتیں لیکن ان میں شامل بیشتر احادیث صحیح احادیث ہیں۔ ان کتابوں کے مصنفین اور مرتبین نے احادیث میں اپنے لئے جو شروط مقرر کی ہیں اور جو معیار انتخاب انہوں نے حدیث کا رکھا ان میں انہوں نے کسی تساہل سے کام نہیں لیا۔ بلکہ اکثر و بیشتر کڑا معیار اپنے سامنے رکھا۔ پھر یہ احادیث جو ان چار کتابوں میں آئی ہیں یعنی ترمذی، ابوداؤد، امام احمد اور نسائی۔ ان احادیث کو امت میں قبول عام حاصل ہوا۔ ایک عام مقبولیت ان احادیث کو حاصل ہو گئی اور محدثین اور فقہا کا ایک اصول یہ ہے (محدثین اس سے اتفاق کم کرتے ہیں فقہا زیادہ کرتے ہیں۔) فقہا یہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی حدیث روایت کے اعتبار سے ذرا کمزور بھی ہو لیکن اس کو تلقّی بالقبول حاصل ہو تو وہ حدیث قابل قبول ہے۔ تلقی بالقبول ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب امت کے عام اہل علم نے اس کو قبول کیا ہو اور اس پر عمل درآمد کرتے ہوں، وہ حدیث صحیح کی نشانی ہے۔ ورنہ اگر اس میں کوئی کمزوری ہوتی تو امت عام طور پر اس کو قبول نہ کرتی۔ تلقی بالقبول خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حدیث اونچے درجہ کی حدیث ہے۔ تو یہ چاروں کتابیں وہ

ہیں جن میں درج احادیث کو تلقی بالقبول حاصل ہوئی۔

ان میں احکام شریعت کے تمام بنیادی اصول پائے جاتے ہیں۔شریعت کے جتنے احکام احادیث میں آئے ہیں۔وہ ساری احادیث بڑی تعداد میں، شاید ننانوے فیصد کے قریب ان کتابوں میں موجود ہیں۔چنانچہ لوگوں نے لکھا ہے کہ سنن ابوداؤد میں احادیث احکام کا اتنا بڑ مجموعہ ہے کہ اگر کسی کے پاس یہ کتاب ہو تو گویا اس کے گھر میں ایک نبی موجود ہے۔کسی سابقہ مصنف نے لکھا کہ سنن ابوداؤد کی گھر میں موجودگی گویا گھر میں ایک بولتے نبی کی موجودگی ہے کہ نبی کے ارشادات ہر وقت آپ کے سامنے رہیں گے۔اور احکام آپ کو معلوم ہوتے رہیں گے۔

ان کتابوں کے علاوہ احادیث کی جو بقیہ کتابیں ہیں وہ حضرت شاہ ولی اللہ کے نزدیک تیسرے اور آخری درجہ میں آتی ہیں۔یہ وہ کتابیں ہیں جن میں ضعیف احادیث بڑی تعداد میں ملتی ہیں۔یہ وہ کتابیں ہیں جن کی سندوں میں بعض ایسے راوی آئے ہیں جو مجہول الحال ہیں، جن کی کیفیت معلوم نہیں کہ وہ مستند تھے کہ غیر مستند تھے۔اس لئے ان احادیث پر صرف وہ لوگ اعتماد کر سکتے ہیں جو علم حدیث کے متخصص ہوں اور فن روایت اور علم رجال میں متعمق ہوں۔علم حدیث پر اچھی نظر رکھے بغیر ان احادیث میں کمزور یا غیر کمزور کا تعین کرنا بڑا دشوار ہے۔عام آدمی کے لئے ان کتابوں سے استفادہ کرنا بڑا دشوار ہے۔اس لئے ان احادیث سے غیر متخصص کو براہ راست استفادہ نہیں کرنا چاہیئے۔اس لئے کہ بہت سی غلط چیزیں ہوں گی، کمزور چیزیں ہوں گی تو عام آدمی الجھ کر رہ جائے گا اور پریشان ہوگا۔لہٰذا صرف اہل علم کو ان کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

شاہ ولی اللہ کے علاوہ بقیہ لوگ اس تیسری کیٹیگری کی دو مزید قسمیں کرتے ہیں۔ایک کیٹیگری وہ ہے کہ جس میں نسبتاً قابل اعتماد چیزیں موجود ہیں۔مثلاً سنن دارقطنی، مصنف ابی شیبہ، مصنف عبدالرزاق، سنن دارمی۔یہ وہ ہیں کہ جن میں کچھ نہ کچھ نئی، صحیح اور مستند چیزیں مل جاتی ہیں۔

ان کے بعد چوتھا درجہ ان کتابوں کا ہے جن میں بالکل قصے کہانیاں اور ادھر ادھر کی باتیں ہیں۔جن کا کوئی پس منظر اور دلیل نہیں ہے۔جن کے پیچھے کوئی مضبوط سند نہیں ہے۔وہ قصے کہانیوں کے انداز میں بیان ہوئی ہیں۔مثلاً دیلمی ایک مشہور محدث ہیں، ان کا آپ نے نام سنا ہوگا، ان کی کتاب 'مسند دیلمی' ہے، اس طرح ابن مردویہ کی کتاب ہے۔اس طرح سے قصے کہانیوں کی بے شمار کتابیں ہیں۔جن کا کوئی علمی مقام نہیں ہے اس لئے ان کو بالکل نظر انداز کر دینا

چاہئے۔اس میں اگر کوئی صحیح چیز آ گئی ہے تو وہ محض اتفاق ہے ورنہ اکثر و بیشتر وہ قصے کہانیوں سے عبارت ہے۔

یہ جو پہلے دو درجے ہیں جن میں پہلا درجہ تین بنیادی کتابوں کا اور دوسرا درجہ چار بنیادی کتابوں کا ہے۔ یہ جو چھ کتابیں ہیں یا سات سمجھ لیں کیونکہ موطاء امام مالکؒ کی ساری احادیث صحیح بخاری میں اور صحیح مسلم میں آ گئیں اس لئے اس کو نکال دیتے ہیں۔ جو بقیہ چھ کتابیں ہیں یہ صحت کے اعلیٰ ترین معیار پر فائز ہیں۔ان کتابوں کو صحاح ستہ کہا جاتا ہے۔مسند امام احمد کی بجائے اس میں اکثر لوگ سنن ابن ماجہ کو شامل کرتے ہیں۔بعض لوگ مسند دارمی کو شامل کرتے ہیں،بعض ابن ماجہ کو،لیکن بیشتر لوگ ابن ماجہ کو شامل کرتے ہیں۔سنن ابن ماجہ کے ساتھ یہ چھ کتابیں ہیں جو کتب ستہ یا صحاح ستہ کہلاتی ہیں۔

اگر حدیث کی کسی کتاب میں کہیں یہ الفاظ بیان ہوں کہ رواہ الستۃ ،اس کو چھوؤں نے روایت کیا ہے تو وہ استناد کے اعلیٰ ترین معیار پر ہے۔یعنی صحیح ترین حدیث جس کو چھ کے چھ بڑے محدثین نے بیان کیا ہو۔وہ بلاشبہ اعلیٰ ترین معیار کی کتاب ہوگی۔

کتب حدیث کی خصوصیات

ان میں سے ہر کتاب کے کچھ الگ الگ خصائص ہیں۔امام بخاری کی کتاب کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ جو شخص امام بخاری کی کتاب کو غور و خوض سے پڑھ لے،اس میں ایک تفقہ پیدا ہو جاتا ہے۔اس حدیث کے گہرے معانی اور حدیث میں پوشیدہ اور پنہاں اندرونی عبرتوں تک اس کی رسائی ہو جاتی ہے۔یہ امام بخاری کی کتاب کی بنیادی خصوصیت ہے۔امام بخاری نے احادیث کے ساتھ ساتھ مختلف حضرات کے بعض اقوال بھی بیان کئے ہیں۔صحابہ کرام کے اقوال،تابعین کے اقوال،بقیہ اہل علم کے اقوال،جن کو بطور حدیث کے وہ نہیں لاتے ،بطور سند کے نہیں بیان کرتے ،بلکہ کسی چیز کے ثبوت یا تائید کے طور پر بیان کرتے ہیں کہ فلاں نے بھی یہ کہا ہے۔ان کو تعلیقات کہتے ہیں۔امام بخاری کے ہاں تعلیقات کی تعداد چند سو ہے۔تین سو سے زائد تعلیقات ہیں جو امام بخاری کی اصل کتاب کے متن کا حصہ نہیں ہیں۔لیکن جو عنوان وہ شروع کرتے ہیں تو ضمناً وہ بات کہہ دیتے ہیں کہ فلاں شخص نے یہ کہا ہے جس سے اندازہ

ہو جائے گا کہ اس حدیث کے معنی کیا ہیں۔امام مسلم کے ہاں تعلیقات بہت تھوڑی ہیں صرف چودہ پندرہ مقامات پر ہیں۔چودہ یا پندرہ مقامات پر صحیح مسلم میں کچھ باتیں بطور تعلیقات آئی ہیں۔امام بخاری کے ہاں تعلیقات زیادہ ہیں۔گویا امام مسلم کے مندرجات میں صحیح احادیث کی نسبت بہت زیادہ ہے بہ نسبت امام بخاری کے مندرجات کے، اس لئے کہ ان کے ہاں تین سو کے قریب تعلیقات آئی ہیں جو اس معیار کی نہیں ہیں نہ امام بخاری نے تعلیقات کو بیان کرنے میں اس معیار کو پیش نظر رکھا۔

امام ترمذی کی کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ حدیث کے طالب علم کو حدیث کے ذخائر سے اچھی طرح باخبر کر دیتی ہے۔امام ترمذی کا اسلوب یہ ہے۔(اگر یہاں ساری کتابیں ہوتیں تو بڑا اچھا ہوتا کہ میں ساتھ ساتھ مثالیں بھی دیتا جاتا) امام ترمذی کا اسلوب یہ ہے کہ کوئی حدیث بیان کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں کہ وفی الباب عن ابن عمرؓ وعن عائشہؓ وعن ابی ہریرۃؓ۔اس موضوع پر حضرت ابن عمرؓ، حضرت عائشہؓ اور ابی ہریرۃؓ کی حدیث بھی موجود ہے۔ایک تو وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس موضوع پر اور کن کن صحابہ کے بیانات یا روایات موجود ہیں جو بقیہ محدثین بیان نہیں کرتے۔دوسری بات امام ترمذیؒ کے ہاں یہ ہے کہ وہ حدیث کا درجہ بھی متعین کر دیتے ہیں۔حدیث بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں ھٰذا حدیث حسن، ھذا حدیث غریب، ھذا حدیث لانعرفہ الا من ھذا الوجہ، یہ حدیث تو ہے لیکن اس ایک سند کے علاوہ باقی کسی اور سند سے نہیں آئی۔یعنی اس کا درجہ اور اس کی حیثیت اپنی تحقیق کے مطابق واضح کر دیتے ہیں۔یہ کام بقیہ محدثین نہیں کرتے۔اس اعتبار سے امام ترمذی کی کتاب حدیث کے طلبہ کے لئے بڑی مفید ہے۔

امام ابوداؤد کی کتاب کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں احادیث احکام کا بڑا مجموعہ شامل ہے۔احادیث احکام کا اتنا بڑا مجموعہ نہ صحیح بخاری میں ہے اور نہ صحیح مسلم میں ہے، نہ ترمذی میں ہے اور نہ نسائی میں ہے۔ابوداؤد میں سب سے بڑا مجموعہ احادیث احکام کا ہے۔امام ابوداؤد کے بارے میں ایک بات یاد رکھئے گا۔امام ابوداؤد کا تعلق ہمارے پاکستان سے تھا۔وہ صوبہ بلوچستان کے ایک علاقہ سے تعلق رکھتے تھے۔تعین کے ساتھ یہ کہنا دشوار ہے کہ کس ضلع سے ان کا تعلق تھا لیکن غالباً ضلع قلات یا ضلع خضدار سے ان کا تعلق تھا۔وہ اصلاً اس علاقہ سے تعلق رکھتے تھے اور بعد میں یہاں سے وہ خراسان چلے گئے۔خراسان اور نیشاپور وغیرہ میں رہے۔پھر وہاں

سے آگے عرب دنیا اور بغداد وغیرہ میں تشریف لے گئے اور وہاں انہوں نے اپنی یہ بے نظیر کتاب مرتب فرمائی۔ لہٰذا ہم اہل پاکستان صحاح ستہ کے مصنفین میں سے ایک مصنف یعنی امام ابوداؤد کے ہم وطن ہیں۔

امام نسائی کی کتاب کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے حدیث کے متن اور رسول اللہ ﷺ کے الفاظ مبارک کی صحت کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ احادیث کے متن کو نقل کرنے میں کہیں کہیں اختلافی روایات ہیں۔ ایک صحابیؓ نے ایک طرح سے نقل کیا ہے دوسرے صحابیؓ نے دوسری طرح نقل کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وہ بات دومرتبہ ارشاد فرمائی ہو۔ اور دومرتبہ مختلف الفاظ میں ارشاد فرمائی ہو۔ ہوسکتا ہے ایک ہی مرتبہ ارشاد فرمائی ہو لیکن ان دونوں سننے والے صحابہ کا لہجہ الگ الگ ہو اور سننے والے نے اپنے لہجہ میں بیان کردیا ہو۔ دونوں چیزوں کا امکان ہے۔ اب ان حالات میں یہ تعین کرنا کہ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے کون سا لہجہ نکلا تھا، یہ خاصی محنت اور تحقیق کا کام ہے۔ امام نسائی نے یہ کاوش کی ہے کہ صحتِ متن کا التزام کریں اور اس بات کو یقینی بنائیں کہ متن زیادہ سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلنے والے الفاظ کے مطابق ہو۔ اسی لئے سنن پر جتنی کتابیں ہیں ان میں ضعیف احادیث کی سب سے کم تعداد سنن نسائی میں ہے۔ یہ نسائی نون کے زبر کے ساتھ ہے نَسائی، اس کا نِساء یعنی عورتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ نَسا وسط ایشیا میں کوئی شہر تھا جو آج کل غالباً ازبکستان میں ہے وہاں سے ان کا تعلق تھا۔ نسا سے نسبت ہے نسائی۔

ابن ماجہؒ جو اکثر لوگوں کے خیال میں صحاح ستہ کی آخری کتاب ہے۔ اس میں ترتیب بڑی اچھی ہے۔ پہلے کون سی احادیث ہوں، پھر کون سی ہوں، پھر کون سا باب ہو، پھر بڑے ابواب میں ذیلی ابواب کی تقسیم ہے، پھر چھوٹے ابواب میں انفرادی موضوعات کی تقسیم ہے۔ اس سلسلہ میں جس محدث نے سب سے زیادہ مفید اور حسین ترتیب اختیار فرمائی وہ امام ابن ماجہ نے اختیار فرمائی۔ ابن ماجہ کی کتاب حسن ترتیب اور حسن تبویب کے اعتبار سے زیادہ اچھے انداز کی بتائی جاتی ہے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم، یہ دونوں صحیحین کہلاتی ہیں۔ یعنی دو صحیح کتابیں۔ جب صحیحین کا لفظ استعمال کیا جائے گا تو بخاری اور مسلم مراد ہوں گے۔ شیخین کا لفظ بولا جائے گا تو بھی بخاری و

مسلم مراد ہوں گے۔ مُتَّفَق عَلَیہ کا لفظ بولا جائے گا تو بخاری ومسلم کی کتابیں مراد ہوں گی۔ لیکن ان دونوں میں دونوں کی شروط ملتی جلتی ہوں گی، ایک فرق کے ساتھ کہ امام بخاری کا معیار اور شرائط نسبتاً سخت ہیں۔ کل یا پرسوں میں نے عرض کیا تھا کہ امام بخاری جب عنعنہ کی بنیاد پر کسی راوی کی حدیث نقل کرتے تھے تو پہلے یہ تحقیق بھی کرتے تھے کہ اس راوی کی اپنے شیخ سے ملاقات ہوئی ہے کہ نہیں ہوئی۔ اگر یہ تیقن سے ثابت ہو جاتا کہ ملاقات ہوئی ہے تب روایت قبول کرتے تھے۔ اس کے برعکس عنعنہ (یعنی عن فلان عن فلان، فلاں شخص فلاں سے روایت کرتا ہے) کے اسلوب پر روایت کرتے وقت امام مسلم صرف یہ دیکھتے تھے کہ دونوں راویوں کے مابین امکان لقاء کافی ہے۔ یعنی ان دونوں کی ملاقات کا امکان موجود ہے، دونوں ہم عصر تھے ایک ہی علاقہ اور ایک ہی زمانہ میں رہے، اتنا کافی ہے اس سے آگے جانے کی ضرورت نہیں۔ شرائط کے اس فرق کی وجہ سے امام مسلم کا درجہ امام بخاری کے بعد آتا ہے۔

امام بخاری نے اپنی کتاب میں ابواب کے جو عنوانات رکھے ہیں وہ بڑے غیر معمولی ہیں۔ اسی لئے علماء حدیث نے لکھا ہے کہ فقہ البخاری فی ابوابہ، امام بخاری کو فقہ اور حدیث کی جو سمجھ ہے اور جس گہرائی کے ساتھ شریعت کے احکام کی فہم ان کو حاصل ہے وہ ان کے عنوانات سے سامنے آجاتی ہے۔ امام بخاری کے نزدیک کسی حدیث میں کیا کیا مضامین پنہاں ہیں وہ اس بات سے ہی واضح ہو جاتے ہیں کہ امام بخاری عنوان کیا لگاتے ہیں۔ حدیث کے عنوان سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس حدیث سے امام بخاری کیا سبق نکالنا چاہتے ہیں۔ امام بخاری کے برعکس امام مسلم نے نہ کوئی باب رکھا نہ کوئی عنوان رکھا۔ اگرچہ انہوں نے ترتیب موضوعات کے حساب سے رکھی ہے لیکن کسی باب کو بھی کوئی عنوان نہیں دیا۔ بعد میں آنے والوں میں سے امام نَوَوی نے جو بہت مشہور محدث تھے اور اپنے زمانے کے صف اول کے محدثین میں شمار کئے جاتے تھے۔ وہ امام مسلم کی کتاب کے شارح بھی ہیں اور ان کی یہ شرح بڑی مشہور ہے۔ انہوں نے اس میں عنوانات کا اضافہ کیا اور اس کے ساتھ ابواب کی تقسیم بھی کی ہے۔ اسی لئے اگر آپ صحیح مسلم کا نسخہ پاکستان کا یا ہندوستان کا چھپا ہوا دیکھیں، تو صحیح مسلم میں عنوانات حاشیہ میں لگے ہوئے نظر آئیں گے۔ اصل کتاب کے متن میں عنوانات نہیں لگائے گئے ہیں۔ اس لئے کہ امام مسلم نے اپنی کتاب میں کوئی عنوانات نہیں لگائے تھے۔ عرب دنیا کے چھپے ہوئے جو نسخے ہیں ان میں عنوانات بین

القوسین ہیں۔قوسین میں اس لئے لگائے گئے ہیں کہ یہ بعد کا اضافہ ہے، اصل کتاب میں امام مسلم نے نہیں لگائے تھے۔امام بخاری کے عنوانات بڑے دقّت نظر کے حامل ہیں جس کی وجہ سے ان کی کتاب کا درجہ اونچا ہوگیا۔

امام مسلم نے اپنی کتاب کے شروع میں ایک بڑا جامع مقدمہ بھی لکھا ہے۔امام بخاری نے کوئی مقدمہ نہیں لکھا اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کتاب شروع کردی ہے کہ 'باب کیف کان بدأالوحی علی رسول اللہ ﷺ کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی کا آغاز کیسے ہوا اور اسی باب پر کتاب شروع ہوگئی۔امام مسلم نے اپنی کتاب میں ایک مقدمہ لکھا اور تفصیل سے بیان کیا کہ اس کتاب کے لکھنے کی ضرورت کیوں پیدا ہوئی ۔ اس کتاب میں کن شرائط کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس کی وضاحت کی، پھر معاصرت، امکان لقا اور وجوب لقا پر گفتگو کی۔اس اعتبار سے ان کی کتاب کا درجہ تھوڑا سا اونچا ہے۔امام بخاری نے کوئی مقدمہ نہیں لکھا۔کتاب کے بارے میں جو کچھ ان کے ذہن میں تھا وہ کتاب کے مطالعہ سے واضح ہوجاتا ہے کہ ان کے ذہن میں کیا تھا۔ انہوں نے خود اپنے اسلوب، مقاصد اور اہداف کو بیان نہیں کیا، جبکہ امام مسلم نے خود بیان کیا ہے۔

امام بخاری کے ہاں ایک چیز، جو ایک پہلو سے بہت مفید چیز ہے اور ایک پہلو سے وہ ہمارے جیسے طلبہ کے لئے مشکل پیدا کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ امام بخاری کے ہاں احادیث موضوعات کے اعتبار سے یکجا نہیں ملتیں۔ایک حدیث کے ایک جملے سے اگر امام بخاری کوئی خاص استدلال کرنا چاہتے ہیں تو اس حصہ کو ایک باب میں بیان کریں گے، دوسرے جملہ کو کتاب کے دوسرے حصہ میں بیان کریں گے، تیسرے جملہ کو تیسرے حصہ میں بیان کریں گے۔ یا ایک حدیث اگر ایک سے زائد موضوعات پر مشتمل ہے تو اس حدیث کی ایک روایت ایک باب میں آجائے گی دوسری روایت دوسرے باب میں آجائے گی۔اگر آپ یکجا دیکھنا چاہیں تو جب تک پوری صحیح بخاری بار بار نہ پڑھیں اور آپ کو تقریباً زبانی یاد نہ ہوجائے اس وقت تک موضوع سے متعلق تمام احادیث کو تلاش کرنا بہت دشوار ہے۔آپ کو کہاں کہاں تلاش کرنا ہے؟ کون کون سی حدیث کس باب میں آئی ہے آپ کو نہیں معلوم۔اس طرح تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے۔اگرچہ قدیم محدثین ایسے تھے جو زبانی بتادیا کرتے تھے کہ یہ حدیث فلاں باب میں ہے، اور وہ حدیث فلاں باب میں ہے۔لیکن آج کل دشوار ہوگیا ہے۔لوگوں کا حافظہ اتنا تیز نہیں ہے، لوگ یاد بھی نہیں

کرتے اس لئے مشکل ہے۔

البتہ مسلم کے ہاں ساری احادیث یکجا مل جاتی ہیں۔مثلاً امام مسلم جب ایمان پر بات کریں گے تو وہاں ایمان سے متعلق ساری احادیث یکجا مل جائیں گی۔ جہاں علم کی بات ہوگی وہاں علم سے متعلق ساری احادیث یکجا ہوں گی۔ جہاں نفاق سے متعلق بات ہوگی وہاں نفاق سے متعلق ساری احادیث یکجا ہوں گی۔ یہ فرق اور موازنہ ہے امام بخاری اور امام مسلم کی کتابوں کے درمیان۔

ایک چھوٹا سا فرق اور بھی ہے۔ بلکہ ایک اعتبار سے یہ ایک بڑا فرق ہوگا۔وہ یہ کہ امام بخاری نے ضبط الفاظ پر نسبۃً کم زور دیا ہے۔یعنی رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلنے والے الفاظ کیا تھے۔جن راویوں نے احادیث کو بیان کیا ہے ان میں اگر کوئی **Variation** یا متن کا اختلاف ہے تو وہ کیا ہے، اس پر امام بخاری نے زیادہ زور نہیں دیا ہے۔ جبکہ امام مسلم نے اس پر بہت زور دیا ہے۔مثال کے طور پر امام مسلم جب حدیث بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ حدثنا هناد، حدثنا عبدالله واللفظ لعبدالله کہ مجھ سے یہ حدیث ھناد نے بھی بیان کی، یہ حدیث عبداللہ نے بھی بیان کی، مثلاً عبداللہ بن مبارکؒ نے، اور یہ الفاظ جو میں بیان کررہا ہوں یہ عبداللہ بن مبارکؒ کے ہیں۔اس سے گویا اشارہ یہ دینا مقصود ہے کہ ھناد نے بھی یہ حدیث بیان کی ہے، لیکن تھوڑے سے لفظی فرق کے ساتھ، دیگر روایات جب سامنے آئیں گی تو آپ کو اس فرق کا اندازہ ہوجائے گا۔امام بخاری جب حدیث بیان کرتے ہیں تو یہ تعین نہیں ہوتا کہ الفاظ دونوں راویوں کے ایک جیسے تھے یا دونوں کے الفاظ الگ الگ تھے۔الگ الگ تھے تو یہ الفاظ کس راوی کے ہیں، یہ آپ کو امام بخاری کے ہاں نہیں ملتا۔یہ آپ کو امام مسلم کے ہاں زیادہ تفصیل کے ساتھ ملتا ہے۔

دوسرا بڑا فرق یہ ہے (اس پر تفصیل سے آگے بات کریں گے، لیکن دونوں میں فرق کی بات چل رہی ہے اس لئے ضمناً اس کا ذکر کردینا ضروری ہے) کہ بالکل ابتدائی دور میں، یعنی صحابہ، تابعین اور تبع تابعینؒ کے دور میں اکثر و بیشتر لوگ بلکہ سارے ہی لوگ انتہائی مخلص، سچے، ذمہ دار، تقویٰ رکھنے والے اور خوف خدا سے سرشار ہوتے تھے، اس لئے کسی کے بارے میں یہ شبہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ بیان کرنے میں کوئی کوتاہی کرے گا۔لیکن بعد میں ایسے لوگ بھی میدان میں آگئے جن کے بارے میں یہ محسوس کیا گیا کہ شاید یہ پوری ذمہ داری سے کام نہ لیں۔

چونکہ محدثین کی معاشرہ میں بہت عزت ہوئی، لوگوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ رکھا اور ان کا احترام بادشاہوں سے بھی زیادہ ہونے لگا، تو بہت سے ایسے لوگ بھی میدان میں آگئے کہ جن کا مقصد دنیاوی عزت تھا یا کم از کم جزوی طور پر وہ دنیاوی عزت میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ جوں جوں ایسے لوگوں میں اضافہ ہوتا گیا محدثین اپنا معیار کڑا کرتے گئے بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کو مزید سخت کرتے گئے۔

اب تک حدیث بیان کرنے کے دو طریقے ہوتے تھے۔ ایک طریقہ یہ ہوتا تھا کہ طلبہ سامنے بیٹھ گئے۔ محدث، مثلاً امام بخاری نے اپنی یادداشت یا اپنے تحریری ذخیرے سے حدیث بیان کرنی شروع کر دی اور لوگوں نے لکھنا شروع کر دیا۔ لوگوں کی تعداد خاصی بڑی ہوتی تھی اور درمیان میں مستملی بھی ہوتے تھے۔ یعنی ہر دو چار سو آدمیوں کے درمیان ایک آدمی بیٹھا ہوتا تھا جو بلند آواز سے ان الفاظ کو دہراتا تھا۔ جیسے مکبر اذان کے الفاظ دہراتا ہے یا نماز میں اللہ اکبر دہراتا ہے۔ اس طرح مستملی ہوا کرتے تھے۔ بعض اوقات کئی کئی سو مستملی ہوا کرتے تھے جو ان الفاظ کو دہرایا تے تھے۔ محدث نے ایک لفظ زور سے کہا کہ 'انما الاعمال بالنیات' اب پہلے مستملی نے دہرایا، پھر دوسرے مستملی نے، پھر تیسرے نے پھر چوتھے نے، اور کوئی پندرہ بیس منٹ میں سب لوگوں نے لکھا۔ پھر اس نے اگلا جملہ بولا پھر اس سے اگلا۔ ایک طریقہ تو یہ تھا۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ طلبہ کے پاس تحریری ذخیرے موجود ہیں۔ امام بخاری نے جو لکھا، طلبہ نے اس کے تحریری نسخے پیشگی ہی حاصل کر لئے۔ لیکن اب طالب علم امام بخاریؒ کو سنا رہا ہے اور سننے کے دوران جہاں غلطی ہے وہ ٹھیک کر دیتے ہیں اور غلطی نہیں ہے تو سن کر کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے، میں نے اجازت دے دی ہے، اب تم میری طرف سے روایت کر سکتے ہو۔ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ سب سے پڑھ کر سنتے تھے۔ اگر چار پانچ ہزار طلبہ ہوں تو سب سے پڑھوا کر نہیں سنا جا سکتا۔ اس میں تو ایک ایک حدیث کے لئے پورا سال چاہئے۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ ایک طالب علم پڑھتا تھا اور بقیہ سنتے تھے اور پھر امام بخاری یا جو بھی محدث ہوتے تھے وہ اجازت دیتے تھے کہ اس طرح سے آپ سب لوگوں کو پڑھنے کی اجازت ہے۔ درمیان میں بطور احتیاط کسی سے سن بھی لیا، کبھی ایک سے کبھی دوسرے سے، اور سب کے بارے میں اندازہ ہو گیا کہ سب نے پڑھا ہے۔

بعد میں محدثین نے ان تینوں طریقوں کے تین درجات مقرر کیے۔ یہ تین گویا الگ الگ درجات ہو گئے۔ ایک تو وہ کہ جس میں محدث نے خود پڑھا اور لوگوں نے سنا۔ دوسرے میں طالب علم نے خود پڑھا اور محدث نے سنا۔ تیسرے میں ایک طالب علم نے پڑھا اور محدث نے سنا۔ لیکن دوسرے بہت سے طلبہ نے بھی سنا۔ امام مسلم کے ہاں ان تینوں میں الگ الگ فرق کیا گیا ہے۔ امام بخاری کے ہاں یہ فرق نہیں ہے۔ امام مسلم کی اصطلاح یہ ہے کہ اگر امام مسلم نے کہا کہ حدثنا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ امام مسلم کے استاد نے حدیث پڑھی، امام مسلم نے سنی اور سن کے لکھی۔ اگر امام مسلم نے کہا کہ اخبرنا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ امام مسلم نے حدیث پڑھی، ان کے استاد نے سنی اور سن کے اجازت دے دی۔ اور اگر کہیں ایسا ہوا کہ امام مسلم اپنے استاد کے درس میں موجود تھے، کسی اور نے حدیث پڑھی امام مسلم نے سنی، تو امام مسلم کہتے ہیں کہ اخبرنا فلان قراءة علیه و انا اسمع، ان کے سامنے پڑھا جا رہا تھا اور میں سن رہا تھا۔ آپ دیکھیں کہ accuracy کی اس سے بہتر مثال دنیا میں کہیں مل نہیں سکتی۔ اگر آپ یہودیوں اور عیسائیوں کے سامنے یہ بیان کریں تو وہ دنگ رہ جائیں گے کہ کسی کام میں اتنی accuracy بھی ہو سکتی ہے۔ کہ محدث نے خود نہیں پڑھا، قراءة علیه و انا اسمع، میرے استاد کے سامنے پڑھا جا رہا تھا، اور دوسرے طالب علم کے ساتھ ساتھ میں سن رہا تھا۔ استاد نے اس طرح سن کر اس کی اجازت دی تھی۔ یہ باریک فرق امام مسلم کے ہاں ہے اور امام بخاری کے ہاں نہیں ہے۔

احادیث نبویؐ کی تعداد

تعداد کے اعتبار سے صحیح مسلم کی احادیث زیادہ ہیں، صحیح بخاری کی احادیث کم ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ حدیث کی ہر کتاب میں ایک ایک حدیث بار بار آتی ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں اگر خطبہ حجۃ الوداع کا ذکر آئے گا تو اس میں درجنوں موضوعات پر بات ہوئی ہے۔ تو جہاں عورتوں کے حقوق کا ذکر ہے وہاں خطبہ حجۃ الوداع کا بھی ذکر آئے گا، جہاں لوگوں کی برابری اور مساوات کا ذکر ہے وہاں بھی اس خطبہ کا حوالہ آئے گا۔ جہاں حج کے احکامات کا ذکر ہے وہاں بھی خطبہ کا کوئی نہ کوئی حصہ زیر بحث آئے گا۔ جہاں منیٰ کا ذکر ہے وہاں بھی آئے گا۔ جہاں عرفات کا ذکر ہے وہاں بھی آئے گا۔ اس طرح ایک حدیث کئی ابواب میں آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث کی

کتابوں میں تکرار اور مکررات بہت ہوتے ہیں۔مکررات کو نکالے بغیر اگر صحیح بخاری کی احادیث کو گنا جائے تو صحیح بخاری کی احادیث کی تعداد ۹ ہزار بیاسی ہے (9082)۔ یہ تعداد حافظ ابن حجر نے بیان کی ہے جن سے بڑا بخاری کا شارح پیدا نہیں ہوا۔ یہ بات میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اس میں مکررات بھی شامل ہیں، تعلیقات بھی شامل ہیں، متابعات بھی شامل ہیں اور شواہد بھی شامل ہیں۔مکررات کو اگر نکال دیا جائے اور صرف وہ احادیث جو براہ راست پوری سند کے ساتھ رسول اکرم ﷺ سے روایت ہوئی ہیں وہ نکالی جائیں تو ۲ ہزار ۶ سو ۲ (2,602) ہیں۔اس کے برعکس صحیح مسلم میں کل چار ہزار احادیث ہیں۔گویا چار ہزار احادیث صحیح مسلم میں ہیں اور دو ہزار احادیث صحیح بخاری میں ہیں۔

احادیث کی کل تعداد کیا ہے؟ اس کے بارے میں کچھ کہنا بڑا دشوار ہے۔لیکن ایک عام اندازہ یہ ہے کہ تکرار کو نکالنے کے بعد کل متون تیس سے چالیس ہزار کے درمیان ہیں۔آج کل کمپیوٹر کا زمانہ ہے۔ بہت سے لوگوں نے حدیث کی کتابیں کمپیوٹرائز کرنا شروع کی ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد جب ساری کتابیں کمپیوٹرائزڈ ہو جائیں گی تو تمام احادیث کی اصل تعداد سامنے آجائے گی۔اس میں بھی قطعیت کے ساتھ تعداد کا تعین کرنا دشوار ہوگا۔ اس لئے کہ کمپیوٹر مکررات کی شناخت نہ کر سکے گا۔ایک حدیث کے الفاظ اگر مختلف ہیں لیکن مفہوم ایک ہے تو کمپیوٹر اس کو دو احادیث قرار دے گا، لیکن حدیث کا طالب علم اس کو ایک ہی حدیث سمجھے گا۔اس لئے قطعیت کے ساتھ کمپیوٹر کے لئے بھی دشوار ہوگا کہ بالکل درست تعداد بتا سکے، جو بہر حال تیس اور چالیس ہزار کے درمیان ہے۔

حُجّیت سنت

حُجیت السنۃ، یعنی کہ سنت کتاب اللہ کے ساتھ حجت ہے اور قرآن مجید کے احکام کی شارح ہے۔اس پر فقہائے اسلام نے بڑی تفصیل کے ساتھ غور کیا ہے۔اور سنت کے کردار پر بات کی ہے۔قرآن مجید میں بنیادی اصول یعنی اصول عامہ ہیں۔سنت میں ان اصولوں کی تطبیق بیان کی گئی ہے۔قرآن پاک میں اجمال ہے، سنت میں تفصیل بیان کی گئی ہے۔مثلاً قرآن پاک میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا فریضہ یہ ہے کہ لتبین للناس ما نزل الیھم، کہ جو کچھ اللہ کی

طرف سے نازل ہوا ہے اس کو لوگوں کے سامنے کھول کھول کر بیان کر دے۔ بیان کی مختلف قسمیں ہیں۔ سب سے پہلے تو بیانِ مراد ہے کہ کسی چیز سے اللہ تعالیٰ کی مراد کیا ہے۔ اقیموا الصلوٰۃ میں صلوٰۃ سے مراد کیا ہے۔ وللہ علی الناس حِج البیت میں حج سے مراد کیا ہے؟ خذ من اموالھم من صدقةٍ میں صدقہ سے مراد کیا ہے؟ یہ ساری چیزیں محتاج وضاحت ہیں۔ اور سنت کا کام یہ ہے کہ ان چیزوں کی اصل معنی کو واضح کر دے۔

سنت اگر نہ ہو تو پھر قرآن پاک کے ان الفاظ کے کوئی معنی متعین نہیں کئے جا سکتے۔ نہ لغت کی مدد سے متعین کئے جا سکتے ہیں نہ کسی اور ذریعے سے۔ قرآن پاک میں اعتکاف کا تذکرہ ہے وانتم عاکفون فی المساجد، اعتکاف سے کیا مراد ہے؟ عاکف کس کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں اس طرح کے درجنوں نہیں سینکڑوں احکام ہیں جن کی کوئی تعبیر وتشریح کسی کے لئے ممکن نہیں ہے اگر سنت کی تعبیر وتشریح ہمارے سامنے نہ ہو۔

اس طرح قرآن پاک کی کچھ آیات میں کچھ الفاظ ہیں جن کے لئے مبہم کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے، یعنی ان کی مراد واضح نہیں ہے۔ سنت سے ان کی تفسیر ہو جاتی ہے۔ کچھ آیات ہیں جو مجمل ہیں۔ سنت سے ان کی تفصیل آ جاتی ہے۔ کچھ آیات ہیں جو مطلق اور عمومی انداز میں آئی ہیں۔ سنت سے ان کی تقیید ہو جاتی ہے۔ سنت اس کو قید کر دیتی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے۔ کچھ الفاظ ہیں جو قرآن مجید میں عام استعمال ہوئے ہیں سنت ان کو خاص کر دیتی ہے کہ اس سے خاص مراد یہ ہے اور اس سے باہر نہیں ہے۔ کچھ احکام ہیں جن کے لئے تشریح کی ضرورت ہوتی ہے کہ ان کو نافذ کیسے کیا جائے گا۔ سنت سے ان احکام کی شرح ہو جاتی ہے۔ قرآن پاک میں کچھ احکام ہیں کہ سنت سے اس کے دائرے میں توسیع ہو جاتی ہے کہ اگرچہ اس کا دائرہ بظاہر یہاں تک معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کا انطباق آگے بھی ہوگا۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ قرآن میں ان کے متعلق ایک اصول آیا ہے لیکن اس اصول سے کون کون سے جزوی مسائل نکلتے ہیں ان کی مثالیں سنت نے دے دی ہیں۔ یہ کام ہے، قرآن پاک کی رو سے سنت کا۔ سن رسول کا یہ کام ہے کہ ان سب چیزوں کی وضاحت کرے۔

مثال کے طور پر قرآن پاک میں ایک اصول دیا گیا کہ 'لاتاکلوا اموالکم بالباطل الاان تکون تجارۃ عن تراض منکم' ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے مت کھاؤ، سوائے

اس کے تمہاری آپس کی رضامندی سے تجارت اور لین دین ہو۔ آپس کی رضامندی یعنی کھلی، آزادانہ اور برابر کی رضامندی کے ساتھ آپس میں تجارت ہو تو یہ مال لینا جائز ہے۔ اس کے علاوہ ایک دوسرے کا مال لینا کسی بھی حالت میں جائز نہیں ہے۔ اب یہ قرآن کریم کا ایک بنیادی اصول ہے۔ اس کا انطباق کیسے ہوگا اور کہاں کہاں ہوگا۔ اس کی بے شمار مثالیں حدیث میں ملتی ہیں۔ حدیث کی یہ جزوی مثالیں قرآن مجید سے کوئی الگ چیز نہیں ہیں، بلکہ قرآن مجید میں بیان کردہ اسی چیز کی تشریح ہیں، قرآن ہی کے اصولوں کی تشریح ہے۔ مثلاً حدیث میں آیا ہے کہ لاتبع مالیس عندك، جو تمہارے پاس نہیں اس کو فروخت مت کرو، جس چیز کے تم آج مالک نہیں ہو اس کو فروخت مت کرو۔ اب آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا تراضی سے کیا تعلق ہے، ذرا غور کریں تو واضح ہو جاتا ہے کہ اس کا تراضی سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ مثلاً میں راول ڈیم میں شکار کھیلنے جانا چاہتا ہوں اور آپ مجھے ایک ہزار روپے دے دیں کہ جتنی مچھلی شکار ہوگئی وہ آپ کی۔ یہ جائز نہیں ہے۔ یہ عن تراضٍ نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ میرے ذہن میں یہ ہو کہ بیس پچیس کلو مچھلی ملے گی اور میں نے اسی بیس پچیس کلو مچھلی کے لئے ایک ہزار روپے لے لئے۔ اب میں نے آ کے کہا کہ مجھے تو یہ چھوٹی سی ایک ہی مچھلی ملی ہے یہ لے لو۔ ظاہر ہے کہ ایک ہزار روپے میں ایک چھوٹی سی مچھلی آپ کے لئے قابل قبول نہیں ہوگی۔ اس کے برعکس میں چاہوں گا کہ آپ ایک ہزار روپے میں ہی ایک مچھلی قبول کر لیں۔ میں سخت ناراضگی کا اظہار کروں گا اور آپ سے جھگڑوں گا تو تراضی تو ختم ہوگئی۔ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ آپ کے ذہن میں یہ ہو کہ ایک ہزار روپے میں تو دس کلو مچھلی ملے گی، اتفاق سے وہاں پچاس کلو مچھلی نکل آئی۔ اب آپ کی رال ٹپکی کہ یہ تو ایک ہزار روپے میں دس ہزار کی مچھلی مل گئی۔ ظاہر ہے کہ میں اس کے لئے آسانی سے تیار نہیں ہوں گا۔ اس جھگڑے سے بچنے کے لئے یہ ہدایت دی گئی کہ اس چیز کی خرید و فروخت ہی نہ کرو جو ابھی تمہارے قبضہ اور ملکیت میں نہیں ہے۔ تو یہ مراد ہے ماتبع مالیس عندك' گویا جو چیز تجارت میں تراضی کو متاثر کرے اور آگے چل کر تراضی کے منافی ثابت ہو وہ جائز نہیں۔ تراضی سے مراد ہے دونوں فریقوں میں برابر کی آزادانہ رضامندی۔

خلاصہ یہ کہ ایک مچھیرا شکار شروع کرنے سے پہلے ہی سودا کر لے کہ ہزار روپے دے دیں جتنی مچھلی ہاتھ لگی سب آپ کی۔ یہ جائز نہیں کیونکہ اس میں عن تراضٍ کی خلاف ورزی ہے۔

اگر مچھلی ہزار روپے سے زیادہ کی پکڑی گئی تو لینے والا تو خوش ہو جائے گا کہ اس کو ہزار روپے میں پندرہ سو کی مچھلی مل گئی لیکن مچھیرے کے دل پر کیا گزرے گی۔ یا فرض کریں کہ مچھلی توقع سے بہت کم مل گئی تو مچھیرا خوش ہوگا کہ بھئی تین سو کی مچھلی ہزار روپے میں بک گئی لیکن لینے والے کے دل پر کیا گزرے گی۔ تو اس طرح کے دل آزار سودے، جن پر دل راضی نہ ہو، جائز نہیں ہیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ 'نھیٰ رسول اللہ ﷺ عن بیع الثمر قبل ان یبدو صلاحھا' کہ درخت میں جب تک پھل کے بارہ میں یہ بات واضح طور پر سامنے نہ آجائے وہ پک چکا ہے، اور درخت پر موجود ہے، اس وقت تک اس کی بیع جائز نہیں ہے۔ لوگ اکثر ایسا کرتے ہیں کہ موسم کے شروع میں ہی باغوں کو فروخت کر دیتے ہیں، جبکہ ابھی پھل لگا بھی نہیں ہوتا۔ یہ جائز نہیں ہے۔ مثلاً میں نے اپنے آموں کے باغ کی ربیع کی اگلی فصل آپ کو دے دی ہے آپ ایک لاکھ روپے مجھے دے دیجئے۔ اب آم لگے گا کہ نہیں لگے گا، آندھی چلے گی سارا بور گر جائے گا، کوئی ویسے چرا کر لے جائے گا یا باغ میں آگ لگ جائے گی، ہزاروں چیزیں ہوسکتی ہیں۔ مجھے ان سے بحث نہیں، میں نے اپنے ایک لاکھ روپے کھرے کر لئے۔ اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔ یہ چیز تراضی کے خلاف ہے اور شریعت میں جائز نہیں۔ جب تک درخت میں پھل لگ کر واضح نہ ہو جائے کہ پھل لگ چکا ہے اور اب عام حالات میں نہیں گرے گا اس وقت تک اس کی فروخت جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس میں بھی تراضی میں گڑبڑ پیدا ہوگی۔ یہ مثالیں اس بات کی ہیں کہ حدیث میں جو ہدایات آئی ہیں وہ قرآن پاک ہی کے کسی بنیادی اصول کی تشریحات ہیں۔

بعض اوقات قرآن پاک میں ایک حکم کا دائرہ بتا دیا گیا ہے کہ اس حکم کا یہ دائرہ ہے۔ سنت نے اس دائرہ کو وسیع کر دیا کہ اس کا انطباق فلاں جگہ پر بھی ہوتا ہے جو بظاہر الفاظ میں نہیں ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید میں آیا ہے کہ احل لکم الطیبات، تمہارے لئے پاکیزہ چیزیں حلال ہیں اور 'ویحرم علیکم الخبائث، اور ناپاک اور گندی چیزیں تمہارے لئے حرام ہیں۔ اب طیبات کیا ہیں اور خبائث کیا ہیں۔ اس کی وضاحت بہت سی احادیث میں ہوئی ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں آیا ہے کہ 'نھیٰ رسول اللہ ﷺ عن کل ذی ناب من کل سباع، کہ ہر وہ درندہ جو اپنے دانت سے شکار کر کے کھاتا ہے اس کا گوشت حرام ہے۔ اب حضورؐ نے بتایا ہے

کہ یہ بھی خبائث میں شامل ہے۔طیبات میں شامل نہیں ہے۔پھر حدیث میں آپ نے فرمایا کہ ہر وہ پرندہ جو جانور کا شکار کر کے اس کا گوشت کھاتا ہے اس کو سباع میں شامل سمجھا جائے گا گویا وہ بھی طیبات میں نہیں خبائث میں شامل ہے۔قرآن پاک میں تو ایک عمومی بات ہے لیکن اس کی مثالیں کون بتائے ، کیسے پتہ چلے کہ کون سی چیز طیبات میں شامل ہے اور کون سی چیز خبائث میں سے ہے یہ حدیث اور سنت ہی سے پتہ چل جائے گا۔ ان مثالوں سے اس کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

قرآن پاک میں آیا ہے کہ 'وان تجمعوا بین الاختین' کہ دونوں بہنوں سے ایک وقت میں نکاح جائز نہیں ہے، ایسا کرنا حرام ہے۔ اب یہ بالکل صریح حکم ہے اور الفاظ میں مزید اضافہ کی بظاہر کہیں گنجائش نہیں ہے، لیکن حدیث میں آیا ہے کہ پھوپھی اور بھتیجی سے بھی بیک وقت نکاح نہیں ہوسکتا۔ بھانجی اور خالہ سے بھی بیک وقت نکاح نہیں ہوسکتا۔ یہ گویا extension ہے ان احکام کی جو قرآن پاک میں آئے ہیں۔حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا۔

اسی طرح قرآن پاک میں جو بات یا حکم مجمل ہے اس کی تفصیل حدیث میں بیان کردی گئی ہے جس کی مثالوں سے ہر مسلمان واقف ہے۔آپؐ نے فرمایا کہ صلوا کما رائیتمونی اصلی ،جس طرح مجھے دیکھو نماز پڑھتے رہو۔ خذوا عنی مناسککم، حج کے مناسک مجھے دیکھتے جاؤ کرتے جاؤ۔اسی طرح زکوۃ کے احکام کی تفصیل بتائی۔

پھر بعض جگہ قرآن پاک میں ایک لفظ عام ہوتا ہے لیکن سنت سے اس کی تخصیص ہو جاتی ہے کہ اس سے فلاں چیز مراد نہیں ہے۔مثال کے طور پر قرآن پاک میں ہے یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین 'اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے اپنی اولاد کے بارے میں کہ ہر مرد کو آدھا حصہ ملے گا عورت کے مقابلہ میں۔ یہ اصول صرف اولاد میں چلے گا اور جگہ نہیں چلے گا ،بعض جگہ برابر بھی ہے بعض جگہ زیادہ بھی ہے۔سورۃ النساء کو دوبارہ پڑھئے گا تو پتہ چلے گا کہ بعض جگہ عورتوں کا حصہ برابر ہے اور بعض جگہ زیادہ ہے۔ ہماری مغرب زدہ عورتوں کو یہ پہلی آیت تو یاد رہتی ہے باقی آیات یاد نہیں رہتیں لیکن یہ ایک عام اصول ہے۔

حضورؐ نے فرمایا لایرث القاتل ۔اگر بیٹا باپ کا قاتل ہو تو اس کو وراثت نہیں ملے گی۔ پوتا دادا کو قتل کردے تو وراثت نہیں ملے گی۔بھتیجا چچا کو قتل کردے تو وراثت نہیں ملے گی۔

ویسے تو وراثت کا حکم عام ہے اور قرآن پاک میں اس کی تخصیص نہیں ہے۔ لیکن حدیث میں اس کی تخصیص کر دی گئی ہے۔

قرآن پاک کے دوسرے پارے میں سورۃ بقرہ میں ہے کہ کتب علیکم الوصیۃ تم پر وصیت فرض کی گئی ہے۔ یہ ایک عام حکم ہے۔ اس عمومی کی تخصیص کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ الالا وصیۃ لوارث، سن لو، وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں ہوسکتی۔ گویا یہ حضورؐ نے تخصیص کر دی ہے قرآن پاک کے ایک عمومی حکم کی۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ سمجھنا درست نہیں ہوگا کہ سنت کا کام بس یہی ہے کہ قرآن پاک کے اجمال کی تفصیل کرے یا اس کے دائرے میں توسیع کر دے اور اس کے علاوہ سنت کا کوئی کردار نہیں۔ سنت کا کردار براہ راست احکام دینا بھی ہے۔ قرآن پاک میں ہے کہ ہم نے رسول کو بھیجا لیحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث، تاکہ وہ رسول طیبات کو ان کے لئے حلال قرار دے اور خبائث کو ناجائز قرار دے۔ گویا رسول خود بھی جس چیز کو طیب دیکھیں اس کو جائز قرار دیں اور جس چیز کو خبیث دیکھیں اس کو حرام قرار دے سکتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جائز و ناجائز کے کئی ایسے احکام ہیں جو سنت میں براہ راست ملتے ہیں، جن کی کوئی بنیاد براہ راست قرآن پاک میں نہیں ہے۔ مثلاً خیار شرط کی حضورؐ نے اجازت دے دی ہے۔ ایک صحابیؓ تھے جو بڑے سادہ لوح تھے ان کا نام جہان ابن منقذؓ تھا۔ وہ جب خرید وفروخت کیا کرتے تھے تو اکثر دھوکہ کھا کے آتے تھے۔ گھر والے کہتے تھے کہ آپ تو یہ چیز مہنگی لے آئے، آپ تو غلط لے آئے، یہ تو سستی مل سکتی تھی، انہوں نے حضورؐ سے شکایت کی کہ میں اس طرح جاتا ہوں اور خریداری کر کے گھر واپس آتا ہوں تو گھر والے کہتے ہیں کہ یہ سودا تو غلط ہوا، دوبارہ بازار جاتا ہوں تو بازار کے لوگ مانتے نہیں، مجھے کیا کرنا چاہئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اذا بایعت، جب تم آئندہ بیع وشراء کرو، فقل، تو یہ کہہ دیا کرو، کہ لا خلابہ، میں دھوکہ نہیں دینا چاہتا، و لی الخیار ثلاثۃ ایام، مجھے اختیار رہوگا کہ میں تین دن تک چاہوں تو اس کو واپس کرسکوں۔ یہ تین دن کی شرط رکھ لیا کرو۔ یہ بنیاد ہے تین دن کی شرط کی کہ گویا اگر کوئی خریدا تین دن خیار شرط رکھنا چاہے کہ میں تین دن تک اس پر دوبارہ غور کرسکتا ہوں اور اگر رائے بدلی تو واپس کرسکتا ہوں تو اس کی اجازت ہے اگر دونوں فریق طے کریں۔ اس کی کوئی بنیاد براہ راست قرآن پاک میں نہیں

ہے۔لیکن بالواسطہ تراضی میں یہ بھی شامل ہے کہ اگر دونوں فریق راضی ہوں تو یہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا قرآن پاک میں اس حکم کی بالواسطہ بنیادیں تو ہیں لیکن براہ راست بنیاد کا تعین کرنا مشکل ہے۔

شفعہ کے بارے میں حدیث میں ہے کہ اگر آپ کے پڑوس میں کوئی جائداد مل رہی ہو، یا آپ کسی جائداد میں شریک ہوں، اس میں آپ کا حصہ ہو، اور ایک حصہ دار اپنا حصہ بیچنا چاہے تو پہلا حق آپ کا ہے بہ نسبت غیر آدمی کے۔ آپ نے اپنی بہن کے ساتھ مکان بنایا ہے اوپر وہ رہتی ہے نیچے آپ رہتے ہیں۔ اب بہن اپنا حصہ بیچنا چاہتی ہے، بجائے اس کے کہ کوئی غیر آدمی آئے اور آپ کو اس سے زحمت ہو، پردے کے مسائل پیدا ہوں یا اور کوئی مسئلہ ہو تو آپ کو شریعت نے یہ اختیار دیا ہے کہ آپ بہن یا کسی بھی شریک جائداد سے کہیں کہ یہ حصہ کسی اور کو دینے کے بجائے مجھے دے دو۔ اب بہن کی ذمہ داری ہے کہ پہلے آپ کو ترجیح دے اور آپ کے ہاتھ فروخت کرے۔ یہ شفعہ کے بارے میں شریعت کا حکم ہے جو آج دنیا کے بہت سے قوانین میں استعمال ہوتا ہے اور اب دنیا اس سے مانوس ہوگئی ہے۔ لیکن انگریز کے زمانے سے پتہ نہیں کیوں یہ چلا آرہا ہے کہ شہری جائداد پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ کیوں نہیں ہوتا؟ ہونا چاہئے، شریعت کا جو منشا ہے وہ ہر جائداد پر حق شفعہ کے لاگو ہونے سے ہی پورا ہو سکتا ہے۔ یہاں شہری جائداد کا استثنا کر دیا گیا ہے اور غیر شہری جائداد پر ہی اس کا انطباق ہوتا ہے۔

یہ اس موضوع پر گفتگو کا مختصر خلاصہ ہے کہ سنت ماخذ شریعت ہے۔ کس طرح ماخذ شریعت ہے، اس کے احکام میں احادیث کے درجات کا لحاظ رکھا جائے گا۔ صحت کے لحاظ سے، ثبوت کے اعتبار سے اور معنی کے اعتبار سے احادیث کے جو مختلف درجات ہیں، ان سب کو پیش نظر رکھ کر طے کیا جائے گا کہ کس حدیث سے کون سے احکام نکلتے ہیں۔ اسی کے حساب سے احکام کا درجہ متعین ہوگا۔ جو حدیث متواتر کے درجہ کی ہے، جس پر کل بات ہوگی، اس کا درجہ سب سے اونچا ہے۔ پھر آگے مختلف درجات ہیں جن پر ہم آئندہ بات کریں گے۔

وآخر دعوانا أن الحمدلله رب العلمين

☆☆☆☆☆☆☆

کیا صحیح بخاری میں سب صحیح احادیث ہیں؟ کوئی ضعیف حدیث نہیں ہے؟

صحیح بخاری کے اندر کوئی ضعیف حدیث موجود نہیں ہے۔ محدثین کے معیارات کی رو سے اس کی تمام احادیث صحیح احادیث ہیں۔

جو منکرین حدیث نماز کو ہی دعا کا نام دیتے ہیں ان کو کیسے بتایا جائے، وہ کہتے ہیں کہ قرآن ایک مکمل کتاب ہے اور اس میں اگر وضو اور تیمم کا طریقہ بتایا جاسکتا ہے تو نماز کا طریقہ کیوں نہیں بتایا گیا؟ وہ لوگ الصلوۃ کا مطلب دعا کرتے ہیں کیونکہ یہ لفظ قرآن ہی میں دعا کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ قرآن مجید یقیناً ایک مکمل کتاب ہے، لیکن اگر قرآن مجید کے ساتھ ایک معلم بھی بھیجا گیا ہے، شارع بھی ساتھ بھیجا گیا ہے تو شارع اور معلم کا ساتھ بھیجا جانا قرآن کے مکمل ہونے سے متعارض نہیں ہے۔ قرآن شارع کی موجودگی میں بھی مکمل ہوسکتا ہے اور ایک معلم کی موجودگی میں بھی مکمل ہوسکتا ہے۔ اس کی تکمیل میں کوئی فرق نہیں آتا۔ مکمل اس اعتبار سے ہے کہ انسان کی اس دنیا اور آخرت میں کامیابی کے لئے، ایک اخلاقی اور روحانی کامرانی اور خوف خدا رکھنے والے انسان کے طور پر کامیابی کے جو تمام اصول ہیں وہ سارے کے سارے اس کتاب میں سمو دیئے گئے ہیں اور اس کتاب کے باہر اب کوئی بھی ایسا اصول نہیں ملتا جس پر انسان کی اخروی کامیابی کا دارومدار ہو اور وہ اس کتاب میں موجود نہ ہو۔ لیکن کسی اصول کی تشریح یا وضاحت اگر کی جائے تو اس سے کتاب کی کاملیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

جناب تعلیقات کو دوبارہ بیان کر دیجئے؟

'تعلیقات' تعلیق کی جمع ہے۔ اس کے لغوی اور لفظی معنی ہیں معلق یعنی لٹکا ہوا کر دینا۔ معلق اس حدیث یا روایت کو کہتے ہیں کہ جس میں راوی کے اور جس کی روایت ہے اس کے درمیان کچھ واسطے کٹ گئے ہوں، اس پر آئندہ بات ہوگی کہ علم حدیث کی اصطلاح میں معلق کس کو کہتے ہیں۔ امام بخاری بہت سی معلق روایات صحیح بخاری میں لائے ہیں، اس لئے کہ وہ ان کو بطور استدلال کے یا کسی چیز کے شواہد کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں براہ راست حدیث کے طور پر پیش کرنا ان کا مقصد نہیں ہے۔ کل میں صحیح بخاری ساتھ لے آؤں گا تو اس میں سے تعلیقات کی مثال دے کر آپ کے سامنے بیان کر دوں گا۔ اب چونکہ تعلیقات کتاب کے اصل ڈھانچہ کا حصہ نہیں ہے، اس لئے ان معلق روایات کا وہ درجہ نہیں ہے جو کتاب کی اصل روایات کا ہے۔ بلکہ کسی خاص

روایت کی کسی خاص بات کی وضاحت کے لئے انہوں نے ضمناً کوئی روایت نقل کردی ہے، اس کو تعلیق کہتے ہیں جیسے چلتے چلتے ذہن میں کوئی بات آجائے اور آدمی اس کو بیان کردے۔ اس مقصد کے لئے امام بخاری نے یہ چیزیں شامل کی ہیں۔

ہم جیسے طلبہ جو حدیث کے بارے میں پہلی بار کچھ سیکھ رہے ہیں اگر مزید سیکھنا چاہیں تو متوسط ذہن کے لئے آپ کے خیال میں حدیث کی کونسی کتاب درست ہوگی؟

ایک تو ہے متن حدیث، یعنی احادیث کا ایسا مجموعہ جس میں ترجمہ بھی ہو اور اچھی تشریح بھی ہو، اس کے لئے میری ناچیز رائے میں دو کتابیں بہت اچھی ہیں۔ ایک کتاب نسبتاً ذرا آسان ہے دوسری کتاب نسبتاً ذرا مشکل ہے۔ آسان کتاب تو ہے 'معارف الحدیث'۔ یہ مولانا منظور نعمانی کی ہے۔ وہ ہندوستان کے معروف عالم تھے، حال ہی میں ان انتقال ہوگیا ہے۔ بڑے پائے کے صاحب علم تھے۔ ان کی یہ کتاب معارف الحدیث سات جلدوں میں ہے، اردو میں ہے بہت اچھی کتاب ہے۔ دوسری کتاب ہے 'ترجمان السنۃ'۔ یہ ایک بزرگ تھے مولانا بدر عالم صاحب ہجرت کرکے، مدینہ منورہ چلے گئے تھے، اس لئے مہاجر مدنی کہلاتے ہیں۔ ان کی کتاب 'ترجمان السنۃ' چار جلدوں میں ہے۔

منتخب احادیث کے متن، ترجمہ اور شرح کے مطالعہ کے لئے یہ دو کتابیں کافی ہیں اور ان سے ان شاء اللہ بہت رہنمائی ملے گی۔ جہاں تک علم حدیث کا بطور فن کے سمجھنے کا تعلق ہے، اس پر اردو میں بہت سی کتابیں ہیں لیکن ان میں سب سے اچھی کتاب کونسی ہے، میرا خیال یہ ہے کہ اردو میں جو کتابیں ہیں ان میں سب سے اچھی کتاب لبنان کے ایک بڑے صاحب علم انسان ڈاکٹر صبحی صالح کی کتاب 'مباحث فی علوم الحدیث' ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ ترجمہ غالباً سیالکوٹ کے کسی بزرگ نے کیا تھا۔ یہ ترجمہ کئی بار چھپ چکا ہے۔

ہم صحیح اور ضعیف حدیث میں کیسے فرق کر سکتے ہیں؟

اس پر کل تفصیل کے ساتھ بات ہوگی۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بخاری میں ضعیف احادیث بھی ہیں۔ وہ ایسا کیوں کہتے ہیں؟

یہ انہی سے پوچھئے کہ وہ کیوں کہتے ہیں۔ محدثین جو اس فن کے ماہر ہیں جو ہمیشہ سے اس پر غور کرتے آرہے ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ بخاری میں کوئی ضعیف حدیث شامل نہیں ہے۔ صحیح

بخاری میں جتنی بھی احادیث ہیں وہ ساری کی ساری صحیح ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھئے کہ صحیح احادیث میں بھی بعض احادیث ہیں کہ ان پر عمل کرنے کے لئے کچھ شرائط پیش نظر رکھنی پڑتی ہیں، کن حالات میں ان پر کس طرح عمل کیا جائے گا، یہ ایک لمبی اور تفصیلی بحث ہے۔ اس میں صرف لفظ 'صحیح' کو یاد کر کے کوئی فیصلہ کرنا غیر متخصص کے لئے درست نہیں ہے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں مسلم کی خصوصیات قدرے زیادہ ہیں......

نہیں، بخاری کی خصوصیات زیادہ ہیں۔ مسلم کی کم ہیں۔ لیکن بعض خصوصیات مسلم کی زیادہ ہیں۔ بعض بخاری کی زیادہ ہیں۔ مجموعی طور پر بخاری کی خصوصیات زیادہ ہیں۔ اس لئے امت نے عام طور پر بخاری ہی کو پہلا درجہ دیا ہے۔ لیکن سب اللہ کے رسول کے کا کلام ہے ہمارے لئے سب کا درجہ برابر ہے اور اگر دونوں میں موازنہ کرنا ہی ہے تو نسبتاً بخاری کا درجہ زیادہ بنتا ہے۔

تلقی بالقبول کی صورت میں حدیث کو درست یا صحیح قرار دینا، کیا یہ طریقہ آج بھی درست ہوگا؟

نہیں آج تلقی بالقبول کی بنیاد پر کسی ضعیف حدیث کو قابل قبول قرار دینا درست نہیں ہوگا۔ اگر کسی حدیث کو متقدمین نے بالاتفاق ضعیف یا کمزور یا ناقابل قبول قرار دیا ہے تو آج تلقی بالقبول کی وجہ سے وہ قابل قبول نہیں ہو جائے گی۔ تلقی بالقبول ان لوگوں کے درمیان مانا جاتا ہے جو علم حدیث کے امام تھے۔ ہمارے اور آپ کے درمیان تلقی بالقبول کی کوئی حیثیت نہیں۔ ہم اور آپ تو کسی شمار قطار میں نہیں آتے، جو حدیث کے ائمہ ہیں، علماء ہیں، جنہوں نے زندگیاں اس میں کھپائی تھیں ان میں دیکھا جائے گا کہ کسی حدیث کو تلقی بالقبول حاصل تھی کہ نہیں تھی۔ مثال کے طور پر ایک چیز عرض کرتا ہوں۔ تلقی بالقبول کے بھی قواعد ہیں۔ مثلاً ایک حدیث ہے 'لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق'۔ کسی مخلوق کی اطاعت اُس وقت نہیں کی جاسکتی جب اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو رہی ہو۔ ماں باپ کی اطاعت نہیں ہوسکتی اگر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو رہی ہو۔ عدالت کی فرمانبرداری نہیں ہوسکتی اگر اللہ کے حکم کی خلاف ورزی ہو رہی ہو، حکومتوں کے احکام کی پابندی نہیں ہوسکتی اگر اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی ہو رہی ہو۔ لیکن یہ حدیث ان الفاظ میں بہت ضعیف ہے۔ پتہ نہیں کسی بہت غیر مستند کتاب میں آئی ہوگی۔ لیکن معناً درست ہے اور اس

سے کوئی اختلاف نہیں کرسکتا۔ دوسرے الفاظ میں کسی اور عبارت میں یہی اصول قرآن پاک میں بھی آیا ہے حدیث میں بھی آیا ہے۔ چونکہ ان الفاظ کو تلقی بالقبول حاصل ہے اس لئے ہم اس کو کہیں گے کہ درست ہے۔ تلقی بالقبول تبع تابعین کے زمانے ہی تک درست ہے۔ یعنی تابعین، تبع تابعینؒ اور ائمہ محدثین کے زمانے تک۔

کیا حدیث کی کتابیں آج بھی ویسی ہی ہیں جیسے لکھی گئیں تھیں؟

حدیث کی کتابوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ الحمدللہ وہ ویسی کی ویسی موجود ہیں اور آج تک موجود ہیں۔ اب اس میں کسی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے کیونکہ لاکھوں کی تعداد میں چھپی ہوئی ہیں۔ حدیث کے ہزاروں حافظ آج بھی موجود ہیں۔ میں نے دیکھا ہے ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنی یادداشت سے پوری صحیح بخاری سنا سکتے ہیں اور ایک نقطہ کا فرق نہیں ہوتا۔

عورتوں کی نماز کے طریقے میں کیا فرق ہے؟ کیا دونوں کی نماز ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے؟

بہت مختلف تو بالکل نہیں ہے۔ جو اختلاف ہے وہ بہت ہلکی قسم کا ہے۔ آپ کا جیسے جی چاہے نماز پڑھیں آپ کی نماز ہو جائے گی، آپ اس اختلاف کی تفصیلات میں نہ جائیں۔

ایک روایت میں ہے کہ خواتین کو نماز کے وقت پردے اور حجاب کا اہتمام کرنا چاہئے۔ ایک حدیث سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اب اس کی تعبیر کیسے ہو اور اس پر عمل درآمد کیسے ہو۔ بعض فقہا یہ کہتے ہیں کہ جب خواتین نماز پڑھیں تو خاص طور پر جب سجدے میں جائیں تو اس طرح نہ جائیں کہ ان کے جسم کی ساخت ظاہر ہو کیونکہ سجدے میں لباس جسم سے چمٹ جاتا ہے اور کھڑے رہنے میں ڈھیلا رہتا ہے۔ سجدے کے وقت لباس کمر اور جسم پر چپک جاتا ہے اور جسم کی ساخت ظاہر ہو جاتی ہے۔ تو پردے کا جو معیار ہے وہ برقرار نہیں رہتا۔ اس لئے بعض فقہا نے کہا ہے کہ جب خواتین سجدہ میں جائیں تو یہ اہتمام کریں کہ لباس جسم سے نہ چپکے اور وہ اپنے جسم کو سمیٹ لیں۔ بعض نے کہا کہ حجاب کا اہتمام تو کرلیں لیکن جسم کو سمیٹنے کی ضرورت نہیں۔ یہ محض ایک تعبیر کی بات ہے۔ آپ کا جیسے جی چاہے کریں۔ اس طرح کی چیزوں پر غیر ضروری اور طویل بحث نہیں کرنی چاہئے۔

موطا صحاح ستہ میں کیوں شامل نہیں؟

موطا امام مالکؒ کے بارے میں ابھی تو میں نے اتنی تفصیل سے عرض کیا ہے۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس میں احادیث کے علاوہ بہت سی اور چیزیں بھی شامل ہیں جو احادیث نہیں ہیں۔ اس میں امام مالکؒ کے اپنے فرمودات اور فتاویٰ بھی شامل ہیں جو احادیث کا موضوع نہیں ہے۔ چونکہ موطا خالص احادیث کا مجموعہ نہیں ہے اس لئے بہت سے لوگوں نے اس کو احادیث کے مجموعوں میں شامل نہیں کیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں جو مرفوع احادیث آئی ہیں وہ ساری کی ساری صحیح بخاری اور مسلم میں آ گئیں، اس لئے جب صحیح بخاری اور مسلم کو صحیحین قرار دیا گیا تو امام مالکؒ کی موطا کی احادیث خود بخود صحاح میں شامل ہو گئیں۔

ہم بخاری شریف کیوں پڑھتے ہیں؟ جبکہ مؤطا اور صحیح مسلم اتنی اچھی کتابیں ہیں۔ نیز یہ بتائیں کہ موطا کو موطا کیوں کہا جاتا ہے؟

آپ ضرور پڑھئے، کون کہتا ہے کہ آپ موطا نہ پڑھیں۔ موطا کے معنی ہے **Beaten Track**، اس کا مطلب ہے وہ راستہ جو زیادہ استعمال سے زیادہ کشادہ ہو جائے۔ امام مالکؒ نے چونکہ اپنے زمانے کی سنت کو جمع کیا تھا۔ گویا **Beaten Track** جس پر حضورؐ اور صحابہ کے زمانے سے عمل ہو رہا ہے اور لوگوں کے لئے ایک راستہ فراہم ہو گیا۔ بخاری مسلم سب پڑھنی چاہئے۔ لیکن اگر کہیں کورس میں یا نصاب میں کوئی ایک کتاب اختیار کی گئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی مصلحت سے اختیار کی گئی ہے۔ اگر آپ کے نصاب میں صحیح بخاری ہے تو اچھی بات ہے۔ آپ کے پاس جتنا وقت ہوگا اس کے حساب سے بقیہ کتابیں بھی شامل ہوں گی۔ اس کا دار و مدار تو وقت اور صلاحیت پر ہے۔

جزاکم اللہ، والسلام علیکم

☆☆☆☆☆☆☆

چوتھا خطبہ

روایت حدیث اور اقسام حدیث

جمعرات، 9 اکتوبر 2003

روایت حدیث اور اقسام حدیث

علم حدیث بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہے۔ایک حصہ وہ ہے جس کو علم روایت کہتے ہیں اور دوسرا حصہ وہ ہے جس کو علم درایت کہتے ہیں۔علم روایت میں اس ذریعہ یا وسیلہ سے بحث ہوتی ہے جس کے ذریعے کوئی حدیث رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک سے لے کر ہم تک پہنچی ہو۔

روایت اور درایت

روایت ،سند، روای، راوی کا سچا یا غیر سچا ہونا، راوی کا کردار، اس کا حافظہ یہ ساری چیزیں علم روایت میں زیر بحث آتی ہیں۔علم درایت کی زیادہ توجہ حدیث کے متن اور اس حصہ پر ہوتی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی سے عبارت ہے۔

میں آپ کے سامنے آج ایک کتاب لے کر آیا ہوں۔اس میں سے بعض چیزیں مثال کے طور پر آپ کے سامنے رکھوں گا۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے اور ساری صحاح ستہ اس میں شامل ہیں۔صحاح ستہ کا مکمل نسخہ ایک جلد میں ہمارے ایک دوست نے شائع کیا ہے۔جس میں ساری کی ساری چھ کتابیں شامل ہیں۔

میں ایک حدیث پڑھتا ہوں اور پھر میں بتاؤں گا کہ اس میں علم روایت سے کس جگہ بحث ہوتی ہے اور علم درایت سے کس جگہ بحث ہوتی ہے۔ یہ صحیح بخاری کی کتاب الایمان ہے۔ کتاب الایمان کا باب نمبر پانچ ہے جس کا عنوان ہے'باب اي الاسلام افضل '۔یعنی سب سے اچھا اور افضل اسلام کونسا ہے یا کس کا ہے۔

'حدثنا سعيدبن یحیٰ بن سعید القریشی قال حدثنا ابی، قال حدثنا ابو بردہ بن عبداللہ بن ابی بردہ عن ابی بردہ، عن ابی موسیؓ قال، قالوا یا رسول اللہ ﷺ ای الاسلام افضل، قال من سلم المسلمون من لسانہ و یدہ'۔

یہ عبارت جو میں نے آپ کے سامنے پڑھی ہے اس میں دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں کچھ نام آئے ہیں۔ یہ ان راویوں کے نام ہیں جن کے ذریعے یہ حدیث امام بخاری تک پہنچی۔ سعید بن یحییٰ بن سعید القریشی امام بخاری کے استاد ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حدثنا ابی، مجھ سے میرے والد نے بیان کیا، یعنی یحییٰ بن سعید القریشی نے، وہ کہتے ہیں کہ حدثنا ابو بردہ بن عبداللہ بن ابی بردہ، یہ ابو بردہ مشہور صحابیؓ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے پوتے تھے، وہ اپنے دادا ابو بردہ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ اپنے والد حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت کرتے ہیں۔ یہاں تک یہ سند ہے اور سند سے متعلق جتنے بھی مسائل اور معاملات ہیں وہ علم روایت میں زیر بحث آتے ہیں۔ اس کو خارجی مطالعہ حدیث یا خارجی نقد حدیث بھی کہتے ہیں۔ یعنی حدیث سے باہر جو چیزیں ہیں ان کا مطالعہ کرکے اور حدیث کے سورس (Source) اور ماخذ کا مطالعہ کرکے یہ پتہ چلایا جائے کہ اس حدیث کا درجہ کیا ہے۔ یہاں یہ دیکھا جائے گا کہ یہ رواۃ جن سے یہ حدیثیں بیان ہوئی ہیں، یہ کون لوگ تھے؟ کن صفات کے حامل لوگ تھے، ابھی ان کی صفات کی بات کرتے ہیں۔ انہوں نے جس راوی سے روایت بیان کی ہے اس سے ان کی ملاقات ہوئی ہے کہ نہیں ہوئی ہے۔ امام بخاری پہلے یہ تحقیق کرتے ہیں کہ واقعتاً ملاقات ہوئی ہے اور واقعتاً انہوں نے کسب فیض کیا ہے۔ امام مسلم کے نزدیک یہ تحقیق ضروری نہیں ہے۔ اگر یہ دونوں معاصر ہیں۔ اور ایک علاقہ میں رہتے تھے اور دونوں کی ملاقات ممکن تھی تو امام مسلم کے نزدیک عام روایت کے لئے یہ کافی ہے، وہ آگے مزید تحقیق نہیں کرتے۔ اس کے برعکس امام بخاری یہ تحقیق بھی کرتے ہیں کہ ان کی ملاقات ثابت بھی ہوئی ہو۔ وہ اس کے بعد وہ ان سے روایت لیتے ہیں۔ یہ سارے مسائل علم روایت میں زیر بحث آتے ہیں۔

متن حدیث

اس کے بعد متن حدیث کا معاملہ آتا ہے یعنی اس ارشاد گرامی کا، کہ صحابہ کرام نے

پوچھا کہ یا رسول اللہ کون سا اسلام افضل ہے؟ آپؐ نے فرمایا وہ اسلام جس میں مسلمان ایک دوسرے کی زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہیں۔اس ارشاد گرامی کا مطالعہ کہ اس سے کیا چیز ثابت ہوتی ہے اور جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ شریعت کے عمومی اصول اور تصورات کے مطابق ہے کہ نہیں۔ یہ ساری چیزیں جس فن کے ذریعے مطالعہ کی جائیں گی، اس فن کا نام ہے علم درایت۔ ہم پہلے علم روایت کی بات کرتے ہیں۔

علم روایت

علم روایت میں سب سے پہلے یہ چیز دیکھی جاتی ہے کہ راوی نے حدیث کا تحمل کیسے کیا۔علم حدیث کے بارے میں راوی کے دو کردار ہیں۔ایک کردار تو اس وقت آتا ہے جب اس نے وہ حدیث حاصل کی جو وہ بیان کر رہا ہے۔ دوسرا کردار اس وقت آتا ہے جب اس نے وہ حدیث آگے بیان کی۔ ایک کو تحمل کہتے ہیں اور دوسرے کو ادا کہتے ہیں۔ تحمل کا ترجمہ انگریزی میں آپ **reception** کر سکتے ہیں۔تحمل کی اصطلاح یہاں بڑی معنی خیز ہے۔تحمل کے لفظی معنی تو ہیں برداشت کرنا یا کسی بھاری چیز کو اٹھانا۔ یہاں تحمل حدیث کے معنی ہوں گے حدیث نبوی کی بھاری ذمہ داری یا امانت کو اٹھانا۔ ادا کا ترجمہ آپ **delivery** کر سکتے ہیں۔ جب اس نے حدیث کو اپنے شیخ سے **receive** کیا تو کہا جائے گا کہ راوی نے حدیث کا تحمل کیا۔ پھر جب راوی اس حدیث کو دوسرے لوگوں سے بیان کرے گا، گویا دوسروں کو **deliver** کرے گا تو کہا جائے گا کہ اس نے حدیث کی یہ امانت ادا کر دی۔ ادا کے لفظ میں بھی امانت اور ذمہ داری کا مفہوم موجود ہے۔ یہ دو الگ الگ مراحل ہیں اور دونوں کے الگ الگ احکام اور الگ الگ شرائط ہیں۔

سماع

سب سے پہلے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تحمل حدیث سے کیا مراد ہے۔تحمل حدیث یعنی جب راوی حدیث کا مواد حاصل کر رہا ہے تو اس کے طریقے کیا کیا ہیں۔سب سے پہلا طریقہ تو سماع کہلاتا ہے کہ انہوں نے براہ راست اپنے استاد یا شیخ کی زبان سے سنا ہو، شیخ نے حدیث پڑھ کر ان کو سنائی ہو اور سنانے کے بعد اجازت دی ہو، یہ طریقہ سماع کہلاتا ہے اور سب سے افضل طریقہ ہے۔

قرات

اس کے بعد دوسرا طریقہ آتا ہے قرات کا، جو میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ شاگرد نے استاد کے سامنے قرات کی ہو اور قرات سننے کے بعد استاد نے اجازت دی ہو کہ تمہاری قرات درست ہے اب تم آگے میرے حوالہ سے اس حدیث کو بیان کر سکتے ہو۔

اجازت

تیسرا درجہ اجازت کا ہے۔ اجازت سے مراد یہ ہے کہ استاد نے کسی صاحب علم کو، جس کے علم، اخلاص اور تقویٰ پر استاذ بھروسہ ہو، یہ اندازہ کرنے کے بعد کہ یہ شخص حدیث کا علم رکھتا ہے، کسی خاص مجموعہ حدیث کے روایت کرنے کی اجازت اس کو دے دی ہو۔ اجازت کا یہ طریقہ آج بھی رائج ہے، ماضی میں بھی رائج تھا۔ ایک دوسرے کو اجازت دینے کا یہ طریقہ تابعین اور تبع تابعینؒ کے زمانے سے چلا آرہا ہے۔

یہ تین درجے تو وہ ہیں جو بڑے معیاری سمجھے جاتے ہیں اور صحاح ستہ کی احادیث انہی تین طریقوں سے آئی ہیں۔ زیادہ سماع کے طریقے سے، اور کچھ حصہ قرات کے ذریعے اور تھوڑا حصہ اجازت کے ذریعے، جو کہ بہت تھوڑا بلکہ برائے نام ہے۔ ان تین طریقوں کے علاوہ صحاح ستہ میں کسی اور طریقہ تحمل سے آئی ہوئی کوئی حدیث شامل نہیں ہے۔

مناولہ

اس کے علاوہ ایک اور طریقہ 'مناولہ' کا طریقہ ہے۔ مناولہ کے معنی حوالہ کر دینا یا کسی کو سونپ دینا۔ مناولہ سے مراد یہ ہے کہ شیخ کے پاس احادیث کا ایک مجموعہ لکھا ہوا موجود ہے۔ اس میں ایک حدیث ہے، یا سو ہیں یا پانچ سو ہیں، وہ حدیث کا مجموعہ دستی طور پر کسی کے حوالہ کر کے کہہ دیا جائے کہ میں یہ کتاب آپ کے حوالہ کر رہا ہوں اس میں جو روایات ہیں، آپ ان کو میری طرف سے بیان کر سکتے ہیں۔ مناولہ کا طریقہ تابعین اور تبع تابعینؒ کے زمانے میں رائج نہیں تھا۔ بعد میں جب علم حدیث پوری طرح سے مدوّن ہو گیا، کتابیں مرتب ہو گئیں، مجموعے مستند طور پر تیار ہو گئے تو پھر مناولہ کا طریقہ بھی رائج ہو گیا کہ ایک شیخ اپنا لکھا ہوا مجموعہ کسی شاگرد کو دے دیا

کرتے تھے اور کہتے کہ یہ لو اور اس کی بنیاد پر تم روایت کرسکتے ہو۔ یہ طریقہ، جیسا کہ آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا اتنا معیاری طریقہ نہیں تھا، صحاح ستہ میں کوئی حدیث اس بنیاد پر نہیں ہے اور حدیث کی بڑی بڑی کتابیں جو طبقہ دوم کی کتابیں ہیں، ان میں بھی اکثر وبیشتر احادیث اس طریقہ کے مطابق نہیں ہیں۔ اکادکا کوئی حدیث اس طریقے کے مطابق ہوگی تو ہوگی۔

مکاتبہ

اس کے بعد پانچواں طریقہ تھا مکاتبہ کا۔ کہ کسی استاد نے شاگرد کو کوئی حدیث لکھ کے بھیج دی اور اس کے بعد اس کی اجازت بھی دے دی، یا شاگرد نے استاد کو خط لکھ کر دریافت کیا کہ فلاں حدیث یا اس مضمون کی کوئی حدیث اگر آپ کے علم میں ہے تو براہ کرم مجھے مطلع فرمائیں۔ استاد نے تحریری طور پر خط کے ذریعے مطلع کردیا۔ یہ طریقہ مکاتبہ کہلاتا تھا۔ بظاہر آپ میں سے بعض کو خیال ہوگا کہ اس کا درجہ تو پہلے ہونا چاہئے، لیکن محدثین کے نزدیک اس کا درجہ بعد میں تھا۔ اس لئے کہ اس زمانے کے ذرائع آمد و رفت کے حساب سے جب سفر کرنے میں چھ چھ مہینے اور سال سال لگ جایا کرتے تھے، یہ تعین بڑا دشوار تھا کہ ایک شخص کے پاس جو تحریر پہنچی ہے، جو فرض کیجئے کہ نیشاپور یا سمرقند یا بخارا سے لکھ کر کسی نے بھیجی اور قاہرہ میں کسی کے پاس آٹھ ماہ کے بعد پہنچی۔ اب قاہرہ میں بیٹھے ہوئے شخص کے لئے یہ تعین بڑا دشوار تھا کہ یہ تحریر اسی استاد یا شیخ کی تحریر ہے جس کی بتائی جارہی ہے یا کسی اور نے لکھ کر اس کی طرف منسوب کردی ہے، کیونکہ اس کا امکان موجود تھا۔ آج تو یہ امکان موجود نہیں ہے۔ آپ کا کوئی خط سعودی عرب سے آتا ہے تو آپ ٹیلفون پر معلوم کرسکتے ہیں کہ واقعی یہ خط انہی بزرگ کا ہے کہ نہیں ہے۔ اگلی مرتبہ جائیں تو تصدیق کرلیں۔ آج اس طرح کی تصدیق کرنا بہت آسان ہے۔ آج اگر تحریر کے ذریعے حدیث کی روایت ہوا کرتی تو اس کا درجہ بہت اونچا ہوتا۔ لیکن اس زمانے میں چونکہ جب یہ تصدیق اور تعین بہت دشوار تھا اس لئے محدثین نے اس درجہ کو بعد میں رکھا اور یہ پانچواں درجہ ہے۔

اعلام

چھٹا درجہ اعلام کہلاتا تھا۔ اعلام کے معنی ہیں مطلع کرنا اور بتادینا۔ اصطلاح میں اعلام سے مراد شیخ کی طرف سے حدیث کے طالب علم کو یہ بتادینا کہ فلاں جگہ فلاں تحریر یا فلاں شخص کے

پاس جو احادیث ہیں وہ مستند احادیث ہیں اور تم میری طرف سے ان کو حاصل کر سکتے ہو اور لے کر روایت کر سکتے ہو۔ صحاح ستہ میں یہ طریقہ بھی کسی نے اختیار نہیں کیا۔ طبقہ دوم کی کسی اور کتاب میں بھی یہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا۔ یہ طریقہ بہت بعد میں ان کتابوں میں اختیار کیا گیا جو طبقہ سوم یا طبقہ چہارم کی کتابیں ہیں۔

وصیت

پھر وصیت کا طریقہ تھا کہ شیخ نے وصیت کی کہ میرے پاس جو مجموعہ ہے یہ میرے بعد فلاں شخص کو دے دیا جائے اور اس شخص کو اجازت ہے کہ وہ میری طرف سے ان احادیث کی روایت کرے۔ مسند امام احمد میں کچھ روایات ہیں جو وصیت کے ذریعے سے امام احمد کے صاحبزادے عبداللہ بن احمد کو پہنچی تھیں۔

وجادہ

اس کے علاوہ ایک طریقہ وجادہ کہلاتا ہے۔ یہ آٹھواں اور آخری طریقہ ہے۔ جس کے بارے میں تمام محدثین کا اتفاق ہے کہ اس کی بنیاد پر روایت اس وقت جائز نہیں تھی۔ 'اُس وقت' کے لفظ پر غور فرمایئے۔ اس وقت وجادہ کے طریقے سے روایت جائز نہیں تھی۔ وجادہ کا مطلب یہ تھا کہ کسی بڑے محدث کی کوئی تحریر بعد میں کسی شخص کو ملے اور وہ اس کی بنیاد پر روایت کرے اس طرح روایت کرنا اس وقت جائز نہیں سمجھا گیا کیونکہ یہ تعین بڑا دشوار تھا کہ یہ تحریر جو دستیاب ہوئی ہے یہ واقعی اسی شیخ کی تحریر ہے جس طرف منسوب کی جا رہی ہے، یا جب یہ تحریر لکھی گئی تو کیا شیخ نے اس کو دیکھ کر اس کی تصدیق کی تھی کہ یہ صحیح لکھا گیا ہے؟ اس میں چونکہ غلطی کا خاصا امکان موجود تھا اس لئے وجادہ کی بنیاد پر روایت کی اجازت نہیں دی گئی۔ لیکن آج وجادہ کی بنیاد پر روایت کی مطبوعہ کتابوں کی حد تک اجازت ہو سکتی ہے۔ آج ایک غیر متخصص کو مثلاً صحاح ستہ میں کوئی حدیث دیکھ کر اسی کو روایت کرنے کی اجازت ہے، اس لئے کہ یہ صحاح ستہ چھپی ہوئی سامنے موجود ہیں اور ہزاروں انسانوں نے اس کی طباعت اور اشاعت میں حصہ لیا ہے۔ بڑے بڑے جید اہل علم اور محدثین نے ان کتابوں کی پروف ریڈنگ کی ہے اور یہ کتابیں ہر جگہ دستیاب ہیں۔ آج کسی کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ صحیح بخاری کا کوئی ایسا نسخہ شائع کر دے جس میں اغلاط ہوں یا الحاقات

ہوں۔اس لئے آج وجادہ کا طریقہ بھی اتنا ہی یقینی ہے جتنا کوئی بھی طریقہ یقینی ہوسکتا ہے۔ چنانچہ آج میرے اور آپ کے لئے جائز ہے کہ ہم صحیح بخاری کا نسخہ سامنے رکھ کر اس میں سے حدیث بیان کریں اور تیقن کے ساتھ یہ بات کہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

یہ آٹھ طریقے تحمل حدیث کے تھے اور یہی طریقے ادا کے طریقے بھی تھے۔

تحمل اور اداء

جب ایک شخص نے ان طریقوں سے حدیث حاصل کی تو یہ طریقے اس کے لئے تحمل کے طریقے تھے، لیکن جس شیخ سے ان طریقوں کے ذریعہ روایت لی گئی اس کے لئے یہ طریقے ادا کے طریقے تھے۔ جب یہ شیخ آگے چل کر دوسرے تک یہ حدیث پہنچائے گا اور کسی کو یہ معلومات delieve کرے گا تو اس کے لئے ادا ہوگا، اُس کے لئے تحمل ہوگا۔ تحمل اور ادا دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ روایت احادیث کے طریقوں کی حد تک یہ ایک ہی چیز کے دو رخ ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اجازت حدیث یا اجازہ کا طریقہ آج بھی رائج ہے، اس کی عملی صورت یہی ہوتی ہے کہ حدیث کے کسی بڑے مشہور شیخ یا استاد سے آپ کی ملاقات ہوئی، آپ نے ان کو یہ بتایا کہ آپ نے علم حدیث حاصل کیا ہوا ہے۔ انہوں نے آپ کا امتحان لے لیا۔ امتحان لینے کے بعد یہ یقین ہوگیا کہ اب آپ کی صلاحیت اور استطاعت آپ کو روایت حدیث کا اہل ثابت کرتی ہے، انہوں نے آپ سے مختلف جگہوں سے پڑھوا کر بھی سن لیا۔ اب چونکہ اس طریقہ سے روایت کرنے میں حدیث کے متن میں کسی کمی بیشی یا اختلاف کا امکان نہیں ہے۔ اس لئے کہ کتابیں چھپی ہوئی ہر جگہ بڑی کثرت سے موجود ہیں۔ اب صرف یہ تیقن اور تعین باقی ہے کہ آپ کی یہ صلاحیت ہے کہ آپ حدیث پڑھ کر اس کا متن آگے بیان کرسکیں۔ یہ تیقن کرنے کے بعد وہ لکھ کر آپ کو سند دیتے ہیں اور اجازت دیتے ہیں۔ اس طرح سندیں لوگ حاصل کرتے چلے آئے ہیں۔ میرے پاس بھی اس طرح کی بہت سی سندیں ہیں اور ایسے اہل علم سے ملاقات ہوتی رہتی ہے کہ جن سے سند لینا ایک شرف اور اعزاز کی بات ہوتی ہے۔

یہ چیز اجازہ یا اجازت کہلاتی ہے۔ اجازت متعین کتاب کی بھی ہوسکتی ہے کہ مثلاً انہوں نے صحیح بخاری کی کچھ احادیث آپ سے سنیں اور یقین کرنے کے بعد کہ آپ صحیح بخاری پڑھ

کر سمجھ سکتے ہیں، آپ کو اجازت دے دی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پوری صحاح ستہ کی اجازت ہو، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اپنی خاص سند کی اجازت ہو کہ فلاں سند سے جو کتاب میں نے پڑھی ہے اس کی اجازت ہے۔ اس طرح کی مختلف قسمیں ہوسکتی ہیں۔ لیکن یہ اجازت ہمیشہ متعین اور طے شدہ امور کی ہونی چاہئے، غیر متعین اور مبہم چیزوں کی اجازت جائز نہیں ہے۔ مثلاً کوئی شیخ آج یہ کہے کہ میں نے آپ کو تمام احادیث کی روایت کی اجازت دے دی، تو یہ مبہم چیز ہے، اس لئے یہ جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ مبہم اجازت میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ کیا خود ان کو ان تمام احادیث کی روایت کی اجازت ہے؟ اور تمام احادیث سے کیا مراد ہے؟ احادیث کے بہت سے مجموعے ہیں۔ بعض مجموعے مروج ہیں بعض مجموعے زیادہ مروج نہیں ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ متعین مجموعے کی ہی اجازت دی جائے۔ یہ بات تو ہمیشہ درست سمجھی گئی کہ کسی صاحب علم کا سرسری امتحان لے کر اس کو حدیث کی کسی متعین کتاب کی روایت کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ اس وقت سے جب سے حدیث کی کتابیں مدون ہو کر اور شائع ہو کر عام ہو گئیں اور ان میں کسی قسم کی ردوبدل اور بھول چوک کا امکان نہیں رہا یہ طریقہ اور بھی مقبول ہو گیا۔ لیکن اس کے باوجود مبہم اور عمومی اجازت کہ آپ کو ہر حدیث کی روایت کی اجازت ہے یہ آج بھی درست نہیں ہے اور پہلے بھی درست نہیں تھا۔

مناولہ، جس کا میں نے ابھی ذکر کیا کہ استاد نے ایک مجموعہ دستی طور پر طالب علم کو دے دیا اور اس کے روایت کرنے کی اجازت دے دی، اس میں یہ شرط تھی کہ مناولہ کے ساتھ ساتھ صراحت سے اجازت دی جائے کہ ان روایات کے آگے بیان کرنے کی میں آپ کو اجازت دیتا ہوں۔ اگر اجازت ہے تو شاگرد ان کو آگے بیان کر سکے گا اور اگر اجازت نہیں ہے تو پھر ان استاد کے حوالہ سے مجموعہ لینے والا اس مجموعہ میں درج احادیث کی روایت نہیں کر سکے گا۔ مثال کے طور پر آج مناولہ کی شکل یہ ہوسکتی ہے کہ آپ کسی شیخ الحدیث سے ملے اور وہ آپ کو صحیح بخاری کا ایک نسخہ تحفہ میں دے دیں، تو یہ مناولہ ہوگا اور اس کی بنیاد پر ان تحفہ دینے والے استاذ کی روایت سے آپ کے لئے روایت کرنا جائز نہ ہوگا۔ اس لئے کہ صحیح بخاری کا نسخہ تحفہ میں دینا اور چیز ہے اور دینے والے کی سند پر صحیح بخاری کی آگے روایت کرنا الگ چیز ہے۔ اگر وہ آپ کا امتحان لینے کے بعد اور آپ کی صلاحیت کا تعین کرنے کے بعد آپ کو اجازت بھی دے دے تو مناولہ معتبر ہوگا

ورنہ محض کتاب کا ہدیہ اجازت کے معاملہ میں یا روایت کے معاملہ میں مناولہ معتبر نہیں ہوگا۔

جہاں تک مکاتبت کا تعلق ہے، تو مکاتبت کے ساتھ ساتھ اگر تیقن کے ساتھ روایت کی اجازت بھی شامل ہے اور یہ بھی یقینی ہو جائے کہ یہ تحریر انہی بزرگ کی ہے تو روایت کی اجازت دے دی جاتی تھی۔ ماضی میں اس کا تعین ایسے ہوتا تھا کہ مثلاً ایک محدث نے اپنے کسی بزرگ استاد کو خط لکھا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ کے پاس فلاں فلاں حدیث کے فلاں فلاں انداز یا روایات موجود ہیں، آپ براہ کرم اس کا متن مجھے لکھ کر بھیج دیں۔ انہوں نے اپنے شاگرد کو متن لکھ کے بھیجا اور اس کے ساتھ دو آدمی بھی بطور گواہ بھیج دیئے۔ ان گواہوں نے جو مستند اور معتبر تھے ،آ کے شاگرد کے سامنے گواہی دی کہ ہمارے سامنے شیخ نے اپنے قلم سے یہ تحریر لکھی تھی اور اپنی یہ مہر لگائی تھی اور ہم اس بات کے گواہ ہیں کہ یہ تحریر انہی محدث کی لکھی ہوئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر اس کی بنیاد پر روایت کی جاسکتی ہے۔

امام بخاری نے ایک دو مقامات پر مکاتبہ مع الاجازۃ مع الشہادۃ کی اجازت دی ہے۔ گویا اجازت، دو شرطوں کے ساتھ ہے، گواہی بھی ہو اور اجازت بھی ہو، یہ دو چیزیں جب شامل ہوں گی تو پھر عام مکاتبہ سے اس کا درجہ اونچا ہو جائے گا۔ اس لئے امام بخاری نے اُن کی اجازت دی ہے۔ امام بخاری یا امام مسلم کے ہاں ایک دو احادیث جو مکاتبہ کی بنیاد پر روایت ہوئی ہیں، اس کے الفاظ یہ ہیں 'اخبرنی فلان کتابة بخطه' فلاں بزرگ نے مجھے تحریری طور پر اطلاع دی 'یعنی اپنی Hand Writing میں یہ لکھ کر اجازت دی۔ بعض جگہ اس کا بھی التزام ہے کہ فلاں فلاں گواہوں کی موجودگی میں جنہوں نے میرے سامنے حلفیہ بیان کیا کہ یہ انہی بزرگ کی تحریر ہے اور انہوں نے اس کے مطابق آپ کو اجازت دی ہے۔

یہ تحمل کے طریقے تو علم روایت سے متعلق ہیں اور ان کا براہ راست تعلق علم روایت سے ہے۔ دوسرا شعبہ علم درایت کا ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا۔ اس میں ایک محدث داخلی ذرائع سے یہ تعین کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ جو ارشادات رسول اللہ ﷺ سے منسوب کئے گئے ہیں وہ واقعتاً رسول اللہ ﷺ کے ارشادات ہیں۔ علم روایت کو خارجی نقد حدیث بھی کہتے ہیں اور علم درایت کو داخلی نقد حدیث بھی کہتے ہیں۔ خارجی نقل حدیث کا زیادہ دارومدار نقل پر ہوتا ہے کہ راوی کے بارے میں جو کچھ معلومات آپ کے پاس ہیں، راوی نے جو کچھ آپ سے بیان کیا یا اس راوی

کے بارے میں ائمہ نے جو کچھ قرار دیا کہ وہ کس درجہ کے راوی ہیں، یہ ساری چیزیں نقل سے آپ کو پہنچی ہیں۔ آپ کی عقل کو اس میں زیادہ دخل نہیں ہے۔ اس لئے علم روایت کا تعلق اکثر و بیشتر نقل کے معاملات سے ہے۔ علم درایت کا اکثر و بیشتر تعلق عقل کے معاملات سے ہے کہ آپ نے خود غور و خوض کر کے دلائل سے پتہ چلایا کہ یہ ارشاد گرامی رسول اللہ ﷺ کا ہو سکتا ہے کہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے بھی کچھ قواعد اور احکام ہیں۔

علم روایت میں سند اور راویوں سے زیادہ بحث ہوتی ہے اور علم درایت میں متن اور سند کے آپس کے تعلق سے بحث ہوتی ہے کہ جو متن نقل ہوا ہے اس کا سند سے تعلق کیا اور کیسا ہے، کمزور ہے کہ مضبوط ہے اور جو راوی اس سند میں شامل ہیں وہ خود کس درجہ کے انسان ہیں۔ رہی یہ بات کہ متن حدیث میں کیا بیان ہوا ہے، شریعت کے طے شدہ اصولوں اور عقلی استدلال کی میزان میں اس کا وزن کیا ہے۔ یہ علم درایت کا مضمون ہے۔ علم درایت کو علم اصول حدیث بھی کہتے ہیں۔ علم اصول حدیث میں یوں تو اور بھی بہت سے معاملات سے بحث ہوتی ہے لیکن علم اصول حدیث میں جو مسائل زیادہ مہتم بالشان ہیں وہ درایت کے معاملات ہیں۔

علم روایت میں جب راوی کے حالات سے بحث ہوتی ہے تو راوی کی شرائط کیا ہیں ان سے بھی بحث ہوتی ہے، تحمل کی شرائط کیا ہیں ان سے بھی بحث ہوتی ہے اور ادا کی شرائط کیا ہیں ان سے بھی بحث ہوتی ہیں۔ راوی کی حد تک شروط تحمل اور شروط ادا میں تھوڑا سا فرق ہے۔

راوی کی شرائط

راوی کی سب سے پہلی شرط تو یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو۔ اس شرط میں تو کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اس باب میں کوئی دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ راوی کے لئے مسلمان ہونا سب سے پہلی شرط ہے۔ لیکن اس میں تھوڑا سا اختلاف ہے اور وہ یہ کہ اگر کوئی صحابیؓ کوئی ایسا واقعہ نقل کرتے ہیں یا رسول اللہ ﷺ کا کوئی ایسا ارشاد گرامی نقل کرتے ہیں جو انہوں نے اس وقت سنا ہو یا دیکھا ہو جب وہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے اور بعد میں شرف صحابیت حاصل کرنے کے بعد اس کو بیان کریں تو کیا ایسا ہو سکتا ہے۔ اکثر و بیشتر محدثین کی رائے یہ ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ صحابیت کا شرف اتنا بڑا ہے کہ اس کی وجہ سے کسی صحابی کی روایت کو قبول کرنے میں تامل

نہیں کیا جانا چاہئے۔ چونکہ صحابہ سب کے سب عدول ہیں اور صحابیؓ ہونے کے بعد اگر وہ اسلام سے پہلے کی بھی کوئی بات بیان کرتے ہیں تو ہمیں پورا یقین ہے کہ اس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہونی چاہئے اس لئے یہ روایت قابل قبول ہے۔ صرف ایک تامل جو بعض حضرات کو ہوا ہے وہ یہ ہوا ہے کہ صحابیؓ ہونے کے بعد جب انہوں نے حضورؐ کا کوئی ارشاد گرامی سنا تو جتنی محبت اور عقیدت واحترام سے اس کو سنا ہوگا اور جتنا اہتمام سے یاد کیا ہوگا اُتنا اہتمام شائد اس وقت نہ کیا ہوگا جب وہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت ان کی نظر میں شائد حضورؐ کے ارشادات کی وہ اہمیت نہ ہو جو بعد میں ہوئی، تو اس امر میں تامل ہوسکتا ہے کہ اس حالت میں حضورؐ کے ارشادات گرامی کو کتنا یاد رکھا، کتنا یاد نہیں رکھا۔ اس لئے اس نقطۂ نظر سے محدثین نے اس پر غور کیا ہے۔ اور صرف وہ معاملات قبول کئے ہیں جن معاملات میں کسی غیر معمولی اہتمام یا حفظ کی ضرورت پیش نہ آئے۔ اگرچہ اس طرح کی مثالیں بہت تھوڑی ہیں کہ کوئی صحابیؓ اسلام سے پہلے کا کوئی واقعہ بیان کرتے ہوں۔ اکثر وبیشتر رسول اللہ ﷺ کے بچپن یا نوجوانی کے واقعات ہیں اور حضورؐ کے ذاتی اور شخصی حالات وکیفیات کے بارے میں ہیں، جس میں بہت زیادہ یادداشت اور حافظہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

مثال کے طور پر آپ نے سنا ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ کے نوجوانی کے ایک ساتھی جو آپ کے ساتھ کاروبار میں شریک تھے وہ بعد میں مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا اور آپؐ سے مخاطب ہوکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ میرے شریک تھے اور آپ نے کبھی کوئی شک وشبہ کی بات نہیں کہی، آپ نے کبھی کوئی غلط بیانی نہیں کی، کبھی کاروبار میں مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور ہمیشہ سچی بات فرمائی۔ یہ ایسی چیز ہے جس کے بارے میں کسی خاص یادداشت یا اہتمام کی ضرورت نہیں۔ یہ بات بغیر کسی خصوصی اہتمام یا عقیدت ومحبت کے ہر ایک کو یاد رہ سکتی ہے۔ اس طرح کی کچھ اور احادیث ہیں جن کے بارے میں محدثین کی غالب اکثریت کا خیال ہے کہ انہیں قبول کرنا چاہئے۔ لیکن صحابہ کے علاوہ بقیہ راویوں کے بارے میں اگر یہ ثابت ہوجائے کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ مسلمان نہیں تھے تو ان کی وہ روایت قابل قبول نہیں ہے۔ یہ استثنا صرف صحابہ کے ساتھ ہے۔

اسلام کے بعد دوسری شرط عدالت کی ہے۔ عدالت ایک جامع اصطلاح ہے، جس کی

بہت سی تعبیریں ہوسکتی ہیں۔ عدالت کی اہل علم نے بہت سی تشریحات کی ہیں۔ لیکن اس کے دو مفاہیم ہیں۔ ایک تو قانونی مفہوم، معیار ہے جو کم سے کم سطح پر ضرور موجود ہونا چاہئے اس سے کم کے بارے میں قبول کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ کم سے کم مفہوم یہ ہے کہ جس شخص کی اچھائیاں اس کی کمزوریوں سے زیادہ ہوں وہ عادل ہے۔ 'من غلبت حسناته على سياته'۔ جس کی حسنات اس کی کمزوریوں سے زیادہ ہوں اس کو عدالت حاصل ہے۔ لیکن یہاں چونکہ معاملہ علم حدیث کا ہے، اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی کا ہے، اس لئے اس میں زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے اور عدالت کی بعض ایسی شرائط بھی شامل کی جاتی ہیں جو عام طور پر عدالت کے قانونی مفہوم میں شامل نہیں ہیں۔ ان میں ایک بنیادی شرط تو یہ ہے کہ اس کی شخصیت اور کردار میں اخلاق اور مروّت کے خلاف کوئی چیز نہ پائی جائے۔ ایک انتہائی اچھے اور اعلیٰ پیمانہ کے انسان میں اخلاق، مروت، وقار اور سنجیدگی کا جو معیار ہونا چاہئے حدیث کے راوی میں وہ معیار اور کردار پایا جاتا ہو۔ بہت سی چیزیں شریعت میں جائز ہوتی ہیں اور وہ گناہ یا حرام نہیں ہوتیں لیکن وہ ایک اعلیٰ کردار کے انسان کے شایان شان نہیں ہوتیں۔ اس لئے اگر کوئی شخص، جو راوی حدیث ہے اور رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے پاکیزہ الفاظ اور پیغام مبارک کو آگے پہنچا رہا ہے، اس کا کردار اور اخلاق اور مروت بھی بہت اعلیٰ ہونا چاہئے۔ ایک بنیادی شرط تو یہ ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ دینی معاملات میں، فرائض کی پابندی اور محرمات سے اجتناب میں وہ ایک معیاری کردار کا انسان ہو۔ کبھی کبھار کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو یہ عدالت کے خلاف نہیں ہے، کبھی کبھار کسی فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی ہو جائے تو یہ بھی عدالت کے خلاف نہیں ہے، لیکن کسی کی شہرت ہی یہ ہو کہ یہ فلاں فریضہ کی پابندی نہیں کرتا، اس کے پاس بقدر نصاب پیسہ ہے اور زکوٰۃ نہیں دیتا، یا یہ شخص عادتاً نماز کی پابندی نہیں کرتا، یا یہ شخص فلاں برے اور حرام کام میں مبتلا ہے، ایسا شخص پھر عادل نہیں ہے اور روایت حدیث کے معاملہ میں اس کی روایت کو قبول نہیں کیا جائے گا۔

تیسری شرط یہ ہے کہ وہ عاقل اور سمجھدار انسان ہو۔ بے وقوف اور نالائق انسان نہ ہو۔ بعض لوگ بڑے نیک اور متقی ہو سکتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ کم عقل اور کم فہم بھی ہو سکتے ہیں، اس لئے یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ تدین اور تقویٰ کے ساتھ ساتھ عقل اور فہم میں بھی وہ

اونچے درجہ کا انسان ہو۔ کم از کم جو بات اس نے سنی ہے اس کو سمجھا ہو، اس کو یاد رکھا ہو اور پوری سمجھ بوجھ کے ساتھ اس کو دہرایا ہو کہ کس سیاق وسباق کے ساتھ یہ بات ارشاد فرمائی گئی تھی اور اس کا مفہوم کیا تھا۔ بے عقل آدمی کی بات اور روایت قابل قبول نہیں ہے۔

یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر ایک چھوٹا بچہ جو تحمل کے وقت کم عمر تھا لیکن ادائیگی کے وقت اس کی عمر پختگی کو پہنچ گئی اور اس میں پختہ عقل وشعور پیدا ہو گیا، مثلاً پانچ چھ سال کا بچہ تھا، جب اس نے تحمل کیا۔ تو کیا اب دس بارہ سال کے بعد وہ اس کو ادا کر سکتا ہے؟ محدثین کی غالب ترین اکثریت کا خیال یہاں بھی وہی ہے جو اسلام کے بارے میں ہے۔ کہ صحابہ کے بارے میں یہ استثنا ہوسکتا ہے غیر صحابیؓ کے بارے میں نہیں ہوسکتا۔ اگر ایک بچہ پانچ سال کی عمر میں کسی تابعیؒ سے یا تبع تابعیؒ سے کوئی حدیث سنتا ہے اور بعد میں بالغ ہونے کے بعد بیان کرتا ہے تو اس میں ایک شک ضرور باقی رہتا ہے کہ بچہ کو حدیث کا متن اور مفہوم صحیح طور پر یاد رہا کہ نہیں رہا۔ لیکن اگر کوئی صحابیؓ اپنا کوئی ایسا واقعہ بیان کرتے ہیں جو ان کے اپنے بچپن کا ہے لیکن رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد گرامی، یا تقریر یا عمل سے متعلق ہے اور وہ بلوغ کے بعد بیان کرتے ہیں تو وہ قابل قبول ہے۔ اس لئے کہ صحابہ کرام میں حضرت علیؓ بن ابی طالب، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ اور اس طرح کے بہت سے صحابہ کرام تھے جنہوں نے اپنے بچپن میں بارہا حضورؐ کی زیارت کی، بہت سے معاملات کو دیکھا اور بعد میں ان کو بیان کیا اور عام طور پر علماء اسلام نے ان کو قبول کیا۔ رسول اللہ ﷺ کے بہت سے واقعات اسلام کے فوراً بعد کے زیادہ تر حضرت علیؓ سے مروی ہیں۔ مکہ مکرمہ کے کئی واقعات حضرت علیؓ سے مروی ہیں جب ان کی عمر دس بارہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ حضرت ابن عباسؓ کی عمر حضورؐ کے انتقال کے وقت تیرہ سال تھی۔ انہوں نے بہت سے واقعات نقل کئے ہیں جو ان کے بچپن کے ہیں۔ یہ سب واقعات قابل قبول ہیں، اس لئے کہ ان کے راوی صحابیؓ ہیں، اور ان سے اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ وہ کوئی کمزور چیز یا غلط یادداشت پر مبنی کوئی چیز بیان کر دیں گے۔ دوسرے تمام راویوں کے لئے یہ شرط ہے کہ انہوں نے تحمل بھی عقل کی حالت میں کیا ہو، البتہ تحمل کے لئے بلوغ شرط نہیں ہے، اگر بارہ سال کا بچہ ہو، یادداشت اچھی ہو، عربی جانتا ہو، اور ایسے لوگ ہر زمانے میں پائے جاتے ہیں، تو وہ حدیث قابل قبول ہے، تیرہ چودہ سال کی عمر کی حد تک قابل قبول ہے۔ لیکن اگر وہ تحمل کے وقت

اتنا کم سن بچہ ہو کہ اس میں عقل وشعور ہی نہ ہو تو اس کی روایت قابل قبول نہیں ہے۔

سب سے اہم شرط جو چوتھے نمبر پر ہے وہ ضبط ہے۔ ضبط سے مراد یہ ہے کہ روای نے جو کچھ سنا اس کو پوری طرح سے یاد رکھا، پھر وہ چیز ہمیشہ اس کی یادداشت میں محفوظ رہی۔ کبھی اس کو بھلایا نہیں، کبھی اس میں التباس نہیں ہوا، کبھی اس میں کوئی شک نہیں ہوا اور روایت بیان کرنے تک، تحمل سے لے کر ادا تک، ضبط باقی رہا ہو، کسی مرحلہ پر ضبط میں کوئی کمزوری یا خلل واقع نہ ہوا ہو۔ اس بات کی تحقیق اور تعین سب سے مشکل کام ہے جس کا محدثین نے التزام کیا اور ایک ایک راوی کے بارے میں تحقیق کی کہ اس کا ضبط کسی عمر سے تھا اور کس عمر تک رہا۔ بڑھاپے میں یادداشت کام نہیں کرتی، محدثین نے اس بارے میں بھی معلومات جمع کیں کہ کس راوی کی کتنی عمر ہوئی اور عمر کے کس حصہ تک اس کی یادداشت محفوظ تھی اور اگر اخیر عمر میں جا کر اس کی یادداشت جواب دے گئی اور خراب ہوگئی تو کس عمر میں خراب ہوگئی۔ پھر علمائے رجال اور محدثین اس بات کا بھی التزام کرتے ہیں کہ راویوں کی یادداشت اور حافظہ کی تاریخ بھی معلوم کریں اور اس بات کی تحقیق بھی کریں کہ فلاں راوی کی یادداشت فلاں سن تک ٹھیک تھی۔ لہٰذا اس سن تک کی روایات قابل قبول ہیں، اس سن کے بعد ان کی یادداشت میں کمزوری آنی شروع ہوگئی۔ لہٰذا اس سن سے لے کر اس سن تک کی روایات کی اگر دیگر مآخذ سے تصدیق ہو جائے تو وہ قابل قبول ہیں اور فلاں سن میں اس کی یادداشت بالکل جواب دے گئی تھی۔ اس کے بعد کی روایات قابل قبول نہیں ہیں۔ چنانچہ آپ کو ایسی بے شمار مثالیں ملیں گی کہ ایک راوی کی ایک روایت قابل قبول ہے اور دوسری روایت قابل قبول نہیں ہے۔ اس لئے کہ پہلی روایات عالم ضبط میں تھیں اور دوسری روایات عالم ضبط کے زائل ہونے کے بعد تھیں۔ راوی کے لئے یہ چار بنیادی شرائط ہیں جو ہر راوی میں پائی جانی چاہئیں۔ راوی کی ان چار شرائط کے بعد سند اور متن کے بارہ میں تین شرائط اور ہیں جو اگر موجود ہوں تو وہ حدیث مکمل طور پر صحیح اور معیاری ہوگی۔

پہلی شرط یہ ہے کہ محدث سے لے کر، مثلاً امام بخاری سے لے کر اور رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی تک متصل سند ہو اور درمیان میں کوئی سلسلہ ٹوٹا ہوا نہ ہو۔ اگر ایک سلسلہ بھی ٹوٹا ہوا ہے تو وہ حدیث پھر صحت کے اس معیار کی نہیں ہوگی۔ دوسری شرط یہ ہے کہ روایت شاذ نہ ہو۔ راوی مستند ہے، اس میں عقل بھی ہے، ضبط بھی ہے، مسلمان بھی ہے، اس میں عدالت بھی ہے اور سند بھی

متصل ہے۔ لیکن وہ کوئی ایسی روایت نہ کرے جو عام، مشہور، مستند اور طے شدہ سنت سے متعارض ہو۔ ایسی روایت کو شاذ کہتے ہیں۔ اگر کوئی ثقہ اور مستند راوی ایسی چیز بیان کرے جو عام رواۃ کی روایت کردہ روایات کے خلاف ہو اس کو شاذ کہتے ہیں۔ اور تیسری شرط اس باب میں یہ ہے کہ اس کے اندر کوئی ایسی چھپی ہوئی داخلی علت نہ ہو جو اس کے معیار کو متاثر کردے۔ علت سے مراد کوئی ایسی کمزوری ہوتی ہے جو بظاہر نہ راویت میں نظر آتی ہے نہ متن میں، اور ہم جیسے عامی لوگوں کو اس کا پتہ نہیں چل سکتا، لیکن ایک ماہر فن جو علم حدیث کا امام ہو اور علم حدیث کی نزاکتوں کی جزوی اور کلّی تفصیلات سے واقف ہو، وہ پتہ لگا سکتا ہے کہ اس میں یہ کمزوری یا یہ خامی ہے۔ اس پوشیدہ کمزوری یا خامی کو علّت کہتے ہیں اور یہ علم حدیث کا سب سے مشکل فن ہے۔

علل الحدیث پر بھی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ 'معرفت علل الحدیث' کے موضوع پر ائمہ حدیث نے بہت کام کیا ہے اور اس بات کے اصول طے کئے ہیں، کہ حدیث کی اگر کوئی علت ہے تو اس کو کیسے دریافت کیا جائے۔ علّت کے معنی آپ 'کمزوری' کر سکتے ہیں کہ کوئی ایسی داخلی، اندرونی اور چھپی ہوئی کمزوری جس کا عام آدمی کو پتہ نہیں چلتا۔ یہ تینوں چیزیں اس میں موجود نہ ہوں اور راوی چاروں شرائط پر پورا اترتا ہو تو پھر وہ حدیث صحیح حدیث کہلائے گی۔

آپ میں سے کل کسی نے پوچھا تھا کہ صحیح حدیث کس کو کہتے ہیں تو حدیث صحیح اس کو کہتے ہیں۔ یعنی حدیث صحیح وہ ہے جس کی سند متصل ہو، اس میں کوئی خلا نہ ہو، اس میں کوئی روایت شاذ نہ ہو، کوئی اندرونی علت نہ پائی جاتی ہو اور راوی میں چاروں شرائط موجود ہوں۔ گویا راوی کی چار شرائط ہیں اور حدیثِ صحیح کی بھی چار شرائط ہیں۔ راوی کی چار شرائط اسلام، عدالت، عقل اور ضبط۔ یہ سات شرائط جس حدیث میں پائی جائیں گی وہ حدیث حدیثِ صحیح ہوگی۔

ضبط سے مراد جیسا کہ میں نے عرض کیا قوت یادداشت ہے، اور محدثین کہتے ہیں، دقّت ملاحظہ۔ جب روای یہ واقعہ دیکھ رہے تھے یا سن رہے تھے یا حدیث کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے تو ان کا مشاہدہ اتنا گہرا ہونا چاہئے، دقت ملاحظہ کے معنی ہیں **keen observation** یا **minute observation** کہ وہ ایک ایک لفظ اور ایک ایک جز کو پوری طرح سمجھ لیں اور اس کے بعد بیان کریں۔

ان سات شرائط میں سے اگر کوئی ایک شرط ناپید ہو جائے یا دو شرائط ناپید ہو جائیں تو

حدیث کا درجہ اسی اعتبار سے گھٹ جائے گا۔ ان شرائط کے کم یا زیادہ کم ہونے کی بنیاد پر احادیث دو قسموں میں تقسیم ہو جاتی ہیں۔ کچھ حدیثیں وہ ہیں جو قابل قبول ہیں اور کچھ احادیث وہ ہیں جو قابل قبول نہیں ہیں۔ ظاہر ہے دو ہی قسمیں ہوں گی۔

یہ نہیں ہوسکتا کہ کوئی حدیث آدھی قابل قبول ہو اور آدھی قابل قبول نہ ہو۔ یا کوئی حدیث جو حضورؐ سے منسوب ہو اور وہ اس معیار پر پورا اترتی ہو اور آپ کو یقین ہو گیا یا ظن غالب قائم ہو گیا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ تو وہ چیز قابل قبول ہے، واجب العمل ہے اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ یہ حدیث کی ایک بڑی قسم ہے۔

دوسری قسم اس حدیث کی ہے جو نا قابل قبول ہے اس کمزوری کی وجہ سے کہ آپ کو یقین ہو کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی نہیں ہے جس ذریعے یا جس اتھارٹی اور سند سے آپ تک پہنچا ہے وہ سند کمزور ہے اتنی مضبوط نہیں ہے، یہ دوسری قسم ہو گئی۔

حدیث کی اقسام

مقبول یا صحیح حدیث

جو پہلی قسم ہے یعنی حدیث صحیح یا قابل قبول حدیث، اس کی پھر دو قسمیں ہیں۔ ایک حدیث صحیح ہے یعنی وہ حدیث جو ان ساری شرائط کی جامع ہو جو میں نے ابھی عرض کیں۔ راوی میں چار باتیں پائی جاتی ہوں اور سند اور متن میں وہ تینوں منفی چیزیں جو موجود ہوسکتی ہیں وہ موجود نہ ہوں۔ ان سات شرائط کے بعد وہ حدیث حدیثِ صحیح ہوگی۔ لیکن حدیث صحیح میں بھی کئی درجات ہیں جن پر آگے چل کر بات کریں گے۔ حدیث صحیح قابل قبول اور واجب العمل ہے۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم اور موطاء امام مالکؒ کی جتنی مرفوع احادیث ہیں وہ ساری صحیح ہیں۔

حدیث حسن

اس کے بعد ایک درجہ آتا ہے جو حدیث حسن کہلاتا ہے، جو قابل قبول ہے لیکن اس کا درجہ حدیث صحیح سے کم ہے۔ حدیث حسن سے مراد وہ حدیث ہے کہ جس میں یا تو راوی کی چار شرائط میں سے کوئی ایک شرط کم ہو، یا ان تین شرائط میں سے کوئی ایک شرط جزوی طور پر مفقود ہو۔ اگر ان شرائط میں سے کوئی شرط کلی طور پر مفقود ہے تو پھر وہ حدیث حسن نہیں ہے، صحیح بخاری اور صحیح مسلم

میں ساری احادیث صحیح ہیں اور حدیث حسن کوئی نہیں ہے۔ ابوداؤد، ترمذی اور نسائی میں صحیح احادیث بھی ہیں اور حدیث حسن بھی بہت ہیں۔

ضعیف اور موضوع احادیث

دوسری طرف جو احادیث ناقابل قبول ہیں ان کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک ضعیف اور دوسری موضوع۔ موضوع کو مجازاً حدیث کہتے ہیں کیونکہ یہ وہ روایات ہیں جن کی نسبت رسول اللہ ﷺ سے درست نہیں ہے اور وہ حضورؐ کے ارشادات گرامی نہیں ہیں۔ موضوعات کے الگ مجموعے پائے جاتے ہیں۔ کئی لوگوں نے یہ مجموعے مرتب کئے ہیں جن کی تعداد درجنوں میں ہے۔ کم از کم پچیس تیس کتابیں ہیں جن میں موضوع احادیث جمع کر دی گئی ہیں، تاکہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ یہ حضورؐ کے ارشادات نہیں ہیں۔

ضعیف حدیث وہ ہے کہ جس میں حدیث حسن کی شرائط میں سے بعض شرائط نہ پائی جاتی ہوں۔ مثلاً سند پوری کی پوری متصل ہے لیکن راوی یادداشت میں کمزور ہے یا عدالت میں کمزور ہے، راوی کمزور باتیں روایت کرتا ہو۔ گویا وہ کھلم کھلا جھوٹا تو مشہور نہیں ہے لیکن اس کی روایات میں کمزور باتیں شامل ہوتی ہیں۔ اگر اس کی شہرت جھوٹے کی ہے تو پھر تو وہ حدیث موضوع ہو جائے گی، لیکن اس کے کردار کے بارے میں لوگوں کو کچھ شکایات ہیں، وہ حدیث ضعیف حدیث کہلائے گی۔

یہ حدیث کی چار بڑی بڑی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی ذیلی تقسیمات بے شمار ہیں۔ محدثین نے کم وبیش سو اقسام بیان کی ہیں۔ ان سو قسموں میں ہر ایک کے الگ الگ احکام ہیں۔ یہ وہ فن ہے جس کی تدوین میں کم وبیش چار پانچ سو سال لگے ہیں اور ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں بہترین دماغوں نے اور انتہائی مخلص ترین اور متقی ترین انسانوں نے اس کی تدوین اور اس کی خدمت میں وقت صرف کیا ہے۔ اس لئے جیسے جیسے غور وخوض ہوتا گیا اور تحقیق ہوتی گئی نئی نئی تقسیمیں سامنے آتی گئیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، نئے نئے مواقع اور نت نئے امکانات سامنے آتے رہے۔ کم وبیش سو قسمیں محدثین نے بیان کی ہیں۔ مقدمہ ابن الصلاح، جو علوم حدیث کی مشہور کتاب ہے، اور اپنے زمانے کی ایک منفرد کتاب سمجھی جاتی تھی، اس میں علامہ ابن

الصلاح نے احادیث کی پینسٹھ اقسام کی تفصیل بیان کی ہے۔انہوں نے اس میں ضعیف احادیث کی بیالیس قسمیں قرار دی ہیں، جن میں سے بعض کا میں ابھی ذکر کر رہا ہوں۔

صحیح احادیث کی مزید اقسام

صحیح لعینہ اور صحیح لغیرہ

سب سے پہلے حدیث صحیح کو لیتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا حدیث صحیح کی کئی تقسیمیں ہیں۔ ان سب کو میں چھوڑ کر صرف دو تقسیموں کا ذکر کرتا ہوں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ حدیث صحیح میں ساری کی ساری شرائط بدرجہ اتم موجود ہوتی ہیں اور کسی شرط کی کمی نہیں ہوتی تو وہ حدیث صحیح لعینہ کہلاتی ہے۔ اس کو آپ کہہ سکتے ہیں یا **The *Sahih par excellance***، جو اپنی ذات میں بالکل صحیح ہے۔ دوسری قسم صحیح لغیرہ کہلاتی ہے، کہ اصل میں تو وہ حدیث صحیح کے مکمل معیار پر نہیں تھی، لیکن اس میں جو کمی رہ گئی تھی وہ کسی اور ذریعہ سے پوری ہوگئی۔ مثال کے طور پر ایک صحابیؓ سے ایک حدیث مروی ہے، آپ کے پاس جس سند سے وہ حدیث پہنچی، فرض کیجئے کہ آپ امام بخاری کے زمانے میں ہیں، اور آپ کو ایک خاص سند سے حدیث پہنچی، اس سند میں جو محدث صحابیؓ سے روایت کرتے ہیں وہ آپ کی تحقیق میں کمزور ہیں۔ اس لئے آپ نے اس کو حدیث حسن یا حدیث ضعیف قرار دے دیا۔ پھر کچھ دن کے بعد آپ کو کسی اور سند سے وہی حدیث پہنچی، اس میں جو راوی صحابیؓ سے روایت کرنے والے ہیں وہ تو درست ہیں لیکن تابعی سے روایت کرنے والے کمزور ہیں، گویا اس مرحلہ پر جو کمزوری تھی وہ دور ہوگئی، دوسرے مرحلہ پر کمزوری آ گئی۔ تو پہلے مرحلہ والی کمزوری تو ایک حد تک دور ہوگئی اور یہ یقین ہو گیا کہ یہ حدیث صحابہ کرام سے روایت کرنے والوں میں بعض مستند اور پختہ لوگ بھی موجود ہیں۔ پھر تیسری حدیث ملی جس میں تبع تابعی کی کمزوری بھی دور ہوگئی تو گویا تبع تابعین میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جو مستند تھے۔ اس طرح سے اس کو کولیٹ کرنے اور آپس میں مختلف روایات اور اسناد کا تقابل کرنے کے بعد جو کمزوری تھی وہ دور ہوگئی۔ اس تحقیق کے بعد آپ نے اس حدیث کو بھی صحیح قرار دے دیا تو ایسی حدیث صحیح لغیرہ کہلاتی ہے۔ جو اپنی ذات میں تو صحیح نہیں تھی لیکن دوسرے دلائل اور شواہد کی وجہ سے وہ صحیح قرار پا گئی۔

حسن لعینہ اور حسن لغیر ہ

جس طرح صحیح کی ہی دو بڑی بڑی قسمیں ہیں: صحیح لعینہ اور صحیح لغیر ہ۔ اسی طرح سے حسن کی بھی دو قسمیں ہیں ۔ حسن لعینہ اور حسن لغیر ہ۔ حسن لعینہ تو وہ حدیث ہے جو صحیح حدیث ہونے کی ایک یا دو شرائط میں ناقص ہے۔ لیکن اگر آپ نے اپنی ابتدائی تحقیق میں کسی حدیث کو ضعیف قرار دیا اور ضعیف قرار دینے کے بعد آپ کو بعض شواہد سے یہ تحقیق ہوگئی کہ جس سبب سے آپ نے ضعیف اُس حدیث کو قرار دیا تھا ان اسباب کا ازالہ ہوسکتا ہے۔ اس ازالہ کی وجہ سے یا اس کمی کے دور ہو جانے کی وجہ سے آپ نے اس کو حسن قرار دے دیا، یہ حسن لغیر ہ ہے۔ یعنی خارجی اسباب و شواہد کی وجہ سے یہ حسن قرار پا گئی ورنہ اصل میں یہ حسن نہیں تھی بلکہ ضعیف تھی۔

صحیح لعینہ اور صحیح لغیر ہ کے بعد یہ ایک اور تقسیم ہوگئی یعنی حسن لعینہ اور حسن لغیر ہ۔ پھر جو احادیث صحیح لعینہ ہیں۔ یعنی **Origionally** صحیح ہیں، ان کی پھر تین قسمیں ہیں۔ ایک قسم وہ ہے کہ جس کو صحابہ کرامؓ کی اتنی بڑی تعداد نے نقل کیا ہو اور تابعین اتنی بڑی تعداد نے روایت کیا ہو جن کے بارے میں ایسے کسی امکان کا شائبہ تک نہ رہے کہ ان میں سے کسی سے کوئی بھول چوک ہوگئی ہوگی۔ صحابہ کرام نعوذ باللہ غلط بیانی تو نہیں کرتے تھے، اور نہ کسی صحابیؓ کو غلط بیان سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس کا عقلی اور بشری طور پر امکان موجود ہے کہ کسی بات کو یاد رکھنے یا سمجھنے میں کسی صحابیؓ سے بھول چوک ہوگئی ہو، اس کا عقلی اور بشری امکان بہر حال موجود ہے۔ لیکن اگر کسی حدیث کو اتنی بڑی تعداد میں صحابہ نے نقل کیا ہو کہ ان میں بھول چوک کا امکان بھی ناپید ہو جائے اور پھر صحابہ سے نقل کرنے والے بھی اتنی ہی بڑی تعداد میں ہوں کہ ان کے بارے میں بھی کسی غلط بیانی یا بھول چوک کا امکان نہ رہے۔ پھر تابعین سے روایت کرنے والے بھی اتنی بڑی تعداد میں ہوں کہ ان کے روایت کرنے میں بھی کسی غلطی کا امکان نہ رہے تو پھر اس حدیث کو حدیث متواتر کہا جاتا ہے۔ حدیث متواتر کا درجہ وہی ہے جو قرآن پاک کا ہے۔ ثبوت کے اعتبار سے حدیث متواتر اور قرآن پاک میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جس طرح قرآن پاک تواتر سے نسلاً بعد نسلٍ ہم تک پہنچا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں صحابہ کرام نے یاد کیا، پھر لاکھوں تابعین کو یاد کرایا اور اس طرح سے ہم تک پہنچ گیا۔ اسی طرح سے حدیث متواتر صحابہ کی بڑی تعداد سے منقول ہے۔ صحابہ

کی بڑی تعداد نے تابعین کی بہت بڑی تعداد تک پہنچایا۔ اس طرح سے ہوتے ہوتے وہ احادیث مرتبین کتب حدیث تک آ گئیں اور مرتب ہوگئیں اس لئے یہ درجہ سب سے اونچا ہے۔

تواتر کے درجات

تواتر میں پھر الگ الگ درجات ہیں۔ سب سے اونچا درجہ اس روایت کا ہے جو متواتر باللفظ ہے یعنی جس کے الفاظ تواتر سے ہم تک پہنچے ہیں۔ جس میں بعینہ ان الفاظ کو درجنوں اور سینکڑوں کی تعداد میں صحابہ نے بیان کیا۔ تبرک کے طور پر صرف دو احادیث متواتر باللفظ آپ سے بیان کر دیتا ہوں۔

حضورؐ نے فرمایا کہ 'مَن کَذب عليّ مُتعَمِّداً فليتبوأ مقعده من النار' جو شخص جان بوجھ کر مجھ سے جھوٹ منسوب کرے وہ جہنم میں اپنا ٹھکانہ بنالے۔ اس حدیث کو دو سو صحابہ نے روایت کیا ہے۔ اور یہ ان چند احادیث میں سے ہے جن کے راویوں میں تمام عشرہ مبشرہ شامل ہیں۔ عشرہ مبشرہ کے دس کے دس اصحاب اس کے راوی ہیں۔ صدیق اکبرؓ سے لے کر بقیہ عشرہ مبشرہ سمیت دو سو صحابہ کرام نے اس کو روایت کیا ہے اور ان سے ہزاروں تابعین نے روایت کیا ہے۔ ہزاروں تابعین سے لاکھوں تبع تابعینؒ نے روایت کیا۔ یہ تواترِ لفظی کی ایک مثال ہے۔

دوسری مثال: 'لافضل لعربي على عجمي الا بالتقوىٰ' حضورؐ نے خطبہ حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا، ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ نے سنا، ان میں سے سینکڑوں نے آگے بیان کیا اور یہ چیز تواتر کے ساتھ انہی الفاظ میں لوگوں تک پہنچی۔

تواتر لفظی کے بعد دوسری مثال ہوتی ہے تواتر معنوی کی۔ کہ وہ الفاظ تو متواتر نہیں ہیں لیکن ان کا مشترک مفہوم تواتر کے ساتھ آیا ہے۔ تواتر معنوی کی مثال ہے: 'مسح علی الخفین'۔ جرابوں پر یا چمڑے کے موزوں پر بہ اختلاف فقہا مسح کا جائز ہونا تواتر معنوی ہے۔ کم وبیش ستر اسی صحابہ کرام سے مروی ہے۔ بہت بڑی تعداد میں صحابہ کرام نے اس روایت کو نقل کیا ہے۔ ان کے الفاظ ایک نہیں ہیں اور ایک ہو بھی نہیں سکتے اس لئے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے عمل کو دیکھا اور ہر دیکھنے والے نے اپنے الفاظ میں بیان کیا۔ الفاظ سب کے الگ الگ ہیں، لیکن مفہوم سب کا ایک ہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے موزوں پر مسح فرمایا۔

تواتر کی تیسری قسم ہوتی ہے تواتر قدر مشترک۔ جہاں سب روایت کے الفاظ بھی الگ الگ ہوتے ہیں اور ان کا مفہوم بھی الگ الگ ہوتا ہے، لیکن ان سب احادیث میں ایک حصہ قدر مشترک ہے جس سے ایک خاص بات ظاہر ہوتی ہے وہ تواتر قدر مشترک ہے۔ گویا یہ قدر مشترک حصہ اس طرح ثابت ہے کہ جس میں نہ کوئی تامل ہے نہ کسی شک وشبہ کی گنجائش ہے۔ وہ تواتر قدر مشترک کہلاتا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ مثال کے طور پر نمازوں کے اوقات کا معاملہ۔ اس بارے میں بہت سی احادیث ہیں۔ مختلف صحابہ نے اپنے اپنے انداز میں تفصیلات کو بیان کیا۔ رسول اللہ نے وقتاً فوقتاً مختلف الفاظ میں اس کو بیان کیا۔ صحابہ کرام نے مختلف سیاق وسباق میں اس کو بیان کیا۔ لیکن ان سب روایات کا قدر مشترک کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ظہر کی نماز اس وقت ہوگی جب سورج ڈھل جائے، فجر کا وقت اس وقت ہوگا جب صبح صادق طلوع ہو جائے۔ یہ الفاظ تو متعین طور پر متواتر احادیث میں نہیں آئے لیکن یہ قدر مشترک سینکڑوں احادیث میں موجود ہے۔ اس لئے یہ تواتر قدر مشترک کہلاتا ہے۔

اس کے بعد ایک درجہ ہے تواتر طبقہ کا۔ کہ ایک طبقہ نے، ایک پوری نسل نے ایک کام اس طرح کیا، اس کو دیکھ کر دوسری نسل نے، پھر تیسری نسل نے، پھر چوتھی نسل نے۔ یا کسی خاص طبقہ نے، لوگوں کے کسی خاص گروہ نے ایک عمل اس طرح کیا۔ مثال کے طور پر ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتا ہوں۔ احادیث میں مختلف ناپوں (Measures) کا ذکر ہے۔ مثلاً صدقہ فطر کے بارے میں ذکر ہے، یا زکوۃ کے بارے میں ذکر ہے۔ اب حدیث میں کچھ پیمانوں کا ذکر آیا ہے کہ 'صاع'، نصف صاع من بُرّ' یعنی صدقہ فطر کے طور پر گندم کا نصف صاع دیا جائے۔ تو صاع سے کیا مراد ہے۔ اُس زمانے میں ایسے پیمانے تو نہیں ہوتے تھے جو سرکاری طور پر سٹینڈ رائزڈ ہوں۔ ہر علاقے میں ایک ہی نام کے مختلف اوزان رائج ہوتے تھے۔ مثلاً جس پیمانہ کو ہم آج تک سیر کہتے تھے اور اب کلو کہنے لگے ہیں، یہ سیر مختلف علاقوں میں مختلف مقدار کے ہوتے تھے مثلاً، سیر عالمگیری، سیر شاہجہانی، پکا سیر، کچا سیر، فلاں سیر اور فلاں سیر وغیرہ۔ ہر سیر کا الگ الگ وزن متعین ہوتا تھا۔ کوئی اسّی تولہ کا سیر ہے، کوئی چالیس تولے کا ہے، کوئی ۱۲۰ تولہ کا۔ اسی طرح سے عرب میں صاع مختلف انداز کے ہوا کرتے تھے۔ اب یہ بات کہ حدیث میں جس صاع کا ذکر ہوا ہے وہ کتنا ہے کہ اس کے مطابق آپ صدقہ فطر ادا کریں، ایک تحقیق طلب بات تھی۔

امام ابو یوسفؒ کوفہ میں رہتے تھے، انہوں نے کوفہ میں رائج صاع کی بنیاد پر فتویٰ دیا کہ صدقہ فطر کوفہ کے نصف صاع کے مطابق دیا کریں۔ جب وہ مدینہ منورہ تشریف لائے تو دیکھا کہ یہاں کا صاع کوفہ کے صاع سے مختلف ہے۔ امام مالکؒ سے ملاقات ہوئی اور مختلف معاملات پر تبادلہ خیال ہوا تو امام مالک نے پوچھا کہ صدقہ فطر کی آپ کیا مقدار قرار دیتے ہیں؟ امام ابو یوسف نے فرمایا کہ آدھا صاع جیسا کہ حدیث میں ہے۔ امام مالکؒ نے پوچھا کون سا صاع، انہوں نے فرمایا صاع، امام مالک نے کہا نہیں، مدینہ کا صاع اور ہے اور دوسری جگہوں میں اور ہے۔ اس پر امام ابو یوسفؒ کو تامل ہوا۔ امام مالکؒ نے اگلے دن مدینہ منورہ کے بازار سے بہت سے دکانداروں کو یہ کہہ کر بلایا کہ اپنا اپنا صاع، یعنی ناپنے کا پیالہ لے کر آو۔ وہ اپنا اپنا صاع لے آئے۔ انہوں نے پوچھا کہ یہ پیالہ آپ کو کہاں سے ملا۔ جواب ملا کہ والد کے زمانے سے، پوچھا والد کے پاس کہاں سے آیا؟ جواب دیا: دادا کے زمانے سے، اس طرح سے یہ پتہ چلا کہ بہت سے لوگوں کے پاس خاندانی صاع تھے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارک سے چلے آرہے تھے۔ یوں یہ ثابت ہو گیا کہ حضورؐ کے زمانے میں یہی صاع رائج تھا۔

یہ تواتر طبقہ ہے کہ ایک خاص طبقہ میں مثلاً جو تاجروں کا طبقہ ہے، اور حضورؐ کے زمانہ سے مدینہ میں تجارت کرتا تھا، ان میں تواتر کے ساتھ ایک چیز چلی آرہی ہے۔ یہ بھی تواتر کی ایک قسم ہے۔ اس پر امام ابو یوسف نے اپنی رائے سے رجوع کیا اور امام مالکؒ کی رائے سے اتفاق فرمایا۔

تواتر طبقہ کی ایک اور مثال عرض کرتا ہوں۔ امام یوسف اور امام مالکؒ ہی کا واقعہ ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب فتح مکہ کے موقع پر مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور وہاں بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا اور وہاں اسلامی ایڈمنسٹریشن قائم ہو گئی تو ایک کمسن نوجوان تھے ابو محذورہ، جن کی آواز بڑی اچھی اور اونچی تھی، اور انہوں نے چار پانچ دن میں جب تک مسلمان وہاں رہے، اذان یاد کر لی تھی۔ ابو محذورہ بہت کم سن تھے اور ان کی عمر تیرہ چودہ سال سے بھی کم تھی۔ آواز بڑی اونچی تھی اور اذان بھی یاد کر لی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو حرم مکہ کا موذن مقرر کر دیا۔ اور یہ دیکھنے کے لئے کہ ان کو اذان صحیح یاد ہے یا نہیں، فرمایا کہ میں کھڑا ہوتا ہوں تم اذان کا ایک ایک جملہ مجھے سناتے جاؤ۔ وہ ایک جملہ آہستہ سے کہتے تھے، اللہ اکبر اللہ اکبر، پھر حضورؐ اشارہ فرماتے تھے کہ ہاں ٹھیک ہے، کہو۔ پھر وہ زور سے کہتے تھے؛ اللہ

اکبراللہ اکبر۔ اس طرح سے پوری اذان کے الفاظ وہ ہر مرتبہ پہلے آہستہ کہتے اور جب حضورؐ اس کے درست ہونے کی تصدیق فرمادیتے تو اس کے بعد وہ زور سے کہتے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے دو تین مرتبہ یہ کیا کہ خود تشریف فرما ہوئے، ابومحذورہؓ نے آہستہ سے اذان کے الفاظ کہے، حضورؐ نے درست ہونے کا اشارہ کیا اور پھر انہوں نے زور سے اذان پڑھی۔

ابومحذورہ زندگی بھر اس طرح سے اذان دیتے رہے۔ اور جو کوئی اذان کی روایت پوچھتا تھا وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے سکھایا کہ پہلے اس کو آہستہ سے کہو پھر زور سے کہو۔ اس کو تـــرجیـــع کہتے ہیں ۔یعنی لوٹانا، رجوع سے ہے۔ امام ابو یوسف حج کے لئے تشریف لے گئے۔ مکہ مکرمہ میں مختلف محدثین سے اذان کے احکام پوچھے۔ تو وہاں کے کئی لوگوں نے ان کو ترجیع کا طریقہ سکھایا کہ اذان کا سنت طریقہ یہ ہے کہ پہلے آہستہ کہو اس کے بعد بلند آواز سے کہو۔ امام ابو یوسفؒ نے اس کی بنیاد پر فتویٰ دینا شروع کر دیا کہ اذان میں ترجیع سنت ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کا مدینہ منورہ تشریف لانا ہوا جہاں امام مالکؒ سے ملاقات ہوئی۔ یہ نہیں معلوم کہ اسی ملاقات میں یا کسی اور ملاقات میں۔ جب اذان پر بات ہوئی تو امام ابو یوسف نے فرمایا کہ اذان میں ترجیع سنت ہے۔ امام مالکؒ نے کہا کہ ترجیع نہ سنت ہے اور نہ شرط ہے، امام ابو یوسف نے فرمایا کہ مجھ سے فلاں محدث نے روایت کی ہے، انہوں نے فلاں سے روایت کی ہے انہوں نے فلاں سے روایت کی انہوں نے فلاں سے روایت کی تو انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے جب ابومحذورہ کو اذان سکھائی تو ترجیع کے ساتھ سکھائی تھی۔ امام مالکؒ نے فرمایا کہ یہ روایت میرے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ اب امام ابو یوسفؒ کو حیرت ہوئی کہ میں حدیث صحیح کو پوری متصل سند سے بیان کر رہا ہوں، ساری کی ساری شرائط پوری ہیں اور امام مالکؒ کہتے ہیں کہ یہ میرے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ امام ابو یوسفؒ نے پوچھا کہ آپ کے پاس کوئی ایسی حدیث متصل موجود ہے جس کی بنیاد پر آپ میری روایت کو نا قابل قبول قرار دے رہے ہیں۔ امام مالک نے کہا نہیں۔ امام ابو یوسف کو اور بھی حیرت ہوئی۔ امام مالکؒ نے کہا اچھا اس کا میں کل جواب دوں گا۔ اگلے دن جب امام ابو یوسف ملاقات کے لئے تشریف لے آئے تو امام مالکؒ کے ہاں بہت سے حضرات بیٹھے ہوئے تھے۔ امام مالکؒ نے ایک سے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ انہوں نے کہا کہ میں مدینہ منورہ کی فلاں مسجد کا موذن ہوں۔ انہوں نے کہا کہ اذان دیجئے۔ انہوں نے

اذان دے کر سنائی، اس میں ترجیع نہیں تھی۔ ان سے پوچھا کہ آپ کو یہ اذان کس نے سکھائی۔ کہا کہ میرے والد نے۔ پوچھا: آپ کے والد کو کس نے سکھائی؟ جواب دیا: ان کے والد نے۔ پوچھا: ان کو کس نے سکھائی؟ جواب دیا: ان کے والد نے، ان کو کس نے سکھائی؟ کہا کہ یہ تو معلوم نہیں لیکن وہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مدینہ منورہ کی فلاں مسجد میں اسی طرح اذان دیا کرتے تھے۔ مدینہ منورہ کی تمام مساجد کے موذنوں نے ایک ایک کر کے یہ گواہی دی کہ ہم ابتداء سے اسی طرح سے اذان دیتے چلے آرہے ہیں۔ اور ہمارے باپ، ہمارے دادا اور ہمارے پڑ دادا، جب سے یہ سلسلہ قائم ہے اس وقت سے اس طرح اذان دیتے چلے آرہے ہیں۔ امام مالکؒ نے کہا کہ یہ تواتر طبقہ ہے جو میرے نزدیک انفرادی روایت سے بڑھ کر ہے۔ یہ انفرادی روایت جو آپ (امام ابو یوسفؒ) نے بیان کی ہے یہ ایک صحابیؓ کی ایک تابعی کو اور ایک تابعی کی ایک تبع تابعی کو ہے۔ اس کے مقابلہ میں میری جو روایت ہے یہ ایک طبقہ کی دوسرے طبقہ کے لئے اور دوسرے طبقہ سے تیسرے طبقہ کے لئے ہے۔ یہ زیادہ قابل قبول ہے۔

یہی وہ چیز ہے جس کو امام مالکؒ 'عملِ اہلِ مدینہ' کہتے ہیں۔ امام مالکؒ کا اصول یہ ہے کہ اگر کوئی ایک حدیث جو کسی ایک راوی سے مروی ہو (جسے حدیث اَحاد کہتے ہیں، آگے اس کی تفصیل آئے گی۔) اگر وہ تواتر طبقہ، یا اہل مدینہ کے عمل سے متعارض ہو تو اہل مدینہ کے عمل کو ترجیح دی جائے گی اور اس روایت کو چھوڑ دیا جائے گا۔ یہ تواتر طبقہ کی مثال ہے۔

آخری قسم ہے جس کو تعامل کہتے ہیں اور تواتر کا لفظ بعض اوقات استعمال نہیں کرتے۔ تعامل سے مراد ہے کہ امت مسلمہ میں جو طریقہ چلا آرہا ہے۔ غور سے سنئے گا اس لئے کہ تعامل کا مفہوم سمجھنے میں اکثر غلط فہمی ہوتی ہے۔ ایسے اہل علم، مخلص، متقی اور متبع سنت جن حضرات کا طرز عمل سنت اور شریعت کے مطابق ہو، اگر ان میں ایک طریقہ کار چلا آرہا ہو جس کی تائید میں صحیح احادیث موجود ہوں تو وہ خود اپنی جگہ ایک دلیل ہے اور قابل قبول ہے۔ عام لوگوں کا، گناہ گاروں کا، جاہلوں کا، شریعت سے ناواقف لوگوں کا تعامل کسی چیز کی دلیل نہیں ہے۔ لوگوں میں بہت سی غلط چیزیں بھی پھیل جاتی ہیں۔ لہٰذا یہ بات کہ چونکہ مسلمانوں میں یہ چیز رائج ہے اس لئے یہ درست ہے، یہ بات صحیح نہیں ہے۔ بلکہ تعامل کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسلمانوں میں رائج بھی ہو اور اس دور کے اور ہر دور کے متدیّن اہل علم، شریعت اور قرآن وسنت کا علم رکھنے والے اس کو

درست سمجھتے ہوں، یہی وہ تعامل ہے جو تواتر کی ایک قسم ہے، بشرطیکہ احادیث صحیحہ سے اس کی تائید ہوتی ہو۔ ورنہ بیسیوں قسم کی گمراہیاں ہیں جو مسلمانوں میں پھیل گئی ہیں۔ اگر ہر چیز کو تعامل کی بنیاد پر درست سمجھا جائے تو بہت سی گمراہیاں درست ہو جائیں گی۔

یہ حدیث متواتر ہے جس کی بے شمار مثالیں ہیں، دو تین مثالیں میں نے بیان بھی کر دیں۔ متواتر کا درجہ ثبوت کے معاملہ میں قرآن پاک کے برابر یا اس کے قریب قریب ہے۔ بعض جگہ قریب قریب ہے، بعض جگہ اس کے فوراً بعد ضرور ہے۔

حدیث مشہور

حدیث صحیح کی دوسری قسم ہے حدیث مشہور۔ یعنی وہ حدیث جس کو نقل کرنے والے تواتر کے درجہ تک تو نہ پہنچتے ہوں۔ لیکن اتنی تعداد میں ضرور ہوں کہ ان کی روایت کردہ حدیث ہر طبقہ میں معروف اور مشہور رہی ہو۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس کے راوی کم از کم تین ہوں، کسی نے کہا کہ دو ہوں، کسی نے کہا کہ دس ہوں۔ اس کا تعین بڑا دشوار ہے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ صحابہ کی سطح پر تین ہوں باقی تین یا اس سے زیادہ ہوں۔ لیکن اس کی کوئی متعین تعداد طے شدہ نہیں ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ روایت اتنی مشہور ہو کہ آپ اس کو خبر واحد یا ایک آدمی کی یادداشت پر مبنی نہ قرار دے سکیں۔

خبر واحد

خبر واحد حدیث صحیح میں بھی ہو سکتی ہے، حسن میں بھی ہو سکتی ہے اور ضعیف میں بھی ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ اس کا تعلق راویوں کی تعداد سے ہے۔ خبر واحد سے مراد وہ حدیث ہے جو ایک راوی نے ایک دوسرے راوی سے بیان کی ہو اور اس دوسرے راوی نے ایک تیسرے راوی سے بیان کی ہو۔ یعنی صحابہ، تابعین اور تبع تابعینؒ، تینوں مراحل پر ایک ایک راوی ہو۔ اس کو خبر واحد بھی کہتے ہیں یا اخبار آحاد یا خبر آحاد بھی کہتے ہیں۔ آحاد، احد یا احد کی جمع ہے۔ یعنی تین سطحوں پر کم از کم ایک ایک راوی ہو۔ ایک سے زیادہ ہو تو وہ حدیث مشہور کے زمرہ میں شامل ہو جائے گی یا عزیز ہو جائے گی، اور بھی قسمیں ہیں۔ لیکن تفصیلات کو میں چھوڑ دیتا ہوں۔

خبر واحد کے بارے میں بڑی تفصیلی بحثیں ہیں کہ خبر صحیح بھی ہو اور خبر واحد بھی ہو۔ تو

اس کا حکم شریعت میں کیا ہے۔ اور فقہائے اسلام اور محدثین کے دور سے لے کر آج تک اس پر عمل درآمد ہوتا چلا آ رہا ہے۔ بعض محدثین کا خیال یہ ہے کہ اگر خبر واحد خبر صحیح ہے تو ہر حال میں واجب التعمیل ہے اور اس پر عمل درآمد کیا جائے گا۔ بعض فقہا کا، جن میں حضرت امام ابوحنیفہؒ بھی شامل ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اگر خبر واحد طے شدہ سنت اور قیاس سے متعارض ہو تو قیاس اور طے شدہ سنت کو ترجیح دی جائے گی، اور خبر واحد کا کوئی اور مفہوم قرار دیا جائے گا۔ اس پر ظاہری معنوں میں عمل نہیں کیا جائے گا۔ اس میں صرف یہی دو رائے نہیں بلکہ اور بھی آراء موجود ہیں اور انہی کی بنیاد پر فقہی مسالک وجود میں آئے، واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں صدر اسلام میں فقہی مسالک جتنے بھی بنے وہ اکثر و بیشتر 75 یا 80 فیصد خبر واحد کے بارے میں اختلاف ہی کی بنیاد پر وجود میں آئے ہیں، حدیث کی باقی قسموں کے بارہ میں کوئی اختلاف نہیں۔

امام ابوحنیفہ اپنے اس نقطۂ نظر کی تائید میں ایک واقعہ سے استدلال کرتے ہیں۔ ایک خاتون تھیں فاطمہ بنت قیسؓ۔ وہ صحابیہ تھیں اور بڑی عالمہ اور فاضلہ خاتون تھیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں طلاق کا ایک مقدمہ آیا۔ کسی شخص نے اپنی اہلیہ کو طلاق دے دی۔ اور طلاق دینے کے بعد کہا کہ میرے گھر سے نکل جاؤ۔ مطلقہ خاتون شکایت لے کر حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور کہا کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق دے دی اور گھر سے نکلنے کے لئے کہتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ قرآن پاک میں متعہ طلاق کا حکم ہے، جس کی بنیاد پر وہ تمہیں نفقہ دینے کے بھی پابند ہیں اور رہائش دینے کے بھی پابند ہیں۔ جب تک تم عدت میں ہو یہ دونوں چیزیں ان کے ذمہ ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ اور تمام خلفائے راشدینؓ کا طریقہ تھا کہ کوئی فیصلہ کرنے کے بعد تصدیق (Confirmation) کے لئے بقیہ صحابہ کرام سے پوچھتے تھے کہ کیا میں نے صحیح فیصلہ کیا ہے؟ اپنے سارے علم و فضل کے باوجود حضرت ابوبکر صدیقؓ کا بھی یہی طریقہ تھا، حضرت عمر فاروقؓ کا بھی، حضرت عثمانؓ کا بھی اور حضرت علیؓ کا بھی، کہ بقیہ صحابہ کرام سے جو وہاں موجود ہوتے تھے اس کو Verify کراتے تھے۔

چنانچہ یہ فیصلہ کرنے کے بعد حضرت عمرؓ نے صحابہ کرام سے، جو وہاں موجود تھے، پوچھا کہ کیا میں نے درست فیصلہ کیا ہے؟ سب صحابہ نے کہا کہ درست ہے۔ اس پر یہ خاتون جن کا میں نے ذکر کیا یعنی فاطمہؓ بنت قیس کھڑی ہوئیں اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں میرے

شوہر نے مجھے طلاق دے دی تھی اور رسول اللہ ﷺ نے میرے شوہر کو نہ رہائش فراہم کرنے کے لئے کہا تھا نہ نفقہ فراہم کرنے کو۔ لہٰذا یہ صاحب جنہوں نے بیوی کو طلاق دے دی ہے وہ ان مطلقہ بیوی کو نفقہ اور رہائش فراہم کرنے کے پابند نہیں ہیں۔ سیّدنا عمر فاروقؓ نے اس پر ارشاد فرمایا کہ 'لانترك كتاب ربّنا و سنة نبينا بقول امرأةٍ لاندرى هل حفظت ام نسيت' کہ ہم اللہ کی کتاب اور اپنے رسول کی سنت کو کسی ایسی خاتون کے کہنے پر نہیں چھوڑ سکتے جس کے بارے میں ہمیں معلوم نہیں کہ اسے صحیح یاد رہا یا وہ بھول گئی۔

اب یہاں خبر واحد ہے جو ایک صحابیہؓ کی روایت ہے۔ وہ صحابہ کی مجلس میں بیان کر رہی ہے، جس میں نعوذ باللہ جھوٹ بولنے یا بد دیانتی کا کوئی امکان نہیں۔ لیکن ایک انسانی اور بشری خطا کا امکان ضرور ہے۔ بقیہ صحابہ کرامؓ کو جو چیز معلوم تھی وہ یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے نفقہ کا حکم بھی دیا ہے اور رہائش فراہم کرنے کا بھی حکم دیا ہے۔ قرآن پاک میں متاع بالمعروف کا ذکر ہے۔ وللمطلقات متاع بالمعروف حقا على المتقين۔ قرآن پاک میں جو حکم آیا ہے اور حضورؐ نے اس پر عمل کیا ہے وہ اس خاتون کی روایت پر ہم نہیں چھوڑ سکتے۔ یہاں حضرت عمر فاروقؓ نے بقیہ تمام صحابہ کی موجودگی میں ان کی منظوری سے خبر واحد کو ترک کر دیا۔ اور ان کی جو فہم کتاب اللہ اور سنت ثابتہ کی تھی اس کے مطابق عمل کیا۔

اس واقعہ سے امام ابوحنیفہ نے استدلال کیا کہ اگر خبر واحد اس نوعیت کی ہو کہ جس کا تعارض کسی بڑے واقعہ سے، قرآن کی کسی آیت سے یا سنت ثابتہ سے ہوتا ہو تو پھر اس کو نظر انداز کر دیا جائے گا اور قرآنی حکم یا سنت ثابتہ کو ترجیح دی جائے گی۔ کچھ اور فقہا کی رائے اس سے مختلف ہے جس کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے۔ لیکن فقہا کے جتنے اختلافات ہیں وہ اسّی فیصد یا پچھتر فیصد اسی خبر واحد کے بارہ میں کہ اس پر کب اور کہاں عمل کیا جائے اور کہاں نہ کیا جائے، کن حالات میں کیا جائے اور کس حد تک کیا جائے، اس پر عمل درآمد کی بنیاد پر ہی یہ سب اختلافات پیدا ہوئے ہیں۔

خبر واحد میں بھی پھر درجات ہیں۔ خبر واحد کی تعداد ذخیرہ احادیث میں بہت زیادہ ہے۔ یعنی احادیث صحیحہ کا تھوڑا حصہ ہے جو متواتر ہے۔ تواتر کی تمام اقسام ملا کر جو احادیث بنیں گی وہ بہت تھوڑی ہیں۔ غالباً ہزار بارہ سو سے زیادہ نہیں ہوں گی۔ یا اس سے کچھ زیادہ ہوں گی۔ باقی

جواحادیث مشہور یا عزیز کہلاتی ہیں اور جو دو یا تین صحابہ سے مروی ہیں، ان کی تعداد پانچ سات یا دس ہزار ہوگی۔ احادیث کا بیشتر حصہ یعنی تقریباً پینسٹھ فیصد احادیث وہ ہیں جو اخبار آحاد ہیں، خبر واحد ہیں۔ لیکن یہ ساری کی ساری کی ایک درجہ کی نہیں ہیں۔ خبر واحد اگر صحیح کے سارے تقاضے پورے کرتی ہو تو وہ صحیح ہوگی۔، جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ حسن میں بھی خبر واحد ہو سکتی ہے۔ ضعیف میں بھی خبر واحد ہو سکتی ہے۔ جو حدیث ضعیف بھی ہو اور خبر واحد بھی ہو اس کا درجہ سب سے نیچے ہوگا۔

لیکن صحیح میں خبر واحد کے گیارہ درجات یا گیارہ levels ہیں جن میں خبر واحد اور حدیث صحیح کو تقسیم کیا جاتا ہے۔ بعض محدثین نے یہ درجات کم بیان کئے ہیں۔ بعض نے گیارہ بیان کئے ہیں۔ بعض نے دس بیان کئے ہیں۔ بعض نے سات بیان کئے ہیں۔ لیکن ان سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کس قسم کے درجات ہیں۔

۱۔ خبر واحد کا سب سے اونچا درجہ وہ ہے جس پر صحاح ستہ کے تمام مرتبین کا اتفاق ہو۔ جو حدیث صحاح ستہ کی ساری کتابوں میں آئی ہو اس کا درجہ سب سے اونچا ہے۔ ایسی احادیث چند ہیں۔ چند سے زیادہ نہیں ہیں۔ اس لئے اکثر محدثین نے اس درجہ کا ذکر نہیں کیا۔

۲۔ اس کے بعد وہ احادیث ہیں جن پر امام بخاری، امام مسلم، ترمذی اور ابوداؤد کا اتفاق ہے۔ جب کہا جاتا ہے رواہ الاربعہ تو اس سے یہ چار مراد ہوتے ہیں۔ جب کہا جائے رواہ الستۃ، تو اس سے مراد ہوتا ہے کہ یہ حدیث صحاح ستہ کی سب کتابوں میں ہے۔ جب کہا جاتا ہے رواہ الخمسہ تو اس سے مراد ہے ابن ماجہ کے علاوہ بقیہ صحاح ستہ، جب کہا جائے کہ رواہ الاربعہ، تو اس سے مراد ہے ابن ماجہ اور نسائی کے علاوہ بقیہ چار کتابیں۔ تو سب سے پہلا درجہ صحاح ستہ والوں کا ہے۔ پھر دوسرا درجہ اربعہ والوں کا۔

۳۔ تیسرا درجہ ان کا جو متفق علیہ کہلاتی ہیں یعنی وہ احادیث جن کو شیخین یعنی امام بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کیا ہو۔

۴۔ پھر وہ جن کو صرف امام بخاری نے روایت کیا ہو۔

۵۔ پھر وہ جن کو صرف امام مسلم نے روایت کیا ہو۔

۶۔ پھر وہ جو ان دونوں کی شرائط پر پوری اترتی ہوں لیکن بخاری و مسلم میں موجود نہ

ہوں۔

۷۔ پھر وہ جو امام بخاری کی شرائط پر پوری ہیں لیکن بخاری میں نہیں ہیں۔

۸۔ پھر وہ جو مسلم کی شرائط پر پوری ہیں لیکن مسلم میں نہیں ہیں۔

۹۔ پھر وہ جن کو بقیہ چار اصحاب سنن نے روایت کیا ہو یعنی ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور نسائی نے۔

۱۰۔ پھر وہ جن کو صرف نسائی نے روایت کیا ہو۔

۱۱۔ پھر وہ جن کو بقیہ ائمہ نے روایت کیا ہو۔

یہ احادیث صحیح میں خبر واحد کے گیارہ درجات ہیں۔ جو متواتر احادیث ہیں وہ ان درجات سے ماوراء ہیں۔ ان کا درجہ سب سے اونچا ہے۔

جس کو حدیث حسن کہتے ہیں وہ صحیح کی وہ شکل ہے جس میں صحیح کی شرائط میں سے کوئی ایک آدھ شرط کم ہو۔ اس لئے اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ حدیث ضعیف کی بے شمار قسمیں ہیں۔ جیسا کہ ابھی میں نے عرض کیا کہ امام ابن الصلاح نے بیالیس قسمیں بیان کی ہیں۔ بعض حضرات نے اس سے بھی زیادہ قسمیں بیان کی ہیں۔ اور ان قسموں میں سے ہر ایک کا الگ الگ حکم ہے۔

چند قسمیں مثال کے طور پر میں بیان کرتا ہوں۔ آٹھ قسمیں بیان کر دیتا ہوں۔

حدیث ضعیف کی اقسام

مرسل حدیث

حدیث ضعیف میں سب سے اونچی قسم حدیث مرسل ہے۔ مرسل کے معنی چھوڑی ہوئی یا Open۔ لیکن اصطلاح حدیث میں مرسل سے مراد وہ حدیث ہے جس میں کسی تابعی نے براہ راست رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک یا آپ کا عمل مبارک نقل کیا ہو اور درمیان میں صحابیؓ کا ذکر نہ کیا ہو۔ مرسل احادیث اکثر و بیشتر محدثین کی نظر میں قابل قبول نہیں ہیں۔ محدثین کی بڑی تعداد مرسل احادیث کو قابل قبول نہیں سمجھتی۔ البتہ فقہا کی کچھ تعداد مرسل احادیث کو قابل قبول سمجھتی ہے۔ بشرطیکہ وہ کسی ایسے تابعی سے منقول ہوں جو فقہ اور شریعت میں گہرائی کی وجہ سے مشہور ہوں۔

اور شریعت کے عمومی احکام کے مطابق ہوں۔ قرآن مجید اور حدیث میں شریعت کے جو عمومی احکام آئے ہیں ان کے مطابق ہوں اور کسی تابعی فقیہ سے مروی ہوں۔ غیر فقیہ یا کم مشہور تابعی سے اگر مروی ہوں تو وہ قابل قبول نہیں ہیں۔ اس کے پھر بہت سے اثرات ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک حدیث مرسل ہے، ایک فقیہ نے قبول کی دوسرے نے قبول نہیں کی۔ امام شافعی کا مسلک اس بات میں ان دونوں آراء سے مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں سعید بن المسیّب کے علاوہ باقی کسی کے مراسیل قبول نہیں کرتا۔ ان کے نزدیک مرسل حدیث قابل قبول نہیں ہے، سوائے سعید بن المسیب کے مراسیل کے، جو سیّد التابعین مشہور ہیں اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شاگرد خاص بھی تھے، ان کے داماد بھی تھے اور پچیس تیس سال کے طویل عرصہ تک ان کے ساتھ رہے۔ ان کی مراسیل امام شافعی کے نزدیک قابل قبول ہیں۔ باقی کسی کے مراسیل امام شافعی کے نزدیک قابل قبول نہیں ہیں۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک ہر تابعی کی مرسل مذکورہ بالا دو شرائط کے ساتھ قابل قبول ہے۔

محدثین میں سے بیشتر کے نزدیک کوئی مرسل حدیث قابل قبول نہیں ہے۔ بعض محدثین کے نزدیک کسی حدیث کی کمزوری کو دور کرنے یا compensate کرنے کے لئے مرسل قابل قبول ہے۔ ایک حدیث مثلاً حسن لغیرہ ہے، کسی مرسل سے وہ کمی دور ہو جاتی ہے، تو وہ صحیح لغیرہ ہو جائے گی۔ کوئی حدیث حسن لغیرہ تھی، کسی مرسل سے اس کا ضعف دور ہو گیا تو حسن لعینہ ہو گئی۔ ضعیف تھی، مرسل سے Reinforce ہو گئی تو حسن لغیرہ ہو جائے گی۔ گویا حدیث مرسل ان کاموں کے لئے تو قابل قبول ہے بقیہ چیزوں کے لئے قابل قبول نہیں ہے۔

منقطع حدیث

دوسرا درجہ منقطع کا ہے۔ منقطع سے مراد وہ حدیث ہے جس میں یا تو کوئی راوی درمیان سے نکل گیا ہو یا کسی مبہم شخص کا ذکر کیا گیا ہو۔ مثال کے طور پر ذکر کیا گیا ہو کہ حدثنی فلان عن فلان عن رجل یا عن شیخ، یا عن شیخ من قبیلة قریش، قریش کے ایک بڑے میاں نے مجھ سے بیان کیا۔ اب معلوم نہیں کہ قریش کے قبیلہ کے وہ بڑے میاں کون تھے۔ اس لئے ایسی حدیث منقطع کہلاتی ہے۔ اس کا درجہ مرسل کے بعد آتا ہے۔ مرسل کا درجہ اس لئے اونچا ہے کہ تابعین تک اس کی سند پکی ہے، صرف صحابیؓ کا نام نہیں ہے۔ اب اگر وہ تابعی اونچے درجہ کے ہیں تو

اس کا درجہ اس کے حساب سے ہوگا۔لیکن منقطع میں جو نام گرا ہوا ہے یا مبہم ہے تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ کون آدمی ہے۔

معضل حدیث

اس کے بعد معضل حدیث کا درجہ آتا ہے۔معضل وہ حدیث ہے جس میں دو راوی گر گئے ہوں۔ دو راوی گرے ہوں ، دونوں مستند ہیں یا غیر مستند ہیں، یہ سارے امکانات موجود ہیں۔ان کا ضبط کس درجہ کا تھا، حفظ کس درجہ کا تھا، تحمل کے وقت وہ مسلمان ہوئے تھے کہ نہیں ہوئے تھے، یہ سارے مسائل جو حدیث صحیح میں تھے وہ پیدا ہوں گے۔

مدلّس حدیث

اس کے بعد ایک قسم مدلس کی ہے۔ مدلس اس حدیث کو کہتے ہیں کہ جس میں روایت بیان کرنے والے نے جان بوجھ کر **misrepresentation** کی ہو۔ روایت حدیث میں تدلیس کا رواج دوسری صدی میں شروع ہوا۔ دراصل جب کسی چیز سے لوگوں کو عزت ملنا شروع ہو جاتی ہے تو اس کے حصول کے لئے ایک مقابلہ اور مسابقت شروع ہو جاتی ہے اور مسابقت میں ہر ایک کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنے کو نمایاں کرے۔اب فرض کریں درس قرآن کی میں مثال دیتا ہوں کہ آپ ڈاکٹر فرحت ادریس سے پڑھتی ہیں، ان کا بڑا اونچا درجہ اللہ نے رکھا، بڑی شہرت عطا فرمائی، درس کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ اب فرض کریں کہ کسی اور نے بھی اس شہر میں درس کا حلقہ شروع کیا۔ اتفاق سے ان خاتون کو کسی وجہ سے وہ شہرت نہیں ملی، کیونکہ شہرت اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔اب اگر ان کے تلامذہ کہیں اور جا کر پڑھائیں اور ایک خاتون آپ کے ہاں سے جا کے پڑھانا شروع کر دیں اور دونوں جا کر فرض کریں لندن میں درس کا حلقہ قائم کریں۔ آپ کے ہاں سے جانے والی خاتون ہر جگہ جا کر فخریہ بیان کریں گی کہ انہوں نے ڈاکٹر فرحت کے ہاں سے پڑھا ہے۔اس کے برعکس وہ دوسری خاتون جب اپنے استاد کا نام لیتی ہیں تو ان کو کوئی نہیں جانتا۔ان کی طرف لوگ کم جاتے ہیں آپ کی طرف زیادہ آتے ہیں۔اب اگر وہ خاتون یہ کہیں کہ میں نے اسلام آباد کی ایک بڑی مستند خاتون سے علم قرآن حاصل کیا ہے تو سننے والا سمجھے گا کہ شاید ڈاکٹر فرحت سے علم حاصل کیا ہے۔اس طرح کی غلط بیانی جھوٹ تو نہیں ہے لیکن ایک طرح

misrepresentation کی misrepresentation ضرور ہے، یا اس سے کم از کم کا امکان ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ تو مدلس اس حدیث کو کہتے ہیں کہ جس میں راوی جان بوجھ کر ایسے الفاظ استعمال کرے کہ جس سے سننے والے کو یہ تاثر ملے کہ اس نے کسی مستند آدمی سے یا فلاں خاص آدمی سے روایت حاصل کی ہے۔ یا انہوں نے براہ راست حاصل نہ کی ہو، سنی سنائی ان کو مل گئی۔ اب وہ روایت کرے کہ فلاں صاحب بیان کرتے ہیں، بھئی بیان ضرور کرتے ہیں، لوگوں سے بیان کیا ہوگا، لیکن آپ سے بھی بیان کیا ہے کہ نہیں اور آپ کو بیان کرنے کی اجازت دی ہے کہ نہیں، اس کو وہ درمیان میں حذف کر دیا کرتے تھے۔ یہ نہیں کہتے تھے کہ اخبرنی یا حدثنی یعنی میں نے یہ سنا، یا مجھ سے انہوں نے یہ بیان کیا، وہ آکے بیٹھے اور کہا کہ فلاں صاحب یہ حدیث بیان کرتے ہیں، یا فلاں صاحب سے روایت ہے، کس کی روایت ہے اس کو انہوں نے تھوڑا سا چھپایا۔ اس طرح کی احادیث کو مدلس کہتے ہیں۔ اور کچھ لوگوں نے یہ کام کیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ لیکن محدثین نے ان کو پکڑ لیا کہ یہ حدیث مدلس ہے۔ مدلس بھی حدیث ضعیف کی ایک قسم ہے۔

معلل حدیث

علت کا میں ذکر کر چکا ہوں کہ جس میں کوئی علت پائی جاتی ہو وہ حدیث معلل کہلاتی ہے۔ معلل حدیث کا پتہ چلانا خاصا مشکل ہوتا ہے۔ اور بڑی مشکل سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ کونسی حدیث معلل ہے کونسی نہیں۔ محدثین نے اس پر کتابیں لکھی ہیں۔ علل الحدیث کے نام سے ایک الگ فن ہے۔ اور علم حدیث کے فنون میں سب سے مشکل فن ہے۔

شاذ حدیث

اس کے بعد شاذ حدیث کا درجہ ہے۔ یہ وہ حدیث ہے جس میں بقیہ سب چیزیں تو بالکل ٹھیک ہیں لیکن بات جو بیان کی گئی ہے وہ ایسی ہے کہ قرآن پاک کے عام احکام کے خلاف ہے۔ ایک نئی چیز ہے جو حدیث کے احکام سے متعارض ہے۔ وہ شاذ کہلاتی ہے۔ اس کی تعریف یہ ہے کہ 'ماروا ہ الثقة مخالفاً للثقات'۔ یعنی ایک ثقہ راوی بقیہ ثقہ راویوں کے مخالف کوئی چیز بیان کرے۔

منکر حدیث

اس کے بعد منکر حدیث کا درجہ ہے۔ کہ ایک ضعیف روای دوسرے ثقہ راویوں کے خلاف کوئی چیز بیان کرے۔ شاذ اور منکر ایک ہی چیز ہے۔ شاذ وہ ہے کہ جو ثقہ راوی سے آئے، منکر وہ ہے جو غیر ثقہ راوی سے آئے۔

متروک حدیث

اور آخری درجہ متروک حدیث کا ہے یعنی وہ حدیث جس کو ترک کر دیا گیا ہو، جس کے بارے میں آپ یقین سے اور قطعیت کے ساتھ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ یہ موضوع ہے اور حضورؐ سے جھوٹ منسوب ہے۔ لیکن آپ کو یہ یقین ہے کہ یہ بات عمل کرنے کے قابل نہیں ہے۔ یا تو وہ راوی ایسا ہے کہ فسق و فجور میں مبتلا ہے، یا ایسا راوی ہے کہ اس کے بارے میں عام شہرت ہے کہ اس کی یادداشت درست نہیں ہے۔ ایک مخبوط الحواس قسم کا آدمی ہے، راوی بلاشبہ نیک آدمی ہوں گے، بزرگ بھی ہوں گے، لیکن ذہنی طور پر اس درجہ کے نہیں ہیں کہ ان کی بات بھروسہ کے قابل ہو۔ ایسی روایت متروک کہلاتی ہے۔ یہ نا قابل قبول احادیث کی مختلف قسمیں تھیں۔

موضوع احادیث

آخری درجہ جس کو صرف مجازاً حدیث کہتے ہیں وہ حدیث موضوع ہے۔ موضوع سے مراد وہ بات یا وہ قول جو غلط طور پر رسول اللہ ﷺ سے منسوب ہو گیا ہو لیکن حضورؐ کا ارشاد یا حضورؐ کا عمل نہ ہو۔ آپ کے ذہن میں سوال پیدا ہوگا کہ اس کا پتہ کیسے چلے گا۔ محدثین نے اسی لئے یہ ساری کاوشیں کیں اور ان چیزوں کا پتہ چلایا کہ رسول اللہ ﷺ سے غلط طور پر جو چیزیں منسوب ہیں وہ کیا ہیں۔ اور ایک جملہ میں آپ سے عرض کرتا ہوں اس کو ہمیشہ یاد رکھئے گا کہ دنیا میں آج جتنی بھی مذہبی کتابیں موجود ہیں، بشمول بائبل نیا عہدنامہ، پرانا عہدنامہ اور دیگر ساری مذہبی کتابیں، وہ تاریخی اور علمی حیثیت سے ہماری موضوع احادیث سے بھی کم درجہ کی ہیں۔ موضوع احادیث بھی تاریخی طور پر ثابت شدہ ہیں۔ کم از کم یہ تو پتہ ہے کہ یہ احادیث کس نے وضع کیں، کس زبان میں وضع کیں، جس نے وضع کیں وہ کس زمانے کا تھا، کس علاقہ میں وضع کیں، اس کے

الفاظ کیا تھے، وہ الفاظ بعینہ ہم تک پہنچے ہیں۔ بائبل کے بارے میں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ کس زمانے میں لکھی گئی، حتمی طور پر یہ بھی ابھی تک طے نہیں کہ موجودہ انجیل اول اول کس زبان میں لکھی گئی، کس نے لکھی، کہاں لکھی۔ خلاصہ یہ کہ علمی اور تاریخی طور پر ہماری موضوع احادیث بھی ان کتابوں کی نسبت کہیں زیادہ مستند اور تاریخی طور پر ثابت شدہ ہیں جن کو آج لوگ مذہبی کتابیں مانتے ہیں۔ اس سے آپ ہمارے اور ان کے معیار کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

موضوع ہونے کا پتہ اس طرح بھی چلتا تھا کہ بعض اوقات لوگ خود اعتراف کر لیتے تھے۔ ایک شخص تھا، غالباً اس کا نام عبدالکریم بن ابی العوجا تھا۔ یہ شخص خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں گرفتار ہوا۔ اس کے بارے میں شکایت تھی کہ یہ شخص جھوٹی حدیثیں گھڑ گھڑ کر لوگوں سے بیان کرتا ہے۔ تحقیق سے ثابت ہوا کہ واقعی ایسا ہی کرتا ہے۔ عدالت میں اس کے لئے سزائے موت کا حکم ہوا۔ اس زمانے میں طریقہ یہ تھا کہ سزائے موت خلیفہ کے ہاں سے کنفرم ہوا کرتی تھی ،آج بھی سزائے موت کو سربراہ مملکت کنفرم کرتا ہے۔ خلیفہ ہارون رشید نے اس کو بلایا اور خود بھی مزید تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ واقعی اس نے چار ہزار حدیثیں گھڑی ہیں۔ اس نے اعتراف بھی کرلیا۔ جب سزائے موت کے لئے لے جانے لگے تو اس نے خلیفہ سے کہا کہ آپ مجھے مروا تو رہے ہیں لیکن ان چار ہزار حدیثوں کا کیا کریں گے جو میں نے گھڑ کر پھیلا دی ہیں۔ ان جعلی حدیثوں میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دے دیا گیا ہے۔ ہارون نے کہا کہ تم ان چار ہزار کی فکر نہ کرو، اگر چالیس ہزار بھی پھیلا دیتے تو ہمارے ہاں شعبہ بن الحجاج جیسے لوگ موجود ہیں، الذی ینخله نخلاً ، جو چھلنی میں سے چھان کر نکال دیتے ہیں کہ کیا چیز صحیح ہے کیا غلط ہے۔ گویا ایسے ماہر فن محدثین موجود تھے جن کا ہارون الرشید نے ذکر کیا مثلاً شعبہ بن الحجاج جیسے لوگ موجود ہیں جو چھان کر نکال دیں گے اور کھوٹے اور کھرے کو الگ الگ کر دیں گے، تم اس کی فکر نہ کرو۔ چنانچہ انہوں نے کھوٹے اور کھرے کو الگ الگ کر دیا، اور آج سب کے سامنے ہے کہ کیا چیز حضورؐ کا ارشاد ہے اور کیا آپ کا ارشاد نہیں ہے۔

یہ تو مثال اس کی ہے کہ جہاں وضع کرنے والے اور گھڑنے والے نے خود اعتراف کیا ہو کہ میں نے گھڑا ہے۔ لیکن اکثر وہ اعتراف نہیں کرتا تھا، یا پتہ نہیں چلتا تھا کہ کس نے سب سے پہلے گھڑی، یا گھڑنے کے بعد پھیلا دی اور مر گیا یا کسی فرضی نام سے پھیلا دی۔ اس کی کچھ

نشانیاں اور کچھ پہچان علماء حدیث نے مقرر کی ہیں جو اکثر و بیشتر موضوعات کی کتابوں میں بھی موجود ہیں۔ موضوعات پر جن لوگوں نے کتابیں تیار کی ہیں اور موضوع احادیث کو الگ جمع کیا ہے ان کے شروع میں وہ اصول بیان کئے ہیں جن کے نتیجہ میں کسی حدیث کے موضوع ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

اس میں سب سے بڑی پہچان تو الفاظ کا جھول ہے یا غیر معیاری عبارت یا غیر معیاری الفاظ ہوں، رکاکة العبارة یا رکاکة اللفظ ۔ رسول اللہ ﷺ فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ ترین معیار پر فائز تھے۔ حضورؐ افصح العرب ہیں اور دنیا نے تسلیم کیا ہے کہ حضورؐ افصح العرب ہیں۔ اس لئے کوئی ایسا جملہ جو گھٹیا قسم کا ہو، یا گھٹیا عبارت پر مبنی ہو یا عبارت جھول رکھتی ہو، اور فصاحت و بلاغت کے معیار سے گری ہوئی ہو وہ قطعاً رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نہیں ہو سکتی۔ جن حضرات نے پوری زندگی علم حدیث میں گزاری اور سالہا سال انہوں نے شب و روز حدیث کا مطالعہ رکھا ان کو ایک بصیرت اور ایک ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ یہ حدیث حضورؐ کا ارشاد نہیں ہو سکتی۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کوئی شخص اپنی ذاتی **Subjective Opinion** سے رائے دے دیتا تھا، ایسا نہیں تھا۔ بلکہ ماہرین حدیث کو محسوس ہو جاتا تھا کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہے، پھر تحقیق سے بھی ثابت ہو جاتا تھا کہ یہاں واقعی گڑبڑ تھی۔

ایک محدث نے صحیح حدیث کے بارے میں لکھا ہے کہ لہ ضوء کضوء النھار، حدیث صحیح میں سے ایسی روشنی نکلتی معلوم ہوتی ہے جیسے سورج سے روشنی نکلتی ہے۔ اور حدیث موضوع کے بارے میں لکھا ہے لہ ظلمة کظلمة اللیل، حدیث موضوع میں ایسی تاریکی ہوتی ہے جیسے رات کی تاریکی ہوتی ہے۔ جب تحقیق کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ واقعی اس میں یہ جھول ہے۔

بعض چیزیں ایسی حضورؐ سے منسوب کر دی گئیں جو عام عقل اور مشاہدہ کے خلاف ہیں۔ اور بعض بڑی مضحکہ خیز قسم کی چیزیں مشہور کر دی گئی ہیں مثلاً ایک کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ کہ مرغا جب بولتا ہے تو فرشتہ کو دیکھ کر بولتا ہے۔ بھئی مرغے کا فرشتہ سے کیا تعلق ہے۔ بالبداہت غلط بات ہے۔ اس طرح کی اور بہت سی چیزیں جو بہت فضول قسم کی ہیں لیکن مشہور کر دی گئی ہیں۔

بعض چیزیں جو غیر اخلاقی اور بے حیائی کی چیزوں پر مشتمل ہوں وہ بھی موضوع ہیں۔ رسول اللہؐ کی زبان مبارک سے نعوذ باللہ کوئی ایسا لفظ نہیں نکل سکتا جو بے حیائی اور غیر اخلاقیات

پر مبنی ہوں۔ ایسی بہت سی بے ہودہ اور بے حیا قسم کی چیزیں حضورؐ سے منسوب کردی گئی ہیں۔ کس لئے یہ بے ہودہ چیزیں حضورؐ سے منسوب کردیں؟ بعض لوگ خود بدکردار تھے، بعض نے محض کھیل میں کردیں، شرارتاً کردیں، کچھ نے ویسے ہی کردیں، مختلف اسباب ہوسکتے ہیں جن کا ابھی ذکر آئے گا۔

ایک اور چیز ہے، اور محدثین کے ہاں یہ اصول ہے کہ کسی چھوٹے عمل پر اتنے بڑے ثواب کا وعدہ ہو کہ جو غیر معمولی طور پر بڑا معلوم ہو تو اسے قبول نہیں کیا جائے گا، اگر آپ موضوعات پر نظر ڈالیں تو آپ کو اس کی مثالیں مل جائیں گی۔ مثلاً ایک جگہ ملتا ہے کہ اگر کوئی شخص صبح اٹھنے کے بعد ایک مرتبہ کلمہ کہے تو اس کے ہر حرف سے ستر ہزار فرشتے پیدا ہوں گے۔ وہ ستر ہزار فرشتے اس کے لئے روزانہ دعا کریں گے اور ہر دعا سے ستر ہزار فرشتے نکلیں گے وہ دعا کریں گے اور قیامت تک اس کے لئے دعا کریں گے، یہ فضول سی بات ہے۔ مطلب یہ کہ آدمی کلمہ شہادت پڑھے، لا الہ الا اللہ پڑھے تو اس کا اجر و ثواب اپنی جگہ۔ لیکن یہ بات کہ اس سے اتنے فرشتے پیدا ہوں گے وغیرہ وغیرہ، اس طرح کا کلام رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نہیں نکلتا تھا۔ صحیح بخاری پوری پڑھ لیں آپ کو اس طرح کی کوئی فضول چیز نظر نہیں آئے گی، صحیح مسلم میں نظر نہیں آئے گی، موطاء امام مالکؒ میں نہیں ملے گی۔ اس طرح کی فضول باتیں اور قصے کہانیوں میں، واعظوں کے بیانوں میں اور گاؤں اور دیہاتوں میں بڑی جلدی مقبول ہو جاتی ہیں۔ کم علم لوگ اس طرح کی چیزیں بیان کرتے ہیں، اس لئے وہاں اس طرح کی چیز ملے گی، حدیث کی صحیح کتابوں میں نہیں ملے گی۔ ایسی ہی کمزور باتوں میں جنت کی کیفیات اور جہنم کی کیفیات اور ان کی اتنی تفصیلات کہ جیسے کسی نے فلم بنائی ہو اس طرح کی تفصیلات حدیث میں نہیں آئیں۔ یہ بھی موضوع حدیث کی ایک علامت ہے۔

موضوع احادیث کی تخلیق کے اسباب

موضوع حدیث کیوں ہمارے سامنے آئی اور کیسے وضع ہوئی؟ اس کے مختلف اسباب ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ جنہوں نے موضوع حدیث بیان کی وہ سارے کے سارے بددیانت لوگ تھے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ ایک صحابیؓ کا قول ہے، صحابیؓ نے بیان کیا اور سننے والے

نے یہ سمجھا کہ شاید رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہوگا۔ انہوں نے غلط فہمی میں اس کو رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے طور پر بیان کر دیا۔ حالانکہ وہ ارشاد کسی صحابیؓ کا تھا۔ اس لئے محدث تو اپنی اصطلاح میں اس کو موضوع حدیث قرار دے گا۔ اس لئے کہ وہ حضورؐ کا ارشاد نہیں ہے لیکن اصل میں وہ کسی صحابیؓ کا ارشاد ہوگا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ کسی بہت نیک اور اللہ والے انسان نے جو بڑے جذبہ والے اور مخلص آدمی تھے لیکن عقل میں ذرا کم تھے، انہوں نے کسی کو کوئی اچھی بات بیان کرتے ہوئے سنا اور سمجھے کہ یہ اتنی اچھی بات شاید حضورؐ نے فرمائی ہو اور اس کو حدیث کے طور پر بیان کرنا شروع کر دیا۔ بعض اوقات یہ بھی ہوا کہ کچھ لوگوں نے کسی سیاسی مصلحت سے اپنے اپنے سیاسی موقف کے حق میں احادیث بیان کرنی شروع کر دیں۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد اور پہلی صدی ہجری میں بہت سے ایسے واقعات پیش آئے۔ کچھ لوگوں نے بدنیتی کی بنیاد پر حضورؐ سے ارشادات منسوب کر دئے تا کہ اس کے ذریعے اپنے سیاسی موقف کے لئے حمایت حاصل کر سکیں۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ حدیث حضورؐ کا ارشاد ہو سکتی ہے کہ نہیں۔

اسی طرح سے بعد میں جب فقہ یا کلام یا عقائد میں اختلافات ہوئے تو بعض حضرات نے اپنی اپنی پسندیدہ شخصیات کے بارے میں احادیث گھڑ کر حضورؐ کی ذات سے منسوب کر دیں۔ مثلاً ایک شخص نے امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں حدیث گھڑ دی کہ 'میرے بعد ایک شخص ہوگا جس کا نام ابوحنیفہ ہوگا هو سراج امتی، سراج امتی سراج امتی، یعنی وہ میری امت کا چراغ ہوگا، میری امت کا چراغ ہوگا، میری امت کا چراغ ہوگا۔ حضورؐ کا ایسا کوئی ارشاد نہیں ہے یہ بالکل جھوٹ اور فضول بات ہے۔

اسی طرح شاید کسی حنفی نے جو بڑا متشدد تھا اس نے امام شافعی کے خلاف حدیث گھڑ دی کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میری امت میں ایک شخص آئے گا کہ یقال له محمد بن ادریس هو اشد علی امتی من ابلیس، کہ نعوذ باللہ وہ میری امت کے لئے ابلیس سے زیادہ نقصان دہ ہوگا۔ امام شافعیؒ جیسے انتہائی متقی، مخلص بزرگ اور مجتہد کے بارے میں یہ فضول بات پھیلا دی۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے۔

موضوع حدیث کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعد آنے والے کسی انسان کا نام لے کر کوئی پیشین گوئی نہیں کی۔ جس حدیث میں نام کے ساتھ کوئی پیشین گوئی

بیان ہوئی ہے وہ ساری کی ساری احادیث موضوع ہیں۔اس طرح رسول اللہ ﷺ نے کسی خاص قوم یا پیشہ کے لوگوں کی برائی بیان نہیں کی۔ کہ مثلاً بصرہ کے لوگ برے ہیں، اور کوفہ کے اچھے ہیں، یا خراسان کے برے ہیں اور مصر کے اچھے ہیں۔ جہاں کسی علاقہ کی برائی حضورؐ سے منسوب ہوئی ہے وہ حضورؐ کی زبان مبارک کے الفاظ نہیں ہیں۔رسول اللہ ﷺ کا یہ طریقہ نہیں تھا۔قرآن پاک میں ہے 'لایسخر قوم من قوم'،کوئی قوم کسی دوسری قوم کے ساتھ استہزا نہ کرے۔حضورؐ ایسا کیسے کر سکتے تھے۔کسی قبیلہ کا نام لے کر برائی کہ فلاں قبیلہ کے لوگوں میں یہ برائی ہے یا فلاں علاقہ کے لوگوں میں یہ برائی ہے،حضورؐ نہیں فرماتے تھے۔اس طرح کی جتنی احادیث ہیں وہ سب کی سب موضوع ہیں۔یہ کچھ علامات اور پہچانیں ہیں جو علم حدیث کے ماہرین نے مقرر کی ہیں اور جن سے موضوع احادیث کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

محدث جب حدیث بیان کیا کرتے تھے تو اس کے بہت سے انداز ہوتے تھے۔ان سب کے درجات الگ الگ ہیں۔سماع یعنی استاد کی زبان سے براہ راست سننا اور اس کی تصریح کرنا تحمل کا سب سے اونچا درجہ ہے۔محدث سے براہ راست سننا۔ پھر سننے کے بعد جب شاگرد آگے بیان کرتا ہے تو بیان کرنے کے جو الفاظ ہیں اس کے مختلف درجات ہیں۔سب سے اونچا درجہ ہے سمعته يقول، کہ میں نے ان کو سنا وہ یہ بیان فرما رہے تھے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے براہ راست سنا اور وہ اپنی زبان سے بیان فرما رہے تھے۔اس کی ایک مثال صحیح بخاری کی پہلی روایت ہے۔کتاب شروع ہوتی ہے 'کتاب بدألوحي' اور پہلا باب ہے 'کیف کان بدألوحي علی رسول الله ﷺ'، پھر آگے بیان کرتے ہیں 'حدثنا الحمیدی قال حدثنا سفيان عن يحي بن سعيد انصاری قال اخبرنی محمد بن ابراهم الطيبی انه سمع علقمة بن الوقاص الليثي يقول ، کہ انہوں نے علقمہ بن وقاص اللیثی کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا، سمعت عمر بن الخطاب علی المنبر يقول، کہ میں نے حضرت عمر فاروق کو یہ ارشاد فرماتے سنا، قال سمعت رسول الله ﷺ يقول ، وہ یہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ 'انما الاعمال بالنیات'۔یہ سب سے اونچا درجہ ہے جس میں محدث یہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے شیخ اور استاذ کو سنا اور وہ یہ بیان فرما رہے تھے۔

دوسرا درجہ ہے حدثنی، کہ انہوں نے مجھ سے بیان کیا۔اس کے بعد ہے حدثنا کہ

انہوں نے ہم سے بیان کیا۔ حدثنا سے پتہ چلتا ہے کہ سننے والے بہت سارے لوگ تھے۔ ایک سننے والا ہوتو توجہ کا مرکز وہ ہوتا ہے۔ سننے والے بہت سارے ہوں تو کوئی ایک آدمی توجہ کا مرکز نہیں ہوتا۔ اس لئے جس جگہ توجہ کا مرکز ایک ہوگا وہ افضل ہوگا بہ نسبت اس کے جہاں توجہ کا مرکز بہت سے لوگ ہوں۔ پھر اخبرنی کا درجہ ہے جس میں شاگرد نے پڑھا اور استاد نے سنا۔ پھر اخبرنا کا درجہ ہے جس میں بہت سے شاگردوں نے پڑھا اور سب نے سنا۔ پھر ہے اخبرنی قرأةً علیہ وانا اسمع کہ ان کے روبرو قرات دوسرے لوگ کر رہے تھے اور میں بھی سن رہا تھا۔ نہ میں پڑھنے والا تھا نہ سنانے والا، لیکن میں سننے والا تھا۔ پھر ہے انبانی، پھر انبأنا عن فلان اور قال فلان۔

عن فلان یعنی فلاں سے روایت ہے۔ اس اسلوب کو عنعنہ کہا جاتا تھا۔ اس میں یہ صراحت نہیں ہوتی تھی کہ شیخ سے روایت کا طریقہ کیا تھا۔ عن فلان فلاں سے روایت میں اس کا امکان ہے، اب ضروری نہیں کہ انہوں نے براہ راست سنا ہو، ممکن ہے کہ براہ راست خود ان کی زبان سے نہ سنا ہو، یا قال فلان، فلاں نے یہ فرمایا۔ اس میں بھی دونوں امکان موجود ہیں۔

امام بخاری کی جن تعلیقات کا میں نے ذکر کیا تھا یہ تعلیقات وہ ہیں کہ جن میں امام بخاری کوئی سند بیان کئے بغیر قال فلان کہہ کر کوئی چیز درج کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال میں آپ کے سامنے عرض کردیتا ہوں۔ یہ مثال آخری باب سے ہے۔ آخری باب میں بخاری کی آخری حدیث ہے، باب کا عنوان ہے باب قول اللہ تعالیٰ و نضع الموازین القسط لیوم القیامة، باب اس بات کے بیان میں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم روز قیامت برابر تولنے والی ترازوئیں رکھیں گے وانّ اعمال بنی آدم وقولهم یوزنون اور اس باب کے بیان میں کہ بنی آدم کے اعمال اور اقوال کو تولا جائے گا۔ یہ امام بخاری نے باب کا عنوان رکھا ہے اور پھر کہتے ہیں کہ وقال مجاهد اور مجاہد کہتے ہیں، (یہ تابعی ہیں اور عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد ہیں۔ امام بخاری کی پیدائش سے ڈیڑھ دو سو سال پہلے انتقال کر چکے تھے۔ یہاں امام بخاری کوئی سند نہیں لا رہے ہیں۔) وقال مجاهد القسطاس العدل بالرومية، یہ جو قسط کا ذکر آیا ہے تو مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ القسطاص العدل بالرومية، رومی زبان میں قسطاس انصاف کو کہتے ہیں ویقال القسط مصدر المقسط ، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قسط مقسط کا مصدر ہے وهو العادل۔ یہاں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد مجاہد بن جبر کا قول امام بخاری نے بغیر کسی سند کے نقل کیا ہے۔

اس کو تعلیق کہتے ہیں۔ اس طرح کی تعلیقات صحیح بخاری میں کوئی ساڑھے تین سو کے قریب ہیں اور صحیح مسلم میں چودہ ہیں۔ ظاہر ہے تعلیقات کا وہ درجہ نہیں ہے جو صحیح بخاری کی اصل روایات کا ہے۔ انہوں نے باب کے عنوان کی وضاحت کے طور پر اس کو نقل کیا ہے اصل حدیث کے طور پر نقل نہیں کیا۔ تو یہ تعلیق اور تعلیقات کا مفہوم ہے۔ یاد رہے کہ یہ قسطاس وہی لفظ ہے جس کو انگریزی میں **Justice** کہتے ہیں۔

و آخر دعونا ان الحمدلله رب العلمین

☆☆☆☆☆☆

آج لوگوں میں یہ بات عام ہے کہ حدیث کی بہت سی کتابیں **authentic** نہیں ہیں اصل اور نقل میں فرق کرنا مشکل ہے۔ اس بات میں کس حد تک سچائی ہے خاص طور پر صحاح ستہ کے لئے یہی بات کہی جاتی ہے۔

میرے خیال میں آج کی ساری گفتگو اسی سوال کے جواب میں تھی۔ یہ جو حدیث صحیح کے اتنے مشکل معیارات میں نے بیان کئے۔ صحاح ستہ کی ساری کتابوں میں ساری احادیث انہی معیارات پر ہیں اور وہ بیشتر صحیح ہیں اور اگر صحیح نہیں ہیں تو حسن ہیں اور حسن بھی قابل قبول ہیں جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔

مودبانہ گزارش ہے کہ آپ اس بات کو واضح کریں کہ اخبارون اور ٹیلی ویژن پر موضوع احادیث کو جو نشر کیا جاتا ہے تو کیا علماء کی جماعت بیٹھ کر اس کی تحقیق کرتی ہے یا ایسے ہی بیان کر دی جاتی ہیں۔

ریڈیو اور ٹی وی وغیرہ پر جو احادیث نشر کی جاتی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حدیث تو وہ ہے جو خبرنامہ سے پہلے اسکرین پر لکھی ہوئی آتی ہے یا اور مواقع پر آتی ہے۔ وہ میں نے ہی دو سال پہلے ڈھائی تین سو احادیث کا اردو ترجمہ کر کے حوالوں کے ساتھ لکھ کے انہیں دیا تھا اور انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اُسی مجموعہ میں سے انتخاب کر کے بیان کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ مستند ہیں۔ لیکن اگر کوئی صاحب علم تقریر کرنے ٹی وی پر آئے ہیں اور اپنے طور پر حدیث بیان کرتے ہیں تو وہی اپنی تحقیق کے مطابق بیان کرتے ہیں اور وہی اس کے ذمہ

دار ہیں، اس کا ٹیلی ویژن والے یا کوئی اور ذمہ نہیں لے سکتا۔ اس لئے کہ پہلے سے تو معلوم نہیں ہوتا کہ کوئی شخص کونسی حدیث بیان کرے گا۔ اس لئے اس بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔

حضرت امیر معاویہؓ کے بیٹے حضرت یزید کے بارے میں جو حدیث ہے کہ میری امت کی وہ جماعت جو قسطنطنیہ یعنی موجودہ استنبول کو فتح کرے گی وہ جماعت جنت میں جائے گی اور اس جماعت کے سپہ سالار یزید تھے، تو کیا یہ حدیث صحیح ہے؟ کیونکہ آپؐ نے ایک خاص جماعت کو اس میں تعظیم دی ہے۔

اس موضوع پر مسند امام احمد میں دو حدیثیں آتی ہیں۔ پہلی حدیث میں استنبول کی فتح کا عمومی ذکر ہے۔ اس میں یزید میرے خیال میں شامل نہیں ہیں۔ میں حدیث کے الفاظ بیان کر دیتا ہوں: لتفتتحن مدينة قيصر "کہ تم ضرور بالضرور قیصر کے شہر کو فتح کرو گے، جو قسطنطنیہ کے نام سے مشہور تھا، فلنعم الامير اميرها و نعم الجيش ذالك الجيش۔ وہ امیر کتنا ہی اچھا امیر ہوگا اور وہ لشکر کتنا ہی اچھا لشکر ہوگا۔ قسطنطنیہ کی فتح 1492ء میں ہوئی تھی۔ بہت سے لوگ قسطنطنیہ پر حملہ کرنے جاتے رہے ہیں کہ شاید ان کے ہاتھوں فتح ہو جائے اور وہ اس بشارت کے مصداق بن جائیں۔ یزید نے بھی کوشش کی لیکن یہ فتح یزید کے مقدر میں نہیں تھی، بلکہ محمد الفاتح کے ہاتھوں مقدر تھی جو عثمانی حکومت کا ایک بادشاہ تھا اور اسی لئے اس کو فاتح کہا جاتا ہے کیونکہ اس نے استنبول فتح کیا تھا۔ فتح کے بارے میں ایک روایت تو یہ ہے۔

مسند امام احمد ہی کی ایک دوسری روایت ہے جس میں ہے کہ اوّل جيش يغز و مدينة قيصر مغفور لهم، یا اس طرح کے کچھ الفاظ ہیں، کہ وہ پہلا لشکر جو قیصر کے شہر پر حملہ کرے گا وہ مغفور لہم ہوگا۔ اب اس میں يغزو کا لفظ ہے، کیا اس سے مراد محض حملہ کرنا ہے یا فتح کر لینا مراد ہے۔ بعض روایات میں فتح کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے حملہ کرنا مراد ہے تو پہلا حملہ جس لشکر نے کیا اس کی سربراہی یزید کے ہاتھ میں تھی اور اس میں بڑے بڑے صحابہ کرامؓ بھی شامل تھے۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ اسّی سال کی عمر میں اسی لئے تشریف لے گئے تھے کہ اس بشارت کے مصداق بن سکیں۔ چنانچہ دوران محاصرہ وہیں ان کا انتقال ہوا اور وہیں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ استنبول میں ان کا مزار آج بھی ہے۔ اور آپ میں سے جو وہاں گئے ہیں انہوں نے دیکھا ہوگا، میں نے بھی کئی بار اس کی زیارت کی ہے۔ اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہاں یغزو سے مراد کیا ہے، محض حملہ یا مکمل فتح۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ کس کو اس کا مصداق

قرار دیتا ہے اور کس کو نہیں۔

آپ نے کہا ہے کہ حضورؐ نے اپنے بعد آنے والے کسی شخص کا نام لے کر کوئی بات نہیں فرمائی لیکن قیامت کی نشانیوں میں امام مہدی کا نام ملتا ہے؟

امام مہدی کے بارے میں جو احادیث ہیں ان کے بارے میں بڑی تفصیل سے بحث ہوئی ہے۔ اس میں وہی تواتر والی بات یاد رکھیں۔ یہ احادیث صحابہ کرام کی بڑی تعداد سے مروی ہیں اور صحابہ کے بعد بھی بڑی تعداد میں لوگوں سے مروی ہے۔ اگرچہ انفرادی طور پر یہ ساری احادیث اخبار آحاد ہیں لیکن ان میں کچھ باتیں قدر مشترک ہیں جن کو ہم تواتر قدر مشترک قرار دے سکتے ہیں۔ ان میں قدر مشترک کسی کا نام نہیں ہے۔ قدر مشترک یہ ہے کہ میرے بعد آخری زمانہ سے پہلے ایک ایسا قائد، ایک ایسا متدیّن اور ہدایت یافتہ امام مسلمانوں کو ملے گا جو میرے طریقے کو دوبارہ زندہ کردے گا۔ تواترِ قدرِ مشترک کے اصول پر اتنی بات مشترک ہے۔ باقی کوئی چیز قدر مشترک نہیں ہے۔ ان روایات میں بہت سی ضعیف بھی ہیں، بلکہ کچھ روایات ان میں سے موضوع بھی ہیں۔ اس لئے جہاں نام کے تعین کے ساتھ ذکر آیا ہے وہ بعض محدثین کے نزدیک موضوع ہے اور جو لوگ اس کو موضوع نہیں سمجھتے ان کے نزدیک وہ احادیث سب کی سب ضعیف یا زیادہ سے زیادہ حسن لغیرہ ہیں۔ اس لئے یہ اصول کہ نام کے ساتھ جو روایات آئی ہیں وہ قابل قبول نہیں ہیں، یہ اصول باقی رہتا ہے اور مہدی کی روایت سے ٹوٹتا نہیں ہے۔ مہدی کی احادیث تواتر قدر مشترک سے ثابت ہیں۔ ان میں نام والی احادیث کا وہ درجہ نہیں ہے۔

شب برات کے موقع پر اخبارات میں شب برات کی رات کو عبادت کی فضیلت کے بارے میں احادیث چھپی ہیں۔

نصف شعبان کے بارہ میں ایک حدیث آئی ہے جو کہ میرے خیال میں بہت ضعیف ہے اور ضعیف کے بھی بہت نچلے درجہ پر ہے۔ پندرہویں شعبان کی کوئی فضیلت حدیث کی مستند کتابوں میں نہیں آئی۔ اور قرآن پاک کی جس آیت کا لوگ حوالہ دیتے ہیں اس سے مراد کوئی اور رات نہیں ہے، بلکہ لیلۃ القدر ہے اور لیلۃ القدر ہی کا نام لیلۃ البرأۃ ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ اپنا جسم نماز میں کتے کی طرح نہ بچھاؤ، اس میں جسم خود بخود اوپر ہو جاتا ہے، اس کی وضاحت فرمائیں۔

کتے کی طرح بچھانے سے مراد یہ ہے کہ دونوں بازو زیادہ نہ پھیلائے جائیں بلکہ کہنیاں اوپر رکھی جائیں۔ کتا جب بیٹھتا ہے دونوں بازو پورے رکھ کر بیٹھتا ہے تو اس کی ممانعت ہے لیکن خواتین اگر جسم کو سمیٹ لیں اور کہنیاں زمین پر پھیلا کر نہ رکھیں تو دونوں پر عمل ہو جاتا ہے۔

اجازۃ اور مناولہ میں شیخ حدیث کی اجازت ضروری ہے تو قرآن پاک کی تفسیر یا اس کے علاوہ جو احادیث ہم پڑھ کر سناتے ہیں......

میں نے عرض کیا تھا شاید آپ کو یاد نہیں رہا، کہ اجازۃ اور مناولہ کے یہ طریقے اس وقت تک زیر بحث تھے جب تک کتب حدیث مرتب اور مدون ہو کر شائع نہیں ہوئی تھیں۔ اب ہر چیز مرتب ہو کر شائع ہو چکی ہے اب اس میں کسی کمی بیشی، ملاوٹ یا غلط بیانی کا امکان نہیں ہے، لہٰذا اجازۃ بھی درست ہے اور مناولہ بھی درست ہے۔ اگر آپ کسی شیخ حدیث کے پاس جائیں اور وہ واقعی آپ کا امتحان لے کر محسوس کریں کہ آپ حدیث بیان کر سکتی ہیں تو پوری صحاح ستہ آپ کو دے کر اجازت دے کر آپ سے کہہ سکتے ہیں کہ آپ روایت کریجئے یا کاغذ پر لکھ کر اجازت دے دیں۔ مجھے بھی ایک بزرگ نے یہ جاننے کے بعد لکھ کر اجازت دی تھی کہ میں علم حدیث پڑھ سکتا ہوں۔ میرے پاس وہ تحریری اجازت موجود ہے اس لئے آج کی کیفیت اور ہے۔ یہ گفتگو جو مناولہ کے بارے میں میں نے کی ہے یہ اس زمانے کی بات ہے جب حدیث مرتب کر اس طرح سے یقینی طور پر سامنے نہیں آئی تھی۔

آپ نے فرمایا کہ وحی چوبیس ہزار مرتبہ نازل ہوئی۔

یہ جو چوبیس ہزار مرتبہ کا ذکر ہے یہ کئی کتابوں میں آیا ہے۔ علامہ سیوطی نے الاتقان میں بھی لکھا ہے اور علامہ زرکشی نے البرہان میں بھی لکھا ہے اور جہاں جہاں وحی سے متعلق مباحث مفسرین قرآن نے بیان کئے ہیں وہاں چوبیس ہزار مرتبہ کا ذکر آیا ہے۔ اس لئے چوبیس ہزار مرتبہ کا ذکر اگر درست ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ سنت بھی وحی کے ذریعے نازل ہوئی ہے اور یقیناً وحی کے ذریعے نازل ہوئی ہے، لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ سنت وحی کے کس خاص طریقے سے نازل ہوئی؟ کیا اس طریقہ سے جس سے قرآن پاک نازل ہوا؟ اس بارہ میں ہمارے لئے قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا دشوار ہے۔

میں نے تعریف کا لفظ نہیں کہا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ اگر کسی روایت میں کسی قوم کی برائی ہوئی ہے تو وہ روایت صحیح نہیں، اس لئے کہ کسی فرد یا گروہ کی برائی حضورؐ نے نہیں کی، تعریفیں تو بہت سوں کی کی ہیں۔ انصار کی تعریف کی ہے۔ یمنیوں کی تعریف کی ہے۔ الایمان یمان والحکمة یمانیة ، قریش کی تعریف بھی کی ہے، تعریفیں بہت سوں کی کی ہیں، لیکن اگر برائی کسی قوم کی کی ہو کہ فلاں قبیلہ کے لوگ بڑے برے ہیں، فلاں قوم کے لوگ بڑے چور ہوتے ہیں یا حبشی بڑے لالچی ہوتے ہیں، اس طرح کی بات کبھی حضورؐ نے نہیں کی ہے۔ البتہ تعریفیں بہت سوں کی کی ہیں۔

سوال......................(سوال پڑھا نہیں گیا ہے اس لئے کیسٹ میں موجود نہیں ہے۔)

لیکچر کے شروع میں قطعی الدلالت اور قطعی الثبوت تو کل میں نے بتا دیا تھا۔ کل میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن مجید یا حدیث یا سنت میں جو کچھ لکھا ہوا ہے اس کو اصطلاح میں نَص کہتے ہیں۔ مثلاً یہ ایک حدیث کی عبارت ہے، حضورؐ نے فرمایا کہ 'انما لاعمال بالنیات'۔ یہ ایک نص ہے۔ قرآن کریم کی کوئی آیت بھی نص ہے۔ 'یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الأنثیین' بھی نص ہے۔ جتنی نصوص ہیں وہ قرآن پاک میں آئی ہوں یا احادیث میں آئی ہوں ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم ہے قطعی الثبوت، جس کا ثبوت قطعی اور یقینی طور پر ہمارے پاس موجود ہے کہ یہ نص قطعی ہے۔ پورا قرآن پاک قطعی الثبوت ہے۔ اور احادیث متواترہ اور سنن ثابتہ قطعی الثبوت ہیں۔ تواتر کی پانچوں قسموں کے ساتھ ان کے ثابت ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس کے علاوہ جو احادیث ہیں جو خبر واحد ہیں وہ ظنی الثبوت ہیں۔ یعنی اس بات کا اگر ایک فی ہزار بھی امکان ہے کہ بیان کرنے میں کسی سے کوئی بھول چوک ہوگئی ہو، تو قطعیت ختم ہوگئی اور ظنیت آگئی۔ تو کچھ احادیث ظنی الثبوت ہیں اور کچھ احادیث اور پورا قرآن مجید قطعی الثبوت ہے۔

اس کے بعد یہ جو ساری احادیث اور آیات قرآن ہیں، ان دونوں قسموں کے ساتھ ملا کر ان کے معانی اور مطالب میں کچھ آیات اور احادیث ہیں جن کے معانی اور مطالب قطعی ہیں اور یقینی ہیں۔ قرآن مجید میں ہے کہ اھدنا الصراط المستقیم، ہر ایک کو پتہ ہے کہ صراط مستقیم سے کیا مراد ہے۔ شریعت کا بتایا ہوا راستہ صراط مستقیم ہے۔ اس میں کوئی دو راستے مراد نہیں ہو سکتے

۔اگر کوئی کہے کہ جدّہ سے مکہ کو جو سڑک جاتی ہے وہ صراط مستقیم ہے، تو یہ گمراہی ہوگی، اس لئے کہ سب کو پتہ ہے کہ صراط مستقیم کیا ہے۔اسی طرح احادیث میں، مثلاً ان الشیطان یحضر احدکم، کہ شیطان تم میں سے ہر ایک کے پاس جاتا ہے اور گمراہ کرتا ہے۔شیطان سے کیا مراد ہے ہر ایک کو معلوم ہے۔اگر کوئی کہے کہ نہیں شیطان سے مراد تو فلاں آدمی ہے جو امریکہ یا فلاں ملک میں بیٹھا ہوا ہے، تو یہ غلط ہوگا۔سب کو پتہ ہے کہ شیطان سے کیا مراد ہے۔یہ جو دلالت ہے، یہ قطعی کہلاتی ہے۔اس لئے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ شیطان اور صراط مستقیم سے کیا مراد ہے۔اس میں کوئی دوسری رائے نہیں ہوسکتی۔جو دوسری رائے پیش کرے گا وہ گمراہی پھیلائے گا اور غلط کرے گا۔لیکن کچھ آیات قرآنی اور احادیث ایسی ہیں کہ جن کے ایک سے زائد مفہوم نکل سکتے ہیں۔مثلاً الماء الکثیر لاینجس، زیادہ پانی ناپاک نہیں ہوتا۔اب ایک مطلب یہ ہے کہ اتنا بڑا تالاب ہو جتنا یہ کمرہ ہے، دوسرا مطلب یہ ہے کہ دو بڑے مٹکے مراد ہیں، ایک مطلب یہ کہ اتنا زیادہ پانی ہو جتنا راول ڈیم میں بھرا ہوا ہے۔یہ سارے مفہوم ممکن ہیں، لیکن ان میں سے کوئی ایک مفہوم قطعی نہیں ہے۔آپ کہیں کہ میرا بیان کردہ یہ ایک سو فیصد درست ہے اور باقی سب غلط ہیں تو ایسا نہیں ہے۔یہ بھی صحیح ہوسکتا ہے، وہ بھی صحیح ہوسکتا ہے۔اس طرح کے مفہوم کو ظنی الثبوت کہتے ہیں۔

قرآن پاک میں کئی جگہ ایسے الفاظ آئے ہیں کہ ایک مفسر نے اس کا ایک مطلب لیا ہے، اور دوسرے نے دوسرا مفہوم سمجھا، اس لئے کہ قرآن پاک کے الفاظ میں دونوں کی گنجائش ہے۔یہ ظنی الثبوت ہے۔ اس لئے کسی ایک مفہوم کے بارے میں قطعیت کا وہ معیار اختیار نہیں کیا جاسکتا جو مثلاً صراط مستقیم کے بارے میں ہے، جو مثلاً صلوٰۃ، زکوٰۃ اور حج کے بارے میں ہے۔ تو یہ چیزیں ظنی الثبوت کہلاتی ہیں۔تو نصوص کی چار قسمیں ہیں۔سب سے اونچا درجہ ان نصوص کا ہے جو قطعی الدلالت اور قطعی الثبوت دونوں ہیں۔دوسرا درجہ وہ ہے جو قطعی الثبوت اور ظنی الدلالت ہیں۔تیسرا درجہ ان کا ہے جو ظنی الثبوت اور قطعی الدلالت ہے اور آخری درجہ اس نص کا ہے جو ظنی الدلالت ہیں اور ظنی الثبوت ہے۔

وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العلمین

☆☆☆☆☆☆☆

پانچواں خطبہ

علم اِسناد و رِجال

جمعۃ المبارک، 10 اکتوبر 2003

علم اِسناد و رِجال

آج کی گفتگو کا عنوان ہے علم اِسناد اور علم رِجال۔ ان دونوں کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ اسناد سے مراد ہے کسی حدیث کی سند بیان کرنا۔ جبکہ سند سے مراد ہے راویوں کا وہ سلسلہ جو حدیث کے ابتدائی راوی یا جامع لے کر رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی تک پہنچتا ہے۔ راوی کون لوگ ہوں، ان کا علمی درجہ کیا ہو، ان کی ذہنی اور فکری صلاحیت کیا ہو، اس کی جو شرائط ہیں ان پر کل کسی قدر تفصیل سے اظہار خیال ہوا ہے۔ لیکن ابھی یہ گفتگو باقی ہے کہ راویوں کے حالات جمع کرنے کا کام کب سے شروع ہوا، کس طرح یہ حالات جمع کئے گئے، اور کسی راوی کے قابل قبول یا نا قابل قبول یا ضابط یا عدم ضابط ہونے کا فیصلہ کس بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ یہ وہ علم ہے جس کو علم اسماءُ الرجال یا علم رجال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

علم اسناد اس وقت تک صحیح طور پر سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک علم رجال یا اسماءُ الرجال کی تفصیلات سامنے نہ ہوں۔ علم حدیث میں یہ مشکل ترین علوم وفنون میں شامل ہے۔ علم درایت میں علل کا موضوع سب سے مشکل ہے اور علم روایت میں رجال کا موضوع سب سے مشکل ہے۔ رجال سے متعلق دو پہلو زیر بحث آتے ہیں۔ ایک معاملہ خود رجال کے بارے میں معلومات، رجال کی شخصیت اور کردار کے بارے میں تفصیلات سے متعلق ہے، جس پر آج گفتگو ہوگی۔ رجال کا دوسرا پہلو، کسی راوی حدیث کے قابل قبول یا نا قابل قبول ہونے کا فیصلہ، اس کے اصول اور قواعد اور ان اصول وقواعد کی روشنی میں بالآخر کسی راوی کے قابل قبول یا نا قابل قبول ہونے کا حتمی فیصلہ جس فن کی روشنی میں کیا جاتا ہے، اس فن کو علم جرح وتعدیل کہتے ہیں۔ اس پر گفتگو کل ہوگی۔

ابتدا میں جب صحابہ کرام کا زمانہ تھا تو نہ روایت کی ان تفصیلی قواعد وضوابط کی ضرورت تھی نہ اسناد کی ضرورت تھی۔ صحابہ کرام نے جس اہتمام اور جس محبت سے رسول اللہ ﷺ کے ارشادات، اقوال وافعال اور آپ کے حالات کو جمع کیا، یاد رکھا اور محفوظ کیا، وہ ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ خود صحابہ کرام ایک دوسرے سے کسب فیض کیا کرتے تھے اور معلومات جمع کیا کرتے تھے۔

صحابہ کرام اور سند کا اہتمام

حضرت عبداللہ بن عباسؓ، جو صحابہ میں علم وفضل میں بڑا اونچا مقام رکھتے ہیں، انہوں نے اپنی زندگی کے آخری تین سالوں میں رسول اللہ ﷺ سے براہ راست کسب فیض کیا۔ جب حضورؐ دنیا سے تشریف لے گئے تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی عمر تقریباً تیرہ سال تھی۔ انہوں نے اپنی عمر کے بقیہ کافی سال کبارِ صحابہ سے کسب فیض میں گزارے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے کسب فیض کے انداز سے یہ پتہ چلایا جاسکتا ہے کہ صحابہ کرام کا اسلوب اور رنگ ڈھنگ کیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو جب پتہ چلتا کہ کسی خاص صحابیؓ کے پاس کوئی حدیث یا رسول اللہ ﷺ کا کوئی ارشاد گرامی ہے تو وہ ان صحابی رسول کے دولت خانے پر حاضر ہوتے۔ ایک مرتبہ وہ ایک انصاری صحابیؓ کے مکان پر پہنچے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اندر سے ملازمہ نے شاید پہچانا نہیں اور اگر پہچانا تو شاید بتانا مناسب نہیں سمجھا اور یہ کہہ دیا کہ وہ اس وقت آرام کر رہے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ ان کی ڈیوڑھی پر بیٹھ گئے۔ گرمی کا موسم تھا، ظاہر ہے ہوا کے تھپیڑے آرہے ہوں گے، ان کو اس میں نیند آ گئی اور وہ اس گرمی میں سو گئے۔ چہرے اور لباس پر گرد بھی پڑی۔ جب وہ صحابیؓ عصر کی نماز کے لئے نکلے۔ تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ گھر سے باہر موجود تھے۔ انہوں نے پریشانی سے کہا کہ اے رسول اللہ ﷺ کے بھائی! آپ یہاں تشریف لائے اور مجھے اطلاع نہیں کی۔ آپ حکم دیتے تو میں آپ کے پاس حاضر ہوتا۔ آپؓ نے فرمایا کہ العلم یوتیٰ ولا یاتی، علم کے پاس آیا جاتا ہے علم کسی کے پاس نہیں جاتا۔ یہ صحابہ کرام کا انداز تھا جو صحابہ کرام کے تذکروں اور سوانح سے پتہ چلتا ہے۔

مشہور صحابیؓ حضرت عبادہ بن صامتؓ، جن کے آخری ایام دمشق میں گزر رہے تھے، ان

کو پتہ چلا کہ ایک اور صحابیؓ حضرت عقبہ بن عامر الجہنی، جو رسول اللہ ﷺ کے خاص خدام میں شامل رہے، ان کے پاس کوئی خاص حدیث ہے، جو پہلے سے حضرت عبادہ بن صامت کے پاس پہنچ چکی تھی، لیکن وہ اس کو کنفرم کرنا چاہتے تھے۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوکر ایک قافلہ کے ساتھ کئی ماہ کی مسافت طے کر کے حضرت عقبہ الجہنی کے پاس پہنچے۔ ان کے مکان پر پہنچے تو شور مچ گیا کہ صحابئ رسولؐ حضرت عبادہ بن صامت تشریف لائے ہیں لوگ جمع ہوگئے۔ وہ سیدھے حضرت عقبہ کے مکان پر پہنچے، دروازہ کھٹکٹایا، وہ باہر نکلے، وہیں کھڑے کھڑے سلام دعا کی اور پوچھا کہ اس حدیث کے اصل الفاظ کیا ہیں؟ انہوں نے حدیث کے الفاظ سنائے، جو ان کی یادداشت کے مطابق تھے تو انہوں نے کہا کہ الحمدللہ مجھ تک جس ذریعے سے یہ حدیث پہنچی تھی وہ بالکل درست ہے، اب میں جارہاہوں اور یہ کہہ کر اجازت لی اور رخصت ہوگئے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خود صحابہ کرام نے کس محنت سے اور کس محبت اور احترام سے احادیث رسول کے بارے میں معلومات جمع کرنی شروع کیں۔

جس کو خارجی نقد حدیث کہا جاتا ہے، جس پر کل ذرا تفصیل سے گفتگو ہوئی تھی۔ اس کی اساس علم روایت پر اور علم روایت کی اساس سند پر اور سند کی اساس رجال پر ہے۔ گویا رجال وہ بنیادی مضمون ہے جس کی بنیاد پر اِسناد کا تعین ہوتا ہے اور اسناد کی بنیاد پر کسی حدیث کی خارجی نقد پر بات ہوتی ہے۔ اور خارجی نقد پر بات کرنے کے بعد گویا تحقیق کا ایک پہلو مکمل ہوجاتا ہے اور یہ طے ہوجاتا ہے کہ خارجی وسائل اور نقد کے اعتبار سے اس حدیث کا کیا درجہ ہے۔ یہ ضرورت صحابہ کرام کے دور کے بعد پیش آئی جب صحابہ کرام دنیا سے اٹھ گئے اور بہت تھوڑی تعداد میں رہ گئے۔ کبار تابعین کا زمانہ بھی تقریباً ختم ہوگیا اور صغار تابعین کا زمانہ آگیا۔ کبار تابعین کے زمانے تک بھی یہ امکان نہیں تھا کہ کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے کوئی کچی بات منسوب کردے، غلط بات منسوب کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اس کا امکان بہرحال موجود رہتا تھا کہ یادداشت میں کوئی کمزوری آجائے، کوئی دو احادیث کا مضمون ایک دوسرے میں مل جائے یا ایک حدیث کا مضمون دو الگ الگ مضامین کے طور پر بیان ہوجائے۔ اس طرح کا امکان موجود تھا۔ صحابہ کرام کی حد تک تو اس امکان کی بھی گنجائش نہیں تھی اس لئے کہ ان کے ہاں حدیث رسول کو حاصل کرنے اور محفوظ رکھنے کا جو اہتمام تھا اس کا اندازہ آپ کو ان دو واقعات سے

ہوگیا ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے جب کوئی پوچھتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا تو وہ براہ راست جواب نہیں دیا کرتے تھے، بلکہ اپنی فہم اور دانست کو بیان کر دیا کرتے تھے، اور جواباً یہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ حدیث میں آیا ہے کہ من کذب علیّ متعمداً فالیتبوّا مقعده من النار، جو شخص جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں کرلے۔ اس لئے وہ حتی الامکان حدیث بیان کرنے سے ہی احتراز کیا کرتے تھے، کہ اس میں اگر ایک فی ہزار بھی غلطی کا امکان ہو تو اس وعید کے مستحق نہ بن جائیں۔ ایک مرتبہ ضرورت پڑ گئی اور وہ حدیث کے الفاظ بیان کرنے لگے، تو پریشانی اور گھبراہٹ کے عالم میں کھڑے ہو گئے اور حدیث بیان کرنے کے بعد کہا کہ 'او قریباً من ذالك او شبیهاً من ذالك' تقریباً ایسی بات فرمائی تھی، اس سے ملتی جلتی بات فرمائی تھی یا اس سے مشابہ بات فرمائی تھی اور پھر بہت ہی پریشانی کا اظہار کیا کہ ہوسکتا ہے کہ میری یادداشت میں کوئی کمزوری رہ گئی ہو۔ غرض انتہائی غیر معمولی اہتمام کے ساتھ انہوں نے یہ چیز بیان فرمائی۔

کبار تابعین کا بھی یہی رویہ تھا۔ لیکن جب صغار تابعین کا دور آیا۔ اور یہ زمانہ پہلی صدی ہجری کا نصف دوم ہے، اس وقت اس کا احساس ہونے لگا کہ بعض لوگ احادیث بیان کرنے میں اخلاق اور تقویٰ کا وہ معیار برقرار نہیں رکھ پا رہے ہیں جو معیار صحابہ کرام نے رکھا تھا۔ اس وقت اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ تابعین سے یہ پوچھا جائے کہ آپ نے کس صحابیؓ سے یہ روایت سنی۔ تابعین میں بھی جو کبار تابعین تھے جن کا علم اور تقویٰ غیر معمولی طور پر ضرب المثل تھا ان سے یہ پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ لیکن صغار تابعین سے، جو صحابہ کرام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے دور ہونے کی وجہ سے جن کے بارے میں یہ امکان موجود تھا کہ شاید ان کے ہاں مطلوبہ احتیاط برقرار نہ رہے۔ ان سے یہ پوچھا جاتا تھا کہ آپ نے یہ حدیث کس صحابیؓ سے یا کس تابعی سے سنی ہے۔

سند کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟

حضرت سفیان ثوریؒ جن کا شمار صغار تابعین میں ہوتا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ پہلے حدیث کی سند پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، لیکن لما استعمل الرواة الكذب استعملنا

لھم التاریخ'۔ جب حدیث کے راویوں نے غلط بیانیوں سے کام لینا شروع کیا تو ہم نے ان کے لئے تاریخ کا وسیلہ اور تاریخ کا ہتھیار استعمال کرنا شروع کر دیا۔ تاریخ کے ہتھیار سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی صاحب کوئی حدیث بیان کرتے تھے۔ وہ زمانہ تابعین یا تبع تابعینؒ کا تھا۔ تو ان سے پوچھا جاتا تھا کہ انہوں نے یہ حدیث کس صحابیؓ سے سنی۔ صحابیؓ کا نام لینے کے بعد وہ یہ تیقن کرتے تھے کہ ان صحابیؓ کی وفات کس سن میں ہوئی، وہ صحابیؓ کس علاقہ میں قیام پذیر تھے۔ اور اس طرح سے یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ بیان کرنے والے نے حدیث صحیح بیان کی ہے یا اس میں کوئی جھول رہ گیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک صاحب نے، جن کا تعلق تبع تابعینؒ سے تھا، انہوں نے کوئی حدیث بیان کی۔ سننے والوں نے پوچھا کہ آپ نے یہ حدیث کس سے سنی ہے؟ انہوں نے بیان کیا کہ فلاں تابعی سے سنی ہے۔ پوچھا گیا کہ کس سن میں سنی ہے تو انہوں نے کہا کہ سن ۱۰۸ھ میں سنی ہے۔ پوچھا گیا کہ سن ۱۰۸ھ میں کہاں سنی تھی تو انہوں نے کہا کہ آرمینیا میں سنی تھی۔ سوال ہوا کہ آرمینیا میں وہ کیا کرنے گئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ جہاد کرنے گئے تھے۔ پوچھنے والے بزرگ نے کہا کہ تم غلط بیان کر رہے ہو، جھوٹ بول رہے ہو۔ ان تابعی کا انتقال ۱۰۴ھ میں ہو گیا تھا اور ۱۰۸ھ میں وہ زندہ نہیں تھے۔ اور وہ جہاد کرنے کے لئے آرمینیا نہیں بلکہ روم تشریف لے گئے تھے۔ اب یہ معلومات کہ ان تابعی کا انتقال ۱۰۴ھ میں ہوا تھا اور انہوں نے جس جہاد میں حصہ لیا تھا وہ روم کی جہادی مہم تھی، آرمینیا کی نہیں تھی اور ان دونوں کے درمیان تقریباً دو ڈھائی ہزار میل کا فرق ہے۔ اس سوال و جواب بلکہ جرح سے یہ پتہ چلا کہ ان صاحب کو بیان کرنے میں یا تو یادداشت میں التباس ہو رہا ہے یا کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے، یا ممکن ہے انہوں نے دانستہ غلط بیانی کی ہو، اس بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اس جھول کی وجہ سے ان کی یہ روایت تبع تابعینؒ نے قبول نہیں کی۔

اس طرح سے جب یہ واقعات کثرت سے پیش آنے شروع ہوئے اور اس کا امکان وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جا رہا تھا، تو پھر یہ معلومات جمع کرنے کا عمل شروع ہوا کہ صحابہ کرام کہاں کہاں تشریف لے گئے تھے، کس کس علاقہ میں مقیم رہے، انہوں نے وہاں جا کر کیا کیا اور کس علاقہ میں کس طرح کی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ مثلاً جہاد کا معاملہ تھا۔ اب یہ بات کہ کسی خاص تابعی نے آرمینیا کے جہاد میں حصہ لیا یا روم کے جہاد میں حصہ لیا، اس کا براہ راست علم

حدیث سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن چونکہ روایت میں اس کا حوالہ دیا گیا کہ آرمینیا کے جہاد کے دوران ان سے یہ بات سنی، جب کہ انہوں نے آرمینیا میں جہاد نہیں کیا تھا۔ اس سے یہ معاملہ واضح ہوگیا، کہ کم سے کم اس تابعی کی حد تک یہ تیقن ہوگیا کہ ان کے ذریعے سے یہ روایت نہیں آئی، کسی اور کے ذریعے سے آئی ہوگی۔

اس طرح سے علم حدیث میں ایک نئے شعبہ کا آغاز ہوا جس کو علم اسناد بھی کہتے ہیں اور علم اسناد کی بنیاد چونکہ سند پر ہے اور سند میں راویوں کا تذکرہ ہوتا ہے، راویوں کے حالات جمع کرنے کو علم رجال کہا گیا۔ علم رجال سے یہ نہ سمجھئے گا کہ اس سے صرف مرد مراد ہیں۔ یہ صرف ایک اصطلاح ہے اور میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ لامشاحة فی الاصطلاح، اصطلاح میں کوئی اختلاف نہیں۔ علم رجال میں خواتین کا بھی تذکرہ ہوتا ہے۔ علم رجال کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں خواتین راویوں کے تذکرے نہ ہوں۔ اس لئے رجال کے لفظ سے کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے۔ اس میں ان تمام روایوں اور راویات کا تذکرہ ہوتا ہے جنہوں نے علم حدیث کی روایت کی ہے۔ جیسے جیسے علم حدیث، روایات اور رجال کا دائرہ بڑھتا گیا، علم حدیث میں اختصاص (specialization) بھی پیدا ہوتا گیا۔ کچھ لوگ وہ تھے جو رجال کے فن میں زیادہ ماہر تھے۔ پھر رجال سے متعلقہ علوم وفنون جن میں جرح وتعدیل بھی ہے جس پر آگے چل کر بات ہوگی، کچھ لوگ اس کے متخصص ہوئے، کچھ لوگ علم درایت کے متخصص ہوئے کہ حدیث کی داخلی شہادت سے اندازہ لگائیں کہ حدیث کی داخلی شہادت سے اس کے کمزور ہونے یا نہ ہونے کا پتہ چلتا ہے یا نہیں چلتا۔ کچھ حضرات تھے جو خارجی نقد و روایت اور رجال میں زیادہ مشہور تھے، کچھ حضرات تھے جو داخلی نقد اور درایت میں زیادہ مشہور تھے۔ یعنی حدیث کی داخلی شہادت اور داخلی مطالعہ نقد میں، کچھ حضرات تھے جو دونوں میں زیادہ مشہور تھے۔ جو دونوں میں زیادہ مشہور تھے ان میں حضرت امام مالکؒ کا نام نامی بھی شامل ہے۔ جو حضرات داخلی نقد و درایت میں زیادہ مشہور تھے ان میں امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا نام زیادہ مشہور ہے۔ جو نقل و روایت میں مشہور ہیں ان میں محدثین کی بڑی تعداد شامل ہے۔ لیکن محدثین میں ایسے حضرات بھی شامل تھے مثلاً امام بخاری، امام ترمذی، جو دونوں میدانوں کے شہسوار تھے۔ جو روایت اور رجال کے بھی ماہر تھے اور نقد و درایت کے بھی ماہر تھے۔ حدیث کی داخلی شہادت سے بھی ان کو بہت کچھ اندازہ ہو جایا کرتا تھا۔

رجال اور سند کی ضرورت پیش آنے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ جہاں تک رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کا تعلق ہے صحابہ کرام اس کی روایت باللفظ کیا کرتے تھے۔ جو بات رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمائی اس کو اسی طرح یاد فرماتے تھے۔ اسی طرح لکھتے تھے اور آپس میں اپنے تحریری ذخائر کا ایک دوسرے سے تبادلہ اور تقابل کرتے رہتے تھے اور اپنی یادداشتوں کو ایک دوسرے سے چیک بھی کروایا کرتے تھے۔ صحابہ کرام کی یادداشت تک تو یہ التزام موجود تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کی روایت باللفظ ہو۔ لیکن جو معاملات رسول اللہ ﷺ کے عمل یا سنت تقریری سے تعلق رکھتے تھے، کہ حضورؐ کے سامنے کوئی کام ہوا اور آپ نے اس کی اجازت دے دی یا منع نہیں فرمایا، اس کی روایت ہر صحابیؓ اپنے الفاظ میں کیا کرتے تھے۔ گویا ایک واقعہ کی تعبیریں مختلف صحابہ کرام نے مختلف انداز سے کیں۔ جس نے جس طرح سے دیکھا اور سمجھا اور جس پہلو کو زیادہ اہم سمجھا اس پہلو کو بیان فرمادیا۔

جب یہ چیز تابعین تک پہنچی تو انہوں نے اس بات کا اہتمام کیا کہ جس صحابیؓ نے جو چیز جن الفاظ میں بیان کی اس کو انہی الفاظ میں آگے تک پہنچایا جائے اور اس کے الفاظ میں ردوبدل نہ کی جائے۔ روایت باللفظ کا یہ سلسلہ اہتمام کے ساتھ جاری رہا۔ اس میں اس حدیث نبویؐ سے بھی صحابہ کرام کو مدد ملی جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ 'نضر الله امرأ، اللہ تعالیٰ اس شخص کو سرسبز وشاداب رکھے، سمع مقالتی، جس نے میری کوئی بات سنی، فاداها کما سمعها، اور جیسا اس کو سنا تھا ویسے ہی اس کو روایت کردیا۔ اس سے روایت باللفظ کی اہمیت واضح ہوتی ہے کہ اگر جیسا سنا تھا ویسا ہی ادا کرو گے تو تروتازگی کی یہ بشارت ملے گی اور اگر اس کے الفاظ یا مفہوم میں کوئی تبدیلی ہوگئی تو بظاہر مفہوم یہ نکلتا ہے کہ یہ بشارت اس طرح سے حاصل نہیں ہوگی۔

احادیث کی روایت باللفظ کا اہتمام

رسول اللہ ﷺ جب صحابہ کرام کو بذات خود کوئی چیز بتاتے یا پڑھاتے یا یاد کروایا کرتے تھے تو اس بات کا اہتمام کرتے تھے کہ جو الفاظ آپ نے یاد کروائے ہوں، صحابہ کرام انہی الفاظ میں اس کو یاد کریں۔ چنانچہ حضرت براء بن عازبؓ کا مشہور واقعہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک

مرتبہ ان سے پوچھا کہ اے برا! جب رات کو سونے کے لئے لیٹتے ہو تو کوئی دعا کرتے ہو؟ انہوںؓ نے فرمایا کہ یارسول اللہ آپ بتائیں، جو آپ فرمائیں گے میں وہ دعا پڑھا کروں گا۔ اس پر حضورؐ نے ان کو یہ دعاء سکھائی جو مشہور ہے کہ 'اللھم اسلمت وجھی الیک وفوّضت امری الیک والجات ظھری الیک رغبتی و رھبتی الیک، لاملجیٰ ولا منجی منك الا الیك امنت بکتابك الذی انزلت و نبیك الذی ارسلتَ' جب حضرت براء بن عازبؓ نے دوبارہ یہ دعا رسول اللہ ﷺ کو سنائی تو آپؐ نے نبیك کی بجائے رسولك الذی ارسلت کہا تو رسول اللہ ﷺ نے مزاحاً ہاتھ سے مُکّا بنا کر اشارہ کیا اور فرمایا کہ میں نے و نبیك الذی ارسلت کہا تھا۔ تو حضرت براء بن عازبؓ کو یہ ہمیشہ یاد رہا اور وہ انتہائی محبت سے بیان کیا کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہاں مُکّہ سے اشارہ کر کے بتایا کہ ونبیک الذی ارسلت۔ اس سے اس بات کی بھی تائید ہوتی ہے کہ جو بات حضورؐ نے ارشاد فرمائی ہو اس کو انہی الفاظ میں بیان کرنا چاہئے اس کا ہم معنی کوئی لفظ استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ نبی اور رسول قریب قریب ایک ہی معنی کے حامل ہیں لیکن رسول ﷺ نے یہاں نبی کا لفظ استعمال فرمایا تھا اسی کی آپ نے تاکید فرمائی کہ اسی لفظ کو استعمال کیا جائے۔ چنانچہ صحابہ کرام کے زمانے سے اس کا التزام رہا اور رسول اللہ ﷺ کے قولی ارشادات تو تقریباً ۹۹ فیصد روایت باللفظ کے ساتھ منقول ہیں۔ البتہ حضورؐ کے اعمال، تقریرات یا افعال کا معاملہ ذرا مختلف ہے، جن کو ہر صحابیؓ نے اپنے انداز میں بیان کیا، جس صحابیؓ نے جس طرح دیکھا اور جس طرح سے مناسب سمجھا بیان کیا۔ پھر تابعین نے صحابہ کرام کی اس روایت کو انہی کے الفاظ میں بیان کیا اور ہر صحابیؓ کی روایت ان کے اپنے مقدس الفاظ کے ساتھ کتب حدیث میں موجود ہے۔

اس بات کی تائید اس مثال سے بھی ہوتی ہے کہ ایک حدیث میں کوئی صحابیؓ ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے دو قبیلوں کا ذکر کرتے ہیں، و اسلم و غِفار، قبیلہ اسلم اور قبیلہ غفار نے یہ کیا، ان کے ساتھ یہ معاملہ ہوا یا کسی بھی سیاق وسباق میں ان کا ذکر ہے۔ اب جن تابعی نے ان سے سنا ان کو یہ التباس ہوا کہ صحابی رسول نے غفار کا لفظ پہلے بولا تھا یا اسلم کا پہلے بولا تھا۔ حالانکہ اس بات کی اتنی اہمیت نہیں ہے۔ اس سے معنی میں، مفہوم میں، پیغام میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن وہ تابعی جب بیان کرتے تھے تو یہ وضاحت ضرور کرتے تھے کہ انہوں نے غفار اور اسلم یا اسلم اور غفار

فرمایا تھا۔ یہ میں بھول گیا ہوں کہ پہلے کیا فرمایا تھا اور ہر روایت میں یہ ذکر آتا ہے کہ وہ تابعی بہت اہتمام سے اس بات کی صراحت کرتے تھے کہ یہ ترتیب میرے ذہن میں نہیں رہی، انہوںؒ نے ان میں سے کوئی ایک بات فرمائی تھی۔ اس کی مثالیں کتب حدیث میں بہت ملتی ہیں۔

اگر آپ صحیح بخاری، صحیح مسلم یا حدیث کی کسی بھی اور کتاب کی ورق گردانی کریں، تو کہیں نہ کہیں آپ کو ایسی مثالیں ضرور ملیں گی۔ موجودہ نسخوں میں تو بریکٹس میں خوبصورت طریقے سے اس کی نشاندہی کردی گئی ہے، لیکن پرانے نسخوں میں بھی لکھا ہوا ہے اور یہ واضح ہوجاتا ہے کہ یہ کس راوی سے ہے اور یہ بھی بتادیا گیا ہے کہ کس راوی سے جلدی میں نقل کرنے کی وجہ سے یہ بھول چوک ہوئی۔

آپ سے میں نے عرض کیا تھا کہ حضرت عبداللہ بن مبارک جب حدیث پڑھایا کرتے تھے تو سننے کے لئے اتنے لوگ جمع ہوتے تھے کہ ایک بار ۶۳ ہزار دواتیں استعمال ہوئیں۔ وہاں جب کئی کئی سو مستملی کسی حدیث کو زور سے بولتے تھے تو ایسا ہوسکتا ہے کہ ہزاروں لکھنے والوں میں سے کسی ایک کے لکھنے میں ایک آدھ لفظ آگے پیچھے ہوجائے۔ کسی نے غِفار کا لفظ پہلے لکھ دیا اور اسلم کا بعد میں لکھ دیا۔ کسی نے اسلم کا پہلے لکھ دیا غفار کا بعد میں لکھ دیا۔ ساری احتیاط کے باوجود اس کا امکان رہ سکتا تھا اس لئے تابعین اور تبع تابعینؒ اس فرق کی وضاحت کردیا کرتے تھے۔

یہاں تک کہ روایت باللفظ کا اس قدر اہتمام ہوتا تھا کہ آپ حدیث کی کوئی کتاب کھول کر سندیں پڑھنا شروع کردیں تو اس طرح کی مثالیں آپ کو مل جائیں گی کہ محدث حدیث بیان کرتا ہے اور مثال کے طور پر کہتا ہے کہ 'حدثني هنّاد بن السري قال حدثني سفيان قال حدثني فلان ......'۔ اب هنّاد نے کہا تھا کہ حدثنی سفیان۔ اور یہ تعین نہیں کیا تھا کہ سفیان ثوری مراد ہیں یا سفیان بن عیینہ مراد ہیں۔ اب بعد والے جو بیان کریں گے وہ اپنی طرف سے نہیں کہیں گے کہ سفیان ثوری۔ یہ نہیں کہیں گے کہ حدثنی هناد قال حدثنی سفيان الثوری اس لئے کہ هناد نے سفیان ثوری نہیں کہا تھا صرف سفیان کہا تھا۔ اب بعد والے کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ سفیان ثوری یا ابن عیینہ کا لفظ لگادے اور وہ هناد سے منسوب ہوجائے۔ هناد نے جب بولا تھا تو اتنا ہی بولا تھا۔ تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ حدثني هناد قال حدثني سفيان، يقول الترمذي

وھو ابن عیینہ ۔یعنی ترمذی کہتا ہے کہ وہ ابن عیینہ ہیں یا ثوری ہیں، تاکہ واضح ہوجائے کہ یہ وضاحت میرے استاد ھناد کی زبان مبارک سے نہیں ہے بلکہ میری زبان سے ہے۔ یہ گویا ایک مثال ہے کہ روایت باللفظ میں کس قدر باریکی اور نزاکت کا اہتمام رکھا گیا۔

کیا رِوایت بالمعنی جائز ہے؟

کچھ وقت گزرنے کے بعد محدثین کے درمیان یہ سوال پیدا ہوا کہ روایت باللفظ سے ہٹ کر اگر روایت بالمعنی کی جائے تو جائز ہے یا نہیں؟۔لیکن روایت بالمعنی کا سوال تدوین کے سلسلہ میں نہیں پیدا ہوا تھا۔تدوین کی حد تک بخاری، مسلم، ترمذی اور باقی سب کتابوں میں جب روایتیں جمع کی گئیں تو جس طرح سے آئی تھیں اسی طرح سے لکھی گئیں۔روایت باللفظ ہی کے انداز میں جمع ہوئیں۔

سوال وہاں پیدا ہوا جہاں کسی مجلس درس یا مجلس وعظ میں یا تبلیغ دعوت کے کسی عمل میں کوئی حدیث بیان کرنے کی ضرورت پیش آئے تو کیا وہاں بھی روایت باللفظ کی پابندی ضروری ہے یا روایت بالمعنی بھی ہوسکتی ہے۔ یہ سوال وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اہمیت اختیار کرنے لگا اور ہم ان تمام محدثین اور علماء کرام کے شکرگزار ہیں جنہوں نے یہ سوال اٹھایا اور اس معاملہ میں یہ گنجائش پیدا کی۔اگر وہ حضرات روایت بالمعنی کی یہ گنجائش پیدا نہ کرتے تو آج دنیائے اسلام کے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کے لئے حدیث رسول کا حوالہ دینا ناممکن ہوجاتا۔اس لئے کہ ہم میں سے کتنے ہیں جو حدیث کے حافظ ہیں اور ایک ایک لفظ زیر زبر کی پابندی کے ساتھ اور ایک ایک شوشے کی پابندی کے ساتھ اسی طرح بیان کرسکتے ہیں جس طرح کی میں نے مثالیں دیں کہ وہ استاد کے نام کا اضافہ بھی ان سے منسوب نہیں کرتے۔ایسا ہوتا تو پھر لوگ حدیث کا حوالہ دینا چھوڑ دیتے اور ہمارے لئے اس سے استفادہ کرنا عملاً مشکل ہوجاتا بلکہ ناممکن ہوجاتا۔اس لئے محدثین نے یہ سوال اٹھایا کہ کیا روایت بالمعنی جائز ہے؟ کچھ لوگوں کا پھر بھی یہی خیال رہا کہ روایت بالمعنی کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے۔ بلکہ جو لوگ بیان کرنا چاہیں وہ پہلے یاد کریں پھر اس کے بعد بیان کریں۔لیکن علماء کرام کی اکثریت نے بعد کے سالوں میں تیسری، چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کے سالوں میں کچھ شرائط کے ساتھ روایت بالمعنی کی اجازت دے دی۔

ایک شرط تو یہ ہے کہ جو راوی اس کو روایت کرے وہ صرف ونحو اور علوم لغت کا عالم ہو۔ یعنی جب وہ روایت بالمعنی کرے تو اس کو پتہ ہو کہ جس لفظ کو وہ جن معنوں میں بیان کر رہا ہے وہ لفظ ان معنی میں استعمال ہوتا ہے کہ نہیں۔ اگر وہ اس معنی ہی میں نہ ہو اور بیان کرنے والا صرف و لغت کا عالم نہ ہو تو وہ کچھ کا کچھ بیان کر دے گا۔

ایک صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے ایک حدیث کا ترجمہ پڑھا 'من امّ قوماً فلیخفف' کہ جو شخص کسی کی امامت کرے وہ ہلکی نماز پڑھائے۔ تو یہ ترجمہ لکھا ہوا دیکھ کر وہ سمجھے کہ شاید ہل کے پڑھائے اور نماز میں حرکت کرتا رہے۔ چنانچہ جب وہ امامت کرتے تو ہلتے رہتے تھے۔ کسی نے پوچھا کہ آپ نماز پڑھاتے ہوئے ہلتے کیوں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے۔ پوچھا کہ حدیث میں کہاں لکھا ہوا ہے کہ نماز میں ہلا کرو۔ ان امام صاحب نے ترجمہ لا کر دکھایا تو لکھا ہوا تھا کہ نماز ہلکے پڑھائے۔ انہوں نے ہَلکے کو ہِلکے پڑھا۔ یعنی اگر آدمی صرف ونحو اور لغت کا عالم نہ ہو تو اس طرح کی غلطیاں ہو سکتی ہیں۔

دوسری شرط یہ ہے کہ وہ الفاظ جو احادیث میں استعمال ہوئے ہیں اور ان کا جو معنی اور مفہوم رسول اللہ ﷺ کا مقصود تھا اس سے واقف ہو۔ اور دونوں الفاظ کے درمیان جو تفاوت ہے یعنی جو الفاظ وہ استعمال کر رہا ہے اور جو اصل میں استعمال ہوئے ہیں ان دونوں کے درمیان فرق سے واقف ہو۔ اور حدیث رسول کو غلطی کے بغیر بیان کرنے کی استطاعت رکھتا ہو۔ یہ شرائط تو ہر اس شخص کے لئے ہیں جو حدیث کا مفہوم بیان کرے گا۔

امام مالکؒ کی ایک بات مجھے بہت پسند آئی ہے۔ امام مالکؒ کا ارشاد یہ ہے کہ احادیث مرفوعہ میں تو روایت بالمعنی جائز نہیں ہے۔ یعنی کوئی چیز جو رسول اللہ ﷺ سے منسوب ہے اس میں تو روایت بالمعنی جائز نہیں ہے اور وہ راویت باللفظ ہی ہونی چاہئے۔ لیکن جو بقیہ احادیث ہیں جن میں صحابہ کرام میں سے کسی کی رائے یا کسی کا مشاہدہ یا کسی کا فتویٰ یا کسی کی روایت بیان ہوئی ہے وہ روایت بالمعنیٰ ہو سکتی ہے کیونکہ اس کے بارے میں یہ وعید نہیں آئی ہے کہ من کذب علی متعمدا فالیتبوأ مقعده من النار۔ یہ حدیث صرف حضورؐ کے ارشادات کے بارے میں آئی ہے۔ یہ امام مالکؒ کی رائے ہے جو بہت وزنی معلوم ہوتی ہے۔

اس سے ملتی جلتی ایک دوسری رائے یہ ہے کہ روایت بالمعنی صحابیؓ کے لئے تو جائز تھی

لیکن غیر صحابیؓ کے لئے جائز نہیں ہے۔اب اگر صحابہ کے لئے جائز تھی اور غیر صحابہ کے لئے جائز نہیں تو پھر ہمارے لئے تو پھر یہ اجازت بے کار ہےاور ہمارے لئے اس اجازت کا ہونا یا نہ ہونا بے معنی ہے۔ یہ تو ایک نظری یا تھیوریٹکل بات ہوگئی۔لیکن جو عام محدثین ہیں ان کا یہی کہنا ہے کہ روایت بالمعنی ان شرائط کے ساتھ جائز ہےاور بعد میں لوگوں نے روایت بالمعنی ہی کے طریقے کو اختیار کیا۔آج کل آپ نے سنا ہوگا لوگ اپنی گفتگو میں ،تقریروں اور مضامین میں کثرت سے احادیث کا حوالہ مفہوم کے ساتھ دیتے ہیں۔لیکن کوشش کرنی چاہیئے کہ مفہوم کا حوالہ صحیح ہواور کسی حدیث کا حوالہ بغیر تحقیق کے نہ دیا جائے۔بعض اوقات گفتگو کے دوران زور بیان میں ایک چیز زبان پر آجاتی ہےاور آدمی اس کو حدیث کہہ کر بیان کردیتا ہےاور بعد میں یاد آجاتا ہے یا تحقیق سے پتہ چل جاتا ہے کہ حدیث نہیں تھی بلکہ کسی اور کا قول تھا ایسا کرنا احتیاط کے خلاف ہے۔ یہ چیز بڑی ذمہ داری کا تقاضا کرتی ہےاوراس معاملہ میں احتیاط کرنی چاہیئے۔

علم روایت میں، جس میں روایت باللفظ اصل ہے اور روایت بالمعنی کی بعد میں اجازت دی گئی ہے، یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود متعدد مواقع پر اپنے ارشادات کو دوسروں تک پہنچانے کا حکم دیا۔ایک جگہ آپؐ نے فرمایا کہ بلغوا عنی و لو آیۃ کہ اگر میری طرف سے ایک آیت بھی تم تک پہنچی ہے تو اس کو دوسروں تک پہنچاؤ۔اب جس شخص کے علم میں بھی رسول اللہ ﷺ کے ارشادات یا سنت کا علم آیا ہے وہ مکلّف ہے کہ جہاں تک اس کے بس میں ہو اور جہاں تک اس کے لئے آسان ہو اسے دوسروں تک پہنچائے۔اسی طرح خطبہ حجۃ الوداع دینے کے بعد آپ نے فرمایا کہ 'اَلا ھَلْ بَلَّغْتُ؟کیا میں نے پہنچادیا،لوگوں نے جواب دیا 'بلی' ہاں آپ نے پہنچادیا۔اس پر آپؐ نے فرمایا کہ فلیبلغ الشاھد الغائب' کہ جو موجود ہے وہ یہ بات ان تک پہنچادے جو موجود نہیں ہیں۔اس لئے بہت بڑی تعداد میں ان صحابہ کرام نے خطبہ حجۃ الوداع کی روایت کی اور انہیں ان صحابہ تک پہنچایا جو وہاں موجود نہیں تھے اوران تابعین تک جو بعد میں آئے کیونکہ فلیبلغ الشاھد الغائب کا اطلاق علماء لغت کے نزدیک ہراس شخص پر ہوتا ہے جس تک یہ حدیث پہنچے۔اس لئے جس مجلس میں یہ حدیث بیان کی جائے گی تو جو شخص وہاں موجود ہوگا وہ شاہد ہوگا اور جو وہاں موجود نہیں ہوگا،وہ غائب ہوگا۔تو موجود رہنے والا موجود نہ رہنے والے تک پہنچائے۔اور جب کوئی شخص پہنچائے گا تو وہ ایک طرح سے راوی حدیث ہوگا۔

اس کا کردار اور اس کی شخصیت زیر بحث آئیں گے۔ جب زیر بحث آئیں گے تو علم رجال وجود میں آئے گا۔ اس لئے ان احادیث کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ راویوں پر رواۃ کے بارے میں بحث ہو۔ چونکہ رواۃ اور راویان حدیث اس ارشاد نبویؐ پر عمل درآمد کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر راویان حدیث نہ ہوتے تو آج ہم ان ارشادات گرامی سے محروم رہتے اور ان پر عمل نہ کر سکتے۔ راویان حدیث ہی کے وسیلہ سے اور انہی کے واسطہ سے یہ ہدایت اور رہنمائی ہم تک پہنچی ہے۔ اس لئے وہ اس عمل کا ایک لازمی حصہ ہیں۔ اور اس عمل کا حصہ ہونے کی وجہ سے ان کی شخصیت کا مطالعہ بھی علم حدیث ہی کا مطالعہ ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ وہ تمام مسلمان خواتین وحضرات جو روایت حدیث، نقل حدیث، کتابت حدیث، شرح حدیث اور درس حدیث میں مصروف ہیں وہ سب کے سب اس عمل کا حصہ ہیں۔ کہ فلیبلغ الشاھد الغائب پر وہ سب عمل کر رہے ہیں اور فلیبلغ الشاھد الغائب کے حکم پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ وہ راویان حدیث اور علم حدیث کا بھی حصہ بنتے جا رہے ہیں۔

چنانچہ اس طرح سے ایک ایک کر کے یہ نام سامنے آتے رہے اور یہ تحقیق شروع ہوتی گئی۔ سب سے پہلے تحقیق اور راویان حدیث کی چھان بین کا یہ عمل حضرت حسن بصریؒ نے شروع کیا۔ حضرت حسن بصریؒ اور محمد بن سیرین تابعین میں بڑا نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ تین تابعین کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سیّد التابعین ہیں۔ ایک سعید المسیّب، جو حضرت ابو ہریرہؓ کے شاگرد خاص اور داماد تھے اور طویل عرصہ ان کے ساتھ رہے۔ دوسرے حضرت حسن بصریؒ جن کے بارے میں کہا گیا کہ وہ سید التابعین ہیں۔ اور تیسرے حضرت محمد بن سیرین جو تابعین میں بڑا نمایاں مقام رکھتے تھے۔

علم طبقات اور علم رجال

ان موخر الذکر دو حضرات نے، یعنی حسن بصری اور محمد بن سیرین نے رجال کے کام کا آغاز کیا۔ اور ایک طرح سے یہ دونوں حضرات علم رجال کے بانی اور موسس ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے یہ معلومات جمع کیں کہ صحابہ کرام کہاں کہاں تشریف لے گئے۔ اس ضمن میں پہلا کام یہ تھا کہ صحابہ کرام کے بارے میں مکمل معلومات جمع کی جائیں، مشاہیر صحابہ کے بارے میں تو

سب کومعلوم ہے۔ان کے بارہ میں زیادہ تحقیق کی ضرورت نہیں پڑی۔لیکن خطبہ حجۃ الوداع میں ایک لاکھ چوبیس یا چالیس ہزار صحابہ کرام موجود تھے،ان کے علاوہ بھی بہت سے صحابہ تھے جو اس موقع پر حج کے لئے تشریف نہیں لائے تھے۔ان میں سے ہر ایک کو ہر شخص نہیں جانتا تھا۔پہلا کام تو یہ تھا کہ صحابہ کرام کے حالات کو جمع کیا جائے اور ان کے تذکروں پر مبنی کتابیں تیار کی جائیں تاکہ پتہ چل جائے کہ کون لوگ صحابیؓ تھے اور کون نہیں تھے۔

لہٰذا سب سے پہلے صحابہ کرام کا تذکرہ کی جمع وتدوین کا کام شروع ہوگیا جن میں بعض کی مثالیں میں ابھی دیتا ہوں، آگے چل کر جب صحابہ کرام مدینہ منورہ سے نکل کر کوفہ، بصرہ، دمشق، مصر اور دیگر مختلف جگہوں میں آباد ہوئے تو اس بات کی بھی ضرورت پیش آئی کہ جو صحابیؓ جہاں جاکر بسے ہیں وہاں جاکر ان کا تذکرہ لکھا جائے۔ چنانچہ ان صحابہ پر الگ الگ کتابیں لکھی گئیں جو کوفہ میں جاکر بسے، جو بصرہ میں جاکر بسے، جو دمشق اور قاہرہ میں جاکر بسے اور اُن صحابہ کے بارے میں ایک کتاب ہماری اردو زبان میں بھی ہے (اور عربی میں بھی) جو سندھ میں آکر بسے۔ ہندوستان کے ایک بزرگ تھے قاضی اطہر مبارکپوری، انہوں نے ایک کتاب لکھی جس میں انہوں نے ان صحابہ کے حالات لکھے جو سندھ میں تشریف لائے، اور سندھ میں آباد ہوئے اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔اس طرح سے ہر شہر اور علاقہ کے صحابہ پر الگ الگ کتابیں آگئیں جس کے بعد یہ ممکن نہیں رہا کہ کوئی شخص غلط طور پر یہ دعویٰ کرے کہ فلاں صحابیؓ نے مجھ سے یہ بیان کیا۔اسی طرح یہ امکان بھی نہیں رہا کہ ایک صاحب صحابیؓ نہ ہوں اور بعد میں یہ دعویٰ کریں کہ میں صحابیؓ ہوں۔مثال کے طور پر کوئی شخص سمرقند جائے اور یہ دعویٰ کرے کہ میں صحابیؓ رسولؐ ہوں اور حضورؐ نے یہ فرمایا ہے۔اگرچہ ایسا نہیں ہوا۔لیکن چونکہ امکان موجود تھا اس لئے اس امکان کا سدباب کرنے کے لئے ان تابعین حضرات نے صحابہ کرام کے تذکرے الگ الگ بھی جمع کئے، شہروار بھی جمع کئے، قبیلہ وار بھی جمع کئے اور مختلف جنگوں کے حساب سے بھی جمع کئے کہ کس جنگ میں کون کون سے صحابیؓ شریک ہوئے۔تاکہ یہ پتہ چلے کہ کون سے صحابیؓ سمرقند تشریف لے گئے تھے اور کون سے صحابیؓ آرمینیا تشریف لے گئے تھے، تاکہ وہاں اگر کوئی روایت ان کے نام سے آئے تو تحقیق کی جاسکے کہ وہ وہاں تشریف لے بھی گئے تھے یا نہیں۔

ہندوستان میں ایک شخص تھا غالباً جنوبی ہندوستان میں، بمبئی یا حیدرآباد دکن کا رہنے

والا تھا۔اس کا نام بابا رتن تھا۔چھٹی صدی ہجری میں تھا اور اس نے طویل عمر پائی تھی۔ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کتنا معمر تھا، لیکن غالباً دوسوا دوسو سال اس کی عمر تھی۔ اس نے دعویٰ کیا کہ میری عمر سات سو سال ہے اور میں رسول ﷺ کے زمانہ میں موجود تھا۔ چنانچہ معجزہ شق القمر کے بعد جب میں نے دیکھا کہ چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے تو میں عرب پہنچا۔اس وقت رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ آ چکے تھے۔ میں مدینہ پہنچا، وہاں جا کر مسلمان ہوا اور آپؐ کے پاس تین چار مہینے رہا، پھر آپؐ نے مجھ سے کہا کہ اپنے علاقہ میں جا کر تبلیغ کرو تو میں واپس ہندوستان آ گیا۔ بہت سے لوگوں نے اس کی باتیں مان لیں اور اس کا بہت چرچا ہوا۔لوگ دور دور سے اس کے پاس آنا شروع ہوئے۔ اس کی خوب پیری مریدی چلی اور بڑی شہرت ہوئی۔ اس پر علماء حدیث کے سامنے سوال پیدا ہوا کہ اس شخص کے دعویٰ کی کیا حیثیت ہے۔محدثین نے لکھا کہ یہ بالکل جھوٹ ہے، ایسا کوئی آدمی صحابیِ رسول قرار نہیں دیا جا سکتا۔لیکن اس کے نام سے روایات مشہور ہونی شروع ہو گئیں۔ ہمارے برصغیر کے لوگ ویسے بھی بڑے خوش عقیدہ ہوتے ہیں اور مذہب کے نام پر بہت جلد لوگوں کی باتوں میں آ جاتے ہیں۔علامہ اقبال نے ایک جگہ کہا ہے کہ

تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے

یہ شاخِ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد

کہ ہندوستان کے مسلمان تاویل کے پھندے میں بہت جلدی پھنس جاتے ہیں۔یہ ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک کمزور پہلو ہے۔لیکن بابا رتن کے علاوہ ایک دوسرے شخص نے بھی ایسا ہی دعویٰ کیا لیکن علماء حدیث نے بڑی صراحت اور قطعیت کے ساتھ کہا کہ دونوں جھوٹے ہیں اور ان دونوں کو دجّال اور کذّاب قرار دیا۔ان کی کوئی بات نہ سنی جائے۔ چنانچہ بہت جلد وہ فتنہ ختم ہو گیا۔

صحابہ کرامؓ کے بعد جیسے جیسے زمانہ بڑھتا گیا علماء حدیث علم رجال پر معلومات جمع کرتے رہے اور بالآخر پانچویں صدی ہجری تک کی معلومات مکمل طور پر جمع ہو گئیں۔اس لئے کہ پانچویں صدی ہجری کے بارے میں میں نے عرض کیا تھا کہ امام بیہقی آخری محدث ہیں جن کی وفات ۴۵۸ھ میں ہوئی ہے اور جنہوں نے براہ راست احادیث کی روایت کر کے اپنا مجموعہ مرتب کیا۔اس کے بعد کے جو مجموعے ہیں وہ براہ راست روایت شدہ مجموعے نہیں ہیں۔ بلکہ سابقہ

مجموعوں کی بنیاد پر مرتب ہونے والے نئے مجموعے ہیں جن کو ثانوی مجموعے کہا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد علم رجال کی اس طرح ضرورت نہیں رہی جیسے روایت حدیث کے ضمن میں پیش آتی تھی۔ لیکن علماء حدیث کے تذکرے ہمیشہ مرتب کئے گئے اس لئے کہ علم حدیث کا درس زبانی بھی ہوا کرتا تھا اور تحریری بھی ہوا کرتا تھا۔ یہ تیقن کرنے کے لئے کہ کس شخص نے کتنے بڑے محدث سے حدیث پڑھی ہے اور صاحب علم کا درجہ اپنے استادوں کے لحاظ سے کیا ہے، یہ جاننے کے لئے محدثین کے تذکرے جمع کئے جاتے تھے۔ اور آج تک جمع کئے جارہے ہیں۔ پندرھویں صدی ہجری کے اوائل اور چودھویں صدی ہجری کے اواخر تک تمام محدثین کے تذکرے مطبوعہ شکل میں موجود ہیں اور ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ علم حدیث کی خدمت کن کن لوگوں نے کی ہے۔ اس میں برصغیر کے محدثین کا تذکرہ غالباً گیارھویں خطبہ میں ہوگا۔ یہ ساری شخصیات جن کے نام جمع ہوئے، ان کا مطالعہ مسلمانوں نے بھی کیا اور غیر مسلموں نے بھی کیا۔ ایک مشہور مغربی مستشرق ڈاکٹر سپرنگر، جس نے امام ابن حجر عسقلانی کی جو حافظ ابن حجر عسقلانی کے نام سے زیادہ مشہور ہیں، الاصابہ فی تمیز الصحابہ ایڈٹ کی ہے اور اس پر انگریزی زبان میں ایک مقدمہ لکھا ہے۔ اس مقدمہ میں اس نے یہ لکھا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم اس باب میں مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی کہ رجال جیسا فن اس کے ہاں ہو۔ نہ ماضی میں کسی قوم میں ایسا فن ہوا ہے نہ آئندہ اس کا کوئی امکان ہے کہ رجال جیسا فن، جیسا کہ مسلمانوں میں ہے، کسی اور قوم میں وجود میں آئے۔

یہ ایسا علم ہے کہ پانچ چھ لاکھ شخصیات کا تذکرہ ہمارے سامنے آجاتا ہے اور ان پانچ چھ لاکھ شخصیات کی بنیاد پر ہم تیقن کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ کسی شخص نے حضورؐ کے بارے میں جو بیان دیا اس کی تاریخی حیثیت کیا ہے۔

ایک اور انگریز مصنف باس ورتھ نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ علم رجال کی مدد سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی کا ہر گوشہ اور آپ کا ہر ارشاد مبارک اور آپ کا ہر فعل روز روشن کی طرح ایسے واضح ہے جیسے کوئی چیز سورج کی روشنی کے سامنے ہوتی ہے اور اس میں کوئی التباس نہیں ہوتا کہ یہ کیا چیز ہے۔ بہر حال یہ وہ چیز ہے جس کا اعتراف غیر مسلموں نے بھی کیا ہے۔

جب رجال پر باقاعدہ کتابیں لکھنے کا کام شروع ہوا تو حسن بصری کے زمانہ میں شروع ہوا لیکن حسن بصری کی لکھی ہوئی کوئی کتاب آج ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ ان کے بعد

جن لوگوں نے لکھا وہ کتابیں ہمارے سامنے ہیں اوران کی بنیاد پر ہم بتا سکتے ہیں کہ اس کا آغاز کب ہوا۔

طبقات پر اہم کتابیں

سب سے پہلے طبقات ابن سعد کے نام سے بارہ تیرہ جلدوں میں ایک کتاب تیار ہوئی، کوئی ایڈیشن بارہ جلدوں میں ہے، کوئی تیرہ میں اور کوئی چودہ جلدوں میں ہے۔ یہ ایک بڑے مشہور محدث اور مورخ تھے۔ انہوں نے طبقات ابن سعد کے نام سے ایک کتاب لکھی اور اپنے زمانے تک صحابہ سمیت جتنے بھی راویان حدیث تھے، ان سب کے حالات جمع کئے۔ تبرکاً پہلی دو جلدیں سیرت پر ہیں۔ انہوں نے سوچا کہ جس شخصیت کے راویوں کے حالات بیان کرنے ہیں پہلے اس شخصیت کا تذکرہ ہونا چاہئے۔ اس لئے پہلی دو جلدوں میں انہوں نے سیرت بیان کی اور بقیہ دس یا بارہ یا چودہ جتنی بھی جلدیں ہیں ان میں انہوں نے صحابہ کرام سے لے کر اپنے زمانہ تک کے تمام راویوں کے حالات بیان کئے۔

میں آپ سے یہ بھی عرض کردوں کہ محدثین کی نظر میں ابن سعد کا درجہ اتنا زیادہ اونچا نہیں ہے۔ اس لئے نہیں کہ ابن سعد پر کوئی اعتراض تھا، لیکن یہ بات میں اس لئے عرض کرنا چاہ رہا ہوں کہ محدثین کے مشکل اور سخت معیار کا اندازہ ہوجائے جو انہوں نے راویوں کے لئے رکھا۔ وہ ابن سعد کو کم معیار کا اس لئے قرار دیتے ہیں کہ ابن سعد واقدی کے شاگرد تھے اور واقدی محدثین کی نظر میں قابل قبول نہیں تھے۔ کوئی محدث واقدی کی روایت قبول نہیں کرتا۔ کسی محدث نے، نہ بخاری نے، نہ مسلم نے، نہ ترمذی نے، نہ ابوداؤد نے، کسی نے ان کی روایت قبول نہیں کی۔

مجھے حیرت ہوتی تھی کہ جب ہم واقدی کی کتابیں پڑھتے ہیں تو وہ بڑے صاحب علم، فقیہ اور متدین انسان معلوم ہوتے ہیں تو آخر یہ محدثین ان کی روایت کیوں قبول نہیں کرتے؟ ان کا کردار کس درجہ کا تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی جتنی آمدنی تھی وہ ساری آمدنی اور اپنے وقت کا سارا حصہ مطالعہ اور علم کے حصول میں لگایا کرتے تھے۔ علم حدیث کے بارے میں معلومات اور سیرت کے واقعات جمع کرنا ان کے مشاغل تھے۔ سیرت کے بڑے

امام تھے۔ مغازی یعنی حضورؐ کے غزوات کے واقعات جمع کرتے تھے۔ ہر اس قبیلہ میں جاتے تھے جس نے کسی جنگ میں حصہ لیا ہو یا اس قبیلہ کے کسی آدمی نے حضورؐ کے ساتھ مل کر کسی جنگ میں شرکت کی ہو اور وہاں سے واقعات سنا کرتے تھے کہ کیا ہوا اور کیسے ہوا اور آپ کے بزرگوں میں کیا چیز مشہور ہے اور پھر اس کو لکھا کرتے تھے۔ ایک ایسا آدمی جس نے پوری زندگی اس کام میں گزاری ہو تو آخر محدثین نے اس کو ناقابل قبول کیوں سمجھا؟

واقدی اپنی دولت کا بیشتر حصہ علم حدیث اور علم سیرت کے حصول کی خاطر دور دراز کے سفر کرنے میں خرچ کرتے تھے۔ اس لئے وہ اکثر تنگ دستی کے شکار رہا کرتے تھے۔ ان کے پاس پیسے نہیں ہوا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ عید کے موقع پر ان کی اہلیہ نے ان سے شکایت کی کہ نہ گھر میں پیسے ہیں، نہ کسی کے پاس کپڑے ہیں اور نہ گھر میں عید کا اہتمام کرنے کے لئے کچھ ہے، آپ کہیں سے پیسوں کا کوئی بندوبست کریں۔ آپ کو معلوم ہے کہ خواتین اس معاملہ میں زیادہ حساس ہوتی ہیں۔ لیکن واقدی نے کوئی توجہ نہیں دی۔ اس پر بیگم نے رونا دھونا شروع کر کے ایک ہنگامہ مچادیا۔ یہ بچارے کسی سے پیسے مانگنے کے لئے گئے۔ ان کے ایک دوست تھے، ان سے جا کر پیسے مانگے۔ انہوں نے دو ہزار درہم کی تھیلی لا کر دے دی۔ اب تھیلی لے کر بڑے خوش خوش گھر آئے کہ آدھے کا یہ کریں گے اور آدھے کا یہ کریں گے۔ ان کے ایک ہاشمی دوست تھے جو سادات میں سے تھے، وہ آئے، تو انہوں نے گھر میں آ کے بیان کیا کہ میرے ایک ہاشمی دوست ہیں سادات میں سے ہیں وہ کچھ پیسے قرض لینا چاہتے ہیں۔ بیگم نے پوچھا کیا ارادہ ہے؟ واقدی نے کہا کہ آدھے ان کو دے دوں اور آدھے میں رکھ لوں گا۔ ایک ہزار میں ہم کام چلالیں گے اور ایک ہزار ان کو دے دیں گے۔ بیگم نے کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ تمہاری ساری عمر سیرت پر مطالعہ کرنے میں گزری ہے، خود کو حدیث کا طالب علم کہتے ہو، حضورؐ کے خاندان کا ایک آدمی آیا ہے اور تم آدھی رقم خود رکھو گے؟ پوری رقم اس کو نہیں دو گے؟ پوری دو ہزار کی تھیلی اس کو دے دو۔ انہوں نے پوری تھیلی ہاشمی صاحب کو دے دی۔ اب ہاشمی اس تھیلی کو دیکھ کر حیران ہوئے کہ یہ کہاں سے آئی؟۔ دراصل وہ پیسے انہی ہاشمی بزرگ کے تھے۔ ان سے ان کے کسی اور دوست نے مانگے تھے جو واقدی کے بھی دوست تھے۔ انہوں نے ہاشمی بزرگ سے شکایت کی تھی کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں، عید کے لئے مجھے کچھ دے دیں، انہوں نے وہ تھیلی واقدی کے دوست کو دے

دی، واقدی نے جب اپنے دوست سے پیسے مانگے تو انہوں نے وہی تھیلی اٹھا کے جوں کی توں واقدی کو دے دی۔ واقدی سے ہاشمی نے مانگی انہوں نے جوں کی توں اٹھا کے ان کو دے دی۔ یہ بنی عباس کے زمانہ کا ذکر ہے۔ جب یہ واقعہ وہاں کے وزیر یحیٰی بن خالد برمکی کو معلوم ہوا تو وہ بڑا خوش ہوا۔ اس نے کہا کہ یہ تو بڑی زبردست بات ہے۔ اس نے دو ہزار درہم واقدی کو دیئے، دو ہزار درہم ہاشمی دوست کو دیئے اور دو ہزار درہم غیر ہاشمی دوست کو دیئے۔ اور کہا کہ یہ پیسے چونکہ واقدی کی بیوی کی وجہ سے ہاشمی کو واپس ہوئے اس لئے بیوی چار ہزار درہم کی مستحق ہے۔ دس ہزار درہم اس نے دیئے اور اس طرح یہ قصہ ختم ہوا۔

واقدی اس درجہ کے انسان تھے لیکن محدثین ان کو قابل اعتماد نہیں سمجھتے۔ ان کی کتاب 'کتاب المغازی' تین جلدوں میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے غزوات کے بارے میں بڑی مستند اور معلومات افزا کتاب ہے۔ محدثین کا طریقہ یہ تھا کہ جس نے جو روایت بیان کی انہوں نے اسی طرح باللفظ بیان کر دی۔ مجھ سے بیان کیا فلاں نے، ان سے فلاں نے، ان سے فلاں نے کہ غزوہ بدر میں مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھی۔ پھر مجھ سے فلاں نے بیان کیا، فلاں سے فلاں نے کہ اونٹوں کی تعداد ۷۳ تھی۔ پھر مجھ سے بیان کیا فلاں نے، کہ گھوڑے دو تھے، تلواریں اتنی تھیں۔ مجھ سے بیان کیا فلاں نے، ان سے فلاں نے کہ ہمارے پاس نیزے اتنے تھے۔ اس طرح کی معلومات وہ جمع کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہی طریقہ درست ہے۔

اس کے برعکس واقدی نے یہ کیا کہ ان ساری معلومات کو جمع کیا اور عنوان رکھا، غزوہ بدر کے حالات۔ پھر یہ لکھا کہ غزوہ بدر کی یہ معلومات میں نے ان ان حضرات سے جمع کی ہیں، ان سب کے نام دیئے ہیں اور نام دینے کے بعد اس پورے واقعہ کو ایک مربوط انداز میں بیان کیا۔ الگ الگ یہ نہیں بتایا کہ ان سب مجموعی معلومات میں سے کس سے کتنا حصہ معلوم ہوا ہے۔ محدثین کے ہاں تو یہ بڑا جرم تھا کہ یہ نہ پتہ چلے کہ کس نے کیا بات روایت کی ہے۔ اس لئے محدثین نے واقدی کے اس اسلوب سے شدید اختلاف کیا اور ان کو ساری عمر کے لئے ناقابل قبول قرار دے دیا۔ اس سے صرف یہ اندازہ کرنا مقصود ہے کہ محدثین کا معیار کتنا کڑا تھا کہ انہوں نے ایک ایسے زبردست اور جید عالم کو اور ایسے طالب علم کو جس نے پوری زندگی عرب کے ریگستانوں میں گھوم پھر کر گزاری تھی اور سیرت کی ساری معلومات جمع کی تھیں، محض اس لئے ناقابل قبول قرار دے دیا

کہ ان کے ہاں احتیاط کا وہ اونچا اور غیر معمولی معیار موجود نہیں جس کی پابندی محدثین کر رہے تھے۔ حالانکہ واقدی کی کتاب غزوات رسول کے سب سے بڑے ماخذوں میں شمار ہوتی ہے لیکن محدثین نے کہا کہ آپ نے یہ بے احتیاطی کی ہے اس لئے ہم آپ کی بات کو قابل قبول نہیں سمجھتے۔ بہر حال محدثین کے ہاں واقدی کا ذکر ہمیشہ منفی انداز میں آتا ہے۔

ابن سعد انہی واقدی کے شاگرد تھے۔ ابن سعد پر ایسا کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن چونکہ واقدی کے ساتھ رہے تھے اس لئے محدثین نے کہا کہ جب تک کسی اور ذریعہ سے تصدیق نہ ہو ابن سعد کی بات بھی زیادہ قابل اعتماد نہیں۔ میری ذاتی رائے میں تو بطور مورخ دونوں قابل اعتماد ہیں اور تاریخی واقعات کی حد تک دونوں کی بات قابل قبول ہے۔ لیکن حدیث کی روایت کے بارے میں ان دونوں حضرات کی بات محدثین نے قبول نہیں فرمائی۔

طبقات ابن سعد کے بعد جن حضرات نے کتابیں لکھیں ان میں سب سے پہلی کتاب جو آج ہمارے پاس موجود ہے وہ امام بخاری کے استاد یحیٰ بن معین کی ہے۔ یحیٰ بن معین اتنے بڑے محدث تھے کہ اپنے زمانے میں امیر المومنین فی الحدیث کہلاتے تھے۔ امام بخاریؒ کے اساتذہ میں سے تھے اور امام احمد بن حنبل کے دوستوں میں سے تھے۔ انہوں نے فن رجال پر کتاب لکھی ہے۔ ان کے بعد امام بخاری کے ایک اور استاد علی بن المدینی نے ایک کتاب لکھی۔

لیکن جس شخصیت نے علم رجال پر سب سے زیادہ کام کیا وہ خود امام بخاری تھے۔ امام بخاری کی کئی کتابیں ہیں جن میں سے کتاب التاریخ الکبیر اور کتاب التاریخ الصغیر یہ دونوں دستیاب ہیں۔ یہ اس طرح سے ہسٹری کی کتابیں نہیں ہیں جس طرح آج ہسٹری کی کتابیں ہوتی ہیں۔ بلکہ یہ کتابیں اسماء الرجال پر ہیں۔ یعنی ان رجال کے حالات پر ہیں جن کا علم حدیث میں ذکر آتا ہے اور یہ کہ کب ان کی پیدائش ہوئی اور کب وفات ہوئی۔ وفات کا تذکرہ اس لئے ضروری ہے کہ یہ تعین کیا جائے کہ ان کی ملاقات اپنے شاگرد سے، جو ان سے منسوب کر کے بیان کرتا ہے ہو سکتی تھی کہ نہیں ہو سکتی تھی۔ جب تک تاریخ وفات کا پتہ نہ ہو اس وقت تک یہ تعین بڑا دشوار ہے۔ پھر امام بخاری کی شرط تو اس سے بھی بہت آگے ہے کہ نہ صرف معاصرت یعنی ہم عصری ہو بلکہ یہ بھی ثابت ہو کہ ان کی ملاقات ہوئی ہے تو اس لئے امام بخاری یہ بھی تحقیق کرتے تھے کہ ان کے کن کن شاگردوں کی ان سے ملاقات ثابت ہے اور ان کی اپنے کن کن اساتذہ سے

ملاقات ثابت ہے۔ یہ معلومات امام بخاری نے جمع کی ہیں۔

امام بخاری نے ایک اور کتاب بھی لکھی ہے۔ یہ علم رجال کا ایک شعبہ ہے جس پر کم از کم ایک درجن کے قریب کتب آج دستیاب ہیں۔ وہ یہ کہ جب رجال پر معلومات کا یہ عمل شروع ہوا تو یہ بھی پتہ چلا کہ اب ایسے لوگ بھی سامنے آرہے ہیں جو کمزور ہیں یا اس معیار کے نہیں ہیں جس معیار کی لوگوں کی روایت قبول کی جاتی ہے۔ ان راویوں کو ضعفاء یا متروکین کہا جاتا ہے۔ جب ضعفاء اور متروکین کی تعداد بڑھ گئی تو محدثین اور علماء رجال نے ان پر الگ کتابیں تیار کیں۔ امام بخاری نے سب سے پہلے ایک کتاب لکھی 'کتاب الضعفا الصغیر' یعنی چھوٹی کتاب جو ضعیف راویوں پر مشتمل ہے۔ اس میں انہوں نے ضعیف راویوں کی معلومات اور فہرست الگ سے دے دی ہے تاکہ لوگ کتاب کی مدد سے یہ تحقیق کرلیں کہ اگر ان میں سے کوئی راوی آیا ہے تو وہ راوی ضعیف ہے اور اس کی روایت میں تامل کرنا چاہیے۔ جن لوگوں نے اس موضوع پر لکھا ہے ان میں امام مسلم بھی شامل ہیں۔ لیکن بعد کے محدثین میں جن کا کام اس میدان میں سب سے نمایاں ہے وہ امام دارقطنی ہیں۔ امام دارقطنی کی کتاب کئی سنن مشہور ہے۔ ان کی کئی کتابیں علم رجال اور جرح وتعدیل پر ہیں۔ جرح وتعدیل پر کتابوں کا آئندہ ذکر کریں گے۔

امام دارقطنی کے ایک معاصر اور امام مسلم کے ایک جونیئر معاصر ابوبکر بزار تھے جن کی مسند بزار مشہور ہے، انہوں نے بھی علم رجال پر ایک کتاب لکھی اور اس کتاب میں ان معلومات کو جمع کیا۔ امام نسائی جو صحاح ستہ میں سے ایک کتاب کے مصنف ہیں، ان کی کتاب ہے 'کتاب الضعفاء والمتروکین'۔ یہ کتاب بھی مطبوعہ شکل میں موجود ہے اور ملتی ہے۔ اس میں ان راویوں کے حالات ہیں جو ضعیف ہیں یا جن کی روایت کو ترک کر دیا جاتا ہے اور قبول نہیں کیا جاتا۔

مزید برآں اس فن کے دو اور بڑے امام علامہ ابن ابی حاتم اور حافظ ابن عبدالبر ہیں۔ ابن عبدالبر اسپین کے رہنے والے تھے۔ ان کا تعلق چوتھی پانچویں صدی ہجری سے ہے اور یہ احفظ اہل المغرب کہلاتے ہیں۔ یعنی سپین، مراکش، اندلس، قیروان اور تیونس کے سب سے بڑے حافظ حدیث۔ ان سے بڑا محدث ان کے زمانے میں اور کوئی نہیں تھا۔ ان سے بڑے متعدد محدثین ان کے بعد پیدا ہوئے۔ لیکن ان کے اپنے زمانے میں ان سے بڑا کوئی محدث نہیں تھا۔ حافظ ابن عبدالبر نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ ان میں موطا کے رجال پر ان کی کتاب بہت

مشہور ہے، موطا کی شرح پر بھی ان کی کتاب ہے، التمہید ان کی ایک بڑی کتاب ہے جس میں موطا کے اسانید (سندوں) پر انہوں نے بحث کی ہے۔ موطا امام مالکؒ دراصل اس علاقہ کی بہت مقبول کتاب تھی اور بہت مشہور تھی اس لئے مغرب کے علماء نے موطا امام مالکؒ کی خدمت زیادہ کی ہے۔ ایک تو وہ خود مالکی ہیں اور یہ فقہ مالکی۔ کے بانی کی کتاب ہے۔ اس لئے اس کو بڑا احترام اور تقدس حاصل تھا۔

پانچویں چھٹی صدی ہجری کے بعد رجال کی ساری معلومات جمع ہوگئیں۔ اور پانچویں صدی کے بعد پھر براہ راست روایت حدیث نہیں ہوئی اس لئے کہ جتنے راویان تھے ان سب کی معلومات جمع ہوگئیں۔ اور یوں علم رجال کی تدوین کا ایک اہم مرحلہ تکمیل کو پہنچا۔ اب ان معلومات کو جمع کرکے اوران کا تقابل کرکے جامع مجموعے تیار کرنے کا عمل شروع ہوا۔ پانچویں صدی ہجری کے بعد کی جو کتابیں رجال پر تیار ہوئیں وہ بڑی جامع کتابیں ہیں اوران پر ایک نئے انداز سے کام کرنے کا آغاز ہوا۔ ان میں سب سے پہلی کتاب علامہ عبدالغنی مقدسی کی ہے جو بیت المقدس کے رہنے والے تھے۔ یہ کتاب بڑی تاریخ ساز کتاب ہے۔ 'الکمال فی اسماء رجال'۔ انہوں نے کوشش کی کہ اسماء رجال پر اب تک جو مواد آیا ہے اس سب کو جمع کرکے ایک بڑی اور مکمل کتاب تیار کردیں۔ اس لئے انہوں نے اس کا نام 'الکمال فی اسماء الرجال' رکھا۔ اس کتاب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ بعد کے آنے والے محدثین نے اس پر اور کام کیا۔ اس پر جب کام کرنے کا آغاز ہوا تو علامہ یوسف المزی نام کے ایک اور بزرگ تھے جو حافظ مزی کہلاتے ہیں اور حدیث کی کتابوں میں ان کا نام حافظ مزی آتا ہے۔ حافظ مزی نے جب کام شروع کیا تو ان کو پتہ چلا کہ بہت سی معلومات علامہ مقدسی کو نہیں ملیں اور اس پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے اس لئے انہوں نے اس کتاب کی تہذیب کی اس میں اضافے کئے، جن معلومات کو انہوں نے غیر ضروری سمجھا یا مکرر پایا، ان کو نکال دیا، جہاں کمی تھی اس میں اضافہ کیا اور بارہ جلدوں میں ایک اور کتاب تیار کی جس کا نام رکھا 'تہذیب الکمال فی اسماء الرجال' یہ چھپی ہوئی ہر جگہ ملتی ہے۔

لیکن کمال صرف اللہ کی ذات کے لئے ہے، انسان کمال کا جتنا بھی دعویٰ کرے، وہ ناقص ہی ہے۔ حافظ مزی کے انتقال کے فوراً بعد یعنی پچیس تیس یا چالیس سال بعد ایک اور بزرگ سامنے آئے جو علامہ علاؤ الدین مغلطائی کہلاتے ہیں۔ ان کا تذکرہ بھی کتابوں میں حافظ مغلطائی

کے نام سے ملتا ہے۔ انہوں نے جب حافظ مزی کی کتاب کو دیکھا تو ان کو پتہ چلا کہ اس میں تو بہت کچھ کمی ہے۔ انہوں نے اس کو مکمل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کا تکملہ لکھا۔ یعنی اس کتاب کا ایک ضمیمہ تیار کیا۔ اصل کتاب بارہ جلدوں میں ہے جو تتمہ ہے وہ تیرہ جلدوں میں تیار ہوا۔ اس طرح سے یہ کتاب 'اکمال الکمال لتھذیب الکمال فی اسماء الرجال' کے نام سے حافظ مغلطائی نے لکھی۔ اب یہ کتاب اتنی طویل اور ضخیم ہوگئی کہ اس سے استفادہ مشکل ہوگیا۔ اس پر علامہ ذہبی نے جو حافظ مغلطائی کے ہم عصر تھے، اس کی تہذیب تیار کی اور 'تھذیب تھذیب الکمال فی اسماء الرجال' یعنی تہذیب الکمال کی تہذیب۔ انہوں نے ایک نیا نسخہ تیار کیا، وہ بڑا مقبول ہوا اور ہر جگہ ملتا ہے۔ اس کے بعد اس کتاب کو بے شمار لوگوں نے، کم وبیش ایک درجن حضرات نے اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ اس پر مزید تحقیق کی، اس کی شرحیں لکھیں، اس کے حواشی لکھے اور اس کو مزید بہتر بنایا تا آنکہ ان کے تقریباً سو سال کے بعد یہی حافظ ابن حجر ہیں جن کا نام ہر حدیث کے حوالہ میں آتا ہے، ایسے کم لوگ ہیں جن کا ذکر حدیث کی ہر گفتگو میں آئے اور حافظ ابن حجر ان میں سے ایک ہیں۔ انہوں نے تہذیب التہذیب کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ یہ بھی ہر جگہ ملتی ہے۔ پھر تہذیب التہذیب کا انہوں نے دو جلدوں میں خلاصہ لکھا 'تقریب التہذیب' یعنی لوگوں کے لئے تہذیب کو قریب بنانا۔

یہ علم حدیث میں علم رجال پر کام تھا جو وقتاً فوقتاً ہوا۔ اس پر مزید گفتگو بھی کرنی ہے لیکن چونکہ آج وقت ختم ہوگیا اس لئے رجال پر بقیہ گفتگو جرح وتعدیل کے سیاق وسباق میں ہوگی۔

صحابہ کرام پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ صحابہ کرام کے تذکرہ پر ہی آج کی گفتگو ختم کرتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا صحابہ کرام پر اس تحقیق کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ غیر صحابیؓ کو کسی غلط فہمی یا کسی بدنیتی کی وجہ سے صحابیؓ نہ سمجھ لیا جائے۔ تو پہلے صحابہ کرام پر الگ الگ تذکرے تیار ہوئے۔ ان میں سب سے قدیم تذکرہ جو آج بھی دستیاب ہے وہ انہی علامہ ابن عبدالبر کا ہے جن کو حافظ اہل المغرب کہا جاتا ہے۔ علامہ ابن عبدالبر کی وفات ۴۶۳ھ میں ہوئی تھی۔ پانچویں صدی ہجری کے آدمی ہیں۔ انہوں نے کتاب لکھی تھی 'الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب' یعنی صحابہ کی پہچان کی ایک جامع کوشش۔ الاستیعاب کے معنی ہیں **comprehesive sarvey** اس کتاب میں انہوں نے کم وبیش سات ساڑھے سات ہزار صحابہ کا تذکرہ کیا ہے۔

اس کے بعد علامہ ابن حجر عسقلانی نے ایک کتاب لکھی 'الاصابہ فی تمییز الصحابہ '۔اس میں تقریباً بارہ ہزار صحابہ کا تذکرہ ہے۔ان سے پہلے ایک کتاب علامہ ابن اثیر جزری نے لکھی تھی 'اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ '۔صحابہ کے تذکرے پر یہ تین بڑی بڑی کتابیں ہیں جو آج ہر جگہ دستیاب ہیں اور صحابہ کے بارے میں براہ راست معلومات کا مستند ترین، جامع ترین اور بہترین ذخیرہ تین کتابیں یہ، چوتھی کتاب طبقات ابن سعد جس کا میں نے ذکر کیا۔ان چار کتابوں سے صحابہ کرام کی زندگی کا پورا نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔اب کسی کے لئے یہ ممکن نہیں رہا کہ کسی غیر صحابی کو صحابیؓ کہہ کر کوئی غلط بات اس کے حوالہ سے حضورؐ کی ذات گرامی سے منسوب کر دے۔وہ کتابیں ان کے علاوہ ہیں جو مختلف شہروں یا مختلف علاقوں کے لحاظ سے لکھی گئیں، دمشق کے صحابہ کرام، فلاں جگہ کے صحابہ کرام وغیرہ۔

ایک آخری کتاب کا ذکر کرکے بات ختم کر دیتا ہوں۔ایک بزرگ تھے علامہ ابن عساکر جو بڑے محدث تھے۔ابن عساکر کی کتاب تاریخ دمشق فن تاریخ کی چند عجائب روزگار کتابوں میں سے ایک ہے۔میں مبالغہ نہیں کر رہا، بلکہ کوئی کتب خانہ ہو تو میں آپ کو دکھا بھی سکتا ہوں، انہوں نے پوری زندگی اس کام میں لگائی کہ دمشق شہر میں کون کون سے محدثین آئے۔دمشق میں کس کس حدیث کی روایت ہوئی، یہاں کون کون سے صحابہ کرام آئے، یہاں حدیث پر کتنا کام ہوا۔علم حدیث سے متعلق دمشق میں کتنا کام ہوا۔علم حدیث کی زبان پر کیا کام ہوا، لغات پر کیا کام ہوا، انہوں نے یہ لکھی تھی تاریخ دمشق کے نام سے۔دمشق میں ایک بڑی فاضل اور معمر خاتون ہیں میری ان سے ملاقات ہوئی ہے، وہاں ایک 'مجمع اللغہ العربیۃ' ہے جو ۱۹۲۶ء سے قائم ہے، عرب دنیا کا قدیم ترین علمی ادارہ ہے، میں بھی الحمدللہ اس کا رکن ہوں۔عربی زبان کے مشہور ماہر مولانا عبدالعزیز میمن بھی اس کے رکن تھے۔میرے استاد مولانا محمد یوسف بنوری جو بڑے مشہور محدث تھے وہ بھی اس کے رکن تھے، وہاں وہ کتاب شائع ہو رہی ہے۔اس کی اسّی (80) جلدیں اب تک چھپ چکی ہیں اور ہر جلد خاصی ضخیم ہے۔ابھی وہ کتاب مکمل نہیں ہوئی ہے۔ان خاتون کا کہنا تھا کہ اگر یہی رفتار رہی تو شاید ۱۲۰ جلدوں میں یہ کتاب مرتب ہو جائے گی۔اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ محدثین نے کتنی معلومات جمع کی ہیں۔یہ ایک کتاب صرف دمشق شہر کے بارے میں ہے۔

خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد لکھی تھی جو متعدد جلدوں میں کئی بار چھپی ہے اور اب ایک اور جگہ تحقیق کے ساتھ چھپ رہی ہے۔ اس کی بھی درجنوں جلدیں ہوں گی اور اس میں یہی معلومات بغداد کے بارے میں ہیں۔ بغداد میں جتنے تابعین گزرے ہیں، صحابہ تو وہاں نہیں گئے، صحابہ کے بعد بغداد بنا، لیکن تابعین، اور زیادہ تر تبع تابعینؒ گئے، تبع تابعینؒ کے دور سے وہاں علم حدیث کا زیادہ چرچا شروع ہوا، تابعین کے دور سے معمولی، جو تابعین یا تبع تابعینؒ وہاں گئے، ان سے لے کر پانچویں صدی ہجری میں خطیب بغدادی کے زمانہ تک بغداد میں آنے والے ہر محدث ہر خادم حدیث اور ہر عالم کا تذکرہ اس میں موجود ہے۔

سوالات کل کریں گے اس لئے کہ آج جمعہ کا دن ہے اور وقت تنگ ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

چھٹا خطبہ

جرح وتعدیل

ہفتہ، 11 اکتوبر2003

جرح وتعدیل

جرح وتعدیل کی قرآنی اساس

اس سے پہلے علم اسناد اور اس سے متعلق چند ضروری مسائل پر گفتگو ہوئی تھی اور اس میں یہ عرض کیا گیا تھا کہ خود قرآن مجید اور سنت رسول کی رو سے یہ بات ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جو چیز منسوب کی جائے وہ ہر لحاظ سے قطعی اور یقینی ہو۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ ہو اور ہر مسلمان جو تا قیام قیامت روئے زمین پر آئے اس کو پورے اطمینان اور شرح صدر کے ساتھ یہ بات معلوم ہو جائے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے لئے کیا بات ارشاد فرمائی ہے۔ کیا چیز جائز قرار دی ہے، کیا ناجائز ٹھہرائی ہے، کن چیزوں پر ایمان لانا اس کے لئے ناگزیر قرار دیا گیا ہے اور کن چیزوں کے بارے میں اس کو آزادی دی گئی ہے۔ اس اصول کی بنیاد تو قرآن مجید کی وہ آیات ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب بھی کوئی اطلاع یا خبر تم تک پہنچے تو اس کی تحقیق کرو' اِذا جاء کم فاسق بنباءٍ فتبیّنوا ' جب کوئی فاسق شخص تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کرو۔ اس لئے کہ اگر بغیر تحقیق کے اس خبر کو قبول کرلو گے تو ہوسکتا ہے کہ کسی ایسی قوم کے خلاف تم کوئی کارروائی کر گزرو جس کے خلاف کارروائی کرنے میں تم حق بجانب نہ ہو۔

اگر چہ اس آیت مبارکہ کا براہ راست تعلق روایت حدیث سے نہیں ہے، لیکن اس سے یہ اصول ضرور نکلتا ہے کہ ہر خبر کی تحقیق ضرور کرلینی چاہئے۔ جب دنیاوی معاملات میں تحقیق کی یہ اہمیت ہے تو وہ خبر جو رسول اللہ ﷺ کے قول، فعل یا تقریر کے بارے میں دی گئی ہو اس کی اہمیت

چونکہ بہت زیادہ ہے، اس لئے اس کی تحقیق کرنا اور پہلے سے اس بات کو یقینی بنانا کہ یہ حضورؐ ہی کا ارشاد ہے، انتہائی ضروری ہو جاتا ہے۔

ایک اور جگہ قرآن حکیم کی سورۃ ممتحنہ میں آیا ہے، ممتحنہ کا نام بھی اسی لئے ممتحنہ ہے اس میں امتحان لینے یا آزمانے کا ذکر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ 'اذا جاء کم المومنات المھاجرات فامتحنوھن'۔ جب تمہارے پاس مومن عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کو آزما کر دیکھو۔ یہ آیت صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہوئی تھی جب بڑی تعداد میں مکہ مکرمہ سے خواتین نے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آنا شروع کیا اور ہر آنے والی خاتون نے یہ کہا کہ چونکہ اس نے اسلام قبول کر لیا ہے، لہٰذا اس کو مدینہ منورہ میں شہریت دے دی جائے اور یہاں بسنے کی اجازت عطا فرمادی جائے۔ اس وقت یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا ہر آنے والی خاتون کے اس دعویٰ کو قبول کر لیا جائے یا اس کی تحقیق اور تصدیق کی جائے۔ ایک اعتبار سے یہ معاملہ بڑا اہم تھا اس لئے کہ آنے والی خاتون یہ بیان کر رہی تھی کہ اس نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اور حالت اسلام میں جب رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی تو وہ صحابیہ ہوگئی۔ گویا ایک صحابیہ کی طرف سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اس نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اس کے باوجود فامتحنوھن کا حکم دیا جا رہا ہے کہ ان کا امتحان لو اور آزمائش کر کے دیکھ لو کہ کیا انہوں نے واقعی اسلام قبول کیا ہے یا نہیں۔ اس سے بجا طور پر یہ سبق نکلتا ہے کہ اگر کسی شخص کا یہ دعویٰ ہو کہ وہ صحابیؓ ہے تو اس دعویٰ کی تحقیق کرنی چاہئے، اگر کسی شک وشبہ کا امکان ہو۔

کل میں نے آپ میں سے کسی کے سوال کے جواب میں بابا رتن ہندی کی مثال دی تھی جس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس کی عمر چھ سو سال ہے اور اس نے رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی تھی۔ اہل علم نے اس کی تحقیق کی اور ثابت کیا کہ دعویٰ جھوٹا ہے۔ اور بابا رتن کے بارے میں تمام اوہام وخرافات اور روایات کی تردید کر دی۔ قرآن مجید کی ان دونوں آیات سے اسناد اور اسناد کی تحقیق کا اصول ملتا ہے۔

مزید برآں، جیسا کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا، جس کا کئی بار حوالہ دیا جا چکا ہے، 'کفیٰ بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع'، کہ کسی شخص کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ جو بات سنے اس کو آگے بیان کر دے۔ اس میں بھی اس بات کی تلقین ملتی ہے کہ جب کوئی بات

سنو تو پہلے اس کی تحقیق کرو اور اگر سچی ثابت ہو جائے تو پھر آگے بیان کرو، ورنہ سنی سنائی بات کو بغیر تحقیق کے آگے بیان نہ کرو۔ جب عام باتوں کے بارے میں یہ حکم ہے تو پھر روایت حدیث تو انتہائی اہمیت رکھنے والا معاملہ ہے۔ اس میں تحقیق کرنے کا حکم کیوں نہیں دیا جائے گا۔ لازماً دیا جائے گا اور یقینی طور پر تحقیق کرنا ناگزیر ہوگا۔

صحابہ کرام اور جرح کی روایت

جب تک معاملہ صحابہ کرام کے ہاتھ میں رہا تو اس کی تحقیق کی جاتی تھی کہ ایک صحابی جو روایت بیان کر رہے ہیں وہ ان کو صحیح طور پر یاد بھی ہے کہ نہیں۔ لیکن بعض اوقات صحابہ کرامؓ تحقیق وتصدیق کے اس عمل نظر انداز بھی کر دیا کرتے تھے۔ نظر انداز وہاں کر دیا کرتے تھے جہاں سو فیصد یقینی ہوتا تھا کہ صحابیؓ رسول جو بات بیان کر رہے ہیں وہ اپنے قطعی یقین اور مشاہدہ کی بنیاد پر بیان کر رہے ہیں۔ اس میں کسی بھول چوک کا امکان نہیں۔ نعوذ باللہ صحابہ کرام کے بارے میں غلط بیانی کا امکان تو تھا نہیں، لیکن بھول چوک یا کسی ایک چیز کو کسی دوسرے سیاق وسباق میں سمجھ لینے کا امکان بہر حال بتقاضائے بشری موجود تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، جن کے بارے میں تمام اہل علم نے تصدیق کی ہے کہ وہ سب سے پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے سندوں اور راویوں کے بارے میں تحقیق کرنے کی روش اختیار کی۔ ظاہر ہے جناب صدیق اکبرؓ کا زمانہ تو سارا ہی صحابہ کا زمانہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے کوئی دو سوا دو سال بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا، اس لئے جو لوگ ان سے احادیث بیان کر رہے تھے وہ تو سارے کے سارے صحابہ ہی تھے۔ لیکن اس کے باوجود جناب صدیق اکبرؓ نے ان سے بھی تصدیق وتحقیق کی روش اپنائی، اور ہمیشہ یہ چاہا کہ اس بات کو لوگوں کے ذہن نشین کر دیں کہ کوئی چیز رسول اللہ ﷺ کی ذات سے غلط منسوب نہ ہو۔ سیّدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی میں ایسے کئی واقعات ملتے ہیں کہ ان کے سامنے کسی صحابیؓ نے کوئی حدیث بیان کی لیکن انہوں نے اس حدیث کو فوراً ہی قبول نہیں کیا۔ صحابیؓ سے کہا کہ اس کے لئے مزید سند اور ثبوت پیش کریں اور اس مزید سند اور ثبوت کے بعد ہی حدیث کو قبول کیا۔

چنانچہ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دربار میں ایک خاتون نے حاضر ہوکر کہا کہ اے امیر المومنین میرے ایک عزیز کا انتقال ہوگیا ہے جو میرا پوتا یا پوتی تھی۔ بقیہ رشتہ داروں میں فلاں فلاں لوگ شامل ہیں، تو میرا حصہ اس کی وراثت میں کتنا ہے؟ اور میرا جتنا حصہ بنتا ہو آپ وہ مجھے دلا دیں۔ اس پر حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے صحابہ سے معلوم کرتا ہوں، کہ آپؐ نے دادی کا حصہ کتنا رکھا تھا۔ اس پر حضرت مغیرہ بن شعبہؓ، جو صحابہ کرام میں بڑا نمایاں مقام رکھتے ہیں اور عقل وفہم کے ایسے درجہ پر فائز تھے کہ عرب میں اسلام سے پہلے بھی چار آدمی، جو 'دہاۃ العرب'، یعنی عرب کے سب سے ذہین ترین انسان مشہور تھے، اُن میں اِن کا شمار تھا۔ یعنی عرب کے چار ذہین ترین انسانوں میں سے ایک حضرت مغیرہ بن شعبہ تھے۔ انہوں نے گواہی دی کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے ہی ایک معاملہ میں فیصلہ فرمایا تھا کہ دادی کا حصہ چھٹا ہوگا۔ لیکن سیّدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ حدیث سن کر فیصلہ نہیں کیا۔ بلکہ ان سے پوچھا کہ 'ھل معك غیرك؟'۔ کیا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے جو اس واقعہ کا گواہ ہو؟ اس پر ایک اور صحابیؓ، حضرت محمد بن مسلمہ انصاریؓ نے گواہی دی کہ میں اس کا گواہ ہوں، اور میرے سامنے یہ واقعہ پیش آیا تھا اور واقعتاً رسول اللہ ﷺ نے دادی کو چھٹا حصہ دلوایا تھا۔ اس پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فیصلہ کردیا اور اس وقت سے یہ ایک طے شدہ روایت اور اصول بن گیا کہ دادی کا حصہ بعض حالات میں چھٹا ہوگا۔

اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ بھی ہے۔ جس میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ کسی سے ملنے کے لئے گئے۔ غالباً حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے پاس ملنے گئے۔ وہاں جاکر انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا، لیکن کسی نے جواب نہیں دیا۔ دوسری مرتبہ دروازہ کھٹکھٹایا، کوئی جواب نہیں آیا۔ پھر تیسری مرتبہ دروازہ کھٹکھٹایا اور جب کوئی جواب نہیں آیا تو انہوں نے کچھ ناخوشگواری یا ناراضگی کا اظہار کیا۔ اس پر اندر سے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ برآمد ہوئے، جن کا مکان تھا، انہوں نے کہا کہ ناراض ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی سے ملنے جائے اور تین مرتبہ آواز دینے اور دروازہ کھٹکھٹانے کے باوجود وہ شخص جواب نہ دے تو آنے والے کو واپس چلے جانا چاہئے اور اس کو محسوس نہیں کرنا چاہئے۔ یہ آنے والے کا لازمی حق نہیں ہے کہ جب بھی کوئی شخص

کسی سے ملنے کے لئے جائے تو دوسرا آدمی ہر وقت اس سے ملنے کے لئے تیار ہو۔ اس کی مصروفیات بھی ہوسکتی ہیں، اس کے آرام کا وقت بھی ہوسکتا ہے، وہ کسی ایسے کام میں مصروف ہوسکتا ہے جو زیادہ اہم ہو۔ اس پر حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے کہا جو بات آپ نے حضور علیہ السلام کے حوالہ سے بیان کی ہے اس پر کوئی گواہ ہے؟ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بڑے سینئر صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ مکہ مکرمہ کے بالکل ابتدائی دور میں مسلمان ہوئے تھے۔ انہوں نے اس کو محسوس کیا کہ میں نے ایک حدیث بیان کی اور حضرت عمر فاروقؓ اس کو قبول کرنے میں تامل کررہے ہیں۔ لیکن ان کے حکم پر انہوں نے ایک دوسرے صحابیؓ، جو اتفاق سے اس وقت موجود تھے، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ چلیں حضرت عمرؓ کے دربار میں گواہی دیں کہ اس ارشاد کے موقع پر آپ بھی موجود تھے۔ چنانچہ حضرت ابوسعید خدریؓ نے گواہی دی اور فرمایا کہ جب رسول اللہ ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی تو میں بھی موجود تھا اور میں اس کا گواہ ہوں۔

اب حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے شکایت کی 'واللہ کنتُ امیناً علیٰ حدیث رسول اللہ ﷺ '۔ خدا کی قسم میں رسول اللہ ﷺ کی احادیث کے معاملہ میں بڑا امانت دار ہوں اور میں پوری ذمہ داری سے یہ بات بیان کررہا تھا۔ اس کے باوجود آپ نے گویا میری بات قبول نہیں کی اور ایک گواہ طلب کرلیا۔ اس پر حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ 'اجل '۔ یقیناً ایسا ہی ہے۔ میں آپ کو بہت دیانت دار سمجھتا ہوں، 'ولکننی احببتُ ان اثبت!'۔ لیکن میں یہ چاہتا تھا کہ میں مزید تحقیق اور مزید تصدیق کرلوں۔

ایسے ہی ایک موقع پر جب حضرت عمر فاروقؓ نے دوسری گواہی طلب کی۔ تو آپ نے فرمایا کہ 'اما انیّ لم اتھمک'۔ دیکھئے میں نے آپ پر کوئی الزام نہیں لگایا، میں آپ پر تہمت نہیں لگا رہا کہ خدانخواستہ آپ غلط بیانی کررہے ہیں، 'ولکن خشیتُ ان یقول الناس علی رسول اللہ ﷺ '، لیکن مجھے یہ ڈر ہوا کہ آپ لوگوں کو بار بار احادیث بیان کرتے دیکھ کر اور ہمیں آسانی سے قبول کرتے دیکھ کر لوگوں میں یہ جرات پیدا نہ ہو جائے کہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں جو چاہیں ہر وقت بیان کردیں۔ لوگوں کو اس طرح کی تربیت دینے کے لئے، کہ جو بات بیان کریں بہت اہتمام اور تحقیق کے ساتھ بیان کریں، میں نے آپ سے گواہی کا مطالبہ کیا۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں روایت میں آتا ہے کہ ان کے سامنے

جب کوئی حضورﷺ کی حدیث بیان کرتا تھا تو وہ اس سے قسم لیا کرتے تھے کہ قسم کھاؤ کہ تم نے ایسے ہی سنا ہے۔ حالانکہ وہ بیان کرنے والے بھی صحابیؓ ہی ہوتے تھے۔ دراصل حضرت علیؓ، یا حضرت عمر فاروقؓ یا حضرت ابو بکر صدیقؓ، دوسرے صحابہ پر شک نہیں کر رہے تھے۔ لیکن دوسرے لوگوں کو تربیت دینے اور غیر صحابہ کو اس بات کی مشق کرانے کے لئے کہ ارشاد رسولؐ کی روایت کی کتنی اہمیت ہے، وہ صحابہ کرام سے بھی قسم لیا کرتے تھے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ صحابہ کرامؓ کی یہ سنت ہے کہ راوی کے بارے میں تحقیق کی جائے اور جب کوئی راوی روایت بیان کرے تو اس کی تحقیق میں حتی الامکان جو بھی تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں وہ اختیار کی جائیں۔

صحابہ کرام تحریری شہادت قبول نہیں کیا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ الخط یشبہ الخط، ایک تحریر دوسری تحریر کے مشابہ ہوسکتی ہے۔ اب اگر مدینہ منورہ سے کوفہ میں کسی صحابیؓ کے نام کوئی خط گیا ہے کہ رسول اللہﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی تو کوفہ میں بیٹھے ہوئے صحابیؓ کو کیسے پتہ چلے گا کہ یہ خط مدینہ منورہ میں فلاں صحابیؓ ہی نے بھیجا ہے۔ یا کوفہ میں اگر کوئی صحابیؓ بیٹھے ہوں اور مصر میں کسی کے نام خط لکھیں کہ رسول اللہﷺ نے یہ بات فرمائی تھی اور مجھ سے فلاں صحابیؓ نے بیان کی تو اس کی تصدیق کون کرے گا کہ یہ خط انہی صحابی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جن سے منسوب کیا جارہا ہے۔ اس میں کسی غلط فہمی، ملاوٹ یا الجھن کا ایک امکان بہر حال موجود تھا۔ اِس لئے اُس وقت یہ طے کیا گیا تھا کہ صرف تحریری دستاویز یا محض نوشتہ کی بنیاد پر کوئی حدیث قبول نہیں کی جائے گی، جب تک اس کے حق میں کوئی زبانی گواہی موجود نہ ہو۔ یا تو کوئی ایسا زبانی گواہ موجود ہو جو جاکر اس بات کی گواہی دے کہ یہ تحریر میرے سامنے فلاں صاحب نے لکھی تھی، پھر ان کی گواہی بھی سند میں شامل ہوگی کہ فلاں صاحب نے یہ گواہی دی۔ مثلاً فلاں صحابیؓ نے میری موجودگی میں میرے روبرو یہ حدیث لکھی اور یہ لکھا کہ یہ بات رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمائی۔ اس طرح سے تحریری اور زبانی دونوں گواہیاں مل کر ایک گواہی بن جاتی تھی۔

یہ سلسلہ صحابہ کرامؓ کے زمانے تک جاری رہا۔ اور صحابہ کرامؓ نے اس سے زیادہ کسی اہتمام کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس لئے کہ روایت کرنے والے سب صحابیؓ تھے۔ صحابہ ایک دوسرے کو جانتے تھے، بڑے بڑے صحابہ جو مدینہ منورہ میں رہتے تھے، مکہ مکرمہ میں رہتے تھے یا کوفہ اور دمشق جاکر بس گئے تھے، وہ سب ایک دوسرے سے واقف تھے۔ ایک ہی برادری اور ایک

خاندان کے لوگ تھے۔ان کا تعلق یا تو قبیلہ قریش سے تھا یا دوسرے ایسے قبائل سے تھا جو مدینہ منورہ میں آکر بس گئے تھے یا انصار کے ان قبائل سے جن کے ساتھ مواخاۃ قائم ہوگئی تھی اور ایک دوسرے کے بھائی بن گئے تھے، رشتہ داریاں قائم ہوگئی تھیں۔اس لئے وہاں اس شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ روایت بیان کرنے والا صحابیؓ ہے یا نہیں ہے۔کوئی غیر صحابیؓ تو صحابیؓ ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا تھا۔اس لئے سوائے اس کے کہ حلفیہ بیان لے لیا جائے یا ایک دوسرے صحابیؓ کی گواہی شامل کرلی جائے یا تحریری بیان ہو تو کسی اور کی زبانی گواہی لے لی جائے۔اس کے علاوہ کسی اور چیز کی ضرورت نہیں تھی۔

لیکن صحابہ کرام کا ایک وقت مقرر تھا۔اللہ تعالیٰ نے مقررہ وقت پر انہیں اٹھالیا اور وہ زمانہ تیزی سے آنے لگا کہ وہ آنکھیں ایک ایک کر کے بند ہونے لگیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے چہرہ مبارک کا دیدار کیا تھا۔اب بڑی تعداد ان حضرات کی آگئی جو صحابیؓ نہیں تھے بلکہ تابعی تھے۔تابعین میں غالب ترین اکثریت صحابہ کرام کے تربیت یافتہ لوگوں کی تھی۔وہ اخلاق، کردار اور تقویٰ کے انتہائی بلند معیار پر فائز تھے۔لیکن ہر عام تابعی کا وہ معیار نہیں تھا جو صحابہ کرام کے تربیت یافتہ خاص تابعین کو حاصل تھا۔پھر حافظہ اور ضبط میں اور بات کو سمجھنے اور محفوظ رکھنے میں ہر شخص کا معیار ایک نہیں ہوسکتا۔اس لئے اس بات کا امکان پیدا ہو چلا کہ تابعین میں سے کوئی بزرگ کسی بات کو اس کے سیاق وسباق میں نہ سمجھ سکیں۔بات کو اس کے اصل مفہوم اور پس منظر سے ہٹ کر کسی اور مفہوم میں بیان کردیں۔

ایسی مثالیں عملاً بھی سامنے آئیں۔اس لئے سند کا مطالبہ کیا جانے لگا اور کہنے والوں نے یہ کہا کہ 'الاسناد من الدین' کہ اسناد یعنی سند بیان کرنے کا عمل دین کا ایک حصہ ہے۔اب یہ دین کا حصہ قرار دے دیا گیا اس لئے کہ اسناد کے بغیر رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کی تصدیق اور تحقیق مشکل تھی اور فقہ اسلامی کا اصول ہے 'مالایتم الواجب الا به فهو واجب'، کہ جس چیز پر کسی واجب کا دارومدار ہو وہ چیز بھی واجب ہوجاتی ہے۔کوئی چیز فی نفسہٖ واجب نہ ہو، لیکن کسی اور واجب پر اس کے بغیر عمل درآمد ممکن نہ ہو تو وہ چیز بھی واجب ہوجائے گی۔رسول اللہ ﷺ کے ارشادات پر عمل درآمد فرض ہے اس لئے ان ارشادات کو جاننا بھی فرض ہے اور جانا نہیں جاسکتا تھا جب تک سند کا معاملہ صاف نہ ہو، اس لئے اسناد کا عمل دین کا حصہ بن گیا۔ لولا الاسناد ،اگر

اسناد کا عمل نہ ہوتا 'لقال من شاء ماشاء'، یہ جملہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا ہے جو امیر المومنین فی الحدیث کہلاتے ہیں، کہ اسناد دین کا حصہ ہے، اگر اسناد کا عمل نہ ہوتا تو دین کے بارے میں جس کا جو جی چاہتا وہ کہہ دیا کرتا اور کوئی پوچھنے والا نہ ہوتا۔ اس لئے اس بات کو یقینی بنانے کے لئے کہ رسول اللہ ﷺ سے کوئی غلط بات منسوب نہ ہو جائے اسناد کے عمل کو لازم قرار دیا گیا۔ اور یہ بات مسلمانوں کے علمی مزاج کا حصہ بن گئی کہ جو علمی بات کسی کے سامنے کہی جائے وہ پوری سند کے ساتھ کہی جائے۔ یہ روایت مسلمانوں کے علاوہ کسی قوم میں موجود نہیں۔ بلا استثنا اور بلا خوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ سند کا یہ تصور صرف اور صرف مسلمانوں کی روایت میں پایا جاتا ہے کسی اور قوم کی مذہبی یا غیر مذہبی روایت میں سند کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔

اسناد کی پابندی کی اسلامی روایت

مسلمانوں کے ہاں نہ صرف علم حدیث میں، بلکہ تمام علوم وفنون میں اسناد کی پابندی لازمی سمجھی گئی۔ آپ تفسیر کی پرانی کتابیں اٹھا کر دیکھ لیجئے، آج ہی جا کر تفسیر طبری دیکھیں۔ اس میں ہر بات اور تفسیر سے متعلق ہر جملہ پوری سند کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ ابن جریر طبری نے یہ جملہ یا قول کس سے سنا، انہوں نے کس سے سنا، انہوں نے کس سے سنا؟ بالآخر یہ بات یا صحابہ کرام تک یا رسول اللہ ﷺ تک یا جہاں تک وہ بیان کرنے والا بیان کرنا چاہے، وہاں تک پہنچتی ہے۔ طبری کی تفسیر میں بغیر حوالہ اور بغیر سند کے ایک جملہ بھی نقل نہیں کیا گیا، الّا یہ کہ وہ بات ابن جریر طبری کی اپنی رائے ہو۔ ایک سے زائد احادیث پر جہاں وہ تبصرہ کرتے ہیں وہاں لکھتے ہیں 'وقال ابن جریر'، اور ابن جریر کا کہنا یہ ہے، یا 'وقلتُ' میں نے کہا، یا اقول یعنی میں یہ کہتا ہوں۔ گویا جہاں ان کی اپنی رائے ہے وہاں اپنا حوالہ ہے اور جہاں ان کی اپنی رائے نہیں ہے تو مکمل حوالہ اور سند کے ساتھ وہ بات کرتے ہیں۔

سیرت کی پرانی کتابیں اٹھا کر دیکھیں۔ سیرت کی ساری پرانی کتابوں میں، ابن اسحاق کی سیرت ہو، جو اب چھپ گئی ہے یا عروہ بن زبیر کی کتاب المغازی ہو، حتیٰ کہ واقدی ہوں جو اتنے مستند نہیں سمجھے جاتے، یا ابن سعد ہوں، ان میں سے ہر کتاب میں ہر واقعہ کی پوری سند موجود ہے۔ ایک ایک جملہ کی مکمل سند بیان کی گئی ہے۔ حتیٰ کہ ادب، شعر، فصاحت، بلاغت،

صرف، نحو اور لغت ان سب کی سندیں موجود ہیں۔

حتیٰ کہ یہ بات کہ امرؤالقیس نے کوئی شعر کس طرح کہا تھا اور کیا کہا تھا اس کی بھی پوری سند بیان ہوئی ہے۔ ایک شاعر اور ادیب تھے المفضل الضبی، انہوں نے عربی شاعری کے بہت سے قصائد جمع کئے اور اپنی زندگی کے سالہاسال اس میں لگائے کہ عرب قبائل میں پھر پھر کے لوگوں سے پرانے اشعار سنے، اور جمع کئے اور پھر پوری سند کے ساتھ بیان کئے کہ انہوں نے کس سے سنا، جس سے سنا اس نے کس سے سنا؟ حالانکہ شعر و ادب میں اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ اگر آپ سے کوئی کہے کہ موجودہ دیوان غالب کی سند کیا ہے تو پوچھنے والا بھی اس سوال کو مضحکہ خیز سمجھے گا اور جس سے پوچھا جائے گا وہ بھی اس کو فضول بات سمجھے گا، حالانکہ مرزا غالب اتنے پرانے نہیں ہیں۔ ڈیڑھ سو سال پہلے کے ہیں۔ لیکن ان کے دیوان کی کوئی سند ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ ہمیں کوئی پتہ نہیں کہ مرزا غالب کے نام سے جو دیوان مشہور ہے یہ واقعی پورا کا پورا انہی کا دیوان ہے کہ نہیں۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخئ تحریر کا
کاغذی ہے پیراہن ہر پیکر تصویر کا

واقعی انہوں نے ہی کہا تھا یا کسی اور نے کہا تھا۔ اس کا بہر حال عقلی طور پر بڑا امکان موجود ہے کہ کسی نے غلط چھاپ دیا ہو اور یہ مطلع مرزا صاحب سے غلط طور پر منسوب کر دیا ہو۔ اب کوئی ایک ایسا آدمی موجود نہیں ہے جو چشم دید گواہی دے کہ مرزا غالب نے میرے سامنے یہ غزل کہی تھی اور پھر انہوں نے آگے بیان کی ہو، پھر کسی اور نے بیان کی ہو۔ یہ چیز مسلمانوں کے علاوہ کسی اور قوم کے پاس موجود نہیں ہے۔

یہ صرف علم حدیث کی دین ہے کہ علم حدیث نے مسلمانوں میں ایک ایسا ذوق پیدا کر دیا کہ انہوں نے نہ صرف دینی علوم بلکہ شعر، ادب، بلاغت اور صرف ونحو کی، ایک ایک واقعہ کی، ایک ایک قاعدہ کلیہ کی، ایک ایک شعر کی، ایک ایک ضرب المثل کی سند کے ساتھ حفاظت کی اور وہ کتابیں آج ہمارے پاس موجود ہیں۔ پڑھنے والوں کو بعض اوقات الجھن بھی ہوتی ہے کہ ادب کی کتاب میں تو روانی تب آتی ہے جب مسلسل عبارت ہو۔ ادب کی کتاب میں درمیان میں سندیں آرہی ہوں تو پڑھنے والوں کو الجھن ہوتی ہے۔ لیکن اس مواد کی تاریخی حیثیت اور اس کے

استناد اور authenticity کو محفوظ رکھنے کے لئے سند کا التزام وہاں بھی کیا گیا۔

جیسا کہ آپ میں سے ہر ایک کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ وقت گزرنے کے ساتھ سند لمبی بھی ہوتی گئی۔ رسول اللہ ﷺ سے زمانہ جتنا دور ہوگا سند اتنی ہی لمبی ہوگی۔ سب سے مختصر سندیں موطا امام مالکؒ میں ہیں جو اکثر و بیشتر دو ناموں پر مشتمل ہیں۔ امام مالکؒ، ان کے استاد اور ایک صحابیؓ۔ مثلاً مالک عن نافع عن ابن عمرؓ، حضرت نافع اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ دو آدمی ہیں۔ کہیں کہیں موطا امام مالکؒ میں تین راوی بھی آتے ہیں لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اسی طرح سے جیسے جیسے زمانہ بڑھتا گیا راویوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ سب سے لمبی سند امام بیہقیؒ کی ہے جو آخری محدث ہیں۔ ۴۵۸ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے۔ اس لئے ان کی سند لمبی ہوتی ہے۔ کبھی سات نام ہوتے ہیں، کبھی آٹھ ہوتے ہیں اور کبھی کبھی نو ہوتے ہیں۔

راویوں کے طبقات

جب یہ سلسلہ آگے بڑھا، تو جو علماء رجال تھے اور جنہوں نے روایوں کے حالات پر کتابیں لکھیں تھیں، انہوں نے راویوں کے طبقات مقرر کئے اور بتایا کہ روایوں کے طبقات کونسے ہیں۔ تاکہ ہر طبقہ کے حالات الگ الگ بیان کئے جا سکیں اور یہ پتہ چل سکے کہ کونسا طبقہ کس طبقہ کے اساتذہ میں شمار ہوتا ہے۔ اب مثلاً اگر کسی غیر محدث سے، جو حدیث کا طالب علم نہ ہو، یہ کہا جائے کہ امام بیہقیؒ نے امام مالکؒ سے روایت کی ہے اور وہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ یہ میں فرضی بات کر رہا ہوں، مثلاً اگر کوئی ایسی سند سے کوئی بات بیان کرے تو غیر محدث یا ایسا آدمی جو حدیث کا طالب علم نہ ہو، اس کو پتہ نہیں چلے گا کہ امام بیہقیؒ اور امام مالکؒ کے درمیان بڑا طویل زمانہ گزرا ہے، ان دونوں کے درمیان کم و بیش پانچ چھ واسطے ہوں گے۔ امام بیہقیؒ امام مالکؒ سے براہ راست روایت کر ہی نہیں سکتے۔ امام مالکؒ تو تبع تابعینؒ میں شامل ہیں اس لئے وہ براہ راست رسول اللہ ﷺ سے روایت ہی نہیں کر سکتے۔ صحابہ سے بھی روایت نہیں کر سکتے۔

اب جو شخص علم حدیث کو جانتا ہے وہ سمجھ لے گا کہ یہ روایت کمزور ہے۔ جو علم حدیث کو نہیں جانتا اس کو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کو نہ امام بیہقیؒ کے سن وفات کا پتہ ہے، نہ امام مالکؒ کے سن وفات کا پتہ ہے، نہ صحابہ کرامؓ کے دور کا پتہ ہے۔ اس لئے

سہولت کی خاطر طبقات مقرر کر دیئے گئے کہ صحابہ کرام کا ایک طبقہ ہے جس سے اس بات کا واضح طور پر اندازہ ہو جائے گا کہ صحابہ کرام کس دور سے کس دور تک رہے۔ آخری صحابیؓ بھی حضرت محمود بن لبید جو میرے ہم نام تھے، ان کی وفات ۱۱۰ھ میں ہوئی ہے۔ وہ آخری صحابیؓ ہیں۔ وہ حضور ﷺ کے انتقال سے چند ماہ پہلے خدمت اقدس میں لائے گئے، ان کی عمر چار پانچ سال تھی۔ وہ صرف ایک واقعہ بیان کرتے ہیں اس کے علاوہ کوئی روایت ان سے نہیں ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں بچہ تھا، میرے والد یا دادا مجھے حضورؐ کی خدمت میں لائے، رسول اللہ ﷺ نے مجھے گود میں بٹھایا اور پانی لے کر خود پیا اور پھر مجھے پلایا اور کھجور تھوڑی سی کھا کر پھر مجھے کھلائی اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر مجھے دعا دی۔ بس، اس کے علاوہ اور کوئی روایت ان سے منقول نہیں ہے۔ یہ آخری صحابہؓ میں سے ہیں جن کے بعد صحابہ کرام دنیا سے رخصت ہو گئے، پھر کوئی ایسا آدمی روئے زمین پر باقی نہیں رہا جس نے رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی ہو۔

اب یہ بات کہ صحابہ کرام کا دور کب تک ہے اور بڑے صحابہ کا زمانہ کب تک ہے، درمیانی عمر کے صحابہ کا زمانہ کب تک ہے، صغار صحابہ کا زمانہ کب تک ہے۔ یہ تمام باتیں جاننا ضروری ہے۔ صغار صحابہ سے مراد وہ صحابہ ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد بچے تھے اور ان کا شمار بچوں میں ہوتا تھا۔ پھر یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ جب انہوں نے پہلی بار حضورؐ کی زیارت کی تو وہ کس عمر میں تھے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو آخری بار کس عمر میں دیکھا، یہ جاننا اس لئے ضروری ہے کہ اگر کوئی شخص، مثال کے طور پر، محمود بن لبیدؓ سے کوئی حدیث بیان کرے، اور یہ دعویٰ کرے کہ ان کا نام صحابہ میں شامل ہے اور الاستیعاب فی معرفت الاصحاب میں لکھا ہوا ہے کہ یہ صحابیؓ تھے، اب اس بنیاد پر ان سے کوئی لمبی چوڑی حدیث روایت کر دے، تو جو آدمی طبقات صحابہ کے علم کو نہیں جانتا وہ دھوکے میں پڑ سکتا ہے کہ واقعی محمود بن لبید صحابیؓ تھے اور ان سے یہ بات منسوب ہے۔ لیکن جو جانتا ہے وہ کہے گا کہ جتنی بھی روایات ان سے منسوب ہیں وہ غلط منسوب ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو پانچ چھ سال کی عمر میں دیکھا تھا یا شاید اس سے بھی کم عمر میں۔ اور اس واقعہ کے علاوہ کوئی روایت ان سے مروی نہیں ہے۔ اس بات کو جاننے کے لئے صحابہ کے طبقات کو جاننا ضروری ہے۔ اس لئے پہلا طبقہ صحابہ کرام کا ہے جس پر الگ بہت سی چھوٹی بڑی سے کتابیں موجود ہیں۔

کبار تابعین کا زمانہ

طبقہ صحابہ کے بعد کبار تابعین کا طبقہ ہے۔ کبار تابعین وہ ہیں کہ جو صحابہ کرام کے ابتدائی دور میں، یعنی سیدنا صدیق اکبرؓ یا سیدنا عمر بن الخطابؓ کے دور میں ہوش وحواس کی حالت میں تھے، صحابہ کا زمانہ انہوں نے طویل عرصہ تک دیکھا، بڑے بڑے صحابہ کرام کی تربیت اور تعلیم میں رہے اور انہوں نے بڑے پیمانے پر صحابہ کرامؓ سے احادیث کو سیکھا۔ جیسے حضرت سعید بن المسیبؒ، جن کو کم وبیش پینتیس چالیس سال تک صحابہ کرام کا زمانہ دیکھنے کا موقع ملا اور صحابیؓ جلیل حضرت ابو ہریرہؓ کے ساتھ انہوں نے پچیس تیس سال گزارے۔ دن رات ان کے ساتھ رہے۔ یہ طبقہ کبار تابعین کا ہے جن کا زمانہ پینسٹھ یا ستر ہجری میں ختم ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد متوسط تابعین کا زمانہ آتا ہے۔ وہ تابعین جنہوں نے کبار صحابہ کو نہیں دیکھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنی، حضرت علیؓ کو اور حضرت ابوعبید بن الجراحؓ کو نہیں دیکھا لیکن متوسط صحابہ کرام کو دیکھا۔ ان کا زمانہ سن نوّے یا سو ہجری کے لگ بھگ آتا ہے اس کے بعد ان کا زمانہ بھی ختم ہو گیا۔ تابعین کے اس طبقہ میں حضرت حسن بصری، محمد بن سیرین وغیرہ شامل ہیں۔

اس کے بعد زمانہ آتا ہے صغار تابعین کا، جنہوں نے صغار صحابہ کو دیکھا۔ صغار صحابہ سے مراد وہ صحابہ ہیں جو حضور ﷺ کے زمانے میں بچے تھے۔ بعد میں ان کی عمر طویل ہوئی، سن اسّی میں، نوے میں پچانوے ہجری میں انتقال ہوا۔ ان صحابہ میں حضرت عبداللہ بن اوفی، حضرت انس، حضرت زید بن ثابت، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عمر بن العاص شامل ہیں، یہ وہ صحابہ ہیں جو طویل عرصہ تک زندہ رہے، صغار تابعین نے ان صغار صحابہ کو دیکھا یا ان سے روایت کی۔

صغار تابعین میں وہ لوگ شامل ہیں جنہوں نے صحابہ کرامؓ سے روایت نہیں کی ہے لیکن انہیں دیکھا ہے۔ اتنے بچے تھے کہ انہوں نے صحابہ کرامؓ کو دیکھنے کی سعادت تو حاصل کی لیکن کم سنی کی وجہ سے صحابہ کرام کی کوئی بات ان کو یاد نہیں اور وہ روایت نہیں کر سکے۔ مثلاً امام اعمش، بڑے مشہور محدث ہیں۔ بڑے بڑے محدثین نے ان کی روایات اپنی کتب میں نقل کی ہیں۔ انہوں نے اپنے بچپن میں حج کے موقع پر بعض صحابہ کو دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ روایت ان سے ثابت نہیں

ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا شمار بھی، بہ اختلاف روایات، صغار تابعین کی اس دوسری کیٹیگری میں ہوتا ہے، بعض لوگوں کی تحقیق کے مطابق امام ابوحنیفہ کا شمار صغار تابعین کی اس کیٹیگری میں ہے۔ جنہوں نے کچھ صحابہ سے روایت بھی کی ہے۔ انہوں نے بعض اصحاب رسولؐ کو دیکھا ضرور ہے۔ وہ اپنے لڑکپن میں اپنے والد کے ساتھ حج کے لئے گئے۔ خود بیان کرتے ہیں کہ میری عمر بارہ تیرہ سال تھی۔ مکہ مکرمہ میں ایک جگہ دیکھا کہ بڑا ہجوم لگا ہوا ہے اور لوگ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش میں ہیں۔ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ یہ کیا ہورہا ہے؟ انہوں نے کہا کہ صحابی جلیلؓ حضرت انس بن مالک حج کے لئے تشریف لائے ہیں، لوگ ان کو دیکھنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ میں اپنے والد سے انگلی چھڑا کر ہجوم میں گھسا اور دیکھا کہ حضرت انس کھڑے تھے اور لوگ ان سے سوالات کررہے تھے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ انہوں نے بھی کوئی سوال پوچھا، بعض روایات میں آتا ہے کہ انہوں نے کچھ نہیں پوچھا، بعض روایات میں آتا ہے کہ انہوں نے کوئی بات سنی اور آگے نقل کی، بعض روایات میں آتا ہے کہ سنی تو تھی لیکن یاد نہیں رہی۔ لیکن دیکھنا ثابت ہے۔ بہرحال یہ وہ صغار تابعین ہیں جو تابعین کے سب سے چھوٹے طبقہ میں آتے ہیں۔

اس کے بعد اتباع تابعین میں یعنی تبع تابعینؒ میں سب سے بڑا طبقہ ہے ان اتباع تابعین کا جنہوں نے بڑے تابعین کو دیکھا۔ پھر اسی طرح سے تبع تابعینؒ کا طبقہ وسطیٰ یعنی درمیانی طبقہ۔ پھر تبع تابعینؒ کا سب سے چھوٹا طبقہ، جنہوں نے چھوٹے تابعین کو دیکھا مثلاً امام شافعیؒ۔ اس کے بعد وہ طبقہ جس نے تبع تابعینؒ کو دیکھا اور ان سے روایت لی۔ پھر وہ طبقہ جس نے متوسطین تبع تابعینؒ کو دیکھا اور اخیر میں جس نے آخری عمر میں، جب تبع تابعینؒ تھوڑے رہ گئے، ان کو دیکھا۔ یہ رواۃ کے بارہ طبقات ہیں۔

طبقات رواۃ کی افادیت

بظاہر کسی حدیث کے سلسلہ میں ان طبقات کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ لیکن اس سے اس بات میں مدد مل جاتی ہے کہ کسی راوی کے طبقہ کا تعین کیا جاسکے کہ اس کا تعلق کس طبقہ سے ہے۔ جب طبقہ کا تعین ہوجائے گا تو زمانے کا تعین آسان ہوجائے گا۔ جب زمانہ کا تعین آسان

ہوگا تو پھر یہ بات طے کرنا آسان ہوجائے گا کہ ان تابعی یا ان راوی نے جس طبقہ کے راوی سے روایت کی ہے وہ روایت ممکن بھی ہے یا نہیں ہے۔ مثال کے طور پر تبع تابعین کے چھوٹے طبقہ کا کوئی آدمی تابعین کے بڑے طبقہ سے روایت کرے تو یہ ممکن نہیں ہے۔ اس لئے فوری طور پر آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ اس روایت میں کہیں کوئی جھول ہے۔ مثال کے طور پر امام بخاری امام زہری سے روایت کریں، تو یہ روایت درست نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ امام بخاری نے امام زہری کا زمانہ نہیں پایا۔ امام زہری کی وفات غالباً ۱۲۴ھ میں ہوئی جبکہ امام بخاری کی ولادت ہی ۱۹۴ھ میں ہوئی ہے۔ اب ۱۹۴ھ کی ولادت اور ۱۲۴ھ کی وفات میں تو ستر اسی سال کا فرق ہے۔ اس لئے ان چیزوں سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ روایت میں کوئی جھول ہے اور فوراً اس کا تعین ہوجاتا ہے۔

یہ طبقے تو تھے راویوں کے، جس سے گویا زمانی اعتبار سے تعین کیا جاسکتا ہے کہ کس خاص طبقہ کے راوی نے کس زمانے میں وقت گزارا ہوگا اور کس زمانے میں وہ زندہ ہوں گے۔ اس کے بعد بارہ طبقات یعنی درجات راویوں کے آتے ہیں۔ ان میں ایک تو طبقات یعنی Classes ہیں، یا جیسا میں نے اردو میں کہا پیڑھی، ایک پیڑھی، پھر دوسری پیڑھی، زمانے کے اعتبار سے۔ ایک درجہ ہے درجہ مستند یا غیر مستند ہونے کے اعتبار سے۔ کچھ راوی ہیں جو بڑے اونچے درجے کے ہیں جن کا نام سنتے ہی ہر شخص گردن جھکا دے گا کہ یہ انتہائی اونچے درجے کے روای ہیں۔ عبداللہ بن مبارک کا میں کئی بار نام لے چکا ہوں، ان کا جب نام آئے گا تو کسی تحقیق کی ضرورت نہیں کہ کس درجہ کے راوی ہیں۔ امام بخاری، امام ترمذی، امام احمد بن حنبل کا نام آئے گا تو ہر شخص بلا تامل اس کی روایت کو قبول کرے گا۔ لیکن اس درجہ کے راویوں کا تعین کیسے ہوگا؟ اس کام کے لئے علم جرح وتعدیل کے قواعد مقرر کئے گئے۔

اس ضمن میں سب سے پہلا اصول تو یہ ہے کہ صحابہ کرام سب کے سب عدول ہیں۔ الصحابة کلهم عدول'، وہ سب ایک درجہ میں ہیں۔ یہ تحقیق تو ہوسکتی ہے کہ فلاں صاحب صحابیؓ ہیں کہ نہیں ہیں۔ لیکن یہ تحقیق ہونے کے بعد کہ وہ صحابیؓ تھے، پھر مزید تحقیق نہیں ہوگی کہ وہ عادل تھے کہ نہیں، اس لئے کہ صحابہ کے بارے میں یہ بات متفق علیہ ہے کہ وہ سب کے سب عادل تھے۔ صحابہ کرام میں بھی یقیناً درجات ہیں اور اس سے کوئی مسلمان انکار نہیں کرتا۔ مثلاً جو درجہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ہے وہ اور صحابہ کا نہیں ہے، جو درجہ حضرت عمر فاروقؓ کا تھا وہ بقیہ صحابہ

کا نہیں ہے۔ جو درجہ عشرہ مبشرہ کا تھا وہ دوسرے صحابہ کا نہیں ہے۔ لیکن علم حدیث کی روایت کی حد تک سب کا درجہ برابر مانا جاتا ہے۔

صحابہ کرامؓ کے بعد بقیہ راویوں کا جو سب سے اونچا درجہ ہے، وہ ان لوگوں کا درجہ ہے جن کے لئے اصطلاح استعمال کی جاتی ہے یا تو الحجہ، یا الثقہ، یا اتفقوا علی جلالتہ قدرہ وشانہ، رجال کی اکثر کتابوں میں آتا ہے، مثلاً یحییٰ بن معین اوران کے درجہ کے لوگوں کے بارہ میں ملے گا اتفقوا علیٰ جلالتہ قدرہ وشانہ، کہ تمام محدثین ان کے مرتبہ کی بلندی پراوران کی اعلیٰ شان پر متفق ہیں۔ گویا یہ سب سے اونچے درجہ کے راوی ہیں۔ اگر میں الفاظ کی مثالیں دینے پر آؤں گا تو بات بہت لمبی ہو جائے گی اس لئے اس کو یہیں پر چھوڑ دیتا ہوں۔ ہر درجہ کے لئے الگ الفاظ ہیں جو راوی کا درجہ بیان کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں اور جن سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ راوی کا کیا درجہ ہے۔ میں صرف دو تین درجات کے حوالے دوں گا باقی میں چھوڑ دیتا ہوں۔

اس کے بعد تیسرا درجہ ان راویوں کا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ثقہ متقن۔ یعنی یہ ثقہ اور قابل اعتماد راوی ہیں۔ اس بعد چوتھا درجہ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ لا بأس به، کوئی حرج نہیں ہے۔ یعنی جیسے انگریزی میں not bad کہیں گے۔ گویا اب کمزوری شروع ہوگئی۔ کمزور تو نہیں ہیں لیکن کمزوری سے اوپر جو درجات ہیں ان میں سے یہ آخری درجہ ہے۔ اس کے بعد جو درجہ آتا ہے وہ ہے صدوق، ہاں سچی بات کہا کرتے تھے، بات صحیح کہا کرتے تھے۔ یعنی گویا ان کی سچائی کے بارے میں تو گواہی ہے لیکن یادداشت اور حافظہ کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا۔ اس کے بعد اگلا درجہ ہے کہ صدوق سئ الحفظ، یعنی نیت کے اعتبار سے خود تو سچے تھے لیکن حافظہ برا تھا۔ اس طرح سے ایک ایک کر کے بارہ درجات ہیں جن میں سے آخری چار درجے کمزور اور ضعیف راویوں کے ہیں۔ آخری درجہ اس جھوٹے راوی کا ہے جو جھوٹی احادیث وضع کرتا تھا، جس کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ یہ جھوٹا راوی تھا۔ ان لوگوں کے الگ سے تذکرے موجود ہیں۔

یہ جو بارہ درجات یا بارہ طبقات ہیں یہ تقریباً تمام علماء رجال کے متفق علیہ ہیں۔ یہ تفصیل جو میں نے بیان کی ہے یہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب 'تقریب التھذیب' میں دی ہے۔ تقریب التھذیب بہت اہم لیکن انتہائی مختصر کتاب ہے جو ایک جلد میں بھی چھپی ہے، دو

جلدوں میں بھی چھپی ہے اور تین جلدوں میں بھی چھپی ہے۔ میرے پاس لاہور کا چھپا ہوا ایک جلد کا نسخہ ہے، اس میں ایک جلد میں انہوں نے تمام کتب رجال کا گویا ملخص دے دیا ہے۔ جس سے آپ کو ایک سرسری اندازہ ہو جائے گا کہ کسی راوی کی حیثیت کیا ہے۔ لیکن رجال پر مواد کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے کہ اگر اس کو جمع کیا جائے تو پوری لائبریری اس سے تیار ہو سکتی ہے۔ درجنوں جلدوں میں، بیس بیس اور پچیس پچیس جلدوں میں رجال پر کتابیں لکھی گئیں۔ یہ کتابیں دوسری صدی ہجری سے لکھی جانی شروع ہو گئیں۔ اور تقریباً آٹھویں نویں صدی ہجری تک لکھی گئیں اور اس کے بعد بھی لوگوں نے ان کو مرتب کیا۔ یہ کتابیں مختلف انداز اور مختلف سطحوں کی ہیں۔ ان میں سے بعض مصنفین وہ ہیں کہ جو بڑے متشدد تھے اور جن کا معیار بہت اونچا تھا جیسے امام بخاری اور امام مسلم کا معیار بہت کڑا تھا۔ انہوں نے جب رجال پر کتاب لکھی تو بہت اونچے معیار کے ساتھ لوگوں کو جانچا۔ ماہرین علم رجال میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ جنہوں نے بڑی نرمی سے کام لیا اور ان کا تساہل مشہور ہے۔ انہوں نے بعض کمزور راویوں کو بھی صحیح قرار دے دیا۔ اور ان میں کچھ لوگ تھے جو معتدل تھے اور ابھی ہم ان سب کا تذکرہ اختصار کے ساتھ کریں گے۔

علم رجال کی شاخیں

رجال پر شروع میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ مختلف علاقوں پر الگ الگ کتابیں تھیں۔ مثلاً سمرقند کے راویوں پر، دمشق کے راویوں پر، کوفہ کے راویوں پر یا کسی خاص قبیلہ کے راویوں پر۔ جیسے جیسے یہ مواد جمع ہوتا گیا زیادہ جامع اور زیادہ مکمل کتابیں سامنے آتی گئیں۔ جن لوگوں نے زیادہ مکمل کام کیا ان میں دو نام بڑے نمایاں ہیں؛ ایک نام حافظ ابن حجر عسقلانی کا ہے اور دوسرا نام امام ذہبی کا ہے۔ امام ذہبی کی چار کتابیں ہیں؛ تذکرۃ الحفاظ، طبقات الحفاظ، میزان الاعتدال فی نقد الرجال اور المجتبیٰ فی اسماء الرجال۔ یہ چاروں کتابیں عام ملتی ہیں اور ان میں سے ہر کتاب کا الگ الگ مقصد ہے اور ہر کتاب کے قاری اور مستفیدین الگ الگ ہیں۔ مختلف لوگوں کی ضروریات کے لحاظ سے انہوں نے یہ چار کتابیں تیار کیں۔

امام نووی، اپنے زمانے کے مشہور محدثین میں سے تھے، صحیح مسلم کے شارح ہیں، ان کی کتاب ریاض الصالحین کا نام آپ نے سنا ہوگا، پڑھی بھی ہوگی، ان کی اربعین نووی بھی

مشہور ہے اور سب سے زیادہ مقبول اربعین وہی ہے، انہوں نے علم رجال پر دو کتابیں لکھیں۔ تهذيب الاسماء اور المبهمات من رجال الحديث۔

رجال میں پھر مزید ذیلی فنون پیدا ہوئے، جن کا ابھی تذکرہ ہوگا۔ حافظ ابن حجر نے کم وبیش نصف درجن کتابیں لکھیں۔ جن کے الگ الگ مقاصد تھے۔ کچھ بطور جامع کتابوں کے، کچھ سابقہ کتب پر استدراکات کے اور کچھ اپنی کتابوں کی تلخیص اور انڈیکس یا ڈائجسٹ کے طور پر۔ آج کل جو کتابیں مروج ہیں وہ حافظ ابن حجر عسقلانی اور امام ذہبی کی کتابیں ہیں۔ اس لئے کہ ان کتابوں کی ترتیب، ان کی خوبصورتی اور جامعیت، ان کے مواد کے بھرپور ہونے نے بقیہ کتابوں سے لوگوں کو مستغنی کر دیا۔ اگرچہ امام بخاری نے جو کتابیں لکھیں وہ آج موجود ہیں، امام ابو حاتم رازی کی کتابیں موجود ہیں، امام ابوزرعہ رازی کی کتابیں موجود ہیں، لیکن چونکہ وہ سارا مواد حافظ ابن حجر اور علامہ ذہبی کے ہاں آ گیا ہے، اس لئے اب لوگوں کو براہ راست امام بخاری اور دوسرے متقدمین کی کتابیں دیکھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اگرچہ وہ دستیاب ہیں۔ تحقیق کرنے والے تحقیق کی ضرورت پڑنے پر ان سے رجوع کرتے ہیں۔

آج کل ایک اچھا کام یہ ہو رہا ہے، جس کی تفصیل آخری خطبہ میں آ رہی ہے، کہ رجال کا یہ سارا مواد کمپیوٹرائز ہونا شروع ہو گیا۔ یہ اتنا بڑا کام ہے کہ چھ لاکھ آدمیوں کے حالات اگر کمپیوٹرائز ہو جائیں اور اس طرح کمپیوٹرائز ہوں کہ اس کا ایک سافٹ ویئر ایسا بن جائے کہ آپ حسب ضرورت آسانی کے ساتھ مدد حاصل کر سکیں، تو یہ کام بہت آسان ہو جائے گا۔ لیکن یہ اتنا لمبا کام ہے اور اتنا مشکل کام ہے کہ جو شخص اس سافٹ ویر کو بنائے گا وہ ایک تو اتنا بڑا محدث ہو کہ کم از کم پانچ دس سال اس نے علم رجال کے مطالعہ میں لگائے ہوں۔ پھر کمپیوٹر کا اتنا بڑا ماہر ہو کہ ایک سافٹ ویئر بنا سکتا ہو۔ اگر دونوں پہلوؤں میں سے ایک پہلو میں بھی مہارت کی کمی ہوگی تو وہ مطلوبہ سافٹ ویر نہیں بنا سکے گا، اسی لئے اس میں دیر لگ رہی ہے۔ جو حدیث کے ماہرین ہیں وہ کہتے ہیں کمپیوٹر فضول چیز ہے اس میں کیوں وقت ضائع کریں۔ جو کمپیوٹر کے ماہرین ہیں ان کے پاس اتنا وقت نہیں کہ دس بیس سال حدیث کے مطالعہ میں لگائیں۔ اس لئے ایک دو دن میں یہ آنے کی چیز نہیں۔ اس پر تو سو پچاس افراد مل کر وقت لگائیں گے تب یہ چیز آئے گی۔ اس لئے مشکل پیدا ہو رہی ہے۔

رجال کی ان کتابوں کے ساتھ ساتھ، جن کی تعداد سینکڑوں میں ہے، جن میں کم وبیش ایک درجن کتابوں کا میں نے آپ کے سامنے ذکر کیا، ان کے ساتھ ساتھ کچھ کتابیں اور بھی ہیں جو براہ راست رجال، یعنی رجال حدیث پر تو نہیں ہیں، لیکن حدیث سے ملتے جلتے موضوعات پر ہیں۔ حدیث کا جو فیڈنگ میٹیریل (Feeding material) ہے، یعنی جس سے علم حدیث میں مدد ملتی ہے یا اس کو علم حدیث سے مدد ملتی ہے، اس سے متعلق بھی کچھ کتابیں ہیں، مثال کے طور پر طبقات المفسرین کے نام سے کتابیں ہیں۔ مختلف ادوار میں کون کونسے مفسرین رہے۔ کس کس نے تفسیر پر کتابیں لکھیں۔ اس مواد سے بھی علم رجال میں مدد ملتی ہے۔ اس لئے کہ بہت سے مفسرین وہ ہیں جو محدثین بھی ہیں، مثلاً امام ابن جریر طبری جنہوں نے تفسیر پر بھی کتاب لکھی اور وہ بیک وقت حدیث کے عالم بھی ہیں اور حدیث کی روایات بھی بیان کرتے ہیں۔ یہ جو تفسیری روایات ہیں یہ علم حدیث میں بھی آتی ہیں۔ اس لئے طبقات مفسرین میں جو تذکرے ملیں گے ان میں بہت سے لوگ علم حدیث میں بھی relevant ہوں گے۔ طبقات القراء، قرآن پاک کے قراء کے طبقات ہیں۔ قراء جو روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فلاں لفظ کو اِس طرح پڑھا، یا اُس طرح پڑھا، یہ بھی علم حدیث کا حصہ ہے۔ تجوید اور قرات سے متعلق بہت سی روایات علم حدیث میں شامل ہیں۔ اس طرح طبقات قراء میں بہت سے لوگ علم حدیث سے متعلق ہوں گے۔ اسی طرح سے طبقات صوفیا ہے، مثال کے طور پر تابعین میں بہت سے لوگوں کا بطور صوفیا کے ذکر ہوتا ہے۔ طبقات صوفیا کی ہر کتاب میں بعض صحابہ کا ذکر ملے گا مثلاً حضرت ابوذر غفاریؓ کا ذکر ہوگا، حضرت علیؓ کا ذکر ہوگا جو ترک دنیا میں ذرا نمایاں تھے۔ اب ظاہر ہے تابعین کا ذکر آئے گا جن میں سے بعض نے احادیث بھی بیان کی ہیں۔ حضرت حسن بصری کا ذکر ہر تذکرہ صوفیا میں آئے گا، وہ بیک وقت محدث بھی تھے اور صوفی بھی۔ اس لئے طبقات کی ان کتابوں میں جن میں طبقات قراء، طبقات مفسرین، طبقات صوفیا، طبقات اُدَبا، طبقات حکما سب شامل ہیں، یہ بھی علم رجال کو جزوی طور پر مواد فراہم کرتے ہیں۔

پھر ان کے ساتھ فقہائے اسلام کے الگ الگ طبقات ہیں۔ طبقات حنفیہ، طبقات مالکیہ، طبقات شافعیہ۔ اب طبقات مالکیہ میں امام مالکؒ کا ذکر ہوگا تو امام مالکؒ کے ذکر کے بغیر کونسا علم رجال مکمل ہوگا۔ ان کا ذکر طبقات مالکیہ میں بھی ہے، اور علم حدیث کی ہر کتاب میں ان کا

ذکر ہوگا۔علم حدیث کی کوئی کتاب امام مالکؒ کے تذکرہ سے خالی نہیں ہوسکتی۔امام اوزاعی کا ذکر فقہ کی ہر کتاب میں ہوگا۔لیکن علم حدیث میں بھی ان کا ذکر ہوگا۔اس لئے طبقات اور علم رجال کی کتابوں میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔

علم رجال کی کتابوں کی ایک اور صنف ہے جس کو مشیخہ کہتے ہیں۔اس سے مراد وہ کتابیں ہیں جن میں کسی ایک محدث نے اپنے شیوخ کا تذکرہ لکھا ہو۔اُس زمانے میں لوگ ایک یا دو یا تین یا دس آدمیوں سے علم حدیث حاصل نہیں کرتے تھے بلکہ ایک ایک آدمی سینکڑوں محدثین کے پاس علم حدیث حاصل کرنے کے لئے جاتا تھا۔کیوں؟ اس کا ذکر میں آگے کروں گا۔اب ایک شخص نے اگر سو آدمیوں سے حدیث سیکھی ہے تو ان سو کا تذکرہ اس نے مرتب کرلیا۔اس تذکرہ کو مشیخہ کہتے تھے۔اس طرح کے مشیخے بڑی تعداد میں ہیں۔امام سخاوی جن کا تعلق دسویں صدی ہجری سے تھا اور اپنے زمانے کے بڑے محدث تھے،انہوں نے لکھا کہ میں نے مشیخہ پر جو کتابیں دیکھی ہیں وہ ایک ہزار سے زیادہ ہیں جو مختلف محدثین نے اپنے اپنے شیوخ کے بارے میں لکھیں۔یہ ساری کی ساری کتابیں فن رجال کا جز ہیں۔پھر جیسے جیسے فن رجال پھیلتا گیا اس کی شاخیں بنتی گئیں۔

اس کے علاوہ فن رجال کی کئی شاخیں تھیں،مثلاً آپ کو معلوم ہے کہ عربی زبان میں لوگوں کا نام الگ ہوتا ہے، لقب الگ ہوتا ہے اور کنیت الگ ہوتی ہے،مثلاً امام بخاری کو بخاری کے لقب سے تو ہم سب جانتے ہیں،لیکن بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ ان کا نام محمد بن اسماعیل تھا۔اگر آپ کسی کتاب میں یہ لکھا ہوا دیکھیں کہ قال محمد بن اسماعیل ،تو شاید بہت کم لوگوں کو یہ پتہ چلے کہ اس سے مراد امام بخاری ہیں۔اسی طرح سے کچھ لوگ اپنی کنیت سے مشہور ہوتے تھے۔مثلاً اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ حضرت عبداللہ بن عثمان نے یہ فرمایا،تو شاید آپ میں سے بہت سے لوگوں کو یہ پتہ نہ چلے کہ میری مراد کیا ہے،عبداللہ بن عثمان حضرت ابوبکر صدیقؓ کا نام تھا۔حضرت ابوبکر صدیقؓ کا نام عبداللہ اور ان کے والد ابوقحافہ کا نام عثمان تھا۔لیکن دونوں اپنی اپنی کنیت سے اتنے مشہور ہوئے کہ اصل نام بہت کم لوگوں کو معلوم ہوسکا۔اس لئے راویوں میں یہ مسئلہ بہت پیدا ہوتا ہے کہ ایک راوی نے ایک جگہ جب حدیث بیان کی تو ایک شاگرد نے اس کو کنیت سے لکھ دیا۔مثلاً حدثنی البخاری، دوسرے نے لکھ دیا کہ حدثنی محمد، تیسرے نے لکھ دیا حدثنی

محمد بن اسماعیل، چوتھے نے لکھ دیا کہ حدثنی ابوعبداللہ۔ اب یہ سب ایک شخصیت کے حوالے ہیں، لیکن جو شخص نہیں جانتا کہ امام بخاری کی کنیت ابوعبداللہ تھی، لیکن وہ مشہور تھے بخاری کے لقب سے، نام ان کا محمد تھا، والد کا نام اسماعیل تھا اس لئے محمد بن اسماعیل بھی کہلاتے تھے، وہ زبردست التباس اور الجھن کا شکار ہوگا۔ لہٰذا کوئی ایسی کتاب ہونی چاہئے جس کی مدد سے یہ پتہ چل جائے کہ کس کی کنیت کیا ہے۔ یہ فن 'موضح' کہلایا۔ موضح الرجال یعنی رجال کی وضاحت کرنے والا، جس میں ان لوگوں کا تذکرہ جمع کیا گیا جن کا نام کچھ اور ہو لیکن وہ اپنی کنیت سے مشہور ہوں۔ یا نام سے مشہور ہوں کنیت کچھ اور ہو۔ تو کہیں کنیت اور نام میں فرق کی وجہ سے التباس نہ ہو۔ اس پر بہت سی کتابیں ہیں۔

اسی طرح سے ایک خاص صنف یا میدان ہے جس کو 'المؤتلف والمختلف' کہتے ہیں۔ المؤتلف والمختلف پر کم از کم ایک درجن کتابیں موجود ہیں۔ یعنی ملتے جلتے ناموں کی تحقیق۔ بعض نام ملتے جلتے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے التباس پیدا ہوسکتا ہے۔ یہاں اتنی خواتین بیٹھی ہوئی ہیں۔ اگر پتہ کریں تو آپ میں سے کم وبیش ایک درجن نام مشترک نکلیں گے۔ ثریا ایک کا نام بھی ہے، دوسری کا بھی نام ہے، تیسری کا بھی نام ہے۔ محدثین اور رواویوں بھی میں اشتراک اسم ہوسکتا تھا اور ہوتا تھا۔ اب یہ بات کہ اگر ایک دور میں ایک سے زیادہ محمد بن اسماعیل ہیں تو کون سے محمد بن اسماعیل مراد ہیں۔ خود صحابہ کرام میں عبداللہ نام کے کم وبیش ایک درجن صحابہ ہیں۔ ان میں سے جو چار مشہور عبداللہ ہیں وہ 'عبادلہ اربعہ' کہلاتے ہیں۔ ان عبادلہ اربعہ میں راوی بیان کرتا ہے حدثنی عبداللہ، مجھ سے عبداللہ نے بیان کیا۔ اب کون سے عبداللہ نے بیان کیا؟ یہ اس وقت تک پتہ نہیں چل سکتا جب تک ان میں سے ہر عبداللہ کے شاگردوں کی فہرست آپ کے پاس موجود نہ ہو۔ عبداللہ بن مسعودؓ سے کسب فیض کرنے والے کون کون ہیں۔ ان کے نمایاں ترین شاگر مثلاً علقمہ ہیں۔ علقمہ کے شاگردوں میں نخعی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ جو ایک اور مشہور عبداللہ تھے ان سے ان کے پوتے شعیب بن عبداللہ روایت کرتے ہیں۔ شعیب بن عبداللہ سے ان کے بیٹے عمر بن شعیب روایت کرتے ہیں، اب اگر آپ سے کوئی حدیث بیان کرے کہ مجھ سے ابراہیم نخعی نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ میرے استاد نے عبداللہ سے یہ پوچھا کہ فلاں معاملہ کس طرح ہوا۔ اب آپ کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ یہاں عبداللہ سے عبداللہ بن مسعود

مراد ہیں، عبداللہ بن عمرو بن العاص مراد نہیں ہوں گے۔آپ کو آسانی سے ایک ابتدائی presumption قائم ہوجائے گی۔اور اگر یہ کہا جائے کہ عمرو بن شعیب نے بیان کیا، وہ روایت کرتے ہیں عبداللہ سے،تو یہاں آپ کو فوراً معلوم ہوجائے گا کہ یہاں عبداللہ سے مراد عبداللہ بن عمرو بن العاص ہیں۔ اس طرح حضرت عبداللہ بن عباسؓ ایک اور عبداللہ ہیں۔مثلاً کوئی کہے کہ مجاہد نے بیان کیا، مجاہد عبداللہ سے نقل کرتے ہیں،تو جاننے والوں کو اندازہ ہوجائے گا کہ چونکہ مجاہد عبداللہ بن عباس کے شاگرد ہیں اس لئے یہاں عبداللہ سے مراد عبداللہ بن عباس ہوں گے۔اس لئے مؤتلف والمختلف کے نام سے جوفن ہے، یہ اس کی ایک چھوٹی سی مثال ہے۔صحابہ میں یہ التباس زیادہ نہیں ہوتا،لیکن باقی لوگوں میں بہت ہوتا ہے۔تابعین میں کم، تبع تابعینؒ میں اس سے بھی زیادہ اوراس کے بعداس سے بھی زیادہ۔جیسے جیسے راویوں کی تعداد بڑھتی جائے گی اس التباس کے امکانات بڑھتے جائیں گے۔اس التباس کو دور کرنے کے لئے کچھ حضرات نے پوری زندگی اس کام میں لگائی کہ ایسے راویوں کے حالات جمع کریں جن کے نام اور کنیتیں ملتی جلتی ہیں۔بعض جگہ ایسا ہے کہ نہ صرف اپنا نام بلکہ والد کا نام اور دادا تک کے نام ایک جیسے ہیں۔اب تین ناموں سے بھی پتہ نہیں چلتا کہ کون مراد ہے۔پھر یہاں کنیت سے پتہ چلے گا۔کہیں وطن کی نسبت سے پتہ چلے گا جیسے نیشاپوری، الکوفی، البصری یا استاد سے پتہ چلے گا۔اس پر قدیم ترین کتاب امام دارقطنی کی ہے جو مشہور محدث ہیں۔حضرت خطیب بغدادی جن کا میں نے ذکر کیا ہے، بغداد کے ہیں۔ان کی بھی اس موضوع پر کتابیں ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ کچھ کتابیں ایسی ہیں جو الگ الگ کتابوں کے راویوں پر مشتمل ہیں۔مثلاً صحیح بخاری میں جتنے راوی ہیں ان پر الگ کتابیں ہیں۔اسماء رجال صحیح البخاری۔صحیح بخاری کے جتنے رجال ہیں وہ کون کون ہیں۔صحیح مسلم کے رجال پر کتابیں ہیں۔موطا امام مالکؒ کے رجال پر کتابیں ہیں، مسند امام احمد کے رجال پر کتابیں ہیں، امام ابوداؤد کی سنن پر کتابیں ہے۔حدیث کی تقریباً تمام کتابوں کے راویوں پر الگ الگ کتابیں موجود ہیں جن میں وہ سارا مواد یکجا مل جاتا ہے۔اس میں تلاش کرنے میں آسانی ہوجاتی ہے۔اب اگر رجال کی ساری کتابیں ایک جگہ ہوتیں اور الگ الگ کتابوں کے رجال پر مواد نہ ہوتا تو تلاش کرنا مشکل ہوجاتا۔اگر ابوداؤد کا راوی آپ کو معلوم ہے تو رجال ابوداؤد میں تلاش کرلیں آسانی سے مل جائے گا۔

اس طرح سے کچھ راوی وہ ہوتے تھے جن کا حافظہ شروع میں اچھا تھا۔ بعد میں عمر زیادہ ہوگئی۔ نوے سال، سوسال ہوگئی اور حافظہ جواب دے گیا۔ اب کس سن سے حافظہ کمزور ہوا؟ کس سن میں تھوڑا کمزور ہوا کس سن میں زیادہ کمزور ہوا۔ جب تک یہ معلومات نہ ہوں تو یہ تعین دشوار ہے کہ یہ روایت کس دور کی ہے۔ اس پر الگ سے کتابیں ہیں۔ امام دارقطنی کی ایک کتاب ہے 'کتاب من حدث ونسی'۔ ان لوگوں کے تذکرہ کے بارے میں جنہوں نے پہلے حدیثیں بیان کیں اور بعد میں بھول گئے۔ وہ سارے نام ایک ساتھ معلوم ہو جائیں گے جن کی یادداشت اخیر میں جواب دے گئی تھی۔ اس کتاب میں سنوں کے تعین کے ساتھ بتا دیا گیا ہے کہ فلاں سن سے فلاں سن تک ان کا حافظہ ٹھیک تھا، فلاں سن میں کمزور ہونا شروع ہوگیا اور فلاں سن میں بالکل جواب دے گیا۔

کل یا پرسوں میں نے عرض کیا تھا کہ ضعیف حدیث کی ایک قسم ہے مدلس، اس سے مراد وہ حدیث ہے جس میں راوی نے اپنے شیخ کے بارہ میں کوئی **misrepresentation** کی ہو۔ غلطی سے یا جان بوجھ کر، کہ جس سے سننے والوں نے یہ سمجھا کہ روای وہ نہیں ہے جس سے انہوں نے روایت لی ہے بلکہ کوئی اور ہے۔ میں نے اس سلسلہ میں ایک فرضی مثال دی تھی کہ مثال کے طور پر امام مالکؒ کے زمانے میں مدینہ منورہ میں کوئی راوی ہے جو کمزور ہے۔ اب دو شخص جا کر کوفہ یا دمشق میں حدیث بیان کر رہے ہیں۔ ایک وہ شخص ہے جو امام مالکؒ سے براہ راست روایت کرتا ہے اور دوسرا وہ شخص ہے جس کو امام مالکؒ سے پڑھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ یہ دوسرا شخص اگر کمزور آدمی کے حوالہ سے بیان کرے گا تو لوگ متنفر ہو جائیں گے۔ اس سے بچنے کے لئے وہ یہ کہنے لگے کہ حدثنی الامام العادل، الامام الکبیر فی المدینة المنورہ۔ اب سننے والے کا ذہن فوراً امام مالکؒ کی طرف جائے گا۔ حالانکہ امام مالکؒ مراد نہیں کوئی اور مراد ہے۔ اس سے التباس ہوسکتا ہے۔ اس لئے ایسی حدیث کو مدلس کہتے ہیں۔ مدلسین پر یعنی تدلیس کرنے والوں پر الگ سے کتابیں موجود ہیں۔ اس موضوع کو مراتب المدلسین اور طبقات المدلسین کہا جاتا ہے۔

بعض اوقات نام کا حوالہ دینے میں بھی ایک عجیب وغریب لذت معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً امام محمد بن حسن شیبانی جو بڑے مشہور محدث ہیں، بڑے فقیہ ہیں اور امام ابوحنیفہ کے

شاگردوں میں بڑا نمایاں مقام رکھتے ہیں اور امام ابوحنیفہ کے نوے فیصد اجتہادات انہوں نے ہی مدوّن کیے ہیں، آج فقہ حنفی امام محمد کی کتابوں کی بنیاد پر قائم ہے۔ امام محمد نے ابتدائی کسب فیض اپنے ہم سبق امام ابویوسف سے کیا تھا۔ امام یوسف کی عمر زیادہ تھی امام محمد کی عمر کم تھی۔ جب امام ابوحنیفہ کا انتقال ہوا تو امام محمد کی عمر کوئی اٹھارہ انیس سال تھی۔ بقیہ تکمیل انہوں نے امام ابویوسف سے کی اور چند سال انہوں نے مدینہ منورہ میں امام مالکؒ سے بھی کسب فیض کیا اور مکہ مکرمہ میں حدیث کی تکمیل کرنے کے بعد وہ کوفہ آ گئے۔ جب وہ کوفہ آئے تو امام ابویوسف اس وقت چیف جسٹس بن چکے تھے۔ امام محمد اور ان کے درمیان تھوڑی سی غلط فہمی ہوگئی جو عام طور پر انسانوں میں ہو جاتی ہے۔ جس دور میں ان دونوں کے درمیان غلط فہمی ہوئی اس دوران امام محمد جب کسی روایت میں امام ابویوسف کا حوالہ دیتے ہیں تو اس میں اس غلط فہمی یا بدمزگی کے باوجود امام ابویوسف کا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہیں اگرچہ اس بشری بدمزگی کی وجہ سے وہ امام ابویوسف کا نام نہیں لیتے، لیکن جو بات بیان کرتے ہیں اس سے ان کے اعلیٰ ترین اخلاقی معیار اور اعلیٰ ترین ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ حدثنی من اثق فی دینه و امانته' مجھ سے اس شخص نے بیان کیا جس کے دین اور امانت پر مجھے پورا اعتماد ہے۔ ناراضگی کی وجہ سے نام نہیں لکھتے، لیکن ناراضگی کے باوجود یہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے ان کے دین اور امانت پر پورا اعتماد ہے۔ حدثنی من اثق فی دینه و امانته' حدثنی الثقه، حدثنی الثبت، حدثنی الحجة الثقه 'مجھ سے ایک ایسے راوی نے بیان کیا جو حجت ہے، ثبت ہے اور ثقہ ہے۔ اور سب کو معلوم ہوتا تھا کہ اس سے امام ابویوسف مراد ہیں اس لئے یہ حدیث مبہم یا مدلس نہیں ہے۔ لیکن اس سے یہ اندازہ کر لیں کہ اعتماد اور ذمہ داری کتنی غیر معمولی تھی۔ اس طرح کی ایک اور مثال بھی میں عرض کرنے والا ہوں جس سے اُس غیر معمولی اور عظیم ذمہ داری کا احساس ہوگا جو راویان حدیث نے ملحوظ رکھی اور اس ذمہ داری کا ثبوت دیا جو آج ناقابل تصور ہے۔

ایک کتاب اعلام النساء پر بھی ہے اس سے مراد وہ خواتین ہیں جو روایت حدیث سے متعلق رہی ہیں اور ان کا سارا تذکرہ پانچ جلدوں پر مشتمل ایک کتاب میں دستیاب ہے۔ بقیہ تذکروں میں بھی ہے۔ رجال کی ہر کتاب میں مرد راویوں کے ساتھ خواتین راویوں کا تذکرہ بھی موجود ہے۔

جیسے جیسے یہ مواد سامنے آتا گیا۔ وہ مرتب ہوتا گیا، یہاں تک کہ چوتھی پانچویں صدی ہجری تک سارا کام مکمل ہوگیا۔ یہ تحقیق عمل کہ ان میں سے کس راوی پر کیا اعتراض ہے یا کس راوی پر کوئی اعتراض نہیں ہے، اس پر الگ کتابیں لکھی جانی شروع ہوئیں۔ یہ وہ علم ہے جس کو علم جرح تعدیل کہتے ہیں۔ جَرح کے معنی زخمی کردینا اور جُرح کے معنی بھی زخمی کردینا ہیں۔ لیکن عربی زبان میں زخمی کردینا دو مفاہیم میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک مفہوم تو کسی چھری یا ہتھیار سے جسم پر زخم لگا دینے کا ہے اس کے لئے عربی زبان میں جُرح کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ایک زخم لگانا دل پر ہے کہ کوئی ایسی بات کہہ دی جو دل کو زخمی کر گئی اس کے لئے جَرح کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

جراحات السنان لها التيام

ولا يلتام ما جرح اللسان

کہ تلوار کا زخم تو اچھا ہو جاتا ہے لیکن زبان اور الفاظ کا جو زخم ہوتا ہے وہ مندمل نہیں ہوتا، وہ دیر تک باقی رہتا ہے۔ لہٰذا جرح کے ہیں معنی کسی کے بارے میں ایسی بات کہنا کہ وہ سنے تو اس کو بری لگے۔ لیکن اصطلاحی اعتبار سے اس سے مراد یہ ہے کہ حدیث کے کسی راوی کا کوئی ایسا عیب بیان کرنا جس کی وجہ سے وہ عدالت کے مرتبہ سے ساقط ہو جائے اور اس کی بیان کردہ روایات ضعیف حدیث شمار ہو جائیں یا کسی راوی کی کسی ایسی کمزوری کو بیان کرنا جس کی وجہ سے اس راوی کی عدالت ختم ہو جائے یا عدالت کا درجہ کم ہو جائے، اور اس کی بیان کردہ راویات ضعیف حدیث شمار ہو جائیں۔ یہ ہے جرح کی تعریف۔ علامہ ابن اثیر جو ایک اور مشہور محدث ہیں اور لغت حدیث پر ان کی کتاب 'النهاية في غريب الحديث' بڑی مشہور ہے اور پانچ جلدوں میں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جرح سے مراد وہ وصف ہے کہ جس کی کسی راوی سے جب نسبت کر دی جائے تو اس کا اعتبار گھٹ جائے اور اس کی بات پر عمل کرنا لازمی نہ رہے۔ اس عمل کو جرح کہتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ دوسرا عمل ہے تعدیل کا، کہ کسی راوی کے بارے میں یہ تحقیق کر کے بتا دیا جائے کہ یہ راوی عادل ہے۔ یہ راوی ان چار شرائط کو، جن میں سے ایک شرط کی تین ذیلی قسمیں ہیں، یعنی سات شرائط کو پورا کرتا ہو، کہ یہ راوی مسلمان تھا، عادل تھا، یعنی ان تمام اخلاقی اور روحانی خوبیوں اور اچھائیوں کا حامل تھا جو ایک راوی حدیث کے لئے ضروری ہیں، اس

کا حافظہ اچھا تھا، اس کا ضبط اچھا تھا، اس کی بیان کردہ روایت میں کوئی علت نہیں ہے، اس کی سند کے راستہ میں کوئی رکاوٹ اور بیچ میں کوئی خلا نہیں ہے اور یہ اونچے کردار کا انسان تھا۔ جب ان ساری چیزوں کی تحقیق ہو جائے تو تحقیق کے اس عمل کو تعدیل کہتے ہیں۔ جرح کے معنی کمزوری بیان کرنا اور تعدیل کے معنی عدالت بیان کرنا۔ گویا جرح اور تعدیل کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔

ایک راوی اگر لوگوں کے مفروضہ میں عادل ہے اور آپ نے یہ بتایا کہ یہ راوی جھوٹا ہے تو اس کی عدالت سلب ہوگئی۔ یا آپ نے کہا کہ جھوٹا تو نہیں لیکن بعض لوگوں نے اس پر جھوٹا ہونے کا الزام لگایا ہے تو وہ مشکوک ہوگیا۔ یا آپ نے اس کے بارے میں تحقیق کر کے پتہ چلایا کہ فاسق ہے اور بعض ایسے اعمال میں مبتلا ہے جن کا کرنے والا فاسق ہو جاتا ہے، نعوذ باللہ شراب پیتا ہے، یا جھوٹی گواہی دی ہے یا کسی ایسی بڑی بدعت میں مبتلا ہے جس کے بدعت ہونے پر اتفاق ہے۔ ایک تو وہ بدعت ہے جس کے بدعت ہونے میں اختلاف ہے، بعض لوگ اس کو بدعت سمجھتے ہیں بعض نہیں سمجھتے، بعض ایک عمل کو سنت سمجھتے ہیں بعض بدعت سمجھتے ہیں، ایسا نہیں بلکہ بدعت کے کسی ایسے عمل میں شریک ہے جس کے بدعت ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ یا یہ مجہول ہے، غیر معلوم ہے، پتہ نہیں کون ہے، کس زمانے کا ہے کس جگہ کا ہے، اس کا استاد کون ہے، علم حدیث کس سے حاصل کیا، یعنی مجہول الکیفیت اور مجہول الحال ہے۔ یا ذات تو معلوم ہے کہ فلاں آدمی ہے، فلاں کا بیٹا ہے فلاں شہر کا ہے۔ لیکن اس کی صفات کا پتہ نہیں کہ کس قسم کا آدمی ہے۔ اچھا ہے کہ برا ہے۔ ان میں سے اگر کوئی چیز اس میں کم ہو تو اس کی عدالت ختم ہو جاتی ہے۔ اور عدالت ختم ہو جائے گی تو وہ راوی مستند نہیں رہے گا۔ اس طرح اگر تعدیل ختم ہوگئی تو جرح ہوگئی۔ اس عمل کو جرح کہتے ہیں۔

اسی طرح ضبط کا معاملہ ہے کہ آپ کی تحقیق میں اس کا حافظہ اچھا تھا، تحمل اور ادا دونوں کے وقت اور اخیر تک اچھا رہا، تحمل سے لے کر ادا تک سب باتیں ٹھیک ٹھیک یاد رہیں، لیکن بعد میں تحقیق سے پتہ چلا کہ اس کا حافظہ ختم ہو چکا تھا۔ شروع سے ختم ہو گیا تھا یا بعد میں ختم ہو گیا، شروع سے خراب تھا یا بعد میں خراب ہو گیا تھا یہ مسئلہ تحقیق سے ثابت ہوگا۔ یا مثلاً کسی راوی کے بارہ میں تحقیق سے پتا چلا کہ ان کا حافظہ تو ٹھیک تھا، لیکن بعض اوقات وہ ایک آدمی اور دوسرے آدمی میں اختلاط کر دیا کرتے تھے یا ایک بات اور دوسری بات میں اختلاط کر دیتے تھے۔ یا یہ ثابت ہوا کہ حافظہ تو ٹھیک ہے لیکن جو روایتیں بیان کرتے ہیں وہ عام ثقہ اور مستند راویوں سے مختلف کوئی

چیز بیان کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر کوئی ایسی بات بیان کرے جو سب راویوں کے بیان سے مختلف ہو۔

مثلاً اکثر راوی یہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز پڑھا کرتے تھے تو یہاں (ناف پر) ہاتھ باندھا کرتے تھے، کچھ لوگوں نے بیان کیا کہ یہاں (ناف کے اوپر) باندھا کرتے تھے، کچھ نے یہ بیان کیا کہ یہاں (سینہ کے اوپر) باندھا کرتے تھے، کچھ نے یہ بیان کیا کہ ہاتھ چھوڑ کر پڑھا کرتے تھے۔ اب یہ چار روایتیں مستند راویوں کے ذریعے آئی ہیں۔ ان چاروں کے بارہ میں یہ اختلاف تو ہوسکتا ہے کہ ان میں بہتر عمل کونسا ہے۔ کچھ کے خیال میں یہاں افضل ہے، کچھ کے خیال میں یہاں افضل ہے، کچھ کے خیال میں چھوڑنا افضل ہے۔ جو مستند اور ثقہ راوی ہیں وہ ان چار میں محدود ہیں۔ اب اس کے علاوہ کوئی شخص کچھ اور بیان کرے مثلاً یہ کہ رسول اللہ ﷺ (نعوذ باللہ) یہاں (گردن پر) ہاتھ باندھا کرتے تھے، بالفرض اگر ایسی روایت ہو تو یہ ثقات کے خلاف ہے، راوی کا درجہ جو بھی ہو لیکن روایت قابل قبول نہیں ہوگی۔ ایسا غیر ثقہ بیان بھی راوی کی عدالت کو ساقط کر دیتا ہے اور اس سے راوی مجروح ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اگر سچا ہوتا تو ایسی بات کیوں بیان کرتا جو عام طور پر کسی نے بیان نہیں کی۔ یا کسی راوی کے بارے میں یہ ثابت ہو کہ اخیر میں کثرت سے ان کو ایسی کیفیت پیش آنے لگی تھی جس میں وہ بات کو بھول جایا کرتے تھے۔ بڑھاپے میں کثرت سے ایسا ہوتا ہے کہ بعض اوقات حافظہ اچھا ہوتا ہے اور بعض اوقات کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ آپ نے اسی نوے سال کی عمر کے بزرگوں میں دیکھا ہوگا کہ پورے پورے ہفتے ایسے گزرتے ہیں کہ یادداشت ٹھیک رہتی ہے اور بعض اوقات اچانک ایسی کیفیت ہو جاتی ہے کہ کچھ یاد نہیں رہتا۔ اپنے گھر والوں کو بھی نہیں پہچانتا۔ تو یہ تحقیق ہونی چاہئے کہ کسی راوی کی یہ کیفیت تھی کہ نہیں تھی۔ بعض اوقات ایک راوی کوئی فاش غلطی کرتا ہے اور وہ ایسی غلطیاں ہوتی ہیں جن سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس طرح کی چند غلطیاں ثابت ہو جائیں تو اس کو بھی عدم تعدیل یا جرح قرار دیں گے اور وہ راوی غیر مستند اور مجروح ہو جائے گا۔

یہ ساری کی ساری اہمیت علم اسناد اور علم جرح وتعدیل کی ہے۔ ذخیرۂ حدیث کا بیش تر دارومدار ان حضرات کی تحقیق اور علم رجال کی تفصیلات پر ہے۔ علم حدیث کے دو بڑے ستون ہیں، ان میں سب سے بڑا اور مرکزی ستون، اگر کسی خیمہ کے درمیانی ستون سے مثال دیں تو وہ علم

اسناد، علم روایت اور علم جرح وتعدیل ہے۔ اسی لئے محدثین کرام نے اس کی طرف زیادہ توجہ دلادی۔ حضرت عبداللہ بن مبارک کا قول میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں۔ انہوں نے فرمایا کہ اسناد دین کا ایک حصہ ہے۔ اگر اسناد نہ ہوتا تو جس کا جو جی چاہتا بیان کر دیا کرتا۔ امام شعبہ بن الحجاج، جن کے بارے میں ہارون الرشید نے کہا تھا کہ وہ پچھوڑ کر اور چھان کر کھوٹے اور کھرے کو الگ الگ کر دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے کھرا اور کھوٹا الگ الگ کر کے ثابت کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ علم حدیث اور جرح وتعدیل کے بہت بڑے امام تھے۔

امام اوزاعی جو فقیہ بھی ہیں اور محدث بھی ہیں، ان کا کہنا یہ تھا کہ علم حدیث اسی وقت زائل ہوگا جب علم اسناد اور علم روایت زائل ہوجائے گا۔ علم اسناد کی بقا علم حدیث کی بقا کے مترادف ہے۔ امام مالکؒ نے فرمایا کہ یہ علم جو تم حاصل کرتے ہو یہ سراپا دین ہے، لہٰذا اس بات کو یقینی بناؤ کہ تم یہ علم کس سے حاصل کر رہے ہو۔ لہٰذا اس علم کو مستند راوی سے حاصل کرو۔ غیر مستند راوی سے حاصل نہ کرو۔ اب سوال یہ ہے کہ مستند اور غیر مستند کا تعین کیسے ہوگا؟ ظاہر بات ہے کہ وہ علم رجال اور علم جرح وتعدیل سے ہوگا۔ سب پہلے جس محدث نے جرح وتعدیل سے کام لیا وہ امام شعبی تھے۔ امام عامر بن شراحیل الشعبی جن کی وفات ۱۰۴ یا ۱۰۲ھ میں ہوئی اور تابعین میں ان کا بڑا اونچا درجہ ہے۔ وہ اپنے زمانے کے بڑے فقیہ اور بڑے محدث تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے اس علم یعنی اسناد اور جرح وتعدیل سے کام لینا شروع کیا۔ حضرت محمد بن سیرین جو تابعین میں ہیں اور علم اسناد میں بڑے مشہور ہیں۔ اسی طرح حضرت حسن بصری، سعید بن جبیر اور ابراہیم نخعی اور ان کے ہم پلہ دیگر حضرات نے سب سے پہلے اس کام کی بنا ڈالی۔ یہ تابعین میں درمیانہ درجہ کے تابعین ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب صحابہ خال خال رہ گئے تھے اور بیشتر کبار تابعین کا زمانہ تھا۔ ان حضرات نے اس فن کو باقاعدہ استعمال کرنا شروع کیا اور سب سے پہلے راویوں کی جرح وتعدیل سے کام لیا۔

جرح وتعدیل اور حسن ظن

جرح وتعدیل کے بارے میں حسن ظن سے کام نہیں چلتا۔ محدثین کا کہنا ہے کہ یہ قرآن پاک میں جو آیا ہے کہ 'ان الظن لایغنی من الحق شیئا' اور حسن ظن سے کام لو، سوئے ظن سے کام مت لو، ان بعض الظن اثم'۔ ان اصولوں کا اطلاق علم حدیث پر نہیں ہوتا۔ یہ رسول اللہ ﷺ

کی حدیث کا معاملہ ہے، یہ دین کی ثقاہت اور authenticity کا معاملہ ہے۔ اس میں یہ خطرہ مول نہیں لیا جاسکتا کہ ہم خوش گمانی سے کسی کو باکردار، نکوکار اور راستباز سمجھ لیں اور محض خوش گمانی سے کام لے کر کسی کو سچا سمجھ لیں۔ اس میں تو انتہائی تحقیق سے کام لینا پڑے گا۔ اس میں ذرہ برابر مداہنت یا کمزوری کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ امام مسلم نے اپنی کتاب 'صحیح مسلم' کے مقدمہ میں اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ ان سے کسی نے کہا کہ آپ جرح وتعدیل سے کام لیتے ہیں۔ یہ تو غیبت ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں امام مسلم نے اپنے مقدمہ میں گفتگو کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک پہلو سے اس میں غیبت تو یقیناً ہوتی ہے۔ کسی کو کہیں کہ وہ جھوٹا ہے یا یہ کہیں کہ اس کا حافظہ جواب دے گیا ہے، تو یہ یقیناً اس کی ذات پر ایک منفی تبصرہ ہے۔ لیکن تمام محدثین اور فقہا نے بالاتفاق یہ قرار دیا ہے کہ یہ وہ غیبت نہیں ہے جو شریعت میں ناجائز اور حرام ہے۔ بلکہ یہ تو دین کے تحفظ اور بقا کی خاطر لازمی ہے۔ حدیث رسول بیان کرنے والے راوی دین کی خاطر گواہی دینے والے لوگ ہیں۔ اور اس گواہی کی اسی طرح چھان پھٹک کی جائے گی جس طرح عدالت میں گواہوں کی چھان بین کی جاتی ہے۔

محدثین نے جب گواہوں کی اس چھان پھٹک کے تذکرہ سے آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا ہوگا کہ جرح وتعدیل کا یہ سارا عمل ہوا کیسے؟ یہ پتہ کیسے چلا کہ یہ راوی بھولتا ہے یا نہیں بھولتا؟ یہ راوی سچا ہے کہ جھوٹا ہے؟ اب تو یہ کام بڑا آسان ہے۔ درجنوں بلکہ سینکڑوں کتابیں ہر جگہ دستیاب ہیں۔ کتابوں میں جا کر دیکھ لیں۔ لیکن لوگوں نے اس کام کو کیسے کیا، میں اس کو عرض کرتا ہوں۔

کچھ حضرات نے اپنی پوری زندگی اس کام میں لگائی کہ ان تمام احادیث کو جمع کیا جو ایک راوی سے مروی ہیں۔ مثلاً حضرت عمر فاروق کا ارشاد ہے کہ انما الاعمال بالنیات وانما لکل امرءٍ ما نوی 'یہ بات حضور ﷺ نے بیان کی تھی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے منبر پر خطبہ کے دوران بیان کیا کہ میں نے خود یہ ارشاد حضور ﷺ سے سنا ہے۔ پھر حضرت عمرؓ سے فلاں نے سنا، پھر فلاں سے فلاں نے سنا۔ اس روایت کو بیان کرنے والے ایک مرحلہ پر جا کر بہت سارے حضرات ہو جاتے ہیں۔ اب ان بہت سارے حضرات کے جو شیخ ہیں وہ ایک ہی ہیں۔ فرض کیجیے شیخ الف سے بیس آدمیوں نے اس کو روایت کیا۔ اب ایک محدث یہ چیک کرنا

چاہتے ہیں کہ ان بیس راویوں کا درجہ جرح وتعدیل کی میزان میں کیا ہے۔اب وہ یہ کریں گے کہ ایک ایک آدمی کے پاس جا کر ملاقات کریں گے۔کوئی مدینہ میں ہے تو کوئی مکہ میں ہے، کوئی کوفہ میں ہے تو کوئی بصرہ میں ہے۔ چھ چھ مہینے سفر کر کے ان کے پاس پہنچیں گے۔ اور جا کر ان شاگردوں کے شاگرد بن کر بیٹھیں گے۔ان سے ان احادیث کی روایت کریں گے۔بیس آدمیوں سے روایت کا یہ عمل ظاہر ہے کہ ایک دو سال میں مکمل نہیں ہوا ہوگا۔اس میں بہت وقت لگا ہوگا۔ دس دس سال میں کہیں جا کر مکمل ہوا ہوگا، بیس سال میں ہوا ہوگا، ہم نہیں کہہ سکتے کہ کتنا وقت لگا ہوگا۔ جب یہ عمل مکمل ہو جائے گا تو پھر وہ ان روایات کا باہم مقابلہ کر کے دیکھیں گے۔ اگر وہ یہ دیکھیں کہ انیس راویوں کی روایت ایک جیسی ہے اور بیسواں راوی مختلف بات کہتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بیسویں راوی سے یا تو بھول چوک ہوگئی یا اس کا حافظہ اس میں کام نہیں کرتا تھا، یا اس نے نعوذ باللہ جان بوجھ کر کوئی چیز ملاوٹ کی ہے۔اب اگر وہ اختلاف یا تبدیلی سنجیدہ قسم کی ہے یعنی ایسی ہے جس سے معنی ومفہوم میں فرق پڑتا ہے، تو یہ اس راوی کے خلاف جائے گا اور اس کی عدالت کمزور ہو جائے گی۔ اور اگر اس اضافہ یا تبدیلی سے معنی اور مفہوم میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، صرف لغت یا الفاظ کا فرق ہے، تو اِس سے اُس راوی کے حافظہ کے بارہ میں رائے پر اثر پڑے گا۔اور کہا جائے گا کہ گویا اس کا حافظہ اتنا اچھا نہیں تھا، ورنہ جب انیس راوی ایک طرح سے بیان کر رہے ہیں تو پھر بیسواں دوسری طرح کیوں بیان کر رہا ہے؛ اب یا تو اس کے حافظہ میں کمی ہے یا پھر اس کی نیت میں فتور ہے۔اگر معنی میں فرق پڑتا ہے تو نیت میں اور اگر صرف الفاظ میں فرق ہے تو حافظہ میں فتور ہے۔اب گویا یہ ایک مفروضہ ہے کہ اس راوی کے حافظہ یا نیت میں سے کسی ایک چیز میں فتور ہے۔ اب وہ محقق اس راوی کی بقیہ روایات کی تحقیق کریں گے۔ ان راویوں کے ساتھ بیٹھ کر وہ پانچ دس سال کسب فیض کریں گے۔ پانچ سال میں ان کی ساری احادیث جمع کرنے کے بعد، ان کے جو اساتذہ ہیں، ان کے پاس جائیں گے۔اُن سے اِن کی تصدیق کریں گے تو اس میں بھی پچیس تیس سال لگیں گے۔ان پچیس تیس سالوں میں کہیں جا کر یہ ثابت ہوگا کہ واقعی ان صاحب کے حافظہ میں کمزوری تھی یا نیت میں فتور تھا۔پھر ان کی جرح کی باری آئے گی اور یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ یہ راوی مجروح ہے۔ یہ کام آسان نہیں تھا۔اس پر لوگوں کی نسلوں کی نسلوں نے کام کیا اور اس طرح سے مختلف روایات کی veriations جمع کیں۔ ان

veriations کوطریق بھی کہتے ہیں۔وجہ بھی کہتے ہیں اور حدیث بھی کہتے ہیں۔

احادیث کی گنتی کا مسئلہ

یہاں ضمناً ایک اور بات بھی سن لیجئے۔آپ نے سنا ہوگا کہ امام بخاری نے چھ لاکھ احادیث میں سے اپنی یہ کتاب صحیح بخاری مرتب کی۔امام احمد بن حنبل نے سات لاکھ احادیث سے مرتب کی۔اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ صحیح بخاری میں تو کل دو ہزار اور کچھ سو احادیث ہیں، چھبیس سو کے قریب ہیں تو یہ بقیہ چار پانچ لاکھ احادیث کہاں گئیں؟ منکرین حدیث اس بات کو بہت اچھالتے ہیں کہ دو ہزار حدیثیں لے کر باقی لاکھوں احادیث کو جھوٹی قرار دے کر پھینک دیا گیا ہے۔یا امام احمد نے ساڑھے سات لاکھ میں سے تیس چالیس ہزار بیان کیں باقی سب جھوٹی تھیں۔یاد رکھئے یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے۔یا تو منکرین حدیث علم حدیث سے واقف نہیں ہیں، یا بدنیتی سے ایسا کہتے ہیں۔میں نہیں جانتا کہ اس کی اصل حقیقت کیا ہے۔اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

جب کوئی محدث یہ کہتا ہے کہ میرے پاس ایک لاکھ احادیث ہیں تو ایک لاکھ احادیث سے ایک لاکھ متن مراد نہیں ہوتے، بلکہ ان کی مراد یہ variation ہوتی ہے کہ بیس آدمیوں کے پاس گئے ان سے جا کر ایک روایت کی تحقیق کی اور حدیث کا متن سنا۔یوں یہ بیس حدیثیں ان کے پاس ہو گئیں۔اب وہ کہتے ہیں کہ میں نے شعبہ سے بیس احادیث حاصل کیں۔وہی ایک روایت بیس اور آدمیوں سے حاصل کی، تو وہ کہیں گے کہ میں نے مزید بیس احادیث حاصل کیں۔بیس یہ ہو گئیں، بیس شعبہ کی ہو گئیں، تو کل چالیس ہو گئیں۔حالانکہ وہ بہت کم ہوں گی، ممکن ہے چار ہوں، ممکن ہے پانچ ہوں۔حضور ﷺ کے بعض ارشادات ایسے ہیں کہ اگر ان کے سارے طُرُق اور ساری روایات کو جمع کیا جائے تو ان کی تعداد کئی کئی سو بنتی ہے۔مشہور حدیث ہے انما الاعمال بالنیات، اس کے سارے طرق ملا کر سات سو ساڑھے سات سو ہیں۔ساڑھے سات سو طرق سے یہ روایت آئی ہے۔اب محدث کہے گا کہ میرے پاس ساڑھے سات سو طرق یا ساڑھے سات سو احادیث ہیں۔لیکن اصل میں حدیث ایک ہی ہے۔ امام بخاری نے یہ کام کیا کہ وہ ایک ایک حدیث کو کنفرم اور ری کنفرم اور ویریفائی اور ری ویریفائی اور ری ری ری ویریفائی کرنے کے لئے درجنوں آدمیوں کے پاس گئے۔سینکڑوں اساتذہ کے پاس جا کر ایک ہی حدیث مختلف سندوں

سے حاصل کی۔ ایک دوسرے سے کولیٹ (Collate) کیا۔ پھر ان میں سے جو بہترین سند تھی اس کو انہوں نے اپنی کتاب میں نقل کیا۔ ساری روایتیں اور ساری سندیں نقل کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اگر وہ ایک ایک حدیث کی ساری سندیں نقل کرتے تو شاید پوری صحیح بخاری اس ایک حدیث، انما الاعمال بالنیات کی سند سے بھر جاتی۔ انہوں نے تمام اساتذہ سے تصدیق کرنے کے بعد سب سے بہترین سند کا انتخاب کر کے نقل کر دی اور باقی کو نقل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ لہٰذا جب امام بخاری یہ کہتے ہیں کہ میں نے چار لاکھ احادیث میں سے صحیح بخاری منتخب کی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک ایک حدیث کو میں نے سینکڑوں مرتبہ ویریفائی کیا، درجنوں شیوخ اور صحابہ کی روایات کو جمع کیا اور پھر ان میں سے جو سند مجھے سب سے زیادہ بہترین لگی میں نے اس کو اختیار کر لیا اور باقی سندوں کو نظر انداز کر دیا لہٰذا جب تعداد بیان کی جاتی ہے تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے۔

امام یحیٰ بن معین جو صحابہ کے بعد محدثین کے سب سے اونچے درجے میں شمار ہوتے ہیں۔ اور اپنے زمانے میں امیر المومنین فی الحدیث کہلاتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب تک مجھے کوئی حدیث تیس طُرُق سے نہ مل جائے، میں اپنے کو یتیم سمجھتا ہوں۔ میں اس حدیث کے بارے میں یتیم ہوں جس کے تیس طرق یا تیس سندیں میرے پاس موجود نہ ہوں، زیادہ ہوں تو اچھا ہے اور جتنی زیادہ ہوں اتنا اچھا ہے۔

ایک بزرگ تھے حضرت ابراہیم بن سعید، جو امام مسلم کے اساتذہ میں سے تھے۔ امام مسلم نے ان سے روایات لی ہیں۔ ان سے ایک محدث ملنے کے لئے گئے اور ان سے کہا کہ میں آپ سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی فلاں روایت سننا چاہتا ہوں۔ آپ کی سند سے وہ کیسے پہنچی۔ گویا یہ ویریفیکیشن اور ری ویریفیکیشن کی ایک قسم تھی۔ انہوں نے اپنی ملازمہ سے کہا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی جو روایات ہیں ان کی 23ویں جلد لے آؤ۔ اب ان صاحب نے حیرت کے ساتھ سوچا کہ حضرت ابوبکرؓ کی ساری روایات ملا کر بھی شاید چالیس اور پچاس سے زیادہ نہیں بنتیں۔ جو زیادہ سے زیادہ دس پندرہ صفحات کے ایک کتابچہ میں سما سکتی ہیں، تو یہ تیئسویں جلد کہاں سے آ گئی؟ انہوں نے پوچھا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تو ساری روایات مل کر چالیس پچاس کے لگ بھگ بنتی ہیں، ان کی مرویات کی تیئسویں جلد کہاں سے آئی؟ انہوں نے کہا کہ جب تک میرے

پاس کسی ایک روایت کے سو طرق جمع نہ ہو جائیں اس وقت تک نہ میں اس کو مستند نہیں سمجھتا ہوں اور نہ آگے بیان کرتا ہوں۔ میں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ہر روایت کے کم از کم سو سو طرق جمع کر کے ایک ایک جلد میں مرتب کر رکھے ہیں۔ یہ حدیث جو آپ بیان کر رہے ہیں یہ تیئسویں جلد میں ہے۔ حدیث ایک ہے باقی ساری اس کی سندیں ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق سے کس کس نے سنا اور انہوں نے کہاں کہاں بیان کیا۔

اب سو سو سندیں اس طرح بنیں۔ کہ ایک صاحب سن کر کوفہ چلے گئے۔ جب انہوں نے وہاں اس روایت کو بیان کیا۔ وہاں سینکڑوں شاگردوں نے اس ایک حدیث کو سنا۔ تو کوفہ میں الگ سندیں وجود میں آ گئیں۔ ایک دوسرے صاحب سن کر بصرہ چلے گئے تو بصرہ میں الگ سندیں ہو گئیں۔ اب یہ بزرگ پہلے بصرہ گئے، وہاں سے سن کر پھر کوفہ گئے۔ اس طرح سے انہوں نے کئی کئی جلدوں میں اس پورے سلسلہ اسناد کو جمع کیا۔ اس طرح اس مسلسل عمل کے ذریعے روایات اور متون کا باہمی مقابلہ (Collate) کیا گیا۔ یہ کوئی آسان عمل نہیں تھا۔ لیکن اس کے نتیجہ میں راویوں کی بھول چوک کا اور اگر ان کی کوئی کمزوری ہے اس کا پورا پورا اندازہ ہو جایا کرتا تھا۔

اس باب میں سب سے زیادہ سخت امام شعبہ بن الحجاج تھے، جن کے بارے میں چھاننے کی بات ہارون رشید نے کہی تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی کے کئی عشرے اس کام میں لگائے۔ کتنے عشرے لگائے ہم نہیں جانتے۔ لیکن کئی عشرے اس کام میں لگائے کہ مختلف راویوں سے جو احادیث آئی ہیں ان میں ویریئشنز کون کون سی ہیں، اس کی وجہ کیا ہے، کیا حافظہ میں کمی ہے یا کسی اور وجہ سے ویریئشن ہے۔ پھر انہوں نے انتہائی سختی کے ساتھ چھان بین کا یہ کام کیا۔ ان کا معیار بڑا اونچا تھا، انہوں نے اپنے اس معیار سے لوگوں کی جرح و تعدیل کی۔

جرح و تعدیل کے اس عمل میں جن لوگوں نے اپنی زندگی کھپائی۔ پچاس پچاس، ساٹھ ساٹھ اور ستر ستر سال کھپائے، ان کے اندر ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جایا کرتا تھا کہ وہ آسانی سے پتہ چلا لیا کرتے تھے کہ اس روایت میں یہ یہ کمزوریاں ہیں، الفاظ میں یہ ہونا چاہئے اور یہ ہونا چاہئے۔

ایک مشہور محدث ہیں۔ وہ اپنے زمانہ کے صف اول کے محدثین میں سے ہیں، جرح و تعدیل کے امام بھی ہیں، امام ابن ابی حاتم الرازی، جرح و تعدیل پر ان کی آٹھ جلدوں پر مشتمل ایک مفصل کتاب بھی ہے۔ امام ابن ابی حاتم کے پاس ایک صاحب آئے اور کہا کہ میرے استاد

نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی ہے اور پوری سند کے بعد حدیث بیان کی۔ امام ابن ابی حاتم نے خاموشی سے پوری حدیث سنی اور پھر کہا کہ اس میں یہ کمزوری ہے، یہ کمزوری ہے اور یہ کمزوری ہے۔ فلاں کی روایت فلاں سے ثابت نہیں ہے، فلاں کی روایت فلاں واسطہ سے ہے اور فلاں کی فلاں واسطہ کے بغیر ہے۔ کوئی آٹھ دس کمزوریاں بتائیں۔ ان صاحب نے کہا کہ آپ نے تو چیک کئے بغیر یہ سب کمزوریاں بیان کر دیں۔ آخر آپ نے یہ سب کچھ کس بنیاد پر بتا دیا؟ غالباً ان صاحب کو شبہ ہوا کہ شاید ایسے ہی کہہ دیا ہو۔ اس پر امام ابن ابی حاتم نے کہا کہ اگر آپ کو میری بات میں کوئی شک یا شبہ ہے تو امام ابوزرعہ رازی، جو ایک اور امام تھے، وہ بھی اسی درجہ کے امام ہیں اور انہوں نے بھی جرح وتعدیل پر ایک کتاب لکھی ہے، ان کے پاس چلے جائیں اور جا کر پوچھ لیں۔ وہ امام ابوزرعہ کے پاس چلے گئے۔ ان سے وہی حدیث بیان کی۔ انہوں نے بھی فوراً ہی کوئی حوالہ یا کتاب چیک کئے بغیر زبانی وہی ساری دس بارہ باتیں دوبارہ بتائیں جو اس سے قبل امام ابن ابی حاتم نے بتائی تھیں۔ اب ان صاحب کو بڑی حیرت ہوئی کہ انہوں نے بھی وہی کچھ بتایا جو ابن ابی ابوحاتم نے بتایا تھا۔ انہوں نے حیرت سے پوچھا کہ آخر آپ یہ سب باتیں کس بنیاد پر بتا رہے ہیں، آپ کی دلیل کیا ہے۔ انہوں کہا کہ جب تم کسی سنار کے پاس کوئی کھوٹا دینار لے کر جاتے ہو، اور وہ اس کو دیکھ کر کہے کہ یہ کھوٹا ہے تو کیا اس سے دلیل پوچھتے ہو؟ جیسے سنار کو کھوٹے کھرے کا اندازہ ہو جاتا ہے کیا ہمیں نہیں ہوتا؟ سنار سکہ کو ایک بار ہاتھ میں لے کر ذرا اچھالتا ہے اور اس کو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ سونا کھوٹا ہے کہ کھرا ہے۔ محدث کو، جس کی عمر اس میدان میں گزری ہو، اس کو بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کیا کھرا ہے اور کیا کھوٹا۔

جرح وتعدیل کے مشہور ائمہ

وہ حضرات جنہوں نے جرح وتعدیل میں اپنا مقام پیدا کیا ان کے نام الگ الگ بیان کئے جائیں تو بات بڑی لمبی ہو جائے گی۔ اور اگر جرح وتعدیل میں ان کا اسلوب بھی بیان کیا جائے تو بات بہت زیادہ لمبی ہو جائے گی۔ لیکن میں مختصراً، صرف برکت کے لئے اس نیت سے کہ اللہ تعالیٰ روز قیامت جب ان کا حشر کرے تو ہمیں بھی ان کے ساتھ شامل کر لے، صرف اس وجہ سے میں ان کے نام دہرا دیتا ہوں۔

(۱) امام سفیان ثوریؒ،

(۲) امام مالکؒ،

(۳) امام شعبہ بن الحجاجؒ،

(۴) امام لیث بن سعدؒ،

(۵) سفیان بن عیینہؒ،

(۶) عبداللہ بن مبارکؒ،

(۷) یحیٰ بن سعید قطانؒ،

(۸) یحیٰ بن سعید انصاریؒ۔ (یاد رہے کہ روایت میں یحیٰ بن سعید قطان اور یحیٰ بن سعید انصاری کا درجہ ایک ہے۔ لیکن جرح وتعدیل میں یحیٰ بن سعید قطان کا درجہ اونچا ہے۔)

(۹) وکیع بن الجراحؒ، یہ امام شافعیؒ کے استاد، امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد اور اپنے زمانہ کے صف اول کے محدثین میں سے تھے۔ آپ نے امام شافعی کا شعر سنا ہوگا، وہ انہی وکیع کے بارے میں ہے۔ امام شافعی کہتے ہیں ۔

شَکَوتُ الی و کیعٍ سوء حفظی   فاوصانی الی ترك المعاصی

فان العلم نور من الہٖ   و نور الله لایعطیٰ لعاصی

کہ میں نے وکیع سے اپنی یادداشت کی کمزوری کی شکایت کی۔ انہوں نے مجھے گناہ چھوڑنے کی نصیحت کی۔ اس لئے کہ علم اللہ تعالیٰ کا نور ہے اور اللہ تعالیٰ کا نور کسی گناہ گار کو عطا نہیں ہوتا۔

(۱۰) اس کے بعد امام شافعی اور ان کے شاگرد،

(۱۱) پھر امام شافعی کے شاگرد احمد بن حنبلؒ،

(۱۲) احمد بن حنبل کے ہم عصر یحیٰ بن معینؒ،

(۱۳) ان کے شاگرد علی بن المدینیؒ، جو امام بخاری کے استاد ہیں۔

یہ جرح وتعدیل کے بڑے بڑے ائمہ ہیں جو دوسری صدی ہجری کے اواخر اور تیسری صدی ہجری کے اوائل کے ہیں۔ تیسری صدی ہجری کے اوائل میں بھی بڑے بڑے محدثین ہیں

جو جرح وتعدیل کے فن میں اونچا مقام رکھتے ہیں۔ مثلاً امام دارمی جن کی سنن دارمی مشہور ہے۔ ابوزرعہ رازیؒ جن کا ذکر ابھی کیا گیا، امام ابوحاتم رازیؒ، امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ابوداؤدؒ اور ان کے بعد والے طبقہ میں امام دارقطنیؒ۔ یہ سب وہ حضرات ہیں جو علم حدیث اور جرح وتعدیل کے بڑے بڑے امام مانے جاتے ہیں۔ ان کا متفقہ فیصلہ جرح وتعدیل کے باب میں حتمی اور آخری فیصلہ سمجھا جاتا ہے۔ کسی راوی کی جرح تعدیل کے بارہ میں اگر ان حضرات میں اختلاف ہو تو اس کو دور کرنے کے تفصیلی قواعد ہیں جو جرح وتعدیل کی تفصیلات میں آتے ہیں۔

ان حضرات نے جرح وتعدیل کے کام کو کتنی دیانت داری سے کیا اس کی دو مثالیں عرض کرتا ہوں۔ دو مثالیں اس لئے کہ پہلی مثال میں شاید کوئی شبہ ہو جائے۔ ایک بزرگ تھے محمد بن ابی السَّری، جو جرح وتعدیل کے بڑے امام تھے۔ انہوں نے اپنے بھائی حسین بن ابی السری کے بارے میں کہا، کہ 'لاتکتبوا عن اخی فانه کذاب' میرے بھائی سے روایت نہ کریں اس لئے کہ وہ جھوٹا ہے۔ ممکن ہے کسی کے دل میں خیال آئے کہ بھائی سے لڑائی ہوگئی ہوگی، مکان کی تقسیم پر جھگڑا ہو گیا ہوگا یا باپ کی میراث پر اختلاف ہو گیا ہوگا اس لئے بھائی کی روایت کو قبول نہ کرنے کا مشورہ ہوگا۔ یہ سب باتیں کہنے والے کہہ سکتے ہیں۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر امام علی بن المدینی کی مثال لیجئے جو امام بخاری کے استاد تھے اور اپنے زمانے میں امیر المومنین فی الحدیث کہلاتے تھے، ان کا کہنا ہے کہ 'لاتکتبوا عن ابی، فان ابی ضعیف'، میرے والد کی روایت مت لینا، وہ ضعیف راوی ہیں۔ اپنے والد کو انہوں نے ضعیف قرار دیا اور ان کی روایات کو صحیح قرار نہیں دیا۔ باپ کے بارے میں کسی کا یہ کہنا کہ وہ علم حدیث کی رو سے ضعیف ہے یہ بہت بڑی بات ہے اور یہ بات صرف وہی آدمی کہہ سکتا ہے جو صرف اللہ سے ڈرتا ہو اور دنیا میں کسی اور کا خوف اس کو نہ ہو۔ ورنہ ممکن نہیں کہ کوئی آدمی اپنے باپ کی زندگی میں یہ کہے کہ میرے باپ کی روایت قابل قبول نہیں ہے۔ اور باپ بھی وہ جو متقی مسلمان ہو، عالم ہو، علم حدیث کا استاد اور شارح ہو، لوگ اس سے حدیث پڑھنے کے لئے جاتے ہوں، اس کے بارے میں یہ کہنا آسان نہیں ہے۔

ائمہ جرح وتعدیل کے درجات

علم حدیث اور جرح وتعدیل میں ائمہ فن کا ایک طبقہ بڑا متشدد اور سخت مشہور ہے۔ وہ ذرا سی بات میں راوی کو مجروح قرار دے دیتے ہیں۔ وہ جب کسی راوی کو عادل قرار دیتے ہیں تو بڑی مشکل سے عادل قرار دیتے ہیں۔ وہ کسی کو آسانی سے عادل قرار نہیں دیتے۔ ان متشددین میں یحییٰ بن معینؒ اور ابن ابی حاتم رازیؒ نمایاں ہیں۔ یحییٰ بن معین اور ابو حاتم رازی کے بارے میں لوگوں نے لکھا ہے کہ اگر یہ کسی کو عادل قرار دے دیں تو اس راوی کو دانت سے پکڑلو، فعضوا علیه بالنواجذ، جس طرح دانت سے مضبوطی سے پکڑا جا سکتا ہے اس طرح پکڑلو، اس لئے کہ وہ بہت پکا راوی ہے۔ جب اُن جیسے لوگ کسی کو عادل قرار دے دیں تو پھر اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اور یہ طبقہ اگر کسی کو مجروح قرار دے تو دیکھو کہ دوسرے لوگ بھی اس کو مجروح قرار دے رہے ہیں یا نہیں۔ اگر دوسرے لوگ بھی اس کو مجروح قرار دے رہے ہیں تو پھر ان کی جرح قابل اعتماد ہے۔ اور اگر دوسرے لوگ مجروح قرار نہیں دے رہے اور صرف یہی متشدد حضرات اس کو مجروح قرار دے رہے ہیں تو پھر دیکھو کہ ان کی جرح کی بنیاد کیا ہے۔ اگر وہ جرح کی کوئی پکی بنیاد اور وجہ بتا رہے ہیں تو پھر ان کی جرح قابل قبول ہے، راوی کو مجروح قرار دے دینا چاہئے۔ لیکن اگر یہ لوگ اپنی جرح کی کوئی بنیاد یا وجہ نہیں بتا رہے ہیں تو ہم یہ سمجھیں گے کہ ان کے معیار کی سختی کی وجہ سے وہ راوی ان کے پیمانے پر پورا نہیں اترا ہوگا۔ اب ایسا پیمانہ کہ کوئی آدمی اپنے باپ کو کمزور قرار دے، یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لئے اتنے اونچے پیمانے پر نہیں ناپنا چاہئے۔ لیکن اگر یہ حضرت اپنی جرح کی کوئی وجہ بتا رہے ہیں کہ میں نے اس کو فلاں کام میں مبتلا دیکھا یا فلاں جگہ غلطی کی یا جان بوجھ کر غلط بیانی کی تو پھر ٹھیک ہے۔ وہ جرح جس کی وجہ نہ بیان کی گئی ہو اس کو جرح غیر مفسر کہتے ہیں یعنی وہ جرح جس کی تفسیر بیان نہیں کی گئی ہو۔ ان حضرات کے جرح غیر مفسر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ معتبر نہیں ہے۔ جرح مفسر معتبر ہے۔

ایک طبقہ ہے متساہلین کا جو تساہل سے کام لیتے ہیں۔ ان حضرات کا انداز یہ ہے کہ انہوں نے اپنے انتہائی تقویٰ کی نظر سے سب کو دیکھا، جو بظاہر نیک اور متقی نظر آیا انہوں اس کو اپنے پر قیاس کیا اور کہا کہ یہ بھی قابل اعتماد ہے۔ ان کی جرح غیر مفسر معتبر ہے، تعدیل غیر مفسر معتبر

نہیں ہے۔ جب وہ کسی کو عادل قرار دیں تو وہ معتبر نہیں ہوگی جب تک وجہ نہ بتائیں کہ ان کو کیوں عادل قرار دے رہے ہیں۔ ان سب متساہلین میں یہ حضرات شامل ہیں: امام حاکم، امام بیہقی اور کسی حد تک امام ترمذی۔ امام ترمذی کے ہاں بھی بڑی حد تک نرمی ہے۔ اور کئی ایسے کمزور راویوں کو انہوں نے عادل قرار دے دیا ہے جو دوسرے محققین کی تحقیق میں مجروح تھے۔

ایک رویہ ہے معتدلین کا جو میانہ روی اور اعتدال سے کام لیتے ہیں۔ ان کی دونوں آراء معتبر ہیں جرح بھی اور تعدیل بھی۔ ان میں امام احمد، امام بخاری اور امام ابوزرعہ شامل ہیں۔

جرح وتعدیل پر جو کتابیں ہیں ان کی تعداد بہت بڑی ہے۔ ثقہ راویوں پر الگ کتابیں ہیں۔ ضعفا پر الگ کتابیں ہیں۔ امام بخاری کی کتاب الضعفاء ہے، امام نسائی کی کتاب ہے کتاب الضعفاء والمتروکین۔ امام دارقطنی کی کتاب ہے۔ ابن عدی کی کتاب ہے الکامل فی الضعفا۔ ان سب کتابوں کا مقصد یہ تھا کہ ایک جگہ الگ سے ضعیف راویوں کی تفصیل بیان کردی جائے تاکہ تلاش کرنے میں آسانی ہو، اور علم حدیث کے راویوں کی تحقیق کرنے والے آسانی سے ان کی تحقیق کرسکیں۔ علم جرح وتعدیل بھی علم رجال کی ایک شاخ ہے۔ اور جس طرح علم رجال ایک بے مثال علم ہے اسی طرح سے علم جرح تعدیل بھی ایک بے مثال علم ہے۔

وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العلمین

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ہمارے اسلاف نے دین کو درست انداز میں پہنچانے کے لئے کتنی کوشش کی، انہوں نے اپنی ساری زندگیاں اس میں کھپائیں، ذہن میں سوال آتا ہے کہ زندگی کی دیگر ذمہ داریاں، رزق حلال کا حصول، گھریلو اور خانگی ذمہ داریوں کی ادائیگی کس طرح ہوتی تھی؟

واقعی یہ ایک بنیادی سوال ہے۔ اس سلسلہ میں ایک مثال میں آپ کو دیتا ہوں۔ امام ربیعۃ الرائے، یعنی امام ربیعہ بن عبدالرحمٰن ایک بڑے مشہور امام ہیں، امام مالکؒ کے استاد ہیں، علم حدیث اور علم فقہ دونوں میں بڑا اونچا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے والد بہت بڑے تاجر تھے۔ انہوں نے بہت دولت اپنے گھر والوں کو دی اور تجارت کی خاطر کسی دوسرے ملک میں چلے گئے۔ وہاں حالات کچھ ایسے رہے کہ وہ وقت پر واپس نہ آسکے اور آنے میں پندرہ بیس سال لگ گئے۔ جب جارہے تھے تو ایک ننھا بچہ چھوڑ کر گئے تھے جو گھر میں رہتا تھا اور ابھی پڑھنا شروع نہیں کیا تھا۔ ان کی اہلیہ نے ان کے جانے کے بعد اس پیسے کو کسی کاروبار میں لگانے یا محفوظ رکھنے کے بجائے بچے کو جگہ جگہ بھیجا جہاں سے اس نے علم حاصل کیا اور اتنا علم حاصل کیا کہ مدینہ منورہ کے سب سے بڑے امام اور سب سے بڑے عالم ہوگئے۔ ان کی رائے اتنی قابل احترام تھی کہ لوگ دور دور سے سننے کے لئے آتے تھے اور ان کا لقب ہی ہوگیا، ربیعۃ الرائے۔ بیس پچیس سال کے بعد ان کے والد واپس آئے۔ پرانے زمانے میں دستور تھا اور سنت بھی ہے کہ جب آدمی سفر سے واپس آئے تو پہلے مسجد میں جاکر دو رکعت نفل ادا کر کے پھر گھر میں آئے۔ صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں یہ سنت رائج تھی۔ افسوس ہے کہ اب لوگوں نے چھوڑ دی ہے۔ چنانچہ امام ربیعۃ الرائے کے والد پہلے مسجد میں گئے اور نوافل ادا کئے۔ وہاں دیکھا کہ ایک بڑا خوبصورت اور صحت مند نوجوان بیٹھا ہوا ہے اور علم حدیث بیان کر رہا ہے اور لوگ سن رہے ہیں۔ یہ بڑے متاثر ہوئے کہ بڑا خوبصورت نوجوان ہے اور عالم فاضل ہے۔ جب گھر واپس آئے، گھر والوں سے ملے، بیٹے کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ کہیں گیا ہوا ہے، تھوڑی دیر میں آئے گا۔ انہوں نے کہا اچھا۔ پھر پوچھا تو یہی کہا کہ تھوڑی دیر میں آجائے گا۔ اس دوران انہوں نے اپنے پیسوں کے بارے میں پوچھا تو اہلیہ نے بتایا کہ وہ تو میں نے بڑے مفید کاروبار اور بڑی اچھی تجارت میں لگا دیئے ہیں۔ اسی اثنا میں والد صاحب اس منظر کی کئی بار تعریف کر چکے تھے جو وہ مسجد میں دیکھ کر آرہے تھے کہ مسجد میں ایک نوجوان حدیث کا درس دے رہے ہیں۔ جب انہوں نے تھوڑی دیر میں رقم کا حساب پوچھا تو پتہ

چلا کہ گھر میں تو کچھ بھی نہیں ہے سب ختم ہوگیا ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ وہ پیسہ کہاں خرچ ہوگیا تو انہیں بتایا گیا کہ ایسے کاروبار میں لگادیا گیا ہے جو بڑا مفید کاروبار تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ مفید کاروبار کہاں ہے، اس کے اثرات تو کہیں نظر نہیں آرہے ہیں۔ گھر میں تو فقر وفاقہ کا منظر نظر آرہا ہے تو جواب دیا کہ وہ آپ ہی کا بیٹا ہے جو مسجد میں درس دے رہا ہے۔ وہ آپ ہی کا صاحبزادہ ہے اور میں نے سارا پیسہ اس کی تعلیم پر خرچ کردیا ہے۔

اس طرح سے لوگ اپنی عمر بھر کی کمائی علم پر خرچ کردیا کرتے تھے۔ لیکن ایسے حضرات بھی تھے جو ایک سال تجارت کرتے تھے اور ایک سال علم حدیث کے لئے سفر کیا کرتے تھے۔ کچھ لوگ یہ کرتے تھے کہ ایک بھائی نے کاروبار کیا اور دوسرے بھائی کو حدیث کی خدمت کے لئے وقف کردیا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ ابتدائی دس بارہ سال علم حدیث میں لگائے پھر چند سال کاروبار میں لگائے، پھر علم حدیث میں میں چند سال لگائے۔ اس لئے کہ علم حدیث میں کے لئے طویل طویل سفر کرنے پڑتے تھے، اور یہ کام پیسے کے بغیر نہیں ہوسکتا تھا۔ پیسہ حاصل کرنے کے لئے محنت کرنی پڑتی تھی۔

اگر ہم علم حدیث حاصل کرنا چاہیں تو ایسے ادارے کہاں کہاں موجود ہیں براہ مہربانی مزید علم کے لئے رہنمائی کردیں۔

علم حدیث کے الگ اداروں کے بارے میں تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ البتہ دینی اداروں میں ہر جگہ حدیث پڑھائی جاتی ہے۔ بعض جگہ اچھی، بعض جگہ کمزور، لیکن اُس کے لئے آپ کو پہلے آٹھ سال ابتدائی علوم پڑھنے پڑیں گے۔ پھر علم حدیث کا نمبر آئے گا۔ اس لئے آپ عربی سیکھ کر پہلے یہاں خود پڑھنا شروع کردیں۔ یہ تو عمر بھر کا کام ہے۔

حضرات کو آپ اپنے ساتھ ایک ضخیم کتاب لائے تھے اس کا نام بتادیں۔

وہ صحاح ستہ یعنی بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور نسائی کا مجموعہ تھا۔

بخاری کی احادیث کے عنوانات میں کوئی خاص جوڑ نظر نہیں آتا......

یہ بات بظاہر صحیح معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے 'اوصانی خلیلی بثلاث'۔ اس کو بخاری میں دو عنوانات کے تحت بیان کیا گیا ہے باقی کہیں بیان نہیں کیا گیا۔ یہ بڑی غور وخوض کی بات ہے۔ اس موضوع پر لوگوں نے الگ سے کتابیں لکھی ہیں۔ امام بخاری جب

کوئی عنوان بیان کرتے ہیں تو وہ عنوان بڑی گہری بصیرت پر دلالت کرتا ہے۔ بعض اوقات حدیث کے الفاظ میں وہ چیز نہیں ہوتی، لیکن حدیث کے معانی پر غور کریں تو وہ چیز سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً میں نے صحیح بخاری کی آخری حدیث پڑھی تھی جس کا عنوان امام بخاری نے دیا ہے 'باب قول الله عزوجل و نضع موازين القسط ليوم القيامة و ان اعمال بنى آدم توزن'۔ یہ اس باب کا عنوان ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے باب میں کہ ہم روز قیامت برابر کا ایک ترازو رکھیں گے اور اس اعلان میں کہ بنی آدم کے اعمال تولے جائیں گے، یہ عنوان ہے اور حدیث ہے كلمتان خفيفتان على اللسان حبيبتان الى الرحمن ثقيلتان فى الميزان سبحان الله وبحمده سبحان الله العظيم، گویا وہ زبان سے نکلنے والا عمل میزان میں بھاری کیسے ہوگا؟ یہ ہلکا سا جملہ جو زبان سے نکلا تو اس کو کیسے تولا جائے گا۔ کیا اس کے تولے جانے کی کوئی شکل ہے؟ جب اس کے تولے جانے کی کوئی شکل ہے تو اعمال کے تولے جانے کی بھی یقیناً کوئی نہ کوئی شکل ممکن ہے۔ جب اعمال کے تولے جانے کا ذکر ہے تو موازین قسط کے معنی معلوم ہو گئے۔ اس طرح سے امام بخاری بالواسطہ طور پر بتاتے ہیں کہ ان کی مراد کیا ہے۔ صحیح بخاری کے عنوانات پر لوگوں نے الگ سے کتابیں لکھی ہیں اور درجنوں جلدوں میں، بعض اوقات بیس بیس جلدوں میں کتابیں لکھی گئی ہیں اور بخاری کے ترجمۃ الباب کی تفسیر کی گئی ہے۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی لاہور کے ایک مشہور محدث تھے، انہوں نے 'تحفۃ القاری فی حل تراجم البخاری' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو ابھی تک چھپی نہیں ہے، لیکن ان کے صاحبزادگان، جن کے پاس وہ کتاب ہے، ان کا کہنا ہے کہ اگر وہ چھپے گی تو پچیس تیس جلدوں میں آئے گی۔ اس میں صرف بخاری کے عنوانات کی تشریح ہے۔ اصل کتاب کی تشریح نہیں بلکہ صرف عنوانات کی تشریح ہے۔

شب برات کے حوالہ سے لوگوں کے جو عقائد ہیں ان کو کیسے درست کیا جائے؟

لوگوں سے ان کے عقائد کے بارے میں لڑنا جھگڑنا نہیں چاہئے۔ لوگ عقائد کے معاملہ میں خاصے متشدد ہوتے ہیں، ایک مرتبہ اختلاف میں شدت پیدا ہو جائے تو پھر کوئی آپ کی بات نہیں سنتا۔ آپ آہستہ آہستہ نرمی سے بیان کریں۔ جو لوگ شب برات پر کچھ عبادت وغیرہ کرتے ہیں وہ بھی یہ سمجھ کر کرتے ہیں کہ حدیث میں شب برات کی عبادت کا ذکر آیا ہے۔ حالانکہ کسی صحیح حدیث میں تو نہیں آیا ہے۔ اس لئے آہستہ آہستہ ان کو قائل کریں۔ اگر پہلے ہی دن تنقید

میں شدت آ گئی تو پھر مناسب نہیں ہوگا۔

حدیث میں مردوں کے لئے سونا، چاندی اور پلاٹینیم کی انگوٹھیاں استعمال کرنے کا کیا بیان ہے؟

مردوں کے لئے صرف سونے کی انگوٹھی کی ممانعت ہے۔ چاندی کی انگوٹھی اگر کسی مقصد کی خاطر ہو تو جائز ہے اور بقیہ چیزوں کی انگوٹھی پہننا مردوں کے لئے حرام نہیں ہے جائز ہے، صرف سونے کی انگوٹھی جائز نہیں ہے۔

کیا ہم حضو علیہ وسلم کو بانئ اسلام کہہ سکتے ہیں؟

میرے خیال میں تو نہیں کہنا چاہئے۔ دین تو اللہ تعالیٰ کا ہے، ان الدین عند اللہ الاسلام، رسول اللہ علیہ وسلم اس کے پہنچانے والے اور داعی ہیں۔ میرے خیال میں بانی کہنا درست نہیں ہے۔

بیہقی اور ترمذی کے حوالہ سے شعبان کی پندرھویں کی روایت کا بیان ہے۔

محدثین میں جو ذمہ دار حضرات ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اس لئے اس سے کوئی چیز ثابت نہیں ہوتی۔ لیکن چونکہ حدیث ترمذی اور بیہقی میں آئی ہے اس لئے اگر کچھ لوگ اس پر عمل کرتے ہیں تو ان سے نہ اختلاف کرنا چاہئے اور نہ خواہ مخواہ الجھنا چاہئے۔ کیونکہ وہ اپنی دانست میں تو حدیث پر ہی عمل کر رہے ہیں، چاہے وہ ضعیف ہی ہو۔ اور حدیث ضعیف کی تحقیق میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ ایک محقق کے نزدیک وہ ضعیف ہوگی تو دوسرے کے نزدیک وہ حسن لغیرہ ہوگی، تیسرے کے نزدیک حسن لعینہ ہوگی۔ تو چونکہ اس طرح کا اختلاف ہوسکتا ہے اس لئے اس میں زیادہ سختی سے کام نہیں لینا چاہئے۔ امام بیہقی کا مقام بہت ہی اونچا ہے۔ ان کا مقام اتنا اونچا ہے کہ وہ سند کے ساتھ احادیث بیان کرنے والوں کے سلسلہ کے آخری محدث ہیں۔ لیکن ان کی کتابوں میں بعض احادیث ضعاف بھی ہیں، بعض کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ موضوعات بھی ہیں۔ لیکن کسی کی غلطی سے اس کے مقام پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ غلطی سے مبرا ذات تو بس ایک ہی ہے وہ رسول اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اس رات بانٹ دیا جاتا ہے ہر حکمت والا کام......،

اکثر علماء کے نزدیک اس سے لیلۃ القدر ہی مراد ہے۔

شب برات کے متعلق وضاحت کریں۔

بھی لوگوں کو شب برات کرنے دیجئے۔ اگر لوگ آپ سے پوچھیں تو آپ صرف اتنا بتا دیجئے کہ شب برات کی کوئی با قاعدہ عبادت صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ لٹھ لے کر پیچھے پڑ جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ جا کر ریڈیو اور ٹی وی والوں سے لڑیں، یہ صحیح نہیں ہے۔ اس سے مسائل بگڑتے ہیں اور خیالات میں شدت پیدا ہوتی ہے۔ نرمی سے کام لیں۔ سختی وہاں کرنی چاہئے جہاں واضح طور پر کوئی چیز دین میں حرام اور ممنوع ہو، اور منکر کی حیثیت رکھتی ہو۔ جہاں اختلافی چیز ہو وہاں شدت نہیں کرنی چاہئے۔ صحابہ کرامؓ میں بھی اختلاف تھا۔ ایک کے نزدیک ایک عمل سنت تھا۔ دوسرے کے نزدیک دوسرا عمل سنت تھا۔ ایک صحابیؓ نے بیان کیا کہ اگر آگ پر پکی ہوئی کوئی چیز کھالی جائے تو اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ بات حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے سامنے بیان ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ اگر میں سر میں گرم تیل لگاؤں تو کیا مجھے دوبارہ وضو کرنا پڑے گا؟ کیا اگر میں گرم پانی سے وضو کروں تو دوبارہ وضو کرنا پڑے گا؟ گویا انہوں نے اس کو قبول نہیں کیا۔ اگر صحابہ میں اختلاف ہو سکتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے خلاف لٹھ لے کر نہیں نکلے تو ہم کیوں نکلیں؟ آپ شب برات پر عبادت کرنے والوں کو عبادت کرنے دیجئے۔ اس طرح کے معاملات میں زیادہ سختی نہیں کرنی چاہئے۔

ایک عالم اور محدث جو یہ جانتے ہیں کہ جو شخص حضور ﷺ سے جھوٹ بات منسوب کرے وہ دوزخ میں اپنا ٹھکانہ بنالے، پھر وہ ضعیف حدیث کیوں بیان کرتے ہیں؟

دیکھئے ضعیف حدیث ایک درجہ میں تو حدیث ہے۔ محدثین کا کہنا ہے کہ اس کو بیان کرتے وقت اس کے ضعف کا حوالہ دے دینا چاہئے کہ ایک ضعیف حدیث میں یہ بات آئی ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر ضعیف حدیث میں کوئی ایسی بات آئی ہو کہ جو ویسے خود اپنی جگہ ٹھیک ہو اور ثابت ہو، اس کو بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ایک ضعیف حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا کو صلوٰۃ التسبیح سکھائی۔ اس کا ضعف بھی کم درجے کا ہے اور اس میں ایک نماز کی تلقین ہے۔ اب اگر کوئی اس پر عمل کرنا چاہے تو کر لے، اچھی بات ہے اور اگر نہ کرنا چاہے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ کسی ضعیف حدیث کی بنیاد پر مسلمانوں میں کوئی اختلاف پیدا کرنا میرے خیال میں مناسب نہیں ہے۔

حضرت ابو بکرؓ حضور ﷺ کے بہت قریب تھے اور ہر وقت ساتھ رہتے تھے پھر ان سے اتنی

کم روایات کیوں ہیں؟

یہ بڑا اچھا سوال ہے۔ بات یہ ہے کہ روایات کی ضرورت اس وقت محسوس کی گئی جب صحابہ کرامؓ کی تعداد کم ہوتی گئی۔ چونکہ عام طور پر صحابہ کرام کو معلوم تھا کہ فلاں معاملہ میں حضور ﷺ کا فیصلہ کیا تھا اس لئے صحابہ کو آپس میں حدیث بیان کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ حدیثیں بیان کرنے کی ضرورت اس وقت پیش آئی جب تابعینؒ کا دور آیا اور تابعین کو رہنمائی کی ضرورت پیش آئی۔ صحابہ کرامؓ نے ان سے بیان کیا کہ کس معاملہ میں حضورؐ کی راہنمائی اور تعلیم کیا تھی۔ جب تک رہنمائی کی ضرورت پیش نہیں آئی تو صحابہ کرام نے روایات بیان نہیں کیں۔ ان حالات میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کس سے روایات کو بیان کرتے۔ اس لئے جو صحابیؓ جتنے متقدم ہیں یعنی جن کا زمانہ جتنا قدیم ہے ان سے روایات اتنی ہی کم ہیں۔ اور جن صحابہ کا زمانہ جتنا بعد کا ہے ان سے روایات اتنی ہی زیادہ ہیں۔ آپ دیکھیں کہ زیادہ روایات کرنے والے صحابہ وہ ہیں جن کی وفات سن اسّی، پچاسی، نوے ہجری یا اس کے بعد ہوئی، اس لئے کہ ان کو زیادہ ضرورت پڑی، لوگوں نے زیادہ رجوع کیا۔ حضرت عمرؓ سے اسی لئے روایات کم ہیں۔

کیا جرح و تعدیل کے بھی درجات ہیں؟

جی ہاں جرح وتعدیل کے بھی درجات اور طبقات ہیں۔ جن بارہ طبقات کا میں نے حوالہ دیا وہ مراتب رواۃ کہلاتے ہیں۔ ان میں پہلے چھ طبقات تو مقبول راویوں کے ہیں اور بقیہ چھ طبقات کمزور راویوں کے ہیں جن میں سے آخری چار متروک راوی ہیں اور ان کی روایت قبول نہیں کی جاتی۔ یہ خلاصہ آپ علامہ حافظ ابن حجر کی تقریب التہذیب کے مقدمہ میں دیکھ لیں اس میں لکھا ہوا ہے۔

حدیث میں مرغے کے بولنے کے وقت کی دعا کیوں سکھائی گئی ہے؟

میرے خیال میں یہ جو دعا سکھائی گئی ہے یہ بھی ایک ضعیف یا موضوع حدیث ہے۔ مجھے اس کی تحقیق نہیں ہے اس لئے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

اگر علم حدیث کے شعبہ کو اپنانا چاہوں تو کیا پہلے عربی میں ماسٹر کرنا ہوگا؟

اگر آپ علم حدیث میں ماسٹر کرنا چاہیں تو ہمارے ہاں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں داخلہ لے لیں، یہاں اصول الدین میں ایم اے ہوتا ہے، حدیث اور تفسیر میں ایک

سپیشلائزیشن ہے جس میں حدیث کے بنیادی کورسز پڑھائے جاتے ہیں۔ پہلے بی اے آنرز میں اصول الدین کرنا ہوگا جو کہ انٹرمیڈیٹ کے بعد چار سال کا کورس ہے۔اس میں بھی علم حدیث کے کورسز لازمی ہیں۔اس کے بعد دو سال کا سپیشل کورس ورک ہے پھر ایک سال کا تھیسس ہے اس میں آپ علم حدیث کے **Intensive** کورسز کر سکتے ہیں۔

کیا آج حدیث کی جو کتابیں شائع کی جاتی ہیں ان میں اتنی ہی احتیاط کی جاتی ہے جتنی پہلے کی جاتی تھی؟

میرے علم کی حد تک واقعی اتنی ہی احتیاط کی جاتی ہے جتنی ہونی چاہیے۔اتنی احتیاط کی جاتی ہے کہ صحیح بخاری کا جو نسخہ اس وقت ہندوستان اور پاکستان میں رائج ہے اس کی پروف ریڈنگ مولانا احمد علی سہارنپوری جیسے جید اور بالغ النظر عالم نے کی تھی، جو اپنے زمانہ کے صف اول کے محدثین میں سے تھے۔ برصغیر کے محدثین، وہ اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھتے ہوں یا علماء دیوبند کے مسلک سے یا کسی اور مسلک سے، لیکن ان میں بہت سے بالواسطہ یا بلاواسطہ مولانا احمد علی سہارنپوری کے شاگرد ہیں۔انہوں نے صحیح بخاری کی پروف ریڈنگ کی تھی۔اسی طرح سے ہمارے ایک دوست، جن کی ایک کتاب کا حوالہ میں اگلے کسی دن کی گفتگو میں دوں گا، ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی، وہ تقریباً بیس سال سے ابن ماجہ کے متن پر کام کر رہے تھے اور ابن ماجہ کا متن اب انہوں نے شائع کر دیا ہے اور تصحیح کا جو زیادہ سے زیادہ امکان ہو سکتا ہے اس امکان کی حد تک انہوں نے کام کیا ہے۔اسی طرح سے بعض کتابوں پر، جن میں ابوداؤد اور غالباً ابن ماجہ اور ترمذی شامل ہیں اور شاید باقی بھی ہوں گی ان پر علامہ ناصر الدین البانی نے طویل عرصہ تک کام کیا ہے اور بہت عرصہ تک کام کرنے کے بعد اب انہوں نے ان کتابوں کے صحیح ایڈیشن چھپوائے ہیں۔ان سب کتابوں پر کم و بیش بارہ سو سال سے مسلسل تحقیق کا کام ہو رہا ہے۔اس لئے آپ اعتماد کے ساتھ ان کتابوں پر بھروسہ کر سکتی ہیں۔

میں حج پر جانا چاہتی ہوں میرا محرم نہیں ہے......

جب محرم نہیں ہے تو آپ پر حج بھی فرض نہیں ہے۔آپ محرم کے ساتھ حج کریں تو زیادہ بہتر ہے۔میرا مشورہ یہی ہے۔آپ کسی کے مشورہ پر نہ جائیں اور اسی مسلک پر عمل کریں کہ بغیر محرم کے حج نہیں ہوتا۔

☆☆☆☆☆☆☆

ساتواں خطبہ

تدوین حدیث

پیر، 13 اکتوبر 2003

تدوین حدیث

تدوین حدیث کے موضوع پر گفتگو کا مقصد اس پورے عمل کا ایک خلاصہ بیان کرنا ہے جس کے نتیجہ میں احادیث نبوی کو جمع کیا گیا، مرتب کیا گیا اور کتابی صورت میں مدون کر کے ہم تک پہنچایا گیا۔ ممکن ہے آپ میں سے بعض کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ تدوین حدیث کا موضوع تو گفتگو کے آغاز میں ہونا چاہئے تھا اور سب سے پہلے یہ بتانا چاہئے تھا کہ احادیث کیسے مدون ہوئیں اور ان کی تدوین کی تاریخ کیا تھی۔

لیکن یہ موضوع میں نے نسبتاً آخر میں اس لئے رکھا ہے کہ ابتدائی چھ دن کی گفتگو سے اس بات کا ایک عمومی اور سرسری سا اندازہ ہو جائے کہ علم حدیث کی تدوین کن مضبوط علمی بنیادوں پر ہوئی ہے۔ جو لوگ علم حدیث کی تدوین کے نقطۂ نظر سے شبہات کا اظہار کرتے ہیں ان کے شبہات کتنے بے بنیاد اور کتنے کمزور ہیں۔ اس کا کچھ اندازہ گزشتہ ہفتہ کی گفتگو سے ہو گیا ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ علم حدیث کے بارے میں محدثین کرام نے جس باریک بینی اور دقت نظر سے کام لیا ہے، جتنی محنت، محبت، عقیدت اور کاوش سے علم حدیث کو آئندہ نسلوں تک پہنچایا گیا اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کو محفوظ کیا گیا وہ پوری انسانی تاریخ کا ایک منفرد، عجیب و غریب اور بے مثال کارنامہ ہے۔ اس کارنامہ سے جو لوگ واقف ہیں اور جن کو اس کارنامہ کی عظمت کا اور اس کے **magnitude** کا تھوڑا سا بھی اندازہ ہے وہ یہ بات سمجھ لیں گے کہ علم حدیث کی تدوین کے بارے میں جو شکوک و شبہات ظاہر کئے جاتے ہیں وہ بالکل بے بنیاد، نہایت کمزور اور بڑے **flimzy** قسم کے ہیں۔ اگر یہ شبہات ناواقفیت پر مبنی ہیں، تو ان سے کسی حد تک صرف نظر کیا

جاسکتا ہے۔ لیکن اگر یہ شبہات کسی بدنیتی پر مبنی ہیں اور اسلام کے بارے میں کسی بدگمانی کو پیدا کرنے کی کوشش کا ایک حصہ ہیں تو پھر یہ ایک بہت بڑا جرم ہے۔ انسانی جرم بھی ہے، علمی جرم بھی ہے اور دینی اور مذہبی جرم بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اس جرم کے اثرات سے محفوظ رکھے جو اس غلط فہمی کا کسی وجہ سے شکار ہو گئے ہیں۔

کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ حدیث کے نام سے آج جو ذخیرۂ علم و ہدایت مسلمانوں کے پاس موجود ہے وہ تاریخی اعتبار سے استناد کا وہ درجہ نہیں رکھتا جو کسی مذہبی روایت کے لئے ضروری ہے۔ یہ بات سب سے پہلے مسلمانوں میں سے کسی نے نہیں کہی بلکہ اس کا آغاز مغربی مستشرقین نے کیا۔ مغربی مستشرقین یعنی یورپ اور دنیائے مغرب کے اُن اہل علم نے جنہوں نے اسلامیات اور اسلامی علوم و فنون کا مطالعہ کیا، سب سے پہلے ذات رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نشانہ بنایا۔ سترھویں اور اٹھارویں صدی عیسوی میں اور کسی حد تک انیسویں صدی کے آغاز میں جو کتابیں لکھی گئیں ان میں بیشتر حملے رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی پر ہوتے تھے۔ ایک مسلمان ان بے بنیاد اور غلیظ باتوں کو نہیں دہرا سکتا جو مغربی مصنفین ذات رسالت مآب ﷺ کے بارے میں اپنی کتابوں میں لکھا کرتے تھے۔ لیکن بہت جلد ان کو اندازہ ہو گیا کہ یہ الزامات اتنے بودے، اتنے کمزور، اتنے غیر علمی اور اتنے غیر عقلی ہیں کہ کوئی سنجیدہ اور منصف مزاج شخص ان الزامات سے متاثر نہیں ہو سکتا۔

یا تو یہ وجہ ہوگی یا پھر خود ان کو احساس ہو گیا ہوگا کہ جو باتیں وہ کہہ رہے ہیں وہ غلط ہیں اس لئے انہوں نے اس بے کار مہم کو چھوڑ دیا اور حملہ کا رخ قرآن پاک کی طرف کر دیا۔ یعنی اب توپوں کا رخ قرآن مجید کی طرف موڑ دیا۔ قرآن مجید کے بارے میں بہت سی الجھنیں اور غلط فہمیاں پیدا کی گئیں اور انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے شروع میں قرآن پر انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور بہت سی دوسری زبانوں میں بہت کچھ لکھا گیا۔ ان تحریروں میں قرآن پاک کے بارے میں ہر طرح کی غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ چالیس پچاس سال کے بعد ان کو اندازہ ہو گیا کہ یہ چیز بھی بہت کمزور ہے اور قرآن پاک اتنی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے کہ ان بنیادوں کو اس طرح کے کمزور الزامات کی بنیاد پر ہلانا ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے قرآن مجید کو بھی چھوڑ دیا اور اپنی توپوں کا رخ حدیث نبوی کی طرف کر دیا۔ اب بڑے زور و شور

سے اس موضوع پر دنیائے مغرب میں کتابیں آنی شروع ہوئیں جن سے مشرق میں بھی بڑی تعداد میں لوگ متاثر ہونے لگے۔

میں نام نہیں لوں گا، ان میں بہت سے لوگ دنیا سے چلے گئے ہیں، لیکن مغربی محققین کو جو لوگ حرف آخر سمجھتے ہیں اور کسی انگریز یا کسی مغربی مصنف کے قلم سے نکلی ہوئی کسی بھی کمزور سے کمزور بات کو تحقیق کا سب سے اونچا معیار قرار دیتے ہیں، وہ لوگ بڑی تعداد میں مستشرقین کی تحریروں سے متاثر ہوئے اور انہوں نے حدیث کے بارے میں وہ غلط فہمیاں دہرانا شروع کر دیں جو مغربی مصنفین دہرایا کرتے تھے۔ الحمدللہ یہ دور بھی گزر گیا اور اب مغربی مصنفین نے بھی تسلیم کر لیا کہ علم حدیث کی بنیاد اتنے مضبوط اور گہرے ستونوں پر قائم ہے کہ کوئی اس کو ہلا نہیں سکتا۔ اب ان کا نشانہ دوسری چیزیں ہیں۔

علم حدیث کے بارے میں ان حضرات کا دعویٰ یہ تھا کہ پہلے نہ سنت کا کوئی تصور تھا نہ حدیث کو رسول اللہ ﷺ نے بطور ماخذ شریعت اور ماخذ قانون کے کبھی بیان کیا، نہ حدیث کے نام سے کوئی فن موجود تھا، نہ حدیث اور سنت کی حفاظت کے لئے وہ سب کچھ کیا گیا جو بتایا جاتا ہے، بلکہ یہ سب پروپیگنڈا ہے۔ یہ میں مغربی مصنفین کی بات کر رہا ہوں ذرا غور سے سن لیجئے گا۔

ان کا مفروضہ یہ تھا کہ تیسری چوتھی صدی ہجری میں مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے مختلف اقوام سے کچھ اچھی اچھی چیزیں حاصل کیں، دوسروں سے سیکھ کر اچھے اچھے اصول اپنائے۔ اور ان کو ایک مذہبی تقدس دینے کے لئے رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے منسوب کر دیا۔ یہ ساری سندیں اور ساری چیزیں جعل سازی سے گھڑی گئیں اور انہیں سابقہ لوگوں سے منسوب کر دیا گیا۔

جو آدمی علم حدیث کے بارے میں اتنا بھی جانتا ہو جتنا سمندر میں انگلی ڈال کر پانی حاصل کیا جا سکتا ہے، تو وہ اس بات کے بے بنیاد ہونے کا اتنا ہی قائل ہوگا جتنا کسی بھی بداہت کا انکار کیا جائے تو آدمی اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ جن لوگوں کو علم حدیث سے واقفیت نہیں تھی یا مغرب سے بہت زیادہ متاثر اور مرعوب تھے انہوں نے اس بات کو اس طرح دہرانا شروع کیا کہ بڑی تعداد میں مسلمان اس سے متاثر ہونا شروع ہو گئے۔ کہا جانے لگا کہ احادیث کی بنیاد محض زبانی طور پر کہی سنی باتوں پر ہے۔ امام بخاری نے اپنے زمانے میں جو اِدھر اُدھر کی باتیں سنیں وہ جمع کر دیں جو سب فضول ہیں اور ان کا کوئی اعتبار نہیں۔

جب احادیث کے بارہ میں یہ بے بنیاد اور غیر علمی بات کہی گئی تو محدثین اور علماء تاریخ نے ایک نئے انداز سے علم حدیث پر غور وخوض شروع کر دیا۔ پچھلی چھ نشستوں میں جو گفتگو ہوئی ہے ان کو سننے کے بعد آپ کو یہ بات ویسے بھی بے بنیاد معلوم ہوگی اور یہ خیال ہوگا کہ یہ اتنی کمزور اور غلط بات ہے کہ جس کا جواب ہی نہیں دینا چاہئے۔ چنانچہ شروع میں مسلمان علماء کا یہی رویّہ رہا، اس لئے کہ وہ حدیث سے واقف تھے اور علم حدیث پر ان کی نظر تھی۔ ان کو یہ چیز اتنی کمزور، اتنی سطحی اور مضحکہ خیز معلوم ہوئی کہ انہوں نے اس کا جواب دینا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں میں جو لوگ علم حدیث سے واقف نہیں ہیں یا مغربی تعلیم یافتہ ہیں اور اسلامی علوم وفنون سے ان کو مس نہیں ہے وہ ان باتوں سے متاثر ہو رہے ہیں۔ اس احساس کے بعد مسلمان علماء نے علم حدیث کے ذخائر اور تاریخ کی شہادتوں سے وہ معلومات جمع کیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ علم حدیث کا تحفظ کیسے ہوا۔ ان میں سے بعض کا ذکر پچھلی گفتگو میں آ چکا ہے اور بعض کچھ کا ذکر میں آج کی گفتگو میں کر رہا ہوں۔

پہلی بات تو مغربی مصنفین کی طرف سے یہ کہی گئی تھی کہ علم حدیث کا سارا ذخیرہ زبانی روایات کی بنیاد پر منتقل ہوا ہے۔ اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے اور تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیا جائے کہ زبانی روایات کی بنیاد پر علم حدیث مرتب ہوا ہے تو پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا زبانی روایت کی بنیاد پر کوئی چیز منتقل نہیں ہوسکتی؟ کیا ماضی میں زبانی روایات کی بنیاد پر علوم وفنون کے ذخائر منتقل نہیں ہوئے؟ کیا اگر ماضی میں کچھ ذخائر زبانی روایات کی بنیاد پر منتقل ہوئے ہوں تو کیا ان کے بارے میں بھی اسی طرح کے شک وشبہ کا اظہار کیا گیا؟ ان تینوں سوالات کے جوابات نفی میں ہیں۔ دنیا میں بہت سی اقوام کی تاریخ اور دنیا کے بہت سے اقوام کے علمی ذخائر زبانی روایات کی بنیاد پر منتقل ہوئے۔ آج اگر مسلمانوں کی حد تک اس اصول کو مان لیا جائے کہ جو چیز زبانی روایات کی بنیاد پر منتقل ہوئی ہے وہ ناقابل قبول اور ناقابل بھروسہ ہے، تو پھر مسلمانوں کے علاوہ دنیا کی ہر قوم کی روایات دریا برد کرنے کے قابل ہیں۔ اس لئے کہ دنیا کی ہر قوم میں جو روایات مذہبی اور غیر مذہبی، ادبی اور غیر ادبی اور علمی اور غیر علمی منتقل ہوئی ہیں وہ آغاز میں ساری کی ساری زبانی بنیادوں پر ہی منتقل ہوئی ہیں۔ چونکہ پوری دنیا کے تمام تحریری اور غیر تحریری ذخائر بھی زبانی روایات کے ذریعہ منتقل ہوئے ہیں۔ اس لئے پھر ان سب کو دریا برد کر دینا چاہئے۔ ظاہر ہے اس

کے لئے کوئی تیار نہیں ہوگا۔ یونانیوں کا سارا ذخیرہ آج آپ تک کیسے پہنچا؟ جو لوگ یونانیوں کے علوم وفنون پر اظہار تعجب کرتے ہیں ان سب کو اس ذخیرہ سے ہاتھ دھو لینے چاہئیں اور اس سارے ذخیرہ کو دریا برد کر دینا چاہئے۔ کیا آج افلاطون کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مکالمات کا کوئی نسخہ موجود ہے؟ کیا آج منطق پر ارسطو کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی کوئی کتاب دستیاب ہے؟ کیا اس کی تحریریں بوطیقا وغیرہ موجود ہیں؟ کیا حکیم افلاطون اور جالینوس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخے آج موجود ہیں؟ اگر یہ سب چیزیں آج موجود نہیں ہیں تو جس بنیاد پر علم حدیث پر شک وشبہ کا اظہار کیا جا رہا ہے انہی بنیادوں پر ان تمام علوم وفنون کا انکار کر دینا چاہئے؟ اور کہنا چاہئے کہ یہ نسخے افلاطون اور جالینوس نے نہیں بلکہ بعد کے کسی آدمی نے مرتب کئے تھے اور پچھلے لوگوں سے غلط منسوب کر دیئے گئے؟ یہ بات تو بڑی عجیب ہے کہ جو بات اہل مغرب سے منسوب کی جائے وہ چاہے کتنی ہی کمزور ہو ہر صورت میں قابل قبول ہے۔ اور جو چیز مسلمانوں سے نسبت رکھتی ہو اور رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے منسوب ہو، وہ کتنی ہی روز روشن کی طرح ہو کتنے ہی آہنی سلسلہ سے منسلک ہو اس کا انکار کر دیا جائے یہ بات قابل قبول نہیں ہے۔

پھر مزید برآں جو چیز تاریخی طور پر ثابت ہے اور نہ صرف ثابت ہے بلکہ بارہ تیرہ سو سال سے بھی زیادہ مدت تک لوگ اس سے اتفاق کرتے رہے ہیں، وہ عربوں کے حافظہ کا معاملہ ہے۔ عربوں کا حافظہ ضرب المثل تھا۔ عربوں نے اپنے حافظہ کی بنیاد پر جو ذخائر محفوظ رکھے، اسلام سے پہلے کے ذخائر، جن کی بنیاد پر مغربی مصنفین اسلام پر بہت سے اعتراضات کرتے چلے آئے ہیں، جن کی بنیاد پر ان کو یہ پتہ چلا کہ کفار مکہ اسلام پر کس قسم کے اعتراضات کیا کرتے تھے وہ ذخائر آج ہم تک کس ذریعے سے پہنچے ہیں؟ اب یہ بات کہ اگر کفار مکہ نے اسلام پر کوئی اعتراض کیا ہے تو وہ اعتراض تو پتھر کی لکیر ہے اور آہنی دلیل ہے کہ کفار مکہ نے اعتراض کیا تھا اس لئے کہ وہ انہی محدثین کی مرتب کردہ تاریخ میں موجود ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کونسی تاریخ میں موجود ہے؟ انہی تاریخوں میں تو موجود ہے جو بقول مغربی محققین محض زبانی روایات کی بنیاد پر ہم نے آپ تک پہنچائیں۔ مسلمانوں نے دنیا کے سامنے رکھیں۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ وہ روایت تو قابل قبول ہے جس میں کہا گیا ہو کہ ابوجہل نے یہ کہا اور ابولہب نے وہ کہا اور عبداللہ بن ابیّ نے یہ کہا، لیکن وہ روایت مشکوک ہے جس میں کہا گیا ہو کہ سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے اس طرح

سے فدائیت کا مظاہرہ کیا اور سیدنا عمر فاروقؓ نے اس طرح سے اسلام کی خدمت کی۔ اگر قابل قبول ہیں تو سب قابل قبول ہونی چاہئیں اور اگر نا قابل قبول ہیں تو سب نا قابل قبول ہیں۔ ان دونوں میں فرق اور امتیاز کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

پھر اسلام سے پہلے کے جو ذخائر عربوں نے محفوظ کئے ہیں، عرب شاعری اور خطابت کے نمونے، جاہلیت کے ادب کے نمونے، جن کو گزشتہ ڈیڑھ ہزار سال سے اہل علم و تحقیق پڑھتے چلے آرہے ہیں ان سے عربوں کے اس مزاج کا اندازہ ہو جاتا ہے جو وہ چیزوں کے محفوظ رکھنے کے بارہ میں رکھتے تھے۔ جن لوگوں نے جاہلی ادب کے نمونے جمع کر کے محفوظ کرنے میں اپنی عمریں کھپائی ہیں، جن لوگوں کو سینکڑوں اشعار پر مشتمل قصائد زبانی یاد ہوا کرتے تھے ان کے حافظہ کی مثالیں ضرب المثل ہیں۔ وہ اتنے تواتر کے ساتھ اور اتنی کثرت کے ساتھ منقول ہیں کہ کوئی ان کا انکار نہیں کرسکتا۔ اگر کوئی شخص آج اس بات کا انکار کرے کہ امرأالقیس نام کا کوئی شاعر تھا جس نے فلاں مشہور قصیدہ لکھا تھا تو وہ اس بات کا بھی انکار کرسکتا ہے کہ ہٹلر نام کا کوئی فرمانروا بھی تھا جو جرمنی میں گزرا ہے۔ یا وہ تاریخ کی ہر چیز کا انکار کرسکتا ہے۔

جن لوگوں نے یہ سینکڑوں قصائد محفوظ رکھے جو تسلسل اور تواتر کے ساتھ اسلام سے پہلے سے مشہور چلے آرہے ہیں، جو قوم ان چیزوں کو صرف ادبی ذوق اور دلچسپی کی وجہ سے محفوظ رکھتی ہے، وہ اس غیر معمولی دینی جذبہ اور حمیت کی وجہ سے، جو صحابہ کرام میں موجزن تھا، اس غیر معمولی محبت اور عقیدت کی وجہ سے جو رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کے لئے ان کے دلوں میں موجود تھی، کیوں وہ اس پورے ذخیرہ رشد و ہدایت کو محفوظ نہیں رکھ سکتے جن پر احادیث نبوی مشتمل تھیں۔

عربوں کے حافظہ کی مثالیں دیکھنی ہوں تو جاہلی ادب اور شاعری کا مطالعہ کریں کہ رسول اللہ ﷺ کی ولادت مبارکہ سے کئی کئی سو سال پہلے کے قصائد لوگوں نے نقل کئے ہیں اور آج تک اسی طرح محفوظ ہیں۔ آج زمانہ جاہلیت کے درجنوں نہیں سینکڑوں قصائد موجود ہیں۔ معلقات، اصمعیات، مفضلیات اور ایسے ہی دوسرے مجموعوں میں موجود یہ قصائد اسلام سے کئی کئی سو سال پہلے کے ہیں۔ ابھی چند سال قبل ایک معاصر عرب محقق نے تیسری صدی عیسوی کے عربی اشعار کا پتا چلایا ہے جو رسول اللہ ﷺ کی ولادت سے تین ساڑھے تین سو سال پہلے کئے گئے تھے۔

جو قوم ان اشعار کو محفوظ رکھ سکتی ہے، جن کو چودہ سو چوبیس میں آج میں آپ کو پڑھ کر

سنا سکتا ہوں، وہ قوم احادیث اور قرآن پاک کو کیوں محفوظ نہیں رکھ سکتی؟

پھر یہ مفروضہ بھی اپنی جگہ غلط ہے کہ کسی چیز کو محفوظ رکھنے کے لئے جب تک تحریری شہادتیں نہ ہوں وہ محفوظ نہیں رہ سکتی۔ حالانکہ اگر کسی تاریخی حقیقت یا واقعہ کی بنیاد صرف تحریری شہادت ہو تو وہ بھی مشکوک ہے۔ خود تحریری شہادت کے بارے میں یہ کیسے پتہ چلے گا کہ یہ وہی تحریر ہے جو فلاں سن میں لکھی گئی۔ فرض کیجئے کہ آج رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کا کوئی مجموعہ جو سیدنا ابو ہریرہؓ نے لکھا، موجود ہوتا، تو جن لوگوں کے مقدر میں ہدایت نہیں ہے وہ اس مجموعہ کے بارہ میں بھی اسی طرح شکوک وشبہات کا اظہار کرتے جیسے آج کر رہے ہیں۔ مستشرقین کہتے کہ نہیں یہ وہ مجموعہ نہیں ہے جو حضرت ابو ہریرہؓ سے منسوب کیا جاتا ہے، بلکہ یہ تو بعد میں کسی نے لکھ کر آپؓ سے منسوب کر دیا ہے۔ پھر کیا ہوتا؟ انکار کرنے والا اس کا بھی انکار کرتا۔ ماننے والے اس کے بغیر بھی مانتے ہیں، انکار کرنے والے اس کے باوجود ہر چیز کا انکار کر سکتے ہیں۔ انکار کرنے والے تو قرآن کا بھی انکار کرتے ہیں جو ہر طرح سے تواتر کے ساتھ پہنچا ہے۔ اس لئے کسی موافق یا مخالف کے انکار سے بات نہیں بنتی، بات اور دلیل اس بنیاد پر قائم ہوتی ہے کہ جو چیز پہنچائی گئی وہ کتنے استناد کے ساتھ پہنچائی گئی۔ کتنی قوت اور اہتمام کے ساتھ اس کو محفوظ رکھا گیا۔ اس کے متن کی جو اصالت یعنی **purity** اور **pristine character** ہے، اس کو آگے کس طرح سے منتقل کیا گیا۔

جس طرح سے اللہ نے عربوں کو حافظہ سے نوازا، اسی طرح سے یہ اللہ تعالیٰ کی عجیب وغریب سنت ہے اور میں اس کی بابت اپنا مشاہدہ آپ سے بیان کر سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی یہ عجیب وغریب حکمت رہی ہے کہ جو شخص علم حدیث میں دلچسپی لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے حافظہ میں برکت عطاء کر دیتا ہے۔ اس دور میں بھی جن لوگوں کا آپ نے بہترین حافظہ دیکھا ہوگا یا آئندہ دیکھنے کا موقع ملے گا وہ علم حدیث سے وابستہ ہوں گے اور جن کا علم حدیث کے ساتھ اختصاص کا تعلق ہوگا وہ حافظہ اور یادداشت میں دوسروں سے نمایاں طور پر ممتاز نظر آئے گا۔ محدث جلیل مولانا انور شاہ کشمیری کے حافظہ کے واقعات ہم سب نے کثرت سے سنے ہیں۔ ماضی قریب میں شیخ عبدالعزیز بن باز اور شیخ ناصر الدین البانی کے حیرت انگیز حافظہ کا مشاہدہ کرنے والے کثرت سے موجود ہیں۔

خود میرے ایک استاد، جن کی سند سے میں آخری دن ایک حدیث آپ کو سناؤں گا، مولانا عبدالرحمٰن صاحب مینوی، مردان کے قریب کسی علاقہ کے رہنے والے تھے، پٹھان تھے، اردو بہت کم جانتے تھے، جب میں ان سے حدیث پڑھتا تو وہ عربی، اردو پشتو کو ملا جلا کر بولا کرتے تھے۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ فجر کی نماز کے بعد درس کا آغاز کرتے تھے اور ظہر تک مسلسل پڑھایا کرتے تھے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر آرام کیا کرتے تھے، عصر کے بعد واک کرنے جایا کرتے تھے۔ مغرب کے بعد کچھ طلبہ کو ایک اور کتاب پڑھایا کرتے، عشاء کے بعد سو جایا کرتے تھے اور پھر تہجد کے لئے اٹھتے تھے۔ میں نے ان کے کمرے میں کوئی کتاب، کوئی نوٹس، کوئی یادداشتیں، کوئی اس طرح کے پوائنٹس بھی لکھے ہوئے نہیں دیکھے جس طرح کہ میں نے اس کاغذ کے پرزہ پر لکھے ہوئے ہیں۔ وہ فجر کی نماز کے بعد بیٹھتے تھے اور زبانی بیان کرنا شروع کر دیتے تھے۔ پڑھنے والا طالب علم ایک ایک حدیث پڑھتا جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ اس حدیث پر زبانی گفتگو کیا کرتے تھے، اور بتایا کرتے تھے کہ اس حدیث میں دس مسائل ہیں، اس میں گیارہ مسائل ہیں، اس میں پندرہ مسائل ہیں، پہلا مسئلہ یہ ہے، دوسرا یہ ہے، تیسرا یہ ہے۔ اس کے بعد فرماتے آگے چلو، درمیان میں ہر راوی پر ایک ایک کر کے جرح یا تعدیل کرتے تھے کہ اس راوی کے بارے میں فلاں نے یہ لکھا ہے، فلاں نے یہ لکھا ہے اور ہر راوی کی پوری تفصیل بیان کیا کرتے تھے، اس حدیث میں جتنی روایات، طرق یا variations ہوتی تھیں وہ سب بیان کیا کرتے تھے۔ میں نے کبھی ان کو کوئی کتاب چیک کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اگر میں ان کو نہ دیکھتا تو شاید میں بھی کبھی کبھی اس شبہ میں پڑ جایا کرتا کہ جو کچھ محدثین کی یادداشت کے بارے میں سنا ہے وہ شاید مبالغہ آمیز ہو، لیکن چونکہ ان کو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا، اس لئے میرے ذہن میں کسی مبالغہ آمیزی کا وسوسہ نہیں آتا۔ میں نے کئی اور لوگوں کو بھی دیکھا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ علم حدیث سے وابستہ رہنے والے افراد کے حافظہ میں ایک خاص برکت عطا فرما دیتا ہے جو باقی لوگوں کے حافظہ میں اکثر نہیں ہوتی۔

امام احمد بن حنبلؒ جن کے نام سے ہر مسلمان واقف ہے، جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے بارے میں یہ روایت ہے کہ ان کے پاس علم حدیث کے بارے میں اپنی یادداشتوں کے جو تحریری ذخائر تھے، وہ بارہ اونٹوں کے بوجھ کے برابر تھے۔ عربی زبان میں ایک لفظ آتا ہے

'حِمْل'۔قرآن مجید میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے ' حِمْل بعیر و انا به زعیم' ایک اونٹ کا بوجھ، تو حمل اس وزن کو کہتے ہیں جو ایک اونٹ پر لادا جاسکے۔ اور ایک اونٹ پر دونوں طرف لادا جاتا ہے۔ امام احمد کے پاس جو تحریری ذخائر تھے وہ بارہ اونٹوں کے بوجھ کے برابر تھے۔ کتنے ذخائر تھے، یہ تو کوئی اہم بات نہیں ہے۔ اس سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن اصل اور اہم بات یہ ہے کہ امام احمد نے خود کئی مرتبہ یہ بات ارشاد فرمائی اور ان کے جاننے والوں نے اس کی تصدیق کی ہے کہ یہ سارے ذخائر ان کو زبانی یاد تھے۔

یحیٰی بن مَعین نے لکھا ہے کہ میں نے اپنے اس ہاتھ سے چھ لاکھ روایات لکھی ہیں۔ روایات سے مراد ہے کہ ایک حدیث مختلف روایات سے آئے تو حدیث ایک ہی رہے گی۔ لیکن روایات بہت سی ہوں گی۔ اس کو حدیث بھی کہتے ہیں، روایت بھی کہتے ہیں اور طریق بھی کہتے ہیں۔ تو یحیٰی بن مَعین نے چھ لاکھ روایات اپنے ہاتھ سے لکھی ہیں اور یہ سب کی سب ان کو زبانی یاد تھیں اور ان میں سے کوئی چیز انہیں بھولی نہیں تھی۔

ابوزرعہ رازی نے لکھا ہے، کہ میں نے سفید پر سیاہ رنگ سے کوئی ایسی چیز نہیں لکھی الاواحفظہ، جو مجھے یاد نہیں ہے۔ کاغذ پر جو بھی لکھا وہ میں نے یاد کر لیا اور مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یاد ہو گیا۔ امام شعبیؒ، امام ابوحنیفہ کے اساتذہ میں سے ہیں، انہوں نے بھی یہی بات لکھی ہے کہ میں نے کسی سفید چیز پر سیاہ رنگ سے ایسی کوئی چیز نہیں لکھی، اور کسی شخص نے مجھے کوئی ایسی حدیث روایت نہیں کی جو مجھے زبانی یاد نہ ہو، ہر چیز کو میں نے زبانی یاد کیا۔

اسلام کے ابتدائی ادوار میں لکھنا کوئی کارنامہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لکھنے پر تو اب زور دیا جانے لگا ہے۔ ان کے ہاں اصل کارنامہ یہ تھا کہ یاد کتنا ہے۔ آپ نے بچپن میں شاید امام غزالیؒ کا قصہ پڑھا ہوگا۔ ایک زمانہ میں تیسری چوتھی جماعت کے کورس کی کتاب میں لکھا ہوتا تھا، کہ امام غزالی کئی سال تک طلب علم کر کے کہیں سے اپنے وطن واپس آرہے تھے۔ اپنی یادداشتیں، نوٹس اور کتابیں وغیرہ ایک گٹھڑی میں باندھ کر ساتھ لئے ہوئے تھے۔ قافلہ پر ڈاکہ پڑا۔ ڈاکو دوسری چیزوں سمیت ان کی گٹھڑی بھی اٹھا کر لے گئے۔ امام غزالیؒ جو اس وقت نوجوان تھے اور عالم فاضل ہو چکے تھے، ڈاکوؤں کے سردار کے پاس گئے اور کہا کہ میری گٹھڑی میں تو کوئی مال و دولت نہیں تھی، وہ تمہارے کسی کام کی نہیں۔ اس لئے وہ مجھے واپس کر دو۔ ڈاکوؤں کے سردار نے

کہا کہ اس میں کیا تھا؟ امام غزالی نے کہا کہ میں طلب علم کے لئے گیا تھا اور دس بارہ سال میں جو علم سیکھ کر آرہا ہوں وہ تحریری یادداشتوں کی صورت میں اس گٹھڑی میں موجود ہے۔ میری یادداشتیں اس گٹھڑی میں ہیں، وہ مجھے واپس کردو۔ اس زمانے میں ڈاکو بھی بڑے 'عالم فاضل' ہوتے تھے۔ ڈاکوؤں کا سردار ہنسا اور اس نے کہا کہ اچھا تمہارا علم اس گٹھڑی میں ہے؟ یہ کیا علم ہوا کہ اگر ڈاکو تمہاری کتابیں لوٹ لیں تو تم جاہل؟ اور تمہاری گٹھڑی واپس کردیں تو تم عالم؟ وہ کیا علم ہے جو گٹھڑی میں رکھا ہوا ہو اور اگر گھٹڑی لٹ گئی تو تم جاہل ہو گئے، اور اگر واپس مل گئی تو عالم ہو گئے۔ امام غزالی پر اس کا بڑا اثر ہوا، کہنے لگے کہ واقعی ڈاکو ٹھیک کہتا ہے۔ چنانچہ دوبارہ واپس گئے، دوبارہ کسب فیض کیا اور جو پڑھا تھا سارا زبانی یاد کیا اور کہا کہ اب میں کسی چیز کا محتاج نہیں ہوں، مجھے سب زبانی یاد ہے۔

آپ نے ڈاکٹر حمید اللہ کا نام سنا ہوگا، میں نے ان کو دیکھا ہے۔ ان کا موضوع بھی علم حدیث تھا۔ اور آج ان کے ایک دو حوالوں سے بات بھی ہوگی۔ انہوں نے علم حدیث پر بڑا کام کیا۔ وہ پوری دنیا میں جایا کرتے تھے۔ میں نے بھی ان کے ساتھ بعض سفر کئے ہیں۔ ان کے پاس کوئی ساز وسامان نہیں ہوتا تھا۔ ان کی جیب میں ایک قلم ہوتا تھا، دوسری جیب میں چند لفافے اور ایروگرام ہوتے تھے۔ جب بھی کہیں سفر پر جانا ہوتا تھا خالی ہاتھ گھر سے نکل کر جہاز میں سوار ہوکر روانہ ہوجاتے تھے۔ نہ ان کے پاس کپڑے ہوتے تھے نہ کتابیں نہ کاغذ۔ رات کو اوپر کا جو لباس ہوتا تھا اس کو اتار دیا کرتے تھے اندر سے ایک اور لباس کرتا پاجامہ نکلتا تھا، اس کو پہن کر سو جایا کرتے تھے۔ ہفتہ دو ہفتے تو اسی طرح گزار دیتے تھے۔ زیادہ عرصہ کے لئے جانا ہوتا تھا تو کپڑوں کے ایک دو جوڑے چھوٹے سے بیگ میں ساتھ لے لیتے تھے۔ علم ان کے دماغ میں اور قلم ان کی جیب میں ہوا کرتا تھا۔ دنیا کے ہر موضوع پر گفتگو اور تقریر کرتے تھے، خطبات بہاولپور کے نام سے ان کے لیکچر آپ نے سنے ہوں گے۔ جب خطبات بہاولپور دینے کے لئے آئے تھے تو ان کے پاس کوئی یادداشت یا کوئی کتاب نہیں تھی سب زبانی دیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کا یہ منظر تو میں نے بھی دیکھا ہے اور لوگوں نے بھی دیکھا ہوگا۔

محدثین کے ہاں بھی مسلمانوں کی روایت کے عین مطابق کاغذ پر لکھا ہونا کوئی کارنامہ نہیں تھا، بلکہ یادداشت اصل کارنامہ تھی۔ محدثین میں ایسے حضرات بھی تھے جو پہلے حدیث کو لکھتے

تھے، لکھنے کے بعد یاد کرتے تھے، یاد کرنے کے بعد ضائع کردیا کرتے تھے۔ حضرت سفیان ثوری نے اپنے تمام ذخائر لکھے، لکھ کران کو یاد کیا، یاد کرنے کے بعد ان تحریروں کو مٹا کر ضائع کردیا۔ وجہ یہ ارشاد فرمائی کہ 'خوفا من ان یتکل القلب علیه' یعنی اس خوف سے ضائع کررہا ہوں کہ میرا دل اس پر مطمئن نہ ہوجائے، بھروسہ نہ کرلے کہ لکھا ہوا تو موجود ہے اس لئے یاد رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر چیز لکھی ہوئی ہو اور کتاب آپ کے پاس رکھی ہو تو خیال ہوگا کہ جب ضرورت ہوگی دیکھ لیں گے۔ یاد کرنے کو دل نہیں چاہے گا۔ لیکن اگر کوئی آپ کو ایک تحریر دے کر کہے کہ کل واپس کردیں اور آئندہ کبھی آپ کو نہیں ملے گی تو آپ اس کو یاد کرنے پر توجہ دیں گے اور وہ جلدی آپ کو یاد ہوجائے گی۔ اس لئے محدثین نے یاد کرنے پر بھی زور دیا اور تحریری ذخائر پر بھی زور دیا۔

کیا رسول اللہ ﷺ نے احادیث لکھنے سے منع فرمایا؟

کتب حدیث کی جمع اور تدوین کا کام رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارک میں شروع ہوگیا تھا جس میں سے بعض مثالیں میں آپ کے سامنے عرض کردیتا ہوں۔ لیکن مثالیں دینے سے پہلے ایک مسئلہ کو صاف کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے احادیث کو لکھنے سے منع فرمایا۔ اسی طرح سے بعض واقعات میں یہ بھی آتا ہے کہ خلفائے راشدین میں سیدنا ابوبکر صدیقؓ اور سیدنا عمر فاروقؓ نے پہلے احادیث کے مجموعے مرتب کرائے یا مرتب کرانے کا ارادہ ظاہر کیا، اور بعد میں یا تو ارادہ بدل دیا، یا اس تیار شدہ مجموعہ کو ضائع کردیا۔ ان روایات کی بنیاد پر منکرین حدیث نے بہت کچھ حاشیہ آرائی کی ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چونکہ احادیث کو لکھنے سے منع کردیا تھا اس لئے علم حدیث کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ نہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی سنت کو واجب التعمیل قرار دیا ہے اور نہ قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے سنت ضروری ہے۔ اگر سنت واجب التعمیل اور تدوین حدیث ضروری ہوتی تو رسول اللہ ﷺ احادیث کو بھی اسی طرح لکھواتے جس طرح قرآن مجید کو لکھوایا۔ یہ بظاہر ایسی مضبوط دلیل معلوم ہوتی ہے کہ جو شخص اس کو پڑھتا ہے وہ متاثر ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ تصویر کے بہت سے پہلوؤں میں سے ایک چھوٹا سا رخ ہے۔ آپ نے ممانعت کیوں فرمائی؟ کن لوگوں کے لئے ممانعت فرمائی؟ کس زمانے

میں ممانعت فرمائی؟ اس پر کوئی منکر حدیث اظہار خیال نہیں کرتا۔ اسی طرح وہ احادیث بھی موجود ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ نے احادیث لکھنے کی اجازت دی، احادیث کو لکھوایا، اپنے حکم سے اپنے بعض ارشادات کو ضبط تحریر میں منتقل کروایا اور صحابہ کرام کو تحریری طور پر منتقل کیا۔ کوئی منکر حدیث کبھی اس کا ذکر نہیں کرتا۔ اس لئے کہ یہ ان کے نقطۂ نظر کے خلاف ہے۔ عدل وانصاف اور **Objectivity** کا تقاضہ تو یہ ہے کہ تصویر کے دونوں رخ دکھائے جائیں اور پھر دلیل سے ثابت کیا جائے کہ اصل بات کیا ہے۔

مثال کے طور ایک جگہ حدیث میں آتا ہے 'لا تکتبوا عنی'، میری طرف سے مت لکھو، ومن کتب عنی غیر القرآن، اور جو شخص مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ لکھے، فلیمحہ، اس کو مٹادے، وحدثوا عنی، ہاں میری طرف سے روایت کرو، ولا حرج، اس میں کوئی حرج نہیں، ومن کذب علي متعمداً فلیتبوّأ مقعدہ من النار۔ یہ ہے وہ حدیث جس کے بارے میں منکرین حدیث کا کہنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے احادیث کو لکھنے سے منع فرمایا تھا۔ اس لئے ان لوگوں کے دعوے کے مطابق آپؐ کے زمانے میں احادیث نہیں لکھی گئیں۔ صحابہ کرام نے نہیں لکھیں اور جب صحابہ کرام نے نہیں لکھیں تو بعد میں لکھے جانے کا کوئی اعتبار نہیں۔ لیکن اس مذکورہ بالا حدیث سے مراد کیا ہے، یہ رسول اللہ ﷺ نے کس کو منع کیا تھا اور کیوں منع کیا تھا؟ یہ ایسی چیز ہے جس پر منکرین حدیث زور نہیں دیتے۔ لیکن خود اس روایت میں دو لفظ بڑے قابل غور ہیں۔ ایک آپ نے یہ فرمایا کہ حدثوا عنی، مجھ سے احادیث بیان کرو، اس میں علم حدیث اور آپؐ کے ارشادات سن کر روایت کرنے کا حکم واضح طور پر موجود ہے، گویا اس حدیث سے کم سے کم اتنا تو ثابت ہوا کہ آپ نے زبانی روایت کرنے کا حکم دیا اور احادیث کو زبانی منتقل کرنے کا حکم دیا۔ لکھنے کی ممانعت کی، لیکن زبانی بیان کرنے کا حکم دیا۔ دوسرا اہم لفظ ہے کہ جو کوئی قرآن کے علاوہ کچھ لکھے اس کو مٹادے، آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ اس کو ضائع کردے، پھاڑ دے یا پھینک دے۔ یا اس کو جلادے ویا زمین میں دفن کردے، مٹادینے کا لفظ ذرا غور سے یاد رکھئے گا اس پر آگے بات آئے گی۔

تدوین حدیث حضورؐ کی حیات مبارکہ میں

اس کے ساتھ ساتھ ایسے بہت سے واقعات ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف صحابہ

کرام کو لکھنے کی اجازت دی بلکہ آپؐ کی موجودگی میں اور آپ کی مجلس میں صحابہ کرامؓ آپؐ کے ارشادات کو لکھا کرتے تھے اور ان کے مجموعے مرتب کیا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی روایت سنن دارمی میں منقول ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں بیٹھا ہوتا تھا اور جو کچھ آپؐ ارشاد فرمایا کرتے تھے وہ لکھا کرتا تھا۔ مجھ سے قریش کے بعض ذمہ دار حضرات نے یہ کہا کہ تم رسول اللہ ﷺ کی ہر بات لکھتے ہو۔ ممکن ہے بعض اوقات آپؐ غصہ میں ہوں، بعض اوقات مزاح کا موڈ ہو سکتا ہے اور وہ کوئی بات مزاح کے طور پر ارشاد فرما سکتے ہیں، تو تم ہر بات کیوں لکھتے ہو؟ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ لوگ ایسا کہتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ نہیں جو سنو وہ لکھو فَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ مَا خَرَجَ مِنْهُ اِلّا حق۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے میری زبان سے حق کے علاوہ کوئی اور بات نہیں نکلتی۔ اب دیکھئے کہ آپؐ نے قسم کھا کر فرمایا کہ جو میں کہتا ہوں وہ حق کہتا ہوں لہٰذا لکھو۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ جو بات سنتے تھے وہ لکھا کرتے تھے۔ ایک روایت کے مطابق انہوں نے ڈیڑھ ہزار احادیث اس مجموعے میں لکھیں۔ یہ مجموعہ صحیفہ صادقہ کہلاتا ہے۔ اس مجموعہ کی اپنی ایک تاریخ ہے، اس مجموعہ کی تاریخ پر اگر بات شروع کی جائے تو گفتگو بہت لمبی ہو جائے گی۔ یہ مجموعہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کے بعد ان کے صاحبزادے کے حصہ میں آیا۔ انہوں نے اپنے والد سے پڑھنے کے بعد اس کو روایت کرنے کی اجازت حاصل کی۔ وہ آگے اس کو بیان کیا کرتے تھے۔ ان کے بعد یہ مجموعہ ان کے پوتے کے حصہ میں آیا جن کا نام شعیب تھا۔ اس کے بعد ان کے پڑپوتے عمرو کے حصہ میں آیا، اور وہ اس کی روایت کیا کرتے تھے۔ کتب حدیث میں آپؐ نے یہ روایت بارہا پڑھی ہوگی، مسند امام احمد اور ترمذی کے ساتھ ساتھ اور بھی کئی کتابوں میں ہے۔ عن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده عن النبي عليه الصلوٰة و السلام، عمر بن شعیب اپنے والد سے، وہ اپنے دادا سے، یعنی والد اپنے دادا سے، جدہ کی نسبت عمرو کی طرف نہیں ہے، شعیب کی طرف ہے کہ شعیب اپنے داد سے روایت کرتے ہیں، یعنی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے یہ بات اس طرح فرمائی۔ یہ ایک ذخیرہ تھا جو صحابہ کے زمانہ سے پہلے ایک صحابیؓ نے حضورؐ کی مجلس میں مرتب کیا،

اس کو زبانی یاد کیا، زبانی یاد کرنے کے بعد اپنے بیٹے کو پہنچایا، بیٹے نے آگے لوگوں تک پہنچایا اور ان کے شاگردوں نے آگے تک پہنچایا، اور یوں یہ ذخیرہ امام احمد بن حنبلؒ تک پہنچا۔ امام احمد بن حنبل نے اس ذخیرہ کا بیشتر حصہ اپنی مسند میں محفوظ کرلیا۔ (سارا اس لئے نہیں کیا کہ احادیث کے انتخاب میں ان کا اپنا ایک معیار تھا۔) اب مسند امام احمد میں بعض تخفیفات کے ساتھ تقریباً پورا کا پورا موجود ہے۔ مسند امام احمد تیسری صدی ہجری میں لکھی گئی۔ لہٰذا یہ کہنا کہ تیسری صدی ہجری میں لکھے جانے والے مجموعوں میں لوگوں نے یادداشت سے سنی سنائی باتیں لکھ دیں، اس کی ایک تردید تو آپ کے سامنے آ گئی کہ مسند امام احمد میں ایک ایسا ذخیرہ موجود ہے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارک میں لکھا گیا اور منتقل ہوتے ہوتے امام احمد تک آ گیا۔ زبانی یادداشت بھی رہی، تحریری روایت بھی رہی، اجتماعی روایت بھی رہی انفرادی روایت بھی رہی۔ اور امام احمد نے اس کو جوں کا توں شامل کر دیا۔ لہٰذا امام احمد کے بارے میں یہ اعتراض تو بے بنیاد اور کمزور ثابت ہو گیا کہ انہوں نے سنی سنائی باتیں لکھی تھیں۔ اس ایک مجموعے سے یہ بات ثابت ہوگئی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ انہوں نے بتایا کہ میں اور عبداللہ بن عمرو بن العاص ہم دونوں حضورؐ کی مجلس میں بیٹھے ہوتے تھے، ان کے پاس حدیثیں زیادہ ہوتی تھیں اور میرے پاس کم ہوتی تھیں۔ فانہ کان یکتب و لا اکتب' اس لئے وہ لکھتے رہتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا۔ اس لئے ان کا مجموعہ زیادہ تھا۔ میرا تھوڑا تھا۔ پھر ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ میں نے حضورؐ سے شکایت کی کہ مجھے اکثر یاد نہیں رہتا تو آپؐ نے فرمایا کہ لکھ لیا کرو، مجھے لکھنے کی ہدایت کی تو اس وقت سے میں بھی لکھنے لگا۔ حافظہ کی کمزوری کی شکایت کے حوالہ سے آپؐ نے فرمایا؛ ایک چادر لاؤ، میں نے ایک چادر یا رومال میں نے لاکر پیش کر دیا۔ اس میں آپؐ نے کچھ پڑھ کر پھونکا۔ اس کو باندھ کر مجھے دے دیا کہ اس کو سینے سے لگا لو۔ جب سے میں نے سینے سے لگایا اس وقت سے میں کوئی بات بھولتا نہیں ہوں۔ مجھے ہر چیز یاد رہتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی طرح سے میری یادداشت بھی تیز ہوگئی۔

یہ مجموعہ جیسا کہ میں پہلے ایک مثال میں بیان کر چکا ہوں، حضرت ابو ہریرہؓ کے پاس موجود تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ اس مجموعہ سے روزانہ اپنی یادداشت کو چیک کیا کرتے تھے۔ اور اس مجموعے میں جو چیزیں لکھی ہوئی تھیں ان کو روایت کیا کرتے تھے۔ لوگ وقتاً فوقتاً چیک کرتے

رہتے تھے۔ جیسا کہ مروان بن حکم خلیفہ نے ایک مرتبہ چیک کیا تھا، اور چیک کرنے کے بعد بعینہ وہی نکلا تھا جو پہلے سے لکھا ہوا تھا۔ لہٰذا حضرت ابوہریرہؓ، جو حضورؐ کے انتقال کے بعد پچاس سال تک زندہ رہے، اور اپنی زندگی کے اگلے پچاس سال تک جو بھی روایات بیان فرماتے رہے اس میں کسی ایک رو' ت اور ان کے تحریری ذخیرہ میں التباس نہیں ہوا۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ 'قَیِّدوا العلم بالکتاب'، کہ جو علم تم مجھ سے حاصل کرتے ہو اس کو تحریر میں قید کرو، ضبط تحریر میں لاؤ۔ یہ تیسری مثال ہے کہ حضورؐ نے لکھنے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ حکم ارشاد فرمایا۔ حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے، امام سیوطی نے تدریب الراوی میں نقل کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ ہم آپ سے بہت سی اشیا سنتے ہیں تو کیا ان کو لکھ لیا کریں؟ آپؐ نے فرمایا 'اکتبوا و لا حرج' لکھ لیا کرو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس کے بعد رافع بن خدیج بھی لکھنے لگے۔ یہ ایک اور صحابیؓ کی مثال آپ کے سامنے آئی۔ کہ صحابہ حضورؐ کے ارشادات حضورؐ کے زمانہ ہی میں حضورؐ کی اجازت سے لکھا کرتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ جب فتح مکہ کے موقع پر مکہ میں داخل ہوئے تو آپ کو معلوم ہے کہ تمام کفار مکہ آپؐ کے سامنے موجود تھے۔ آپؐ نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ جب آپؐ یہ خطبہ ارشاد فرما چکے، تو یمن سے آنے والے ایک صحابیؓ تھے جن کا نام ابوشاہ تھا، انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ نے خطبہ میں بہت اچھی باتیں ارشاد فرمائیں یہ خطبہ اگر کوئی مجھ کو لکھ کر دے دے تو بڑا ہی اچھا ہوگا۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا 'اکتبوا لابی شاہ' ابوشاہ کو لکھ کے دے دو۔ لوگوں نے ابوشاہ کو خطبہ کا مکمل متن لکھ کر دے دیا جو ان کے پاس لکھا ہوا موجود تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے حکم سے آپؐ کا پورا خطبہ لکھ کر ایک صحابیؓ کو دے دیا گیا۔

یہ کہنا کہ حضورؐ نے تمام احادیث کو لکھنے کی ممانعت کر دی تھی یہ ایک بالکل بے بنیاد اور غلط بات ہے۔ جامع ترمذی کی روایت ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، جو ایک بڑے صحابیؓ ہیں، ہجرت سے پہلے مدینہ کے سرداروں میں شمار ہوتے تھے، قبیلہ خزرج کے بڑے سرداروں میں سے تھے اور اتنے بڑے سردار تھے، اتنے بڑے سردار تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا جب انتقال ہوا تو انصار کو یہ خیال ہوا کہ ان کو رسول اللہ ﷺ کا جانشین ہونا چاہئے۔ اگر رسول اللہ ﷺ

کا جانشین انصار میں سے ہوتا تو یقیناً سعد بن عبادہؓ ہی ہوتے ، ان کے پاس ایک تحریری ذخیرہ احادیث موجود تھا۔ کان یملك صحیفة، ان کی ملکیت میں ایک صحیفہ یعنی ایک کتاب تھی، جمع فیھا طائفة من احادیث الرسول علیه الصلوٰة والسلام وسننه ' جس میں انہوں نے احادیث رسول اور سنتوں کی ایک بڑی تعداد محفوظ کر رکھی تھی۔ یعنی ان کے پاس احادیث رسول اور سنن پر مشتمل ایک ایک لکھا ہوا مجموعہ موجود تھا۔ ان کے بعد وہ صحیفہ ان کے صاحبزادے کے پاس گیا۔ ان کے صاحبزادے لوگوں کو اس کی روایت کر کے اور پڑھ کر سنایا کرتے تھے اور لوگ اس کی نقلیں ان سے حاصل کیا کرتے تھے۔ وہ ذخیرہ حضرت سعد بن عبادہؓ کے صاحبزادے کے بعد ان کے شاگردوں کے پاس گیا۔ پہلے تو ایک ہی نسخہ تھا، اب اس کے سینکڑوں نسخے تیار ہو گئے۔ ہر شاگرد نے اپنا نسخہ تیار کر لیا۔ جیسا کہ طریقہ تھا کہ استاد اپنا نسخہ سامنے رکھ کر بولتے تھے اور شاگرد لکھتے جاتے تھے۔ ہر شاگرد کے پاس ایک نسخہ تیار ہو جاتا تھا۔ یہ ایک اور اہم مثال ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں صحابہ کرامؓ نے احادیث کے نسخے تیار کئے اور لکھ کر ان کو محفوظ رکھا۔

اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ نے کم وبیش، بعض روایات میں آتا ہے 104، بعض میں آتا ہے 105 تبلیغی خطوط مختلف حکمرانوں کے نام لکھے۔ اگر حضورؐ کا ہر ارشاد حدیث ہے تو ہر نامہ مبارک بھی ایک حدیث ہے۔ تبرکاً ایک نامہ مبارک سنا دیتا ہوں:

بسم الله الرحمن الرحيم

من محمد عبدالله ورسوله الى هرقل عظيم الروم۔ سلام علىٰ من اتبع الهدىٰ

اما بعد فاني ادعوك بدعاية الاسلام۔ اسلم تسلم يوتك الله اجرك مرتين۔ فان توليت فانما عليك اثم اليريسيين۔ والسلام على من اتبع الهدىٰ ۔

محمد رسول الله

یہ نامہ مبارک بلا شک وشبہ حدیث تھی، حضورؐ نے لکھوائی۔ 104 اس طرح کی احادیث آپ نے لکھوائیں۔ مختلف لوگوں کو آپؐ نے بھیجیں۔ ان میں سے چھ آج بھی اپنی اصلی صورت میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہؒ نے فرانسیسی زبان میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا مضمون یہی چھ اصل نامہ ہائے مبارک ہیں جو مختلف مقامات پر موجود ہیں۔ انہوں نے ان کی پوری تفصیل اور

تاریخ اس کتاب میں بیان کی ہے۔ایک بڑی اہم چیز یہ ہے کہ یہ متن جو میں نے آپ کے سامنے پڑھا ہے آپ نے بعض کیلینڈروں میں بھی اس کو چھپا ہوا دیکھا ہوگا، بعض نقشوں میں بھی چھپا ہوا دیکھا ہوگا، یہ متن بار ہا چھپا ہے۔لوگ اس کو نقل کرتے ہیں۔ یہ متن اور صحیح بخاری میں دیا ہوا متن بالکل ایک ہے۔ دونوں میں سو فیصد یکسانیت ہے۔ یہ مکتوب نبوی 1864ء میں ایک عیسائی کے پاس دریافت ہوا تھا۔اس کی تاریخ بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔لیکن جب یہ دریافت ہوا اور اس کی یہ عبارت پڑھی گئی تو پتہ چلا تو اس کا متن بعینہ وہی ہے جو صحیح بخاری میں لکھا ہوا ہے۔ گویا صحیح بخاری کے ایک ماخذ کی تصدیق ہوگئی۔ کہ آج جس چیز کا اصل نسخہ دریافت ہوا ہے وہ صحیح بخاری میں تیسری صدی ہجری میں اسی طرح لکھی گئی تھی۔اب اس بات کی گویا ایک اور تصدیق ہوگئی کہ صحیح بخاری مرتب کرتے وقت امام بخاری کے پاس جو ماخذ تھے وہ بالکل صحیح ترین ماخذ تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے صرف ان نامہ ہائے مبارک پر اکتفا نہیں فرمایا تھا۔آپ نے پڑھا ہوگا کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپؐ نے مدینہ کے قبائل اور یہودیوں کے درمیان ایک معاہدہ فرمایا جو میثاق مدینہ کہلاتا ہے۔ یہ 52 دفعات پر مشتمل دنیا کا پہلا تحریری دستور ہے۔اس سے پہلے کوئی دستور تحریری طور پر مرتب نہیں ہوا۔دنیا کی کسی قوم میں اس طرح کی کسی تحریری اور مدون دستوری قانون کی اس سے پہلے کوئی مثال نہیں ملتی، یہ دستاویز کسی مدوّن دستور کی پہلی مثال ہے۔ یہ حضورؐ نے لکھا، لوگوں نے اپنے پاس محفوظ رکھا۔آج اس کا متن کتب حدیث میں موجود ہے۔ صحیح بخاری میں اس کا بالواسطہ حوالہ ہے، سنن ابوداؤد میں اس کے بعض حوالے اور سیرت ابن ہشام میں اس کا پورے کا پورا متن نقل ہوا ہے۔ یہ اس بات کی ایک اور مثال ہے کہ عہد نبوی میں حدیثیں لکھی گئیں اور رسول اللہ ﷺ کے حکم سے لکھی گئیں۔

ان کے علاوہ حضورؐ نے مختلف قبائل سے معاہدے فرمائے ، ہر معاہدہ ایک حدیث ہے۔اس لئے کہ کس معاہدہ میں کس قبیلہ کے ساتھ آپؐ نے کیا شرائط طے فرمائیں؟ کس قبیلہ کو کونسی مراعات عطا فرمائیں، غیر مسلموں کو کیا حقوق دیئے؟ یہ سب ان معاہدوں سے ثابت ہوتا ہے۔تو یہ سب معاہدے احادیث ہیں۔اس طرح کے جو معاہدے رسول اللہ ﷺ نے فرمائے ان کی تعداد کم وبیش چار ساڑھے چار سو کے قریب ہے۔ ان میں سے بیشتر معاہدے آج بھی موجود ہیں اور مکاتیب نبوی اور وثائق نبوی کا اہم حصہ ہیں۔اس موضوع پر درجنوں کی تعداد میں

الگ سے کتابیں موجود ہیں جو صدر اسلام سے آج تک لکھی جارہی ہیں۔ لوگ ان پر کام کر رہے ہیں۔ اس لئے ان مثالوں کے بعد یہ کہنا کہ رسول اللہ ﷺ نے حدیث لکھنے کی ممانعت کی تھی یہ بات فضول اور بے بنیاد ہے۔

ایک سوال پھر بھی پیدا ہوتا ہے کہ جو ممانعت والی احادیث آئی ہیں ان کا کیا مفہوم ہے۔ ان کے تین مختلف مفاہیم ہیں۔ سب سے پہلے تو رسول اللہ ﷺ نے اسلام کے بالکل آغاز کے دور میں ممانعت فرمائی۔ جب حضورؐ ایسے ماحول میں تھے جہاں لکھنے والے بہت تھوڑے تھے۔ آغاز اسلام میں مکہ مکرمہ میں تمام لکھنے والوں کی تعداد سترہ تھی جیسا کہ بلاذری نے لکھا ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تو بارہ تیرہ آدمیوں کے سوا کوئی لکھنا نہیں جانتا تھا۔ ان لکھنے والوں میں سے جن لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا وہ تعداد میں اور بھی تھوڑے تھے۔ سب نے تو اسلام قبول نہیں کیا۔ مثلاً ابوجہل لکھنا پڑھنا جانتا تھا لیکن اس نے تو اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ ابولہب لکھنا جانتا تھا، عبداللہ بن ابی بھی لکھنا جانتا تھا، لیکن انہوں نے تو اسلام قبول نہیں کیا۔

اس لئے اسلام قبول کرنے والوں میں جو لکھنا جانتے تھے ان کی تعداد اور بھی کم تھی اور رسول اللہ ﷺ انہی سے قرآن پاک لکھوانے کا کام لیا کرتے تھے۔ اس لئے اگر شروع میں قرآن پاک اور احادیث دونوں چیزیں یہی حضرات لکھا کرتے تو اس بات کا بڑا امکان تھا کہ قرآن اور احادیث کے مضامین آپس میں مخلوط ہو جائیں اور کسی کو آگے چل کر یہ شبہ ہو جائے کہ یہ قرآن پاک کی آیت ہے یا حدیث ہے۔ مثلاً حضرت عمر فاروقؓ لکھنا جانتے تھے۔ لیکن اگر رسول اللہ ﷺ شروع میں حضرت عمر فاروقؓ کو اس کی اجازت دیتے کہ ایک کاغذ کے ایک سرے پر قرآن پاک لکھیں، جو تھوڑا تھوڑا نازل ہو رہا تھا۔ اور دوسرے سرے پر حدیث لکھیں اور یہ ذخیرہ حضرت عمر فاروقؓ کے خاندان میں چلا آتا تو سو پچاس سال کے بعد اس بات کا امکان تھا کہ وہ دونوں کاغذ کسی ایسے آدمی کو ملیں جو قرآن کا حافظ نہیں ہے اور وہ حدیث کو بھی قرآن کا حصہ سمجھ لے۔ اس کا امکان تو بہر حال موجود رہتا۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے شروع میں قرآن پاک کے علاوہ کوئی اور چیز لکھنے کی ممانعت فرمائی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ صحابہ کی یہ تربیت فرما رہے تھے کہ جو حضورؐ کو کرتا ہوا دیکھیں اس پر خود بخود عمل درآمد شروع کر دیں، بجائے صحیفہ پر لکھنے کے اس کو سینوں میں اتار لیں

تاکہ وہ عمل کے ذریعے محفوظ ہو جائے۔ قرآن پاک الفاظ کے ذریعے محفوظ ہو جائے، سنت آپ کے عمل کے ذریعے محفوظ ہو جائے، اور لوگوں کے رگ و پے میں سما جائے، لوگوں کے طرز عمل اور شب و روز کی نشست و برخواست کا حصہ بن جائے۔ اس لئے شروع میں رسول اللہ ﷺ نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں فرمائی کہ حدیث اور سنت کو لکھا جائے۔

اس کے بعد دوسری ممانعت آپ نے کاتبان وحی کے لئے فرمائی۔ جو لوگ خاص کاتبین وحی تھے ان کے لئے فرمایا کہ وہ قرآن پاک کے علاوہ کوئی اور چیز نہ لکھیں۔ اس لئے کہ اگر کاتبان وحی کوئی اور چیز لکھیں گے تو ان کے بارے میں التباس کا زیادہ امکان ہے۔ اگر دوسرے حضرات لکھیں، مثلاً حضرت ابوشاہؓ کے پاس لکھی ہوئی چیز موجود تھی اور ابوشاہؓ کاتبان وحی میں سے نہیں تھے۔ اس لئے ابوشاہؓ کے ذخیرے میں کوئی چیز نکلے تو اس میں یہ غلط فہمی نہیں ہو سکتی تھی کہ یہ قرآن پاک کی آیت ہے کہ نہیں ہے۔ ایک فی لاکھ بھی اس کا امکان نہیں تھا۔ لیکن مثلاً حضرت زید بن ثابتؓ کے پاس اگر کوئی ایسی چیز ہوتی تو مغالطہ کا امکان تھا اس لئے حضورؐ نے کاتبان وحی کو منع فرمایا۔

تیسری چیز جو بڑی اہم ہے وہ یہ کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ جس نے قرآن کے علاوہ کوئی چیز لکھی ہے فلیمحہ، وہ اس کو مٹا دے۔ بعض صحابہ یہ کرتے تھے، اور ایک مرتبہ حضورؐ نے دیکھا کہ وہؓ ایسا کر رہے تھے کہ قرآن پاک کے اپنے نسخہ میں تفسیری حواشی لکھ لیتے تھے یا اسی کاغذ پر جو جگہ بچتی اس پر آپؐ کے ارشادات گرامی لکھ لیا کرتے تھے۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ قرآن کے علاوہ کوئی چیز لکھی ہے تو مٹا دو۔ اس لئے کہ اگر ایک ہی کاغذ پر ایک ہی چیز ہو گی تو اس سے آگے چل کر بڑی الجھن پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لئے آپ نے مٹانے کا حکم دیا، ضائع کرنے کا حکم نہیں دیا۔

یہ وہ چیز ہے جس کے بارے میں لوگ جان بوجھ کر یا غلط فہمی کی بنیاد پر شبہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ حضورؐ نے لکھنے کی ممانعت فرمائی تھی۔ لکھنے کی ممانعت بہت آغاز کے سالوں میں تھی، کاتبین وحی کے لئے تھی اور قرآن پاک جن چیزوں پر لکھا ہوتا تھا ان پر حدیث لکھنے سے منع کرنے کی ہدایت تھی۔ اس ایک پہلو کے علاوہ حضورؐ نے خود احادیث لکھنے کی اجازت دی، آپؐ کی محفل میں احادیث لکھی گئیں، آپؐ کی اجازت سے لکھی گئیں، آپؐ نے خود لکھوا کر لوگوں کو دیں، بہت سی دستاویزات اور وثائق آپؐ نے تیار کروائے جو آج کتب حدیث میں موجود ہیں اور ان

سے اسی طرح احکام نکلتے ہیں جیسے سنت کی باقی چیزوں سے احکام نکلتے ہیں۔ یہ طریقہ صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں بھی جاری رہا۔

تدوین حدیث صحابہ کرامؓ کے دور میں

مشہور صحابیؓ حضرت انس بن مالک کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کسی ذمہ داری پر بھیجا۔ صدقہ اور زکوٰۃ کی وصولی کے لئے محصل بنا کر بھیجا۔ مسند امام احمد کی روایت ہے کہ 'کتب ابو بکر لانس بن مالك فرائض الصدقه التی سنها رسول الله ﷺ'، کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت انس بن مالک کو وہ تمام احکام جو زکوٰۃ کے بارے میں ہیں اور حضور ﷺ سے ثابت ہیں وہ سب لکھ کر دیئے۔ یہ واضح طور پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف سے حدیث کو تحریری طور پر مرتب کرنے کا ایک نمونہ ہے۔ ایک صحابیؓ دوسرے صحابیؓ کو ارشادات رسولؐ لکھ کر دے رہے ہیں۔ مسند امام احمد ہی کی دوسری روایت ہے کہ 'کتب عمر لعقبه بن فرقد بعض السنن'، کہ عقبہ بن فرقد جو ایک تابعی ہیں، ان کو حضرت عمرؓ نے بعض سنتیں لکھ کر دیں۔ یہ دوسرے صحابیؓ اور خلیفہ راشد کی طرف سے سنت کو تحریری طور پر مرتب کرنے کی ایک مثال ہے۔

بعض جاہلوں اور بدوؤں میں مشہور تھا کہ حضرت علیؓ کو حضورؐ نے کوئی خاص قسم کا علم دیا تھا جو باقی صحابہ کو نہیں دیا تھا۔ یہ بات حضرت علیؓ کی حیات مبارکہ ہی میں لوگوں نے پھیلا دی تھی حالانکہ رسول اللہ ﷺ کو تو حکم تھا کہ 'یاایها الرسول بلغ ماانزل الیك' جو تم پر نازل کیا گیا ہے لوگوں تک پہنچا دو۔ تو حضورؐ کے بارے میں یہ کہنا نعوذ باللہ کہ خاص خاص چیزیں صرف اپنے اہل خاندان کو پہنچائیں اور عام چیزیں باقی لوگوں تک پہنچائیں، یہ بڑی بدگمانی کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے۔ لیکن بعض لوگوں نے یہ بات پھیلا دی کہ حضورؐ نے کوئی خاص قسم کا علم حضرت علیؓ کو دیا تھا جو باقی صحابہ کو نہیں دیا۔ کسی نے اس پس منظر میں حضرت علیؓ سے ان کے زمانہ خلافت میں پوچھا کہ آپ کو رسول اللہ ﷺ سے کوئی خاص علم ملا ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں، حضورؐ سے ہمیں صرف تین چیزیں ملی ہیں۔ ایک قرآن مجید، ایک وہ خاص فہم جو اللہ تعالیٰ کسی انسان کو عطا کرتا ہے اور ایک وہ ہدایات جو اس صحیفے میں لکھی ہوئی ہیں۔ لوگوں نے پوچھا کہ اس صحیفہ میں کیا لکھا ہے؟ تو آپؓ نے فرمایا کہ اس میں دیت اور قیدیوں کو آزاد کرانے کے احکام لکھے ہوئے ہیں اور یہ حکم لکھا

ہوا ہے کہ کسی مسلمان کو کافر کے بدلے میں قتل نہ کیا جائے۔ یہ بعض خاص حالات میں حضورؐ نے ہدایت فرمائی تھی۔ یہ تین قسم کے مسائل اس صحیفہ میں لکھے ہوئے جو حضورؐ کے زمانہ میں لکھے ہوئے مجھے دیئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ کوئی اور چیز خاص طور پر مجھے نہیں دی گئی جو بقیہ صحابہ کو ملی وہ مجھے بھی ملی۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ ایک صحیفہ حضورؐ کے زمانے کا لکھا ہوا حضرت علیؓ کے پاس بھی موجود تھا جس میں دیت، قیدیوں کی رہائی کے احکام اور یہ بات کہ مسلمان اور کافر کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں قتل کیا جا سکتا ہے کہ نہیں، اس کے بارے میں بعض ہدایات دی گئی تھیں۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ ایک صحابیؓ تھے جو سب سے آخر میں انتقال کرنے والے صحابہ میں سے تھے۔ مجھے صحیح سن یاد نہیں لیکن سن اٹھاسی نواسی ہجری کے لگ بھگ ان کا انتقال ہوا۔ چند آخری صحابہ میں سے ہیں۔ ان کے پاس ایک صحیفہ، یعنی احادیث کا لکھا ہوا مجموعہ، موجود تھا جس میں سے وہ روایت کیا کرتے تھے۔ حضرت سمرہ بن جندب مشہور صحابیؓ ہیں، آپ نے ان کا نام سنا ہوگا، ان کے بارے میں حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ 'جمع فیھا احادیث کثیرۃ' اس رسالہ یا کتاب میں انہوں نے بہت سی احادیث جمع کی تھیں۔ حافظ ابن حجر نے تعداد نہیں بتائی۔ لیکن احادیث کثیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑی تعداد میں احادیث جمع کی تھیں۔ حضرت ابو رافعؓ رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے اور آپؐ کے ساتھ بہت طویل عرصہ تک رہے۔ ان کے پاس ایک تحریری ذخیرہ موجود تھا جس میں نماز کے بعض احکام لکھے ہوئے تھے۔ یہ بھی ایک صحابیؓ کا لکھا ہوا ذخیرہ ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا مرتب کیا ہوا ایک مجموعہ آج بھی دستیاب ہے اور استنبول کے کتب خانہ سعید علی پاشا میں اس کا مخطوطہ موجود ہے۔ مشہور صحابیؓ حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ کے دست مبارک کا لکھا ہوا ایک اور مجموعہ اسی کتب خانہ سعید علی پاشا میں موجود ہے جس میں حج کے احکام لکھے ہوئے ہیں۔ یہ وہ چند نمونے ہیں جو صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں لکھے گئے۔ ایک اور نمونہ حضرت ابو سلمہ اشجعیؓ کا مرتب کیا ہوا مجموعہ بھی آج موجود ہے۔ استنبول میں ایک اور کتب خانہ ہے جو کتب خانہ فیض اللہ کہلاتا ہے وہاں موجود ہے۔ دمشق کا ایک کتب خانہ 'دار الکتب الظاہریہ' ہے جو بہت بڑا اور نفیس کتب خانہ ہے اور اب اس کی ایک جدید ترین عمارت بنائی گئی ہے، اس میں یہ کتب خانہ موجود ہے۔ الملک الظاہر البیبرس ایک حکمران تھا جس نے یہ کتب خانہ بنایا تھا اور قدیم

کتابیں اس میں جمع کی تھیں۔ اس میں یہ مجموعہ موجود ہے۔ ایک اور مجموعہ ہے جو حضرت ابو ہریرہؓ کے شاگرد رشید ہمام بن منبہ، جو ایک تابعی تھے، ان کا مرتب کیا ہوا ہے، لیکن اس طرح مرتب کیا ہوا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے ان کو جو احادیث املا کرائیں وہ انہوں نے اس مجموعہ میں مرتب کر دیں۔ اصل مجموعہ حضرت ابو ہریرہؓ کا تھا، لیکن ہمام کے نام سے اس لئے مشہور ہے کہ تحریر ہمام بن منبہ کی تھی۔ یہ دستیاب صحائف میں قدیم ترین ہے جو مطبوعہ شکل میں موجود ہے، غیر مطبوعہ تو اور بھی ہیں جن کا میں نے حوالہ دیا ہے۔ یہ مجموعہ بارہا چھپا ہے جس کا اردو، انگریزی، فرانسیسی، ترکی اور کئی دوسری زبانوں میں ترجمہ موجود ہے۔ اصل مجموعہ عربی میں ہے جس کو ڈاکٹر حمید اللہ نے آج سے کوئی پچاس یا ساٹھ سال پہلے ایڈٹ کیا تھا۔ یہ چند مجموعے ہیں جو صحابہ کے زمانہ میں تیار ہوئے۔ یہ مثال کے طور پر میں نے ذکر کئے ہیں۔

تدوین حدیث تابعین کے دور میں

ہمارے ایک بہت محترم اور فاضل دوست ڈاکٹر محمد مصطفےٰ اعظمی نے ایک کتاب انگریزی میں لکھی ہے آپ ضرور پڑھئے گا۔ اس کا نام ہے **Studies in the Early Hadith Literature**۔ اس کتاب میں انہوں نے صحابہ کے مرتب کئے ہوئے **48** مجموعوں کا تذکرہ کیا ہے جن میں یہ چند مجموعے بھی شامل ہیں جن کا میں نے ذکر کیا۔ ان **48** مجموعوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے تابعین کے زمانہ کے کم و بیش **250** مجموعوں کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے تاریخ سے ڈھائی سو مجموعوں کی شہادت جمع کر کے مرتب کی ہے جس سے پتہ چلا کہ ڈھائی سو تابعین کے مجموعوں کا تذکرہ حدیث کی کتابوں میں ملتا ہے۔ ان میں سے چند مجموعے جو بہت اہم ہیں وہ میں آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں۔

لیکن ان کا ذکر کرنے سے پہلے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا نام لینا بڑا ضروری ہے جن کا انتقال غالباً **101** ہجری میں ہوا۔ ہجرت کے تقریباً نوے سال کے بعد کا ان کا زمانہ ہے۔ لیکن اپنے زمانہ خلافت سے پہلے وہ کچھ عرصہ مدینہ منورہ کے گورنر رہے۔ مدینہ منورہ کی گورنری کے زمانے میں جو غالباً ساٹھ یا ستر ہجری کے لگ بھگ کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ میں انہوں نے مدینہ منورہ کے ایک محدث حضرت محمد بن مسلم بن شہاب زہری سے جو امام مالکؒ کے استاد ہیں، یہ کہا کہ آپ

مدینہ منورہ کے شیوخ حدیث سے احادیث کا ایک مجموعہ جمع کر کے مرتب کریں۔ چنانچہ مدینہ منورہ میں جتنے راویان حدیث اور شیوخ حدیث تھے، ان سب کے پاس جا کر انہوں نے کسب فیض کیا اور ان سب احادیث کا ایک مجموعہ سرکاری اہتمام میں مرتب کیا۔

جب سن 99-98 ھ کے لگ بھگ حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو انہوں نے ایک سرکلر جاری کیا اور مختلف علاقوں میں لوگوں کو خطوط لکھے کہ احادیث کے مجموعے مرتب کر کے مجھے بھیجے جائیں۔ انظروا الی حدیث رسول اللہ ﷺ فاجمعوہ 'رسول اللہ ﷺ کی احادیث کا جائزہ لو اور ان کا پتہ چلا کر ان کو مجموعوں کی شکل میں مرتب کرو۔ یہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا منشور تھا، ایک سرکلر تھا جو انہوں نے صوبوں کے گورنروں کے نام لکھا تھا۔ مختلف لوگوں نے یہ مجموعے تیار کر کے بھیجے جن میں تین مجموعوں کا تذکرہ صراحت سے محدثین نے کیا ہے۔ ایک تھے قاضی ابوبکر محمد بن عمرو بن حزم، انہوں نے ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جو آج بھی موجود ہے۔ اور کتب حدیث میں جابجا اس کے حوالے ملتے ہیں اور بعض محدثین نے ان کو یکجا بھی بیان کیا ہے۔ ایک مجموعہ تو یہ ہے۔

دوسرا مجموعہ ایک خاتون محدثہ کا تھا۔ حضرت عمرہ بنت عبدالرحمٰن انصاریہ، مدینہ منورہ کی ایک صاحبہ علم خاتون تھیں جو اپنے زمانہ کی بہت بڑی محدثہ تھیں۔ انصار سے تعلق تھا۔ بڑے بڑے محدثین ان کی خدمت میں جا کر حدیث پڑھا کرتے تھے۔ اور کسب فیض کیا کرتے تھے۔ انہوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے کہنے پر اپنا مجموعہ مرتب کیا اور ان کو بھجوایا۔ ایک تیسرا مجموعہ جو حضرت عمر بن عبدالعزیز کے منشور کے جواب میں لکھا گیا وہ سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے پوتے قاسم بن محمد بن ابی بکرؒ کا مرتب کردہ تھا جو تابعین میں سے تھے، ان کے والد محمد بھی تابعین میں سے تھے۔ ان کے والد کی ولادت اس سن میں ہوئی تھی جس میں رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا تھا۔ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتقال ہوا تو ان محمد بن ابی بکر کی عمر دو سال تھی۔ اس لئے ان کا شمار صحابہ میں نہیں بلکہ تابعین میں ہوتا ہے۔ ان کے بیٹے قاسم بھی تابعین میں سے تھے، قاسم بن محمد۔ آپ نے مدینہ کے فقہائے سبعہ کا نام سنا ہوگا۔ مدینہ منورہ میں سات فقہا بڑے مشہور تھے جن کو فقہائے سبعہ کہا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک قاسم بن محمد بھی ہیں۔ یہ گویا سرکاری طور پر تین بڑے محدثین کی طرف سے تین بڑے مجموعے تیار کئے گئے۔ ان کے علاوہ حضرت امام محمد بن شہاب زہری نے

بھی ایک مجموعہ مرتب کیا اور اس کو لے کر حضرت عمر بن عبدالعزیز کے پاس آئے، 'وقدمہ الی عمر بن عبدالعزیز'، عمر بن عبدالعزیز نے وہ مجموعہ دیکھا، انتہائی جامع مجموعہ تھا، امام زہری صف اول کے محدثین میں سے ہیں، بہت سے محدثین ان کے شاگرد ہیں۔ امام مالکؒ جیسے محدث کا تعلق ان کے تلامذہ سے ہے۔ ان کا مجموعہ بہت جامع قسم کا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے 'بعث الی کل ارض دفتراً من دفاترہ'، ہر علاقہ میں اس کا ایک نسخہ یا نقل تیار کرا کے بھیجی تا کہ لوگوں کے پاس یہ مجموعے مرتب ہو جائیں۔ یہ مجموعے صحابہ کرام کے بعد تابعین کے دور میں مرتب ہوئے۔

تدوین حدیث تبع تابعینؒ کے دور میں

تبع تابعینؒ کے ابتدائی دور میں اور صغار تابعین کے دور میں کتنے مجموعے مرتب ہوئے، ان کی تعداد بیان کرنا بڑا دشوار ہے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی نے صرف تابعین دور کے ڈھائی سو مجموعوں کا پتہ چلایا ہے۔ وقتاً فوقتاً دوسرے محققین بھی ان کا پتہ چلاتے رہے ہیں۔ دو تین کی مثالیں دینے پر میں اکتفا کرتا ہوں۔

محمد بن اسحاق جن کا تعلق تبع تابعینؒ کی بڑی نسل سے ہے۔ اور بعض لوگوں نے ان کو صغار تابعین میں بھی شمار کیا ہے۔ ان کا مجموعہ آج مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔ انہوں نے ان احادیث کو جمع کیا جن کا تعلق سیرت سے، رسول اللہ ﷺ کے غزوات اور آپؐ کی ذات گرامی سے ہے۔ وہ ساری احادیث محمد بن اسحاق کے مجموعے میں آج مطبوعہ شکل میں موجود ہیں اور اردو اور انگریزی زبانوں میں اس مجموعہ کا ترجمہ بھی دستیاب ہے۔

ایک اور تابعی حضرت معمر بن راشد تھے، یمن کے ایک بڑے محدث تھے۔ انہوں نے ایک کتاب الجامع المسند کے نام سے لکھی تھی۔ الجامع اس لئے کہ اس میں حدیث کے آٹھوں ابواب کا تذکرہ تھا اور المسند اس لئے کہ وہ صحابہ کی ترتیب پر تھی۔ انہوں نے اس کتاب کو دس جلدوں میں مرتب کیا تھا جس کی آخری پانچ جلدیں آج بھی مخطوطہ کی شکل میں ترکی کے ایک کتب خانہ میں موجود ہیں۔ معمر بن راشد کا تعلق تابعین کے متوسط دور سے ہے۔ معمر بن راشد کے براہ راست شاگرد عبدالرزاق بن ہمام تھے۔ عبدالرزاق بن ہمام نے ان سے احادیث روایت کیں۔

معمر کے مجموعے کی جو آخری پانچ جلدیں آج دستیاب ہیں ان میں جو احادیث ہیں وہ ساری کی ساری مسند عبدالرزاق میں بھی موجود ہیں۔ مسند عبدالرزاق آج مطبوعہ موجود ہے۔ گویا مسند عبدالرزاق کی حد تک ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ معمر بن راشد نے جو احادیث تحریری طور پر مرتب کیں جن کا تعلق صغار تابعین کے طبقہ سے تھا، وہ ساری احادیث تحریری اور زبانی طور پر عبدالرزاق کو منتقل ہوئیں۔ عبدالرزاق بڑے بڑے محدثین کے استاد ہیں۔ امام بخاری کے بھی استاد ہیں، امام مسلم کے بھی استاد ہیں۔ اور اس زمانہ کے بہت سے محدثین بشمول امام احمد بن حنبل ان کے تلامذہ میں شامل ہیں۔ ان کو جو احادیث ملیں ان کا بہت بڑا حصہ عبدالرزاق کے ذریعہ ملا۔ ان میں وہ احادیث بھی شامل ہیں جو معمر بن راشد کے مجموعہ میں شامل تھیں۔

تدوین حدیث تیسری صدی ہجری میں

صحیح بخاری، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ تیسری صدی ہجری میں لکھی گئی، ایک بزرگ نے صحیح بخاری کی ان روایات کو جمع کیا، وہ آج کل جرمنی میں رہتے ہیں، بہت فاضل انسان ہیں، بیسویں اور اکیسویں صدی کے غالباً اس وقت فاضل ترین اہل علم میں سے ہیں، اگر مجھ سے کہا جائے کہ اس دور کی تین فاضل ترین شخصیات کے نام بتاؤ، تو میں سب سے پہلے ان کا نام بتاؤں گا۔ ڈاکٹر فواد سیزگن، انہوں نے پندرہ بیس جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے اور ہر جلد بہت ضخیم اور ہزار ہزار صفحات پر مشتمل ہے، یہ کتاب انہوں نے جرمن زبان میں لکھی ہے جس میں انہوں نے صدر اسلام، یعنی پہلی چار صدیوں میں تمام اسلامی علوم وفنون کی تاریخ بیان کی ہے۔ قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ، کلام، تصوف اور عربی ادب غرض ہر فن کی تاریخ بتائی ہے۔ اس موضوع پر اس سے زیادہ جامع کتاب کوئی نہیں ہے۔ اس کتاب کی چوتھی جلد پوری حدیث پر ہے۔ حدیث کی تاریخ پر جتنا مواد اس کتاب میں ہے کسی اور کتاب میں نہیں ہے، یا بہت کم کتابوں میں ہے۔ ان کے پی ایچ ڈی کے تھیسس کا موضوع تھا کہ صحیح بخاری کے مآخذ کیا تھے۔ اس میں انہوں نے اور بھی بہت سی مثالیں دیں اور عبدالرزاق کا بھی حوالہ دیا۔ انہوں نے کہا کہ امام بخاری کی وہ روایات جو انہوں نے عبدالرزاق سے لی ہیں، وہ ساری کی ساری عبدالرزاق کی مسند میں موجود ہیں۔ مسند عبدالرزاق کی وہ تمام احادیث جو معمر بن راشد سے لی ہیں وہ ساری کی ساری معمر کی جامع میں

موجود ہیں۔ انہوں نے ایک ایک کر کے بتایا کہ بغیر کسی حرف یا لفظ کے اختلاف کے، زبر زیر کا بھی اس میں فرق نہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ یہ سارا سلسلہ زبانی یادداشت کی بنیاد پر چل رہا تھا یہ بالکل بے بنیاد ہے۔ انہوں نے اس پر پوری کتاب لکھی ہے۔ میں نے اصل کتاب نہیں پڑھی، وہ جرمن اور ترکی زبان میں ہے، لیکن اس کے خلاصے دیکھے ہیں، اور خود ان سے ملاقات کا موقع ملا تو ان سے یہ باتیں معلوم ہوئیں۔

اس بات کی تردید کرنے کے لئے یہ چند مثالیں کافی ہیں کہ احادیث زبانی روایت پر چل رہی تھیں، سنی سنائی باتیں تھیں اور تیسری صدی ہجری کے محدثین نے ان کو جوں کا توں نقل کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ جن کا تعلق تبع تابعینؒ کے اونچے طبقہ سے ہے، ان کے اپنے دست مبارک کی مرتب کی ہوئی دو مطبوعہ کتابیں آج موجود ہیں۔ ایک 'کتاب الزہد' ہے جس میں زہد سے متعلق احادیث ہیں اور ایک 'کتاب الجہاد' ہے جس میں جہاد سے متعلق احادیث ہیں۔ امام مالکؒ جن کا تعلق کچھ روایات کے مطابق صغار تابعین سے ہے اور اکثر روایات کے مطابق ان کا تعلق تبع تابعینؒ کے اونچے طبقہ سے ہے۔ ان کی کتاب موطا سے تو ہم سب واقف ہیں۔ جن حضرات نے تابعین میں سے کتابیں لکھیں اور وہ آج ہمارے پاس موجود ہیں ان میں حضرت ہشام بن عروہ بن زبیر بھی شامل ہیں جو حضرت عائشہ کے بھانجے کے بیٹے تھے۔ حضرت عائشہ سے بہت سی روایات عروہ بن زبیر کرتے ہیں۔ ان کا مرتب کیا ہوا مجموعہ ترکی کے شہید علی کتب خانہ میں موجود ہے۔

حضرت ابو بردہ، حضرت ابوموسیٰ اشعری کے پوتے تھے، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا مجموعہ ان کو ملا اور بہت سی کتابیں ان کو ملیں جن کی بنیاد پر وہ روایت کیا کرتے تھے۔ ان کا مرتب کیا ہوا مجموعہ دمشق کے کتب خانہ ظاہریہ میں موجود ہے۔ اسامہ بن مالک، ابوعدی الہمدانی، ابوزبیر محمد بن مسلم الاسدی۔ یہ وہ چند صغار تابعین ہیں جن کے مجموعے آج کتب خانوں میں موجود ہیں۔

ان حضرات کے علاوہ تبع تابعینؒ میں سے صغار تبع تابعینؒ کا طبقہ تھا، یعنی مشہور محدثین سے پہلے کا طبقہ، ان کی جو کتابیں آج ہمارے پاس موجود ہیں، ان میں قدیم ترین کتب میں سے امام ابوداؤد طیالسی کی مسند ہے جو مسند ابوداؤد طیالسی کے نام سے ہر جگہ ملتی ہے۔ ان کا انتقال 204

ہجری میں ہوا تھا۔ان کی کتاب دوسری صدی ہجری کے اواخر میں لکھی گئی۔وہ آج چار جلدوں میں مطبوعہ موجود ہے اور ہر جگہ دستیاب ہے۔امام بخاری کے استاد حمیدی کی کتاب مسند الحمیدی بھی دوسری صدی ہجری کے اواخر میں لکھی گئی ہے۔امام حمیدی کا انتقال 219ھ میں ہوا۔انہوں نے انتقال سے خاصا پہلے یہ کتاب شروع کی تھی۔تیسری صدی ہجری کے بالکل شروع میں یا دوسری صدی ہجری کے بالکل اواخر میں یہ کتاب لکھی گئی ہے۔اسی طرح سے نعیم بن حماد الخزاعی ہیں جنہوں نے 'کتاب الفتن' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی تھی۔اس میں انہوں نے فتن سے متعلق احادیث کو جمع کیا تھا۔اس کا مخطوطہ برٹش میوزیم میں آج بھی موجود ہے۔یہ کتاب تیسری صدی ہجری کے بالکل شروع میں مرتب کی ہوئی ہے۔

جو مجموعے آج دستیاب ہیں ان میں امام ابوبکر بن ابی شیبہ، جو مشہور محدثین اور فقہا میں سے ہیں ان کی کتاب المصنف پاکستان سمیت ہر جگہ چھپی ہوئی موجود ہے اور کئی بار چھپی ہے، ان کا انتقال 235ھ میں ہوا تھا۔تیسری صدی ہجری کے اوائل میں ان کی کتاب مرتب ہوئی اور المصنف کے نام سے آج بھی موجود ہے۔ایک اور محدث عبد بن حمید ہیں جن کی مسند کا نسخہ 'فاس' یعنی مراکش کے جامعہ قرویین میں موجود ہے، ان کا انتقال بھی تیسری صدی ہجری کے نصف اول میں ہوا۔خود امام دارمی، جن کا میں پہلے حوالہ دے چکا ہوں اور جن کی مسند مشہور ہے، ان کا تعلق بھی تیسری صدی ہجری کے نصف اول سے ہے۔یہ مثالیں اس بات کی دلیل ہیں کہ ہر دور میں علم حدیث کے مجموعے مرتب ہوتے رہے ہیں۔صحابہ کے دور کی مثالیں آپ کے سامنے آگئیں، تابعین کے پہلے، درمیانی اور آخری دور کی آگئیں۔تبع تابعینؒ کے بھی شروع دور کی، درمیانی دور اور آخری دور کی مثالیں آگئیں اور تبع تابعینؒ کے آخری دور کے فوراً بعد کی جو مثالیں ہیں وہ ان صحاح ستہ کے ان مصنفین کی ہیں، جن کے بارے میں انشاء اللہ آگے گفتگو ہوگی۔

واخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العلمین

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ایک دن آپ نے کہا تھا کہ قرآن تمام کا تمام قطعی الثبوت ہے لیکن دوسرے دن ایک سوال کے جواب میں آپ نے کہا کہ قرآن کی بعض آیات ایسی ہیں جن کا ایک سے زیادہ مفہوم نکل سکتا ہے۔

نہیں، آپ کو سمجھنے میں غلطی ہورہی ہے۔ جہاں کسی ایک لفظ میں ایک سے زیادہ مفہوم نکل رہے ہوں، وہ ظنی الدلالت کہلاتے ہیں۔ میں نے دو چیزیں بتائی تھیں ایک یہ کہ قرآن پاک سارا کا سارا قطعی الثبوت ہے اور اس کا قرآن ہونا ثابت ہے، اس باب میں تو پورا قرآن الحمد سے لے کر والناس تک ایک ایک حرف، ایک ایک شوشہ اور ایک ایک زبر زیر قطعی الثبوت ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ احادیث کا بھی بہت بڑا حصہ قطعی الثبوت ہے اور اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لیکن قرآن مجید کی بعض آیات ہیں جن کا ایک سے زیادہ مفہوم نکل سکتا ہے، وہ ظنی الدلالت ہیں، یعنی جن کے مفہوم میں ایک سے زائد معانی اور مطالب کی گنجائش ہے اور علماء حدیث یا علماء تفسیر نے ان کے ایک سے زائد مطلب قرار دیئے ہیں۔ وہ سارے مطالب ظنی الدلالت ہیں۔ ان میں سے ہر مطلب بیک وقت صحیح ہوسکتا ہے، اس لئے میں نے ظنی الدلالت لفظ بولا تھا، ظنی الثبوت کا نہیں بولا تھا۔ قرآن پاک پورے کا پورا قطعی الثبوت ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے احادیث کیوں روایت نہیں کی گئیں؟

میں یہ بات پہلے بھی عرض کرچکا ہوں کہ احادیث کو بیان کرنے کا زیادہ موقع اس وقت ملا جب صحابہ کرام ایک ایک کرکے دنیا سے اٹھتے جارہے تھے۔ صحابہ کرام کو آپس میں احادیث بیان کرنے کا بہت کم موقع ملتا تھا، اس لئے کہ انہیں اس کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ احادیث بیان کرنے کی زیادہ ضرورت اس وقت پیش آئی جب تابعین کی تعداد بڑھتی گئی اور صحابہ کرام کی تعداد کم ہوتی گئی۔ حضرت فاطمۃ الزہرا ؓ کا انتقال رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے چھ ماہ کے اندر اندر ہوگیا تھا اور ان چھ مہینوں میں انہوں ؓ نے جس پریشانی اور کرب میں اپنا وقت گزارا وہ سب کو معلوم ہے۔ وہ چھ ماہ کے اس زمانے میں جو اشعار وقتاً فوقتاً پڑھا کرتی تھیں ان میں سے ایک یہ تھا ؎

صبت علی مصائب لو انہا
صبت علی الایام صرن لیا لیا

مجھ پر جو مصائب آن پڑے ہیں اگر وہ دنوں پر پڑتے تو دن راتوں میں تبدیل ہو جاتے۔

حضرت فاطمہؓ کسی سے ملتی جلتی نہیں تھیں۔ دن رات اپنے گھر میں رہا کرتی تھیں۔اور چھ ماہ کے بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا۔اس لئے ان کو احادیث بیان کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔

تدوین حدیث میں خواتین کا ذکر نہیں آیا؟

ابھی میں نے آپ کے سامنے عمرہ انصاریہ کا ذکر اسی لئے تو کیا ہے کہ جب خواتین کا ذکر ہو رہا ہے تو خواتین کی کم از کم ایک مثال سامنے آجائے۔خواتین سے بہت سی احادیث روایت ہوئی ہیں۔مسند عائشہؓ الگ سے چھپی ہوئی موجود ہے، وہ احادیث جو حضرت عائشہؓ نے روایت کیں وہ الگ مجموعہ کی شکل میں مرتب ہیں اور پاکستان کی ایک قابل احترام خاتون محدثہ ڈاکٹر جمیلہ شوکت نے نے ان کو ایڈٹ کیا ہے، وہ ایک عرصہ تک پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ اسلامیات کی چیئر پرسن رہی ہیں۔اسلامی نظریاتی کونسل میں ہم دونوں رکن کی حیثیت سے کولیگ رہے ہیں۔ انہوں نے مسند عائشہؓ کے نام سے کتاب مرتب کی ہے، جو چھپی ہوئی موجود ہے۔میرے خیال میں یہ کہنا درست نہیں کہ خواتین کا ذکر نہیں ہے۔خواتین کا ذکر ملتا ہے۔

آپ نے علم رجال کے تین گروہ بتائے تھے، متشددین، معتدلین اور......

تیسرا گروپ تھا متساہلین کا، جو تساہل سے کام لیتے ہیں، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اگر کسی کو عادل قرار دیں تو وہ تساہل سے کام لیتے ہیں اس لئے اس میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ان میں سے ایک امام ترمذیؒ ہیں اور ایک امام حاکم ہیں جو مستدرک کے مصنف ہیں۔امام حاکم اگر کسی راوی کو عادل قرار دیں تو اس کے بارے میں عام اصول یہ ہے کہ دوسری کتابوں سے بھی اس کو چیک کرنا چاہئے۔اگر دوسرے ائمہ جرح وتعدیل بھی اس راوی کو عادل قرار دے رہے ہیں تو پھر واقعی وہ راوی عادل ہے اور اگر دوسرے ائمہ نے اس کو عادل قرار نہیں دیا تو پھر امام حاکم یا امام ترمذی کی تعدیل پر زیادہ بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔یہ تیسرے گروہ یعنی متساہلین کے گروہ سے مثالیں ہیں۔

ہمیں بتایا گیا ہے کہ مرغ کی آواز پر کوئی دعا نہیں، لیکن 'پیارے رسولؐ کی پیاری دعائیں' میں یہ دعا موجود ہے۔

مجھ سے غلطی ہوئی ہوگی، جہاں تک مجھے یاد ہے وہ یہی ہے کہ مرغ کی بانگ اور دعا کے بارے میں جتنی احادیث ہیں وہ ساری کی ساری ضعیف ہیں۔ لیکن اگر یہ روایت موجود ہے تو صحیح ہوگی میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے اس خاص روایت کی تحقیق نہیں۔ لیکن میں نے موضوعات کی کسی کتاب میں اس کو پڑھا تھا، کہ مرغ کو دیکھنے اور دعا کرنے کے بارے میں جتنی احادیث ہیں وہ ساری کی ساری ضعیف ہیں۔ میں دوبارہ چیک کروں گا ممکن ہے میری یادداشت سے غلطی ہوئی ہو۔

احادیث تو بہت سے صحابہ کرام سے روایت ہوئیں لیکن کیا وجہ ہے کہ منکرین حدیث زیادہ تر حضرت ابو ہریرہؓ کو نشانہ بناتے ہیں۔

ہمارے منکرین حدیث میں بہت زیادہ اوریجنلٹی نہیں ہے۔ وہ تمام باتیں مغربی لوگوں کی ہی دہراتے رہتے ہیں۔ ہمارا کوئی منکر حدیث ایسا نہیں ہے جس نے کوئی نئی بات اپنی طرف سے نکالی ہو۔ جرمنی کا ایک شخص تھا جو پچھلی صدی کے اواخر میں اور موجودہ صدی کے اوائل میں تھا گولڈ تسیہر، سب سے پہلے اس نے حدیث پر کام کا آغاز کیا تھا۔ اور اس کا ایک شاگرد تھا جوزف شخت، یہ بھی جرمن تھا، دونوں یہودی اور دونوں جرمن تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے حدیث کے بارے میں بدگمانی پھیلائی۔ ایک بدگمانی یہ پھیلائی کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے تو سن سات ہجری میں اسلام قبول کیا، اور سات ہجری کے بعد گویا صرف تین سال ان کو حضور اکرمؐ کے ساتھ رہنے کا موقع ملا، ان سے جو روایات ہیں وہ ساڑھے پانچ ہزار بتائی جاتی ہیں اور ان صحابہ کی روایات تھوڑی ہیں جو طویل طویل عرصہ حضورؐ کے ساتھ رہے۔ جو آدمی صرف تین سال ساتھ رہا اس نے تو ساڑے پانچ ہزار روایات بیان کیں اور جو بیس بیس، پچیس پچیس سال اور پوری زندگی ساتھ رہے ان سے مروی احادیث بہت تھوڑی ہیں۔ یہ گویا اس بات کا ثبوت ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نعوذ باللہ غلط بیانی کیا کرتے تھے۔ انہی الزامات کو ان لوگوں نے دہرایا۔ ہمارے لوگوں نے بھی انہی کو دہرایا۔

ہمارے ایک اور دوست ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت دے، بڑے عالم فاضل انسان ہیں، علم حدیث پر انہوں نے بہت کام کیا ہے۔ وہ بھی مدینہ منورہ کے رہنے والے ہیں، اور مصطفیٰ اعظمی کی طرح اعظمی ہیں لیکن ان کا نام ہے ضیاء الرحمٰن اعظمی۔ ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ پندرہ سال کی عمر تک ہندو تھے اور پھر اسلام میں داخل ہوئے تو ان کے رشتہ داروں نے

ان پر غیر معمولی مظالم ڈھائے اور اتنے مظالم کئے کہ ان کی تفصیل سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔اس کے باوجود وہ نہ صرف اسلام پر قائم رہے، بلکہ علم دین حاصل کیا،علم حدیث میں تخصص پیدا کیا۔سعودی عرب چلے گئے اور اب گزشتہ تقریباً پچیس تیس سال سے مدینہ منورہ میں قیام پذیر ہیں۔سعودی عرب کی شہریت ان کو ملی ہوئی ہے۔مدینہ منورہ میں جامعہ اسلامیہ میں حدیث کے استاذ ہیں اور حدیث پر انہوں نے بہت سی کتابیں لکھیں۔انہوں نے علم حدیث پر جو کام کیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ انہوں نے حضرت ابو ہریرہؓ کی احادیث پر کام کیا۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی احادیث پر جو اعتراضات جوزف شخت اور گولڈ تسیہر نے اٹھائے تھے وہی اعتراضات مصر کے ایک منکر حدیث محمود ابوریہ نے بھی اٹھائے ہیں۔محمود ابوریہ نے ایک کتاب کتاب لکھی 'ابو هريرةؓ و مرویاته'، ابو ہریرہؓ اور ان کی روایات، اور اس میں وہی باتیں دہرائیں جو وہ لوگ کہتے تھے۔ ہمارے ہاں بھی کچھ لوگوں نے یہی باتیں بار بار دہرائیں۔ ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی نے کمپیوٹر کی مدد سے حضرت ابو ہریرہؓ کی ساری روایات کو جمع کیا۔ان کے تمام طرق کو جمع کیا اور یہ ثابت کیا کہ جو متون ہیں وہ کل پندرہ سو کے قریب ہیں، باقی سارے طرق ہیں۔پندرہ سو متون کا ایسے آدمی کے لئے یاد رکھنا جو لکھتا بھی ہو تین سال میں کوئی مشکل بات نہیں۔روزانہ اوسطاً دو تین حدیثیں بھی نہیں بنتیں۔تو ایک آدمی تین چار پانچ احادیث تو روزانہ لکھ سکتا ہے اور یاد بھی کرسکتا ہے اس میں ایسی کوئی بڑی بات نہیں۔یہ ضیاء الرحمٰن اعظمی کی کتاب میں تمام تفصیل موجود ہے۔اس کتاب کا نام بھی 'ابو هريرة و مرویاته' ہے۔مستشرقین اور منکرین حدیث کو چونکہ حضرت ابو ہریرہؓ کے راستہ سے حدیث پر اعتراض کا موقع ملتا ہے اس لئے حضرت ابو ہریرہؓ کو زیادہ نشانہ بناتے ہیں۔

احادیث کے ضعف کے بھی درجے ہوتے ہیں؟

یقیناً ہوتے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ضعیف احادیث کی بیالیس قسمیں ہیں جن میں سے چند میں پہلے بیان کر چکا ہوں ان سب کے الگ الگ درجات ہیں۔ضعیف احادیث کو بالکل مسترد نہیں کیا جاتا۔بعض شرائط کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے لیکن اس قبولیت کا دارومدار ضعف پر ہے۔زیادہ ضعف ہو تو قبول نہیں کی جاتی، جو کم ضعف والی ہو اس کو پہلے دیکھا جاتا ہے کہ آیا دوسری ضعیف احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے؟ اگر دوسری ضعیف احادیث سے تائید ہوتی ہو تو

بعض معاملات میں ضعف کے باوجود اس کو قبول کرلیا جاتا ہے، بعض معاملات میں قبول نہیں کیا جاتا۔ احکام اور عقائد میں ضعیف حدیث کو قبول نہیں کیا جاتا۔ فضائل میں قبول کرلیا جاتا ہے۔ مثلاً حدیث میں آیا ہو کہ فلاں دن کا روزہ رکھنا افضل ہے تو روزہ رکھنا ویسے بھی افضل ہے۔ اگر دو تین ضعیف احادیث سے ایک بات کا پتہ چلتا ہو تو عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ محدثین کی بڑی تعداد کی رائے ہے۔ بعض لوگوں کی رائے یہ بھی ہے کہ اسے حضورؐ سے منسوب نہیں کرنا چاہئے اور اس پر عمل نہیں کرنا چاہئے۔

یادداشت کو بڑھانے کے لئے کوئی ایکسر سائز یا دعا بتادیجئے...... شاہ ولی اللہ کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ گیارہ بارہ بادام روزانہ کھایا کرتے تھے......

مجھے تو ایسا کوئی نسخہ نہیں معلوم، اگر آپ کے علم میں آئے تو مجھے بھی بتایئے گا۔ میرے علم میں تو کوئی ایسی ایکسر سائز نہیں ہے جس کے کرنے سے حافظہ بڑھتا ہو۔ اگر بادام کھانے سے یادداشت بڑھتی ہو تو آپ ضرور کھائیں۔ میں نے وید کی ایک کتاب میں پڑھا تھا۔ آیوروید جو ہندوؤں کی تقریباً تین ہزار سال پرانی میڈیکل سائنس ہے۔ اس میں لکھا ہوا ہے کہ ہندوؤں کے ہاں ایک دوا ہے جو مہا سرسوتی چورن کہلاتی ہے، اس کے کھانے سے آدمی کا حافظہ بہت بڑھ جاتا ہے اور وہ مہا سرسوتی یعنی بہت بڑا علامہ بن جاتا ہے تو میں نے ہندوستان میں رہنے والے ایک عزیز کو فون کیا جو وہاں سے آرہے تھے، اب ان کا انتقال ہوگیا ہے اللہ تعالیٰ جنت نصیب کرے، میں نے ان سے کہا کہ پاکستان آتے وقت کسی وید کی دکان پر جاکر مہا سرسوتی چورن لے کر آئیں تاکہ آزمائش ہو جائے کہ یادداشت اس سے بڑھتی ہے کہ نہیں بڑھتی۔

البتہ ایک دعا ہے رب زدنی علماً یہ دعا پڑھیں۔ ایک اور دعا میں نے کسی کتاب میں پڑھی تھی اللھم انی اسئلك علماً لا ینسیٰ، اے اللہ میں تجھ سے ایسے علم کا سوال کرتا ہوں جو بھلایا نہ جاسکے۔

یہ دعائیں بھی پڑھا کریں۔ لیکن ایک گر جو میں نے دیکھا ہے لیکن اس پر خود مجھے عمل کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا، وہ یہ کہ علم حدیث سے زیادہ اعتنا رکھیں۔ جو آدمی علم حدیث زیادہ پڑھتا پڑھاتا ہے اس کا حافظہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ تو یہ تینوں کام کریں، بادام بھی کھائیں، یہ دعا بھی پڑھیں اور علم حدیث کا بھی مطالعہ رکھیں اور اگر وہ مہا سرسوتی چورن ملتا ہے تو اس کو بھی آزمالیں۔

☆☆☆☆☆☆

آٹھواں خطبہ

رحلۃ اور محدثین کی خدمات

منگل، 14 اکتوبر 2003

رحلۃ اور محدثین کی خدمات

آج کی گفتگو کا عنوان ہے: رحلة فی طلب الحدیث ،یعنی علم حدیث کے حصول اور تدوین کی غرض سے سفر۔ یوں تو حصول علم کے لئے دور دراز علاقوں کا سفر کرنا مسلمانوں کی روایات کا ہمیشہ ہی ایک اہم حصہ رہا،لیکن علم حدیث کے حصول کی خاطر سفر کا اپنا ایک منفرد مقام ہے۔ محدثین کرام نے علم حدیث کے حصول، احادیث کی تحقیق، راویوں کی جرح وتعدیل اور رجال کے بارے میں معلومات جمع کرنے کی خاطر جو طویل اور مشقت انگیز سفر اختیار فرمائے ان سب کی داستان نہ صرف دلچسپ اور حیرت انگیز ہے، بلکہ علم حدیث کی تاریخ کا ایک بڑا نمایاں اور منفرد باب ہے۔ محدثین میں جس شخصیت نے جتنے زیادہ سفر کئے ہوں، تذکرہ حدیث اور تذکرہ محدثین میں اسی اہتمام سے اس محدث کا ذکر کیا جاتا ہے۔ محدثین کے تذکرے میں رَحّال ،یعنی بہت زیادہ سفر کرنے والا اور جوّال ، بہت زیادہ پھرنے والا ، یہ صفات بہت کثرت سے نظر آتی ہیں۔ بعض محدثین کے بارے میں تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ طاف البلاد،انہوں نے مختلف ملکوں کا چکر لگایا تھا۔ جــاب الآفــاق انہوں نے چار دانگ عالم میں سفر کئے تھے۔ انہوں نے مشرق ومغرب کے شہر اور علاقے علم حدیث کی تلاش میں چھان مارے۔ یہ عبارتیں اور الفاظ تذکرہ محدثین میں عام ہیں۔

القاب محدثین

علم حدیث میں محدثین کے لئے جو القاب استعمال ہوتے ہیں ان میں سے ایک لقب رُحلہ بھی ہے۔ مثال کے طور پر حدیث کی کسی کتاب میں آپ کو ملے گا، مثلاً یہ سنن نسائی کے شروع

میں ہے،قال الامام العالم الربانی المحدث الحافظ الثبت الرُّحلہ ،یعنی امام نسائی کا جب ذکر ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے: فرمایا امام نسائی نے جو بہت بڑے حجت تھے،ثبت تھے،علم حدیث میں اونچا مقام رکھتے تھے اور رُحلہ تھے۔ رُحلہ سے مراد وہ محدث ہے جس کی طرف سفر کر کے آنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہو اور روئے زمین کے ہر گوشے سے طلبہ اس کے پاس آتے ہوں۔ ایسے مرجع خلائق محدث کو علم حدیث کی اصطلاح میں رُحلہ کہا جاتا ہے۔

ایک اور محدث ہیں ابن المقری، جو غالباً پانچویں صدی ہجری کے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے روئے زمین میں مشرق و مغرب سے لے کر چار مرتبہ سفر کیا۔ طفت الشرق والغرب اربع مرّات ، جب وہ شرق اور غرب کہتے ہیں تو شرق سے ان کی مراد وسط ایشیا کے وہ علاقے ہوتے ہیں جو مسلمانوں میں علوم وفنون کا مرکز تھے،سمرقند اور بخارا۔ اور غرب سے ان کی مراد ہوتی ہے اسپین، اندلس،غرناطہ، فاس، قیروان، رباط، گویا اندلس سے لے کر سمرقند اور بخارا تک اور شمال میں آذربائیجان اور آرمینیا سے لے کر جنوب میں مصر اور یمن تک۔ انہوں نے علم حدیث کی تلاش میں اس پورے علاقے کا چار مرتبہ چکر لگایا۔

محدثین میں ان لوگوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے جو علم حدیث کی تلاش اور جستجو میں سفر پر نکلے،سفر کے دوران مفلس ہو گئے، پیسے ختم ہو گئے اور ان کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مفلسین فی طلب الحدیث کا تذکرہ الگ سے ملتا ہے،یعنی راہ حدیث میں سفر پر نکلنے والے اور اس سفر کی وجہ سے افلاس کا شکار ہو جانے والے جان نثارانِ علم۔ ظاہر ہے یہ سفر آسان نہیں تھے، ان اسفار میں پیسہ بھی خرچ ہوتا تھا، دولت بھی خرچ ہوتی تھی، پریشانیاں اور مشکلات بھی پیش آتی تھیں۔ان سب چیزوں کے تذکرہ اور تاریخ پر الگ سے کتابیں ہیں۔

خود علم حدیث کے راستے میں سفر کیسے کیا جائے،سفر کے آداب کیا ہیں،فوائد کیا ہیں، ان پر الگ سے کتابیں ہیں۔ان میں سے یہ ایک کتاب میں آج ساتھ لایا ہوں'الرحلة فی طلب الحدیث '، یہ خطیب بغدادی کی کتاب ہے۔گفتگو کے آخر میں اس کتاب سے دو واقعات پڑھ کر سناؤں گا۔

امام یحیٰ بن مَعین جن کا میں کئی بار ذکر کر چکا ہوں۔اور واقعہ یہ ہے کہ علم حدیث کا کوئی بھی تذکرہ ان کے نام نامی کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ان کے والد نے دس لاکھ پچاس ہزار درہم

ترکے میں چھوڑے جو یحییٰ بن مَعین کو ملے۔ یحییٰ بن مَعین نے یہ ساری کی ساری رقم علم حدیث کے حصول اور اس کی خاطر سفر کرنے میں صرف کر دی۔ لما توسع فی طلبه و رحلته من اجله، انہوں نے وسیع پیمانے پر سفروں کا سلسلہ اختیار کیا اور علم حدیث کے حصول میں جو توسّع وہ اپنا سکتے تھے وہ انہوں نے اپنایا۔

یحییٰ بن مَعین نے ایک مرتبہ امام احمد کے ساتھ مل کر ایک علمی سفر کیا۔ طویل سفر طے کر کے یمن پہنچے اور وہاں امام عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی، جن کا ذکر آچکا ہے، ان سے ان دونوں بزرگوں نے بعض احادیث کی تحقیق و تحصیل نے کی۔ یہ دونوں بزرگ بغداد سے سفر کر کے یمن پہنچے تھے۔ امام عبدالرزاق کی خدمت میں رہے اور جن احادیث کی تحقیق کرنی تھی ان احادیث کی تحقیق کی۔

ایک مرتبہ یہ دونوں بزرگ کوفہ گئے۔ وہاں ایک محدث ابونعیم فضل بن دکین تھے۔ امام احمد نے یحییٰ بن مَعین سے کہا کہ یہ ایک بہت مستند راوی ہیں۔ اطمینان رکھو، میں نے تحقیق کر لی ہے۔ امام یحییٰ بن مَعین نے کہا کہ جب تک میں خود تحقیق نہ کرلوں میں ان کے عادل اور حجت ہونے کی گواہی نہیں دے سکتا۔ چنانچہ یہ دونوں بزرگ ان کی خدمت میں پہنچے۔ اپنا تعارف نہیں کروایا اور نہ ہی اپنا نام بتایا۔ جا کر صرف یہ بتایا کہ دور دراز کے ایک علاقہ سے آپ کے پاس علم حدیث سیکھنے آئے ہیں۔

جیسا کہ میں نے بتایا کہ محدثین میں سے بعض کا طریقہ یہ تھا کہ طالب علم پڑھے اور استاد سنے۔ چنانچہ ابونعیم نے یحییٰ بن مَعین سے کہا کہ سنائیں۔ یحییٰ بن مَعین نے پہلے سے ان کی احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کر لیا تھا جو انہوں نے پہلے سے سنا ہوا تھا اور روایت سے ان تک پہنچ چکا تھا۔ اس سفر سے ان کے پیش نظر اسی مجموعہ کی احادیث کی تحقیق اور تصدیق تھی اور اس بات کا یقین کرنا مقصود تھا کہ کیا واقعتاً ان کی یادداشت اور حافظہ میں یہ روایات اسی طرح محفوظ ہیں کہ نہیں۔ یحییٰ بن مَعین نے وہ روایات پڑھنی شروع کیں اور ہر دسویں روایت کے بعد ایک روایت کا انہوں نے اپنی طرف سے اضافہ کیا جو اس محدث یعنی ابونعیم بن دکین کی روایت نہیں تھی۔ جب وہ روایت آتی تو ابن دکین اشارہ کرتے کہ اس کو نکالو۔ پھر آگے گیارویں سے شروع کرتے اور جب دوسری دس پوری ہوتیں تو وہ پھر ایک روایت کا اپنی طرف سے اضافہ کر دیتے۔ اب پھر ابونعیم ہاتھ

سے اشارہ کرتے اور کہتے کہ اس کو نکالو۔ جب چوتھی پانچویں مرتبہ ایسا ہوا تو ابونعیم مسکرائے اور کہا کہ کتنا امتحان لینا چاہتے ہو۔ پھر کہا کہ تمہارے اس دوست نے تو یہ شرارت میرے ساتھ نہیں کی۔ تم کیوں ایسا کرنا چاہتے ہو۔ یعنی ان کو اپنی روایت اور حافظہ پر اتنا اعتماد تھا کہ ایک دو مرتبہ ہی میں ان کو اندازہ ہو گیا کہ یہ محض غلطی نہیں بلکہ مجھے آزمانا مقصود ہے۔ چنانچہ دونوں بزرگوں، امام احمد اور یحیٰ بن مَعین نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ان سے اجازت لے کر واپس آ گئے۔ امام احمد نے کہا کہ میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ یہ بہت قابل اعتماد ہیں اور ان کو چیک کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس ذاتی تحقیق کے بعد ہی یحیٰ بن مَعین نے اپنی کتاب میں درج کیا کہ ابونعیم مستند راوی ہیں۔

رحلہ

رحلہ ایک اصطلاح ہے جس کے لفظی معنی تو سفر کے ہیں لیکن یہاں علم حدیث کی اصطلاح میں علم حدیث حاصل کرنے کے لئے سفر کرنا رحلہ کہلاتا ہے۔ رَحّال اس محدث کو کہتے ہیں جو بہت زیادہ سفر کرے اور رُحلہ وہ محدث جس کے پاس سفر کر کے جایا جائے۔ بعض حضرات نے قرآن مجید میں سورۃ التوبہ میں جو آیت آئی ہے 'السائحون' یعنی سفر کرنے والے سے طلب علم کا سفر مراد لیا ہے۔ اس لفظ کے بارے میں بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہاں سفر کرنے والے سے مراد وہ سفر کرنے والے ہیں جو کسی نیک مقصد کی خاطر سفر کریں۔ مثلاً جہاد کے لئے، یا دعوت دین کے لئے یا پھر مثلاً طلب علم کے لئے۔ اور یہ آخری قول جن لوگوں کا ہے ان میں حضرت عکرمہؓ، (حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد) بھی شامل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ 'ھم طلبة الحدیث' اس سے مراد حدیث کے طلبہ ہیں۔ گویا اگر حدیث کے طلبہ اس سے مراد ہوں، جیسے کہ حضرت عکرمہؓ کی رائے ہے، تو طلب حدیث کے لئے گھر سے نکلنا اور سفر اختیار کرنا قرآن مجید سے براہ راست بھی ثابت ہے۔

لیکن بالواسطہ طور پر قرآن مجید کی ایک آیت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شریعت میں طلب علم کے لئے گھر سے نکلنے اور سفر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ سورۃ توبہ ہی کی آیت ہے' فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین ولینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم

لعلهم یحذرون '، پھرایسا کیوں نہ ہو کہ ہر گروہ میں سے ایک چھوٹی جماعت اس کام کے لئے نکلے تا کہ وہ دین میں گہری بصیرت حاصل کرے اور جب واپس آئے تو اپنی قوم کو ڈرائے اور اپنی قوم کو اس کی اطلاع دے۔ اس سے بھی یہ بات نکلتی ہے کہ طلب علم کے لئے گھر سے نکلنا اور سفر اختیار کرنا قرآن مجید کا ایک حکم ہے۔

بعض حضرات نے حضرت موسیٰ کے واقعہ سے بھی استدلال کیا ہے۔ کہ حضرت موسیٰ نے ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ آپ کا سب سے مقرب بندہ کون سا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ جس کے پاس علم زیادہ ہے اور وہ اس علم کے مطابق عمل بھی کرتا ہے۔ پھر حضرت موسیٰ نے مزید تفصیلات پوچھیں اور نام پوچھا تو بتایا گیا کہ اس بندے کا نام 'خَضِر' یا 'خِضر' ہے جو فلاں جگہ پائے جاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ نے وہ سفر اختیار کیا جس کا قرآن مجید کی سورۃ کہف میں تذکرہ ہے۔ گویا ایک پیغمبر نے طلب علم کے لئے ایک طویل علاقے کا سفر اختیار فرمایا اور راستے میں جو مشکلات پیش آئیں ان کو بھی برداشت کیا۔

صحیح مسلم کی ایک روایت ہے: حضورؐ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ ' من سلك طريقا يلتمس فيه علماً سهل الله به طريقه الى الجنة '۔ کہ جو شخص کسی راستے پر چلا اور اس کا مقصد علم حاصل کرنا تھا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان کر دیتے ہیں۔ اس سے بھی علم حدیث اور علم دین اختیار کرنے کے لئے سفر کرنا پسندیدہ معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسولؐ نے اس کو ایک پسندیدہ چیز اور جنت کا ایک ذریعہ قرار دیا ہے۔

علو اسناد اور نزول اسناد

جن مقاصد کے لئے محدثین کرام سفر اختیار فرماتے تھے، ان میں سے بعض کا تذکرہ آگے آئے گا۔ ان میں سے ایک اہم مقصد یہ بھی ہوتا تھا کہ اپنی سند کو بہتر سے بہتر بنایا جائے۔ کل علوم حدیث کے عنوان سے اس موضوع پر بھی اس پر بات ہوگی کہ علو اسناد اور نزول اسناد سے کیا مراد ہے۔

علو اسناد سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور محدث کے درمیان کم سے کم واسطے ہوں۔ جیسا کہ امام مالکؒ کی موطا میں اعلیٰ ترین احادیث وہ ہیں جو ثنائی ہیں اور جن میں امام مالکؒ

اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان صرف دو واسطے ہیں، مالک عن نافع عن بن عمرؓ۔ امام بخاری کی عالی اسناد کے بارے میں ایک دو روز قبل مجھ سے غلطی ہوگئی تھی۔ میں اس کی اصلاح کر دیتا ہوں۔ آپ بھی اپنی یادداشتوں میں اصلاح کرلیں۔ امام بخاری کے ہاں جو سندیں سب سے اعلیٰ ہیں وہ ثلاثیات کہلاتی ہیں جن میں امام بخاری اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان تین واسطے ہیں۔ میں نے غالبًا یہ کہا تھا کہ ثلاثیات کا بیش تر حصہ علی بن مدینی سے منقول ہے۔ یہ غلطی ہوئی۔ علی بن مدینی سے نہیں، بلکہ امام بخاری کی بیشتر ثلاثیات مکی بن ابراہیم سے منقول ہیں۔ مکی بن ابراہیم اور علی بن مدینی دونوں امام بخاری کے اساتذہ ہیں۔ لیکن ثلاثیات کی بڑی تعداد مکی بن ابراہم سے منقول ہے۔ علی بن مدینی سے منقول نہیں ہے۔

اس علو اسناد کے بارے میں امام احمد کا ارشاد ہے کہ 'طلب علو الاسناد من الدین' کہ علو اسناد کو حاصل کرنا بھی دین کا ایک حصہ ہے، یہ چیز دین کا حصہ اس لئے ہے کہ سندیں اور واسطے جتنے کم ہوں گے بات اتنی یقینی ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات جتنے یقینی انداز میں کسی تک پہنچیں گے اتنا ہی زیادہ اس پر عمل درآمد کے لئے جذبہ پیدا ہوگا۔ جتنا عمل درآمد کا جذبہ پیدا ہوگا اتنی ہی دقت نظر کے ساتھ انسان عمل کرے گا۔ اس لئے علو اسناد کا حصول بھی دین کا ایک حصہ ہے۔ جب علو اسناد کے لئے انسان سفر اختیار کرے گا تو وہ بھی دین کا ایک حصہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے اس کا اجر ملے گا۔

آپ نے مشہور بزرگ اور صوفی ابراہیم بن ادھمؒ کا قصہ سنا ہوگا۔ ان کا زمانہ وہی ہے جب محدثین کرام طویل اور مسلسل سفر اختیار فرمایا کرتے تھے اور علم حدیث کے بارے میں معلومات جمع کیا کرتے تھے۔ ایک موقع پر حضرت ابراہیم بن ادھم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت سے جو بلائیں اور آزمائشیں اٹھائی ہیں اس کی ایک وجہ محدثین کرام کے طویل سفر بھی ہیں، یعنی محدثین جو طویل سفر اختیار فرماتے ہیں اور جو مشقت برداشت کرتے ہیں اس کی برکت سے اور اس کی پسندیدگی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس امت کی بہت سی بلائیں ہٹادی ہیں اور ختم کردی ہیں۔

علم حدیث کے لئے صحابہؓ کے سفر

علم حدیث کے لئے سفر کرنے کا طریقہ سب سے پہلے خود صحابہ کرامؓ نے شروع کیا۔ صحابہ کرامؓ نے کئی مواقع پر طویل سفر اختیار فرمائے، جن کا مقصد یہ تھا کہ حدیث کے بارے میں جو معلومات کسی اور صحابیؓ کے پاس ہیں ان کو حاصل کیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جو عبادلہ اربعہ میں سب سے پہلے درجہ پر فائز ہیں۔ یعنی عبداللہ نام کے چار مشہور صحابیوں میں جن کا درجہ سب سے پہلا ہے اور صحابہ کرامؓ میں جو فقہ اور افتا میں سب سے نمایاں صحابہ میں سے تھے، ان کا ارشاد ہے کہ قرآن مجید کی کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کے بارے میں مجھے یہ معلوم نہ ہو کہ یہ کب نازل ہوئی ہے اور کہاں نازل ہوئی ہے۔ میں ہر آیت کے بارے میں جانتا ہوں، اور الحمدللہ ہر سورۃ کے بارے میں مجھے علم ہے۔ اگر کوئی آیت ایسی ہوتی جس کے بارے میں میں نہ جانتا کہ وہ کہاں نازل ہوئی اور کب نازل ہوئی، یا جس کے بارے میں مجھ سے زیادہ کوئی جاننے والا موجود ہوتا تو میں اس کے پاس سفر کر کے جاتا اور جہاں تک سواریاں اور اونٹنیاں پہنچا سکتی ہیں میں وہاں پہنچتا اور اس آیت کے بارے میں معلومات حاصل کرتا۔ یہ متفق علیہ حدیث ہے اور بخاری و مسلم دونوں نے اس کو نقل کیا ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ ایک مشہور صحابیؓ ہیں۔ ان کو اطلاع ملی کہ رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابیؓ شام میں مقیم ہیں جن کا نام عبداللہ بن اُنیس ہے۔ ان کے پاس کوئی ایسی حدیث ہے جو جابر بن عبداللہؓ نے نہیں سنی۔ جابر بن عبداللہؓ نے سفر کے مصارف اور زادِ راہ کا انتظام کیا، اونٹ خریدا اور ایک مہینے کا سفر کر کے شام پہنچے۔ دمشق گئے، عبداللہ بن انیس کے مکان کا پتہ کیا۔ دروازے پر کھٹکھٹایا، ملازم نکلا، اس نے اندر جا کر بتایا کہ کوئی بدو آیا ہے، پرانے کپڑے پہنے ہوئے ہے، گرد آلود ہے، معلوم ہوتا ہے کہ دور سے سفر کر کے آیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن انیس نے کہا کہ جا کر نام معلوم کرو۔ انہوں نے کہا کہ 'جابر'۔ عبداللہ بن انیس نے ملازم سے مزید وضاحت کروائی کہ کون جابر؟ باہر سے جواب لایا گیا کہ 'جابر بن عبداللہؓ'۔ یہ نام سنتے ہی عبداللہ بن انیس تڑپ اٹھے۔ اندر سے دوڑتے ہوئے نکلے، حضرت جابر کو گلے لگایا، پیشانی پر بوسہ دیا اور پوچھا کہ کیسے تشریف لائے؟ انہوں نے کہا 'بس اتنا معلوم کرنا تھا کہ فلاں حدیث کے بارے میں پتہ چلا

تھا کہ وہ آپ کے پاس ہے۔ اس کے الفاظ کیا ہیں اور آپ نے رسول اللہ ﷺ سے کن الفاظ میں اس حدیث کو سنا تھا؟' انہوں نے دوہرایا کہ ان الفاظ میں سنا تھا۔ انہوں نے کہا الحمد للہ، صرف اس غرض کے لئے آیا تھا اس کے علاوہ اور کوئی غرض نہیں ہے۔ اونٹ کی باگ موڑ دی اور واپس مدینہ منورہ کی طرف چل پڑے۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ کو ایک مرتبہ ایک اور حدیث کے حصول کے لئے مصر جانے کا موقع ملا۔ مصر میں ایک صحابی کے بارے میں انہوں نے سنا کہ ان صحابی کے علم میں کوئی حدیث ہے اور ان کے علاوہ کوئی اور صحابیؓ اس وقت ایسے نہیں ہیں جو اس حدیث کا علم رکھتے ہوں۔ وہ اونٹ پر سوار ہوئے اور مدینہ منورہ سے سفر کر کے مصر پہنچے۔ وہ صحابیؓ مصر کے گورنر تھے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ ملازم نکلا تو بولے کہ گورنر سے کہو کہ باہر آئے۔ ملازم کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ کون شخص ہے، اس لئے کہ اس طرح تو کوئی نہیں کہتا۔ لوگ تو درخواست لے کر آتے ہیں کہ میں گورنر سے ملنا چاہتا ہوں، کس وقت ملاقات کا موقع مل سکتا ہے وغیرہ۔ یہ کون شخص ہے جو گورنر سے باہر آنے کا کہہ رہا ہے۔ اس نے جا کر کہا کہ باہر ایک بدو آیا ہے اور کہتا ہے کہ گورنر سے کہو کہ باہر آئے۔ وہ بھی اپنے ساتھیوں کے مزاج شناس تھے، سمجھ گئے کہ کوئی صحابیؓ ہوں گے۔ کہا کہ جا کر نام پوچھ کر آؤ۔ اِنہوں نے کہا 'جابر'۔ اُنہوں نے کہا کہ ہو نہ ہو یہ جابر بن عبداللہ ہیں، دوڑتے ہوئے باہر آئے، گلے ملے اور پوچھا کہ کیسے آنا ہوا۔ انہوں نے کہا کہ آپ کے پاس ایک حدیث ہے جس کے الفاظ ہیں کہ من ستر عورة مسلم فکانما احیا موءدة، یعنی جس نے کسی مسلمان کی کسی کمزوری کو چھپایا وہ ایسا ہی ہے جیسا کسی نے زندہ در گور کی جانے والی بچی کو زندگی بخشی۔ کسی مسلمان کی کسی کمزوری کو چھپانا ایسا ہی کار ثواب ہے جیسا کسی ایسی جان کو بچا لینا جس کو اس کے رشتہ دار زندہ در گور کرنے کے لئے آمادہ ہوں۔ گورنر صاحب نے تصدیق کی اور دوبارہ حدیث کے الفاظ دہرا دیئے۔ انہوں نے یہ الفاظ سنے۔ نعرہ تکبیر بلند کیا، اللہ اکبر کہا اور واپس تشریف لے گئے۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ کو پتہ چلا کہ یہی حدیث دوسرے الفاظ میں ایک صحابیؓ کے پاس ہے۔ انہوں نے بھی مدینہ منورہ سے مصر کا سفر اختیار کیا۔ ان صحابیؓ کے مکان پر دستک دی اور یہ حدیث ان الفاظ میں سنی کہ من ستر مومنا فی الدنیا ستره الله فی یوم القیامة، جو شخص اس دنیا میں کسی مومن کی پردہ پوشی کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی کرے گا۔ انہوں

نے اللہ اکبر کہا، الحمد للہ کہا اور اپنی سواری کی باگ موڑ کر واپس تشریف لے گئے۔

ایک صحابیؓ جن کا نام عبید اللہ بن عدیؓ ہے۔ ان کا تعلق رسول اللہ ﷺ کے قبیلہ بنی عبد مناف سے تھا۔ ان کو پتہ چلا کہ حضرت علیؓ کے پاس کوئی حدیث ہے جو ان تک نہیں پہنچی۔ یہ مدینہ منورہ سے چلے، کوفہ پہنچے، حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے حدیث سنی، سیکھی، یاد کی، نوٹ کر لی اور واپس چلے گئے۔

حضرت جابر بن عبد اللہؓ نے دو سفر کئے۔ ایک شام کا اور ایک مصر کا۔ دونوں سفروں میں صرف دو احادیث سن کر واپس آ گئے۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے بھی ایک سفر مصر کے لئے اختیار کیا۔ حضرت عقبہ بن عامر الجہنی جو مصر میں تھے، ان سے علم حدیث کے بارے میں کوئی روایت معلوم کی اور واپس آ گئے۔ صحابہ کرامؓ کے اور بھی واقعات ہیں جن میں انہوں نے کسی حدیث کی تحقیق کے لئے سفر اختیار کئے۔ ان چند واقعات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہوں نے ایک ایک روایت کی تحقیق کی خاطر کتنے سفر اختیار کئے۔

علم حدیث کے لئے تابعین کے سفر

جب تابعین کا زمانہ آیا تو یہ روایت اور بھی زیادہ عام ہوگئی۔ اتنی عام ہوگئی کہ ایک ایک لفظ اور ایک ایک بات سیکھنے کے لئے تابعین طویل سفر اختیار فرمایا کرتے تھے۔ امام شعبی جن کی وفات **104** ھ میں ہوئی اور وہ امام ابو حنیفہ کے اساتذہ میں سے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص شام کے انتہائی شمالی علاقہ سے سفر کرے اور یمن کے انتہائی جنوبی علاقہ تک جائے اور کسی حدیث کا ایک لفظ یاد کر کے واپس آ جائے، فحفظ کلمۃ، کوئی ایک کلمہ سن کر آ جائے، تنفع فی ما یستقبلہ، جو مستقبل میں اس کے لئے مفید اور کارآمد ہو، تو میرا یہ خیال ہے کہ اس کا یہ سفر ضائع نہیں ہوا۔ یہ سفر کامیاب اور کامران و مفید ہے۔

حضرت علقمہ اور اسود دو مشہور اور بڑے تابعین میں سے ہیں اور ان کا درجہ تفقہ میں اور شریعت کے فہم اور بصیرت میں بہت اونچا مانا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ امام ابو حنیفہ نے ایک بار ارشاد فرمایا کہ اگر شرف صحابیت اور احترام صحابیت مانع نہ ہوتا تو میں یہ کہتا کہ علقمہ کا تفقہ عبد اللہ بن عمرؓ سے بڑھ کر ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں کوفہ میں تھے۔ وہ اور اسود نخعی دونوں حضرت

عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگرد تھے اور بقیہ لوگوں سے بھی احادیث اور روایات سیکھتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے حضرت عمر فاروقؓ کے حوالہ سے لوگوں سے بعض روایات سنیں۔ حضرت عمر فاروقؓ مدینہ منورہ میں حیات تھے۔ ان دونوں حضرات نے ایک دو مرتبہ نہیں بار ہا کوفہ سے مدینہ منورہ کا سفر اختیار کیا اور وہ روایات براہ راست حضرت عمر فاروقؓ کی زبان سے سنیں جو وہ پہلے تابعین کے ذریعے بالواسطہ سنتے تھے۔ اس میں علو اسناد بھی ہے اور روایت کا مزید تحقق اور تثبت بھی ہے۔

ایک مشہور تابعی ہیں ابوالعالیہ، وہ کہتے ہیں کہ ہم اصحاب رسول ﷺ کے بارے میں روایات سنتے رہتے تھے۔ ان سے وہ روایات جو تابعین روایت کرتے تھے وہ بصرہ میں ہم تک پہنچتی تھیں۔ فما نرضیٰ حتیٰ نرکب الی المدینہ، ہم اس پر راضی نہ ہوتے تھے جب تک مدینہ جا کر براہ راست ان صحابہ کرامؓ کی زبان مبارک سے نہ سنیں۔ فنسمع من افواھھم، ان کی زبان مبارک سے براہ راست سننے کے لئے ہم مدینہ کا سفر اختیار کرتے تھے۔ اس وقت اگر سڑک کے راستہ بصرہ سے مدینہ منورہ آئیں، اور یاد رہے کہ سعودی عرب کی سڑکوں پر سو ڈیڑھ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنا معمول کی بات ہے۔ آج بھی بصرہ سے مدینہ منورہ تک پہنچنے میں کم از کم تیس بتیس گھنٹے لگیں گے۔ اس زمانے میں یہ کم و بیش ایک ڈیڑھ مہینے کا سفر ہوا کرتا تھا۔

حضرت ابوعثمان النہدی ایک اور تابعی ہیں۔ ان کو پتہ چلا کہ حضرت ابو ہریرۃؓ کے پاس ایک ایسی روایت ہے جو براہ راست انہی سے مل سکتی ہے کسی اور صحابیؓ کے پاس وہ روایت نہیں ہے، یا کم از کم ان صحابہ کے پاس نہیں ہے جن تک ان کی رسائی تھی۔ انہوں نے مدینہ منورہ کا سفر اختیار کیا۔ مدینہ منورہ پہنچتے پہنچتے حج کا زمانہ آگیا۔ معلوم ہوا کہ حضرت ابو ہریرۃؓ حج کے لئے تشریف لے گئے۔ یہ بھی حج کے لئے چلے گئے۔ حج سے فارغ ہو کر حضرت ابو ہریرۃؓ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا کہ ہمارا ارادہ تو حج کرنے کا نہیں تھا، لیکن یہ سنا تھا کہ آپ کے پاس ایک روایت ہے جو کسی ذریعہ سے مجھ تک پہنچی ہے۔ میں اس کے بارے میں براہ راست آپ سے تحقیق کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت ابو ہریرۃؓ نے پوچھا: وہ کیا روایت ہے۔ انہوں نے کہا کہ روایت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ان اللہ لیکتب لعبدہ المومن بالحسنۃ الواحدۃ الفَ الفِ حسنۃ' اللہ تعالیٰ بعض اوقات اپنے مومن بندے کے لئے ایک نیکی کے بدلے میں دس لاکھ

نیکیاں لکھ دیتے ہیں۔حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ سننے والے سے غلطی ہوئی۔صحیح الفاظ یہ نہیں ہیں۔اب ان کو بڑی مایوسی ہوئی کہ میرے پاس ایک بہت حوصلہ افزا اور ایمان افروز حدیث تھی جس کی تصدیق حضرت ابو ہریرہؓ نے نہیں کی۔فوراً ان کے دل میں مایوسی کی ایک کیفیت طاری ہوگئی۔حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا: اصل الفاظ یہ ہیں:' ان الله ليعطى لعبده المومن بالحسنة الواحدة الفى الف حسنة 'اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے کو ایک نیکی کے مقابلہ میں بیس لاکھ نیکیاں دیتے ہیں۔اب انہوں نے حیرت سے دیکھا کہ ایک نیکی کے مقابلہ میں بیس لاکھ نیکیاں کیسے ہوسکتی ہیں۔اس پر حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ جو لوگ اللہ کو قرض دیں گے، قرضا حسناً فيضعفه له اضعافا كثيراً تو اللہ تعالیٰ ان کے لئے اس کو بہت گنا بڑھا دیں گے۔تو انہوں نے کہا کہ ہمارے تمہارے لئے دس بیس لاکھ تھوڑی رقم ہے۔ اللہ کے لئے تو اضعافاً کثیراً ہے، بہت گنا۔تو اللہ تعالیٰ کے لئے دس لاکھ بیس لاکھ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔وہ اس اضافہ اور ترمیم کے ساتھ خوشی خوشی واپس آئے اور یہ حدیث انہوں نے ایک واسطہ کم کر کے براہ راست صحابیؓ رسولؐ سے سن لی۔

ایک تابعی تھے ابن الدیلمی، فلسطین میں رہتے تھے۔ان کو پتہ چلا کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، جو صحیفہ صادقہ کے مصنف ہیں، مدینہ منورہ آئے ہوئے ہیں اور ان کے پاس ایک ایسی روایت ہے جس سے شراب خور کے بارے میں کوئی وعید ثابت ہوتی ہے۔وہ فلسطین سے سفر کر کے مدینہ منورہ پہنچے۔مدینہ میں لوگوں نے بتایا کہ وہ تو مکہ مکرمہ چلے گئے ہیں۔وہ سفر کر کے مکہ مکرمہ چلے گئے۔وہاں پہنچے تو کسی نے بتایا کہ حضرت عبداللہ طائف میں اپنے باغ کی دیکھ بال کے لئے گئے ہیں اور وہیں پر مقیم ہیں۔ چنانچہ یہ طائف پہنچے۔اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے پوچھا کہ کیا آپ نے رسول اللہ ﷺ سے کوئی حدیث شراب خور کی وعید کے بارے میں سنی ہے۔آپ نے فرمایا ہاں، سمعت رسول الله ﷺ يقول، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا' من شرب الخمر، جس نے شراب پی، لم تقبل له صلوٰة اربعين صباحاً، تو چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہیں ہوگی۔

ایک صاحب امام اوزاعی کے پاس علم حدیث سیکھنے کے لئے تشریف لائے۔چار پانچ دن امام اوزاعی کے پاس رہے۔صبح سویرے امام کی خدمت میں حاضر ہو جاتے تھے اور رات تک

ان کی خدمت میں رہتے تھے۔امام اوزاعی ایک دن میں ایک ہی حدیث سنانے پر اکتفا کرتے تھے۔چار پانچ دن کے بعد انہوں نے قدرے ناگواری سے عرض کیا کہ میں چار دن سے آپ کے ساتھ ہوں اور آپ نے چار دنوں میں مجھے چار ہی حدیثیں سنائی ہیں۔امام اوزاعی غالباً یہی بات ان سے کہلوانا چاہتے تھے۔انہوں نے حضرت جابرؓ کا وہ قصہ سنایا جس میں انہوں نے ایک اونٹ خریدا اور پہلے دمشق جا کر ایک روایت کی تصدیق (confirmation) کی۔پھر ایک دوسرے موقعہ پر سفر کر کے مصر گئے اور ایک وہاں ایک دوسری روایت verify کرائی۔انہوں نے کہا کہ صحابہ کرامؓ ایک ایک روایت کے حصول کے لئے نہیں، کیونکہ روایت تو ان کو پہلے سے حاصل ہوتی تھی، محض صحابیؓ سے براہ راست سننے کے لئے ایک ایک اور دو دو مہینے کا سفر اختیار کیا کرتے تھے۔تم چار دن میں چار احادیث کے ملنے پر ناخوش ہو۔غالباً اس کام کی اہمیت ان کو جتانا مقصود تھا۔اس لئے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا اور ان کو یاد دلایا۔

ایک اور تابعی ہیں حضرت ابوعلی بغدادی الاسدی۔ان کو یہ پتہ چلا کہ خراسان میں کوئی تابعی ہیں۔خراسان بہت بڑا صوبہ سمجھا جاتا تھا جس کی حدود موجودہ ایران میں مشہد سے لے کر پورے افغانستان کے شمالی حصہ اور وسط ایشیا کے جنوبی حصہ اور موجودہ تاجکستان کے حدود تک پھیلی ہوئی تھیں، اور یہ پورا علاقہ خراسان کہلاتا تھا۔آج وسط ایشیا میں جو علاقہ فارسی بان ہے یہ خراسان کہلاتا تھا۔امام ابوعلی بغدادی کو یہ پتہ چلا کہ خراسان میں کسی صاحب کے پاس ایک حدیث ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے حضرت معاویہؓ کو ایک خط لکھا تھا اور اس میں یہ لکھا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا سکھائی ہے کہ لا الہ الا اللہ وحدہ لہ الملك ولہ الحمد و ھو علی کل شئی قدیر اللھم لا مانع لما اعطیت و لا معطی لما منعت و لا ینفع ذالجد منك الجد 'انہوں نے کہا کہ یہ دعا رسول اللہ ﷺ نے مجھے سکھائی تھی تم بھی پڑھا کرو۔حضرت معاویہؓ سے پھر بقیہ تابعین نے اس دعا کو یاد کیا۔یہ روایت ان تابعی سے براہ راست سننے کی غرض سے انہوں نے بغداد سے خراسان کا طویل سفر اختیار کیا۔

ایسی روایات بھی ہیں جن میں دو صحابیؓ ایک دوسرے سے روایت کرتے ہیں۔عموماً ایک صحابیؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کر کے تابعین کو بتاتے ہیں۔لیکن ایسی مثالیں بھی ہیں کہ ایک صحابیؓ نے دوسرے صحابیؓ سے حدیث روایت کی ہے اور یہ حدیث اس کی ایک مثال ہے کہ

حضرت معاویہؓ حضرت مغیرہ بن شعبہ سے روایت کرتے ہیں۔ اس حدیث کو براہ راست ان تابعی کی زبان سے سننے کے لئے جنہوں نے حضرت معاویہؓ کی زبان مبارک سے سنا تھا انہوں نے بغداد سے خراسان کا سفر اختیار کیا اور خراسان جا کر اس حدیث کا ایک واسطہ کم ہو گیا اور یہ حدیث انہوں نے اختیار کی۔

آپ نے حضرت زِر بن حُبَیش کا نام سنا ہوگا۔ زر بن حبیش ایک مشہور تابعی ہیں۔ قرات کے فن میں بہت بڑے امام ہیں۔ حضرت اُبیؓ بن کعبؓ کے خصوصی تلامذہ میں سے ہیں۔ حضرت اُبیؓ بن کعبؓ وہ صحابیؓ ہیں جن کو حضورؐ نے یہ اعزاز عطا فرمایا کہ آپؐ کے بارے میں یہ گواہی دی کہ اقرئھم ابی، میرے صحابہ میں سب سے اچھے قاری اور سب سے اچھا قرآن پڑھنے والے ابیؓ بن کعبؓ ہیں۔ حضرت ابیؓ بن کعبؓ قرآن فہمی اور قرآن خوانی میں سب صحابہ کرامؓ میں ممتاز تھے۔ جتنے قرات اور تجوید کے سلسلے ہیں وہ سارے کے سارے یا اکثر و بیشتر حضرت ابیؓ بن کعبؓ تک پہنچتے ہیں۔ جو بڑے بڑے قرّا ہیں، جو قراسبعہ کہلاتے ہیں ان میں سے بیشتر کی روایت حضرت ابیؓ بن کعب تک پہنچتی ہے۔ ان کے شاگردوں میں بڑا نمایاں نام حضرت زر بن حبیش کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں حضرت عثمان بن عفانؓ کی خلافت کے زمانے میں کوفہ سے مدینہ منورہ آیا اور اس پورے سفر کا مقصد صرف حضرت ابیؓ بن کعبؓ سے ملاقات اور دوسرے صحابہ کرامؓ کی زیارت تھی۔ وانما حملنی علی الافادۃ، اور مجھے اس لمبے علمی سفر پر آمادہ کیا، لقی ابئی بن کعب، ابیؓ بن کعب کی ملاقات نے۔ اس کے علاوہ میرا کوئی اور مقصد نہیں تھا۔

حضرت ابوالعالیہ جن کا ابھی میں نے ذکر کیا، وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ، یعنی تابعی حضرات کسی شیخِ حدیث سے ملاقات کے لئے کئی کئی روز کا سفر کر کے پہنچتے تھے، یا تو کسی حدیث کی تحقیق کی خاطر یا سابقہ حدیث کی سند کو مزید بہتر بنانے کی خاطر، یا ایک نئے طریقے کا اضافہ کرنے کی خاطر، یا کسی راوی کے کردار اور حافظہ کی تحقیق کی خاطر۔ سفر کرنے کے بعد جب ہم منزل پر پہنچتے تھے تو سب سے پہلے ہم یہ دیکھتے تھے کہ ان کے ہاں نماز کا اہتمام کتنا ہے۔ اگر وہ نماز کا اہتمام مکمل طور پر کرتے تھے تو ہم وہاں ٹھہر کر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور حدیث کے بارے میں جو سیکھنا ہوتا تھا وہ سیکھ لیتے تھے۔ اور اگر یہ دیکھتے تھے کہ نماز میں کمزوری پائی جاتی ہے تو ہم الٹے پاؤں واپس آجاتے تھے اور ان سے نہیں ملتے تھے اور ہمارا کہنا یہ ہوتا تھا کہ جو نماز کے

بارے میں اہتمام نہیں کرتا اور نمازوں کو ضائع کرتا ہے وہ باقی چیزوں کو بھی ضائع کرتا ہوگا۔

ایک اور تابعی ہیں جن کا شمار غالباً صغار تابعین میں ہے، زید بن الحباب، یا تبع تابعینؒ میں سے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ مجھے ایک روایت ملی، جس کے بارے میں پتہ چلا کہ اس کو تین بزرگوں نے روایت کیا ہے۔ ایک روایت کے راوی کوفہ میں، دوسری روایت کے راوی مدینہ میں اور تیسری روایت کے راوی مصر میں ہیں۔ میں پہلے کوفہ گیا۔ وہاں شیخ سے مل کر اس کی تصدیق کی اور اس روایت کو حاصل کیا۔ اس کے بعد دوسرا سفر میں نے مدینہ منورہ کا اختیار کیا۔ مدینہ منورہ میں جو شیخ تھے ان سے اس روایت کو لیا اور وہاں سے مصر پہنچا تو معلوم ہوا کہ جن سے ملنے آیا ہوں ان سے ملاقات کے اوقات مقرر ہیں اور ان مقرر اوقات کے علاوہ وہ کسی سے نہیں ملتے۔ فجلست علی بابه، میں ان کے دروازے پر بیٹھا رہا۔ جب وہ باہر نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک بدو دروازے پر بیٹھا ہوا ہے۔ پوچھا کہ کس لئے آئے ہو، بتایا کہ اس غرض سے آیا ہوں۔ انہوں نے حدیث پڑھ کر بتائی اور حدیث کے الفاظ کو verify کیا کہ یہی الفاظ تھے: فرق مابین صیامنا و صیام اھل الکتاب اکلة السحر ۔ کہ ہمارے اور اہل کتاب کے روزوں میں ایک اہم فرق ہے وہ سحری کا ہے۔ اہل کتاب جب روزہ رکھتے ہیں تو سحری نہیں کھاتے اور ہم جب روزہ رکھتے ہیں تو سحری کھا کر رکھتے ہیں۔

اس روایت کے ان الفاظ کے تحقق اور تیقن کے لئے انہوں نے تین بڑے شہروں کا سفر اختیار کیا۔ اس میں کتنا وقت لگا ہوگا، کتنے پیسے لگے ہوں گے، کتنے وسائل خرچ ہوئے ہوں گے، اس کا ہم صرف اندازہ ہی کر سکتے ہیں، یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ افسوس کہ کسی محدث نے اپنا حساب کتاب لکھ کے نہیں چھوڑا، ورنہ ہمیں شاید یہ بھی پتہ چلتا کہ راستے میں کتنا خرچ ہوا، کتنی منزلیں آئیں اور کہاں کہاں ٹھہرے۔ وہ اس کام کو صرف اللہ کے لئے کرنا چاہتے تھے، اس لئے انہوں نے شاید اپنا حساب نہیں لکھا۔ اگر حساب کسی نے لکھا ہوتا تو آج شاید اس بہن کے سوال کا جواب بھی مل جاتا جنہوں نے پوچھا تھا کہ ان کے اخراجات کیسے اور کہاں سے پورے ہوتے تھے۔

علم حدیث کے لئے تبع تابعین کے سفر

عبدالرحمٰن بن مندہ ایک اور محدث ہیں جن کا شمار تبع تابعینؒ کے بعد کی نسل میں ہوتا ہے۔ غالبًا 395 ان کا سن وفات ہے۔ یہ ایک طویل سفر پر نکلے۔مختلف شہروں، علاقوں اور براعظموں میں گھومے اور جہاں جہاں محدثین پائے جاتے تھے، (اور یاد رہے کہ محدثین کرام تین براعظموں میں پائے جاتے تھے؛ یورپ، افریقہ اور ایشیا۔) وہاں وہاں انہوں نے علم حدیث حاصل کیا اور جب واپس آئے تو چالیس اونٹوں پر ان کی کتابیں اور یادداشتیں لدی ہوئی تھیں۔وہ یہ سارا ذخیرہ لے کر وہ واپس لے کر آئے۔

یہ چند مثالیں ہیں جو حدیث کی کتابوں سے سرسری طور پر میں نے نوٹ کی ہیں وہ میں نے آپ کے سامنے رکھ دیں ہیں۔تذکرۃ الحفاظ جو امام ذہبی کی مشہور کتاب ہے،آپ میں سے جو لوگ عربی جانتے ہیں وہ ایک سرسری نظر اس کتاب پر ڈالیں،تو اس طرح کے بہت سے واقعات نظر آئیں گے۔علامہ خطیب بغدادی کی یہ کتاب جس کا عنوان ہے:'الرحلہ فی طلب الحدیث'۔اس میں بھی اس طرح کے سفروں کے واقعات اور مثالیں بیان ہوئی ہیں۔

اسفار محدثین کے مقاصد

یہ سفر کیوں اختیار کیا جاتا تھا؟ اس کے فوائد کیا تھے اور اس کے آداب کیا تھے؟ اب میں اس بارہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

سب سے پہلا فائدہ تو یہ تھا کہ وہ مختلف سندیں جو مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے راویوں کے ذریعے مرتب ہوئی تھیں ان میں یکسانیت اور وحدت پیدا ہو جاتی تھی۔ مدینہ منورہ میں رہنے والے ایک راوی خراسان کے رہنے والے ایک شیخ سے روایت کرتے تھے،خراسان کے اس راوی نے دمشق میں رہنے والے راوی سے روایت کی اور دمشق میں رہنے والے راوی نے قاہرہ میں رہنے والے راوی سے روایت کی۔اس طرح یہ دو براعظموں میں رہنے والے راوی اور مختلف ملکوں میں رہنے والے محدثین ایک سلسلہ سند سے وابستہ ہو جاتے تھے۔ وحدت اسناد ایک ایسا بڑا فائدہ تھا جو رحلہ کے ذریعے حاصل ہوا اور اس کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

دوسرا بڑا فائدہ تھا اشتراک روایات، کہ وہ روایات جو بعض خاص صحابہ کرامؓ کی وجہ

سے ان خاص علاقوں میں محدود ہوسکتی تھیں وہ پوری دنیائے اسلام میں پھیل گئیں۔ مثلاً حضرت علیؓ مدینہ منورہ سے ہجرت فرما کر کوفہ تشریف لے گئے۔ اب اگر تابعین بڑی کثرت سے کوفہ تشریف نہ لے گئے ہوتے اور کوفہ کے تابعین دوسرے شہروں میں تشریف نہ لے گئے ہوتے تو حضرت علیؓ کے پاس جو علم تھا وہ سارے کا سارا کوفے میں محدود ہو جاتا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ قاہرہ تشریف لے گئے تو ان کے علوم وفنون قاہرہ میں محدود ہو جاتے۔ حضرت عبادہ بن صامت دمشق تشریف لے گئے۔ حضرت معاویہؓ دمشق تشریف لے گئے۔ ان سب صحابہ کرامؓ کا علم قاہرہ اور دمشق وغیرہ تک محدود ہو جاتا۔ رحلہ اور پے در پے سفروں کی وجہ سے روایات ایک دوسرے کے ساتھ مشترک ہوگئیں۔ یعنی انہوں نے اس ذخیرے کو ایک دوسرے کے ساتھ شریک کرلیا۔ تمام صحابہ کرامؓ کے ذریعے فراہم ہونے والی رہنمائی باقی علاقوں کے لوگوں کے لئے عام ہوگئی۔

رحلہ کا تیسرا فائدہ تھا وحدت فکر۔ اس طرح کہ مختلف احادیث اور آیات قرانی کی تعبیر و تشریح میں جو ایک خاص نکتہ نظر ایک خاص علاقے کے صحابیؓ کا تھا اس سے باقی لوگوں نے استفادہ کیا۔ یوں ایک وحدت فکر پیدا ہوتی چلی گئی جس نے پوری دنیائے اسلام کے اتنے بڑے علاقے کو متحد رکھا جس کی حدود منگولیا سے لے کر اسپین بلکہ فرانس کی حدود تک پھیلی ہوئی تھیں۔ تین براعظموں پر مشتمل یہ وسیع دنیائے اسلام ایک ایسی غیر معمولی وحدت فکر کا نمونہ پیش کر رہی تھی جس کی مثال نہ پہلے ملتی تھی نہ اب ملتی ہے۔ یہ صرف رحلہ کے ذریعے ممکن ہوا۔

وحدت فکر وعلم کے ساتھ ساتھ وحدت عمل بھی پیدا ہوئی۔ وحدت عمل اس طرح پیدا ہوئی کہ دین کے احکام پر عمل کرنے کا جو طریقہ صحابہ کرامؓ کے پاس تھا وہ ان کے ذریعے تابعین تک اور پھر تابعین کے ذریعے تبع تابعینؒ تک اور پھر ان کے ذریعے پوری دنیائے اسلام میں عام ہوتا گیا۔ جب کسی تابعی کو پتہ چلتا کہ کوئی صحابیؓ کسی علاقہ میں تشریف لائے ہیں تو وہ کثرت سے ان کے قریب جمع ہوتے تھے۔

جب تابعین کا زمانہ ختم ہونے لگا تو تبع تابعینؒ اسی طرح تابعین کے پاس جمع ہوتے تھے جب تبع تابعینؒ کا زمانہ ختم ہونے لگا تو بقیہ لوگ ان کے پاس جمع ہوتے تھے اور یوں وحدت کا ایک عمل پوری دنیائے اسلام میں ان سفروں کی وجہ سے پیدا ہوا۔

پانچواں بڑا فائدہ تھا علو اسناد، جس کا میں ذکر کر چکا ہوں کہ جو سندیں محدثین کے پاس جمع ہو جایا کرتی تھیں ان کا درجہ مزید اونچا ہو جاتا تھا۔ کبھی دو درجے کبھی تین درجے۔ وہ روایت جو دو یا تین واسطوں سے ان تک پہنچی ہوتی تھی ان میں ایک یا دو واسطے کم ہو جاتے تھے اور براہ راست کسی صحابیؓ یا تابعی یا تبع تابعی یا بڑے محدث کی زبان سے ان کو احادیث سننے کا موقع ملتا تھا۔

روایات اور طرق کی تحقیق کا ایک فائدہ اور بھی تھا، ایک روایت یا طریق یعنی variation جس چینل سے آئی ہے اس کے بارے میں یہ بات confirm ہو جائے کہ واقعی یہ روایت یا سند درست ہے۔ ایک اور فائدہ یہ تھا کہ جن لوگوں کے بارے میں یہ شبہ تھا کہ یہ تدلیس سے کام لیتے ہیں۔ ان کے بارہ میں یہ یقین ہو جائے کہ انہوں نے سند میں تدلیس کی ہے یا نہیں۔ تدلیس سے مراد misrepresentation ہے۔ یعنی کوئی راوی جس حدیث یا محدث سے روایت کرنا بتاتے ہیں واقعتاً اس سے روایت کرتے بھی ہیں یا نہیں کرتے۔ مثلاً کسی شخص نے مدینہ سے واپسی پر کہا کہ عن قاسم بن محمد، قاسم بن محمد سے منقول ہے، اب ان الفاظ میں دونوں کی گنجائش موجود ہے کہ کیا براہ راست آپ نے سنا ہے یا ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ یہ روایت کیا کرتے ہیں اور آپ نے کہیں اور سے سن سنا کر بیان کر دیا۔ اس کا امکان موجود تھا کہ انہوں نے خود نہ سنا ہو بلکہ کسی اور سے سنا ہو تو عن کے ذریعے یہ بات کہی جا سکتی ہے تا کہ بعد میں اگر کوئی سوال کرے تو کہیں کہ میں نے تو کہا تھا کہ عن قاسم بن محمد۔ تو اگر کوئی شخص براہ راست قاسم بن محمد سے حدیث نقل کرے اور براہ راست ان کے اصحاب سے سنے تو اندازہ ہو جاتا تھا کہ تدلیس کرتے ہیں یا نہیں۔ پتہ چل جاتا تھا کہ ان کی قاسم سے ملاقات ہوئی تھی یا نہیں۔ اور جب یہ صاحب مدینہ منورہ آئے تھے تو قاسم بن محمد وہاں تشریف فرما تھے کہ نہیں تھے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہو جاتا تھا کہ تدلیس یا ضعف کے جو دوسرے اسباب ہیں وہ حدیث میں موجود ہیں کہ نہیں ہیں، اور اگر ہیں تو کس حد تک ہیں۔

ایک فائدہ یہ تھا کہ راویوں کے حالات کی تحقیق ہو جاتی تھی۔ جب محدثین دوسرے شہروں میں جاتے تھے تو ان کے پاس پہلے سے راویوں کی فہرست ہوا کرتی تھی کہ فلاں شہر میں کون کون سے راوی مشہور ہیں۔ کون کون سے شیوخ حدیث ہیں جو معروف ہیں۔ پھر وہاں جا کر وہ یہ تحقیق کرتے تھے کہ یہاں کے مشہور شیوخ کون کون ہیں اور کس درجہ کے انسان ہیں۔ ان

کا کردار کیسا ہے، اخلاق کیسے ہیں ان کی تعلیم کہاں ہوئی، انہوں نے کن اساتذہ سے سیکھا، ان کا عمل کیسا ہے، انہوں نے جن مشائخ سے سیکھا ہے واقعتاً اِن کی اُن سے ملاقات بھی ہوئی ہے کہ نہیں ہوئی ہے۔ یہ ساری معلومات جو آج فن رجال اور رواۃ کی کتابوں میں ملتی ہیں وہ اس طرح کے سفروں کے ذریعے جمع کی گئی تھیں۔ مزید برآں ایک اور فائدہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے عام حالات سے واقف ہونے کا موقع ملتا تھا جس سے امت مسلمہ میں مزید وحدت اور یکجہتی پیدا ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ علما سے مذاکرہ اور تبادلہ خیال کا موقع بھی مل جاتا تھا۔

یہ وہ فوائد تھے جو لوگوں نے خاص علم حدیث کے حوالے سے بیان کئے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور فوائد جو خالص علمی ہیں اور صرف علم حدیث کے ساتھ خاص نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر علمی پختگی پیدا ہوتی تھی۔ فارسی میں کہتے ہیں کہ بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے، بہت سفر کرنے کے بعد ہی ایک خام آدمی پختہ ہوتا ہے۔ کچے آدمی میں پے درپے سفر اختیار کرنے سے پختگی پیدا ہو جاتی ہے۔ جب مختلف پس منظر رکھنے والے اہل علم سے تبادلہ خیال کا اور ان کی باتیں سننے کا موقع ملتا ہے تو اس سے علم کی نشر و اشاعت میں مدد ملتی تھی اور یوں سب کو علمی فائدہ ہوتا تھا۔ اسلامی ثقافت میں وسعت پیدا ہوتی تھی۔ مکارم اخلاق و کردار اور صبر و ہمت اور بلند حوصلگی پیدا ہوتی تھیں۔ یہ فوائد تھے جو رحلہ کے ذریعے ایک خالص علمی انداز میں سامنے آرہے تھے۔

علم حدیث کے لئے سفر کرنے کا طریقہ

ابن خلدون نے مقدمہ میں جہاں علم حدیث کی تاریخ پر بحث کی ہے اور مسلمانوں کی علمی روایات کا تذکرہ کیا ہے وہاں ایک خاص فصل اس مفہوم کی رکھی ہے کہ علم حدیث کے لئے سفر کا کیا طریقہ تھا۔ اس فصل کا عنوان ابن خلدون نے یہ باندھا ہے: 'فصل فی ان الرحلة فی طلب العلوم ولقاء المشیخه مزید کمال فی التعلم'۔ فصل اس امر کے بیان میں کہ طلب علم کے لئے سفر اور مشائخ کی ملاقات سے تعلم میں مزید کمال پیدا ہوتا ہے۔ علم میں اور علم حاصل کرنے کی اس مہم میں مزید پختگی آتی ہے۔ اس لئے یہ روایت مسلمانوں میں طویل زمانے تک جاری رہی۔ برصغیر کے علما بھی اس سے خالی نہیں تھے۔ ان کے بارے میں گفتگو 'برصغیر میں علم حدیث' کے موضوع پر ہونے والے خطبہ میں آئے گی۔

جن حضرات نے علم حدیث سیکھنے اور سکھانے کے آداب پر کتابیں لکھی ہیں ان میں رحلہ کے آداب پر بھی کتابیں لکھی ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا تھا کہ جب منہ اٹھا چل پڑے اور جب جی چاہا واپس آ گئے بلکہ کچھ آداب اور قواعد کی پابندی لازمی سمجھی جاتی تھی۔

خطیب بغدادی کی ایک کتاب ہے 'الکفایہ فی علم الروایۃ' اور ایک دوسری کتاب ہے 'الرحلۃ فی طلب الحدیث'۔ اس میں خطیب بغدادی نے یہ سارے قواعد وضوابط بیان کئے ہیں کہ علم حدیث کے طالب علم کو کن آداب اور قواعد کی پابندی کرنی چاہئے۔ ایک اور کتاب ہے 'الجامع فی اخلاق الراوی و آداب السامع' یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ راوی کے اخلاق کیسے ہونے چاہئیں اور جو حدیث سننے والا ہے یعنی روایت کرنے والا ہے اس کو کن آداب کی پیروی کرنی چاہئے۔ یہ کتاب دو ضخیم جلدوں میں ہے جس میں ایک ایک مرحلہ کے آداب الگ الگ ترتیب وار بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں بعض کا ذکر علوم حدیث کے باب میں ہوگا۔ اسی طرح سے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جب راوی شیخ کی خدمت میں جا کر بیٹھے تو املا لینے کے آداب کیا ہوں۔ اس پر ایک الگ کتاب بھی ہے جس کا نام ہے: 'آداب الاملاء والاستملاء' املا اور استملا کے آداب۔

جیسا کہ میں نے بتایا کہ جب حاضرین زیادہ تعداد میں ہوتے تھے تو شیخ کسی حدیث کا ایک جملہ پڑھتے تھے، آگے ایک مستملی بیٹھا ہوتا تھا وہ اس کو بلند آواز سے دہراتا تھا، پھر آگے ایک اور مستملی بیٹھا ہوتا تھا وہ مزید بلند آواز سے دہراتا تھا، یہاں تک کہ تمام حاضرین تک بات پہنچ جائے۔ اس کے آداب کیا تھے؟ اس بارے میں علوم حدیث میں بات ہوگی۔

علم حدیث کے لئے سفر کے آداب

اختصار کے ساتھ رحلہ کے جو آداب بیان کئے گئے ہیں وہ پانچ ہیں۔

(۱) سب سے پہلا ادب یہ بیان کیا گیا ہے کہ سفر اختیار کرنے سے پہلے اپنے وطن کے علمائے حدیث سے علم حدیث حاصل کیا جائے۔ اس لئے کہ ان کے پاس جو ذخیرہ علم ہے، اس کو چھوڑ کر دور کا سفر اختیار کرنا اس دستیاب نعمت کی قدر ناشناسی ہوگی۔ علم حدیث اگر اپنے شہر میں دستیاب ہے تو جتنا ذخیرہ وہاں دستیاب ہے پہلے اس کو حاصل کیا جائے۔ اس کے بعد دور کا

سفر اختیار کیا جائے۔ یہ حدیث رسولؐ کے ادب اور احترام کے خلاف سمجھا گیا کہ قریب کے دستیاب ذخیرہ کو نظر انداز کر کے دوسرے کسی علاقے میں دستیاب ذخیرہ کو حاصل کرنے کے لئے سفر اختیار کیا جائے۔

(۲) دوسرا ادب یہ تھا کہ جب اپنے علاقے میں حدیث کے ذخائر اور حدیث کے مشائخ سے پورے کا پورا علم حاصل کر لیا جائے اور دوسرے کسی علاقے کا سفر اختیار کیا جائے تو جگہ کے تعین اور انتخاب میں اہتمام سے کام لیا جائے۔ یہ دیکھا جائے کہ زیادہ بڑا ذخیرہ کہاں دستیاب ہے۔ مشائخ کس علاقہ میں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ حدیث کے تحریری ذخائر جس علاقہ کے مشائخ کے پاس زیادہ ہیں، پہلے اس کو منتخب کیا جائے۔ اس کے بعد بتدریج جس علاقہ میں حدیث کی روایات جتنی زیادہ ہوں اس علاقہ کا سفر پہلے اختیار کیا جائے۔

(۳) تیسرا ادب بڑا دلچسپ اور اہم ہے کہ جب سفر اختیار کیا جائے اور کسی علاقہ میں جا کر وہاں کے مشائخ کی خدمت میں حاضری دی جائے تو تکثیر روایات پر زور دیا جائے، تکثیر مشائخ پر زور نہ دیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس راوی کے اساتذہ کی تعداد زیادہ ہوتی تھی اس کو زیادہ پذیرائی ملتی تھی اور اس کی شہرت زیادہ ہوتی تھی کہ فلاں نے ایک ہزار اساتذہ سے علم سیکھا ہے، فلاں محدث نے دو ہزار اساتذہ سے علم سیکھا ہے۔ تو یہ شہرت اپنے بارے میں ایک خوش گمانی اور نفس میں ایک جذبہ تفاخر پیدا کرتی تھی۔ یہ تواضع کے خلاف تھا اور اس رویہ کے خلاف تھا جو ایک ایسے صاحب علم میں ہونا چاہئے جو صرف اللہ کی رضا کی خاطر علم دین کو حاصل کرتا ہو اور اس کا مقصد دنیاوی شہرت حاصل کرنا نہ ہو۔ اس لئے روایات کی تعداد بڑھانے پر زیادہ زور دیا گیا بہ نسبت شیوخ کی تعداد بڑھانے کے۔ مثلاً اگر ایک حدیث کے بارے میں بیس روایات ایک شیخ کے پاس ہیں تو بہتر یہ ہے کہ بیس روایات اسی شیخ سے حاصل کی جائیں بہ نسبت اس کے کہ بیس شیوخ سے ایک ایک روایت حاصل کی جائے۔

(۴) چوتھا ادب یہ تھا کہ روایات یا علم حاصل ہو جائے تو اس کا مذاکرہ اس علاقہ کے محقق اہل علم کے ساتھ مسلسل کیا جائے۔ جو احادیث آپ نے سیکھی ہیں اور جو کسی اور راوی نے سیکھی ہیں تو اب دونوں راوی مل کر ان کا مذاکرہ کریں۔ وہ آپ کو پڑھ کر سنائیں آپ انہیں پڑھ کر سنائیں۔ جو مطلب انہوں نے سمجھا وہ آپ سے بیان کریں اور جو آپ نے سمجھا ہے آپ ان سے

بیان کریں۔راویوں کے بارے میں جو معلومات آپ کو ملی ہیں وہ آپ ان سے بیان کریں اور جو اُن کو ملی ہیں وہ آپ سے بیان کریں تا کہ ایک دوسرے کا علم پختہ ہو اور اس میں مزید علم اور نکتے سامنے آئیں اور دونوں کا علم کمال تک پہنچ جائے۔

(۵) پانچواں ادب یہ تھا کہ جب سفر اختیار کیا جائے تو شریعت میں سفر کے جو آداب بیان ہوئے ہیں ان کا لحاظ رکھا جائے۔سفر کے بہت سے آداب ہیں جن کا علم حدیث کے موضوع سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے،لیکن ان آداب کی پابندی جب ہر سفر میں ضروری ہے تو طلب حدیث کے لئے کئے جانے والے سفر میں بطریق اولیٰ ان آداب کی پابندی ہونی چاہئے۔چنانچہ جب سفر اختیار کیا جائے تو اللہ کی رضا مقصود ہونی چاہئے۔دنیاوی شہرت مقصود نہیں ہونی چاہئے۔ صرف رسول اللہ کی احادیث کا تحفظ اور بقا مقصود ہو،کوئی مادی منفعت مقصود نہ ہو۔جس پیسے سے سفر اختیار کیا جائے وہ جائز پیسہ ہو اور اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ ہو۔جو ہمراہی اختیار کئے جائیں وہ متقی اور پرہیز گار لوگ ہوں۔اگر ایک سے زیادہ آدمی سفر کر رہے ہیں تو ایک کو اپنا امیر مقرر کرلیا جائے اور باقی اس کی امارت میں سفر کریں۔ جہاں ٹھہرنا ہو وہ جگہ صاف ستھری ہونی چاہئے۔حلال وحرام کا خیال رکھیں۔یہ وہ آداب ہیں جو ہر سفر پر منطبق ہوتے ہیں۔اس لئے بہتر یہ ہے کہ شریعت میں سفر کے جتنے بھی آداب بیان ہوئے ہیں ان سب کا لحاظ رکھا جائے۔

یہ وہ آداب تھے جن کا تمام راویان حدیث اور محدثین کرام لحاظ رکھتے تھے۔انہوں نے دور دور کے سفر اختیار کئے۔بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ ایک محدث طویل سفر اختیار کر کے ایک جگہ پہنچے اور پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ جن کی خدمت میں حاضر ہونے آئے ہیں وہ تو انتقال فرما گئے ہیں۔

اس طرح کے حوصلہ شکن واقعات کی ایک بڑی مثال ایک صحابیؓ عبدالرحمٰن الصنابحیؒ کی ہے۔وہ صحابیؓ تو نہیں ہیں،تابعی ہیں۔صحابہ کے تذکرہ میں ان کا نام تشرفاً لکھا جاتا ہے۔وہ بہت دور سے،یمن سے،رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔نیا نیا اسلام قبول کیا تھا۔بڑے اشتیاق اور دردمندی کے ساتھ تیز رفتاری سے یمن سے مدینہ کی طرف آ رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری دیں گے۔جب مدینہ منورہ تک ایک رات کی مسافت رہ گئی تو کہیں پڑاؤ کیا۔ صبح سویرے اٹھ کر دربار رسالت میں حاضری کی غرض سے نہانے دھونے کا اہتمام کر رہے تھے۔ اپنے پاس موجود کپڑوں میں سے بہترین لباس پہن لیا۔خوشبو لگائی اور دربار رسالت میں حاضری

کے خیال سے خوش ہو رہے تھے۔ ابھی سفر شروع کر ہی رہے تھے کہ مدینہ کی سمت سے کچھ لوگ آتے دکھائی دیئے۔ انہوں نے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو۔ بتایا کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جا رہا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ انا للہ و انا الیہ راجعون، ہم تو آج ہی رسول اللہ ﷺ کی تدفین سے فارغ ہو کر آ رہے ہیں۔ اب ان پر جو گزری ہوگی اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ اس کی ایک بڑی مثال ہے کہ علم حدیث کے حصول کے لئے کسی بڑے شیخ کی خدمت میں حاضر ہونے والے تھے اور عین وقت پر جا کر پتہ چلا کہ جب لب بام ایک ہاتھ رہ گئی تو کمند ٹوٹ گئی۔

حصول علم حدیث کے لئے محدثین کی قربانیاں

امام اوزاعی جو امام اہل شام کہلاتے ہیں۔ اتنے بڑے امام ہیں کہ ان کا درجہ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کے برابر قرار دیا جاتا ہے۔ علم حدیث میں امام مالک کے برابر کا درجہ رکھتے تھے۔ بیروت میں رہتے تھے، جہاں آج بھی ان کا مزار موجود ہے اور جس علاقہ میں ان کا مزار ہے وہ محلّہ امام اوزاعی کہلاتا ہے۔ یہ کوفہ اور بصرہ کے سفر کے لئے روانہ ہوئے۔ ارادہ یہ تھا کہ حضرت حسن بصری اور محمد بن سیرین سے علم حدیث کی روایت حاصل کریں گے۔ جب وہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ حسن بصری کا تو انتقال ہو گیا ہے اور محمد بن سیرین بیمار ہیں۔ ان کے ہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ بستر پر لیٹے ہوئے ہیں۔ طبیبوں نے آرام کا مشورہ دیا ہے اور لوگوں سے ملنے کی ممانعت کر دی ہے۔ انہوں نے جا کر دیکھا، کھڑے کھڑے سلام کیا، مزاج پرسی کی، چند روز مقیم رہے، ہر روز جا کر دیکھتے رہے، چند دن بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا اور یہ بغیر کچھ حاصل کئے بیروت واپس چل پڑے۔ یہ اس طرح کی بے شمار مثالوں میں سے صرف چند ایک ہیں۔ ایک تابعی کی مثال ہے جو صحابیؓ بنتے بنتے رہ گئے اور ایک بڑے مشہور تابعی کی جو بیک وقت محدث اور فقیہ دونوں تھے۔

ابن ابی حاتم رازی، جو بہت مشہور ہیں اور جن کا میں پہلے بھی کئی بار تذکرہ کر چکا ہوں، ان کی کتاب علل الحدیث پر بڑی مشہور ہے۔ یہ رے کے رہنے والے تھے جو موجودہ تہران کے قرب و جوار میں تھا جو اب یا تو مٹ گیا یا تہران کا حصہ بن گیا۔ وہاں سے یہ سفر کر کے بصرہ پہنچے اور وہاں کے کچھ شیوخ حدیث سے کسب فیض کے لئے وہاں کچھ دن مقیم رہے۔ ایک سال کی نیت سے بصرہ پہنچے تھے۔ آٹھ ماہ میں جمع پونجی ختم ہو گئی۔ اب کسی سے مانگنا انہوں نے اپنی شان

خودداری اور استغنا کے خلاف سمجھا۔ حدیث رسولؐ کا طالب علم دست سوال نہیں پھیلا سکتا تھا۔ انہوں نے بھی دست سوال نہیں پھیلایا اور یہ طے کیا کہ جب تک رہ سکتے ہیں رہیں گے۔ چنانچہ پانی پی پی کر گزارہ کرتے رہے۔ جب چار پانچ دن بعد ہمت جواب دینے لگی تو خیال کیا کہ واپس چلے جائیں لیکن کیسے۔ پھر سوچا کہ واپسی میں اگر راستہ ہی میں مرنا ہے تو یہاں کیوں نہ مریں۔ جس شیخ کے پاس جایا کرتے تھے ان کے پاس جانا جاری رکھا۔ آٹھ دس دن کے بعد جب بالکل ہی ہمت نہیں رہی اور کمزوری سے گر گئے تو ایک دوست نے پوچھا کہ اصل بات کیا ہے؟ انہوں نے سب کچھ بتا دیا۔ دوست نے کہا کہ میرے پاس ایک دینار ہے۔ دینار سونے کا ایک سکہ ہوتا تھا جو ہمارے حساب سے ساڑھے چار یا پانچ ماشہ کا ہوتا تھا۔ پانچ گرام سونے کی قیمت اب بھی غالباً کافی ہوتی ہے۔ اس نے کہا کہ چلو اس کو بیچ دیتے ہیں آدھا دینار آپ لے لیں آدھا میں رکھ لیتا ہوں۔ اس سے اتنے پیسے ہو جائیں گے کہ خراسان واپس چلے جائیں۔ چنانچہ وہ رے واپس چلے گئے۔

ابن مندہ کے بارے میں لکھا ہوا ہے کہ طوف الاقالیم، انہوں نے اقلیموں کے طواف کئے تھے۔ طواف کرنا ایک سفر کو نہیں کہتے۔ جب بار بار کسی علاقہ کا سفر کیا جائے اس کو طواف کہا جاتا ہے۔ طواف کرنا چکر لگانے کو کہتے ہیں۔ سات چکر اسلام کی روایت ہے تو کم از کم کئی سفر کئے ہوں تب کہا جاسکتا ہے کہ فلاں علاقے کا طواف کیا ہے۔ یہ چالیس سال سفر میں رہے۔ نیشاپور، بغداد، مکہ، قاہرہ، بخارا، مرو، بلخ ان سب علاقوں کا انہوں نے سفر کیا۔ یہاں کے محدثین نے جو روایات ان کو دیں وہ سب انہوں نے حاصل کیں۔ چالیس اونٹوں کا وزن لے کر اپنے وطن اصفہان واپس پہنچے۔ کل سترہ سو شیوخ سے انہوں نے روایت کی۔ سترہ سو شیوخ حدیث سے روایات لے کر اس علاقہ میں پہنچے۔

ایک اور محدث ہیں محمد بن طاہر المقدسی، بیت المقدس کے رہنے والے تھے۔ محمد بن طاہر نام تھا۔ ایک مرتبہ بغداد کے سفر پر روانہ ہوئے۔ راستے میں پیسے ختم ہو گئے۔ جس طرح آج کل ٹریول ایجنٹ یا ٹور ایجنٹ یا ٹور آپریٹرز ہوتے ہیں اس زمانے میں بھی ٹور ایجنٹ ہوتے تھے، اور وہ بڑے بڑے شہروں کے درمیان اونٹوں کے قافلے چلایا کرتے تھے۔ راستے میں پڑاؤ، خیمے، حفاظت اور کھانے پینے کا انتظام بھی کرتے تھے۔ ٹور آپریٹرز کو لوگ پیشگی پیسے دے دیتے تھے اور

وہ مسافروں کو اپنے قافلے میں لے جایا کرتے تھے۔علامہ مقدسی نے پیسے دیئے جو راستے میں ختم ہوگئے۔جس منزل تک انہوں نے پیسے دیئے تھے وہ منزل آگئی تو انہوں نے کہا کہ اب ہم آپ کو آگے نہیں لے جاتے اور انہیں راستہ میں چھوڑ دیا۔محمد بن طاہر نے سوچا کہ بغداد تو ہر صورت جانا ہے، پیدل ہی روانہ ہوگئے۔اگر بیت المقدس اور بغداد کے درمیان کا راستہ آپ کے سامنے ہو تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک بہت بڑا صحرا راستے میں آتا ہے جو بڑا مشکل اور دشوار گزار ہے۔ گھوڑے اور اونٹ کی پشت پر بھی بہت کم لوگ اس کو عبور کر پاتے ہیں۔انہوں نے کہا کہ میں نے اپنی پشت پر کتابیں لادیں اور پیدل چل پڑا۔ چلتے چلتے جوتے گھس کر پھٹ گئے تو میں ننگے پاؤں چل پڑا۔گرمی کا زمانہ تھا، اوپر سے جلتی ہوئی دھوپ اور نیچے سے تپتا ہوا صحرا۔ پیسے نہیں تھے تو کھانے پینے کا انتظام بھی ختم ہوگیا۔ پشت پر کتابوں اور کاغذات کا بوجھ، طبیعت اتنی خراب ہوئی کہ خون کا پیشاب آنے لگا۔ان تمام تکالیف کے باجود بغداد پہنچ گئے۔اپنا وقت گزارا، مزدوری کرکے کچھ پیسے کمائے اور مکہ مکرمہ آگئے۔مکہ مکرمہ میں بھی یہی کیفیت ہوئی، وہاں بھی مزدوری کرکے کچھ پیسے کمائے اور پھر اپنے وطن واپس پہنچ گئے۔

امام ابونصر عبداللہ سجستانی ایک اور محدث ہیں۔ان کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ 'طوّف الافاق 'انہوں نے کائنات کے چکر لگائے۔آفاق زمین یعنی زمین کے گوشوں کے چکر لگائے اور اسی چکر میں وہ مختلف جگہوں پر گئے تھے۔ہوتے ہوتے کسی شہر میں جا نکلے۔وہاں جا کر ٹھہرے، شہرت ہوئی کہ علم حدیث کے بڑے ماہر آئے ہیں۔لوگ ان سے علم حدیث حاصل کرتے تھے۔یہ اوروں سے حاصل کرتے تھے۔رات کو مزدوری کرتے تھے اور دن میں کسب علم کرتے تھے۔کوئی خاتون بچاری بہت نیک دل تھی اور بڑے اچھے جذبہ والی تھی۔اس نے دیکھا کہ یہ عالم ہیں، محدث ہیں، جذبہ والے ہیں، رات کو مزدوری کرتے ہیں۔صبح فیض حاصل بھی کرتے ہیں اور پہنچاتے بھی ہیں۔وہ ایک مرتبہ ان کے گھر آئی، ان کے شاگرد موجود تھے۔خاتون نے دروازہ پر دستک دی۔شاگرد نے دروازہ کھول کر دیکھا تو اطلاع دی کہ ایک خاتون آئی ہوئی ہے۔انہوں نے پوچھا بی بی کیا کام ہے؟ اس نے ایک تھیلی دی کہ یہ میں آپ کے لئے لے کر آئی ہوں۔اس میں ایک ہزار دینار ہیں۔کہا کہ میں آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں، اور صرف آپ کی خدمت کرنے کے لئے ایسا کرنا چاہتی ہوں۔میرا اور کوئی مقصد یا کوئی ضرورت نہیں ہے۔آپ کی محرم

بن کر آپ کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔ اس پیسے سے آپ اپنا گزارہ کریں اور علم حدیث کے لئے اپنا وقت لگائیں۔ یہ پیسہ اور میری خدمات آپ کے لئے حاضر ہیں۔ انہوں نے کہا کہ بی بی تمہارا بہت بہت شکریہ، لیکن میں نے یہ طے کیا تھا کہ میں صرف اللہ کے لئے علم حاصل کروں گا۔ صرف اللہ ہی سے اس کا اجر مقصود ہے۔ میں دنیا میں کوئی اجر نہیں چاہتا، لہٰذا مجھے تمہاری خدمت اور پیسوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے، تمہاری اس پیشکش کا بہت شکریہ۔ جو مجھ پر گزرتی ہے یہ گزر جائے گی اور مجھے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اجر ملے گا۔

علامہ ابو حاتم الرازی علم حدیث کے بہت بڑے امام تھے۔ ان کے صاحبزادے بھی علم حدیث اور خاص طور پر جرح و تعدیل کے بہت بڑے امام ہیں جو ابن ابی حاتم الرازی کہلاتے ہیں اور نام ان کا عبدالرحمٰن ہے۔ ان کا یہ واقعہ میں خطیب بغدادی کی اس کتاب 'الرحلۃ فی طلب الحدیث' سے پڑھ کر سناتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں میں نے اپنے والد کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ جب میں پہلی مرتبہ طلب حدیث کے لئے نکلا تو میں سات سال سفر میں رہا۔ میں جتنا پیدل چلتا تھا میں اس کو گنتا رہتا تھا، جب ایک ہزار فرسخ سے زیادہ ہو گیا، (اور جن صاحب نے یہ کتاب ایڈٹ کی ہے وہ بھی بڑے عالم ہیں، انہوں نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ ایک فرسخ موجودہ پانچ کلومیٹر سے تھوڑا زیادہ ہوتا تھا۔) جب میں نے ایک ہزار فرسخ کا سفر پیدل طے کر لیا، یعنی ساڑھے پانچ ہزار کلومیٹر کے لگ بھگ چل لیا تو اس کے بعد میں نے گننا چھوڑ دیا۔ لیکن جو میں چلا وہ یہ تھا کہ کوفہ اور بغداد کے درمیان جو سفر میں نے کیا مجھے یاد نہیں کہ کتنی مرتبہ کیا۔ جب کوفہ میں سنا کہ کوئی محدث آیا ہے تو کوفہ چلا گیا، پھر سنا کہ کوئی محدث بغداد آ گیا ہے تو میں بھی بغداد چلا گیا۔ اور مکہ اور مدینہ کے درمیان بہت مرتبہ اور بحرین (جو مشرقی سعودی عرب کے قریب ہے وہاں) سے جو سلا شہر کے قریب تھا مصر گیا۔ اِس وقت ہوائی جہاز میں تین گھنٹے لگتے ہیں۔ اور مصر سے رملہ، موجودہ فلسطین کی جو اتھارٹی ہے اس کے دارالحکومت رملہ میں، جس کو اخبار والے رام اللہ کہتے ہیں۔ اور رملہ سے بیت المقدس پیدل گیا اور بیت المقدس سے عسقلان اور رملہ سے طبریہ جو وہیں کا ایک شہر ہے اور طبریہ سے دمشق اور دمشق سے حمص اور حمص سے انطاکیہ اور انطاکیہ سے طرسوس، یہ بھی شام کا ایک شہر ہے، پھر طرسوس سے حمص واپس آیا اور ابو الیمان جو ایک مشہور محدث تھے ان کی احادیث میں سے کچھ چیزیں رہ گئیں تھیں وہ میں نے حمص سے حاصل کیں، پھر حمص سے بیسان پیدل آیا، جو

موجودہ عراق اور شام کی سرحد کے قریب ہے۔ بیسان سے رقہ آیا، جو بغداد کے قریب ایک شہر ہے' اور رقہ سے دریائے فرات میں کشتی میں سوار ہوا اور بغداد آیا۔ اور شام کے اس سفر سے پہلے میں واسط سے نیل کا سفر اور دریائے نیل سے کوفہ تک ایک سفر کر چکا تھا۔ یہ سارے سفر پیدل تھے۔ یہ میرے پہلے سفر کی تفصیل ہے اس وقت میری عمر بیس سال تھی اور سات سال میں نے اس پورے سفر میں گزارے۔ رے سے جو میرا وطن تھا، 213ھ میں نکلا، رمضان کے مہینے میں گھر سے چلا تھا اور 221ھ میں واپس آیا۔ یہ مختصر سی تفصیل ہے اس سفر کی جو ابوحاتم رازی نے کیا۔

ایک اور روایت میں وہ بیان کرتے ہیں کہ جب ہم مدینہ منورہ سے نکلے، داؤد جعفری وہاں کے کوئی بزرگ تھے ان کے ہاں سے ہم بندرگاہ پر گئے اور کشتی میں سوار ہو گئے، ہم تین آدمی تھے، مرو کے نام پر دو شہر ہیں۔ ایک مرو کہلاتا ہے، صرف مرو، اور ایک مروالروذ یعنی مرو کا وہ علاقہ جو دریا کے کنارے ہے۔ میرے ساتھ ابوزہیر مروالروذی تھے اور ایک اور نیشاپوری بزرگ تھے۔ ہم تینوں سوار ہوئے لیکن سفر ہوا کے مخالف سمت میں تھا اس لئے ہماری کشتیاں تین ماہ تک سمندر میں لنگر انداز رہیں۔ ہم بہت پریشان ہو گئے اور ہمارے پاس جو زادراہ تھا وہ ختم ہو گیا اور ہم صرف تن تنہا رہ گئے۔ ہم خشکی میں اتر گئے، اور پیدل ہی خشکی میں چلتے رہے، یہاں تک کہ جو تھوڑا بہت پانی اور زادہ راہ تھا وہ سب ختم ہو گیا، ہم ایک رات چلتے رہے اور ہم میں سے کسی نے ایک دن رات نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ دوسرا دن بھی اسی طرح رہا۔ تیسرا دن بھی اسی طرح تمام دن ہر روز رات تک چلتے اور جب شام آتی نمازیں پڑھتے، اور اپنے آپ کو اسی طرح زمین پر ڈالتے، جہاں بھی ہوتے، بھوک، پیاس اور تھکن سے ہمارے جسم کمزور ہو چکے تھے، جب تیسرے دن صبح ہوئی تو بقدر طاقت ہم نے چلنا چاہا مروالروذ کے جو بوڑھے ساتھی ہمارے ساتھ تھے وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے، ہم نے ان کو حرکت دی لیکن ان میں کوئی سمجھ بوجھ اور عقل نہیں رہی تھی، ہم نے ان کو وہیں چھوڑ دیا۔ میں اور میرے نیشاپوری ساتھی چل پڑے، ایک فرسنگ یا دو فرسنگ یعنی ساڑھے پانچ یا گیارہ کلومیٹر چلنے کے بعد میں بھی بے ہوش ہو کر گر گیا، میرا ساتھی چل پڑا اور مجھے چھوڑ دیا، وہ چلتے رہے' انہوں نے دور سے ایک گروہ کو دیکھا جنہوں نے اپنی کشتی خشکی سے قریب کر رکھی تھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جو کنواں کوہ سینا میں ہے اس کے قریب اترے جب انہوں نے کشتی والوں کو دیکھا تو اپنا کپڑا ان کی طرف کر کے لہرایا۔ وہ لوگ پانی لے کر آئے انہوں نے

اس کو پلایا اور ہاتھ پکڑ کر کھڑا کیا، انہوں نے کہا میرے دو ساتھی ہیں ان کو بھی لاؤ، وہ وہاں بے ہوش پڑے ہوئے ہیں، مجھے اس وقت پتہ چلا جب ایک شخص میرے چہرے پر پانی چھڑک رہا تھا تو میں نے آنکھیں کھولیں اور کہا کہ پانی پلاؤ، اس نے کسی مشک یا کسی گلاس وغیرہ سے مجھے پانی پلایا میں نے پانی پیا تو مجھ ہوش آیا اور جتنا میں پیاسا تھا اتنا نہیں پلایا۔ اس پر میں نے کہا کہ اور پلاؤ، اس نے تھوڑا سا اور پلایا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ میں نے کہا میرے پیچھے ایک اور بڑے میاں بھی پڑے ہیں ان کے پاس جاؤ۔ ایک گروہ ان کے پاس گیا اس نے میرا ہاتھ بھی پکڑا، میں پاؤں کھینچتا اور گھسیٹتا ہوا ان کے ساتھ چلا۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں وہ لوگ مجھے پانی پلاتے رہے۔ جب میں ان کی کشتی تک پہنچا تو وہ ہمارے تیسرے ساتھی کو بھی لے آئے۔ کشتی والوں نے ہمارے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا۔ ہم چند دن ان کے پاس رہے۔ یہاں تک کہ ہمارے اندر ہمت آگئی اور جان میں جان آگئی۔ پھر انہوں نے ہمیں ایک شہر کے لوگوں کے نام جس کا نام رایہ تھا، ایک تحریر لکھ کر دے دی۔ اس شہر کے گورنر کے نام، اور ہمیں کیک، ستو اور پانی بھی دے دیا۔ ہم مسلسل چلتے رہے۔ ہمارے پاس جو پانی، کیک اور ستو تھے وہ ختم ہو گئے۔ ہم سمندر کے کنارے بھوکے پیاسے چلتے رہے حتی کہ ہمیں ایک بڑا کچھوا ملا جس کو سمندر نے ساحل پر پھینک دیا تھا۔ اتنا بڑا تھا جتنی بڑی ایک ڈھال ہوتی ہے۔ ہم نے ایک بڑا پتھر لیا اس کی پشت پر مارا تو وہ ٹوٹ گئی، اس میں ایسے بہت سے انڈے تھے جیسے انڈے کی زردی ہوتی ہے۔ ہم نے ایک سیپی اٹھائی جو دریا کے کنارے پڑی ہوئی تھی۔ اس سے ہم اس زردی کو اس طرح کھانے لگے جیسے کوئی چیز چمچی سے کھائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ہماری بھوک کچھ قابو میں آئی اور پیاس بجھی، پھر ہم چل پڑے، اور یہ برداشت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ہم رایہ شہر میں داخل ہو گئے اور وہاں کے عامل یا گورنر کو وہ خط پہنچایا اس نے ہمیں اپنے گھر میں ٹھہرایا اور ہمارے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ روزانہ ہمیں کدو کھلاتا تھا، اور اپنے ملازم سے کہا کرتا تھا کہ ان کے لئے چھوٹے اور نرم کدو لاؤ اور روزانہ ہمیں وہ کدو روٹی کے ساتھ کھلاتا تھا۔ ہم تینوں میں سے ایک نے فارسی میں کہا؛ کیا یہ بھنا ہوا گوشت نہیں کھلاتے اور اس طرح کہا کہ گھر والا بھی سن لے۔ وہ بولا: میں بھی فارسی جانتا ہوں۔ میری دادی ہرات کی رہنے والی تھی۔ اس کے بعد وہ ہمیں گوشت بھی کھلانے لگا۔ پھر وہاں سے ہم نکلے، اور اس نے ہمیں مزید زادراہ دیا یہاں تک کہ ہم مصر آ گئے۔

ایک اور طویل واقعہ امام حاکم کا ہے جو خطیب نے اسی کتاب میں بیان کیا ہے، لیکن وقت کم ہے اس لئے اس کو چھوڑ دیتا ہوں۔ اس میں بھی اسی طرح کی قربانیوں کا ذکر ہے۔ ان واقعات سے اندازہ ہو جائے گا کہ محدثین نے کن مصائب اور مشکلات کے ساتھ یہ ذخیرہ ہم تک پہنچایا ہے۔ اب آج اگر کوئی اٹھ کر یہ کہے کہ یہ سب سنی سنائی باتیں ہیں اور غیر حقیقی اور غیر علمی ہیں تو انسان کو حیرت ہوتی ہے کہ اس بارے میں اب کیا کہے۔ یا تو ایسی بے بنیاد بات کہنا سراسر بد نیتی ہے، بد دیانتی ہے یا جہالت ہے، اس کے علاوہ اور کیا سبب ہو سکتا ہے۔

یہ رحلہ کے بارے میں چند مثالیں تھیں جو میں نے آپ کے سامنے رکھیں۔

وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العلمین

☆☆☆☆☆☆☆

کہتے ہیں شب برات کی فضیلت میں چالیس ضعیف احادیث ہیں؟

بھئی شب برات کو چھوڑ دیجئے، جو آپ کا جی چاہے وہ کر لیجئے۔ ایک اصولی بات میں عرض کر دیتا ہوں اس کو آئندہ بھی یاد رکھیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ کچھ احادیث ہیں جو قطعی الثبوت ہیں۔ کچھ احادیث ظنی الثبوت ہیں۔ ظنی الثبوت وہ ہیں جن کے حدیث صحیح ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ وہ اکثر خبر واحد یا اخبار آحاد ہیں۔ ان میں شروع سے علما اور محدثین کے درمیان اختلاف رہا ہے۔ ایک محدث ایک حدیث کو ثابت شدہ مانتے ہیں، ان کی نظر میں وہ صحیح ہے۔ دوسرے محدث اپنی تحقیق میں اس کو ضعیف مانتے ہیں۔ ان کی نظر میں وہ ضعیف ہے۔ جو ضعیف مانتے ہیں وہ اس پر عمل نہیں کرتے، کیونکہ ان کی تحقیق کے مطابق وہ ضعیف ہے۔ جو اپنی تحقیق میں اس کو صحیح سمجھتے ہیں وہ اس پر عمل کرتے ہیں۔ اس لئے اگر کوئی کسی ضعیف حدیث پر عمل کر رہا ہے تو یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ اور جو کوئی اس پر عمل نہیں کر رہا ہے تو یہ بھی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔

اعتراض یا نکیر صرف وہاں کرنا چاہئے جہاں شریعت کے کسی واضح، قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت حکم کی خلاف ورزی ہو رہی ہو۔ اس لئے اگر کوئی شب براۃ کی احادیث پر عمل کرتا ہے تو آپ کا کیا لیتا ہے، کرنے دیجئے۔ اگر آپ کی تحقیق میں وہ احادیث کمزور ہیں یا ان لوگوں کی تحقیق میں کمزور ہیں جن کے علم پر آپ کو اعتماد ہے تو آپ ان پر عمل نہ کیجئے۔ لیکن اگر کچھ اور لوگ ایسے ہیں جن کی تحقیق پر آپ کو اعتماد نہیں ہے لیکن وہ ان احادیث کو ثابت شدہ سمجھ کر ان پر عمل کر رہے ہیں تو آپ ان پر اعتراض مت کیجئے۔ یہ ایک جزوی سی چیز ہے اس پر زیادہ بحث اور اختلاف کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے کہا کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے وہ بتایا کہ اگر میں اس وقت باہر نکل کر لوگوں کے سامنے سچ کہہ دوں تو میرا قتل مسلمانوں پر واجب ہو جاتا اور وہ مجھے قتل کر دیتے۔

یہ نہیں کہا کہ میرا قتل مسلمانوں پر واجب ہو جاتا۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ بہت سی چیزیں میرے علم میں ایسی ہیں کہ اگر میں ان کو کھلم کھلا بیان کروں تو شاید لوگ مجھے قتل کر دیں۔ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جب علم حدیث یا علم دین بیان کیا جائے تو تدریج اور ترتیب کے ساتھ بیان

کیا جائے۔ اس طرح بیان نہ کیا جائے کہ سننے والے لوگ پہلے ہی مرحلے میں اس کا انکار کردیں۔ آپ پہلے اسلام کے عقائد پھر اخلاق پھر تربیت اور تعلیم اور پھر احکام بتائیں۔ یہ وہی چیز ہے جو حضرت عائشہؓ نے فرمائی کہ رسول اللہ ﷺ اگر پہلے ہی دن یہ کہتے کہ شراب نوشی چھوڑ دو تو شاید عرب میں بہت کم لوگ آپؐ کی بات مانتے۔ آپ نے تدریج کے ساتھ پہلے ان کو مکارم اخلاق سکھائے، پھر نماز سکھائی پھر ایک ایک کر کے باقی چیزیں سکھائیں۔ آخر میں کہا کہ شراب نوشی اور فلاں فلاں قسم کے گناہ چھوڑ دو تو لوگوں نے چھوڑ دیئے کیونکہ تربیت ہو چکی تھی۔ یہی بات حضرت ابوہریرہؓ نے کہی کہ میں ایسا علم بھی رکھتا ہوں کہ اگر میں بیان کروں تو شاید لوگ مجھے قتل کردیں اس لئے کہ ابھی ان کی وہ تربیت نہیں ہوئی اور شائد وہ ان کو سننے کے لئے تیار نہ ہوں۔ اس کے علاوہ اس کا کوئی اور مطلب نہیں ہے اور منکرین حدیث اس سے جو مطلب نکالنا چاہتے ہیں وہ درست نہیں ہے۔

کل آپ نے ڈاکٹر حمید اللہ کی کتاب خطبات بہاولپور کا ذکر کیا، اس کا کچھ حصہ میں پڑھ چکی ہوں۔ اس میں انہوں نے بارہ لیکچرز کو بارہ چشموں سے تشبیہ دی ہے جن کا ذکر قرآن پاک میں ہے۔ میں بھی ان خطبات کو براہ راست ڈاکٹر حمید اللہ سے سننے کی خواہش رکھتی تھی۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ بہت دل چاہ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ان بارہ خطبوں سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ مجھے بھی ایسا ہی اخلاص عطا فرمادے جو ڈاکٹر حمید اللہ کو عطا فرمایا تھا۔ ان خطبات کا علمی درجہ وہ نہیں ہے جو ڈاکٹر حمید اللہ صاحبؒ کے خطبات کا تھا۔ ان خطبات کے دینے والے کا نہ وہ علمی مقام ہے نہ روحانی نہ اخلاقی جو ڈاکٹر صاحب کا تھا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ان خطبات اور ڈاکٹر صاحب کے خطبات بہاولپور میں ایک اور ایک ہزار کی نسبت بھی نہیں ہے۔ لیکن ایک ادنیٰ مشابہت ضرور ہے کہ وہ بھی بارہ تھے یہ بھی بارہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو قبول فرمائے۔ آمین

کیا آپ انگریزی میں کسی ایسی اچھی کتاب کا نام بتا سکتے ہیں جو علم حدیث کے اہم موضوعات سے متعلق ہو اور اس بارے میں ہماری رہنمائی کر سکے۔

افسوس کہ اس وقت انگریزی میں کوئی ایسی کتاب میرے ذہن میں نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ نے ان خطبات کے کچھ نوٹس انگریزی میں بنائے ہوں تو ان کو ایک ترتیب دے کر ایک نقل

مجھے بھی دیجئے گا۔ میں بڑی خوشی سے ان کی ایڈیٹنگ کروں گا اور ان میں ضرور کچھ اضافہ بھی کروں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کے بارے میں یہ اعتراض ہے کہ حضرت عمرؓ کے دور میں کسی وجہ سے ان کو جیل میں بند کر دیا گیا تھا۔

یہ بات میرے علم میں نہیں ہے، میں نہیں جانتا کہ حضرت عمرؓ کے دور میں حضرت ابو ہریرہؓ کو جیل میں بند کر دیا گیا تھا یا گورنری سے معطل کر دیا گیا تھا۔ میرے علم میں نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں تو لوگ گورنری سے معطل ہوتے رہتے تھے۔ ایک صاحب آج مقرر ہوئے ہیں کل دوسرے ہوں گے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ بصرہ کے گورنر تھے، بعد میں وہاں سے ہٹا دیئے گئے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ مصر کے گورنر تھے، ان کو بھی بعد میں ہٹا دیا گیا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ کمانڈر انچیف تھے ان کو بھی ہٹایا گیا۔ یہ تو انتظامی معاملات ہوتے ہیں ان کا کوئی تعلق حدیث کی روایت سے نہیں ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ حضرت ابو ہریرہؓ گورنر تھے کہ نہیں تھے۔

شش کلمات یا چھ کلموں کی سند کیا ہے جو ہمارے معاشرہ میں گویا ایک جزو ایمان بن گئے ہیں؟

مجھے ان چھ کلموں کی سند کے بارے میں تو کوئی علم نہیں، تاہم مختلف احادیث میں مختلف طریقوں سے ان کلمات کا تذکرہ ملتا ہے۔ قرآن وحدیث میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جس کے مطابق یہ کلمے پڑھنا یا ان کو یاد کرنا ایمان یا عقیدہ کا کوئی جز ہو۔ میرے خیال میں یہ بعض علما نے عام لوگوں کی سہولت کے لئے ترتیب دیئے ہیں، تاکہ ایمان سے متعلق بنیادی چیزوں کا حفظ کرنا آسان ہو جائے۔ اس کے علاوہ ان کی کوئی سند نہیں ہے۔ یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ اگر کسی نے یہ چھ کلمے یاد کر لئے تو وہ اچھا مسلمان ہوگا اور جس نے یاد نہیں کئے اس کے ایمان پر کوئی حرف آئے گا۔ یہ صرف سہولت کے لئے ہیں، فرض عین قسم کی کوئی چیز نہیں ہے۔

حصول علم حدیث کے لئے سفر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُس دور میں مسلمانوں کے عروج اور ترقی کی وجہ کیا تھی۔ ان کے اندر علم طلب اور تڑپ تھی۔ بدقسمتی سے آج یہ طلب اور تڑپ برائے نام رہ گئی ہے۔ اس لئے عروج بھی ختم ہو گیا۔

ہاں واقعی ختم ہو گیا۔ مسلمانوں میں علمی ذوق ختم ہو گیا ہے اس لئے مسلمانوں کا عروج زوال میں بدل گیا۔ مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ کے لئے ان کی علمی زندگی کا احیا ضروری ہے۔ سب

سے پہلے علوم دین میں اس کے بعد باقی علوم میں جب تک علمی اور فکری نشأت الثانیہ نہیں ہوگی، اس وقت تک مسلمانوں کا عروج دوبارہ نہیں آسکتا۔

ہمارے علاقے میں بڑے زمیندار اپنی اجاڑ اور بے کار زمین کو چھوٹے کسانوں کو دو یا پانچ سال کے لئے ٹھیکے پر دیتے ہیں اور اس پر سالانہ ایک مخصوص رقم وصول کرتے ہیں، مثلاً سو کنال پر سالانہ پچاس ہزار عام ریٹ ہے۔ مدت اور رقم کا تعین زمین کی حالت پر مختلف ہو سکتا ہے جبکہ زمین پر محنت اور بیج کسان کا ہوتا ہے۔ اس مدت کے دوران اگر زمیندار یہ سمجھتا ہے کہ اس کی زمین اس کی توقع سے زیادہ نفع مند ہے تو مقررہ مدت ختم ہونے پر وہ اپنی زمین کسان سے واپس لے سکتا ہے یا اسی کسان کو زیادہ رقم پر دے دیتا ہے۔ مقررہ مدت کے دوران وہ کسان سے اپنی زمین واپس نہیں لیتا۔ یہ سارا معاملہ دونوں فریقوں کی باہمی رضامندی سے ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ سود ہی کی کوئی قسم ہے یا شرعی طور جائز ہے؟

یہ جائز ہے اور سود کی کوئی قسم نہیں ہے۔

آج کل بینکوں سے لیز پر جو گاڑیاں لی جاتی ہیں کیا درست ہیں؟

لیز میں بہت سی چیزیں ہیں جو دیکھنے کی ہیں۔ ایک بنیادی چیز یہ ہے کہ لیز کے بارے میں کوئی عمومی بات اس وقت تک نہیں کہی جا سکتی جب تک کسی متعین لیز کی دستاویزات نہ دیکھی جائیں۔ گاڑیوں کی لیز کا جو کام میزان بینک والے کرتے ہیں وہ جائز ہے۔ میں نے اس کی دستاویزات دیکھی ہیں اس کے مطابق لیز شرعاً درست ہے۔ بقیہ بینک بھی لیزنگ کا کاروبار کرتے ہیں، لیکن میں ان کی دستاویزات دیکھے بغیر کچھ کہہ نہیں سکتا۔ باقی چیزیں چھوٹی ہیں۔ البتہ ایک بڑی بنیادی چیز ہے کہ جو لیزڈ پراپرٹی ہے اس کا رسک اور اس کا encumberance لیسور کے پاس ہونا چاہئے۔

If the lessor undertakes to pay the encumberance and the risk of the leased property, then the lease is parmissible.

ایسی لیز جائز ہے اور اگر سارا رسک لیسی پر ہے تو وہ جائز نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اور تفصیلات بھی ہیں جو دستاویزات دیکھ کر معلوم کی جا سکتی ہیں۔

کیا کوئی ایسی کتاب ہے جو منکرین حدیث کو دی جائے یا اس میں ان کے سوالات کے

جوابات ہوں جو آپ نے ذکر کئے ہیں تا کہ بحث کی جائے اور ان کو کتاب دی جائے۔

منکرین حدیث میں دوطرح کے لوگ ہیں۔ کچھ وہ ہیں جن کو واقعی کوئی غلط فہمی ہے۔ ان کوتو کئی کتابیں دی جاسکتی ہیں۔مثال کے طور پر شام کے ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کی ایک عربی کتاب ہے 'السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی'۔اس کے دواردو تراجم ہیں۔ایک پروفیسر غلام احمد حریری کا کیا ہوا اور دوسر ڈاکٹر احمد حسن کا کیا ہوا ہے۔ یہ دونوں کتابیں آپ ان کو دے سکتی ہیں۔ایک ہمارے دوست اور میرے بزرگ اور فاضل رجل مولانا محمد تقی عثمانی کی انگریزی کتاب ہے **The Authority of Sunnah**، وہ آپ منکرین حدیث سے متاثرہ افراد کو دے سکتی ہیں۔اسی طرح سے ایک چھوٹی سی کتاب ہے مولانا بدر عالم مہاجر مدنی کی، ان کی کتاب کا نام ہے 'حجیت حدیث' وہ بھی اس سلسلہ میں مفید ہے۔لیکن بہترین کتاب **Studies in the Early Hadith Literture** ہے جو ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی کی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

نواں خطبہ

علوم حدیث

بدھ، 15 اکتوبر 2003

علوم حدیث

علم حدیث کا آغاز اور ارتقا

آج کی گفتگو کا عنوان ہے علوم حدیث۔ آج تک جتنی بحث ہوئی ہے اس سب کا تعلق ایک اعتبار سے علوم حدیث ہی سے ہے۔ یہ سب موضوعات علوم حدیث ہی کے موضوعات تھے ۔لیکن علوم حدیث پر الگ سے گفتگو کرنے کی ضرورت اس بات پر زور دینے کے لئے پیش آئی کہ جن موضوعات کو علوم حدیث کہتے ہیں وہ ایک بہت بڑی، ایک منفرد اور نئی علمی روایت کے مختلف حصے ہیں۔ یہ روایت مسلمانوں کے علاوہ کسی اور قوم میں نہیں پائی جاتی۔ علوم وفنون کے اس مجموعہ کو لاتعداد اہل علم نے اپنی زندگیاں قربان کر کے مرتب کیا۔ اور ان تمام موضوعات سے متعلق مواد جمع کیا جس کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے احوال، اقوال اور شخصیت مبارکہ سے تھا۔ انہوں نے اس مواد کی تحقیق کی اور اس کو مرتب انداز اور نت نئے اسالیب میں پیش کیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ موضوعات پھیلتے گئے۔ ان میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان میں سے ہر جزوی موضوع پر الگ الگ کتابیں لکھی گئیں۔ پھر ان کتابوں کی شرحیں لکھی گئیں، شرحوں کے حواشی لکھے گئے، پھر ان کتابوں کی تلخیصیں تیار ہوئیں۔ مختلف اہل علم نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق ان کتابوں کے ایڈیشنز تیار کئے۔ اس طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ سب علوم نئے نئے عنوانات کے تحت مرتب ہوتے گئے۔ ان سب موضوعات کے مجموعہ کو علوم حدیث کہا جاتا ہے۔ گویا علوم حدیث سے مراد علم وفن کی وہ پوری روایت ہے جس کا محدثین کرام نے

اہتمام کیا اور اہل علم کی ایک بہت بڑی تعداد، بلکہ اہل علم کی درجنوں نسلوں نے اس مواد کو فراہم کر کے مرتب و منظم کیا، کئی سو سال کے تسلسل کے ساتھ اس کی تہذیب و تنقیح کی۔

علم حدیث کے موضوعات

ان میں سے بعض موضوعات جو نسبتاً زیادہ اہم تھے ان پر گزارشات پیش کی گئیں۔ کچھ اور موضوعات اس اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں کہ ان پر الگ سے ایک دو نہیں بلکہ درجنوں کتابیں لکھی گئیں۔ بعض محدثین نے ان میں اختصاص پیدا کیا اور یوں یہ موضوعات اس اختصاص کا موضوع قرار پائے۔ علم حدیث میں مختلف پہلوؤں سے اس اختصاص سے کام لیا گیا۔ بعض ایسے موضوعات کا ابتدائی، مختصر اور سرسری تعارف آج مقصود ہے۔

معرفت صحابہ

ان میں سب سے اولین موضوع جس کا اختصار کے ساتھ پہلے بھی تذکرہ کیا جا چکا ہے، وہ معرفت الصحابہ ہے۔ سب سے پہلے صحابہ کرامؓ کی نشاندہی، پھر ان کی سیرت و سوانح کی تدوین ایک ایسا بڑا موضوع ہے جس سے واقفیت کسی بھی حدیث کا درجہ متعین کرنے کے لئے ضروری ہے۔ کسی حدیث کا کیا مقام و مرتبہ ہے، اس کا تعین کرنے میں علم معرفت صحابہ کا بنیادی کردار ہے۔ اگر کوئی روایت کسی صحابیؓ سے مروی ہے اور صحابیؓ تک سند مکمل اتصال اور تسلسل کے ساتھ پہنچ جاتی ہے تو پھر اس حدیث کا درجہ یقیناً اونچا ہوگا۔ لیکن اگر اس حدیث کی سند اُس صحابیؓ تک نہیں پہنچتی تو پھر ظاہر ہے کہ اس کا درجہ وہ نہیں ہوگا جو صحابیؓ کی روایت کا ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے جس سے حدیث کا ہر طالب علم فوری طور پر اتفاق کرے گا۔ مشکل وہاں پیش آتی ہے جہاں کسی شخصیت کے صحابیؓ ہونے یا نہ ہونے میں اختلاف ہو، یا اس کے صحابیؓ ہونے یا تابعی ہونے کے بارے میں دو مختلف رائے پائی جاتی ہوں۔ دوسری مشکل وہاں پیش آئے گی جب کسی صحابیؓ کے سن وفات میں اختلاف ہوگا۔

اس تعین کی ضرورت اس لئے پیش آتی ہے کہ اگر کوئی تابعی یہ بیان کریں کہ انہوں نے فلاں صحابیؓ سے یہ حدیث سنی اور صحابیؓ کا انتقال ایک خاص سن میں ہو جانا متعین ہو چکا ہو تو پھر یہ تعین کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ ان تابعی کی ملاقات ان صحابیؓ سے ہوئی تھی کہ نہیں۔ مثال کے طور پر

ایک صاحب نے سن 195ھ میں ایک حدیث بیان کی اور دعویٰ کیا کہ انہوں نے ایک صحابیؓ سے اس حدیث کو سنا ہے۔ وہاں ایک بڑے محدث بھی موجود تھے۔انہوں نے پوچھا کہ حضرت آپ کی عمر کیا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ میری عمر 115 یا 120 سال ہے۔ان محدث نے فوراً بتادیا کہ آپ کے دعویٰ کے مطابق اگر آپ کی عمر 120 سال بھی مان لی جائے تو بھی آپ کی پیدائش سے پانچ سال پہلے ان صحابیؓ کا انتقال ہو چکا تھا جن سے آپ روایت بیان کر رہے ہیں۔

یہ جو فوری ردعمل اور فوری طور پر اس بات کا تیقن حاصل کرنا ہے کہ کسی تابعی کو کسی صحابیؓ سے تلمذ حاصل ہے کہ نہیں، یا کسی تابعی نے کسی صحابیؓ سے کسب فیض کیا ہے کہ نہیں، اس کا دارومدار بڑی حد تک اس بات پر ہے کہ صحابہ کرامؓ کے بارے میں معلومات مکمل، یقینی اور واضح طور پر ہمارے پاس موجود ہوں۔

صحابی کی تعریف

ائمہ حدیث کے نزدیک صحابیؓ کی بالاتفاق تعریف یہ ہے کہ صحابیؓ وہ خوش نصیب شخصیت ہیں جنہوں نے حالت ایمان میں حضورؐ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت کی ہو اور آپ کو دیکھا ہو۔ چاہے یہ سعادت کتنے ہی محدود اور مختصر لمحہ کے لئے حاصل ہوئی ہو، لیکن اگر یہ سعادت حالت ایمان میں حاصل ہوگئی اور وہ صاحب حالت ایمان میں زندہ رہے اور اسی حالت ایمان میں وفات پاگئے تو وہ صحابیؓ شمار ہوں گے۔ اس میں چھوٹا سا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے بدنصیب بھی تھے جو رسول ﷺ کے زمانہ مبارک میں اسلام لائے اور آپؐ کی زیارت سے مشرف ہوئے، لیکن آپؐ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد کسی قبائلی عصبیت یا کسی غلط فہمی یا کسی دوسری گمراہی کی وجہ سے اسلام سے پھر گئے، کسی مدعیٔ نبوت کے ساتھ ہو گئے اور خدانخواستہ اسی حالت میں مر گئے۔ ایسے لوگوں کے صحابی ہونے کا تو کوئی سوال نہیں۔ کیونکہ مسلمان کی حیثیت سے اور اسلام کی حالت میں وفات نہیں ہوئی۔ لیکن ان لوگوں میں بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو بعد میں اللہ کی توفیق سے دوبارہ مسلمان ہو گئے، وہ بھی صحابیؓ نہیں کہلائیں گے۔ اگرچہ انہوں نے حالت ایمان میں حضورؐ کی زیارت کی اور حالت ایمان ہی میں وفات پائی، لیکن چونکہ حالت ایمان تسلسل سے قائم نہیں رہی اس لئے وہ صحابیت کے شرف سے خارج ہو گئے۔

کچھ اہل علم کا خیال ہے کہ ایسے لوگوں کو تبرکاً صحابیؓ کہا جائے گا۔ کچھ کا خیال ہے کہ نہیں کہا جائے گا۔ محدثین کا عام رجحان یہ ہے کہ ایسا کوئی شخص صحابیؓ نہیں کہلا سکے گا جو حالت ایمان پر قائم نہ رہا ہو اور درمیان میں کسی گمراہی، کفر یا شرک کا وقفہ آ گیا ہو۔

شرف صحابیت کے حصول میں نہ تو بالغ ہونا شرط ہے، اور نہ روایت کرنا شرط ہے۔ کسی نے رسول اللہ ﷺ سے کوئی روایت نہ کی ہو، صرف آپ کو دیکھا ہو تو ان کو بھی شرف صحابیت حاصل ہے اور اگر وہ اتنے بچے ہوں کہ ان کو معاملات، احادیث، احکام اور شریعت کی بہت زیادہ سمجھ بوجھ نہ بھی ہو، لیکن ان کو یہ یاد ہو کہ انہوں نے بچپن میں حضورؐ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت کی تھی، تو وہ بھی شرف صحابیت سے مشرف مانے جائیں گے۔ ایسے بہت سے حضرات ہیں جو حضور ﷺ کی رحلت کے وقت بہت کم عمر تھے۔ حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت محمود بن لبیدؓ، حضرت ابو طفیل عامر بن واثلہؓ اور ان کے علاوہ بھی ایسے کئی حضرات ہیں جو بہت بچے تھے اور پانچ، چھ یا سات سال کی عمر میں انہوں نے حضورؐ کو دیکھا اور بعد میں وہی یادداشتیں جو ان کے ذہن میں مبہم سی تھیں، ان کو بیان کرنے لگے۔ یہ شرف صحابیت کے لئے کافی ہے۔

صحابیؓ کی تعریف اور تعین کے بارے میں محدثین اور علمائے اصول میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ علمائے اصول یعنی اصول فقہ کے علما صحابیؓ کی تعریف کچھ اور کرتے ہیں۔ میں اس کو چھوڑ دیتا ہوں البتہ محدثین کے نزدیک صحابی کی تعریف وہ ہے جو میں نے ابھی بیان کر دی۔

صحابہ کرامؓ کی اس تعریف میں یکسانیت کے باوجود صحابہ کے درجات میں فرق ہے۔ بعض صحابہ کو بعض صحابہ پر فضیلت حاصل ہے جس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ صحابہ پر بات کرتے وقت دو چیزیں الگ الگ شمار ہوں گی۔ ایک صحابہ کے طبقات ہوں گے اور دوسری صحابہ کی فضیلت کے معیارات ہوں گے۔ طبقات صحابہ سے مراد ہے صحابہ کرامؓ کی زمانی اعتبار سے تقسیم کہ کن صحابیؓ کی کتنی عمر ہوئی اور محدثین نے زمانوں کے لحاظ سے ان کو کتنے طبقات میں تقسیم کیا۔ یہ ایک الگ چیز ہے جو ابھی آئے گی۔

فضیلت کے لحاظ صحابہ کے درجات

جہاں تک صحابہ کے فضائل کا تعلق ہے تو اس اعتبار سے صحابہ کرامؓ کے مختلف درجات

ہیں۔سب سے پہلا درجہ جس کی قرآن مجید سے تائید ہوتی ہے اور قرآن مجید میں کئی مرتبہ اس کا ذکر بھی آیا ہے وہ السابقون الاولون ہے۔اس سے مراد وہ صحابہ ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی تبلیغ دین کے ابتدائی تین سالوں کے دوران اسلام میں داخل ہوئے۔ابتدائی تین یا چار سال میں جب رسول اللہ ﷺ نے صرف مکہ مکرمہ تک دعوت کو محدود رکھا اور مکہ مکرمہ میں بھی اپنے قریبی رشتہ دار قبائل تک اپنی دعوت کو پہنچایا، اور وہ لوگ اسلام میں داخل ہوئے جو حضور ﷺ سے بالواسطہ یا بلا واسطہ قبائلی رشتہ کی وجہ سے یا خونی رشتہ داری کی وجہ سے وابستہ تھے۔یہ حضرات السابقون الاولون کہلاتے ہیں۔ان میں خلفاء اربعہ، سیدنا زید بن حارثہؓ، حضرت خدیجہ الکبریٰؓ اور وہ تمام صحابہ جو ابتدائے اسلام کے چند سالوں میں اسلام میں داخل ہوئے، شامل ہیں۔یہ تقسیم امام حاکم نے کی ہے جن کی کتاب معرفت علوم الحدیث بڑی مشہور ہے۔بقیہ محدثین بھی قریب قریب اس سے اتفاق کرتے ہیں۔جب رسول اللہ ﷺ نے اسلام کی دعوت شروع کی اس وقت سے لے کر جب تک آپ نے کھلم کھلا دارالندوۃ میں، جو قریش کا ایک طرح سے اسمبلی ہال تھا، وہاں جا کر علی الاعلان دعوت نہیں دی، اس وقت تک جو لوگ اسلام میں داخل ہوئے وہ السابقون الاولون کہلاتے ہیں۔

جب سیدنا عمر فاروقؓ نے اسلام قبول کرلیا اور ان کے قبول اسلام کے ذریعے اللہ نے اسلام اور مسلمانوں کو قوت عطا فرمائی تو حضرت عمر فاروقؓ کی تجویز پر رسول اللہ ﷺ صحابہ کرامؓ کو لے کر نکلے اور دارالندوہ میں عین قریش کے مرکز میں جا کر علی الاعلان اسلام کا کلمہ بلند کیا۔اس مرحلہ پر بہت سے لوگ جو مسلمان ہوئے وہ اور جو بعد میں مسلمان ہوئے، وہ صحابیت کے دوسرے درجہ پر فائز کہلاتے ہیں اور ان کے لئے امام حاکم نے 'اصحاب دارالندوہ' کی اصطلاح رکھی ہے۔یعنی وہ صحابہ کرامؓ جو دارالندوہ میں دعوت کے نتیجہ میں یا اس کے بعد مسلمان ہوئے۔

صحابہ کرامؓ میں تیسرا درجہ ان حضرات کا ہے جنہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی یا اس ہجرت کے دوران اسلام میں داخل ہوئے۔یہ زمانہ ہجرت حبشہ سے لے کر ہجرت مدینہ تک چلتا ہے جب رسول اللہ ﷺ نے خود مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔

اس کے بعد انصار مدینہ میں ان خوش نصیبوں کا درجہ ہے جو بیعت عقبہ اولیٰ میں شامل رہے۔یہ گویا انصار کے سابقون الاولون ہیں۔انصار میں سابقین الاولین وہ حضرات ہیں جو پہلی

بیعت عقبہ میں شامل رہے۔ اس کے بعد وہ حضرات جو دوسری بیعت عقبہ میں شامل رہے۔ بیعت عقبہ کے بارے میں بعض سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ دو مرتبہ ہوئی اور بعض نے لکھا ہے کہ تین مرتبہ ہوئی۔ ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ یہ صرف اصطلاح کا فرق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عقبہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ سے مدینہ منورہ کے تین مختلف وفود کی ملاقات تین مرتبہ ہوئی۔ پہلی مرتبہ چھ حضرات سے ملاقات ہوئی۔ اس میں کوئی باقاعدہ معاہدہ یا اتفاق رائے نہیں ہوا کہ رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے جائیں، یا مدینہ منورہ میں اسلام کی دعوت کے کام کو باقاعدہ کیسے مرتب کیا جائے۔ بعض سیرت نگار حضرات نے اس کو بیعت کا نام نہیں دیا۔ لہٰذا وہ اس کو بیعت عقبہ اولیٰ قرار نہیں دیتے۔ وہ دوسری بیعت عقبہ کو بیعت عقبہ اولیٰ اور تیسری کو بیعت عقبہ ثانیہ قرار دیتے ہیں۔ کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ اس موقع پر عقبہ کے مقام پر رسول اللہ ﷺ اور مدینہ کے چھ رکنی وفد کے درمیان باقاعدہ ملاقات ہوئی تھی۔ چھ صحابہ کرامؓ مدینہ منورہ سے وہاں تشریف لائے تھے اور انہی سے مدینہ منورہ میں دعوت اسلامی کا آغاز ہوا، اس لئے یہ پہلی بیعت عقبہ ہے، اور جو بیعت دوسرے اہل علم کے نزدیک پہلی بیعت کہلاتی ہے وہ ان حضرات کے نزدیک دوسری ہے اور جو دوسری ہے وہ دراصل تیسری ہے۔ یہ محض گنتی اور شمار کا فرق ہے ورنہ واقعات کی اس ترتیب میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ تو گویا پہلی یا دوسری یا جو بھی تقسیم آپ پسند کریں، ان میں جو حضرات شریک ہوئے ان کا درجہ چوتھا ہے اور جو دوسری یا تیسری بیعت میں شریک ہوئے ان کا درجہ پانچواں ہے۔

اس کے بعد وہ حضرات ہیں جو مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے گئے یا مدینہ کے قرب وجوار کے رہنے والے یا مدینہ منورہ میں رہنے والے حضرات جو رسول اللہ ﷺ کے قیام قبا کے دوران اسلام میں داخل ہوئے۔ حضورؐ نے پندرہ دن قبا میں قیام فرمایا جہاں بہت سے حضرات نے اسلام قبول کیا۔ بہت سے مہاجرین ہجرت کر کے حضورؐ کے ساتھ مدینہ میں جاکر مل گئے۔ ان کا طبقہ وہ ہے جو امام حاکم کے نزدیک درجہ اور فضیلت کے اعتبار سے صحابہ کرامؓ کا چھٹا طبقہ ہے۔ ابھی بطور ماخذ حدیث یا مصدر حدیث کے بات نہیں ہو رہی ہے بلکہ ابھی صرف صحابہ میں درجات اور فضیلت کی بات ہو رہی ہے۔

پھر ساتواں درجہ ان کا ہے جو اصحاب بدر ہیں۔ ممکن ہے آپ کے ذہن میں یہ سوال

پیدا ہو کہ ہم تو ابھی تک یہ پڑھتے آرہے ہیں کہ اصحاب بدر کا درجہ سب سے اونچا ہے۔ یہ ساتواں درجہ کیوں بتایا جارہا ہے۔ اس سوال پر میرا پہلا جواب تو یہ ہے کہ یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ امام حاکم بتارہے ہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ جو پہلے تمام درجات ہیں اصحاب بدران میں شامل ہیں۔ سابقون اولون میں سے کوئی نہیں جو غزوہ بدر میں شامل نہ ہو۔ اصحاب دارالندوہ میں کوئی نہیں جو بدر میں شامل نہ ہوا ہو۔ یہ سارے کے سارے اصحاب بدر میں شامل ہیں۔ اس لئے جب ہم اصحاب بدر کے درجہ کا ذکر کریں گے تو ایک آدھ کے استثنا کے ساتھ یہ سارے کے سارے اس میں شامل ہوں گے۔

اصحاب بدر کے بعد صلح حدیبیہ سے پہلے اسلام میں داخل ہونے والے ان خوش نصیبوں کا درجہ ہے جو ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ ان کا درجہ اس لئے اونچا ہے کہ صلح حدیبیہ سے پہلے پہلے مکہ مکرمہ کے لوگوں اور مسلمانوں کے درمیان شدید جنگ اور کشمکش کی کیفیت تھی اور تمام اہل مکہ اور ان کی وجہ سے بقیہ قبائل کے بہت سے لوگ مسلمانوں کے شدید دشمن تھے۔ لہٰذا جو شخص مکہ مکرمہ یا کسی اور قبیلہ سے اپنا وطن چھوڑ کر اسلام قبول کرتا ہے اور مدینہ منورہ آکر گویا اپنی سابقہ شہریت کو منسوخ کر کے مسلمانوں کی برادری میں شامل ہو جاتا ہے وہ پوری برادری اور گھر بار چھوڑ کر پورے عرب سے دشمنی مول لے کر مدینہ منورہ کی بستی میں آتا ہے تو اس کا درجہ بعد والوں سے بلاشبہ اونچا ہونا چاہئے۔

صلح حدیبیہ کے بعد صورت حال بدل گئی۔ کفار مکہ سے جنگ بندی کا معاہدہ ہوا۔ دوسرے قبائل سے بھی معاہدات ہوئے، کچھ قبائل سے دوستی کے عہد و پیمان ہوئے۔ مسلمانوں کے لئے حالات نسبتاً بہتر ہو گئے اور اب دشمنی کی وہ کیفیت نہیں رہی۔ ان حالات میں جو اصحاب تشریف لائے ان کی قربانی پہلے آنے والے حضرات کے مقابلہ میں نسبتہً کم درجے کی ہے۔ اس لئے آٹھواں درجہ ان کا ہے جو صلح حدیبیہ کے بعد اور بیعت رضوان سے پہلے پہلے تشریف لائے۔ پھر بیعت رضوان میں جو لوگ شریک ہوئے قرآن مجید میں ان کا ذکر موجود ہے 'لقد رضی الله عن المومنین اذیبایعونك تحت الشجرہ ' اللہ تعالیٰ راضی ہو گیا ان لوگوں سے جو درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے۔ اب قرآن مجید کی اس گواہی کے بعد تو کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ ان کا درجہ کیا ہے۔

پھر وہ حضرات ہیں جو بیعت رضوان کے اس واقعہ کے بعد اور فتح مکہ سے پہلے اسلام میں داخل ہوئے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور ان صحابہ کرامؓ کی خاصی تعداد ہے جو بیعت رضوان کے بعد اور فتح مکہ سے پہلے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آ گئے اور اسلام میں داخل ہو گئے۔

گیارھواں درجہ ان حضرات کا ہے جن کو کہا جاتا ہے 'مسلمۃ الفتح'، جو فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے۔ مثلاً حضرت ابو سفیانؓ۔

بارھواں درجہ ان حضرات کا ہے جو بہت بچے تھے جب رسول اللہ ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے۔ اس لئے ان کو تبرکاً اور تیمناً صحابیؓ کہا جاتا ہے، جن کو یہ شرف حاصل ہے کہ ان کی آنکھوں نے حضور ﷺ کے چہرہ انور کا دیدار کیا۔ اس کے علاوہ کوئی اور ایسی بات نہیں جس سے وہ صحابہ کرامؓ کے کسی اور طبقہ میں شامل ہو سکیں۔

یہ بارہ درجات امام حاکم کے بیان کردہ ہیں۔ ان میں سے کہیں کہیں تھوڑی سی اوورلیپنگ اور تداخل بھی ہے۔ لیکن عمومی طور پر سمجھنے کے لئے امام حاکم نے یہ درجات بتائے ہیں۔ یہ صحابہ کرامؓ کے آپس میں فضیلت کے اعتبار سے درجات کا ایک عام یا مبہم اندازہ ہے۔ اصل درجہ تو اللہ کو معلوم ہے۔ اگرچہ بعض صحابہ کے بارے میں ہمیں یقین سے معلوم ہے کہ ان کا درجہ کیا ہے، مثلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ کا درجہ یا عشرہ مبشرہ کا درجہ باقی اصحاب رسولؐ سے اونچا ہے۔ لیکن بقیہ ایک لاکھ سے زیادہ جو صحابہ کرامؓ ہیں ان کے درجات کا یہ ایک مبہم سا اندازہ ہے۔ اور ایک ظنی بات ہے۔ اس میں تیقن یا قطعیت کے ساتھ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کو کرنا ہے۔

طبقات صحابہ کرام

اس درجہ بندی کے علاوہ محدثین نے صحابہ کرامؓ کے طبقات بھی بتائے ہیں۔ طبقات سے مراد زمانی اعتبار سے صحابہ کرامؓ کی عمروں کو سامنے رکھ کر اس بات کا تعین کرنا کہ کون سے صحابہ کرامؓ وہ ہیں جن سے کبار تابعین کو کسب فیض کرنے کا موقع ملا۔ کون سے صحابہ کرامؓ وہ ہیں جن سے اوساط تابعین کو کسب فیض کا موقع ملا اور کون سے صحابہ وہ ہیں جن سے صغار تابعین کو کسب فیض

کا موقع ملا۔ظاہر ہے کہ جن تابعین کو اکابر صحابہ سے کسب فیض کا موقع ملا، مثلاً اگر کسی تابعی نے سیدنا عمر فاروقؓ سے روایت نقل کی یا کسی تابعی نے صدیق اکبرؓ سے روایت نقل کی تو ان کے تابعی ہونے کا درجہ بھی بڑا ہوگا۔اس اعتبار سے صحابہ کرامؓ کے تین طبقات علماء حدیث نے بیان کیے ہیں۔

کبار صحابہ

سب سے پہلا یا سب سے اونچا اور بڑا درجہ کبار صحابہ کا ہے۔ان میں وہ صحابہ کرامؓ شامل ہیں جن کو ایک طویل عرصہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں گزارنے، آپؐ کی سنت کا مشاہدہ کرنے، آپ سے حدیث کو حاصل کرنے اور آپ کے زیر سایہ براہ راست اور مکمل تربیت حاصل کرنے کا موقع ملا۔ یہ کبار صحابہ ہیں جن میں خلفائے اربعہ، عشرہ مبشرہ اور امہات المومنین کے علاوہ مہاجرین کی بڑی تعداد شامل ہے۔ان میں انصار اور مہاجرین دونوں گروہوں سے حضورؐ کے قریب ترین وہ اصحاب شامل ہیں جو شب و روز آپؐ کے ساتھ رہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی تعداد تھوڑی ہے لیکن تیقن کے ساتھ گنتی کر کے بتانا دشوار ہے کہ کون سے صحابہ کبار صحابہ میں سے ہیں اور کون سے نہیں۔آخر میں کبار صحابہ اور اوساط صحابہ کے درمیان جو **Dividing Line** آئے گی وہاں تھوڑا سا اختلاف ہوگا اور وہاں حتمی اور قطعی طور پر یہ تعین کرنا دشوار ہوگا کہ یہ وہ لکیر ہے جو کبار صحابہ کو باقی صحابہ سے الگ کرتی ہے تو یہ لکیر کھینچنا بہت مشکل ہے۔البتہ اس تقسیم سے کبار صحابہ کے بارے میں ایک عمومی اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔

اوساط صحابہ

اس کے بعد اوساط صحابہ کا درجہ ہے۔ یہ وہ صحابہ ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی حیات ارضی میں اپنے ہوش و حواس میں تھے، نوجوان تھے، جن کو حضور ﷺ کو دیکھنے کے خاصے مواقع ملے، لیکن نوجوان اور کم سن ہونے کی وجہ سے اتنے قریبی اور خصوصی مواقع نہیں ملے جتنے مثلاً حضرت عمر فاروقؓ یا حضرت علیؓ کو ملے یا امہات المومنین کو ملے۔مثال کے طور پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا شمار مدینہ منورہ کے ابتدائی سالوں میں کم سن بچوں میں ہوتا تھا۔ جب حضورؐ دنیا سے تشریف لے گئے تو ان کی عمر اکیس بائیس سال کے لگ بھگ تھی۔اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضورؐ

کے پاس دس سال کی عمر میں تشریف لائے، اس لئے ان جیسے نوعمر صحابہ کرام کا شمار کبار صحابہ میں تو نہیں ہوسکتا۔ لیکن دس سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر معمولی فہم، سمجھ بوجھ اور عقل و دانش سے نوازا تھا۔ انہوں نے تین سالوں میں اتنا کچھ حاصل کرلیا جتنا کہ بہت سے اور حضرات حاصل نہیں کر سکے۔ اس لئے ان کا شمار اوساط صحابہ میں ہے۔ جب حضورؐ کا انتقال ہوا تو حضرت عبداللہ بن عباس کی عمر تیرہ یا ساڑے تیرہ سال تھی۔ ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہیں، جب غزوہ احد ہوا تو جو صحابہ کرامؓ غزوہ احد میں شرکت کے لئے ہتھیار اور سامان جنگ لے کر نکلے۔ حضورؐ نے مدینہ سے باہر جا کر فوج کا معائنہ فرمایا۔ اس وقت ایک ہزار کے قریب شرکا تھے۔ بعض لوگوں کو آپؐ نے کم سن قرار دے کر واپس بھیج دیا۔ ان میں حضرات عبداللہ بن عمرؓ، ابوسعید خدریؓ اور چند اور حضرات شامل تھے۔ آپؐ نے ان سے کہا کہ تم ابھی کم سن ہو، جنگ میں شریک نہیں ہوسکتے اس لئے چلے جاؤ۔ وہ بہت بوجھل دل اور افسوس کے ساتھ واپس چلے گئے کہ حضورؐ کے ساتھ جہاد میں شرکت کی اس سعادت عظمٰی کے حصول کا موقع نہیں ملا۔ اس وقت ان کی عمر کیا ہوگی؟ ظاہر ہے بارہ تیرہ یا چودہ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ ایسی عمر تھی کہ نہ ان کا شمار بچوں میں تھا نہ بڑوں میں۔ خود اپنی دانست میں یہ جنگ میں حصہ لینے کے اہل تھے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے از راہ شفقت اور از راہ مہربانی اور از راہ بزرگی ان کو اس کا اہل نہیں سمجھا کہ وہ جنگ میں شرکت جیسی اہم ذمہ داری انجام دے سکیں۔

یہ سارے حضرات جو غزوہ احد میں نوجوان تھے ان کو غزوہ خندق میں آپؐ نے شرکت کا موقع عطا فرمایا اور وہ اس میں شریک ہوئے۔ یہ اوساط صحابہ کہلاتے ہیں۔ ان میں سے متعدد حضرات نے لمبی عمر پائی اور جن کی عمر زیادہ طویل ہوئی زیادہ تر روایات انہی سے ہیں۔ تابعین نے زیادہ تر انہی حضرات سے استفادہ کیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، یہ اور ان کے ہم عمر حضرات اوساط صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔

صغار صحابہ

تیسرا طبقہ صحابہ کرامؓ میں صغار صحابہ کا ہے جو حضور ﷺ کی حیات کے زمانہ میں بہت بچے تھے اور ان کی جوانی کا زمانہ آپؐ کی حیات کے بعد شروع ہوا۔ مثلاً حضرات حسنینؓ سے کوئی

روایت منقول نہیں ہے۔ بہت عام قسم کی دو ایک باتیں ان سے منقول ہیں۔ مثلاً حضورؐ کے حلیہ مبارک کے بارے میں، آپؐ کے کسی عام طرز عمل کے بارے میں اکا دکا روایت ہوگی۔ ورنہ عام طور پر ان حضرات سے کوئی روایت نہیں ہے۔ حضرت محمود بن لبیدؓ جن کا ذکر ہو چکا ہے، ابوالطفیل عامر بن واثلہ، یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا تو سہی لیکن روایت کرنے یا صحبت میں رہنے یا کوئی طویل استفادہ کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ ان کی اکثر روایتیں دوسرے صحابہ کرامؓ سے ہیں۔ یہ صحابیؓ ہوتے ہوئے بھی صحابہ سے روایت کرنے والے لوگ ہیں۔

ان طبقات سے یا زمانے کے اس تعین سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس صحابیؓ کا زمانہ کس زمانے تک آتا ہے۔ چونکہ صحابہ کے طبقات پر الگ الگ کتابیں بھی ہیں اور طبقات صحابہ میں مورخین اور محدثین نے زمانے کا تعین بھی کیا ہے اس لئے اس بات کا پتہ چلانا بہت آسان ہے کہ اگر کسی تابعی نے کسی صحابیؓ سے روایت کی ہو تو اس روایت کا درجہ کیا ہے اور وہ روایت ممکن بھی ہے کہ نہیں۔

صحابہ کرام کی کل تعداد

صحابہ کرامؓ کی تعداد ایک لاکھ سے اوپر ہے۔ بعض لوگوں نے یہ تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی ہے۔ بعض لوگوں نے کم وبیش بتائی ہے۔ ان تمام حضرات کی تعداد جن کو شرف صحابیت حاصل تھا وہ بہت زیادہ تھی۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار تو وہ تھے جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ 9 ذی الحجہ سن 10ھ کو میدان عرفات میں موجود تھے۔ بہت سے حضرات ایسے بھی ہوں گے جو اس موقع پر حج کے لئے حاضر نہیں ہو سکے ہوں گے، انہوں نے بھی اس سے پہلے یا بعد میں حضورؐ کو دیکھا ہوگا لہٰذا وہ بھی صحابیؓ ہیں۔ اس لئے صحابہ کی تعداد کے بارے میں قطعی طور پر کچھ کہنا تو بہت مشکل ہے۔ البتہ وہ صحابہ کرامؓ جن کے اسمائے گرامی معلوم ہوئے اور کسی نہ کسی اعتبار سے محدثین کے علم میں آئے ان کی تعداد امام ابوزرعہ رازی نے ایک لاکھ چودہ ہزار بتائی ہے۔ صحابہ کے جو تذکرے آج موجود ہیں، مثلاً 'الاستیعاب فی معرفة الاصحاب'، 'الاصابہ فی تمییز الصحابہ'، 'اسد الغابہ' اور 'طبقات ابن سعد' ان سب کتابوں میں جن صحابہ کرامؓ کا ذکر ہے ان کی مجموعی تعداد پندرہ بیس ہزار کے درمیان ہے۔ یہ وہ حضرات ہیں جن سے یا تو کوئی نہ کوئی

روایت منقول ہے یا سیرت سے متعلق کسی واقعہ میں ان کا ذکر آتا ہے۔ باقی صحابہ سے کوئی روایت منقول نہیں ہے۔ انہوں نے حضورؐ کو دیکھا ضرور لیکن ایسا کوئی موقع نہیں آیا کہ وہ کوئی روایت بیان کرسکیں۔

علم حدیث کا ایک طے شدہ اصول ہے کہ صحابہ کرامؓ سب کے سب عادل ہیں۔ لہٰذا کسی صحابیؓ کے عادل یا غیر عادل ہونے کے بارے میں بحث غیر ضروری ہے۔ یہ بحث تحصیل حاصل ہے۔ امام ابوزرعہ رازی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ 'اذا رأیت الرجل ینتقص احداً من اصحاب رسول اللہ ﷺ' جب تم کسی کو دیکھو کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں سے کسی کی تنقیص کررہا ہے، 'فاعلم انہ زندیق' تو جان لو کہ وہ زندیق ہے۔ یعنی بے دین اور دہریہ ہے۔ اس لئے کہ قرآن مجید صحابہ کرامؓ کے واسطے سے ہی ہم تک پہنچا۔ سنت کے ذخائر صحابہ کرامؓ ہی کے واسطے سے آئے۔ اگر صحابہ کرامؓ کا ایمان نعوذ باللہ مشکوک ٹھرا دیا جائے، صحابہ کرامؓ کے کردار اور عدالت پر چھینٹے اڑا دیئے جائیں تو پھر قرآن مجید بھی مشکوک ہے، حدیث بھی مشکوک ہے اور پورا دین مشکوک ہے۔ اس وجہ سے بالاتفاق محدثین، فقہائے اسلام اور مفسرین قرآن تمام صحابہ کرامؓ کو عادل قرار دیتے ہیں۔

صحابہ کرامؓ سے جو روایات آئی ہیں ان صحابہ اور ان روایات کے نقطہ نظر سے بھی صحابہ کرامؓ کے یہ تین طبقات ہیں۔

۱۔ ایک طبقہ وہ ہے جو کبار صحابہ سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن ان سے کوئی روایت منقول نہیں ہے۔ مثلاً حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جن کا تعلق صحابہ کے طبقہ اول کے بھی طبقہ اول سے ہے۔ لیکن ان سے کوئی روایت منقول نہیں ہے۔ ان کا انتقال مکہ مکرمہ میں ہوا اور ان کو کسی تابعی نے دیکھا ہی نہیں۔ ان کا سارا رابطہ صحابہ سے ہی رہا۔ ان صحابہ کرامؓ میں سے کسی کو سرے سے ضرورت ہی پیش نہیں آئی کہ سیّدہؓ سے کوئی روایت معلوم کرتا۔ صحابہ کرامؓ کا جو طبقہ زمانی اعتبار سے جتنا زیادہ متقدم تھا ان سے روایتیں اتنی ہی کم ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے روایتیں بہت ہی کم ہیں۔ مسند امام احمد کو آپ کھول کر دیکھ لیں، غالباً بیس پچیس صفحات سے زیادہ کی روایات نہیں ہوں گی۔

۲۔ زیادہ روایتیں ان صحابہ کرامؓ سے ہیں جن کا تعلق اوساط صحابہ یعنی متوسط طبقہ

سے ہے۔ یہ وہ حضرات ہیں جن کو حضور ﷺ کے بعد طویل عرصہ تک زندگی گزارنے کا موقع ملا۔ ان میں چھ صحابہ کرامؓ سب سے نمایاں ہیں۔ جو مکثرین یعنی کثرت سے روایت بیان کرنے والے کہلاتے ہیں۔ سیدنا ابو ہریرہؓ، سیدنا عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت انس بن مالکؓ۔ ان صحابہ کرامؓ سے جو احادیث مروی ہیں وہ ہزاروں میں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی مرویات کی تعداد ایک ہزار یا اس سے اوپر ہے۔

۳۔ ان کے بعد درجہ آتا ہے ان چار صحابہ کرام کا جن کو عبادلہ کہا جاتا ہے۔ ان میں سے دو پہلے طبقہ میں بھی شامل ہیں۔ لیکن عبادلہ یعنی عبداللہ ہونے کی وجہ سے ان کو اس تیسرے طبقہ میں بھی شامل کیا گیا ہے۔ یہ بھی مکثرین کہلاتے ہیں۔ عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ۔ یہ عبادلہ اربعہ کہلاتے ہیں۔ بعض لوگ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو بھی ان میں شامل کرتے ہیں اور یوں یہ حضرات عبادلہ خمسہ کہلاتے ہیں۔ بہر حال یہ ایک اصطلاح ہے عبادلہ خمسہ اور اربعہ کی۔ یہ پانچ یا چار عبداللہ ہیں جو مکثرین میں سے ہیں جن سے بڑی تعداد روایات کی منقول ہے۔

۴۔ ان صحابہ کے علاوہ بھی کچھ صحابہ کرامؓ ہیں جن سے بڑی تعداد میں روایات منقول ہیں۔ لیکن ان کی روایات ایک ہزار سے کم ہیں۔ ان کے بارے میں حضرت مسروق جو صف اول کے تابعی ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ میں نے صحابہ کرامؓ کے علوم وفنون کا مطالعہ کیا اور ان پر غور کیا تو مجھے یہ پتہ چلا کہ صحابہ کرامؓ کے پاس قرآن پاک، سنت اور شریعت کا جو بھی علم تھا وہ سارے کا سارا سمٹ سمٹا کر چھ صحابہ میں جمع ہو گیا تھا۔ 'انتھیٰ علم الصحابه الی سته'، صحابہ کا علم سمٹ کر چھ صحابہ میں آ گیا، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت علی بن ابی طالبؓ، حضرت ابیؓ بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابو درداؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ۔ پھر ان چھ صحابہ کا علم جب میں نے دیکھا اور اس پر غور کیا تو وہ سمٹ کر دو حضرات کے پاس آ گیا۔ ایک حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور دوسرے حضرت علی بن ابی طالبؓ۔

امام مسروق کی یہ بات بڑی وزنی معلوم ہوتی ہے اور بڑے گہرے مطالعہ اور مشاہدہ پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ بعد میں جتنے محدثین ہمیں ملتے ہیں اور خاص طور پر جتنے فقہا ہمارے سامنے آتے ہیں، بالخصوص وہ فقہا جنہوں نے اپنے اپنے مکتب فکر مرتب فرمائے۔ جن کے اجتہادات اور

خیالات کو ان کے شاگردوں نے باقاعدہ طور پر علم کی شکل میں مرتب کر دیا اور جس کے نتیجہ میں مکاتب فکر وجود میں آئے، ان میں سے اکثر وبیشتر کے علم کا زیادہ تر دارومدار انہی دو صحابہ کے علم پر ہے۔ حضرت علی بن ابی طالبؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، یا تو براہ راست ان دو صحابہ پر یا کسی واسطے سے ان صحابہ پر جن پر ان سے پہلے علم جمع ہوا تھا یعنی چھ صحابہ۔

مثال کے طور پر امام مالک مدینہ منورہ میں قیام فرماتے تھے۔ ان کی پوری زندگی مدینہ منورہ میں گزری۔ مدینہ منورہ میں ان کو کسب فیض کرنے کا سب سے زیادہ موقع ان تابعین سے ملا جن تابعین نے مدینہ منورہ کے صحابہ کرامؓ سے کسب فیض کیا تھا۔ مدینہ منورہ میں تابعین نے جن صحابہ سے کسب فیض کیا ان میں دو نام بڑے نمایاں ہیں، ایک حضرت عمر فاروقؓ اور دوسرے حضرت علی بن ابی طالبؓ۔ حضرت علیؓ کوفہ میں گزارے ہوئے زندگی کے آخری چار پانچ سالوں کے علاوہ پوری زندگی مدینہ منورہ میں رہے۔ امام مالک کی روایات آپ دیکھیں تو اکثر روایات میں ہے مالك عن نافع عن ابن عمرؓ، یا مالك عن ابن شهاب اور ابن شہاب کے اساتذہ اور پھر مدینہ منورہ کے صحابہ کرامؓ، مالك عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی هریرةؓ، امام مالک کے استاد تھے ابوزناد، امام مالک روایت کرتے ہیں مالك عن ابی الزناد عن الاعرج۔ عبدالرحمٰن بن الاعرج ان کے ایک استاد تھے غالباً پاؤں میں کوئی تکلیف تھی تو عرف عام میں اعرج کہلاتے تھے۔ اس طرح سے مدینہ کا جتنا علم تھا وہ حضرت علیؓ، حضرت عمر فاروقؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کے ذریعہ سمٹ کر امام مالکؒ تک پہنچا اور امام مالک کا مکتب فکر وجود میں آ گیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ایک طویل عرصہ تک کوفہ میں رہے۔ حضرت علیؓ بھی کوفہ تشریف لے گئے۔ انؓ کا اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا علم جو کوفہ میں سمٹا وہ ان تابعین تک پہنچا جنہوں نے ان دو شخصیات سے کسب فیض کیا۔ ان تابعین میں پھر دو نامور حضرات بہت نمایاں ہیں: حضرت علقمہ اور حضرت اسود نخعی۔ ان دونوں کا علم سمٹ سمٹا کر حضرت امام ابوحنیفہؒ تک آ گیا۔ عبداللہ بن مسعودؓ کا علم علقمہ تک، علقمہ کا علم ابراہیم نخعی تک، ابراہیم نخعی کا علم حماد بن سلیمان تک، حماد بن سلیمان کا علم امام ابوحنیفہ تک۔ پھر امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ نے اس پر کتابیں مرتب کر دیں، پوری پوری لائبریریاں لکھ کر پیش کر دیں اور یوں ایک مکتب فکر بن گیا۔

پھر وہ حضرات ہیں جنہوں نے کوفہ اور مدینہ منورہ دونوں کے اہل علم سے استفادہ کیا اوران دوروایتوں یعنی مدینہ اور کوفہ کی روایات کو جمع کیا۔ مدینہ اور کوفہ یعنی عراق کی روایت کو جس شخصیت نے جمع کیا وہ امام شافعی تھے۔ امام شافعی کے ہاں یہ دونوں روایتیں جمع ہوگئیں۔ امام شافعی نے طویل عرصہ تک مکہ مکرمہ میں رہ کر وہاں کے علما سے کسب فیض کیا۔ اس کے بعد وہ مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ مدینہ منورہ میں انہوں نے امام مالکؒ سے کسب فیض کیا۔ امام مالکؒ سے کسب فیض کرنے کے بعد وہ عراق گئے اور وہاں امام محمدؒ اور عراق کے بقیہ علماء سے سے کسب فیض کیا جن کے پاس حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا علم تھا۔ اس طرح سے وہ دوروایتوں کے جامع بن گئے تو ایک تیسرا مکتب فکر وجود میں آ گیا۔

پھر امام شافعیؒ سے جن حضرات نے کسب فیض کیا ان میں بعض لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کی طرف سے ان دونوں روایتوں کے جمع کرنے سے اہل علم کا ایک طبقہ سامنے آیا ہے جس کا زیادہ زور عقلیات اور رائے پر ہے۔ لہٰذا عقلیات اور رائے کے ساتھ ساتھ احادیث اور سنت پر دوبارہ سے زور دینے کی ضرورت ہے۔ دوبارہ زور دینے کی اس ضرورت کا احساس جب پیدا ہوا تو امام احمد بن حنبلؒ کا مکتب فکر وجود میں آیا۔ ان چار مثالوں سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ جو مکاتب فکر وجود میں آئے ہیں یہ ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور نہ صرف یہ کہ الگ نہیں کیا جاسکتا بلکہ جن صحابہ کرامؓ کے علمی اثرات اور اجتہادی بصیرت اور غور وفکر کے نتیجہ میں یہ مکاتب فکر وجود میں آئے وہ آپس میں اس طرح مربوط ہیں کہ ایک دوسرے سے کسب فیض کرتے ہیں اور سب کا علم چھن چھن کر ایک جگہ پہنچتا ہے۔

صحابہ کرامؓ پر یہ مباحث ایک پورے فن کا موضوع ہے۔ اس پر کتابیں ہیں۔ درجنوں کتابیں کئی کئی جلدوں میں لکھی گئیں جن کا انتہائی مختصر ترین خلاصہ بلکہ خلاصہ کا خلاصہ یہ ہے جو میں نے آپ کے سامنے رکھا۔

تابعی کی تعریف

جس طرح صحابہ کرامؓ پر بحث ہوئی اسی طرح سے تابعین پر بھی بحث ہوئی۔ تابعین

کے طبقات اور مراتب پر بھی بات ہوئی۔ جو درجہ صحابہ کرامؓ کا بعد والوں کے لئے ہے وہی درجہ تابعین کا بھی بعد والوں کے لئے ہے۔ تابعی کی تعریف وہی ہے جو صحابیؓ کی تعریف ہے۔ تابعی سے مراد وہ خوش نصیب شخصیت ہے جس نے حالت ایمان میں کسی صحابیؓ رسول کی زیارت کی ہو، اسی حالت ایمان پر زندہ رہے ہوں اور اسی حالت ایمان پر انتقال کر گئے ہوں، ایسے خوش نصیب حضرات تابعی کہلاتے ہیں۔ لہٰذا ایسے لوگ اس تعریف سے نکل جاتے ہیں جو پہلے تابعی ہوئے اور بعد میں خدانخواستہ اسلام سے پھر گئے اور پھر دوبارہ اسلام قبول کیا۔ اگرچہ ایسے لوگ ہیں نہیں، لیکن ایسے کسی شخص کے وجود کا کم ازکم ایک نظری امکان موجود ہے، اگر کوئی ایسا آدمی رہا ہو جو بعد میں اسلام سے پھر گیا ہو اور اسی پھرنے کی حالت میں انتقال کر گیا ہو یا ایسے وقت میں مسلمان ہو گیا ہو جب تابعین دنیا سے اٹھ گئے تھے تو اس کا شمار تابعین میں نہیں ہوگا۔ حدیث کے راویوں کی حد تک ایسا کوئی آدمی غالباً موجود نہیں ہے۔

طبقات تابعین

امام حاکم نے تابعین کے پندرہ طبقات بتائے ہیں۔ اس لئے کہ تابعین کا زمانہ خاصا طویل ہے۔ صحابہ کرامؓ میں تو ایک یا دو نسلیں ہیں جبکہ تابعین میں بہت سی نسلیں ہیں۔ ایک نسل وہ جو حضور ﷺ کے زمانے میں خاصی پختہ عمر کو پہنچ گئی تھی لیکن اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ بعض لوگ ایسے بھی تھے جو اسلام میں تو داخل ہو گئے تھے لیکن مدینہ منورہ سے باہر رہنے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی زیارت کا موقع نہیں ملا، جیسے حضرت صنابحی کا میں نے ذکر کیا۔ وہ طویل عرصہ پہلے اسلام قبول کر چکے تھے اور کوشاں تھے کہ جلد از جلد مدینہ منورہ حاضری ہو اور حضور ﷺ کی خدمت میں کچھ دن گزاریں۔ جب بندوبست کر کے نکلے اور بڑے اہتمام سے مدینہ منورہ میں داخل ہو رہے تھے تو اطلاع ملی کہ رسول اللہ ﷺ انتقال فرما چکے ہیں اور آپ کی تدفین بھی مکمل ہو گئی ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت عمر فاروقؓ کی ایک روایت ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ خواجہ اویس قرنی ایک تابعی تھے جن کو حضور ﷺ سے دلی محبت تھی اور ان کی اس محبت اور جذبہ صادق کا حضور ﷺ کو علم تھا۔ آپؐ نے حضرت عمر فاروقؓ کو بتایا۔ یہ وہ تابعین ہیں جو عمر کے اعتبار سے اس درجہ کے تھے کہ اگر وہ صحابیؓ ہوتے تو شاید ان کا شمار اوساط صحابہ میں یا ممکن ہے کہ کبار صحابہ میں بھی

ہوتا۔لیکن کسی وجہ سے ان کو قبول اسلام کا موقع نہیں ملا، اس لئے تابعین میں شمار ہو گئے۔ ان کا انتقال ظاہر ہے جلد ہو گیا۔ یہ تابعین کی پہلی نسل تھی اور آخری نسل وہ تھی جنہوں نے کم سنی میں صغار صحابہ کو دیکھا۔ آخری صحابیؓ جن کی وفات **110**ھ میں ہوئی ان کو اگر کسی تابعی نے پانچ چھ سال کی عمر میں دیکھا ہو اور ان کی عمر سو سال یا ایک سو پانچ سال ہوئی ہو، جو کہیں کہیں ہو جاتی ہے۔ ہر قوم اور ہر علاقے میں دو چار فی ہزار ایسے لوگ تو ہوتے ہیں جن کی عمر سو سال یا زیادہ ہو۔ تو اگر ایسے کچھ لوگ ہوں تو وہ تابعی ہو جائیں گے۔ اس طرح تابعین کا زمانہ کم وبیش **210**ھ تک آجاتا ہے۔ یہ زمانہ نسبتاً لمبا ہے اور صحابہ کا زمانہ نسبتاً چھوٹا ہے۔ تابعین کا زمانہ کم وبیش **110** سال طویل ہے۔ صحابہ کا زمانہ سو سال کے لگ بھگ طویل ہوگا۔ اس لئے تابعین کے طبقات زیادہ ہیں اور صحابہ کے طبقات کم ہیں۔ تابعین کے یہ پندرہ طبقات ان کے درجات کے حساب سے ہیں۔

تابعین کے درجات

فن روایت کے نقطہ نظر سے صحابہ کی طرح تابعین کے بھی تین درجات ہیں۔ سب سے بڑا درجہ کبار تابعین کا ہے۔ کبار تابعین سے مراد وہ لوگ ہیں 'الذین یروون عن کبار الصحابه' جو کبار صحابہ سے روایت کرتے ہیں، وہ کبار تابعین کہلاتے ہیں۔ کبار تابعین میں ایک شخصیت ایسی بھی ہے جس کو ایسا شرف حاصل ہے جو کسی اور تابعی کو حاصل نہیں ہے۔ شاید کسی صحابیؓ کو بھی حاصل نہ ہو۔ وہ ہیں حضرت قیس بن ابی حازمؒ، یہ تمام عشرہ مبشرہ سے روایت کرتے ہیں۔ اگر کوئی ایک شخص ایسا ہے جس کے اساتذہ میں عشرہ مبشرہ کے تمام کے تمام صحابہ شامل ہوں تو وہ قیس بن حازمؒ ہیں۔ یہ واحد تابعی ہیں جو تمام عشرہ مبشرہ سے روایت کرتے ہیں۔ یہ بات امام حاکم نے اپنی کتاب میں لکھی ہے۔

اس کے بعد اوساط تابعین ہیں جو بقیہ صحابہ سے روایت کرتے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ ان کی روایت کبار تابعین سے بھی ہے۔ جن کی روایت اکثر وبیشتر کبار تابعین سے ہے اور کبار صحابہ کے علاوہ جو بقیہ صحابہ کرامؓ ہیں ان سے بھی روایت کرتے ہیں۔

صغار تابعین وہ ہیں جنہوں نے صغار صحابہ کو دیکھا ہے اور اوساط تابعین سے روایت کی ہے۔ ان میں سے بعض حضرات کی اکا دکا روایت بھی صغار صحابہ سے منقول ہے اور ثابت ہے۔ ان

میں امام ابوحنیفہ بھی شامل ہیں جنہوں نے صغار صحابہ کو دیکھا تو ہے اور اس پر سب محدثین متفق ہیں، لیکن کیا روایت بھی کی ہے؟ اس کے بارے میں اختلاف ہے کہ ان کو صغار صحابہ سے روایت حاصل ہے کہ نہیں ہے۔

یہ زمانہ ایک سو اسی سال سے دو سو دس سال تک کے لگ بھگ بنتا ہے۔ تابعین کو بھی بڑا درجہ حاصل ہے۔ ان کا درجہ ایک حدیث سے بھی ثابت ہے اور قرآن مجید سے بھی ثابت ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ سورۃ التوبہ میں آتا ہے 'السابقون الاولون من المهاجرين والانصار والذين اتبعوا هم باحسان'، سب سے اونچا درجہ ان السابقون الاولون کا ہے جو مہاجرین اور انصار میں سے ہوں اور پھر ان لوگوں کا جنہوں نے ان کی پیروی کی اچھائی اور احسان کے ساتھ۔ اگرچہ یہاں اصطلاحی تابعین مراد نہیں ہیں۔ ان وہ میں صحابہ بھی شامل ہیں جو سابقون الاولون کے بعد آئے۔ لیکن چونکہ آیت میں اتبعوهم کا لفظ ہے تو لغتاً اس میں تابعین بھی شامل ہیں۔ ایک عمومی معنی کے اعتبار سے اس میں تابعین شامل ہو جاتے ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بالواسطہ طور پر قرآن مجید میں تابعین کا ذکر موجود ہے۔ غیر تابعین بھی جزواً اور مجازاً اس میں شامل ہو جائیں گے۔ ہر وہ شخص جس نے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کا اتباع کیا وہ اس میں شامل ہے۔ لیکن چونکہ لفظ اتبعوهم آیا ہے اس لئے بہت سے لوگوں نے اس میں تابعین کو بھی شامل کیا ہے۔

تابعین کی فضیلت اور شرف کا ذکر ایک حدیث میں بھی ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ 'خير القرون قرني ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم'، بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر وہ زمانہ جو میرے بعد آئے پھر وہ زمانہ جو اس کے بعد آئے۔ اس حدیث کی تعبیر مین تھوڑا سا اختلاف ہے۔ ایک تو یہ کہ جو پہلا ثم الذين يلونهم ہے، یہ دور صحابہ ہے اور جو دوسرا ثم الذين يلونهم ہے یہ دور تابعین ہے۔ مجھے ذاتی طور پر اس کی دوسری تشریح بہتر معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ خير القرون قرني سے مراد صحابہ کرامؓ کا زمانہ ہے۔ بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے۔ اس لئے کہ صحابہ کا زمانہ حضورؐ ہی کے زمانہ مبارک کی توسیع ہے۔ صحابہ نے حضورؐ کے زمانہ میں تربیت پائی، آپؐ کے تلامذہ تھے، آپؐ ہی سے کسب فیض کیا، حضورؐ کی سنتوں کو آگے پہنچایا، رسول اللہ ﷺ نے جو بہت سے کام شروع فرمائے صحابہ نے ان کی تکمیل فرمائی۔ جن کاموں کا حضورؐ نے حکم دیا، یا

قرآن پاک میں پیشین گوئی آئی ان کی تکمیل صحابہ کرامؓ کے ہاتھوں ہوئی۔اس لئے 'قرنی' جس کو حضورؐ نے اپنا زمانہ کہا وہ دراصل صحابہ کرامؓ کا زمانہ ہے۔ ثم الذین یلو نھم پھران کا زمانہ جوان کے بعد آئیں گے۔ یلو نھم میں ضمیر جمع کی ہے جس سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔اگر حضورؐ کا اپنا زمانہ مراد ہوتا تو آپؐ فرماتے کہ ثم الذین یلونی، پھر وہ لوگ جو میرے بعد آئیں گے۔ لیکن آپؐ نے ایسا نہیں فرمایا بلکہ فرمایا: ثم الذین یلو نھم۔گویا اس میں قرنی سے مراد صحابہ کا زمانہ ہے، اسی لئے آپ نے جمع کی ضمیر کا استعمال فرمایا ہے۔ثم الذین یلو نھم پھران کا زمانہ جو ان کے بعد آئیں گے یعنی تبع تابعین۔تو پہلا یلو نھم تابعین اور دوسرا یلو نھم تبع تابعین کے متعلق ہوا۔

ایک بزرگ نے ایک لطیف نکتہ کے طور پر لکھا کہ قرنی سے دور صحابہ مراد ہے۔اس کے شواہد میں سے ایک چیز یہ بھی ہے کہ چاروں خلفائے راشدین کے ناموں کا مخفف بھی آگیا ہے۔ق سے صدیق، ر سے عمر، ن سے عثمان، ی سے علی۔خلفائے راشدین کے ناموں کے آخری حروف لیں تو قرنی بنتا ہے۔یہ محض ایک نکتہ ہے۔اگر آپ کا جی چاہے تو اتفاق کریں اور نہ چاہے تو نہ کریں۔لیکن خود حدیث کے الفاظ یلونہم سے بھی یہ اشارہ ملتا ہے کہ اس سے مراد صحابہ کا دور ہے۔اس لئے کہ وہ حضورؐ ہی کے دور کی ایک توسیع اور تکملہ ہے۔

اس پر بڑی بحث ہوئی ہے کہ تابعین میں سب سے افضل شخصیت کون ہیں۔اگر کسی ایک شخصیت کو منتخب کرنا ہو تو سب سے افضل تابعی کس کو قرار دیا جائے گا۔اصل بات تو یہ ہے کہ اس بارہ میں ہم قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔اللہ تعالیٰ ہی اس کا فیصلہ کرے گا۔کچھ حضرات نے کہا کہ افضل ترین تابعی حضرت قیس بن ابی حازمؒ ہیں جنہوں نے عشرہ مبشرہ سے روایت کی ہے۔ تاہم بہت بڑی تعداد میں علمائے حدیث کا کہنا ہے کہ افضل التابعین حضرت سعید بن المسیب ہیں جنہوں نے طویل عرصہ تک حضرت ابو ہریرہؓ سے اور دیگر بہت سے صحابہ کرامؓ سے کسب فیض کیا۔ بعض کا خیال ہے کہ افضل التابعین یا سید التابعین حضرت اویس قرنی ہیں جن کا ذکر صحیح مسلم میں ہے اور رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے ان کا نام آیا ہے۔کچھ کا خیال ہے کہ حضرت عطا بن ابی رباحؒ افضل التابعین ہیں جو مکہ مکرمہ میں سالہا سال قرآن اور حدیث کا درس دیتے رہے اور مکہ مکرمہ میں رہنے والے صحابہ کرامؓ کی بڑی تعداد سے انہوں نے کسب فیض کیا۔کچھ کا خیال ہے

کہ افضل ترین تابعی حضرت قاسم بن محمدؒ ہیں جو سیدنا صدیق اکبرؓ کے پوتے اور ان کے بیٹے حضرت محمد بن ابوبکرؓ کے صاحبزادے ہیں۔ کچھ کا کہنا ہے کہ افضل ترین تابعی حضرت عروہ بن زبیرؒ ہیں جو حضرت عائشہؓ کے بھانجے ہیں جنہوں نے حضرت عائشہؓ سے بہت کسب فیض کیا اور جنہوں نے اسلام کی تاریخ میں سب سے پہلے سیرت پر کتاب لکھی ہے۔ سیرت پر سب سے پہلا علمی کام انہوں نے کیا جس میں انہوں نے اپنی خالہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایات سن کر جمع کیں اور ان کو ایک کتاب کی صورت میں مرتب کیا۔ وہ اپنی خالہ کے پاس جایا کرتے تھے، ان کے ہاں رہا کرتے تھے، خالہ نے ان کو بچپن سے رکھا اور ان کی تربیت کی اس لئے ان کے پاس جو علم تھا وہ بہت کم لوگوں کے پاس ہوسکتا ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ حضرت حسن بصریؒ افضل التابعین ہیں کچھ کا خیال ہے کہ محمد بن سیرینؒ افضل التابعین ہیں۔ کچھ کا خیال ہے کہ حضرت ابو ادریس الخولانیؒ ہیں۔ ابو ادریس الخولانی کا معاملہ بھی بالکل اسی طرح کا ہے جو حضرت عبدالرحمٰن الصنابحیؒ کا ہے۔ وہ حضورؐ کے زمانے میں اسلام لا چکے تھے لیکن مدینہ منورہ آنے کا موقع نہیں ملا۔ جب مدینہ منورہ آنے کا موقع ملا تو حضورؐ دنیا سے تشریف لے جا چکے تھے۔ اس لئے عمر کے اعتبار سے تو وہ صحابہ کرامؓ کے ہم سن تھے، البتہ منصب اور درجہ کے اعتبار سے وہ تابعین کے ہم سر ہیں۔

تابعی اور تبع تابعی کا تعین

یہ سارے معاملات کہ تابعین اور تبع تابعین کا تعین کیسے ہو۔ ان کا دارومدار اکثر و بیشتر ایک خاص فن پر ہے، جس پر علمائے حدیث نے بہت کام کیا۔ وہ ہے تواریخ الرواۃ، یہ ویسے تو ایک ہلکا اور مختصر موضوع معلوم ہوتا ہے لیکن یہ موضوع جلد ہی اتنا پھیل گیا اور اس پر اتنا مواد جمع ہوگیا کہ محدثین نے اس پر الگ الگ کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب کے بعد دوسری، پھر تیسری، پھر چوتھی۔ ایک بہت اہم کتاب اس موضوع پر امام بخاری کی کتاب التاریخ الکبیر ہے جو غالباً آٹھ جلدوں میں ہے۔ اس کے علاوہ اور لوگوں کی بھی اس پر کتابیں ہیں جن میں انہوں نے یہ پتہ چلانے کی کوشش کی کہ کن تابعی کا انتقال کس سن میں ہوا، کن تبع تابعی کا انتقال کس سن میں ہوا اور تبع تابعین کے شاگردوں میں کس کا انتقال کس سن میں ہوا۔ یہ بات جاننا اس لئے ضروری ہے کہ احادیث اور سندوں کی تحقیق میں بہت سے معاملات ایسے پیش آئے کہ اس تعین سے کسی

حدیث کے قابل قبول یا نا قابل قبول ہونے کا اندازہ ہو گیا۔

غالباً علامہ ابن الجوزی کے زمانے میں جو چھٹی صدی ہجری کا زمانہ ہے، شام کے کچھ یہودی کوئی دستاویز لے کر عباسی خلیفہ کے پاس آئے۔ دستاویز کافی پرانی معلوم ہوتی تھی۔ قدیم خط میں لکھی ہوئی تھی۔ انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ وہ دستاویز ہے جو رسول اللہ ﷺ نے فتح خیبر کے موقع پر ہمیں دی تھی۔ اس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ ہمیں فلاں فلاں معاملات سے مستثنیٰ کر دیا جائے گا۔ بہت سی مراعات کا اس میں ذکر تھا اور دعویٰ کیا گیا تھا کہ حضورؐ نے یہ یہ مراعات ہمیں دی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ مراعات حضورؐ کے زمانے تک ہمیں حاصل رہیں۔ لیکن بعد میں جب ہمیں خیبر سے جلاوطن کر کے شام بھیجا گیا تو یہ مراعات بھی ہم سے لے لی گئیں۔ لہٰذا آپ یہ مراعات ہمیں دوبارہ دیں۔ خلیفہ وقت نے وہ دستاویز اس زمانے کے سب سے بڑے محدث علامہ عبدالرحمٰن ابن الجوزی (جو صف اول کے محدثین میں سے تھے۔) کو بھیجی کہ بتائیں اس دستاویز کے بارے میں کیا فیصلہ کیا جائے؟ انہوں نے دستاویز سامنے رکھی اور اسے دیکھا تو پہلی ہی نظر میں معلوم ہو گیا کہ جعلی ہے۔ انہوں نے خلیفہ کو خط لکھا کہ یہ دستاویز جعلی ہے۔ لوگوں نے بڑی حیرت کا اظہار کیا کہ حضور ﷺ سے منسوب ایک دستاویز آئی ہے، خاصی پرانی ہے جس پر صحابہ کرامؓ کی گواہیاں ہیں اور آپ نے ایک ہی نظر دیکھنے کے بعد کہہ دیا کہ جعلی ہے۔ خلیفہ نے علامہ ابن الجوزی کو بلایا کہ ذرا تشریف لائیے۔ وہ آئے تو پوچھا کہ آپ کس بنیاد پر یہ بات کہہ رہے ہیں کہ دستاویز جعلی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس دستاویز میں لکھا ہوا ہے کہ اس کے گواہان میں حضرت معاویہؓ اور حضرت سعد بن معاذؓ بھی شامل ہیں اور دعویٰ یہ کیا جا رہا ہے کہ یہ دستاویز رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کو فتح خیبر کے موقع پر عطا کی۔ غزوہ خیبر سن 6ھ میں ہوا تھا۔ سن 6ھ تک حضرت معاویہؓ اسلام قبول کر کے مدینہ منورہ نہیں آئے تھے۔ وہ فتح مکہ سے پہلے اور صلح حدیبیہ کے بعد اسلام لانے والے صحابہ میں سے ہیں۔ غزوہ خیبر کے وقت حضرت معاویہؓ مسلمان ہی نہیں ہوئے تھے لہٰذا اس وقت ان کا خیبر جانا اور اس معاہدہ پر بطور صحابی رسول مسلمانوں کی طرف سے دستخط کرنا خارج از امکان ہے۔ اسی طرح حضرت سعد بن معاذؓ کا انتقال غزوہ احد کے وقت ہو گیا تھا۔ وہ غزوہ احد میں شدید زخمی ہو گئے تھے اور اس کے فوراً بعد انہی زخموں کی وجہ سے کچھ ہی دن میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ بھی غزوہ خیبر کے موقع پر اس وقت دنیا میں موجود نہیں تھے، لہٰذا ان

دو جعلی گواہیوں سے پتہ چلا کہ دستاویز جعلی ہے۔ یہ فائدہ ہے صحابہ کرامؓ، تابعین اور تبع تابعین اور بقیہ راویوں کے سن پیدائش اور سن وفات کا تعین کرنے کا۔

امام سفیان ثوری جو بڑے مشہور محدث ہیں وہ یہ کہتے ہیں (اور یہ قول کئی کتابوں میں نقل ہوا ہے) کہ 'لما استعمل الرواۃ الکذب' جب راویوں نے جھوٹ سے کام لینا شروع کیا 'استعملنا لھم التاریخ' تو ہم نے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے تاریخ کا استعمال شروع کر دیا۔ یعنی ہمیں تاریخ کے استعمال سے پتہ چل جاتا ہے کہ کون کس زمانے میں زندہ تھا اور اس سے کس کی روایت ممکن ہے اور کس کی روایت ممکن نہیں ہے۔

حضرت خالد بن معدان مشہور تابعی ہیں، ان کی وفات 104ھ میں ہوئی تھی، ان سے ایک صاحب نے کوئی حدیث روایت کی اور دعویٰ کیا کہ سن 108ھ میں آرمینیا کی جنگ میں میں نے ان سے یہ حدیث لی تھی۔ ایک مجلس میں ایک صاحب احادیث بیان کر رہے تھے۔ دوران روایت انہوں نے بیان کیا کہ مجھ سے ایک بڑے ثقہ راوی نے یہ اور یہ بیان کیا ہے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ یہ ثقہ راوی کون ہیں۔ انہوں نے پھر کہا کہ ثقہ راوی نے بیان کیا ہے۔ بار بار اصرار کیا گیا کہ اس ثقہ راوی کا نام بتائیں۔ تو انہوں نے کہا کہ خالد بن معدان نے بیان کیا تھا۔ پوچھنے والے نے پوچھا کہ آپ نے کس سن میں ان سے یہ روایت لی تھی؟ انہوں نے بتایا کہ 108ھ میں۔ پوچھا گیا: کس جگہ؟ تو انہوں نے بتایا کہ وہ آرمینیا کی جنگ میں شریک تھے۔ جو محدث یہ سوالات کر رہے تھے انہوں نے کہا کہ یہ روایت سراسر جعلی ہے، اس لئے کہ خالد بن معدان کا انتقال 104ھ میں ہو گیا تھا اور وہ آرمینیا کی جنگ میں نہیں بلکہ روم کی جنگ میں شریک ہوئے تھے۔

ایک اور راوی تھے ابو خالد السقاء، انہوں نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے حضرت انسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے۔ یہ دعویٰ انہوں نے سن 209ھ میں کیا۔ امام ابُونعیم اصفہانی جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے، وہ وہاں موجود تھے۔ انہوں نے پوچھا کہ آپ کی عمر کیا ہے۔ ابو خالد انہوں نے جواب دیا کہ 125 سال ہے۔ حضرت ابونعیم نے کہا کہ پھر آپ کی پیدائش سے پانچ سال پہلے حضرت عبداللہ بن عمرؓ وفات پا چکے تھے۔ ویسے بھی 209ھ بہت ہی صغار تابعین کا زمانہ ہے۔ یہ اوساط تابعین کا زمانہ نہیں ہے۔ تابعین کا زمانہ صحابہ کرامؓ کے زمانے سے کم و بیش اسی نوے سال کے بعد تک کا ہے۔ صحابہ کا آخری دور 110ھ تک ہے۔ اس کے بعد اسی یا نوے سال

لگائیں تو تقریباً 190 یا 200ھ کے لگ بھگ بیشتر تابعین کا زمانہ ختم ہو گیا۔

ان معلومات کا بیشتر ذخیرہ امام بخاری، حضرت علی بن المدینی، ابوحاتم رازی اور امام نسائی کی کتابیں ہیں۔ان میں سب سے بڑا ماخذ حضرت امام بخاری کی کتاب التاریخ الکبیر ہے جو آٹھ جلدوں میں ہے۔

ان راویوں کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کا تعین کرنے کے ساتھ ساتھ اور ان کے ضبط، حافظہ، عدالت اور کردار کا تعین کرنے کے ساتھ ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی پیدا ہوا کہ ان کی رشتہ داریوں پر بھی بحث کی جائے اور یہ پتہ چلایا جائے کہ کون کس کا بھائی تھا اور کون کسی کی بہن تھی وغیرہ وغیرہ۔اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اگر ایک راوی، مثلاً ایک تابعی راوی کے دو بیٹے ہوں۔ایک بیٹا بہت باکردار اور سچا راوی ہو اور دوسرا بیٹا اس درجہ کا نہ ہو، اور روایت اس طرح کی جائے کہ ابن فلاں نے روایت کی تو یہ جاننا بہت ضروری ہوگا کہ یہاں ابن فلاں سے کون سا بیٹا مراد ہے۔ پہلا بیٹا مراد ہے کہ دوسرا بیٹا مراد ہے۔اگر ایک ہی بیٹا ہے تو پھر تو ابن فلاں کی روایت قبول کرنے میں کوئی شک اور تامل نہیں ہے۔لیکن اگر دو بیٹے ہیں تو پھر تحقیق کرنی پڑے گی کہ کون سے بیٹے کی روایت ہے اور اس بیٹے کا درجہ کیا تھا۔اس تحقیق کی ضرورت وہاں ہوگی جہاں یہ ثابت ہو جائے کہ کسی راوی کے دو یا تین یا چار بیٹے تھے۔ یہی حال بہنوں کا ہے۔ مثلاً عمرہ بنت عبدالرحمٰن ایک انتہائی مستند راویہ ہیں۔انہوں نے احادیث کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا تھا۔عمرہ بنت عبدالرحمٰن سے روایت کرنے والی ان کی صاحبزادی ہوں، مثال کے طور پر فرض کریں کہ ان کی دو بیٹیاں ہوں اور آپ کے پاس آکر کوئی کہے کہ بنت عمرہ نے یہ روایت کی ہے۔اب بنت عمرہ سے مراد کون سی بیٹی ہے؟ وہ بیٹی جس کا حافظہ اور کردار اچھا تھا یا وہ بیٹی جس کا حافظہ اچھا نہیں تھا۔اس تحقیق کی ضرورت تب پیش آئے گی جب یہ پتہ ہو کہ عمرہ کی دو صاحبزادیاں راویات تھیں۔اس موضوع پر امام مسلم نے ایک کتاب لکھی تھی علم الاخوہ والاخوات ۔امام ابوداؤد نے، امام نسائی نے اور امام بخاری کے استاد علی بن المدینی نے بھی اس موضوع پر الگ سے کتابیں لکھیں۔

ایک اور چیز جس کا مختصر تذکرہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔ وہ حدیث ضعیف کی تفصیل، واقفیت اور معرفت ہے۔علم حدیث میں جو مشکل ترین میدان ہے وہ حدیث ضعیف کا تعین ہے۔

محدثین نے حدیث ضعیف کے بہت سے درجات بتائے ہیں۔ بعض حضرات بیالیس یا تنتالیس درجات بتاتے ہیں۔ بعض نے چونسٹھ پینسٹھ اور بعض نے اس سے بھی زیادہ بتائے ہیں۔ چالیس سے لے کر سو کے قریب قسمیں حدیث ضعیف کی بتائی گئی ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کے الگ احکام ہیں اور ہر ایک کا الگ درجہ ہے۔ لیکن ایک بات پر سب متفق ہیں کہ 'مراتب الضعف متفاوتة' کہ ضعف کے درجات متفاوت ہیں۔ یعنی ان احادیث میں ضعف کے اعتبار سے کمی بیشی ہوسکتی ہے۔ ایک ضعف کم درجہ کا ہوگا، دوسرا ضعف زیادہ درجہ کا ہوگا۔ زیادہ ضعف میں بھی پھر کئی درجات ہوسکتے ہیں۔ بعض اوقات کسی حدیث میں ضعف کا ایک سبب ہوگا، بعض اوقات ایک سے زائد اسباب ہوں گے۔ کچھ اسباب ہلکے ہوں گے اور کچھ سنجیدہ قسم کے ہوں گے۔ اس لئے اسباب ضعف اور مراتب پر بھی بحث ضروری ہے۔ ان میں سے بعض پہلوؤں کا اختصار کے ساتھ بیان میں کر چکا ہوں۔ اب دوہرانے کی ضرورت نہیں۔

ضعیف حدیث پر عمل

کیا حدیث ضعیف پر عمل کیا جانا چاہئے؟ یا نہیں کیا جانا چاہئے۔ اس کے بارے میں اہل علم میں تین نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ یہاں جب میں اہل علم کا لفظ استعمال کر رہا ہوں تو اس سے مراد محدثین بھی ہیں، فقہائے کرام بھی ہیں اور وہ حضرات بھی ہیں جو بیک وقت محدثین بھی ہیں اور فقہا بھی ہیں۔ مثلاً امام شافعی اور امام مالک وغیرہ۔ وہ حضرات بھی مراد ہیں جو صرف محدث ہیں مثلاً امام نسائی یا امام علی بن المدینی یا امام ابوحاتم رازی۔ اسی طرح وہ حضرات بھی یہاں مراد ہیں جن کی شہرت صرف فقیہ کی ہے، مثلاً امام ابوحنیفہ۔ ان سب نقطہ ہائے نظر کو تین اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

ا۔ ایک نقطۂ نظر وہ ہے جو اکثر و بیشتر ان حضرات کا ہے جو صرف محدث ہیں۔ یا علم حدیث میں زیادہ نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ 'لایعمل به مطلقاً' کہ حدیث ضعیف پر مطلقاً عمل نہیں کرنا چاہئے، نہ احکام میں نہ فضائل میں نہ کسی اور چیز میں۔ اس لئے کہ جس بات یا قول کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ اس کی نسبت رسول اللہ ﷺ سے کمزور ہے۔ ایسی بات کی نسبت حضورؐ سے کرنا ایک اعتبار سے رسول اللہ ﷺ سے غلط چیز منسوب کرنے کے

مترادف ہے۔ جب اس کی نسبت ہی کچی ہے تو حضورؐ سے آپ کیسے اس کو منسوب کر سکتے ہیں اور بطور حدیث رسول اس پر کس طرح عمل کر سکتے ہیں۔ یہ نقطۂ نظر امام یحیٰ بن معین، امام بخاری، امام مسلم اور امام ابن حزم کا ہے۔ ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ اگر کسی حدیث کا ضعیف ہونا ثابت ہو گیا تو اس پر عمل درآمد نہیں ہوگا۔

۲۔ ایک دوسرا نقطۂ نظر درمیانہ درجہ کے کچھ لوگوں کا ہے یعنی ان حضرات کا جو حدیث اور فقہ دونوں میں دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ضعیف حدیث پر عمل کیا جائے گا 'یعمل بہ مطلقاً' ہر حال میں عمل کیا جائے گا۔ یہ رائے امام ابوداؤد اور امام احمد بن حنبل سے منسوب ہے۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ حدیث ضعیف بھی اگر مل جائے تو وہ ہماری تمہاری رائے سے زیادہ بہتر ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اپنی یا کسی انسان کی رائے پر عمل کریں اس سے بہتر ہے کہ حدیث ضعیف پر عمل کر لیں۔ اگر رسول اللہ ﷺ سے منسوب ایک چیز موجود ہے اگر چہ اس کی نسبت کمزور ہے، لیکن پھر بھی اس پر عمل کیا جانا چاہئے۔ یہ ایک طرح سے عاشقانہ اور ایک والہانہ قسم کی بات ہے۔

۳۔ تیسرا نقطۂ نظر جو اکثر ائمہ فقہا کا نقطۂ نظر ہے اور محدثین میں سے بھی بعض حضرات کا یہی نقطۂ نظر ہے۔ وہ یہ ہے کہ فضائل کے باب میں حدیث ضعیف پر کچھ شرائط کے ساتھ عمل کیا جائے گا۔ یہ شرائط اگر موجود ہوں تو فضائل، مناقب اور دعاؤں کے باب میں اس پر عمل کیا جائے گا۔ پہلی شرط یہ ہے کہ اس حدیث ضعیف سے نہ کوئی حلال حرام ثابت ہوتا ہو نہ کوئی حرام حلال ثابت ہوتا ہو اور نہ اس سے شریعت کا کوئی حکم ثابت ہوتا ہو۔ یعنی حکم شرعی اور حلال و حرام جیسے معاملات حدیث ضعیف کی بنیاد پر طے نہیں ہو سکتے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ حدیث ترہیب یا ترغیب کے موضوع پر ہو۔ یعنی اس میں کسی نیک کام کی ترغیب دلائی گئی ہو یا کسی برے کام کے انجام سے ڈرایا گیا ہو۔ اس میں ایک بات یاد رکھئے گا کہ کسی فعل کا اچھا فعل ہونا اس سے ثابت نہیں ہوگا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی ضعیف حدیث میں یہ بتایا گیا ہو کہ فلاں فعل اچھا ہے اس کو اختیار کرو اور آپ اس ضعیف حدیث کی بنیاد پر اس فعل کو اچھا فعل قرار دے دیں۔ بلکہ وہ فعل جس کا اچھا ہونا پہلے سے ثابت ہو اس فعل کی ترغیب دلائی گئی ہو اور کسی ایسے فعل کے انجام سے ڈرایا گیا ہو جس کا برا ہونا پہلے سے ثابت ہو۔ اس کا انجام بتایا گیا ہو۔ تیسری شرط یہ ہے کہ اس کا

ضعف بہت سخت درجہ کا نہ ہو۔ شدید درجہ کا نہ ہو۔ یہ تین شرائط تو وہ ہیں جو ان تمام محدثین کے نزدیک ضروری ہیں جو حدیث ضعیف پر عمل کرنے کو جائز سمجھتے ہیں۔ بقیہ دو شرائط حافظ ابن حجر عسقلانی نے اضافہ کی ہیں۔ وہ بھی اس کے قائل ہیں کہ حدیث ضعیف پر عمل کیا جانا چاہئے۔ ان کے نزدیک ایک شرط یہ ہے کہ اس حدیث میں کسی عمل کی جو فضیلت ثابت ہو رہی ہو وہ شریعت کے کسی طے شدہ اصول کے تحت آتی ہو تو پھر اس پر عمل درآمد کیا جائے گا۔ مثال کے طور پر شریعت میں نفل نمازوں کی کثرت کو پسند کیا گیا ہے، اور ہر مشکل اور پریشانی کے موقعہ پر نماز کی تلقین کی گئی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔ صحیحین کی روایات میں آیا ہے کہ 'کان رسول اللہ ﷺ اذا حزبہ امر بادر الی الصلوٰۃ' جب کوئی مشکل مرحلہ پیش آتا تھا تو رسول اللہ ﷺ فوراً نماز کی طرف رجوع فرماتے تھے۔ لہٰذا نوافل ادا کرنا اور ایسے خاص مواقع پر نماز پڑھنا یہ اسلام کا ایک اصل اور طے شدہ اصول ہے۔ اب اگر کوئی حدیث ضعیف ہے جو کسی خاص موقع پر نماز کی تلقین کرتی ہے تو اس پر عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اس لئے کہ ایسا کرنا دوسری عمومی روایات سے ثابت ہے۔

دوسرا اصول جو حافظ ابن حجر بتاتے ہیں وہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی ضعیف حدیث پر عمل کر رہا ہو تو یہ سمجھ کر کرے کہ یہ ثابت شدہ حدیث نہیں ہے، بلکہ احتیاطاً اس پر عمل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ احتیاط کا تقاضا ہے کہ اس پر عمل کر لیا جائے، تاکہ حضور ﷺ کا کوئی ارشاد بغیر عمل کے باقی نہ رہے۔ یہ شرط حافظ ابن حجر عسقلانی نے بیان کی ہے جو حدیث ضعیف پر عمل کرنے کو لازمی سمجھتے ہیں۔ گویا حدیث ضعیف پر عمل کرنے کے بارے میں تین نقطۂ نظر ہیں اور یہ تینوں امت میں ہر دور میں پائے جاتے رہے ہیں۔

یہ جو بعض بہنیں بار بار شب برات کے بارے میں پوچھتی ہیں تو اس تفصیل میں اس سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے۔ شب براۃ کی راویت ضعیف ہے۔ جو حضرات سمجھتے ہیں کہ ضعیف حدیث پر عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ نوافل ادا کرنا اور تلاوت کلام پاک کرنا ویسے بھی افضل ہے لہٰذا اگر کسی خاص موقع پر تلاوت کلام پاک کر لی جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ روزہ اگر نفلی رکھا جائے تو ویسے بھی سنت ہے اور اچھی بات ہے۔ لہٰذا اگر کوئی پندرہ شعبان کو روزہ رکھ لے تو کوئی حرج نہیں۔ گویا وہ تمام شرائط جو حافظ ابن حجر اور باقی محدثین بتاتے ہیں وہ ساری اس میں شامل

ہیں۔اس لئے اگر کوئی شخص عمل کرتا ہو تو اس پر اعتراض نہ کریں۔

جو حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ حدیث ضعیف پر عمل نہیں کرنا چاہئے مثلاً علی بن المدینی اور اس طرح ان کے ہم مسلک دوسرے حضرات اس پر متفق ہیں کہ اس پر عمل نہ کریں۔ جو حضرات سمجھتے ہیں کہ حدیث ضعیف پر ہر صورت میں عمل کرنا چاہئے ان میں سے بہت سے عمل کر رہے ہیں۔آپ کا نقطۂ نظر کوئی پوچھے تو آپ بیان کر دیجئے کہ ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے۔ اس کے دلائل پوچھے تو وہ بھی بیان کر دیجئے۔لیکن ان معاملات میں جن میں صحابہ کرامؓ اور تابعین کے زمانہ سے امت میں ایک سے زائد آرا چلی آ رہی ہیں امت میں تفریق پیدا نہیں کرنی چاہئے۔ امت کی وحدت اور اتفاق قرآن پاک کی نص قطعی سے ثابت ہے۔قطعی الدلالت اور قطعی الثبوت ہے کہ 'ان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ '۔سنت کے قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت نصوص سے ثابت ہے کہ امت کی وحدت کا تحفظ کرنا چاہئے۔لہٰذا اس طرح کے اختلافی معاملہ میں جہاں تابعین کے زمانہ سے متعدد آراء چلی آ رہی ہوں، اور بڑے بڑے محدثین اور بڑے بڑے علما کے نقطہ ہائے نظر تین طرح کے پائے جاتے ہیں تو ایسے معاملات میں نکیر نہیں کرنی چاہئے۔آج بھی اگر وہ تین آراء موجود ہوں تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ اس کی بنیاد پر اگر کوئی اختلاف ایسا پیدا نہیں ہونا چاہئے کہ جس سے امت میں کوئی تفریق ہو جائے۔

ضعیف حدیث سے متعلق ایک دو مسائل اور ہیں جو علم حدیث کے طلبہ کو خاص طور پر یاد رکھنے چاہئیں۔مثال کے طور پر اگر آپ کوئی کتاب پڑھ رہی ہوں۔فرض کریں کہ آپ جامع ترمذی پڑھ رہی ہوں یا ابو داؤد کی سنن کا مطالعہ کر رہی ہوں۔اور پڑھتے پڑھتے آپ کو حاشیہ میں کسی کی تعلیق یا حاشیہ نظر آئے کہ'ضعیف' کہ یہ حدیث ضعیف ہے تو اس کے بارے میں فوراً یہ فیصلہ نہ کیجئے کہ یہ حدیث ہر اعتبار سے اور کلیۃً ضعیف ہے۔اس لئے کہ جب محدثین یہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے تو ان کی مراد وہ طریقہ یا وہ روایت یا وہ راستہ ہوتی ہے جس سے وہ بیان ہوئی ہے۔اس روایت میں طریقہ بھی شامل ہے اور متن بھی شامل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس روایت یا اس سند کو کمزور کہہ رہے ہوں اور متن کمزور نہ ہو۔بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث ایک سند سے قوی اور صحیح ہے اور دوسری سند سے ضعیف ہے۔اب اگر محدث ایک سند کو ضعیف قرار دے رہا ہے تو ضروری نہیں کہ متن بھی ضعیف ہے۔یہ تحقیق کرنی چاہئے کہ بقیہ طرق

سے بھی یہ متن جو پہنچا ہے تو سارے طرق ضعیف ہیں یا بعض طرق ضعیف ہیں اور بعض قوی ہیں۔ پھر اگر سارے کے سارے طرق ضعیف ثابت ہوں تو پھر اس کا حتمی درجہ مقرر کیا جائے گا۔ اگر بہت سارے طرق ضعیف مل جائیں اور ان سب میں ضعف الگ الگ قسم کا ہو تو پھر اس حدیث کا درجہ عام ضعیف سے مختلف ہوگا۔

یہ ایک لمبی بحث ہے۔ میں اگر مثالیں دوں گا تو بات اور بھی لمبی ہو جائے گی۔ ضعف الگ الگ قسم کا ہو اور مختلف درجات اور مراتب میں ضعف ہو تو وہ ایک دوسرے کو منجبر کر دیتا ہے یعنی یہ دو قسم کا ضعف ایک دوسرے کو compensate کر دیتا ہے۔ پھر وہ حدیث حسن کے درجہ پر پہنچ جاتی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ سب جگہ پر ایک ہی درجہ اور ایک ہی قسم کا ضعف ہے تو وہ حدیث ضعیف ہے۔ فرض کریں ایک حدیث روایت ہوئی جس میں راوی الف نے بیان کیا کہ انہوں نے راوی ب سے یہ حدیث سنی، راوی ب نے بیان کیا کہ انہوں نے راوی ج سے سنی، راوی ج بیان کرے کہ انہوں نے راوی د سے سنی، راوی د بیان کرتا ہے کہ انہوں نے فلاں صحابیؓ سے سنی اور فلاں صحابیؓ نے رسول اللہ ﷺ سے سنی۔ اب راوی د جو ہیں ان کی روایت یا سماع کسی صحابیؓ سے ثابت نہیں ہے اور وہ مثال کے طور پر تابعین میں سے نہیں ہیں۔ اب اگر بعد میں کوئی اور سند ایسی دستیاب ہو جائے جس میں ایک تابعی اسی حدیث کو کسی اور صحابیؓ سے روایت کرتے ہیں جن سے ان کی ملاقات ثابت ہے تو پھر یہ حدیث صحیح ہوگی اور جو کمزوری تھی وہ دور ہوگئی۔ گویا وہ خاص سند کمزور تھی، لیکن چونکہ متن دوسری صحیح سندوں سے بھی آیا ہے اس لئے متن اپنی جگہ درست قرار پا گیا۔ اس کے بارہ میں سمجھا جائے گا کہ اس کمزور روایت سے جو متن آیا ہے وہ حسن لغیرہ ہے۔ لیکن دوسری روایت سے جو آیا ہے وہ صحیح ہے۔

اگر تحقیق سے یہ پتہ چلے کہ جہاں جہاں تابعی سے صحابیؓ کا سلسلہ جڑنا بیان کیا جاتا ہے وہاں یہ خلا پایا جاتا ہے۔ یا تو یہی ایک راوی ہو جو مختلف صحابہ سے بیان کرتا ہے اور اس کی ملاقات کسی صحابیؓ سے ثابت نہیں تو اس کا درجہ بہت نیچے چلا جائے گا۔ اس کو متہم بالکذب کہا جائے گا، جو موضوع سے ایک درجہ اونچا ہے اور جو ضعف کی سب سے نچلی قسم ہے۔ اگر کچھ تابعین ایسے ہیں جن کی روایت صحابہ کرامؓ سے ممکن ہے یا ثابت ہے تو پھر سمجھا جائے گا کہ ضعف ذرا اونچے درجے کا ہے۔ اس لئے کسی حدیث کو حتمی طور پر ضعیف قرار دینے میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہئے۔

یہ بات بتانا میں نے اس لئے ضروری سمجھی کہ بعض محدثین نے علم حدیث کی الگ الگ کتابوں کا جائزہ لے کر ان کی روایات کو بالکل ایک ایک کر کے یہ تعین کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کا درجہ صحیح کا ہے، ضعیف کا ہے یا موضوع کا ہے۔ کسی حدیث کا موضوع ہونا تو واضح ہے۔ لیکن جب وہ کسی روایت کو صحیح یا حسن یا ضعیف قرار دیتے ہیں تو وہ صرف اس روایت کو ضعیف وغیرہ قرار دے رہے ہوتے ہیں جو اس طریق سے اس کتاب میں بیان ہوئی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ متن اگر مثلاً صحیح بخاری میں کسی اور طریق سے آیا ہو تو وہ بھی ضعیف ہو، وہ طریق ظاہر ہے ضعیف نہیں ہوگا۔ یہ وضاحت میں نے اس لئے کی کہ میں نے بہت سے لوگوں کو خود سنا ہے کہ ان کے سامنے ایک حدیث بیان ہوئی اور انہوں نے فوراً چھوٹتے ہی کہہ دیا کہ یہ حدیث ضعیف ہے، اس لئے کہ فلاں بزرگ نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ وہ دراصل بھول جاتے ہیں کہ جو ضعیف ہے وہ اس روایت کے ساتھ اس کتاب میں ضعیف ہے۔ لیکن اگر وہی روایت کسی اور روایت اور سند سے کسی اور کتاب میں آئی ہے تو ضروری نہیں کہ وہ بھی ضعیف ہو، ہوسکتا ہے کہ صحیح ہو، ہوسکتا ہے کہ حسن ہو، حسن لعینہ ہو یا حسن لغیرہ ہو، بہرحال حتمی رائے دینے سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہئے۔

چنانچہ حدیث کی وہ قسم جو ضعیف سند سے لوگوں تک پہنچی ہو لیکن اس کا ضعف ذرا ہلکی قسم کا ہو۔ جب آپ اس حدیث کو کسی جگہ بیان کریں اور آپ کے علم میں ہو کہ یہ حدیث ضعیف ہے تو بہترین طریقہ یہ ہے اور ذمہ داری کا تقاضا بھی ہے کہ یہ بیان کر دیں کہ یہ ضعیف حدیث ہے۔ لیکن اس ضعیف حدیث میں فلاں بات ارشاد فرمائی گئی ہے جو بظاہر درست ہے اس لئے اس پر عمل کرنا چاہئے۔ بہت سے لوگ اس بات کا اہتمام نہیں کرتے، کیوں نہیں کرتے، اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے ان کو کم از کم اتنا ضرور کرنا چاہئے اور اس پر محدثین نے زور دیا ہے کہ وہ یہ نہ کہیں کہ قال رسول اللہ ﷺ، رسول اللہ ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی۔ بلکہ اگر اس کو بیان کرنا ہی ہو تو صرف یہ کہنے پر اکتفا کریں کہ روایت میں آتا ہے کہ یہ بات ارشاد فرمائی گئی۔ یا بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ حضورؐ نے یہ بات ارشاد فرمائی، یا حضورؐ سے یہ منسوب ہے کہ آپؐ نے یہ بات ارشاد فرمائی، یا فلاں کتاب میں اس طرح آیا ہے، ترمذی شریف میں آیا ہے کہ فلاں کام اس طرح ہے۔ اس طرح آپ براہ راست رسول اللہ ﷺ سے نسبت کرنے سے بچ جاتے ہیں اور یوں ایک کمزور چیز کی نسبت حضورؐ سے نہیں ہو سکے گی۔

بعض محدثین اتنے اونچے درجے کے ہیں کہ ان سے اونچا درجہ علم حدیث میں اللہ نے بہت کم لوگوں کو عطا فرمایا۔ ان میں سے ایک امام یحیٰ بن معین ہیں۔ امام احمد بن حنبل ہیں، امام ابوزرعہ ہیں، امام بخاری ہیں۔ یہ لوگ بڑے اونچے درجہ کے ائمہ حدیث ہیں۔ جب اتنے اونچے درجہ کے محدث یہ کہیں کہ لا اعرف ھذا الحدیث' کہ میں اس حدیث سے واقف نہیں، یا مجھے نہیں پتہ کہ یہ حدیث کیا ہے، تو پھر اس بات کے باور کرنے کے قوی امکانات ہیں کہ یہ حدیث صحیح یا حسن نہیں ہے، یا تو بالکل ہی ضعیف ہے یا موضوع ہے۔ لیکن کیا محض کسی ایک محدث کے کہنے سے ہم یہ کہہ دیں کہ حدیث موضوع ہے؟ یہ بھی احتیاط کے خلاف ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں بڑے محدث نے اس حدیث کے جاننے سے انکار کر دیا ہے، لہٰذا یہ کمزور روایت معلوم ہوتی ہے، اس میں احتیاط سے کام لینا چاہئے اور از سر نو تحقیق کر لینی چاہئے۔

علل حدیث

یہ علم حدیث کا ایک اور اہم میدان ہے جو بڑا مشکل ہے، میں اس کی تفصیلی مثالیں دینا چاہتا تھا۔ لیکن ایک مثال دینے کے لئے بھی بڑی تفصیلی گفتگو چاہئے، امام ابوحاتم رازی کی کتاب 'علل الحدیث' دو جلدوں میں چھپی ہوئی موجود ہے میں آج وہ ہمراہ لانا چاہتا تھا لیکن پھر اس لئے نہیں لایا کہ کتاب سامنے رکھ کر علل پر گفتگو شروع کی تو بات بہت لمبی ہو جائے گی اور باقی موضوعات رہ جائیں گے، علل الحدیث سے مراد کسی حدیث میں متن یا سند کے اعتبار سے وہ کمزوری ہے جس کا عام طالب حدیث یا عالم حدیث کو پتہ نہ چلے اور جس کا پتہ چلانے کے لئے بڑی گہری بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ہے خلاصہ علل الحدیث کا اور سب سے مشکل فن علم حدیث میں یہی ہے۔ یہاں ایک بات یاد رکھنی چاہئے۔ محدثین نے لکھا ہے کہ 'الحدیث الصحیح لا یعلل بالضعیف' یعنی ایک حدیث جو ویسے تو حدیث صحیح ہے، روایت کے اعتبار سے بھی صحیح ہے، سند اور متن کے اعتبار سے بھی صحیح ہے، درایت کے اعتبار سے بھی صحیح ہے اور آپ نے ان سب پہلوؤں سے تحقیق کرنے کے بعد یہ حتمی نتیجہ نکال لیا کہ یہ صحیح حدیث ہے۔ اب اسی موضوع پر کوئی کمزور یا معلل حدیث آپ کے سامنے آئی تو اس حدیث کے معلل ہونے کی وجہ سے پہلے سے صحیح ثابت شدہ اُس حدیث پر اثر نہیں پڑے گا، بلکہ اُس کے صحیح ہونے کی وجہ سے اس

معلل یا ضعیف حدیث کی علت دور ہو جائے گی۔ کمزور قوی کو متاثر نہیں کر سکتا، البتہ قوی کمزور کو متاثر کر سکتا ہے۔ یہ بدیہی اور ایک عقلی بات ہے۔

علم حدیث کے آداب

علم حدیث پر جن حضرات نے کتابیں لکھی ہیں ان میں علامہ خطیب بغدادی کی دو کتابیں بھی شامل ہیں۔ آپ میں سے جو لوگ عربی جانتے ہیں وہ ضرور یہ دونوں کتابیں پڑھیں۔ ان میں یہ بتایا گیا ہے کہ حدیث پڑھنے والوں کو کن آداب کی پیروی کرنی چاہئے۔ کل میں نے سفر یعنی رحلہ کے آداب کا ذکر کیا تھا۔ لیکن خود علم حدیث کے پڑھنے میں کن آداب کی پیروی کرنی چاہئے، محدث کے آداب کیا ہیں، طالب حدیث کے آداب کیا ہیں، لکھنے والے کے آداب کیا ہیں، املا کے آداب کیا ہیں، املا لینے اور دوسروں کو املا دینے کے آداب کیا ہیں۔ ایک تو مستملی وہ ہے جو شیخ سے املا لے کر آگے لوگوں کو بتا رہا ہے، اور دوسرا مستملی وہ ہے جو خود اپنے لئے لکھ رہا ہے، دونوں کے الگ الگ آداب ہیں اور اس پر الگ الگ کتابیں ہیں۔ امام خطیب بغدادی کی دو کتابیں اہم ہیں 'الکفایہ فی علم الروایۃ' اور 'الجامع فی آداب الراوی و اخلاق السامع' ان میں انہوں نے راوی اور سامع کے آداب بتائے ہیں۔ الجامع دو جلدوں میں ہے اور الکفایہ ایک ضخیم جلد میں ہے۔ ان دونوں کتابوں میں انہوں نے جو آداب بتائے ہیں ان کی تلخیص امام غزالی نے احیاء العلوم میں کی ہے جس کے اردو اور انگریزی دونوں تراجم ملتے ہیں۔ انگریزی ترجمہ جو ہمارے ملک میں چھپا ہے، بڑا ناقص ہے اس کو بھی آپ دیکھنا چاہیں تو دیکھ لیں، اس میں آپ کو آداب مل جائیں گے۔ اس لئے میں اس کا حوالہ دے کر اس بات کو یہیں چھوڑ دیتا ہوں۔ اسی طرح کی ایک کتاب علامہ سمعانی کی ہے جس میں انہوں نے 'آداب الاملاء و الاستملاء' بیان کئے ہیں، کہ املا کے آداب کیا ہیں اور استملا کے آداب کیا ہیں اور جو شخص املا لے کر آگے بیان کرے گا، یعنی مستملی، اس کے آداب کیا ہیں۔ اس کے علاوہ طالب حدیث کے آداب کیا ہیں ان کا خلاصہ بھی امام غزالی نے دیا ہے وہاں سے دیکھ لیں۔

درس حدیث کی اقسام

ابتدا ہی سے حدیث پڑھانے کے تین انداز اور اسالیب مروج رہے ہیں۔ اور یہ بڑی

عجیب بات ہے۔ جب میں نے پہلی مرتبہ ان کے بارے میں پڑھا تو مجھے بہت حیرت ہوئی اور کسی حدتک وہ حیرت آج بھی موجود ہے۔ ان تینوں طریقوں کا بہت سے اہل علم نے ذکر کیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے استاد تھے شیخ ابوطاہر الکردی، جب آخر میں اپنی سند بیان کروں گا تو ان کا بھی نام آئے گا۔ اس لئے بالواسطہ طور پر وہ میرے بھی استاد ہیں۔ انہوں نے بھی ان تین طریقوں کی تفصیل بیان کی ہے۔

ان ایک طریقہ ہے السرد کا۔ سرد کے معنی ہیں بیان کرنا یعنی **simple naration** ۔ یہ طریقہ اہل علم کے لئے ہے، یعنی وہ لوگ جو حدیث کا اچھا علم رکھتے ہیں۔ اس طریقہ کے تحت شیخ کا کام یہ ہے کہ وہ حدیث کو بیان کرتا جائے، خود پڑھ کر سنائے یا طالب علم سے پڑھوا کر سنے، یا ایک طالب علم پڑھے اور بقیہ طلبہ سنیں، یا ایک ایک کر کے سب سنائیں، یہ طریقہ سرد کہلاتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر شیخ کا اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ اس نے ایک کتاب پڑھ کر سنائی اور آپ کو اجازت دے دی۔ یا آپ نے پڑھ کر سنائی۔ اس نے سن کر آپ کو اجازت دے دی۔ یا ایک ایک کر کے سب نے پڑھ کر سنائی اور سب کو اجازت دے دی۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ یہ طریقہ علما اور خواص کے ساتھ مخصوص ہے اس لئے کہ وہ پہلے سے علم حدیث پڑھ چکے ہیں۔ علم حدیث کے معانی اور مطالب کو جانتے ہیں۔ علمی سطح پر اس درجہ کے لوگ ہیں کہ علم حدیث کے سارے مباحث ان کے سامنے ہیں۔

۲۔ دوسرا طریقہ کہلاتا ہے طریق الحل والبحث۔ یعنی حدیث کی مشکلات حل کرنے اور مسائل پر بحث کرنے کا طریقہ۔ کہتے ہیں کہ یہ طریقہ حدیث کے طلبہ کے لئے ہے اور جو حدیث کے طلبہ ہوں ان کے لئے یہی طریقہ ہونا چاہئے۔ یہاں علم حدیث کے لغوی، فنی اور فقہی مباحث کا ذکر ہوگا۔ فنی مباحث سے مراد علم روایت اور علوم حدیث سے متعلق مباحث ہیں اور فقہی مباحث سے مراد ہے ان احادیث کی خصوصی تحقیق جہاں فقہ سے متعلق مسائل کا ذکر ہو، کلامی مباحث یعنی عقیدہ سے متعلق اور لغوی مباحث یعنی جہاں کوئی مشکل لفظ آ گیا ہے اس پر بحث۔ یہ طریقہ طلبہ کے لئے ہے۔ ان اہل علم نے لکھا ہے کہ اس میں اعتدال اور توازن سے کام لینا چاہئے، زیادہ تفصیلی بحث نہیں کرنی چاہئے۔

۳۔ تیسرا طریقہ امعان کا ہے۔ امعان یعنی گہرائی سے کوئی کام کرنا۔ امعان کی

جو وضاحت محدثین نے کی ہے شیخ ابو طاہر کردی بھی اس سے اتفاق فرماتے ہیں۔ یہ سب حضرات کہتے ہیں کہ امعان سے مراد یہ ہے کہ حدیث میں جو مسائل بیان ہوئے ہیں ان سب پر بہت تفصیل سے گفتگو کی جائے اور جو مسائل براہ راست حدیث سے متعلق نہ ہوں بلکہ جن کا بالواسطہ تعلق ہو ان پر بھی تفصیل سے بات کی جائے۔ یہ طریقہ امعان کہلاتا ہے۔ طریقہ امعان کے بارہ میں ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ یہ سنجیدہ لوگوں کا طریقہ نہیں ہے۔ بلکہ قصہ گو قسم کے لوگوں کا طریقہ ہے، دنیا پرست لوگوں کا طریقہ ہے۔

اس پر مجھے حیرت ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں لکھا۔ یہ حیرت ابھی تک قائم ہے۔ انہوں نے لکھا کہ یہ طریقہ محدثین کا طریقہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ دنیا پرست اور قصہ گو اور جاہ پرست لوگوں کا طریقہ ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں ڈالا کہ انہوں نے یہ تین طریقے بیان فرمائے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ میری رائے ممکن ہے کہ غلط ہو۔ لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید کچھ لوگ اس میدان میں ایسے آ گئے ہوں گے جنہوں نے اپنا علم ظاہر کرنے اور اپنے کو بڑا علامہ ثابت کرنے کے لئے بڑی لمبی چوڑی تقریریں شروع کر دی ہوں گی اور لمبے لمبے مباحث بیان کئے ہوں گے تو مخلص اور متقی محدثین نے ان کے اس عمل کو تقویٰ اور اخلاص کے خلاف سمجھا ہوگا، اس لئے یہ بات ارشاد فرمائی ہوگی۔ ممکن ہے کہ میری یہ رائے غلط ہو۔ لیکن شاید درست بھی ہو۔ بہر حال طریقۂ امعان پر اتنے بڑے اور جید ائمہ حدیث کے اس منفی بلکہ خاصے جارحانہ تبصرہ کی اصل وجہ معلوم نہیں۔ اس لئے اب تک حیرت ہے۔

احادیث میں تعارض

ایک آخری چیز جو بڑی لمبی ہے لیکن اختصار کے ساتھ میں صرف اصولی بات بیان کر کے ختم کر دیتا ہوں۔ وہ یہ کہ بعض اوقات بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ دو حدیثوں میں تعارض یعنی Conflict ہے۔ یہ تعارض بظاہر تو نظر آتا ہے لیکن درحقیقت نہیں ہوتا۔ یہ ایک بڑی لمبی بحث ہے۔ ایک بڑے محدث سے اپنے زمانے میں کسی نے پوچھا کہ اگر دو احادیث میں تعارض ہو تو اس کو کیسے دور کیا جائے۔ انہوں نے بہت ناگواری سے فرمایا کہ اگر ایسی کوئی دو حدیثیں ہیں جو دونوں مکمل طور پر صحیح ہیں، سند، روایت، درایت اور ہر اعتبار سے صحیح ہیں، برابر درجہ کی ہیں اور ان

میں تعارض ہے تو لے کر آ جاؤ۔ گویا ان کی رائے میں ایسی کوئی احادیث نہیں پائی جاتیں جو ہر لحاظ سے ایک درجہ کی ہوں اور صحیح کے بہت اونچے درجہ کی ہوں اور ان میں تعارض ہو۔

لیکن بظاہر بعض احادیث میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔ یہ تعارض جو معلوم ہوتا ہے اس کو کیسے دور کیا جائے؟ اس کے لئے بڑی لمبی بحثیں ہوئی ہیں۔ کچھ وجوہ ترجیح یعنی grounds of preferance محدثین نے بیان کئے ہیں، اہل علم نے تلاش کر کے ان کا پتہ چلایا پھر ان کی شناخت کی کہ وہ وجوہ ترجیح یعنی grounds of preferance کیا ہیں جو ائمہ حدیث اور فقہائے مجتہدین نے اختیار کئے ہیں۔ ان میں سے کچھ اسباب ترجیح تو وہ ہیں جو اسناد کے اعتبار سے ہیں، کچھ اسباب وہ ہیں جو متن کے اعتبار سے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو مدلول کے اعتبار سے ہیں یعنی اس متن سے کیا بات ظاہر ہوتی ہے، اور کچھ حدیث سے متعلق دیگر پہلوؤں کے اعتبار سے ہیں۔ گویا وجوہ ترجیح یا اسباب ترجیح کی چار قسمیں ہیں۔

سند کے اعتبار سے ترجیح کی وجوہ تیرہ ہیں۔ متن کے اعتبار سے چھ ہیں۔ مدلول یعنی مفہوم کے اعتبار سے چار ہیں اور خارجی اسباب کے اعتبار سے سات ہیں۔ نمونہ کے طور پر ایک ایک دو دو مثالیں دے دیتا ہوں۔

سند کے اعتبار سے وجوہ ترجیح سے مراد کیا ہے اور وہ وجوہ کیا ہیں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر دو حدیثیں صحیح ہوں، سند اور متن ہر اعتبار سے اس درجہ کی ہوں جس پر کوئی صحیح حدیث ہوتی ہے۔ دونوں کے مندرجات سے یہ پتہ نہ چلتا ہو کہ دونوں حدیثیں کس زمانہ کی ہیں۔ دونوں حدیثوں میں کوئی اندرونی شہادت ایسی نہ جس سے کوئی اور مفہوم یا میدان تطبیق ظاہر ہوتا ہو تو پھر یہ دیکھا جائے گا کہ سند کس کی زیادہ قوی ہے۔ زیادہ راوی کس کے ہیں، سینئر راوی کس حدیث میں زیادہ ہیں اور جونیئر راوی کس حدیث میں ہیں۔ کبار صحابہ سے کونسی حدیث مروی ہے اور صغار صحابہ سے کون سی ہے۔ کبار تابعین سے کون سی حدیث مروی ہے اور صغار تابعین سے کون سی مروی ہے۔ اس اعتبار سے تقریباً تیرہ وجوہ ترجیح بنتی ہیں جن کی بنیاد پر ان دونوں میں ایک کو ترجیح دی جائے گی اور دوسری پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک اجتہادی فیصلہ ہی ہو سکتا ہے، جس کی بنیاد پر محدث یا فقیہ کو کوئی فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔

ضروری نہیں کہ یہ فیصلہ ہر صورت میں بالکل موضوعی یا سو فیصد objective ہو۔ اس

میں ایک سے زیادہ آرا ممکن ہوں گی۔اس میں اختلاف رائے بھی ہوگا۔ایک محدث کی نظر میں ایک حدیث کو ترجیح حاصل ہوگی تو دوسرے کی نظر میں دوسری حدیث کو ترجیح حاصل ہوگی۔اس لئے ان مسائل پر زندگی میں کبھی بھی لڑیے گا نہیں۔

مثال کے طور پر وجوہ ترجیح میں سے بعض کبار فقہا کے نزدیک ایک اہم وجہ ترجیح یہ ہے کہ اگر دونوں روایتیں برابر درجہ کی ہوں تو اس صحابیؓ کی روایت کو زیادہ ترجیح دی جائے گی جن کو رسول اللہ ﷺ کی قربت زیادہ حاصل رہی ہوگی، بہ نسبت ان صحابی کی راویت کے جو حضور ﷺ کے اتنے قریب نہیں رہے۔ یہ بڑی معقول بات معلوم ہوتی ہے اور اس سے اختلاف کرنا بہت مشکل ہے۔

ایک اور وجہ ترجیح جو ایک معقول رائے پر مبنی ہے کہ جو بعد کا طرز عمل ہے اس کو ترجیح دی جائے گی، بہ نسبت پہلے کے طرز عمل کے۔رسول اللہ ﷺ نے ایک عمل پہلے اختیار فرمایا، دوسرا عمل بعد میں اختیار فرمایا۔دونوں احادیث بظاہر متعارض معلوم ہوں تو ایسے میں بعد والی حدیث کو ترجیح دی جائے گی، پہلی والی کو چھوڑ دیا جائے گا۔امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں جہاں دونوں احادیث کے زمانۂ صدور کی تعیین ممکن نہ ہو وہاں ان صحابیؓ کی رائے کو ترجیح دی جائے گی جو حضور ﷺ کے زیادہ قریب رہے ہیں۔ جو صحابی حضور ﷺ سے زیادہ قریب نہیں رہے یا کم عرصہ قریب رہے ان کی روایت کو ترجیح نہیں دی جائے گی۔ چنانچہ رفع یدین کے مسئلہ پر لوگ بہت جھگڑتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ رفع یدین کی روایت نہیں کیا کرتے تھے اور بغیر ہاتھ اٹھائے رکوع میں جایا کرتے تھے۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنا دست مبارک اٹھا کر رکوع میں جایا کرتے تھے اور گویا رفع یدین کے ساتھ نماز پڑھا کرتے تھے۔دونوں صحابیؓ ہیں، دونوں کا درجہ بہت اونچا ہے، دونوں کی روایت کا درجہ بالکل برابر ہے۔ امام ابوحنیفہ کا ارشاد گرامی یہ ہے کہ یہاں ان صحابی کی روایت کو ترجیح دی جائے گی جو حضورؐ کے زیادہ قریب رہے۔وہ صحابی جو مکہ مکرمہ کے چوتھے یا پانچویں سال اسلام میں داخل ہوگئے اور حضورؐ کے اتنے قریب تھے کہ باہر سے آنے والے ان کو اہل بیت میں سے سمجھتے تھے ان کی روایت کو ترجیح دی جائے گی، بہ نسبت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کے جو غزوہ احد میں اس لئے واپس کردیئے گئے کہ کم سن ہیں اور ابھی بچے ہیں۔

یہ بہر حال امام ابوحنیفہؒ کی ایک رائے ہے جس کی ایک مضبوط عقلی بنیاد بھی موجود ہے۔ اس معاملہ میں ہر محدث اور ہر فقیہ کو ایک دلیل کی بنیاد پر رائے قائم کرنے کا اختیار ہے۔ اس بارے میں یہ کہنا کہ فلاں فقیہ کا طرز عمل سنت کے خلاف ہے، یا یہ عمل سنت سے متعارض ہے اور بدعت ہے، ایسا کہنا درست نہیں۔ یہ بھی سنت ہے اور وہ بھی سنت ہے۔ محدثین اپنے غیر معمولی علم وبصیرت اور اپنے غیر معمولی اخلاص وتقویٰ اور فقہا اپنے غیر معمولی تعمق کی وجہ سے ایک رائے کو زیادہ قوی اور دوسری رائے کو نسبتاً کم قوی سمجھتے ہیں اور ان میں سے جس نے جس رائے کو قوی تر سمجھا اس کو اختیار کر لیا۔

اسی طرح سے کچھ وجوہ ترجیح متن کے اعتبار سے ہیں کہ ایک حدیث کے متن میں کوئی عام اصول بیان ہوا ہے۔ اور ایک دوسری حدیث میں کسی خاص **specific situation** کے بارے میں کوئی بات بیان ہوئی ہے۔ یہاں یہ کہا جائے گا کہ ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ جہاں خاص صورت حال ہے وہاں یہ خاص حدیث قابل عمل ہوگی اور جہاں عمومی صورت حال ہوگی وہاں وہ عمومی حدیث قابل عمل ہوگی۔ دونوں مدلول کے اعتبار سے ایک دوسرے کو **compensate** کریں گی۔ مثال کے طور پر ایک حدیث وہ ہے جس میں احتیاط کا پہلو زیادہ سامنے آتا ہے اور ایک وہ ہے جس میں احتیاط کا پہلو نسبتاً کم ہے۔ مثلاً ایک حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ فلاں عمل جائز ہے اور ایک اور حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عمل جائز نہیں ہے۔ اب احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو نہ کیا جائے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ آیا ہے کہ شیشہ کے گلاس میں پانی پینا مکروہ ہے، جبکہ ایک دوسری حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ مکروہ نہیں ہے۔ اب اس میں یہ تو نہیں کہا گیا ہے کہ شیشہ کے گلاس میں پانی ضرور پیا کرو۔ اس لئے احتیاط یہ ہے کہ نہ پیا جائے، ہوسکتا ہے کہ مکروہ ہو، تو احتیاط کا تقاضا ہے کہ بلاضرورت شیشہ کے قیمتی گلاس میں پانی نہ پیا جائے۔ یہ بعض لوگوں کی رائے ہے یہ ہے کہ یہاں اس حدیث پر عمل کیا جائے گا جس مین احتیاط زیادہ ہے بہ نسبت اس کے جس میں احتیاط کم ہے۔ اس طرح مدلول یا مفہوم کے اعتبار سے بھی کچھ اصول ہیں۔

کچھ اصول ہیں جو خارجی ہیں۔ یعنی حدیث کے الفاظ میں نہیں لیکن خارجی شواہد کی بنیاد پر اس سے ان اسباب کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً دو حدیثیں ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث میں

جو بات ارشاد فرمائی گئی ہے وہ ائمہ اربعہ یا خلفائے اربعہ کا نقطۂ نظر بھی ہے تو خلفائے راشدین کا نقطۂ نظر اس کے ساتھ شامل ہو گیا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی حدیث نسبۃً زیادہ قوی ہے، اس پر عمل کیا جائے گا۔ یا مثلاً ایک وہ روایت ہے جس پر عمل اہل مدینہ بھی موجود ہے اور دوسری روایت ایسی ہے جس کی تائید کسی ایسے اجتماعی عمل سے نہیں ہوتی۔ اب یہاں دو روایتیں ہیں۔ دونوں اصول روایت، سند وغیرہ کے اعتبار سے برابر ہیں تو عمل اہل مدینہ والی روایت کو ترجیح دی جائے گی۔ میں نے اذان میں ترجیع سے متعلق امام ابو یوسف کی مثال دی تھی، امام ابو یوسف نے اپنی روایت کو چھوڑ کر اس کو قبول کیا، حالانکہ دونوں روایتیں صحیح تھیں۔ لیکن انہوں نے عمل اہل مدینہ کی وجہ سے اپنی روایت کو ترک کر دیا۔ اب یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ امام مالک اور امام ابو یوسف نعوذ باللہ حدیث کے تارک ہو گئے۔ نہیں حدیث کے تارک نہیں ہوئے، بلکہ دو برابر کی حدیثوں میں ترجیح اس کو دی جس کے حق میں عمل اہل مدینہ کی تائید بھی حاصل ہو رہی تھی۔

علم ناسخ اور منسوخ

علم حدیث میں آخری چیز علم ناسخ اور منسوخ ہے۔ رسول اللہ ﷺ جب دنیا میں بطور نبی اور پیغمبر کے تشریف لائے تو آپ کی چار ذمہ داریاں تھیں، یتلوا علیهم آیاته و یزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة' یہ جو تزکیہ کا عمل تھا کہ لوگوں کا تزکیہ فرماتے تھے تو یہ افراد کا تزکیہ بھی تھا، خاندانوں کا تزکیہ بھی تھا، مال اور متاع کا تزکیہ بھی تھا، لوگوں کے اوقات کا تزکیہ بھی تھا، نظام اور معاشرہ کا تزکیہ بھی تھا، ہر چیز کا تزکیہ تھا۔ کوئی چیز آپؐ نے تزکیہ کے بغیر نہیں چھوڑی، ہر چیز کو پاکیزہ اور ستھرا بنایا۔

اس ستھرا بنانے کے عمل میں ایک تدریج اور اعتدال حضورؐ نے پیش نظر رکھا۔ جو چیزیں بنیادی تھیں وہ پہلے بیان فرمائیں، جن کا انداز عمارت کی بنیادوں کے اوپر اٹھنے والی دیواروں کا تھا وہ آپ نے بعد میں بیان فرمائیں۔ جو دیواروں سے آگے بڑھ کر چھت کی نوعیت کی تھیں وہ آپ نے اس کے بعد بیان فرمائیں۔ جو بات ستون کی حیثیت رکھتی تھی وہ اپنے مقام پر بیان فرمائی۔ جو اس انداز کی تھی کہ مکان بننے کے بعد اس کی تکمیل کیسے ہو وہ آخر میں بیان فرمائی۔ یہ ایک منطقی ترتیب حضورؐ نے پیش نظر رکھی۔ جیسے ایک طبیب جب کسی پیچیدہ مرض کا علاج کرتا ہے تو پہلے ایک

دوا دیتا ہے، پھر دوسری پھر تیسری، پھر چوتھی اور بقیہ دواؤں کو ایک ایک کر کے چھڑا دیتا ہے۔ کچھ پرہیز بتا دیتا ہے اور بعد میں اس پرہیز کو ختم کر دیتا ہے کہ ٹھیک ہے اب کھاؤ۔

اسی طرح سے رسول اللہ ﷺ کے ارشادات میں یہ تدریج پائی جاتی ہے۔ اس تدریج میں جب کسی عمل کی ضرورت نہیں رہی تو وہ عمل ختم ہو گیا، وہ حدیث گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ منسوخ ہو گئی۔ مثال کے طور پر جب اسلام آیا تو عرب میں شراب نوشی بڑی کثرت سے رائج تھی۔ ہر جگہ شراب نوش اور مئے خوار پائے جاتے تھے۔ شراب کی حرمت کا ذکر قرآن پاک میں تدریج کے ساتھ آیا اور جب مکمل حرمت آ گئی تو رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو شراب نوشی سے بالکل پاک اور صاف کرنے کے لئے بعض دوسری چیزوں کی بھی ممانعت کر دی۔ لیکن حضورؐ یہ ممانعت نے وقتی طور پر کی تھی۔ صحیح مسلم میں ایک روایت ہے جو صحیح بخاری میں بھی ہے۔ ایک صحابیؓ بیان کرتے ہیں کہ ہمارے قبیلے کا وفد جب حضورؐ کی خدمت میں آیا تو آپ نے ہمیں فلاں فلاں چیزوں کا حکم دیا اوران چیزوں سے روکا۔ 'و نهانا عن النقير و المزفت والدباء' ہمیں چار چیزوں سے روکا، یہ چار قسم کے برتن ہوا کرتے تھے جن میں شراب رکھی جاتی تھی اور بنائی جاتی تھی۔ کسی برتن میں فی نفسہ کوئی اچھائی یا برائی نہیں ہے۔ لیکن ایک برتن ہوتا تھا جو کدو سے بنتا تھا۔ اس زمانے میں یہ پراسیسنگ مشینیں تو نہیں ہوتی تھیں، اس کے بجائے ایک بڑا کدو لے کر اس کو خشک کر دیا کرتے تھے۔ وہ کدو خشک ہونے کے بعد لکڑی کی طرح سخت ہو جاتا تھا۔ اندر سے اس کا ریشہ نکال کر اس کو کھوکھلا کرتے تھے۔ اس میں کھجور یا انگور کا رس بھر کے اس کو اوپر سے بند کر کے درخت سے لٹکا دیتے تھے۔ وہ کئی دن تک لٹکا رہتا تھا۔ ہوا کی ٹھنڈک اور دھوپ کی گرمی سے اس میں خمیر پیدا ہو جاتا تھا اور وہ شراب بن جاتی تھی۔ بعد میں اس برتن کو دیگر مقاصد کے لئے بھی استعمال کرتے تھے۔ اس کو دباء کہتے تھے۔ اب بظاہر اس میں کوئی قباحت نہیں کہ آپ کدو لیں اور اس کو خشک کر کے برتن بنالیں، لیکن چونکہ یہ برتن خاص شراب نوشی اور شراب سازی کے لئے استعمال ہوتا تھا اس لئے حضور ﷺ نے اس کی بھی ممانعت فرما دی۔ جب شراب کا بالکل خاتمہ ہو گیا اور لوگوں نے مکمل طور پر شراب چھوڑ دی پھر ان برتنوں کی ممانعت کی ضرورت نہیں رہی۔ آج اگر کوئی شخص کدو کا برتن بنانا چاہے تو بنا سکتا ہے۔

اسی طرح سے ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا کہ 'كنت نهيتكم عن زيارة

القبور الافزوروها'۔ میں نے تم کو قبروں پر جانے سے منع کیا تھا، اب تم جاسکتے ہو۔ ایک زمانے میں عرب میں قبر پرستی زور وشور سے ہوا کرتی تھی، قبروں پر طرح طرح کے چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے، طرح طرح کے مشرکانہ اعمال ہوا کرتے تھے تو آپؐ نے فرمایا کہ قبروں پر مت جایا کرو۔ جب صحابہ کرامؓ کی تربیت ہوگئی اور یہ خطرہ ٹل گیا کہ ان سے قبروں پر کوئی مشرکانہ عمل سرزد ہوگا تو آپؐ نے فرمایا کہ'الافزوروھا' اب تم جاسکتے ہو۔ ان دو مثالوں سے اندازہ ہو جائے گا کہ احادیث میں یہ تدریج پائی جاتی ہے۔

صحابہ کرامؓ میں جو صف اول کے صحابہ کرامؓ ہیں، طبقہ اولیٰ کے صحابہ یا فقیہ صحابہ ہیں ان سے ایسی کوئی روایت منقول نہیں ہے جس میں اس تدریج کا لحاظ نہ رکھا گیا ہو۔ لیکن طبقہ متوسط اور صغار صحابہ میں خاص طور پر وہ صحابہ جن کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رہنے کا زیادہ موقع نہیں ملا ان سے ایسی روایات بھی منقول ہیں جو اس تدریج کے کسی خاص مرحلہ کے بارہ میں ان کے مشاہدہ پر مبنی ہیں۔ فرض کریں کوئی صاحب یمن میں رہتے تھے، وہ ایک قافلہ کے ساتھ آئے، چند دن مدینہ منورہ میں رہے اور چلے گئے۔ انہوں نے جو دیکھا وہی بیان کر دیا۔ وہ آخر تک وہی بات بیان کرتے رہے اور بعد میں بھی وہی بیان کرتے رہے، کیونکہ ان کو یہ پتہ نہیں چلا کہ بعد میں یہ چیز تبدیل ہوگئی تھی یا حضورؐ نے کوئی اور بات ارشاد فرمائی تھی۔ تابعین کو وہ چیز بھی مل گئی اور یہ بھی مل گئی۔ اب یہ پتہ لگانا تابعین کا کام تھا کہ کون سی چیز پہلے کی ہے اور کون سی بعد کی ہے۔ یہ علم ناسخ و منسوخ کہلاتا ہے۔

اسباب ورود الحدیث

آخری چیز یہ ہے کہ جس طرح سے قرآن پاک کی آیات میں شان نزول ہوتا ہے جس سے اس آیت کا سیاق وسباق سمجھنے میں مدد مل جاتی ہے، یہ پتہ چل جاتا ہے کہ جب کوئی آیت نازل ہوئی تھی تو کیا حالات تھے، اس سے اس آیت کا مفہوم اور اس کا اندازہ کرنے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ جن حالات میں وہ آیت نازل ہوئی اور جن حالات سے عہدہ برا ہونے کے لئے وہ نازل ہوئی ان کو اسباب نزول کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ علوم القرآن کا ایک اہم باب ہے۔ اسی سے ملتا جلتا ایک فن ہے اسباب ورود الحدیث یعنی کوئی حدیث جو رسول اللہ ﷺ نے

ارشاد فرمائی وہ کن حالات میں فرمائی اور اس وقت آپؐ کے پیش نظر کیا مسئلہ تھا۔ اگر اس حدیث کو اس سیاق وسباق میں سمجھ لیں جس میں آپؐ نے وہ بات ارشاد فرمائی تو آسانی ہو جاتی ہے۔ اس سیاق وسباق سے ہٹا کر اس کو دیکھیں تو بعض اوقات مشکل پیش آتی ہے۔ یہ ایک فن ہے، جس پر الگ سے کتابیں ہیں۔

علوم حدیث میں اور بھی بہت سے شعبے ہیں، اور بھی فنون ہیں جن کا ذکر میں وقت کی تنگی کے باعث چھوڑ رہا ہوں۔

اگر آپ پسند کریں تو سوالات کل کر لیں گے اور اگر آپ اصرار کرتی ہیں تو میں ابھی جواب دے دیتا ہوں۔ چونکہ بات لمبی ہوگئی یہ موضوع بہت لمبا تھا، اب بھی تقریباً آدھے کے قریب رہ گیا۔ اس آدھے میں جو چیزیں زیادہ اہم تھیں وہ میں نے بیان کر دیں اور جو بیان نہیں کیں تو جب اللہ تعالیٰ آپ کو موقع عطا فرمائے گا آپ باقی موضوعات کا بھی مطالعہ فرما لیجئے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆

دسواں خطبہ

کتب حدیث - شروح حدیث

جمعرات، 16 اکتوبر 2003ء

کتب حدیث - شروح حدیث

آج کی گفتگو میں حدیث کی چند مشہور کتابوں اور ان کی شرحوں کا تعارف مقصود ہے۔ یہ تعارف دو حصوں پر مشتمل ہوگا۔ حدیث کی وہ بنیادی کتابیں اور ان کی وہ شرحیں جو برصغیر سے باہر لکھی گئیں ان پر آج کی نشست میں گفتگو ہوگی۔ وہ کتب حدیث اور شرحیں جن کی تصنیف کا کام برصغیر میں ہوا ان میں سے چند ایک کے بارہ میں کل بات ہوگی۔

علم حدیث جس کی تدوین، تاریخ اور علوم وفنون کا تذکرہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ گزشتہ نو دنوں میں ہوا ہے اس سے بخوبی یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ محدثین کرام نے جو بے مثال کام کیا اس پر وہ امت کی طرف سے کتنے شکر اور کتنے غیر معمولی امتنان واحترام کے مستحق ہیں۔ اللہ رب العزت نے ان کو جس اہم اور عظیم الشان کام کے لئے منتخب فرمایا وہ نہ صرف اسلام کی تاریخ میں بلکہ پوری انسانیت کی تاریخ میں ایک نہایت منفرد نوعیت کا کام ہے۔ انہوں نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا جس کی مثال انسانوں کی فکری، علمی، مذہبی اور تہذیبی تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ سارا کام جو دراصل ملت مسلمہ کی فکری اور تہذیبی بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے، آج ہم میں سے بہت سے لوگوں کے سامنے نہیں ہے۔

جن حضرات نے یہ قربانیاں دیں وہ قربانیاں دے کر دنیا سے تشریف لے گئے۔ جن حضرات نے یہ مشقتیں برداشت کیں وہ مشقتیں اللہ کی بارگاہ میں یقیناً مقبول ہوئی ہوں گی۔ ان سب مشقتوں کی تفصیل ان سب حضرات کے نامہ اعمال میں لکھی ہوئی ہے۔ ان بے پناہ مشقتوں کا علم یا صرف اللہ کو ہے یا ان حضرات کو ہے جنہوں نے یہ مشقتیں برداشت کیں۔ ہمارے سامنے

ان ساری مشقتوں کے جو نتائج ہیں اور ان کے جو کارنامے اور ثمرات ہیں وہ ان کتابوں کی شکل میں موجود ہیں جن میں آج احادیث لکھی ہوئی ہیں۔ یہ مجموعے ان کی کاوشوں کے نتیجہ میں مرتب ہوئے۔

احادیث کے یہ مجموعے عام کتابوں سے مختلف ہیں۔ عام کتاب جب ایک شخص لکھتا ہے تو اس کا عام طریقہ یہ ہے کہ وہ کسی کتب خانہ میں بیٹھ کر بہت سی کتابیں سامنے رکھ لیتا ہے، تحقیق کرتا ہے اور چند سال یا چند مہینے کی محنت کرکے، کم یا زیادہ مدت میں تحقیق کرکے، کتاب تیار کر لیتا ہے۔ احادیث کے مجموعے اس طرح تیار نہیں ہوئے۔ وہ جس غیر معمولی مشقت اور جن غیر معمولی سفروں کے نتیجے میں تیار ہوئے وہ آپ کے سامنے ہیں۔ اس لئے جب ان کتابوں کا تعارف کرایا جائے اور ان پر لکھی جانے والی شروح کا تعارف کرایا جائے تو یہ ساری کاوش اور کوشش جو ابتدائی تین چار صدیوں میں ہوئی وہ ہمارے سامنے رہنی چاہئے۔ حدیث کی کوئی کتاب بظاہر چھوٹی سی ہوگی۔ اس میں احادیث کی تعداد بھی چند ہزار یا چند سو ہوگی لیکن ان چند ہزار یا چند سو احادیث کا مجموعہ ہم تک پہنچانے کے لئے ان حضرات کو کیا کچھ کرنا پڑا، اس کا اندازہ آپ کو گزشتہ نو خطبات کے دوران ہو چکا ہوگا۔

یوں تو احادیث کے بے شمار مجموعے مرتب ہوئے۔ صحابہ کرامؓ کے مجموعوں کا میں نے ذکر کیا۔ صحابہ کرامؓ کے براہ راست مرتب کئے ہوئے کئی مجموعے آج ہمارے پاس موجود ہیں جن میں صحیفہ ہمام بن منبہؒ بہت مشہور ہے جو حضرت ابو ہریرہؓ نے اپنے شاگرد ہمام بن منبہؒ کو املا کرایا تھا۔ یہ مجموعہ آج مطبوعہ شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ اسی طرح سے کچھ اور چھوٹے چھوٹے مجموعے صحابہ کرامؓ اور تابعین کے مرتب کئے ہوئے ہم تک پہنچے ہیں۔ جن میں سے بعض مطبوعہ ہیں اور بعض ابھی تک کتب خانوں کی زینت ہیں۔

ایسا ہی ایک مجموعہ 'کتاب السرد والفرد' کے نام سے ڈاکٹر حمید اللہؒ نے ایڈٹ کرکے شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں ایک بزرگ نے صحابہ اور تابعین کے مرتب کئے ہوئے کئی چھوٹے چھوٹے مجموعے یک جا کئے ہیں اور اس اعتبار سے یہ کتاب احادیث نبوی کے قدیم ترین مجموعوں کا ایک مجموعہ ہے۔ لیکن یہ مجموعے عام طور پر متداول نہیں ہیں اور صرف ان حضرات کی دلچسپی کا ہدف ہیں جن کو علم حدیث کی تاریخ اور اس پر ہونے والے اعتراضات کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ عام

قارئین کے لئے یا علم حدیث کے عام طلبہ کے لئے وہ مجموعے زیادہ دلچسپی اور زیادہ اہمیت رکھتے ہیں جو عام طور پر کتب خانوں میں دستیاب ہیں، جو اپنی ترتیب کی خوبی اور جامعیت کی وجہ سے دوسرے قدیم تر مجموعوں سے زیادہ مفید اور مقبول ہیں۔

موطا امام مالکؒ

ان میں معروف اور متداول ہونے کے اعتبار سے قدیم ترین مجموعہ امام مالک کی موطا ہے۔ موطا سے پہلے بھی مجموعے تیار ہوئے اور ان میں سے بعض آج بھی موجود ہیں لیکن وہ مقبول اور متداول مجموعے نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ذکر عام طور پر علم حدیث کے سیاق وسباق میں کم ہوتا ہے۔ متداول اور معروف ومقبول اور مشہور مجموعوں میں قدیم ترین مجموعہ امام مالک کی موطا ہے۔ موطا کے لفظی معنی تو ہیں: Beaent Track یعنی وہ راستہ جس کو لوگوں نے پے در پے چل کر اتنا ہموار کر دیا ہو کہ بعد والوں کے لئے اس پر چلنا آسان ہو گیا ہو۔ امام مالک نے جب موطا مرتب کی تو انہوں نے کوشش کی کہ وہ تمام احادیث، صحابہ کرامؓ کے آثار، تابعین کے اجتہادات اور عمل اہل مدینہ پر معلومات وتحقیقات کے ذخائر ان میں جمع کر دئے جائیں جن پر مسلسل عمل درآمد ہو رہا ہے اور جو ایک لمحہ کے لئے بھی عمل سے خالی نہیں رہے۔ پھر امام مالک نے اس کتاب کو مرتب کرنے کے بعد اپنے ہم عصر جید ترین اہل علم کی بڑی تعداد کو، جن کے بارے میں بعض حضرات کا خیال ہے کہ ان کی تعداد ستر تھی، ان کو دکھایا اور ان کی منظوری اور پسند کے بعد امام مالک نے اس مجموعے کو مشتہر کیا۔

یہ بات کہ امام مالک کو یہ مجموعہ مرتب کرنے کا خیال کیوں آیا۔ اس کے بارے میں بعض روایات کتب حدیث اور کتب تاریخ میں بیان ہوئی ہیں۔ ایک بات جو عام طور سے مشہور ہے جو بظاہر درست معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ امام مالک نے یہ مجموعہ عباسی خلیفہ منصور کے کہنے پر مرتب کیا تھا۔ منصور عباسی خاندان کا ایک نہایت نامور، ذہین اور صاحب علم فرد تھا۔ اس نے خود ایک طویل عرصہ مدینہ منورہ میں گزارا تھا۔ امام مالک کا ہم درس تھا اور امام مالک کے ساتھ مل کر بہت سے اہل علم سے اور بہت سے محدثین اور فقہا سے اس نے کسب فیض کیا تھا۔ اس نے خلیفہ بننے کے بعد امام مالک سے یہ درخواست کی کہ اس وقت دنیائے اسلام میں، جو اس وقت

ایک ہی مملکت پر مشتمل تھی، ایسی کتاب کی ضرورت ہے جس کی تمام عدالتیں، مفتی صاحبان اور فقہ اسلامی پر کام کرنے والے تمام لوگ پیروی کریں۔ اتنی مختصر ہو کہ ہر شخص اس سے استفادہ کر سکے۔ اتنی چھوٹی بھی نہ ہو کہ لوگ اس سے استفادہ نہ کر سکیں اور اتنی ضخیم بھی نہ ہو کہ اس کو پڑھنا وقت طلب ہو جائے۔ اس میں ان تمام سنتوں اور احادیث کو جمع کیا جائے جن پر حضورؐ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے سے عمل ہوتا آیا ہے۔ صحابہ کرامؓ اور تابعین کے وہ اقوال بھی اس میں شامل ہوں جن سے قرآن پاک اور احادیث کے مفہوم کو سمجھنے میں مدد ملے۔ نہ اس میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے شواذ ہوں، نہ عبداللہ بن عباسؓ کی رخص ہوں اور نہ عبداللہ بن عمرؓ کی سختیاں ہوں بلکہ وہ ایک درمیانی راستہ کو بیان کرتی ہو۔

امام مالک نے اس تجویز کے مطابق موطا لکھنی شروع کی اور ایک طویل عرصہ تک اس کے لئے مواد جمع کرتے رہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ انہوں نے چالیس سال اس کام میں لگائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ چالیس سال منصور کے کہنے کے بعد نہیں لگے ہوں گے۔ وہ پہلے سے علم حدیث پر جو کام کر رہے تھے اور جو یادداشتیں وہ مرتب کر رہے تھے، امام مالک نے انہی کو سامنے رکھا اور منصور کی تجویز کے مطابق مجوزہ کتاب پر کام شروع کر دیا۔

امام مالک اس کام کے لئے یقیناً اپنے زمانے میں موزون ترین شخصیت تھے۔ علم حدیث میں بھی ان کو بڑا نمایاں مقام حاصل تھا اور علم فقہ میں بھی وہ اتنا نمایاں مقام رکھتے ہیں کہ چار بڑے مسالک فقہ میں سے ایک کے بانی ہیں۔ امام مالک نے مدینہ منورہ میں جن اصحاب علم سے کسب فیض کیا وہ تمام جید صحابہ کرامؓ کے علوم وفنون کے جامع تھے۔ حضرات شیخین، حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت علی بن ابی طالبؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، کہ صحابہ کرامؓ میں ان سے زیادہ احادیث اور سنت کی سختی سے پیروی کرنے والا مشکل سے ملے گا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ جو ترجمان القرآن اور حبر الامہ یعنی امت کے سب سے بڑے عالم کہلاتے تھے، حضرت ابوہریرۃؓ جو ایک طویل عرصہ مدینہ منورہ میں حدیث کی روایت کرتے رہے اور جو سب سے بڑی تعداد میں احادیث کے راوی ہیں۔ حضرت زید بن ثابتؓ جو کاتب وحی اور دربار رسالت کے سیکریٹری تھے۔ ان سب کے علوم وفنون مدینہ منورہ میں موجود تابعین تک پہنچے۔ امام مالک نے ان سب تابعین سے کسب فیض کیا اور یہ سارے علوم ان تک منتقل ہوئے۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے مدینہ منورہ میں صحابہ کرامؓ کے بعد جو نسل بہت نمایاں ہوئی ان میں فقہائے سبعہ کا مقام بہت بلند ہے۔ فقہائے سبعہ وہ حضرات ہیں جو مدینہ منورہ میں علم حدیث اور علم فقہ میں سب سے نمایاں تھے۔ دنیا بھر سے لوگ ان کے پاس استفادہ اور رہنمائی کے لئے آیا کرتے تھے۔ یہ حضرات مدینہ منورہ کے صحابہ کرامؓ کے علوم وفنون کے امین اور جامع تھے۔ امام مالک کو ان حضرات کا علم بھی پہنچا۔ انہوں نے ان حضرات کے تلامذہ سے اور ان کی تحریروں سے استفادہ کیا۔ ان کے اساتذہ میں امام نافع بھی شامل تھے جو تیس سال حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ شب وروز رہے۔ سفر میں بھی ساتھ رہے اور حضر میں بھی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے علاوہ انہوں نے دوسرے مدنی صحابہ سے بھی کسب فیض کیا۔ دنیائے اسلام کے دوسرے شہروں میں بھی گئے۔

امام مالک نے بہت بچپن میں، کم سنی میں امام نافع کی صحبت اختیار کر لی تھی اور ایک طویل عرصہ جس کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چوبیس سال یا اس کے لگ بھگ ہے وہ امام نافع کے پاس رہے۔ امام نافع کے انتقال کے بعد ہی امام مالک نے اپنا حلقہ درس قائم کیا۔ اس کے علاوہ امام مالک نے اپنے زمانے کے بڑے بڑے اساتذہ اور مدینہ منورہ کے صف اول کے محدثین اور فقہا سے علم حاصل کیا۔ امام زہری، امام جعفر صادق، یحیٰ بن سعید الانصاری، امام لیث بن سعد جو امام شافعی کے بھی استاد ہیں اور جن کا مزار مصر میں ہے، اور ربیعۃ الرائے جو امام مالک کے اساتذہ میں بڑا نمایاں مقام رکھتے ہیں، ان سب کے علوم وفنون سے استفادہ کرنے کے بعد امام مالک نے موطا امام مالک لکھی۔

امام مالک کے بارے میں ایک چیز بڑی نمایاں ہے اور وہ یہ کہ ان کے شیوخ کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ بقیہ محدثین کے تذکروں میں آپ نے سنا ہوگا کہ کسی نے سترہ سو محدثین سے استفادہ کیا، کسی نے اٹھارہ سو سے کسی نے ہزار سے۔ امام مالک کے شیوخ کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ان کے شیوخ کی تعداد چورانوے ہے۔ کسی نے کہا کہ تریسٹھ ہے۔ کسی نے اس کے کم وبیش بیان کی ہے۔ یعنی ساٹھ اور نوے کے درمیان ان کے شیوخ کی تعداد بیان کی جاتی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ امام مالک نے پہلے دن سے یہ طے کیا تھا کہ میں صرف اس شیخ سے

کسب فیض کروں گا جو علم حدیث کے ساتھ ساتھ تفقہ میں بھی بڑا اونچا مقام رکھتے ہوں اور حدیث کے فہم اور عملی انطباق اور اس سے نکلنے والے مسائل پر بھی ان کی گرفت مضبوط ہو۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں کہ میں کسی غیر فقیہ کی محفل میں نہیں بیٹھا اور جن کی محفل میں بیٹھ کر استفادہ کیا وہ سب کے سب جید فقہا تھے۔ خود ایک جگہ فرمایا کہ میں نے محض کسی کے زہد و اتقا کی بنیاد پر اس کی شاگردی اختیار نہیں کی بلکہ صرف ان حضرات کی شاگردی اختیار کی جو زہد و اتقا کے ساتھ ساتھ علم حدیث اور روایت میں اونچا مقام رکھتے تھے، اور تفقہ اور بصیرت میں بہت آگے تھے۔ میں نے صرف ایسے ہی لوگوں سے کسب فیض کیا۔ ایک جگہ لکھا کہ میں نے مدینہ منورہ میں ایسے ایسے لوگ دیکھے کہ اگر ان کا نام لے کر دعا کی جاتی تو شاید اللہ تعالیٰ بارش برسا دیتا، گویا دین، تقویٰ اور روحانیات میں وہ اس درجہ کے لوگ تھے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ ان میں سے کچھ تفقہ میں اونچا مقام نہیں رکھتے تھے اس لئے میں ان کے حلقہ درس میں نہیں بیٹھا۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالک کے اساتذہ کی تعداد نسبتاً تھوڑی ہے۔ لیکن وہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے کہ جب ایک مرتبہ یہ ثابت ہو جاتا تھا کہ فلاں شیخ امام مالک کے استاد ہیں تو پھر محدثین ان کے حفظ و ضبط اور عدالت وغیرہ کی مزید تحقیق نہیں کرتے تھے۔ امام یحیٰ بن معین کہتے ہیں کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی راوی امام مالک کے اساتذہ میں شامل ہیں تو میں اس راوی کی مزید تحقیق نہیں کرتا۔ امام احمد بن حنبل کا کہنا ہے کہ اگر کسی شیخ سے امام مالک نے روایت لی ہو تو پھر اس شیخ کی روایت قبول کرنے میں مجھے کوئی تامل نہیں۔

ایسے برگزیدہ شیوخ سے روایتیں لے کر امام مالک نے موطا مرتب فرمائی جو ایک لاکھ احادیث میں سے انتخاب ہے۔ ایک لاکھ احادیث میں متون تھوڑے ہیں روایات اور سندیں زیادہ ہیں۔ ایک لاکھ طریقوں سے جو روایات پہنچی تھیں ان میں سے امام مالک نے انتخاب کیا جن میں کم و بیش ایک ہزار سے کچھ کم احادیث ہیں اور دو ہزار کے قریب صحابہ اور تابعین کے اقوال، ارشادات اور آثار ہیں۔ یہ سارے۔ کے سارے اندراجات وہ ہیں جو خالص عملی مسائل سے متعلق ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں انسانی کو ذاتی، انفرادی اور اجتماعی معاملات میں جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے وہ سارے کے سارے معاملات امام مالک کی موطا میں موجود ہیں۔ اس میں جتنی بھی احادیث ہیں جو ایک ہزار کے لگ بھگ ہیں وہ ساری کی ساری صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں موجود ہیں۔ محدثین نے تحقیق کر کے اس بات کی تصدیق کی ہے وہ سب کی سب صحیح اور مرفوع

روایات ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی صحت کے اعلیٰ درجہ سے نیچے نہیں ہے۔ اسی لئے صحیحین سے پہلے کے زمانے میں جب صحیح مسلم اور صحیح بخاری مرتب نہیں ہوئی تھیں عام طور پر لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ موطا امام مالک اصح کتب بعد کتاب اللہ ہے۔ امام شافعی کا یہ ارشاد بہت سی کتابوں میں منقول ہے کہ کتاب اللہ کے بعد صحیح ترین کتاب موطا امام مالک ہے، اس لئے کہ اس وقت صحیح بخاری اور صحیح مسلم موجود نہیں تھیں۔ بعد میں چونکہ یہ سارا ذخیرہ بخاری اور مسلم میں شامل ہو گیا، اس میں مزید صحیح احادیث بھی شامل ہو گئیں اور صحابہ اور تابعین کے اقوال جو موطا امام مالک میں تعلیقات یا بلاغات کے طور پر آئے تھے ان کتابوں میں براہ راست سند کے ذریعے بیان ہو گئے اس لئے ان دونوں کتابوں میں سے کسی ایک کتاب کو (زیادہ تر حضرات نے صحیح بخاری کو) اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیا ہے۔

امام مالک ایک طویل عرصہ تک موطا پڑھاتے رہے۔ طلبہ دور دور سے ان کے پاس آیا کرتے تھے اور موطا امام مالک کا درس لیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے امام مالک کو جو مرتبہ عطا فرمایا اس کا اندازہ دو چیزوں سے ہوتا ہے۔ ایک حدیث ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ عنقریب ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگ اونٹ کی پشت کو کستے ہوئے دور دور کا سفر کریں گے اور علم دین کی تلاش میں نکلیں گے لیکن مدینہ کے عالم سے بڑا کوئی عالم انہیں نہیں ملے گا۔ اکثر محدثین اور علمائے حدیث کی بڑی تعداد کے نزدیک اس حدیث کا مصداق امام مالک ہیں۔ اس لئے کہ ان کے زمانے میں ایسا کوئی عالم نہیں تھا جس کی خدمت میں لوگ دور دور سے آئیں۔ تین براعظموں سے لوگ امام مالک کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ افریقہ، ایشیا اور یورپ۔ چنانچہ اسپین سے امام یحیٰ بن یحیٰ المصمودی جو ان کے شاگردوں میں سب سے نمایاں مقام رکھتے ہیں اور موطا امام مالک کے سب سے مقبول نسخہ کے راوی ہیں، ان کا تعلق یورپ سے تھا۔ ایشیا میں خراسان اور سمرقند جیسے دور دراز علاقوں سے لوگ ان کی خدمت میں آئے اور موطا امام مالک کا درس لے کر گئے۔

اللہ تعالیٰ نے امام مالک کو غیر معمولی عزت اور بڑے مال و دولت سے نوازا تھا۔ وہ جس مکان میں رہتے تھے وہ ایک زمانہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مکان رہ چکا تھا اور جس مکان میں درس حدیث کی محفل لگتی تھی وہ حضرت عمر فاروقؓ کا مکان تھا۔ درس حدیث کے لئے

وہاں بڑا پر تکلف اہتمام ہوتا تھا۔ صفائی خاص اہتمام سے کرائی جاتی تھی۔ عود اور لوبان کی خوشبو جلائی جاتی تھی۔ امام مالک غسل کر کے اور عمدہ لباس پہن کر آتے تھے اور تمام حاضرین مودب ہو کر بیٹھتے تھے۔ ایک مرتبہ امام ابوحنیفہ حاضر ہوئے اور بقیہ عام طلبہ کی طرح مودب ہو کر بیٹھ گئے۔ اسی طرح جو بھی آتا تھا وہ چھوٹا ہو یا بڑا، اسی طرح مودب ہو کر بیٹھ جاتا تھا۔ امام شافعی بھی طالب علم کی حیثیت سے اس درس میں شریک ہوئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ کتاب کا ورق بھی اتنا آہستہ پلٹتے تھے کہ ورق پلٹنے کی آواز نہ ہو۔ آواز ہوگی تو محفل کے سکون اور کیفیت میں خلل پڑے گا۔

ایک دیکھنے والے نے بیان کیا کہ وہاں دربار شاہی جیسا رعب داب ہوا کرتا تھا۔ جب پڑھنے والے پڑھ کر نکلتے تھے تو دروازے پر سواریوں کا ہجوم ایسا ہوتا تھا جیسے شاہی دربار برخواست ہو گیا ہو اور سواریاں نکل نکل کر جا رہی ہوں۔ کسی بھی آدمی کو وہاں کوئی خصوصی یا نمایاں مقام حاصل کرنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ خلفائے وقت مہدی، ہارون اور منصور تینوں کو اپنے اپنے زمانے میں امام مالک کے درس میں بیٹھنے کا موقع ملا۔ یہ لوگ اس درس میں آئے تو عام آدمی کی طرح طالب علم کی حیثیت سے بیٹھے اور اسی طرح مودب ہو کر بیٹھے رہنے کے بعد چلے گئے۔ خلیفہ مہدی نے ایک مرتبہ گزارش کی کہ میں مدینہ منورہ آیا ہوں۔ میری تین گزارشات ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ مجھے موطا امام مالک کی اجازت عطا فرمائیں، دوسری یہ کہ میرے دونوں بیٹوں کو درس میں حاضری کا موقع دیں، اور تیسری یہ کہ میرے بیٹوں کے لئے خصوصی محفل کا اہتمام فرمائیں۔ امام مالک نے کہا کہ پہلی دونوں درخواستیں قبول ہیں تیسری قابل قبول نہیں ہے۔ صاحبزادے محفل میں آئیں جہاں جگہ ملے بیٹھ جائیں اور درس لے کر چلے جائیں۔ چنانچہ مہدی کے دونوں بیٹے، اس فرمانروا کے بیٹے جس کی حکومت اسپین سے لے کر سمرقند اور بخارا تک اور آرمیدیا اور آذربائیجان سے لے کر سوڈان تک پھیلی ہوئی تھی، اس کے بیٹے امام مالک کے درس میں عام لوگوں کی طرح بیٹھے اور درس لے کر چلے گئے۔ آپ نے فرمایا اور یہ جملہ مشہور ہے کہ العلم یؤتیٰ ولا یأتی، علم کی خدمت میں حاضر ہوا جاتا ہے، علم کسی کی خدمت میں حاضر نہیں ہوتا۔

کچھ زمانہ کے بعد خلیفہ ہارون ان کے دربار میں آیا اور گزارش کی کہ امام مالک کوئی حدیث پڑھ کر سنا دیں تا کہ میں سنلوں اور حدثنا کی اسلوب پر مجھے حدیث پڑھنے کی اجازت دے دیں۔ امام مالک نے کہا کہ میرا اسلوب حدثنا کا نہیں بلکہ اخبرنا کا ہے۔ موطا کا نسخہ کہیں سے لے

لیجئے، پڑھ کر سنایئے میں سن کر اجازت دے دوں گا۔ میرا طریقہ یہ ہے جس کو میں خلیفہ سمیت کسی کے کہنے پر بھی بدل نہیں سکتا۔ چنانچہ ہارون الرشید نے بیٹھ کر موطا امام مالک پڑھی اور پڑھ کر اجازت لی جیسے کہ باقی شاگرد اجازت لیا کرتے تھے۔

امام شافعیؒ جب امام مالک کی خدمت میں حاضر ہوئے تو امام مالک کا آخری زمانہ تھا۔ امام مالک ان دنوں صرف مخصوص طلبہ کو موطا کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ عام درس انہوں نے بند کر دیا تھا۔ امام مالک کی عمر پچانوے برس کے قریب ہوئی تھی۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب ان کی عمر بانوے یا ترانوے سال تھی۔ صحت اجازت نہیں دیتی تھی کہ بڑے پیمانے پر طلبہ کو درس دیں۔ امام مالک کی خدمت میں حاضری سے پہلے امام شافعی نے مکہ مکرمہ کے گورنر سے مدینہ منورہ کے گورنر کے نام سفارشی خط لیا کہ نوجوان محمد بن ادریس شافعی کو امام مالک کے دربار میں پہنچا دیا جائے اور اجازت دلائی جائے کہ یہ موطا کے درس میں شریک ہوں۔ امام شافعی گورنر مدینہ کے پاس گورنر مکہ کا وہ خط لے کر گئے، اپنا تعارف کروایا، خط پیش کیا اور امام مالک کے درس میں شریک ہونے کے لئے سفارش چاہی، گورنر نے کہا کہ چلیں میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔

جب دونوں امام مالک کے در دولت پر پہنچے تو ملازمہ نے کہا کہ یہ ان کے آرام کا وقت ہے۔ آپ کو ملنا ہو تو فلاں وقت پر آسکتے ہیں۔ گورنر صاحب واپس چلے گئے۔ امام مالک کے اٹھنے کا وقت ہوا تو یہ دونوں دوبارہ پہنچے۔ وہاں جا کر گورنر نے بہت ادب اور احترام سے درخواست کی اور اپنی شرمندگی دور کرنے کی غرض سے مکہ کے گورنر کا خط بھی پیش کر دیا کہ میں اس سفارش کے سلسلہ میں حاضر ہوا ہوں۔ امام مالک نے خط دیکھ کر پھینک دیا اور کہا کہ اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث گورنروں کی سفارشوں پر پڑھائی جایا کرے گی اور ناخوشی کا اظہار کیا۔ گورنر نے معذرت کی۔ امام شافعی نے عرض کیا کہ میرا تعلق رسول اللہ ﷺ کے خاندان سے ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ امام شافعی مُطّلِبی تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے پردادا جناب ہاشم کے بھائی مطلب کی اولاد میں سے تھے۔ مُطلِب جناب ہاشم کے بھائی تھے اور امام شافعی ان کی اولاد میں سے تھے۔ یہ نسبت سن کر امام مالک نے اجازت دے دی۔ مکہ اور مدینہ کے گورنروں کی سفارش کو تو انہوں نے درخور اعتنا نہیں سمجھا لیکن رسول اللہ ﷺ کے خاندان کی نسبت کا حوالہ سن کر اجازت دے دی۔

اس سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ وہ کس شان کا درس ہوتا ہوگا اور کیسے لوگ موطا کا درس لیتے ہوں گے۔ موطا کا درس کتنے لوگوں نے لیا اس کا تعین کرنا بہت دشوار ہے۔ بلا شبہ وہ ہزاروں لوگ ہوں گے۔ جن لوگوں کو تحریری طور پر با قاعدہ اجازت عطا ہوئی ان کی تعداد بھی سینکڑوں میں ہے، ایک ڈیڑھ ہزار کے قریب ہے۔ ہر علاقہ میں یہ حضرات موجود تھے۔ تمام بڑے بڑے محدثین بالواسطہ یا بلاواسطہ امام مالک کے شاگرد ہیں۔ امام احمد، امام بخاری، امام ابوداؤد، امام ترمذی اور امام نسائی یہ سب حضرات ایک ایک واسطہ سے امام مالک کے شاگرد تھے۔ ائمہ فقہ میں سے امام شافعی اور امام محمد بن حسن شیبانی براہ راست امام مالک کے شاگرد تھے۔ اتنا غیر معمولی مقام و مرتبہ جس شخص کو حاصل ہو جائے پھر اللہ تعالیٰ اس کے تواضع اور اس کے کردار کو اور جواب دہی کے احساس کو برقرار رکھے، یہ بہت بڑی بات ہے۔

ایک مرتبہ ایک بڑی محفل میں مکہ مکرمہ تشریف فرما تھے۔ غالباً حج کے لئے تشریف لے گئے تھے، مکہ مکرمہ میں جس طرح اور جس پیمانے پر تشنگان علم کا رجوع ہوا ہوگا اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ بڑی تعداد میں لوگ جمع ہوئے۔ اس محفل میں جہاں بڑے بڑے لوگ موجود تھے، امام مالک سے چالیس سوالات کئے گئے۔ اڑتیس سوالات کے جواب میں فرمایا 'لا ادری، مجھے نہیں پتہ، صرف دو سوالات کا جواب دیا کہ ہاں ان کا جواب میں جانتا ہوں۔

ایک مرتبہ ایک شخص چھ ماہ کی مسافت کا طویل سفر کر کے پہنچا۔ غالباً اسپین سے آیا تھا اور کوئی مسئلہ پوچھا۔ امام مالک نے بتایا کہ میں نہیں جانتا۔ یہ بات میرے علم میں نہیں ہے۔ اس نے تھوڑا سا ناخوشی کا اظہار کر کے کہا کہ میں چھ مہینے کا سفر کر کے آیا ہوں، لوگوں نے آپ سے یہ مسئلہ پوچھنے کے لئے مجھے بھیجا ہے۔ میں جب واپس جاؤں گا تو ان لوگوں کو کیا جواب دوں گا۔ آپ نے کہا کہ ان سے کہنا کہ مالک نے کہا ہے کہ مجھے معلوم نہیں۔ جس چیز کے بارے میں مکمل اور سو فیصد تحقیق نہیں ہوا کرتی تھی اس کا جواب نہیں دیا کرتے تھے۔

موطا امام مالک کم و بیش **140ھ** کے لگ بھگ مرتب ہوئی۔ جب موطا امام مالک مرتب ہوئی اور اس کو مقبولیت حاصل ہوئی تو اور بھی کئی لوگوں نے، جن میں کئی حضرات استناد اور ثقاہت کے اعتبار سے زیادہ بلند معیار کے نہیں تھے، کتابیں لکھنی شروع کر دیں۔ لوگوں نے امام مالک سے کہا کہ فلاں بھی کتاب لکھ رہا ہے، فلاں بھی لکھ رہا ہے، فلاں بھی لکھ رہا ہے۔ آپ نے

ایک بات ایسی فرمائی کہ آج اس کی تصدیق سب کے سامنے ہے۔ آپ نے فرمایا کہ حسن نیت کو بقا ہے۔ جس نے اچھی نیت سے لکھی ہوگی اس کی کتاب کو بقا ہوگی۔ آج کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کتابیں کہاں گئیں۔ تذکروں میں ذکر ملتا ہے کہ لوگوں نے امام مالک کے مقابلہ میں کتابیں لکھیں تھیں۔ لیکن وہ سب کتابیں فنا کا شکار ہوئیں۔ لیکن بقا موطا امام مالک کو حاصل ہوئی۔

امام مالک کی کتاب میں چالیس ثنائیات ہیں۔ ثنائیات سے مراد وہ احادیث ہیں جن میں حضورؐ اور امام مالک کے درمیان صرف دو واسطے ہوں۔ ایک امام مالک کے استاد اور دوسرے کوئی صحابی رسول ﷺ۔ ان میں سے ایک سند وہ بھی ہے جس کا میں کئی بار ذکر کر چکا ہوں، مالك عن نافع عن ابن عمر، امام مالک امام نافع سے روایت کرتے ہیں اور وہ عبداللہ بن عمر سے، صرف دو واسطے ہیں۔

امام مالک سے موطا کا املا لینے والوں میں ہزاروں حضرات شامل تھے۔ سننے والے اور عمومی استفادہ کرنے والے تو پتہ نہیں کتنے ہوں گے، شاید لاکھوں ہوں گے۔ لیکن جن لوگوں نے پوری موطا امام مالک پڑھ کر اس کی باقاعدہ اجازت لی اور سند حاصل کی ان کی تعداد چودہ سو کے قریب ہے۔ ان چودہ سو میں سے تیس حضرات جو اپنی اپنی جگہ بڑے نامور صاحب علم ہوئے۔ حدیث اور فقہ کے امام ہوئے۔ انہوں نے اپنے اپنے لئے موطا کے نسخے تیار کئے۔ ان تیس نسخوں میں سے سترہ نسخے مشہور ہیں۔ ان سترہ نسخوں میں سے جو سب سے متداول اور معروف نسخہ ہے وہ امام مالک کے شاگرد خاص یحیٰ بن یحیٰ کا ہے۔

یحیٰ بن یحیٰ اسپین سے تشریف لائے تھے۔ طویل عرصہ امام مالک کی خدمت میں رہے۔ موطا امام مالک کے اصل نسخہ کے راوی وہی ہیں۔ انہی کے نسخہ کو موطا کہا جاتا ہے۔ جب کہا جاتا ہے کہ موطا امام مالک میں یہ ہے تو مراد ہوتی ہے یحیٰ بن یحیٰ کا نسخہ۔ باقی نسخے ان کے مرتبین کی طرف منسوب ہوتے ہیں، مثلاً موطا امام محمد۔ تو یہ موطا، امام محمد کی کتاب نہیں ہے بلکہ یہ امام مالک کی موطا کا وہ نسخہ ہے جو امام محمد نے تیار کیا۔ اسی طرح موطا قعنبی بھی ہے۔ قعنبی نے خود کوئی موطا تیار نہیں کی تھی بلکہ یہ موطا امام مالک کا وہ نسخہ ہے جو قعنبی نے تیار کیا۔ اسی طرح باقی نسخے ان کے تیار کرنے والوں کے ناموں سے مشہور ہوئے۔ یحیٰ بن یحیٰ کا نسخہ امام مالک کے نام سے منسوب ہوا۔

ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں درس ہو رہا تھا۔ یحییٰ بن یحییٰ بھی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کہیں سے شور مچا کہ ہاتھی آیا ہوا ہے۔ عرب میں ہاتھی نہیں ہوتا۔ لوگوں کے لئے ایک عجیب چیز تھی۔ تمام حاضرین نکل کر ہاتھی دیکھنے چلے گئے۔ یحییٰ بن یحییٰ بیٹھے رہے۔ امام مالک نے پوچھا: یحییٰ! تم ہاتھی دیکھنے نہیں گئے؟ یحییٰ نے جواب دیا کہ میں اسپین سے آپ کو دیکھنے کے لئے آیا ہوں، ہاتھی کو دیکھنے کے لئے نہیں آیا ہوں۔

امام مالک کی اس کتاب کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں۔ برصغیر میں بھی لکھی گئیں اور برصغیر سے باہر بھی لکھی گئیں۔ دو شرحوں کا ذکر کل برصغیر کے سیاق وسباق میں ہوگا۔ دو شرحیں جو بڑی مشہور ہیں وہ برصغیر سے باہر لکھی گئیں۔ اتفاق سے دونوں اسپین میں لکھی گئیں۔ ایک پرتگال کے ایک عالم نے لکھی اور دوسری اسپین کے ایک عالم نے لکھی۔ اسپین کے عالم تھے علامہ ابن عبدالبر، ان کی کتاب التمہید لما فی الموطامن المعانی والاسانید' ہے۔ اس کے دو تین ایڈیشن چھپے ہیں۔ ایک ایڈیشن جو میں نے دیکھا ہے وہ مراکش کی وزارت اوقاف نے شائع کروایا ہے۔ غالباً تیس بتیس جلدوں میں ہے۔ التمہید بڑی طویل اور مفصل شرح ہے۔ اس کے مصنف علامہ ابن عبدالبر، جن کا ذکر میں پہلے بھی غالباً تذکرہ صحابہ کے ضمن میں کر چکا ہوں، پانچویں صدی ھجری کے بڑے مشہور محدث اور عالم تھے۔ ان کی اور بھی بہت سی کتابیں ہیں۔ اس شرح کا زیادہ زور علم روایت اور علوم حدیث پر ہے۔ موطا امام مالک میں صحابہ کے جتنے اقوال آئے ہیں انہوں نے ان کی سندیں معلوم کی ہیں اور ان کا درجہ متعین کیا ہے جو سب کا سب صحت کو پہنچتا ہے۔ اسی طرح سے وہ اقوال اور فتاویٰ جو امام مالک نے بغیر سند کے بیان کئے ہیں ان کی بھی سندیں انہوں نے بیان کی ہیں اور یہ بتایا ہے کہ کس کس سند سے یہ فتاویٰ اور اور یہ ارشادات پہنچے ہیں۔ جہاں امام مالک نے بتایا ہے کہ اہل مدینہ کا طرز عمل یا سنت کیا ہے۔ اس کے سنت ہونے کے شواہد علامہ ابن عبدالبر نے حدیث کی بقیہ کتابوں سے جمع کئے ہیں۔ اس لئے یہ اس اعتبار سے بڑی غیر معمولی شرح ہے کہ علم روایت اور علوم حدیث کے نقطۂ نظر سے موطا امام مالک کی تشریح اور تائید میں جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ کم وبیش انہوں نے سارے کا سارا کہہ دیا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ کہنا اب تقریباً ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ کوئی انسان خاتم العلما نہیں ہے، لیکن عام اسباب اور شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ موطا امام مالک کی احادیث پر روایتی اور اسنادی نقطہ نظر سے اس کتاب سے

آ گے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

دوسری شرح جس شخصیت کی ہے وہ پرتگال کے ایک مشہور عالم اور اپنے زمانہ کے فقیہ تھے، یعنی علامہ ابوالولید الباجی، جب کتب حدیث میں یہ الفاظ آئیں وقال الباجی تو اس سے مراد علامہ ابوالولید الباجی ہوتے ہیں۔ انہوں نے موطا امام مالک کی شرح لکھی جو بڑی ضخیم سائز کی ہے اور باریک حروف کی پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلا ایڈیشن پانچ جلدوں میں نے دیکھا تھا۔ اب سنا ہے کہ دوسرا ایڈیشن چھپا ہے جو غالباً پندرہ سولہ جلدوں میں ہے۔ میں نے دیکھا نہیں ہے۔ لیکن پانچ جلدوں والا ایڈیشن میں نے دیکھا ہے۔ اس میں علامہ ابوالولید الباجی نے موطا امام مالک کے فقہی مباحث پر زیادہ زور دیا ہے۔ گویا یہ دونوں شرحیں مل کر ایک دوسری کی تکمیل کرتی ہیں۔ ایک موطا امام مالک کی حدیثیات کی تکمیل کرتی ہے دوسری فقہیات کی تکمیل کرتی ہے۔ اور یہ دونوں مل کر موطا امام مالک کے دونوں پہلوؤں کو بیان کرتی ہیں۔ اس لئے کہ موطا امام مالک حدیث کی کتاب بھی ہے اور فقہ کی کتاب بھی ہے۔ حدیث کی کتاب اس لئے کہ وہ احادیث کا مجموعہ ہے اور فقہ کی کتاب اس لئے کہ اس میں امام مالک کے اپنے فتاویٰ، صحابہ اور تابعین کے فتاویٰ بھی ہیں اور تمام عملی مسائل میں صحابہ کرامؓ کی جو سنت ہے اس کا بھی تذکرہ ہے۔ اس طرح یہ فقہ کی کتاب بھی ہے، فقہ الحدیث بھی ہے اور حدیث کا مجموعہ بھی ہے۔ ان دونوں کتابوں میں ان تینوں نقطہ ہائے نظر سے بحث ہوئی ہے اور یوں یہ دونوں کتابیں ایک دوسری کی تکمیل کرتی ہیں۔

موطا امام مالک کی کل شرحیں جو لکھی گئیں ان کی تعداد تیس کے قریب ہے۔ یعنی یہ تیس شرحیں وہ ہیں جو آج لکھی ہوئی موجود ہیں، کتابوں میں ان تذکرہ ہے اور کتب خانوں میں پائی جاتی ہیں۔ موطا امام مالک کی براہ راست شروح کے علاوہ موطا امام مالک پر لوگوں نے کتابیں بھی لکھی ہیں۔ مثلاً موطا امام مالک میں جو احادیث ہیں ان کے رجال پر لوگوں نے کتابیں لکھی ہیں۔ اس کی احادیث میں جو مشکل الفاظ ہیں ان کے حل لغات پر کتابیں آئی ہیں۔ جو غریب الفاظ آئے ہیں ان کی غرابت پر کتابیں ہیں۔ یہ کتابیں کم وبیش ستر کی تعداد میں ہیں۔

مُصَنَّف عبدالرزاق

موطا امام مالک کے بعد دوسری صدی ہجری کے اواخر میں مرتب اور مدوّن ہونے والا سب سے بڑا مجموعہ مُصَنَّف عبدالرزاق ہے۔ مصنف عبدالرزاق بارہ جلدوں میں چھپی ہے۔ اب

اس کا دوسرا ایڈیشن بھی آیا ہے۔ یہ بارہ جلدیں مصنّف کے نام سے مشہور ہیں۔ مصنّف اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں احادیث کے ساتھ ساتھ صحابہ اور تابعین کے اقوال اور فتاویٰ بھی موجود ہوں۔ اس لئے مصنف عبدالرزاق صحابہ اور تابعین کے فتاویٰ کا ایک بہت بڑا ماخذ ہے۔ اس میں تابعین کے فتاویٰ کے ساتھ ساتھ جو نمایاں تبع تابعین ہیں اور ان میں بھی جو بڑے فقہا ہیں جن میں خود امام عبدالرزاق بھی شامل ہیں، ان کے فتاویٰ کا ایک بڑا مجموعہ شامل ہے۔ امام عبدالرّزاق بہت سے محدثین کے استاد ہیں۔ بہت سے محدثین نے ان سے کسب فیض کیا۔ علم حدیث اور علم فقہ دونوں میں ان کا بہت اونچا مقام ہے۔

امام عبدالرّزاق کے بعد ایک اور مُصَنَّف، (مُصَنِّف سے مراد تو وہ آدمی ہے جس نے کوئی کتاب تصنیف کی ہو۔ لیکن مصَنَّف ن کے زبر کے ساتھ، کا مطلب ہے وہ کتاب جو تصنیف کی گئی ہو۔ علم حدیث کی اصطلاح میں مصنَّف سے مراد حدیث کی ایک خاص انداز والی کتاب ہے جس میں تمام ابواب پر حدیثیں مرتب کی گئی ہوں اور صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے اجتہادات اور اقوال سب موجود ہوں۔) ابوبکر بن ابی شیبہ کی مصنَّف بھی ہے جس کے کئی ایڈیشن نکلے ہیں کوئی بارہ جلدوں میں ہے کوئی دس میں ہے کوئی پندرہ میں ہے کوئی سولہ میں ہے۔ ابوبکر بن ابی شیبہ کی وفات 235ھ میں ہوئی۔ اس لئے یہ دوسری صدی ہجری کے اواخر اور تیسری صدی ہجری کے اوائل کے محدث ہیں۔ ان کے اساتذہ میں امام سفیان بن عیینہ، عبداللہ بن مبارک، وکیع بن الجراح، امام شافعی کے استاد اور یحییٰ بن سعید قطان جیسے جید ترین محدثین شامل ہیں۔ ان کے براہ راست تلامذہ میں امام احمد، امام بخاری، امام مسلم، ابن ماجہ، ابوزرعہ اور ابوحاتم رازی جیسے لوگ شامل ہیں۔ مصنف ابی بکر بن ابی شیبہ کی ترتیب فقہی ابواب پر ہے۔ یعنی وہ مسائل جو فقہی نوعیت کے ہیں۔ مثلاً پہلے طہارت کے ابواب ہیں، پھر وضو کے ابواب ہیں، پھر نماز کے، پھر روزے کے، پھر حج کے پھر نکاح وطلاق وغیرہ کے ابواب ترتیب سے موجود ہیں۔ عملی مسائل کے متعلق ابواب کی ترتیب کے ساتھ یہ کتاب فقہیات حدیث کا بہت بڑا ماخذ ہے اور احادیث احکام کا سب سے بڑا اور جامع مجموعہ ہے اور اتنا ضخیم ہے کہ پندرہ سولہ جلدوں میں آیا ہے۔ اس لئے احادیث احکام ساری کی ساری اس میں آگئی ہیں۔

مسند امام احمد بن حنبلؒ

اس کے بعد مشہور ترین مجموعہ 'مسند امام احمد بن حنبلؒ ' ہے۔ امام احمد بن حنبل کی وفات 241ھ میں ہوئی۔ اس میں جو احادیث ہیں وہ غالباً اور یجنل مجموعوں میں تعداد کے اعتبار سے سب سے زیادہ ہیں۔ کم از کم اس بارہ میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ کتاب احادیث کے چند ضخیم ترین اور جامع ترین والے مجموعوں میں سے ایک ہے۔ اس مجموعہ کی اہمیت کے اظہار کے لئے امام احمد کا نام نامی کافی ہے۔ امام احمد کے بارے میں غالباً علامہ ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ انسان کے متبع سنت اور محبّ سنت ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ اس کو امام احمد سے محبت ہو۔ یعنی جس کو امام احمد سے محبت ہوگی اس کو سنت رسول سے محبت ہوگی۔ جس کو سنت رسول سے محبت ہے اس کو لازماً امام احمد بن حنبل سے محبت ہوگی۔ ایک اور بزرگ کا قول ہے 'لایحبہ الا مومن تقی' ان سے محبت نہیں رکھ سکتا سوائے اس شخص کے جو متقی مومن ہو،' ولا یبغضہ الا منافق شقی' اور ان سے نفرت نہیں رکھ سکتا سوائے اس شخص کے جو بدبخت منافق ہو۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ کس درجہ کے انسان ہیں۔

امام احمد کے اساتذہ کا بھی بیان کرنے کی ضرورت نہیں اور ان کے تلامذہ کا بھی بیان کرنے کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ وہ اس درجہ کے انسان ہیں کہ ان کے اساتذہ کا نام لینے سے ان کی عظمت میں اضافہ نہیں ہوسکتا۔ اور نہ ہی ان کے تلامذہ کا نام لینے سے ان کی بڑائی میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ امام احمد کا نام لے کر ان کے اساتذہ کی عظمت میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ اسی طرح ان کے تلامذہ کی عظمت میں بھی امام احمد کی نسبت کی وجہ سے اضافہ ہوسکتا ہے۔ امام احمد کے سب سے نمایاں استاد امام شافعی ہیں۔ جن کا انہوں نے انتہائی اہتمام سے ہر جگہ ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ میں نے تیس سال سے کوئی نماز ایسی نہیں پڑھی جس کے بعد میں نے امام شافعی کے لئے دعا نہ کی ہو۔ امام شافعی سے کتنا کسب فیض کیا ہوگا، کتنا کچھ ان سے سیکھا ہوگا جس کے اعتراف کے میں تیس سال انہوں نے امام شافعی کے لئے دعا کی۔ بقیہ اساتذہ سے بھی یقیناً سیکھا ہوگا، لیکن امام شافعی سے بہت زیادہ سیکھا۔

امام احمد بن حنبل جب درس دیا کرتے تھے تو ایک ایک وقت میں پانچ پانچ ہزار طلبہ

درس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ امام بخاری، امام مسلم اور امام ابوداؤد براہ راست ان کے شاگردوں میں شامل ہیں۔اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان کے شاگرد بھی کس شان کے ہیں۔

امام احمد نے جب یہ کتاب مرتب کی تو اس میں تیس ہزار احادیث شامل کیں۔ یہ تیس ہزار احادیث وہ تھیں جن پر امام احمد مسلسل نظر ثانی کرتے رہتے تھے۔اور ہر تھوڑے وقفہ کے بعد اس کا نیا نسخہ (version) تیار کیا کرتے تھے۔ پھر رکھ دیا کرتے تھے کہ ابھی مزید غور وخوض کرنا ہے۔اس طرح پوری زندگی اس ایک کتاب پر غور وحوض کرتے رہے۔اس کے الگ الگ اجزا گویا پمفلٹس کی شکل میں یا الگ الگ ابواب کی شکل میں ان کے پاس موجود تھے،اس لئے کہ ہر نظر ثانی کے بعد ایک نیا ورژن تیار ہوتا تھا۔

جب امام احمد کا انتقال ہوگیا تو ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن احمد نے (جو ان کے شاگرد اور خود بھی بہت بڑے محدث تھے) اس کتاب کی تہذیب وتکمیل کی۔انہوں نے اس کتاب میں تقریباً دس ہزار احادیث کا مزید اضافہ کیا۔ یہ دس ہزار نئی احادیث پانچ اقسام میں تقسیم ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جس کی روایت عبداللہ بن احمد بن حنبل براہ راست اپنے والد سے کرتے ہیں۔ یہ تو اسی درجہ کی مستند ہیں جس درجہ کی امام احمد کی اصل مرویات ہیں۔ بقیہ جو چار درجے ہیں ان کے بارے میں محدثین میں مختلف انداز کے تبصرے اور خیالات کا اظہار ہوتا رہا۔ کچھ احادیث وہ ہیں جو عبداللہ بن احمد نے اپنے والد کے علاوہ دوسرے اساتذہ سے حاصل کیں، وہ بھی انہوں نے اس میں شامل کردیں۔ پھر عبداللہ کے ایک رفیق کار تھے جن کا لقب قطیعی تھا(پورا نام مجھے اس وقت یاد نہیں آرہا) انہوں نے کچھ احادیث کا اضافہ کیا۔ قطیعی کی احادیث کا درجہ نسبتاً کم ہے اور گرا ہوا ہے۔لیکن مسند میں پتہ چل جاتا ہے اور معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ براہ راست امام احمد کی مرویات ہیں، یہ عبداللہ بن احمد بن حنبل کے اضافے ہیں اور ان کے اضافوں میں یہ امام احمد سے لئے ہوئے ہیں اور یہ بقیہ اساتذہ سے۔اس لئے مسند امام احمد کی مرویات میں کوئی التباس نہیں ہوتا کہ ان میں امام احمد کی روایات کون سی ہیں اور باقی کون سی ہیں۔آج جو مسند امام احمد ہمارے پاس موجود ہے جس میں کم وبیش چالیس ہزار احادیث ہیں ان میں تیس ہزار براہ راست امام احمد کی مرتب کی ہوئی ہیں اور دس ہزار عبداللہ کی اضافہ کی ہوئی ہیں جن کی پانچ قسمیں ہیں اور ہر قسم کی احادیث کی الگ الگ شناخت ہوسکتی ہے۔

امام احمد کی یہ کتاب غیر معمولی علمی مقام رکھتی ہے۔ لیکن اس سے استفادہ بڑا مشکل تھا۔ آج بھی اس کتاب سے براہ راست استفادہ بڑا مشکل ہے۔ اس لئے کہ یہ مسند ہے اور مسند حدیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں جس کی ترتیب صحابہ کرامؓ کی بنیاد پر ہو۔ اس کتاب میں سب سے پہلے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی مرویات ہیں، پھر حضرت عمر فاروقؓ کی اور بقیہ عشرہ مبشرہ کی، پھر بقیہ صحابہ کرامؓ کی۔ اب کوئی آدمی جو علم حدیث سے زیادہ واقف نہیں ہے، وہ مسند امام احمد میں کوئی حدیث تلاش کرنا چاہے تو پہلے اس کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس حدیث کے اصل راوی کون سے صحابیؓ ہیں۔ جب تک یہ معلوم نہ ہو مسند امام احمد میں کسی حدیث کا تلاش کرنا بڑا دشوار کام ہے۔ لیکن الحمد للہ اب یہ کام بہت آسان ہو گیا۔ اس لئے کہ ایک تو وینسنک کی انڈیکس آ گئی ہے۔ وینسنک کی انڈیکس ضرور دیکھ لیجئے گا۔ وینسنک ایک ڈچ مستشرق تھا جس نے مستشرقین کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ مل کر صحاح ستہ سمیت بڑی حدیث کی نو بڑی کتابوں کا ایک انڈکس تیار کیا جس میں صحاح ستہ، مسند امام احمد اور موطا امام مالک اور سنن دارمی شامل ہیں۔ ان نو کتابوں کا اس نے ایک **Word Index** تیار کیا ہے۔ حدیث کا کوئی ایک لفظ بھی آپ کو یاد ہو تو حروف تہجی کی ترتیب سے وہ اس میں شامل ہے۔ آپ اس انڈکس کی مدد سے اسے تلاش کر سکتی ہیں۔

اس انڈکس میں ان نو کتابوں کے ایک ایک مخصوص ایڈیشن کا حوالہ دیا گیا ہے۔ وہ ایڈیشن جن کا حوالہ ونسنک نے دیا ہے وہ پچھلی صدی کے چھپے ہوئے ایڈیشن تھے، تیرھویں صدی کے اواخر یا چودھویں صدی کے بہت شروع کے چھپے ہوئے تھے۔ آج وہ ایڈیشن نہیں ملتے۔ حال ہی میں کسی ادارہ نے، غالباً کسی عرب ملک میں اس پرانے ایڈیشن کا ایک نیا ایڈیشن فوٹو کاپی سے چھاپ دیا ہے اور وہ ساری کی ساری نو کتابیں پچیس تیس جلدوں میں ایک ساتھ چھاپ دی ہیں تاکہ اگر اس انڈکس سے استفادہ کرنا ہو تو اس نئے ایڈیشن کی مدد سے آپ استفادہ کر سکیں۔ اس نئے ایڈیشن سے کام نسبتاً آسان ہو گیا ہے۔

لیکن ایک اور بڑا کام مسند امام احمد پر بیسویں صدی کے وسط میں ہوا۔ یہ کام مشہور مجاہد اسلام، داعیٔ اسلام اور شہید اسلام شیخ حسن البنا کے والد احمد عبدالرحمٰن البنا نے کیا۔ حسن البنا شہید کے والد احمد عبدالرحمٰن البنا الساعاتی جو اپنی روزی کے لئے گھڑی سازی کا کام کرتے تھے۔ (ایک بہن نے پوچھا تھا کہ محدثین کماتے کہاں سے تھے تو حسن البنا کے والد نے پوری زندگی علم حدیث

کی خدمت کا کام کیا۔لیکن گھڑیوں کی ایک دکان تھی جس سے ان کی آمدنی ہوتی تھی۔ چند گھنٹے وہاں بیٹھا کرتے تھے اس کے بعد بقیہ وقت علم حدیث کی خدمت میں صرف کرتے تھے۔اسی وجہ سے ان کا لقب الساعاتی پڑ گیا۔) انہوں نے مسند امام احمد کو ایک نئی ترتیب سے مرتب کیا جس کا نام ہے'الفتح الربانی فی ترتیب المسند الامام احمدبن حنبل الشیبانی'۔الفتح الربانی میں انہوں نے ان تمام احادیث کو ایک نئے موضوعاتی انداز میں مرتب کردیا۔اب آپ اس میں سبجیکٹ وائز احادیث تلاش کرسکتی ہیں۔اسی طرح سے انہوں نے ان احادیث کی ایک شرح بھی لکھی جس کا نام انہوں نے رکھا' بلوغ الامانی'۔یہ بلوغ الامانی اور فتح الربانی دونوں ایک ساتھ بہت ساری جلدوں میں چھپی ہیں اور کتب خانوں میں عام طور پر مل جاتی ہیں۔

امام احمد ابن حنبل کی مسند کے ساتھ ساتھ ایک اور مسند کا حوالہ اور تذکرہ بھی ملتا ہے۔ لیکن افسوس کہ وہ مسند آج موجود نہیں ہے اور صرف تاریخ کی کتابوں میں اس کا تذکرہ ملتا ہے، وہ مسند امام بقی بن مخلد نے مرتب کی تھی۔بقی بن مخلد کا تعلق اسپین سے تھا۔قرطبہ کے رہنے والے تھے۔ان کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ انہوں نے چھ مرتبہ مشرق ومغرب کا سفر کیا۔مشرق ومغرب سے مراد یہ ہے کہ سپین سے نکلے اور سمرقند و بخارا تک گئے۔اس طرح انہوں نے پوری دنیائے اسلام کا چھ مرتبہ سفر کیا اور احادیث کا سب سے بڑا مجموعہ مرتب کیا۔وہ مجموعہ افسوس کہ ضائع ہو گیا اور ہم تک نہیں پہنچا۔لیکن اس کے بارے میں جو تفصیلات احادیث کی کتابوں میں ملتی ہیں وہ بڑی عجیب وغریب ہیں۔اس کتاب کی ضخامت کا اندازہ ہم اس بات سے کرسکتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل نے جن صحابہ کی احادیث اپنی مسند میں جمع کیں ان کی تعداد 695 ہے۔جبکہ امام بقی بن مخلد نے اپنی مسند میں سولہ سو صحابہ سے احادیث جمع کی تھیں۔تقریباً دوگنی سے زیادہ اس کی جلدیں ہوں گی اور احادیث کی تعداد بھی اسی حساب سے دوگنے سے زائد ہوگی۔

الجامع الصحیح، امام بخاری

امام احمد بن حنبلؒ کی مسند کے بعد جو اہم ترین، مقبول ترین اور اعلیٰ ترین مجموعہ ہے وہ امام بخاری کی الجامع الصحیح ہے۔امام بخاری کی وفات 256ھ میں ہوئی۔ایک مصرعہ یاد رکھئے گا۔ کسی نے لکھا ہے۔

میلادہ صدق، ان کی ولادت صدق ہے،

وعاش حمیداً، وہ قابل تعریف ہو کر زندہ رہے،

وانقضیٰ فی نور، اور نور میں ان کی وفات ہوئی۔

ابجدی تعداد کے حساب سے نور کا عدد 256ھ ہے۔ 256ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ ولادت ان کی صدق یعنی 194ھ ہے اور حمید کے جتنے نمبر بنتے ہیں اتنی ان کی عمر ہے۔ کتاب کا پورا نام ہے 'الجامع الصحیح المسند المختصر من حدیث رسول اللہ ﷺ و امورہٗ۔

امام بخاری نے جن لوگوں سے کسب فیض کیا ان میں خود امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، علی بن المدینی، یحیٰ بن معین، قتیبہ بن سعید اور مکی بن ابرہیم شامل ہیں۔ مکی بن ابراہم وہ محدث ہیں جن سے ثلاثیات روایت ہوئی ہیں۔ مکی بن ابراہیم کے ذریعے جو احادیث روایت ہوئی ہیں ان کا بڑا حصہ ثلاثیات ہے۔ امام بخاری اور رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کے درمیان صرف تین واسطے ہیں۔ امام بخاری نے سولہ سال اس کتاب کی ترتیب میں لگائے اور چھ لاکھ احادیث میں سے ان کو منتخب کیا۔

امام بخاری سے پہلے جتنے مجموعے کتب حدیث کے تھے، باستثنا مسند امام احمد کے، وہ اکثر و بیشتر امام بخاری نے اس کتاب میں سمو دیئے ہیں۔ امام بخاری نے کُل احادیث جو اس میں لکھی ہیں ان کی تعداد دس ہزار سے کچھ کم ہے۔ لیکن اس میں تکرار بھی شامل ہے۔ اس میں ایک حدیث کی مختلف روایات اور سندیں بھی شامل ہیں، ان سب کو نکال کر جو احادیث بنتی ہیں وہ دو ہزار چھ سو دو کے قریب ہیں۔

امام بخاری کی اس کتاب کو غیر معمولی مقبولیت اور غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ غالباً حدیث کی کسی کتاب یا کسی محدث کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جتنی امام بخاری کی کتاب کو حاصل ہوئی۔ امام بخاری نے ابھی اس کتاب کو مرتب کرنے کا عمل شروع کیا تھا اور اس ترتیب کے کام میں مشغول تھے کہ وہ جہاں جاتے تھے ان کی شہرت ان سے پہلے پہنچ جاتی تھی۔ امام مسلم نے بیان کیا ہے کہ جب وہ نیشاپور تشریف لائے تو ان کا ایسا استقبال ہوا جیسا بادشاہوں اور فرمانرواؤں کا ہوتا ہے۔ بڑے پیمانے پر لوگ ان کی طرف رجوع ہوئے۔ بڑے بڑے محدثین اور فقہا کے حلقے سُونے پڑ گئے، لوگ اُمڈ اُمڈ کر امام بخاری کے حلقہ میں آتے تھے۔ لوگوں نے ان پر

اپنی جانیں نچھاور کیں۔ جب امام بخاری ایک طویل سفر کے بعد آخری مرتبہ اپنے وطن بخارا واپس تشریف لے گئے تو پورے شہر نے ان کا استقبال کیا۔ شہر کے لوگوں کو اس کا اندازہ تھا کہ انہیں کیسا اعزاز حاصل ہوا ہے کہ امت کی طرف سے ان کے شہر کے ایک فرزند کو امیر المومنین فی الحدیث کا لقب دیا گیا اور ان کی مرتب کی ہوئی کتاب اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار پائی۔ اس لئے پورا شہر بشمول حاکم وقت کے ان کے استقبال کے لئے نکل آیا۔ لوگوں نے فرط مسرت سے ان کے قافلے پر درہم اور دینا نچھاور کئے اور اس طرح امام بخاری اپنے وطن واپس تشریف لے آئے۔

ایک محفل میں، جہاں امام بخاری احادیث بیان فرما رہے تھے، امام مسلم بھی حاضر تھے۔ امام مسلم کا درجہ بھی کم نہیں ہے۔ امام مسلم درس کے دوران خوشی سے اتنے بے تاب ہو گئے کہ بے اختیار کہا اے امیر المومنین مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کے پاؤں چوم لوں۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ امام بخاری کس درجہ کے انسان ہوں گے۔ ان کے استاد امام احمد بن حنبل کا کہنا ہے۔ اور یہ گواہی کسی کچے انسان کی نہیں بلکہ امام احمد بن حنبل کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ارض خراسان نے محمد بن اسماعیل سے بہتر کوئی انسان پیدا نہیں کیا۔ یہ محمد بن اسماعیل امام بخاری تھے۔

آپ کو معلوم ہے کہ پرانے زمانے میں ہر بڑی کتاب میں کتاب کے نام سے موضوع کا عنوان ہوتا تھا: کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ وغیرہ۔ اس طرح صحیح بخاری میں جو کتابیں ہیں ان کی تعداد 160 ہے۔ کتاب الایمان، کتاب العلم، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ وغیرہ وغیرہ، یہ کتابیں 160 ہیں۔ ہر کتاب میں کئی کئی ابواب ہیں۔ مجموعی طور پر کل تین ہزار چار سو پچاس (3450) ابواب ہیں۔ احادیث کی کل تعداد مکررات کو نکال کر دو ہزار چھ سو دو ہے۔ جن میں سے بائیس ثلاثیات ہیں۔

کتاب کی ترتیب کے ضمن میں امام بخاری نے پہلے یہ کیا کہ اس کتاب کے ابواب کا ایک نقشہ مرتب کیا کہ اس کے ابواب کیا کیا ہوں گے۔ ان تمام ابواب کا نقشہ مرتب کرنے کے بعد مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ مسجد نبوی میں گئے اور روضہ رسول ﷺ پر حاضری دی۔ وہاں دو رکعات نماز پڑھ کر انہوں نے اس کتاب کو لکھنے کا آغاز کیا اور سولہ سال اس کتاب کو لکھتے رہے اور احادیث کی چھان پھٹک کرتے رہے۔ بعض ابواب ایسے ہیں کہ جو صرف عنوان ہی سے عبارت ہیں، ان میں کوئی حدیث نہیں ہے۔ آپ صحیح بخاری دیکھیں تو دس بارہ جگہیں ایسی ملیں گی

جہاں امام بخاری نے صرف باب کا لفظ لکھا ہے یا صرف عنوان دیا ہے لیکن حدیث کوئی نہیں لکھی۔ وجہ یہ ہے کہ جس درجہ کی سند اور جس معیار کی روایت وہ دینا چاہتے تھے اس معیار کی کوئی روایت نہیں ملی، اس لئے انہوں نے باب کا عنوان خالی چھوڑ دیا اور حدیث نہیں لکھی۔

امام بخاری نے جتنی احادیث نقل کی ہیں وہ سب کی سب صحیح لعینہ ہیں۔ اس میں صحیح لغیرہ بھی کوئی نہیں ہے۔ اکثر احادیث مستفیض ہیں۔ مستفیض صحیح لعینہ کی اس قسم کو کہتے ہیں جس کو ہر درجہ میں کم سے کم تین راویوں نے روایت کیا ہو۔ تین صحابیوں نے لفظاً یا معناً روایت کیا ہو، پھر تین تابعین نے پھر تین تبع تابعین نے۔ اس لئے اس کی بیشتر احادیث بڑی تعداد میں مستفیض ہیں۔ صحیح بخاری کی کچھ احادیث عزیز ہیں۔ عزیز ان احادیث کو کہا جاتا ہے جن کو ہر درجہ میں دو راویوں نے روایت کیا ہو اور بہت تھوڑی احادیث ہیں جو اخبار آحاد ہیں۔ خبر واحد یا اخبار آحاد ان احادیث کو کہتے ہیں جن کو کسی ایک یا دو درجوں میں صرف ایک راوی نے روایت کیا ہو۔

صحیح بخاری میں مکررات وغیرہ کو ملا کر کل احادیث نو ہزار بیاسی 9082 ہیں۔ ان مکررات وغیرہ کو نکال کر کل احادیث کی کل تعداد دو ہزار چھ سو دو 2602 ہے اور جو تعلیقات ہیں ان کی تعداد بھی کئی سو ہے۔ موقوفات علی الصحابہ کا بعض لوگ شمار کرتے ہیں بعض نہیں کرتے۔

صحیح بخاری کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کی کوئی مثال امت مسلمہ کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ دیگر اقوام کا میں نہیں کہہ سکتا، لیکن بظاہر اور اقوام میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسانی تاریخ میں کسی انسان کی علمی کاوش کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جتنی امام بخاری کی کتاب کو حاصل ہوئی۔ اس کی سینکڑوں شرحیں لکھی گئیں جن میں سے 53 شرحیں وہ ہیں جن کا ذکر حاجی خلیفہ نے کشف الظنون نے میں کیا ہے۔ حاجی خلیفہ ڈیڑھ دو سو سال پہلے ایک ترکی عالم گزرے ہیں۔ انہوں نے اسلامی علوم وفنون کی تاریخ اور ببلیوگرافیکل ہسٹری پر ایک کتاب کئی جلدوں پر مشتمل لکھی ہے جس کا نام کشف الظنون ہے۔ اس میں انہوں نے 53 شرحوں کا ذکر کیا ہے۔ امام بخاری کے ایک شارح ہیں مولانا عبدالسلام مبارکپوری جن کی ایک کتاب 'سیرت البخاری' مشہور ہے، اس میں انہوں نے 143 شرحوں کا ذکر کیا ہے۔ میں نے اس کتاب کو کچھ دن پہلے دیکھا۔ بعض اردو کی شرحیں جو ان کے زمانے میں لکھی جا چکی تھیں اس کتاب میں ان کا ذکر نہیں ہے اور یہ کتاب 'سیرت البخاری' بھی کم وبیش ستر سال پہلے لکھی گئی تھی۔ اس دوران بھی کئی شرحیں لکھی

گئیں جن کا ذکر بھی اس کتاب میں نہیں ہے۔ اس لئے ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ آج امام بخاری کی اس کتاب کی کم وبیش دوسو شرحیں موجود ہوں گی۔ ایک محتاط اور محفوظ اندازہ دو سو کا کیا جا سکتا ہے۔ یہ شرحیں عربی، فارسی، اردو، انگریزی، فرانسیسی اور ترکی زبانوں میں لکھی گئی ہیں۔ ان چھ زبانوں میں تو بہت سی شرحیں میرے علم میں ہیں اور ان میں سے بیشتر کو میں نے خود دیکھا ہے اس لئے میں کہہ سکتا ہوں۔ ممکن ہے دوسری زبانوں میں بھی صحیح بخاری کی شرحیں موجود ہوں جن کا مجھے علم نہیں۔

صحیح بخاری کی عربی زبان میں چار شرحیں مشہور ہیں۔ جو چار مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں۔ سب سے مشہور شرح، جس کے بارے میں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ **The Commentry *par excellance*** ہے وہ حافظ ابن حجر کی فتح الباری ہے۔ ابن خلدون نے لکھا تھا۔ ابن خلدون کا زمانہ حافظ ابن حجر سے ذرا پہلے کا ہے۔ انہوں نے جہاں یہ بحث کی کہ صحیح بخاری افضل ہے یا صحیح مسلم افضل ہے، اور یہ رائے دی کہ صحیح بخاری افضل ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ یہ کتاب جس درجہ کی ہے اس درجہ کی شرح ابھی تک نہیں لکھی گئی اور یہ امت مسلمہ کے ذمہ ایک فرض کفایہ ہے کہ اس کتاب کی ایک شرح لکھے۔ جب ابن خلدون کے کم وبیش نصف صدی بعد فتح الباری لکھی گئی تو لوگوں نے بالاتفاق کہا کہ جس قرض کا ذکر ابن خلدون نے کیا تھا وہ حافظ ابن حجر نے امت کی طرف سے چکا دیا۔ حدیث کی کسی شرح میں جو معیارات ہونے چاہئیں، جس معیار اور پائے کی شرح ہونی چاہئے اس معیار اور پیمانہ کی شرح حافظ ابن حجر نے فتح الباری کی شکل میں لکھ دی اور صحیح بخاری کی شرح کا حق ادا کر دیا۔ علم روایت، علم درایت، طرق اور علوم حدیث کی جتنی قسمیں میں نے آپ کے سامنے ان گزارشات کے دوران بیان کی ہیں اور جتنی بیان نہیں کیں، وہ سب کی سب صحیح بخاری کی شرح فتح الباری میں استعمال ہوئی ہیں۔

آج سے چند سال پہلے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں یہ تجویز آئی تھی کہ اس کا شرح اردو ترجمہ کرایا جائے۔ چنانچہ ہم نے بہت غور وخوض کے بعد اس ترجمہ کا ایک فارمیٹ تیار کیا اور اس کے بعض اجزا کا ترجمہ کرایا جو آج کل ایڈٹ ہو رہا ہے اور ان شاء اللہ جلد شائع ہوگا۔ اس طرح اردو میں وہ مواد یا اس کا ایک نمونہ ہمارے سامنے آجائے گا جو حافظ ابن حجر نے صحیح بخاری کی شرح میں امت کے سامنے رکھا ہے۔

فتح الباری کے درجنوں ایڈیشن دنیائے اسلام میں نکلے ہیں اور شاید دنیا میں اسلامیات کا کوئی ایسا کتب خانہ نہیں ہے جو فتح الباری سے خالی ہو۔ حافظ ابن حجر جامعہ ازہر میں پڑھاتے تھے اور یہ جامعہ ازہر کے لئے بڑی فضیلت کی بات ہے کہ حافظ ابن حجر وہاں استاد رہے ہیں۔ حافظ ابن حجر کے رفیق کار، ان کے معاصر اور اُتنے ہی درجہ کے فقیہ اور محدث علامہ حافظ بدرالدین عینی تھے۔ انہوں نے بھی صحیح بخاری کی شرح لکھی عمدۃ القاری۔ وہ بھی جامعہ ازہر میں استاد تھے۔ ان کی شرح بھی بڑی غیر معمولی اور بہت مقبول ہے۔ لیکن اللہ نے جو درجہ حافظ ابن حجر کی فتح الباری کو عطا فرمایا وہ غالباً عمدۃ القاری کو حاصل نہیں ہوا۔

عمدۃ القاری میں فقہی مباحث پر زیادہ زور دیا گیا اور صحیح بخاری کے ابواب کے جو عنوانات ہیں جنہیں تراجم ابواب کہتے ہیں علامہ بدرالدین عینی نے ان پر غیر معمولی توجہ دی۔ بدرالدین عینی خود ایک بہت بڑے محدث تھے۔ انہوں نے صحیح بخاری کی اس شرح کے ساتھ ساتھ سنن ابی داؤد بھی شرح لکھی اور بھی بہت سا علمی کام کیا۔ لیکن ان کی کتاب عمدۃ القاری بہت مشہور ہے۔ ضخامت کے اعتبار سے عمدۃ القاری زیادہ بڑی کتاب ہے، لیکن معیار اور کیفیت کے لحاظ سے فتح الباری کا درجہ بہت اونچا ہے۔ ایک حدیث ہے 'لاھجرۃ بعدالفتح'۔ 'فتح مکہ کے بعد ہجرت کی ضرورت نہیں'۔ اس پر بعض لوگوں نے کہا کہ 'لاھجرۃ بعدالفتح' یعنی فتح الباری کے بعد علم حدیث کے لئے اب ہجرت کرنے کی ضرورت نہیں۔ فتح الباری کا یہ مقام ومرتبہ ہے۔

صحیح مسلم

صحیح بخاری کے بعد صحیح مسلم کا درجہ آتا ہے۔ امام مسلمؒ کے اساتذہ میں خود امام بخاری، امام احمد بن حنبل اور امام شافعی کے ایک براہ راست شاگرد حرملہ بن یحییٰ بھی شامل ہیں۔ اس لئے امام مسلم کو دو بڑے محدثین سے براہ راست اور ایک بڑے فقیہ سے بالواسطہ کسب فیض کا موقع ملا۔ امام شافعی سے ان کے شاگرد کے ذریعے اور امام احمد سے براہ راست۔ امام صاحب نے امام اسحاق بن راہویہ سے بھی براہ راست کسب فیض کیا۔ لیکن ان کے خاص اساتذہ قتیبہ بن سعید اور ابوعبداللہ القعنبی تھے۔ مسلم میں ان دونوں کی روایات کثرت سے ملیں گی۔ آپ دیکھیں گے حدثنی القعنبی، اخبرنی القعنبی، حدثنا قتیبة بن سعید۔ ان دونوں شیوخ کی بہت

احادیث آپ کو صحیح مسلم میں کثرت سے ملیں گی۔ یہ امام مسلم کے خاص اساتذہ میں سے تھے۔ امام مسلم کی صحیح میں بلاتکرار چار ہزار احادیث ہیں۔ صحیح مسلم کے بعض خصائص کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے موازنہ کے بارے میں بھی بات ہوگئی ہے۔

صحیح مسلم کی دو شرحیں مشہور ہیں۔ ایک کا ذکر کل کریں گے۔ دوسری مشہور شرح امام نووی کی ہے جو بہت مشہور اور مقبول ہے۔ چھپی ہوئی ہے اور ہر جگہ دستیاب ہے اور مسلم کی شرحوں میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ امام مسلم کی کتاب صحیح بخاری کے بعد بلند ترین درجہ رکھتی ہے۔ بعض علما کا کہنا ہے کہ وہ صحیح بخاری سے بھی افضل ہے، چنانچہ مغرب کے بعض علما کا یہی خیال تھا کہ وہ صحیح بخاری سے افضل ہے۔

صحیح مسلم کے بعد جو چار کتابیں ہیں ان میں مختلف حضرات نے مختلف کتابوں کا درجہ مختلف رکھا ہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ سب سے اونچا درجہ سنن ابوداؤد کا ہے، بعض کا کہنا ہے کہ جامع ترمذی کا ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ سنن نسائی کا درجہ اونچا ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ مختلف خصوصیات کے باعث ان تینوں کتابوں کا درجہ اپنی اپنی جگہ اونچا ہے۔ سنن ابوداؤد اس اعتبار سے خاص مقام رکھتی ہے کہ وہ احادیث احکام کا ایک بڑا مجموعہ ہے جو ایک جگہ دستیاب ہے اور احادیث احکام میں صحیح ترین احادیث کا مجموعہ ہے، سنن ابوداؤد کا اس لحاظ سے درجہ بہت اونچا ہے۔ علم حدیث کے مختلف علوم وفنون کو ایک ساتھ سمو دینے کے اعتبار سے جامع ترمذی کا درجہ اونچا ہے اور صحت متن اور صحت نقل کے اعتبار سے سنن نسائی کا درجہ ہے۔ اس لئے جس ترتیب سے بھی بیان کریں ان تینوں میں سے کوئی نہ کوئی کتاب اس کی مستحق ہوگی کہ صحیحین کے بعد اس کا درجہ ہو۔ امام ابوداؤد صف اول کے محدثین میں سے ہیں۔ ہمارے بلوچستان کے غالباً ضلع قلات یا خضدار سے ان کا تعلق ہے اس لئے پاکستانی ہیں۔ ان کے اساتذہ میں امام احمد، یحیٰ بن معین، قتیبہ بن سعید (جو امام مسلم کے بھی استاد ہیں)، ابوبکر بن ابی شیبہ اور اسحاق بن راہویہ شامل ہیں اور بڑے محدثین میں سے امام نسائی ان کے شاگرد ہیں۔ کچھ لوگ امام ابوداؤد کو پہلے لکھتے ہیں کہ ترمذی اور نسائی ان کے شاگردوں میں ہیں۔ اس لئے استاد کا ذکر پہلے اور شاگرد کا ذکر بعد میں کیا جاتا ہے۔

سنن ابوداؤد

امام ابوداؤد اس کتاب کے علاوہ بھی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ان کا علمی مقام اس کتاب سے پہلے بھی بہت غیر معمولی اور مشہور ومعروف تھا۔جب وہ بصرہ تشریف لائے تو بصرہ کا گورنران سے ملنے کے لئے حاضر ہوا اور کہا کہ میری تین گزارشات اگر آپ قبول کرلیں تو میں بہت شکرگزار رہوں گا۔ایک یہ کہ آپ بصرہ میں کچھ دن قیام فرمائیں تاکہ اہل بصرہ آپ سے استفادہ کرسکیں۔دوسرا یہ کہ آپ اہل بصرہ کے لئے خاص طور پر علم حدیث کی درس وتدریس کا کوئی حلقہ قائم کریں۔اور تیسری گزارش یہ ہے کہ میرے دو بچوں کو الگ سے کوئی وقت دے دیں کہ جس میں آکر وہ آپ سے علم حدیث پڑھا کریں۔آپ نے فرمایا کہ پہلی دو گزارشات قبول ہیں ۔تیسری گزارش مسترد۔بچوں کو چاہئے کہ بقیہ لوگوں کے ساتھ آکر حدیث پڑھیں۔

سنن ابوداؤد میں پانچ لاکھ احادیث میں سے چار ہزار آٹھ سو **4800** کا انتخاب کیا گیا۔یہ احادیث صرف سنن اور احکام سے متعلق ہیں۔صحاح ستہ میں فقہی احادیث کا سب سے بڑ ماخذ یہی کتاب ہے۔صحاح ستہ کی کسی اور کتاب میں فقہی احادیث اتنی بڑی تعداد میں موجود نہیں ہیں۔اس میں تکرار برائے نام ہے۔کہیں کہیں کوئی حدیث دوبارہ نقل ہوگئی ہے ورنہ ایک حدیث دوبارہ نقل نہیں کی گئی ہے۔اس لئے چار ہزار آٹھ سو احادیث میں اکثر وبیشتر وہ ہیں جو ایک ہی بار بیان ہوئی ہیں۔

یہ کتاب جب سے لکھی گئی ہے ہمیشہ مقبول رہی ہے۔علما اور طلبہ نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ایک محدث نے کہا کہ جس کے پاس سنن ابوداؤد ہے اس کے پاس گویا ایک ایسا پیغمبر ہے جو ہر وقت اس کی رہنمائی کررہا ہے۔یوں تو یہ بات حدیث کی ہر کتاب کے بارے میں صحیح ہے۔لیکن جس نے پہلی بار سنن ابوداؤد کے بارے میں کہی اس نے سنن ابوداؤد کے خاص مقام کو سامنے رکھ کر کہی۔

سنن ابوداؤد کی بھی بہت سی شرحیں لکھی گئیں جن میں سے ایک قدیم شرح امام خطابی کی ہے جو معالم السنن کے نام سے مشہور ہے۔امام خطابی کا زمانہ امام ابوداؤد سے کم وبیش سو سال بعد کا ہے۔امام ابوداؤد کا انتقال 275ھ میں ہوا،امام خطابی کا انتقال 388ھ میں ہوا۔پھر ایک امام منذری تھے جنہوں نے اس کتاب کی تلخیص کی اور اس تلخیص کی شرح علامہ ابن قیم نے

لکھی۔ایک شرح علامہ بدرالدین عینی کی ہے جو نامکمل ہے۔ یہ نامکمل شرح بھی چھ یا سات جلدوں میں ہے۔ابھی حال ہی میں عرب دنیااور پاکستان میں چھپی ہےاور ہر جگہ ملتی ہے۔

علامہ سیوطی نے بھی سنن ابوداؤد کی شرح میں ایک کتاب لکھی 'مرقاۃ الصعود فی شرح ابی داؤد' مرقاۃ الصعود سے مراد وہ سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر آدمی بلندی کی طرف جاتا ہے۔ بارھویں صدی ہجری میں ایک عالم علامہ ابوالحسن سندھی تھے، ہمارے ٹھٹھہ کے رہنے والے۔انہوں نے ایک مختصر شرح لکھی تھی جو فتح الودود کے نام سے مشہور ہےاور کئی بار چھپ چکی ہے۔ابوداؤد کی چار مشہور شرحیں برصغیر میں لکھی گئیں جن کے بارے میں کل تفصیل سے بات ہوگی۔اس کا انگریزی ترجمہ بھی ہے جو ہمارے ایک سابق رفیق کاراور محترم دوست ڈاکٹر احمد حسن مرحوم نے کیا تھا، کئی بار چھپ چکا ہے اس پر انگریزی میں حواشی بھی ہیں اور مختصر شرح بھی ہے۔امام مسلم کی صحیح کا بھی انگریزی ترجمہ ہو چکا ہے جس کی تفصیل کل آئے گی۔یہ ترجمہ پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم نے کیا تھا۔

جامع ترمذی

سنن ابوداؤد کے بعد جامع ترمذی کا درجہ آتا ہے۔امام ترمذی امام بخاری اور امام مسلم دونوں کے براہ راست شاگرد ہیں۔امام ابوداؤد کے بھی شاگرد ہیں۔قتیبہ بن سعید جو امام مسلم کے استاد ہیں وہ امام ترمذی کے بھی استاد ہیں۔ جامع ترمذی جامع ہے۔یعنی حدیث کے آٹھوں ابواب اس میں شامل ہیں۔اس میں عقائد، اخلاق، احکام، تفسیر، فضائل، فتن، اشراط قیامت، علامات قیامت یہ سب موضوعات شامل ہیں۔اس لئے اس کا درجہ جامع کا ہےاوراس طرح سے وہ امام بخاری کی جامع کے برابر ہے۔صحاح ستہ میں امام بخاری اور ترمذی دونوں کی کتابیں جامع ہیں۔

جامع ترمذی کے جو اہم خصائص یا مباحث ہیں ان میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ حدیث کے درجہ کا تعین بھی کرتے ہیں۔وہ پہلے حدیث بیان کرتے ہیں اور پھر اس کا درجہ بیان کرتے ہیں جیسے۔ھذا حدیث حسن، ھذا حدیث صحیح، ھذا حدیث غریب۔اس میں امام ترمذی اپنی اصطلاحات بھی استعمال کرتے ہیں اور کچھ اصطلاحات بقیہ محدثین کی لیتے ہیں۔اس طرح سے ہر حدیث کے بعد پڑھنے والوں کو پتہ چل جاتا ہے کہ امام ترمذی نے اس

حدیث کو کس درجہ پر رکھا ہے۔ پھر امام ترمذی یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اس حدیث سے جو احکام نکلتے ہیں ان احکام میں بقیہ محدثین اور فقہا کی رائے کیا ہے، مثلاً اس بارے میں امام شافعی کیا کہتے ہیں، امام مسلم کیا کہتے ہیں، امام احمد بن حنبل کیا کہتے ہیں، امام مالک کیا کہتے ہیں اور امام ابوحنیفہ کیا کہتے ہیں گویا تمام فقہا کی آراء بھی قاری کے سامنے آجاتی ہیں۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو حدیث کی کسی اور کتاب میں نہیں پائی جاتی۔

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ امام ترمذی ایک باب میں جو احادیث بیان کرتے ہیں وہ بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ 'وفی الباب عن فلان وفلان وفلان، کہ اس موضوع پر فلاں فلاں صحابہ کی احادیث بھی ہیں۔ ان احادیث کو انہوں نے اپنی کتاب میں شامل نہیں کیا۔ یا تو اس کی سند جو امام ترمذی تک پہنچی وہ اس درجہ کی نہیں تھی یا امام ترمذی نے محسوس کیا کہ جو مضمون تھا وہ بقیہ احادیث میں آگیا، یا کسی اور وجہ سے انہوں نے ان احادیث کو شامل نہیں کیا لیکن حوالہ دے دیا کہ اس موضوع پر فلاں احادیث بھی موجود ہیں۔ تلاش کرنے والے تلاش کر سکتے ہیں۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تکرار برائے نام ہے۔ جو حدیث ایک بار آگئی امام ترمذی اس کو دوبارہ نہیں دوہراتے۔ پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ امام ترمذی نے راویوں کے نام اور کنیت پر بڑی بحث کی ہے۔ اس لئے کہ بعض راوی کنیت سے بہت مشہور ہیں اور بعض نام سے مشہور ہیں۔ اگر ایک جگہ کنیت آئی ہو اور دوسری جگہ نام آیا ہو تو یہ التباس ہوسکتا ہے کہ دو آدمی ہیں یا ایک ہی آدمی ہے۔ تو امام ترمذی وضاحت کر دیتے ہیں کہ یہ نام جن بزرگ کا ہے یہ وہی شخصیت ہیں جن کی کنیت یہ ہے۔ مثلاً ابوثور، ابوثور کا نام کچھ اور تھا، یا امام اوزاعی، کہیں اوزاعی آتا ہے کہیں عبدالرحمٰن آتا ہے۔ اب جہاں عبدالرحمٰن آیا ہے وہاں یہ پتہ چلانا کہ یہ امام اوزاعی ہیں ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ امام ترمذی اس کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔

جامع ترمذی کے ضمن میں ایک بات خاص طور پر قابل غور ہے۔ وہ یہ کہ امام ترمذی ان محدثین میں سے ہیں کہ جن کا تساہل جرح وتعدیل میں مشہور ہے۔ امام ترمذی راوی کو عادل قرار دینے میں نرمی سے کام لیا کرتے تھے۔ محدثین نے امام ترمذی اور امام حاکم دونوں کی تعدیل کے بارے میں یہ کہا ہے کہ ان کی رائے قبول کرنے میں احتیاط سے کام لینا چاہئے اور جس راوی کو امام ترمذی اور امام حاکم عادل قرار دیں اس کی عدالت کی دوسری جگہ سے بھی تحقیق کر لینی چاہئے۔

اگر دوسرے محدثین بھی اس کو عادل قرار دیتے ہیں تو وہ عادل ہیں اور اگر دوسرے محدثین اسے مجروح قرار دے رہے ہیں تو پھر محض امام ترمذی کی تعدیل پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔ اگر یہ بات ہے تو امام ترمذی نے جن راویوں کو عادل قرار دے کر ان سے احادیث نقل کی ہیں ان احادیث میں بھی کلام ہوسکتا ہے۔ اس لئے امام ترمذی کی صحیح یا حسن قرار دی ہوئی احادیث میں سے بھی کئی احادیث کے بارے میں کلام ہوا ہے۔ تیئیس (23) روایات وہ ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ شدید درجہ کی ضعیف ہیں۔ اس موضوع پر لوگوں نے کام کیا ہے۔ کئی لوگوں نے زمانہ حال میں جامع ترمذی کے کئی ایسے ایڈیشن بھی شائع کئے ہیں جس میں ہر حدیث کی الگ سے نشاندہی کردی گئی ہے۔

لیکن بہر حال یہ ایک اختلافی رائے رہے گی۔ اگر آج کا کوئی آدمی امام ترمذی جیسے عظیم امام حدیث کی رائے اور ان کی تجریح وتعدیل سے اختلاف کرسکتا ہے تو آج کے آدمی سے بھی اختلاف ہوسکتا ہے۔ امام ترمذی جیسا انسان اگر اپنے زمانے میں کسی حدیث کو ضعیف یا حسن قرار دیں اور آج کا کوئی آدمی یہ کہے کہ اسے امام ترمذی کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے اور وہ حدیث حسن یا صحیح نہیں بلکہ ضعیف ہے۔ تو پھر آج کے آدمی سے بھی کل کے آدمی اختلاف کرسکتے ہیں۔

یہ بات میں اس لئے کررہا ہوں کہ میں نے بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ زمانہ حال کے ایک بزرگ جن کا چند سال قبل انتقال ہوا ہے ان کے شاگردوں میں بڑی شدت پائی جاتی ہے۔ جس حدیث کو ان کے استاد نے ضعیف قرار دیا ہے تو ان کے شاگرد اس کو ضعیف منوانے کے لئے لڑنے مرنے پر تیار ہوجاتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک عرب ملک میں کسی جگہ میری گفتگو یا تقریر تھی۔ میں نے کوئی حدیث بیان کی، تو وہاں ایک صاحب علم جو چالیس بیالیس سال کی عمر کے تھے، وہ ان بزرگ سے کسب فیض کرچکے تھے، انہوں نے محفل میں ایک ہنگامہ برپا کردیا کہ یہ حدیث تو ضعیف ہے اور ہمارے فلاں استاد نے فلاں تحقیق کی ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں آپ کے استاد کی تحقیق کے بارے میں کوئی منفی بات نہیں کہتا۔ سرآنکھوں پر، ظاہر ہے ان کا علم ومرتبہ اور مقام ایسا ہے کہ جو بات وہ کہیں گے وہ قابل احترام ہے۔ لیکن اگر آپ کے استاد کو امام ترمذی سے اختلاف کرنے کا حق پہنچتا ہے تو بقیہ حضرات کو آپ کے استاد سے بھی اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ ان کی اس تحقیق پر بھی لوگوں نے کتابیں لکھی ہیں۔ ابھی حال ہی میں ایک کتاب دمشق

کے ایک عالم نے لکھی ہے جو غالباً چار پانچ جلدوں میں ہے جس میں انہوں نے ان بزرگ کی تصحیح یا تضعیف سے اختلاف کیا ہے۔

میں نام لے ہی دیتا ہوں: علامہ شیخ ناصر الدین البانی، بڑے مشہور اور صف اول کے محدثین میں سے تھے۔ چند سال پہلے ان کا انتقال ہوا ہے۔ اگر بیسویں صدی میں عالم اسلام کے چند عظیم ترین علمائے حدیث کے نام چننے ہوں تو یقیناً ایک نام ان کا ہوگا۔ انہوں نے تمام کتب حدیث کا از سر نو جائزہ لیا اور اپنی تحقیق میں جہاں جہاں جس حدیث کو صحیح یا ضعیف یا حسن قرار دیا اس کی نشاندہی کر دی۔ اب اگر علامہ ناصر الدین البانی امام ترمذی سے اختلاف کر سکتے ہیں تو آج کے اہل علم کو علامہ البانی سے اختلاف کا حق ہونا چاہئے۔ ہمارے لئے تو دونوں سر آنکھوں پر، ہمارے لئے تو دونوں ایسے ہیں کہ وہ آئیں تو بقول امام مسلم کے ہم ان کے پاؤں چوم لیں۔ لیکن اگر علامہ ناصر الدین البانی امام ترمذی سے اختلاف کر سکتے ہیں تو کوئی اور آنے والا علامہ ناصر الدین البانی سے بھی اختلاف کر سکتا ہے۔ اس سے احترام میں کمی یا خدانخواستہ مقام و مرتبہ میں کمی کا سوال نہیں۔ مقام اپنی جگہ، اختلاف رائے اپنی جگہ۔

جامع ترمذی کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں۔ برصغیر کی شرحوں کا کل ذکر کریں گے۔ برصغیر سے باہر کی شرحوں میں دو شرحیں مشہور ہیں۔ ایک علامہ ابوبکر بن العربی کی جو ایک مشہور مالکی فقیہ ہیں۔ ان کی کتاب ہے 'عارضۃ الاحوذی'، یہ مختصر شرح ہے لیکن اچھی شرح ہے۔ دوسری شرح علامہ سراج الدین بلقینیؒ کی ہے۔ یہ مصر کے رہنے والے تھے۔ مسلکاً شافعی تھے۔ ابوبکر بن العربی مالکی تھے۔ گویا ایک شرح مالکی عالم نے کی ہے اور دوسری شرح شافعی عالم نے کی ہے۔ حنفی عالم کی شرح کا ذکر کل کریں گے۔ یہ دونوں شرحیں بڑی مشہور ہیں۔ علامہ سراج الدین بلقینیؒ کی شرح ہے 'العرف الشذی'، علامہ بلقینیؒ قاہرہ کے رہنے والے تھے۔ وہیں ان کا مزار ہے اور وہیں دفن ہوئے۔ امام ترمذی کی اور بھی کئی کتابیں علم حدیث پر ہیں جن کا تذکرہ میں چھوڑ دیتا ہوں۔ ان کی ایک مشہور کتاب 'شمائل ترمذی' ہے جس میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے شمائل کو بیان فرمایا ہے۔ یہ جامع ترمذی ہی کا ایک باب ہے جو الگ سے چھپا ہے۔ گویا ترمذی ہی کی کتاب کا ایک حصہ ہے۔ بعض حضرات نے اس کو الگ بھی چھاپا ہے، اس کی شرحیں بھی لکھی گئیں ہیں اور بہت سی شرحوں کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔

سنن نسائی

ترمذی کے بعد درجہ ہے امام نسائی کی کتاب کا۔ امام نسائی نے دراصل 'السنن الکبریٰ' کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی تھی۔ امام نسائی کی وفات 303ھ میں ہوئی ہے۔ یہ صحاح ستہ کے مصنفین میں زمانہ کے اعتبار سے سب سے آخری آدمی ہیں۔ یعنی ترتیب زمانی میں سب سے آخر میں آتے ہیں۔ لیکن کتاب کی اہمیت اور صحت کی ترتیب میں پانچویں نمبر پر یا تیسرے یا چوتھے نمبر پر آتے ہیں، اس بارے میں میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ تیسرے، چوتھے اور پانچویں میں سے ایک پر آتے ہیں۔ ان کی کتاب 'السنن الکبریٰ' دراصل بڑی کتاب تھی۔ جب وہ لکھی جا چکی اور شائع ہوئی تو رملہ جو فلسطین کا شہر ہے جس کو آج کل رام اللہ کہا جاتا ہے وہاں کا گورنر ایک بہت صاحب علم آدمی تھا۔ امام صاحب کے پاس کسب فیض کے لئے آیا کرتا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ آپ سے گزارش کی کہ لوگوں کے لئے اتنی بڑی کتاب کا پڑھنا اور اس کا نقل کرانا تو بہت دشوار ہوگا، پھر اس میں بعض احادیث ضعاف بھی آ گئی ہیں اور بعض حسن لغیرہ ہیں۔ اس لئے آپ اس کا ایک مختصر نسخہ تیار کریں جس میں صرف صحیح احادیث ہوں اور جو تکرار ہے یا جو احادیث فوری حوالہ کی نہیں ہیں وہ آپ نکال دیں۔ آپ نے 'السنن المجتبیٰ' کے نام سے اس کتاب کا خلاصہ تیار کیا۔ یہی وہ کتاب ہے جو آج کل مروج ہے اور سنن نسائی کہلاتی ہے۔

سنن نسائی اس اعتبار سے بڑی ممتاز ہے کہ صحیحین کے بعد سب سے کم ضعیف حدیثیں اس میں ہیں۔ صحیحین میں تو کوئی نہیں ہے، بقیہ دونوں کتابوں، ابوداؤد اور ترمذی میں ضعاف کی تعداد سنن نسائی کی نسبت زیادہ ہے۔ اس کے رجال یا راوی سنن کی بقیہ کتابوں کے مقابلہ میں زیادہ ہیں۔ بقیہ چار کتابوں میں، ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی اور نسائی میں، نسائی کے رجال سب سے قوی ہیں، اس کے راوی سب سے مستند ہیں اور اس کی شرائط بخاری اور مسلم کی شرائط کے بہت قریب ہیں۔

امام نسائی کو علل الحدیث میں بڑی مہارت تھی۔ انہوں نے علل الحدیث کی جابجا نشاندہی کی ہے۔ امام ترمذی نے بھی علل کی نشاندہی کی ہے لیکن امام نسائی اس میں زیادہ نمایاں ہیں۔ امام ترمذی کی طرح وہ اسماء اور کنیٰ (کنیتوں) کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ اس طرح سے

وہ امام ترمذی سے ملتے جلتے ہیں۔انہوں نے غریب الاحادیث کی بھی شرح کی ہے۔ جہاں مشکل لفظ آئے ہیں ان کی شرح کی ہے۔گویا یہ وہ کتاب ہے جو ابوداؤد اور ترمذی دونوں کی خصوصیات اپنے اندر رکھتی ہے اور ایک اعتبار سے صحیحین کے بعد اسی کا درجہ آتا ہے۔اس لئے کہ ضعیف حدیثیں اس میں سب سے کم ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض حضرات نے اس کو صحیحین کے بعد کا درجہ دیا ہے۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس کتاب کی اس کے شایان شان کوئی شرح نہیں لکھی گئی۔ میں نے بہت تلاش کیا لیکن کسی قدیم شرح کا کوئی سراغ نہیں ملا۔آج سے نہیں بلکہ تیس پینتیس سال پہلے مجھے خیال ہوا کہ اس کتاب کی کوئی باقاعدہ اور مفصل شرح نہیں ہے۔کسی نے ایک فقیر قسم کے آدمی سے پوچھا کہ آج کل کیا کرر ہے ہو۔اس نے کہا کہ بادشاہ کی لڑکی سے شادی کی فکر میں ہوں۔پوچھنے والے نے کہا اچھا، کتنا کام ہوگیا۔اس نے جواب دیا کہ آدھا کام ہوگیا ہے اور آدھا باقی ہے۔اس نے کہا کہ آدھا کیا کام ہوگیا ہے؟ فقیر نے جواب دیا کہ میں تو راضی ہوں اور شہزادی کا راضی ہونا ابھی باقی ہے۔میرا آج سے پینتیس سال پہلے سے یہ خیال ہے کہ مجھے اگر موقع ملا تو سنن نسائی کی شرح لکھوں گا۔اس میں آدھا کام تو ہوگیا کہ میں تیار ہوں۔بقیہ آدھا ہونا ابھی باقی ہے، یعنی شرح لکھی نہیں گئی ہے۔

اس کی جو شرحیں مشہور ہیں وہ صرف دو ہیں۔ایک علامہ محمد بن عبدالہادی سندھی تھے، جن کی وفات **1138** ھ میں ہوئی ہے، ان کا ایک حاشیہ ہے جو عام چھپی ہوئی کتابوں میں ملتا ہے۔اس وقت پاکستان میں سنن نسائی کے جو نسخے ملتے ہیں وہ علامہ سندھی کی اس شرح کے ساتھ ملتے ہیں۔یہ بڑی مختصر شرح ہے جو صرف حاشیہ پر آئی ہے۔دوسری شرح 'زھر الربیٰ' علامہ سیوطی نے لکھی ہے۔وہ بھی بڑی مختصر ہے اور کہیں کہیں حاشیوں پر چھپی ہوئی ملتی ہے۔ان دو کتابوں کے علاوہ کوئی شرح ایسی قابل ذکر مجھے نہیں ملی جو مخطوطہ کی شکل میں ہو یا مطبوعہ شکل میں موجود ہو۔اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ اس کی شرح لکھی جائے جو اسی انداز کی ہو جس انداز کی حدیث کی بقیہ کتابوں کی شرحیں ہیں۔جن میں سے بعض کا تذکرہ کل ہوگا۔

سنن ابن ماجہ

صحاح ستہ کی آخری کتاب امام ابن ماجہ کی ہے۔محمد بن یزید بن ماجہ کی وفات **273** ھ میں ہوئی۔اس لئے یہ امام ابوداؤد کے قریب قریب ہم عصر ہیں۔امام ابوداؤد کی وفات **275** ھ

میں ہوئی۔ ان کی وفات 273ھ میں ہوئی۔ زمانہ اگرچہ دونوں کا قریب قریب ایک ہے۔ لیکن امام ابن ماجہ کی کتاب کا درجہ سب سے آخر میں ہے۔ اس لئے کہ اس میں کمزوری کے اعتبار سے بعض ایسی چیزیں ہیں جو حدیث کی بقیہ کتابوں میں نہیں پائی جاتیں۔ اس میں جو ترتیب اختیار کی گئی ہے وہ احادیث احکام یعنی سنن کی ترتیب ہے۔ اس میں بتیس کتابیں، تین سو پندرہ ابواب اور چار ہزار احادیث ہیں۔ حسن ترتیب کے اعتبار سے یہ تمام صحاح ستہ میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ اس کی ترتیب بہت اچھی ہے۔ تکرار بہت کم ہے۔ اس میں سندیں کم اور متون زیادہ ہیں۔ انہوں نے سندیں صرف متون کے برابر رکھی ہیں اور بعض جگہ ایک سند سے ایک سے زائد متن بھی بیان کئے ہیں۔ ایک سند بیان کی ہے اور کہا ہے کہ اسی سند سے میں نے فلاں فلاں روایات فلاں استاد سے سنی ہیں۔

اس کتاب کے آنے سے پہلے اور اس کے بعد بھی یہ بحث جاری رہی کہ صحاح ستہ کی چھٹی کتاب کون سی ہے۔ اگرچہ محدثین کی اکثریت سنن ابن ماجہ کو ہی صحاح ستہ کا حصہ سمجھتی ہے، لیکن بعض حضرات نے سنن ابن ماجہ کو صحاح ستہ میں شامل نہیں کیا۔ کچھ حضرات کا خیال ہے کہ سنن دارمی صحاح ستہ میں شامل ہے۔ کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ موطا امام مالک صحاح ستہ میں شامل ہے۔ لیکن علما کی غالب اکثریت سنن ابن ماجہ کو صحاح ستہ میں شامل سمجھتی ہے۔

سنن ابن ماجہ میں حدیث کی بقیہ کتابوں کے مقابلہ میں ضعیف احادیث زیادہ ہیں۔ ان کی ٹھیک ٹھیک تعداد کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا بڑا دشوار ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ ان کی تعداد چونتیس ہے، کچھ کا خیال ہے کہ ایک سو کے قریب ہے، کچھ کا خیال ہے کہ ایک سو بتیس یا ایک سو پینتیس کے قریب ہے۔ پھر ضعیف کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا ویسے بھی بہت مشکل ہوتا ہے۔ ایک محدث کی رائے میں ایک حدیث ضعیف ہے دوسرے کی رائے میں وہ ضعیف نہیں ہے یا اتنی ضعیف نہیں ہے۔ پھر ضعاف کے بھی مختلف درجات ہیں، بہرحال اس کتاب میں ضعاف کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے، بعض وہ ہیں جن کا ضعف بہت شدید ہے۔ وہ تقریباً تیس پینتیس کے قریب ہیں۔ بقیہ وہ ہیں جو ضعف کے ہلکے درجے پر ہیں۔

اس کتاب کی شرحیں بھی نسبتاً کم لکھی گئیں۔ برصغیر میں اس کی ایک دو شرحیں لکھی گئیں جن کا ذکر آگے کیا جائے گا۔ برصغیر سے باہر جو شرحیں لکھی گئیں ان میں ایک کتاب ہے علامہ سیوطی

کی 'مصباح الزجاجه فی شرح سنن ابن ماجه'، اور ایک ہے 'ماتمس الیه الحاجة لمن یطالع سنن ابن ماجه'۔

یہ علم حدیث کی بنیادی کتابوں کا مختصر تعارف تھا جس میں صحاح ستہ بھی آگئیں اور ان کے علاوہ بقیہ کچھ کتابیں بھی آگئیں۔ آج کی گفتگو میں یہیں ختم کرتا ہوں۔ ہمارے پاس پندرہ منٹ ہیں سوال جواب کے لئے۔ کل کے سوالات بھی آپ پوچھنا چاہیں تو پوچھ سکتی ہیں۔ کل جمعہ کا دن ہے نسبتاً وقت کم ہوگا، لیکن علم حدیث پر برصغیر میں جو کام ہوا ہے اس کا تذکرہ ہوگا۔ اور ان شاء اللہ برصغیر میں اسلام کے آنے سے لے کر 2003 تک علم حدیث پر جو کام ہوا ہے اس کا تذکرہ اختصار کے ساتھ کروں گا، جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ علم حدیث کی خدمت میں برصغیر کے لوگ دنیائے اسلام کے دوسرے علاقوں سے پیچھے نہیں رہے۔ برصغیر میں علم حدیث اور اس کے متعلقات پر خاصا کام ہوا ہے بلکہ برصغیر کے لوگوں نے ایک زمانے میں دنیائے اسلام کے دوسرے علاقوں کے لوگوں کے مقابلہ میں علم حدیث پر زیادہ کام کیا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

زمانہ کے اعتبار سے صحابہ کرامؓ کے جو طبقات ہیں اس کا علم تو ان لوگوں کے پاس بھی ہوسکتا ہے جو جھوٹی حدیثیں روایت کرتے ہیں۔ تو ایسے میں اگر وہ زمانے کا صحیح تعین کر دیں تو اس میں کیا طریقہ اختیار کیا جاتا تھا؟

ضعیف یا موضوع حدیث کو معلوم کرنے کے تو درجنوں طریقے تھے۔ صرف یہی ایک طریقہ نہیں تھا کہ صحابہ کے زمانہ سے طے کرلیا جائے۔ یہ تو اس کام کے لئے ایک ابتدائی قدم تھا۔ اس کے بعد ایک پورا سفر ہوتا تھا، فرد کا ذاتی کردار، اس کا علمی اور دینی مقام، اس کی شخصیت کے بارہ میں عام تصور، لوگ اس راوی کے بارے میں کیا کہتے ہیں، اس نے علم حدیث کہاں سے حاصل کیا، اس کے استاد سے تحقیق، پھر علم رجال کے بارے میں تفصیلات، اس کے لئے اتنی کاوش کی جاتی تھی کہ لوگوں کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ جعل سازی کرسکیں۔ اگر چہ کچھ لوگوں نے اس کی کوشش کی کہ جعلی حدیثیں گھڑ گھڑ کر مسلمانوں میں پھیلادیں لیکن علما اسلام نے اس فتنہ کو روکنے کا اہتمام پہلے سے کیا ہوا تھا۔

آپ نے کہا کہ امام ترمذی راویوں کے بارے میں نرمی سے کام لیتے تھے۔ اس وجہ سے باقی اماموں نے کہا کہ کسی راوی کو امام ترمذی نے ٹھیک کہا ہے تو اس بارے میں مزید پڑتال کر لینی چاہئے۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ جو حدیث امام ترمذی کی سند سے ہے اس کو نہیں ماننا چاہئے؟

نہیں نہیں۔ امام ترمذی نے اپنی کتاب میں ہر حدیث کا درجہ بیان کر دیا ہے۔ اس لئے امام ترمذی کے ہاں جو احادیث ہیں وہ ساری کی ساری قابل قبول ہیں۔ اس میں کوئی پینتیس چھتیس احادیث کے بارے میں اختلاف ہے جس کی وضاحت موجود ہے۔ ان پینتیس چھتیس کی مزید تحقیق کرلیں۔ باقی کے بارے میں اکثر و بیشتر تحقیق ہوچکی ہے آپ کو اب نئے سرے سے تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ علمائے حدیث نے اتنا کام کر دیا ہے کہ ہمارے لئے پکی پکائی چیز موجود ہے، آپ جو کتاب چاہیں اٹھا کر دیکھ لیں اور کوئی بھی شرح اٹھا کر دیکھ لیں اس میں ساری بحث آپ کو مل جائے گی آپ اس کے مطابق عمل کریں۔

کیا وہ لوگ بھی صحابہ ہوں گے جنہوں نے نبی کو تو دیکھا لیکن اس وقت ایمان نہیں لائے تھے۔

یہ بات تو میں کہہ چکا ہوں کہ جو بعد میں ایمان لائے اور انہوں نے حالت ایمان میں

رسول اللہ ﷺ کی زیارت نہیں کی وہ صحابیؓ شمار نہیں ہوتے۔ صحابیؓ وہ خوش نصیب حضرات شمار ہوتے ہیں۔ جنہوں نے حضورؐ کو حالت ایمان میں دیکھا اور بعد میں اسلام نہیں لائے بلکہ حضورؐ کے زمانے ہی میں اسلام لائے۔ ایک مشہور بزرگ تھے کعب الاحبار، یہ حضورؐ کے زمانہ میں مدینہ میں موجود تھے۔ یہودی تھے انہوں نے حضورؐ کے زمانے میں اسلام قبول نہیں کیا۔ حضورؐ کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ یا حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں اسلام لائے۔ اس لئے ان کا شمار تابعین میں ہوتا ہے، صحابہ میں نہیں۔ حالانکہ وہ مدینہ میں رہتے تھے اس لئے حضورؐ کو بارہا دیکھا۔

آپ کی اتنی اچھی آرزو ہے شرح نسائی لکھنے کے بارے میں کہ دل سے آواز اٹھی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو امام نسائی کی سنن کی شرح لکھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

آپ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ توفیق دے۔ بہرحال یہ ایجنڈے پر موجود ہے۔ بہت ساری چیزیں جو Wish list میں ہیں اس میں یہ بھی شامل ہے۔ میں نے ایک بڑا لفافہ بنا رکھا ہے، اس پر امام نسائی کا نام لکھا ہوا ہے۔ جب بھی امام نسائی سے متعلق کوئی چیز ملتی ہے تو اس لفافے میں اس کی فوٹو کاپی ڈال دیتا ہوں اس خیال سے کہ جب موقع ملے گا تو اس سے کام لیں گے۔

صغار تابعین کی روایت کس طبقہ کے صحابہ سے ہیں؟

صغار تابعین کی روایات کبار تابعین اور صغار صحابہ سے ہیں۔ صحابہ میں جن کا انتقال بہت بعد میں ہوا، وہ پہلی صدی ہجری کے اواخر تک زندہ رہے۔ ان سے روایتیں صغار تابعین کی ہیں اور بقیہ روایات کبار تابعین سے ہیں۔

شرح کی Term کو واضح کریں۔

شرح سے مراد ہے Commentary، یا تشریح۔ یعنی **Commentary of the Hadith.**

There are many commentaries of the Ahadith and almost right from the begining, from the days the Ahadith were compiled in book form, the process of writing commentaries and explainations on those Ahadith had been started. There are thousands of commentries of the Ahadith writen during the course of last one thousand years.

امام ابن ماجہ کی کتاب میں ضعیف احادیث کی کثرت کی کیا وجہ ہے؟

وجہ یہ ہے کہ وہ احادیث امام ابن ماجہ کے نزدیک ضعیف نہیں تھیں۔ امام ابن ماجہ ایک راوی کو صحیح سمجھتے تھے، ضعیف نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے وہ احادیث نقل کر دیں۔ لیکن بقیہ اہل علم نے مزید تحقیق کی تو انہوں نے امام ابن ماجہ کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔

ابھی تک سننے گئے لیکچرز سے میں نے اندازہ لگایا کہ استاد اور شاگرد کی رائے میں بھی فرق ہو سکتا ہے۔ confusion پیدا ہوتی ہے کہ کس کی رائے پر عمل کیا جائے، کیونکہ دونوں نے تحقیق کے بعد ہی بات کی ہوگی۔

اصل اور آئیڈیل بات تو یہ تھی کہ ہر شخص اپنی تحقیق پر عمل کرے۔ آئیڈیل بات تو یہی ہے۔ لیکن ہر شخص کے پاس اتنا وقت نہیں کہ خود تحقیق کرے۔ اس لئے مسلمانوں میں رواج یہ پیدا ہو گیا کہ یا تو آپ خود تحقیق کریں اور خود ہی اس درجہ پر پہنچ جائیں کہ حدیث کی ہر روایت کی تحقیق کر کے خود فیصلہ کریں۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو اور ہر شخص کے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا تو پھر قرآن پاک نے نہایت مفید، آسان اور عملی اصول عطا کیا ہے کہ 'فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون'، اگر تم نہیں جانتے تو جو جاننے والے ہیں ان سے پوچھو ان کی رائے پر عمل کرو۔ اس لئے مسلمانوں میں پہلے دن سے یہ طریقہ ہے کہ جس شخص کی دو باتوں پر اعتماد ہو، صرف دو، بقیہ کچھ نہیں۔ جس کی ان دو چیزوں پر آپ کو اعتماد ہو، اس کی رائے پر عمل کریں، اس اعتماد کے ساتھ کہ یہ رائے صحیح ہوگی اور اللہ تعالیٰ آپ سے باز پرس نہیں کرے گا۔ ایک اعتماد اس کے علم پر اور دوسرا اعتماد اس کے تقویٰ پر ہو۔ علم کے بغیر صرف تقویٰ کافی نہیں اور تقویٰ کے بغیر علم کافی نہیں۔ ابھی میں امام مالکؒ کا ذکر کر چکا ہوں کہ انہوں نے ایسے لوگوں کی احادیث قبول نہیں کیں جو تقویٰ میں تو اونچے درجہ کے تھے لیکن ان کی علمی پختگی میں امام مالک کو تأمل تھا۔ اس لئے علم بھی اونچے درجہ کا ہونا چاہئے اور تقویٰ بھی کامل ہونا چاہئے جس کی رائے اور اجتہاد پر آپ عمل کرنے کا فیصلہ کریں تو پہلے یہ یقین کر لیں کہ اس کا تقویٰ بھی اونچے درجہ کا ہو اور علم بھی راسخ ہو۔ یہ فیصلہ آپ کو خود ہی کرنا پڑے گا اس میں کوئی اور آپ کا ساتھ نہیں دے گا کہ آپ کو کس کے علم اور تقویٰ پر اعتماد ہے۔ تقویٰ آپ خود جج کریں، کوئی آدمی نہیں بتا سکتا۔ میں اپنے بارے میں فیصلہ کروں گا، آپ اپنے بارے میں فیصلہ کریں گے۔ اگر آپ میری رائے جاننا چاہیں کہ فلاں فلاں معاملہ میں میں کس کے علم و

تقویٰ کو بھروسہ کے قابل سمجھتا ہوں تو میں انفرادی طور پر آپ کو بتا سکتا ہوں۔

پلیز کوئی ایک شرح پڑھ کر سنادیں۔ سنن سے کیا مراد ہے لفظی اور اصطلاحی دونوں معنی بتادیں۔

سنن سنت کی جمع ہے۔اس کے دو معنی ہیں۔ایک تو ان احادیث کا مجموعہ جن سے کوئی سنت ثابت ہوتی ہو۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے سنن سے مراد حدیث کی وہ کتاب ہے جس کی ترتیب فقہی احکام پر ہو۔اور سنن کے ایک اور معنی ہیں سنتوں کا مجموعہ، وہ کتاب یا وہ کتاب حدیث جس میں بہت ساری احادیث لکھی ہوئی ہوں۔اس اعتبار سے حدیث کی ہر کتاب سنن کا مجموعہ ہے اس لئے کہ ہر کتاب میں حدیثیں لکھی ہوئی ہیں۔لیکن خاص طور پر علمائے حدیث کی اصطلاح میں حدیث کی وہ کتاب جس کی ترتیب فقہی احکام پر ہو وہ سنن کہلاتی ہے۔

جب تمام احادیث آپ ﷺ کی ہیں اور سب مانتے ہیں تو پھر مسلکوں کی بنیاد کیسے پڑی؟ لوگ صرف ایک ہی منتخب کردہ امام کی بات مانتے ہیں اور باقیوں کی بات نہیں مانتے حالانکہ ساری احادیث آپؐ کی ہیں۔

میں کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ بعض احادیث کی تعبیر و تشریح میں اور قرآن پاک کی آیات کی تعبیر و تشریح میں بھی ایک سے زائد رائے کا امکان موجود ہے جس کی مثال میں نے صحابہ کے زمانے سے دی کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کی ایک سے زائد تعبیروں اور ایک سے زائد توضیحات کو درست بتایا اور دونوں کو بیک وقت قابل قبول قرار دیا۔اس سے یہ پتہ چلا کہ اسلام میں بعض احکام ایسے دیئے گئے ہیں، قرآن پاک میں بھی اور احادیث میں بھی، جن کی مختلف تفسیریں اور تشریحات کی جاسکتی ہیں۔ یہ اجازت اس لئے دی گئی کہ مختلف حالات کے لحاظ سے، مختلف زمانے کے متنوع تقاضوں اور لوگوں کی ضروریات کے لحاظ سے علما اور فقہا اور محدثین اس کی نئے نئے انداز سے تشریح کر سکیں۔

میں نے مثال دی تھی قرآن پاک کی آیات میں کہ 'علی الموسع قدرہ وعلی المقتر قدرہ'، کہ جب شوہر بیوی کا نفقہ ادا کرے گا تو دولت مند اپنی استطاعت کے لحاظ سے اور غریب اور نادار اپنی استطاعت کے لحاظ سے ادا کرے گا۔حالانکہ مثال کے طور پر قرآن پاک کہہ سکتا تھا کہ شوہر سو درہم نفقہ دیا کرے گا، یا ایک من گندم دیا کرے گا، اس حکم کو بیان کرنے کا ایک

طریقہ یہ بھی ہوسکتا تھا۔لیکن قرآن مجید میں اس طرح سے کوئی معین مقدار یا quantify کر کے نہیں بتایا بلکہ ایک عمومی بات بتائی جس کو اپنے اپنے زمانے کے لحاظ سے لوگ سمجھیں اور اس کی تعبیر کر دیں۔ چونکہ تعبیروں کا اختلاف اسلام کی بنیادی خصوصیات میں شامل ہے اس لئے حضورؐ نے اس کی اجازت دی۔قرآن پاک میں اس کی گنجائش رکھی گئی۔مختلف اہل علم نے مختلف تعبیریں کیں اور جو شخص جس فقیہ کے علم اور تقویٰ پر اعتماد کرتا ہے اس کی بات مان لیتا ہے۔ اُس زمانے میں جب یہ سارے محدثین اور فقہا موجود تھے اس وقت جن حضرات کو امام شافعیؒ کے علم اور تقویٰ پر اعتماد تھا وہ امام شافعی کے اجتہادات کو سر آنکھوں پر تسلیم کرتے تھے۔امام شافعی اتنے اونچے درجہ کے انسان تھے کہ اگر آج وہ آئیں اور ہم میں سے کوئی ان کے پاؤں چومنے کی کوشش نہ کرے تو بڑا بد بخت ہوگا۔

امام احمد بن حنبلؒ سے ہر مسلمان کو محبت اور عقیدت ہے۔لیکن امام احمد بن حنبل کے اجتہادات کو دنیائے اسلام میں بہت تھوڑے لوگ قبول کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں مشکل سے ایک فیصد لوگ ہوں گے جو فقہی معاملات میں امام احمد کی رائے اور اجتہاد پر عمل کرتے ہیں۔ بقیہ ننانوے فیصد دوسرے فقہا کی پیروی کرتے ہیں۔لیکن امام احمد کے احترام میں وہ کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔تقلید سے مراد صرف یہ ہے کہ کسی شخص کے علم اور تقویٰ کی بنیاد پر اس کی بات کو مان کر اس پر عمل کرلیا جائے۔ اس کو تقلید کہتے ہیں۔امام احمد کی تقلید تو تھوڑے لوگوں نے کی۔لیکن احترام سب کرتے ہیں۔تقلید کا تعلق احترام سے نہیں ہے۔ احترام تو ہر صاحب علم کا ہوتا ہے۔صحیح بخاری دنیائے اسلام میں ہر جگہ پڑھائی جاتی ہے۔اس وقت دنیائے اسلام میں امام ابوحنیفہ کی پیروی کرنے والے کم وبیش پینسٹھ فیصد مسلمان ہیں۔پورا وسط ایشیا، پورا افغانستان، پورا ترکی، پورا مشرقی یورپ، پورا ہندوستان، پورا پاکستان، پورا بنگلہ دیش، پورا چین۔یہ دنیائے اسلام کے تقریباً ساٹھ پینسٹھ فیصد بنتے ہیں اور امام ابوحنیفہ کی تقلید کرتے ہیں۔لیکن ان میں سے کوئی بھی امام بخاری کے احترام اور عقیدت میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔امام بخاری نے کم سے کم بیس مقامات پر امام ابوحنیفہ پر تنقید کی ہے جو بعض مقامات پر خاصی سخت ہے۔سر آنکھوں پر۔اگر باپ اور چچا میں اختلاف ہو تو بچوں کا یہ حق نہیں کہ وہ باپ کا ساتھ دے کر چچا کے خلاف کچھ آواز اٹھائیں۔دادا اور دادا کے بھائی میں اختلاف ہو تو پوتوں اور نواسوں کا یہ کام نہیں کہ وہ ایک کی

حمایت میں اٹھیں اور دوسرے کی مخالفت کریں۔ ہم امام بخاری کا بھی احترام کرتے ہیں اور امام ابوحنیفہ کا بھی احترام کرتے ہیں۔ ان کا ایک علمی اختلاف ہے۔ جس کو امام بخاری کے دلائل زیادہ مضبوط معلوم ہوں وہ ان کی پیروی کرے اور جس کو امام ابوحنیفہ کے دلائل مضبوط معلوم ہوتے ہیں وہ ان کی پیروی کرے اور احترام دونوں کا کرے۔

کیا صحیح بخاری میں ایک ہی باب کے اندر آنے والی دو قولی احادیث کے الفاظ ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں؟

ایسا ہوسکتا ہے، اس کا امکان موجود ہے کہ ایک باب میں ایک ہی صحابیؓ سے آنے والی روایت کے الفاظ مختلف ہوں۔ اس کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک سبب تو یہ ہوسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہی ایک بات کوئی بار بیان فرمایا ہو۔ دو صحابہ نے دو مختلف اوقات میں اس کو سنا اور دونوں الفاظ نوٹ کر کے یاد کر لئے اور آگے بیان کر دیا۔ لیکن زیادہ ایسا ہوا ہے کہ کسی فعلی معاملہ کو، یعنی حضورؐ کے قولی ارشاد کو نہیں بلکہ کسی طرز عمل کو صحابہ نے دیکھا اور ایک صحابیؓ نے اپنے الفاظ میں بیان کر دیا اور دوسرے نے اپنے الفاظ میں۔ تو واقعہ تو ایک ہے لیکن دیکھنے والے صحابیؓ اس کو ایک سے زیادہ قسم کے الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں۔ صحابیؓ کے لئے ضروری نہیں ہے کہ جو واقعہ وہ دیکھے اس کے لئے بھی ایک ہی طرز بیان اختیار کرے۔ مثلاً عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں غزوہ بدر میں گیا تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے اور میرے ساتھ کئی لوگوں کو کمسنی کی بنیاد پر واپس کر دیا۔ اب اس واقعہ کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ جب بھی بیان کریں گے ضروری نہیں کہ ایک ہی طرح کے الفاظ میں بیان کریں۔ لیکن ان سے جو تابعی سنیں گے وہ انہی الفاظ میں لکھیں گے جن الفاظ میں ان سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بیان کیا ہے۔ ان الفاظ میں وہ تابعی اپنی طرف سے کوئی ردوبدل نہیں کریں گے۔ البتہ جس صحابیؓ نے اپنی آنکھوں سے ایک واقعہ دیکھا ہے اس کے الفاظ میں ردوبدل ہوسکتا ہے۔ اس طرح ایک ہی واقعہ کے الفاظ میں فرق ہوسکتا ہے۔

امام بخاری کی کتاب کا مکمل نام کیا ہے؟

امام بخاری کی کتاب کا مکمل نام ہے 'الجامع الصحیح المسند المختصر من امور رسول اللہ ﷺ وسننہ وایامہ'

کیا موطا امام مالک بھی دوسری کتابوں کی طرح مختلف جلدوں میں ہے؟

موطا امام مالک کی ایک ہی جلد ہے۔ بعض لوگوں نے دو جلدوں میں بھی چھاپی ہے۔ لیکن زیادہ تر ایک ہی جلد میں ملتی ہے۔ اگر حواشی زیادہ ہیں تو کتاب دو جلدوں میں ہوگی۔ اور اگر حواشی نہیں ہیں یا مختصر ہیں تو ایک ہی جلد میں آجائے گی۔ میرے پاس موطا امام مالک کے تین نسخے ہیں۔ ایک نسخہ جس میں حواشی بہت ہیں دو جلدوں میں ہے اور دو نسخے ایک ایک جلد میں ہیں۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم اہل حدیث ہیں تو اس سے کیا مراد ہے؟

ایک اعتبار سے تو ہر مسلمان اہل حدیث ہے۔ کیا ہم سب مسلمان جو ایک ارب بیس کروڑ کی تعداد میں دنیا میں بستے ہیں کیا ہم حدیث رسول پر عمل نہیں کرتے؟ سب حدیث پر عمل کرتے ہیں۔ اس لئے ہم سب اس مفہوم میں اہل حدیث ہیں۔ لیکن اہل حدیث کے نام سے جو حضرات برصغیر میں مشہور ومعروف ہیں، یہ اصل میں وہ حضرات ہیں، (اس پر تفصیل سے بات تو کل ہوگی)، جو حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے زمانے میں، اور ان کے بعض فتاویٰ کی روشنی میں کچھ احادیث پر عمل کرنے لگے تھے اور ان احادیث پر عمل کرنے کی وجہ سے باقی لوگوں سے ان کا تھوڑا اختلاف پیدا ہوگیا تھا۔ یہ لوگ شروع میں تو کسی خاص نام سے مشہور نہیں تھے۔ لیکن جب حضرت سید احمد شہید کی سربراہی میں تحریک جہاد شروع ہوئی اور مولانا شاہ اسمٰعیل شہید اس میں شریک ہوئے تو وہ سارے کے سارے لوگ انگریزوں کی تحریروں میں وہابی کہلانے لگے۔ انگریزوں نے ان کو وہابی کے نام سے مشہور کردیا اور ایک طرح سے ان کا نِک نام وہابی پڑ گیا۔ وہابی کے لفظ کو انگریزوں اور کچھ دوسرے لوگوں نے غلط معنوں میں استعمال کیا تو جب یہ لوگ وہابی کے نام سے مشہور ہوئے تو ان کو بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزوں نے ان کو بڑا **persecute** کیا اور اس **persecution** کے بہت قصے مشہور ہیں اور بڑے دردناک اور سبق آموز ہیں۔ جب یہ سلسلہ بہت آگے بڑھا تو کچھ لوگوں نے یہ چاہا کہ ہم وہابی کی بجائے کسی اور نام سے جانے جائیں تو شاید اچھا ہو۔ انہوں نے یہ طے کیا کہ ہمارا نام اہل حدیث ہونا چاہئے۔ انہوں نے اہل حدیث کے لفظ کو رواج دے دیا تو وہ اہل حدیث کے نام سے مشہور ہوگئے۔ اس میں وہ حضرات بھی شامل ہیں جو مولانا شاہ اسمٰعیل شہید کے فتاویٰ پر عمل کرتے تھے اور زیادہ تر وہ حضرات شامل ہیں جن کا سلسلہ تلمذ حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی سے ملتا ہے، جو بعد میں حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلویؒ کے ارشادات اور طریقہ کار پر چلتے تھے۔ میاں صاحب

اتنے بڑے انسان ہیں کہ اپنے زمانے میں وہ شیخ الکل کہلاتے تھے، یعنی سب کے استاد، پورے ہندوستان کے استاد۔ اور واقعی وہ علم حدیث میں شیخ الکل تھے۔

علوم الحدیث کی کسی جامع کتاب کا نام بیان کر دیں۔

اس موضوع پر سب سے جامع کتاب ڈاکٹر خالد علوی کی ہے جس کا نام علوم الحدیث ہے اور دو جلدوں میں چھپنی ہے۔ ایک جلد اس کی چھپ چکی ہے۔

حدیث کے تعارض میں جو ترجیحی وجوہ تلاش ہوئے اس میں مفہوم کے اعتبار سے جو ہیں اس کی وضاحت کر دیں۔

اگر دو احادیث میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہو تو اس کو دور کرنے کے چار وجوہ یا چار طریقے ہیں۔ ان میں سے ایک سند ہے، دوسرا متن ہے، تیسرا مفہوم ہے اور چوتھا خارجی امور ہیں۔ مفہوم میں بھی چار پانچ چیزیں شامل ہیں۔ مفہوم کا ایک اصول یہ ہے جو سب سے پہلے محدثین نے وضع کیا بعد میں دنیا کے سب لوگ اس کو ماننے لگے۔ وہ یہ ہے کہ ایک حدیث میں کوئی چیز عمومی انداز میں بیان ہوئی ہے، جنرل مفہوم ہے جس کو اصطلاح میں 'حدیث عام' کہا جاتا ہے۔ اور ایک دوسری حدیث خاص ہے اور وہ کسی خاص حالت کو بیان کرتی ہو۔ تو بظاہر ان میں تعارض ہوگا لیکن دراصل ان میں تعارض نہیں ہے۔ جو عام کو بیان کرتی ہے وہ عام مسائل کو بیان کرتی ہے جو خاص ہے وہ اس خاص particular categary کو regulate کرتی ہے۔ تو ہم یہ کہیں گے کہ یہ جو خاص حدیث ہے یہ اِس عام کے اُس پہلو کو مستثنیٰ کر دیتی ہے جس کا ذکر اس حدیث میں کیا گیا ہے۔ یہ دو احادیث کے درمیان تعارض دور کرنے کا ایک طریقہ ہے۔

اس سلسلہ میں ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ 'لاتبع ما ليس عندك' یہ سنن کی اکثر کتابوں میں موجود ہے۔ کہ وہ چیز مت بیچو جو تمہارے پاس موجود نہیں ہے۔ یہ ایک عام حدیث ہے۔ آپ گندم بیچیں اور آپ کے پاس موجود نہ ہو تو مت بیچیں۔ آپ کے پاس جوتا نہیں ہے تو جوتا مت بیچیں، میز نہیں ہے تو میز مت بیچیں، گلاس نہیں ہے تو گلاس مت بیچیں۔ یہ ایک عام چیز ہے۔ لیکن ایک خاص چیز ہے کہ کسی کے پاس فیکٹری لگی ہوئی ہے۔ وہ مثلاً فرنیچر بناتا ہے اور آپ پیسے دیں کہ یہ پیسے لیجئے اور مجھے سو تپائیاں بنا کر دے دیں۔ پیسے آپ نے دے دیئے، خرید و فروخت مکمل ہوگئی اور تپائیاں اس شخص کے پاس موجود نہیں ہیں۔ تو اس حدیث کی رو

سے وہ آپ کو تپائیاں نہیں بیچ سکتا۔ نہ آپ سے پیسے لے سکتا ہے۔ پہلے وہ تپائیاں بنائے، جب بن جائیں تو پھر آپ کو فروخت کرے۔ لیکن ایک طریقہ شروع سے یہ رائج رہا ہے کہ جو لوگ سپلائرز ہیں یا مینوفیکچررز ہیں، اسلام سے پہلے بھی ایسا ہوتا تھا آج بھی ہوتا ہے۔ آپ مینوفیکچرر یا سپلائیر سے کوئی معاملہ کرلیں اور پہلے اس کو پیسے دے دیں۔ وہ جس طریقے سے سپلائی کرتا ہے آپ کو سپلائی کردے گا۔ اس وقت تو وہ چیز موجود نہیں ہے لیکن بعد میں موجود ہو جائے گی۔ وہ آپ کو دے دے گا۔ یہ ایک خاص حکم ہے جو اس خاص صورت حال کے لئے ہے۔ یہ اس عام حکم سے مستثنٰی ہے۔ اب آپ کہیں کہ بظاہر تو تعارض ہے۔ وہ چیز موجود نہیں ہے تو وہ کیسے بیچے گا۔ لیکن یہ ایک خاص حدیث ہے ایک خاص صورت حال کو بیان کرتی ہے۔ مینوفیکچرر یا **Grower** کو آپ کہیں کہ فلاں تاریخ کو آپ مجھے دس من گندم دے دیں۔ یا قصائی ہے جانور خرید کرلاتا ہے اور گوشت سپلائی کرتا ہے۔ آپ کے ہاں کوئی تقریب ہے اور آپ اس سے کہیں کہ فلاں تاریخ کو دو من گوشت سپلائی کردو تو وہ کردے گا اس لئے کہ وہ سپلائر ہے۔ تو سپلائیر، مینوفیکچرر یا **Grower** کے لئے حضورؐ نے اجازت دی ہے اس لئے کہ یہ طریقہ چلا آرہا تھا۔ یہ مخصوص صورت حال ہے اور اس کو اسی پر محدود رکھا جائے گا اور بقیہ عام حدیث بقیہ معاملات پر منطبق ہوگی۔ ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں رہا۔ یہ ہے مفہوم کے لحاظ سے تعارض کو دور کرنا۔

وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العلمین۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

گیارھواں خطبہ

برصغیر میں علم حدیث

جمعۃ المبارک، 17 اکتوبر 2003

برصغیر میں علم حدیث

برصغیر میں علم حدیث پر گفتگو کی ضرورت دو وجوہات کی بنا پر ہے۔ ایک بڑی وجہ تو یہ ہے کہ برصغیر میں ایک خاص دور میں علم حدیث پر بہت کام ہوا۔ یہ کام اتنے وسیع پیمانے پر اور اتنی جامعیت کے ساتھ ہوا کہ عرب دنیا میں بہت سے حضرات نے اس کا اعتراف کیا اور اس کے اثرات وسیع پیمانے پر عرب دنیا میں بھی محسوس کئے گئے۔ مصر کے ایک نامور عالم اور دانشور علامہ سید رشید رضا نے یہ لکھا کہ اگر ہمارے بھائی، برصغیر کے مسلمان، نہ ہوتے تو شاید علم حدیث دنیا سے اٹھ جاتا۔ یہ اٹھارویں انیسویں صدی کی صورت حال کا تذکرہ ہے۔ برصغیر کے علماء کرام نے اس دور میں علم حدیث کا پرچم بلند کیا جب دنیائے اسلام اپنے مختلف مسائل میں الجھی ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی علمی اور تہذیبی روایتیں ایک ایک کر کے ختم ہو رہی تھی۔ مسلمانوں کے تعلیمی ادارے ایک ایک کر کے بند کئے جا رہے تھے۔ اس لئے جہاں اور بہت سی روایات ختم ہو رہی تھی وہاں علم حدیث کی روایت بھی کمزور پڑ رہی تھی۔ اس دور میں برصغیر کے اہل علم نے اس روایت کا پرچم تھاما اور اس کو اس طرح زندہ کر دیا کہ اس کے اثرات پوری دنیا میں ہر جگہ محسوس کئے گئے۔

دوسری وجہ برصغیر میں خاص علم حدیث پر گفتگو کرنے کی یہ ہے کہ برصغیر میں علم حدیث کی تاریخ کا موضوعی مطالعہ یعنی **objective study** کم ہوئی ہے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ برصغیر میں صف اول کے اہل علم کو، ایسے اہل علم کو، جن کے علمی کارناموں کو عرب دنیا کے صف اول کے اہل علم و تحقیق نے اور عجمی دنیا کے اکابر علماء نے تسلیم کیا ہمارے ہاں مسلکی تقسیم کا نشانہ بنا دیا گیا۔ میں نے ایسے بہت سے حضرات کو دیکھا ہے جو صف اول کے بعض محدثین کے

کام سے اس لئے واقف نہیں ہیں کہ ان محدثین کا تعلق اس مسلک سے نہیں تھا جس مسلک کا علمبردار یہ حضرات خود کو کہتے تھے۔ اس مسلکیت نے مسلمانوں کو علم کی ایک بہت بڑی دولت سے محروم کیا ہوا ہے۔ اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک موضوعی انداز میں ان تمام محدثین کے علمی کام کا جائزہ لیا جائے جنہوں نے برصغیر میں اس شمع کو روشن کیا۔ برصغیر میں علم حدیث مسلمانوں کی علمی تاریخ سے کوئی الگ چیز نہیں ہے بلکہ جنوبی ایشیا کی علمی تاریخ ہی کا ایک نہایت روشن، تابناک اور شاندار باب ہے۔ آج بھی مسلمانوں کی عمومی علمی تاریخ کے اثرات برصغیر میں علم حدیث پر کی جانے والی تحقیق اور کاوشوں پر بھی پڑ رہے ہیں۔

برصغیر میں اسلام خلفائے راشدین کے زمانے میں ہی آ گیا تھا۔ سیدنا عمر فاروقؓ کے زمانے میں مغربی ہندوستان میں، بمبئی اور تھانہ میں مسلمانوں کی آبادیاں وجود میں آ چکی تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب حضرات تابعین تھے جو ہندوستان میں آئے اور جن کی آبادیاں برصغیر میں قائم ہوئیں۔ انہی تابعین کے ہاتھوں برصغیر میں اسلام باقاعدہ طور پر داخل ہوا۔ سیدنا عمر فاروقؓ اور سیدنا عثمان غنیؓ کے زمانے میں مسلمانوں کے قافلے یہاں آنے جانے شروع ہوئے۔ سیدنا عثمان غنیؓ کے زمانے میں یہاں **Fact finding missions** بڑے پیمانے پر آئے۔ اور برصغیر کا تذکرہ اسلامی ادب میں تیزی کے ساتھ ہونے لگا۔

پھر جب سن 92ھ میں محمد بن قاسمؒ کے ہاتھوں سندھ اور موجودہ پاکستان کا بیشتر حصہ فتح ہوا تو ان کے ساتھ بڑی تعداد میں تابعین اور بعض صحابہ کرامؓ بھی تشریف لائے۔ برصغیر کے ایک مشہور مورخ اور محقق قاضی اطہر مبارک پوری نے برصغیر کی تاریخ پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں ایک کتاب انہوں نے خاص طور پر ان صحابہ کے تذکرے پر بھی لکھی ہے جو برصغیر میں آئے، یہاں رہے اور یہیں پر دفن ہوئے۔ خاص طور پر صحابہ کرامؓ کی یہ آمد سندھ، ملتان اور ان کے قرب و جوار کے علاقوں میں زیادہ کثرت سے ہوئی۔ ظاہر ہے ان میں کوئی نامور صحابیؓ تو شامل نہیں تھے۔ یہ صغار صحابہ ہی تھے جو یہاں تشریف لائے ہوں گے، کیونکہ سن 92ھ میں یہ علاقہ فتح ہوا اور صحابہ کا زمانہ **110**ھ تک کا ہے۔ اس لئے صحابہ میں سے بعض شخصیات یہاں تشریف لائیں۔ لیکن صحابہ کرام سے کہیں زیادہ علمائے تابعین بڑی تعداد میں یہاں آئے۔ ان میں علم حدیث کے ماہرین بھی شامل تھے۔

علم حدیث میں برصغیر کا contribution تابعین اور تبع تابعین کے زمانے سے شروع ہوگیا تھا۔ ایک بزرگ تھے ابومعشر نجیح السندی، ان کے لقب کے ساتھ سندی یا سندھی لگا ہوا ہے۔ان کی روایات اور ان کی بیان کردہ احادیث اور سیرت کا مواد کتب حدیث اور کتب سیرت میں کثرت سے ملتا ہے۔اس سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ برصغیر میں اس روایت نے اتنی تیزی سے جڑیں پکڑیں کہ یہاں کے ایک نامور صاحب علم کا تذکرہ عراق، حجاز اور مصر کے ناموراصحاب علم کے ساتھ ہونے لگا۔

علم حدیث کے ارتقاء اور برصغیر میں علم حدیث پر ہونے والے کام کی رفتار اور اسلوب وانداز کے اعتبار سے دیکھا جائے تو برصغیر کی علمی تاریخ کے سات دور بنتے ہیں۔

برصغیر میں علم حدیث کا پہلا دور

سب سے پہلا دور وہ ہے جو محمد بن قاسمؒ کی فتح سندھ کے ساتھ شروع ہوا اور اس وقت تک جاری رہا جب دہلی میں مسلمانوں کی خودمختار اور مستقل بالذات سلطنت کا دارالحکومت قائم ہوا۔ یہ وہ دور ہے جس میں مسلمانوں کے علمی روابط دنیائے عرب کے ساتھ بالعموم اور عراق کے ساتھ بالخصوص قائم ہوئے۔عراق کے لوگ بڑی تعداد میں یہاں آئے۔اسی طرح دوسرے عرب ممالک سے بھی لوگ بڑی تعداد میں یہاں برصغیر میں آکر بسے۔ان میں اہل علم بھی شامل تھے، محدثین بھی شامل تھے۔ان محدثین کے جزوی تذکرے تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ یہ محدثین بڑی تعداد میں آتے رہے اور یہاں علم حدیث کی نشر واشاعت اپنی مقدور بھر کوششوں کے ذریعہ تصنیفی اور تحقیقی کام کرتے رہے۔لیکن ان میں سے بیشتر کا کوئی مفصل تذکرہ نہیں ملتا۔اُس دور کے اہل علم کے بارہ میں اگر کوئی مواد ملتا بھی ہے تو وہ انتہائی مختصر اور محدود ہے۔اس قلت معلومات کی ایک بڑی اور اہم وجہ یہ بھی ہے کہ کوئی بڑا اور نمایاں تصنیفی اور تحقیقی کام اس دور میں ایسا نہیں ہوا کہ جو کسی قابل ذکر کتاب کی شکل میں یا تصنیف کی شکل میں ہوتا اور ہم تک پہنچتا۔

برصغیر میں علم حدیث کا دوسرا دور

اس کے بعد جب دہلی میں مسلمانوں کی سلطنت قائم ہوئی۔اور وہ دور شروع ہوا جس کو دور سلطنت کہتے ہیں۔اس وقت بڑی تعداد میں علمائے کرام برصغیر میں آئے جن میں علم

حدیث کے ماہرین بھی شامل تھے۔ لیکن اس دور میں ایک نئی خصوصیت یہ سامنے آئی کہ برصغیر کے مسلمانوں کے علمی روابط دنیائے عرب سے کمزور ہوکر بلکہ بڑی حد تک کٹ کر دنیائے عجم سے قائم ہوگئے۔ اس لئے کہ محمد بن قاسمؒ اور ان کے ساتھی حجاز، عراق اور باقی عرب دنیا سے آئے تھے اور ان کے روابط عرب دنیا کے علمی مراکز کے ساتھ تھے۔ بعد میں دور سلطنت میں جو لوگ افغانستان اور سنٹرل ایشیا سے آئے ان کے روابط افغانستان اور سنٹرل ایشیا کے علمی مراکز سے قائم رہے اور سنٹرل ایشیا ہی کی علمی اور دینی روایت کو انہوں نے فروغ دیا۔ سنٹرل ایشیا اور افغانستان کی مذہبی روایت میں منطق، کلام، عقلیات اور اصول فقہ کا زیادہ زور تھا۔ اس لئے اس دور میں علم حدیث پر زور نسبتاً کم ہوگیا۔ کم ہوتے ہوتے ایک وقت ایسا بھی آیا جس میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید برصغیر کے مرکزی علمی مقامات پر علم حدیث تقریباً ختم ہوگیا ہے اور ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ علم حدیث ہندوستان سے اٹھتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

انہی دنوں ایک بزرگ جو علامہ ابن تیمیہؒ کے شاگرد تھے، وہ ہندوستان آئے اور اپنے ساتھ علم حدیث کے ذخائر بھی لے کر آئے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد وہ ہندوستان سے واپس چلے گئے۔ ایک اور بزرگ جو بڑے نامور محدث تھے یہاں تشریف لائے اور اس خیال سے آئے کہ برصغیر میں درس حدیث کا سلسلہ شروع کریں گے۔ لیکن جب ہندوستان کی سرحد کے قریب پہنچے تو یہ سن کر واپس چلے گئے کہ اس ملک کا بادشاہ بے نماز ہے اور بعض ایسے اعمال میں مبتلا ہے جو شرعاً قابل اعتراض ہیں۔ اس لئے انہوں نے فرمایا کہ میں ایسے ملک میں نہیں رہ سکتا جہاں حکمران اس سطح کے لوگ ہوں۔ اس لئے اس دور میں علمی اعتبار سے کسی بڑے کارنامے کا ذکر نہیں ملتا۔

البتہ دو چیزیں ایسی ہیں جو بڑی نمایاں اور قابل توجہ ہیں۔ اس زمانے میں بھی جب پورے برصغیر میں علمی اعتبار سے علم حدیث کا میدان خشک سالی کا شکار تھا اور گلستان حدیث میں خزاں کا دور دورہ تھا۔ اس زمانے میں بھی دو کام بڑے نمایاں ہوئے۔ ایک کام تو ہمارے موجودہ پاکستان میں ہوا۔ اور دوسرا کام مغربی ہندوستان کے صوبہ گجرات میں ہوا۔ جہاں آج بھی مسلمانوں کی بڑی آبادیاں اور تعلیمی ادارے موجود ہیں۔ ہمارے اسی پنجاب کے دارالحکومت لاہور میں ایک بہت بڑے محدث نے، جو اس زمانے میں دنیائے اسلام میں صف اول کے چند محدثین میں سے ایک تھے، انہوں نے اس علاقہ کو اپنا وطن بنایا اور لاہوری کہلائے۔ انہوں نے علم

حدیث پر جو کام کیا وہ کئی سو سال تک پوری دنیائے اسلام میں بہت مشہور و معروف اور مقبول رہا۔ ان کا اسم گرامی تھا امام حسن بن محمد صغانی لاہوری۔ امام صغانی لاہوری کے نام سے مشہور ہیں۔ لاہور میں طویل عرصہ تک قیام کرنے کی وجہ سے وہ لاہوری کہلائے۔ اگرچہ ان کے بارے میں یہ بات مختلف فیہ ہے کہ وہ اصل میں کہاں کے رہنے والے تھے۔ بعض بزرگوں کا کہنا ہے کہ ان کا تعلق بدایون سے تھا جو یوپی کا ایک شہر ہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ان کا تعلق پنجاب ہی کے کسی علاقے سے تھا۔ تاہم اس پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ لاہور ہی میں قیام فرما رہے۔ لاہور ہی کو انہوں نے اپنا وطن بنایا۔ پھر ایک طویل عرصہ کے بعد وہ لاہور سے دنیائے عرب چلے گئے اور حجاز میں سکونت اختیار فرمائی، اور حرمین ہی میں ان کا انتقال ہو۔ حدیث پر ان کی کتاب ہے 'مشارق الانوار النبویہ فی صحاح الاخبار المصطفویہ'۔ جس کو مختصراً مشارق الانوار کہا جاتا ہے۔

مشارق الانوار برصغیر میں کئی سو سال تک حدیث کی ایک مستند کتاب کے طور پر مروج رہی ہے۔ درسگاہوں میں پڑھائی جاتی رہی ہے۔ بہت سے حضرات نے اس کے ترجمے کئے اور اس کی شرحیں لکھیں۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ایک قدیم ترین کتاب کے طور پر موجود ہے۔ جب برصغیر میں طباعت اور نشر و اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا اسی وقت یعنی بارھویں صدی ہجری کے اواخر میں یا تیرھویں صدی ہجری کے شروع میں مشارق الانوار کا یہ اردو ترجمہ شائع ہوا تھا۔

مشارق الانوار ایک ضخیم کتاب ہے جس میں صحیحین کی قولی احادیث کا انتخاب ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں جتنی احادیث ہیں، ان میں فعلی اور تقریری احادیث کو انہوں نے نکال دیا ہے اور قولی احادیث، یعنی رسول اللہ ﷺ کے قولی ارشادات گرامی کو منتخب کر کے اور سند حذف کر کے انہوں نے جمع کر دیا ہے۔ گویا وہ یہ چاہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی روایت اور سند کے فنی مباحث سے ہٹ کر عام قارئین تک پہنچ جائیں تا کہ عام لوگ اس کا مطالعہ کر سکیں۔

یہ مشکوٰۃ سے پہلے لکھی جانے والی ایک کتاب تھی۔ امام صغانی لاہوری کی وفات 650ھ میں ہوئی تھی۔ ظاہر ہے انہوں نے اس سے پہلے یہ کتاب لکھی ہوگی۔ ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں لکھی جانے والی یہ کتاب برصغیر میں طویل عرصہ تک مروج رہی۔ اس کی شرحیں بھی لکھی گئیں۔ بعد میں استنبول میں جو کم و بیش سات سو برس تک دنیائے اسلام کا سیاسی مرکز اور

خلافت عثمانیہ کا دارالحکومت رہا۔ وہاں کے ایک بزرگ نے اس کی شرح لکھی جو مطبوعہ موجود ہے اور استنبول سے 1328ھ/ء میں شائع ہوئی تھی اور جس کا نام ہے 'مبارق الاظهار فی شرح مشارق الانوار'۔

پنجاب کے اس غیر معمولی کارنامے کے علاوہ مغربی ہندوستان میں گجرات کے صوبے میں بڑے بڑے محدثین پیدا ہوئے۔ انہوں نے علم حدیث پر جو کام کیا وہ دور سلطنت کا ایک نمایاں کام ہے۔ اس میں ایک بہت بڑے اور مشہور بزرگ شیخ محمد طاہر پٹنی تھے۔ ان کو عربی میں فتنی کہا جاتا ہے اس لئے کہ 'پ' کو معرب کر کے 'ف' کر دیتے ہیں اور 'ٹ' کو معرب کر کے 'ط' یا 'ت' کر دیتے ہیں۔ شیخ محمد طاہر فتنی کا تعلق صوبہ گجرات سے تھا۔ انہوں نے علم حدیث میں دو بڑے کارنامے کئے۔ ان میں سے ایک کارنامہ تو اپنی نوعیت کا بالکل منفرد ہے اور اتنا منفرد ہے کہ شاید دنیائے اسلام میں اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ دوسرا کارنامہ وہ ہے جس میں اور لوگ بھی ان کے ہمسر ہیں۔ ایک کام تو انہوں نے یہ کیا کہ 'تذکرۃ الموضوعات' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں موضوع احادیث کو جمع کر دیا۔ موضوع احادیث پر کام کرنے والے بعد میں بھی بہت ہوئے۔ شیخ طاہر پٹنی سے پہلے بھی لوگ ہیں، اگرچہ کم ہیں۔ شیخ طاہر وہ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے برصغیر میں موضوعات پر ایک جامع کام کرنے کا ارادہ کیا اور تذکرۃ الموضوعات پر ایک ضخیم کتاب تیار کی جس کے کئی ایڈیشن پاکستان، ہندوستان اور عرب دنیا میں شائع ہوئے اور عام طور پر مشہور ومعروف ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے ان تمام احادیث کو مضامین کے لحاظ سے جمع کر دیا ہے جو ان کے خیال میں موضوع اور ناقابل قبول ہیں۔ یہ تو ایسا کام ہے جو اور جگہ بھی ہوا ہے۔ لیکن ان کا وہ کام جس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی وہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک ضخیم کتاب لکھی جس کا عنوان ہے 'مجمع بحار الانوار'۔ یہ کتاب اسی نام سے مشہور ہے اور کتب خانوں میں موجود ہے۔ اس کتاب کا مکمل نام ہے 'مجمع بحار الانوار فی غرائب التنزیل ولطائف الاخبار'۔

اس کتاب میں انہوں نے یہ کیا ہے کہ پوری صحاح ستہ کا جائزہ لے کر مکررات کو نکالا اور بقیہ احادیث کو جمع کر کے ان کے غریب اور مشکل الفاظ کے معانی بیان کئے اور اہم نکات کی شرح لکھی۔ اس طرح سے یہ گویا پوری صحاح ستہ کی شرح ہے۔ اس میں بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ سب کی شرح موجود ہے۔ چھ کی چھ کتابوں میں مکررات نکال کر جو چیزیں

پہنچتی ہیں یہ کتاب ایک اعتبار سے ان کی شرح ہے۔ تو اس کتاب کو سامنے رکھ کر گویا علم حدیث کی ساری کتابوں کے بارے میں پڑھنے والے کو کچھ نہ کچھ واقفیت ہو سکتی ہے۔ بہت سے اہل علم نے اس کی تعریف کی ہے اور اس کا ذکر مختلف تذکروں میں ملتا ہے۔ یہ ایک ایسا اچھوتا کام ہے جو اس انداز میں برصغیر کے علاوہ کسی اور ملک میں نہیں ہوا۔

صوبہ گجرات کے دو بڑے محدثین اور تھے جن میں ایک محدث سے ہم سب اور علم حدیث کا ہر طالب علم اور پوری دنیائے اسلام واقف ہے۔ وہ ہیں شیخ علی المتقی الہندی۔ اگر کہا جائے کہ شیخ علی متقی دنیائے اسلام میں اپنے زمانے کے سب سے بڑے محدث تھے تو شاید غلط نہیں ہوگا۔ وہ گجرات سے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ چلے گئے تھے اور زندگی بھر وہیں رہے۔ انہوں نے ایک ایسا کام کیا جو اپنی نوعیت کا ایک بہت بڑا اور منفرد کام تھا۔ انہوں نے یہ چاہا کہ تمام احادیث رسول کو، جو تمام دستیاب مجموعوں میں موجود ہیں، حروف تہجی کے اعتبار سے جمع کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے 'کنز العمال' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ کنز العمال میں تمام صحاح ستہ، مسند امام احمد، معجم طبرانی، مسند ابوداؤد طیالیسی اور حدیث کی جتنی کتابیں اُن کو دستیاب ہوئیں، ان سب کی احادیث کو انہوں نے حروف تہجی کے حساب سے جمع کر دیا ہے۔

یہ کتاب کئی بار چھپی ہے۔ پہلی بار تو قدیم انداز میں چھپی تھی۔ کتاب کے قدیم ایڈیشنوں میں احادیث کی تعداد کا کوئی بندوبست نہیں تھا کہ ان کو ترتیب وار، نمبر شمار لگا کر شائع کیا جائے۔ لوگوں نے انفرادی طور پر **manually** اس کی گنتی کی تو بعض لوگوں کے مطابق اس میں **52,000** احادیث ہیں، کچھ اور لوگوں کے اندازہ کے مطابق اس سے کم اور کچھ کے اندازہ کے مطابق اس سے زیادہ ہیں۔

چند سال پہلے یہ کتاب عرب دنیا میں بڑی تحقیق اور اہتمام کے ساتھ چھپنی شروع ہوئی اور کتاب کے مرتب و محقق نے ہر حدیث کا نمبر بھی ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بات میرے علم میں نہیں کہ پوری کتاب مکمل ہوئی کہ نہیں ہوئی۔ اس کے بعض اجزا آنے شروع ہوئے تھے اور میں نے دیکھے تھے۔ اگر مکمل ہوگئی ہے تو صحیح تعداد کا اندازہ ہو گیا ہوگا جس کا مجھے پتہ نہیں ہے۔ لیکن یہ ایک بڑی اہم کتاب ہے جو ایک طویل عرصہ تک طلبہ حدیث کے مطالعہ کا موضوع رہی، اس لئے کہ اس میں حدیث کو تلاش کرنا اور اس کا حوالہ دینا بڑا آسان ہے۔ اگر حدیث کے شروع کا حصہ

آپ کو یاد ہو تو حروف تہجی کی ترتیب سے کتاب شروع کر دیں۔ نہ یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ اس کے راوی کون ہیں، نہ یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ دراصل یہ حدیث کس کتاب میں ہے اور نہ یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ اصل اور ابتدائی راوی کون ہیں۔ اگر پہلا لفظ آپ کو یاد ہے تو مزید کچھ بھی جاننے کی ضرورت نہیں۔ اس حساب سے یہ کتاب طلبہ اور محققین، واعظین، مقررین اور عام مسلمانوں کے لئے بڑی مفید ہے۔ سب نے اس سے استفادہ کیا اور بہت جلد یہ مقبول ہوئی۔

شیخ علی المتقی کے بعد علم حدیث میں نمایاں کام کرنے والے انہی کے شاگرد تھے 'شیخ عبدالوہاب المتقی'، جو ایک بہت بڑے محدث تھے۔ وہ بھی ہجرت کر کے ہندوستان سے مکہ مکرمہ چلے گئے تھے۔ انہوں نے مکہ مکرمہ میں علم حدیث کو بڑے پیمانے پر عام کیا۔ گجرات اور برصغیر کا نام ان کی وجہ سے ہر جگہ روشن ہوا۔ دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں سے آنے والوں نے ان سے کسب فیض کیا۔ ان سے استفادہ کرنے والوں میں برصغیر کے لوگ بھی شامل تھے اور باہر کے لوگ بھی۔ یہ تین شخصیات تو ان لوگوں میں انتہائی نامور حیثیت رکھتی ہیں جن کا تعلق برصغیر سے ہے اور جنہوں نے اس کام کو اس طرح سے انجام دیا کہ پوری دنیا میں اس کے اثرات محسوس کئے گئے۔

برصغیر میں علم حدیث کا تیسرا دور

دور مغلیہ جو دور سلطنت کے بعد آیا اس کو ہم علم حدیث کے اعتبار سے ایک نئے دور کا آغاز کہہ سکتے ہیں۔ علم حدیث پر ایک نئے انداز سے اور نئے جوش وخروش سے دور مغلیہ میں کام کا آغاز ہوا۔ اگرچہ اس نئے جوش وخروش کا مغل حکمرانوں سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس کا اعزاز ان کو نہیں جاتا، لیکن چونکہ یہ کام مغل حکمرانوں کے زمانے میں ہوا اس لئے ان کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ یہ دور دو بڑی شخصیات سے عبارت ہے۔ وہ دو بڑی شخصیات جن کے تذکرے کے بغیر برصغیر میں علم حدیث کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان میں ایک شخصیت تو ایسی ہے کہ دنیائے اسلام میں حدیث کی تاریخ ان کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہے تو درست ہے۔ ان میں سے پہلی شخصیت تو شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی ہے اور دوسری شخصیت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے تذکرہ کے بغیر علم حدیث کی کوئی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ برصغیر کے مسلمانوں کے امیر المومنین فی الحدیث ہیں تو غلط نہیں ہوگا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا تعلق دہلی سے تھا۔علم حدیث سے ان کی دلچسپی اور علم حدیث میں ان کی خدمات اس درجہ کی ہیں کہ محدث دہلوی کا لفظ ان کے نام کا حصہ بن گیا ہے۔ آپ نے دہلی کے رہنے والے بہت سے لوگوں کے نام کے ساتھ حقی کا لفظ سنا ہوگا، وہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی اولاد میں سے ہیں اس لئے حقی کہلاتے ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے خاصی طویل عمر پائی۔ یہ اکبر کے زمانے میں پیدا ہوئے۔اور شاہجہان کے زمانے میں ان کا انتقال ہوا۔ جہانگیر ان سے متاثر تھا۔اس نے انہیں اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی۔ وہ جہانگیر سے ملنے کے لئے اس کے دربار میں تشریف لے گئے اور جہانگیر سے ملے۔ جہانگیر ان کی شخصیت سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اپنے روزنامچے میں، جو 'تزک جہانگیری' کے نام سے مطبوعہ موجود ہے، ان کا ذکر کیا اور بڑے تعریفی انداز میں لکھا ہے کہ ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ میں ان کی شخصیت اور کردار سے بڑا متاثر ہوا ہوں۔یعنی ایسی شخصیت کہ جن کا بادشاہوں نے نوٹس لیا اور بادشاہوں نے اپنی تحریروں میں جن کا ذکر کیا ان میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ شامل ہیں۔

شیخ عبدالحق نے حرمین کا سفر کیا اور تین سال وہاں بسر کئے۔حرمین کے بہت سے مشائخ سے بھی کسب فیض کیا،سندیں اور اجازت حاصل کی اور اس کے بعد واپس ہندوستان آگئے۔

یہاں آنے سے پہلے اور آنے کے بعد انہوں نے یہ محسوس کیا کہ برصغیر کی بہت سی خرابیوں اور گمراہیوں کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ یہاں براہ راست قرآن مجید، حدیث اور سیرت کا مطالعہ کم ہوتا جارہا ہے۔عقلیات اور معقولات پر زیادہ زور ہے جس کی وجہ سے لوگوں میں تدین، خشیت الٰہی اور تعلق مع اللہ کی وہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی جو براہ راست قرآن مجید، حدیث اور سیرت کے مطالعہ سے پیدا ہوسکتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں اکبر کی گمراہی عام تھی۔ علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ

تخم الحادے کہ اکبر پرورید
باز اندر فطرت دارا دمید

الحاد کا وہ بیج جو اکبر نے بویا تھا وہ دوبارہ دارا کی فطرت میں اگ کر سامنے آ گیا تھا۔ گویا اکبر کا الحادی دور ضرب المثل ہے۔ اس کی وضاحت یا تشریح کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ بہت ہی بددینی اور الحاد کا زمانہ تھا جس کے منفی اثرات مسلم معاشرہ پر مرتب ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اس دور میں اور ان حالات میں جن حضرات نے اس صورت حال کو بدلنے کے لئے قدم اٹھایا ان میں سے ایک بڑا نمایاں نام حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا بھی ہے۔

حضرت شیخ محدث دہلوی نے تین بڑے کام کئے۔ ایک بڑا کام تو یہ کیا کہ دہلی میں علم حدیث کا ایک بہت بڑا حلقہ شروع کیا جہاں سے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں طلبہ اور اہل علم نے ان سے کسب فیض کیا اور علم حدیث کا ایک نیا رجحان دارالحکومت دہلی میں شروع ہوا جس کے اثرات باقی معاشرہ پر بھی ہوئے۔ ان کے تلامذہ ان سے پڑھ کر دوسرے شہروں میں گئے۔ دوسرے شہروں میں علم حدیث کے حلقے قائم ہوئے اور علم حدیث کی ایک نئی خوشبو، ایک تازہ ہوا اور ایک نئی نسیم جاں فزا ہندوستان میں پھیلنا شروع ہوئی جس کے محرک اول شیخ عبدالحق محدث دہلوی تھے۔

شیخ عبدالحق نے دوسرا کام یہ کیا کہ علوم نبوت پر چھوٹے چھوٹے رسالے اور کتابیں لکھنا شروع کیں جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں ذات رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام سے تعلق استوار ہو۔ رسول اللہ ﷺ کی ذات سے محبت پیدا ہو۔ حضورؐ کی شخصیت پر، آپؐ کے شمائل پر، نبوت پر اور مدینہ منورہ کے فضائل جیسے موضوعات پر انہوں نے فارسی میں مختلف چھوٹے بڑے رسائل لکھے جو بہت مقبول بھی ہوئے اور ان کے بھی بہت اچھے اثرات مرتب ہوئے۔

اس کے ساتھ ساتھ ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے برصغیر میں حدیث کی تعلیم کی ایک باقاعدہ روایت پیدا کی، اس روایت کو مضبوط علمی بنیادوں پر قائم کیا اور اس طرح قائم کیا کہ ان کے انتقال کے کئی سو سال بعد تک بھی وہ جاری رہی۔ انہوں نے حدیث کی مشہور کتاب 'مشکوٰۃ المصابیح' کی شرحیں تیار کیں جو فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں تیار ہوئیں۔ مشکوٰۃ المصابیح آٹھویں صدی میں لکھی گئی تھی اور یہ حدیث کا ایک ایسا مجموعہ ہے، جس کی اپنی ایک حیثیت ہے۔ ایک طویل عرصہ مشکوٰۃ درسی کتاب کی حیثیت سے رائج رہی ہے اور آج بھی بہت سے اداروں کے نصاب میں شامل ہے۔ اس کتاب کو برصغیر میں متعارف کرانے والے اور بطور نصابی کتاب کے اختیار کرنے والے شیخ عبدالحق محدث دہلوی ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اس

کتاب کو اپنے ادارے میں متعارف کرایا۔ ان کی وجہ سے یہ کتاب بقیہ ہندوستان میں متعارف ہوئی اور اس کو پڑھ کر بہت سے لوگ حدیث رسول سے پہلی مرتبہ واقف ہوئے۔ انہوں نے اس کتاب کی دو شرحیں لکھیں۔ ایک فارسی میں 'اشعۃ اللمعات فی شرح المشکوٰۃ' لکھی جو نسبتاً مختصر ہے اور عام تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے ہے۔ اس میں انہوں نے احادیث کا فارسی ترجمہ بھی کیا، مختصر تشریح بھی کی، مشکل الفاظ کے معانی بھی بیان کئے اور جہاں جہاں ضرورت ہوئی کچھ تفصیلی مباحث بھی بیان کئے جو برصغیر کے حالات کو پیش نظر رکھ کر مرتب کئے گئے تھے۔

دوسری کتاب شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے عربی زبان میں 'لمعات التنقیح' کے نام سے لکھی جو کئی بار چھپی ہے اور کئی جلدوں میں ہے۔ یہ علمائے حدیث اور متخصصین کے لئے ہے۔ اس میں لغوی، فقہی اور کلامی مباحث خاصی تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ علمائے کرام جو دینی علوم کے متخصص ہیں وہ علم حدیث کے متخصص بھی ہو جائیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا یہ کام اپنی جگہ ایک تاریخ ساز کام تھا۔ اس تاریخ ساز کام کے انتہائی دیرپا اثرات ہوئے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے انتقال کے بعد وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ روایت کمزور پڑ گئی۔ ان کا انتقال گیارھویں صدی ہجری کے وسط میں غالباً 1052ھ وغیرہ میں ہوا۔ ان کو طویل عمر ملی، تقریباً پچانوے یا چھیانوے سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا اور کم و بیش پچاس سال وہ مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ سے واپسی پر درس حدیث دیتے رہے۔ سفر حرمین سے پہلے بھی وہ درس حدیث دیتے رہے تھے۔ لیکن اب پچاس سال مسلسل درس دینے کی وجہ سے پورے ہندوستان پر ان کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ روایت کمزور پڑ گئی۔

ہندوستان میں وسط ایشیا کے اثرات کی وجہ سے عقلیات کو غیر معمولی پذیرائی ملی تھی، اور منطق اور فلسفہ کی گہری اور طویل تعلیم کے ساتھ ساتھ فقہ اور اصول فقہ بھی منطق اور فلسفہ کے رنگ میں پڑھائے جاتے تھے۔ اصول فقہ کی جو کتابیں برصغیر میں لکھی گئیں وہ ساری کی ساری منطق اور فلسفہ کے انداز میں لکھی گئی ہیں۔ اگر آپ اصول فقہ کے طالب علم ہوں اور یہاں کی لکھی ہوئی کوئی درسی کتاب اٹھا کر دیکھیں تو اس اسلوب کا اندازہ ہو جائے گا جو برصغیر میں رائج تھا۔ ملا محب اللہ بہاری برصغیر کے ایک مشہور اصولی تھے۔ ان کی ایک کتاب ہے 'مُسَلَّم الثبوت'۔ اسے اگر آپ دیکھیں تو یہ اتنی مشکل کتاب ہے کہ اصول فقہ کی تاریخ میں اس سے مشکل کتاب شاید اور

کوئی نہ ہو۔ اگر اصول فقہ کے موضوع پر چار پانچ مشکل ترین کتابوں کا نام لیا جائے تو ان میں سے ایک ملا محب اللہ کی یہ کتاب ہوگی۔ ایک بزرگ کہا کرتے تھے کہ اس کتاب کے پڑھنے سے دانتوں کو پسینہ آجاتا ہے۔ اس سے اندازہ کرلیں کہ عقلیات اصول فقہ پر بھی اتنی اثر انداز ہوئیں کہ اصول فقہ کی کتابیں بھی خالص منطق اور عقلیات کی بنیاد پر لکھی جانے لگیں۔ اس لئے علم حدیث پر توجہ پھر کمزور پڑ گئی۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

اس کے بعد دوبارہ علم حدیث کی طرف توجہ دلانے کا کارنامہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے انجام دیا اور اتنے غیر معمولی اخلاص سے انجام دیا کہ ان کا جاری کردہ سلسلہ آج تک چلا آرہا ہے اور برصغیر کا ہر وہ طالب علم جو حدیث پڑھتا ہو، اور ہر وہ استاد جو حدیث پڑھاتا ہو وہ شاہ صاحب کا ممنون احسان ہے۔ شاید برصغیر کے وابستگان حدیث میں **99** فیصد لوگ براہ راست اس روایت سے وابستہ ہیں۔ ننانوے بھی میں نے صرف احتیاطاً کہہ دیا ورنہ ممکن ہے کہ ایک آدھ ہی اس روایت سے باہر ہوں ورنہ شاید برصغیر میں علم حدیث سے اعتنا کرنے والے سو فیصد علماء براہ راست شاہ ولی اللہ کی روایت سے وابستہ ہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ بھی حجاز تشریف لے گئے۔ ایک سال وہاں مقیم رہے۔ انہوں نے برصغیر میں سب سے پہلے اپنے والد شاہ عبدالرحیم سے علم حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ یہاں کے ایک مشہور محدث تھے حاجی شیخ محمد افضل، جو ہمارے پنجاب میں سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ سیالکوٹ میں انہوں نے علم حدیث کی شمع روشن کی تھی اور لوگ بڑی تعداد میں سیالکوٹ آکر ان سے علم حدیث حاصل کیا کرتے تھے۔ ان سے شاہ ولی اللہ کے والد نے علم حدیث پڑھا تھا۔ پھر ایک اور مشہور بزرگ تھے جو مکہ مکرمہ میں حدیث کی تعلیم دیا کرتے تھے شیخ ابوطاہر الکردیؒ۔ شاہ ولی اللہ نے ان سے بھی ایک سال تک علم حدیث کی تعلیم پائی اور تیرہ مہینے ان کے درس میں شریک رہے۔ شاہ صاحب کی شخصیت پر شیخ ابوطاہر کردیؒ کے انتہائی گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ یہاں تک کہ شاہ صاحب نے ہندوستان واپسی کا ارادہ ملتوی کردیا تھا اور شیخ ابوطاہر کردی کو بتایا کہ میں پوری زندگی آپ کے قدموں میں گزارنا چاہتا ہوں۔ جب شاہ ولی اللہ یہ بات ان سے کہہ رہے

تھے تو شاہ صاحب نے یہ شعر پڑھا۔

نسیت کل طریق کنت اعرفہ

الا طریقاً یودینی الی ربعکم

میں ہر راستہ بھول چکا ہوں سوائے اُس راستہ کے جو آپ کے گھر تک آتا ہے۔

لیکن شیخ ابوطاہر کردی نے کہا کہ جلدی میں کوئی فیصلہ نہ کرو، بلکہ ابھی غور کرلو۔ انہوں نے خود بھی چند روز غور کرنے کے بعد شاہ ولی اللہ سے کہا کہ تم یہاں نہ رہو اور واپس ہندوستان چلے جاؤ۔ شیخ ابوطاہر نے بہ اصرار شاہ صاحب کو واپس بھیج دیا۔ اس وقت شاہ صاحب بڑے بوجھل دل کے ساتھ واپس تشریف لے آئے۔ لیکن واپس تشریف لانے کے بعد شاہ صاحب نے جو کارنامے انجام دیئے اور جن کا سلسلہ آج تک چلا آرہا ہے، ان کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ ابوطاہر کردی نے کسی خاص نیت سے ان کو بھیجا تھا اور شاہ صاحب کو بھی اس کا اندازہ ہوگیا تھا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے برصغیر میں علم حدیث اور علوم حدیث کی ایسی نئی روایت کو پروان چڑھایا جو اتنی مضبوط تھی اور اخلاص کی ایسی مضبوط بنیادوں پر استوار تھی کہ آج بھی ان کی رکھی ہوئی بنیادیں موجود ہیں۔ ان کے لگائے ہوئے چمنستان حدیث کے گلہائے معطر گزشتہ ڈھائی سو سال سے برصغیر کو معطر کئے ہوئے ہیں۔ ان کے جاری کئے ہوئے کام کے ثمرات آج بھی پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہیں جن سے آج تک لوگ مستفید ہورہے ہیں۔

شاہ صاحب نے علم حدیث کی تدریس کا ایک حلقہ قائم کیا اور اعلیٰ ترین سطح پر علم حدیث کی تعلیم دی۔ اپنی خاص نگرانی میں ماہرین حدیث کی ایک جماعت تیار کی، ان کو ہندوستان کے مختلف گوشوں میں متعین کیا اور جگہ جگہ حدیث کی تعلیم کے ادارے قائم کئے۔ خود انہوں نے علوم حدیث پر متعدد کتابیں تصنیف کیں جو فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے علوم حدیث میں ایک نئے فن کی بناڈالی، بناڈالنے کا یہ لفظ شاید درست نہ ہو، اس لئے کہ ان سے پہلے بھی کئی حضرات نے اس موضوع پر قلم اٹھایا تھا، لیکن جس انداز سے شاہ صاحب نے قلم اٹھایا تھا، اس کی مثال نہیں ملتی۔

شاہ صاحب نے علم حدیث کی تاریخ کا ایک قابل ذکر کام یہ کیا کہ حدیث نبوی کے پورے ذخائر کو جمع کرکے اور ان کا مطالعہ کرکے ان میں جو اسرار دین اور شریعت کے بنیادی اصول

بیان ہوئے ہیں، ان کو اس طرح اجاگر کیا کہ پورے علوم حدیث اور علوم نبوت کی روح پڑھنے والے کے سامنے آجاتی ہے۔ یہ کارنامہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی جس کتاب میں ہے اس کا نام 'حجة الله البالغه' ہے، جس کا اردو اور انگریزی ترجمہ دونوں دستیاب ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہؒ نے فرانسیسی زبان میں بھی ترجمہ کیا تھا لیکن وہ شائع نہیں ہوا ہے۔ عربی میں اصل کتاب دنیائے عرب اور عجم میں درجنوں مرتبہ چھپی ہے اور دنیا کے ہر گوشے کے اہل علم نے مراکش سے لے کر انڈونیشیا اور جنوبی افریقہ سے لے کر انتہائی شمال تک جہاں جہاں مسلمان بستے ہیں، اس سے استفادہ کیا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے موطا امام مالک کو علم حدیث کی بنیادی کتاب کے طور پر اختیار کیا۔ وہ موطا امام مالک کے بڑے مداح تھے۔ وہ اس کو صحیحین سے افضل اور اصح تر سمجھتے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو موطا امام مالک کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ جتنے مکاتب فقہ ہیں وہ سارے کے سارے بالواسطہ اور بلا واسطہ موطا امام مالک سے متاثر ہیں اور موطا امام مالک میں ان تمام مکاتب فکر کی جڑ موجود ہے جن کی بنیاد پر فقہی مکاتب اور حدیثی اسکول مرتب ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ تمام بڑے بڑے محدثین بالواسطہ اور بلا واسطہ امام مالک کے شاگرد ہیں۔ اس لئے ان کے حدیثی کام پر امام مالک کے اثرات نمایاں ہیں۔

امام شافعی، براہ راست ان کے شاگرد ہیں، امام محمد ابن حسن شیبانی جو فقہ حنفی کے مدون اول ہیں، وہ ان کے براہ راست شاگرد ہیں اور امام احمد بن حنبل ایک واسطہ سے ان کے شاگرد ہیں۔ اس لئے چاروں مکاتب فکر امام مالک سے سے بالواسطہ یا بلا واسطہ متعلق اور متاثر ہیں۔ لہذا موطا امام مالک کو دین وشریعت کی ساری تعلیم کی بنیاد ہونا چاہئے تا کہ سب مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جا سکے۔ اہل فقہ، اہل حدیث اور تمام اہل علم سب امام مالک کی ذات کے گرد ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو سکتے ہیں۔ یہ شاہ صاحب کا نقطہ نظر تھا جو انہوں کئی جگہ بڑی تفصیل سے لکھا بھی ہے۔ اس لئے شاہ صاحب نے موطا امام مالک کا درس دینا شروع کیا۔ برصغیر میں پہلی مرتبہ موطا امام مالک کا درس انہوں نے ہی شروع کیا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے موطا امام مالک کی دو شرحیں لکھیں۔ جیسے شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مشکوٰۃ کی دو شرحیں لکھی تھیں اسی طرح شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے موطا امام مالک کی دو شرحیں لکھیں۔ ایک فارسی میں اور ایک عربی میں لکھی۔ عربی میں 'المسوّیٰ' ہے جو

مفصل ہے اور فارسی میں 'المصفیٰ' لکھی جو مختصر ہے۔ المسویٰ حدیث کے ماہرین اور طلبہ کے لئے ہے اور المصفیٰ عام تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لئے ہے۔

ان دو شرحوں کے ساتھ ساتھ شاہ صاحب نے علم حدیث پر اور بھی کتابیں لکھیں۔ ان میں سے ایک بڑی کتاب جو ہماری اس بہن کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگی جنہوں نے امام بخاری کے ابواب کے عنوانات کے بارے میں سوال کیا تھا۔ یہ تراجم ابواب بخاری کی شرح ہے 'شرح تراجم ابواب البخاری'۔ امام بخاری نے مختلف ابواب کے جو عنوانات بتائے ہیں ان میں کیا مفہوم اور حکمت پنہاں ہیں۔ اس پر بہت سے لوگوں نے کتابیں لکھیں جن میں ایک شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی بھی ہے۔

شاہ عبدالعزیزؒ

شاہ صاحب کے یوں تو بہت سے شاگرد اور طلبہ تھے، لیکن ان کے شاگردوں اور طلبہ میں جو سب سے نمایاں نام ہے وہ ان کے اپنے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کا ہے۔ شاہ ولی اللہ کی عمر تو شاید اکسٹھ یا باسٹھ سال ہوئی۔ لیکن شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی عمر زیادہ ہوئی۔ قریباً اسی پچاسی سال ان کی عمر ہوئی اور انہوں نے کم وبیش پینسٹھ ستر سال تک ہندوستان میں درس حدیث دیا۔ جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو شاہ عبدالعزیز کی عمر اٹھارہ یا انیس سال تھی اور وہ اسی وقت فارغ التحصیل ہو کر نئے نئے مدرس ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے والد کی جگہ سنبھالی اور علم حدیث اور درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔ آج برصغیر میں عوامی سطح پر درس قرآن کے جو حلقے جاری ہیں ان کے بانی شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ہیں۔ ان سے پہلے اس طرح عوامی سطح پر درس قرآن نہیں ہوا کرتا تھا۔ محدود درس قرآن کا آغاز شاہ عبدالعزیز کے دادا شاہ عبدالرحیم صاحب نے کیا تھا، پھر شاہ ولی اللہ نے اس کو جاری رکھا، لیکن وہ محدود اہل علم کے لئے تھا۔ عوامی سطح پر جس میں ہزاروں لوگ شریک ہوتے ہوں وہ شاہ عبدالعزیز کا درس قرآن ہوا کرتا تھا جو ہفتہ میں دو مرتبہ ہوتا تھا۔ اس میں مغل حکمرانوں کے اہل خانہ، شہزادے اور اعلیٰ حکام بھی شریک بھی ہوتے تھے۔ ایک آدھ مرتبہ شاہ عبدالعزیز نے مغل بادشاہ کے ہاں جا کر بھی درس دیا اور مغل بادشاہوں نے بھی ان کے درس میں شرکت کی۔

شاہ عبدالعزیز نے کم وبیش ستر سال تک موطا امام مالک اور حدیث کی بعض دوسری کتابوں کا درس دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ شاہ صاحب نے علم حدیث پر دو بڑی کتابیں لکھیں۔ ان کی ایک کتاب 'بستان المحدثین' ہے۔ یہ کتاب دراصل فارسی میں ہے اور اس کا اردو ترجمہ بھی ملتا ہے۔ محدثین کے تذکرہ سے متعلق ہے جس میں محدثین کی خدمات اور تذکرہ پر پہلی مرتبہ برصغیر میں کتاب لکھی جس سے عام آدمی کو علم حدیث کے کارنامے اور محدثین کی خدمات کا پتہ چلا۔ ان کی دوسری کتاب 'عجالہ نافعہ' ہے جس کا اردو ترجمہ مکمل شرح کے ساتھ موجود ہے۔ اس میں انہوں نے اصول حدیث اور علوم حدیث پر اختصار کے ساتھ ایک درسی کتاب تیار کی جو بہت سے مدارس میں طویل عرصہ تک پڑھائی جاتی رہی۔

شاہ صاحب کے بہت سے شاگردوں نے علم حدیث کی شمع روشن کی اور ہندوستان کے ہر گوشے میں جا کر ہر علاقے میں علم حدیث کی تعلیم دی۔ ایک بڑے مشہور صاحب علم تھے مفتی عنایت احمد کاکوروی، جنہوں نے 1857ء کے جہاد میں حصہ لیا تھا اور انگریز کے خلاف جب پہلی بغاوت ہوئی تو اس میں وہ شریک تھے۔ انگریزوں نے ان کو عمر قید کی سزا دی تھی اور جزیرہ انڈیمان میں ان کو جلاوطن کیا تھا جہاں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ بڑے عالم، فقیہ اور مفتی تھے۔ ان کی پوری زندگی افتا میں گزری تھی اور وہ مجاہد بھی تھے۔ ان کو جزیرہ انڈیمان میں زندگی بھر کے لئے قید بامشقت دی گئی اور سزا یہ تھی کہ پورے جزیرے میں جو گندگی ہو اس کو صاف کیا کریں، اس زمانے میں ظاہر ہے کہ اٹیچ باتھ رومز اور ٹائلٹ کا موجودہ سسٹم نہیں تھا اور بیت الخلا کو ہاتھوں سے صاف کیا جاتا تھا، تو مفتی عنایت احمد کاکوروی کو اس بستی کے تمام بیت الخلا صاف کرنے پر لگا دیا گیا تھا اور ان کی آخری عمر اسی کام میں صرف ہو گئی۔ انہی مفتی عنایت احمد کاکوروی کا کہنا ہے کہ شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی ذات ایک ایسا شجرہ طوبیٰ ہے جس کی شاخیں اور جس کے پھل اور ٹہنیاں ہندوستان کے ہر مسلمان کے گھر میں پہنچے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کا کوئی گھر ایسا نہیں ہے جو ان شجرہ ہائے طیبہ کے ثمرات سے مستفید نہ ہوا ہو۔ یہ بات بالکل درست ہے۔ برصغیر میں جتنی روایات علم حدیث کی ہیں وہ سب بالواسطہ اور بلاواسطہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ان کے واسطے سے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تک پہنچتی ہیں۔ کچھ حضرات براہ راست شاہ ولی اللہ تک پہنچتے ہیں اور بیشتر وہ ہیں جو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے واسطے سے ان تک پہنچتے ہیں۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے ستر سال تک درس حدیث دیا اور **1824**ء میں وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ چونکہ انہوں نے طویل عمر پائی تھی اس لئے جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے جتنے ہم سن رشتہ دار اور بھائی تھے وہ سب ان سے پہلے دنیا سے جا چکے تھے۔ اب ان کے جانشین ان کے نواسے حضرت شاہ محمد اسحاق تھے۔ انہوں نے بھی کم وبیش چالیس یا پچاس سال ہندوستان میں درس حدیث دیا اور ہزاروں تلامذہ ان سے درس حدیث پڑھ کر فارغ ہوئے۔ ان کے تلامذہ میں یہ کہنا کہ کون نمایاں ہیں اور کون نمایاں نہیں، یہ بڑا دشوار ہے۔ شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کے ہزاروں شاگرد تھے جنہوں نے ہندوستان کے گوشے گوشے میں علم حدیث کو عام کیا۔

حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلویؒ

ان کے شاگردوں میں تین حضرات بڑے نمایاں ہیں۔ اتنے نمایاں ہیں کہ ان سے وہ روایتیں آگے چلیں جو ہندوستان کے ہر علاقے میں پھیلیں۔ ان کے ایک شاگرد تھے جو شیخ الکل یعنی ہر فن کے استاد اور سب کے استاد کہلاتے تھے۔ وہ تھے حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی۔ شاہ محمد اسحاق **1857** کے ہنگامہ کے کچھ سال بعد بعد ہجرت کر کے مکہ مکرمہ چلے گئے۔ باقی زندگی وہیں گزاری اور وہیں ان کا انتقال بھی ہوگیا۔ ان کے بعد ان کی جانشینی ہندوستان میں جن حضرات نے کی ان میں ایک تو میاں نذیر حسین محدث دہلویؒ تھے جن سے تلامذہ کا ایک طویل سلسلہ چلا۔ میاں صاحب کے تلامذہ میں جو لوگ نمایاں ہیں ان میں سے دو تین نام میں عرض کر دیتا ہوں۔ ایک علامہ وحید الزمان تھے جنہوں نے علوم حدیث کی تقریباً تمام کتابوں کا اردو ترجمہ کیا اور اردو زبان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ صحیح بخاری، مسلم، ترمذی، موطا امام مالک اور حدیث کی بہت سی کتابیں اردو ترجمہ کے ساتھ سامنے آئیں۔ گویا اردو زبان میں حدیث کی کتابوں کے پہلے مترجم علامہ وحید الزمان ہیں جو حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی کے شاگرد ہیں۔ ظاہر ہے اردو میں ان کتب کے تراجم کی اشاعت سے علم حدیث جتنا عام ہوا ہوگا اس کا اندازہ ہم کر سکتے ہیں۔

میاں نذیر حسین کے دوسرے شاگرد تھے علامہ شمس الحق عظیم آبادی، یہ اتنے بڑے محدث ہیں کہ اگر یہ کہا جائے کہ ان کے زمانے میں ان سے بڑا محدث کوئی نہیں تھا، یا اگر تھے تو ایک دو ہی تھے۔ تو شاید یہ مبالغہ نہیں ہوگا۔ انہوں نے دو کارنامے انجام دیئے جو بہت غیر معمولی

تھے۔ان کا ایک کارنامہ تو یہ تھا کہ انہوں نے 'غایة المقصود' کے نام سے سنن ابوداؤد کی شرح لکھی جو بتیس جلدوں میں تھی۔ بہت افسوس کی بات ہے کہ یہ شرح چھپ نہیں سکی۔ انہوں نے اس کی جلد اول شائع کی تو بعض لوگوں نے کہا کہ اتنی طویل شرح کون پڑھے گا۔ اس کو کیسے چھاپیں گے، پتہ نہیں آپ کی زندگی میں چھپ سکے گی یا نہیں۔ انگریزوں کا دور تھا۔ مسلمانوں کے پاس وسائل نہیں تھے، فقر و فاقہ تھا، نہ چندہ دینے والے تھے اور نہ کوئی مسلمان بڑی رقم بطور چندہ دینے کی پوزیشن میں تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی اور ایک دو شاگردوں کو اس کی تلخیص کے کام پر لگا دیا۔ یہ تلخیص 'عون المعبود' کے نام سے شائع ہوئی اور آج چھپی ہوئی ہر جگہ ملتی ہے جو سنن ابوداؤد کی بہترین شرحوں میں سے ایک ہے۔ عون المعبود برصغیر، ایران، بیروت، مصر اور باقی عرب دنیا میں بھی چھپی ہے اور اس کے درجنوں ایڈیشن نکلے ہیں۔

علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوریؒ

علامہ شمس الحق عظیم آبادی کے ایک شاگرد اور ان کے سلسلہ کے ایک اور بزرگ علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری تھے۔ علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری صف اول کے محدث تھے۔ انہوں نے سنن ترمذی کی ایک شرح لکھی جس کا نام 'تحفۃ الاحوذی' ہے۔ اس کے بارے میں اگر میں یہ عرض کروں کہ یہ سنن ترمذی کی اتنی ہی بہترین شرح ہے جتنی بہترین شرح صحیح بخاری کی فتح الباری ہے، تو شاید یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ جامع ترمذی کی اس سے بہتر کوئی اور شرح موجود نہیں ہے اور یہ برصغیر کے ایک صاحب علم کا اتنا بڑا کارنامہ ہے جو دنیائے اسلام میں سمجھا بھی جاتا ہے اور اس کا اعتراف بھی کیا جاتا ہے۔ اس کتاب کا بیروت، تہران، مصر، ہندوستان، پاکستان اور کئی دوسری جگہوں پر بارہا چھپنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کتاب کو دنیائے اسلام میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا ہے۔ برصغیر میں اس کا جو ایڈیشن شائع ہوا تھا وہ پانچ جلدوں میں ہے۔ عرب دنیا میں شائع ہونے والے ایڈیشنوں کی جلدیں مختلف ہیں۔ کوئی سولہ جلدوں میں ہے کوئی پندرہ میں اور کوئی بیس میں۔ لیکن یہ ترمذی کی بہترین شرح ہے اور اگر کوئی اس سے اتفاق نہ کرے کہ یہ جامع ترمذی کی سب سے بہتر شرح ہے، تو یہ تو بلا شک و شبہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب جامع ترمذی کی چند بہترین شرحوں میں یقیناً ہے اور اس سے کوئی اختلاف نہیں کرے گا۔

مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری کے تلامذہ بہت کثرت سے ہیں۔ میں نے بھی ایک بزرگ سے اجازت حدیث لی تھی جو براہ راست مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری کے شاگرد تھے اور گویا میں نے ایک واسطہ سے مولانا مبارکپوری سے اجازت حاصل کی ہے۔ وہ بزرگ درمیان میں ہیں اورانہوں نے مولانا مبارکپوری سے علم حدیث کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ہمارے برصغیر کے مشہور عالم اور مفسر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی بھی علم حدیث میں مولانا مبارکپوری کے شاگرد تھے۔

مبارکپور اعظم گڑھ کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ میں 1982 میں اس گاؤں کو دیکھنے کے لئے صرف اس وجہ سے گیا تھا کہ مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری کا گاؤں ہے اس لئے دیکھنا چاہیے۔ وہ مدرسہ اب بھی قائم ہے جہاں مولانا مبارکپوری حدیث پڑھایا کرتے تھے۔ وہ کچا سا مکان اب بھی موجود ہے جس میں بیٹھ کر اتنا بڑا کام ہوا جو پوری دنیائے اسلام میں جامع ترمذی کی تدوین کے بعد نہیں ہوا تھا۔

شاہ محمد اسحاق کے دوسرے شاگردوں کا ایک دوسرا سلسلہ ہے جن میں ایک بڑے مشہور بزرگ تھے شاہ ابوسعید مجددی۔ جو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں تھے اور شاہ محمد اسحاق کے شاگردوں میں تھے۔ ان سے ایک نیا سلسلہ شاہ اسحاق کے تلامذہ کا نکلا جن کے شاگرد تھے مولانا شاہ عبدالغنی۔ ان کے شاگرد تھے مولانا مملوک علی۔ مولانا مملوک علی طویل عرصہ تک علم حدیث کے استاد رہے۔ ان کے تلامذہ میں ایک گروہ وہ ہے جو علماء دیوبند کہلاتا ہے اور دوسرا وہ ہے جو سرسید احمد خان اور ان کے ہم راہی ہیں۔ سرسید احمد خان بھی مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے اور علماء دیوبند میں مولانا قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہی شامل ہیں۔

مولانا رشید احمد گنگوہی اور ان کے تلامذہ

مولانا رشید احمد گنگوہی زندگی بھر حدیث پڑھاتے رہے۔ ان کے امالی یعنی حدیث میں ان کی تقریروں اور دروس کو بہت سے لوگوں نے جمع کر کے مرتب کیا اور شائع کرایا۔ صحیح بخاری کی شرح 'لامع الدراری' کے نام سے ایڈٹ ہوئی۔ اور بھی متعدد کتابوں کی شرحیں ایڈٹ ہوئیں اور ان کے نام سے یہ چیزیں شائع ہوئیں جو آج موجود ہیں۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے شاگردوں میں دو شخصیات بہت نمایاں ہیں۔ ایک کا اسم گرامی تھا مولانا محمد یحیٰ اور دوسرے کا اسم گرامی تھا

مولانا خلیل احمد۔ مولانا خلیل احمد نے سنن ابوداؤد کی شرح 'بذل المجہود' کے نام سے لکھی۔ بذل المجہود بھی پندرہ بیس جلدوں میں ہے۔ عرب دنیا میں کئی بار چھپی ہے۔ مصر، ہندوستان، پاکستان اور کئی دوسری جگہوں پر چھپی ہے۔ یہ سنن ابوداؤد کی بہترین شرحوں میں سے ایک ہے۔ غایۃ المقصود کا درجہ تو بلاشبہ بہت اونچا ہے۔ پھر عون المعبود اور پھر بذل المجہود کا درجہ ہے۔ اور پھر باقی شرحوں کا درجہ ہے۔ یہ بڑی جامع شرح ہے۔ فقہی اعتبار سے اس میں مسائل پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ حدیثی اور روایتی مسائل پر عون المعبود میں زیادہ زور دیا گیا ہے اور اس طرح یہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔

مولانا انور شاہ کشمیری

مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے ایک شاگرد جنہوں نے دیگر علمائے دیوبند سے بھی کسب فیض کیا وہ خاتم المحدثین علامہ سید انور شاہ کشمیری ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ علماء دیوبند میں ان سے بڑا محدث پیدا نہیں ہوا۔ یقیناً علماء دیوبند میں حدیث کی جو روایت ہے اس کے سب سے بڑے ترجمان اور سب سے بڑے نمائندہ علامہ سید انور شاہ صاحب کشمیری ہیں جن کے تلامذہ کی ایک بہت بڑی تعداد پورے برصغیر میں پھیلی ہوئی ہے۔ برصغیر میں بیسویں صدی کے نصف اول بلکہ 1925 تک کی اس ابتدائی چوتھائی کو نکال کر جتنے بھی علماء حدیث مسلک دیوبند سے وابستہ ہیں وہ سب کے سب مولانا انور شاہ کشمیری کے شاگرد ہیں۔ ان سب حضرات نے مل کر علم حدیث کے ہر موضوع پر کام کیا ہے۔ علم حدیث کی ہر کتاب کی شرح لکھی ہے۔ یہ اتنا بڑا کام ہے جس کی مثال بیسویں صدی میں دنیائے اسلام کے کسی اور ملک میں نہیں ملتی۔ تفصیلات بیان کرنے کا موقع نہیں۔ مولانا انور شاہ کشمیری کے درس حدیث کی اپنی یادداشتیں فیض الباری کے نام سے قاہرہ میں شائع ہوئی ہیں جو ان کے شاگرد مولانا بدر عالم صاحب نے مرتب کی ہیں۔

مولانا انور شاہ کشمیری کے جو نوٹس جامع ترمذی پر تھے وہ ان کے شاگرد مولانا محمد یوسف بنوری نے جو میرے بھی استاد تھے، مرتب کئے جو معارف السنن کے نام سے شائع ہوئے۔ ترمذی پر ان کے ایک اور شاگرد مولانا محمد چراغ نے جن کا تعلق گجرانوالہ سے تھا، 'العرف الشذی' کے نام سے کام کیا جو شاہ صاحب ہی کے امالی پر مبنی ہے اور مطبوعہ موجود ہے۔ مولانا

انورشاہ کشمیری کے ایک اور شاگرد مولانا محمد اشفاق الرحمٰن تھے جو مولانا مودودیؒ کے بھی استاد تھے، ان کی دو کتابیں ہیں۔ ایک ترمذی کی شرح ہے جو غیر مطبوعہ ہے اور دوسرے موطا امام مالک کی شرح ہے جو پاکستان میں کئی بار چھپی ہے اور موطا امام مالک کی مختصر اور جامع شرحوں میں سے ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ مولانا انورشاہ کشمیری کے کئی شاگردوں نے علم حدیث کے مختلف موضوعات پر کام کیا اور علم حدیث کا ایک پورا ذخیرہ انہوں نے ہندوستان میں چھوڑا۔ خود مولانا کے داماد اور شاگرد مولانا احمد رضا بجنوری نے صحیح بخاری پر اپنے شیخ کے امالی کو اردو میں اٹھارہ جلدوں میں مرتب کیا۔ ان کی یہ کتاب 'انوار الباری' کے نام سے پاکستان اور ہندوستان میں کئی بار چھپ چکی ہے۔ علامہ انورشاہ کشمیری کا کام اتنا وسیع ہے کہ اگر اس کی تفصیل بیان کی جائے تو اتنا وقت درکار ہے کہ شاید پورا ایک دن بھی اس کے لئے کافی نہ ہوگا۔ مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری اور مولانا شمس الحق عظیم آبادی کے عظیم الشان کام کو میں نے اتنے اختصار کے ساتھ بیان کیا۔ اگر اس کی تفصیل بیان کی جائے تو بہت وقت درکار ہوگا۔

فرنگی محلی علماء

ایک اور بزرگ تھے بلکہ ایک اور روایت تھی جس کا میں دو تین جملوں میں ذکر کرتا ہوں۔ اس روایت سے وابستہ اہل علم کی بھی علم حدیث میں بڑی غیر معمولی خدمات ہیں۔ یہ روایت علماء فرنگی محل کی ہے۔ لکھنو میں ایک بہت بڑا امکان تھا۔ ایک حویلی تھی جو جہانگیر نے انگریز تاجروں کو دی تھی۔ انگریز تاجر جہانگیر کے زمانے میں آئے تھے انہوں نے تجارتی مرکز قائم کرنے کی اجازت مانگی۔ جہانگیر نے ان کو وہ تجارتی کوٹھی دے دی۔ ہندوستان میں جہاں جہاں انگریزوں نے اپنے مراکز قائم کئے ان میں سے ایک لکھنو میں بھی تھا۔ وہ حویلی فرنگی محل کہلاتی تھی کیونکہ فرنگی وہاں رہا کرتے تھے۔ جب ان کی سازشیں اور حرکتیں برداشت کی حدوں سے باہر ہوگئیں تو اورنگزیب عالمگیر نے ان کے خلاف ایکشن لیا۔ ان کو وہاں سے نکال دیا۔ وہ فرنگی محل کی عمارت ان سے خالی کرادی اور ملا نظام الدین سہالوی ایک عالم تھے، ان کو دے دی کہ اس میں کوئی دینی ادارہ قائم کردیں۔ اس طرح فرنگی محل میں ایک دینی ادارہ قائم ہوگیا اور جتنے بھی علما وہاں کے فارغ التحصیل ہیں وہ فرنگی محلی کے نام سے مشہور ہیں۔ ان میں کئی علماء پیدا ہوئے جن

میں ایک بہت نمایاں نام مولانا عبدالحیٔ لکھنوی کا ہے۔مولانا عبدالحیٔ لکھنوی علم حدیث پر بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ان کی ویسے تو کئی کتابیں قابل ذکر ہیں۔لیکن علم حدیث پر اس وقت ان کی دو کتابیں میرے ذہن میں آرہی ہیں۔ایک موطا امام محمد کی شرح ہے'التعلیق الممجد علی موطا امام محمد 'اور دوسری کتاب علم جرح وتعدیل پر ہے۔جو جرح وتعدیل پر چند بہترین کتابوں میں سے ایک ہے۔'الرفع و التکمیل فی الجرح و التعدیل'۔یہ ہندوستان، پاکستان، بیروت، شام، دمشق، حلب، قاہرہ اور دوسری کئی جگہوں سے چھپ چکی ہے اور بہت مشہور کتاب ہے۔ان کے علاوہ بھی فرنگی محل کے علماء میں سے کئی ایک ہیں جنہوں نے علم حدیث پر بہت کام کیا۔

نواب صدیق حسن خان

ایک اور بزرگ جن کا تذکرہ ضروری ہے۔وسطی ہندوستان کے شہر بھوپال کے رہنے والے تھے۔بنیادی طور پر وہ حدیث اور فقہ کے عالم تھے۔تذکرہ اور رجال ان کا مضمون تھا۔ان کا نام صدیق حسن خان تھا۔ان کی شادی بیگم بھوپال سے ہوئی تھی جو بیوہ تھی۔چونکہ بیگم بھوپال نے ان سے نکاح کرلیا تھا اس وجہ سے ان کو نواب کا لقب ملا اور نواب صدیق حسن خان کہلانے لگے۔ اصل حکمرانی ان کی بیگم کی تھی۔لیکن چونکہ وہ ملکہ بھوپال کے شوہر تھے اس لئے ان کو بہت وسائل حاصل ہو گئے تھے۔ان وسائل سے کام لے کر انہوں نے ایک بہت بڑا تحقیقی ادارہ قائم کیا۔خود بھی کئی کتابیں لکھیں اور اپنی نگرانی میں اور بھی بہت سی کتابیں لکھوائیں۔ان میں علوم حدیث پر درجنوں کتابیں شامل ہیں۔درجنوں کتابیں سرکاری اہتمام سے شائع ہوئیں اور پورے ہندوستان میں تقسیم ہوئیں۔علم حدیث کو ان کی کوششوں سے ایک نیا فروغ ملا جو برصغیر میں علم حدیث کی تاریخ میں ایک نمایاں باب ہے۔

بھوپال میں علم حدیث کو ان کی وجہ سے جو عروج حاصل ہوا اس کے اثرات طویل عرصہ تک محسوس کئے گئے۔انہوں نے عرب دنیا سے ایک بڑے محدث علامہ علی بن محسن الیمانی کو بھوپال بلایا۔یہ بزرگ علامہ شوکانی کے ایک واسطے سے شاگرد تھے۔امام شوکانی ایک بہت مشہور محدث تھے اور اتنے بڑے محدث تھے کہ ان کو یمن کا آخری بڑا محدث کہا جاتا ہے۔یہ علامہ علی بن محسن ایک واسطہ سے ان کے شاگرد تھے۔وہ بھوپال میں آئے اور پھر طویل عرصہ تک یہاں

رہے۔ ان کی اولاد پھر نسل در نسل بھوپال میں حدیث کا درس دیتی رہی اور علماء نے بڑے پیمانے پر ان سے کسب فیض کیا۔ دار العلوم ندوۃ العلما میں حدیث پڑھانے والے کئی بڑے بڑے علما ان کے براہ راست اور بالواسطہ شاگرد رہے جن میں سے ایک بڑا نمایاں نام مولانا حیدر حسن خان کا تھا۔ ندوۃ العلما میں حدیث پڑھانے والے اکثر و بیشتر علما انہی مولانا حیدر حسن خان کے شاگرد تھے۔

دائرۃ المعارف العثمانیہ

یہ برصغیر میں خدمات حدیث کا ایک انتہائی مختصر ترین جائزہ ہے۔ اس میں مناسب ہوگا کہ اگر ایک ادارہ کا بھی ذکر کیا جائے۔ اگر چہ یہ ایک سرکاری ادارہ تھا لیکن اس نے علم حدیث پر بڑا کام کیا۔ یہ حیدر آباد دکن میں قائم ہوا تھا جس کا نام تھا دائرۃ المعارف العثمانیہ۔ سلطنت آصفیہ جو حیدر آباد میں قائم تھی اور اس کے فرمانروا میر عثمان علی خان نے ایک ادارہ دائرۃ المعارف العثمانیہ کے نام سے قائم کیا تھا۔ اس میں علم حدیث پر کئی درجن کتابیں شائع ہوئیں جو دنیا کے سامنے پہلی مرتبہ اس ادارہ کی مدد سے سامنے آئیں۔ میرے پاس وہ مکمل فہرست موجود نہیں ہے جس میں اس ادارہ سے شائع ہونے والی ان کتابوں کا تذکرہ ہو جن کا تعلق علم حدیث سے ہے۔ لیکن میرے ذاتی مطالعہ یا علم میں جو کتابیں آئیں ان میں سے کئی کتابیں بڑی اہم ہیں۔ الکفایہ فی علم الروایۃ، جو خطیب بغدادی کی بہت مشہور کتاب ہے، پہلی بار اسی ادارہ کے ذریعہ دنیا کے سامنے آئی۔ لسان المیزان اور تھذیب التھذیب جو علم رجال پر حافظ ابن حجر عسقلانی کی انتہائی مشہور اور مستند کتابیں ہیں، پہلی بار اسی ادارہ نے شائع کیں۔ المؤتلف والمختلف حافظ ابن ماکولا کی ایک بڑی جامع کتاب ہے۔ المؤتلف والمختلف رجال کی وہ کتاب ہے جس میں ملتے جلتے ناموں کو جمع کیا گیا ہے تاکہ ایک جیسے ناموں والے راویوں میں التباس نہ ہو۔ یہ کئی جلدوں میں ہے اور پہلی بار دائرۃ المعارف سے شائع ہوئی ہے۔

اسی طرح سے کتب حدیث کے رجال پر الگ الگ کتابیں تھیں۔ رجال بخاری پر الگ، رجال مسلم پر الگ۔ پھر بعد میں لوگوں نے مختلف کتابوں پر رجالوں میں مشترک رجال پر کتابیں لکھیں۔ تو اس طرح کی ایک کتاب صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے مشترک رجال پر تھی 'کتاب الجمع بین کتابی ابی نصر الکلاباذی و ابی بکر الاصفھانی فی رجال البخاری و مسلم'۔ یہ

پہلی مرتبہ وہاں سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ علم حدیث پر کم وبیش پچیس تیس کتابیں پہلی مرتبہ دائرۃ المعارف عثمانیہ سے شائع ہوئیں اور پوری دنیا میں تقسیم ہوئیں۔ گویا دنیا میں ان کتب کے اثرات اس ادارہ کے ذریعے پہنچے اس لئے اس ادارہ کو بھی علم حدیث کی تاریخ میں یاد رکھنا چاہئے۔

یہ مختصر ترین جائزہ ہے علم حدیث کے اس کام کا جو برصغیر میں ہوا۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ علم حدیث کے دور نو کا آغاز شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے ہوا جو آج تک چل رہا ہے اور جتنے بھی تلامذہ حدیث، اساتذہ حدیث یا علماء حدیث برصغیر میں آج نظر آتے ہیں وہ سب مختلف واسطوں سے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے شاگرد ہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے دو باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ ایک بات یہ کہ امت مسلمہ کو ایک پلیٹ فارم پر کیسے جمع کیا جائے اور لوگوں میں عدم وحدت کے رجحان کو کیسے ختم کیا جائے۔ یہ ان کی اولین کوشش ہوا کرتی تھی۔ ان کی دوسری کوشش یہ ہوا کرتی تھی کہ ان مسلکی اختلافات کو اور مسلمانوں میں جو متنوع آرا ہیں ان کو حدیث نبوی اور رسول اللہ ﷺ کی سنت سے کیسے ہم آہنگ کیا جائے اور کس طرح سے علم حدیث کو عام کیا جائے کہ اختلافات حدود کے اندر آجائیں۔

اس لئے حدیث کے تمام طلبہ سے میری گزارش یہ ہوتی ہے کہ شاہ ولی اللہ کی کتابیں اپنے مطالعہ میں رکھیں۔ خاص طور پر ان کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ۔ حجۃ اللہ البالغہ کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ شروع کا ہے جو نسبتاً مشکل ہے، اس کو بھی پڑھنا چاہئے۔ لیکن اگر وہ نہ پڑھ سکیں تو اس مشکل حصہ کو چھوڑ کر بقیہ حصہ جو سارے کا سارا علم حدیث پر مشتمل ہے اور علم حدیث سے نکالے گئے دروس اور حکمتوں پر مبنی ہے وہ حدیث کے تمام طلبہ کو پڑھنا چاہئے۔ اس سے وہ رجحان جسے آپ accomodative tendency کہہ سکتے ہیں، یعنی سب کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا رجحان شاہ ولی اللہ کی اس کتاب کے مطالعہ سے خود بخود پرورش پاتا ہے اور یہی حضرت شاہ ولی اللہ کی تمام کوششوں اور کاوشوں کا مقصود تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

برصغیر میں حدیث سے متعلق کام کے بارے میں سن کر بہت خوشی ہوئی۔ کیا اور ممالک میں بھی ایسا ہوا کہ نہیں؟

دوسرے ممالک میں انیسویں صدی میں ایسا نہیں ہوا۔ افسوس کہ بیسویں صدی کے نصف اول میں بھی نہیں ہوا اور اگر کچھ ہوا ہے تو وہ بہت کم ہے۔ یعنی جتنا کام برصغیر میں ہوا اتنا کام اٹھارویں اور انیسویں صدی میں اور ملکوں میں نہیں ہوا۔ اب اور ملکوں میں، خاص طور پر عرب ممالک میں بیسویں صدی کے اواخر یا نصف ثانی سے کام کی رفتار بہت تیز ہوگئی ہے اور اب وہ ہم سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ اس وقت جتنا کام عرب دنیا میں ہو رہا ہے، سعودی عرب، اردن، شام اور بعض دوسرے ممالک میں، وہ بڑا غیر معمولی ہے۔ اتنا بڑا کام ہے کہ اس کو دیکھا جائے تو دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔

کیا میں علامہ سیوطی کے بارے میں جان سکتی ہوں؟

علامہ سیوطی کے بارے میں دو تین جملے عرض کرتا ہوں۔ ان کا پورا نام جلال الدین سیوطی ہے۔ دسویں صدی ہجری کے اوائل میں ان کا انتقال ہوا۔ اپنے زمانہ کے ہرفن مولا امام تھے۔ پانچ سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ علم حدیث میں ان کی بڑی بنیادی کتابیں ہیں۔ علم حدیث سے متعلق انہوں نے کم وبیش پچاس ساٹھ کتابیں لکھیں اور ایک خاص بات ان میں اور برصغیر کے ایک اور بزرگ، جن کا نام لینا میں بھول گیا، ہمارے ٹھٹہ کے ایک بزرگ تھے جو غالباً 1238ھ میں فوت ہوئے ہیں، علامہ ابوالحسن محمد بن عبدالوہاب ٹھٹوی السندی، ان کا یہ ایک عجیب وغریب کارنامہ ہے کہ صحاح ستہ کی ہر کتاب پر ان دونوں کی ایک ایک شرح موجود ہے۔ صحیح بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ، ان چھ کی چھ کتابوں کی انہوں نے شرحیں لکھیں جو اکثر مطبوعہ موجود ہیں ایک دو غیر مطبوعہ ہیں۔ اسی طرح سے علامہ سیوطی نے بہت سی کتابوں کی شرحیں لکھیں جن میں صحاح ستہ کی ہر کتاب کی شرح بھی شامل ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ پر جو کتاب میرے پاس ہے اس کی اردو مشکل ہے۔

ظاہر ہے کتاب مشکل ہے تو اردو بھی مشکل ہوگی۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ ایک بزرگ تھے مولانا عبدالحق حقانی، ان کا ترجمہ نسبتاً آسان ہے۔ یہ ترجمہ دو جلدوں میں کراچی سے نور محمد کارخانہ تجارت سے غالباً 56-1955 میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ بھی شائع ہوا ہے

اگر مل جائے تو یہ آسان ہے۔ ابھی حال ہی میں ادارہ تحقیقات اسلامی (آئی آر آئی) نے اس کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے۔ اس کے ایک حصہ کا انگریزی ترجمہ میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر غزالی صاحب نے کیا تھا، وہ بھی مطبوعہ موجود ہے لیکن ایک مکمل ترجمہ دو جلدوں میں ایک امریکی نومسلم خاتون، جن کا اصل نام مارسیہ ہرمنسن ہے، انہوں نے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ وہ انگریزی ترجمہ بہت اچھا ہے اور یہاں ملتا ہے۔ اردو پڑھنا چاہیں تو مولانا عبدالحق حقانی کا ترجمہ پڑھ لیں۔

آج کے دور کے برصغیر کے محدثین کے بارے میں بیان کر دیں۔

وہ اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا تذکرہ کرنا بڑا دشوار ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی کاوشوں میں برکت دے۔ لیکن اس درجہ کا کوئی آدمی نہیں ہے جس درجہ کے علامہ انور شاہ کشمیری یا علامہ شمس الحق عظیم آبادی، یا مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری تھے۔ ابھی ایک بزرگ ہندوستان میں ہیں اور غالباً حیات ہیں اور بہت معمر ہوں گے۔ ان کی ایک شرح بخاری 'انوار الباری' کے نام سے چھپی ہے۔ کراچی میں بھی چھپی ہے۔ بہت اچھی کتاب ہے۔ یہ مولانا انور شاہ کشمیری کے داماد اور شاگرد تھے۔ انہوں نے ان کی تقریروں کے نوٹس مرتب کئے ہیں۔ جو مجھے بہت اچھے معلوم ہوئے۔ اگر چہ اس میں مسلکی چیزیں بہت ہیں جو نہیں ہونی چاہئے تھیں لیکن اس کے باوجود کتاب بہت اچھی ہے۔ ایک ہمارے دوست مولانا تقی عثمانی ہیں۔ انہوں نے مولانا شبیر احمد عثمانی کی شرح صحیح مسلم کی تکمیل کی ہے۔ فتح الملہم مولانا شبیر احمد عثمانی کے قلم سے صحیح مسلم کی شرح ہے۔ یہ نامکمل تھی اور کتاب الرضاع تک ہی لکھی جا سکی۔ اس کی بقیہ جلدیں مولانا محمد تقی عثمانی نے لکھی ہیں۔ اسی طرح اور حضرات کی کتابیں بھی ہیں جن کی تفصیل بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆☆

بارھواں خطبہ

علوم حدیث - دور جدید میں

ہفتہ 18 اکتوبر 2003

علوم حدیث - دور جدید میں

اس گفتگو سے دو چیزیں پیش کرنا مقصود ہیں۔ ایک تو اس غلط فہمی یا کم ہمتی کی تردید کہ علم حدیث پر جو کام ہونا تھا وہ ماضی کے سالوں میں ہو چکا۔ اور آج نہ علم حدیث پر کسی نئے کام کی ضرورت ہے اور نہ کوئی نیا کام ہو رہا ہے۔ محدثین کے یہ کارنامے سن کر ایک خیال یہ ذہن میں آسکتا ہے کہ جتنا کام ہونا تھا وہ ہو چکا۔ جو تحقیق ہونی تھی وہ ہو چکی۔ اب مزید نہ کسی کام کی ضرورت ہے اور نہ کسی تحقیق کی۔ یہ غلط فہمی دور ہو سکتی ہے اگر مختصر طور پر یہ دیکھ لیا جائے کہ آج کل حدیث پر کتنا کام ہو رہا ہے اور اس میں مزید کن کن کاموں کے کرنے کے امکانات ہیں اور کیا کیا کام آئندہ ہو سکتے ہیں۔

دوسری وجہ اس گفتگو کی یہ ہے کہ بہت سے ایسے اہل علم اور تحقیق کے طلبہ جو کوئی کام کرنا چاہتے ہیں اور علم حدیث کو اپنے مطالعہ کا موضوع بنانا چاہتے ہیں، ان میں سے بہت سے طلبہ کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اگر علم حدیث پر کوئی نئی تحقیقی کاوش شروع کی جائے تو وہ کیا ہو۔ کن موضوعات پر ہو اور کن خطوط پر ہو۔ آج کی گفتگو میں انہی دو اسباب کی وجہ سے بعض گزارشات پیش خدمت ہیں۔

بیسویں صدی کو اگر ہم دور حاضر یا دور جدید قرار دیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کے دوران علم حدیث میں ایک نئی سرگرمی پیدا ہوئی ہے اور علم حدیث پر کام کرنے کے نئے نئے میدان اور نئے نئے موضوعات سامنے آئے ہیں۔ خاص طور پر دنیائے عرب میں اہل علم کی ایک بہت بڑی تعداد نے علم حدیث پر ایک نئے انداز سے کام کا آغاز کیا ہے اور تحقیق اور علمی کاوش کے

ایسے ایسے نمونے دنیا کے سامنے رکھے ہیں جن کو علم حدیث کی تاریخ میں ایک نئے دور کا نقطۂ آغاز کہا جاسکتا ہے۔عرب دنیا میں بہت سی جامعات کے شعبہ ہائے اسلامیات نے اور بہت سی جامعات اسلامیہ نے علم حدیث کے موضوع پر ایسے نئے نئے مقالات تیار کرائے ہیں جنہوں نے علم حدیث کے ان تمام گوشوں کو از سر نو زندہ کر دیا ہے جن کو ایک طویل عرصہ سے لوگوں نے نظر انداز کر دیا تھا۔

ایک عام تاثر یہ تھا کہ رجال اور جرح وتعدیل پر جتنا کام ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ احادیث مرتب ہوچکیں، مدون ہوچکیں اور کتابی شکل میں ہم تک پہنچ چکیں۔اب از سر نو رجال پر غور کرنے یا جرح وتعدیل کے مباحث کو دوبارہ چھیڑنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور نہ اب اس کی ضرورت ہے۔جزوی طور پر یہ بات درست ہے اور ایک حد تک میں بھی اس سے اتفاق کرتا ہوں کہ احادیث مرتب ہوچکیں، کتابوں کی شکل میں مدون ہوچکیں، احادیث کا درجہ متعین کیا جا چکا ہے اور کم وبیش ننانوے فیصد احادیث کے بارے میں یہ تحقیق ہو چکی ہے کہ ان میں سے کس حدیث کا روایت کے اعتبار سے، فن رجال اور سند کے اعتبار سے کیا درجہ ہے۔اس لئے اس موضوع پر کسی نئی تحقیق یا کسی نئے نتیجہ کا سامنے آنا بہت بعید از امکان ہے۔لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خود علم رجال اپنی اہمیت کھو چکا ہے یا علم جرح وتعدیل کی اب کوئی اہمیت نہیں رہی اور یہ ماضی کا ایک بھولا بسرا علم ہے جس کو ایک آثار قدیمہ کے طور پر تو پڑھا جاسکتا ہے، ایک زندہ علم اور ایک مسلسل حرکت پذیر علم کے طور پر اب اس کی اہمیت نہیں رہی۔میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔علم رجال، علم روایت، علم سند اور علوم حدیث آج بھی ویسے ہی زندہ علوم ہیں جیسے آج سے ایک ہزار سال پہلے یا بارہ سو سال پہلے تھے۔ان علوم میں تحقیق کے ایسے ایسے گوشے اب بھی موجود ہیں جو اہل علم کی اور طلبہ حدیث کی توجہ کے مستحق ہیں۔علامہ اقبال کا ایک فارسی شعر ہے جو شاید انہوں نے ایسے ہی کسی موقع کے لئے کہا ہوگا۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں
ہزار بادہ ناخوردہ در رگ تاکست

یہ مت سمجھو کہ انگور کے خوشے سے شراب نچوڑنے والے کا کام ختم ہو چکا ہے۔ابھی تو انگور کے خوشوں میں ہزاروں شرابیں ہیں جو نچوڑی جانی ہیں اور جن کو نکال کر ابھی لوگوں کے

سامنے پیش کرنا ہے۔ یہی معاملہ علم حدیث کا ہے کہ علم حدیث کے تمام علوم وفنون میں تحقیق کے ایسے ایسے گوشے ابھی موجود ہیں جن پر کام کرنے کی ضرورت ہے اور اہل علم ان پر کام کر رہے ہیں۔

اس معاملہ میں دنیائے عرب کی جامعات نے، خاص طور پر جامعہ ازہر، سعودی عرب، شام اور مراکش کی جامعات میں علم حدیث کے موضوعات پر قابل ذکر ذخیرہ پیش کیا ہے اور علم حدیث کو ایک نئے انداز سے مرتب کرنے کی طرح ڈالی ہے۔ ان حضرات کے نام لئے جائیں تو گفتگو بڑی طویل ہو جائے گی جنھوں نے علم حدیث کو نئی جہتوں سے نوازا ہے۔ ایسے حضرات کی تعداد بھی درجنوں سے بڑھ کر سینکڑوں میں ہے جو آج عرب دنیا کے گوشے گوشے میں علم حدیث اور علوم حدیث پر نئے انداز سے کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض کا ذکر میں آج کی گفتگو میں کروں گا۔

مستشرقین کی خدمات

اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہاں مستشرقین کی مثبت علمی کاوشوں کا اعتراف بھی کرنا چاہئے۔ ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ اچھی بات کی تعریف کرے اور بری بات کی برائی کی نشاندہی کرے۔ ہم مستشرقین کے کاموں پر تنقید کرتے ہیں۔ مستشرقین کے جو کام تنقید کے قابل ہیں ان پر تنقید کرنی چاہئے۔ جہاں جہاں غلطیاں ہیں ان کی نشاندہی کرنی چاہئے۔ جہاں جہاں اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں یا پیدا کی گئی ہیں ان کا ازالہ کیا جانا چاہئے۔ اس کے ساتھ ساتھ جہاں مستشرقین نے کوئی اچھا کام کیا ہے اس کا اعتراف بھی کرنا چاہئے۔ مستشرقین کا کیا ہوا ایک غیر معمولی کام المعجم المفهرس لالفاظ الحديث جیسے جامع انڈکس کی ترتیب ہے جس کا میں نے پہلے تذکرہ کیا ہے۔ یہ مستشرقین کی ایک جماعت نے سالہا سال کی کوششوں کے بعد تیار کی ہے۔ یہ بڑے سائز کی سات آٹھ جلدوں میں حدیث کی ایک انڈکس ہے جو ابجدی ترتیب کے حساب سے ہے۔ آپ کو کسی حدیث کا کوئی ایک لفظ بھی یاد ہو تو آپ اس سے نو کتابوں میں موجود کسی حدیث کا پتہ چلا سکتے ہیں۔ صحاح ستہ، موطا امام مالک، مسند امام احمد اور مسند دارمی۔ آپ کو مثال کے طور پر اگر یہ یاد ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت کردہ ایک حدیث ہے کہ انہوں نے ایک اونٹ خریدا اور وہ ان سے رسول اللہ ﷺ نے خرید لیا۔ اب آپ کو جمل کا لفظ معلوم

ہے اور باقی کوئی الفاظ یاد نہیں ہیں اور نہ یہ یاد ہے کہ صحابیؓ کون سے تھے۔ تو آپ ابجد کے حساب سے جمل میں تلاش کر لیں۔ جمل کی احادیث دیکھ لیں تو آپ کو وہ حدیث مل جائے گی جس میں حضرت جابر کے اونٹ خریدنے اور رسول اللہ ﷺ سے معاملہ کرنے کا ذکر ہے۔

یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اس کی جتنی قدر کی جائے کم ہے۔ جب کوئی شخص علم حدیث پر کام کر رہا ہو اور احادیث کے حوالے تلاش کر رہا ہو اور اس کتاب سے مدد لے اس وقت اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ ان چند کتابوں میں سے ہے جو حدیث کے طلبہ بہت کثرت سے استعمال کرتے ہیں اور علم حدیث کا کوئی استاد، کوئی محقق اور کوئی مصنف اس کتاب سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ یہ مستشرقین کا ایک قابل قدر کارنامہ ہے اور ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہئے۔ انہوں نے اچھی کاوش کی ہے ہم اس کی قدر کرتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ مستشرقین کا ایک اور کام جو دور جدید میں ہمارے سامنے آیا ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں نے بھی اس طریق کار کو اختیار کیا، وہ کتابوں کی ایڈٹنگ کا ایک نیا اسلوب ہے۔ ہمارے قدیم زمانے میں اسلامی دور میں جو کتابیں لکھی جاتی تھیں یا چھپتی تھیں۔ ان میں نہ کوئی پیراگراف ہوتا تھا، نہ گنتی ہوتی تھی، نہ انڈکس ہوتی تھی، نہ فہرست ہوتی تھی اور کتاب شروع سے لے کر آخر تک ایک ہی پیرے میں ہوتی تھی۔ میرے پاس ایک کتاب ہے جو بارہ پندرہ جلدوں میں ہے اور پوری کتاب ایک ہی پیرے پر مشتمل ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ نیا مضمون کہاں سے شروع ہوا ہے اور اس میں کیا بیان ہوا ہے۔ جس زمانے میں اہل علم اپنے حافظہ اور یادداشت میں بہت اونچے مقام پر فائز تھے ان کو شاید یہ یاد ہوتا ہوگا کہ کس کتاب میں کون سی بات کہاں لکھی ہوئی ہے۔

لیکن اب جب کہ ہمتیں کم ہوگئیں اور حوصلے پست ہوگئے تو اب یہ دشوار ہوگیا کہ اتنی بڑی کتاب میں کوئی چیز تلاش کرنی ہو تو کس طرح تلاش کی جائے۔ اس میں مستشرقین کے اسلوب سے بڑی مدد ملی۔ انہوں نے کتابوں کو ایڈیٹ کرنے کا اور شائع کرنے کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا جس پر اب دنیائے اسلام میں بھی عمل ہو رہا ہے۔ اب نئی نئی کتابیں تحقیق ہو کر سامنے آرہی ہیں جن میں کتاب کو پیراگراف کے انداز میں تقسیم کیا گیا۔ اس کے مندرجات کو انڈکس کیا گیا، ان کے اشاریئے مرتب کیے گئے، فہرستیں تیار کی گئیں، اس کتاب کے پرانے نسخوں سے اس کا موازنہ

کیا گیا اور صحیح ترین نسخہ کے تعین کا اہتمام کیا گیا۔ یہ اہتمام کسی حد تک پہلے بھی ہوا کرتا تھا لیکن اب زیادہ سائنسی اور علمی انداز میں ہونے لگا ہے۔

اسی طرح سے اگر کتاب میں کسی سابقہ کتاب کا حوالہ ہے تو اس کتاب سے تلاش کر کے اس حوالہ کی نشاندہی کی جائے تا کہ آسانی ہو جائے اور اصل کتاب سے موازنہ کر کے رجوع کیا جا سکے۔ یہ طریقہ مغرب میں رائج ہوا اور دنیائے اسلام نے اس کو اپنایا۔ بلاشبہ یہ ایک اچھا طریقہ ہے۔ اس کے مطابق حدیث کی بہت سی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن سے استفادہ کرنا بہت آسان ہو گیا ہے۔

تاریخ حدیث پر ہونے والا کام

بیسویں صدی میں تاریخ حدیث پر بھی ایک بڑا اہم کام ہوا جس کا ذکر میں اختصار کے ساتھ پہلے کر چکا ہوں۔ یہ کام جن صاحب علم بزرگ نے شروع کیا وہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی تھے جو حیدر آباد دکن میں جامعہ عثمانیہ میں اسلامیات کے استاد اور بڑے عالم اور مشہور مفکر تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے تاریخ تدوین حدیث کے نام سے ایک کتاب مرتب کی۔ تاریخ تدوین حدیث مرتب کرتے ہوئے انہوں نے مستشرقین کے ان اعتراضات کو سامنے رکھا جن میں یہ کہا گیا تھا کہ علم حدیث سارے کا سارا محض زبانی اور سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہے۔ اس کے پیچھے کوئی مضبوط، ٹھوس اور علمی روایت نہیں ہے۔ اس لئے جو ذخائر حدیث کے نام سے آج پیش کئے جاتے ہیں وہ سارے کے سارے مشکوک ہیں۔ یہ بات مستشرقین بیسویں صدی کے شروع میں کہا کرتے تھے۔ مولانا مناظر حسن گیلانی نے تدوین حدیث پر ایک بڑی ضخیم کتاب مرتب کی جو غالباً آٹھ نو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں انہوں نے اس اعتراض کو سامنے رکھ کر تدوین حدیث کی تاریخ کو ایسے نئے انداز سے مرتب کیا کہ یہ اعتراض خود بخود ختم ہو جاتا ہے اور وہ سارے شواہد سامنے آ جاتے ہیں جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مستشرقین کا یہ اعتراض کتنا کمزور ہے، کتنا بے بنیاد ہے اور کتنا غیر علمی ہے۔

مولانا مناظر حسن گیلانیؒ کے اس کام کو ان کے شاگردوں نے آگے بڑھایا۔ ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم ان کے براہ راست شاگرد تھے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے صحیفہ ہمام بن منبہ کو ایڈٹ کیا۔ یہ

حضرت ابو ہریرہؓ کا ڈکٹیٹ کرایا ہوا اوران کے تلمیذ خاص جناب ہمام بن منبہ کا مرتب کیا ہوا ذخیرہ تھا جس کے قلمی نسخے جرمنی اور کئی دوسرے ممالک کے کتب خانوں میں موجود تھے۔ وہاں سے انہوں نے یہ قلمی نسخہ حاصل کر کے اس کو ایڈٹ کیا اور اس پر ایک بڑا بھرپور مقدمہ لکھا۔ انہوں نے اس مقدمہ میں یہ بات ثابت کی کہ یہ مجموعہ جو حضرت ابو ہریرہؓ کی نگرانی میں تیار ہوا تھا اس کو حضرت ابو ہریرہؓ نے تحریری اور زبانی دونوں یادداشتوں کے ذریعے اپنے شاگردوں تک منتقل کیا۔ انؓ کے شاگردوں نے بھی دونوں طرح سے اس میں مندرج احادیث کو اپنے شاگردوں تک منتقل کیا۔ یہاں تک کہ یہ مجموعہ مرتبین کتب حدیث تک پہنچا۔ اس مثال سے یا گویا **Case Study** سے مستشرقین کا وہ اعتراض غلط ثابت ہو گیا جس کی بنیاد پر وہ حدیث پر اعتراض کیا کرتے تھے۔

اس طرز استدلال کو اور لوگوں نے بھی آگے بڑھایا۔ ڈاکٹر فواد سیزگین بھی ان اہل علم میں سے جنہوں نے دفاع حدیث میں قابل قدر کام کیا ہے۔ انہوں نے اسلامی علوم کی تاریخ پر ایک انتہائی بھرپور اور تاریخ ساز کام کیا ہے جو آئندہ کئی سو سال تک لوگوں کے لئے مشعل ہدایت اور رہنمائی کا ذریعہ بنے گا۔ ان کی یہ کتاب جرمن زبان میں ہے۔ اس میں ایک پوری جلد علم حدیث کی تاریخ اور مخطوطات کی فہرست پر مشتمل ہے۔ ان کا اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ صحیح بخاری کے مآخذ پر تھا۔ اس میں انہوں نے صحیح بخاری کے تمام مآخذ کا جائزہ لیا، اور ایک ایک ماخذ کا جائزہ لے کر اور تجزیہ کر کے بتایا کہ صحیح بخاری میں جو مواد ہے یہ آج کی دنیا کے نزدیک تاریخ کے جو مستند ترین تاریخی مآخذ ہو سکتے ہیں، ان کے ذریعے منتقل ہوا ہے۔ اس میں ایک لفظ اور ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جو علمی اعتبار سے ثابت نہ کی جاسکتی ہو۔ ڈاکٹر فواد سیزگین کا یہ کارنامہ غیر معمولی ہے۔ اب کوئی مستشرق یہ اعتراض نہیں کرتا کہ صحیح بخاری یا صحیح مسلم یا حدیث کی کسی اور کتاب کا مواد غیر مستند ہے۔ انہوں نے دلائل سے یہ بات بالکل روز روشن کی طرح واضح کر دی ہے۔

یہی بات ڈاکٹر مصطفٰی اعظمی، ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی اور ان جیسے کئی دوسرے حضرات نے واضح فرمائی ہے۔ یہ سارے کا سارا کام بیسویں صدی میں ہوا ہے۔ بیسویں صدی ہجری نے گویا ایک نیا اسلوب تاریخ حدیث کے مطالعہ کا دیا جس کے نتیجہ میں وہ رجحان ساز کام ہوا جس کی نمائندہ ترین شخصیات یہ پانچ چھ حضرات ہیں، جن کے میں نے نام لئے۔

مخطوطات

قدیم مخطوطات کی جتنی اشاعت بیسویں صدی میں ہوئی اتنی ماضی کے شاید پورے دور میں نہ ہوئی ہو۔ بعض کتابیں ایسی تھیں کہ علم حدیث میں ان کا بڑا مقام تھا۔ لیکن وہ کسی وجہ سے عوامی سطح پر مقبول نہیں ہوسکیں۔ ان کے مخطوطات بھی بہت کم دستیاب ہوتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ جونسبۃً زیادہ بہتر کتابیں تھیں، زیادہ جامع اور زیادہ مکمل کتابیں تھیں اور ترتیب کے اعتبار سے زیادہ اچھی کتابیں تھیں، انہوں نے بقیہ کتابوں سے لوگوں کو مستغنی کردیا۔ عام طلبہ کو ان کتابوں کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ چونکہ طباعت کا زمانہ نہیں تھا اس لئے وہ کتابیں زیادہ رائج نہیں ہوسکیں اور قدیم مخطوطات ہی کی صورت میں رہیں یا چند اہل علم تک محدود رہیں۔ عام طور پر اہل علم ان کتابوں سے واقف نہیں ہوتے تھے۔

مثلاً مصنف عبدالرزاق کا میں نے ذکر کیا۔ مصنف عبدالرزاق ایک بڑی جامع کتاب ہے۔ اتنی جامع کہ حدیث کے چند جامع ترین مجموعوں میں سے ایک ہے۔ صحابہ اور تابعین کے اقوال اور فتاویٰ کا بہت بڑا ماخذ ہے۔ لیکن اس کے مخطوطے بڑے محدود تھے، کہیں کہیں پائے جاتے تھے اور عام طور پر ملتے نہیں تھے۔ مصنف عبدالرزاق کوئی درسی کتاب نہیں تھی کہ ہر جگہ آسانی سے اس کے نسخے مل جائیں۔ علماء حدیث کو عام طور پر اس کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، اس لئے کہ طلبا کو پڑھانے کے لئے صحاح ستہ اور ان کی شرحیں کافی تھیں۔ اب بیسویں صدی اور اس کے وسط میں ایک بڑے مشہور بزرگ جن کا تعلق ہندوستان سے تھا، حیدرآباد دکن میں رہے، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، انہوں نے حدیث کی درجنوں کتابیں ایڈٹ کیں اور عرب دنیا میں چھپوائیں جو آج عام ہیں۔ ہندوستان میں گجرات کے صوبہ کے ایک بزرگ مولانا احمد میاں سملکی تھے۔ سملک بھارت کے صوبہ گجرات کا کوئی شہر تھا جہاں کے وہ رہنے والے تھے۔ وہ بڑے صاحب علم آدمی تھے اور اللہ تعالیٰ نے دولت بھی بہت دی تھی۔ جنوبی افریقہ میں ان کے خاندان کا ایک حصہ آباد ہے، کچھ گجرات میں اور کچھ کراچی میں آباد ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی دولت دی ہے اور میں نے خود ان کی دولت مندی کے بہت سے نمونے دیکھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو توفیق دی کہ وہ ایک بہت بڑا ادارہ قائم کریں جس سے یہ ساری کتابیں شائع

ہوئیں۔مُصَنَّف عبدالرزاق انہوں نے اپنے خرچہ سے شائع کی اور پوری دنیا میں مفت تقسیم کرادی۔آج مصنف عبدالرزاق کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور یہ کتاب دنیا کے ہر کتب خانہ میں موجود ہے۔

اسی طرح سے امام حمیدی جو امام بخاری کے استاد تھے، ان کی ایک کتاب تھی جو مسندالحمیدی کے نام سے بڑی مشہور تھی۔ وہ عام طور پر نہیں ملتی تھی۔کہیں کہیں اس کے مخطوطے اور نسخے موجود تھے۔مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے اس کو بھی ایڈٹ کیا اور انہی بزرگ نے اپنے خرچ پر اس کو بھی شائع کرادیا۔آج وہ دنیا کی ہر لائبریری میں موجود ہے۔

امام ابوبکر بزّار جو ایک بڑے مشہور محدث تھے۔ان کی کتاب 'مسند بزار' ہے۔ان کے زوائد پر ایک پرانی کتاب چلی آرہی تھی جس کا نام تھا 'کشف الاستار عن زوائد البزار'۔وہ بھی مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے ایڈٹ کر کے شائع کروادی۔اس طرح حدیث اور علوم حدیث کی درجنوں پرانی اور بیش قیمت کتابیں ہیں جس پر اتنی بڑی تعداد میں اہل علم نے کام کیا ہے کہ اگر میں ان کے صرف نام ہی لینے لگوں تو گفتگو بہت لمبی ہو جائے گی۔اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر دے۔

بیسویں صدی اس اعتبار سے علم حدیث کی تاریخ میں نمایاں ہے کہ وہ مواد جو ابتدائی دو تین صدیوں میں جمع ہوا تھا۔تیسری چوتھی صدی ہجری تک آ گیا تھا، وہ بعد کے سالوں میں یعنی پانچویں چھٹی صدی سے لے کر تیرھویں صدی تک لوگوں کے لئے اکثر و بیشتر دستیاب نہیں رہا اور عام لوگوں کو ملتا نہیں تھا۔بعض بعض کتب خانوں میں موجود تھا اور اہل علم جا کر استفادہ بھی کیا کرتے تھے لیکن بیسویں صدی میں یہ سب کتابیں چھپ کر عام ہو گئیں اور لوگوں تک پہنچ گئیں۔

شام کے ایک بزرگ 'ڈاکٹر نورالدین عتر' ہیں۔انہوں نے علم حدیث پر بڑا قابل قدر کام کیا ہے اور کئی پرانی کتابیں ایڈٹ کر کے شائع کردی ہیں۔خطیب بغدادی کی کتابیں بیسویں صدی میں شائع ہوئیں۔اسی طرح سے ہمارے سابقہ مشرقی پاکستان مرحوم (بنگلہ دیش) کے ایک بزرگ ڈاکٹر معظم حسین تھے، جو وہاں شعبہ عربی کے صدر تھے۔انہوں نے امام حاکم کی معرفت علوم الحدیث ایڈٹ کر کے شائع کرائی تھی اور قاہرہ سے شائع ہوئی تھی۔وہ اب دنیا میں ہر جگہ عام ہے۔

علم حدیث پر نئے علوم کی روشنی میں کام

بیسویں صدی میں بعض نئے موضوعات پر لوگوں نے کام کیا اور علم حدیث کا ایک نئے انداز سے مطالعہ کیا۔ اس میں سے ایک مثال بہت دلچسپ ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ علم حدیث پر اس نئے انداز سے بھی کام شروع ہوا ہے۔ آپ نے مشہور فرانسیسی مصنف ڈاکٹر مورس بکائی کا نام سنا ہوگا۔ وہ ایک زمانہ میں غالباً پورے فرانس کی میڈیکل ایسوسی ایشن کے صدر تھے۔ سائنسدان ہیں اور بہت بڑے ہارٹ سپیشلسٹ ہیں۔ وہ شاہ فیصل مرحوم کے ذاتی معالج تھے اور شاہ فیصل مرحوم کا علاج کرنے کے لئے ان کو وقتاً فوقتاً ریاض بلایا جاتا تھا۔

ایک مرتبہ ان کو ریاض بلایا گیا تو یہ سرکاری مہمان کے طور پر ہوٹل میں ٹھہرے اور کئی روز تک شاہ فیصل سے ملاقات کا انتظار کرتے رہے۔ ظاہر ہے کسی بھی وقت بادشاہ کی طرف سے ملاقات کا بلاوا آسکتا تھا اس لئے کہیں آجا بھی نہیں سکتے تھے۔ ہر وقت اپنے کمرے میں رہتے تھے کہ اچانک کوئی فون کال آئے گی تو چلے جائیں گے۔ وہاں ہوٹل کے کمرے میں قرآن پاک کا ایک نسخہ انگریزی ترجمہ کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے وقت گزاری کے لئے اس کی ورق گردانی شروع کردی۔ عیسائی تھے اس لئے ظاہر ہے کبھی قرآن پاک پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس انگریزی ترجمہ کی ورق گردانی کے دوران خیال ہوا کہ قرآن پاک میں بعض ایسے بیانات پائے جاتے ہیں جو سائنسی نوعیت کے ہیں۔ مثلاً بارش کیسے برستی ہے، انسان کی ولادت کن مراحل سے گزر کر ہوتی ہے۔ اس طرح اور بھی کئی چیزوں کی تفصیلات کا تذکرہ تھا۔

چونکہ وہ خود میڈیکل سائنس کے ماہر تھے اور سائنس ہی ان کا مضمون تھا اس لئے انہوں نے ان بیانات کو زیادہ دلچسپی کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ ایک بار پڑھنے کے بعد قرآن پاک کو انہوں نے دوبارہ پڑھا تو ان مقامات پر نشان لگاتے گئے جہاں سائنس سے متعلق کوئی بیان تھا۔ چند دن وہاں رہے تو پورے قرآن پاک کا ترجمہ کئی بار پڑھا اور اس طرح کے بیانات نوٹ کرتے گئے۔ اس سے ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر اسی طرح کے بیانات بائبل میں بھی ہوں اور ان کے ساتھ قرآن پاک کے بیانات کا تقابل کیا جائے تو دلچسپ چیز سامنے آسکتی ہے

انہوں نے واپس جانے کے بعد اس مشغلہ کو جاری رکھا اور بائبل میں جو اس طرح کے

بیانات تھی ان کی نشاندہی کی اور پھر ان دونوں بیانات کا تقابلی مطالعہ کیا اور اس میں انہوں نے خالص سائنسی معیار سے کام لیا۔ ظاہر ہے کہ وہ مسلمان نہیں تھے اور قرآن کے ساتھ کوئی عقیدت مندی نہیں تھی۔ انہوں نے خالص **Objectively** اور خالص سائنسی تحقیق کے پیمانے سے قرآن پاک اور بائبل کے بیانات کو دیکھا۔ اور اس نتیجے پر پہنچے کہ قرآن پاک میں سائنسی نوعیت کے جتنے بیانات ہیں وہ سب کے سب درست ہیں اور بائبل میں سائنسی نوعیت کے جتنے بیانات ہیں وہ سب کے سب غلط ہیں۔ انہوں نے ان نتائج پر مشتمل ایک کتاب شائع کی **The Bible, Quran and Science** جس کا اردو اور انگریزی سمیت بہت سی زبانوں میں ترجمہ ملتا ہے۔

اس کتاب کے بعد اسلامیات میں ان کی دلچسپی مزید بڑھ گئی اور انہوں نے تھوڑی سی عربی بھی سیکھ لی۔ ڈاکٹر حمید اللہ سے ان کے مراسم اور روابط بڑھ گئے۔ دونوں پیرس میں رہتے تھے۔ بعد میں ان کو خیال ہوا کہ اسی طرح کا مطالعہ صحیح بخاری کا بھی کرنا چاہئے۔ انہوں نے صحیح بخاری کا مطالعہ بھی شروع کر دیا۔ صحیح بخاری میں سائنسی نوعیت کے جتنے بیانات تھے ان کی الگ سے فہرست بنائی۔ انہوں نے اس طرح کے غالباً سو بیانات منتخب کئے۔ ان سو بیانات کا ایک ایک کر کے جائزہ لینا شروع کیا۔ اور یہ دیکھا کہ کس بیان کے نتائج سائنسی تحقیق میں کیا نکلتے ہیں۔ یہ سب بیانات جمع کرنے اور ان پر غور کرنے کے بعد انہوں نے ایک مقالہ لکھا جو ڈاکٹر حمید اللہ صاحبؒ کو دکھایا۔ یہ واقعہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے مجھے خود سنایا۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا کہنا تھا کہ جب میں نے اس مقالہ کو پڑھا تو اس میں لکھا ہوا تھا کہ صحیح بخاری کے جو سو بیانات میں نے منتخب کئے ہیں ان میں سے اٹھانوے بیانات تو سائنسی تحقیق میں صحیح ثابت ہوتے ہیں۔ البتہ دو بیانات غلط ہیں۔ ڈاکٹر موریس بکائی نے جن دو بیانات کو غلط قرار دیا تھا، ان میں سے ایک تو صحیح بخاری میں درج حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے جس میں آپؐ نے فرمایا کہ جب کھانے میں کوئی مکھی گر جائے تو اس کو اندر پورا ڈبو کر پھر نکالو۔ اس لئے کہ مکھی کے ایک پر میں بیماری اور دوسرے میں شفا ہوتی ہے۔ تم دونوں پروں کو اس میں ڈبو دو تا کہ شفا والا حصہ بھی کھانے میں ڈوب جائے۔ جب وہ گرتی ہے تو بیماری والا حصہ کھانے میں پہلے ڈالتی ہے۔ ڈاکٹر بکائی کا خیال تھا کہ یہ غلط ہے۔ مکھی کے کسی پر میں شفا نہیں ہوتی، مکھی تو

گندی چیز ہے۔ اگر کھانے میں مکھی گر جائے تو کھانے کو ضائع کر دینا چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ بات سائنسی طور پر غلط ہے۔

دوسری بات جو انہوں نے غلط قرار دی وہ بھی صحیح بخاری ہی کی روایت ہے۔ عرب میں ایک قبیلہ تھا عرینیین کا، بنی عرینہ کہلاتے تھے۔ یہ لوگ مشہور ڈاکو تھے اور پورے عرب میں ڈاکے ڈالا کرتے تھے۔ اس قبیلہ کے کچھ لوگ مدینہ آئے اور اسلام قبول کیا یا اسلام قبول کرنے کا دعویٰ کیا اور رسول اللہ ﷺ سے کچھ مراعات اور مدد مانگی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو مدینہ میں ٹھہرنے کے لئے ٹھکانہ دیا اور کچھ صحابہ کو ان کی مہمان داری کے لئے مقرر کیا۔ مدینہ منورہ کی آب و ہوا ان کو موافق نہیں آئی اور وہ بیمار ہو گئے۔ بیماری کی تفصیل یہ بتائی کہ ان کے رنگ زرد ہو گئے، پیٹ پھول گئے اور ایک خاص انداز کا بخار جس کو آج کل **yellow fever** کہتے ہیں، ان کو ہو گیا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے یہ بیماری دیکھی تو آپؐ نے ان سے فرمایا کہ تم مدینہ کے باہر فلاں جگہ چلے جاؤ۔ مدینہ منورہ سے کچھ فاصلہ پر ایک جگہ تھی جہاں بیت المال کے سرکاری اونٹ رکھے جاتے تھے۔ وہاں جا کر رہو۔ اونٹ کا دودھ بھی پیو اور پیشاب بھی پیو۔ بات عجیب سی ہے۔ لیکن بخاری میں یہی درج ہے۔ چنانچہ انہوں نے یہ علاج کیا اور چند روز وہاں رہنے کے بعد ان کو شفا ہو گئی۔ جب طبعیت ٹھیک ہو گئی تو انہوں نے اونٹوں کے باڑے میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے مامور چوکیدار کو شہید کر دیا اور بیت المال کے اونٹ لے کر فرار ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ کو پتہ چلا کہ یہ لوگ نہ صرف اونٹ لے کر فرار ہو گئے ہیں بلکہ وہاں پر متعین صحابیؓ کو بھی اتنی بے دردی سے شہید کیا ہے کہ انؓ کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے ہیں۔ گرم سلاخ ٹھونس کر آنکھیں پھوڑ دیں اور صحابیؓ کو ریگستان کی گرم دھوپ میں زندہ تڑپتا ہوا چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور وہ بچارے وہیں تڑپ تڑپ کر شہید ہو گئے ہیں۔ تو حضورؐ کو یہ سب کچھ سن کر بہت دکھ ہوا اور صحابہ کرامؓ کو بھی اس پر بہت زیادہ غصہ آیا۔ حضورؐ نے صحابہ کو ان کا پیچھا کرنے کے لئے بھیجا اور وہ لوگ گرفتار کر کے قصاص میں قتل کر دیئے گئے۔

اس پر مورس بکائی نے ڈاکٹر حمید اللہ سے کہا کہ یہ بھی درست نہیں ہے۔ سائنسی اعتبار سے یہ غلط ہے۔ کیونکہ پیشاب تو جسم کا **refuse** ہے۔ انسانی جسم خوراک کا جو حصہ قبول نہیں کر سکتا اسے جسم سے خارج کر دیتا ہے۔ ہر مشروب کا وہ حصہ جو انسانی جسم کے لئے ناقابل قبول

ہے تو وہ جسم سے خارج ہو جاتا ہے اور وہ انسانی جسم کے لئے قابل قبول نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس سے علاج کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے اس کے جواب میں ڈاکٹر مورس بکائی سے کہا کہ میں نہ تو سائنسدان ہوں نہ میڈیکل ڈاکٹر ہوں، اس لئے میں آپ کے ان دلائل کے بارے میں سائنسی اعتبار سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ایک عام آدمی کے طور پر میرے کچھ شبہات ہیں جن کا آپ جواب دیں تو پھر اس تحقیق کو اپنے اعتراضات کے ساتھ ضرور شائع کر دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں نے میٹرک میں سائنس کی ایک دو کتابیں پڑھی تھیں۔ اس وقت مجھے کسی نے بتایا تھا کہ سائنسدان جب تجربات کرتے ہیں تو اگر ایک تجربہ دو مرتبہ صحیح ثابت ہو جائے تو سائنسدان اس کو پچاس فیصد درجہ دیتا ہے اور جب تین چار مرتبہ صحیح ثابت ہو جائے تو اس کا درجہ اور بھی بڑھ جاتا ہے اور چار پانچ مرتبہ کے تجربات میں بھی اگر کوئی چیز صحیح ثابت ہو جائے تو آپ کہتے ہیں کہ فلاں بات سو فیصد صحیح ثابت ہو گئی۔ حالانکہ آپ نے سو مرتبہ تجربہ نہیں کیا ہوتا۔ ایک تجربہ تین چار مرتبہ کرنے کے بعد آپ اس کو درست مان لیتے ہیں۔ ڈاکٹر مورس نے کہا کہ ہاں واقعی ایسا ہی ہے۔ اگر چار پانچ تجربات کا ایک ہی نتیجہ نکل آئے تو ہم کہتے ہیں کہ سو فیصد یہی نتیجہ ہے۔ اس پر ڈاکٹر حمید اللہ نے کہا کہ جب آپ نے صحیح بخاری کے سو بیانات میں سے اٹھانوے تجربہ کر کے درست قرار دے دیئے ہیں تو پھر ان دو نتائج کو بغیر تجربات کے درست کیوں نہیں مان لیتے؟ جب کہ پانچ تجربات کر کے آپ سو فیصد مان لیتے ہیں۔ یہ بات تو خود آپ کے معیار کے مطابق غلط ہے۔ ڈاکٹر مورس بکائی نے اس کو تسلیم کیا کہ واقعی ان کا یہ نتیجہ اور یہ اعتراض غلط ہے۔

دوسری بات ڈاکٹر حمید اللہ نے یہ کہی کہ میرے علم کے مطابق آپ میڈیکل سائنس کے ماہر ہیں۔ انسانوں کا علاج کرتے ہیں۔ آپ جانوروں کے ماہر تو نہیں ہیں، تو آپ کو پتہ نہیں کہ دنیا میں کتنے قسم کے جانور پائے جاتے ہیں۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں نہیں جانتا کہ علم حیوانات میں کیا کیا شعبے اور کون کون سی ذیلی شاخیں ہیں اور ان میں کیا کیا چیزیں پڑھائی جاتی ہیں لیکن اگر علم حیوانات میں 'مکھیات' کا کوئی شعبہ ہے تو آپ اس شعبہ کے ماہر نہیں ہیں۔ کیا آپ کو پتہ ہے کہ دنیا میں کتنی اقسام کی مکھیاں ہوتی ہیں۔ کیا آپ نے کوئی سروے کیا ہے کہ دنیا میں کس موسم میں کس قسم کی مکھیاں پائی جاتی ہیں۔ جب تک آپ عرب میں ہر موسم میں پائی جانے والی

مکھیوں کا تجربہ کرکے اوران کے ایک ایک جز کا معائنہ کرکے، لیبارٹری میں چالیس پچاس سال لگا کر نہ بتائیں کہ ان میں کسی مکھی کے پَر میں کسی بھی قسم کی شفانہیں ہے اس وقت تک آپ یہ مفروضہ کیسے قائم کرسکتے ہیں کہ مکھی کے پر میں بیماری یا شفانہیں ہوتی۔ ڈاکٹر مورس بکائی نے اس سے بھی اتفاق کیا کہ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اگر آپ تحقیق کرکے یہ ثابت بھی کردیں کہ مکھی کے پر میں شفانہیں ہوتی تو یہ کیسے پتہ چلے گا کہ چودہ سوسال پہلے ایسی مکھیاں نہیں ہوتی تھیں۔ ہوسکتا ہے ہوتی ہوں، ممکن ہے ان کی نسل ختم ہوگئی ہو۔ جانوروں کی نسلیں تو آتی ہیں اور ختم بھی ہوجاتی ہیں۔ روز کا تجربہ ہے کہ جانوروں کی ایک نسل آئی اور بعد میں وہ ختم ہوگئی۔ تاریخ میں ذکر ملتا ہے اور خود سائنسدان بتاتے ہیں کہ فلاں جانور اِس شکل کا اور فلاں اُس شکل کا ہوتا تھا۔ ڈاکٹر مورس نے اس کو بھی درست تسلیم کیا۔

پھر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے کہا کہ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ حضورؐ نے اونٹ کا پیشاب پینے کا حکم دیا، حالانکہ شریعت نے پیشاب کو ناپاک کہا ہے۔ بالکل صحیح ہے۔ یہ حیوانی بدن کا مسترد کردہ مواد ہے۔ یہ بھی درست ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں بطور ایک عام آدمی (layman) کے یہ سمجھتا ہوں کہ بعض بیماریوں کا علاج تیزاب سے بھی ہوتا ہے۔ دواؤں میں کیا ایسیڈ شامل نہیں ہوتے۔ جانوروں کے پیشاب میں کیا ایسیڈ شامل نہیں ہوتا۔ ہوسکتا ہے کہ بعض علاج جو آج خالص اور آپ کے بقول پاک ایسیڈ سے ہوتا ہے تو اگر عرب میں اس کا رواج ہو کہ کسی نیچرل طریقے سے لیا ہوا کوئی ایسا لیکویڈ جس میں تیزاب کی ایک خاص مقدار پائی جاتی ہو، وہ بطور علاج کے استعمال ہوتا ہو تو اس میں کونسی بات بعید از امکان اور غیر سائنسی ہے۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آج سے کچھ سال پہلے میں نے ایک کتاب پڑھی تھی۔ ایک انگریز سیاح تھا جو پورے جزیرہ عرب کی سیاحت کرکے گیا تھا۔ اس کا نام تھا ڈاوٹی۔ 1924 -25 -26 میں اس نے پورے عرب کا دورہ کیا تھا اور دو کتابیں لکھی تھیں جو بہت زبردست کتابیں ہیں اور جزیرہ عرب کے جغرافیہ پر بڑی بہترین کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ ایک کا نام **Arabia Deserta** اور دوسرے کا نام **Arabia Petra** ہے۔ یعنی جزیرہ عرب کا صحرائی حصہ اور جزیرہ عرب کا پہاڑی حصہ۔ انہوں نے کہا کہ اس شخص نے اتنی کثرت سے یہاں سفر کیا

ہے۔ یہ اپنی ایک یادداشت میں لکھتا ہے کہ جزیرہ عرب کے سفر کے دوران ایک موقع پر میں بیمار پڑ گیا۔ پیٹ پھول گیا، رنگ زرد پڑ گیا اور مجھے زرد بخار کی طرح کی ایک بیماری ہوگئی جس کا میں نے دنیا میں جگہ جگہ علاج کروایا لیکن کچھ افاقہ نہیں ہوا۔ آخر کار جرمنی میں کسی بڑے ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ جہاں تمہیں یہ بیماری لگی ہے وہاں جاؤ۔ ممکن ہے کہ وہاں کوئی مقامی طریقہ علاج ہو یا کوئی عوامی انداز کا کوئی دیسی علاج ہو۔ کہتے ہیں کہ جب میں واپس آیا تو جس بدو کو میں نے خادم کے طور پر رکھا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا تو پوچھا کہ یہ بیماری آپ کو کب سے ہے۔ میں نے بتایا کہ کئی مہینے ہوگئے اور میں بہت پریشان ہوں۔ اس نے کہا کہ ابھی میرے ساتھ چلئے۔ مجھے اپنے ساتھ لے کر گیا اور ایک ریگستان میں اونٹوں کے باڑے میں لے جا کر کہا کہ آپ کچھ دن یہاں رہیں اور یہاں اونٹ کے دودھ اور پیشاب کے علاوہ کچھ نہ پئیں۔ چنانچہ ایک ہفتہ تک یہ علاج کرنے کے بعد میں بالکل ٹھیک ہوگیا۔ مجھے بہت حیرت ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے ڈاکٹر مورس سے کہا یہ دیکھئے کہ 26 - 1925 میں ایک مغربی مصنف کا لکھا ہوا ہے۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ یہ سابق طریقہ علاج ہو۔ مورس بکائی نے اپنے دونوں اعتراضات واپس لے لئے اور اس مقالہ کو انہوں نے اپنے دونوں اعتراضات کے بغیر ہی شائع کر دیا۔

یہ واقعہ میں نے اتنی تفصیل سے اس لئے بیان کیا کہ علم حدیث میں ایک نیا پہلو ایسا ہے جو اس کے سائنسی مطالعہ سے عبارت ہے۔ حدیث کی کتابیں سائنسی کتابیں نہیں ہیں۔ حدیث رسولؐ کی کتابوں کو سائنس یا طب کی کتاب قرار دینا ان کا درجہ گھٹانے کے برابر ہے۔ حدیث پاک کا درجہ ان تجرباتی انسانی علوم سے بہت اونچا ہے۔ حدیث میں جو بیانات ہیں یہ سارے کے سارے زبان رسالت سے نکلے ہوئے ہیں۔ اس لئے ان کو سائنس یا طب کی قرار دینا تو بے ادبی ہے۔ البتہ ان کتابوں میں جو بیانات سائنسی اہمیت رکھتے ہیں ان کی روشنی میں سائنس کا مطالعہ مفید ہوگا۔ سائنسدان اگر اس پر تحقیق کریں گے تو سائنس کے نئے گوشے ان کے سامنے آئیں گے۔ یا کم از کم ان کے ایمان اور عقیدہ میں پختگی آسکتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آج سے چودہ سو سال پہلے جو بات فرمائی تھی وہ آج بھی سائنس کے میزان پر پوری اترتی ہے۔ اگر سائنس کے طلبہ اس نقطہ نظر سے علم حدیث کا مطالعہ کریں گے تو بہت سی نئی چیزیں ان کے سامنے آئیں گی۔

احادیث میں سابقہ کتب کا ذکر

علم حدیث کا کچھ اور لوگوں نے نئے انداز سے مطالعہ شروع کیا ہے جس پر ابھی کام کا آغاز بھی صحیح معنوں میں نہیں ہوا۔ وہ یہ کہ بہت سی احادیث میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ سابقہ کتابوں کے حوالے ہیں کہ توراۃ میں یہ آیا ہے، انجیل میں یہ آیا ہے، فلاں کتاب میں یہ آیا ہے، سابقہ کتابوں میں یہ آیا ہے۔ آج ان کتابوں میں وہ حوالہ نہیں ملتا۔ اس سے مطالعہ مذاہب کا اور مذاہب کی تاریخ پر کام کرنے کا ایک نیا راستہ کھلتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے وحی کی بنیاد پر سابقہ کتابوں کے مندرجات پر جو باتیں ارشاد فرمائیں وہ کس حد تک آج کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں اور نہیں پائی جاتیں تو اس کے اسباب کیا ہیں۔ اس سے پتہ چل جاتا ہے کہ ان کتابوں میں انحراف یا تبدیلی ہوئی تو کہاں کہاں ہوئی اور کن راستوں سے ہوئی۔ اس سے سابقہ کتابوں کے مطالعہ کی ایک نئی جہت ہمارے سامنے آتی ہے۔

اسی طرح سے مطالعہ مذاہب میں حدیث کے ذریعے وہ گوشے بھی سامنے آتے ہیں جن میں مذاہب کی وہ تعلیمات جو اللہ تعالیٰ اور انبیاؑ کی طرف سے تھیں، مذاہب کے ماننے والوں کی تحریفات اور ملاوٹوں سے پہلے جو تعلیمات تھیں، ان کا واضح پتہ احادیث سے چلتا ہے۔ مثلاً توراۃ میں یہ تھا، بائبل میں یہ تھا، فلاں پیغمبر کی تعلیم میں یہ تھا، فلاں پیغمبر کی تعلیم میں یہ تھا۔ اس سے دنیا کی دوسری اقوام کے سامنے بھی مطالعہ کی ایک نئی جہت روشن ہوتی ہے۔ جس سے وہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

مسلمانوں میں جو اجتماعی علوم پیدا ہوئے۔ سوشل سائنسز پیدا ہوئے، تاریخ کا فن پیدا ہوا، ریاست اور معاشرت کے مطالعہ کا فن پیدا ہوا۔ اس میں بہت بڑی مدد علم حدیث سے آج مل سکتی ہے۔ علم حدیث ایک نئی تہذیب کا منادہ ہے۔ علم حدیث نے ایک نئی تہذیب کو جنم دیا جس کی بنیاد تعلیم، فکر اور مطالعہ پر تھی جس کے کچھ نمونے آپ نے دیکھے۔ علم حدیث نے علم تاریخ کو ایک نئی جہت سے نوازا۔ اسلام سے پہلے ہسٹوریوگرافی یا تاریخ نویسی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اسلام نے پہلی مرتبہ علم حدیث کے ذریعے انسان کو یہ پیغام دیا کہ سابقہ اقوام کے بارے میں معلومات او رتاریخ کو جمع کرنے کے لئے کتنی احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ یہ وہ چیز ہے جس کی بنیاد پر

مسلمانوں نے ایک نیا فن تاریخ مرتب کیا۔ ابن خلدون اور امام سخاوی کا میں نے ذکر کیا تھا جو ہسٹوریوگرافی میں ایک نئی جہت اور ایک نئے اسلوب کو شروع کرنے والے ہیں۔ یہ وہ نئے میدان ہیں جو علم حدیث کے مطالعہ کے راستے ہمارے سامنے کھولتے ہیں۔

بیسویں صدی میں علم حدیث کے نئے مجموعے بھی مرتب ہوئے۔ نئے مجموعے ہر دور میں مرتب ہوتے رہے ہیں۔ جیسے جیسے انسانوں کے مسائل بڑھتے جائیں گے، نئے نئے مسائل پیش آتے جائیں گے، ان کو علم حدیث کے موضوعات کو نت نئے طریقوں سے مرتب کرنے کی ضرورت پیش آتی جائے گی۔

ان میں سے کون سے مجموعے قابل ذکر ہیں ان کا حوالہ دینا بھی بڑا دشوار ہے۔ اس لئے کہ وہ لاتعداد ہیں۔ ان کی فہرست بھی بیان کرنا مشکل ہے۔ بیسویں صدی میں مختلف زبانوں میں انگریزی، اردو، فارسی، فرانسیسی، عربی، ترکی اور جرمن زبانوں میں مرتب ہوئے اور انہوں نے ہزاروں لاکھوں انسانوں تک علم حدیث کے ذخائر اور معلومات کو پہنچایا۔

نئے انداز سے کام کرنے کی راہیں

آج جو نئے اور قابل ذکر مجموعے مرتب ہو رہے ہیں اور جن پر کام کرنے کی ضرورت ہے وہ نئے مسائل کے بارے میں ہیں۔ مثال کے طور پر آج معیشت نئے انداز سے مرتب ہو رہی ہے۔ حدیث نبوی کی بنیادی کتابوں میں اور احادیث نبوی کے ذخائر میں ہزاروں ایسے ارشادات اور ہدایات موجود ہیں جن کا انسان کی انفرادی اور اجتماعی معاشی زندگی سے، یعنی **Micro Economics** اور **Macro Economics** پہلو سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ بعض حضرات نے بعض ایسے مجموعے مرتب کئے ہیں۔ محمد اکرم خان صاحب ہمارے ایک دوست ہیں۔ انہوں نے علم حدیث کے ذخائر کو تلاش کر کے وہ احادیث دو جلدوں میں یکجا کی ہیں جو معاشیات سے متعلق ہیں۔ لیکن ابھی اس پر طویل کام کی ضرورت ہے۔ نئے نئے مجموعے جو اب شائع ہوئے ہیں ان کو کنگھال کر اس مواد کو ایک ساتھ کرنے کی ضرورت ہے۔

آج سے کچھ سال پہلے ایک شخص نے یہ کام کیا تھا کہ علم حدیث کے تمام بنیادی مآخذ سے کام لے کر وہ تمام احادیث جمع کی تھیں جن کا تعلق ریاست اور حکومت سے ہے۔ تو اتنا

بڑا ذخیرہ تیار ہوا کہ جس میں سینکڑوں بلکہ شاید ہزاروں احادیث موجود ہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ ریاست اور ریاستی اداروں سے متعلق ہیں۔ بظاہر علم حدیث کی کتابیں آپ پڑھیں تو سو سو احادیث میں مشکل سے ایسی حدیث ملے گی جس کا تعلق حکومت اور ریاست سے ہو۔ لیکن ان سارے مجموعوں کا جائزہ لیا گیا تو اتنی تعداد میں احادیث دستیاب ہوئیں جن سے کئی جلدیں مرتب ہوسکتی ہیں۔ بقیہ موضوعات کا آپ خود اندازہ کرلیں۔

تہذیب وتمدن کی اساس کس بنیاد پر بنتی ہے۔ قوموں کا عروج وزوال کیسے ہوتا ہے۔ سابقہ محدثین نے اپنی کتابیں مرتب کرتے وقت اپنے سامنے یہ موضوعات نہیں رکھے۔ انہوں نے اپنے زمانہ اور اپنی ضروریات کے لحاظ سے عنوانات تجویز کئے اور موضوعات رکھے۔ لیکن سارے موضوعات کو اس طرح سے **Re-arrange** کریں تو نئے نئے علوم وفنون سامنے آئیں گے۔ اس لئے نئے انداز سے علم حدیث کے مجموعے مرتب کرنے کی ضرورت ہے جن میں آج کے دور کے تہذیبی، تمدنی، سیاسی، معاشی، اجتماعی، اخلاقی اور روحانی ضروریات کے مطابق ابواب کی ترتیب اور مضامین کی تقسیم کی جائے اور یوں مجموعے مرتب کئے جائیں۔

ابتدائی صدیوں میں جب اسلام کے عقائد پر فقہائے اسلام اور متکلمین اسلام کام کررہے تھے، تو اسلام کے عقائد پر جو اعتراضات یا حملے یونانیوں کی طرف سے ہورہے تھے یا جو شبہات ایرانی اور ہندوستانی فلاسفہ سے آگاہ لوگ بیان کررہے تھے، ان اعتراضات کا جواب علما اور متکلمین نے احادیث کی روشنی میں دیا۔ آج اسلام اور اسلام کے عقائد پر وہ اعتراضات نہیں ہورہے ہیں۔ قدیم یونانی فلسفہ ختم ہوگیا، قدیم ایرانی اور ہندوستانی تصورات دنیا سے مٹ گئے۔ آج نئے انداز سے حملے ہورہے ہیں۔ آج اسلامی عقائد اور تعلیمات پر مغربی نظریہ علم کے حوالہ سے اسلام پر اور ہی انداز کے اعتراضات ہورہے ہیں۔ آج مغربی نفسیات نبوت پر اعتراض کررہی ہے۔ آج کی سائکالوجی نبوت کو بطور ماخذ علم نہیں مانتی۔ وحی کو بطور مصدر علم نہیں مانتی۔ لہٰذا آج علم حدیث کے ذخائر کو اس انداز سے مرتب کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلام کا فلسفہ علم اور نظریہ معرفت مکمل طور پر ہمارے سامنے آجائے۔ جو اعتراضات اسلام کے عقائد پر ہورہے ہیں ان کا جواب ان احادیث کے ذریعے سامنے آجائے۔

اسی طرح سے علم حدیث میں آپ نے دیکھا ہوگا۔ حدیث کی کوئی بھی کتاب آپ

اٹھا کر دیکھ لیں اس میں سابقہ انبیاؑ اور ان کے واقعات کا ذکر ہے۔ سابقہ اقوام کا ذکر ہے۔ انبیاءؑ کے معاصر، ان کے ماننے والے اور انکار کرنے والے دونوں کے تذکرے ملتے ہیں۔ آج کل کے مستشرقین فن تاریخ کے نقطۂ نظر سے، آرکیالوجی کے نقطۂ نظر سے اور آثار قدیمہ کے نقطۂ نظر سے ان پر اعتراضات کر رہے ہیں۔ ان اعتراضات کا جواب بھی حدیث کی کتابوں میں مل جاتا ہے۔ لیکن ان احادیث میں ان جوابات کو سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے نئی ترتیب درکار ہے۔ نئے مجموعے مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ وہ چند مثالیں ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ نئے انداز سے احادیث کے نئے مجموعوں کی ضرورت پیش آتی رہے گی۔ مآخذ یہی قدیم کتابیں اور یہی ذخائر رہیں گے جو ائمہ اسلام نے 458ھ تک مرتب کر کے ہمیں دے دیئے تھے۔ پانچویں صدی ہجری تک جو مجموعے مرتب ہو گئے وہ تو بنیادی ماخذ ہیں، وہ تو ایک طرح سے **Power Houses** ہیں جہاں سے آپ کو **Connection** ملتا رہے گا۔ لیکن اس کنکشن سے آپ نئی نئی مشینیں چلائیں، نئے نئے کام کریں، نئے نئے انداز سے روشنی پیدا کریں، نئے نئے راستے روشن کریں۔ یہ کام ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ وہ پاور ہاؤس اپنی جگہ موجود رہیں گے۔

جس طرح سے متن حدیث کو نئے انداز سے مرتب کرنے کی ضرورت ہے اسی طرح علم حدیث کی نئی شرحیں لکھنے کی بھی ضرورت ہے۔ پرانی شرحیں پرانے سیاق وسباق میں ہیں۔ نئی شرحیں نئے سیاق وسباق میں ہوں گی۔ ان میں جو پرانی شرحیں ہیں ان کو نئے انداز سے پیش کرنے کا کام بھی ہوگا اور نئے مسائل کی نئی شرحیں اور نئے اعتراضات کے نئے جواب بھی ہوں گے۔ پرانے اعتراضات کے پرانے جواب بھی ہوں گے اور پرانے اعتراضات کے نئے جواب بھی ہوں گے۔ یہ ایک نئی دنیا ہے جس پر ابھی کام کا شاید آغاز بھی نہیں ہوا ہے اور اگر آغاز ہوا ہے تو محض آغاز ہی ہے۔ ابھی تو محض پہلا قدم اٹھایا گیا ہے۔ کتنے دن اور کتنے سال یہ عمل چلے گا ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔

تدوین حدیث غیر مسلموں کے لئے

پھر ایک نئی چیز جو علم حدیث میں کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے تمام سابقہ مآخذ جو

حدیث کی شرحوں اور تفاسیر سے متعلق ہیں ان میں جو خطاب ہے وہ مسلمانوں سے ہے اور ان مسلمانوں سے ہے جو دین کو جانتے اور مانتے ہیں، ان مسلمانوں سے ہے جو حدیث اور سنت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس لئے شرح لکھنے والا بہت سی چیزوں کے بارے میں یہ فرض کر کے لکھتا ہے کہ یہ پڑھنے والے مانتے ہیں۔ آج کا پڑھنے والا بہت سی چیزوں کو نہیں مانتا۔ بہت سی چیزوں کے بارے میں وہ شک رکھتا ہے۔ نبوت کے ماننے میں اس کو تامل ہے، وحی بطور ذریعہ علم کے قابل قبول ہے کہ نہیں، ابھی اس کو ماننے میں بھی آج کے انسان کو تردد ہے۔ لہٰذا جب آج کے دور میں حدیث کی کوئی شرح بیان کی جائے گی تو ان سوالات کا جواب پہلے دیا جائے گا۔ ماضی کے شارحین جزئیات کا جواب دیا کرتے تھے اس لئے کہ کلیات لوگوں کی نظر میں پہلے سے قابل قبول تھیں۔ اسلامی ادوار میں کلیات کے بارے میں سوالات نہیں ہوتے تھے، صرف جزئیات کے بارے میں سوالات سامنے آتے تھے۔ ان کا جواب قدیم کتابوں میں مل جاتا ہے۔ آج اسلام کے کلیات کو ماننے والے بھی نہیں ہیں جزئیات کو ماننے والے بھی نہیں ہیں۔ تو پہلے کلیات کا جواب دیا جائے گا اور کلیات کے بعد پھر جزئیات کا جواب دیا جائے گا۔ اس طرح سے نئے انداز کی شرحیں، نئے مخاطبین کو سامنے رکھ کر اور نئے مسائل کے لحاظ سے درکار ہوں گی۔

علم حدیث کی کمپیوٹرائزیشن

ایک نیا میدان جو علم حدیث کے باب میں سامنے آیا ہے اور جس پر بڑا کام ہوا ہے لیکن ابھی نامکمل ہے۔ وہ حدیث کی کمپیوٹرائزیشن ہے۔ حدیث کی کمپیوٹرائزیشن پر کئی جگہ کام ہو رہا ہے۔ آج سے بیس سال پہلے لندن میں ایک ادارہ قائم ہوا تھا **Islamic Computing Centre** کے نام سے بنا تھا۔ میں نے بھی اس کا دورہ کیا۔ وہاں کے ایک صاحب یہاں پاکستان بھی آئے تھے۔ اس زمانے میں صدر ضیاء الحق صاحب سے ملے۔ اس کے بعد سعودی عرب میں یہ کام شروع ہوا۔ اس دور کے ایک فاضل رجل ڈاکٹر مصطفےٰ اعظمی بھی یہ کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح سے مصر اور کئی دوسرے علاقوں میں یہ کام شروع ہوا اور بڑے پیمانے پر اس کام کے نمونے سامنے آئے ہیں، سی ڈیز سامنے آئی ہیں۔

میرے اپنے استعمال میں ایک ایسی سی ڈی ہے جس میں حدیث کی پندرہ بیس کتابوں

کوسمودیا گیا ہے۔ اس میں تمام صحاح ستہ، مسند امام احمد اور حدیث کی دوسری بڑی کتابیں موجود ہیں اور کمپیوٹر کے ذریعے چند منٹ میں آپ کے سامنے آسکتی ہیں۔ چھوٹی سی سی ڈی جیب میں رکھیں اور کہیں بھی کمپیوٹر کے ذریعے اس کو دیکھیں۔ یہ ایک مفید چیز ہے۔لیکن ابھی حدیث کے متون بھی سارے کے سارے کمپیوٹرائز نہیں ہوئے۔ حدیث کی چند کتابیں ہی کمپیوٹرائز ہوئی ہیں۔ یہ سارے بنیادی مآخذ جو بیسویں صدی میں شائع ہوئے یا اس سے پہلے شائع ہوئے لیکن زیادہ متداول نہیں تھے وہ سارے کے سارے کمپیوٹرائز ہونے باقی ہیں۔

لیکن اس سے بھی زیادہ جو مشکل کام ہے وہ رجال کی کمپیوٹرائزیشن کا کام ہے۔ چھ لاکھ افراد کے بارے میں تفصیلات، معلومات کے اس تمام ذخیرے کے ساتھ جو علمائے رجال اور جرح وتعدیل کے ائمہ نے جمع کیا ہے۔ اس کو کمپیوٹرائز کرنا انتہائی اہم، مشکل اور لمبا کام ہے۔ اس کے لئے ایک نئے سافٹ وئر کی ضرورت ہے۔ وہ سافٹ وئیر وہ آدمی بنا سکتا ہے جو خود بھی محدث ہو۔علم حدیث بھی جانتا ہو اور پروگرامنگ بھی جانتا ہو۔اگر علم حدیث نہ جانتا ہو تو شاید اس کے لئے سافٹ وئیر بنانا بہت مشکل ہوگا۔ مثال کے طور پر میں نے عرض کیا تھا کہ بعض محدثین تعدیل اور تجریح میں متشدد ہیں۔ بعض متساہل ہیں اور بعض معتدل ہیں۔تو ان تینوں کو الگ الگ نمبر دینا ہوگا۔ متساہل کا کوڈ الگ ہوگا، متشدد کا الگ اور معتدل کا الگ ہوگا۔ پھر متشددین میں لوگوں کے درجات ہیں ان کو اسی سطح پر رکھنا ہوگا۔ اس کے لئے کمپیوٹر میں سافٹ وئیر کی تیاری کی ضرورت ہے ۔ جب یہ سارا کام ہو جائے تو پھر اس کی مدد سے رجال کے سارے ذخیرے کو ایک نئے انداز سے دیکھنا پڑے گا۔ مثلاً علم حدیث میں رجال میں ایک اصطلاح 'مدار سند' استعمال ہوتی ہے۔ مدار سند اس کو کہتے ہیں کہ ایک محدث تک ایک حدیث مختلف راویوں اور مختلف سندوں سے پہنچی لیکن اوپر جا کر درمیان میں راوی ایک ہی ہے۔ پھر آگے چل کر اسی ایک راوی سے آگے بات بنتی ہے۔ اس کو مدار سند کہتے ہیں۔ مدار سند اگر کمزور ہیں تو سند کے بقیہ حصوں میں اگر اونچے سے اونچے راوی بھی موجود ہوں تو وہ irrelevant ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ مدار سند سے آگے بات کمزور ہے تو اگر نیچے کی سطح پر لوگ بہت مستند بھی ہیں تو بھی ان کا مستند ہونا کوئی خاص فائدہ نہیں رکھتا۔ مدار سند اگر مضبوط ہے تو پھر ان لوگوں کی مضبوطی بہت فائدہ دے گی۔ اس لئے مدار سند کی بہت اہمیت ہے۔ مدار سند کا پتہ غیر معمولی یادداشت اور طویل مطالعہ سے ہی چل سکتا ہے۔

میرا کافی عرصہ سے یہ خیال ہے کہ کمپیوٹرائزیشن سے مدار سند کا تعین کرنا شائد آسان ہو جائے۔ اس لئے کہ کمپیوٹر میں آپ حدیث کی ہر سند کو فیڈ کر دیں گے اور فیڈ کرنے کے بعد یہ معلوم ہو جائے گا کہ وہ نام کہاں کہاں مشترک ہے۔ کمپیوٹر سے پتہ چل جائے گا کہ مدار سند کون ہے اور کہاں کہاں وہ مدار سند ہے۔ یہ تو کمپیوٹر والے ہی بتا سکتے ہیں کہ مدار سند کے لئے کیا کچھ کرنا پڑے گا، اس کا سافٹ وئیر کیسے بنایا جاسکتا ہے۔

اسی طرح سے جرح وتعدیل کا مواد جو لاکھوں صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں سے انتخاب کرنا، اس کا درجہ متعین کرنا، پھر اس کو فیڈ کر کے اس کے نتائج کمپیوٹر سے معلوم کئے جائیں۔ پھر حدیث کا ضعف، صحت اور حسن میں جو درجہ ہے، یہ سارا کام کمپیوٹرائزیشن کے ساتھ ابھی ہونا باقی ہے اور اس میں وقت لگے گا۔ جب ایسے ماہرین سامنے آئیں گے جو حدیث کے علوم سے بھی اچھی طرح واقفیت رکھتے ہوں اور کمپیوٹر میں کم از کم سافٹ وئیر بنانے کے بھی ماہر ہوں تو وہ اس کام کو کر سکتے ہیں۔

انکار حدیث کا مقابلہ

علم حدیث پر بیسویں صدی میں جو کام ہوئے ہیں ان میں ایک بڑا موضوع فتنہ انکار حدیث کی تردید کا رہا ہے۔ انکار حدیث پر منکرین حدیث نے زور وشور سے جو کچھ لکھا ہے وہ بیسویں صدی ہی میں لکھا ہے۔ اس سے پہلے اکا دکا لوگوں کی طرف سے بہت تھوڑا سا لکھا گیا ہے جس کا زیادہ اثر نہیں تھا۔ بیسویں صدی میں لوگوں نے اتنے زور وشور سے انکار حدیث پر لکھا کہ بہت سے لوگ اس سے متاثر ہو گئے۔ اور مسلمانوں کی بھی ایک بڑی تعداد اس گمراہی سے متاثر ہو گئی۔ اس لئے علم حدیث پر لکھنے والوں کا ایک میدان یہ بھی تھا کہ منکرین حدیث اور مخالفین حدیث کے اعتراضات کو دور کیا جائے۔ لیکن حدیث کے مخالفین بھی بڑے باہمت لوگ ہیں اور بڑے حوصلے والے ہیں۔ ایک اعتراض کا جواب ملتا ہے تو دوسرا داغ دیتے ہیں، اس کا جواب ملتا ہے تو پھر تیسرا پھر چوتھا اور پانچواں۔ اس حوصلہ مندی کے ساتھ تھوڑے سے بے حیا اور ڈھیٹ بھی معلوم ہوتے ہیں۔ بہت سے ایسے اعتراضات جن کا جواب دیا جا چکا، ان کو اس خیال سے دوبارہ ناواقف لوگوں کے سامنے دہراتے رہتے ہیں کہ شاید اس شخص کو وہ جواب معلوم نہ ہو۔ اگر

آپ کو وہ جواب معلوم ہو اور آپ متاثر نہ ہوں تو وہ کسی اور کے سامنے وہی بات دوہرا دیتے ہیں۔ وہ تسلسل کے ساتھ ایک ہی بات کو بار بار دہراتے رہتے ہیں۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان جوابات کو بھی بار بار بیان کیا جائے۔ اور ان غلط فہمیوں کی بار بار تردید کی جائے۔

علم حدیث پر انیسویں صدی کے وسط میں جو بنیادی اعتراض کئے گئے تھے ان سب کی اصل بنیاد یہ غلط فہمی تھی کہ ذخیرہ احادیث تاریخی طور پر ثابت شدہ نہیں ہے اور غیر مستند ہے۔ اس غلط فہمی کی تو اچھی طرح وضاحت ہوگئی۔ اب اس اعتراض کو نہیں دوہرایا جاتا اور جو لوگ اس اعتراض کو دوہراتے ہیں وہ کم پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ کوئی ذمہ دار مستشرق یا پڑھا لکھا منکر حدیث اب حدیث کی تاریخی سندوں کو نشانہ نہیں بناتا۔ لیکن ہمارے یہاں بعض کم علم لوگ ابھی تک اسی لکیر کو پیٹ رہے ہیں۔

اب دوسرے اعتراضات جو بعض لوگ آج کل علم حدیث پر کرتے ہیں، وہ حدیث کے مندرجات پر ہو رہے ہیں۔ کچھ لوگ نیک نیتی سے کرتے ہیں جس کی دو مثالیں میں نے مورس بکائی کی دیں۔ کچھ لوگ کم فہمی سے اور کچھ ویسے ہی کرتے ہیں۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان سب اعتراضات کا علمی انداز میں جائزہ لے کر ان کا جواب دیا جائے۔ میں اعتراضات کا جواب دینے کے اس طریقے کو صحیح نہیں سمجھتا کہ پہلے آپ اعتراض نقل کریں اور پھر اس کا جواب دیں۔ آپ اصل بات کو اس طرح بیان کریں کہ اعتراض پیدا ہی نہ ہو۔ یہ زیادہ دیرپا اور زیادہ موثر طریقہ ہے۔ اعتراضات بیان کر کے ان کا جواب دینا صحیح طریقہ نہیں ہے۔

علم حدیث پر بعض اعتراضات ایسے ہیں جو کم فہمی یا علم حدیث کی اہمیت سے ناواقفیت کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ اس طرح کے اعتراضات آج سے نہیں بلکہ شروع سے ہو رہے ہیں۔ سنن ابوداؤد میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک روایت ہے۔ کہ انؓ سے کسی یہودی نے بڑے طنز واستہزا اور مذاق سے پوچھا کہ کیا تمہارے رسول تمہیں ہگنے موتنے کا طریقہ بھی بتاتے ہیں۔ انہوںؓ نے کہا کہ ہاں، بتاتے ہیں۔ آپؐ نے بتایا کہ استنجا کرو تو اس طرح کرو وغیرہ۔ انہوںؓ نے اس پر کوئی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا، نہ ناپسندیدگی ظاہر کی اور اس کے طنز کو طنز کے طور پر نہیں لیا اور کہا کہ ہمارے پیغمبر ہمیں ہر اچھی بات سکھاتے ہیں۔ حدیث رسول پر اعتراض کرنے کی جو ذہنیت ہے یہ یہودی ذہنیت ہے۔ یہ حضرت سلمان فارسیؓ کے زمانے سے آج تک

چلی آرہی ہے اور ہر زمانے میں یہودی اس طرح کے سوالات کرتے رہے ہیں۔ یہ ان تمام لوگوں کی ذمہ داری ہے جو حدیث کا علم رکھتے ہیں یا اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو علم حدیث سے دلچسپی عطا فرمائی ہے اور جن کو اللہ تعالیٰ نے علم حدیث کا دفاع کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے۔

یہ چند باتیں تھیں جن کو میں آج کہنا چاہتا تھا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے یہ موقع عنایت فرمایا۔ دعا کریں کہ جو کچھ میں نے یہاں کہا اللہ تعالیٰ اس کو اخلاص سے کہنے کی توفیق کے ساتھ ساتھ اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ جو کچھ کہا اس پر مجھے بھی عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور آپ کو بھی عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ جو غلطیاں ہوئی ہوں ان کو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔ جو صحیح بات ہوئی ہو اس کو قائم و دائم رکھے۔

☆☆☆☆☆

چہرے کا پردہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک نہیں ہے۔ باقی ائمہ کرام کا اس بارے میں کیا خیال ہے۔

دیکھئے، چہرے کے پردے کے بارے میں شروع سے ایک گفتگو چلی آرہی ہے جس میں صحابہ اور تابعین کے زمانے سے یہ بحث ہورہی ہے۔ قرآن پاک کی جس آیت میں آیا ہے کہ پردہ کرو، اس میں آیا ہے کہ 'الا ماظھر منھا' سوائے اس کے کہ جو ظاہر ہو۔ فقہا، محدثین، صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کی ایک بہت بڑی تعداد کا کہنا یہ ہے کہ الا ماظھر منھا یعنی سوائے اس کے کہ جو ظاہر ہو جائے، اس میں جسم کی ساخت اور قد وقامت شامل ہے جس کو نہیں چھپایا جاسکتا۔ جب ایک خاتون نکل کر کہیں جائے گی تو لوگ دیکھ لیں گے کہ دبلی ہے، پتلی ہے، موٹی ہے بھاری ہے تو یہ ظاہر ہو جائے گا اور جسم کی ساخت کا بھی اندازہ ہو جائے گا تو یہ تو نہیں چھپایا جاسکتا۔ اس لئے اس میں یہ شامل ہے باقی سب چیزیں چھپانی چاہئیں۔

کچھ اور حضرات کا کہنا ہے کہ اس میں جسم کے وہ اعضاء بھی شامل ہیں جن کو بعض اوقات کھولنا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً کسی کام کے لئے خاتون جارہی ہے، سفر پر جارہی ہے تو ہاتھ کھلا ہوگا، پاؤں کھلے ہوں گے، کسی مزدوری کے لئے ضرورت پڑ گئی تو ہاتھ کھولنا پڑے گا۔ اس میں کچھ لوگ چہرہ کھولنے کو بھی شامل سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ چہرہ کا پردہ واجب ہے کہ نہیں اس میں تو اختلاف شروع سے چلا آرہا ہے۔ اس لئے کچھ لوگ جو چہرے کے پردے کو لازمی سمجھتے ہیں ان میں ہمارے امام احمد بن حنبل اور سعودی علما شامل ہیں۔ وہ ہر حال میں چہرے کے پردے کو لازمی سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ چہرے کا پردہ عام حالات میں تو کرنا چاہئے لیکن اگر کسی خاتون کو کوئی ناگزیر ضرورت ایسی پیش آجائے جس میں اسے وقتی یا مستقل طور پر چہرہ کھولنے پر مجبور ہو تو چہرہ، ہاتھ اور پاؤں کھولنے کی اجازت ہے۔

تیسرا نقطۂ نظر یہ ہے جو مجھے بھی ذاتی طور پر دلائل وغیرہ دیکھ کر درست معلوم ہوتا ہے لیکن آپ کا جو جی چاہے وہ آپ اختیار کریں۔ وہ ہے کہ چہرے کا ڈھکنا تو افضل اور عزیمت ہے لیکن کھولنے کی اجازت ہے۔ چہرہ کھولنا رخصت ہے۔ اگر وہ خاتون یہ سمجھتی ہیں کہ چہرہ نہ کھولنے سے اس کے لئے مشکلات ہیں تو وہ کھول سکتی ہیں۔ اور یہ مسائل بعض اوقات یورپ اور دیگر مغربی ممالک میں پیش آتے ہیں۔ جہاں ہماری بہت سی بہنوں کی نوکری کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اور باہر جانا پڑتا ہے۔ وہاں کے ماحول میں ان کو سر ڈھانکنے کی اجازت بھی بڑی مشکل سے ملتی ہے تو

چہرے کے ڈھانکنے کی پابندی بھی اگر لازم کردی جائے تو ان کے لئے شاید مشکل ہو جائے۔ اس لئے جہاں حالات ناگزیر یا مشکل ہوں تو وہ میرے خیال میں چہرہ کھول سکتی ہیں۔

آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا..................

میں اسلامی یونیورسٹی میں پڑھاتا ہوں۔ وہاں استاد ہوں۔

کیا مارٹ گیج (رہن) پر گھر لینا سود کے زمرے میں آتا ہے۔

مارٹ گیج کی بھی بعض شکلیں جائز ہیں بعض ناجائز ہیں۔ جب تک اس کی تفصیلات کا مجھے پتہ نہ ہو کہ اس کی شرائط اور تفصیلات کیا ہیں، اس وقت تک کچھ کہنا مشکل ہے۔ بعض چیزیں اس میں جائز ہوتی ہیں بعض ناجائز ہوتی ہیں۔

مسلکوں کے حوالہ سے کئی سوالات ایک ساتھ آئے ہیں۔

ہم لوگ اپنے آپ کو حنفی، مالکی یا شافعی کہتے ہیں۔ تو یہ امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام شافعی اپنے آپ کو کیا کہتے تھے۔ مسلم کہتے تھے یا کچھ اور۔

لوگ ایک حدیث بیان کرتے ہیں کہ جو جماعت سے باہر ہو وہ دین سے باہر ہوا۔ کیا اس کا مطلب کسی امام کی پیروی کرنے کے حوالے سے ہے۔ ہمارے معاشرہ میں کسی امام کی پیروی کے حوالے جو رویہ پایا جاتا ہے اس کا سبب کیا چیز بنی؟ کیا یہ کہنا کہ جس کو صحیح سمجھیں اس کی پیروی کریں' درست رویہ ہوگا۔

کیا ہم ایک ہی کام کے حوالہ سے کئی طریقے اپنا سکتے ہیں۔ اگر نہیں تو پھر کیا کریں۔ کیا کسی ایک ہی امام کی پیروی ضروری ہے؟

اماموں کے درمیان احادیث کے حوالہ سے جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ اختلافات ہمارے روزمرہ کے معاملات میں ہمارے اعمال کو کس حد تک متاثر کر سکتے ہیں۔

دراصل ہم جس چیز کے پابند ہیں وہ تو اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول کی سنت ہے۔ اور یہی شریعت کہلاتی ہے۔ اس کے علاوہ قرآن اور سنت نے کسی اور شخص یا کسی اور چیز کی پیروی کرنے کی پابندی نہیں لگائی ہے۔ لہٰذا شرعاً نہ امام ابوحنیفہ کی پیروی لازم ہے نہ امام بخاری کی، نہ امام مسلم کی، نہ کسی اہل حدیث کے فقہ کی پیروی شرعاً لازم نہیں ہے۔ قرآن وسنت کی پیروی لازم ہے۔ لیکن ہر شخص قرآن وحدیث کا اتنا علم نہیں رکھتا کہ وہ ان کی صحیح پیروی کر سکے۔ اس لئے جو شخص

علم نہیں رکھتا وہ مجبور ہے کہ وہ جاننے والوں سے پوچھے۔ علم جاننے والوں میں جس کے علم اور تقویٰ پر سب سے زیادہ اعتماد ہو، جس کا علم اور تقویٰ اس درجے کا ہو کہ آپ آنکھیں بند کر کے اس کی بات آپ مان لیں۔ جب یہ ائمہ فقہ اور ائمہ حدیث نے اپنے اپنے یہ اجتہادات مرتب کئے تو بعض حضرات کے ارشادات کتابی شکل میں مرتب ہو گئے۔ ان کے شاگردوں نے بڑی تعداد میں ان کے ارشادات اور فتاویٰ کو پھیلا دیا۔ اس لئے ان کی بات پر عمل کرنا آسان ہو گیا۔ بقیہ فقہا کے اجتہادات اور اقوال مرتب نہیں ہوئے اس لئے ہم تک نہیں آئے۔ مثلاً امام بقی بن مخلد بہت بڑے محدث تھے۔ ان کے خیالات کیا تھے وہ حدیث کی کیسے تعبیر کرتے تھے، وہ آج ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں۔ اس لئے ہم آج امام بقی بن مخلد کے اجتہادات پر عمل نہیں کر سکتے کہ وہ کیا مفہوم بیان کرتے تھے۔ لیکن امام مالک کے اقوال ہمارے سامنے ہیں۔ امام بخاری کے فتاویٰ ہمارے سامنے ہیں۔ اس لئے ان کے بارے میں یقین سے یہ کہنا آسان ہے کہ وہ کس حدیث کی کیا تعبیر کرتے تھے۔ اس لئے جس کے علم اور تقویٰ پر آپ کو اعتماد ہو آپ اس کو اختیار کر لیں۔ لیکن یہ بات کہ ہر آدمی کو یہ حق ہو کہ جزوی مسائل میں پہلے یہ دیکھے کہ کیا چیز میرے لئے آسان ہے۔ اس سے گمراہی اور افراتفری کا راستہ کھلتا ہے۔ اگر صاحب علم دلائل کی بنیاد پر ثابت کرے تو وہ جائز ہے اور ہمیشہ ہوتا رہا ہے اور آج بھی ہو رہا ہے۔ آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ لیکن جو عام آدمی قرآن و حدیث کا علم نہیں رکھتا وہ صرف آسانیاں تلاش کرنا چاہتا ہے تو کتاب کھول کر جو چیز آسان لگے اس کو اختیار کر لے۔ اس سے شریعت کے تقاضے ٹوٹتے ہیں اور متاثر ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر صاحب علم دلائل سامنے لا کر ایسا کرتا ہے تو وہ واقعی ایسا کر سکتا ہے۔ ایک عام آدمی جس کو نہیں معلوم کہ حدیث ضعیف کیا ہے، حدیث موضوع کیا ہے۔ جس کو یہ نہیں معلوم کہ قرآن مجید کی کس آیت کا کیا مفہوم ہے۔ کون سی آیت پہلے نازل ہوئی کونسی بعد میں نازل ہوئی۔ وہ اگر عمل کرنا شروع کر دے تو شائد غلطی کا شکار ہو جائے۔ اس لئے غلطی سے بچنے کے لئے معتبر اور معتمد اصحاب علم پر اعتماد کرنا چاہئے۔

آج علوم حدیث کی آخری کلاس ہے دعا نکلتی ہے دل سے آپ کے لئے۔

اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

المعجم المفہرس جو مستشرقین نے لکھی اس کا محرک کیا تھا۔

میرے خیال میں علمی فائدہ (Academic interest) ان کا محرک تھا۔ بہت سے لوگ خالص علمی جذبہ سے بھی کام کرتے تھے۔ انہوں نے علمی سہولت کے لئے یہ کام کیا۔ یہ ایک اچھا ٹول ہے، ایک اچھا وسیلہ ہے جس سے کام لے کر حدیث کی کتابوں سے استفادہ آسان ہو جاتا ہے۔

ایک اور بہن نے دعا کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے مواقع اور بھی دے۔ آمین

یہ کیسٹ کہاں دستیاب ہو گی؟

مجھے نہیں معلوم۔ اگر الہدیٰ کے لوگوں نے کوئی کیسٹ بنائی ہے تو آپ ان سے پوچھ لیجئے۔

پوچھنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی تقاریر کی اور کیسٹس کہاں دستیاب ہوں گی؟

میری تو ایسی کوئی کیسٹس کسی خاص پتہ پر دستیاب نہیں ہیں۔ نہ میں نے کبھی بنوائی ہیں۔ کسی پروگرام میں اگر کوئی خود ہی بنا لے تو میں کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ میری تقریریں اور مواعظ جمع ہوں اور لوگ پڑھیں۔ لیکن اگر اس پروگرام کے کیسٹس بن گئے ہیں تو میری طرف سے آپ کے لئے ہدیہ ہے۔ کوئی نقل کرنا چاہے تو ضرور کرے۔

ابھی علوم حدیث کی بہت سی جہتیں باقی ہیں۔ آپ ضرور رابطہ کریں۔ میں اسلامی یونیورسٹی میں بیٹھتا ہوں جس کا جی چاہے رابطہ کرے۔

آپ نے جو سند بیان کی، کیا اس سند کی ایک کاپی مل سکتی ہے۔

بالکل مل سکتی ہے۔ میں ایک کاپی الہدیٰ میں دے دوں گا۔

ایک اور بہن نے دعا کی ہے، جزاک اللہ

صحیح بخاری کے ابواب میں جو احادیث بیان ہوئی ہیں کیا وہ سب صحیح ہیں؟

جی ہاں وہ سب صحیح ہیں۔ اس میں کوئی حدیث ضعیف یا حسن کے درجہ کی نہیں ہے وہ سب کی سب صحیح ہیں۔

اس بات کی کیا دلیل ہے کہ مثلاً صحیح بخاری وغیرہ کے یہ مجموعے ہم تک بغیر تحریر کے پہنچے ہیں؟

یہ جو بارہ دنوں میں اتنی داستان بیان کی یہی تو بتانے کے لئے بیان کی۔ ہر دور میں ہزاروں انسانوں نے ان کو زبانی یاد کیا، لاکھوں انسانوں نے ایک ایک آدمی کا نام محفوظ کیا جس کے ذریعے یہ ان تک پہنچا ہے۔ ان میں سے ہر آدمی کی تاریخ محفوظ ہے۔ ہر دور کے تحریری

مجموعے موجود ہیں۔ ہر دور کے مخطوطات موجود ہیں۔ اس کے بعد اگر یہ ہو کہ یہ مستند نہیں ہیں تو پھر یہ بھی مستند نہیں ہے کہ ہم اسلام آباد میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے یہ ٹوکیو ہو، غلط فہمی سے کسی نے اس کو اسلام آباد کہہ دیا ہو۔

امام بخاری کی مختلف تصانیف مثلاً تاریخ کبیر، تاریخ......

امام بخاری کی تاریخ کبیر کا اردو ترجمہ موجود نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ کتابیں ہیں جن کی ضرورت ماہرین علم اور علما حدیث کو پڑتی ہے سب عربی جانتے ہیں۔ علوم حدیث کی وہ کتابیں جو بڑی تکنیکی ہیں مثلاً جرح وتعدیل پر کتابیں، راویوں کے حالات کے بارے میں کتابیں اردو میں زیادہ نہیں، اس لئے کہ ضرورت نہیں پڑتی۔ جو لوگ اس سطح تک علم حاصل کر لیتے ہیں وہ عربی جان لیتے ہیں۔ تو عربی میں یہ ساری کتابیں ہیں۔ کسی اور زبان میں ان کا ترجمہ نہیں ہوا۔

ایک اور بہن نے دعا کی ہے، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

ایک حدیث میں آتا ہے ح

ہاں یہ میں بتانا بھول گیا۔ یہ امام مسلم کی اصطلاح ہے۔ وہ جب کوئی سند بیان کرتے ہیں تو آگے جا کر وہ سند دو حصوں میں تقسیم ہو جائے، یا آغاز میں دو سندیں ہوں اور اوپر جا کر ایک ہو جائیں تو وہاں امام مسلم تحویل کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں جس کا مخفف ہے 'ح'۔ ابھی میں نے عرض کیا تھا کہ مدار سند کسی حدیث کی سند میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ مثلاً چار سندیں امام مسلم سے جا رہی ہیں۔ اور ان سب کا ایک مدار سند ہے۔ تو امام مسلم جب مدار تک پہنچ جائیں گے تو پھر کہیں گے 'ح'، یعنی تحویل، یعنی میں دوبارہ دہراتا ہوں، و حدثنا سے پھر سند شروع کریں گے، پھر مدار تک آئیں گے، ح، تحویل یعنی **Reversion**، پھر دوبارہ۔ یعنی پہلے کے جو چار حصے ہیں وہ بیان کرنے بعد مدار سے آگے چلیں گے۔ یہ ح اور تحویل کا مطلب ہے۔ اس کو جب پڑھتے ہیں تو ح یا تحویل بھی پڑھ سکتے ہیں۔

اگر ہم میں سے کوئی محدثہ بننا چاہے تو اسے کیا کرنا ہوگا۔

آپ علم حدیث کا مطالعہ شروع کر دیجئے۔ جو علم حدیث کا کما حقہ مطالعہ کرتا ہے وہ محدث بن جاتا ہے۔

کیا سیرت البخاری پر کوئی کتابیں لکھی گئی ہیں؟

امام بخاری پر بہت ساری کتابیں لکھی گئی ہیں۔ دو کتابوں کا میں ذکر کروں گا جو مجھے اچھی لگیں۔ ایک کتاب تو 'تذکرۃ المحدثین' دو جلدوں میں ہے۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی ہندوستان کے ایک بزرگ تھے، ان کی لکھی ہوئی ہے۔ ہندوستان میں چھپی تھی۔ وہ آپ دیکھ لیں اس میں بڑے محدثین کا تذکرہ ہے۔ دوسری کتاب ہے جو مدینہ یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے ایک بزرگ ڈاکٹر تقی الدین مظاہری کی لکھی ہوئی ہے۔ اردو میں ہے۔ کتاب کا نام ہے 'محدثین کرام اوران کے کارنامے'۔

ایک اور ہیں ڈاکٹر محمد لقمان السّلفی۔ ہندوستان کے، ان کی بھی تذکرہ محدثین پر ایک کتاب ہے۔

مورس بکائی مسلمان ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنے قبول اسلام کا کوئی بیس سال پہلے اعلان کر دیا تھا۔

کیا امام ابو حنیفہ نے براہ راست حضرت انس کو دیکھا تھا؟

جی ہاں امام صاحب نے حضرت انس کو دیکھا تھا۔ امام ابوحنیفہ اپنے والد کے ساتھ حج کے لئے گئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر تیرہ یا چودہ سال تھی۔ حضرت انسؓ مکہ مکرمہ میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ اور امام ابوحنیفہ بیان کرتے ہیں کہ جب میں حج کے لئے گیا تو مسجد حرام کے باہر ہجوم تھا۔ بہت سے لوگ جمع تھے۔ ہر شخص لپک کر اس ہجوم کے مرکز تک پہنچنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ انہوں نے کسی سے پوچھ کر بتایا کہ صحابئ رسول حضرت انسؓ آئے ہوئے ہیں اور لوگ ان کو دیکھنے کے لئے جمع ہو رہے ہیں۔ تو امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ میں بھی لوگوں کے درمیان سے نکل کر ان تک پہنچ گیا اور میں نے ان کی زیارت کی۔

کیا استخارے میں خواب کا آنا ضروری ہے؟

نہیں استخارے میں خواب کا آنا ضروری نہیں ہے۔ استخارے کے معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے طلب خیر کیا جائے۔ استخارہ کا مطلب ہے خیر طلب کرنا۔ جب آپ کے سامنے دو کام ہوں، دونوں جائز ہوں، یہ نہیں کہ ایک جائز ہو اور ایک ناجائز کہ سود کھاؤں کہ نہ کھاؤں، اور استخارہ کرنے لگے، یہ استخارہ نہیں ہوگا۔ استخارہ وہاں ہوگا جہاں دو جائز کام درپیش ہوں اور انتخاب میں مشکل پیش آرہی ہو۔ مثلاً مکان خریدنے کا پروگرام ہے۔ دو مکان مل رہے ہیں اور آپ کے لئے

دونوں میں سے ایک منتخب کرنا ہے کہ اچھا کونسا ہے تو استخارہ کرلیں۔ تو پھر اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کریں کہ میرے لئے جو اچھا ہو میرے لئے اس کو آسان کر دے۔ تو جو خیر ہو گی اللہ تعالیٰ اس کو آسان کر دے گا۔ خواب واب کا آنا کوئی ضروری نہیں ہے۔

شرح بیان کرنے کا طریقہ کب اور کیوں شروع ہوا؟

شرح بیان کرنے کا طریقہ اسی وقت سے شروع ہوا جب احادیث کی تدوین کا کام مکمل ہوا۔ ابھی میں نے امام ابوعیسیٰ ترمذی کی تعلیق آپ کو پڑھ کر سنائی۔ امام ترمذی جب یہ کتاب مرتب کر رہے تھے اسی کے ساتھ انہوں نے بعض پہلوؤں کی تشریح کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ اسی طرح سے بقیہ محدثین نے بھی تشریح کا کام شروع کر دیا۔ پھر جب محدثین اس کام سے فارغ ہوئے تو باقی حضرات نے شرح کا کام بیان کر دیا تھا۔ ضرورت اس لئے نہیں پڑی کہ لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ حدیث کا مفہوم کیسے نکالا جائے۔ اس کی تعبیر و تشریح کیسے کریں۔ غلط تعبیر کے راستے کو کیسے روکیں۔ اس لئے ضرورت پیش آئی کہ کتب حدیث کی مستند شرحیں تیار کی جائیں۔

جو شخص علم حدیث کو جانتا ہو، شریعت کا علم رکھتا ہو وہی شرح کر سکتا ہے اس میں رسمی طور پر اجازت دینے یا نہ دینے کا کوئی سوال نہیں۔ مسلمانوں کا مزاج ایسا ہونا چاہئے کہ وہ مستند آدمی ہی کی شرح سے استفادہ کریں اور غیر مستند آدمی کی شرح کو قبول نہ کریں۔ جب غیر مستند آدمی کی شرح کو پذیرائی نہیں ہوگی تو وہ شرح نہیں لکھے گا۔

اللہ تعالیٰ اس ایمان کو تازہ رکھے،

نام تو بیان کرنا دشوار ہے لیکن ویسے اسلامی یونیورسٹی کے نیو کیمپس H-10 میں آپ جائیں تو وہاں ٹینکی کے ساتھ کتابوں کی ایک دکان ہے، اس کے پاس سی ڈی زہیں وہاں سے جا کر لے لیں۔

آپ نے بیان کیا کہ اگر ضعیف احادیث پر عمل کرنے والوں کا عمل غیر شرعی نہیں ہے تو ان کو کرنے دیا جائے، مثلاً کسی رات کو نفل پڑھنا جیسے شب معراج اور شب برات کو، تو براہ مہربانی اس بات کو واضح کریں کہ پھر بدعت کی شناخت کیسے کی جائے؟

دیکھئے بدعت وہ ہے جس کی کسی حدیث یا سنت یا حدیث میں یا حدیث کی تعبیر و تشریح میں کوئی اساس نہ ہو۔ لیکن اگر کوئی عمل کسی حدیث کی تعبیر کی وجہ سے ہے وہ تعبیر تو کمزور ہو سکتی ہے اور آپ اس تعبیر کو غلط بھی کہہ سکتے ہیں لیکن اس عمل کو بدعت نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے اگر کوئی حدیث

ایسی ہے جو کمزور ہے، مثلاً اسی ترمذی میں ہے جو میرے سامنے ہے جس میں پندرہ شعبان کو عبادت کرنے کا ذکر ہے لیکن ضعیف حدیث ہے۔ اکثر محدثین اس کو ضعیف سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ حدیث ضعیف ہے اور اس کا ضعف بڑے کمزور درجہ کا ہے۔ جو حضرات سمجھتے ہیں کہ اس کا ضعف کمزور درجہ کا نہیں وہ اس پر عمل کرنے کو جائز سمجھتے ہیں۔ اس لئے جو حدیث پر عمل کرنے کی نیت سے اس کام کو کر رہے ہیں، وہ بدعت نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کوئی پندرہ شعبان کی رات کو عبادت کرتا ہے یا دن کو روزہ رکھتا ہے تو وہ نعوذ باللہ بدعت نہیں ہے۔ لیکن جو پندرہ شعبان کو پھلجڑی چلاتا ہے وہ یقیناً بدعت ہے۔ جو سمجھتا ہے کہ پندرہ شعبان کو حلوہ بنانا ضروری ہے وہ یقیناً بدعت ہے، جو پندرہ شعبان کو چراغاں کرتا ہے وہ یقیناً بدعت ہے کیونکہ اس کو کوئی براہ راست یا بالواسطہ کسی حدیث میں، کسی ضعیف میں بھی کہیں نہیں آیا۔ یہ فرق ہے بدعت اور غیر بدعت میں۔ کسی چیز کا صحیح ہونا، سنت ہونا یا نہ ہونا یہ الگ چیز ہے اور اس کا بدعت ہونا یا نہ ہونا الگ چیز ہے۔

آپ نے کہا جس کے دلائل بہتر ہوں اور جس کو صحیح سمجھتے ہوں اس کی پیروی کریں۔ کیا ہم لوگ، جو ابھی تعلیمی میدان میں مبتدی ہیں، اس قابل ہیں کہ ہم خود فیصلہ کر سکیں کہ فلاں عمل کرنا چاہئے اور فلاں نہیں......

اسی لئے میں نے کہا کہ جواب تک کرتے آئے ہیں وہی کرتے رہیں۔ جواب تک کرتی رہی ہیں وہ کرتی رہیے۔

یہ اسلام کی بڑی خدمت ہوگی اگر آپ سائیکالوجی پڑھ کر اس کی روشنی میں دلائل سے اسلامی عقائد اور نظریات کی تشریح کریں اور بتائیں کہ ان دلائل سے بھی یہ عقائد درست ہیں تو یہ بہت بڑی خدمت ہوگی، آپ ضرور کریں۔

آج کل دم یا قرآن پڑھ کر جادو یا سحر کا علاج کیا جاتا ہے اور اس کے پیسے وصل کئے جاتے ہیں اس بارے میں کچھ بتادیں۔ سورۃ فاتحہ سے ایک سردار کے علاج وغیرہ کا سن کر رقم لینے کی اجازت ہے؟ اگر اس کی اجازت واقعی ہے تو کیا ہم اپنی کلاس سے پیسے وصول کر کے لوگوں کے لئے اس طرح کی کلینک کھول سکتے ہیں؟

میرے خیال میں تو کلینک کھولنے کا راستہ تو بڑا خطرناک ہوگا۔ نہ کلینک کھولیں نہ پیسے

لیں۔صحابہ نے کوئی کلینک نہیں کھولا تھا وہ بعد میں بھی سوسال تک رہے۔110ھ تک صحابہ کرامؓ کا زمانہ ہے کسی نے کلینک نہیں کھولا، اس لئے کلینک کھولنا صحابہ کے مزاج کے خلاف ہوگا۔کلینک تو میڈیکل سائنس کی بنیاد پر کھولتے ہیں۔ یہ تو ایک صحابیؓ نے اس یقین سے کہ اللہ کی کتاب میں شفا ہے،قرآن پاک میں اس کو شفا کہا گیا کہ فیه شفاء لمافی الصدور،تو اس یقین سے اس کو پڑھ کر پھونک دیا اور اس قبیلہ کے سردار نے ہدیہ کے طور پر کچھ پیسے بھی دے دیئے اور انہوں نے لے لئے۔ وہ معاوضہ کی بات نہیں تھی کہ انہوں نے پہلے فیس مقرر کی ہو کہ پانچ سو روپے لیں گے اور پانچ سو روپے لے کر پھونک دیا۔ یہ کسی صحابیؓ یا تابعی نے نہیں کیا اس لئے دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

دی بائبل؛ قرآن اینڈ سائنس کے رائٹر مورلیس بُکائی Maourice اس کو فرنچ میں مورلیس پڑھتے ہیں اور بُکائی کے ہجے ہیں Bucaille یہ فرنچ میں بکائی پڑھا جاتا ہے فرنچ میں جہاں بھی ڈبل ایل ای آئے اس کو 'ی' پڑھتے ہیں۔

شوق پیدا ہوا ہے مطالعہ کو جاری رکھنا چاہتی ہوں، کوئی ٹپ بتادیں......

میرے علم میں تو کوئی ایسی ٹپ نہیں ہے لیکن ایک بزرگ تھے آپ نے نام سنا ہوگا مولانا ابوالخیر مودودی، مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کے بڑے بھائی تھے، ان کے پاس میں بہت جایا کرتا تھا اور کتابوں پر تبادلہ خیال ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ میں ان کے پاس گیا۔ میں نے ان سے ایک سوال کیا جو شاید آپ کی دلچسپی کا بھی ہو، اگر چہ اس کا جواب نہیں ملا۔ میں نے ان سے پوچھا تھا کہ اب بھی لوگوں سے پوچھتا رہتا ہوں، تلاش بھی کرتا رہتا ہوں، جب یہ پوچھا تھا تو اس کو کوئی بتیس سال ہوگئے ہیں۔ 1971 میں پوچھا تھا کہ رسول اللہ ﷺ تو جنوں اور انسانوں دونوں کے لئے بھیجے گئے تھے اور جنوں اور انسانوں دونوں کے لئے حضورؐ کے نبی ہونے کا ذکر قرآن پاک میں آتا ہے۔تو انسانوں تو حدیث کے یہ سارے ذخائر جمع کئے، فقہ مرتب کی، اصول حدیث اور اصول فقہ پر کتابیں لکھیں تو کیا جنوں نے بھی ایسا کوئی کام کیا کہ حضورؐ کے سارے ارشادات جمع کئے ہوں؟ یا وہ بھی انسانوں کے کئے ہوئے کے پابند ہیں؟ اگر انسانوں کے کئے ہوئے کے پابند ہیں تو اس کی دلیل کیا ہے؟ یعنی کیوں جنات انسانوں کے فقہ، علم حدیث اور علم جرح وتعدیل کی پیروی کریں؟ یا ان کے اپنے بھی کچھ لوگ ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ بھئی میں نے تو کبھی نہیں

سوچا لیکن کتابوں میں تلاش کرتے ہیں۔ تو انہوں نے مجھے کچھ کتابوں کے نام بتائے جو میں نے دیکھے اور نہیں ملے تو کئی سال بعد جب ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے پوچھا کہ فلاں فلاں کتابیں دیکھی تھیں؟ میں نے کہا جی دیکھی تھیں لیکن ملی نہیں۔ کہنے لگے انڈکس میں دیکھا تھا؟ میں نے کہا کہ جی انڈیکس میں اور فہرست میں۔ تو انہوں نے ایک مشورہ دیا جو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ جب کوئی کتاب پڑھو تو بسم اللہ کی ب سے لے تمت کی ت تک پڑھو۔ تو پہلی ٹپ تو یہ ہے کہ بسم اللہ کی ب سے لے کر تمت کی ت تک پڑھیں۔ دوسری ٹپ یہ ہے کہ روزانہ مطالعہ کے لئے کوئی نہ کوئی وقت ضرور رکھیں۔ ایک دو، تین گھنٹہ، جتنا آپ سہولت سے کر سکیں۔

نماز عصر کا وقت کیسے معلوم کر سکتے ہیں؟ حدیث میں تو ہے جب کسی چیز کا سایہ برابر ہو جائے تو اس کے عصر کا وقت ممکن ہو جاتا ہے۔

کچھ لوگوں نے اس کی مستقل جنتریاں بنا رکھی ہیں جس میں ہر علاقہ کے اوقات درج ہیں کہ سورج کا سایہ دو گنا کب ہوتا ہے اور ایک گنا کب ہوتا ہے۔ میرے پاس ایک ایسی جنتری ہے جس میں ہر شہر کی الگ الگ بنی ہوئی ہے۔ اس طرح کی کوئی جنتری آپ کو مل جائے تو اس سے آسان ہو جائے گا۔

کیا آپ کا کوئی شاگرد آپ سے حدیث......

نہیں میرا کوئی شاگرد نہیں ہے نہ میں حدیث بیان کرنے والا استاد ہوں۔ اس لئے میرے حوالہ سے کوئی حدیث بیان نہ کریں۔ مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ میں علم حدیث کی سند اس طرح بیان کروں جسطرح سے باقی لوگ بیان کرتے ہیں۔ آپ کسی اچھے اور مستند صاحب علم سے اجازت لیں اور اسی کی سند سے حدیث بیان کریں۔

حدیث میں آیا ہے کہ اسلام میں عورت ولی کے بغیر شادی نہیں کر سکتی، لیکن علماء نے گھر والوں نے راضی نہ ہونے کی صورت میں کورٹ میں شادی کو جائز قرار دیا ہے۔

دیکھئے کچھ احادیث ایسی ہیں جن میں حضورؐ نے فرمایا کہ اپنی اولاد سے پوچھے بغیر اس کا نکاح نہ کرو۔ الفاظ مجھے یاد نہیں لیکن مفہوم یہ ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ جب تم کسی بیٹی کی شادی کرو تو اس سے اجازت لے لو۔ واذنھا سماتھا، اس کی خاموشی اس کی اجازت ہے۔ اور

ایک ایسی مثال ہے کہ کسی صاحب نے اپنی زیر کفالت خاتون یا بیٹی کا نکاح کر دیا اور اس نے اعتراض کیا تو حضورؐ نے اس نکاح کو ختم کروادیا۔ اور ان سے پوچھ کے ان کا نکاح کروایا۔ اور ایسی بھی مثالیں ہیں کہ 'ایما امرأة نکحت بغیراذن ولیھا فنکاحھا باطل باطل باطل'، کہ جو کوئی خاتون اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے تو وہ باطل ہے باطل ہے باطل ہے۔ اب بظاہر یہ دو احادیث ہیں اور ان میں تعارض ہے۔ میں نے اس سے پہلے بتایا تھا کہ علماء نے تعارض کو حل کرنے کے کم سے کم پچاس اصول مقرر کئے ہیں۔ ان میں سے ان اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ جن احادیث میں ولی کی اجازت کے بغیر نکاح نہ کرنے کا ذکر ہے، ان احادیث کو ترجیح دی جائے گی اور ولی کی اجازت کے بغیر جو نکاح ہوگا وہ باطل ہوگا۔

امام ابوحنیفہ نے ان دونوں کو ایک دوسرے سے تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ جہاں ولی کی اجازت کے بغیر نکاح نہ کرنے کا ذکر ہے وہاں اس کے اخلاقی پہلو کو حضورؐ نے بیان کیا ہے کہ اخلاقی طور پر ایک مسلمان خاتون کو یہ زیب نہیں دیتا کہ باپ سے پوچھے بغیر جہاں چاہے نکاح کرلے اور باپ کو بعد میں پتہ چلے وہ بیچارہ پریشان ہو۔ اس طرح نہیں کرنا چاہئے۔ یہ بہت مضبوط اخلاقی ہدایت ہے۔ لیکن کیا اگر کوئی خاتون نکاح کرے تو کیا وہ نکاح **Valid** **Legally** ہوا کہ نہیں ہوا؟

یہ بڑا نازک سا معاملہ ہے۔ فرض کریں ایک خاتون نے نکاح کرلیا اور گھر والوں کو اطلاع نہیں دی۔ ان کو دس سال بعد پتہ چلا۔ میں ایک مثال دیتا ہوں۔ ایک لڑکی یہاں سے پڑھنے کے لئے انگلستان گئی۔ وہاں اپنے کسی کلاس فیلو سے شادی کرلی۔ ماں باپ کو پتہ نہیں چلا۔ دس سال بعد آئی تو شوہر صاحب بھی ساتھ آئے اور تین بچے بھی ساتھ تھے۔ اب بتائیے کہ جو فقہا کہتے ہیں کہ نکاح جائز نہیں ہے ان بچوں کو کیا کہیں گے؟

امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ یہ نکاح قانوناً جائز ہے لیکن ان کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ان کو آپ سزا دیں، جرمانہ کریں، قید میں بھی ڈال دیں، تھپڑ بھی لگادیں اس لئے کہ اس نے ایک ایسا کام کیا ہے جس کی اجازت حدیث میں نہیں دی گئی ہے۔ لیکن قانوناً جو اس کا ٹکنیکلی لیگل حصہ ہے اس کو آپ منسوخ نہیں کر سکتے۔ یہ ایک لمبی بحث ہے لیکن دونوں کے بیانات کا خلاصہ یہ ہے۔ پاکستان میں عدالتیں اکثر امام ابوحنیفہ کے نکتہ نظر کے مطابق فیصلہ کرتی ہیں۔ اس میں بھی عدالتوں

کے بعض فیصلوں کے بارے میں مجھے بھی تامل ہے۔اس میں فیصلہ اس طرح نہیں ہوا جس طرح ہونا چاہئے تھا۔میرا کہنا یہ ہے کہ اس موضوع پر ایک مفصل مرتب قانون ہونا چاہئے۔

جب میں اسلامی نظریاتی کونسل کا رکن تھا تو وہاں میں نے یہ مسئلہ اٹھایا تھا اور اس ضرورت کا اظہار کیا تھا کہ ایک مکمل اور جامع مسلم فیملی لاء پاکستان میں تیار ہونا چاہئے جس میں اس طرح کے سارے مسائل کو مکمل طریقے سے بیان کردیا جائے۔اور جو کمزور پہلو (Loop holes) ہیں یا چھوٹے چھوٹے راستے ہیں ان کو بند کردیا جائے۔

صحیح اور ضعیف احادیث کو پڑھ کر ہم کو فرق کیسے کریں؟

آپ وہ مجموعے پڑھیں جن میں صحیح احادیث کا ذکر ہے۔صحیح بخاری، صحیح مسلم کا ترجمہ پڑھیں۔اردو میں ایک کتاب ہے جس کا انگریزی ترجمہ بھی ملتا ہے، اگرچہ بہت معیاری نہیں ہے، وہ 'الؤ لؤ والمرجان فی مااتفق علیه الشیخان' ہے۔جس میں صحیح بخاری اور مسلم دونوں کے متفق علیہ احادیث کو بیان کیا گیا ہے۔وہ موجود ہے اس کو پڑھئے اس میں ضعیف ہونے کا انشاء اللہ امکان نہیں ہے۔

آپ سے درخواست ہے کہ آپ ہمیں اصول فقہ پڑھا دیں۔

اگر زندگی رہی تو میں ضرور پڑھاؤں گا لیکن میں اسلامی یونیورسٹی میں پڑھاتا ہوں آپ وہاں داخلہ لے لیں تو میں آپ کو پڑھادوں گا۔

علوم حدیث کے اس تعارف کے بعد اندازہ ہوا کہ ایک مومن مسلمان کو کیا کرنا چاہئے۔ہمارے ہاں جو اختلافات ہیں ان کو ختم کرنا چاہئے......

اختلافات کو ختم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔اختلاف کوئی بری چیز نہیں ہے۔اس سے خیالات کا تنوع اور ورائٹی سامنے آتی ہے۔جتنی ورائٹی ہوگی اتنا خیالات اور افکار پھیلیں گے اور تعلیمی سطح بلند ہوگی۔لیکن ان خیالات کو ایک دوسرے سے جھگڑنے کا ذریعہ نہیں بنانا چاہئے۔امام بخاری اور امام مسلم میں کئی معاملات پر اختلاف ہے۔لیکن امام مسلم امام بخاری کا اتنا احترام کرتے ہیں کہ انہوں نے امام بخاری سے کہا کہ آپ اجازت دیں کہ میں آپ کے پاؤں چوم لوں۔لیکن امام مسلم نے خود اسی صحیح مسلم کے مقدمہ میں امام بخاری پر اتنے احترام کے باوجود تنقید کی ہے۔تو احترام اپنی جگہ اور اختلاف اپنی جگہ۔دونوں ہوسکتے ہیں۔

کیا عورت اور مرد کی نماز میں فرق ہے؟

یہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ نماز میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک ہی طرح کی ہے سارے احکام ایک جیسے ہیں۔ لیکن بعض فقہا کا کہنا یہ ہے کہ جب خاتون سجدہ یا رکوع کی حالت میں جائے تو سجدہ ایسے کرے کہ اس کے جسم کے لئے زیادہ سے زیادہ ساتر ہو، اور جسم کے جو خدوخال ہیں وہ نمایاں نہ ہوں۔ یہ بھی ایک حدیث سے استدلال کی بنیاد پر ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کوئی ضرورت نہیں اسی طرح کرنی چاہئے۔ جیسے آپ کا جی چاہے ویسے کرلیں۔

حضورؐ سے محبت میں کیسے اضافہ کیا جاسکتا ہے؟

آپ سیرت اور حدیث کا مطالعہ کریں حضورؐ سے محبت میں اضافہ ہو جائے گا۔

آپ نے ایک شرح پڑھ کر سنانے کا وعدہ کیا تھا

میں بھول گیا تھا، ابھی پڑھتا ہوں۔

اگر ہر ایک کو اپنی پسند کے امام کے مسلک پہ چلنے کی کھلی چھٹی دے دی جائے تو کیا اس سے فرقہ بننے کی گنجائش پیدا نہیں ہوتی؟

اس سے اور بھی بہت سی خرابیاں پیدا ہوں گی اس لئے ہر شخص کو جو علم نہ رکھتا ہو، اپنی پسند کے مطابق فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ یہ حکم بالشریعہ نہیں ہوگا بلکہ حکم بالتشہی ہوگی، اپنی شہوات کے مطابق آدمی پیروی کرے گا، جو چیز کاروبار میں مفید ہوگی تو تاجر کہے گا کہ یہ رائے اختیار کریں، جس کو کسی اور چیز میں فائدہ ہوگا تو وہ کہے گا اس چیز کو اختیار کریں۔ تو اس سے بڑی قباحت پیدا ہوگی۔

حواشی کا مطلب ہے حدیث کی کسی کتاب کے حاشیہ پر۔

یہ ۱۲ لکھا ہوتا ہے اس کا کیا مطلب ہے؟

جو ۱۲ لکھا ہوتا ہے یہ حد کے ابجدی عدد ہیں۔ حد کے معنی ہیں انتہا۔ حد کے ان ابجدی الفاظ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہاں حاشیہ ختم ہو گیا۔ یعنی **unqoute** جسے کہتے ہیں۔ انگریزی میں کہتے ہیں **qout** اور **unqout** تو پہلے لکھتے ہیں منہ، اس کے بعد لکھتے ہیں انتہی، تو انتہی کی تلخیص آہ ہے۔ انتہا کی بجائے اہ لکھ دیتے ہیں۔

کیا ہم اس بات کا یقین کرلیں کہ مستشرقین نے احادیث کو درست کر کے بغیر رد و بدل کی لکھی

ہوں گی۔

مستشرقین نے کم ازکم اس انڈیکس میں کوئی ردوبدل نہیں کی۔ میں اس انڈیکس کو کم وبیش تیس بتیس سال سے استعمال کررہاہوں۔ میں نے کوئی ایسا اندراج نہیں دیکھا جس میں انہوں نے ردوبدل کی ہو۔

گولڈن احادیث کتنی ہیں؟

گولڈن چین کے بارے میں مختلف لوگوں کی رائے مختلف ہیں۔ کہ کس کو گولڈن چین کہتے ہیں۔ عام طور پر ایک تو وہ روایت ہے جو موطاء امام مالک میں ہے اور جسے میں دہراچکاہوں، مالک عن نافع عن ابن عمر، لوگ اس کو گولڈن چین کہتے ہیں ۔یعنی یہ سب سے مختصر ترین روایت ہے جو امام مالک کو دو واسطوں سے ملی۔

اس کے علاوہ بھی بعض روایات کے بارے میں لوگوں نے کہا ہے کہ یہ گولڈن چین ہے۔ ایک روایت ایسی ہے جو مجھے پوری یاد نہیں لیکن اس مین امام احمد، امام شافعی اور امام مالک تینوں کے نام آجاتے ہیں۔تو تین فقہا کے نام ایک سند میں آئے ہیں اس کو بھی بعض لوگوں نے گولڈن چین کہاہے۔ اس پر بڑی لمبی بحثیں ہیں اور ہر محدث نے اپنی رائے یا اپنے فہم کے مطابق گولڈ چین قرار دیاہے۔

اللہ تعالیٰ کو یہ دنیا بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

اللہ تعالیٰ سے یہ پوچھنے کا کسی میں یارا نہیں ہے کہ یہ دنیا آپ نے کیوں بنائی؟ اللہ تعالیٰ نے بنائی۔لیکن ایک بات ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جو بہت سی صفات ہیں ان صفات کا پتہ تبھی چلے جب ان کا کوئی مظہر ہو۔اللہ تعالیٰ علیم ہے تو اللہ کا علم ہوگا تو صفت علیم کے معنی ہوں گے۔اللہ تعالیٰ بصیر ہے وہ کائنات کو دیکھے گا تو صفت بصیر کا علم ہوگا۔اللہ تعالیٰ خالق ہے تو خلق ہوگی تو اللہ تعالیٰ کی صفت خلق کا علم ہوگا ورنہ کیسے علم ہوگا؟

جب اللہ تعالیٰ کو ہماری عبادت کی ضرورت نہیں......

اللہ تعالیٰ کو ہماری عبادت کی ضرورت نہیں لیکن ہمیں اس کی عبادت کی ضرورت ہے۔ اسلام اللہ نے ہماری ضرورت کے لئے اتارا ہے اپنی ضرورت کے لئے نہیں اتارا۔

ہمارے شہر میں موجود کس عالم سے علم حدیث کے لئے کسب فیض کیاجائے؟

اس شہر میں کئی علماء ہیں جس سے آپ کسب فیض کے لئے جاسکتی ہیں۔ میں تو دو علماء کو جانتا ہوں ۔ ایک ڈاکٹر سہیل حسن صاحب کو جانتا ہوں۔ ان کے والد مولانا عبدالغفار حسن بھی حیات ہیں، ان کی صحت اجازت دے تو ان سے بھی جا کر سند لیں۔ان کی سند بڑی عالی ہے۔ وہ ایک واسطہ سے مولانا شیخ الکل میاں نذیر حسین کے شاگرد ہیں۔ غالباً جہاں تک میرے علم میں ہے۔ اور مولانا نذیر حسین مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب کے شاگرد ہیں، تو ان کی سند بڑی عالی اور مختصر ہے، ان سے سند لے لیں۔

حدیث کی جگہ جو فرق حدثنا اور اخبرنا میں ہے تو ان دونوں میں کیا فرق ہے؟

حدثنا یہ ہے کہ استاد نے حدیث پڑھی اور طالب علم نے سنی، تو جب طالب علم اس کو آگے بیان کرے گا تو حدثنا سے بیان کرے گا۔ اخبرنا یہ ہے کہ طالب علم نے حدیث پڑھی اور استاد نے سن لی اور سن کر اجازت دے دی، یہ اخبرنا ہے۔

یہ اصطلاح سب سے پہلے امام مسلم نے شروع کی تھی۔ امام بخاری کے ہاں یہ اصطلاح نہیں ہے۔

احادیث کے علم سے پتہ چلتا ہے کہ برصغیر میں زیادہ تر اسلام محدثین کی کوششوں سے پھیلا۔

ٹھیک ہے۔ محدثین کی کوششیں بھی شامل ہیں، صوفیا کی کوششیں بھی شامل ہیں۔ اس زمانے میں صوفیا اور محدثین الگ الگ نہیں ہوتے تھے۔ یہ کہنا نہیں تھا کہ یہ صوفیا ہیں اور یہ محدثین ہیں۔ محدثین صوفیا بھی ہوتے تھے اور صوفیا محدثین ہوتے تھے سب ملے جلے ہوتے تھے **All three in one** ہوا کرتا تھا۔ اس لئے کسی نے ان کو صوفی کے نکتہ نظر سے دیکھا تو صوفیا میں بیان کر دیا۔ کسی نے عالم کے نکتہ نظر سے دیکھا تو علما میں بیان کر دیا۔ کسی نے محدث کے نکتہ نظر سے دیکھا تو محدث بیان کر دیا۔ اب شاہ ولی اللہؒ صاحب تصوف کے بھی بڑے امام تھے، سب صوفیا ان کو مانتے ہیں، ان کے مریدین بھی تھے اور وہ محدث بھی تھے۔ شیخ احمد سرہندیؒ صوفی بھی تھے تصوف کے بڑے سلسلے ان سے چلے ہیں، لیکن انہوں نے سیالکوٹ جا کر شیخ افضل سیالکوٹی سے علم حدیث حاصل کیا۔

I would be gratful if you could reffer to some books or wbe sites relating to psycology and Islam, objections made by psycologists on

Islam.

I would reffer you to two books, one is by Dr. Rafiuddin, that is know by the Ideology of the Future. Ideology of the Future is a comment of some leading Western philosophers from Islamic point of view and the projectional formulation of an Islamic point of view with always with those philosophers. In that book he has intensively dealth with the question of psycology and prophethood. The other book is by Dr. Malik Badri from Sudan, in which he has tried to develop comments from Islamic point of view and modern western psycology.

عبد اللہ ابن عمر کے شاگرد نافع عبد اللہ ابن عمرو ابن العاص کے ہیں یا عبد اللہ ابن عمر ابن الخطاب کے؟

نافع عبداللہ بن عمر بن خطاب کے شاگرد ہیں عبداللہ بن عمرو بن العاص کے نہیں ہیں۔عبداللہ بن عَمرو بن العاص عین کے زبر کے ساتھ ہے اور پہچان کے لئے آخر میں واو لگایا جاتا ہے جس کی وجہ سے اردو دان لوگ اکثر اس کو عُمرو پڑھتے ہیں یہ عُمرو نہیں ہے اس کو عَمر پڑھا جاتا ہے۔اور اگر واو نہ ہوتو اس کو عُمر پڑھا جائے گا۔

کریڈٹ کارڈ کے بارے میں بتائیں کہ کیا ان کا استعمال کیا جاسکتا ہے کہ نہیں؟

کریڈٹ کارڈ میں بعض تفصیلات ہیں جس میں اگر سود نہ ہوتو استعمال جائز ہے۔اگر ادائیگی ایک خاص مدت کے بعد کی جائے اور اس پر سود ہوتو یہ جائز نہیں ہے۔اگر فوراً ادائیگی کردیں اور بعض ادارے اس پر سود وصول نہیں کرتے تو یہ جائز ہے۔

امت کے لئے کچھ انتہائی متنازعہ امور پر رائے قائم کرنے کے لئے کیا......اس سے فرقے بھی نہ بنتے......

دیکھئے اللہ تعالیٰ کی منشا یہ نہیں تھی کہ تمام علما اور فقہا اور محدثین ایک جگہ جمع ہوکر ایک ہی رائے بنادیتے اور ساری امت اس کی پیروی کرتی ۔ یہ اللہ تعالیٰ کا منشا نہیں تھا۔ یہ رسول اللہ ﷺ کا منشا

بھی نہیں تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو خود تربیت دی کہ ایک سے زائد نکتہ نظر کو اپنائیں اور اختیار کریں۔ دو مثالیں میں نے آپ کو دی تھی۔ ایک مثال تھی بنی قریظہ کے محلّہ میں نماز عصر پڑھنے کی۔ جس میں کچھ صحابہ نے نماز راستہ میں پڑھ لی کچھ نے وہاں پہنچ کر پڑھ لی تو مغرب کا وقت ہو گیا اور نماز قضا ہو گئی۔ حضورؐ نے دونوں کو پسند فرمایا اور فرمایا کہ لقد اصبتم لقد اصبتم دونوں سے کہا کہ تم نے ٹھیک کیا۔

ایک اور موقعہ پر دو صحابیؓ تھے۔ ان کو ایک سفر میں غسل کی ضرورت پیش آئی۔ پانی نہیں تھا انہوں نے تیمّم کر کے نماز پڑھ لی اور تیمّم اور نماز کے بعد ایک صاحب کو پانی مل گیا تو انہوں نے غسل دہرایا اور نماز بھی دہرائی جبکہ دوسرے صاحب نے کہا کہ دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو دونوں نے اپنی بات حضورؐ کی خدمت میں عرض کی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ان صاحب سے، جنہوں نے دوبارہ غسل کیا تھا کہ لك الاجر مرتين کہ تمہیں دہرا اجر ملے گا۔ جن صاحب نے غسل نہیں کی اور نماز نہیں دہرائی۔ آپؐ نے ان سے فرمایا لقد اصبت السنة، تمہیں سنت کے مطابق کام کرنے کی توفیق ہوئی۔ گویا دونوں کو حضورؐ نے بہت پسند فرمایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گویا بعض احکام کی ایک سے زائد تعبیریں ممکن ہیں۔

ایک اور بہن نے لکھا ہے کہ آپ حدیث کی تعلیم کا اہتمام کریں۔

دعا کریں اللہ تعالیٰ توفیق دے۔

☆☆☆☆☆☆☆

محاضرات حدیث

ڈاکٹر محمود احمد غازی

محاضرات حدیث

ڈاکٹر محمود احمد غازی

الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

297.124 Mahmood Ahmad Ghazi, Dr.
Mahazrat-e-Hadees/ Dr. Mahmood Ahmad Ghazi.-Lahore: Al-Faisal Nashran, 2010.
480P.

1. Ahadees I. Title Card.

ISBN 969-503-345-8

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں۔

اشاعت ششم.........مارچ 2010ء
محمد فیصل نے
آر۔آر پرنٹرز سے چھپوا کر شائع کی۔
قیمت:-/500روپے

AL-FAISAL NASHRAN
Ghazni Street,Urdu Bazar,Lahore.Pakistan
Phone : 042-7230777 Fax : 09242-7231387
http : www.alfaisalpublishers.com
e.mail : alfaisal_pk@hotmail.com

فہرست مضامین

پہلا خطبہ:

حدیث: ایک تعارف

علم حدیث کا تعارف	۱۵
حدیث کے لغوی معنی	۱۷
حدیث نبویؐ	۱۹
حدیث کی تعریف	۲۰
علم حدیث کا موضوع	۲۱
اصطلاحات	۲۲
حدیث اور سنت کا فرق	۲۳
سنت کی تعریف	۲۴
حدیث، اثر اور خبر	۲۶
علم حدیث؛ ایک بے مثال فن	۲۸
صحت حدیث پر شکوک کی حقیقت	۳۱
کتب حدیث کے بارے میں غلط فہمیوں کی حقیقت	۳۳
کتب حدیث کی اقسام	۴۱
سوال و جواب	۴۲

دوسرا خطبہ:

علم حدیث کی ضرورت اور اہمیت

سنت کی اقسام	۴۹
سنت فعلی	۴۹
سنت تقریری	۴۹
قرآن میں سنت کی سند	۵۱
حدیث کے مقابلہ میں دیگر مذاہب کے صحائف کی حیثیت	۵۴
کتاب الٰہی اور ارشادات انبیا میں بنیادی فرق	۵۶
سنت: وحی الٰہی کا عملی نمونہ	۵۷
قرآن وسنت کا باہمی تعلق	۷۵
محدثین کی اقسام	۸۳
سوال وجواب	۸۶

تیسرا خطبہ:

حدیث اور سنت بطور ماخذ شریعت

وحی کی اقسام	۱۰۲
کتب حدیث کی خصوصیات	۱۱۲
احادیث نبویؐ کی تعداد	۱۱۹
حُجیتِ سنت	۱۲۰
سوال وجواب	۱۲۷

چوتھا خطبہ:

روایت حدیث اور اقسام حدیث

روایت اور درایت	۱۳۵
متنِ حدیث	۱۳۶
علم روایت	۱۳۷

سماع	۱۳۷
قرأت	۱۳۸
اجازت	۱۳۸
مناولہ	۱۳۸
مکاتبہ	۱۳۹
اعلام	۱۳۹
وصیت	۱۴۰
وجادہ	۱۴۰
تحمل اور اداء	۱۴۱
راوی کی شرائط	۱۴۴
مقبول یا صحیح حدیث	۱۵۰
حدیث حسن	۱۵۰
ضعیف اور موضوع احادیث	۱۵۱
صحیح لعینہٖ اور صحیح لغیرہٖ	۱۵۲
حسن لعینہٖ اور حسن لغیرہٖ	۱۵۳
تواتر کے درجات	۱۵۴
حدیث مشہور	۱۵۹
خبرِ واحد	۱۵۹
مرسل حدیث	۱۶۳
منقطع حدیث	۱۶۴
معضل حدیث	۱۶۵
مدلّس حدیث	۱۶۵
معلل حدیث	۱۶۶
شاذ حدیث	۱۶۶

منکر حدیث ۱۶۷
متروک حدیث ۱۶۷
موضوع احادیث ۱۶۷
موضوع احادیث کی تخلیق کے اسباب ۱۷۰
سوال و جواب ۱۷۴

پانچواں خطبہ:

علم اسناد ورجال

صحابہ کرام اور سند کا اہتمام ۱۸۴
سند کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ ۱۸۶
احادیث کی روایت باللفظ کا اہتمام ۱۸۹
کیا روایت بالمعنی جائز ہے؟ ۱۹۲
علم طبقات اور علم رجال ۱۹۵
طبقات پر اہم کتابیں ۱۹۹

چھٹا خطبہ:

جرح وتعدیل

جرح وتعدیل کی قرآنی اساس ۲۱۱
صحابہ کرام اور جرح کی روایت ۲۱۳
اسناد کی پابندی کی اسلامی روایت ۲۱۸
راویوں کے طبقات ۲۲۰
کبار تابعین کا زمانہ ۲۲۲
طبقات رواۃ کی افادیت ۲۲۳
علم رجال کی شاخیں ۲۲۶
جرح وتعدیل اور حسن ظن ۲۳۷
احادیث کی گنتی کا مسئلہ ۲۴۰

جرح وتعدیل کے مشہور ائمہ ۲۴۳
ائمہ جرح وتعدیل کے درجات ۲۴۶
سوال وجواب ۲۴۸

ساتواں خطبہ:

تدوین حدیث
کیا رسول اللہ ﷺ نے احادیث لکھنے سے منع فرمایا؟ ۲۶۷
تدوین حدیث حضورؐ کی حیات مبارکہ میں ۲۶۸
تدوین حدیث صحابہ کرامؓ کے دور میں ۲۷۶
تدوین حدیث تابعین کے دور میں ۲۷۸
تدوین حدیث تبع تابعین کے دور میں ۲۸۰
تدوین حدیث تیسری صدی ہجری میں ۲۸۱
سوال وجواب ۲۸۴

آٹھواں خطبہ:

رحلة اور محدثین کی خدمات
القاب محدثین ۲۹۱
رحلہ ۲۹۴
علو اسناد اور نزول اسناد ۲۹۵
علم حدیث کے لئے صحابہؓ کے سفر ۲۹۷
علم حدیث کے لئے تابعین کے سفر ۲۹۹
علم حدیث کے لئے تبع تابعین کے سفر ۳۰۵
اسفار محدثین کے مقاصد ۳۰۵
علم حدیث کے لئے سفر کرنے کا طریقہ ۳۰۸
علم حدیث کے لئے سفر کے آداب ۳۰۹
حصول علم حدیث کے لئے محدثین کی قربانیاں ۳۱۲

نواں خطبہ:

سوال وجواب ۳۱۹

علوم حدیث

علم حدیث کا آغاز اور ارتقاء ۳۲۷

علم حدیث کے موضوعات ۳۲۸

معرفت صحابہ ۳۲۸

صحابی کی تعریف ۳۲۹

فضیلت کے لحاظ سے صحابہ کے درجات ۳۳۰

طبقات صحابہ کرامؓ ۳۳۴

کبار صحابہؓ ۳۳۵

اوساط صحابہؓ ۳۳۵

صغار صحابہؓ ۳۳۶

صحابہ کرامؓ کی کل تعداد ۳۳۷

تابعی کی تعریف ۳۴۱

طبقات تابعین ۳۴۲

تابعین کے درجات ۳۴۳

تابعی اور تبع تابعی کا تعین ۳۴۶

ضعیف حدیث پر عمل ۳۵۰

علل حدیث ۳۵۶

علم حدیث کے آداب ۳۵۷

درس حدیث کی اقسام ۳۵۷

احادیث میں تعارض ۳۵۹

علم ناسخ اور منسوخ ۳۶۳

اسباب ورود حدیث ۳۶۵

دسواں خطبہ:

کتب حدیث — شروح حدیث

موطا امام مالکؒ	۳۷۱
مُصنّف عبدالرزاق	۳۸۱
مسند امام احمد بن حنبلؒ	۳۸۳
الجامع الصحیح، امام بخاریؒ	۳۸۶
صحیح مسلم	۳۹۱
سُنن ابوداوٗد	۳۹۳
جامع ترمذی	۳۹۴
سُنَنِ نسائی	۳۹۸
سنن ابن ماجہ	۳۹۹
سوال و جواب	۴۰۲

گیارھواں خطبہ:

برصغیر میں علم حدیث

برصغیر میں علم حدیث کا پہلا دور	۴۱۵
برصغیر میں علم حدیث کا دوسرا دور	۴۲۰
برصغیر میں علم حدیث کا تیسرا دور	۴۲۰
شیخ عبدالحق محدث دہلوی	۴۲۱
شاہ ولی اللہ محدث دہلوی	۴۲۴
شاہ عبدالعزیزؒ	۴۲۷
حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی	۴۲۹
علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری	۴۳۰
مولانا رشید احمد گنگوہی اور ان کے تلامذہ	۴۳۱
مولانا انور شاہ کشمیری	۴۳۲

فرنگی محلی علماء ۴۳۳
نواب صدیق حسن خان ۴۳۴
دائرۃ المعارف العثمانیہ ۴۳۵
سوال وجواب ۴۳۷

بارھواں خطبہ:

علوم حدیث — دورِ جدید میں

مستشرقین کی خدمات ۴۴۳
تاریخ حدیث پر ہونے والا کام ۴۴۵
مخطوطات ۴۴۷
علم حدیث پر نئے علوم کی روشنی میں کام ۴۴۹
احادیث میں سابقہ کتب کا ذکر ۴۵۵
نئے انداز سے کام کرنے کی راہیں ۴۵۶
تدوین حدیث غیر مسلموں کے لئے ۴۵۸
علم حدیث کی کمپیوٹرائزیشن ۴۵۹
انکار حدیث کا مقابلہ ۴۶۱

☆☆☆

پیش لفظ

قبل ازیں محاضرات قرآنی کے عنوان سے علوم قرآن، تاریخ قرآن مجید، اور تفسیر سے متعلق موضوعات پر بارہ خطبات پر مبنی ایک جلد طلبہ علوم قرآنی کی خدمت میں پیش کی جاچکی ہے۔ زیر نظر جلد اسی سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ اس میں حدیث، علوم حدیث، تاریخ تدوین حدیث اور مناہج محدثین سے متعلق موضوعات پر بارہ خطبات پیش خدمت ہیں۔

یہ خطبات ادارہ ''الھدیٰ'' کے تعاون سے ادارہ الھدیٰ ہی کے اسلام آباد مرکز کے وسیع ہال میں دیئے گئے۔ شرکاء میں راولپنڈی اور اسلام آباد کی بہت سی مُدرسات قرآن کے علاوہ الھدیٰ سے وابستہ خواتین اہل علم کی بڑی تعداد شامل تھی۔ خطبات کا آغاز ۷ اکتوبر، ۲۰۰۳ بروز پیر ہوا اور درمیان میں اتوار کا دن نکال کر ۱۹ اکتوبر ۲۰۰۳ تک مسلسل بارہ روز یہ سلسلہ جاری رہا۔ خواتین اسلام کی کثیر تعداد نے شرکت فرما کر مقرر کو عزت بخشی۔ علوم حدیث، رجال، جرح و تعدیل، حدیث کی اقسام اور ان کے احکام جیسے دقیق اور فنی مباحث کو شریک خواتین نے بڑی دلچسپی اور توجہ کے ساتھ سنا۔ ان کی اس دلچسپی سے اندازہ ہوا کہ خواتین کے دیندار تعلیم یافتہ طبقے میں دینی تخصصات کی کس قدر ضرورت اور کتنی شدید طلب موجود ہے۔

محاضرات قرآنی کی طرح ان محاضرات کی اصل مخاطب بھی وہ خواتین اہل علم ہیں جو قرآن مجید کے درس و تدریس میں مصروف ہیں۔ فہم قرآن اور تفسیر قرآن کے لئے سیرت وسنت کی ضرورت و اہمیت سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں ہے۔ مُدرسات قرآن کو علوم سیرت و حدیث کی اہمیت سے باخبر کرانا اور علم حدیث کی طلب اور شوق پیدا کرنا ہی ان خطبات کا اصل مقصد تھا جو

الحمداللہ بڑی حدتک پوراہوتامحسوس ہوا۔خواتین کی ایک بڑی تعداد نے علم حدیث میں تخصص کے حصول کا عزم ظاہرکیا۔ایک باہمت خاتون نے اپنے کم سن بچے یحیی کو(یحیی بن معین، یحیی بن سعیداور یحیی بن یحیی جیسے ائمہ حدیث کا بار بارتذکرہ سن کر) حدیث کا عالم بنانے فیصلہ کیا۔اللہ تعالیٰ ان کےاس بابرکت ارادےکوپایہ تکمیل تک پہنچائے۔

محاضرات حدیث کا یہ سلسلہ مختصرنوٹس کی مدد سے زبانی ہی دیا گیا تھا۔ان کوصوتی تسـجیـل سے صفحہ قرطاس پرمنتقل کرنے اورکمپوزکرنے کا کام ذاتی دلچسپی،علم دوستی اورمحبت کے جذبے سے میرے عزیز دوست جناب احسان الحق حقانی نے کیا۔انھوں نے یہ تمام خطبات ٹیپ ریکارڈر سے سن کر براہ راست کمپوز کردیے۔اوراتنی حیرت انگیز تیزی اورصحت کے ساتھ یہ کام کیا کہ کہیں کہیں ناموں کی اصلاح کے علاوہ کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔اللہ تعالیٰ عزیز موصوف کواس کام کاصلہ عطافرمائے۔

محاضرات قرآنی کےکمزورپہلوؤں کے بارے میں جوگذارشات محاضرات قرآنی کے پیش لفظ میں کی گئی تھیں وہ محاضرات حدیث پربھی صادق آتی ہیں۔ان کو یہاں دہرانا غیرضروری معلوم ہوتا ہے۔ان خطبات میں جوجوکمزوریاں ہیں وہ صرف راقم سطورکی کم علمی، بے مائیگی اورکم ہمتی کی وجہ سے ہیں۔اللہ تعالیٰ سے دعاہے کہ وہ ان کمزوریوں سے درگذرفرمائے۔

میں جناب سید قاسم محمود کاشکرگزارہوں جن کےتوسط اورشفاعت حسنہ کی وجہ سے یہ کتاب بھی ''الفیصل'' کی طرف سےشائع ہورہی ہے۔

ڈاکٹرمحمود احمد غازی
اسلام آباد

۱۷ربیع الاول ۱۴۲۵ھ
۸مئی ۲۰۰۴

پہلا خطبہ

علم حدیث: ایک تعارف

پیر، 6 اکتوبر 2003

علم حدیث: ایک تعارف

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم وعلی اله واصحابه اجمعین

سب سے پہلے میں دل کی گہرائیوں سے ادارہ الہدیٰ کا شکرگزار ہوں، جنہوں نے مجھے یہ عزت بخشی اور یہ موقع عنایت فرمایا کہ حدیث نبوی اور سنت رسول ﷺ کے بارے میں یہ گزارشات آپ کی خدمت میں پیش کرسکوں۔

یہ خطبات، جن کی تعداد انشاءاللہ بارہ ہوگی، علم حدیث کے مختلف پہلوؤں سے بحث کریں گے۔ اس میں علم حدیث کے فنی مباحث پر بھی گفتگو ہوگی، علم حدیث کی تاریخ پر بھی گفتگو ہوگی، اور محدثین کرام نے احادیث رسول کو جمع کرنے، فراہم کرنے اور ان کا مطالعہ اور تشریح وتفسیر کرنے میں جو خدمات انجام دی ہیں، ان خدمات کا بھی اختصار کے ساتھ جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔

علم حدیث کا تعارف

آج کی گفتگو کا عنوان ہے علم حدیث: ایک تعارف۔ علم حدیث کے تعارف کی ضرورت اس لئے پیش آتی ہے کہ عموماً ہر مسلمان حدیث رسولؐ سے تو واقف ہوتا ہے، اس کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کیا ہے؟ اور اسلام میں حدیث کی اہمیت کیا ہے؟ لیکن بہت سے حضرات کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ فنی اعتبار سے علم حدیث کا کیا مطلب ہے؟ حدیث اور اُس سے ملتی جلتی اصطلاحات کا مفہوم کیا ہے؟ ان اصطلاحات کا استعمال اہل علم کے یہاں کن کن معانی میں ہوا ہے؟ یہ اور اس قسم کی بہت سی فنی تفصیلات ایسی ہیں جن سے بہت سے لوگ واقف نہیں

ہیں۔اس عدم واقفیت کے باعث بہت سے مسائل اور خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔قرآن مجید کی تشریح وتفسیر کا سوال ہو، فقہی احکام اور شریعت کے مسائل کا معاملہ ہو، یا شریعت کے احکام میں ترتیب اور باہمی ربط کا سوال ہو، ان سب چیزوں کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے علم حدیث سے فنی واقفیت بقدرِ ضرورت لازمی ہے۔

ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآن مجید ایک متعین کتاب ہے۔ پورا قرآن مجید اس کتاب کے اندر لکھا ہوا ہے۔اس سے باہر قرآن کا کوئی وجود نہیں ہے اور سارے کا سارا قرآن اس کتاب کے اندر سما گیا ہے۔لیکن حدیث یا سنت کے بارے میں ایسی کوئی ایک کتاب موجود نہیں ہے جس کے بارہ میں کہا جاسکے کہ حدیث یا سنت پوری کی پوری اس کتاب میں موجود ہے۔

احادیث کی تاریخ، تدوین اور روایت ودرایت کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔خود احادیث کے بہت سے مجموعے ابتدائی صدیوں سے متداول چلے آرہے ہیں۔ بعد کی صدیوں میں مرتب ہونے والے بھی بہت سے مجموعے ملتے ہیں جن میں بہت سی احادیث مختلف موضوعات پر مختلف مقاصد کے لئے جمع کی گئی ہیں۔ان سب کتابوں سے سنت کا پتہ چلتا ہے۔ اس لئے جب تک اسلامیات کے طلبہ کو بالعموم اور قرآن مجید کے طلبہ کو بالخصوص اچھی طرح سے یہ معلوم نہ ہو کہ حدیث اور سنت کس کو کہتے ہیں۔حدیث کی جو کتابیں ہمارے سامنے ہیں ان سے استفادہ کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ حدیث کی کسی کتاب میں اگر کوئی حدیث لکھی ہوئی ہے تو اس کی روشنی میں قرآن پاک کو کیسے سمجھا جائے؟ جب تک ان سب امور سے گہری واقفیت نہ ہو اس وقت تک قرآن پاک کو کما حقہ سمجھنا بہت مشکل ہے۔ان تمام امور کو جاننے اور سمجھنے کے تفصیلی قواعد اور ضوابط مقرر ہیں جن پر گزشتہ تیرہ سو سال سے لوگ عمل کرتے چلے آرہے ہیں اور قرآن مجید اور ارشادات رسول کو ان قواعد وضوابط کی روشنی میں سمجھ رہے ہیں۔

یہ سمجھنا کہ قرآن مجید اور سنت کسی خلاء میں پائے جاتے ہیں اور بغیر کسی تسلسل کے آج جس کا جو جی چاہے، وہی معنی قرآن مجید کی آیات اور الفاظ کو پہنا دے، یہ تصور درست نہیں ہے۔قرآن مجید ایک تسلسل کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے صحابہ کرام کو اس کے معانی ومطالب سمجھائے۔ صحابہ کرامؓ نے وہی معانی ومطالب تابعین کو سمجھائے اور اس طرح نسلاً بعد نسلٍ ایک طبقہ کے بعد دوسرا طبقہ اور دوسرے کے بعد تیسرا طبقہ اس کو سیکھتا گیا اور اس طرح یہ

رہنمائی ہم تک پہنچی ہے۔اس لئے ماضی اور حال میں خدانخواستہ اگر کوئی خلا پیدا ہو گیا، یا ہماری فہم میں کوئی ایسا خلل آ گیا کہ جس میں ماضی سے ہمارا رشتہ کٹ جائے تو پھر قرآن مجید کے فہم میں بڑی غلطیاں پیدا ہو جانے کا امکان ہے۔ ماضی قریب میں خود ہمارے ملک میں بہت سی گمراہیاں اس لئے پیدا ہوئیں کہ بعض لوگوں نے سنت رسولؐ کے اس تسلسل کو، احادیث کے اس پورے علم اور فن کو اور قرآن مجید کی تعبیر و تشریح کے ان سارے اصولوں کو نظر انداز کر کے صرف اپنی عربی زبان دانی اور مجرد اپنی فہم کی مدد سے قرآن کو سمجھنے کی کوشش کی۔اس کے نتیجے میں بہت سی خرابیاں اور کمزوریاں پیدا ہوئیں۔اس لئے قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے علم حدیث سے واقفیت ناگزیر ہے۔

علم حدیث کی ضرورت اور اہمیت پر تفصیلی گفتگو بعد میں ہوگی۔لیکن اس ابتدائی تمہیدی گزارش سے یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ علوم اسلامیہ میں بالعموم اور قرآن مجید کو سمجھنے میں بالخصوص علم حدیث کی اہمیت کتنی ہے۔

حدیث کے لغوی معنی

لفظ 'حدیث'، جس کو اس خاص فن کی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، عربی زبان میں بہت سے معانی اور مطالب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔عربی زبان میں حدیث کے معنی گفتگو کے بھی ہیں۔حدیث کے معنی نئی بات کے بھی ہیں اور حدیث کے معنی کسی اہم اور قابل ذکر واقعہ کے بھی ہیں۔نئی چیز، نئی بات، اہم اور قابل ذکر واقعہ، کوئی گفتگو یا کوئی کلام، اس کو عربی زبان میں حدیث کہتے ہیں۔آپ نے رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مشہور ارشاد سنا ہوگا جس میں آپؐ نے فرمایا 'خَیرُ الحدیثِ کتابُ الله'۔ایک جگہ ہے 'اَحسنُ الحدیثِ کتابُ الله'۔یعنی سب سے اچھی گفتگو، سب سے اچھا کلام اللہ کا کلام ہے۔گویا حدیث اور کلام دونوں بعض دفعہ مترادف کے طور پر بھی استعمال ہوتے ہیں۔

جاہلیت کے زمانے میں عربوں میں آپس میں جنگیں ہوتی رہتی تھیں اور آپس میں اختلافات بھی ہوتے رہتے تھے۔جب ایک قبیلے کی دوسرے قبیلے سے جنگ ہوتی تھی، تو جیتنے والا قبیلہ اپنی فتح کو ایک تاریخی جشن کے طور پر یاد رکھتا تھا۔اس کی تفصیلات قبیلے کے خطیبوں، شاعروں اور عام لوگوں میں افتخار کے ساتھ محفوظ رکھی جاتی تھیں۔ان واقعات کو اَیّامُ العرب کے

نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ یعنی عرب کے نمایاں یا تاریخی یا قابل ذکر دن۔ ان ایام مشہورہ کو احادیث بھی کہا جاتا تھا۔ احادیث العرب؛ یعنی وہ تاریخی واقعات جو کسی قبیلے کی تاریخ میں قابل ذکر ہیں اور قبیلہ اظہار فخر کے طور پر اس کو بیان کرتا تھا۔

احادیث کا لفظ ''اُحدُوثہ'' کی جمع ہے۔ لیکن محدثین کے ہاں ابتداء ہی سے عام رواج یہ رہا ہے کہ حدیث کی جمع احادیث استعمال کی جارہی ہے۔ اصل لغت کے اعتبار سے احادیث جمع ہے احـــدوثــہ کی، اح دوث ہ، یعنی کوئی خاص بات یا کوئی ایسی نمایاں چیز یا Novel چیز، جس کو لوگ یاد رکھیں۔ اس کی جمع احادیث ہے۔

قرآن مجید میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ربانی ہے: فَجَعَلْنٰاهُم اَحادَيثَ و مزّقْناهُم كُلَّ مُمَزّق ، ہم نے انہیں بھولے بسرے قصے بنادیا۔ گویا احادیث کے معنی کسی تاریخی واقعہ اور تاریخی قصے کے بھی آتے ہیں۔ حدیث کے معنی نئی چیز کے بھی آتے ہیں۔ آپ نے عربی زبان میں پڑھا ہوگا کہ حديث عهد بالاسلام، نیا نیا اسلام میں داخل ہوا ہے۔ تو حدیث گویا قدیم کے مقابلہ میں نئی بات کو کہیں گے۔ یہ قدیم کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات قدیم ہے۔ ہمشہ سے ہے، ہمیشہ رہے گی۔ ازلی اور ابدی ہے۔ اس لئے اس کا کلام بھی ازلی اور ابدی ہے۔ قرآن مجید کلام قدیم ہے۔ اور اگر وہ کلام قدیم ہے تو گویا اس کے سیاق وسباق میں حدیث رسول کو کلام حدیث یعنی نیا کلام قرار دے دیا گیا۔ دونوں وحی الٰہی ہیں۔ دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ ایک کلام قدیم ہے جو قدیم سے چلا آرہا ہے۔ ایک کلام نَو ہے، جو رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے بعد، آپؐ کے زمانہ حیات میں آپ کے ذریعے انسانوں تک پہنچا۔ اس لئے بھی علم حدیث کو حدیث کہا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں حدیث کا لفظ لغوی معنی میں مختلف مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید کے لئے بھی استعمال ہوا ہے؛ فَلياْتوا بِحديثٍ مِن مثلِه۔ اس جیسی ایک حدیث، یا اس جیسا ایک کلام، یا اس جیسی گفتگو بنا کر لے آؤ۔ یہاں حدیث کا لفظ کلام اور گفتگو کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح سے خود حدیث پاک میں لفظ حدیث لغوی معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔

تاہم جب یہ لفظ یعنی علم حدیث ایک فنی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔تو اس سے مراد وہ تمام چیزیں یا وہ تمام امور ہوتے ہیں جن کا مقصد رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی، آپؐ کے افعال اور آپ کے احوال کی تحقیق کرنا ہے۔علامہ بدرالدین عینی ایک مشہور محدث ہیں، صحیح بخاری کے شارح بھی ہیں اور مشہور فقیہ بھی ہیں۔انہوں نے علم حدیث کی تعریف کی ہے کہ هُوَ عِلم يُعرَفُ بِهٖ أقوالُ رَسول اللهﷺ وافعالُهٗ واحوالُهٗ؛ یعنی علم حدیث وہ علم ہے جس کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کے اقوال، آپؐ کے افعال اور آپؐ کے احوال معلوم کئے جائیں۔

علم حدیث کی تاریخ میں محدثین کے درمیان شروع سے حدیث کی اصطلاحی تعریف کے بارہ میں ایک اختلاف چلا آرہا ہے۔ اور وہ اختلاف یہ ہے کہ کیا صرف رسول اللہ ﷺ کے اقوال، افعال اور احوال کا نام حدیث ہے یا صحابہ کرامؓ اور تابعین کے اقوال، افعال اور احوال کا نام بھی حدیث ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ صحابہ کرام کے اقوال اور افعال واحوال تو حدیث میں شامل ہیں لیکن تابعین کے اقوال، افعال اور احوال حدیث کے مفہوم میں شامل نہیں ہیں۔ کچھ اور حضرات کا کہنا ہے کہ تابعین کے اقوال، افعال اور احوال بھی حدیث میں شامل ہیں۔اس اعتبار سے علم حدیث کی تعریف میں تھوڑا سا فرق واقع ہو جائے گا۔ جو حضرات صرف رسول اللہ ﷺ کے اقوال، افعال اور احوال کو حدیث قرار دیتے ہیں۔ وہ اس کی وہ تعریف کریں گے جو ابھی میں نے عرض کی۔ جو لوگ صحابہ اور تابعین کے اقوال، افعال اور احوال کو بھی حدیث کے مفہوم میں شامل قرار دیں گے وہ اس کی تعریف میں صحابہ اور تابعین کے الفاظ بھی شامل کر دیں گے۔

اس اختلاف سے یہ نہ سمجھئے گا کہ اس سے علم حدیث کے ذخیرہ پر کوئی فرق پڑتا ہے۔علم حدیث کا ذخیرہ وہی ہے، چاہے آپ یہ تعریف اختیار کریں یا وہ تعریف اختیار کریں یا کوئی تیسری تعریف اپنائیں۔اس لئے کہ جو حضرات صحابہ کرام کے ارشادات اور اقوال کو بھی حدیث قرار دیتے ہیں، وہ ان کو اس لئے حدیث قرار دیتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کے ارشادات سے رسول اللہ ﷺ کے اقوال اور احوال کا پتہ چلتا ہے۔صحابہ کرام کے اجتماعی طرز عمل سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ

ﷺ کا طرزِ عمل کیا تھا۔ صحابہ کرامؓ کے رویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا رویہ کیا تھا۔ مثال کے طور پر سیّدنا عبداللہ بن عمرؓ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ وہ کوئی کام سنت رسولؐ سے ہٹ کر نہیں کیا کرتے تھے۔ ہر کام سو فیصد اُسی طرح کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے جس طرح رسول اللہ ﷺ نے کیا ہو۔ چاہے آپؐ نے وہ کام بطور سنت کے کیا ہو یا عادت کے طور پر، یا بطور ذاتی پسند ناپسند کے کیا ہو، جس چیز کا دین یا شریعت سے تعلق نہ بھی ہو اس کو بھی حضرت عبداللہ بن عمرؓ اسی طرح کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اب حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا اپنا فعل اس اعتبار سے تو اُن کا اپنا فعل ہے کہ ایک صحابیؓ کا فعل ہے۔ لیکن اس سے ضرور یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی خاص معاملہ میں کیا رویّہ اختیار فرمایا ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے رویہ سے حضورؐ کے رویہ کی بالواسطہ نشاندہی ہوتی ہے تو اس مفہوم کے اعتبار سے صحابہ کرام کے اقوال، افعال اور احوال بھی حدیث کا حصہ ہوجائیں گے۔ یہی کیفیت تابعین کی ہے کہ تابعین میں ہزاروں انسان اور ہزاروں مقدس لوگ ایسے تھے کہ جنہوں نے علم حدیث کی خدمت کی۔ لیکن ایسے بھی تھے جن کا علم حدیث سے زیادہ اعتنا نہیں تھا۔ وہ زندگی کی اور سرگرمیوں میں اپنے وقت کو لگاتے تھے۔ لیکن ان میں بہت سوں کے رویّے اور طرزِ عمل سے صحابہ کرامؓ کے طرزِ عمل کی نشاندہی ہوتی تھی۔ صحابہ کرامؓ کے طرزِ عمل سے رسول اللہ ﷺ کے طرزِ عمل کی نشاندہی ہوتی تھی۔ اس لئے علم حدیث کی تعریف میں یہ دونوں چیزیں بعض حضرات نے شامل کی ہیں۔

حدیث کی تعریف

یہ تو علم حدیث کی تعریف ہوئی، خود حدیث کی تعریف کیا ہے؟ جس کا علم، علمِ حدیث کہلاتا ہے۔ حدیث کی مختصر ترین اور جامع ترین تعریف یہ ہے جو ایک بڑے محدث نے کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کُلُ ما اُضیفَ اِلَی النبی علیه الصلوٰۃ والسلام، فَهوَ حدیث۔ ہر وہ چیز جو رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے نسبت رکھتی ہے وہ حدیث ہے اور علم حدیث میں شامل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے کون سی بات کیسے ارشاد فرمائی، حضورؐ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کوئی فعل کیسے فرمایا، آپ کا طرزِ عمل کیا تھا، آپ کی شخصیت، ذات مبارکہ، ہر چیز جس کی نسبت حضورؐ کی ذات گرامی سے ہے وہ حدیث ہے۔

یہ حدیث کی مختصر ترین تعریف ہے۔ اس میں وہ چیزیں بھی شامل ہیں جن کی حضورﷺ کی ذات گرامی سے نسبت صحیح ہے اور وہ روایات بھی شامل ہیں جن کی نسبت حضورؐ کی ذات مبارک سے کمزور ہے، اور وہ روایت بھی شامل ہے جس کی نسبت حضورؐ سے، اہل علم کی نظر میں، درست نہیں ہے۔ بہر حال جو امر بھی آپؐ کی ذات گرامی سے منسوب ہوگیا، وہ حدیث میں شامل ہوگیا۔ پھر حدیث کے مختلف درجات ہیں جن پر ہم آگے چل کر بات کریں گے۔

علم حدیث کا موضوع

ہر علم کا ایک موضوع ہوتا ہے۔ معاشیات کا ایک موضوع ہے۔ سیاسیات کا ایک موضوع ہے، منطق اور فلسفہ کا ایک خاص موضوع ہے۔ ہر کتاب کا بھی ایک موضوع ہوتا ہے۔ محدثین نے یہ سوال اٹھایا کہ علم حدیث کا موضوع کیا ہے؟ علم حدیث کا موضوع محدثین نے ذاتُ الرسول علیہ السلام من حیث انہ رسول اللہ، یعنی رسول اللہﷺ کی ذات گرامی اس حیثیت میں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ اس حیثیت سے کہ وہ اللہ کے فرستادہ ہیں، یہ علم حدیث کا موضوع ہے۔

بعض اہل علم کو اس رائے میں تامل ہوا کہ رسول اللہﷺ کی ذات گرامی کو حدیث کا موضوع قرار دیں۔ انہوں نے کہا کہ کسی شخص کی ذات طب کا موضوع ہوسکتی ہے۔ میڈیکل سائنس کا موضوع ہوسکتی ہے، علم حدیث کا موضوع کیسے ہوگی؟ لیکن وہ یہ بھول گئے کہ اس تعریف کے اخیر میں یہ شرط لگائی گئی ہے کہ من حیث انہ رسول اللہ، یعنی اس حیثیت سے آپؐ کی ذات مبارک کا مطالعہ کیا جائے کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ کے رسول ہونے کی حیثیت میں آپؐ کی ذات گرامی کا مطالعہ علم طب کا نہیں بلکہ علم حدیث کا موضوع ہے۔

بعض حضرات نے علم حدیث کا موضوع تھوڑا سا ہٹ کر قرار دیا ہے۔ اس کا مفہوم بھی تقریباً وہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ المرویات الحدیثیۃ من حیث الاتصال والانقطاع، وہ تمام روایات و مرویات (جو حضورؐ کی ذات گرامی سے منسوب ہیں) حدیث کہلاتی ہیں، اس اعتبار سے کہ ان کی سند رسول اللہﷺ تک براہ راست پہنچتی ہے یا درمیان میں کوئی انقطاع واقع ہوا ہے۔ گویا بالواسطہ ذات رسالت مآب تک پہنچے یا بلا واسطہ ذات رسالت مآبؐ تک پہنچے۔ دونوں صورتوں میں علم حدیث کا موضوع رسول اللہﷺ کی ذات گرامی بنتی ہے۔

اصطلاحات

آپؐ نے حدیث سے متعلق لٹریچر میں کئی الفاظ سنے ہوں گے۔ حدیث، سنت، اثر، خبر۔ یہ الفاظ الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں یا ان کا ایک مفہوم ہے؟ اس کے بارے میں محدثین میں ہمیشہ گفتگو رہی ہے۔ اور اس موضوع پر محدثین نے تفصیل سے کلام کیا ہے۔ لیکن آگے بڑھنے سے پہلے دو باتیں یاد رکھئے۔

پہلی بات تو یہ یاد رکھنی چاہئے جو صرف علم حدیث ہی میں نہیں، بلکہ تفسیر میں، اصول فقہ میں، تاریخ میں اور ہر فن میں مشترک ہے کہ کسی چیز کی حقیقت یا تصور پہلے جنم لیتا ہے اور اس کے بارہ میں اصطلاحات ہمیشہ بعد میں پیدا ہوتی ہیں۔ حدیث، تفسیر اور فقہ وغیرہ علوم کی اصطلاحات رسول اللہﷺ کے دور مبارک میں پیدا نہیں ہوئیں۔ صحابہ کرامؓ کے دور میں بیشتر اصطلاحات پیدا نہیں ہوئیں۔ تابعین اور تبع تابعینؒ کے دور سے ہی اصطلاحات سامنے آنا شروع ہوئیں اور جب فنی اعتبار سے اسلامی علوم وفنون مدون ہوئے، اس وقت زیادہ اصطلاحات مرتب ہوئیں۔ اس لئے رسول اللہﷺ کے ارشادات مبارکہ میں بہت سے الفاظ ان اصطلاحی معنوں میں استعمال نہیں ہوئے جو بعد میں محدثین کے ہاں رائج ہوئے۔ اس لئے یہ حقیقت سامنے رہنی چاہئے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اگر ایک لفظ بعد میں محدثین یا مفسرین یا فقہا کے ہاں اصطلاحی لفظ بن گیا اور وہ حدیث رسولؐ میں بھی آیا ہے تو ضروری نہیں کہ وہ ان اصطلاحی معنوں میں آیا ہو۔ وہ لفظ کسی لغوی مفہوم میں بھی ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آپ نے دیکھا کہ 'فأتوا بحديث مثله'، اس میں حدیث کا لفظ غیر حدیث یا غیر قرآن کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ اس لئے کہ حدیث رسول کی یہ اصطلاح بعد کی ہے۔ قرآن پاک میں یہ اصطلاح نہیں تھی۔ یہ بات تمام اصطلاحات کے بارے میں یاد رکھیں۔

دوسری چیز یہ یاد رکھیں کہ عربی میں ایک کلیہ ہے کہ لا مشاحة في الاصطلاح۔ یعنی اصطلاح کے باب میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہئے۔ ہر شخص کو یا ہر گروہ کو اپنی الگ اصطلاحات متعین کرنے کا حق حاصل ہے۔ مثلاً آپ الہدیٰ میں یہ طے کریں کہ ہماری اصطلاح یہ ہے کہ اگر سفید لائٹ جلا دی جائے تو سب لوگ کلاس میں آجائیں اور ہری لائٹ جلا دی جائے تو کلاس سے

نکل جائیں، گویا ہری روشنی کا مطلب یہ ہے کہ کلاس ختم ہوگئی۔ کسی کو یہ اصطلاح اختیار کرنے پر اعتراض کرنے کی اجازت نہیں کہ آپ نے یہ اصطلاح کیوں رکھی؟ یا اس کا عکس کیوں نہیں رکھا؟ آپ کو یہ اختیار ہے کہ آپ اپنی سہولت کی خاطر جو اصطلاح چاہیں وہ اختیار کرلیں۔ آپ بطور اصطلاح کوئی لفظ مقرر کرلیں کہ جو باہر سے ٹیچر آئے گا اس کو معلم کہیں گے جو اندر کا ہوگا اس کو مدرس کہیں گے۔ اس میں کوئی اختلاف کی بات نہیں ہے۔

اس لئے اگر محدثین نے اپنی اپنی اصطلاحات اختیار کی ہیں تو اس میں کسی کو اعتراض کا یا شک وشبہ کا حق نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہر عالم یا غیر عالم کو اپنی اصطلاحات وضع کرنے کا حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مفسرین میں اور محدثین میں کچھ اصطلاحات کے بارے میں تو اتفاق رائے ہے۔ لیکن کچھ اصطلاحات کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض حضرات نے اس کا ایک مفہوم قرار دے کر اس کو استعمال کیا ہے اور بعض دوسرے حضرات نے کوئی اور مفہوم قرار دے کر استعمال کیا ہے جس کی تفصیل آگے وقتاً فوقتاً آپ کے سامنے آتی رہے گی۔

حدیث اور سنت کا فرق

سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ حدیث اور سنت میں محدثین نے کیا فرق رکھا ہے۔ حدیث اور سنت دو مشہور اصطلاحات ہیں۔ قرآن مجید میں سنت کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے اور حدیث کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ خود حدیث پاک میں حدیث کا لفظ بھی آیا ہے اور سنت کا لفظ بھی آیا ہے۔ حدیث اور سنت کے بارے میں علماء کے ایک گروہ کی تو رائے یہ ہے کہ یہ دونوں بالکل ایک مفہوم میں ہیں۔ جو حدیث ہے وہ سنت ہے اور جو سنت ہے وہ حدیث ہے۔ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک بڑی تعداد کی رائے یہ ہے۔

کچھ اور حضرات کا کہنا ہے کہ حدیث ایک عام چیز ہے اور سنت خاص ہے اور اس کا ایک حصہ ہے۔ حدیث تو ہر وہ چیز ہے جو رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک سے منسوب ہوگئی جس میں ضعیف احادیث بھی شامل ہیں اور موضوع احادیث بھی شامل ہیں، منکر اور شاذ احادیث بھی شامل ہیں جس کی تفصیل آگے آئے گی، اور سنت سے مراد وہ طریقہ ہے جو احادیث صحیحہ کی بنیاد پر ثابت ہوتا ہے، جو رسول اللہ ﷺ کا طے کیا ہوا طریقہ ہے جو آپ نے اپنی امت کو سکھایا، جو قرآن

پاک کے منشا اور معانی کی تفسیر وتشریح کرتا ہے اور جو دنیا میں قرآن پاک کے لائے ہوئے نظام کی عملی تشکیل کرتا ہے۔ اُس طریقہ خاص کا نام سنت ہے۔

سنت کی تعریف

پھر اگر سنت کی تعریف یہ ہو کہ وہ طریقہ جو رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے لئے قائم فرمایا، جس طریقے کو قائم فرمانے کے لئے رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، وہ طریقہ کیا صرف اور صرف رسول اللہ ﷺ کے طریقہ اور ارشادات سے ثابت ہوتا ہے، یا صحابہ کرامؓ کے ارشادات وافعال سے بھی ثابت ہوتا ہے؟ یا تابعین کے ارشادات سے بھی ثابت ہوتا ہے؟ جو اختلاف حدیث کی اصطلاحی تعریف کے بارہ میں تھا وہی اختلاف سنت کے بارے میں بھی ہے۔

امام مالکؒ، جو مشہور امام المحدثین ہیں اور امام الفقہا بھی ہیں۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ سنت میں رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرامؓ اور تابعین، ان تینوں کا طرز عمل اور ان تینوں کا طریقہ شامل ہے۔ آپ موطاء امام مالکؒ پڑھیں تو اُس میں بارہا، درجنوں نہیں، سینکڑوں مقامات پر امام مالکؒ نے ایک خاص عمل کو اپنی تحقیق میں سنت قرار دیا ہے اور دلیل دی ہے کہ فلاں صحابیؓ یہ طرز عمل اختیار کیا کرتے تھے۔ کبھی دلیل دی ہے کہ فلاں تابعی یہ کام کیا کرتے تھے۔ ایک جگہ لکھا کہ فلاں طرز عمل سنت ہے اس لئے کہ عبدالملک بن مروان کو میں نے یہ کام کرتے دیکھا۔ یہ امام مالکؒ کی رائے ہے۔

کچھ اور حضرات ہیں جو صرف رسول اللہ ﷺ کے طرز عمل اور طریقہ کار کو سنت قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک صحابہ کرامؓ کے طریقہ کار کو صحابہؓ کی سنت قرار دیا جائے گا۔ خلفائے راشدین کی سنت کو خلفائے راشدین کی سنت قرار دیا جائے گا، رسول اللہ ﷺ کی سنت قرار نہیں دیا جائے گا۔

کچھ دیگر حضرات کا کہنا یہ ہے کہ یہ دونوں اصطلاحات الگ الگ معنی رکھتی ہیں۔ علم حدیث کا الگ مفہوم ہے اور علم سنت کا بالکل الگ مفہوم ہے۔ سنت کی تعریف جن لوگوں نے حدیث سے الگ کی ہے وہ کہتے ہیں کہ طریقہ متبعہ کا نام سنت ہے یعنی وہ طریقہ جس کا اتباع کرنے کا حکم دیا گیا وہ سنت ہے۔

سنت کی اصطلاح اسلام سے پہلے سے چلی آرہی ہے اور حدیث کی اصطلاح اسلام نے دی ہے۔حدیث کا لفظ تو ان اصطلاحی معنوں میں اور اس مفہوم میں استعمال نہیں ہوتا تھا جو بعد میں اس لفظ کو دیا گیا۔لیکن سنت کا لفظ قریب قریب انہی معنوں میں اسلام سے پہلے سے چلا آرہا ہے۔اگر آپ نے جاہلی شاعری کا مطالعہ فرمایا ہو، تو جاہلی شاعروں میں سے ایک مشہور شاعر ہیں جو معلقات کے شاعروں میں سے ایک ہیں، لبید بن ربیعہ العامری، ایک شعر میں ان کا کہنا ہے کہ۔

مِن مَعشَرٍ سَنّت لهم ابأهم
وَ لِكُلِّ قوم سُنة و إمامُها

میرا تعلق اس گروہ سے ہے جن کے اباواجداد نے ایک سنت مقرر کی ہے اور ہر قوم کی ایک سنت یعنی طریقہ متبعہ ہوتا ہے اور امام ہوتا ہے۔یعنی میرے اباواجدادا تنے بڑے لیڈر تھے کہ ان کا طریقہ کار پورے عرب میں سنت بن گیا، اسلام سے پہلے کا طریقہ بن گیا۔(یہاں سنت کا لفظ آیا ہے جو اسلام سے پہلے اسی مفہوم میں استعمال ہوتا تھا۔)

جو حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ حدیث اور سنت کے دونوں الفاظ دو الگ الگ معانی میں استعمال ہوئے ہیں۔ان میں سے ایک مشہور محدث امام عبدالرحمٰن بن مہدی بھی ہیں۔وہ امام مالکؒ اور سفیان ثوری کے بارے میں کہتے ہیں، (یہ سفیان ثوری مشہور محدث ہیں، اپنے زمانے میں امیرالمومنین فی الحدیث کہلاتے تھے، یعنی حدیث میں مسلمانوں کے امیر۔صف اول کے اعلیٰ ترین، عظیم ترین اور متقی ترین محدثین میں سے گزرے ہیں، ان کے بارے میں عبدالرحمٰن بن مہدی نے کہا کہ) سفيان الثوری امام فی الحديث ،سفیان ثوری حدیث کے امام ہیں۔ والاوزاعی امام فی السنة ،اورامام اوزاعی، جو مشہور فقیہ ہیں، سنت میں امام ہیں وَ مالك امام فيهما اور مالک، جو موطاء کے مصنف ہیں، دونوں کے امام ہیں، سنت کے بھی امام ہیں اور حدیث کے بھی امام ہیں۔گویا انہوں نے ان دونوں کو بالکل الگ الگ مفاہیم میں سمجھا ہے۔

آپ نے حدیث کی اکثر کتابوں میں پڑھا ہوگا۔ایک محدث جب کوئی حدیث بیان کرتا ہے اور اس حدیث پر روایت کے بعد درایت کے نقطہ نظر سے بحث کرتا ہے، جس پر آگے چل کر ہم بات کریں گے، تو وہ یہ کہتا ہے کہ هذالحديث مخالف للقياس والسنة والاجماع،

اس حدیث کے ظاہر پر ہم اس لئے عمل نہیں کریں گے کہ یہ قیاس، سنت اور اجماع کے خلاف ہے۔ایک طرف حدیث ہے اور ایک طرف سنت ہے، گویا سنت اور حدیث کو وہ متعارض معنوں میں لے رہے ہیں۔ یہ مثالیں میں نے یہ ظاہر کرنے کے لئے دی ہیں کہ محدثین کا ایک گروہ حدیث اور سنت کو الگ الگ مفہوم میں سمجھتا ہے۔

قرآن مجید میں بھی سنت کا لفظ اللہ تعالیٰ کی سنت اور عادت کے لئے استعمال ہوا ہے۔ سنت الله في الذين خلوا من قبل ، یہ اللہ کی سنت ہے جو پہلے لوگوں کے زمانے سے چلی آرہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا جو خاص نظام ہے، جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، جس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی، جو اللہ کا اصول ہے وہ ہمیشہ ایک جیسا رہتا ہے۔ اللہ کے اس اصول اور اللہ کے اس طریقے کے لئے بھی قرآن مجید میں سنت کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

مدینہ منورہ کو بعض لوگ دارالسنۃ قرار دیا کرتے تھے۔ یعنی سنت کا گھر، جہاں سے ساری سنتیں نکلی ہیں۔ یقیناً مدینہ منورہ دارالسنۃ تھا۔ صحابہ کرامؓ جن کے پاس سنت کا علم تھا وہ مدینہ منورہ ہی میں رہتے تھے۔ مدینہ منورہ ہی سے سنت کے ذخائر نکلے ہیں۔ مدینہ منورہ ہی سے صحابہ کرامؓ دنیا کے گوشوں میں پھیلے، اس لئے مدینۃ السنۃ، مدینہ منورہ کا نام ہونا ایک بالکل فطری چیز ہے۔

حدیث، اثر اور خبر

حدیث اور سنت کے ساتھ ساتھ 'حدیث اور اثر' کی اصطلاح بھی استعمال ہوتی ہے، ا ثَ ر۔ اثر کے لفظی معنی تو نشان اور آثار قدم کے ہیں۔ یا کسی بھی چیز پر کسی اور چیز کا نشان پڑ جائے اس کو عربی زبان میں اثر کہتے ہیں اور تاثیر کے معنی کسی پر نشان ڈال دینا۔ آپ نے کسی چیز پر اپنے انگوٹھے کا نشان ڈال دیا۔ اس عمل کو عربی زبان میں تاثیر کہتے ہیں۔ اثر کا لفظ بھی علمائے اہل حدیث کی نظر میں دو معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ محدثین کی ایک جماعت ہے جو صرف صحابہ کرامؓ اور تابعین کے اقوال و فرمودات کے لئے آثار اور اثر کا لفظ استعمال کرتی ہے اور آثار صحابہ و تابعین کی اصطلاح اسی مفہوم میں ہے۔ ایک اور جماعت ہے جو اثر اور حدیث کو ایک ہی مفہوم میں سمجھتی ہے۔ اس کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے ارشادات، اقوال و افعال اور اعمال اور صحابہ

وتابعین ان سب کے اقوال وافعال واعمال کو حدیث بھی کہتے ہیں اور اثر بھی کہتے ہیں۔

علم حدیث کی اصطلاح میں ایک اصطلاح ہے 'مرفوع'۔ مرفوع کے لفظی معنی ہیں 'وہ چیز جس کو بلند کیا گیا ہو' جس کو اٹھایا گیا ہو، بلند شدہ، انگریزی میں **Exalted**۔ اصطلاح میں اس سے مراد وہ حدیث ہے جو رسول اللہ ﷺ تک پہنچتی ہے، جس میں راوی رسول اللہ ﷺ کا اسم مبارک لے کر صراحتاً اس حدیث کو آپ کی ذات مبارکہ سے منسوب کرتا ہے۔ اس کو مرفوع کہتے ہیں۔

اس کے مقابلہ میں دوسری اصطلاح ہے موقوف۔ یعنی ٹھہرا ہوا، جو رُک گیا ہو، انگریزی میں آپ **Halted** کہہ سکتے ہیں۔ یہ وہ روایت یا حدیث ہے جس کی نسبت صحابہ تک پہنچتی ہے، ان کے بعد آگے نسبت کوئی پیش قدمی نہیں کرتی۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ فلاں شخص نے مجھ سے بیان کیا، فلاں شخص سے فلاں نے بیان کیا، انہوں نے فلاں صحابیؓ کو یہ ارشاد فرماتے سنا اور پھر آگے وہ بات بیان ہوتی ہے۔ اس کے بعد آگے نہیں۔ اس بات کو موقوف کہتے ہیں جو صحابہ کرام پر جا کر رک جائے۔ جو لوگ حدیث اور اثر میں فرق کرتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ روایت اگر مرفوع ہو، رسول اللہ ﷺ کی ذات تک پہنچتی ہو تو اس کو حدیث کہا جائے گا اور اگر روایت صحابہ کرام یا تابعین پر موقوف ہو جائے تو اس کو اثر کہا جائے گا۔

یہی فرق ہے خبر اور حدیث کے درمیان۔ خبر کا لفظ بھی کتب حدیث میں کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ لغوی اعتبار سے خبر کا مطلب ہے اطلاع یا رپورٹ۔ ہر وہ اطلاع یا رپورٹ جو رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد، یا فعل یا کیفیت کے بارے میں اگر کسی نے دی، وہ اصطلاحاً خبر بھی کہلاتی ہے اور حدیث بھی کہلاتی ہے۔ یہ دونوں اصطلاحات **Inter-changeable** ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کے بدلے میں بھی استعمال ہوتی ہیں اور الگ الگ بھی استعمال ہوتی ہیں۔ یہ چار اصطلاحی الفاظ ہیں جن کو سمجھ لینا چاہئے یعنی حدیث، سنت، اثر اور خبر۔

اصطلاحات میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہئے۔ ہر بڑے محدث کا حق ہے کہ جو اصطلاح چاہے وضع کرے۔ لیکن جب ہم کسی اصطلاح کو استعمال کرنا چاہتے ہیں تو ہم پہلے یہ ضرور دیکھ لیں کہ ہم اس اصطلاح کو کس سیاق وسباق میں استعمال کر رہے ہیں اور کس مفہوم میں استعمال کر رہے ہیں۔ مثلاً ایک اصطلاح امام بخاریؒ کی ہے تو ہم امام بخاری کے سیاق وسباق میں امام بخاری کی اصطلاح کو استعمال کریں گے اور اپنی کوئی اصطلاح استعمال نہیں کریں گے۔ یہ

بات درست نہیں ہوگی کہ میں اپنی کوئی اصطلاح وضع کروں یا آپ اپنی کوئی اصطلاح وضع کریں اوراس کوامام بخاری کے سیاق وسباق میں استعمال کریں۔ وہ امام بخاری کے نقطہ نظر کی صحیح ترجمانی نہیں ہوگی۔اس لئے ان چاروں اصطلاحات کامفہوم پہلے سے ہی ذہن میں واضح ہونا چاہئے۔

علم حدیث؛ ایک بے مثال فن

علم حدیث جس کے بارے میں علم بھی دن بہ دن کم ہوتا جارہا ہےاورلوگوں کی دلچسپی بھی روز بروز گھٹ رہی ہے۔اس میں مہارتیں دن بدن محدود ہوتی چلی جارہی ہیں۔اس علم سے دلچسپی خود اسلامیات کے طلبہ کی محدود ہوتی چلی جارہی ہے۔ یہ انسانی تاریخ کا ایک انتہائی منفرداور بے مثال علمی کارنامہ ہے۔ یہ ایک ایسا بے نظیر علم ہے جس کی مثال پیش کرنے سے انسانی تاریخ قاصر ہے۔ اس پرتھوڑی سی گفتگوتو آگے چل کر ہوگی۔لیکن سردست اختصار کے ساتھ یہ ذہن میں رکھئے کہ انسانی تاریخ میں کوئی ایسا علم موجود نہیں ہے جس کا مقصد کسی ایک شخصیت کے اقوال وافعال کومحفوظ رکھنا اوراس کو ہرقسم کے شک وشبہ سے پاک کرکے اس طرح منقح کردینا ہو کہ پڑھنے والوں کوایسا یقین آجائے جیسا کہ آج سورج نکلنے کا یقین ہے۔ جتنی یہ بات یقینی ہے کہ اس وقت سورج نکلا ہوا ہے اتنا ہی اس بات کو یقینی بنادینا کہ یہ بات رسول اللہ ﷺ کے دہنِ مبارک سے نکلی کہ نہیں نکلی۔ یہ کاوش انسانی تاریخ میں اپنی نوعیت کی منفرد کاوش ہے۔ دنیا میں بڑی بڑی بڑی دینی شخصیتیں گزری ہیں۔آج بھی ایسی دینی شخصیتیں موجود ہیں اور تاریخ میں بھی موجود رہی ہیں جن کے پیروکاروں کی تعداد رسول اللہ ﷺ کے ماننے والوں سے زیادہ ہے۔حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جولوگ مانتے ہیں۔ان کی تعداد اُن سے بہت زیادہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کو مانتے ہیں۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ماننے والوں میں یہودی بھی شامل ہیں عیسائی بھی شامل ہیں اور مسلمان بھی شامل ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ماننے والوں میں یہودی، عیسائی اور مسلمان تینوں شامل ہیں۔لیکن ان میں سے کسی بھی جلیل القدر پیغمبر کے اقوال وافعال اور ارشادات کومحفوظ رکھنے کا ان کے ماننے والوں نے ایک لاکھواں اہتمام بھی نہیں کیا، ایک کروڑواں اہتمام بھی نہیں کیا جتنا اہتمام مسلمانوں نے رسول اکرمؐ کے ارشادات گرامی کومحفوظ کرنے کے لئے کیا۔اس پرآگے چل کرمزید تفصیل سے گفتگوہوگی۔نہ اس سے پہلے ایسے کسی فن کی کوئی مثال

ملتی ہے نہ آگے چل کر ایسی کوئی مثال دستیاب ہوئی ہے۔

انسانی عبقریت، یعنی انسانی Genius، کا اظہار دو طریقوں سے ہوتا ہے۔ یعنی کسی علم وفن میں انسان کی عبقریت کا اگر آپ جائزہ لیں تو دو انداز سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک انداز تو وہ ہے جس کو آپ تخلیقی عبقریت کہہ سکتے ہیں یعنی Creative Genius۔ تخلیقی عبقریت سے مراد یہ ہے کہ ایسی عبقریت کہ جس میں انسان اپنی عقل سے کام لے کر علوم وفنون کے میدان میں ایسے کارنامے انجام دے جو کسی اور انسان کی عقل میں نہ آئے ہوں اور انسانی عقل ان کو دیکھ کر حیران رہ جائے۔ مسلمانوں میں Creative Genius کا سب سے اعلیٰ نمونہ 'علم اصول الفقہ' ہے۔ اصول فقہ سے بڑھ کر کریٹیو جینئس کی مثال مسلمانوں میں نہیں ملتی۔ جینئس یا عبقریت کی ایک دوسری قسم بھی ہوتی ہے۔ جس کو ہم Accumulative Genius کہہ سکتے ہیں۔ یعنی معلومات اتنی کثرت سے اور اتنی وافر انداز سے فراہم کردی جائیں کہ انسانی عقل اس کی کثرت پر دنگ رہ جائے۔ علم حدیث مسلمانوں کی Accumulative Genius کا بے مثال نمونہ ہے۔ انسانی تاریخ میں کوئی فن ایسا نہیں ہے جس میں معلومات کے انبار، معلومات کے پہاڑ اور معلومات کے سمندر اس طرح جمع کئے گئے ہوں جس طرح علم حدیث میں جمع کئے گئے ہیں۔ آئندہ گیارہ خطبات میں آپ کو اس کا تھوڑا سا اندازہ ہو سکے گا۔

یہ وہ چیز ہے جس کا اعتراف ایک بڑے غیر مسلم مستشرق ڈاکٹر سپرینگر (Springer) نے کیا ہے۔ آپ نے اس شخص کا نام سنا ہوگا۔ یہ ایک جرمن مستشرق تھا۔ ہمارے برصغیر میں بھی کافی عرصہ رہا۔ اس نے علم حدیث پر کام کیا تھا اور جب اس نے فن رجال کا مطالعہ کیا، (فن رجال پر آگے چل کر گفتگو ہوگی، یعنی علم حدیث کے راویوں کا علم۔) تو وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ ایک شخصیت کے احوال اور اقوال کو یقینی بنانے اور محفوظ رکھنے کے لئے چھ لاکھ انسانوں کے حالات جمع کئے گئے۔ چھ لاکھ انسانوں کے حالات اس لئے جمع کئے گئے کہ وہ چھ لاکھ انسان بالواسطہ یا بلاواسطہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی کو محفوظ رکھنے کے عمل میں شریک تھے۔ اس کی مثال مسیحیت کی تاریخ میں، یہودیت کی تاریخ میں یا کسی بھی مذہب کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ عیسائیوں سے پوچھا جائے کہ آپ اپنی دو ہزار سالہ تاریخ میں ان شخصیتوں کے نام بتایئے جنھوں نے حضرت عیسی علیہ السلام کے اقوال کو محفوظ رکھا ہو یا ہم تک پہنچایا ہو تو شاید اول تو ان کی سمجھ میں نہیں

آئے گا کہ آپ کا سوال کیا ہے، اور اگر سمجھ میں آجائے تو پچیس تیس آدمیوں سے یا شاید پچاس چالیس آدمیوں سے زیادہ کے نام آپ کو نہ دے سکیں۔ مسلمانوں میں چھ لاکھ رواۃ کے نام اس وقت محفوظ اور موجود ہیں۔

ابھی میں ساتھ والے کمرے میں بیٹھا تھا تو یہاں جو کتابیں رکھی ہوئی ہیں وہ اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہیں۔ رجال کی ان کتابوں میں کئی لاکھ انسانوں کے حالات محفوظ ہیں۔ صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارکہ کو دیکھا۔ ان کی آنکھیں اس شرف سے مشرف ہوئیں اور ان کے کان اس اعزاز سے معزز ہوئے۔ اس لئے سب سے پہلے ان کے حالات جمع کرنے پر توجہ دی گئی۔ آج صحابہ کرام کے تذکرے پر جو کتابیں ہیں جن کی تعداد ایک دو نہیں بلکہ درجنوں میں ہے، ان میں کم وبیش بارہ سے پندرہ ہزار صحابہ کرام کے حالات محفوظ ہیں۔ اس کی کوئی مثال آج تک کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ اور اُس وقت بھی نہیں مل سکتی تھی۔ کہ کسی بڑے سے بڑے انسان کے ساتھیوں کا اور اس کے اصحاب کا تذکرہ جمع کیا گیا ہو اور بارہ پندرہ ہزار افراد کا تذکرہ اس لئے جمع کیا گیا ہو کہ یہ فلاں شخص کے اصحاب اور اس کے ساتھی ہیں اور اِن سے اُن کے بارے میں کوئی معلومات یا کوئی رہنمائی مل سکتی ہے۔ اس نقطہ نظر سے آپ جتنا غور کریں، تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ انسانی تاریخ کا ایک انتہائی منفرد علم ہے، جس کی کوئی مثال دنیا کی تاریخ میں نہ مذہبی علوم میں ملتی ہے اور نہ غیر مذہبی علوم کی تاریخ میں ملتی ہے۔

مذہبی علوم کی تاریخ میں ایسی مثالیں تو موجود ہیں کہ کسی مذہبی شخصیت کے ارشادات کے مجموعے مرتب ہوئے ہوں۔ آج بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعض ارشادات بائبل میں موجود ہیں۔ یہ چار انجیلیں جن کو عیسائی مستند انجیلیں مانتے ہیں، یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمریاں اور ارشادات کے مجموعے ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ ان کی تاریخی حیثیت کیا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ ان کی کوئی Authenticity ہے کہ نہیں، یہ بات بہرحال سب مانتے ہیں کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اقوال اور ارشادات کے کچھ مجموعے ہیں۔ لیکن ان مجموعوں کی مدد سے اگر آپ حضرت عیسیٰؑ کے اقوال وارشادات کی کوئی فہرست مرتب کریں تو دو سو ڈھائی سو سے زیادہ ارشادات کا مجموعہ نہیں ملے گا۔ سارے ارشادات ملا کر ان کی تعداد دو ڈھائی سو سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اس کے مقابلے میں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی جو صحابہ کرام نے جمع کئے ہیں ان

کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ مسند امام احمد کم وبیش پچاس ہزار احادیث کا مجموعہ ہے۔ جس میں سے اگر مکررات نکال دیئے جائیں تو تیس ہزار سے زیادہ احادیث اور اقوال رسولؐ اس میں دستیاب ہیں۔ کنز العمال جو ہمارے برصغیر کے مشہور محدث علامہ سیّد علی متقی ہندی کی تصنیف ہے، اس میں انہوں نے باون ہزار ارشادات نبویؐ جمع کئے ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطی، جنہوں نے یہ طے کیا کہ اس وقت تک جتنے مجموعے احادیث کے موجود ہیں ان سب کو جمع کر کے ساری احادیث ایک ہی کتاب میں جمع کردی جائیں۔ اس میں انہوں نے یہ تعداد ستر ہزار کے لگ بھگ پہنچائی اور وہ اس کام کو نامکمل چھوڑ کر رخصت ہوئے، مکمل نہیں کر پائے۔ ان کی کتاب 'جمع الجوامع' یا 'الجامع الکبیر' کے نام سے مشہور ہے۔

اس طرح سے جو بڑے بڑے مجموعے ہیں ان میں احادیث کی تعداد ساٹھ ہزار پینسٹھ ہزار، ستر ہزار تک دستیاب ہے، ان میں سے مکررات نکال دیئے جائیں تو اندازاً پچاس ہزار تک یہ ارشادات بنتے ہیں۔ اتنا بڑا مجموعہ دنیا میں کسی بھی انسان کے اقوال وارشادات کا، کسی مذہبی یا غیر مذہبی شخصیت کا موجود نہیں ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص کسی مذہبی یا دینی جذبہ سے بھی علم حدیث کو حاصل نہ کرنا چاہے، جو بڑے افسوس کی بات ہوگی، لیکن خالص علمی لحاظ سے بھی یہ مضمون اس کا متقاضی ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے اور دیکھا جائے کہ یہ منفرد واقعہ کیسے اور کیوں وجود میں آیا۔

صحت حدیث پر شکوک کی حقیقت

علم حدیث میں جو ذخیرہ سنت اور احادیثِ صحیحہ کا موجود ہے اس کی ثقاہت یعنی Authenticity کس درجہ کی ہے اس پر ایک الگ نشست اور گفتگو میں بحث کی جائے گی۔ لیکن اس غلط فہمی کو آج ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ذہنوں اور دلوں سے نکال دیجئے کہ علم حدیث کے ثبوت میں کسی بھی اعتبار سے شک وشبہ کی کوئی گنجائش پائی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں برصغیر میں بھی اور برصغیر سے باہر بھی ایسے کئی لوگ موجود ہیں جنہوں نے اردو، عربی، انگریزی، فارسی اور دیگر زبانوں میں علم حدیث کے بارہ میں شکوک وشبہات پر مشتمل کتابیں لکھی ہیں، جن کا مقصد ہی یہ ہے کہ علم حدیث کے بارے میں شکوک پیدا کئے جائیں اور مسلمانوں کا اس پر ایمان کمزور کر دیا جائے۔ اگر یہ لوگ بد نیتی سے ایسا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے، نیک نیتی سے

کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی غلطی کو درست کر دے۔ لیکن یہ بات یا تو پر لے درجہ کی غلط فہمی اور کم علمی ہے یا انتہائی بدترین قسم کی بددیانتی ہے جس میں علم حدیث کے بارے میں شک وشبہ کا اظہار کیا جائے۔

کسی بھی چیز کو محفوظ رکھنے کے جتنے طریقے ہو سکتے ہیں اور انسانی ذہن و دماغ میں آسکتے ہیں وہ سارے کے سارے سنت کو اور ارشادات رسول ﷺ کو محفوظ رکھنے کے لئے محدثین نے اور امت مسلمہ نے اختیار کئے اور ان سب ممکنہ طریقوں سے محفوظ ہو کر علم حدیث مرتب و منقح ہو کر ہم تک پہنچا ہے۔ دنیا کے کسی علم پر اتنے بڑے بڑے انسانی دماغوں نے اور اتنے غیر معمولی یادداشت رکھنے والے انسانوں نے مسلسل غور و خوض نہیں کیا جتنا علم حدیث پر غور و خوض ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے زبان مبارک سے نکلنے والے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف پر سینکڑوں پہلوؤں سے لاکھوں انسانوں نے غور کیا ہے اور یہ غور چودہ سو برس سے مسلسل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ ابھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ اس وقت بھی دنیا بھر میں جاری و ساری ہے۔ اور نئے نئے اہل علم تسلسل کے ساتھ نئے نئے راستے اور نئے نئے رجحانات علم حدیث پر غور کرنے کے لئے سامنے لا رہے ہیں۔ جن پر میں سب سے آخری خطبہ میں ان شاء اللہ گفتگو کروں گا۔

اس لئے سب سے پہلے تو یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ علم حدیث اسی طرح کا مستند علم ہے جیسے کوئی بھی انسانی علم مستند ہو سکتا ہے۔ اس علم کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کی سنت اور آپؐ کی احادیث مبارکہ کو جس طرح محفوظ کیا گیا وہ اسی طرح قطعی اور یقینی ہے جس طرح قرآن حکیم قطعی اور یقینی ہے۔ حدیث وسنت قرآن حکیم کی طرح صرف ایک فرق کے ساتھ قطعی اور یقینی ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ اللہ کی طرف سے ہیں اور احادیث کے الفاظ اللہ کی طرف سے نہیں ہیں۔ قرآن مجید ایک خاص ترتیب سے رسول اللہ ﷺ نے محفوظ کرایا اور احادیث کو حضورؐ نے اس ترتیب سے محفوظ نہیں کرایا۔ صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارک میں قرآن مجید کو زبانی یاد کر لیا اور احادیث کو بہت سے صحابہ نے اُس طرح سے زبانی یاد نہیں کیا۔ اس لئے کہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس ایک فرق کے ساتھ احادیث اور سنت اسی طرح مستند اور محفوظ ہیں جس طرح کہ قرآن مجید مستند اور محفوظ ہے۔

کتب حدیث کے بارے میں غلط فہمیوں کی حقیقت

بعض لوگ یہ کہتے ہیں، آپ نے بھی سنا ہوگا کہ اس وقت احادیث کے جتنے مجموعے ہیں یہ سب کے سب بعد میں لکھے گئے۔ صحیح بخاری تیسری صدی ہجری میں لکھی گئی، صحیح مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، یہ سارے مجموعے تیسری صدی ہجری کے مرتب شدہ ہیں۔ یہ لوگ اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ محدثین نے وہ قصے کہانیاں جو بازار میں مشہور ہوتی ہیں، ایک جگہ جمع کردیئے، مسلمانوں نے عقیدت مندی میں ان کو مان لیا اور اس کو بطور حدیث رسول ﷺ کے قبول کرلیا۔ یہ غلط فہمی کیوں پیدا ہوئی؟ کیسے پیدا ہوئی۔ اس پر تفصیل سے بات کریں گے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی غلط فہمی جس کی تائید میں بہت سی بے سروپا باتیں کی گئی ہیں ان میں سے کوئی ایک بات بھی درست نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا وہمی اور فرضی قسم کا خیال ہے جس کی نہ کوئی علمی بنیاد ہے نہ عقلی بنیاد ہے۔ علماء اسلام نے خاص طور سے بیسویں صدی میں بہت سے علمائے حدیث نے اس غلط فہمی کو ہمیشہ کے لئے دور کردیا ہے اور اس غلط فہمی کی اس طرح تردید کردی ہے کہ اس کے بعد اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہی۔

علم حدیث رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں وجود میں آچکا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو اپنے ارشادات کو سننے کی اور دوسروں تک پہنچانے کی ہدایت فرمائی۔ یہ حدیث آپ نے پڑھی ہوگی جس میں ارشاد فرمایا گیا کہ 'نضر الله امرءً سمع مقالتي فحفظها ووعيها واداها كما سمعها' یہ روایت مختلف الفاظ میں مختلف صحابہ کرام نے نقل کی ہے اور تقریباً تمام محدثین نے اس کو مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس شخص کو سرسبز و شاداب رکھے جس نے میری بات سنی، اس کو یاد کیا، اس کو محفوظ رکھا اور اس کو آگے تک پہنچادیا۔

یاد رکھیں کہ آپ بھی اس کی مستحق بن سکتی ہیں، جس نے میری بات سنی، اس کو یاد رکھا، اس کو محفوظ رکھا اور اس کو آگے تک پہنچادیا۔ اگر کوئی شخص ایک حدیث بھی یاد کرکے اس نیت سے دوسروں تک پہنچادے کہ وہ شادابی کی اس خوشخبری کا مستحق بن جائے تو ان شاء اللہ اس شادابی کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے گا۔ اس روایت کے مختلف الفاظ آئے ہیں۔ مختلف الفاظ میں یہ حدیث بیان ہوئی ہے۔ بعض جگہ آپ نے فرمایا کہ 'رُب مبلغ اوعى من سامعٍ' اس کی مثالیں آپ کو بہت نظر آئیں گی۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آپ نے کسی کے سامنے حدیث

بیان کی، جس کے سامنے بیان کی اس نے آپ کی نسبت زیادہ بہتر طور پر اس کی حفاظت کی۔ یعنی آپ نے بیان کی اور پھر کسی وجہ سے آپ کو یاد نہیں رہا، جس سے بیان کی تھی اس نے یاد رکھا اور آگے سینکڑوں ہزاروں تک پہنچا دیا جہاں تک آپ شاید نہیں پہنچا سکتے تھے۔ تو اس کا امکان ہے کہ آپ سے زیادہ بہتر انداز میں وہ لوگوں تک پہنچا سکے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض ایسے لوگ جن کو پہنچایا گیا ہو وہ پہنچانے والے سے زیادہ حفاظت کرنے والے ہوں۔ ایک جگہ ارشاد ہوا کہ 'فرب حامل فقه الى من هو افقه منه' بعض اوقات ایسا ہو سکتا ہے کہ فقہ اور دانائی کی یہ بات، دین میں گہری سمجھ اور شعور کی یہ بات آپ نے کسی ایسے کو پہنچائی جو آپ سے زیادہ سمجھ رکھتا ہو اور وہ اس سے وہ معانی اور مطالب نکال لے جو آپ کے ذہن میں نہیں آئے۔ میں نے اپنی زندگی میں بارہا ایسی مثالیں دیکھی ہیں۔ کہ علم حدیث کا ایک خاص پہلو کسی جگہ بیان کیا گیا اور جس کے روبرو اور جس سے بیان کیا گیا اس نے اس سے وہ معنی نکالے جو بیان کرنے والے کے ذہن میں بالکل نہیں تھے۔

میرے ساتھ بھی ایک بار ایسا ہی ہوا۔ اے کے بروہی مرحوم ہمارے ملک کے مشہور دانشور اور قانون دان تھے۔ ایک مرتبہ ہم دونوں کسی معاملہ پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ میں نے ان کو اپنے نقطہ نظر کی تائید میں ایک حدیث سنائی جو انہوں نے پہلے نہیں سنی تھی۔ انہوں نے اس کو بڑا خوش ہو کر سنا اور اپنے پاس نوٹ بھی کر لیا۔ اگلے دن کسی موضوع پر ان کا لیکچر تھا۔ اس لیکچر میں انہوں نے اس حدیث کے معانی اور پیغام کو اتنی خوبصورتی اور جامعیت سے بیان کیا کہ میرے ذہن میں بے اختیار حضورؐ کے الفاظ گونجنے لگے کہ 'فرب حامل فقه الى من هو افقه منهٔ' بعض اوقات سنانے والا دانائی کی بات کی گہرائی تک اتنا نہیں پہنچ پاتا جتنا کہ سننے والا پہنچ جاتا ہے۔ حدیث رسول کی یہ بصیرت میں نے خود دیکھی ہے۔

ایک جگہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اور یہ ہم سب کے لئے ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ 'اللهم ارحم خلفائی' اے اللہ میرے جانشینوں پر رحمت فرما۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ کے خلفاء سے مراد کون لوگ ہیں؟۔ آپؐ نے فرمایا کہ 'الذین یأتون من بعدیٔ میرے خلفا سے مراد وہ لوگ ہیں جو میرے بعد آئیں گے۔ 'یروون احادیثی' میری حدیثیں روایت کریں گے۔ 'ویعلمونها الناس' اور لوگوں کو سکھائیں گے۔ یعنی وہ لوگ جو میری احادیث کا

علم حاصل کریں اور اس کو لوگوں تک پہنچائیں، وہ میرے جانشین اور خلفاء ہیں اور ان کے لئے حضورؐ نے رحمت کی دعا فرمائی۔

اس دعا میں بھی ہم میں سے ہر شخص شامل ہوسکتا ہے۔ اور اگر مجھے تھوڑی سی تفصیل میں جانے کی اجازت ہو تو میں یہ کہوں گا کہ یہاں احادیث کا لفظ جمع کے صیغے میں آیا ہے اور عربی زبان میں کم سے کم تین کے عدد کو جمع کہتے ہیں۔ تو اگر کم سے کم تین احادیث کوئی یاد کر کے لوگوں تک پہنچادے تو شاید وہ اس بشارت کا مستحق بن جائے۔ عربی زبان میں جمع کی دو قسمیں ہیں۔ ایک جمع قلت اور دوسری جمع کثرت۔ جمع کثرت کا اطلاق کم سے کم نو پر ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ جتنا بھی ہو۔ اگر یہ جمع کثرت ہو تو تب بھی کم از کم نو حدیثوں کے لئے احادیث کا لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اگر تین یا نو حدیثیں بھی کوئی شخص یاد کر کے لوگوں تک پہنچادے تو یقیناً حضورؐ کے جانشینوں کے زمرے میں شامل ہوسکتا ہے۔

ایک اور جگہ حضورؐ نے بشارت دی اور وہ بشارت بھی ان تمام لوگوں کے لئے ہے جو قرآن اور سنت دونوں کا علم حاصل کریں اور اس علم کو لوگوں تک پہنچادیں تو اس بشارت کے مصداق بن سکتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ 'یحمل هذا العلم من كل خلف عدوله ينفون عنه تحريف الغالين وانتحال المبطلين و تاويل الجاهلين'۔ یہ علم یعنی یہ علم دین جو میں لے کر آیا ہوں اور جو قرآن وسنت کی شکل میں موجود ہے، اس کو ہر گروہ کے بعد وہ لوگ اٹھائیں گے جو سب سے زیادہ عدل والے ہوں گے۔ اردو زبان میں ایک لفظ استعمال ہوتا ہے پیڑھی، یعنی ایک نسل۔ تو خلف کے معنی ہے پیڑھی، ایک نسل۔ اور ہر پیڑھی میں جو عادل ترین لوگ ہوں گے وہ اس علم کے حامل ہوں گے، ان کے تین کام ہوں گے۔ اس علم میں غلو کرنے والے، انتہا پسندی اور شدت پسندی اختیار کرنے والے اس کو جو معنی پہنائیں گے ان سے اس کی نفی کرتے رہیں گے، ينفون عنه تحريف الغالين۔ آپ کو معلوم ہے کہ کچھ لوگوں میں ہمیشہ دین میں غلو اور انتہا پسندی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں غلو اور انتہا پسندی کو سختی سے ناپسند فرمایا ہے اور قرآن پاک میں غلو کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ دین کے معاملہ میں اس حد سے آگے جانا جو اللہ اور رسول نے مقرر کر دی ہے، یہ غلو ہے۔ تو یہ عادل علما غلو کرنے والوں کی تحاریف کی نفی کرتے رہیں گے، وانتحال المبطلين' اور باطل پرست لوگ جو چیزیں گھڑ گھڑ

کر منسوب کریں گے ان کی بھی نفی کرتے رہیں گے۔ یہ بھی ہر دور میں ہوا ہے۔ ہر دور میں ایسے باطل پرست لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کا نہ اسلام پر ایمان ہے اور نہ اسلام کے ساتھ تعلق رہا، لیکن چونکہ مسلمان دین سے متعلق بات پر مٹ مرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اس لئے وہ اپنے باطل خیالات کو دین کے نام پر لوگوں تک پہنچاتے رہتے ہیں۔ یہ عادل علما باطل پرستوں کی خود ساختہ ایجادات کو بھی دین سے دور کرتے رہیں گے۔ وتاویل الجاھلین اور جاہل لوگوں کی تاویل سے بھی۔ جاہل لوگ قرآن وسنت کی نصوص کو ایسی معانی پہناتے رہتے ہیں جو معنی قرآن وسنت کی مراد نہیں ہوتے، اور یہ لوگ وہ چیزیں تاویلات کے ذریعے قرآن وسنت میں شامل کر دیتے ہیں جو قرآن وسنت کا منشا نہیں ہوتا۔

آپ غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ گمراہی کن کن طریقوں سے آتی ہے۔ گمراہی کے بڑے راستے یہی تین ہیں: تحریف الغالین، انتحال المبطلین اور تاویل الجاھلین۔ اگر اہل علم موجود ہوں اور ان تینوں چیزوں کی تردید کرتے رہیں اور ان تینوں چیزوں سے مسلمانوں کو محفوظ کرتے رہیں تو علم دین اسی طرح منقح رہے گا جس طرح آج تک منقح چلا آرہا ہے۔ قرآن مجید کی حفاظت کا تو اللہ نے وعدہ کیا ہے، لیکن قرآن مجید کی معانی اور تعبیر وتشریح کی حفاظت ہم سب کی ذمہ داری ہے اور قرآن مجید کی معانی اور تعبیر وتشریح کی حفاظت کے بہت سے طریقوں میں سے سب سے اہم طریقہ سنت اور حدیث کی حفاظت کا ہے۔ لہٰذا سنت اور قرآن مجید کی حفاظت کا ایک اہم میدان سنت اور حدیث کی حفاظت بھی ہے۔

حدیث اور سنت ایک منفرد فن ہے۔ اس کا آغاز، جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے، رسول اللہ ﷺ کے دور مبارک میں ہوا۔ حضورؐ کے ان ارشادات سے اندازہ ہوا کہ آپؐ کے ارشادات کو یاد رکھنا اور محفوظ رکھنا بڑی فضیلت کی بات ہے۔ صحابہ کرامؓ نے اس فضیلت کے حصول کے لئے رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ ہی میں اس کام کو شروع کر دیا تھا۔ صحابہ کرامؓ میں ایسے بزرگوں کی تعداد کم وبیش پچاس کے لگ بھگ ہے جنہوں نے احادیث کے تحریری ذخائر مرتب کئے اور صحابہ کرامؓ کے شاگردوں یعنی تابعین میں ایسے بزرگوں کی تعداد ڈھائی سو کے قریب ہے جنہوں نے احادیث کے مجموعے مرتب کئے اور تابعین کے شاگردوں یعنی تبع تابعین میں تو ایسے لوگ ہزاروں کی تعداد میں ہیں جن کے مجموعے تیار ہوئے اور ان میں سے سینکڑوں مجموعے آج ہمارے پاس

موجود ہیں اور دستیاب ہیں۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ حدیث زبانی روایت کی بنیاد پر چلی اور زبانی روایت کی بنیاد پر تین سو سال تک چلتی رہی اور بعد میں لوگوں نے جمع کر دیا، یہ بات درست نہیں ہے۔ اس پر تفصیل سے آگے چل کر بات کریں گے۔

لیکن ایک بات یاد رکھیں کہ کسی چیز کو محفوظ رکھنے کے جو طریقے ہو سکتے ہیں وہ سارے کے سارے علم حدیث اور سنت کو محفوظ رکھنے کے لئے اختیار کئے گئے۔ صحابہ کرامؓ میں سے پچاس کے قریب ایسے ہیں کہ جنہوں نے حضور ﷺ کی حیات مبارکہ ہی میں آپؐ کے ارشادات کو لکھا۔ ان لکھنے والوں میں حضرت ابو ہریرہؓ بھی شامل ہیں۔ ان میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، حضرت سعد بن عبادہؓ اور کئی ایک حضرات شامل ہیں جن کے بارے میں آئندہ گفتگو کی جائے گی۔ یہ حضرات رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی کو تحریر کیا کرتے تھے، زبانی یاد کیا کرتے تھے اور اس زبانی یادداشت کا وقتاً فوقتاً اپنے تحریری ذخائر سے موازنہ کرتے رہتے تھے۔ ان ذاتی ذخائر سے موازنہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہزاروں افراد ایسے موجود تھے جو تھوڑی سی بھی بھول چوک یا کمزوری، اگر پیدا ہوتی، تو اس کی نشاندہی کرنے پر ہر وقت کمر بستہ رہا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ عرض کرتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ لوگ اس معاملہ میں کتنے حساس اور متشدد تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات کے ساتھ کوئی ایسی چیز منسوب نہ ہونے پائے جس کے بارے میں پورے یقین کے ساتھ یہ ثابت نہ ہو کہ حضورؐ کی زبان مبارک سے ایسا ہی نکلا تھا۔

حضرت ابو ہریرہؓ راویان حدیث میں سب سے مشہور ہیں اور آپ ایک طویل عرصہ تک حدیث بیان فرماتے رہے۔ منکرین حدیث کا سب سے بڑا نشانہ آپ ہی کی ذات گرامی رہتی ہے، اس پر بھی آگے گفتگو کریں گے۔ آپؓ مدینہ منورہ میں حدیث بیان فرمایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں مشہور تابعی، جن کو بعض لوگوں نے صغار صحابہ میں شامل کیا ہے، مروان بن حکم، مدینہ کے گورنر تھے۔ یہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے پہلے تھے۔ اپنی گورنری کے زمانے میں وہ کبھی کبھی حضرت ابو ہریرہؓ کے درس حدیث میں جا کر بیٹھا کرتے تھے۔ بعض احادیث انہوں نے سنیں اور یاد کر لیں۔ اس کے بعد گورنری سے معزول ہو کر کہیں اور چلے گئے۔ ایک طویل عرصہ کے بعد وہ خلیفہ بنے اور کچھ عرصہ بعد حج کے لئے آنا ہوا اور مدینہ منورہ میں حاضری ہوئی تو دوبارہ حضرت ابو ہریرہؓ کے درس میں جا کر بیٹھ گئے۔ ان کو خیال ہوا کہ شاید حضرت ابو ہریرہؓ سے حدیث بیان

کرنے میں کوئی بھول چوک ہو رہی ہے اور جو پہلے بیان کیا تھا آج اس سے مختلف بیان کر رہے ہیں۔ انہوں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے اس بارے میں کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ صرف یہ کہا کہ میں حدیث سننا چاہتا ہوں آپ ایک خاص مجلس میرے لئے بھی رکھ لیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے حامی بھر لی۔ اس پر خلیفہ نے ایک کاتب کی ذمہ داری لگائی کہ خاص محفل میں جب حضرت ابو ہریرہؓ حدیث بیان کریں تم ان کو چپکے چپکے نوٹ کرتے رہو اور کسی کو اس کا پتہ نہ چلے۔ جب یہ خاص مجلس شروع ہوئی تو حضرت ابو ہریرہؓ حدیث بیان کرتے اور کاتب لکھتے گئے۔ مروان بن حکم بعد میں اس تحریر کو اپنے ساتھ لے گئے۔

ایک سال کے بعد ان کا دوبارہ مدینہ منورہ آنا ہوا۔ اس موقع پر وہ اپنے ساتھ اس تحریر کو بھی ساتھ لائے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے کہا کہ وہ احادیث آپ دوبارہ بیان فرما دیجئے۔ انہوںؓ نے وہ احادیث دوبارہ بیان کیں۔ کاتب ایک ایک کر کے چیک کرتے رہے اور معلوم ہوا کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے نہ تو ایک حرف زیادہ کہا تھا اور نہ ہی ایک حرف کم کہا تھا۔ اس پر مروان نے کہا کہ مجھے شبہ ہوا تھا کہ شاید آپ حدیث سنانے میں کچھ بھول رہے ہیں تو میں آپ کی آزمائش کرنا چاہتا تھا کہ آپ کی یادداشت میں کوئی فرق تو نہیں آیا۔ اس لئے میں نے آپ کے درس کا ریکارڈ چیک کیا تو درست نکلا۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے یہ سن کر فرمایا کہ اگر ان میں ایک نقطہ کا بھی فرق نکلتا تو میں آج سے احادیث بیان کرنا چھوڑ دیتا۔ پھر خلیفہ کو لے کر اپنے مکان پر گئے۔ وہ سارے رجسٹر ان کو دکھائے اور کہا کہ یہ وہ کاغذات ہیں جو میں نے رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے سن کر لکھے تھے۔ میں ان کو روزانہ چیک کرتا ہوں، روزانہ یاد کرتا ہوں اور جب بھی کوئی حدیث بیان کرنے نکلتا ہوں تو پہلے اس ذخیرہ سے اپنی یادداشت کو تازہ کرتا ہوں۔

پھر آپؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کی محفل میں میری حاضری کا معاملہ یہ تھا کہ سارے صحابہ کرامؓ اپنے کاروبار وغیرہ کے لئے جا چکے ہوتے، کسی کے خاندان تھے، برادریاں تھیں اور زمینیں تھیں۔ میرا کچھ نہیں تھا۔ میں مسجد نبوی میں رہتا تھا، اور اصحاب صفہ میں سے تھا، نہ میرا کوئی روزگار تھا، نہ ملازمت تھی، رسول اللہ ﷺ نے کھانے کے لئے کچھ بھجوا دیا تو میں نے کھا لیا۔ جب بھی آپ مسجد میں تشریف لاتے میں قریب جا کر بیٹھ جاتا تھا۔ ہر بات سنتا رہتا تھا۔ ایک دن میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ جب کچھ ارشاد فرماتے ہیں تو بعض اوقات مجھے یاد نہیں

رہتا۔ مجھے کوئی ایسا طریقہ بتائیں کہ مجھے یاد رہا کرے۔ آپؐ نے دو باتیں ارشاد فرمائیں۔ ایک تو کہا کہ ذرا اپنی چادر مجھے دو، میں نے اپنی چادر دے دی۔ آپؐ نے کوئی دعا پڑھی، چادر پر پھونک ماری اور ایسے گرہ لگائی جیسے کوئی چیز رکھ کر گرہ لگائی جاتی ہے۔ پھر فرمایا اس چادر کو سینے سے لگا لو۔ ایک تو دعا کا یہ خاص طریقہ اختیار فرمایا۔ دوسرا آپؐ نے فرمایا کہ 'استعن بیمینک' اپنے دائیں ہاتھ سے کام لو، یا 'قیدالعلم بالکتابہ' یعنی علم کو کتابت کے ذریعے قید کرلو، محفوظ کرلو۔ اس طرح کے مختلف الفاظ آئے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں لکھنے لگا اور جو کچھ آپ فرماتے تھے میں جوں کا توں سب کچھ لکھ لیا کرتا تھا۔ اس کے بعد کوئی چیز میں بھولا نہیں۔ جو کچھ میں نے آپؐ سے سنا وہ میرے حافظہ میں بھی محفوظ رہا اور میں نے اس کو لکھا بھی۔ یہ سارا ذخیرہ رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ کے آخری ساڑھے تین سالوں کا ہے۔

یہ گویا صحابہ کرامؓ کے زمانہ کی ایک مثال ہے کہ علم حدیث کا آغاز ہو گیا تھا۔ یہ سلسلہ تابعین کے زمانے میں اور بھی دراز ہو گیا۔ تبع تابعینؒ کے زمانے میں مزید آگے بڑھا۔ پھر تدوین حدیث کا دور آ گیا۔ علم حدیث کی تدوین پر ایک دن ہم الگ سے گفتگو کریں گے۔ جب یہ سارا ذخیرہ مرتب ہو گیا تو مختلف محدثین نے اس کو مختلف انداز سے ترتیب دیا، نت نئے مجموعے ہمارے سامنے آئے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ روز بروز احادیث کا کوئی نہ کوئی مجموعہ کسی نہ کسی نئے انداز سے سامنے آتا ہے۔

ان سارے مجموعوں میں جو موضوعات بیان ہوئے ہیں، ان کو ہم دس قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ بعض محدثین نے ان دس موضوعات کو آٹھ میں تقسیم کیا ہے اور یہ ابواب ثمانیہ کہلاتے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ اس کی تعداد میں کمی بیشی کی جا سکتی ہے یہ کوئی متعین چیز نہیں۔ محدثین میں اکثر حضرات نے ان کو آٹھ موضوعات قرار دیا ہے۔ بہر حال احادیث کے بڑے بڑے موضوعات یہ ہیں:

۱) عقائد

۲) احکام

۳) آداب و اخلاق

۴) رقاق، یعنی دل میں رقت قلب پیدا کرنے والی احادیث، جن سے تعلق باللہ اور

خشیت الٰہی پیدا ہو، دلوں سختی دور ہو اور نرمی پیدا ہو۔ صحیح بخاری اور حدیث کی تقریباً ہر کتاب میں آپ کو اس سے متعلق ابواب ملیں گے۔

۵) تفسیر، حدیث کی تقریباً ہر کتاب میں آپ کو تفسیر کے ابواب ملیں گے۔

۶) تاریخ اور سیَر، یعنی انبیا اور سابقہ اقوام کا تذکرہ اور واقعات

۷) شمائل، یعنی رسول اللہ ﷺ کی اپنی عادات و خصائل۔ اس کو لوگوں نے الگ کتابوں کی شکل میں بھی محفوظ کر لیا ہے۔ شمائل ترمذی مشہور ہے۔ حدیث کی تقریباً ہر کتاب میں شمائل پر الگ باب ہوتا ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کے بارے میں، آپ کے جسمانی وجود اور شخصی محاسن اور کمالات کے بارے میں، آپ کے عادات و خصائل، آپ کے لباس اور آپ کی ذات سے متعلق مختلف چیزوں کے بارے میں شمائل کے ابواب میں تفصیلات درج ہیں۔

۸) فتن، یعنی آئندہ جو فتنے آنے والے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو فتنوں سے آگاہ کیا تھا اور متنبہ کیا تھا کہ یہ راستے فتنہ کے راستے ہیں ان سے بچا جائے۔ ان راستوں پر چلنے سے جن خرابیوں کے پیدا ہونے کا امکان تھا ان کی آپ نے نشاندہی فرمائی۔

۹) مناقب اور مثالب، یعنی صحابہ کرامؓ کے مناقب اور فضائل۔ حضورؐ کے جو مخالفین ہیں ان کے مثالب اور ان کی کمزوریوں کی آپ نے نشاندہی فرمائی۔ اسی طرح سے آپؐ نے بعض قبائل کے مناقب بیان فرمائے۔ انصار اور قریش کے فضائل بیان فرمائے۔ مختلف اقوام کی ذمہ داریوں کی آپ نے نشاندہی فرمائی۔ بعض اقوام میں کوئی کمزوری ہے تو اس کی نشاندہی فرمائی تاکہ لوگ ان کی خوبیوں سے فائدہ اٹھائیں اور خرابیوں سے بچیں۔

۱۰) اشراط الساعۃ یعنی قیامت کی علامات۔ شرط علامت کو بھی کہتے ہیں۔ اگر اس کو شرط یعنی Condition کے معنوں میں لیا جائے تو یہ بھی ٹھیک ہے اور عربی زبان میں شرط علامت کو بھی کہتے ہیں۔

جن لوگوں نے اس کو ابواب ثمانیہ یعنی آٹھ ابواب میں تقسیم کیا ہے وہ یہ ابواب بیان کرتے ہیں۔

۱) عقائد

۲)احکام

۳) آداب اور شمائل

۴)رقاق

۵)تفسیر

۶) فضائل

۷)فتن اور اشراط الساعۃ

۸)علم

یہ آٹھ ابواب محدثین کرام نے بیان کیے ہیں۔ابواب آٹھ ہوں، دس ہوں یا کچھ بھی ہوں لیکن تقریباً یہی عنوانات ہیں جن میں علم حدیث کی کتابیں منقسم ہیں۔

کتب حدیث کی اقسام

علم حدیث کی کتابوں کی بھی الگ الگ قسمیں ہیں۔آپ نے سنا ہوگا کہ امام بخاری کی کتاب صحیح بخاری کہلاتی ہے۔امام مسلم کی کتاب صحیح مسلم، ابوداوٗد کی کتاب سنن ابوداوٗد، امام احمد کی مسند امام احمد اور امام طبرانی کی کتاب معجم طبرانی کہلاتی ہے۔معجم، مسند، صحیح، جامع اور سنن وغیرہ میں فرق کیا ہے، کل کی گفتگو کا آغاز اسی سے کریں گے کہ کتب حدیث کی ترتیب کیا ہے۔تاہم حدیث کی وہ کتاب جس میں ان تمام موضوعات پر احادیث بیان کی گئی ہوں اور ان سب موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہو وہ کتاب الجامع کہلاتی ہے۔الجامع وہ کتاب ہے جس میں ان آٹھ یا دس موضوعات کے بارے میں احادیث بیان کی گئی ہوں۔صحیح بخاری، صحیح مسلم اور ترمذی جامع ہیں۔ان تینوں میں آٹھ کے آٹھ ابواب آئے ہیں۔

بقیہ کتابوں کی ترتیب اور ہے، جس پر کل گفتگو ہوگی۔

یہ علم حدیث کا ایک ابتدائی تعارف تھا۔کل علم حدیث کی ضرورت اور اہمیت پر بات کریں گے۔علم حدیث کی ضرورت واہمیت ایک عام طالب علم کے لئے، پھر دینیات اور مذہبیات کے طالب علم کے لئے اور پھر قرآن مجید اور اسلامی علوم کے طلبہ کے لئے علم حدیث کی کیا اہمیت ہے۔علم حدیث کی عظمت کے بارے میں چند اشارے کل کی گفتگو کا عنوان ہوگا۔

لوگوں کی غلط فہمی کو کس طرح دور کیا جائے کہ آج احادیث کی کتابیں ضعیف ہیں۔

ان شاءاللہ اگلے دس بارہ دن کی گفتگو سے آپ کو اس سوال کے جواب میں خاصا مواد مل جائے گا اور پھر آپ کے لئے لوگوں کو یہ بتانا آسان ہو جائے گا کہ یہ غلط فہمی کیوں پیدا ہوئی اور اس کی بنیاد کیا ہے۔

جو لوگ حدیث اور سنت میں فرق کرتے ہیں وہ اس کی واضح تعریف کیا بتاتے ہیں؟

جو لوگ حدیث اور سنت میں فرق کرتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ حدیث سے مراد تو وہ روایت ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کے کسی قول، فعل یا حالت کی نشاندہی ہو۔ مثال کے طور پر صحیح بخاری کی پہلی حدیث ہے انما الاعمال بالنیات ۔ یہ رسول اللہ ﷺ کا ایک ارشاد گرامی ہے۔ لیکن سنت سے مراد وہ طریقہ متبعہ، جس کی آپ نے لوگوں کو تعلیم دی ہو اور جس کو آپ نے لوگوں کو سکھایا ہو۔ مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ نے یہ سکھایا کہ جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو کیسا طرز عمل اختیار کیا جاتا ہے۔ جب مسلمان پانچ وقت کی نماز ادا کرتے ہیں تو کیا کرتے ہیں۔ یہ جو مجموعی طور پر نماز کی ادائیگی کا حکم ہے یہ سنت ہے اور اس حکم کی تشریح اور توضیح کے لئے اگر کوئی انفرادی روایت آئی ہے تو وہ حدیث ہے۔ گویا حدیث تو وہ روایت یا رپورٹ ہے اور اس کے نتیجے میں جو طرز عمل سامنے آیا ہے وہ سنت ہے۔ یہ ان لوگوں کی رائے ہے جو حدیث اور سنت کو الگ الگ قرار دیتے ہیں۔

میرے ذاتی خیال میں وہ رائے زیادہ درست ہے، ممکن ہے میں غلطی پر ہوں، مجھے اپنی رائے پر زیادہ اصرار نہیں لیکن میرے خیال میں وہ رائے زیادہ درست ہے جس کے مطابق علم حدیث ایک عام لفظ ہے۔ اس میں سنت سمیت وہ ساری چیزیں شامل ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی ذات سے منسوب ہوں۔ ان میں وہ چیز بھی شامل ہے جو ثابت اور طے شدہ ہے۔ جس کے بارے میں تمام امت کا اتفاق ہے کہ حضورؐ سے اس کا انتساب درست ہے، جس کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں اور جس سے امت کے طرز عمل کی تشکیل ہوتی ہے وہ سنت ہے۔ جبکہ حدیث میں کچھ چیزیں ایسی بھی شامل سمجھی جاتی ہیں جو سنت میں شامل نہیں ہیں مثلاً ضعیف احادیث۔ محدثین نے کہا کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ حضورؐ سے اس کی نسبت کمزور ہے۔ حدیث تو یہ بھی ہے۔ کیونکہ اسے حدیث کہا گیا ہے، اگرچہ ضعیف ہونے کی وجہ سے وہ سنت میں شامل نہیں

ہے۔اس لئے حدیث عام ہے سنت خاص ہے۔ یہ میری ذاتی رائے ہے ممکن ہے کہ یہ غلط ہو۔ لیکن حدیث اور سنت کے فرق کے بارے میں یہ تین نقطہ ہائے نظر ہیں۔آپ کا جو چاہے اختیار کیجئے۔اصطلاح کی بات ہے اور اصطلاح میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہئے۔

خبر کے بارے میں دوبارہ بتادیں۔

خبر کے لفظی معنی تو ہیں اطلاع یا رپورٹ۔اردو میں بھی خبر کے یہی معنی ہیں۔آپ نے سنا ہوگا نیوز News کے لئے خبر کا لفظ بولا جاتا ہے۔ لیکن علم حدیث کی اصطلاح میں خبر حدیث کے مترادف کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔یعنی ہر وہ روایت جو رسول اللہ ﷺ کے کسی قول، فعل یا عمل کو بیان کرتی ہو، وہ اصطلاحاً خبر کہلاتی ہے۔اس لحاظ سے خبر اور حدیث مترادف الفاظ ہیں۔ خبر رسول اللہ ﷺ کے قول کے بارے میں ہو مثلاً انما الاعمال بالنیات ،یا آپ کے کسی فعل کے بارے میں ہو جیسے آپؐ نے نماز میں طویل رکوع کیا۔یہ عمل کی روایت ہے۔حدیث بھی ہے خبر بھی ہے۔حدیث اور خبر قریب قریب مترادف الفاظ ہیں اور ایک معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

دوسرا خطبہ

علم حدیث کی ضرورت اور اہمیت

منگل، 7 اکتوبر 2003

علم حدیث کی ضرورت اور اہمیت

علم حدیث کی ضرورت اور اہمیت پر گفتگو دو عنوانات کے تحت ہوسکتی ہے۔ ایک عنوان جس پر آج گفتگو کرنا مقصود ہے وہ علم حدیث کی عمومی ضرورت اور اسلامی علوم وفنون میں بالخصوص اور انسانی فکر کے دائرے میں بالعموم اس کی اہمیت کا مسئلہ ہے۔ دوسرا پہلو بطور ایک ماخذ قانون اور مصدر شریعت کے حدیث اور سنت کی اہمیت اور مقام ومرتبہ کا ہے۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآن مجید اور سنت رسول مسلمانوں کے لئے شریعت اور قانون سازی کا اولین اور ابتدائی ماخذ ہے۔ سنت قرآن مجید کے ساتھ شریعت کا ماخذ کس طرح ہے؟ کن معاملات میں یہ ماخذ اور مصدر ہے؟ اس سے احکام کا استنباط کس طرح ہوتا ہے؟ اس پر قدرے تفصیل کے ساتھ کل گفتگو ہوگی۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے محدثین کرام کی غالب اکثریت کے نزدیک حدیث کی اصطلاح عام ہے اور سنت کی اصطلاح خاص ہے۔ سنتؔ سے مراد وہ طریقہ یا وہ انداز اور ڈھنگ ہے جس پر کوئی انسان زندگی گزارتا ہے یا جس کے مطابق کوئی کام کرتا ہے۔ اچھے ڈھنگ کو بھی سنت کہا جاتا ہے اور برے ڈھنگ کو بھی سنت کہا جاتا ہے۔ عربی زبان میں سنت کا لفظ دونوں قسم کے انداز اور ڈھنگ کے لئے استعمال ہوا ہے۔

خود حدیث پاک میں بھی یہ لفظ انہی عمومی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک مشہور حدیث آپ نے پڑھی ہوگی؛ من سنّ فی الاسلام سنة حسنة ، جس نے اسلام میں کوئی اچھی سنت پیدا کی، یعنی اچھا ڈھنگ اختیار کیا، کوئی اچھی ریت ڈالی یا اچھا طور طریقہ نکالا اُس کو اِس کا اجر ملے اور جو لوگ آئندہ اس پر عمل کریں گے ان کا اجر بھی اُس کو ملتا رہے گا۔ لیکن ان کا اجر کم نہیں ہوگا۔ یہاں سنت کا لفظ اچھے طریقے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اسی حدیث کا دوسرا جملہ

ہے؛ومن سنّ فی الاسلام سنة سیئةً فعلیه وِزرُها وَ وزرُ من عمل بها اور جس شخص نے کوئی برا طریقہ ایجاد کیا، سنة سیئة بُرا طریقہ، برا ڈھنگ یا بری ریت ڈالی، تو اس کو اپنے کرتوت کا بھی گناہ ملے گا اور جو لوگ اس برے ڈھنگ کو اختیار کریں گے ان کے گناہ میں بھی یہ شخص شریک رہے گا۔ اس مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سنت کا لفظ عربی زبان میں طریقہ یا ڈھنگ یا ریت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

اسلامی شریعت کی اصطلاح میں سنت کے ایک معنی تو وہ ہیں جو پہلے بیان کئے گئے ہیں یعنی رسول اللہ ﷺ کا وہ طرز عمل جس کی رسول اللہ ﷺ نے دعوت دی، جس کو قائم کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ دنیا میں بھیجے گئے اور جو صحابہ کرام نے آپ سے سیکھ کر اختیار کیا اور نسلاً بعد نسلٍ مسلمانوں تک منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس طریقہ کو عربی زبان میں اور اسلام کی اصطلاح میں سنت کے لفظ سے یاد کرتے ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن وسنت دونوں شریعت کے ماخذ ہیں تو ہماری مراد اسی مفہوم میں سنت ہوتی ہے۔

لیکن سنت کے ایک معنی اور بھی ہیں جو تھوڑا سا ہٹ کر ہیں۔ اور ان دنوں کو الگ الگ سمجھ لینا چاہئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ محدثین کی اصطلاح میں سنت سے کیا مراد ہے یہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ محدثین سے ہٹ کر ایک اصطلاح علماء اصول کی ہے، ایک اصطلاح فقہائے اسلام کی ہے۔ علماء اصول کی اصطلاح وہ ہے جو ابھی میں نے عرض کی، یعنی رسول اللہ ﷺ کا دیا ہوا وہ طریقہ جس پر مسلمان عمل کرتے ہیں جو شریعت کے احکام کا ماخذ اور مصدر ہے، جو ہم تک تین طریقوں سے پہنچا ہے جس کی میں ابھی وضاحت کرتا ہوں۔

تیسرا مفہوم فقہا کے نزدیک وہ ہے جو آپ نے عام بول چال میں بھی سنا ہوگا کہ یہ دو رکعت سنت ہے، یہ تین رکعت فرض ہے، وہ تین رکعت واجب ہے۔ واجب اور فرض کے مقابلہ میں سنت کی جو اصطلاح استعمال ہوتی ہے وہ پہلے دو معنوں سے مختلف ہے۔ یہاں سنت سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کا وہ حصہ جو لازمی اور واجب نہیں ہے، جو فرض و واجب نہیں ہے۔ اس کو اگر اختیار کیا جائے تو اجر ملے گا اور نہ کیا جائے تو امید ہے کہ اللہ کے ہاں باز پرس نہیں ہوگی، یہ سنت کا تیسرا مفہوم ہے۔ ان تینوں مفاہیم کو ذہن میں الگ الگ رکھنا چاہئے۔

سنت کی اقسام

سنت کی تین قسمیں ہیں۔یعنی سنت ہم تک تین طریقوں سے پہنچی ہے۔ایک طریقہ تو ہے رسول اللہ ﷺ کے زبانی ارشادات گرامی کا جو صحابہ کرام نے سن کر بعینہ یاد کئے اور ہم تک پہنچائے۔حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی 'انما الاعمال بالنیات'، و انما لکل امرءٍ مانویٰ' فمن کان ھجرتہ الی اللہ و رسولہ فھجرتہ الی اللہ و رسولہ ومن کانت ھجرتہ الی الدنیا یصیبھا او امرأۃ یتزوجھا فھجرتہ الی ما ھاجرالیہ 'یہ ایک مثال ہے سنت قولی کی، کہ آپ کی زبان مبارک سے ایک قول نکلا، صحابہ نے اسی طرح یاد کر کے دوسروں تک پہنچایا، دوسروں نے اس کو یاد کر کے آگے منتقل کیا اور یوں یہ ارشاد گرامی ہم تک پہنچ گیا۔یہ سنت قولی یا حدیث قولی ہے۔

سنت فعلی

سنت کی ایک قسم ہے 'سنت فعلی'۔یعنی صحابہ کرام نے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ یہ کیا کرتے تھے یا فلاں موقع پر آپؐ نے یہ کیا۔سنت قولی وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلنے والے الفاظ پر مشتمل ہو اور صحابہ کرام نے اسے بعینہ نقل کرلیا ہو۔سنت فعلی یہ ہے کہ ایک صحابیؓ نے حضورؐ کا طرز عمل دیکھا اور اپنی زبان میں اپنے الفاظ میں بعد والوں کے لئے بیان کیا۔یہ سنت فعلی ہے۔

سنت تقریری

سنت کی تیسری قسم 'سنت تقریری' ہے جس میں نہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی بیان ہوا ہے، نہ رسول اللہ ﷺ کا اپنا کوئی فعل یا عمل نقل ہوا ہے، لیکن دوسروں کا کوئی فعل یا عمل حضورؐ کے سامنے ہوا اور آپؐ نے اس کی ممانعت نہیں فرمائی اور اس کو ناجائز نہیں قرار دیا، یہ بھی سنت ہے۔ اس طرح کی سنت سے بہت سے معاملات حدیث میں ثابت ہوتے ہیں۔رسول اللہ ﷺ جب تشریف لائے تو عربوں میں بہت سے طور طریقے رائج تھے۔بہت سے معاملات پر عرب لوگ کاربند تھے۔ان معاملات اور طور طریقوں میں جس چیز کو رسول اللہ ﷺ نے شریعت کے خلاف

دیکھا اس کی ممانعت فرمادی۔ جس چیز کو شریعت کے خلاف نہیں پایا البتہ اس میں کوئی چیز قابل اصلاح تھی اس جز کی رسول اللہ ﷺ نے اصلاح فرمادی۔ اور جن معاملات میں کوئی بھی چیز قابل اعتراض نہیں تھی آپ نے اس پر کوئی اعتراض نہیں فرمایا وہ اسی طرح چلتی رہی۔ صحابہ کرام کرتے رہے۔ رسول اللہ ﷺ کے علم اور اطلاع سے اس پر عمل درآمد ہوتا رہا۔ یہ بھی سنت تقریری ہے۔

آپ نے سنا ہوگا کہ مضاربہ اور مشارکہ اسلام کے قانون تجارت کی دو اہم اصطلاحات ہیں۔ یہ کاروبار سے متعلق اسلام کے دو طریقے ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں کاروبار کے یہ طریقے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن پاک نے کہیں مضاربہ کا حکم دیا ہے یا سنت میں کہیں مشارکہ کی ہدایت کی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نہ قرآن پاک میں مضاربہ کا حکم ہے نہ سنت میں مضاربہ کا حکم ہے۔ اس کے اسلامی طریقہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نبوت کے منصب پر فائز ہوئے اور شریعت کے احکام نازل ہونا شروع ہوئے تو صحابہ کرام میں یہ دونوں طریقے رائج تھے۔ عرب میں اسلام سے قبل بھی مضاربہ اور مشارکہ پر عمل درآمد ہوتا تھا۔ ان دونوں کے علاوہ بھی تجارت کے بہت سے طریقے رائج تھے۔ لیکن ان میں سے دو کی مثال لیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان میں جزوی ہدایات کے ذریعے اصلاح فرمائی۔ بقیہ طریقے اسی طرح قائم رہے۔ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ مضاربہ اور مشارکہ سنت تقریری سے ہمارے سامنے آئے ہیں۔

ایک اور مثال عرض کرتا ہوں۔ صحابہ کرام کی ایک جماعت سفر پر روانہ ہوئی۔ وہاں ایک صاحب کو وضو کی ضرورت پیش آئی۔ انہوں نے دیکھا کہ پانی نہیں ہے تو تیمّم کر کے نماز پڑھ لی۔ ایک دوسرے صاحب کو بھی وضو کی ضرورت پیش آئی۔ انہوں نے بھی تیمّم کر کے نماز ادا کر لی۔ تھوڑی دیر میں پانی دستیاب ہوگیا۔ ان میں سے ایک صاحب نے، جنہوں نے تیمّم کیا تھا، وضو کیا اور وضو کر کے نماز دہرالی۔ پہلے صاحب نے نماز نہیں دہرائی۔ اگلے دن جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری ہوئی تو دونوں حضرات نے اپنا اپنا نقطہ نظر بیان کیا۔ ایک صاحب نے کہا کہ میں نے تیمّم کر کے نماز پڑھ لی تھی۔ چونکہ شریعت نے تیمّم کر کے نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے اس لئے میری نماز ہوگئی تھی، لہٰذا نماز کو دہرانے کی ضرورت نہیں تھی۔ دوسرے صاحب نے عرض کیا کہ میں نے سوچا کہ نماز کا وقت موجود ہے اور پانی مل گیا ہے اور وضو تیمّم سے زیادہ

افضل ہے، اس لئے میں نے وضو کر کے نماز دہرالی۔ آپ نے پہلے صاحب کو جواب دیا 'لقد اصبت السنة' تم نے سنت کے مطابق عمل اختیار کیا اور نماز نہیں دہرائی۔ دوسرے صاحب سے فرمایا کہ 'لك الاجر مرتين' تمہیں دوہرا اجر ملے گا۔ گویا آپ نے دونوں حضرات کے اس نقطہ نظر کو پسند فرمایا اور جائز قرار دیا اس لئے اب یہ سنت ہوگیا۔ سنت سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ جس شخص کو پانی دستیاب نہ ہو اور وہ وضو کے بجائے تیمم کر کے نماز پڑھ لے تو یہ کافی ہے۔ دوبارہ پانی ملنے کے بعد دوہرانا ضروری نہیں۔ لیکن اگر کوئی دہرالے تو اس کو دوہرا اجر ملے گا۔ اس طرح کے اور بھی بہت سے واقعات ہمیں مل سکتے ہیں۔ حدیث میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ سنت تقریری سے کوئی چیز کیسے ثابت ہوتی ہے؟ ان دو مثالوں سے اس کا اندازہ ہوجائے گا۔

قرآن میں سنت کی سند

اس دور میں بعض حضرات کا کہنا ہے جو کہ بہت بڑی گمراہی ہے اور اسلام کے بنیادی تصور کے خلاف ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں اور دوسروں کو بھی یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ جو چیز سنت کی صورت میں مسلمانوں کے پاس اس وقت موجود ہے اس کی کوئی سند یا کوئی اتھارٹی قرآن پاک میں موجود نہیں ہے۔ یہ نہ صرف ایک بہت بڑی گمراہی ہے بلکہ ایک بہت بڑی فضیلت سے محرومی کی بات بھی ہے۔ اگر صرف قرآن مجید یا کوئی تحریری نوشتہ رہنمائی اور ہدایت کے لئے کافی ہوتا تو اللہ تعالیٰ کو انبیاء بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ آسمانی کتابیں اتار دی جاتیں اور اسی پر اکتفا کیا جاتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوا۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیا بھیجے گئے جن میں سے کچھ پر کتابیں بھی اتاری گئیں۔ کتابوں کی تعداد چند سو سے زیادہ نہیں ہے۔ ایک روایت میں ایک سو چار (۱۰۴) کتابوں کی تعداد بیان ہوئی ہے۔ ایک دوسری روایت سے تین سو چودہ (۳۱۴) کتابوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن انبیا علیہم السلام کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب ہے۔ گویا اصل چیز نبی اور پیغمبر ہے۔ کتاب کا اتارا جانا یا نہ اتارا جانا یہ اللہ کی مشیت پر ہے۔ جب مناسب سمجھا اس نے کتاب نازل فرمائی، اور جب مناسب نہیں سمجھا کتاب نازل نہیں فرمائی۔ اس لئے نبی اور پیغمبر کو اور ان کی رہنمائی کو کتاب سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ مزید برآں خود کتاب اللہ یعنی اللہ کی کتاب قرآن مجید میں درجنوں مقامات پر وہ ہدایات موجود ہیں جن میں بعض کا تذکرہ

آئندہ کیا جارہا ہے، جن میں پیغمبر کی سنت اور اس کی تفسیر وتشریح کو قرآن مجید کے سمجھنے اور اس پر عمل درآمد کے لئے لازمی قرار دیا گیا ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ 'الا انی اوتیت القرآن ومثلہ معہ' یاد رکھو مجھے قرآن مجید بھی دیا گیا اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور بھی بہت کچھ دیا گیا ہے۔ قرآن سے ملتی جلتی اور بھی بہت سی ہدایات اور رہنمائی عطا فرمائی گئی ہے۔ لہٰذا یہ دونوں قسم کی رہنمائی جس کی مزید تفصیل ہم آگے چل کر دیکھیں گے، اللہ کی طرف سے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عطا ہوئی۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر نزول وحی کم وبیش چوبیس ہزار مرتبہ ہوا۔ بظاہر چوبیس ہزار مرتبہ اگر وحی نازل ہوئی ہو اور قرآن پاک کی ایک ایک آیت ایک مرتبہ بھی نازل ہو، اگرچہ بعض مرتبہ لمبی لمبی سورتیں ایک ہی مرتبہ کی وحی میں نازل ہوئیں، سورۃ انعام پوری ایک ہی وقت میں نازل ہوئی۔ سورۃ یوسف پوری ایک وقت میں نازل ہوئی۔ مکّی سورتیں اکثر چھوٹی چھوٹی ایک ایک وقت میں نازل ہوئیں تو اس سے زیادہ سے زیادہ چار پانچ سو مرتبہ کر کے پورا قرآن مجید نازل ہو سکتا تھا۔ یہ چوبیس ہزار مرتبہ وحی نازل ہونے کا کیا مفہوم ہے؟

امام ابوداؤد نے اپنی کتاب سنن میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر جبرئیل امینؑ قرآن لے کر بھی اترتے تھے اور سنت لے کر بھی نازل ہوتے تھے؛ کان جبریل علیہ الصلوٰۃ والسلام ینزل علی رسول اللہ ﷺ بالسنۃ کما ینزل علیہ بالقرآن' جبرئیل امین سنت لے کر بھی اسی طرح اترتے تھے جس طرح کہ قرآن مجید لے کر اترتے تھے۔ و یعلمہ ایاہ کما یعلمہ القرآن' اور جیسے آپ کو قرآن سکھایا کرتے تھے اسی طرح سنت بھی سکھایا کرتے تھے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ چوبیس ہزار مرتبہ جو نزول وحی ہوا اس میں قرآن پاک کے ساتھ ساتھ سنت کا نزول بھی شامل ہے۔ اور جبرئیل امین نے سنت کے بنیادی احکام بھی رسول اللہ ﷺ کو سکھائے۔

اس لئے علم حدیث جو سنت کا سب سے [illegible] ماخذ اور سب سے بڑا مصدر ہے اس کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے اور اس کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ علم سنت کو بیان کرتا ہے۔ سنت کی تفصیلات علم حدیث کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں۔ سنت کا تحفظ اور سنت کی بقا کی ہر کاوش مسلمانوں کے لئے اسی طرح لازمی ہے اور بہت اونچی فضیلت رکھتی ہے جس طرح

قرآن مجید کا تحفظ اور اس کی بقا کی کاوش ہے۔قرآن مجید کی حفاظت کا تو اللہ نے وعدہ کیا ہے انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون ،لیکن اس وعدے کی جزوی تطبیق سنت پر بھی ہوتی ہے۔اس لئے کہ یہاں ذکر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ذکر میں قرآن مجید شامل ہے۔لیکن ذکر، یعنی یاددہانی اسی وقت یاددہانی ہوسکتی ہے جب اس کا مفہوم سامنے ہو۔اگر کوئی یاددہانی ہو لیکن اس کا مفہوم کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔مثلاً کوئی شخص آپ کو کسی پرانی زبان میں یاددہانی کا خط بھیج دے، پرانی سریانی یا رومن یا لیٹن زبان میں آپ کو خط لکھے اور آپ کو وہ زبان نہ آتی ہو تو یاددہانی بے معنی ہے۔یاددہانی اسی وقت بامعنی ہوگی جب آپ کی سمجھ میں آئے۔اس لئے اگر قرآن مجید کی تشریح اور توضیح موجود نہیں ہے تو یاددہانی اور اس کے اثرات محدود ہو جاتے ہیں۔اس لئے یاددہانی کو محفوظ رکھنے کے لئے جہاں اس کے متن کا تحفظ ضروری ہے وہاں اس کی تشریح وتعبیر کا تحفظ بھی ضروری ہے۔ اور وہ تشریح وتفسیر کا تحفظ سنت کے ذریعے ہم تک پہنچتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے امت مسلمہ کو تلقین فرمائی کہ سنت کے تحفظ اور بقا کے لئے بھی اسی طرح کوشش کریں جیسے قرآن پاک کے تحفظ اور بقا کے لئے کرتے ہیں۔ایک جگہ ارشاد فرمایا: المتمسك بسنتي عندفساد امتي له اجر شهيدٍ ؛ کہ وہ شخص جو میری سنت کا دامن پکڑے ہوئے ہے، اس وقت جب میری امت فساد کا شکار ہو تو اس کے لئے شہید کا اجر ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ له اجر مأة شهيد، یعنی اس کو سو شہیدوں کا اجر ملے گا۔سو شہیدوں کا اجر اس لئے ملے گا کہ ایک شہید جس مقصد کے لئے جان قربان کرتا ہے وہ کیا ہے؟ وہ اسلام کی بقا اور اسلام کا تحفظ ہے، امت مسلمہ کا تحفظ ہے۔اگر خدانخواستہ سنتیں مٹ رہی ہوں، حدیث ختم ہو رہی ہو تو پھر امت مسلمہ کا وجود دینی بنیادوں پر باقی نہیں رہ سکے گا۔تو جن مقاصد کی خاطر شہید اپنی جان قربان کرتا ہے سنت کا تحفظ کرنے والا انہی مقاصد کو دوسرے انداز سے حاصل کرتا ہے۔ اس لئے اس کو ایک شہید یا سو شہید کا اجر ملے گا۔مختلف اسباب اور نیتوں کے لحاظ سے دونوں اپنے اپنے اجر کے مستحق ہوں گے۔

امام شافعی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ علماء حدیث اور علماء سنت کی اپنے اپنے علاقے اور زمانے میں وہی حیثیت ہے جو صحابہ کرام اور تابعین کی اپنے دور میں تھی۔صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کو ان کے دور میں عزت واحترام کا مقام کیوں حاصل تھا؟ اس لئے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی دی

ہوئی رہنمائی لوگوں تک پہنچا رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات ان کے ذریعے لوگوں تک پہنچ رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت کا علم ان کے ذریعے پھیل رہا تھا۔ لہٰذا آج ایک صاحب علم جو حدیث اور سنت کا علم رکھتا ہو اور اس کے ذریعے یہ علم لوگوں تک پہنچ رہا ہو تو گویا وہ وہی کردار ادا کر رہا ہے جو صحابہ کرامؓ اور تابعین اپنے زمانے میں ادا کیا کرتے تھے۔ اسی لئے امام شافعی نے ایک جگہ فرمایا ہے کہ 'اھل الحدیث فی کل زمان کالصحابة فی زمانھم' کہ علمائے حدیث کی ہر زمانے میں وہی حیثیت ہوگی جو صحابہ کرام کی اپنے زمانے میں تھی۔ ایک جگہ انہوں نے فرمایا کہ 'اذا رأیت صاحب حدیث فکانی رأیت احدا من اصحاب الرسول ﷺ' اگر میں حدیث کے کسی عالم کو حدیث بیان کرتے ہوئے دیکھوں، اور خود امام شافعی ان میں شامل تھے، تو گویا میں نے رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابیؓ کو دیکھا جو علم حدیث بیان کر رہے تھے۔

یہ حدیث اور سنت کی دینی اور اسلامی اہمیت اور ضرورت ہے۔ اس پر ایک دوسرے نقطہ نظر سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وحی الٰہی جو قرآن پاک کی شکل میں ہمارے پاس ہے۔ اس میں بنیادی ہدایات اور کلیات بیان ہوئی ہیں جن میں سے بعض کا ذکر ہم ابھی کریں گے، لیکن ان ہدایات کا جو کتاب الٰہی میں بیان ہوئی ہیں جب تک عملی تشکُّل نہ ہو اس وقت تک ان ہدایات پر عمل درآمد بڑا دشوار ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حدیث اور سنت کی رہنمائی کے بغیر ان ہدایات پر عمل درآمد ممکن نہیں ہے تو شاید غلط نہیں ہوگا۔

حدیث کے مقابلہ میں دیگر مذاہب کے صحائف کی حیثیت

سابقہ آسمانی کتابوں کو دیکھیں۔ آج حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ناپید ہے۔ انؑ پر اتارے جانے والے صحیفے ناپید ہوگئے۔ انؑ کے ارشادات ہمارے علم میں نہیں ہیں۔ ان کی سنت کے بہت معمولی اور مبہم سے آثار ہیں جو اس لئے محفوظ رہ گئے کہ رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں وہ شامل ہوگئے، عرب میں ان کا رواج تھا اور رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے حکم سے ان کو شریعت کا حصہ بنادیا۔ اس لئے وہ آج محفوظ ہیں ورنہ وہ اتنے بھی محفوظ نہ رہتے۔

حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ماننے والے آج کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ ان کی ایک ریاست بھی موجود ہے جس کے پاس بڑے بڑے وسائل ہیں۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ

السلام کی سنت موجود ہے کہ نہیں ہے۔ان کے ارشادات موجود ہیں کہ نہیں ہیں۔اس کے بارے میں یہودی بھی یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے۔ان کے پاس جو کچھ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نام سے منسوب ہے وہ ایک انتہائی غیر مستند، مبہم اور غیر تاریخی چیز ہے۔مختلف انداز سے اس کو مرتب کیا گیا ہے۔لیکن کوئی یہودی یقین سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ موسیٰ علیہ السلام ہی کے ارشادات گرامی ہیں۔

یہی حال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہے کہ آج یہ چار انجیلیں ان کے ارشادات کا سب سے بڑا ماخذ مانی جاتی ہیں۔اناجیل اربعہ کا نام آپ نے سنا ہوگا، جو عیسائیوں کے نزدیک مستند ہیں یا وہ ان کو مستند سمجھتے ہیں، ان میں حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشادات جگہ جگہ بیان کئے گئے ہیں۔ان کی سیرت بیان ہوئی ہے۔لیکن اگر آپ تاریخ کے ایک ایسے طالب علم کے نقطۂ نظر سے دیکھیں جو چیزوں کو میرٹ پر جاننا چاہتا ہو اور محض کسی عقیدت مندی کی بنیاد پر چیزوں کو نہ مانتا ہو تو آپ کو پتہ چلے گا کہ تاریخی اعتبار سے ان بیانات کی کوئی حیثیت نہیں۔اول تو وہ بیانات اتنے مبہم ہیں جس کی کوئی حد نہیں اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ اگر کوئی ان کی فہرست بنانا چاہے تو ان کی تعداد شاید تیس یا چالیس پچاس سے زیادہ نہیں بن سکتی۔ پھر اگر ان بیانات کو درست مان بھی لیا جائے تو ان کی تاریخی Authenticity کیا ہے۔اس معاملہ میں عیسائی مورخین بھی خاموش ہیں اور دنیا کے دوسرے مورخین بھی خاموش ہیں۔جن لوگوں نے ان اناجیل کو بیان کیا ان میں سے کوئی بھی حضرت عیسیٰؑ کا معاصر نہیں تھا۔یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کو کس نے سب سے پہلے بیان کیا؟ کس زبان میں بیان کیا؟ کس جگہ بیٹھ کر اس کو مرتب کیا۔ پہلے پہل اناجیل کا جو نسخہ مرتب کیا گیا تھا وہ کہاں ہے؟ ان میں سے کوئی چیز آج موجود نہیں ہے۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد کچھ لوگوں نے یہ چیزیں لکھیں۔ساٹھ، ستر یا پچھتر سال بعد لوگوں نے یہ چیزیں مرتب کیں۔ان ابتدائی تحریروں میں سے کوئی چیز بھی تحریری شکل میں آج موجود نہیں ہے۔ان میں سے ایک نسخہ کا بعد میں کسی شخص نے ترجمہ کیا تھا۔وہ ترجمہ کرنے والا کون تھا؟ یہ بھی معلوم نہیں۔وہ اس زبان کو جانتا تھا جس میں انجیل پہلے پہل لکھی گئی یا نہیں جانتا تھا؟ یہ بھی معلوم نہیں۔اس نے صحیح ترجمہ کیا؟ یہ بھی نہیں معلوم، مکمل ترجمہ کیا؟ یہ بھی نہیں معلوم۔اپنی طرف سے کچھ ملا دیا؟ یہ بھی نہیں معلوم۔کچھ چیزیں حذف کر دیں؟ یہ بھی نہیں معلوم۔

اس نے ترجمہ کر کے چھوڑ دیا۔ وہ ترجمہ دوڈھائی سو سال بعد کہیں سے دریافت ہوا اور اس غیر مستند ترجمہ کے یہ سارے ترجمے ہیں جو آج عہد نامہ جدید کی پہلی چار کتابوں کی صورت میں موجود ہیں۔ یہ اناجیل اربعہ کی تاریخی حیثیت ہے۔

اس کے مقابلہ میں آپ دیکھیں سنت رسول اللہ ﷺ کو، جس کی تفصیل میں آگے چل کر مزید بیان کروں گا کہ اگر آج میں آپ سے یہ بیان کروں کہ یہ حدیث مبارک جو ابھی میں نے پڑھی انما الاعمال بالنیات وانما لکل امرئ ما نوی میں آپ سے بیان کرسکتا ہوں کہ مجھ سے یہ حدیث کس نے بیان کیا۔ اس سے کس نے بیان کی اور میں رسول اللہ ﷺ تک پوری سند آپ کو سنا سکتا ہوں۔ اور انشاء اللہ آخری دن میں تبرک کے طور پر بیان بھی کردوں گا۔ پوری سند میں آپ کے سامنے بیان کردوں گا کہ صحاح ستہ کی احادیث میں کس روایت سے بیان کرتا ہوں۔ مسلمانوں کے علاوہ دنیا میں کسی اور کے پاس ایسی کوئی چیز موجود نہیں۔ دنیا کے لئے یہ بات ناقابل تصور ہے کہ ایسی کوئی چیز بھی ہوسکتی ہے؟ حضرت عیسیٰؑ تو بہت پہلے تھے۔ آج سے سو دو سو سال پہلے کے کسی آدمی کا بیان اس سند کے ساتھ موجود نہیں کہ سند میں شامل ہر آدمی ایک تاریخی وجود رکھتا ہو اور آپ کو اختیار ہو کہ ہر ایک کے بارے میں پوچھیں کہ یہ آدمی کون تھا؟ اور میری ذمہ داری ہو کہ میں تاریخ سے ثابت کروں کہ یہ فلاں صاحب تھے، فلاں جگہ پیدا ہوئے تھے یہ ان کا نام تھا اور یہ ان کا کارنامہ ہے۔ یہ چیز دنیا میں کسی کے پاس نہیں ہے۔ یہ صرف مسلمانوں کے پاس ہے۔

کتاب الٰہی اور ارشادات انبیا میں بنیادی فرق

اب وحی الٰہی کی طرف آتے ہیں۔ وحی الٰہی کا ایک خاص اسلوب ہے۔ قرآن مجید میں بھی یہ اسلوب ہے تو راۃ میں بھی یہ اسلوب ملتا ہے، جو حصے توراۃ کے مستند باقی رہ گئے۔ اور جس حد تک انجیل میں استناد پایا جاتا ہے انجیل میں بھی یہ بات موجود ہے کہ انبیا علیہم السلام اپنی باتوں کو عمومی انداز میں بیان فرماتے تھے۔ کتاب الٰہی کے عمومی اصول ہوتے تھے۔ کتاب الٰہی میں عملی تفصیلات اور روزمرہ کے احکام نہیں ہوتے۔ اگر ایسا ہونے لگے تو کتاب الٰہی کی کم از کم سو جلدیں ہوں۔ قرآن مجید کی سو جلدیں ہوتیں اگر یہ سب کچھ قرآن مجید میں لکھا جاتا کہ نماز میں ہاتھ

یہاں باندھو، رفع یدین کرو یا مت کرو، نماز میں کیا پڑھو، کیسے پڑھو۔ صرف نماز کے احکام اگر قرآن پاک میں لکھے جاتے تو موجودہ قرآن پاک سے شاید دس گنا زیادہ اس کی جلدیں بن جاتیں۔ پھر لوگ اس کو یاد کیسے رکھتے اور سمجھتے کیسے۔ اس لئے قرآن مجید کا اسلوب یہ ہے کہ اس میں عمومی ہدایات اور عمومی اصول بیان کئے گئے ہیں۔ ایسے ہی عمومی اصول توراۃ میں ہیں۔ یہی عمومی اصول انجیل میں ہیں۔ یہی بقیہ کتابوں میں ہیں۔

اب اللہ کی سنت یہ رہی ہے کہ ان اصولوں کے دینے کے ساتھ ساتھ انبیاء علیہم السلام کو دنیا میں بھیجا کہ ان کی سنت کو دیکھتے جاؤ اور عمل سیکھتے جاؤ۔ اگر کتاب الٰہی میں لکھا ہوا ہے کہ عدل وانصاف سے کام لو تو جو ان کا طرز عمل ہے وہ عدل وانصاف ہے، اس کے مطابق کام شروع کردو۔ اگر اس میں لکھا ہوا ہے کہ اللہ کی عبادت کرو تو جیسے یہ عبادت کرتے ہیں ویسے عبادت شروع کردو۔ اس طرح سے کتاب الٰہی کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ انبیاء علیہم السلام کے سالہاسال کی سنتوں کے نتیجہ میں سامنے آتا ہے۔ وہ ایک زندہ پائندہ وجود ہے۔ لوگ اس کو دیکھتے جائیں اور کتاب الٰہی پر عمل درآمد کرتے جائیں۔

سنت؛ وحی الٰہی کا عملی نمونہ

سابقہ انبیاء علیہم السلام کی اقوام نے ان کی سنتوں کو بھلا دیا۔ محفوظ بھی نہیں رکھا اور جتنا کچھ باقی رہا تھا اس کو بھی بھلا دیا اور یاد نہیں رکھا۔ اب صورت یہ ہے کہ ان کے ہاں صرف نعرے اور اعلانات ہیں۔ عمل درآمد نہیں ہے۔ میں ایک مثال آپ کو دیتا ہوں۔ عیسائیوں کے بارے میں آپ نے سنا ہوگا وہ کہتے ہیں کہ ہمیں دو اصولوں کی تعلیم دی گئی ہے اور ہم دو ہی اصولوں کے علمبردار ہیں۔ عدل وانصاف اور انسانیت سے محبت۔ عیسائیوں کی کتابوں میں اکثر جگہ آپ نے یہی لکھا دیکھا ہوگا۔ لیکن یہ بات کہ انسانیت سے محبت سے کیا مراد ہے؟ اس پر عمل درآمد کیسے کیا جائے گا؟ عدل وانصاف کی تعریف کیا ہے؟ اس کے عملی تقاضے کیا ہیں؟ جب تک عملی تشکیل کرکے لوگوں کی رہنمائی نہ کی جائے کہ عدل کس کو کہتے ہیں؟ اس وقت تک عدل کا لفظ بے معنی ہے۔ میں پوری زندگی تقریریں کرتا رہوں کہ عدل ہونا چاہئے۔ نہ میری زندگی میں عدل ہو، نہ آپ کی زندگی میں عدل ہو، تو یہ تقریر بے معنی ہے۔ یہ بات کہنے میں تو بہت اچھی لگتی ہے کہ کوئی تمہارے دائیں گال پر چانٹا مارے تو تم بایاں گال بھی سامنے کردو۔ کہنے کو تو بڑی اچھی بات ہے لیکن اس کی عملی

شکل کیا ہوگی؟ کیا بعض صورتوں میں استثنا بھی ہوگا یا ہر حالت میں ایسا کرنا چاہئے؟ کیا کسی قاتل کے سامنے، جب وہ تلوار سے وار کرے تو دوسرا کندھا بھی سامنے کردیں کہ 'ادھر بھی وار کردو' کہ یہی انجیل کا حکم ہے۔ چور ایک کمرے میں ڈاکہ ڈالے تو آپ دوسرا کمرہ بھی کھول دیں کہ یہاں بھی ڈاکہ ڈال دو۔ سوال یہ ہے کہ اس اصول پر کہاں عمل درآمد کریں گے اور کہاں نہیں کریں گے؟ کیسے عمل کریں گے؟ جب تک یہ تفصیل سامنے نہ ہو اس وقت تک یہ نعرہ محض ایک بے معنی بات ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سنت ان لوگوں نے محفوظ نہیں رکھی، گم کردی ہے۔ لہٰذا ان کے پاس سوائے اس مبہم نعرے کے اور کچھ نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سنت یہودیوں نے مٹادی۔ وہ کہتے ہیں کہ تم اپنے پڑوسی کے لئے وہی کرو جو اپنے لئے کرتے ہو، لیکن کیا یہودی اپنے پڑوسیوں کے لئے وہ کچھ کرتے ہیں جو کچھ اپنے لئے کرتے ہیں؟ آپ دیکھ لیجئے کیا ہورہا ہے؟ اسرائیل میں کیا کررہے ہیں باقی جگہوں میں کیا کررہے ہیں؟ اس لئے کہ یہ نعرہ تو لکھا ہوا ہے۔ توراۃ میں اس موضوع پر ایک آدھ سطر کی تعلیم ہے۔ لیکن اس پر عمل درآمد کے لئے اس کے پیچھے کوئی سنت اور طرز عمل نہیں ہے۔

جو بات میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ سنت میں وحی الٰہی کی ایک عملی تشکیل فراہم کی گئی ہے۔ ایک جیتا جاگتا عملی نمونہ ہمارے سامنے رکھ دیا گیا ہے جس میں وحی الٰہی کے ایک ایک حکم، ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف کی پوری نقشہ کشی کردی ہے کہ اس پر عمل درآمد ایسے ہوگا۔ اب کسی لفظ کے بارے میں کوئی ابہام نہیں ہے کہ قرآن مجید میں کوئی لفظ کس لئے اختیار کیا گیا ہے؟ اور اس میں کیا کہا گیا ہے؟

اگر سنت کا یہ کارنامہ نہ ہوتا تو قرآن مجید کے اصول صرف نظری بیانات اور خوشگوار اعلانات ہوتے۔ قرآن مجید کے اعلانات بھی نعوذ باللہ مجرّد اعلانات بن کر رہ جاتے۔ جیسے توراۃ اور انجیل کے اعلانات محض لفظی بیانات ہو کر رہ گئے ہیں۔ جیسے بقیہ مذہبی کتابوں میں اچھی اچھی باتیں لکھی ہوئی ہیں۔ جس قوم کی بھی مذہبی کتاب اٹھا کر دیکھیں اس میں بڑے اچھے اخلاقی اصول بیان ہوئے ہیں۔ لیکن عمل درآمد کا معاملہ صفر ہے۔ وہ اس لئے صفر ہے کہ اس کے پیچھے کوئی عملی نمونہ نہیں ہے۔ عملی نمونے بلا شبہ موجود تھے، اللہ نے بھیجے تھے، لیکن ان کے ماننے والوں نے ان عملی نمونوں کی تفصیلات باقی نہیں رکھیں۔ عدل، محبت، مساوات، کرامت آدم یہ سارے اعلانات

جوقرآن مجید میں کیئے گئے ان کی عملی تشریح رسول اللہ ﷺ کی سنت کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ یہی وہ عصا ہے سنت رسول کا، جس نے اس کلیمی کو بنیاد فراہم کی۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

اگر یہ عصا نہ ہوتا تو وحی الٰہی اس طرح ایک عملی نمونہ کے طور پر ہمارے سامنے نہ آسکتی۔ ابھی میں نے عرض کیا کہ قرآن مجید میں اللہ رب العزت نے کتاب الٰہی کو محفوظ رکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحفظون ۔اور مشاہدہ بھی یہ ہے کہ قرآن مجید وہ واحد آسمانی کتاب ہے جو آج تک بعینہ اسی طرح محفوظ ہے جس طرح اللہ رب العزت نے رسول اللہ ﷺ پر اتاری اور رسول اللہ ﷺ نے صحابہ تک پہنچائی ۔اس میں ایک حرف، ایک شوشے اور ایک زبر زیر کا بھی فرق نہیں ہے۔حتیٰ کہ صحابہ کرامؓ نے جس طرح لکھی آج تک اسی طرح لکھی جا رہی ہے۔

آپ میں سے جن بہنوں کو قرآن پاک پر گفتگو میں شرکت کا موقع ملا تھا ان کے سامنے میں نے بعض مثالیں عرض کی تھیں ۔ایک جگہ لکھا جاتا ہے: والسمآ بنینٰھا بایید وانا لموسعون ۔ایدٍ میں لکھی جاتی ہیں دو 'ی'۔اور پڑھی جاتی ہے ایک 'ی'۔دو 'ی' کیوں لکھی جاتی ہیں ،کسی کو نہیں معلوم ۔صرف یہ معلوم ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے جب قرآن پاک لکھا تھا تو یہ لفظ دو 'ی' سے لکھا تھا بس ۔آج تک اسی کی پیروی ہو رہی ہے۔

ایک جگہ ہے سترھویں پارے میں 'وکذالك نجی المومنین نجی المومنین میں دو 'نون' پڑھے جاتے ہیں ایک لکھا جاتا ہے دوسرا نہیں لکھا جاتا۔ بعد میں پڑھنے والوں کی آسانی کے لئے اس کے اوپر ایک چھوٹے نون کے لکھنے کا رواج ہو گیا۔لیکن یہ حرف آج تک اسی طرح لکھا جاتا رہا۔یہ اس لئے کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے اسی طرح لکھا تھا۔

اس طرح کی مثالیں قرآن پاک میں اور بھی ہیں ۔جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کتاب الٰہی کے متن کے ساتھ ساتھ اس کا املاء اور ہجاء بھی محفوظ ہیں ۔واقعہ یہ ہے کہ کتاب الٰہی کے تحفظ کے لئے اللہ رب العزت نے دس چیزوں کا تحفظ کیا۔ یہ دس چیزیں وہ ہیں جو قرآن پاک کے تحفظ کی خاطر محفوظ کی گئی ہیں۔

۱: سب سے پہلے تو خود قرآن پاک کا متن ہے جو ہماری اس وقت کی گفتگو کے موضوع سے باہر ہے۔ بہر حال یہ ایک قطعی امر ہے کہ قرآن پاک کا متن پوری طرح سے محفوظ

ہے۔

۲: پھر متن محفوظ ہو اور معنی اور مفہوم محفوظ نہ ہو تو متن کی حفاظت سے فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ میں نے مثال دی تھی کہ پرانے زمانے میں اسی علاقے میں جہاں آج ہم بیٹھے ہیں (اسلام آباد) یہاں کسی زمانے میں پراکرت زبان بولی جاتی تھی۔ پراکرت زبان ہو یا اردو ہی گورمکھی رسم الخط میں لکھی ہو تو ہمارے اور آپ کے لئے بے کار ہے۔ دو سو سال پرانا متن ہو، ہزار سال پرانا ہو یا دو ہزار سال پرانا ہو، وہ ہمارے لئے بے معنی ہے۔ اس لئے کہ اس کے معنی اور مفاہیم مٹ گئے۔ اس کے برعکس اللہ نے قرآن پاک کے متن کو بھی محفوظ رکھا اور اس کے معنی کو بھی محفوظ رکھا جو سنت کی شکل میں ہمارے سامنے ہے اور ہماری اس گفتگو کا موضوع ہے۔

۳: اللہ رب العزت نے قرآن مجید کی زبان کو بھی محفوظ رکھا۔ قرآن مجید کی زبان بھی محفوظ ہے۔ قرآن مجید کی ہم عصر سب زبانیں مٹ گئی ہیں۔ جن جن زبانوں کو نزول قرآن کے زمانے میں انسان بولتے تھے آج ان میں سے کوئی زبان دنیا میں محفوظ نہیں ہے۔ سب مٹ چکی ہیں۔ صرف ایک قرآن مجید کی زبان موجود ہے۔ یہ ایک ایسا عجیب وغریب استثنا ہے جس کی لسانیات کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔ دنیا کی ہر زبان تین چار سو سال بعد بدل جاتی ہے۔ آج میں جو اردو بول رہا ہوں یہ اردو آج سے چار سو سال پہلے نہیں بولی جاتی تھی۔ تین سو سال کے بعد نہیں بولی جائے گی۔ تین سو سال بعد آنے والے شاید اس زبان کو نہیں سمجھ سکیں گے۔ لیکن عربی زبان واحد زبان ہے جو رسول اللہ ﷺ کی ولادت مبارکہ سے کم وبیش ساڑھے تین سو سال پہلے سے بولی جارہی تھی۔ اس کی مثالیں موجود ہیں۔ گفتگو لمبی ہو جائے گی اس لئے میں نہیں دوہراتا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کی ولادت سے ساڑھے تین سو سال پہلے کی عربی زبان کے نمونے موجود ہیں اور آج ہم تک پہنچے ہیں، اور ان میں یہی اسلوب، یہی الفاظ اور یہی لغت استعمال ہوئی ہے جو احادیث اور قرآن پاک میں ہمیں ملتی ہے۔

۴: پھر اس کے ساتھ ساتھ قرآن پاک اور سنت پر جو اجتماعی عمل مسلمانوں کا رہا ہے، جسے تعامل کہتے ہیں یعنی نسلاً بعد نسلٍ لوگ عمل کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہ بھی پوری طرح محفوظ ہے۔ ہر دور کا عمل اور تعامل محفوظ ہے۔ جس کا نہ صرف مسلمانوں کے اجتماعی طرز عمل سے بلکہ مسلمانوں کے بعض دستیاب مطبوعہ ریکارڈ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ تعامل کس زمانے میں کیسا تھا۔

ایک مثال میں عرض کر دیتا ہوں۔ قرآن پاک میں ہے اقیموا الصلوٰۃ ، درجنوں نہیں سینکڑوں جگہ آیا ہے کہ نماز قائم کرو لیکن کہیں بھی نماز کی تفصیل بیان نہیں کی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے نماز کے احکام اور طریقہ کار کو بیان فرمایا اور آپؐ اس تفصیل میں نہیں گئے کہ یہ فرض ہے، اور یہ واجب ہے، آپؐ نے صرف اتنا کہنے پر اکتفاء فرمایا کہ صلّو ا کما رائیتمونی اصلی جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو اسی طرح نماز پڑھنی شروع کردو۔ صحابہؓ نے اس طرح نماز پڑھنی شروع کر دی۔ صحابہ نے آگے تابعین کو سکھایا، تابعین نے تبع تابعینؒ کو سکھایا اور ہر دور میں فقہائے اسلام اور محدثین اور مفسرین قرآن نماز کے احکام کی تفصیلات بیان کرتے رہے۔ آج مسلمان اربوں کی تعداد میں نماز ادا کر رہے ہیں۔ کروڑوں کی تعداد میں مسلمان باقاعدہ نماز پڑھتے ہیں۔ اگر آپ کو یہ جاننے کا شوق ہو کہ کس دور میں مسلمان نماز کس طرح پڑھتے تھے تو اس دور کی کوئی کتاب، فقہ کی، حدیث کی یا تفسیر کی دیکھ لیں، معلوم ہو جائے گا کہ مسلمان بارہویں صدی ہجری میں ایسے کرتے تھے۔ ساتویں صدی ہجری میں ایسے کرتے تھے، نویں صدی ہجری میں ایسے کرتے تھے، اگر چہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آج جس طرح کر رہے ہیں یہ تعامل سے ثابت ہے۔ لیکن مزید چیک کرنا چاہیں تو یہ سارا ذخیرہ موجود ہے اس کو چیک کیا جا سکتا ہے۔ یہ تحفظ تعامل ہے جو قرآن مجید کے تسلسل کے لئے ضروری ہے۔

۵: پھر جس ماحول اور جس سیاق وسباق میں قرآن مجید نازل کیا گیا اس ماحول اور سیاق وسباق کی پوری تفصیل موجود ہے اور یہ حدیث کی صورت میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ سیرت اور حدیث کے ذخائر میں وہ پورا ماحول، اس کی منظر کشی اور نقشہ کشی کر کے ہمارے سامنے رکھ دی گئی جس میں قرآن مجید نازل ہوا۔ جب حدیث کا ایک طالب علم حدیث کی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ سیرت کا طالب علم سیرت کی تفصیلات پڑھتا ہے تو اس کے سامنے چشم تصور میں وہ سارا منظر متشکل ہو کر آجاتا ہے جس منظر میں قرآن پاک نازل ہوا، جس پس منظر اور پیش منظر میں قرآن پاک کے احکام وہدایات پر عمل درآمد شروع ہوا اور ایسی چیزیں جن کا بظاہر قرآن پاک یا حدیث پاک کے سمجھنے سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا وہ تفصیلات بھی صحابہ کرامؓ نے بیان کر دیں اور ان کو محفوظ رکھ دیا۔

حدیث کی اقسام پر آگے چل کر بات ہوگی، لیکن ابھی ضمناً ایک بات عرض

کر دیتا ہوں۔ایک قسم حدیث کی کہلاتی ہے'حدیث مسلسل'۔اس سے مراد وہ حدیث ہے جس میں ہر راوی نے کوئی خاص نقطہ یا کسی خاص کیفیت کے تسلسل کے ساتھ روایت کو بیان کیا ہو، اس کو حدیث مسلسل کہتے ہیں۔چنانچہ ایک حدیث کہلاتی ہے'حدیث مسلسل بالتشبیك 'تشبیک دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو اس طرح ایک دوسرے کے اندر پرو لینا، اس عمل کو تشبیک کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ تقریر فرما رہے تھے اور بیان فرما رہے تھے کہ'جب انسان کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے دل سے ایمان اس طرح نکلتا ہے، اور جب توبہ کر لیتا ہے تو ایمان دل میں ایسے داخل ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے آپ نے دونوں کی ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے کے اندر پرو کر بتایا۔ جب صحابیؓ نے اس کو نقل کر کے بتایا تو انہوںؓ نے بھی ایسے کیا فشبك بین اصابعه' آپ نے دونوں انگلیوں کو پرو کر علیحدہ کیا اور کہا کہ ایمان اس طرح نکل جاتا ہے، پھر چوری کرتا ہے تو ایسے نکلتا ہے، پھر فلاں عمل کرتا ہے تو ایسے نکلتا ہے۔ پھر توبہ کرتا ہے تو داخل ہو جاتا ہے۔اس حدیث کو حدیث مسلسل بالتشبیک کہا جاتا ہے۔اور صحابہ کرام کے زمانے سے لے کر آج تک اس حدیث کو بیان کرنے والے اس عمل کی نقل کر کے بتاتے ہیں۔اس عمل کو کر کے دکھانے اور بتانے کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور اگر کوئی نہ بھی کرے تو بھی بات سمجھ میں آجائے گی۔ لیکن اس سے ایک اضافی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ نفسیاتی اور جذباتی طور پر انسان اس ماحول میں چلا جاتا ہے جس ماحول میں رسول اللہ ﷺ اس بات کو بیان فرما رہے تھے۔مسجد نبوی میں یا جس مقام پر حضورؐ اس کو بیان فرما رہے تھے تو روحانی طور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں وہاں موجود ہوں اور رسول اللہ ﷺ کے اس عمل کو صحابہ، تابعین اور تبع تابعینؒ اور حدیث کے طلبہ اور اساتذہ کے ذریعے میں دیکھتا چلا آرہا ہوں۔ یہ ہے تحفظ ماحول کی ایک مثال۔اس طرح کی مثالیں اور بھی سامنے آئیں گی یعنی وہ پوری کیفیت (Setting) جس میں حضورؐ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کوئی حدیث ارشاد فرمائی یا سنت کا کوئی نمونہ لوگوں کے سامنے رکھا اور قرآن مجید کی تعبیر وتشریح فرمائی تو اس ماحول کی تفصیلات کو بھی اللہ نے محفوظ رکھا اور آئندہ نسلوں کے لئے باقی رکھا۔

۷: جو شخصیت کتاب الٰہی لے کر آئی وہ اپنی جگہ خود ایک سمندر ہے، ایک موضوع ہے اور اگر زندگی رہی تو اس موضوع یعنی سیرت کے موضوع پر بھی خطبات کا ایک سلسلہ ہوگا، ان شاء اللہ۔ حاملِ کتابِ الٰہی کی سیرت کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی طرح محفوظ رکھا کہ جس سے زیادہ کسی

انسان کی شخصیت کی تفصیلات کومحفوظ رکھنے کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔

۷: انسان کے حاشیۂ خیال میں وہ امکانات اور تفصیلات نہیں آسکتیں جو سیرت کے واقعات کومحفوظ رکھنے کے لئے کی گئیں۔ زیادہ تفصیلات بیان کرنے کا موقع نہیں لیکن ایک چھوٹی سی مثال عرض کرتا ہوں۔

عربوں کے دل میں اللہ تعالیٰ نے یہ ڈالا اور بظاہر ہمارے خیال میں اسی لئے ڈالا کہ سیرت کے واقعات محفوظ رکھنے تھے، کہ اپنے قبائل اور برادریوں کے نسب کو محفوظ رکھیں۔ علم الانساب ان کے ہاں ایک باقاعدہ فن تھا۔ اس پر درجنوں کتابیں آج بھی موجود ہیں۔ علم الانساب کے نام سے ان موضوعات پر کتابیں لکھی گئیں کہ عرب قبائل کا نسب کیا تھا؟ کون کس کا بیٹا تھا، کس کا پوتا تھا، کس کا دادا تھا، کس کی شادی کہاں ہوئی، کس کی کتنی اولادیں تھیں، کس قبیلہ کی آپس میں کیا رشتہ داریاں تھیں۔ ان معلومات پر درجنوں کتابیں آج بھی دستیاب ہیں جو لوگوں نے وقتاً فوقتاً لکھیں۔

اب کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ عربوں کو ان موضوعات سے دلچسپی تھی، اس لئے ان کو ان چیزوں پر معلومات جمع کرنے کا شوق تھا، اس لئے انہوں نے انساب پر کتابیں لکھ دیں۔ بہت سے لوگ اپنے شوق کے لئے کتابیں لکھ دیتے ہیں۔ اس لئے ان لوگوں نے بھی لکھ دیں۔ لیکن محض یہ کہنا کافی نہیں ہے۔ جب ہم انساب کی ان کتابوں کا جائزہ لیتے ہیں اور ان کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایک عجیب وغریب بات سامنے آتی ہے، بہت عجیب وغریب۔ اتنی عجیب وغریب کہ اس کو محض اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔ وہ عجیب وغریب بات یہ سامنے آتی ہے کہ جتنی معلومات محفوظ ہوئیں وہ مرکوز ہیں رسول اللہ ﷺ کی شخصیت پر، حالانکہ جس وقت سے محفوظ ہونا شروع ہوئیں اس وقت تو حضورؐ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ چالیس سال تک کسی کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھا کہ یہ نبی ہوں گے اور نبوت کا سلسلہ اس طرح چلے گا اور پھر ایک امت قائم ہوگی اور اُس امت میں علوم وفنون کے بہت سے سلسلوں میں سے ایک سلسلہ یہ چلے گا کہ انساب کے بارے میں یہ معلومات جمع کی جائیں گی، یہ تو کبھی کسی کے تصور میں بھی نہیں آیا تھا۔ لیکن عربوں نے اپنے اپنے طور پر جو معلومات جمع کیں اور جو بعد میں کتابی شکل میں مدوّن ہوئیں اور آج جس طرح ہم تک پہنچیں، وہ سب رسول اللہ ﷺ کی شخصیت مبارکہ پر مرکوز ہیں۔ جس طرح ایک سرچ لائٹ ہوتی ہے۔ آپ پانچ ہزار واٹ کے ایک بلب سے روشنی کسی ایک نقطہ پر ڈالیں تو جس طرح سے وہ نقطہ چمکے گا اور

ایک ایک گوشہ اس کا روشن ہو جائے گا اسی طرح سے رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک کا ایک ایک گوشہ محفوظ ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے لے کر آپ کے پینتیسویں چالیسویں جدّ امجد عدنان تک اہم اور بنیادی امور سے متعلق ہر ایک چیز محفوظ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی دادیاں کون تھیں، نانیاں کون تھیں، پھوپھیاں کون تھیں۔ یہ سب معلومات علم انساب کی کتابوں میں ملیں گی۔ مثال کے طور پر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ کی دادی کا نام کیا تھا تو شاید آپ بتا دیں۔ آپ میں سے اکثر بتا دیں گے۔ اگر میں یہ پوچھوں کہ دادی کی دادی کا کیا نام تھا تو شاید آپ میں سے دس فیصد بتا سکیں اور اگر میں پوچھوں کہ دادی کی دادی کی دادی کا کیا نام تھا تو شاید ہم میں سے کوئی بھی نہ بتا سکے۔ کم از کم میں تو نہیں بتا سکتا۔ اسی طرح میری یا آپ کی نانی کا کیا نام تھا، سب بتا دیں گے۔ نانی کی نانی کا نام شاید دو چار بتا سکیں۔ نانی کی نانی کی نانی کا کیا نام تھا شاید کوئی بھی نہیں بتا سکتا۔

رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ عجیب وغریب بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اجداد، آپ کی دادیاں، آپؐ کی نانیاں، آپؐ کے نانا اور آگے آپؐ کی پھوپھیاں اور آگے آپؐ کے چچا اور آگے ہر ایک کی تفصیلات پچیس پچیس اور تیس تیس نسلوں تک محفوظ ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی محفوظ نہیں ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کی محفوظ نہیں ہیں۔ ابوجہل، ابولہب کی محفوظ نہیں ہیں، خالد بن ولیدؓ کی محفوظ نہیں ہیں۔ یہ اسلام سے پہلے عرب کے بڑے بڑے لوگ تھے، انہی کا چرچا تھا۔ ان میں سے کسی کے بارے میں اس طرح کی معلومات محفوظ نہیں رہیں۔ جو محفوظ رہ گئیں وہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں محفوظ رہ گئیں۔

اس لئے میں یہ سمجھتا ہوں۔ اور میرا خیال ہے کہ میں حق بجانب ہوں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص مشیت سے عربوں کے دل میں یہ ڈالا کہ وہ نسب محفوظ رکھیں اور جس نسب کو عربوں نے زیادہ اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھا یہ وہ تھا جس کا رشتہ رسول اللہ ﷺ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ ملتا تھا۔

سیرت کے واقعات کے محفوظ رکھے جانے کی ایسی ایسی مثالیں ہیں کہ جن کی تفصیلات میں اگر میں جاؤں تو گفتگو موضوع سے آگے نکل جائے گی۔ رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے۔ مسجد نبوی میں ایک ستون سے ٹیک لگا کر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ آج بھی وہ جگہ محفوظ ہے اس کو 'اسطوانہ حنانہ' کہتے ہیں۔ اس کے بعد جب صحابہ کی تعداد بڑھنے لگی تو کسی نے تجویز پیش کی کہ

کوئی بلند جگہ ہو جس پر قیام فرمایا کریں اور وہاں سے خطبہ ارشاد فرمایا کریں۔ اس غرض کے لئے ایک صحابیؓ نے منبر ڈیزائن کیا کہ جس پر آپؐ بیٹھ بھی سکیں اور اگر کھڑے ہونا چاہیں تو کھڑے بھی ہو سکیں۔ چنانچہ وہ منبر بنا کر لے آئے۔ اب بظاہر اتنا کافی ہے۔ یعنی معلومات اور رہنمائی کے لئے اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ تفصیلات کہ یہ منبر کس لکڑی کا تھا، وہ منبر کس نے بنایا تھا، اس کا سائز کیا تھا، اس کا ڈیزائن کیا تھا، وہ لکڑی کس نے کاٹی تھی، کس جنگل سے کاٹ کر لائی گئی تھی، کہاں بیٹھ کر منبر بنایا گیا، اس پر لوگوں نے معلومات جمع کیں اور کتابیں لکھیں اور سیرت پر جو قدیم لٹریچر ہے اس میں تقریباً بیس کتابوں کا تذکرہ ملتا ہے جو منبر کے ڈیزائن اور اس کے بارے میں تیار ہوئیں۔ رسول اللہ ﷺ جوتا کیسا استعمال فرماتے تھے، نعل مبارک، اس کی شکل کیسی تھی، وہ چمڑے کا تھا کہ ربڑ کا تھا، کون بناتا تھا، کس سے خریدتے تھے، نعل مبارک ٹوٹ جاتا تھا تو کس سے مرمت کراتے تھے، اس پر کتابیں موجود ہیں اور ایک چھوٹا رسالہ اردو میں بھی دستیاب ہے۔ یہ اس شخصیتؐ کے حالات کا تحفظ ہے جو شخصیت حامل قرآن اور ناقل قرآن ہے، جس کے ذریعے قرآن ہم تک پہنچا۔

۸: وہ علوم جو رسول اللہ ﷺ کی شخصیت سے متعلق ہیں یعنی علوم سیرت، ارشادات اور سنت اور عمل سے متعلق تو سنت اور حدیث ہوگئی لیکن آپ کی ذات سے متعلق، آپ کی شخصی اور جسمانی حالات اور واقعات سے متعلق ان کی وسعتوں کو اگر بیان کیا جائے تو اس کے لئے میری اور آپ کی عمریں کافی نہیں ہیں۔ لوگ تسلسل سے جس طرح سے تحقیق کرتے آرہے ہیں، اُس کے نتیجہ میں جو نئے نئے معاملات اور مسائل سامنے آرہے ہیں اس کا صرف ایک ہی سبب معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے تحفظ کے لئے سنت کا تحفظ فرمایا، سنت کے تحفظ کے لئے صاحب سنت کا تحفظ فرمایا، صاحبِ سنت کی سیرت کے تحفظ کے لئے ہر وہ چیز جو بالواسطہ یا بلا واسطہ اس سے متعلق تھی وہ محفوظ رکھی گئی۔

۹: پھر رسول اللہ ﷺ کے براہ راست مخاطبین تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے مخاطبین اور ہمراہیوں یعنی صحابہ کرامؓ کے حالات محفوظ رکھے گئے۔ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ کم وبیش پندرہ ہزار صحابہ کرامؓ کے حالات محفوظ اور موجود ہیں۔ اور جو صحابیؓ جتنے قریب تھے ان کے حالات اسی قدر تفصیل اور دقت نظر کے ساتھ محفوظ ہیں۔ انسان اپنے دوستوں کے ذریعے پہچانا جاتا ہے۔ یہ

ہرقوم میں ایک دلیل اور ایک کلیہ ہے۔ انسانی تاریخ کی بہترین شخصیتیں ہر اعتبار سے وہ ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہیں جنہوں نے حضورؐ کا ساتھ دیا۔ اس لئے قرآن اور صاحب قرآن کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ قرآن مجید پر اجتماعی طور پر عمل درآمد کیسے ہوا؟ سنت کی اجتماعی تشکیل کیسے ہوئی؟ حدیث کی رہنمائی کی روشنی میں امت نے کیسے جنم لیا؟ یہ چیزیں سمجھ میں نہیں آسکتیں جب تک کہ صحابہ کرام کے حالات محفوظ نہ ہوں۔ صحابہ کرامؓ کا تذکرہ محفوظ ہے اور کم و بیش پندرہ ہزار صحابہ کرامؓ کے حالات نام بہ نام اور نسل بہ نسل دستیاب ہیں۔

۱۰: ان صحابہ کرام کے حالات ہم تک کس طرح پہنچے؟ میں نے عرض کیا کہ چھ لاکھ افراد کے بارے میں معلومات محفوظ ہیں۔ چھ لاکھ افراد کے بارے میں یہ واقعات جمع کئے گئے کہ یہ کون لوگ تھے؟ کس زمانے میں پیدا ہوئے؟ ان کی شخصیتیں کس درجہ کی تھیں؟ ان کا علم و فضل کس درجہ کا تھا؟ اس پر علم رجال کے عنوان سے جب گفتگو ہوگی تو تفصیل سامنے آئے گی۔ علم رجال ایک ایسا فن ہے جس کی کوئی مثال دنیا کے کسی مذہبی یا غیر مذہبی فن میں نہیں ملتی۔ نہ مذہبی علوم میں اس کی مثال ہے نہ غیر مذہبی علوم میں اس کی کوئی مثال ہے۔ یہ دس چیزیں ہیں جو سنت کے تحفظ کی خاطر اور قرآن پاک کے تحفظ کی خاطر محفوظ رکھی گئیں اور اللہ کی مشیت اس کی متقاضی ہوئی کہ ان سب چیزوں کو محفوظ رکھا جائے۔

پھر محض ان کے محفوظ رکھنے پر اکتفا نہیں ہوا، بلکہ سنت نے اور احادیث کے ذخیرے نے ایک ایسا کردار ادا کیا۔ اگر آپ انگریزی میں کہنے کی اجازت دیں، تو میں کہوں گا کہ اس نے ایک ایسا(**Cataclyst**) کردار اداء کیا کہ جس نے ایک علمی سرگرمی (**Intellectual Activity**) کو ایک تحریک کی شکل دے دی۔ ایک فکری سرگرمی کو جنم دیا، ایک ایسے تعلیمی عمل کا آغاز کیا جو تسلسل کے ساتھ آج بھی جاری ہے۔ حدیث اور سنت کے یہ ذخائر اسلامی علوم وفنون میں نہ صرف مسلسل بقا اور تحفظ کی ضمانت ہیں بلکہ اس کی مسلسل توسیع اور وسعت بھی علوم حدیث اور علوم سنت کے ذریعے ہو رہی ہے۔

قاضی ابوبکر بن العربیؒ ایک مشہور محدث ہیں۔ مالکی فقیہ بھی ہیں اور مالکی فقہا میں ان کا ایک بہت بڑا مقام ہے، محدث بھی ہیں اور مفسر قرآن بھی ہیں۔ انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ تمام اسلامی علوم، جن کی تعداد اُس وقت ساڑھے سات سو کے لگ بھگ اندازہ کی جاتی تھی، یہ سب

اسلامی علوم سنت کی شرح ہیں اور سب کے سب بالواسطہ یا بلا واسطہ حدیث اور سنت کی تفسیر اور توضیح سے عبارت ہیں۔ اور حدیث اور سنت قرآن پاک کی شرح ہے۔ لہٰذا قرآن پاک، حدیث اور دیگر تمام علوم وفنون میں وہ رشتہ ہے جو درخت میں، اس کے تنے اور شاخوں میں اور پھلوں اور پھولوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ سارے علوم وفنون پھل اور پھول اور پتے ہیں، سنت شاخیں اور تنا ہے اور قرآن پاک وہ جڑ ہے جس سے یہ سارے علوم وفنون نکلے ہیں۔

یہاں تفصیلی مثالیں دینے کا موقع نہیں ہے، گفتگو طویل ہو جائے گی، لیکن چند مثالیں دینے پر اکتفا کرتا ہوں، جن سے یہ پتہ چلے گا کہ اسلامی علوم وفنون کا آغاز علم حدیث اور سنت کی بنیاد پر کیسے ہوا؟

مسلمانوں کا ایک بہت بڑا اور اہم فن ہے علم کلام۔ جس کو بعض لوگ انگریزی میں Scholasticism بھی کہتے ہیں اور جس کو آپ Theology بھی کہہ سکتے ہیں۔ علم کلام سے مراد وہ علم ہے جس میں عقلی دلائل کے ذریعے اسلام کے عقائد کو ثابت کیا جائے اور اسلام کے عقائد پر دوسرے مذاہب اور نظریات کے اعتراض کا جواب دیا جائے۔ اس کو علم کلام کہتے ہیں۔ اس پر صرف چند کتابیں ہی نہیں بلکہ پوری لائبریریاں اور کتب خانے موجود ہیں۔ لیکن اس علم کا آغاز جن مسائل سے ہوا وہ مسائل سب سے پہلے تفصیل کے ساتھ علم حدیث میں بیان ہوئے۔ جب محدثین نے احادیث کے اُن پہلوؤں پر غور شروع کیا جن میں عقائد بیان ہوئے تھے اور جب انہوں نے اُن احادیث کی تشریح کرنی چاہی تو ان مباحث کے نتیجہ میں علم کلام پیدا ہوا۔

ایک چھوٹی سی مثال عرض کرتا ہوں۔ مسلمان ہونے کے لئے ایمان لانا شرط ہے۔ ایمان اسلام کی لازمی شرط ہے۔ لیکن ایمان کس کو کہتے ہیں؟ اس سے کیا مراد ہے؟ اس کی تعریف کیا ہے؟ کیا محض دل میں یہ خیال ہونا کہ اللہ ایک ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ کے رسول ہیں، یہ کافی ہے؟ یا ایمان کے لئے اس سے زیادہ کچھ ہونا چاہئے؟ پھر اس سے زیادہ اگر ہو تو کیا ایمان میں کمی بیشی ہو سکتی ہے؟ ایک رائے اُس زمانے میں یہ سامنے آئی کہ ایمان میں کمی بیشی ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے وہ محدود و متعین ہیں۔ مثال کے طور پر امن الرسول بما انزل الیه من ربه والمؤمنون o کل امن بالله وملئکته و کتبه ورسله لانفرق بین احدمن رسله یہ جو ایمان مفصل یا ایمان مجمل ہے، یہ تو متعین ہے۔ اس میں

کمی بیشی کا مطلب یہ ہے کہ میں پانچ چیزوں کی بجائے چھ چیزوں کو مانتا ہوں۔ یا پانچ کے بجائے چار کو مانتا ہوں جو ایمان کی تحدید کے خلاف ہے۔ لہٰذا ایمان میں کمی بیشی تو نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ کچھ حضرات کا خیال تھا کہ ایمان میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس کچھ حضرات کا خیال تھا کہ ایمان میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے کہ جب کوئی نئی آیت نازل ہوتی ہے تو زادتهم ایمانا، یعنی ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے، تو اگر ایمان بڑھ جاتا ہے تو گھٹ بھی سکتا ہے۔ اس پر محدثین کے ہاں لمبی بحثیں ہوئیں۔ امام بخاریؒ اس رائے کے قائل تھے کہ ایمان میں کمی بیشی کا امکان ہے۔ بعض دوسرے اہل علم اور محدثین مثلاً حضرت امام ابوحنیفہ اس رائے کے قائل تھے کہ ایمان میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔

ان دونوں آراء میں کوئی تعارض نہ سمجھئے گا۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ ایمان میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی، ان کی مراد ہے ایمان کی کمیت میں کمی بیشی، یعنی Quantity کے اعتبار سے ایمان میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی، جو ایمان کا کم سے کم تقاضا ہے کہ اللہ کو اس کے رسول کو، کتابوں کو، روز آخرت کو، رسول اللہ ﷺ کی نبوت کو اور آپ کی تعلیم کو مانا جائے۔ اس میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی۔ اس میں اگر کوئی ایک چیز بھی آپ گرادیں گے تو آپ مسلمان نہیں رہیں گے۔ اگر کوئی کہے کہ جی میں باقی چیزوں کو تو مانتا ہوں بس روز آخرت کو نہیں مانتا۔ یا مثلاً باقی تمام انبیاء کو مانتا ہوں ایک موسیٰ علیہ السلام کو نعوذ باللہ نہیں مانتا۔ اگر کوئی شخص ان میں کسی ایک چیز کو بھی کم کرے گا تو وہ مسلمان نہیں رہے گا۔ اگر کوئی چیز اپنی طرف سے بڑھادے کہ میں سب انبیاء کو مانتا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ فلاں صاحب کو بھی نبی مانتا ہوں جو بعد میں وارد ہوئے، ایسا کہنے والا بھی مسلمان نہیں رہے گا۔ اس لئے جو لوگ کہتے ہیں کہ ایمان میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی وہ بالکل صحیح کہتے ہیں۔ کمی اعتبار سے، یعنی (Quantity) اور مقدار کے اعتبار سے ایمان میں کمی یا بیشی نہیں ہو سکتی، البتہ (Quality) معیار میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔

جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ ایمان میں کمی بیشی ہو سکتی ہے وہ کیفیت کے اعتبار سے کہتے ہیں کہ ایمان میں کیفیت اور شدت کے اعتبار سے کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ ایمان کی Intensity یعنی شدت کے بہت سے درجات ہو سکتے ہیں۔ ایمان کی شدت میں ہمیشہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ صحابہ کرام کو جو ایمان حاصل تھا وہ ہمیں اور آپ کو حاصل نہیں ہے۔ کسی اور کو بھی ایمان کا وہ درجہ

حاصل نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس پورے سلسلہ گفتگو میں ایک بحث اور پیدا ہوئی جس میں ایمان کی نوعیت پر ذرا فلسفیانہ انداز سے غور شروع ہوا۔ زیادہ گہرائی میں جا کر غور ہوا۔ اس سے علم کلام پیدا ہوا۔

یہ بات بڑی بنیادی اہمیت رکھتی ہے کہ جن اہل علم نے سب سے پہلے کلامی اور فلسفیانہ نوعیت کے یہ سوالات اٹھائے وہ اصلاً محدثین تھے۔ مثال کے طور پر امام بخاریؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور دوسرے محدثین نے ان سوالات سے بحث کی، کہ کلام الٰہی قدیم ہے کہ حادث ہے، یہ خالص عقلی اور فلسفیانہ مسئلہ ہے۔ لیکن امام احمد بن حنبلؒ نے یہ مسئلہ اٹھایا جو ایک محدث ہیں۔ ان مثالوں سے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ علم حدیث نے اور ذخیرہ حدیث نے ایک نیا رجحان مسلمانوں کے علوم وفنون میں پیدا کیا۔ اور اسلامی عقائد کی تعبیر، اسلامی عقائد پر اعتراضات کا عقلی انداز سے دفاع کرنے کی کوششیں ایک نئے علم کی تشکیل پر منتج ہوئیں جس کو علم کلام کہتے ہیں۔ جس میں مسلمانوں نے بڑے غیر معمولی کارنامے انجام دیئے۔

اس وقت علم کلام کی تاریخ میں جانا مقصود نہیں۔ لیکن متکلمین اسلام نے مسلمانوں کو اس گمراہی سے محفوظ رکھا جس گمراہی کا بڑے بڑے لوگ شکار ہوئے اور بڑے بڑے مذاہب اس گمراہی میں مبتلا ہوئے۔ ہر مذہب میں ایک چیلنج یہ درپیش رہا کہ معاملات میں اصل چیز انسانی عقل ہے یا وحی الٰہی ہے؟ مذہب اصل ہے یا عقل، بالفاظ دیگر انسان کے لئے ضابطۂ زندگی کی تشکیل میں وحی الٰہی فیصلہ کن ہے یا عقل کو فیصلہ کرنے کا حتمی اختیا حاصل ہے؟ کچھ لوگوں نے کہا کہ عقل ہی معاملات میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ ایسا کہنے سے مذہب کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ جیسے مغرب میں ہوا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ اصل فیصلہ کن عامل مذہب ہے۔ اس سے مذہب کو تو کچھ زندگی مل گئی، لیکن عقلیات کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور بالآخر مذہب بھی ختم ہو گیا۔ جیسے ہندومت ختم ہو گیا یا دیگر پرانے مذاہب ختم ہو گئے۔ متکلمین نے دونوں کو ایک ساتھ جوڑا۔ متکلمین نے عقل کے رشتے کو خالص دینی معاملات سے برقرار رکھا، دونوں کے تقاضے نبھائے۔ اور دینی معاملات کی عقلی تعبیریں کر کے ان دونوں میں وہ توازن پیدا کیا کہ مسلمانوں میں بیک وقت عقلی سلسلے بھی جاری رہے اور نقلی سلسلے بھی، یعنی نقل کی بنیاد پر جو سلسلے تھے، وہ بھی جاری رہے۔ اور ان دونوں میں کوئی تعارض پیدا نہیں ہوا۔ یہ نیا علم یعنی علم کلام علم حدیث کی دین ہے۔

فقہ مسلمانوں کے عملی رویہ کی تشکیل کرتا ہے، اور بتاتا ہے کہ مسلمانوں کی عملی زندگی انفرادی اور اجتماعی طور پر کیسی ہونی چاہئے۔ روزمرہ کے معاملات کو شریعت کے مطابق کیسے ڈھالا جائے۔ ایک مثالی اور متوازن اسلامی زندگی کیسے ہوتی ہے؟ اس کو فقہ کہتے ہیں۔ فقہ اور حدیث کو دو الگ الگ چیزیں مت سمجھئے گا۔ یہ بڑی کم علمی کی بات ہے۔ فقہ سے مراد یہ ہے کہ قرآن وسنت کی ان نصوص کو جو انسانوں کے عملی رویہ کی تشکیل سے عبارت ہیں ان کو گہرائی کے ساتھ سمجھا جائے۔ اور گہرائی کے ساتھ سمجھنے کے بعد ان میں جو ہدایت اور رہنمائی دی گئی ہے اس کو مختلف صورت ہائے احوال پر منطبق کیا جائے۔ اس عمل کا نام فقہ ہے اور اس کے نتیجے میں جو ہدایات مرتب ہوئیں ان سے ایک نیا فن وجود میں آ گیا۔ لیکن اس فن کی بنیاد علم حدیث پر ہے۔ اور علم حدیث سے ہی یہ چیزیں سامنے آئیں۔

احادیث میں نماز کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ احادیث میں زکوٰۃ کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں۔ احادیث میں حج کے احکام بیان ہوئے ہیں، مناسک کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ احادیث میں خرید وفروخت کے احکام، نکاح وطلاق کے احکام اور وراثت و وصیت کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ یہ سارے احکام وہ ہیں جن سے وہ بنیادیں تشکیل پاتی ہیں جن کی عملی تفصیلات فقہائے اسلام اور محدثین کرام نے مرتب فرمائیں۔ اگر علم حدیث نہ ہوتا تو علم فقہ وجود میں نہ آتا۔

جو ابتدائی فقہا ہیں اور جن سے فقہ وجود میں آئی ہے وہ سب کے سب اصلاً محدثین تھے۔ امام مالکؒ، اصل میں محدث تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ اصلاً محدث تھے۔ امام شافعیؒ اصلاً محدث تھے۔ امام محمد بن حسن شیبانی اور امام ابو یوسف اصلاً محدث تھے۔ امام اوزاعی محدث تھے۔ امام ابو جعفر طبری محدث تھے، امام سفیان ثوری اور سفیان بن عیینہ محدث تھے۔ یہ سب وہ لوگ ہیں جن سے فقہی مسالک وجود میں آئے۔ اس لئے کہ انہوں نے احادیث پر اس نقطۂ نظر سے غور کیا کہ اس سے کون سے احکام نکلتے ہیں؟ جن محدثین نے اس نقطۂ نظر سے احادیث پر غور کیا کہ ان سے عقائد کون سے نکلتے ہیں۔ یعنی حسن بصری اور اس طرح کے اور بزرگ، ان کے غور وفکر کے عمل سے علم کلام مرتب ہوا، اور جن بزرگوں نے اس نقطۂ نظر سے غور کیا کہ احادیث سے احکام کون سے نکلتے ہیں۔ ان کی کاوشوں کے نتیجے میں فقہ مرتب ہوا۔

'اصول فقہ' یعنی وہ بنیادی اصول اور وہ بنیادی رہنمائی جس سے کام لے کر روزمرہ کے

فقہی احکام معلوم کئے جاسکتے ہیں یہ سارے کا سارا علم حدیث کی دَین ہے۔ علم حدیث اور سنت میں وہ احکام بیان ہوئے ہیں جن سے اصول فقہ کا علم نکلا ہے۔ اس سے پہلے میں نے عرض کیا تھا کہ مسلمانوں کی عبقریت اور Guenius کے دو عظیم الشان نمونے ہیں۔ ایک علم حدیث اور دوسرا علم اصول فقہ۔

علم حدیث اس نبوغ اور عبقریت کا نمونہ ہے کا جس میں معلومات اور معاملات کی وسعت پر دارومدار ہو۔ اور اصول فقہ اس نبوغ اور عبقریت کا نمونہ ہے جس میں تخلیقی صلاحیتیں اور نئے نئے افکار و نظریات کو سامنے لانے پر معاملات کی بنیاد ہو۔ علم اصول فقہ نے علم کلام سے کہیں زیادہ عقل و نقل کے درمیان تطبیق پیدا کی ہے اور عقل اور نقل کے درمیان توازن پیدا کیا ہے۔ اس توازن واعتدال اور جامعیت کی مثال دنیا کی کسی قوم کے مذہب یا علمی روایت میں نہیں ملتی۔ اور یہ بات آپ بلاخوف تردید نوٹ کرلیں کہ دنیا کی کسی قوم کے پاس نہ آج ایسا علم ہے، نہ ماضی میں تھا اور نہ ماضی بعید میں کوئی ایسا علم تھا۔ جس کو اصول فقہ کے مقابلہ میں رکھا جاسکے۔ جو بیک وقت خالص دینی علم بھی ہو، اس اعتبار سے اس کی اساس قرآن پاک اور سنت رسول پر ہو۔ اور بیک وقت اس کی بنیاد خالص عقلی اور تجرباتی معاملات پر بھی ہو جس کو عقل کا بڑے سے بڑا پرستار بھی عقلی بنیادوں پر غلط قرار نہ دے سکے۔ یہ مستحکم بنیادیں اصول فقہ کو علم حدیث سے حاصل ہوئیں۔ اس کی مثالیں میں دوں گا تو بات بڑی لمبی ہو جائے گی اس لئے میں صرف اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

دنیا میں اسلام سے پہلے بھی تاریخ کا تصور موجود تھا۔ اسلام سے پہلے تاریخ کی بہت سی کتابیں موجود تھیں۔ ایسی کئی کتابیں ملتی ہیں جن میں قوموں کی تاریخ بیان ہوئی ہے۔ یونانیوں میں بھی موجود تھیں ہندوستانیوں میں بھی موجود تھیں اور رومیوں میں بھی موجود تھیں۔ ہیروڈوٹس اسلام سے پہلے کا مورخ ہے۔ اس کی بیان کی ہوئی معلومات آج بھی دستیاب ہیں۔ اس کی Authentecity کتنی ہے، وہ کتنا مستند ہے یہ ایک دوسری بات ہے۔ لیکن اسلام سے پہلے کی تاریخ اور تمدنی معلومات کا ایک ذخیرہ بہر حال موجود ہے۔ ہندوؤں میں بھی اسلام سے پہلے کی کتابیں موجود ہیں جن میں کچھ تاریخی نوعیت کی معلومات بھی شامل ہیں۔ لیکن وہ چیز جس کو اسلام سے پہلے تاریخ کہا جاتا تھا، وہ کیا تھی؟ آج دنیا کا کوئی مورخ اسلام کے اس احسان کو

مانتا ہے یا نہیں مانتا۔ مانتا ہے تو بلا شبہ عدل وانصاف کی بات کرتا ہے اور نہیں مانتا تو بڑا احسان فراموش یا کم از کم ناواقف ضرور ہے۔ لیکن تاریخ کا صحیح تصور اور تاریخ کا وہ صحیح شعور جس طریقے سے مسلمانوں کو اور ان سے دنیا کو حاصل ہوا اس کا اولین مصدر و ماخذ علم حدیث ہے۔

اسلام سے پہلے تاریخ کا جو تصور تھا وہ یہ تھا کہ کسی قوم میں جو قصے کہانیاں مشہور ہیں ان کو مدون کرلیا جائے، جو رطب ویابس دستیاب ہے اس کو حقیقت مان لیا جائے۔ گویا جب تاریخ لکھنے بیٹھو تو عوام میں رائج قصے جمع کرلو، وہ سارے کے سارے بیان کردو، اور نقل کر کے جمع کردو۔ کوئی یہ پوچھنے والا نہیں تھا کہ ہیروڈوٹس صاحب! آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ماخذ کیا ہے؟ یہ چیز آپ نے صحیح لکھی ہے کہ غلط لکھی ہے؟ کس سے پوچھ کر، کس سے سن کر یا کن مآخذ کی مدد سے لکھی تھی؟ آپ سے کس نے بیان کیا؟ آپ وہاں موقع پر موجود تھے کہ نہیں تھے؟ آپ اس کے چشم دید گواہ تھے کہ نہیں تھے؟ اس وقت نہ یہ سوالات تھے اور نہ ایسا کوئی تصور تاریخ کے بارے میں موجود تھا۔

علم حدیث نے سب سے پہلے لوگوں کو یہ تصور دیا کہ جب کوئی واقعہ بیان کرو تو پہلے خود یہ اطمنان کرو اور پھر دوسروں کو یہ اطمنان دلاؤ کہ تم اس واقعہ کے عینی شاہد ہو۔ اگر عینی شاہد نہیں ہو تو جو عینی شاہد تھا اس کا حوالہ دو کہ مجھ سے فلاں شخص نے بیان کیا جو عینی شاہد تھا۔ پھر اس بات کا یقین دلاؤ کہ تم جس واقعہ کو بیان کر رہے ہو اس کو بیان کرنے میں تمہارا کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے؟ اگر اس واقعہ کو بیان کرنے میں تمہارا کوئی ذاتی مفاد ہے تو ہم تمہارے بیان کو قبول کرنے میں تامل کریں گے۔ اس لئے کہ ذاتی مفاد کی بنیاد پر آدمی بہت سی باتوں کو غلط طور پر نمایاں کرسکتا ہے اور صحیح باتوں کو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر دبا سکتا ہے۔

یہ تصورات سب سے پہلے مسلمانوں نے دیئے، سب سے پہلے اسلامی علوم وفنون میں یہ اصول پیدا ہوئے اور مسلمان مورخین نے ان کو مسلمانوں کی تاریخ پر منطبق کر کے دکھایا۔ انہوں نے مسلمانوں کی تاریخ ان اصولوں کی بنیاد پر مرتب کردی اور تاریخ نویسی کے اصول مقرر کردیئے۔ یہ دنیا کو علم حدیث کی ایک ایسی بڑی دین ہے جس کے احسان سے دنیا کبھی بری الذمہ نہیں ہوسکتی۔ گزشتہ تین چار سو سالوں کے دوران مغرب میں بڑے بڑے فلسفی پیدا ہوئے، جو فلسفہ تاریخ کے مورخین مانے جاتے ہیں، جن کی کتابیں دنیا بھر میں پڑھی جاتی اور احترام کی نظر

سے دیکھی جاتی ہیں۔لیکن آج ان مورخین کو جو اعتبار حاصل ہوا ہے اس کی بنیاد کیا ہے؟ یہ اصول تاریخ ان حضرات کے ہاں کہاں سے آئے؟

مسلمانوں میں سب سے پہلے مورخین ابن خلدون اور علامہ سخاوی ہیں جنہوں نے اصول تاریخ نویسی اور فلسفہ تاریخ کو نئے انداز سے مرتب کیا۔ علامہ سخاوی اصلاً علم حدیث کے امام تھے ان کی ایک تصنیف ہے، جو فلسفہ تاریخ اسلامی کی ایک بڑی نمایاں کتاب ہے 'الاعـلان بـالتـوبيـخ لـمـن ذم أهـل التـاريـخ '۔اس میں انہوں نے مسلمانوں کی تاریخ نویسی اور **Historiography** کے اصول بیان کئے ہیں جو سارے کے سارے علم حدیث سے ماخوذ ہیں۔

اگر آپ انگریزی میں پڑھنا چاہیں تو ایک چھوٹی سی کتاب میں ان مباحث کی تلخیص ہے **Philosophical Interpretation of History**۔ لاہور میں ایک بزرگ تھے پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم، یہ کتاب انہوں نے لکھی ہے۔ مختصر کتاب ہے۔ اس سے ذرا زیادہ تفصیل دیکھنا چاہیں تو ایک کتاب اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے شائع کی تھی **Quranic Concept of History** اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن پاک کی تعلیم کے نتیجے میں اور احادیث مبارکہ کی وضاحت کے نتیجہ میں جو تصور تاریخ پیدا ہوا، وہ کیا ہے؟ اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ علم حدیث کے علم تاریخ پر کتنے احسانات ہیں۔مزید اختصار درکار ہو تو مولانا شبلی نعمانی کی جو سیرت النبی ہے اس کی جلد اول کے مقدمے میں شبلی نے اس پر بحث کی ہے، وہ آپ پڑھ لیں تین چار صفحات کی بحث ہے۔اس میں اس بات کا خلاصہ آپ کو مل جائے گا۔ وہ ضرور پڑھ لیجئے گا۔سیرت النبیؐ، شبلی نعمانی، جلد اول، مقدمہ۔

اصول دعوت اور اسلوب دعوت ایک اہم موضوع ہے۔مسلمان اہل علم نے اس پر بیسویں صدی میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔یعنی یہ مباحث کہ دعوت کا اصول کیا ہے؟ جب دوسروں کو دعوت دی جائے تو کیسے دی جائے؟ دوسروں تک اسلام کا پیغام پہنچایا جائے تو کیسے پہنچایا جائے؟ بعد میں یہ پوری امت مسلمہ کا ایک انفرادی رویہ اور ایک طرز عمل بن گیا کہ وہ ہر جگہ اسلام کو لے کر گئے۔انہیں کار دعوت کے اصول اور اس باب میں جو رہنمائی ملی وہ احادیث سے ملی۔

تزکیہ و احسان یعنی انسان کو اندر سے کیسے پاکیزہ کیا جائے؟ انسان کے اخلاق کو اندر

سے کیسے سدھارا جائے؟ یہ مسلمانوں میں ایک بہت بڑا فن ہے۔اس پر بہت سی کتابیں لکھی گئی۔ بعض کتابیں اچھی ہیں بعض اچھی نہیں ہیں۔بعض کتابوں میں ایسا مواد بھی ہے جو اسلامی نقطۂ نظر سے نظر ثانی کا محتاج ہے۔لیکن بہت سی کتابیں ایسی ہیں جن میں بڑی صحیح باتیں کہی گئی ہیں اور احادیث اور سنت کی تعبیر اس انداز سے کی گئی ہے کہ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انسانی مزاج اور اندر کی اصلاح کیسے ہوتی ہے۔اخلاق وکردار سازی کیسے ہوتی ہے؟ اس کو علم تزکیہ اور احسان کہتے ہیں۔یہ سارے کا سارا علم حدیث سے عبارت ہے۔اور اس کی بنیاد ان احادیث پر ہے جن کو رقاق کہتے ہیں، جس کا میں نے کل تذکرہ کیا تھا۔یعنی اندر سے دل کو کیسے نرم کیا جائے۔ان احادیث میں جو رہنمائی ملتی ہے اس کو علمی انداز سے کیسے مرتب کیا جائے۔اس سے ایک نیا فن پیدا ہوا۔

علم سیَر یعنی اسلام کا بین الاقوامی قانون، یہ سارا کا سارا علم حدیث کی دین ہے۔ شروع میں علم حدیث کے وہ علماء اور محدثین جن کو بین الاقوامی تعلقات اور قانون صلح و جنگ سے زیادہ دلچسپی تھی وہ احادیث کے ان حصوں کو زیادہ محفوظ رکھتے تھے اور ان احادیث کو زیادہ پڑھتے اور پڑھاتے تھے جن سے بین الاقوامی قانون پر روشنی پڑتی ہو۔اس طرح مغازی اور غزوات رسولؐ پر الگ سے کتابیں وجود میں آنی شروع ہوئیں تو علم مغازی جود میں آیا۔علم مغازی وجود میں آیا تو علم غزوات میں جو احکام ہیں وہ وجود میں آئے تو قانون جنگ وجود میں آنا شروع ہو گیا اور دوسری صدی ہجری شروع ہونے سے پہلے پہلے بین الاقوامی قانون کے موضوع پر سیر کے نام سے ایک نیا فن وجود میں آ گیا جس کو علم سیَر کہتے ہیں جس کی بنیاد اصلاً احادیث رسول پر ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے بارے میں فرمایا تھا اور بجا فرمایا تھا کہ انا افصح العرب، میں عرب میں سب سے فصیح انسان ہوں۔اللہ نے دنیا کی سب سے فصیح و بلیغ قوم کو قرآن کے تحمل کے لئے منتخب فرمایا۔اور جو رسول بھیجا، اسے ایسے شہر میں بھیجا جو فصاحت و بلاغت میں اپنی جگہ معیار سمجھا جاتا تھا۔جہاں کی زبان ٹکسالی سمجھی جاتی تھی، یعنی مکہ مکرمہ میں، اس قبیلہ میں بھیجا جس قبیلے کی زبان بڑی ٹکسالی سمجھی جاتی تھی یعنی قریش۔اور قریش میں فصیح ترین انسان اللہ نے رسول اللہ ﷺ کو بنایا۔لہٰذا رسول اللہ ﷺ کے ارشادات ماخذ ہیں فصاحت و بلاغت کے اصولوں کا۔ جن مفسرین اور محدثین نے قرآن پاک کے ساتھ ساتھ سنت اور حدیث کے ذخائر کا فصاحت و بلاغت اور ادبیت کے نقطۂ نظر سے جائزہ لیا۔ان کی کاوشوں کے نتیجہ میں علم بلاغت کے قواعد

مرتب ہونے شروع ہوئے، اور یوں بلاغت کے نام سے ایک نیا فن وجود میں آنا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ ایک بڑا فن معرض وجود میں آ گیا۔

یہ وہ علوم وفنون ہیں جو براہ راست علم حدیث کی تاثیر کے نتیجہ میں مسلمانوں کے ہاں وجود میں آئے۔ لیکن علم حدیث کی اہمیت ان سے بھی بڑھ کر ہے۔ یہ علوم وفنون وجود میں آئے اور آج بھی ان میں وسعت آتی جارہی ہے۔ ہر آنے والا دن علم حدیث میں ایک نیا میدان ہمارے سامنے لے کر آتا ہے جس پر آخری خطبہ میں گفتگو ہوگی۔ ہر نیا آنے والا استاذ علم حدیث کا نئے انداز سے مطالعہ کرتا ہے اور نیا آنے والا ہر طالب علم نئے انداز سے مطالعہ کرتا ہے۔ علم حدیث کے نئے نئے گوشے روز بروز ہمارے سامنے آتے چلے جارہے ہیں۔ لیکن علم حدیث کی جو دیرپا اہمیت ہے جو دائمی، ازلی اور ابدی اہمیت ہے، وہ ہے بطور ماخذ تشریع اور ماخذ قانون کے، جس پر تفصیل سے گفتگو آگے چل کر ہوگی۔

قرآن وسنت کا باہمی تعلق

ماخذ قانون اور ماخذ شریعت ہونے کی حیثیت سے قرآن اور سنت دونوں میں اتنا گہرا باہمی تعلق ہے کہ وہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ قرآن مجید بنیاد ہے، سنت رسول اس بنیاد پر تعمیر کیا جانے والا ڈھانچہ ہے۔ قرآن مجید تنا ہے اور سنت رسول اس تنے سے نکلنے والی شاخیں ہیں۔ قرآن مجید ایک ایسا مرکز نور ہے جس سے شعاعیں نکل رہی ہیں اور وہ شعاعیں سنت رسول ہیں۔ قرآن مجید میں بنیادی اصول اور کلیات بیان کئے گئے ہیں۔ فقہی احکام کے اصول وکلیات جہاں جہاں بیان ہوئے ہیں جزئیات کے پردے میں بیان ہوئے ہیں۔ ان کلیات کی عملی تطبیق احادیث کے ذریعے ہوئی۔ اس عملی تطبیق کے نتیجہ میں مزید احکام نکلے، فقہائے اسلام نے ان پر غور کیا۔ غور کرنے سے مزید احکام نکلتے چلے گئے۔ جب دو قسم کے احکام کو سامنے رکھا گیا تو تیسری قسم کے احکام سامنے آ گئے، تیسرے اور دوسرے حکم کو سامنے رکھا تو چوتھا حکم سامنے آیا، چوتھے اور تیسرے کو سامنے رکھا تو پانچواں حکم سامنے آ گیا۔ یہ سلسلہ آج تک چلتا چلا جارہا ہے۔ اور ہر مرحلہ پر ان میں سے ہر حکم کی براہ راست وابستگی احادیث رسول اور سنت رسول سے ہے۔ کوئی حکم اور کوئی فقہی مسلک اس وقت تک قابل قبول نہیں ہے جب تک اس کو براہ

راست حدیث رسول کی سند حاصل نہ ہو۔ گویا احادیث رسول نے فقہی ارتقا اور قوانین فقہ کی توسیع کے عمل کو اس طرح سے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے جس طرح گھوڑے کی لگام سوار کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ انسانی تصورات کو پھیلنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ انسان کا ذہن ہر وقت کام کرتا رہتا ہے۔ انسان کا ذہن کسی افق کا پابند نہیں ہوتا۔ آپ رات کو آنکھیں بند کر کے لیٹیں اور سوچیں تو لگے گا کہ پوری کائنات کا افق آپ کے سامنے کھلا ہوا ہے۔ اس افق میں نہ زمین ہے نہ آسمان ہے۔ اس کی نہ حدود وثغور ہیں، نہ کوئی ابتداء نہ انتہا، نہ کچھ اور ہے۔ یہ ایک لامتناہی وسعت ہے جو آپ کے سامنے ہے۔ یہی وسعت انسان کی عقل میں ہوتی ہے۔ اگر اس لامتناہی وسعت کو کسی حد اور ضابطہ کا کا پابند نہ کیا جائے تو انسان کبھی مشرق کی طرف جائے گا کبھی مغرب کی طرف جائے گا اور اس کے سامنے کوئی راستہ متعین نہیں ہوگا۔ بار بار ایک ہی سفر کو طے کرے گا۔ اس لئے اس کی لگام کو کس کے رکھنا ضروری ہے۔ اس کو حدود کا پابند کر کے رکھنا ضروری ہے۔ یہ حدود کی پابندی اور یہ لگام کسنے کا عمل حدیث رسول ﷺ نے کیا ہے۔

قرآن مجید کے عمومی کلیات یا ہدایات وہ ہیں کہ اگر حدیث وسنت کا حوالہ ختم کر دیا جائے تو ان کی اچھی تعبیر بھی ہوسکتی ہے اور بُری تعبیر بھی ہوسکتی ہے۔ قرآن مجید میں خود ایک جگہ لکھا ہوا ہے "یضل به کثیراً و یهدی به کثیراً" کہ اللہ تعالیٰ اس قرآن کے ذریعے بہت سوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہت سوں کو ہدایت دیتا ہے۔ جو لوگ سنت اور حدیث سے ہٹ کر قرآن سے رہنمائی لینا چاہتے ہیں وہ گمراہ ہو جاتے ہیں اس لئے کہ قرآن مجید کی تعلیم ایک عمومی چیز ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں عدل کی تعلیم ہے۔ لیکن عدل سے کیا مراد ہے؟ عدل کیا چیز ہے؟ جب تک اس کو سنت کی شکل میں Concretise نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک آپ کا جو جی چاہے عدل کو معنی پہنا دیں۔

آج سے تقریباً ستر اسی سال پہلے برصغیر میں ایک صاحب پیدا ہوئے جنہوں نے کہا کہ قرآن مجید کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے حدیث اور سنت کی ضرورت نہیں ہے، چونکہ حدیث اور سنت میں بڑا اختلاف ہے اس لئے اس نے مسلمانوں میں فرقے پیدا کئے ہیں۔ ایک بزرگ اُن صاحب سے ملے اور ان سے کہا کہ یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ آپ مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر سنت اور حدیث کی وجہ سے اختلاف پیدا ہوا ہے تو قرآن کی بنیاد پر اتحاد ہو جائے گا۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ لیکن آپ ذرا یہ بتایئے کہ قرآن پاک میں نماز کا حکم ہے

'اقیموا الصلوٰۃ 'تو نماز آپ کیسے پڑھیں گے؟ اب تک تو ایک متفق علیہ شکل یہ رائج تھی کہ حدیث میں نماز پڑھنے کا جو طریقہ ہے اس طرح پڑھیں۔ لیکن یہ شکل آپ کے لئے قابل قبول نہیں اور اس کو آپ ختم کرنا چاہتے ہیں تو پھر نماز آپ کے طریقے سے پڑھی جائے یا ہر شخص اپنے دل پسند طریقے سے پڑھے؟ پہلے تو انہوں نے کہا کہ نہیں میں بتاؤں گا اقیموا الصلوٰۃ کا کیا مطلب ہے اور نماز کیسے پڑھی جائے۔ اس پر ان بزرگ نے ان منکر حدیث صاحب سے کہا کہ اگر رسول اللہ ﷺ کو یہ بتانے کا حق نہیں کہ نماز کیا ہے اور کیسے پڑھی جائے اور ان کے بتانے سے اختلاف ہوتا ہے تو پھر خود آپ کو کیا حق پہنچتا ہے؟ اور آپ کے بتانے سے اختلاف کیوں نہیں بڑھے گا؟ تھوڑی ردّ وقدح کے بعد ہی انہوں نے اپنا موقف بدلا اور کہنے لگے کہ نہیں ہر شخص اپنے ذوق کے مطابق پڑھے گا۔ اس پر ان بزرگ نے فرمایا کہ اس وقت تو مسلمانوں میں نماز پڑھنے کے تین یا چار طریقے ہوں گے، کوئی ناف کے اوپر ہاتھ باندھتا ہے کوئی نیچے باندھتا ہے، لیکن اُس وقت تو ایک ارب طریقے ہوں گے۔ کیونکہ ہر شخص اپنے طریقے سے پڑھے گا۔ تو جو چیز وحدت کا سبب بنی اس کو وحدت ہی کی خاطر آپ ختم کرنا چاہتے ہیں اس سے تو اتنا اختلاف پیدا ہو جائے گا جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

کہنا یہ ہے کہ قرآن مجید کی جو عمومی ہدایات اور احکام ہیں ان کی عملی تشکیل، اور یقینی تشکیل اور متفقہ اور متحدہ تشکیل اگر ہوتی ہے تو صرف اور صرف حدیث اور سنت کے ذریعے ہوتی ہے۔ کسی اور ذریعے سے نہیں ہو سکتی۔

دشمنان اسلام کی اور گمراہ فرقوں کی ہمیشہ یہ کاوش رہی ہے کہ حدیث اور سنت کا اور قرآن مجید کا تعلق منقطع کر دیا جائے۔ حضرت علی بن طالبؓ کے زمانے میں خوارج کے نام سے ایک فرقہ پیدا ہوا۔ جن میں اکثر وبیشتر بڑے کم علم لوگ تھے، وہ عموماً بدّو قسم کے لوگ تھے، زیادہ علم نہیں تھا۔ قرآن پاک تھوڑا بہت جانتے تھے۔ حدیث کے ذخائر سے واقف نہیں تھے۔ انہوں نے بعض معاملات میں حضرت علیؓ کے فیصلوں پر اعتراضات کئے اور ان کے خلاف جنگ شروع کردی۔ حضرت علیؓ نے خوارج سے گفتگو کرنے کے لئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو بھیجا، جو صحابہ کرام میں علم وفضل کے لحاظ سے بڑا اونچا مقام رکھتے تھے، اور قرآن فہمی میں 'ترجمان القرآن' کا لقب ان کو حاصل تھا، ان کو خوارج سے گفتگو کے لئے بھیجا اور یہ کہہ کے بھیجا کہ خوارج تم سے

قرآن پاک کے حوالہ سے بات کریں گے تو تم قرآن پاک کے حوالہ سے بات مت کرنا۔ اس لئے کہ قرآن پاک کے حکم میں تو متعدد تعبیریں ہوسکتی ہیں۔ لیکن جو صحیح تعبیر ہے وہ صرف حدیث اور سنت ہی سے ملے گی، اس لئے سنت کے حوالہ سے ان سے بات کرنا، قرآن پاک کے حوالہ سے بات مت کرنا۔ یہ ایک جلیل القدر صحابیؓ دوسرے جلیل القدر صحابیؓ کو مشورہ دے رہا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے جا کر خوارج سے سنت ہی کے حوالہ سے بات کی اور بہت سے خوارج کو ان کی گمراہیوں سے روکا اور نکالا۔ اس لئے علم حدیث کی اہمیت مسلمانوں کے لئے نہ صرف علوم وفنون کی خاطر بلکہ قرآن مجید کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے بھی ناگزیر ہے۔

اب میں اختصار کے ساتھ ایک چیز اور عرض کر دیتا ہوں۔ کل علم حدیث کے موضوعات کا تذکرہ ہوا تھا۔ علم حدیث کے آٹھ موضوعات مشہور ہیں، جن کی تفصیل بیان کرتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا کہ وہ کتابیں جو علم حدیث کے ان سارے موضوعات پر حاوی ہوں وہ کتابیں جامع کہلاتی ہیں جیسے امام ترمذیؒ کی کتاب جامع ترمذی کہلاتی ہے، یا صحیح بخاری الجامع الصحیح کہلاتی ہے۔

لیکن کچھ کتابیں ایسی ہیں کہ جن میں فقہی احادیث کو فقہی مسائل کی ترتیب سے بیان کیا گیا ہے۔ وہ کتب احادیث جن میں مسائل کی ترتیب فقہی ہو۔ مثلاً پہلے وضو کے احکام ہوں پھر نماز کے احکام ہوں، پھر زکوٰۃ کے احکام ہوں، پھر روزے کے احکام ہوں۔ اور صرف فقہی معاملات سے متعلق احادیث کو لیا گیا ہو، وہ کتابیں سُنَن کہلاتی ہیں۔ جیسے سنن ابوداؤد۔ سُنَن ابوداؤد کتب حدیث میں فقہی احکام کا ایک بہت بڑا مصدر و ماخذ ہے۔

شروع میں جب احادیث مرتب ہو رہی تھیں اور صحابہ کرامؓ احادیث کا سب سے بڑا ذخیرہ اور مصدر و ماخذ تھے تو ہر تابعی کی کوشش ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ صحابہ کرام کے پاس حاضر ہو کر ان کی احادیث اپنے پاس نوٹ کر لے۔ اس لئے تابعین کے پاس احادیث کے جو مجموعے ہوتے تھے وہ صحابہ سے سنے ہوئے ہوتے تھے۔ مثلاً ایک صحابیؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے سنی ہوئی احادیث اپنے پاس نقل کر لیں۔ پھر حضرت عمرؓ سے سنی ہوئی احادیث نقل کر لیں۔ اس طرح شروع شروع میں جو مجموعے مرتب ہوئے وہ صحابہ کرام کی مرویات کے مجموعے تھے۔ لہٰذا جن کتابوں میں احادیث صحابہ کرام کی ترتیب سے جمع کی گئی ہوں ان کو مُسنَد کہا جاتا ہے۔ مسندوں میں سب سے بڑی کتاب مسند امام احمد ہے جس میں بہت بڑی تعداد میں

احادیث شامل ہیں۔ مسند امام احمدؒ کے ساتھ کچھ اور مسندیں بھی ہیں۔ مسند امام احمد تو ہے ہی، مسند ابوعوانہ ہے، مسند ابوداؤد طیالیسی ہے۔ یہ سب وہ ہیں جن میں صحابہ کی ترتیب سے الگ الگ احادیث جمع کی گئی ہیں۔ صحابہ کی ترتیب میں کیا اصول رکھا جائے اس باب میں بھی محدثین کے اپنے اپنے ذوق تھے۔ مثلاً امام احمد نے یہ ترتیب اس حساب سے رکھی ہے کہ اسلام میں ان صحابی کا درجہ کیا ہے؟ چنانچہ سب سے پہلے عشرہ مبشرہ کی احادیث درج کی ہیں۔ عشرہ مبشرہ میں سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ کی احادیث ہیں۔ پھر بقیہ عشرہ مبشرہ، اس کے بعد ترتیب کے ساتھ وہ دیگر صحابہ جوان کے خیال میں اسلام میں اونچا مقام رکھتے تھے۔ کچھ مسندوں کے مصنفین نے فیصلہ کیا کہ حروف تہجی کے اعتبار سے (Alphabetical) ترتیب رکھیں گے۔ کچھ مصنفین نے طے کیا کہ رشتہ داری کے حساب سے ترتیب رکھیں گے کہ جس صحابیؓ کی قرابت رسول اللہ ﷺ سے زیادہ ہوگی، اس کی احادیث پہلے ہوں گی۔ اس لحاظ سے بنی ہاشم کی احادیث پہلے ہوں گی۔ یہ ترتیب انہوں نے اپنی اپنی سہولت کی خاطر رکھی۔ لہٰذا مسند اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں احادیث کو صحابہ کی ترتیب سے بیان کیا گیا ہو۔

حدیث کی ایک کتاب ہوتی ہے 'مُعجَم' آپ نے سنا ہوگا معجم طبرانی کبیر، معجم طبرانی صغیر، معجم طبرانی اوسط، اور بھی کئی معجمیں ہیں۔ معجم سے مراد وہ احادیث ہیں جن میں مرتب کرنے والے محدث نے اپنے استاد کی ترتیب سے احادیث کو جمع کیا ہو۔ مثلاً آپ حدیث کے طالب علم ہیں، آپ نے دس اساتذہ سے احادیث پڑھیں اور ان کی حدیثیں آپ کے پاس ہیں۔ اب جب آپ ان کو کتابی شکل میں مرتب کریں گے تو آپ سب اساتذہ کی احادیث الگ الگ کر دیں گے، باب اول استاد الف کی احادیث ہیں، باب دوم استاد 'ب' کی احادیث ہیں۔ باب سوم استاد 'ج' کی احادیث ہیں۔ اس طرح کی ترتیب پر مشتمل احادیث کی کتاب کو معجم کہتے ہیں۔ اس میں بھی حروف تہجی کی ترتیب ہوسکتی ہے یا کوئی بھی ترتیب ہوسکتی ہے۔ معجم کے نام سے احادیث کی جو کتابیں ہیں ان میں طبرانی کی تین معجمیں زیادہ مشہور ہیں۔ پہلے امام طبرانی نے معجم کبیر لکھی۔ پھر امام صاحب کو خیال ہوا کہ یہ تو بہت بڑی ہے اس لئے اس کی تلخیص کی اور معجم صغیر لکھی، پھر خیال ہوا کہ یہ تو بہت چھوٹی رہ گئی تو ایک معجم اوسط لکھی جو درمیانے درجے کی ہے۔ یہ تینوں معجمیں چھپی ہوئی موجود ہیں اور دستیاب ہیں۔

کچھ کتابیں ایسی ہیں کہ جن کے مصنفین نے یہ چاہا کہ صرف ان احادیث کو یکجا کریں جو تمام محدثین کے نزدیک صحیح ہوں۔ اور جن میں روایتی اعتبار سے کوئی کمی بیشی نہ ہو۔ اس پر ہم آگے چل کر بحث کریں گے۔

اس طرح کی صحیح احادیث کو انہوں نے کتابی شکل میں مرتب کیا اس کا نام 'صحیح' رکھا گیا۔ امام بخاری کی کتاب کا نام 'صحیح' ہے، صحیح مسلم 'صحیح' کہلاتی ہے، صحیح ابن حبان 'صحیح' کہلاتی ہے، صحیح ابن خزیمہ صحیح کہلاتی ہے۔ یہ وہ کتابیں ہیں جو الصحیح کے نام سے مشہور ہیں۔ امام بخاری کی کتاب الجامع بھی ہے اس میں آٹھوں ابواب ہیں۔ الصحیح بھی ہے کیونکہ انہوں نے ساری احادیث صحیح بیان کی ہیں اور اس میں غیر صحیح احادیث کو بیان نہیں کیا ہے۔

صحیح سے مراد یہ نہ سمجھئے گا کہ اس کا متضاد غلط ہے اور جو صحیح ہے وہ صحیح ہے باقی غلط ہیں۔ نہیں غلط یہاں مراد نہیں ہے۔ صحیح ایک اصطلاح ہے جس کا ایک خاص مفہوم ہے۔ اس پر آگے چل کر بات کریں گے۔ جو صحیح نہیں ہے وہ لازماً غلط نہیں ہے، غلط بھی ہوسکتا ہے، غیر غلط بھی ہوسکتا ہے۔

کچھ احادیث کی کتابیں ایسی ہیں جن کو مُستَدرَک کہا جاتا ہے۔ مُستَدرَک سے مراد وہ حدیثیں ہیں کہ جن میں بعد میں آنے والے کسی محدث نے کسی سابقہ محدث کی شرائط کو سامنے رکھ کر احادیث کا جائزہ لیا ہو اور ایسی احادیث جو سابقہ محدث سے رہ گئی ہوں ان کو ایک کتابی شکل میں مرتب کر دیا ہو۔ مثال کے طور پر امام بخاری کی الصحیح ہے، امام مسلم کی الصحیح ہے، ان دونوں حضرات نے یہ طے کیا کہ ہم اپنی کتاب میں صرف وہ احادیث جمع کریں گے جن کی پوری سند رسول اللہ ﷺ تک براہ راست پہنچتی ہو، جس کے درمیان میں کوئی خلا نہ ہو، جتنے راوی ہوں وہ سارے کے سارے اپنے حافظہ، عدالت اور اخلاقی پیمانہ کے معیار پر سو فیصد پورے اترتے ہوں۔ ہم اس میں کوئی ایسی حدیث بیان نہیں کریں گے جو مشہور احادیث اور سنتِ متواترہ سے متعارض ہو۔ اس طرح کی کچھ اور شرائط انہوں نے اپنے پیش نظر رکھیں۔ امام بخاری کی شرائط میں ایک اضافہ یہ بھی تھا کہ صرف اس راوی کی حدیث لیں گے جس کی اپنے استاد سے ملاقات باقاعدہ ثابت ہو۔ 'ثبوتِ لقاء' یعنی ملاقات کے ثبوت کی شرط رکھی۔ امام مسلم نے لکھا کہ ثبوت لقاء ضروری نہیں ہے امکان لقاء کافی ہے۔ یعنی اگر ایک محدث کسی ایسے محدث سے حدیث بیان

کررہے ہیں جو اس زمانے میں موجود تھے اور ان کے معاصر تھے اور اسی جگہ تھے اور اس کا امکان موجود ہے کہ ان کی آپس میں ملاقات ہوئی ہو، لیکن ان کی یہ ملاقات ہمارے علم میں نہیں آئی، تو میں ان کی حدیث کو تسلیم کرلوں گا کہ وہ صحیح حدیث ہے۔ اس لئے کہ وہ خود اخلاق و کردار کے اتنے اونچے معیار پر ہیں کہ ان کی روایت کو قبول نہ کرنا نامناسب ہے۔

مثلاً امام مالکؒ روایت کرتے ہیں امام زہری سے۔ امام مالکؒ اتنے اونچے درجہ کے انسان ہیں کہ مجھے یہ تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں کہ امام مالکؒ کی امام زہری سے ملاقات ہوئی تھی کہ نہیں ہوئی تھی۔ جب وہ روایت کرتے ہیں تو دونوں ایک زمانے میں تھے۔ امام زہری مدینہ بارہا تشریف لائے، حج کے لئے تشریف لائے، مدینہ منورہ میں ایک عرصہ رہے اس لئے اس کی تحقیق کئے بغیر کہ ان کی ملاقات واقعی ہوئی بھی تھی کہ نہیں ہوئی تھی میں ان کی روایت قبول کروں گا۔ اس لئے امام مسلم نے کہا کہ امکان لقاء کافی ہے ثبوت لقاء ضروری نہیں ہے۔ یہ تھوڑا سا فرق ہے امام مسلم اور امام بخاری کی شرائط اور معیارات میں۔ ان معیارات کی بنیاد پر دونوں نے اپنے اپنے مجموعے مرتب کئے۔ ان دونوں حضرات کے قریباً سو یا سوا سو سال بعد امام حاکم تشریف لائے۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ مختلف کتابوں میں بہت سی ایسی احادیث موجود ہیں جو ان دونوں محدثین کی شرائط پر پوری اترتی ہیں لیکن ان دونوں نے اپنی صحیح میں ان کا ذکر نہیں کیا۔ تو انہوں نے ایک نیا مجموعہ ان احادیث کا مرتب کیا جو مستدرک کہلاتا ہے۔ المستدرك على الصحيحين، لہٰذا مستدرک سے مراد وہ مجموعہ ہے جو کسی سابقہ محدث کی شرائط پر پوری اترنے والی احادیث کا بعد میں آنے والے محدث نے مرتب کیا ہو۔ جس کی شرائط پر ہوگی اس کی مستدرک کہلائے گی۔ صحیحین کی مستدرک، ابوداؤد کی مستدرک، ترمذی کی مستدرک، اس طرح مستدرک کے نام سے خاصی کتابیں موجود ہیں۔

ایک کتاب کہلاتی ہے 'مُستَخرَج'۔ اس کے لفظی معنی تو ہیں 'نکالی ہوئی'، لیکن 'مُستَخرَج' سے مراد وہ مجموعہ ہے جس میں بعد میں آنے والے کسی محدث نے کسی سابقہ مجموعہ کی احادیث کو نئی سند سے بیان کیا ہو۔ مثلاً موطا امام مالکؒ ہے۔ اس میں امام مالکؒ ایک حدیث بیان کرتے ہیں کہ 'حدثنا نافع عن ابن عمرؓ عن النبی علیه الصلوٰة و السلام' کہ میں نے امام نافع سے سنا، انہوں نے ابن عمر سے سنا اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا اور پھر حضورؐ نے یہ

بیان فرمایا۔ اب بعد میں آنے والا کوئی محدث یہی روایت کسی اور سند سے بیان کرے، روایت یہی ہو لیکن سند اور ہو تو گویا یہ سند زیادہ باوثوق ہو جائے گی۔ بات زیادہ قابل اعتماد ہو جائے گی کہ ایک سے زیادہ سندوں اور مختلف واسطوں سے ایک ہی بات آئی ہے تو بات زیادہ صحیح ہے۔ تو گویا پہلی کسی حدیث کو Reinforce کرنے کے لئے مستخرج کے نام سے کتابیں مرتب کی گئیں جو 'مُستَخرَج' کہلاتی ہیں۔

حدیث کی کتابوں کی بڑی بڑی اور مشہور قسمیں یہی ہیں۔ اور بھی کئی قسمیں ہیں جن کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں ہے ان میں سے ایک قسم جزء کہلاتی ہے۔ 'جُـــزءٗ' کے معنی ہیں حصہ، لیکن اصطلاح میں کسی ایک صحابیؓ کی احادیث، یا کسی ایک استاذ کی احادیث، یا کسی ایک موضوع پر پائی جانے والی احادیث کے مجموعوں کو جزء کہا جاتا ہے۔ امام بخاری کی کئی کتابیں 'جزء' کے نام سے موجود ہیں۔ بعض اور محدثین نے بھی کتابیں جزء کے نام سے لکھی ہیں مثلاً 'جزء حجة الوداع جس میں حجۃ الوداع سے متعلق ساری احادیث یکجا کر دی گئی ہیں۔ اسی طرح کسی موضوع پر ساری احادیث ایک ہی جگہ پر جمع کی جائیں تو یہ مجموعہ بھی جزء کہلاتا ہے۔

ایک مجموعہ اربعین کا ہے۔ چالیس احادیث کا مجموعہ، بہت سے محدثین نے ایسے مجموعے مرتب کئے ہیں۔ اس لئے کہ حضورﷺ نے فرمایا کہ جو میری چالیس باتیں سن کر آگے دہرائے اس کے لئے بڑی بشارت ہے۔ اس بشارت کا مصداق بننے کے لئے محدثین نے چالیس احادیث کے مجموعے جمع کئے۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ یہ کام آپ بھی کر سکتی ہیں۔ اگر آپ یہ طے کریں کہ کسی ایک موضوع پر کتابوں کا جائزہ لے کر چالیس احادیث کا مجموعہ مرتب کر دیں تو آپ بھی اس حدیث کی مصداق ہو سکتی ہیں۔ مثلاً آپ یہ کر سکتی ہیں کہ ماں باپ کے حقوق پر چالیس احادیث، پڑوسیوں کے حقوق پر چالیس احادیث، طلب علم کے بارے میں چالیس احادیث، یا صفائی کی اہمیت پر چالیس احادیث جمع کر لیں، یا کوئی بھی دوسرا عنوان لے لیں اور اس پر چالیس احادیث جمع کریں، ترجمہ کریں، مختصر تشریح کریں اور چھپوا دیں یا کسی کو پڑھا دیں تو آپ اس حدیث کا مصداق بن سکتی ہیں۔ مختلف موضوعات پر اربعین کے نام سے چالیس احادیث کے سینکڑوں مجموعے ملتے ہیں۔ بہرحال یہ کتب احادیث کی بڑی بڑی قسمیں ہیں۔

محدثین کی اقسام

علم حدیث کے بارے میں آخری بات کہہ کے آج کی گفتگو ختم کرتا ہوں، علم حدیث سے جو لوگ وابستہ ہیں ان میں بڑی تعداد تو ہمارے اور آپ جیسے طالبان علم کی ہوتی ہے۔ جو طالب علم ہیں وہ تو کسی شمار قطار میں نہیں آتے، لیکن جن کا درجہ طالب علم سے ذرا آگے بڑھ کر ہے ان میں سب سے پہلا درجہ 'مُسنِد' کا ہوتا ہے۔ مُسنِد کا مطلب ہے سند بیان کرنے والا، اَسنَدَ کا مطلب ہے سند بیان کی، اور یُسنِدُ سند بیان کرتا ہے۔ لہٰذا مسند یہاں اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ مسند کے معنی ہے سند بیان کرنے والا، یعنی حدیث کا وہ سنجیدہ طالب علم جو سند کے ساتھ حدیث کا مطالعہ کرے اور سند اور رجال اور متن ان سب چیزوں کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد آگے بیان کرے وہ مسند کہلاتا ہے۔ یہ سب سے پہلا درجہ ہے۔

اس کے بعد درجہ آتا ہے محدث کا، یعنی وہ شخص جس نے علم حدیث میں اتنی مہارت حاصل کرلی ہو کہ علوم حدیث کا بیشتر حصہ اس کے علم اور مطالعہ اور حافظہ میں محفوظ ہو، وہ محدث کہلاتا ہے۔

اس کے بعد حافظ کہلاتا ہے۔ ہمارے ہاں بعض علاقوں میں حافظ اندھے اور نابینا کو بھی کہتے ہیں اس حافظ سے وہ نابینا حافظ مراد نہیں ہے، یا قرآن کے حافظ کو بھی ہم لوگ حافظ کہتے ہیں۔ یہاں حافظ سے وہ بھی مراد نہیں ہے۔ بلکہ حافظ علم حدیث کی ایک اصطلاح ہے جو بڑے بڑے علماء بلکہ ائمہ حدیث کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ آپ کے اندازے کے لئے میں عرض کروں کہ ایک زمانہ میں حافظ ابن حجر عسقلانی گزرے ہیں جن سے بڑا محدث ان کے بعد سے کوئی پیدا نہیں ہوا، ان کو آج تک حافظ ابن حجرؒ کہا جاتا ہے۔ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ ایک زمانے تک حافظ ابن تیمیہ کہلاتے تھے۔ علامہ ابن قیمؒ آج بھی حافظ ابن قیم کہلاتے ہیں۔ اس درجے کے لوگ جیسے ابن تیمیہ، ابن قیم اور ابن حجر تھے وہ لوگ حافظ کہلاتے ہیں۔ وہ لوگ جو علم حدیث کے ذخائر کو اپنی یادداشت میں محفوظ کئے ہوئے ہوں اور علم حدیث کے علوم وفنون ان کی یادداشت میں محفوظ ہوں اور علم حدیث کا کوئی گوشہ ان کے مطالعہ سے خارج نہ ہو وہ اصطلاحاً حافظ کہلاتے ہیں۔

اس کے بعد درجہ آتا ہے 'اَلحُجَّہ' کا۔ اَلحُجّہ سے مختلف لوگوں نے مختلف معنی مراد لئے

ہیں۔کسی نے کہا کہ جس کو تین لاکھ احادیث یاد ہوں وہ الحجۃ کہلاتا ہے۔کسی نے کہا کہ جس کو پانچ لاکھ احادیث یاد ہوں وہ الحجۃ ہے۔ بہر حال احادیث کی یہ تعداد لاکھوں میں ہے۔اس کے بعد درجہ آتا ہے الحاکم کا، الحاکم سے مراد وہ ہے جس کو ساری دستیاب احادیث زبانی یاد ہوں۔ جو بھی حدیث کا ذخیرہ اس وقت موجود ہے وہ سندوں کے ساتھ اس کو زبانی یاد ہوتو وہ الحاکم کہلاتا ہے۔ ان سب درجات کے بعد جو سب سے اونچا درجہ ہے وہ امیر المومنین فی الحدیث کہلاتا ہے۔ مسلمانوں نے جن بزرگوں کو امیر المومنین فی الحدیث کا لقب دیا ان میں حضرت سفیان ثوری، جن کا تذکرہ ہو چکا ہے، حضرت عبداللہ بن مبارکؒ، وہ اس درجہ کے انسان تھے کہ ایک ایک وقت میں لاکھوں انسان ان سے کسب فیض کے لئے آیا کرتے تھے۔ایک مرتبہ ان سے حدیث مبارک کی روایت سننے کے لئے لوگ جب جمع ہوئے تو دوران حدیث ان کو چھینک آگئی۔ ان کے ہزاروں شاگردوں نے جب بیک آواز اور بیک وقت یرحمک اللہ کہا تو اس سے اتنا شور پیدا ہوا کہ لوگ یہ سمجھے کہ بغداد میں شاید فساد ہو گیا اور پولیس چوکس ہو گئی کہ کیا واقعہ ہوا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ عبداللہ بن مبارک کو چھینک آئی تھی تو ان کے شاگردوں نے یرحمک اللہ کہا تھا یہ اس کا شور ہے۔عبداللہ بن مبارک کی محفل میں شرکت کرنے والے ایک شخص نے بیان کیا کہ عبداللہ بن مبارک جب حدیث بیان کر رہے تھے اور لوگ لکھ رہے تھے تو ایک ایک دوات کو آٹھ آٹھ دس دس آدمی استعمال کرتے تھے۔اس کے باوجود دواتوں کی کل تعداد ۶۳ ہزار تھی۔ایک مرتبہ ایسے ہی ایک موقع پر قرب وجوار کے ایک کنویں کا پانی خشک ہو گیا تھا کیونکہ اپنی دوات میں تازہ پانی ڈالنے والوں کی اتنی کثرت تھی کہ لوگوں کے بار بار پانی لینے سے کنواں خشک ہو گیا۔دوات میں کتنا پانی پڑتا ہے؟ ایک چھوٹے برتن سے پچیس دواتیں تر ہو سکتی ہیں اور وہاں دوات میں پانی لینے والوں کی وجہ سے کنویں کا پانی خشک ہو گیا تھا۔ یہ عبداللہ بن مبارک بھی امیر المومنین فی الحدیث کہلاتے تھے۔

امام احمد بن حنبل بھی امیر المومنین فی الحدیث کہلاتے ہیں۔ امام بخاری اور مسلم ان دونوں کا لقب بھی امیر المومنین فی الحدیث تھا۔اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ کس درجہ کے انسان کو امیر المومنین فی الحدیث کہا گیا۔ بعد میں امام مسلمؒ شاید آخری آدمی ہیں جن کو اس سلسلہ میں یہ لقب دیا گیا۔ ان کے بعد کسی اور محدث کو غالباً ایسا لقب نہیں ملا ہے سوائے حافظ ابن حجر عسقلانی

کے، جن کو علم حدیث کی تاریخ میں امیر المومنین فی الحدیث کا لقب دیا گیا ہو۔ حافظ ابن حجر عسقلانی کس درجہ کے انسان ہیں اس کا صرف اس بات سے اندازہ کیجئے کہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم ان دونوں میں زیادہ بہتر کتاب کونسی ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے موازنہ پر بھی بات کریں گے، لیکن اس نے یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں کی واضح اور بھاری اکثریت صحیح بخاری کو قرآن مجید کے بعد صحیح ترین کتاب سمجھتی ہے۔ اور مسلمانوں کی اکثریت یہی سمجھتی ہے، اغلبیت کا یہی نقطۂ نظر ہے۔ لیکن ابن خلدون نے یہ لکھا ہے کہ ابھی تک مسلمانوں نے صحیح بخاری کی شرح کا حق ادا نہیں کیا۔ جس شان کی یہ کتاب ہے اس شان کی کوئی شرح اس کتاب کی نہیں لکھی گئی اور یہ مسلمانوں کے ذمہ ابھی تک قرض ہے۔ یہ قرض ادا نہیں ہوا۔ جب حافظ ابن حجر نے بخاری کی شرح میں 'فتح الباری' لکھی تو بالاتفاق امت نے کہا کہ حافظ ابن حجر نے وہ حق ادا کر دیا جو امت کے ذمہ تھا۔

ایک حدیث ہے 'لا ھجرۃ بعد الفتح' فتح کے بعد یعنی فتح مکہ کے بعد ہجرت کی ضرورت نہیں رہی مفہوم یہ تھا۔ جب فتح الباری لکھی تو لوگوں نے کہا کہ لا ھجرۃ بعد الفتح یعنی اب شرح حدیث کے لئے گھر بار چھوڑنے کی ضرورت نہیں، اب فتح الباری لکھی جا چکی ہے۔

یہاں میں اپنی بات ختم کرتا ہوں۔ اگر کوئی سوال ہے تو اس کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

آپ نے چالیس احادیث کا مجموعہ لکھنے کی معلومات دی ہیں تو عربی متن درست طور پر سمجھ میں نہ آئے تو اس کا کیا حل ہو گا؟ جبکہ میں نے ایسا کرنے کی نیت کر لی ہے۔

کوئی بات نہیں آپ اردو زبان میں حدیث کی کوئی بھی کتاب لے لیں اور انگریزی میں کتاب لکھنی ہو تو انگریزی ترجمہ کے ساتھ کتابیں موجود ہیں، اردو میں کتاب لکھنی ہو تو اردو ترجمہ کے ساتھ کتابیں موجود ہیں۔ وہاں سے فوٹو کاپی لیں، ور اس طرح چالیس احادیث کو جمع کریں اور نیچے جو تفسیر یا شرح لکھنی ہو وہ آپ لکھ دیں۔

کراچی میں ڈاکٹر بابر کے طرز عمل کے بارے میں وضاحت کریں کہ وہ تمام احادیث لیتے ہیں جن کا تعلق اخلاق سے ہو یا قرآن سے واضح موافقت رکھتی ہوں اور احکامات کو واضح کرتی ہوں۔

مجھے نہیں معلوم کہ ڈاکٹر بابر صاحب کون ہیں۔ میں ان سے واقف نہیں ہوں۔ وہ کیا فرماتے ہیں مجھے یہ بھی نہیں معلوم۔ اس لئے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

Sir, with due respect please use easy language during the lecture

آپ چاہیں تو میں انگریزی میں بھی بات کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اردو میں انگریزی بولنا مجھے ذرا ناگوار ہوتا ہے۔ اس لئے میں غیر ضروری طور پر اردو میں انگریزی الفاظ نہیں بولتا۔ لیکن آئندہ کوشش کروں گا کہ آسان زبان میں گفتگو کروں۔

بُری سنت یا بری ریت نکالنا غلط ہے یہ سمجھائیے کہ کیا اچھی سنت جاری کرنا کیا سنت سے بڑھ کر یا بدعت سے مختلف ہے؟

پہلے یہ سمجھ لیں کہ بدعت کس کو کہتے ہیں؟ ہم جن معاملات میں شریعت کی رہنمائی میں کام کرتے ہیں وہ تین بنیادی چیزیں ہیں۔ ایک میدان عقائد کا ہے۔ یہ وہ بنیادی اصول ہیں جن کا ماننا ہم سب کے لئے لازمی ہے، گویا جن چیزوں کا ماننا ضروری ہے ان کو عقائد کہتے ہیں۔ ایک میدان عبادات کا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے نماز، روزہ، حج، تلاوت قرآن، نوافل، صدقہ وغیرہ۔ ایک میدان معاملات کا ہے جسے ہر انسان انجام دیتا ہے چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ کھاتا پیتا ہے، سواری کرتا ہے، کپڑے پہنتا ہے، کاروبار کرتا ہے، تجارت کرتا ہے۔ جہاں تک بدعت کی بات ہے تو اس کا تعلق پہلی دو چیزوں سے ہے۔ معاملات یا عادات میں بدعت نہیں ہوتی۔ اگر دین کے عقائد میں آج میں کوئی ایسا عقیدہ نکال لوں یا کوئی شخص نکال لے جس کی رسول اللہ ﷺ نے تعلیم نہیں دی، یا رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کے لئے جس چیز کی ضرورت نہیں ہے وہ بدعت ہے۔ اللہ کی عبادت کرنے کا کوئی ایسا طریقہ اگر ایسا ایجاد کر لیا جائے جس کی حضورؐ نے تعلیم نہیں دی یا حضورؐ کے تعلیم دیئے ہوئے طریقے کے لئے جس چیز کی ضرورت نہ ہو وہ بدعت ہے۔

مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ نے الہدیٰ نہیں بنایا تھا۔ اس طرح کے ڈیسک نہیں لگائے تھے جس طرح کہ آپ نے لگائے ہیں۔ ایسا روسٹرم نہیں بنایا تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی چیز بدعت نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ چیز دین کی تعلیم کے لئے آج کل کے ماحول اور زمانہ میں مفید یا ضروری ہے۔ جو چیز اسباب اور وسائل کی نوعیت کی ہو اور دین کی خدمت کے لئے ضروری یا مفید

ہو وہ بدعت نہیں ہے۔ جس کی ضرورت نہ ہواور جس کی حضورؐ نے تعلیم نہ دی ہو۔ لیکن عبادات اور عقائد سے تعلق ہو وہ بدعت ہے۔ جو چیز حرام نہیں ہے وہ آپ کے لئے بالکل جائز ہے، آپ جتنی مرضی ہو اس میدان میں نئی نئی چیزیں لایئے۔ مکان بنانے کے نئے نئے طریقے ایجاد کریں۔ کاروبار کرنے کے نئے نئے طریقے ایجاد کریں۔ کپڑا اچھے سے اچھا بنوایں، گھر کو اچھے سے اچھے طریقے سے ڈیکوریٹ کریں۔ اگر وہ حرام چیز نہیں ہے تو جائز ہے۔ گھر میں سونے کے برتن نہ رکھیں۔ اچھے سے اچھے برتن رکھنا جائز ہے۔ مردوں کے لئے ریشم نہ ہو تو اچھے سے اچھا کپڑا پہنیں، جائز ہے۔ مرد سونے چاندی کا زیور نہ پہنے، ریشم استعمال نہ کرے، کسی کے مذہبی شعائر کی پیروی نہ کرے، اس کے علاوہ ہر چیز جائز ہے۔ یعنی معاملات میں صرف حلال وحرام کی قید ہے۔ جو حرام ہے اس سے بچیں، باقی جتنا مرضی رزق حلال کمائیں، جو مرضی کریں۔

لیکن عقائد اور عبادات میں صرف اس حد تک رہیں جس حد تک رسول اللہ ﷺ اور شریعت نے اجازت دی ہے۔ اس سے آگے جانا وہاں جائز ہے جہاں جانا تعلیم پر مؤثر عمل درآمد اس کے لئے ناگزیر ہو جو حضورؐ نے سکھائی ہے۔ مثلاً حج کی تعلیم دی، حج فرض ہے۔ لیکن حج کے لئے اگر آپ جانا چاہیں تو آج ویزا لینا ناگزیر ہے، بغیر ویزا کے آپ حج پر نہیں جاسکتے۔ ویزا کے لئے پاسپورٹ ضروری ہے، پاسپورٹ کے لئے تصویر بنوانا ضروری ہے۔ تو یہ چیزیں عارضی طور پر ضروری ہو جائیں گی۔ اس لئے کہ ان چیزوں کے بغیر یہ عبادت ادا نہیں ہوسکتی۔ اگر ان سب کے بغیر حج کے حکم پر عمل ہو سکے تو پھر نہ پاسپورٹ بنوانا ضروری ہوگا نہ تصویر بنوانا نہ ویزا لینا۔ یہ چیزیں بدعت نہیں کہلائیں گی۔ اگرچہ خالص عبادات سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن بدعت نہیں ہیں اس لئے کہ عبادت کے لئے ناگزیر ہیں۔ عقائد اور عبادات سے متعلق جو چیز نہ ناگزیر ہو نہ حضورؐ نے اس کی تعلیم دی ہو، وہ بدعت ہے۔ مثلاً اگر میں آپ سے کہوں کہ کل سے آپ ساڑھے نو بجے کھڑے ہو کر چھ رکعات نماز پڑھیں جماعت کے ساتھ، اور روزانہ پہلی رکعت میں فلاں سورۃ پڑھیں، دوسری میں فلاں سورۃ پڑھیں اور سجدے میں یہ دعا کریں اور ایسا کرنا سب کے لئے لازمی ہے، تو یہ بدعت ہو جائے گی، یہ بدعت ہے اس لئے کہ مجھے ایسا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں آپ کو کسی خاص نماز کی تلقین کروں جو حضورؐ نے نہیں سکھائی۔ یا میں کہوں کہ چونکہ میں ۱۸ ستمبر کو پیدا ہوا تھا اس لئے آپ میری پیدائش کی خوشی میں اٹھارہ ستمبر کا روزہ رکھا کریں۔ یہ بدعت ہے

اس لئے کہ حضورؐ نے ایسے کسی روزے کی تعلیم نہیں دی۔

معاشرہ میں منکرین حدیث کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ عموماً لوگ ان سے متاثر نظر آتے ہیں، ایک سیدھا سادا انسان ان کے پروپیگنڈہ سے کس طرح بچ سکتا ہے؟

اس طرح بچ سکتا ہے کہ لوگوں کو علم حدیث کی تعلیم دی جائے جیسے کہ آپ یہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ لوگوں تک علم حدیث کے ذخائر اور رہنمائی پہنچائی جائے۔

اس اردو رسالہ کا نام بتادیں جس میں رسول اللہ ﷺ کے جوتے کا ذکر ہے؟

اس کا اردو نام مجھے یاد نہیں رہا۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ایک چھوٹے سے رسالہ میں اس کا ذکر ہے، جس کا عربی نام ہے، وہ اپنی کتابوں کا عربی نام رکھا کرتے تھے، لیکن رسالہ چھوٹا سا ہے، اردو میں ہے غالباً تیس چالیس صفحات کا ہے، آج سے تیس چالیس سال قبل چھپا تھا، اور کوئی پینتیس چالیس سال پہلے میں نے پڑھا تھا۔

چالیس احادیث مختلف موضوعات پر بھی جمع کی جاسکتی ہیں اور ایک موضوع پر بھی، آپ کو اختیار ہے۔ حدیث ہر جگہ رہنمائی کرتی ہے وہ سبجیکٹ وائز ہو یا الگ الگ ہو۔

جن لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ ہم سنت کو صحیح مانیں تو ہم اللہ کو نعوذ باللہ جھوٹا کہہ رہے ہیں، اللہ کہتا ہے کہ میں نے کھول کھول کر بیان کر دیا ہے اور لوگ نماز کا طریقہ قرآن سے ثابت کرتے ہیں۔

ایک جملہ حضرت علیؓ نے ارشاد فرمایا تھا۔ جملہ بڑا زبردست ہے اور بہت سے معاملات پر صادق آتا ہے۔ جب خوارج نے آپ کے خلاف بغاوت کا فیصلہ کیا، تو یہ عنوان اختیار کیا کہ قرآن پاک میں آیا ہے کہ اِن الحکم الاّ للہ فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اللہ کو ہے اور آپ نے دو ثالث مقرر کر دیئے، تو آپ نے قرآن پاک کی آیت کی خلاف ورزی کی۔ حضرت علی نے فرمایا کہ کلمة حق ارید بها الباطل، یہ جملہ تو حق ہے لیکن مراد اس سے باطل ہے۔ نیت اور عزائم برے ہیں جملہ درست ہے۔ تو یہ جملہ تو درست ہے کہ قرآن پاک میں ہر چیز کو کھول کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ لیکن نیت اس سے باطل ہے۔ قرآن پاک کوئی نظری یا مجرد یا Abstract کتاب نہیں ہے کہ کسی خلا میں نازل ہوئی ہو۔ بلکہ قرآن مجید ایک کتاب ہدایت اور ایک دستور العمل ہے جس کے ساتھ اس کا پڑھانے والا بھی بھیجا گیا تھا۔ خود قرآن مجید میں یہ لکھا ہوا ہے، کل اس پر بات کریں گے اور یہ بات واضح ہوجائے گی کہ یہ اعتراض بے بنیاد ہے۔

قرآن مجید میں ہے کہ لتبین للناس مانزل الیھم آپ پر یہ کتاب اس لئے نازل کی گئی ہے کہ آپ اس کتاب کو ان لوگوں کے سامنے بیان کریں جن کے لئے یہ اتاری گئی ہے۔ بیان سے کیا مراد ہے؟ اگر بیان انہی آیات کا دہرانا ہے تو یہ ایک بے کار عمل ہے جس کے لئے کسی نبی کو بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بیان سے مراد کیا تھی؟ کیا رسول اللہ ﷺ صرف آیات کے دہرانے پر اکتفا فرماتے تھے یا اس کی وضاحت بھی فرماتے تھے؟ اگر صرف آیات دہرانے پر اکتفا فرماتے تھے تو تحصیل حاصل ہے۔ سننے والا کسی سے بھی سن لے۔ میں آج قرآن پاک پڑھ لوں وہ کافی ہے، اور اگر آپ آیات قرآنی کی وضاحت بھی فرماتے تھے تو اسی وضاحت کا نام سنت ہے۔ پھر قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے کہ نبی کے چار کام ہیں۔ یتلوا علیھم ایاتہ ،اس کی آیات تلاوت کرتے ہیں، ویزکیھم ،لوگوں کا تزکیہ کرتے ہیں، گویا ان کو اندر سے ستھرا کرتے ہیں، ویعلمھم الکتاب اور کتاب کی تعلیم دیتے ہیں، والحکمۃ، اور دانائی سکھاتے ہیں تو یہ باقی تین چیزیں جو ہیں وہ ان میں شامل ہیں کہ نہیں۔ یتلو اعلیھم ایاتہ میں تو وہ چیز شامل ہوگئی جو منکرین حدیث بتاتے ہیں۔ اگر قرآن بغیر حضور کی تشریح کے واضح تھا تو یتلوا علیھم ایاتہ کافی تھا، یہ یزکیھم حضور کیسے کرتے تھے؟ کوئی ہدایات دیتے تھے؟ زبان مبارک سے کچھ ارشاد فرماتے تھے یا خاموش رہتے تھے؟ تو وہ جو ہدایات تھیں وہ کیا ہیں؟ وہ قرآن پاک کے اس تزکیہ کی وضاحت ہیں یا نہیں ہیں؟ اور ویعلمھم الکتاب ، تعلیم کتاب کیا ہے؟ وہ تلاوت آیات سے مختلف چیز ہے۔ اگر وہ تلاوت آیات سے کوئی مختلف چیز ہے تو یہ قرآن پاک کی تفسیر ہے جو حدیث میں آئی ہے، اور حکمت سکھاتے ہیں تو یہ تو کتاب کی تشریح سے بھی الگ چیز ہے۔ تو گویا خود قرآن پاک میں درجنوں آیات ہیں جن سے سنت کا شارح قرآن ہونا ثابت ہوتا ہے۔ جو لوگ ایک آیت لے کر باقی کا انکار کرتے ہیں وہ قرآن کے بھی منکر ہیں۔ وہ صرف سنت کے منکر نہیں، وہ قرآن کے بھی منکر ہیں۔ اور قرآن بھی ان کے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ غالباً قرآن کو توڑنا مروڑنا آسان ہے، سنت کو توڑنا مروڑنا دشوار ہے، اس لئے سنت کا انکار کرتے ہیں تاکہ پھر اسلام سے جان چھوٹ جائے۔

اگر ہم چالیس احادیث کا مجموعہ لکھنا یا یاد کرنا چاہیں تو کیا سند کے ساتھ یاد کرنا پڑیں گی؟

نہیں ضروری نہیں۔ آپ کی مرضی ہے اگر آپ بغیر سند کے بیان کریں۔ تو کسی مستند کتاب سے نقل کریں۔ غیر مستند کتاب سے نہ کریں اور سند بیان کرنا چاہیں تو آپ ضرور سند بیان کریں۔

حدیث کے متعلق جاننے کا بہت اچھا موقع ملا ہے۔ اللہ پاک آپ کو جزائے خیر دے، آمین۔ اس لیکچر کو لکھنے میں مشکل ہو رہی ہے۔ اگر آپ کی نظر میں کوئی خاص کتاب ہو جس کو ہم پڑھ سکیں یا کوئی اور طریقہ بتائیں جس سے ہم اصطلاحات کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔

اصل میں یہی طے ہوا تھا کہ یہ لیکچر ریکارڈ ہوں گے اور بعد میں ان کو ٹرانسکرائب کر کے میں ایڈٹ کروں گا تو شائع بھی کریں گے انشاءاللہ۔ اردو میں کوئی کتاب آپ دیکھنا چاہیں تو میں کل چیک کر کے بتادوں گا۔ میں اکثر اردو کتابیں نہیں پڑھتا ہوں۔ زیادہ تر عربی کتابیں دیکھتا ہوں۔ وہی بتا سکتا ہوں۔ لیکن اردو میں اس پر ایک تو ڈاکٹر خالد علوی صاحب کی بڑی اچھی کتاب ہے 'حفاظت حدیث'۔ اور ایک کتاب علوم حدیث پر ہے، ایک جلد چھپی ہے دوسری جلد چھپنے والی ہے۔ 'اصول حدیث' پر بھی دو تین کتابیں موجود ہیں۔ ایک کتاب ہے نخبة الفكر، حافظ ابن حجر کی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ اور بھی کئی ہیں میں کل چیک کر کے آپ کو مزید کتابوں کے نام بتادوں گا۔

فقہی ترتیب سے کیا مراد ہے؟

فقہی ترتیب سے مراد ہے کہ فقہ کی کتابوں میں مضامین کو بیان کرنے کا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اس میں طہارت کے احکام ہوتے ہیں۔ پھر نماز کے احکام ہوتے ہیں۔ پھر زکوۃ اور روزہ کے احکام ہوتے ہیں۔ پھر حج کے احکام ہوتے ہیں۔ پھر نکاح وطلاق کے احکام ہوتے ہیں۔ پھر وراثت و وصیت، پھر معاملات اور خرید وفروخت لین دین، یہ ترتیب فقہ کی سب کتابوں میں رائج ہے اور امام مالکؒ کے زمانہ سے رائج ہے۔ احادیث کی وہ کتابیں جو اس ترتیب سے ہوں جن میں سب سے پہلے طہارت، نماز روزے کے احکام ہوں وہ سُنَن کہلاتی ہیں، جن میں یہ ترتیب نہ ہو وہ سنن نہیں کہلاتیں۔ مثلاً صحیح بخاری میں یہ ترتیب نہیں ہے۔ صحیح بخاری میں جو پہلا باب ہے وہ ہے باب كيف كان بدء الوحى علىٰ رسول ﷺ۔ کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی کا آغاز کیسے ہوا۔ سب سے پہلے یہ باب ہے پھر ایمان کا باب ہے پھر علم کا باب ہے۔ سنن ابن ماجہ میں پہلے علم کا باب ہے پھر بقیہ ابواب ہیں۔ ہر مصنف کی ترتیب الگ الگ ہے۔

اگر عورتوں کا محرم نہ ہو تو وہ گروپ کی شکل میں حج یا عمرہ کے لئے جا سکتی ہیں؟

یہ تو آپ کسی مفتی سے پوچھیں۔ لیکن فقہائے احناف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر کوئی

خاتون معمر ہیں اور اس کی حد انہوں نے پچاس سال مقرر کی ہے وہ بغیر محرم کے اس شرط کے ساتھ حج پر جاسکتی ہیں کہ ان کے ساتھ خواتین کی ایک بڑی تعداد ہو اور ان خواتین کے ساتھ ان کے محرم موجود ہوں ۔ یہ تو فقہی جواب ہے۔ لیکن سعودی قانون کی رو سے بغیر محرم کے کوئی خاتون حج کے لئے نہیں جاسکتی اور ہمیں اس قانون کی پابندی کرنی چاہئے۔ میں تین سال حج کے انتظامات سے وابستہ رہا ہوں۔ میں نے حج کے انتظامات کو براہ راست دیکھا ہے۔ اس تجربہ کی روشنی میں میرا مشورہ یہ ہے کہ بغیر محرم کے کوئی خاتون کبھی حج پر نہ جائے۔ چاہے ان کی عمر کتنی ہی ہو اور شرعاً فقہا کسی نے اجازت دی ہو یا نہ دی ہو۔ بہتر یہی ہے کہ وہ محرم کے ساتھ جائے۔ میں نے ایسے ایسے واقعات اور مثالیں دیکھی ہیں کہ محرم نہ ہونے کی وجہ سے خواتین کو کتنی مشکلات پیش آئیں۔ یہ شریعت کا حکم ہے اور بہت رحمت وشفقت پر مبنی ہے۔ فقہائے اسلام میں سب نے لکھا ہے کہ اگر کسی خاتون کے ساتھ محرم نہ ہو یا اس کے پاس اتنے پیسے نہ ہوں کو وہ محرم کو بھی ساتھ لے جاسکے تو اس پر حج فرض ہی نہیں ہے۔ اپنے پاس پیسے موجود ہوں لیکن محرم موجود نہ ہو تو بھی خواتین پر حج فرض نہیں ہے۔ حج فرض تب ہی ہوتا ہے جب محرم بھی ہو اور اس کے لئے بھی پیسے ہوں۔ اپنے پاس پیسے ہوں اور محرم جانے کے لئے تیار ہو یا خاتون کے پاس پیسے ہوں کہ محرم کو لے جاسکے تبھی حج فرض ہوتا ہے۔ اس لئے اس اجازت سے فائدہ اٹھایئے اور اگر محرم ہو تو پھر جایئے اس کے بغیر بڑی مشکل پیش آتی ہے۔

سند کے ساتھ احادیث کو یاد کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ کوشش کی لیکن یاد نہیں رہتی۔

بڑی مشکل سے یاد ہوتی ہیں۔ میں نے بھی بہت کوشش کی لیکن مجھے بھی یاد نہیں ہوئیں۔ میں نے کسی زمانے میں کوشش کی تھی کہ صحیح بخاری مجھے سند کے ساتھ یاد ہو جائے لیکن یاد نہیں ہوئی۔ اللہ سے دعا کریں اپنے لئے بھی اور میرے لئے بھی، خدا کرے کہ ہم دونوں کو یاد ہو جائے۔

واخر دعوٰنا ان الحمدللہ رب العلمین۔

☆☆☆☆☆☆☆

تیسرا خطبہ

حدیث اور سنت بطور ماخذ شریعت

بدھ، 18 اکتوبر 2003

حدیث اور سنت

بطور ماخذ شریعت

اس سے پہلے دو نشستوں میں حدیث اور اس کی تعریف، سنت اور اس کی تعریف، حدیث اور اس کی اہمیت اور سنت اور اس کی ضرورت پر گفتگو کی گئی تھی۔ آج حدیث اور سنت پر اس اعتبار سے گفتگو کرنی ہے کہ یہ شریعت کا ماخذ ہے، قرآن مجید کی شارح ہے، وحی الٰہی کی تفسیر ہے۔ آج کی گفتگو کا مقصد یہ دیکھنا ہے کہ کلام ربانی کو سمجھنے میں اور شریعت کے احکام کی تفصیل بیان کرنے میں سنت اور حدیث کی اہمیت کیا ہے۔

گفتگو کو آگے بڑھانے سے پہلے ایک بنیادی بات ذہن میں رکھنی چاہئے۔ وہ یہ ہے کہ قرآن وسنت میں جو کچھ آیا ہے اس کو اصطلاح میں نصوص کہا جاتا ہے۔ نص کے لغوی معنیٰ تو عبارت یا Text کے آتے ہیں۔ لیکن اصطلاح میں نصوص سے مراد قرآن پاک اور سنت رسول کے Text یا عبارتیں ہیں جو دراصل شریعت کا ماخذ اور مصدر ہیں۔

نصوص کی دو قسمیں ہیں۔ کچھ نصوص وہ ہیں جن کو قطعی الثبوت کہا جاتا ہے۔ یعنی ان کا ثبوت قطعی اور یقینی دلائل کے ساتھ ہمارے سامنے ہو چکا ہے۔ قرآن مجید سارے کا سارا قطعی الثبوت ہے۔ احادیث اور سنت میں بھی خاصا بڑا حصہ قطعی الثبوت ہے۔ مثلاً سب کی سب متواتر احادیث اور سنن ثابتہ قطعی الثبوت ہیں۔ متواتر احادیث کی تفصیل آج کی گفتگو میں آئے گی۔ لیکن کچھ احادیث ہیں جو تواتر کے کسی درجہ تک نہیں پہنچیں وہ قطعی الثبوت نہیں ہیں اور ان کا درجہ قرآن کریم اور سنت متواترہ سے کم ہے۔ اس پر بھی آگے چل کر بات ہوگی۔ گویا کچھ نصوص ہیں جو قطعی

الثبوت ہیں اور کچھ نصوص ہیں جو ظنی الثبوت ہیں۔ جن کے بارے میں ظن غالب یہ ہے کہ یہ شریعت کا نص ہے۔

اسی طرح سے معانی اور مطالب کے اعتبار سے بھی ان نصوص کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ ہے جو قطعی الدلالت ہے۔ جس کے معنی اور مفہوم بالکل قطعی اور یقینی ہیں اور جن میں کسی اختلاف رائے کی یا کسی دوسری تعبیر کی گنجائش نہیں ہے۔ مثلاً قرآن پاک میں ہے اقیموا الصلوٰۃ، نماز قائم کرو۔ اب ہر شخص جو تھوڑی بہت بھی عربی جانتا ہے اور اسلام کی تعلیم سے تھوڑا سا بھی واقف ہے وہ یہ جانتا اور سمجھتا ہے کہ اقیموا الصلوٰۃ سے کیا مراد ہے۔ اس میں کسی دو تعبیروں کی گنجائش نہیں ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ کچھ نصوص ایسے ہیں جن میں ایک سے زیادہ تعبیروں کی گنجائش ہے۔ اور یہ گنجائش اللہ اور رسول نے ایک مصلحت سے رکھی ہے۔ جہاں اللہ اور رسول کی حکمت اور منشاء یہ تھا کہ شریعت کے احکام کو ایک سے زیادہ انداز سے سمجھا جاسکے وہاں انہوں نے ایسا اسلوب اور ایسا طرز بیان اختیار کیا جس میں ایک سے زائد تعبیرات کی گنجائش موجود ہے۔ قرآن مجید میں بہت سے الفاظ ہیں جو مشترک معنی کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن پاک فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ ترین معیار پر ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی ایسا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے عربی زبان میں ایک سے زائد معنی ہیں اور وہاں سیاق وسباق میں کوئی ایسا قرینہ بھی نہیں رکھا گیا جس سے ایک معنی متعین ہوسکیں تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ قرآن مجید کی کچھ نصوص کو ایک سے زائد انداز میں سمجھا جاسکے، جن میں ایک دو کی مثالیں میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔

اسی طرح سے حدیث پاک میں بھی ہے، رسول اللہ ﷺ کے ارشادات فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ ترین معیار پر ہیں۔ اس لئے کہ حضورؐ علیہ الصلوٰۃ والسلام افصح العرب تھے۔ کسی کا یہ تصور کرنا انتہائی بے بنیاد اور مہمل بات ہوگی کہ نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ بات تو واضح کہنا چاہتے تھے لیکن کہہ نہیں سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جس موقعہ پر جو بات ارشاد فرمانا چاہتے تھے آپؐ نے اس موقعہ پر وہی ارشاد فرمائی اور اس سے جو مفہوم نکلتا ہے وہی مفہوم حضورؐ کا مقصود تھا۔ یہ کہنا بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کہ رسول اللہ ﷺ تو کسی خاص حکم سے اپنے ذہن میں ایک خاص مقصد رکھتے تھے۔ لیکن چونکہ لغت کے اعتبار سے اس لفظ کے ایک سے زیادہ مفاہیم نکل سکتے تھے

اس لئے لوگوں نے اس کو اور طرح سمجھ لیا جو حضورﷺ کی منشا کے خلاف تھا۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔ جس چیز کو رسول اللہﷺ نے دوٹوک اور قطعی انداز میں ارشاد فرمانا چاہا اسے دوٹوک اور قطعی انداز میں ارشاد فرمایا اور جس چیز کے بارے میں حضورؐ کا ارادہ یہ تھا کہ اس کو لوگ اپنے اپنے انداز سے سمجھیں وہ بات حضورؐ نے اس طرح ارشاد فرمائی کہ لوگ اس کو اپنے اپنے انداز سے سمجھے۔

ان دونوں کی ایک ایک مثال میں آپ کو دے دیتا ہوں۔ ایک قرآن پاک سے اور ایک حدیث سے۔ قران پاک میں ایک جگہ آیا ہے کہ اگر کسی شوہر اور بیوی میں اختلاف ہو جائے اور شوہر بیوی کو طلاق دے دے تو جب تک وہ مطلقہ خاتون عدت میں ہے اس وقت تک اس مطلقہ خاتون کے اخراجات اس کے شوہر کے ذمہ ہوں گے۔ یہ مشہور معاملہ ہے جس کو متعہ الطلاق کہتے ہیں۔ اس موقعہ پر ارشاد ہوا ہے کہ علی الموسع قدرہ وعلی المقتر قدرہ، کہ خوشحال اپنی استطاعت کے مطابق اور نادار اپنی استطاعت کے مطابق۔ متاعاً بالمعروف، اس علاقے اور اس زمانے کے معروف طریقے کے مطابق ضروری ساز وسامان دے۔ یہ الفاظ قرآن پاک میں آئے ہیں جن کے قطعی الثبوت ہونے میں کوئی شک نہیں۔ لیکن موسع سے کیا مراد ہے ؟مقتر سے کیا مراد ہے؟ یہ ہر زمانے کے لحاظ سے الگ الگ طے ہوسکتا ہے۔ ایک غریب ماحول میں، ایک فقیر ملک میں دولت مند اور موسع کا مفہوم اور ہوگا اور نادار اور مقتر کا مفہوم الگ ہوگا۔ ایک انتہائی دولت مند ملک میں، مثلاً کویت میں اگر کہا جائے کہ دولت مند اپنی ستطاعت کے مطابق دے اور نادار اپنی استطاعت کے مطابق دے۔ تو کویت کے ماحول میں نادار کے معنی اور ہوں گے پاکستان کے ماحول میں نادار کے معنی اور ہوں گے، پاکستان سے بھی زیادہ کوئی غریب فقیر ملک ہوگا تو وہاں نادار کے معنی اور ہوں گے۔

ایسا اس لئے رکھا گیا کہ اللہ کی مشیت اور منشا یہ تھا کہ چونکہ ناداری اور دولت مندی اضافی چیزیں ہیں اس لئے ان کو اپنے اپنے زمانے کے لحاظ سے سمجھا جائے اور اپنے اپنے زمانے کے لحاظ سے اس کے معنی متعین کئے جائیں۔ اس کے لئے معروف کی قید بھی لگا دی جس سے یہ بات مزید واضح ہوگئی کہ اس کی بہت سی تعبیریں ممکن ہیں۔ مثال کے طور پر پاکستان کے کسی دیہات میں اگر کسی خاتون کو یہ آزمائش پیش آجائے اور وہ متاع کا مطالبہ کرے تو غالباً یہ کافی ہوگا کہ اس کو رہنے کے لئے مکان دے دیا جائے۔ اس مکان میں ضروری ساز وسامان ہو۔ دو وقت

کھانے کا انتظام ہو، ناشتہ کا انتظام ہو، کپڑے ہوں اور ضروری ساز وسامان ہو۔ شاید اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں یہی معروف ہے۔ جو دولت مند ہوگا وہ پختہ مکان دے دے گا، غریب کچا مکان دے دے گا۔ دولت مند آدمی شاید گھر میں گھوڑا بھی رکھوا دے، تانگہ بھی رکھوا دے۔ غریب آدمی یہ چیزیں نہیں رکھ سکے گا۔

لیکن اگر یہی واقعہ کسی کے ساتھ پیرس میں پیش آجائے تو پیرس میں موسع اور مقتر کے معنی اور ہوں گے۔ وہاں مطلقہ خاتون یہ مطالبہ کرسکتی ہے کہ جو گھر مجھے رہنے کے لئے دیا گیا ہے اس میں ریفریجریٹر بھی رکھا ہو، اس میں سینٹرل ہیٹنگ کا نظام بھی ہو، اس میں ٹیلیفون کی لائن بھی لگی ہوئی ہو۔ اس لئے کہ یہ چیزیں وہاں ناگزیر ہیں اور ہر آدمی کے پاس ہوتی ہیں۔ وہاں نادار سے نادار آدمی بھی ان چیزوں کے بغیر گزارہ نہیں کرسکتا۔ لیکن پاکستان میں کوئی نادار خاندان یہ مطالبہ کرے تو شائد وہ حق بجانب نہ ہو۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ شریعت کے احکام میں بعض جگہ اللہ کی حکمت ہی اس بات کی متقاضی رہی ہے کہ اس کے معنی اور مطالب کو زیادہ سے زیادہ عمومی انداز میں سمجھا جاسکے۔ اور ہر علاقے کے لوگ اپنے حالات کے لحاظ سے، ہر زمانے کے لوگ اپنے ماحول کے لحاظ سے اس کو سمجھ سکیں۔ یہ معنی ہیں ظنی الدلالت کے، یعنی جس کے معانی اور دلالت کے مفاہیم ظنی ہیں۔ آپ اپنے ظن غالب، فہم وبصیرت اور خیال سے شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے اس کے معنی اور مطالب متعین کرلیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کسی نے پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ ہم بدوی لوگ ہیں ریگستان میں سفر کرتے ہیں۔ ریگستان میں سب سے کمیاب چیز پانی ہوتی ہے۔ بعض اوقات ہم گزرتے ہیں، راستے میں کوئی تالاب یا گڑھا نظر آتا ہے، اس میں پانی جمع ہے، یا کسی پہاڑ کے دامن میں پانی جمع ہے۔ اب ہمیں نہیں معلوم کہ یہ پانی پاک ہے کہ ناپاک ہے۔ اس میں کسی درندے نے منہ تو نہیں ڈالا۔ کسی ناپاک جانور نے اس کو ناپاک تو نہیں کیا تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ تو آپؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا، مختلف احادیث میں مختلف الفاظ آئے ہیں، ایک حدیث کے الفاظ ہیں، الماء الکثیر لاینجس، کہ زیادہ پانی ناپاک نہیں ہوتا۔ ایک اور جگہ فرمایا کہ الماء الکثیر طھور لاینجسہ شئی، کہ زیادہ پانی پاک ہے کوئی چیز اس کو ناپاک نہیں کرسکتی۔ اب ذرا غور فرمایئے کہ یہ الفاظ کہ 'زیادہ پانی ناپاک نہیں ہوتا' رسول اللہ ﷺ جو افصح

العرب ہیں، آپ کی زبان مبارک سے ارادۃً اور سوچ سمجھ کر نکلے ہیں۔ یہاں آپ نے اسلام کی حکمت تشریع کے پیش نظر ایسے عمومی الفاظ استعمال فرمائے جن کی متعدد تعبیریں ممکن ہیں۔ آپؐ چاہتے تو مثلاً یہ فرمادیتے کہ پانی دس یا بیس رطل (ایک پیمانہ) ہوتو ناپاک نہیں ہوتا۔ لیکن آپ نے ماءالکثیر کے الفاظ استعمال فرمائے۔ ماء الکثیر سے کیا مراد ہے؟ کتنا پانی، جتنا کسی بڑے تالاب میں ہوتا ہے؟ اتنا پانی جتنا راول ڈیم میں ہے؟ اتنا پانی؟ یا اتنا پانی جتنا ایک ٹب میں بھرا ہوا ہے یا اتنا پانی جو ایک کولر میں بھرا ہوا ہے؟ ماء الکثیر کے مفہوم میں لغوی اعتبار سے یہ سب شامل ہیں۔

ہمارے شہر میں شاید ہم ماء کثیر کا یہ مفہوم قرار دیں کہ راول ڈیم کا پانی ماء کثیر ہے، اس لئے اس میں زیادہ پانی ہے۔ لیکن بلوچستان کے بعض علاقوں میں جہاں دس دس میل پانی نہیں ملتا، وہاں کے لوگوں کے نزدیک ایک مشک بھر پانی بھی بہت اور ماء کثیر ہے۔ بعض اور علاقے ایسے ہوں گے جہاں ایک مٹکا پانی بھی بہت زیادہ یعنی ماء کثیر قرار دیا جائے گا۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے جان بوجھ کر، سوچ کر اور حکمت کی وجہ سے یہ بات ارشاد فرمائی کہ ہر علاقہ کے لوگ اپنے حالات کے لحاظ سے اس اصطلاح کے معنی متعین کرلیں۔ چنانچہ امام ابوحنیفہؒ کے سامنے جب یہ حدیث اور اس کی تعبیر کا مسئلہ آیا تو وہ کوفہ میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں ایک طرف دریائے دجلہ بہتا تھا دوسری طرف فرات بہتا تھا۔ تو ان کے ذہن میں ماء کثیر کا جو تصور آیا وہ یہ آیا کہ اتنا بڑا تالاب کہ اگر کوئی ایک طرف سے اس کے پانی کو ہلائے تو اس کی لہر دوسرے کنارے تک نہ پہنچے۔ انہوں نے ماء کثیر کا یہ مفہوم سمجھا۔ اس کے برعکس امام مالکؒ جو مدینہ منورہ میں تشریف فرما تھے جہاں صرف دو کنویں تھے اور ان میں بھی ایک یہودی کا تھا، آپ نے سنا ہوگا، اس نے کنٹرول کیا ہوا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے پھر اس سے خرید کر وقف کردیا۔ جہاں دو کنویں تھے ایک یہودی کا تھا اور پانی کی قلت تھی۔ امام مالکؒ نے ایک اور روایت کے الفاظ سے استدلال کرتے ہوئے کہا کہ دو ایسے بڑے مٹکے جو لوگ گھروں میں پانی کے لئے رکھتے ہیں وہ اگر پانی سے بھرے ہوئے ہوں تو یہ ماء کثیر ہے۔ انہوں نے اسی مقدار کو ماء کثیر سمجھا۔ اب آپ دیکھیں دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اتنا بڑا تالاب جس میں کم وبیش دس ہزار مٹکے آجائیں وہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک ماء کثیر ہے۔ اس کے برعکس امام مالکؒ کے نزدیک ماء کثیر وہ ہے جو دو مٹکوں میں سما جائے۔ یہ دونوں مسالک اپنی جگہ

درست ہیں اس لئے کہ حدیث کے الفاظ میں دونوں کی گنجائش موجود ہے۔ مدینہ میں ماء کثیر یہ ہے، کوفہ میں ماء کثیر وہ ہے۔

اس طرح کی احادیث اور آیات قرانی جن میں ایک سے زیادہ تعبیروں کی گنجائش ہو وہ ساری تعبیریں کم ازکم لغوی اعتبار سے بیک وقت درست ہوسکتی ہوں۔ ضروری نہیں کہ ہر وقت درست ہوں۔ بلکہ درست ہوسکتی ہوں۔ ان کے درست ہونے کے امکانات اور دلائل موجود ہوں۔ یہ چیز ہے جس کو ظنی الدلالت کہتے ہیں، یعنی وہ نص جس کے معنی ومفہوم ظنی ہو۔

لہٰذا نصوص شریعہ کی چار قسمیں ہوگئیں۔ ظنی الثبوت اور ظنی الدلالت دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملائیں تو چار قسمیں بنتی ہیں۔ یہ چاروں قسمیں احکام شریعت کا ماخذ ہیں اور اسی ترتیب کے ساتھ ہیں۔ سب سے پہلے وہ چیز جو قطعی الثبوت بھی ہے اور قطعی الدلالت بھی ہے۔ جس میں قرآن پاک کی وہ آیات جو محکم ہیں اور سنت متواترہ اور احادیث ثابتہ میں جو محکمات ہیں وہ شامل ہیں۔ پھر ان نصوص کا درجہ ہے جو قطعی الثبوت اور ظنی الدلالت ہیں۔ پھر وہ نصوص ہیں جو ظنی الدلالت ہیں اور قطعی الثبوت ہیں۔ پھر وہ نصوص ہیں جو ظنی الدلالت ہیں اور ظنی الثبوت ہیں۔ یہ ترتیب ہے جس سے احادیث اور آیات دونوں سے احکام کا استدلال ہوتا ہے۔

یہ گفتگو بڑی تفصیل کی متقاضی ہے کہ ان چاروں درجات میں جب استنباط اور استدلال کا عمل شروع کیا جائے گا تو اگر ان دونوں میں کسی میں تعارض ہو تو اس کو کیسے حل کیا جائے گا۔ لیکن ایک عام بات جو کامن سنس اور عقل عام کی بات ہے وہ یہ کہ جو پہلی والی Category ہے اس کو ترجیح دی جائے گی اور سردست دوسری والی کیٹگری کو نظر انداز کردیا جائے گا۔ اس لئے جب سنت کی بات بطور ماخذ شریعت کے ہوتی ہے تو ہمارے سامنے چاروں چیزیں رہتی ہیں۔ یہ چاروں چیزیں سنت میں بھی پائی جاتی ہیں۔ قرآن پاک میں ان میں سے دو چیزیں پائی جاتی ہیں اور دو نہیں پائی جاتیں۔ قرآن پاک سارے کا سارا قطعی الثبوت ہے اس لئے ظنی الثبوت والی کیٹگری قرآن پاک میں نہیں پائی جاتی۔ احادیث میں کچھ قطعی الثبوت ہیں کچھ ظنی الثبوت ہیں۔ قطعی الدلالت اور ظنی الدلالت قرآن پاک میں بھی ہیں اور حدیث میں بھی ہیں۔ اس لئے ان چاروں کیٹگریز کا انطباق احادیث پر زیادہ ہوتا ہے قرآن پاک کی آیات پر کم ہوتا ہے۔

کل ایک بہن نے سوال پوچھا تھا کہ منکرین حدیث یہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ قرآن

مجید کی موجودگی میں کسی اور رہنمائی یا کسی اور ہدایت کی ضرورت نہیں۔اس کے جواب میں آپ کے سامنے میں نے ایک حدیث بیان کی تھی کہ 'الا انّنی اوتیت القرآن ومثله معهٗ یاد رکھو مجھے قرآن پاک بھی دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس جیسی رہنمائی اور بھی دی گئی ہے۔قرآن پاک کی متعدد آیات سے، جن کی تعداد سینکڑوں میں ہے، ان سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر نزول قرآن کے علاوہ بھی وحی ہوتی تھی جو سنت اور حدیث کی رہنمائی کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔

کل میں نے اس آیت کا بھی حوالہ دیا تھا جس میں رسول اللہ ﷺ کے چار فرائض کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یتلوا علیهم ایاته ویز کیهم و یعلمهم الکتاب و الحکمة ، یہ جو آخری تین فرائض ہیں یہ تلاوت کتاب سے ہٹ کر ہیں، تلاوت آیات سے مختلف چیزیں ہیں۔تلاوت آیات تو قرآن پاک کا بیان کر دینا ہوا۔پھر یعلمهم الکتاب و الحکمة ویز کیهم یہ تین کام ہیں، ان کا طریقہ کار کیا تھا۔اس کے لئے رسول اللہ ﷺ جو ہدایات یا رہنمائی فرمایا کرتے تھے وہی رہنمائی کیا تھی؟ وہ رہنمائی سنت کی شکل میں آج ہمارے سامنے ہے۔

خود قرآن مجید میں تین چار مقامات پر قرآن کی تبیین کا فریضہ رسول اللہ ﷺ کے سپرد کیا گیا ہے۔ لتبیّن للناس مانزل الیهم ،تا کہ آپ وہ تمام چیزیں ان کے لئے بیان کر دیں جو ان کے لئے نازل کی گئی ہیں۔یعنی قرآن پاک کی آیات اور مطالب کا بیان کرنا، بیان سے مراد محض تلاوت آیات نہیں ہے، بلکہ بیان کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کے معانی ومطالب کو بیان کر دیا جائے۔اس کے مقاصد کی تشریح کی جائے۔اس میں جو سبق پنہاں ہے اس کو روز روشن کی طرح واضح کر دیا جائے۔اس میں جہاں جہاں انسانی ذہن کی نارسائی کی وجہ سے الجھاؤ کا امکان پیدا ہوسکتا ہے اس ممکنہ الجھاؤ کو دور کیا جائے۔ جہاں جہاں غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے، اس غلط فہمی کے راستوں کو بند کر دیا جائے۔یہ ساری چیزیں بیان وتبیین میں شامل ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے جو بیان جاری ہوتا تھا، علماء اسلام نے اس کی قسمیں بیان کی ہیں۔ان میں سے بعض اقسام کا ذکر میں آج کی گفتگو میں کرتا ہوں۔ایک مشہور صحابیؓ ہیں حضرت عمران بن حصینؓ۔ وہ ایک مرتبہ اپنے حلقۂ درس میں کچھ مسائل بیان فرمار ہے تھے۔اس زمانے میں خوارج میں سے بعض جاہل اور انتہا پسند لوگ اس طرح کی باتیں کیا کرتے

تھے جیسے آج کل کے منکرین حدیث کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی خارجی باہر سے آیا ہوا تھا۔ اس نے آ کے کہا کہ 'لاتحدثنا بالاحادیث' آپ ہمیں احادیث نہ سنائیں حدثنا بالقرآن، قرآن پاک کی باتیں بتائیں۔ حضرت عمران بن حصینؓ نے قدرے ناگواری سے فرمایا کہ میں قرآن ہی کی باتیں بیان کر رہا ہوں۔ قرآن میں اگر نماز کا حکم ہے تو تمہیں کہاں سے پتہ چلے گا کہ ظہر کی رکعتیں چار ہیں، عصر کی چار ہیں اور مغرب کی تین ہیں۔ یہ اگر میں سنت سے نہیں بیان کروں گا تو تمہیں کہاں سے معلوم ہوگا۔ سنت سے بیان کروں گا تو یہ قرآن ہی کا بیان ہے۔ یہ قرآن ہی کا درس ہے، قرآن سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ 'خذوا عنا' آج یہ ساری معلومات ہم سے لے لو، اگر تم نہیں لو گے تو پھر تمہارے اندر بڑا اختلاف پیدا ہوگا اور تم ایسے معاملات اور مسائل میں الجھ جاؤ گے جن سے نکلنے کا تمہارے سامنے کوئی راستہ نہیں ہوگا۔

وحی کی اقسام

آگے چلنے سے پہلے ایک اور چیز ذہن میں رکھیں، وہ سنت کی ایک خاص قسم ہے۔ حدیث کی بقیہ اقسام پر تو تفصیل سے کل بات ہوگی لیکن ایک قسم ایسی ہے جس پر آج بات کرنا ضروری ہے۔ ہم نے یہ دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی دو طریقوں سے آتی تھی۔ ایک وہ وحی ہوتی تھی جو وحی جلی کہلاتی ہے۔ یعنی جس کے الفاظ، جس کی عبارتیں، جس کے کلمات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے تھے اور جس میں رسول اللہ ﷺ کا کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ وہ وحی تھی جس کے الفاظ اور کلمات معجز ہیں، جن کا اسلوب، جن کا معیار، جن کی فصاحت و بلاغت معجزہ کی سطح تک پہنچی ہوئی ہے۔ یہ وحی قرآن مجید کہلاتی ہے۔

اس کے علاوہ جو وحی ہوتی تھی وہ متعین الفاظ میں نہیں ہوتی تھی وہ سنت ہے۔ جس کے صرف معنی اور مفاہیم حضورؐ تک منتقل ہوئے۔ یہ وحی بعض اوقات جبرئیل امینؑ کے ذریعے سے نازل ہوئی۔ بعض اوقات کسی اور ذریعے سے بھی نازل ہوئی۔ حضورؐ نے خواب میں کوئی چیز دیکھی، یا ویسے اللہ نے دل میں کوئی چیز ڈال دی۔ سنت حضورؐ تک پہنچانے کے لئے وحی خفی کی رہنمائی کے کئی طریقے تھے، جس میں وہ طریقہ بھی شامل تھا جس طریقے پر قرآن مجید نازل ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی طریقے شامل تھے۔ بہرحال وحی خفی کہلاتی ہے یعنی جسے آپ انگریزی میں **Tacit Revelation** کہہ

سکتے ہیں۔ دوسری Express Revelation یا وحی جلی ہے، جو اپنے الفاظ کے ساتھ نازل ہوتی تھی۔ وحی خفی صرف معانی اور پیغام پر مشتمل ہوتی تھی جس میں الفاظ اللہ کی طرف سے نہیں تھے لیکن معانی حضورؐ پر نازل فرمائے گئے اور حضورؐ نے اپنے الفاظ میں اس کو بیان فرمایا۔

اس دوسری وحی یعنی وحی خفی میں ایک خاص قسم وہ ہے جو بقیہ تمام اقسام سے منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ تعداد میں بھی تھوڑی ہے، لیکن اس کا ایک خصوصی مقام ہے جس کے لئے اس کو 'حدیث قدسی' کہا گیا ہے۔ وہ دراصل اللہ تعالیٰ ہی کا کلام ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے ادا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ یا تو صیغہ واحد متکلم یا جمع متکلم میں ارشاد فرماتے ہیں، لیکن بیان کرنے والے رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اس کے الفاظ چونکہ رسول اللہ ﷺ کے ہیں اس لئے یہ وحی قرآن مجید میں شامل نہیں ہے، اس کی تلاوت نہیں ہوتی، وہ قرآن مجید میں نہیں لکھی جاتی، لیکن وہ اللہ کا کلام ہے۔ مثال کے طور پر صحیح بخاری میں ہے ما زال العبد یتقرب الیّ بالنوافل، میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرے سے قربت حاصل کرسکتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ جب وہ میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے تو میں ایک باع (اس فاصلے کو جو دونوں بازوؤں کو دائیں بائیں پوری طرح پھیلانے کے وقت ہاتھوں کی انگلیوں کے آخری سروں کے درمیان ہوتا ہے، اس کو عربی زبان میں باع کہتے ہیں، آپ کہہ سکتے ہیں کہ ڈیڑھ گز کا فاصلہ) اس کی طرف بڑھتا ہوں۔ جب وہ میری طرف آہستہ چلتا ہے تو میں لپک کے اس کی طرف چلتا ہوں۔ جو لپک کر میری طرف آتا ہے تو میں دوڑ کر اس کی طرف آتا ہوں' یہ ارشاد ربانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضورؐ نے صیغہ واحد متکلم میں ارشاد فرمایا۔ یہ حدیث حدیث قدسی کہلاتی ہے۔

احادیث قدسیہ کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ کل احادیث کی تعداد اگر پچاس ہزار ہو، جیسا کہ بعض لوگوں کا اندازہ ہے یا تیس ہزار ہو جیسا کہ کچھ اور لوگوں کا اندازہ ہے۔ تو ان میں سے چند سو احادیث ہیں جو احادیث قدسیہ کہلاتی ہیں۔ کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ ان کی تعداد تین سو کے لگ بھگ ہے۔ احادیث قدسیہ کے مجموعے الگ سے بھی شائع ہوئے ہیں۔ تقریباً ایک درجن مجموعے ہیں جن میں احادیث قدسیہ الگ الگ شائع کردی گئی ہیں۔ ایک مجموعہ میں ایک سو کے قریب احادیث ہیں، ایک دوسرے مجموعہ میں دو سو بہتر احادیث ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تعداد تین سو کے لگ بھگ ہے۔ یہ تین سو احادیث ایک طرح سے قرآن مجید سے ملتی جلتی

ہیں کہ اللہ کا کلام ہے اور براہ راست اللہ کی طرف سے ان کا بیان ہوا ہے۔ دوسری طرف یہ احادیث رسول سے ملتی جلتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو اپنے الفاظ میں بیان فرمایا۔ گویا ان حادیث کا درجہ قرآن پاک اور حدیث رسولؐ کے درمیان ہے۔ چونکہ ان دونوں کے درمیان ان احادیث کا درجہ ہے اس لئے ان کو احادیث قدسیہ کہا جاتا ہے۔

احادیث قدسیہ اور قرآن مجید کے درمیان گیارہ بنیادی فرق ہیں۔ پہلا فرق تو یہ ہے کہ قرآن مجید معجزہ ہے احادیث قدسیہ معجزہ نہیں ہیں۔ یعنی قرآن کے الفاظ اور عبارت کی فصاحت و بلاغت اور کلمات کی بندش و بلندی، یہ معجزہ ہے۔ احادیث قدسیہ میں ضروری نہیں کہ معجزہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ معجز ہونے کی حد تک بہت اونچا معیار ہو، ہوسکتا ہے کہ نہ ہو۔ قرآن مجید کی روایت بالمعنیٰ جائز نہیں ہے۔ روایت بالمعنیٰ سے مراد یہ ہے کہ قرآن مجید کے مفہوم کو آپ اپنے الفاظ میں بیان کردیں اور کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے۔ مثلاً آپ کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہٰذا کتاب لاشک فیہ، یہ عربی زبان میں میں نے روایت بالمعنیٰ کی ہے، یہ جائز نہیں ہے۔ یہ حرام ہے۔ مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ذالك الكتاب لاريب فيه ۔ لیکن اگر میں اس مفہوم میں حدیث قدسی کو بیان کردوں تو یہ جائز ہے۔ کہ حدیث قدسی میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے پھر مفہوم کو اپنے الفاظ میں بیان کردوں اور نقل کردوں تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، یہ حرام نہیں ہے۔ اگرچہ افضل نہیں ہے۔ افضل یہی ہے کہ اصل الفاظ میں بیان کیا جائے لیکن حرام اور ناجائز نہیں ہے۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ قرآن پاک اگر کہیں لکھا ہوا ہو تو بیشتر فقہا کے نزدیک بے وضو اس کو ہاتھ لگانا جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر حدیث قدسی لکھی ہوئی ہو تو بغیر وضو اس کو ہاتھ لگانا جائز ہے، اگرچہ ادب کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

چوتھا فرق یہ ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت اس شخص کے لئے جائز نہیں ہے جس پر غسل فرض ہو، لیکن حدیث قدسی اس حالت میں بھی پڑھ سکتا ہے۔ اگرچہ ادب اور احترام کا تقاضا یہ ہے کہ نہ پڑھے۔ محدثین کرام نے علم حدیث کے انتہائی احترام کی جو مثالیں قائم کی ہیں ان کا تقاضا یہی ہے کہ بغیر وضو ارشادات رسول کو نہ پڑھا جائے۔ امام مالکؒ جب درس دیا کرتے تھے تو لوگوں نے بیان کیا کہ ان سے زیادہ اہتمام کے ساتھ علم حدیث کا درس کسی نے نہیں دیا۔ اللہ تعالیٰ نے

انہیں مال ودولت سے بھی نوازا تھا۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ وہ جس مکان میں رہتے تھے یہ وہ مکان تھا جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ صحابی کا تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مکان انہوں نے خریدا تھا اوراس میں رہتے تھے اور ایک مکان الگ سے خرید کر اس کو درس حدیث کے لئے مختص کیا ہوا تھا۔ وہ حضرت عمر فاروقؓ کا مکان تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے مکان میں درس ہوا کرتا تھا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مکان میں رہا کرتے تھے۔ اس مکان میں جب امام مالکؒ درس کے لئے تشریف لایا کرتے تھے تو پورے مکان میں خوشبوئیں بکھیری جاتی تھیں، سفید چادریں بچھادی جاتی تھیں، امام مالکؒ کی طرف سے لوگوں کی خدمت کرنے، پانی پلانے اور خوشبو لگانے کے لئے ملازمین مامور ہوتے تھے، گرمی کے موسم میں وقفہ وقفہ سے خوشبو چھڑک دی جاتی تھی۔ امام مالکؒ پوری تیاری کے ساتھ وہاں تشریف لایا کرتے تھے۔ جس شان سے کوئی بادشاہ دربار میں آتا ہے اسی شان سے امام مالکؒ تشریف لاتے تھے۔ بہترین لباس پہن کر اور خوشبو لگا کر تشریف لاتے تھے اور اتنے وقار سے درس حدیث دیا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ لوگوں نے دیکھا کہ درس حدیث دیتے ہوئے ان کا چہرہ سترہ مرتبہ متغیر ہوا، لیکن ان کے طرز عمل اور روانی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ جب گھر تشریف لائے تو کسی سے کہا کہ دیکھو میرے کپڑوں میں کیا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ بچھو گھس گیا تھا جس نے سترہ مرتبہ ان کو ڈنک مارا لیکن انہوں نے ادب واحترام کی خاطر اس مجلس کو موقوف نہیں کیا اور اسی روانی کے ساتھ درس جاری رکھا۔ احترام کا تقاضا تو یہ ہے۔ لیکن اگر کوئی آدمی جائز ناجائز کو جاننا چاہے تو وضو نہ ہونے کی حالت میں حدیث قدسی کی تحریر کو چھوسکتا ہے اور غسل نہ ہونے کی حالت میں حدیث قدسی پڑھ سکتا ہے۔ ایسا کرنا جائز ہے حرام نہیں ہے۔

پانچواں فرق یہ ہے کہ قرآن مجید کی نماز میں تلاوت ہوتی ہے، حدیث قدسی کی نماز میں تلاوت نہیں ہوسکتی۔ اگر کوئی شخص حدیث قدسی نماز میں پڑھ لے تو تلاوت کا جو رکن ہے اور فرض ہے، وہ ادا نہیں ہوگا۔ قرآن پاک کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جو شخص ایک حرف کی تلاوت کرے اس کو دس نیکیاں ملیں گی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، جن کا ابھی ذکر ہوا، انہوں نے فرمایا کہ 'لااقول الم حرف'، پہلے انہوں نے حدیث بیان فرمائی کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جس نے قرآن پاک کے ایک حرف کی تلاوت کی اس کو دس نیکیوں کا ثواب ملے گا۔ پھر انہوں نے اپنی فہم بیان فرمائی کہ میں یہ نہیں کہتا کہ الم میں ایک حرف ہے، بل الف حرف ولام حرف ومیم حرف' الف الگ

حرف ہے لام الگ حرف ہے میم الگ حرف ہے۔ یہ خصوصیت صرف قرآن پاک کی ہے جو حدیث قدسی کو حاصل نہیں ہے۔ حدیث قدسی آپ پڑھیں تو اس میں اتنا اجر نہیں ہے جو قرآن پاک کی تلاوت میں ہے۔

ساتواں بڑا فرق یہ ہے کہ قرآن پاک وحی جلی ہے اور حدیث قدسی وحی خفی ہے۔ آٹھواں فرق یہ ہے کہ قرآن پاک روح امین یا جبرئیلؑ لے کر نازل ہوتے تھے۔ جبکہ حدیث قدسی کسی بھی طریقے سے آسکتی تھی۔ نواں فرق یہ ہے کہ قرآن وحی متلو ہے جس کی تلاوت ہوتی ہے۔ حدیث قدسی وحی متلو نہیں ہے۔ اس کی تلاوت نہیں ہوتی۔ دسواں فرق یہ ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ متواتر ہیں۔ ضروری نہیں کہ حدیث قدسی بھی متواتر ہو۔ اگرچہ ایک دو قدسی حدیثیں ایسی ہیں جو کہ متواتر بھی ہیں، لیکن اکثر احادیث قدسیہ متواتر نہیں ہیں۔ گیارھواں فرق یہ ہے کہ قرآن پاک مصاحف میں لکھا ہوا ہے اور یکجا موجود ہے، احادیث قدسیہ مصاحف میں نہیں ہیں اور کسی ایک سرکاری یا باضابطہ مجموعہ میں یکجا موجود نہیں ہیں۔

احادیث اور سنت کا جو ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے یہ درجنوں نہیں بلکہ سینکڑوں کتابوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتابیں جو آج کتب حدیث کی ہماری پاس موجود ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ ان کی ترتیب وتدوین کیسے ہوئی اس پر بعد میں بات ہوگی۔ لیکن اس وقت جو ذخیرہ جیسا کہ موجود ہے اس پر بات کریں گے۔ اگر ہم کسی بھی لائبریری میں جائیں تو وہاں جو کتابیں حدیث کی موجود ہیں وہ دو طرح کی ہیں۔ کچھ کتابیں تو وہ ہیں جو حدیث کی اصلی اور بنیادی کتابیں کہلاتی ہیں۔ اصلی اور بنیادی کتابیں وہ ہیں جن کو ان کتابوں کے قابل احترام اور جلیل القدر مرتبین نے براہ راست روایت کر کے مرتب کیا ہے۔ اور کچھ کتابیں وہ ہیں جن کی تعداد زیادہ ہے جو محدثین نے براہ راست روایت کر کے مرتب نہیں کیں بلکہ دوسرے مجموعے سامنے رکھ کر ان مجموعوں سے احادیث کا انتخاب کر کے ان مجموعوں کو مرتب کیا ہے۔

آخری کتاب جو براہ راست روایت کر کے مرتب ہوئی ہے وہ امام بیہقی کی السنن الکبریٰ ہے۔ امام بیہقیؒ اس اعتبار سے سب سے بڑے اور نمایاں محدث ہیں کہ ان کی کتاب آخری کتاب ہے جو براہ راست روایت کر کے مرتب کی گئی ہے۔ ان کے بعد براہ راست حدیث روایت کر کے مرتب کرنے والے دنیا سے ختم ہو گئے۔

امام بیہقیؒ کی وفات ۴۵۸ھ میں ہوئی۔ ۴۵۸ھ کے بعد جتنی کتابیں ہیں وہ ثانوی کتابیں ہیں۔ثانوی سے مراد وہ کتاب ہے جو کسی ایک یا دو تین قدیم تر مجموعوں کو سامنے رکھ کر کسی نے اپنا مجموعہ مرتب کیا ہو، تلخیص کی ہو، شرح کی ہو یا چند کتابوں سے ایک ہی موضوع کی احادیث نکال کر جمع کی ہوں۔ یہ تو ہوتا رہا ہے اب بھی ہوتا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔لیکن براہ راست روایت کر کے کہ محدث نے اپنے اساتذہ سے سن کر جمع کی ہوں، انہوں نے اپنے اساتذہ سے اور رسول اللہ ﷺ تک پوری سند بیان کی ہو پھر احادیث جمع کی ہوں، یہ کام آخری بار امام بیہقیؒ نے کیا ہے۔ان کے بعد کسی نے نہیں کیا۔

امام بیہقیؒ کی یوں تو بہت سی کتابیں ہیں۔لیکن سنن کے نام سے دو کتابیں ہیں۔ایک السنن الصغری کہلاتی ہے جو دو جلدوں میں ہے اور کم وبیش پانچ ہزار احادیث پر مشتمل ہے۔ دوسری طویل تر کتاب دس ضخیم جلدوں میں ہے، اتنی ضخیم جلدیں جو انسائکلو پیڈیا برٹانیکا کی سائز کی ہیں۔انہوں نے براہ راست یہ سارا ذخیرہ مرتب کیا ہے۔حدیث کی بنیادی کتابوں میں سب سے بڑی کتاب ان کی ہے، اپنے ماخذ کے اعتبار سے بھی اور اپنے تنوع کے اعتبار سے بھی۔ یہ سنن کہلاتی ہے کیونکہ فقہی احکام کی ترتیب پر ہے، لیکن اس میں حدیث کے تمام مباحث اور مضامین پر احادیث موجود ہیں اس لئے یہ سنن کبریٰ بھی کہلاتی ہے اور جامع بھی کہلاتی ہے۔لیکن سنن کبریٰ کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔

موطا امام مالکؒ سے لے کر اور سنن کبریٰ بیہقی تک آج ہمارے پاس کتب حدیث کا جو ذخیرہ موجود ہے یہ سب کا سب ایک درجہ کی احادیث پر مشتمل نہیں ہے۔ان میں مندرج احادیث کے درجات مختلف ہیں۔قرآن پاک سارے کا سارا ایک درجہ کا ہے۔وہ سب قطعی الثبوت ہے۔ الحمد سے لے کر والناس تک۔سب ثبوت کے لحاظ سے ایک ہی درجہ کا ہے۔اس کے ایک حرف میں کوئی فرق نہیں ہے۔اس کا زبر زیر سب ایک درجہ کی چیز ہے۔احادیث میں درجات ایک جیسے نہیں ہیں، بلکہ احادیث کے مختلف درجات ہیں۔

درجات کے اعتبار سے، صحت اور قبول کے اعتبار سے علماء اسلام نے کتب حدیث کے پانچ درجے قرار دیئے ہیں۔حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے تین درجے قرار دیئے ہیں۔ بعض اور محدثین نے چار درجے قرار دیئے ہیں۔ چار درجے ہوں یا پانچ درجے ہوں یا تین

درجے ہوں اصل حقیقت کے اعتبار سے ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے تین درجے قرار دیئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ درجہ اول میں وہ کتابیں شامل ہیں جن میں تمام احادیث صحیح ہیں اور مستند ہیں۔ کوئی ایک حدیث بھی ان میں ایسی نہیں ہے جو صحت کے اعلیٰ ترین معیار سے ہٹی ہوئی ہو۔ اس درجہ کی کتابوں میں صرف مستند اور صحیح احادیث ہی شامل ہیں۔ وہ تقریباً تمام محدثین کے نزدیک اتفاق رائے سے تین کتابیں ہیں۔ 'تقریباً' کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا کہ شاید ایک آدھ کا کوئی جزوی اختلاف ہوگا۔

احادیث کی یہ تین کتابیں صحت کے اعلیٰ ترین درجہ پر فائز ہیں۔ موطا امام مالکؒ، جس کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اصح الکتاب بعد کتاب اللہ ہے۔ کتاب اللہ کے بعد صحیح ترین کتاب بعض لوگوں کے خیال میں موطا امام مالکؒ ہے۔ امام شافعیؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ امام شافعیؒ جو بہت بڑے محدث بھی ہیں اور بہت بڑے فقیہ بھی ہیں وہ موطا امام مالکؒ کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیتے ہیں۔ موطا امام مالکؒ کے بعد صحیح بخاری کا درجہ ہے۔ جو مسلمانوں کی غالب ترین اکثریت کی نظر میں اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے، اللہ کی کتاب کے بعد صحیح ترین کتاب روئے زمین پر صحیح بخاری ہے۔ تیسرا درجہ صحیح مسلم کا ہے جو بعض اہل مغرب کے نزدیک اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ اہل مغرب سے مراد یورپ یا امریکہ والے نہیں ہیں، بلکہ اسلامی اصطلاح میں اہل مغرب سے مراد سپین، اندلس، مراکش، الجزائر اور تیونس کے علاقے ہیں۔ یہ مغاربہ یا اہل مغرب کہلاتے تھے۔ یہ پورا علاقہ دنیائے اسلام کے انتہائی مغرب میں تھا۔ اس لئے وہاں کے لوگوں کی رائے بیان کرنا ہوتو مغاربہ یا اہل مغرب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تو بعض اہل مغرب کی رائے ہے کہ صحیح مسلم اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔

یہ بحث ہمیشہ مسلمانوں میں چلتی رہی کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ ان تینوں میں سے کون سی کتاب ہے۔ جو حضرات موطا امام مالکؒ کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیتے ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ موطا امام مالکؒ میں جتنی احادیث آئی ہیں وہ ساری کی ساری مستند ترین اور صحیح ترین احادیث ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ امام مالکؒ ان تمام محدثین میں، جن کی کتابیں آج ہمارے سامنے ہیں اور عام مشہور و معروف ہیں، قدیم ترین مجموعہ حدیث کے مرتب ہیں، امام مالکؒ سے زیادہ قربت رسول اللہ کے زمانہ مبارک سے معروف صاحب تصنیف محدثین میں سے کسی اور

محدث کو حاصل نہیں تھی۔ علم حدیث میں ایک خاص اہتمام یہ کیا جاتا تھا کہ سند حتی الامکان چھوٹی سے چھوٹی ہو، یعنی راویوں کا بیان رسول اللہ ﷺ تک جتنا کم ہو اتنا اچھا ہے۔ ان میں اعلیٰ ترین سند وہ سمجھی جاتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ تک کم سے کم واسطے ہوں۔ اور جتنے زیادہ واسطے ہوں اتنا ہی سند نازل مانی جاتی تھی۔ سند عالی یعنی اونچی سند وہ سمجھی جاتی تھی جس میں کم واسطے ہوں۔ اس کے مقابلہ میں سند نازل وہ ہوتی تھی جس میں زیادہ واسطے ہوں۔ امام مالکؒ کی جتنی سندیں ہیں وہ باقی سب محدثین کے مقابلہ میں عالی سندیں ہیں۔ ثُلاثیات کتب حدیث میں انتہائی اعزاز کی بات سمجھی جاتی ہے۔ کتب حدیث میں ثلاثیات سے مراد وہ احادیث ہیں کہ جن کے مرتب کرنے والے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان صرف تین واسطے ہوں۔ تین سے زیادہ نہ ہوں۔ امام مالکؒ کی بیشتر سندیں ثُلاثی ہیں اور کچھ سندیں ثُنائی بھی ہیں جن میں صرف دو واسطے ہیں۔ ایک امام مالکؒ کے استاد اور ایک صحابیؓ۔ چنانچہ امام مالکؒ کی موطا میں بہت سی احادیث ملیں گی مالک عن نافع عن بن عمر۔ امام مالکؒ اپنے استاد نافع سے روایت کرتے ہیں، امام نافع اپنے استاد عبداللہ بن عمرؓ سے اور وہ رسول اللہ ﷺ سے۔ لہٰذا اس علو اسناد کی رو سے امام مالکؒ کی کتاب رسول اللہ ﷺ کے دور مبارک سے اقرب ترین کتاب ہے اور وہ اس لئے اصح یعنی صحیح ترین قرار دیئے جانے کے مستحق ہے۔

لیکن امت کی غالب ترین اکثریت کی رائے یہ ہے کہ صحیح بخاری اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ صحیح بخاری اصح الکتب بعد کتاب اللہ جن اسباب کی وجہ سے ہے ان اسباب پر ابھی گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن ایک بات ذہن میں رہے کہ موطا امام مالکؒ کی جتنی صحیح احادیث ہیں وہ ساری کی ساری نہیں تو ان کا بیشتر حصہ صحیح بخاری میں شامل ہوگیا ہے۔ اس لئے جب صحیح بخاری کو اصح الکتب کہا جائے گا تو موطا امام مالکؒ کی صحیح روایات خود بخود اصح الکتب بن گئیں۔ ایک دوسری وجہ موطا امام مالکؒ کو اصح الکتب قرار نہ دینے کی یہ بھی ہے کہ امام مالکؒ جب اپنی کتاب موطا تحریر فرمارہے تھے تو ان کا مقصد صرف اور صرف احادیث کا مجموعہ مرتب کرنا نہیں تھا بلکہ حدیث اور فقہ اور صحابہ اور تابعین کی سنت کو یکجا کرنا مقصود تھا۔ لہٰذا امام مالکؒ کی کتاب میں جہاں احادیث ہیں وہاں صحابہ کے اقوال بھی ہیں اور تابعین کے ارشادات اور آثار بھی ہیں اور اس موضوع پر امام مالکؒ کا اپنا مشاہدہ بھی شامل ہے کہ مدینہ منورہ کا عام طریقہ کیا تھا۔ تو گویا یہ ایک ایسی کتاب ہے

جس کا میدان یا دائرہ کار کتب حدیث سے ذرا مختلف اور بڑھ کر ہے۔ یہ خالص حدیث کی کتاب ان معنوں میں نہیں ہے جن معنوں میں حدیث کی اور کتابیں ہیں۔ اس میں احادیث کے علاوہ بھی بہت سے مباحث ہیں۔ امام مالکؒ کے اپنے فتاویٰ بھی اس میں ہیں۔ بعض جگہوں پر امام مالکؒ کے اپنے ارشادات بھی اس میں بیان ہوئے ہیں۔ تو گویا یہ فقہ اور حدیث دونوں کتابوں کا مجموعہ ہے۔ خالص حدیث کی کتابوں میں صحیح ترین کتاب صحیح بخاری ہے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک صحیح ترین کتاب صحیح مسلم ہے۔ بہر حال یہ تین کتابیں طبقہ اول کی کتابیں ہیں۔

طبقہ دوم کی کتابیں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی نظر میں چار ہیں۔ جامع ترمذی، سنن ابوداؤد، نسائی اور مُسند امام احمد۔ طبقہ دوم کی کتابیں وہ ہیں کہ جن کی بیشتر احادیث صحیح احادیث ہیں۔ اکثر و بیشتر احادیث سند کے اعلیٰ معیار پر پورا اترتی ہیں۔ کچھ احادیث ہیں جو صحت کے معیار سے ذرا کم ہیں۔ ان معیارات کا ابھی تذکرہ کرتے ہیں۔ اور بہت تھوڑی احادیث ہیں جو ضعیف ہیں یا جن کا ضعف بہت نچلے درجے کا ہے۔ ضعیف ہیں تو معمولی درجہ کا ضعف ہے اور زیادہ سنجیدہ انداز کا ضعف نہیں ہے۔ یہ درجہ دوم کی احادیث ہیں۔

درجہ دوم کی احادیث میں جو بنیادی خصائص ہیں وہ یہ ہیں کہ اگر چہ یہ صحیحین یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے درجہ تک تو نہیں پہنچتیں لیکن ان میں شامل بیشتر احادیث صحیح احادیث ہیں۔ ان کتابوں کے مصنفین اور مرتبین نے احادیث میں اپنے لئے جو شروط مقرر کی ہیں اور جو معیار انتخاب انہوں نے حدیث کا رکھا ان میں انہوں نے کسی تساہل سے کام نہیں لیا۔ بلکہ اکثر و بیشتر کڑا معیار اپنے سامنے رکھا۔ پھر یہ احادیث جو ان چار کتابوں میں آئی ہیں یعنی ترمذی، ابوداؤد، امام احمد اور نسائی۔ ان احادیث کو امت میں قبول عام حاصل ہوا۔ ایک عام مقبولیت ان احادیث کو حاصل ہوگئی اور محدثین اور فقہا کا ایک اصول یہ ہے (محدثین اس سے اتفاق کم کرتے ہیں فقہا زیادہ کرتے ہیں۔) فقہا یہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی حدیث روایت کے اعتبار سے ذرا کمزور بھی ہو لیکن اس کو تلقّی بالقبول حاصل ہو تو وہ حدیث قابل قبول ہے۔ تلقی بالقبول ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب امت کے عام اہل علم نے اس کو قبول کیا ہو اور اس پر عمل درآمد کرتے ہوں، وہ حدیث صحیح کی نشانی ہے۔ ورنہ اگر اس میں کوئی کمزوری ہوتی تو امت عام طور پر اس کو قبول نہ کرتی۔ تلقی بالقبول خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حدیث اونچے درجہ کی حدیث ہے۔ تو یہ چاروں کتابیں وہ

ہیں جن میں درج احادیث کو تلقی بالقبول حاصل ہوئی۔

ان میں احکام شریعت کے تمام بنیادی اصول پائے جاتے ہیں۔شریعت کے جتنے احکام احادیث میں آئے ہیں۔وہ ساری احادیث بڑی تعداد میں، شاید ننانوے فیصد کے قریب ان کتابوں میں موجود ہیں۔چنانچہ لوگوں نے لکھا ہے کہ سنن ابوداؤد میں احادیث احکام کا اتنا بڑ مجموعہ ہے کہ اگر کسی کے پاس یہ کتاب ہو تو گویا اس کے گھر میں ایک نبی موجود ہے۔کسی سابقہ مصنف نے لکھا کہ سنن ابوداؤد کی گھر میں موجودگی گویا گھر میں ایک بولتے نبی کی موجودگی ہے کہ نبی کے ارشادات ہر وقت آپ کے سامنے رہیں گے۔اور احکام آپ کو معلوم ہوتے رہیں گے۔

ان کتابوں کے علاوہ احادیث کی جو بقیہ کتابیں ہیں وہ حضرت شاہ ولی اللہ کے نزدیک تیسرے اور آخری درجہ میں آتی ہیں۔یہ وہ کتابیں ہیں جن میں ضعیف احادیث بڑی تعداد میں ملتی ہیں۔یہ وہ کتابیں ہیں جن کی سندوں میں بعض ایسے راوی آئے ہیں جو مجہول الحال ہیں، جن کی کیفیت معلوم نہیں کہ وہ مستند تھے کہ غیر مستند تھے۔اس لئے ان احادیث پر صرف وہ لوگ اعتماد کر سکتے ہیں جو علم حدیث کے متخصص ہوں اور فن روایت اور علم رجال میں متعمق ہوں۔علم حدیث پر اچھی نظر رکھے بغیر ان احادیث میں کمزور یا غیر کمزور کا تعین کرنا بڑا دشوار ہے۔عام آدمی کے لئے ان کتابوں سے استفادہ کرنا بڑا دشوار ہے۔اس لئے ان احادیث سے غیر متخصص کو براہ راست استفادہ نہیں کرنا چاہئیے۔اس لئے کہ بہت سی غلط چیزیں ہوں گی، کمزور چیزیں ہوں گی تو عام آدمی الجھ کر رہ جائے گا اور پریشان ہوگا۔لہٰذا صرف اہل علم کو ان کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

شاہ ولی اللہ کے علاوہ بقیہ لوگ اس تیسری کیٹیگری کی دو مزید قسمیں کرتے ہیں۔ایک کیٹگری وہ ہے کہ جس میں نسبتاً قابل اعتماد چیزیں موجود ہیں۔مثلاً سنن دار قطنی، مصنف ابی شیبہ، مصنف عبدالرزاق، سنن دارمی۔یہ وہ ہیں کہ جن میں کچھ نہ کچھ نئی، صحیح اور مستند چیزیں مل جاتی ہیں۔

ان کے بعد چوتھا درجہ ان کتابوں کا ہے جن میں بالکل قصے کہانیاں اور ادھر ادھر کی باتیں ہیں۔جن کا کوئی پس منظر اور دلیل نہیں ہے۔جن کے پیچھے کوئی مضبوط سند نہیں ہے۔وہ قصے کہانیوں کے انداز میں بیان ہوئی ہیں۔مثلاً دیلمی ایک مشہور محدث ہیں، ان کا آپ نے نام سنا ہوگا، ان کی کتاب 'مسند دیلمی' ہے، اس طرح ابن مردویہ کی کتاب ہے۔اس طرح سے قصے کہانیوں کی بے شمار کتابیں ہیں۔جن کا کوئی علمی مقام نہیں ہے اس لئے ان کو بالکل نظر انداز کر دینا

چاہئے۔اس میں اگر کوئی صحیح چیز آ گئی ہے تو وہ محض اتفاق ہے ورنہ اکثر وبیشتر وہ قصے کہانیوں سے عبارت ہے۔

یہ جو پہلے دو درجے ہیں جن میں پہلا درجہ تین بنیادی کتابوں کا اور دوسرا درجہ چار بنیادی کتابوں کا ہے۔ یہ جو چھ کتابیں ہیں یا سات سمجھ لیں کیونکہ موطاء امام مالکؒ کی ساری احادیث صحیح بخاری میں اور صحیح مسلم میں آ گئیں اس لئے اس کو نکال دیتے ہیں۔ جو بقیہ چھ کتابیں ہیں یہ صحت کے اعلیٰ ترین معیار پر فائز ہیں۔ان کتابوں کو صحاح ستہ کہا جاتا ہے۔مسند امام احمد کی بجائے اس میں اکثر لوگ سنن ابن ماجہ کو شامل کرتے ہیں۔بعض لوگ مسند دارمی کو شامل کرتے ہیں،بعض ابن ماجہ کو، لیکن بیشتر لوگ ابن ماجہ کو شامل کرتے ہیں۔سنن ابن ماجہ کے ساتھ یہ چھ کتابیں ہیں جو کتب ستہ یا صحاح ستہ کہلاتی ہیں۔

اگر حدیث کی کسی کتاب میں کہیں یہ الفاظ بیان ہوں کہ رواہ الستہ، اس کو چھوؤں نے روایت کیا ہے تو وہ استناد کے اعلیٰ ترین معیار پر ہے۔یعنی صحیح ترین حدیث جس کو چھ کے چھ بڑے محدثین نے بیان کیا ہو۔وہ بلاشبہ اعلیٰ ترین معیار کی کتاب ہوگی۔

کتب حدیث کی خصوصیات

ان میں سے ہر کتاب کے کچھ الگ الگ خصائص ہیں۔ امام بخاری کی کتاب کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ جو شخص امام بخاری کی کتاب کو غور وخوض سے پڑھ لے، اس میں ایک تفقہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس حدیث کے گہرے معانی اور حدیث میں پوشیدہ اور پنہاں اندرونی عبرتوں تک اس کی رسائی ہو جاتی ہے۔ یہ امام بخاری کی کتاب کی بنیادی خصوصیت ہے۔ امام بخاری نے احادیث کے ساتھ ساتھ مختلف حضرات کے بعض اقوال بھی بیان کئے ہیں۔ صحابہ کرام کے اقوال، تابعین کے اقوال، بقیہ اہل علم کے اقوال، جن کو بطور حدیث کے وہ نہیں لاتے، بطور سند کے نہیں بیان کرتے، بلکہ کسی چیز کے ثبوت یا تائید کے طور پر بیان کرتے ہیں کہ فلاں نے بھی یہ کہا ہے۔ ان کو تعلیقات کہتے ہیں۔ امام بخاری کے ہاں تعلیقات کی تعداد چند سو ہے۔ تین سو سے زائد تعلیقات ہیں جو امام بخاری کی اصل کتاب کے متن کا حصہ نہیں ہیں۔ لیکن جو عنوان وہ شروع کرتے ہیں تو ضمناً وہ بات کہہ دیتے ہیں کہ فلاں شخص نے یہ کہا ہے جس سے اندازہ

ہو جائے گا کہ اس حدیث کے معنی کیا ہیں۔ امام مسلم کے ہاں تعلیقات بہت تھوڑی ہیں صرف چودہ پندرہ مقامات پر ہیں۔ چودہ یا پندرہ مقامات پر صحیح مسلم میں کچھ باتیں بطور تعلیقات آئی ہیں۔ امام بخاری کے ہاں تعلیقات زیادہ ہیں۔ گویا امام مسلم کے مندرجات میں صحیح احادیث کی نسبت بہت زیادہ ہے بہ نسبت امام بخاری کے مندرجات کے، اس لئے کہ ان کے ہاں تین سو کے قریب تعلیقات آئی ہیں جو اس معیار کی نہیں ہیں نہ امام بخاری نے تعلیقات کو بیان کرنے میں اس معیار کو پیش نظر رکھا۔

امام ترمذی کی کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ حدیث کے طالب علم کو حدیث کے ذخائر سے اچھی طرح باخبر کر دیتی ہے۔ امام ترمذی کا اسلوب یہ ہے۔ (اگر یہاں ساری کتابیں ہوتیں تو بڑا اچھا ہوتا کہ میں ساتھ ساتھ مثالیں بھی دیتا جاتا) امام ترمذی کا اسلوب یہ ہے کہ کوئی حدیث بیان کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں کہ وفی الباب عن ابن عمرؓ وعن عائشہؓ وعن ابی ہریرہؓ۔ اس موضوع پر حضرت ابن عمرؓ، حضرت عائشہؓ اور ابی ہریرہؓ کی حدیث بھی موجود ہے۔ ایک تو وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس موضوع پر اور کن کن صحابہ کے بیانات یا روایات موجود ہیں جو بقیہ محدثین بیان نہیں کرتے۔ دوسری بات امام ترمذیؒ کے ہاں یہ ہے کہ وہ حدیث کا درجہ بھی متعین کر دیتے ہیں۔ حدیث بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں ھٰذا حدیث حسن، ھذا حدیث غریب، ھذا حدیث لانعرفہ الا من ھذا الوجہ، یہ حدیث تو ہے لیکن اس ایک سند کے علاوہ باقی کسی اور سند سے نہیں آئی۔ یعنی اس کا درجہ اور اس کی حیثیت اپنی تحقیق کے مطابق واضح کر دیتے ہیں۔ یہ کام بقیہ محدثین نہیں کرتے۔ اس اعتبار سے امام ترمذی کی کتاب حدیث کے طلبہ کے لئے بڑی مفید ہے۔

امام ابوداؤد کی کتاب کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں احادیث احکام کا بڑا مجموعہ شامل ہے۔ احادیث احکام کا اتنا بڑا مجموعہ نہ صحیح بخاری میں ہے اور نہ صحیح مسلم میں ہے، نہ ترمذی میں ہے اور نہ نسائی میں ہے۔ ابوداؤد میں سب سے بڑا مجموعہ احادیث احکام کا ہے۔ امام ابوداؤد کے بارے میں ایک بات یاد رکھئے گا۔ امام ابوداؤد کا تعلق ہمارے پاکستان سے تھا۔ وہ صوبہ بلوچستان کے ایک علاقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ تعین کے ساتھ یہ کہنا دشوار ہے کہ کس ضلع سے ان کا تعلق تھا لیکن غالباً ضلع قلات یا ضلع خضدار سے ان کا تعلق تھا۔ وہ اصلاً اس علاقہ سے تعلق رکھتے تھے اور بعد میں یہاں سے وہ خراسان چلے گئے۔ خراسان اور نیشاپور وغیرہ میں رہے۔ پھر وہاں

سے آگے عرب دنیا اور بغداد وغیرہ میں تشریف لے گئے اور وہاں انہوں نے اپنی یہ بے نظیر کتاب مرتب فرمائی۔ لہٰذا ہم اہل پاکستان صحاح ستہ کے مصنفین میں سے ایک مصنف یعنی امام ابوداؤد کے ہم وطن ہیں۔

امام نسائی کی کتاب کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے حدیث کے متن اور رسول اللہ ﷺ کے الفاظ مبارک کی صحت کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ احادیث کے متن کو نقل کرنے میں کہیں کہیں اختلافی روایات ہیں۔ ایک صحابیؓ نے ایک طرح سے نقل کیا ہے دوسرے صحابیؓ نے دوسری طرح نقل کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وہ بات دو مرتبہ ارشاد فرمائی ہو۔ اور دو مرتبہ مختلف الفاظ میں ارشاد فرمائی ہو۔ ہوسکتا ہے ایک ہی مرتبہ ارشاد فرمائی ہو لیکن ان دونوں سننے والے صحابہ کا لہجہ الگ الگ ہو اور سننے والے نے اپنے لہجہ میں بیان کر دیا ہو۔ دونوں چیزوں کا امکان ہے۔ اب ان حالات میں یہ تعین کرنا کہ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے کون سا لہجہ نکلا تھا، یہ خاصی محنت اور تحقیق کا کام ہے۔ امام نسائی نے یہ کاوش کی ہے کہ صحتِ متن کا التزام کریں اور اس بات کو یقینی بنائیں کہ متن زیادہ سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلنے والے الفاظ کے مطابق ہو۔ اسی لئے سنن پر جتنی کتابیں ہیں ان میں ضعیف احادیث کی سب سے کم تعداد سنن نسائی میں ہے۔ یہ نسائی نون کے زبر کے ساتھ ہے نَسائی، اس کا نِساء یعنی عورتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ نَسا وسط ایشیا میں کوئی شہر تھا جو آج کل غالباً ازبکستان میں ہے وہاں سے ان کا تعلق تھا۔ نسا سے نسبت ہے نسائی۔

ابن ماجہؒ جو اکثر لوگوں کے خیال میں صحاح ستہ کی آخری کتاب ہے۔ اس میں ترتیب بڑی اچھی ہے۔ پہلے کون سی احادیث ہوں، پھر کون سی ہوں، پھر کون سا باب ہو، پھر بڑے ابواب میں ذیلی ابواب کی تقسیم ہے، پھر چھوٹے ابواب میں انفرادی موضوعات کی تقسیم ہے۔ اس سلسلہ میں جس محدث نے سب سے زیادہ مفید اور حسین ترتیب اختیار فرمائی وہ امام ابن ماجہ نے اختیار فرمائی۔ ابن ماجہ کی کتاب حسن ترتیب اور حسن تبویب کے اعتبار سے زیادہ اچھے انداز کی بتائی جاتی ہے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم، یہ دونوں صحیحین کہلاتی ہیں۔ یعنی دو صحیح کتابیں۔ جب صحیحین کا لفظ استعمال کیا جائے گا تو بخاری اور مسلم مراد ہوں گے۔ شیخین کا لفظ بولا جائے گا تو بھی بخاری و

مسلم مراد ہوں گے۔ مُتَّفَق عَلَیہ کا لفظ بولا جائے گا تو بخاری و مسلم کی کتابیں مراد ہوں گی۔ لیکن ان دونوں میں دونوں کی شروط ملتی جلتی ہوں گی، ایک فرق کے ساتھ کہ امام بخاری کا معیار اور شرائط نسبتاً سخت ہیں۔ کل یا پرسوں میں نے عرض کیا تھا کہ امام بخاری جب عنعنہ کی بنیاد پر کسی راوی کی حدیث نقل کرتے تھے تو پہلے یہ تحقیق بھی کرتے تھے کہ اس راوی کی اپنے شیخ سے ملاقات ہوئی ہے کہ نہیں ہوئی۔ اگر یہ تیقن سے ثابت ہو جاتا کہ ملاقات ہوئی ہے تب روایت قبول کرتے تھے۔ اس کے برعکس عنعنہ (یعنی عن فلان عن فلان، فلاں شخص فلاں سے روایت کرتا ہے) کے اسلوب پر روایت کرتے وقت امام مسلم صرف یہ دیکھتے تھے کہ دونوں راویوں کے مابین امکان لقاء کافی ہے۔ یعنی ان دونوں کی ملاقات کا امکان موجود ہے، دونوں ہم عصر تھے ایک ہی علاقہ اور ایک ہی زمانہ میں رہے، اتنا کافی ہے اس سے آگے جانے کی ضرورت نہیں۔ شرائط کے اس فرق کی وجہ سے امام مسلم کا درجہ امام بخاری کے بعد آتا ہے۔

امام بخاری نے اپنی کتاب میں ابواب کے جو عنوانات رکھے ہیں وہ بڑے غیر معمولی ہیں۔ اسی لئے علماء حدیث نے لکھا ہے کہ فقہ البخاری فی ابوابہ، امام بخاری کو فقہ اور حدیث کی جو سمجھ ہے اور جس گہرائی کے ساتھ شریعت کے احکام کی فہم ان کو حاصل ہے وہ ان کے عنوانات سے سامنے آجاتی ہے۔ امام بخاری کے نزدیک کسی حدیث میں کیا کیا مضامین پنہاں ہیں وہ اس بات سے ہی واضح ہو جاتے ہیں کہ امام بخاری عنوان کیا لگاتے ہیں۔ حدیث کے عنوان سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس حدیث سے امام بخاری کیا سبق نکالنا چاہتے ہیں۔ امام بخاری کے برعکس امام مسلم نے نہ کوئی باب رکھا نہ کوئی عنوان رکھا۔ اگرچہ انہوں نے ترتیب موضوعات کے حساب سے رکھی ہے لیکن کسی باب کو بھی کوئی عنوان نہیں دیا۔ بعد میں آنے والوں میں سے امام نَوَوی نے جو بہت مشہور محدث تھے اور اپنے زمانے کے صف اول کے محدثین میں شمار کئے جاتے تھے۔ وہ امام مسلم کی کتاب کے شارح بھی ہیں اور ان کی یہ شرح بڑی مشہور ہے۔ انہوں نے اس میں عنوانات کا اضافہ کیا اور اس کے ساتھ ابواب کی تقسیم بھی کی ہے۔ اسی لئے اگر آپ صحیح مسلم کا نسخہ پاکستان کا یا ہندوستان کا چھپا ہوا دیکھیں، تو صحیح مسلم میں عنوانات حاشیہ میں لگے ہوئے نظر آئیں گے۔ اصل کتاب کے متن میں عنوانات نہیں لگائے گئے ہیں۔ اس لئے کہ امام مسلم نے اپنی کتاب میں کوئی عنوانات نہیں لگائے تھے۔ عرب دنیا کے چھپے ہوئے جو نسخے ہیں ان میں عنوانات بین

القوسین ہیں۔قوسین میں اس لئے لگائے گئے ہیں کہ یہ بعد کا اضافہ ہے، اصل کتاب میں امام مسلم نے نہیں لگائے تھے۔امام بخاری کے عنوانات بڑے دقّت نظر کے حامل ہیں جس کی وجہ سے ان کی کتاب کا درجہ اونچا ہوگیا۔

امام مسلم نے اپنی کتاب کے شروع میں ایک بڑا جامع مقدمہ بھی لکھا ہے۔امام بخاری نے کوئی مقدمہ نہیں لکھا اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کتاب شروع کر دی ہے کہ 'باب کیف کان بدأالوحی علی رسول الله ﷺ' کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی کا آغاز کیسے ہوا اور اسی باب پر کتاب شروع ہوگئی۔امام مسلم نے اپنی کتاب میں ایک مقدمہ لکھا اور تفصیل سے بیان کیا کہ اس کتاب کے لکھنے کی ضرورت کیوں پیدا ہوئی۔ اس کتاب میں کن شرائط کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس کی وضاحت کی، پھر معاصرت، امکان لقا اور وجوب لقا پر گفتگو کی۔اس اعتبار سے ان کی کتاب کا درجہ تھوڑا سا اونچا ہے۔امام بخاری نے کوئی مقدمہ نہیں لکھا۔کتاب کے بارے میں جو کچھ ان کے ذہن میں تھا وہ کتاب کے مطالعہ سے واضح ہوجاتا ہے کہ ان کے ذہن میں کیا تھا۔ انہوں نے خود اپنے اسلوب، مقاصد اور اہداف کو بیان نہیں کیا، جبکہ امام مسلم نے خود بیان کیا ہے۔

امام بخاری کے ہاں ایک چیز، جو ایک پہلو سے بہت مفید چیز ہے اور ایک پہلو سے وہ ہمارے جیسے طلبہ کے لئے مشکل پیدا کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ امام بخاری کے ہاں احادیث موضوعات کے اعتبار سے یکجا نہیں ملتیں۔ایک حدیث کے ایک جملے سے اگر امام بخاری کوئی خاص استدلال کرنا چاہتے ہیں تو اس حصہ کو ایک باب میں بیان کریں گے، دوسرے جملہ کو کتاب کے دوسرے حصہ میں بیان کریں گے، تیسرے جملہ کو تیسرے حصہ میں بیان کریں گے۔ یا ایک حدیث اگر ایک سے زائد موضوعات پر مشتمل ہے تو اس حدیث کی ایک روایت ایک باب میں آجائے گی دوسری روایت دوسرے باب میں آجائے گی۔اگر آپ یکجا دیکھنا چاہیں تو جب تک پوری صحیح بخاری بار بار نہ پڑھیں اور آپ کو تقریباً زبانی یاد نہ ہوجائے اس وقت تک موضوع سے متعلق تمام احادیث کو تلاش کرنا بہت دشوار ہے۔آپ کو کہاں کہاں تلاش کرنا ہے؟ کون کون سی حدیث کس باب میں آئی ہے آپ کو نہیں معلوم۔اس طرح تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے۔اگر چہ قدیم محدثین ایسے تھے جو زبانی بتادیا کرتے تھے کہ یہ حدیث فلاں باب میں ہے، اور وہ حدیث فلاں باب میں ہے۔لیکن آج کل دشوار ہوگیا ہے۔لوگوں کا حافظہ اتنا تیز نہیں ہے، لوگ یاد بھی نہیں

کرتے اس لئے مشکل ہے۔

البتہ مسلم کے ہاں ساری احادیث یکجا مل جاتی ہیں۔ مثلاً امام مسلم جب ایمان پر بات کریں گے تو وہاں ایمان سے متعلق ساری احادیث یکجا مل جائیں گی۔ جہاں علم کی بات ہوگی وہاں علم سے متعلق ساری احادیث یکجا ہوں گی۔ جہاں نفاق سے متعلق بات ہوگی وہاں نفاق سے متعلق ساری احادیث یکجا ہوں گی۔ یہ فرق اور موازنہ ہے امام بخاری اور امام مسلم کی کتابوں کے درمیان۔

ایک چھوٹا سا فرق اور بھی ہے۔ بلکہ ایک اعتبار سے یہ ایک بڑا فرق ہوگا۔ وہ یہ کہ امام بخاری نے ضبط الفاظ پر نسبۃً کم زور دیا ہے۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلنے والے الفاظ کیا تھے۔ جن راویوں نے احادیث کو بیان کیا ہے ان میں اگر کوئی **Variation** یا متن کا اختلاف ہے تو وہ کیا ہے، اس پر امام بخاری نے زیادہ زور نہیں دیا ہے۔ جبکہ امام مسلم نے اس پر بہت زور دیا ہے۔ مثال کے طور پر امام مسلم جب حدیث بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ حدثنا هناد، حدثنا عبدالله واللفظ لعبدالله کہ مجھ سے یہ حدیث ھناد نے بھی بیان کی، یہ حدیث عبداللہ نے بھی بیان کی، مثلاً عبداللہ بن مبارکؒ نے، اور یہ الفاظ جو میں بیان کر رہا ہوں یہ عبداللہ بن مبارکؒ کے ہیں۔ اس سے گویا اشارہ یہ دینا مقصود ہے کہ ھناد نے بھی یہ حدیث بیان کی ہے، لیکن تھوڑے سے لفظی فرق کے ساتھ، دیگر روایات جب سامنے آئیں گی تو آپ کو اس فرق کا اندازہ ہو جائے گا۔ امام بخاری جب حدیث بیان کرتے ہیں تو یہ تعین نہیں ہوتا کہ الفاظ دونوں راویوں کے ایک جیسے تھے یا دونوں کے الفاظ الگ الگ تھے۔ الگ الگ تھے تو یہ الفاظ کس راوی کے ہیں، یہ آپ کو امام بخاری کے ہاں نہیں ملتا۔ یہ آپ کو امام مسلم کے ہاں زیادہ تفصیل کے ساتھ ملتا ہے۔

دوسرا بڑا فرق یہ ہے (اس پر تفصیل سے آگے بات کریں گے، لیکن دونوں میں فرق کی بات چل رہی ہے اس لئے ضمناً اس کا ذکر کر دینا ضروری ہے) کہ بالکل ابتدائی دور میں، یعنی صحابہ، تابعین اور تبع تابعینؒ کے دور میں اکثر و بیشتر لوگ بلکہ سارے ہی لوگ انتہائی مخلص، سچے، ذمہ دار، تقویٰ رکھنے والے اور خوف خدا سے سرشار ہوتے تھے، اس لئے کسی کے بارے میں یہ شبہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ بیان کرنے میں کوئی کوتاہی کرے گا۔ لیکن بعد میں ایسے لوگ بھی میدان میں آگئے جن کے بارے میں یہ محسوس کیا گیا کہ شاید یہ پوری ذمہ داری سے کام نہ لیں۔

چونکہ محدثین کی معاشرہ میں بہت عزت ہوئی، لوگوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ رکھا اور ان کا احترام بادشاہوں سے بھی زیادہ ہونے لگا، تو بہت سے ایسے لوگ بھی میدان میں آگئے کہ جن کا مقصد دنیاوی عزت تھا یا کم از کم جزوی طور پر وہ دنیاوی عزت میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ جوں جوں ایسے لوگوں میں اضافہ ہوتا گیا محدثین اپنا معیار کڑا کرتے گئے بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کو مزید سخت کرتے گئے۔

اب تک حدیث بیان کرنے کے دو طریقے ہوتے تھے۔ ایک طریقہ یہ ہوتا تھا کہ طلبہ سامنے بیٹھ گئے۔ محدث، مثلاً امام بخاری نے اپنی یادداشت یا اپنے تحریری ذخیرے سے حدیث بیان کرنی شروع کر دی اور لوگوں نے لکھنا شروع کر دیا۔ لوگوں کی تعداد خاصی بڑی ہوتی تھی اور درمیان میں مستملی بھی ہوتے تھے۔ یعنی ہر دو چار سو آدمیوں کے درمیان ایک آدمی بیٹھا ہوتا تھا جو بلند آواز سے ان الفاظ کو دہراتا تھا۔ جیسے مکبر اذان کے الفاظ دہراتا ہے یا نماز میں اللہ اکبر دہراتا ہے۔ اس طرح مستملی ہوا کرتے تھے۔ بعض اوقات کئی کئی سو مستملی ہوا کرتے تھے جو ان الفاظ کو دہرایا تے تھے۔ محدث نے ایک لفظ زور سے کہا کہ 'انما الاعمال بالنیات' اب پہلے مستملی نے دہرایا، پھر دوسرے مستملی نے، پھر تیسرے نے پھر چوتھے نے، اور کوئی پندرہ بیس منٹ میں سب لوگوں نے لکھا۔ پھر اس نے اگلا جملہ بولا پھر اس سے اگلا۔ ایک طریقہ تو یہ تھا۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ طلبہ کے پاس تحریری ذخیرے موجود ہیں۔ امام بخاری نے جو لکھا، طلبہ نے اس کے تحریری نسخے پیشگی ہی حاصل کر لئے۔ لیکن اب طالب علم امام بخاریؒ کو سنا رہا ہے اور سننے کے دوران جہاں غلطی ہے وہ ٹھیک کر دیتے ہیں اور غلطی نہیں ہے تو سن کر کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے، میں نے اجازت دے دی ہے، اب تم میری طرف سے روایت کر سکتے ہو۔ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ سب سے پڑھ کر سنتے تھے۔ اگر چار پانچ ہزار طلبہ ہوں تو سب سے پڑھوا کر نہیں سنا جا سکتا۔ اس میں تو ایک ایک حدیث کے لئے پورا سال چاہئے۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ ایک طالب علم پڑھتا تھا اور بقیہ سنتے تھے اور پھر امام بخاری یا جو بھی محدث ہوتے تھے وہ اجازت دیتے تھے کہ اس طرح سے آپ سب لوگوں کو پڑھنے کی اجازت ہے۔ درمیان میں بطور احتیاط کسی سے سن بھی لیا، کبھی ایک سے کبھی دوسرے سے، اور سب کے بارے میں اندازہ ہو گیا کہ سب نے پڑھا ہے۔

بعد میں محدثین نے ان تینوں طریقوں کے تین درجات مقرر کیے۔ یہ تین گویا الگ الگ درجات ہو گئے۔ ایک تو وہ کہ جس میں محدث نے خود پڑھا اور لوگوں نے سنا۔ دوسرے میں طالب علم نے خود پڑھا اور محدث نے سنا۔ تیسرے میں ایک طالب علم نے پڑھا اور محدث نے سنا۔ لیکن دوسرے بہت سے طلبہ نے بھی سنا۔ امام مسلم کے ہاں ان تینوں میں الگ الگ فرق کیا گیا ہے۔ امام بخاری کے ہاں یہ فرق نہیں ہے۔ امام مسلم کی اصطلاح یہ ہے کہ اگر امام مسلم نے کہا کہ حدثنا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ امام مسلم کے استاد نے حدیث پڑھی، امام مسلم نے سنی اور سن کے لکھی۔ اگر امام مسلم نے کہا کہ اخبرنا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ امام مسلم نے حدیث پڑھی، ان کے استاد نے سنی اور سن کے اجازت دے دی۔ اور اگر کہیں ایسا ہوا کہ امام مسلم اپنے استاد کے درس میں موجود تھے، کسی اور نے حدیث پڑھی امام مسلم نے سنی، تو امام مسلم کہتے ہیں کہ اخبرنا فلان قراءۃ علیه و انا اسمع، ان کے سامنے پڑھا جا رہا تھا اور میں سن رہا تھا۔ آپ دیکھیں کہ accuracy کی اس سے بہتر مثال دنیا میں کہیں مل نہیں سکتی۔ اگر آپ یہودیوں اور عیسائیوں کے سامنے یہ بیان کریں تو وہ دنگ رہ جائیں گے کہ کسی کام میں اتنی accuracy بھی ہو سکتی ہے۔ کہ محدث نے خود نہیں پڑھا، قراءۃ علیه و انا اسمع، میرے استاد کے سامنے پڑھا جا رہا تھا، اور دوسرے طالب علم کے ساتھ ساتھ میں سن رہا تھا۔ استاد نے اس طرح سن کر اس کی اجازت دی تھی۔ یہ باریک فرق امام مسلم کے ہاں ہے اور امام بخاری کے ہاں نہیں ہے۔

احادیث نبویؐ کی تعداد

تعداد کے اعتبار سے صحیح مسلم کی احادیث زیادہ ہیں، صحیح بخاری کی احادیث کم ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ حدیث کی ہر کتاب میں ایک ایک حدیث بار بار آتی ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں اگر خطبہ حجۃ الوداع کا ذکر آئے گا تو اس میں درجنوں موضوعات پر بات ہوئی ہے۔ تو جہاں عورتوں کے حقوق کا ذکر ہے وہاں خطبہ حجۃ الوداع کا بھی ذکر آئے گا، جہاں لوگوں کی برابری اور مساوات کا ذکر ہے وہاں بھی اس خطبہ کا حوالہ آئے گا۔ جہاں حج کے احکامات کا ذکر ہے وہاں بھی خطبہ کا کوئی نہ کوئی حصہ زیر بحث آئے گا۔ جہاں منیٰ کا ذکر ہے وہاں بھی آئے گا۔ جہاں عرفات کا ذکر ہے وہاں بھی آئے گا۔ اس طرح ایک حدیث کئی ابواب میں آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث کی

کتابوں میں تکرار اور مکررات بہت ہوتے ہیں۔ مکررات کو نکالے بغیر اگر صحیح بخاری کی احادیث کو گنا جائے تو صحیح بخاری کی احادیث کی تعداد ۹ ہزار بیاسی ہے (9082)۔ یہ تعداد حافظ ابن حجر نے بیان کی ہے جن سے بڑا بخاری کا شارح پیدا نہیں ہوا۔ یہ بات میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اس میں مکررات بھی شامل ہیں، تعلیقات بھی شامل ہیں، متابعات بھی شامل ہیں اور شواہد بھی شامل ہیں۔ مکررات کو اگر نکال دیا جائے اور صرف وہ احادیث جو براہ راست پوری سند کے ساتھ رسول اکرم ﷺ سے روایت ہوئی ہیں وہ نکالی جائیں تو ۲ ہزار ۶ سو ۲ (2,602) ہیں۔ اس کے برعکس صحیح مسلم میں کل چار ہزار احادیث ہیں۔ گویا چار ہزار احادیث صحیح مسلم میں ہیں اور دو ہزار احادیث صحیح بخاری میں ہیں۔

احادیث کی کل تعداد کیا ہے؟ اس کے بارے میں کچھ کہنا بڑا دشوار ہے۔ لیکن ایک عام اندازہ یہ ہے کہ تکرار کو نکالنے کے بعد کل متون تیس سے چالیس ہزار کے درمیان ہیں۔ آج کل کمپیوٹر کا زمانہ ہے۔ بہت سے لوگوں نے حدیث کی کتابیں کمپیوٹرائز کرنا شروع کی ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد جب ساری کتابیں کمپیوٹرائزڈ ہو جائیں گی تو تمام احادیث کی اصل تعداد سامنے آ جائے گی۔ اس میں بھی قطعیت کے ساتھ تعداد کا تعین کرنا دشوار ہوگا۔ اس لئے کہ کمپیوٹر مکررات کی شناخت نہ کر سکے گا۔ ایک حدیث کے الفاظ اگر مختلف ہیں لیکن مفہوم ایک ہے تو کمپیوٹر اس کو دو احادیث قرار دے گا، لیکن حدیث کا طالب علم اس کو ایک ہی حدیث سمجھے گا۔ اس لئے قطعیت کے ساتھ کمپیوٹر کے لئے بھی دشوار ہوگا کہ بالکل درست تعداد بتا سکے، جو بہرحال تیس اور چالیس ہزار کے درمیان ہے۔

حُجّیت سنت

حُجّیت السنۃ، یعنی کہ سنت کتاب اللہ کے ساتھ حجت ہے اور قرآن مجید کے احکام کی شارح ہے۔ اس پر فقہائے اسلام نے بڑی تفصیل کے ساتھ غور کیا ہے۔ اور سنت کے کردار پر بات کی ہے۔ قرآن مجید میں بنیادی اصول یعنی اصول عامہ ہیں۔ سنت میں ان اصولوں کی تطبیق بیان کی گئی ہے۔ قرآن پاک میں اجمال ہے، سنت میں تفصیل بیان کی گئی ہے۔ مثلاً قرآن پاک میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا فریضہ یہ ہے کہ لتبین للناس مانزل الیھم، کہ جو کچھ اللہ کی

طرف سے نازل ہوا ہے اس کو لوگوں کے سامنے کھول کھول کر بیان کر دے۔ بیان کی مختلف قسمیں ہیں۔ سب سے پہلے تو بیانِ مراد ہے کہ کسی چیز سے اللہ تعالیٰ کی مراد کیا ہے۔ اقیموا الصلوٰۃ میں صلوٰۃ سے مراد کیا ہے۔ وللہ علی الناس حِج البیت میں حج سے مراد کیا ہے؟ خذ من اموالھم من صدقۃٍ میں صدقہ سے مراد کیا ہے؟ یہ ساری چیزیں محتاج وضاحت ہیں۔ اور سنت کا کام یہ ہے کہ ان چیزوں کی اصل معنی کو واضح کر دے۔

سنت اگر نہ ہو تو پھر قرآن پاک کے ان الفاظ کے کوئی معنی متعین نہیں کئے جاسکتے۔ نہ لغت کی مدد سے متعین کئے جاسکتے ہیں نہ کسی اور ذریعے سے۔ قرآن پاک میں اعتکاف کا تذکرہ ہے و انتم عاکفون فی المساجد، اعتکاف سے کیا مراد ہے؟ عاکف کس کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں اس طرح کے درجنوں نہیں سینکڑوں احکام ہیں جن کی کوئی تعبیر وتشریح کسی کے لئے ممکن نہیں ہے اگر سنت کی تعبیر وتشریح ہمارے سامنے نہ ہو۔

اس طرح قرآن پاک کی کچھ آیات میں کچھ الفاظ ہیں جن کے لئے مبہم کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے، یعنی ان کی مراد واضح نہیں ہے۔ سنت سے ان کی تفسیر ہو جاتی ہے۔ کچھ آیات ہیں جو مجمل ہیں۔ سنت سے ان کی تفصیل آجاتی ہے۔ کچھ آیات ہیں جو مطلق اور عمومی انداز میں آئی ہیں۔ سنت سے ان کی تقیید ہو جاتی ہے۔ سنت اس کو قید کر دیتی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے۔ کچھ الفاظ ہیں جو قرآن مجید میں عام استعمال ہوئے ہیں سنت ان کو خاص کر دیتی ہے کہ اس سے خاص مراد یہ ہے اور اس سے باہر نہیں ہے۔ کچھ احکام ہیں جن کے لئے تشریح کی ضرورت ہوتی ہے کہ ان کو نافذ کیسے کیا جائے گا۔ سنت سے ان احکام کی شرح ہو جاتی ہے۔ قرآن پاک میں کچھ احکام ہیں کہ سنت سے اس کے دائرے میں توسیع ہو جاتی ہے کہ اگر چہ اس کا دائرہ بظاہر یہاں تک معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کا انطباق آگے بھی ہوگا۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ قرآن میں ان کے متعلق ایک اصول آیا ہے لیکن اس اصول سے کون کون سے جزوی مسائل نکلتے ہیں ان کی مثالیں سنت نے دے دی ہیں۔ یہ کام ہے، قرآن پاک کی رو سے سنت کا۔ سنِ رسول کا یہ کام ہے کہ ان سب چیزوں کی وضاحت کرے۔

مثال کے طور پر قرآن پاک میں ایک اصول دیا گیا کہ 'لاتاکلوا اموالکم بالباطل الاان تکون تجارۃ عن تراض منکم' ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے مت کھاؤ، سوائے

اس کے تمہاری آپس کی رضامندی سے تجارت اور لین دین ہو۔ آپس کی رضامندی یعنی کھلی، آزادانہ اور برابر کی رضامندی کے ساتھ آپس میں تجارت ہو تو یہ مال لینا جائز ہے۔ اس کے علاوہ ایک دوسرے کا مال لینا کسی بھی حالت میں جائز نہیں ہے۔ اب یہ قرآن کریم کا ایک بنیادی اصول ہے۔ اس کا انطباق کیسے ہوگا اور کہاں کہاں ہوگا۔ اس کی بے شمار مثالیں حدیث میں ملتی ہیں۔ حدیث کی یہ جزوی مثالیں قرآن مجید سے کوئی الگ چیز نہیں ہیں، بلکہ قرآن مجید میں بیان کردہ اسی چیز کی تشریح ہیں، قرآن ہی کے اصولوں کی تشریح ہے۔ مثلاً حدیث میں آیا ہے کہ لاتبع ماليس عندك، جو تمہارے پاس نہیں اس کو فروخت مت کرو، جس چیز کے تم آج مالک نہیں ہو اس کو فروخت مت کرو۔ اب آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا تراضی سے کیا تعلق ہے، ذرا غور کریں تو واضح ہو جاتا ہے کہ اس کا تراضی سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ مثلاً میں راول ڈیم میں شکار کھیلنے جانا چاہتا ہوں اور آپ مجھے ایک ہزار روپے دے دیں کہ جتنی مچھلی شکار ہوگئی وہ آپ کی۔ یہ جائز نہیں ہے۔ یہ عن تراضٍ نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ میرے ذہن میں یہ ہو کہ بیس پچیس کلو مچھلی ملے گی اور میں نے اسی بیس پچیس کلو مچھلی کے لئے ایک ہزار روپے لے لئے۔ اب میں نے آ کے کہا کہ مجھے تو یہ چھوٹی سی ایک ہی مچھلی ملی ہے یہ لے لو۔ ظاہر ہے کہ ایک ہزار روپے میں ایک چھوٹی سی مچھلی آپ کے لئے قابل قبول نہیں ہوگی۔ اس کے برعکس میں چاہوں گا کہ آپ ایک ہزار روپے میں ہی ایک مچھلی قبول کرلیں۔ میں سخت ناراضگی کا اظہار کروں گا اور آپ سے جھگڑوں گا تو تراضی تو ختم ہوگئی۔ اسی طرح ہوسکتا ہے کہ آپ کے ذہن میں یہ ہو کہ ایک ہزار روپے میں تو دس کلو مچھلی ملے گی، اتفاق سے وہاں پچاس کلو مچھلی نکل آئی۔ اب آپ کی رال ٹپکی کہ یہ تو ایک ہزار روپے میں دس ہزار کی مچھلی مل گئی۔ ظاہر ہے کہ میں اس کے لئے آسانی سے تیار نہیں ہوں گا۔ اس جھگڑے سے بچنے کے لئے یہ ہدایت دی گئی کہ اس چیز کی خرید وفروخت ہی نہ کرو جو ابھی تمہارے قبضہ اور ملکیت میں نہیں ہے۔ تو یہ مراد ہے ماتبع ماليس عندك' گویا جو چیز تجارت میں تراضی کو متاثر کرے اور آگے چل کر تراضی کے منافی ثابت ہو وہ جائز نہیں۔ تراضی سے مراد ہے دونوں فریقوں میں برابر کی آزادانہ رضامندی۔

خلاصہ یہ کہ ایک مچھیرا شکار شروع کرنے سے پہلے ہی سودا کرلے کہ ہزار روپے دے دیں جتنی مچھلی ہاتھ لگی سب آپ کی۔ یہ جائز نہیں کیونکہ اس میں عن تراضٍ کی خلاف ورزی ہے۔

اگر مچھلی ہزار روپے سے زیادہ کی پکڑی گئی تو لینے والا تو خوش ہوجائے گا کہ اس کو ہزار روپے میں پندرہ سو کی مچھلی مل گئی لیکن مچھیرے کے دل پر کیا گزرے گی۔ یا فرض کریں کہ مچھلی توقع سے بہت کم مل گئی تو مچھیرا خوش ہوگا کہ بھئی تین سو کی مچھلی ہزار روپے میں بک گئی لیکن لینے والے کے دل پر کیا گزرے گی۔ تو اس طرح کے دل آزار سودے، جن پر دل راضی نہ ہو، جائز نہیں ہیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ 'نھیٰ رسول اللہ ﷺ عن بیع الثمر قبل ان یبدو صلاحھا' کہ درخت میں جب تک پھل کے بارہ میں یہ بات واضح طور پر سامنے نہ آجائے وہ پک چکا ہے، اور درخت پر موجود ہے، اس وقت تک اس کی بیع جائز نہیں ہے۔ لوگ اکثر ایسا کرتے ہیں کہ موسم کے شروع میں ہی باغوں کو فروخت کر دیتے ہیں، جبکہ ابھی پھل لگا بھی نہیں ہوتا۔ یہ جائز نہیں ہے۔ مثلاً میں نے اپنے آموں کے باغ کی ربیع کی اگلی فصل آپ کو دے دی ہے آپ ایک لاکھ روپے مجھے دے دیجئے۔ اب آم لگے گا کہ نہیں لگے گا، آندھی چلے گی سارا بور گر جائے گا، کوئی ویسے چرا کر لے جائے گا یا باغ میں آگ لگ جائے گی، ہزاروں چیزیں ہوسکتی ہیں۔ مجھے ان سے بحث نہیں، میں نے اپنے ایک لاکھ روپے کھرے کر لئے۔ اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔ یہ چیز تراضی کے خلاف ہے اور شریعت میں جائز نہیں۔ جب تک درخت میں پھل لگ کر واضح نہ ہوجائے کہ پھل لگ چکا ہے اور اب عام حالات میں نہیں گرے گا اس وقت تک اس کی فروخت جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس میں بھی تراضی میں گڑبڑ پیدا ہوگی۔ یہ مثالیں اس بات کی ہیں کہ حدیث میں جو ہدایات آئی ہیں وہ قرآن پاک ہی کے کسی بنیادی اصول کی تشریحات ہیں۔

بعض اوقات قرآن پاک میں ایک حکم کا دائرہ بتا دیا گیا ہے کہ اس حکم کا یہ دائرہ ہے۔ سنت نے اس دائرہ کو وسیع کر دیا کہ اس کا انطباق فلاں جگہ پر بھی ہوتا ہے جو بظاہر الفاظ میں نہیں ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید میں آیا ہے کہ احل لکم الطیبات، تمہارے لئے پاکیزہ چیزیں حلال ہیں اور 'ویحرم علیکم الخبائث، اور ناپاک اور گندی چیزیں تمہارے لئے حرام ہیں۔ اب طیبات کیا ہیں اور خبائث کیا ہیں۔ اس کی وضاحت بہت سی احادیث میں ہوئی ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں آیا ہے کہ 'نھیٰ رسول اللہ ﷺ عن کل ذی ناب من کل سباع، کہ ہر وہ درندہ جو اپنے دانت سے شکار کر کے کھاتا ہے اس کا گوشت حرام ہے۔ اب حضورؐ نے بتایا ہے

کہ یہ بھی خبائث میں شامل ہے۔طیبات میں شامل نہیں ہے۔پھر حدیث میں آپ نے فرمایا کہ ہر وہ پرندہ جو جانور کا شکار کر کے اس کا گوشت کھاتا ہے اس کو سباع میں شامل سمجھا جائے گا گویا وہ بھی طیبات میں نہیں خبائث میں شامل ہے۔قرآن پاک میں تو ایک عمومی بات ہے لیکن اس کی مثالیں کون بتائے، کیسے پتہ چلے کہ کون سی چیز طیبات میں شامل ہے اور کون سی چیز خبائث میں سے ہے یہ حدیث اور سنت ہی سے پتہ چل جائے گا۔ ان مثالوں سے اس کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

قرآن پاک میں آیا ہے کہ'و ان تجمعوا بین الاختین' کہ دونوں بہنوں سے ایک وقت میں نکاح جائز نہیں ہے، ایسا کرنا حرام ہے۔اب یہ بالکل صریح حکم ہے اور الفاظ میں مزید اضافہ کی بظاہر کہیں گنجائش نہیں ہے، لیکن حدیث میں آیا ہے کہ پھوپھی اور بھتیجی سے بھی بیک وقت نکاح نہیں ہوسکتا۔ بھانجی اور خالہ سے بھی بیک وقت نکاح نہیں ہوسکتا۔ یہ گویا extension ہے ان احکام کی جو قرآن پاک میں آئے ہیں۔حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا۔

اسی طرح قرآن پاک میں جو بات یا حکم مجمل ہے اس کی تفصیل حدیث میں بیان کردی گئی ہے جس کی مثالوں سے ہر مسلمان واقف ہے۔آپؐ نے فرمایا کہ صلوا کما رائیتمونی اصلی ،جس طرح مجھے دیکھو نماز پڑھتے رہو۔ خذوا عنی مناسککم، حج کے مناسک مجھے دیکھتے جاؤ کرتے جاؤ۔اسی طرح زکوۃ کے احکام کی تفصیل بتائی۔

پھر بعض جگہ قرآن پاک میں ایک لفظ عام ہوتا ہے لیکن سنت سے اس کی تخصیص ہو جاتی ہے کہ اس سے فلاں چیز مراد نہیں ہے۔مثال کے طور پر قرآن پاک میں ہے یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین 'اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے اپنی اولاد کے بارے میں کہ ہر مرد کو آدھا حصہ ملے گا عورت کے مقابلہ میں۔یہ اصول صرف اولاد میں چلے گا اور جگہ نہیں چلے گا، بعض جگہ برابر بھی ہے بعض جگہ زیادہ بھی ہے۔سورۃ النساء کو دوبارہ پڑھئے گا تو پتہ چلے گا کہ بعض جگہ عورتوں کا حصہ برابر ہے اور بعض جگہ زیادہ ہے۔ ہماری مغرب زدہ عورتوں کو یہ پہلی آیت تو یاد رہتی ہے باقی آیات یاد نہیں رہتیں لیکن یہ ایک عام اصول ہے۔

حضورؐ نے فرمایا لایرث القاتل۔اگر بیٹا باپ کا قاتل ہو تو اس کو وراثت نہیں ملے گی۔ پوتا دادا کو قتل کردے تو وراثت نہیں ملے گی۔بھتیجا چچا کو قتل کردے تو وراثت نہیں ملے گی۔

ویسے تو وراثت کا حکم عام ہے اور قرآن پاک میں اس کی تخصیص نہیں ہے۔ لیکن حدیث میں اس کی تخصیص کر دی گئی ہے۔

قرآن پاک کے دوسرے پارے میں سورۃ بقرہ میں ہے کہ کتب علیکم الوصیة تم پر وصیت فرض کی گئی ہے۔ یہ ایک عام حکم ہے۔ اس عمومی کی تخصیص کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ الالا وصیة لوارث، سن لو، وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں ہو سکتی۔ گویا یہ حضورؐ نے تخصیص کر دی ہے قرآن پاک کے ایک عمومی حکم کی۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ سمجھنا درست نہیں ہوگا کہ سنت کا کام بس یہی ہے کہ قرآن پاک کے اجمال کی تفصیل کرے یا اس کے دائرے میں توسیع کر دے اور اس کے علاوہ سنت کا کوئی کردار نہیں۔ سنت کا کردار براہ راست احکام دینا بھی ہے۔ قرآن پاک میں ہے کہ ہم نے رسول کو بھیجا لیحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث، تاکہ وہ رسول طیبات کو ان کے لئے حلال قرار دے اور خبائث کو ناجائز قرار دے۔ گویا رسول خود بھی جس چیز کو طیب دیکھیں اس کو جائز قرار دیں اور جس چیز کو خبیث دیکھیں اس کو حرام قرار دے سکتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جائز و ناجائز کے کئی ایسے احکام ہیں جو سنت میں براہ راست ملتے ہیں، جن کی کوئی بنیاد براہ راست قرآن پاک میں نہیں ہے۔ مثلاً خیار شرط کی حضورؐ نے اجازت دے دی ہے۔ ایک صحابیؓ تھے جو بڑے سادہ لوح تھے ان کا نام جہان ابن منقذؓ تھا۔ وہ جب خرید و فروخت کیا کرتے تھے تو اکثر دھوکہ کھا کے آتے تھے۔ گھر والے کہتے تھے کہ آپ تو یہ چیز مہنگی لے آئے، آپ تو غلط لے آئے، یہ تو سستی مل سکتی تھی، انہوں نے حضورؐ سے شکایت کی کہ میں اس طرح جاتا ہوں اور خریداری کر کے گھر واپس آتا ہوں تو گھر والے کہتے ہیں کہ یہ سودا تو غلط ہوا، دوبارہ بازار جاتا ہوں تو بازار کے لوگ مانتے نہیں، مجھے کیا کرنا چاہئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اذا بایعت، جب تم آئندہ بیع و شراء کرو، فقل، تو یہ کہہ دیا کرو، کہ لا خلابہ، میں دھوکہ نہیں دینا چاہتا، و لی الخیار ثلاثة ایام، مجھے اختیار رہو گا کہ میں تین دن تک چاہوں تو اس کو واپس کر سکوں۔ یہ تین دن کی شرط رکھ لیا کرو۔ یہ بنیاد ہے تین دن کی شرط کی کہ گویا اگر کوئی خریدا تین دن خیار شرط رکھنا چاہے کہ میں تین دن تک اس پر دوبارہ غور کر سکتا ہوں اور اگر رائے بدلی تو واپس کر سکتا ہوں تو اس کی اجازت ہے اگر دونوں فریق طے کریں۔ اس کی کوئی بنیاد براہ راست قرآن پاک میں نہیں

ہے۔لیکن بالواسطہ تراضی میں یہ بھی شامل ہے کہ اگر دونوں فریق راضی ہوں تو یہ ہوسکتا ہے۔ لہٰذا قرآن پاک میں اس حکم کی بالواسطہ بنیادیں تو ہیں لیکن براہ راست بنیاد کا تعین کرنا مشکل ہے۔

شفعہ کے بارے میں حدیث میں ہے کہ اگر آپ کے پڑوس میں کوئی جائداد مل رہی ہو، یا آپ کسی جائداد میں شریک ہوں، اس میں آپ کا حصہ ہو، اور ایک حصہ دار اپنا حصہ بیچنا چاہے تو پہلا حق آپ کا ہے بہ نسبت غیر آدمی کے۔آپ نے اپنی بہن کے ساتھ مکان بنایا ہے اوپر وہ رہتی ہے نیچے آپ رہتے ہیں۔اب بہن اپنا حصہ بیچنا چاہتی ہے، بجائے اس کے کہ کوئی غیر آدمی آئے اور آپ کو اس سے زحمت ہو، پردے کے مسائل پیدا ہوں یا اور کوئی مسئلہ ہو تو آپ کو شریعت نے یہ اختیار دیا ہے کہ آپ بہن یا کسی بھی شریک جائداد سے کہیں کہ یہ حصہ کسی اور کو دینے کے بجائے مجھے دے دو۔ اب بہن کی ذمہ داری ہے کہ پہلے آپ کو ترجیح دے اور آپ کے ہاتھ فروخت کرے۔ یہ شفعہ کے بارے میں شریعت کا حکم ہے جو آج دنیا کے بہت سے قوانین میں استعمال ہوتا ہے اور اب دنیا اس سے مانوس ہوگئی ہے۔لیکن انگریز کے زمانے سے پتہ نہیں کیوں یہ چلا آرہا ہے کہ شہری جائداد پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔کیوں نہیں ہوتا؟ ہونا چاہئے،شریعت کا جو منشا ہے وہ ہر جائداد پر حق شفعہ کے لاگو ہونے سے ہی پورا ہوسکتا ہے۔یہاں شہری جائداد کا استثنا کردیا گیا ہے اور غیر شہری جائداد پر ہی اس کا انطباق ہوتا ہے۔

یہ اس موضوع پر گفتگو کا مختصر خلاصہ ہے کہ سنت ماخذ شریعت ہے۔کس طرح ماخذ شریعت ہے، اس کے احکام میں احادیث کے درجات کا لحاظ رکھا جائے گا۔صحت کے لحاظ سے، ثبوت کے اعتبار سے اور معنی کے اعتبار سے احادیث کے جو مختلف درجات ہیں، ان سب کو پیش نظر رکھ کر طے کیا جائے گا کہ کس حدیث سے کون سے احکام نکلتے ہیں۔اسی کے حساب سے احکام کا درجہ متعین ہوگا۔جو حدیث متواتر کے درجہ کی ہے، جس پر کل بات ہوگی، اس کا درجہ سب سے اونچا ہے۔پھر آگے مختلف درجات ہیں جن پر ہم آئندہ بات کریں گے۔

وآخر دعوانا أن الحمدلله رب العلمین

☆☆☆☆☆☆☆

کیا صحیح بخاری میں سب صحیح احادیث ہیں؟ کوئی ضعیف حدیث نہیں ہے؟

صحیح بخاری کے اندر کوئی ضعیف حدیث موجود نہیں ہے۔ محدثین کے معیارات کی رو سے اس کی تمام احادیث صحیح احادیث ہیں۔

جو منکرین حدیث نماز کو ہی دعا کا نام دیتے ہیں ان کو کیسے بتایا جائے، وہ کہتے ہیں کہ قرآن ایک مکمل کتاب ہے اور اس میں اگر وضو اور تیمم کا طریقہ بتایا جاسکتا ہے تو نماز کا طریقہ کیوں نہیں بتایا گیا؟ وہ لوگ الصلوۃ کا مطلب دعا کرتے ہیں کیونکہ یہ لفظ قرآن ہی میں دعا کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ قرآن مجید یقیناً ایک مکمل کتاب ہے، لیکن اگر قرآن مجید کے ساتھ ایک معلم بھی بھیجا گیا ہے، شارع بھی ساتھ بھیجا گیا ہے تو شارع اور معلم کا ساتھ بھیجا جانا قرآن کے مکمل ہونے سے متعارض نہیں ہے۔ قرآن شارع کی موجودگی میں بھی مکمل ہوسکتا ہے اور ایک معلم کی موجودگی میں بھی مکمل ہوسکتا ہے۔ اس کی تکمیل میں کوئی فرق نہیں آتا۔ مکمل اس اعتبار سے ہے کہ انسان کی اس دنیا اور آخرت میں کامیابی کے لئے، ایک اخلاقی اور روحانی کامرانی اور خوف خدا رکھنے والے انسان کے طور پر کامیابی کے جو تمام اصول ہیں وہ سارے کے سارے اس کتاب میں سمو دیئے گئے ہیں اور اس کتاب کے باہر اب کوئی بھی ایسا اصول نہیں ملتا جس پر انسان کی اخروی کامیابی کا دارومدار ہو اور وہ اس کتاب میں موجود نہ ہو۔ لیکن کسی اصول کی تشریح یا وضاحت اگر کی جائے تو اس سے کتاب کی کاملیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

جناب تعلیقات کو دوبارہ بیان کر دیجئے؟

'تعلیقات' تعلیق کی جمع ہے۔ اس کے لغوی اور لفظی معنی ہیں معلق یعنی لٹکا ہوا کر دینا۔ معلق اس حدیث یا روایت کو کہتے ہیں کہ جس میں راوی کے اور جس کی روایت ہے اس کے درمیان کچھ واسطے کٹ گئے ہوں، اس پر آئندہ بات ہوگی کہ علم حدیث کی اصطلاح میں معلق کس کو کہتے ہیں۔ امام بخاری بہت سی معلق روایات صحیح بخاری میں لائے ہیں، اس لئے کہ وہ ان کو بطور استدلال کے یا کسی چیز کے شواہد کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں براہ راست حدیث کے طور پر پیش کرنا ان کا مقصد نہیں ہے۔ کل میں صحیح بخاری ساتھ لے آؤں گا تو اس میں سے تعلیقات کی مثال دے کر آپ کے سامنے بیان کر دوں گا۔ اب چونکہ تعلیقات کتاب کے اصل ڈھانچہ کا حصہ نہیں ہے، اس لئے ان معلق روایات کا وہ درجہ نہیں ہے جو کتاب کی اصل روایات کا ہے۔ بلکہ کسی خاص

روایت کی کسی خاص بات کی وضاحت کے لئے انہوں نے ضمناً کوئی روایت نقل کردی ہے، اس کو تعلیق کہتے ہیں جیسے چلتے چلتے ذہن میں کوئی بات آجائے اور آدمی اس کو بیان کردے۔ اس مقصد کے لئے امام بخاری نے یہ چیزیں شامل کی ہیں۔

ہم جیسے طلبہ جو حدیث کے بارے میں پہلی بار کچھ سیکھ رہے ہیں اگر مزید سیکھنا چاہیں تو متوسط ذہن کے لئے آپ کے خیال میں حدیث کی کونسی کتاب درست ہوگی؟

ایک تو ہے متن حدیث، یعنی احادیث کا ایسا مجموعہ جس میں ترجمہ بھی ہو اور اچھی تشریح بھی ہو، اس کے لئے میری ناچیز رائے میں دو کتابیں بہت اچھی ہیں۔ ایک کتاب نسبتاً ذرا آسان ہے دوسری کتاب نسبتاً ذرا مشکل ہے۔ آسان کتاب تو ہے 'معارف الحدیث'۔ یہ مولانا منظور نعمانی کی ہے۔ وہ ہندوستان کے معروف عالم تھے، حال ہی میں ان انتقال ہوگیا ہے۔ بڑے پائے کے صاحب علم تھے۔ ان کی یہ کتاب معارف الحدیث سات جلدوں میں ہے، اردو میں ہے بہت اچھی کتاب ہے۔ دوسری کتاب ہے 'ترجمان السنۃ'۔ یہ ایک بزرگ تھے مولانا بدر عالم صاحب ہجرت کرکے، مدینہ منورہ چلے گئے تھے، اس لئے مہاجر مدنی کہلاتے ہیں۔ ان کی کتاب 'ترجمان السنۃ' چار جلدوں میں ہے۔

منتخب احادیث کے متن، ترجمہ اور شرح کے مطالعہ کے لئے یہ دو کتابیں کافی ہیں اور ان سے ان شاء اللہ بہت رہنمائی ملے گی۔ جہاں تک علم حدیث کا بطور فن کے سمجھنے کا تعلق ہے، اس پر اردو میں بہت سی کتابیں ہیں لیکن ان میں سب سے اچھی کتاب کونسی ہے، میرا خیال یہ ہے کہ اردو میں جو کتابیں ہیں ان میں سب سے اچھی کتاب لبنان کے ایک بڑے صاحب علم انسان ڈاکٹر صبحی صالح کی کتاب 'مباحث فی علوم الحدیث' ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ ترجمہ غالباً سیالکوٹ کے کسی بزرگ نے کیا تھا۔ یہ ترجمہ کئی بار چھپ چکا ہے۔

ہم صحیح اور ضعیف حدیث میں کیسے فرق کر سکتے ہیں؟

اس پر کل تفصیل کے ساتھ بات ہوگی۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بخاری میں ضعیف احادیث بھی ہیں۔ وہ ایسا کیوں کہتے ہیں؟

یہ انہی سے پوچھئے کہ وہ کیوں کہتے ہیں۔ محدثین جو اس فن کے ماہر ہیں جو ہمیشہ سے اس پر غور کرتے آرہے ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ بخاری میں کوئی ضعیف حدیث شامل نہیں ہے۔ صحیح

بخاری میں جتنی بھی احادیث ہیں وہ ساری کی ساری صحیح ہیں۔لیکن یہ یادرکھئے کہ صحیح احادیث میں بھی بعض احادیث ہیں کہ ان پرعمل کرنے کے لئے کچھ شرائط پیش نظر رکھنی پڑتی ہیں، کن حالات میں ان پرکس طرح عمل کیا جائے گا، یہ ایک لمبی اور تفصیلی بحث ہے۔اس میں صرف لفظ 'صحیح' کو یاد کرکے کوئی فیصلہ کرنا غیر متخصص کے لئے درست نہیں ہے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں مسلم کی خصوصیات قدرے زیادہ ہیں......

نہیں، بخاری کی خصوصیات زیادہ ہیں۔مسلم کی کم ہیں۔لیکن بعض خصوصیات مسلم کی زیادہ ہیں۔بعض بخاری کی زیادہ ہیں۔مجموعی طور پر بخاری کی خصوصیات زیادہ ہیں۔اس لئے امت نے عام طور پر بخاری ہی کو پہلا درجہ دیا ہے۔لیکن سب اللہ کے رسول کے کا کلام ہے ہمارے لئے سب کا درجہ برابر ہے اور اگر دونوں میں موازنہ کرنا ہی ہے تو نسبتاً بخاری کا درجہ زیادہ بنتا ہے۔

تلقی بالقبول کی صورت میں حدیث کو درست یا صحیح قرار دینا،کیا یہ طریقہ آج بھی درست ہوگا؟

نہیں آج تلقی بالقبول کی بنیاد پرکسی ضعیف حدیث کو قابل قبول قرار دینا درست نہیں ہوگا۔اگرکسی حدیث کو متقدمین نے بالاتفاق ضعیف یا کمزور یا ناقابل قبول قرار دیا ہے تو آج تلقی بالقبول کی وجہ سے وہ قابل قبول نہیں ہو جائے گی۔تلقی بالقبول ان لوگوں کے درمیان مانا جاتا ہے جو علم حدیث کے امام تھے۔ہمارے اور آپ کے درمیان تلقی بالقبول کی کوئی حیثیت نہیں۔ہم اور آپ تو کسی شمار قطار میں نہیں آتے، جو حدیث کے ائمہ ہیں،علماء ہیں، جنہوں نے زندگیاں اس میں کھپائی تھیں ان میں دیکھا جائے گا کہ کسی حدیث کو تلقی بالقبول حاصل تھی کہ نہیں تھی۔مثال کے طور پر ایک چیز عرض کرتا ہوں۔تلقی بالقبول کے بھی قواعد ہیں۔مثلاً ایک حدیث ہے 'لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق '۔کسی مخلوق کی اطاعت اُس وقت نہیں کی جاسکتی جب اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہورہی ہو۔ماں باپ کی اطاعت نہیں ہوسکتی اگر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہورہی ہو۔عدالت کی فرمانبرداری نہیں ہوسکتی اگر اللہ کے حکم کی خلاف ورزی ہورہی ہو،حکومتوں کے احکام کی پابندی نہیں ہوسکتی اگر اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی ہورہی ہو۔لیکن یہ حدیث ان الفاظ میں بہت ضعیف ہے۔پتہ نہیں کسی بہت غیر مستند کتاب میں آئی ہوگی۔لیکن معناً درست ہے اور اس

سے کوئی اختلاف نہیں کرسکتا۔ دوسرے الفاظ میں کسی اور عبارت میں یہی اصول قرآن پاک میں بھی آیا ہے حدیث میں بھی آیا ہے۔ چونکہ ان الفاظ کو تلقی بالقبول حاصل ہے اس لئے ہم اس کو کہیں گے کہ درست ہے۔ تلقی بالقبول تبع تابعین کے زمانے ہی تک درست ہے۔ یعنی تابعین، تبع تابعینؒ اور ائمہ محدثین کے زمانے تک۔

کیا حدیث کی کتابیں آج بھی ویسی ہی ہیں جیسے لکھی گئیں تھیں؟

حدیث کی کتابوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ الحمدللہ وہ ویسی کی ویسی موجود ہیں اور آج تک موجود ہیں۔ اب اس میں کسی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے کیونکہ لاکھوں کی تعداد میں چھپی ہوئی ہیں۔ حدیث کے ہزاروں حافظ آج بھی موجود ہیں۔ میں نے دیکھا ہے ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنی یادداشت سے پوری صحیح بخاری سنا سکتے ہیں اور ایک نقطہ کا فرق نہیں ہوتا۔

عورتوں کی نماز کے طریقے میں کیا فرق ہے؟ کیا دونوں کی نماز ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے؟

بہت مختلف تو بالکل نہیں ہے۔ جو اختلاف ہے وہ بہت ہلکی قسم کا ہے۔ آپ کا جیسے جی چاہے نماز پڑھیں آپ کی نماز ہو جائے گی، آپ اس اختلاف کی تفصیلات میں نہ جائیں۔

ایک روایت میں ہے کہ خواتین کو نماز کے وقت پردے اور حجاب کا اہتمام کرنا چاہئے۔ ایک حدیث سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اب اس کی تعبیر کیسے ہو اور اس پر عمل درآمد کیسے ہو۔ بعض فقہا یہ کہتے ہیں کہ جب خواتین نماز پڑھیں تو خاص طور پر جب سجدے میں جائیں تو اس طرح نہ جائیں کہ ان کے جسم کی ساخت ظاہر ہو کیونکہ سجدے میں لباس جسم سے چمٹ جاتا ہے اور کھڑے رہنے میں ڈھیلا رہتا ہے۔ سجدے کے وقت لباس کمر اور جسم پر چپک جاتا ہے اور جسم کی ساخت ظاہر ہو جاتی ہے۔ تو پردے کا جو معیار ہے وہ برقرار نہیں رہتا۔ اس لئے بعض فقہا نے کہا ہے کہ جب خواتین سجدہ میں جائیں تو یہ اہتمام کریں کہ لباس جسم سے نہ چپکے اور وہ اپنے جسم کو سمیٹ لیں۔ بعض نے کہا کہ حجاب کا اہتمام تو کرلیں لیکن جسم کو سمیٹنے کی ضرورت نہیں۔ یہ محض ایک تعبیر کی بات ہے۔ آپ کا جیسے جی چاہے کریں۔ اس طرح کی چیزوں پر غیر ضروری اور طویل بحث نہیں کرنی چاہئے۔

موطا صحاح ستہ میں کیوں شامل نہیں؟

موطا امام مالکؒ کے بارے میں ابھی تو میں نے اتنی تفصیل سے عرض کیا ہے۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس میں احادیث کے علاوہ بہت سی اور چیزیں بھی شامل ہیں جو احادیث نہیں ہیں۔ اس میں امام مالکؒ کے اپنے فرمودات اور فتاویٰ بھی شامل ہیں جو احادیث کا موضوع نہیں ہے۔ چونکہ موطا خالص احادیث کا مجموعہ نہیں ہے اس لئے بہت سے لوگوں نے اس کو احادیث کے مجموعوں میں شامل نہیں کیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں جو مرفوع احادیث آئی ہیں وہ ساری کی ساری صحیح بخاری اور مسلم میں آگئیں، اس لئے جب صحیح بخاری اور مسلم کو صحیحین قرار دیا گیا تو امام مالکؒ کی موطا کی احادیث خود بخود صحاح میں شامل ہو گئیں۔

ہم بخاری شریف کیوں پڑھتے ہیں؟ جبکہ مؤطا اور صحیح مسلم اتنی اچھی کتابیں ہیں۔ نیز یہ بتائیں کہ موطا کو موطا کیوں کہا جاتا ہے؟

آپ ضرور پڑھئے، کون کہتا ہے کہ آپ موطا نہ پڑھیں۔ موطا کے معنی ہے **Beaten Track**، اس کا مطلب ہے وہ راستہ جو زیادہ استعمال سے زیادہ کشادہ ہو جائے۔ امام مالکؒ نے چونکہ اپنے زمانے کی سنت کو جمع کیا تھا۔ گویا **Beaten Track** جس پر حضورؐ اور صحابہ کے زمانے سے عمل ہو رہا ہے اور لوگوں کے لئے ایک راستہ فراہم ہو گیا۔ بخاری مسلم سب پڑھنی چاہئے۔ لیکن اگر کہیں کورس میں یا نصاب میں کوئی ایک کتاب اختیار کی گئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی مصلحت سے اختیار کی گئی ہے۔ اگر آپ کے نصاب میں صحیح بخاری ہے تو اچھی بات ہے۔ آپ کے پاس جتنا وقت ہوگا اس کے حساب سے بقیہ کتابیں بھی شامل ہوں گی۔ اس کا دارومدار تو وقت اور صلاحیت پر ہے۔

جزاکم اللہ، والسلام علیکم

☆☆☆☆☆☆☆

چوتھا خطبہ

روایت حدیث اور اقسام حدیث

جمعرات، 9 اکتوبر 2003

روایت حدیث اور اقسام حدیث

علم حدیث بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک حصہ وہ ہے جس کو علم روایت کہتے ہیں اور دوسرا حصہ وہ ہے جس کو علم درایت کہتے ہیں۔ علم روایت میں اس ذریعہ یا وسیلہ سے بحث ہوتی ہے جس کے ذریعے کوئی حدیث رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک سے لے کر ہم تک پہنچی ہو۔

روایت اور درایت

روایت، سند، رواۃ، راوی کا سچا یا غیر سچا ہونا، راوی کا کردار، اس کا حافظہ یہ ساری چیزیں علم روایت میں زیر بحث آتی ہیں۔ علم درایت کی زیادہ توجہ حدیث کے متن اور اس حصہ پر ہوتی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی سے عبارت ہے۔

میں آپ کے سامنے آج ایک کتاب لے کر آیا ہوں۔ اس میں سے بعض چیزیں مثال کے طور پر آپ کے سامنے رکھوں گا۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے اور ساری صحاح ستہ اس میں شامل ہیں۔ صحاح ستہ کا مکمل نسخہ ایک جلد میں ہمارے ایک دوست نے شائع کیا ہے۔ جس میں ساری کی ساری چھ کتابیں شامل ہیں۔

میں ایک حدیث پڑھتا ہوں اور پھر میں بتاؤں گا کہ اس میں علم روایت سے کس جگہ بحث ہوتی ہے اور علم درایت سے کس جگہ بحث ہوتی ہے۔ یہ صحیح بخاری کی کتاب الایمان ہے۔ کتاب الایمان کا باب نمبر پانچ ہے جس کا عنوان ہے 'باب ای الاسلام افضل'۔ یعنی سب سے اچھا اور افضل اسلام کونسا ہے یا کس کا ہے۔

'حدثنا سعیدبن یحییٰ بن سعید القریشی قال حدثنا ابی، قال حدثنا ابو بردہ بن عبداللہ بن ابی بردہ عن ابی بردہ، عن ابی موسیٰؓ قال، قالوا یا رسول اللہ ﷺ ای الاسلام افضل، قال من سلم المسلمون من لسانہ و یدہ'۔

یہ عبارت جو میں نے آپ کے سامنے پڑھی ہے اس میں دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں کچھ نام آئے ہیں۔ یہ ان راویوں کے نام ہیں جن کے ذریعے یہ حدیث امام بخاری تک پہنچی۔ سعید بن یحیٰی بن سعید القریشی امام بخاری کے استاد ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حدثنا ابی، مجھ سے میرے والد نے بیان کیا، یعنی یحیٰی بن سعید القریشی نے، وہ کہتے ہیں کہ حدثنا ابو بردہ بن عبداللہ بن ابی بردہ، یہ ابو بردہ مشہور صحابیؓ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے پوتے تھے، وہ اپنے دادا ابو بردہ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ اپنے والد حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت کرتے ہیں۔ یہاں تک یہ سند ہے اور سند سے متعلق جتنے بھی مسائل اور معاملات ہیں وہ علم روایت میں زیر بحث آتے ہیں۔ اس کو خارجی مطالعہ حدیث یا خارجی نقد حدیث بھی کہتے ہیں۔ یعنی حدیث سے باہر جو چیزیں ہیں ان کا مطالعہ کرکے اور حدیث کے سورس (Source) اور ماخذ کا مطالعہ کرکے یہ پتہ چلایا جائے کہ اس حدیث کا درجہ کیا ہے۔ یہاں یہ دیکھا جائے گا کہ یہ رواۃ جن سے یہ حدیثیں بیان ہوئی ہیں، یہ کون لوگ تھے؟ کن صفات کے حامل لوگ تھے، ابھی ان کی صفات کی بات کرتے ہیں۔ انہوں نے جس راوی سے روایت بیان کی ہے اس سے ان کی ملاقات ہوئی ہے کہ نہیں ہوئی ہے۔ امام بخاری پہلے یہ تحقیق کرتے ہیں کہ واقعتاً ملاقات ہوئی ہے اور واقعتاً انہوں نے کسب فیض کیا ہے۔ امام مسلم کے نزدیک یہ تحقیق ضروری نہیں ہے۔ اگر یہ دونوں معاصر ہیں۔ اور ایک علاقہ میں رہتے تھے اور دونوں کی ملاقات ممکن تھی تو امام مسلم کے نزدیک عام روایت کے لئے یہ کافی ہے، وہ آگے مزید تحقیق نہیں کرتے۔ اس کے برعکس امام بخاری یہ تحقیق بھی کرتے ہیں کہ ان کی ملاقات ثابت بھی ہوئی ہو۔ وہ اس کے بعد وہ ان سے روایت لیتے ہیں۔ یہ سارے مسائل علم روایت میں زیر بحث آتے ہیں۔

متن حدیث

اس کے بعد متن حدیث کا معاملہ آتا ہے یعنی اس ارشاد گرامی کا، کہ صحابہ کرام نے

پوچھا کہ یا رسول اللہ کون سا اسلام افضل ہے؟ آپؐ نے فرمایا وہ اسلام جس میں مسلمان ایک دوسرے کی زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہیں۔اس ارشاد گرامی کا مطالعہ کہ اس سے کیا چیز ثابت ہوتی ہے اور جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ شریعت کے عمومی اصول اور تصورات کے مطابق ہے کہ نہیں۔ یہ ساری چیزیں جس فن کے ذریعے مطالعہ کی جائیں گی، اس فن کا نام ہے علم درایت۔ ہم پہلے علم روایت کی بات کرتے ہیں۔

علم روایت

علم روایت میں سب سے پہلے یہ چیز دیکھی جاتی ہے کہ راوی نے حدیث کا تحمل کیسے کیا۔علم حدیث کے بارے میں راوی کے دو کردار ہیں۔ایک کردار تو اس وقت آتا ہے جب اس نے وہ حدیث حاصل کی جو وہ بیان کر رہا ہے۔ دوسرا کردار اس وقت آتا ہے جب اس نے وہ حدیث آگے بیان کی۔ایک کو تحمل کہتے ہیں اور دوسرے کو ادا کہتے ہیں۔تحمل کا ترجمہ انگریزی میں آپ **reception** کر سکتے ہیں۔تحمل کی اصطلاح یہاں بڑی معنی خیز ہے۔تحمل کے لفظی معنی تو ہیں برداشت کرنا یا کسی بھاری چیز کو اٹھانا۔ یہاں تحمل حدیث کے معنی ہوں گے حدیث نبوی کی بھاری ذمہ داری یا امانت کو اٹھانا۔ ادا کا ترجمہ آپ **delivery** کر سکتے ہیں۔ جب اس نے حدیث کو اپنے شیخ سے **receive** کیا تو کہا جائے گا کہ راوی نے حدیث کا تحمل کیا۔ پھر جب راوی اس حدیث کو دوسرے لوگوں سے بیان کرے گا، گویا دوسروں کو **deliver** کرے گا تو کہا جائے گا کہ اس نے حدیث کی یہ امانت ادا کر دی۔ادا کے لفظ میں بھی امانت اور ذمہ داری کا مفہوم موجود ہے۔ یہ دو الگ الگ مراحل ہیں اور دونوں کے الگ الگ احکام اور الگ الگ شرائط ہیں۔

سماع

سب سے پہلے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تحمل حدیث سے کیا مراد ہے۔تحمل حدیث یعنی جب راوی حدیث کا مواد حاصل کر رہا ہے تو اس کے طریقے کیا کیا ہیں۔سب سے پہلا طریقہ تو سماع کہلاتا ہے کہ انہوں نے براہ راست اپنے استاد یا شیخ کی زبان سے سنا ہو، شیخ نے حدیث پڑھ کر ان کو سنائی ہو اور سنانے کے بعد اجازت دی ہو، یہ طریقہ سماع کہلاتا ہے اور سب سے افضل طریقہ ہے۔

قرات

اس کے بعد دوسرا طریقہ آتا ہے قرات کا، جو میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ شاگرد نے استاد کے سامنے قرات کی ہو اور قرات سننے کے بعد استاد نے اجازت دی ہو کہ تمہاری قرات درست ہے اب تم آگے میرے حوالہ سے اس حدیث کو بیان کر سکتے ہو۔

اجازت

تیسرا درجہ اجازت کا ہے۔ اجازت سے مراد یہ ہے کہ استاد نے کسی صاحب علم کو، جس کے علم، اخلاص اور تقویٰ پر استاذ بھروسہ ہو، یہ اندازہ کرنے کے بعد کہ یہ شخص حدیث کا علم رکھتا ہے، کسی خاص مجموعہ حدیث کے روایت کرنے کی اجازت اس کو دے دی ہو۔ اجازت کا یہ طریقہ آج بھی رائج ہے، ماضی میں بھی رائج تھا۔ ایک دوسرے کو اجازت دینے کا یہ طریقہ تابعین اور تبع تابعینؒ کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔

یہ تین درجے تو وہ ہیں جو بڑے معیاری سمجھے جاتے ہیں اور صحاح ستہ کی احادیث انہی تین طریقوں سے آئی ہیں۔ زیادہ سماع کے طریقے سے، اور کچھ حصہ قرات کے ذریعے اور تھوڑا حصہ اجازت کے ذریعے، جو کہ بہت تھوڑا بلکہ برائے نام ہے۔ ان تین طریقوں کے علاوہ صحاح ستہ میں کسی اور طریقہ تحمل سے آئی ہوئی کوئی حدیث شامل نہیں ہے۔

مناولہ

اس کے علاوہ ایک اور طریقہ 'مناولہ' کا طریقہ ہے۔ مناولہ کے معنی حوالہ کر دینا یا کسی کو سونپ دینا۔ مناولہ سے مراد یہ ہے کہ شیخ کے پاس احادیث کا ایک مجموعہ لکھا ہوا موجود ہے۔ اس میں ایک حدیث ہے، یا سو ہیں یا پانچ سو ہیں، وہ حدیث کا مجموعہ دستی طور پر کسی کے حوالہ کر کے کہہ دیا جائے کہ میں یہ کتاب آپ کے حوالہ کر رہا ہوں اس میں جو روایات ہیں، آپ ان کو میری طرف سے بیان کر سکتے ہیں۔ مناولہ کا طریقہ تابعین اور تبع تابعینؒ کے زمانے میں رائج نہیں تھا۔ بعد میں جب علم حدیث پوری طرح سے مدوّن ہو گیا، کتابیں مرتب ہو گئیں، مجموعے مستند طور پر تیار ہو گئے تو پھر مناولہ کا طریقہ بھی رائج ہو گیا کہ ایک شیخ اپنا لکھا ہوا مجموعہ کسی شاگرد کو دے دیا

کرتے تھے اور کہتے کہ یہ لو اور اس کی بنیاد پر تم روایت کر سکتے ہو۔ یہ طریقہ، جیسا کہ آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا اتنا معیاری طریقہ نہیں تھا، صحاح ستہ میں کوئی حدیث اس بنیاد پر نہیں ہے اور حدیث کی بڑی بڑی کتابیں جو طبقہ دوم کی کتابیں ہیں، ان میں بھی اکثر و بیشتر احادیث اس طریقہ کے مطابق نہیں ہیں۔ اکا دکا کوئی حدیث اس طریقے کے مطابق ہوگی تو ہوگی۔

مکاتبہ

اس کے بعد پانچواں طریقہ تھا مکاتبہ کا۔ کہ کسی استاد نے شاگرد کو کوئی حدیث لکھ کے بھیج دی اور اس کے بعد اس کی اجازت بھی دے دی، یا شاگرد نے استاد کو خط لکھ کر دریافت کیا کہ فلاں حدیث یا اس مضمون کی کوئی حدیث اگر آپ کے علم میں ہے تو براہ کرم مجھے مطلع فرمائیں۔ استاد نے تحریری طور پر خط کے ذریعے مطلع کر دیا۔ یہ طریقہ مکاتبہ کہلاتا تھا۔ بظاہر آپ میں سے بعض کو خیال ہوگا کہ اس کا درجہ تو پہلے ہونا چاہئے، لیکن محدثین کے نزدیک اس کا درجہ بعد میں تھا۔ اس لئے کہ اس زمانے کے ذرائع آمد و رفت کے حساب سے جب سفر کرنے میں چھ چھ مہینے اور سال سال لگ جایا کرتے تھے، یہ تعین بڑا دشوار تھا کہ ایک شخص کے پاس جو تحریر پہنچی ہے، جو فرض کیجئے کہ نیشاپور یا سمرقند یا بخارا سے لکھ کر کسی نے بھیجی اور قاہرہ میں کسی کے پاس آٹھ ماہ کے بعد پہنچی۔ اب قاہرہ میں بیٹھے ہوئے شخص کے لئے یہ تعین بڑا دشوار تھا کہ یہ تحریر اسی استاد یا شیخ کی تحریر ہے جس کی بتائی جا رہی ہے یا کسی اور نے لکھ کر اس کی طرف منسوب کر دی ہے، کیونکہ اس کا امکان موجود تھا۔ آج تو یہ امکان موجود نہیں ہے۔ آپ کا کوئی خط سعودی عرب سے آتا ہے تو آپ ٹیلفون پر معلوم کر سکتے ہیں کہ واقعی یہ خط انہی بزرگ کا ہے کہ نہیں ہے۔ اگلی مرتبہ جائیں تو تصدیق کر لیں۔ آج اس طرح کی تصدیق کرنا بہت آسان ہے۔ آج اگر تحریر کے ذریعے حدیث کی روایت ہوا کرتی تو اس کا درجہ بہت اونچا ہوتا۔ لیکن اس زمانے میں چونکہ جب یہ تصدیق اور تعین بہت دشوار تھا اس لئے محدثین نے اس درجہ کو بعد میں رکھا اور یہ پانچواں درجہ ہے۔

اعلام

چھٹا درجہ اعلام کہلاتا تھا۔ اعلام کے معنی ہیں مطلع کرنا اور بتا دینا۔ اصطلاح میں اعلام سے مراد شیخ کی طرف سے حدیث کے طالب علم کو یہ بتا دینا کہ فلاں جگہ فلاں تحریر یا فلاں شخص کے

پاس جو احادیث ہیں وہ مستند احادیث ہیں اور تم میری طرف سے ان کو حاصل کر سکتے ہو اور لے کر روایت کر سکتے ہو۔ صحاح ستہ میں یہ طریقہ بھی کسی نے اختیار نہیں کیا۔ طبقہ دوم کی کسی اور کتاب میں بھی یہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا۔ یہ طریقہ بہت بعد میں ان کتابوں میں اختیار کیا گیا جو طبقہ سوم یا طبقہ چہارم کی کتابیں ہیں۔

وصیت

پھر وصیت کا طریقہ تھا کہ شیخ نے وصیت کی کہ میرے پاس جو مجموعہ ہے یہ میرے بعد فلاں شخص کو دے دیا جائے اور اس شخص کو اجازت ہے کہ وہ میری طرف سے ان احادیث کی روایت کرے۔ مسند امام احمد میں کچھ روایات ہیں جو وصیت کے ذریعے سے امام احمد کے صاحبزادے عبداللہ بن احمد کو پہنچی تھیں۔

وجادہ

اس کے علاوہ ایک طریقہ وجادہ کہلاتا ہے۔ یہ آٹھواں اور آخری طریقہ ہے۔ جس کے بارے میں تمام محدثین کا اتفاق ہے کہ اس کی بنیاد پر روایت اس وقت جائز نہیں تھی۔ 'اُس وقت' کے لفظ پر غور فرمایئے۔ اس وقت وجادہ کے طریقے سے روایت جائز نہیں تھی۔ وجادہ کا مطلب یہ تھا کہ کسی بڑے محدث کی کوئی تحریر بعد میں کسی شخص کو ملے اور وہ اس کی بنیاد پر روایت کرے اس طرح روایت کرنا اس وقت جائز نہیں سمجھا گیا کیونکہ یہ تعین بڑا دشوار تھا کہ یہ تحریر جو دستیاب ہوئی ہے یہ واقعی اسی شیخ کی تحریر ہے جس طرف منسوب کی جارہی ہے، یا جب یہ تحریر لکھی گئی تو کیا شیخ نے اس کو دیکھ کر اس کی تصدیق کی تھی کہ یہ صحیح لکھا گیا ہے؟ اس میں چونکہ غلطی کا خاصا امکان موجود تھا اس لئے وجادہ کی بنیاد پر روایت کی اجازت نہیں دی گئی۔ لیکن آج وجادہ کی بنیاد پر روایت کی مطبوعہ کتابوں کی حد تک اجازت ہو سکتی ہے۔ آج ایک غیر متخصص کو مثلاً صحاح ستہ میں کوئی حدیث دیکھ کر اسی کو روایت کرنے کی اجازت ہے، اس لئے کہ یہ صحاح ستہ چھپی ہوئی سامنے موجود ہیں اور ہزاروں انسانوں نے اس کی طباعت اور اشاعت میں حصہ لیا ہے۔ بڑے بڑے جید اہل علم اور محدثین نے ان کتابوں کی پروف ریڈنگ کی ہے اور یہ کتابیں ہر جگہ دستیاب ہیں۔ آج کسی کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ صحیح بخاری کا کوئی ایسا نسخہ شائع کر دے جس میں اغلاط ہوں یا الحاقات

ہوں۔اس لئے آج وجادہ کا طریقہ بھی اتنا ہی یقینی ہے جتنا کوئی بھی طریقہ یقینی ہوسکتا ہے۔ چنانچہ آج میرے اور آپ کے لئے جائز ہے کہ ہم صحیح بخاری کا نسخہ سامنے رکھ کر اس میں سے حدیث بیان کریں اور تیقن کے ساتھ یہ بات کہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

یہ آٹھ طریقے تحمل حدیث کے تھے اور یہی طریقے ادا کے طریقے بھی تھے۔

تحمل اور اداء

جب ایک شخص نے ان طریقوں سے حدیث حاصل کی تو یہ طریقے اس کے لئے تحمل کے طریقے تھے، لیکن جس شیخ سے ان طریقوں کے ذریعہ روایت لی گئی اس کے لئے یہ طریقے ادا کے طریقے تھے۔ جب یہ شیخ آگے چل کر دوسرے تک یہ حدیث پہنچائے گا اور کسی کو یہ معلومات delieve کرے گا تو اِس کے لئے ادا ہوگا، اُس کے لئے تحمل ہوگا۔ تحمل اور ادا دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ روایت احادیث کے طریقوں کی حد تک یہ ایک ہی چیز کے دو رخ ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اجازت حدیث یا اجازہ کا طریقہ آج بھی رائج ہے، اس کی عملی صورت یہی ہوتی ہے کہ حدیث کے کسی بڑے مشہور شیخ یا استاد سے آپ کی ملاقات ہوئی، آپ نے ان کو یہ بتایا کہ آپ نے علم حدیث حاصل کیا ہوا ہے۔ انہوں نے آپ کا امتحان لے لیا۔ امتحان لینے کے بعد یہ یقین ہوگیا کہ اب آپ کی صلاحیت اور استطاعت آپ کو روایت حدیث کا اہل ثابت کرتی ہے، انہوں نے آپ سے مختلف جگہوں سے پڑھوا کر بھی سن لیا۔ اب چونکہ اس طریقہ سے روایت کرنے میں حدیث کے متن میں کسی کمی بیشی یا اختلاف کا امکان نہیں ہے۔ اس لئے کہ کتابیں چھپی ہوئی ہر جگہ بڑی کثرت سے موجود ہیں۔ اب صرف یہ تیقن اور تعین باقی ہے کہ آپ کی یہ صلاحیت ہے کہ آپ حدیث پڑھ کر اس کا متن آگے بیان کرسکیں۔ یہ تیقن کرنے کے بعد وہ لکھ کر آپ کو سند دیتے ہیں اور اجازت دیتے ہیں۔ اس طرح سندیں لوگ حاصل کرتے چلے آئے ہیں۔ میرے پاس بھی اس طرح کی بہت سی سندیں ہیں اور ایسے اہل علم سے ملاقات ہوتی رہتی ہے کہ جن سے سند لینا ایک شرف اور اعزاز کی بات ہوتی ہے۔

یہ چیز اجازہ یا اجازت کہلاتی ہے۔ اجازت متعین کتاب کی بھی ہوسکتی ہے کہ مثلاً انہوں نے صحیح بخاری کی کچھ احادیث آپ سے سنیں اور یقین کرنے کے بعد کہ آپ صحیح بخاری پڑھ

کر سمجھ سکتے ہیں، آپ کو اجازت دے دی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پوری صحاح ستہ کی اجازت ہو، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اپنی خاص سند کی اجازت ہو کہ فلاں سند سے جو کتاب میں نے پڑھی ہے اس کی اجازت ہے۔ اس طرح کی مختلف قسمیں ہوسکتی ہیں۔ لیکن یہ اجازت ہمیشہ متعین اور طے شدہ امور کی ہونی چاہئے، غیر متعین اور مبہم چیزوں کی اجازت جائز نہیں ہے۔ مثلاً کوئی شیخ آج یہ کہے کہ میں نے آپ کو تمام احادیث کی روایت کی اجازت دے دی، تو یہ مبہم چیز ہے، اس لئے یہ جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ مبہم اجازت میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ کیا خود ان کو ان تمام احادیث کی روایت کی اجازت ہے؟ اور تمام احادیث سے کیا مراد ہے؟ احادیث کے بہت سے مجموعے ہیں۔ بعض مجموعے مروج ہیں بعض مجموعے زیادہ مروج نہیں ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ متعین مجموعے کی ہی اجازت دی جائے۔ یہ بات تو ہمیشہ درست سمجھی گئی کہ کسی صاحب علم کا سرسری امتحان لے کر اس کو حدیث کی کسی متعین کتاب کی روایت کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ اس وقت سے جب سے حدیث کی کتابیں مدون ہو کر اور شائع ہو کر عام ہو گئیں اور ان میں کسی قسم کی ردوبدل اور بھول چوک کا امکان نہیں رہا یہ طریقہ اور بھی مقبول ہو گیا۔ لیکن اس کے باوجود مبہم اور عمومی اجازت کہ آپ کو ہر حدیث کی روایت کی اجازت ہے یہ آج بھی درست نہیں ہے اور پہلے بھی درست نہیں تھا۔

مناولہ، جس کا میں نے ابھی ذکر کیا کہ استاد نے ایک مجموعہ دستی طور پر طالب علم کو دے دیا اور اس کے روایت کرنے کی اجازت دے دی، اس میں یہ شرط تھی کہ مناولہ کے ساتھ ساتھ صراحت سے اجازت دی جائے کہ ان روایات کے آگے بیان کرنے کی میں آپ کو اجازت دیتا ہوں۔ اگر اجازت ہے تو شاگرد ان کو آگے بیان کر سکے گا اور اگر اجازت نہیں ہے تو پھر ان استاد کے حوالہ سے مجموعہ لینے والا اس مجموعہ میں درج احادیث کی روایت نہیں کر سکے گا۔ مثال کے طور پر آج مناولہ کی شکل یہ ہوسکتی ہے کہ آپ کسی شیخ الحدیث سے ملے اور وہ آپ کو صحیح بخاری کا ایک نسخہ تحفہ میں دے دیں، تو یہ مناولہ ہوگا اور اس کی بنیاد پر ان تحفہ دینے والے استاذ کی روایت سے آپ کے لئے روایت کرنا جائز نہ ہوگا۔ اس لئے کہ صحیح بخاری کا نسخہ تحفہ میں دینا اور چیز ہے اور دینے والے کی سند پر صحیح بخاری کی آگے روایت کرنا الگ چیز ہے۔ اگر وہ آپ کا امتحان لینے کے بعد اور آپ کی صلاحیت کا تعین کرنے کے بعد آپ کو اجازت بھی دے دے تو مناولہ معتبر ہوگا

ورنہ محض کتاب کا ہدیہ اجازت کے معاملہ میں یا روایت کے معاملہ میں مناولہ معتبر نہیں ہوگا۔

جہاں تک مکاتبت کا تعلق ہے، تو مکاتبت کے ساتھ ساتھ اگر تیقن کے ساتھ روایت کی اجازت بھی شامل ہے اور یہ بھی یقینی ہو جائے کہ یہ تحریر انہی بزرگ کی ہے تو روایت کی اجازت دے دی جاتی تھی۔ ماضی میں اس کا تعین ایسے ہوتا تھا کہ مثلاً ایک محدث نے اپنے کسی بزرگ استاد کو خط لکھا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ کے پاس فلاں فلاں حدیث کے فلاں فلاں انداز یا روایات موجود ہیں، آپ براہ کرم اس کا متن مجھے لکھ کر بھیج دیں۔ انہوں نے اپنے شاگرد کو متن لکھ کے بھیجا اور اس کے ساتھ دو آدمی بھی بطور گواہ بھیج دیئے۔ ان گواہوں نے جو مستند اور معتبر تھے ،آ کے شاگرد کے سامنے گواہی دی کہ ہمارے سامنے شیخ نے اپنے قلم سے یہ تحریر لکھی تھی اور اپنی یہ مہر لگائی تھی اور ہم اس بات کے گواہ ہیں کہ یہ تحریر انہی محدث کی لکھی ہوئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر اس کی بنیاد پر روایت کی جاسکتی ہے۔

امام بخاری نے ایک دو مقامات پر مکاتبہ مع الاجازۃ مع الشہادۃ کی اجازت دی ہے۔ گویا اجازت، دو شرطوں کے ساتھ ہے، گواہی بھی ہو اور اجازت بھی ہو، یہ دو چیزیں جب شامل ہوں گی تو پھر عام مکاتبہ سے اس کا درجہ اونچا ہو جائے گا۔ اس لئے امام بخاری نے اُن کی اجازت دی ہے۔ امام بخاری یا امام مسلم کے ہاں ایک دو احادیث جو مکاتبہ کی بنیاد پر روایت ہوئی ہیں، اس کے الفاظ یہ ہیں 'اخبرنی فلان کتابة بخطه' فلاں بزرگ نے مجھے تحریری طور پر اطلاع دی' یعنی اپنی Hand Writing میں یہ لکھ کر اجازت دی۔ بعض جگہ اس کا بھی التزام ہے کہ فلاں فلاں گواہوں کی موجودگی میں جنہوں نے میرے سامنے حلفیہ بیان کیا کہ یہ انہی بزرگ کی تحریر ہے اور انہوں نے اس کے مطابق آپ کو اجازت دی ہے۔

یہ تحمل کے طریقے تو علم روایت سے متعلق ہیں اور ان کا براہ راست تعلق علم روایت سے ہے۔ دوسرا شعبہ علم درایت کا ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا۔ اس میں ایک محدث داخلی ذرائع سے یہ تعین کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ جو ارشادات رسول اللہ ﷺ سے منسوب کئے گئے ہیں وہ واقعتاً رسول اللہ ﷺ کے ارشادات ہیں۔ علم روایت کو خارجی نقد حدیث بھی کہتے ہیں اور علم درایت کو داخلی نقد حدیث بھی کہتے ہیں۔ خارجی نقل حدیث کا زیادہ دارو مدار نقل پر ہوتا ہے کہ راوی کے بارے میں جو کچھ معلومات آپ کے پاس ہیں، راوی نے جو کچھ آپ سے بیان کیا یا اس راوی

کے بارے میں ائمہ نے جو کچھ قرار دیا کہ وہ کس درجہ کے راوی ہیں، یہ ساری چیزیں نقل سے آپ کو پہنچی ہیں۔ آپ کی عقل کو اس میں زیادہ دخل نہیں ہے۔ اس لئے علم روایت کا تعلق اکثر و بیشتر نقل کے معاملات سے ہے۔ علم درایت کا اکثر و بیشتر تعلق عقل کے معاملات سے ہے کہ آپ نے خود غور و خوض کر کے دلائل سے پتہ چلایا کہ یہ ارشاد گرامی رسول اللہ ﷺ کا ہو سکتا ہے کہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے بھی کچھ قواعد اور احکام ہیں۔

علم روایت میں سند اور راویوں سے زیادہ بحث ہوتی ہے اور علم درایت میں متن اور سند کے آپس کے تعلق سے بحث ہوتی ہے کہ جو متن نقل ہوا ہے اس کا سند سے تعلق کیا اور کیسا ہے، کمزور ہے کہ مضبوط ہے اور جو راوی اس سند میں شامل ہیں وہ خود کس درجہ کے انسان ہیں۔ رہی یہ بات کہ متن حدیث میں کیا بیان ہوا ہے، شریعت کے طے شدہ اصولوں اور عقلی استدلال کی میزان میں اس کا وزن کیا ہے۔ یہ علم درایت کا مضمون ہے۔ علم درایت کو علم اصول حدیث بھی کہتے ہیں۔ علم اصول حدیث میں یوں تو اور بھی بہت سے معاملات سے بحث ہوتی ہے لیکن علم اصول حدیث میں جو مسائل زیادہ مہتم بالشان ہیں وہ درایت کے معاملات ہیں۔

علم روایت میں جب راوی کے حالات سے بحث ہوتی ہے تو راوی کی شرائط کیا ہیں ان سے بھی بحث ہوتی ہے، تحمل کی شرائط کیا ہیں ان سے بھی بحث ہوتی ہے اور ادا کی شرائط کیا ہیں ان سے بھی بحث ہوتی ہیں۔ راوی کی حد تک شروط تحمل اور شروط ادا میں تھوڑا سا فرق ہے۔

راوی کی شرائط

راوی کی سب سے پہلی شرط تو یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو۔ اس شرط میں تو کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اس باب میں کوئی دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ راوی کے لئے مسلمان ہونا سب سے پہلی شرط ہے۔ لیکن اس میں تھوڑا سا اختلاف ہے اور وہ یہ کہ اگر کوئی صحابیؓ کوئی ایسا واقعہ نقل کرتے ہیں یا رسول اللہ ﷺ کا کوئی ایسا ارشاد گرامی نقل کرتے ہیں جو انہوں نے اس وقت سنا ہو یا دیکھا ہو جب وہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے اور بعد میں شرف صحابیت حاصل کرنے کے بعد اس کو بیان کریں تو کیا ایسا ہو سکتا ہے۔ اکثر و بیشتر محدثین کی رائے یہ ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ صحابیت کا شرف اتنا بڑا ہے کہ اس کی وجہ سے کسی صحابی کی روایت کو قبول کرنے میں تامل

نہیں کیا جانا چاہئے۔ چونکہ صحابہ سب کے سب عدول ہیں اور صحابیؓ ہونے کے بعد اگر وہ اسلام سے پہلے کی بھی کوئی بات بیان کرتے ہیں تو ہمیں پورا یقین ہے کہ اس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہونی چاہئے اس لئے یہ روایت قابل قبول ہے۔ صرف ایک تامل جو بعض حضرات کو ہوا ہے وہ یہ ہوا ہے کہ صحابیؓ ہونے کے بعد جب انہوں نے حضورؐ کا کوئی ارشاد گرامی سنا تو جتنی محبت اور عقیدت واحترام سے اس کو سنا ہوگا اور جتنا اہتمام سے یاد کیا ہوگا اُتنا اہتمام شائد اس وقت نہ کیا ہوگا جب وہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت ان کی نظر میں شائد حضورؐ کے ارشادات کی وہ اہمیت نہ ہو جو بعد میں ہوئی، تو اس امر میں تامل ہوسکتا ہے کہ اس حالت میں حضورؐ کے ارشادات گرامی کو کتنا یاد رکھا، کتنا یاد نہیں رکھا۔ اس لئے اس نقطۂ نظر سے محدثین نے اس پر غور کیا ہے۔ اور صرف وہ معاملات قبول کئے ہیں جن معاملات میں کسی غیر معمولی اہتمام یا حفظ کی ضرورت پیش نہ آئے۔ اگر چہ اس طرح کی مثالیں بہت تھوڑی ہیں کہ کوئی صحابیؓ اسلام سے پہلے کا کوئی واقعہ بیان کرتے ہوں۔ اکثر وبیشتر رسول اللہ ﷺ کے بچپن یا نوجوانی کے واقعات ہیں اور حضورؐ کے ذاتی اور شخصی حالات وکیفیات کے بارے میں ہیں، جس میں بہت زیادہ یادداشت اور حافظہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

مثال کے طور پر آپ نے سنا ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ کے نوجوانی کے ایک ساتھی جو آپ کے ساتھ کاروبار میں شریک تھے وہ بعد میں مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا اور آپؐ سے مخاطب ہوکر عرض کیا کہ یارسول اللہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ میرے شریک تھے اور آپ نے کبھی کوئی شک وشبہ کی بات نہیں کہی، آپ نے کبھی کوئی غلط بیانی نہیں کی، کبھی کاروبار میں مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور ہمیشہ سچی بات فرمائی۔ یہ ایسی چیز ہے جس کے بارے میں کسی خاص یادداشت یا اہتمام کی ضرورت نہیں۔ یہ بات بغیر کسی خصوصی اہتمام یا عقیدت ومحبت کے ہر ایک کو یاد رہ سکتی ہے۔ اس طرح کی کچھ اور احادیث ہیں جن کے بارے میں محدثین کی غالب اکثریت کا خیال ہے کہ انہیں قبول کرنا چاہئے۔ لیکن صحابہ کے علاوہ بقیہ راویوں کے بارے میں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ مسلمان نہیں تھے تو ان کی وہ روایت قابل قبول نہیں ہے۔ یہ استثنا صرف صحابہ کے ساتھ ہے۔

اسلام کے بعد دوسری شرط عدالت کی ہے۔ عدالت ایک جامع اصطلاح ہے، جس کی

بہت سی تعبیریں ہوسکتی ہیں۔ عدالت کی اہل علم نے بہت سی تشریحات کی ہیں۔ لیکن اس کے دو مفاہیم ہیں۔ ایک تو قانونی مفہوم، معیار ہے جو کم سے کم سطح پر ضرور موجود ہونا چاہئے اس سے کم کے بارے میں قبول کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ کم سے کم مفہوم یہ ہے کہ جس شخص کی اچھائیاں اس کی کمزوریوں سے زیادہ ہوں وہ عادل ہے۔ 'من غلبت حسناته علی سیاته'۔ جس کی حسنات اس کی کمزوریوں سے زیادہ ہوں اس کو عدالت حاصل ہے۔ لیکن یہاں چونکہ معاملہ علم حدیث کا ہے، اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی کا ہے، اس لئے اس میں زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے اور عدالت کی بعض ایسی شرائط بھی شامل کی جاتی ہیں جو عام طور پر عدالت کے قانونی مفہوم میں شامل نہیں ہیں۔ ان میں ایک بنیادی شرط تو یہ ہے کہ اس کی شخصیت اور کردار میں اخلاق اور مروّت کے خلاف کوئی چیز نہ پائی جائے۔ ایک انتہائی اچھے اور اعلیٰ پیمانہ کے انسان میں اخلاق، مروت، وقار اور سنجیدگی کا جو معیار ہونا چاہئے حدیث کے راوی میں وہ معیار اور کردار پایا جاتا ہو۔ بہت سی چیزیں شریعت میں جائز ہوتی ہیں اور وہ گناہ یا حرام نہیں ہوتیں لیکن وہ ایک اعلیٰ کردار کے انسان کے شایانِ شان نہیں ہوتیں۔ اس لئے اگر کوئی شخص، جو راوی حدیث ہے اور رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے پاکیزہ الفاظ اور پیغام مبارک کو آگے پہنچا رہا ہے، اس کا کردار اور اخلاق اور مروت بھی بہت اعلیٰ ہونا چاہئے۔ ایک بنیادی شرط تو یہ ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ دینی معاملات میں، فرائض کی پابندی اور محرمات سے اجتناب میں وہ ایک معیاری کردار کا انسان ہو۔ کبھی کبھار کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو یہ عدالت کے خلاف نہیں ہے، کبھی کبھار کسی فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی ہو جائے تو یہ بھی عدالت کے خلاف نہیں ہے، لیکن کسی کی شہرت ہی یہ ہو کہ یہ فلاں فریضہ کی پابندی نہیں کرتا، اس کے پاس بقدر نصاب پیسہ ہے اور زکوۃ نہیں دیتا، یا یہ شخص عادتاً نماز کی پابندی نہیں کرتا، یا یہ شخص فلاں برے اور حرام کام میں مبتلا ہے، ایسا شخص پھر عادل نہیں ہے اور روایت حدیث کے معاملہ میں اس کی روایت کو قبول نہیں کیا جائے گا۔

تیسری شرط یہ ہے کہ وہ عاقل اور سمجھدار انسان ہو۔ بے وقوف اور نالائق انسان نہ ہو۔ بعض لوگ بڑے نیک اور متقی ہو سکتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ کم عقل اور کم فہم بھی ہو سکتے ہیں، اس لئے یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ تدین اور تقوی کے ساتھ ساتھ عقل اور فہم میں بھی وہ

او نچے درجہ کا انسان ہو۔ کم از کم جو بات اس نے سنی ہے اس کو سمجھا ہو، اس کو یاد رکھا ہو اور پوری سمجھ بوجھ کے ساتھ اس کو دہرایا ہو کہ کس سیاق وسباق کے ساتھ یہ بات ارشاد فرمائی گئی تھی اور اس کا مفہوم کیا تھا۔ بے عقل آدمی کی بات اور روایت قابل قبول نہیں ہے۔

یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر ایک چھوٹا بچہ جو تحمل کے وقت کم عمر تھا لیکن ادائیگی کے وقت اس کی عمر پختگی کو پہنچ گئی اور اس میں پختہ عقل وشعور پیدا ہو گیا، مثلاً پانچ چھ سال کا بچہ تھا، جب اس نے تحمل کیا۔ تو کیا اب دس بارہ سال کے بعد وہ اس کو ادا کر سکتا ہے؟ محدثین کی غالب ترین اکثریت کا خیال یہاں بھی وہی ہے جو اسلام کے بارے میں ہے۔ کہ صحابہ کے بارے میں یہ استثنا ہو سکتا ہے غیر صحابیؓ کے بارے میں نہیں ہو سکتا۔ اگر ایک بچہ پانچ سال کی عمر میں کسی تابعیؒ سے یا تبع تابعیؒ سے کوئی حدیث سنتا ہے اور بعد میں بالغ ہونے کے بعد بیان کرتا ہے تو اس میں ایک شک ضرور باقی رہتا ہے کہ بچہ کو حدیث کا متن اور مفہوم صحیح طور پر یاد رہا کہ نہیں رہا۔ لیکن اگر کوئی صحابیؓ اپنا کوئی ایسا واقعہ بیان کرتے ہیں جو ان کے اپنے بچپن کا ہے لیکن رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد گرامی، یا تقریر یا عمل سے متعلق ہے اور وہ بلوغ کے بعد بیان کرتے ہیں تو وہ قابل قبول ہے۔ اس لئے کہ صحابہ کرام میں حضرت علیؓ بن ابی طالب، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ اور اس طرح کے بہت سے صحابہ کرام تھے جنہوں نے اپنے بچپن میں بارہا حضورؐ کی زیارت کی، بہت سے معاملات کو دیکھا اور بعد میں ان کو بیان کیا اور عام طور پر علماء اسلام نے ان کو قبول کیا۔ رسول اللہ ﷺ کے بہت سے واقعات اسلام کے فوراً بعد کے زیادہ تر حضرت علیؓ سے مروی ہیں۔ مکہ مکرمہ کے کئی واقعات حضرت علیؓ سے مروی ہیں جب ان کی عمر دس بارہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ حضرت ابن عباسؓ کی عمر حضورؐ کے انتقال کے وقت تیرہ سال تھی۔ انہوں نے بہت سے واقعات نقل کئے ہیں جو ان کے بچپن کے ہیں۔ یہ سب واقعات قابل قبول ہیں، اس لئے کہ ان کے راوی صحابیؓ ہیں، اور ان سے اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ وہ کوئی کمزور چیز یا غلط یادداشت پر مبنی کوئی چیز بیان کر دیں گے۔ دوسرے تمام راویوں کے لئے یہ شرط ہے کہ انہوں نے تحمل بھی عقل کی حالت میں کیا ہو، البتہ تحمل کے لئے بلوغ شرط نہیں ہے، اگر بارہ سال کا بچہ ہو، یادداشت اچھی ہو، عربی جانتا ہو، اور ایسے لوگ ہر زمانے میں پائے جاتے ہیں، تو وہ حدیث قابل قبول ہے، تیرہ چودہ سال کی عمر کی حد تک قابل قبول ہے۔ لیکن اگر وہ تحمل کے وقت

اتنا کم سن بچہ ہو کہ اس میں عقل وشعور ہی نہ ہو تو اس کی روایت قابل قبول نہیں ہے۔

سب سے اہم شرط جو چوتھے نمبر پر ہے وہ ضبط ہے۔ ضبط سے مراد یہ ہے کہ روای نے جو کچھ سنا اس کو پوری طرح سے یاد رکھا، پھر وہ چیز ہمیشہ اس کی یادداشت میں محفوظ رہی۔ کبھی اس کو بھلایا نہیں، کبھی اس میں التباس نہیں ہوا، کبھی اس میں کوئی شک نہیں ہوا اور روایت بیان کرنے تک، تحمل سے لے کر ادا تک، ضبط باقی رہا ہو، کسی مرحلہ پر ضبط میں کوئی کمزوری یا خلل واقع نہ ہوا ہو۔ اس بات کی تحقیق اور تعین سب سے مشکل کام ہے جس کا محدثین نے التزام کیا اور ایک ایک راوی کے بارے میں تحقیق کی کہ اس کا ضبط کس عمر سے تھا اور کس عمر تک رہا۔ بڑھاپے میں یادداشت کام نہیں کرتی، محدثین نے اس بارے میں بھی معلومات جمع کیں کہ کس راوی کی کتنی عمر ہوئی اور عمر کے کس حصہ تک اس کی یادداشت محفوظ تھی اور اگر اخیر عمر میں جا کر اس کی یادداشت جواب دے گئی اور خراب ہوگئی تو کس عمر میں خراب ہوگئی۔ پھر علمائے رجال اور محدثین اس بات کا بھی التزام کرتے ہیں کہ راویوں کی یادداشت اور حافظہ کی تاریخ بھی معلوم کریں اور اس بات کی تحقیق بھی کریں کہ فلاں راوی کی یادداشت فلاں سن تک ٹھیک تھی۔ لہٰذا اس سن تک کی روایات قابل قبول ہیں، اس سن کے بعد ان کی یادداشت میں کمزوری آنی شروع ہوگئی۔ لہٰذا اس سن سے لے کر اس سن تک کی روایات کی اگر دیگر مآخذ سے تصدیق ہو جائے تو وہ قابل قبول ہیں اور فلاں سن میں اس کی یادداشت بالکل جواب دے گئی تھی۔ اس کے بعد کی روایات قابل قبول نہیں ہیں۔ چنانچہ آپ کو ایسی بے شمار مثالیں ملیں گی کہ ایک راوی کی ایک روایت قابل قبول ہے اور دوسری روایت قابل قبول نہیں ہے۔ اس لئے کہ پہلی روایات عالم ضبط میں تھیں اور دوسری روایات عالم ضبط کے زائل ہونے کے بعد تھیں۔ راوی کے لئے یہ چار بنیادی شرائط ہیں جو ہر راوی میں پائی جانی چاہئیں۔ راوی کی ان چار شرائط کے بعد سند اور متن کے بارہ میں تین شرائط اور ہیں جو اگر موجود ہوں تو وہ حدیث مکمل طور پر صحیح اور معیاری ہوگی۔

پہلی شرط یہ ہے کہ محدث سے لے کر، مثلاً امام بخاری سے لے کر اور رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی تک متصل سند ہو اور درمیان میں کوئی سلسلہ ٹوٹا ہوا نہ ہو۔ اگر ایک سلسلہ بھی ٹوٹا ہوا ہے تو وہ حدیث پھر صحت کے اس معیار کی نہیں ہوگی۔ دوسری شرط یہ ہے کہ روایت شاذ نہ ہو۔ راوی مستند ہے، اس میں عقل بھی ہے، ضبط بھی ہے، مسلمان بھی ہے، اس میں عدالت بھی ہے اور سند بھی

متصل ہے۔لیکن وہ کوئی ایسی روایت نہ کرے جو عام، مشہور، مستند اور طے شدہ سنت سے متعارض ہو۔ایسی روایت کو شاذ کہتے ہیں۔اگر کوئی ثقہ اور مستند راوی ایسی چیز بیان کرے جو عام رواۃ کی روایت کردہ روایات کے خلاف ہو اس کو شاذ کہتے ہیں۔اور تیسری شرط اس باب میں یہ ہے کہ اس کے اندر کوئی ایسی چھپی ہوئی داخلی علت نہ ہو جو اس کے معیار کو متاثر کردے۔علت سے مراد کوئی ایسی کمزوری ہوتی ہے جو بظاہر نہ راویت میں نظر آتی ہے نہ متن میں، اور ہم جیسے عامی لوگوں کو اس کا پتہ نہیں چل سکتا، لیکن ایک ماہر فن جو علم حدیث کا امام ہو اور علم حدیث کی نزاکتوں کی جزوی اور کلّی تفصیلات سے واقف ہو، وہ پتہ لگا سکتا ہے کہ اس میں یہ کمزوری یا یہ خامی ہے۔اس پوشیدہ کمزوری یا خامی کو علّت کہتے ہیں اور یہ علم حدیث کا سب سے مشکل فن ہے۔

علل الحدیث پر بھی کتابیں لکھی گئی ہیں۔'معرفت علل الحدیث' کے موضوع پر ائمہ حدیث نے بہت کام کیا ہے اور اس بات کے اصول طے کیے ہیں، کہ حدیث کی اگر کوئی علت ہے تو اس کو کیسے دریافت کیا جائے۔علّت کے معنی آپ 'کمزوری' کر سکتے ہیں کہ کوئی ایسی داخلی، اندرونی اور چھپی ہوئی کمزوری جس کا عام آدمی کو پتہ نہیں چلتا۔یہ تینوں چیزیں اس میں موجود نہ ہوں اور راوی چاروں شرائط پر پورا اترتا ہو تو پھر وہ حدیث صحیح حدیث کہلائے گی۔

آپ میں سے کل کسی نے پوچھا تھا کہ صحیح حدیث کس کو کہتے ہیں تو حدیث صحیح اس کو کہتے ہیں۔یعنی حدیث صحیح وہ ہے جس کی سند متصل ہو، اس میں کوئی خلا نہ ہو، اس میں کوئی روایت شاذ نہ ہو، کوئی اندرونی علت نہ پائی جاتی ہو اور راوی میں چاروں شرائط موجود ہوں۔گویا راوی کی چار شرائط ہیں اور حدیثِ صحیح کی بھی چار شرائط ہیں۔راوی کی چار شرائط اسلام، عدالت، عقل اور ضبط۔یہ سات شرائط جس حدیث میں پائی جائیں گی وہ حدیث حدیثِ صحیح ہوگی۔

ضبط سے مراد جیسا کہ میں نے عرض کیا قوت یادداشت ہے، اور محدثین کہتے ہیں، دقّت ملاحظہ۔جب روای یہ واقعہ دیکھ رہے تھے یا سن رہے تھے یا حدیث کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے تو ان کا مشاہدہ اتنا گہرا ہونا چاہئے، دقت ملاحظہ کے معنی ہیں **keen observation** یا **minute observation** کہ وہ ایک ایک لفظ اور ایک ایک جز کو پوری طرح سمجھ لیں اور اس کے بعد بیان کریں۔

ان سات شرائط میں سے اگر کوئی ایک شرط ناپید ہو جائے یا دو شرائط ناپید ہو جائیں تو

حدیث کا درجہ اسی اعتبار سے گھٹ جائے گا۔ ان شرائط کے کم یا زیادہ کم ہونے کی بنیاد پر احادیث دو قسموں میں تقسیم ہو جاتی ہیں۔ کچھ حدیثیں وہ ہیں جو قابل قبول ہیں اور کچھ احادیث وہ ہیں جو قابل قبول نہیں ہیں۔ ظاہر ہے دو ہی قسمیں ہوں گی۔

یہ نہیں ہوسکتا کہ کوئی حدیث آدھی قابل قبول ہو اور آدھی قابل قبول نہ ہو۔ یا کوئی حدیث جو حضورؐ سے منسوب ہو اور وہ اس معیار پر پورا اترتی ہو اور آپ کو یقین ہو گیا یا ظن غالب قائم ہو گیا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ تو وہ چیز قابل قبول ہے، واجب العمل ہے اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ یہ حدیث کی ایک بڑی قسم ہے۔

دوسری قسم اس حدیث کی ہے جو نا قابل قبول ہے اس کمزوری کی وجہ سے کہ آپ کو یقین ہو کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی نہیں ہے جس ذریعے یا جس اتھارٹی اور سند سے آپ تک پہنچا ہے وہ سند کمزور ہے اتنی مضبوط نہیں ہے، یہ دوسری قسم ہوگئی۔

حدیث کی اقسام

مقبول یا صحیح حدیث

جو پہلی قسم ہے یعنی حدیث صحیح یا قابل قبول حدیث، اس کی پھر دو قسمیں ہیں۔ ایک حدیث صحیح ہے یعنی وہ حدیث جو ان ساری شرائط کی جامع ہو جو میں نے ابھی عرض کیں۔ راوی میں چار باتیں پائی جاتی ہوں اور سند اور متن میں وہ تینوں منفی چیزیں جو موجود ہوسکتی ہیں وہ موجود نہ ہوں۔ ان سات شرائط کے بعد وہ حدیث حدیثِ صحیح ہوگی۔ لیکن حدیث صحیح میں بھی کئی درجات ہیں جن پر آگے چل کر بات کریں گے۔ حدیث صحیح قابل قبول اور واجب العمل ہے۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم اور موطاء امام مالکؒ کی جتنی مرفوع احادیث ہیں وہ ساری صحیح ہیں۔

حدیث حسن

اس کے بعد ایک درجہ آتا ہے جو حدیث حسن کہلاتا ہے، جو قابل قبول ہے لیکن اس کا درجہ حدیث صحیح سے کم ہے۔ حدیث حسن سے مراد وہ حدیث ہے کہ جس میں یا تو راوی کی چار شرائط میں سے کوئی ایک شرط کم ہو، یا ان تین شرائط میں سے کوئی ایک شرط جزوی طور پر مفقود ہو۔ اگر ان شرائط میں سے کوئی شرط کلی طور پر مفقود ہے تو پھر وہ حدیث حسن نہیں ہے، صحیح بخاری اور صحیح مسلم

میں ساری احادیث صحیح ہیں اور حدیث حسن کوئی نہیں ہے۔ ابوداؤد، ترمذی اور نسائی میں صحیح احادیث بھی ہیں اور حدیث حسن بھی بہت ہیں۔

ضعیف اور موضوع احادیث

دوسری طرف جو احادیث ناقابل قبول ہیں ان کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک ضعیف اور دوسری موضوع۔ موضوع کو مجازاً حدیث کہتے ہیں کیونکہ یہ وہ روایات ہیں جن کی نسبت رسول اللہ ﷺ سے درست نہیں ہے اور وہ حضورؐ کے ارشادات گرامی نہیں ہیں۔ موضوعات کے الگ مجموعے پائے جاتے ہیں۔ کئی لوگوں نے یہ مجموعے مرتب کئے ہیں جن کی تعداد درجنوں میں ہے۔ کم از کم پچیس تیس کتابیں ہیں جن میں موضوع احادیث جمع کر دی گئی ہیں، تا کہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ یہ حضورؐ کے ارشادات نہیں ہیں۔

ضعیف حدیث وہ ہے کہ جس میں حدیث حسن کی شرائط میں سے بعض شرائط نہ پائی جاتی ہوں۔ مثلاً سند پوری کی پوری متصل ہے لیکن راوی یادداشت میں کمزور ہے یا عدالت میں کمزور ہے، راوی کمزور باتیں روایت کرتا ہو۔ گویا وہ کھلم کھلا جھوٹا تو مشہور نہیں ہے لیکن اس کی روایات میں کمزور باتیں شامل ہوتی ہیں۔ اگر اس کی شہرت جھوٹے کی ہے تو پھر تو وہ حدیث موضوع ہو جائے گی، لیکن اس کے کردار کے بارے میں لوگوں کو کچھ شکایات ہیں، وہ حدیث ضعیف حدیث کہلائے گی۔

یہ حدیث کی چار بڑی بڑی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی ذیلی تقسیمات بے شمار ہیں۔ محدثین نے کم وبیش سو اقسام بیان کی ہیں۔ ان سو قسموں میں ہر ایک کے الگ الگ احکام ہیں۔ یہ وہ فن ہے جس کی تدوین میں کم وبیش چار پانچ سو سال لگے ہیں اور ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں بہترین دماغوں نے اور انتہائی مخلص ترین اور متقی ترین انسانوں نے اس کی تدوین اور اس کی خدمت میں وقت صرف کیا ہے۔ اس لئے جیسے جیسے غور وخوض ہوتا گیا اور تحقیق ہوتی گئی نئی نئی تقسیمیں سامنے آتی گئیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، نئے نئے مواقع اور نت نئے امکانات سامنے آتے رہے۔ کم وبیش سو قسمیں محدثین نے بیان کی ہیں۔ مقدمہ ابن الصلاح، جو علوم حدیث کی مشہور کتاب ہے، اور اپنے زمانے کی ایک منفرد کتاب سمجھی جاتی تھی، اس میں علامہ ابن

الصلاح نے احادیث کی پینسٹھ اقسام کی تفصیل بیان کی ہے۔انہوں نے اس میں ضعیف احادیث کی بیالیس قسمیں قرار دی ہیں،جن میں سے بعض کا میں ابھی ذکر کر رہا ہوں۔

صحیح احادیث کی مزید اقسام

صحیح لعینہ اور صحیح لغیرہ

سب سے پہلے حدیث صحیح کو لیتے ہیں۔جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا حدیث صحیح کی کئی تقسیمیں ہیں۔ان سب کو میں چھوڑ کر صرف دو تقسیموں کا ذکر کرتا ہوں۔بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ حدیث صحیح میں ساری کی ساری شرائط بدرجہ اتم موجود ہوتی ہیں اور کسی شرط کی کمی نہیں ہوتی تو وہ حدیث صحیح لعینہ کہلاتی ہے۔اس کو آپ کہہ سکتے ہیں یا **The *Sahih par excellance***،جو اپنی ذات میں بالکل صحیح ہے۔دوسری قسم صحیح لغیرہ کہلاتی ہے،کہ اصل میں تو وہ حدیث صحیح کے مکمل معیار پر نہیں تھی،لیکن اس میں جو کمی رہ گئی تھی وہ کسی اور ذریعہ سے پوری ہو گئی۔مثال کے طور پر ایک صحابیؓ سے ایک حدیث مروی ہے،آپ کے پاس جس سند سے وہ حدیث پہنچی،فرض کیجئے کہ آپ امام بخاری کے زمانے میں ہیں،اور آپ کو ایک خاص سند سے حدیث پہنچی،اس سند میں جو محدث صحابیؓ سے روایت کرتے ہیں وہ آپ کی تحقیق میں کمزور ہیں۔اس لئے آپ نے اس کو حدیث حسن یا حدیث ضعیف قرار دے دیا۔پھر کچھ دن کے بعد آپ کو کسی اور سند سے وہی حدیث پہنچی،اس میں جو راوی صحابیؓ سے روایت کرنے والے ہیں وہ تو درست ہیں لیکن تابعی سے روایت کرنے والے کمزور ہیں،گویا اس مرحلہ پر جو کمزوری تھی وہ دور ہو گئی،دوسرے مرحلہ پر کمزوری آ گئی۔تو پہلے مرحلہ والی کمزوری تو ایک حد تک دور ہو گئی اور یہ یقین ہو گیا کہ یہ حدیث صحابہ کرام سے روایت کرنے والوں میں بعض مستند اور پختہ لوگ بھی موجود ہیں۔پھر تیسری حدیث ملی جس میں تبع تابعی کی کمزوری بھی دور ہو گئی تو گویا تبع تابعین میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جو مستند تھے۔اس طرح سے اس کو کولیٹ کرنے اور آپس میں مختلف روایات اور اسناد کا تقابل کرنے کے بعد جو کمزوری تھی وہ دور ہو گئی۔اس تحقیق کے بعد آپ نے اس حدیث کو بھی صحیح قرار دے دیا تو ایسی حدیث صحیح لغیرہ کہلاتی ہے۔جو اپنی ذات میں تو صحیح نہیں تھی لیکن دوسرے دلائل اور شواہد کی وجہ سے وہ صحیح قرار پا گئی۔

حسن لعینہ اور حسن لغیرہ

جس طرح صحیح کی ہی دو بڑی بڑی قسمیں ہیں: صحیح لعینہ اور صحیح لغیرہ۔ اسی طرح سے حسن کی بھی دو قسمیں ہیں۔ حسن لعینہ اور حسن لغیرہ۔ حسن لعینہ تو وہ حدیث ہے جو صحیح حدیث ہونے کی ایک یا دو شرائط میں ناقص ہے۔ لیکن اگر آپ نے اپنی ابتدائی تحقیق میں کسی حدیث کو ضعیف قرار دیا اور ضعیف قرار دینے کے بعد آپ کو بعض شواہد سے یہ تحقیق ہوگئی کہ جس سبب سے آپ نے ضعیف اُس حدیث کو قرار دیا تھا ان اسباب کا ازالہ ہوسکتا ہے۔ اس ازالہ کی وجہ سے یا اس کمی کے دور ہو جانے کی وجہ سے آپ نے اس کو حسن قرار دے دیا، یہ حسن لغیرہ ہے۔ یعنی خارجی اسباب وشواہد کی وجہ سے یہ حسن قرار پا گئی ورنہ اصل میں یہ حسن نہیں تھی بلکہ ضعیف تھی۔

صحیح لعینہ اور صحیح لغیرہ کے بعد یہ ایک اور تقسیم ہوگئی یعنی حسن لعینہ اور حسن لغیرہ۔ پھر جو احادیث صحیح لعینہ ہیں۔ یعنی **Origionally** صحیح ہیں، ان کی پھر تین قسمیں ہیں۔ ایک قسم وہ ہے کہ جس کو صحابہ کرامؓ کی اتنی بڑی تعداد نے نقل کیا ہو اور تابعین اتنی بڑی تعداد نے روایت کیا ہو جن کے بارے میں ایسے کسی امکان کا شائبہ تک نہ رہے کہ ان میں سے کسی سے کوئی بھول چوک ہوگئی ہوگی۔ صحابہ کرام نعوذ باللہ غلط بیانی تو نہیں کرتے تھے، اور نہ کسی صحابیؓ کو غلط بیان سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس کا عقلی اور بشری طور پر امکان موجود ہے کہ کسی بات کو یاد رکھنے یا سمجھنے میں کسی صحابیؓ سے بھول چوک ہوگئی ہو، اس کا عقلی اور بشری امکان بہر حال موجود ہے۔ لیکن اگر کسی حدیث کو اتنی بڑی تعداد میں صحابہ نے نقل کیا ہو کہ ان میں بھول چوک کا امکان بھی ناپید ہو جائے اور پھر صحابہ سے نقل کرنے والے بھی اتنی ہی بڑی تعداد میں ہوں کہ ان کے بارے میں بھی کسی غلط بیانی یا بھول چوک کا امکان نہ رہے۔ پھر تابعین سے روایت کرنے والے بھی اتنی بڑی تعداد میں ہوں کہ ان کے روایت کرنے میں بھی کسی غلطی کا امکان نہ رہے تو پھر اس حدیث کو حدیث متواتر کہا جاتا ہے۔ حدیث متواتر کا درجہ وہی ہے جو قرآن پاک کا ہے۔ ثبوت کے اعتبار سے حدیث متواتر اور قرآن پاک میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جس طرح قرآن پاک تواتر سے نسلاً بعد نسلٍ ہم تک پہنچا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں صحابہ کرام نے یاد کیا، پھر لاکھوں تابعین کو یاد کرایا اور اس طرح سے ہم تک پہنچ گیا۔ اسی طرح سے حدیث متواتر صحابہ کی بڑی تعداد سے منقول ہے۔ صحابہ

کی بڑی تعداد نے تابعین کی بہت بڑی تعداد تک پہنچایا۔ اس طرح سے ہوتے ہوتے وہ احادیث مرتبین کتب حدیث تک آگئیں اور مرتب ہوگئیں اس لئے یہ درجہ سب سے اونچا ہے۔

تواتر کے درجات

تواتر میں پھر الگ الگ درجات ہیں۔ سب سے اونچا درجہ اس روایت کا ہے جو متواتر باللفظ ہے یعنی جس کے الفاظ تواتر سے ہم تک پہنچے ہیں۔ جس میں بعینہ ان الفاظ کو درجنوں اور سینکڑوں کی تعداد میں صحابہ نے بیان کیا۔ تبرک کے طور پر صرف دو احادیث متواتر باللفظ آپ سے بیان کر دیتا ہوں۔

حضورؐ نے فرمایا کہ 'مَن کَذب عليّ مُتَعَمِّداً فليتبوأ مقعده من النار' جو شخص جان بوجھ کر مجھ سے جھوٹ منسوب کرے وہ جہنم میں اپنا ٹھکانہ بنالے۔ اس حدیث کو دو سو صحابہ نے روایت کیا ہے۔ اور یہ ان چند احادیث میں سے ہے جن کے راویوں میں تمام عشرہ مبشرہ شامل ہیں۔ عشرہ مبشرہ کے دس کے دس اصحاب اس کے راوی ہیں۔ صدیق اکبرؓ سے لے کر بقیہ عشرہ مبشرہ سمیت دو سو صحابہ کرام نے اس کو روایت کیا ہے اور ان سے ہزاروں تابعین نے روایت کیا ہے۔ ہزاروں تابعین سے لاکھوں تبع تابعینؒ نے روایت کیا۔ یہ تواترِ لفظی کی ایک مثال ہے۔

دوسری مثال: 'لافضل لعربي على عجمي الا بالتقوىٰ' حضورؐ نے خطبہ حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا، ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ نے سنا، ان میں سے سینکڑوں نے آگے بیان کیا اور یہ چیز تواتر کے ساتھ انہی الفاظ میں لوگوں تک پہنچی۔

تواتر لفظی کے بعد دوسری مثال ہوتی ہے تواتر معنوی کی۔ کہ وہ الفاظ تو متواتر نہیں ہیں لیکن ان کا مشترک مفہوم تواتر کے ساتھ آیا ہے۔ تواتر معنوی کی مثال ہے: 'مسح على الخفين'۔ جرابوں پر یا چمڑے کے موزوں پر بہ اختلاف فقہا مسح کا جائز ہونا تواتر معنوی ہے۔ کم وبیش ستر اسی صحابہ کرام سے مروی ہے۔ بہت بڑی تعداد میں صحابہ کرام نے اس روایت کو نقل کیا ہے۔ ان کے الفاظ ایک نہیں ہیں اور ایک ہو بھی نہیں سکتے اس لئے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے عمل کو دیکھا اور ہر دیکھنے والے نے اپنے الفاظ میں بیان کیا۔ الفاظ سب کے الگ الگ ہیں، لیکن مفہوم سب کا ایک ہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے موزوں پر مسح فرمایا۔

تواتر کی تیسری قسم ہوتی ہے تواتر قدر مشترک۔ جہاں سب روایت کے الفاظ بھی الگ الگ ہوتے ہیں اور ان کا مفہوم بھی الگ الگ ہوتا ہے، لیکن ان سب احادیث میں ایک حصہ قدر مشترک ہے جس سے ایک خاص بات ظاہر ہوتی ہے وہ تواتر قدر مشترک ہے۔ گویا یہ قدر مشترک حصہ اس طرح ثابت ہے کہ جس میں نہ کوئی تامل ہے نہ کسی شک وشبہ کی گنجائش ہے۔ وہ تواتر قدر مشترک کہلاتا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ مثال کے طور پر نمازوں کے اوقات کا معاملہ۔ اس بارے میں بہت سی احادیث ہیں۔ مختلف صحابہ نے اپنے اپنے انداز میں تفصیلات کو بیان کیا۔ رسول اللہ نے وقتاً فوقتاً مختلف الفاظ میں اس کو بیان کیا۔ صحابہ کرام نے مختلف سیاق وسباق میں اس کو بیان کیا۔ لیکن ان سب روایات کا قدر مشترک کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ظہر کی نماز اس وقت ہوگی جب سورج ڈھل جائے، فجر کا وقت اس وقت ہوگا جب صبح صادق طلوع ہو جائے۔ یہ الفاظ تو متعین طور پر متواتر احادیث میں نہیں آئے لیکن یہ قدر مشترک سینکڑوں احادیث میں موجود ہے۔ اس لئے یہ تواتر قدر مشترک کہلاتا ہے۔

اس کے بعد ایک درجہ ہے تواتر طبقہ کا۔ کہ ایک طبقہ نے، ایک پوری نسل نے ایک کام اس طرح کیا، اس کو دیکھ کر دوسری نسل نے، پھر تیسری نسل نے، پھر چوتھی نسل نے۔ یا کسی خاص طبقہ نے، لوگوں کے کسی خاص گروہ نے ایک عمل اس طرح کیا۔ مثال کے طور پر ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتا ہوں۔ احادیث میں مختلف ناپوں (Measures) کا ذکر ہے۔ مثلاً صدقہ فطر کے بارے میں ذکر ہے، یا زکوۃ کے بارے میں ذکر ہے۔ اب حدیث میں کچھ پیمانوں کا ذکر آیا ہے کہ 'صاع'، نصف صاع من برّ' یعنی صدقہ فطر کے طور پر گندم کا نصف صاع دیا جائے۔ تو صاع سے کیا مراد ہے۔ اُس زمانے میں ایسے پیمانے تو نہیں ہوتے تھے جو سرکاری طور پر سٹینڈرائزڈ ہوں۔ ہر علاقے میں ایک ہی نام کے مختلف اوزان رائج ہوتے تھے۔ مثلاً جس پیمانہ کو ہم آج تک سیر کہتے تھے اور اب کلو کہنے لگے ہیں، یہ سیر مختلف علاقوں میں مختلف مقدار کے ہوتے تھے مثلاً، سیر عالمگیری، سیر شاہجہانی، پکا سیر، کچا سیر، فلاں سیر اور فلاں سیر وغیرہ۔ ہر سیر کا الگ الگ وزن متعین ہوتا تھا۔ کوئی اسّی تولہ کا سیر ہے، کوئی چالیس تولے کا ہے، کوئی ۱۲۰ تولہ کا۔ اسی طرح سے عرب میں صاع مختلف انداز کے ہوا کرتے تھے۔ اب یہ بات کہ حدیث میں جس صاع کا ذکر ہوا ہے وہ کتنا ہے کہ اس کے مطابق آپ صدقہ فطر ادا کریں، ایک تحقیق طلب بات تھی۔

امام ابو یوسفؒ کوفہ میں رہتے تھے، انہوں نے کوفہ میں رائج صاع کی بنیاد پر فتویٰ دیا کہ صدقہ فطر کوفہ کے نصف صاع کے مطابق دیا کریں۔ جب وہ مدینہ منورہ تشریف لائے تو دیکھا کہ یہاں کا صاع کوفہ کے صاع سے مختلف ہے۔ امام مالکؒ سے ملاقات ہوئی اور مختلف معاملات پر تبادلہ خیال ہوا تو امام مالک نے پوچھا کہ صدقہ فطر کی آپ کیا مقدار قرار دیتے ہیں؟ امام ابو یوسف نے فرمایا کہ آدھا صاع جیسا کہ حدیث میں ہے۔ امام مالکؒ نے پوچھا کون سا صاع، انہوں نے فرمایا صاع، امام مالک نے کہا نہیں، مدینہ کا صاع اور ہے اور دوسری جگہوں میں اور ہے۔ اس پر امام ابو یوسفؒ کو تامل ہوا۔ امام مالکؒ نے اگلے دن مدینہ منورہ کے بازار سے بہت سے دکانداروں کو یہ کہہ کر بلایا کہ اپنا اپنا صاع، یعنی ناپنے کا پیالہ لے کر آو۔ وہ اپنا اپنا صاع لے آئے۔ انہوں نے پوچھا کہ یہ پیالہ آپ کو کہاں سے ملا۔ جواب ملا کہ والد کے زمانے سے، پوچھا والد کے پاس کہاں سے آیا؟ جواب دیا: دادا کے زمانے سے، اس طرح سے یہ پتہ چلا کہ بہت سے لوگوں کے پاس خاندانی صاع تھے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارک سے چلے آرہے تھے۔ یوں یہ ثابت ہو گیا کہ حضورؐ کے زمانے میں یہی صاع رائج تھا۔

یہ تواتر طبقہ ہے کہ ایک خاص طبقہ میں مثلاً جو تاجروں کا طبقہ ہے، اور حضورؐ کے زمانہ سے مدینہ میں تجارت کرتا تھا، ان میں تواتر کے ساتھ ایک چیز چلی آرہی ہے۔ یہ بھی تواتر کی ایک قسم ہے۔ اس پر امام ابو یوسف نے اپنی رائے سے رجوع کیا اور امام مالکؒ کی رائے سے اتفاق فرمایا۔

تواتر طبقہ کی ایک اور مثال عرض کرتا ہوں۔ امام یوسف اور امام مالکؒ ہی کا واقعہ ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب فتح مکہ کے موقع پر مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور وہاں بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا اور وہاں اسلامی ایڈمنسٹریشن قائم ہو گئی تو ایک کمسن نوجوان تھے ابو محذورہ، جن کی آواز بڑی اچھی اور اونچی تھی، اور انہوں نے چار پانچ دن میں جب تک مسلمان وہاں رہے، اذان یاد کر لی تھی۔ ابو محذورہ بہت کم سن تھے اور ان کی عمر تیرہ چودہ سال سے بھی کم تھی۔ آواز بڑی اونچی تھی اور اذان بھی یاد کر لی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو حرم مکہ کا موذن مقرر کر دیا۔ اور یہ دیکھنے کے لئے کہ ان کو اذان صحیح یاد ہے یا نہیں، فرمایا کہ میں کھڑا ہوتا ہوں تم اذان کا ایک ایک جملہ مجھے سناتے جاؤ۔ وہ ایک جملہ آہستہ سے کہتے تھے، اللہ اکبر اللہ اکبر، پھر حضورؐ اشارہ فرماتے تھے کہ ہاں ٹھیک ہے، کہو۔ پھر وہ زور سے کہتے تھے؛ اللہ

اکبراللہ اکبر۔اس طرح سے پوری اذان کے الفاظ وہ ہرمرتبہ پہلے آہستہ کہتے اور جب حضورؐ اس کے درست ہونے کی تصدیق فرمادیتے تو اس کے بعد وہ زور سے کہتے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے دوتین مرتبہ یہ کیا کہ خودتشریف فرما ہوئے، ابومحذورہؓ نے آہستہ سے اذان کے الفاظ کہے، حضورؐ نے درست ہونے کا اشارہ کیا اور پھر انہوں نے زور سے اذان پڑھی۔

ابومحذورہ زندگی بھراس طرح سے اذان دیتے رہے۔ اور جوکوئی اذان کی روایت پوچھتا تھاوہ کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے سکھایا کہ پہلے اس کوآہستہ سے کہو پھر زور سے کہو۔ اس کو ترجیع کہتے ہیں۔یعنی لوٹانا، رجوع سے ہے۔امام ابویوسف حج کے لئے تشریف لے گئے۔ مکہ مکرمہ میں مختلف محدثین سے اذان کے احکام پوچھے۔تو وہاں کے کئی لوگوں نے ان کو ترجیع کا طریقہ سکھایا کہ اذان کا سنت طریقہ یہ ہے کہ پہلے آہستہ کہواس کے بعد بلند آواز سے کہو۔ امام ابویوسفؒ نے اس کی بنیاد پر فتویٰ دینا شروع کردیا کہ اذان میں ترجیع سنت ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کا مدینہ منورہ تشریف لانا ہوا جہاں امام مالکؒ سے ملاقات ہوئی۔ یہ نہیں معلوم کہ اسی ملاقات میں یا کسی اور ملاقات میں۔ جب اذان پر بات ہوئی تو امام ابویوسف نے فرمایا کہ اذان میں ترجیع سنت ہے۔امام مالکؒ نے کہا کہ ترجیع نہ سنت ہے اور نہ شرط ہے، امام ابویوسف نے فرمایا کہ مجھ سے فلاں محدث نے روایت کی ہے، انہوں نے فلاں سے روایت کی ہے انہوں نے فلاں سے روایت کی انہوں نے فلاں سے روایت کی تو انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے جب ابومحذورہ کواذان سکھائی تو ترجیع کے ساتھ سکھائی تھی۔امام مالکؒ نے فرمایا کہ یہ روایت میرے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ اب امام ابویوسفؒ کو حیرت ہوئی کہ میں حدیث صحیح کو پوری متصل سند سے بیان کررہاہوں، ساری کی ساری شرائط پوری ہیں اور امام مالکؒ کہتے ہیں کہ یہ میرے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ امام ابویوسفؒ نے پوچھا کہ آپ کے پاس کوئی ایسی حدیث متصل موجود ہے جس کی بنیاد پر آپ میری روایت کو نا قابل قبول قرار دے رہے ہیں۔امام مالک نے کہانہیں۔امام ابویوسف کو اور بھی حیرت ہوئی۔ امام مالکؒ نے کہا اچھا اس کا میں کل جواب دوں گا۔ اگلے دن جب امام ابویوسف ملاقات کے لئے تشریف لے آئے تو امام مالکؒ کے ہاں بہت سے حضرات بیٹھے ہوئے تھے۔امام مالکؒ نے ایک سے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ انہوں نے کہا کہ میں مدینہ منورہ کی فلاں مسجد کا موذن ہوں۔انہوں نے کہا کہ اذان دیجئے۔ انہوں نے

اذان دے کر سنائی، اس میں ترجیع نہیں تھی۔ ان سے پوچھا کہ آپ کو یہ اذان کس نے سکھائی۔ کہا کہ میرے والد نے۔ پوچھا: آپ کے والد کو کس نے سکھائی؟ جواب دیا: ان کے والد نے۔ پوچھا: ان کو کس نے سکھائی؟ جواب دیا: ان کے والد نے، ان کو کس نے سکھائی؟ کہا کہ یہ تو معلوم نہیں لیکن وہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مدینہ منورہ کی فلاں مسجد میں اسی طرح اذان دیا کرتے تھے۔ مدینہ منورہ کی تمام مساجد کے موذنوں نے ایک ایک کر کے یہ گواہی دی کہ ہم ابتداء سے اسی طرح سے اذان دیتے چلے آرہے ہیں۔ اور ہمارے باپ، ہمارے دادا اور ہمارے پڑ دادا، جب سے یہ سلسلہ قائم ہے اس وقت سے اس طرح اذان دیتے چلے آرہے ہیں۔ امام مالکؒ نے کہا کہ یہ تواتر طبقہ ہے جو میرے نزدیک انفرادی روایت سے بڑھ کر ہے۔ یہ انفرادی روایت جو آپ (امام ابو یوسفؒ) نے بیان کی ہے یہ ایک صحابیؓ کی ایک تابعی کو اور ایک تابعی کی ایک تبع تابعی کو ہے۔ اس کے مقابلہ میں میری جو روایت ہے یہ ایک طبقہ کی دوسرے طبقہ کے لئے اور دوسرے طبقہ سے تیسرے طبقہ کے لئے ہے۔ یہ زیادہ قابل قبول ہے۔

یہی وہ چیز ہے جس کو امام مالکؒ 'عملِ اہلِ مدینہ' کہتے ہیں۔ امام مالکؒ کا اصول یہ ہے کہ اگر کوئی ایک حدیث جو کسی ایک راوی سے مروی ہو (جسے حدیث اَحاد کہتے ہیں، آگے اس کی تفصیل آئے گی۔) اگر وہ تواتر طبقہ، یا اہل مدینہ کے عمل سے متعارض ہو تو اہل مدینہ کے عمل کو ترجیح دی جائے گی اور اس روایت کو چھوڑ دیا جائے گا۔ یہ تواتر طبقہ کی مثال ہے۔

آخری قسم ہے جس کو تعامل کہتے ہیں اور تواتر کا لفظ بعض اوقات استعمال نہیں کرتے۔ تعامل سے مراد ہے کہ امت مسلمہ میں جو طریقہ چلا آرہا ہے۔ غور سے سنئے گا اس لئے کہ تعامل کا مفہوم سمجھنے میں اکثر غلط فہمی ہوتی ہے۔ ایسے اہل علم، مخلص، متقی اور متبع سنت جن حضرات کا طرز عمل سنت اور شریعت کے مطابق ہو، اگر ان میں ایک طریقہ کار چلا آرہا ہو جس کی تائید میں صحیح احادیث موجود ہوں تو وہ خود اپنی جگہ ایک دلیل ہے اور قابل قبول ہے۔ عام لوگوں کا، گناہ گاروں کا، جاہلوں کا، شریعت سے ناواقف لوگوں کا تعامل کسی چیز کی دلیل نہیں ہے۔ لوگوں میں بہت سی غلط چیزیں بھی پھیل جاتی ہیں۔ لہٰذا یہ بات کہ چونکہ مسلمانوں میں یہ چیز رائج ہے اس لئے یہ درست ہے، یہ بات صحیح نہیں ہے۔ بلکہ تعامل کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسلمانوں میں رائج بھی ہو اور اس دور کے اور ہر دور کے متدیّن اہل علم، شریعت اور قرآن و سنت کا علم رکھنے والے اس کو

درست سمجھتے ہوں، یہی وہ تعامل ہے جو تواتر کی ایک قسم ہے، بشرطیکہ احادیث صحیحہ سے اس کی تائید ہوتی ہو۔ ورنہ بیسیوں قسم کی گمراہیاں ہیں جو مسلمانوں میں پھیل گئی ہیں۔ اگر ہر چیز کو تعامل کی بنیاد پر درست سمجھا جائے تو بہت سی گمراہیاں درست ہو جائیں گی۔

یہ حدیث متواتر ہے جس کی بے شمار مثالیں ہیں، دو تین مثالیں میں نے بیان بھی کر دیں۔ متواتر کا درجہ ثبوت کے معاملہ میں قرآن پاک کے برابر یا اس کے قریب قریب ہے۔ بعض جگہ قریب قریب ہے، بعض جگہ اس کے فوراً بعد ضرور ہے۔

حدیث مشہور

حدیث صحیح کی دوسری قسم ہے حدیث مشہور۔ یعنی وہ حدیث جس کو نقل کرنے والے تواتر کے درجہ تک تو نہ پہنچتے ہوں۔ لیکن اتنی تعداد میں ضرور ہوں کہ ان کی روایت کردہ حدیث ہر طبقہ میں معروف اور مشہور رہی ہو۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس کے راوی کم از کم تین ہوں، کسی نے کہا کہ دو ہوں، کسی نے کہا کہ دس ہوں۔ اس کا تعین بڑا دشوار ہے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ صحابہ کی سطح پر تین ہوں باقی تین یا اس سے زیادہ ہوں۔ لیکن اس کی کوئی متعین تعداد طے شدہ نہیں ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ روایت اتنی مشہور ہو کہ آپ اس کو خبر واحد یا ایک آدمی کی یادداشت پر مبنی نہ قرار دے سکیں۔

خبر واحد

خبر واحد حدیث صحیح میں بھی ہو سکتی ہے، حسن میں بھی ہو سکتی ہے اور ضعیف میں بھی ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ اس کا تعلق راویوں کی تعداد سے ہے۔ خبر واحد سے مراد وہ حدیث ہے جو ایک راوی نے ایک دوسرے راوی سے بیان کی ہو اور اس دوسرے راوی نے ایک تیسرے راوی سے بیان کی ہو۔ یعنی صحابہ، تابعین اور تبع تابعینؒ، تینوں مراحل پر ایک ایک راوی ہو۔ اس کو خبر واحد بھی کہتے ہیں یا اخبار آحاد یا خبر آحاد بھی کہتے ہیں۔ آحاد، احد یا احد کی جمع ہے۔ یعنی تین سطحوں پر کم از کم ایک ایک راوی ہو۔ ایک سے زیادہ ہو تو وہ حدیث مشہور کے زمرہ میں شامل ہو جائے گی یا عزیز ہو جائے گی، اور بھی قسمیں ہیں۔ لیکن تفصیلات کو میں چھوڑ دیتا ہوں۔

خبر واحد کے بارے میں بڑی تفصیلی بحثیں ہیں کہ خبر صحیح بھی ہو اور خبر واحد بھی ہو۔ تو

اس کا حکم شریعت میں کیا ہے۔ اور فقہائے اسلام اور محدثین کے دور سے لے کر آج تک اس پر عمل درآمد ہوتا چلا آ رہا ہے۔ بعض محدثین کا خیال یہ ہے کہ اگر خبر واحد خبر صحیح ہے تو ہر حال میں واجب التعمیل ہے اور اس پر عمل درآمد کیا جائے گا۔ بعض فقہا کا، جن میں حضرت امام ابوحنیفہؒ بھی شامل ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اگر خبر واحد طے شدہ سنت اور قیاس سے متعارض ہو تو قیاس اور طے شدہ سنت کو ترجیح دی جائے گی، اور خبر واحد کا کوئی اور مفہوم قرار دیا جائے گا۔ اس پر ظاہری معنوں میں عمل نہیں کیا جائے گا۔ اس میں صرف یہی دو رائے نہیں بلکہ اور بھی آراء موجود ہیں اور انہی کی بنیاد پر فقہی مسالک وجود میں آئے، واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں صدر اسلام میں فقہی مسالک جتنے بھی بنے وہ اکثر و بیشتر 75 یا 80 فیصد خبر واحد کے بارے میں اختلاف ہی کی بنیاد پر وجود میں آئے ہیں، حدیث کی باقی قسموں کے بارہ میں کوئی اختلاف نہیں۔

امام ابوحنیفہ اپنے اس نقطۂ نظر کی تائید میں ایک واقعہ سے استدلال کرتے ہیں۔ ایک خاتون تھیں فاطمہ بنت قیسؓ۔ وہ صحابیہ تھیں اور بڑی عالمہ اور فاضلہ خاتون تھیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں طلاق کا ایک مقدمہ آیا۔ کسی شخص نے اپنی اہلیہ کو طلاق دے دی۔ اور طلاق دینے کے بعد کہا کہ میرے گھر سے نکل جاؤ۔ مطلقہ خاتون شکایت لے کر حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور کہا کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق دے دی اور گھر سے نکلنے کے لئے کہتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ قرآن پاک میں متعہ طلاق کا حکم ہے جس کی بنیاد پر وہ تمہیں نفقہ دینے کے بھی پابند ہیں اور رہائش دینے کے بھی پابند ہیں۔ جب تک تم عدت میں ہو یہ دونوں چیزیں ان کے ذمہ ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ اور تمام خلفائے راشدینؓ کا طریقہ تھا کہ کوئی فیصلہ کرنے کے بعد تصدیق (Confirmation) کے لئے بقیہ صحابہ کرام سے پوچھتے تھے کہ کیا میں نے صحیح فیصلہ کیا ہے؟ اپنے سارے علم و فضل کے باوجود حضرت ابوبکر صدیقؓ کا بھی یہی طریقہ تھا، حضرت عمر فاروقؓ کا بھی، حضرت عثمانؓ کا بھی اور حضرت علیؓ کا بھی، کہ بقیہ صحابہ کرام سے جو وہاں موجود ہوتے تھے اس کو Verify کراتے تھے۔

چنانچہ یہ فیصلہ کرنے کے بعد حضرت عمرؓ نے صحابہ کرام سے، جو وہاں موجود تھے، پوچھا کہ کیا میں نے درست فیصلہ کیا ہے؟ سب صحابہ نے کہا کہ درست ہے۔ اس پر یہ خاتون جن کا میں نے ذکر کیا یعنی فاطمہؓ بنت قیس کھڑی ہوئیں اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں میرے

شوہر نے مجھے طلاق دے دی تھی اور رسول اللہ ﷺ نے میرے شوہر کو نہ رہائش فراہم کرنے کے لئے کہا تھا نہ نفقہ فراہم کرنے کو۔ لہٰذا یہ صاحب جنہوں نے بیوی کو طلاق دے دی ہے وہ ان مطلقہ بیوی کو نفقہ اور رہائش فراہم کرنے کے پابند نہیں ہیں۔ سیّدنا عمر فاروقؓ نے اس پر ارشاد فرمایا کہ 'لانترك كتاب ربّنا و سنة نبينا بقول امرأةٍ لاندرى هل حفظت ام نسيت' کہ ہم اللہ کی کتاب اور اپنے رسول کی سنت کو کسی ایسی خاتون کے کہنے پر نہیں چھوڑ سکتے جس کے بارے میں ہمیں معلوم نہیں کہ اسے صحیح یاد رہا یا وہ بھول گئی۔

اب یہاں خبر واحد ہے جو ایک صحابیہؓ کی روایت ہے۔ وہ صحابہ کی مجلس میں بیان کر رہی ہے، جس میں نعوذ باللہ جھوٹ بولنے یا بد دیانتی کا کوئی امکان نہیں۔ لیکن ایک انسانی اور بشری خطا کا امکان ضرور ہے۔ بقیہ صحابہ کرامؓ کو جو چیز معلوم تھی وہ یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے نفقہ کا حکم بھی دیا ہے اور رہائش فراہم کرنے کا بھی حکم دیا ہے۔ قرآن پاک میں متاع بالمعروف کا ذکر ہے۔ وللمطلقات متاع بالمعروف حقا على المتقين ۔قرآن پاک میں جو حکم آیا ہے اور حضورؐ نے اس پر عمل کیا ہے وہ اس خاتون کی روایت پر ہم نہیں چھوڑ سکتے ۔ یہاں حضرت عمر فاروقؓ نے بقیہ تمام صحابہ کی موجودگی میں ان کی منظوری سے خبر واحد کو ترک کر دیا۔ اور ان کی جو فہم کتاب اللہ اور سنت ثابتہ کی تھی اس کے مطابق عمل کیا۔

اس واقعہ سے امام ابوحنیفہ نے استدلال کیا کہ اگر خبر واحد اس نوعیت کی ہو کہ جس کا تعارض کسی بڑے واقعہ سے، قرآن کی کسی آیت سے یا سنت ثابتہ سے ہوتا ہو تو پھر اس کو نظر انداز کر دیا جائے گا اور قرآنی حکم یا سنت ثابتہ کو ترجیح دی جائے گی۔ کچھ اور فقہا کی رائے اس سے مختلف ہے جس کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے۔ لیکن فقہا کے جتنے اختلافات ہیں وہ اسّی فیصد یا پچھتر فیصد اسی خبر واحد کے بارہ میں کہ اس پر کب اور کہاں عمل کیا جائے اور کہاں نہ کیا جائے، کن حالات میں کیا جائے اور کس حد تک کیا جائے، اس پر عمل درآمد کی بنیاد پر ہی یہ سب اختلافات پیدا ہوئے ہیں۔

خبر واحد میں بھی پھر درجات ہیں۔ خبر واحد کی تعداد ذخیرہ احادیث میں بہت زیادہ ہے۔ یعنی احادیث صحیحہ کا تھوڑا حصہ ہے جو متواتر ہے۔ تواتر کی تمام اقسام ملا کر جو احادیث بنیں گی وہ بہت تھوڑی ہیں۔ غالباً ہزار بارہ سو سے زیادہ نہیں ہوں گی۔ یا اس سے کچھ زیادہ ہوں گی۔ باقی

جو احادیث مشہور یا عزیز کہلاتی ہیں اور جو دو یا تین صحابہ سے مروی ہیں، ان کی تعداد پانچ سات یا دس ہزار ہوگی۔ احادیث کا بیشتر حصہ یعنی تقریباً پینسٹھ فیصد احادیث وہ ہیں جو اخبارآحاد ہیں، خبر واحد ہیں۔ لیکن یہ ساری کی ساری کی ایک درجہ کی نہیں ہیں۔ خبر واحد اگر صحیح کے سارے تقاضے پورے کرتی ہو تو وہ صحیح ہوگی۔، جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ حسن میں بھی خبر واحد ہوسکتی ہے۔ ضعیف میں بھی خبر واحد ہوسکتی ہے۔ جو حدیث ضعیف بھی ہو اور خبر واحد بھی ہو اس کا درجہ سب سے نیچے ہوگا۔

لیکن صحیح میں خبر واحد کے گیارہ درجات یا گیارہ levels ہیں جن میں خبر واحد اور حدیث صحیح کو تقسیم کیا جاتا ہے۔ بعض محدثین نے یہ درجات کم بیان کئے ہیں۔ بعض نے گیارہ بیان کئے ہیں۔ بعض نے دس بیان کئے ہیں۔ بعض نے سات بیان کئے ہیں۔ لیکن ان سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ کس قسم کے درجات ہیں۔

۱۔ خبر واحد کا سب سے اونچا درجہ وہ ہے جس پر صحاح ستہ کے تمام مرتبین کا اتفاق ہو۔ جو حدیث صحاح ستہ کی ساری کتابوں میں آئی ہو اس کا درجہ سب سے اونچا ہے۔ ایسی احادیث چند ہیں۔ چند سے زیادہ نہیں ہیں۔ اس لئے اکثر محدثین نے اس درجہ کا ذکر نہیں کیا۔

۲۔ اس کے بعد وہ احادیث ہیں جن پر امام بخاری، امام مسلم، ترمذی اور ابوداؤد کا اتفاق ہے۔ جب کہا جاتا ہے رواہ الاربعہ تو اس سے یہ چار مراد ہوتے ہیں۔ جب کہا جائے رواہ الستۃ، تو اس سے مراد ہوتا ہے کہ یہ حدیث صحاح ستہ کی سب کتابوں میں ہے۔ جب کہا جاتا ہے رواہ الخمسہ تو اس سے مراد ہے ابن ماجہ کے علاوہ بقیہ صحاح ستہ، جب کہا جائے کہ رواہ الاربعہ، تو اس سے مراد ہے ابن ماجہ اور نسائی کے علاوہ بقیہ چار کتابیں۔ تو سب سے پہلا درجہ صحاح ستہ والوں کا ہے۔ پھر دوسرا درجہ اربعہ والوں کا۔

۳۔ تیسرا درجہ ان کا جو متفق علیہ کہلاتی ہیں یعنی وہ احادیث جن کو شیخین یعنی امام بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کیا ہو۔

۴۔ پھر وہ جن کو صرف امام بخاری نے روایت کیا ہو۔

۵۔ پھر وہ جن کو صرف امام مسلم نے روایت کیا ہو۔

۶۔ پھر وہ جو ان دونوں کی شرائط پر پوری اترتی ہوں لیکن بخاری و مسلم میں موجود نہ

ہوں۔

۷۔ پھر وہ جو امام بخاری کی شرائط پر پوری ہیں لیکن بخاری میں نہیں ہیں۔

۸۔ پھر وہ جو مسلم کی شرائط پر پوری ہیں لیکن مسلم میں نہیں ہیں۔

۹۔ پھر وہ جن کو بقیہ چار اصحاب سنن نے روایت کیا ہو یعنی ابوداؤ، ترمذی، ابن ماجہ اور نسائی نے۔

۱۰۔ پھر وہ جن کو صرف نسائی نے روایت کیا ہو۔

۱۱۔ پھر وہ جن کو بقیہ ائمہ نے روایت کیا ہو۔

یہ احادیث صحیح میں خبر واحد کے گیارہ درجات ہیں۔ جو متواتر احادیث ہیں وہ ان درجات سے ماوراہیں۔ ان کا درجہ سب سے اونچا ہے۔

جس کو حدیث حسن کہتے ہیں وہ صحیح کی وہ شکل ہے جس میں صحیح کی شرائط میں سے کوئی ایک آدھ شرط کم ہو۔ اس لئے اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ حدیث ضعیف کی بے شمار قسمیں ہیں۔ جیسا کہ ابھی میں نے عرض کیا کہ امام ابن الصلاح نے بیالیس قسمیں بیان کی ہیں۔ بعض حضرات نے اس سے بھی زیادہ قسمیں بیان کی ہیں۔ اوران قسموں میں سے ہر ایک کا الگ الگ حکم ہے۔

چند قسمیں مثال کے طور پر میں بیان کرتا ہوں۔ آٹھ قسمیں بیان کر دیتا ہوں۔

حدیث ضعیف کی اقسام

مرسل حدیث

حدیث ضعیف میں سب سے اونچی قسم حدیث مرسل ہے۔ مرسل کے معنی چھوڑی ہوئی یا Open۔ لیکن اصطلاح حدیث میں مرسل سے مراد وہ حدیث ہے جس میں کسی تابعی نے براہ راست رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک یا آپ کا عمل مبارک نقل کیا ہو اور درمیان میں صحابیؓ کا ذکر نہ کیا ہو۔ مرسل احادیث اکثر و بیشتر محدثین کی نظر میں قابل قبول نہیں ہیں۔ محدثین کی بڑی تعداد مرسل احادیث کو قابل قبول نہیں سمجھتی۔ البتہ فقہا کی کچھ تعداد مرسل احادیث کو قابل قبول سمجھتی ہے۔ بشرطیکہ وہ کسی ایسے تابعی سے منقول ہوں جو فقہ اور شریعت میں گہرائی کی وجہ سے مشہور ہوں۔

اور شریعت کے عمومی احکام کے مطابق ہوں۔قرآن مجید اور حدیث میں شریعت کے جو عمومی احکام آئے ہیں ان کے مطابق ہوں اور کسی تابعی فقیہ سے مروی ہوں۔غیر فقیہ یا کم مشہور تابعی سے اگر مروی ہوں تو وہ قابل قبول نہیں ہیں۔اس کے پھر بہت سے اثرات ہوتے ہیں۔مثلاً ایک حدیث مرسل ہے، ایک فقیہ نے قبول کی دوسرے نے قبول نہیں کی۔امام شافعی کا مسلک اس بات میں ان دونوں اراء سے مختلف ہے۔وہ کہتے ہیں کہ میں سعید بن المسیّب کے علاوہ باقی کسی کے مراسیل قبول نہیں کرتا۔ان کے نزدیک مرسل حدیث قابل قبول نہیں ہے، سوائے سعید بن المسیب کے مراسیل کے، جو سیّد التابعین مشہور ہیں اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شاگرد خاص بھی تھے، ان کے داماد بھی تھے اور پچیس تیس سال کے طویل عرصہ تک ان کے ساتھ رہے۔ان کی مراسیل امام شافعی کے نزدیک قابل قبول ہیں۔باقی کسی کے مراسیل امام شافعی کے نزدیک قابل قبول نہیں ہیں۔امام ابوحنیفہ کے نزدیک ہر تابعی کی مرسل مذکورہ بالا دو شرائط کے ساتھ قابل قبول ہے۔

محدثین میں سے بیشتر کے نزدیک کوئی مرسل حدیث قابل قبول نہیں ہے۔بعض محدثین کے نزدیک کسی حدیث کی کمزوری کو دور کرنے یا **compensate** کرنے کے لئے مرسل قابل قبول ہے۔ایک حدیث مثلاً حسن لغیرہ ہے، کسی مرسل سے وہ کمی دور ہو جاتی ہے، تو وہ صحیح لغیرہ ہو جائے گی۔کوئی حدیث حسن لغیرہ تھی، کسی مرسل سے اس کا ضعف دور ہو گیا تو حسن لعینہ ہو گئی۔ضعیف تھی، مرسل سے **Reinforce** ہو گئی تو حسن لغیرہ ہو جائے گی۔گویا حدیث مرسل ان کاموں کے لئے تو قابل قبول ہے بقیہ چیزوں کے لئے قابل قبول نہیں ہے۔

منقطع حدیث

دوسرا درجہ منقطع کا ہے۔منقطع سے مراد وہ حدیث ہے جس میں یا تو کوئی راوی درمیان سے نکل گیا ہو یا کسی مبہم شخص کا ذکر کیا گیا ہو۔مثال کے طور پر ذکر کیا گیا ہو کہ حدثنی فلان عن فلان عن رجل یا عن شیخ، یا عن شیخ من قبیلة قریش ،قریش کے ایک بڑے میاں نے مجھ سے بیان کیا۔اب معلوم نہیں کہ قریش کے قبیلہ کے وہ بڑے میاں کون تھے۔اس لئے ایسی حدیث منقطع کہلاتی ہے۔اس کا درجہ مرسل کے بعد آتا ہے۔مرسل کا درجہ اس لئے اونچا ہے کہ تابعین تک اس کی سند پکی ہے، صرف صحابیؓ کا نام نہیں ہے۔اب اگر وہ تابعی اونچے درجہ کے ہیں تو

اس کا درجہ اس کے حساب سے ہوگا۔ لیکن منقطع میں جو نام گرا ہوا ہے یا مبہم ہے تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ کون آدمی ہے۔

معضل حدیث

اس کے بعد معضل حدیث کا درجہ آتا ہے۔ معضل وہ حدیث ہے جس میں دو راوی گر گئے ہوں۔ دو راوی گرے ہوں، دونوں مستند ہیں یا غیر مستند ہیں، یہ سارے امکانات موجود ہیں۔ ان کا ضبط کس درجہ کا تھا، حفظ کس درجہ کا تھا، تحمل کے وقت وہ مسلمان ہوئے تھے کہ نہیں ہوئے تھے، یہ سارے مسائل جو حدیث صحیح میں تھے وہ پیدا ہوں گے۔

مدلّس حدیث

اس کے بعد ایک قسم مدلس کی ہے۔ مدلس اس حدیث کو کہتے ہیں کہ جس میں روایت بیان کرنے والے نے جان بوجھ کر **misrepresentation** کی ہو۔ روایت حدیث میں تدلیس کا رواج دوسری صدی میں شروع ہوا۔ دراصل جب کسی چیز سے لوگوں کو عزت ملنا شروع ہو جاتی ہے تو اس کے حصول کے لئے ایک مقابلہ اور مسابقت شروع ہو جاتی ہے اور مسابقت میں ہر ایک کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنے کو نمایاں کرے۔ اب فرض کریں درس قرآن کی میں مثال دیتا ہوں کہ آپ ڈاکٹر فرحت ادریس سے پڑھتی ہیں، ان کا بڑا اونچا درجہ اللہ نے رکھا، بڑی شہرت عطا فرمائی، درس کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ اب فرض کریں کہ کسی اور نے بھی اس شہر میں درس کا حلقہ شروع کیا۔ اتفاق سے ان خاتون کو کسی وجہ سے وہ شہرت نہیں ملی، کیونکہ شہرت اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ اب اگر ان کے تلامذہ کہیں اور جا کر پڑھائیں اور ایک خاتون آپ کے ہاں سے جا کے پڑھانا شروع کر دیں اور دونوں جا کر فرض کریں لندن میں درس کا حلقہ قائم کریں۔ آپ کے ہاں سے جانے والی خاتون ہر جگہ جا کر فخر یہ بیان کریں گی کہ انہوں نے ڈاکٹر فرحت کے ہاں سے پڑھا ہے۔ اس کے برعکس وہ دوسری خاتون جب اپنے استاد کا نام لیتی ہیں تو ان کو کوئی نہیں جانتا۔ ان کی طرف لوگ کم جاتے ہیں آپ کی طرف زیادہ آتے ہیں۔ اب اگر وہ خاتون یہ کہیں کہ میں نے اسلام آباد کی ایک بڑی مستند خاتون سے علم قرآن حاصل کیا ہے تو سننے والا سمجھے گا کہ شاید ڈاکٹر فرحت سے علم حاصل کیا ہے۔ اس طرح کی غلط بیانی جھوٹ تو نہیں ہے لیکن ایک طرح

کی misrepresentation ضرور ہے، یا اس سے کم از کم misrepresentation کا امکان ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ تو مدلس اس حدیث کو کہتے ہیں کہ جس میں راوی جان بوجھ کر ایسے الفاظ استعمال کرے کہ جس سے سننے والے کو یہ تاثر ملے کہ اس نے کسی مستند آدمی سے یا فلاں خاص آدمی سے روایت حاصل کی ہے۔ یا انہوں نے براہ راست حاصل نہ کی ہو، سنی سنائی ان کو مل گئی۔ اب وہ روایت کرے کہ فلاں صاحب بیان کرتے ہیں، بھئی بیان ضرور کرتے ہیں، لوگوں سے بیان کیا ہوگا، لیکن آپ سے بھی بیان کیا ہے کہ نہیں اور آپ کو بیان کرنے کی اجازت دی ہے کہ نہیں، اس کو وہ درمیان میں حذف کر دیا کرتے تھے۔ یہ نہیں کہتے تھے کہ اخبرنی یا حدثنی یعنی میں نے یہ سنا، یا مجھ سے انہوں نے یہ بیان کیا، وہ آ کے بیٹھے اور کہا کہ فلاں صاحب یہ حدیث بیان کرتے ہیں، یا فلاں صاحب سے روایت ہے، کس کی روایت ہے اس کو انہوں نے تھوڑا سا چھپایا۔ اس طرح کی احادیث کو مدلس کہتے ہیں۔ اور کچھ لوگوں نے یہ کام کیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ لیکن محدثین نے ان کو پکڑ لیا کہ یہ حدیث مدلس ہے۔ مدلس بھی حدیث ضعیف کی ایک قسم ہے۔

معلل حدیث

علت کا میں ذکر کر چکا ہوں کہ جس میں کوئی علت پائی جاتی ہو وہ حدیث معلل کہلاتی ہے۔ معلل حدیث کا پتہ چلانا خاصا مشکل ہوتا ہے۔ اور بڑی مشکل سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ کونسی حدیث معلل ہے کونسی نہیں۔ محدثین نے اس پر کتابیں لکھی ہیں۔ علل الحدیث کے نام سے ایک الگ فن ہے۔ اور علم حدیث کے فنون میں سب سے مشکل فن ہے۔

شاذ حدیث

اس کے بعد شاذ حدیث کا درجہ ہے۔ یہ وہ حدیث ہے جس میں بقیہ سب چیزیں تو بالکل ٹھیک ہیں لیکن بات جو بیان کی گئی ہے وہ ایسی ہے کہ قرآن پاک کے عام احکام کے خلاف ہے۔ ایک نئی چیز ہے جو حدیث کے احکام سے متعارض ہے۔ وہ شاذ کہلاتی ہے۔ اس کی تعریف یہ ہے کہ 'ماروا ہ الثقة مخالفاً للثقات'۔ یعنی ایک ثقہ راوی بقیہ ثقہ راویوں کے مخالف کوئی چیز بیان کرے۔

منکر حدیث

اس کے بعد منکر حدیث کا درجہ ہے۔ کہ ایک ضعیف روای دوسرے ثقہ راویوں کے خلاف کوئی چیز بیان کرے۔ شاذ اور منکر ایک ہی چیز ہے۔ شاذ وہ ہے کہ جو ثقہ راوی سے آئے، منکر وہ ہے جو غیر ثقہ راوی سے آئے۔

متروک حدیث

اور آخری درجہ متروک حدیث کا ہے یعنی وہ حدیث جس کو ترک کر دیا گیا ہو، جس کے بارے میں آپ یقین سے اور قطعیت کے ساتھ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ یہ موضوع ہے اور حضورؐ سے جھوٹ منسوب ہے۔ لیکن آپ کو یہ یقین ہے کہ یہ بات عمل کرنے کے قابل نہیں ہے۔ یا تو وہ راوی ایسا ہے کہ فسق و فجور میں مبتلا ہے، یا ایسا راوی ہے کہ اس کے بارے میں عام شہرت ہے کہ اس کی یادداشت درست نہیں ہے۔ ایک مخبوط الحواس قسم کا آدمی ہے، راوی بلاشبہ نیک آدمی ہوں گے، بزرگ بھی ہوں گے، لیکن ذہنی طور پر اس درجہ کے نہیں ہیں کہ ان کی بات بھروسہ کے قابل ہو۔ ایسی روایت متروک کہلاتی ہے۔ یہ نا قابل قبول احادیث کی مختلف قسمیں تھیں۔

موضوع احادیث

آخری درجہ جس کو صرف مجازاً حدیث کہتے ہیں وہ حدیث موضوع ہے۔ موضوع سے مراد وہ بات یا وہ قول جو غلط طور پر رسول اللہ ﷺ سے منسوب ہو گیا ہو لیکن حضورؐ کا ارشاد یا حضورؐ کا عمل نہ ہو۔ آپ کے ذہن میں سوال پیدا ہوگا کہ اس کا پتہ کیسے چلے گا۔ محدثین نے اسی لئے یہ ساری کاوشیں کیں اور ان چیزوں کا پتہ چلایا کہ رسول اللہ ﷺ سے غلط طور پر جو چیزیں منسوب ہیں وہ کیا ہیں۔ اور ایک جملہ میں آپ سے عرض کرتا ہوں اس کو ہمیشہ یاد رکھئے گا کہ دنیا میں آج جتنی بھی مذہبی کتابیں موجود ہیں، بشمول بائبل نیا عہدنامہ، پرانا عہدنامہ اور دیگر ساری مذہبی کتابیں، وہ تاریخی اور علمی حیثیت سے ہماری موضوع احادیث سے بھی کم درجہ کی ہیں۔ موضوع احادیث بھی تاریخی طور پر ثابت شدہ ہیں۔ کم از کم یہ تو پتہ ہے کہ یہ احادیث کس نے وضع کیں، کس زبان میں وضع کیں، جس نے وضع کیں وہ کس زمانے کا تھا، کس علاقہ میں وضع کیں، اس کے

الفاظ کیا تھے، وہ الفاظ بعینہ ہم تک پہنچے ہیں۔ بائبل کے بارے میں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ کس زمانے میں لکھی گئی، حتمی طور پر یہ بھی ابھی تک طے نہیں کہ موجودہ انجیل اول اول کس زبان میں لکھی گئی، کس نے لکھی، کہاں لکھی۔ خلاصہ یہ کہ علمی اور تاریخی طور پر ہماری موضوع احادیث بھی ان کتابوں کی نسبت کہیں زیادہ مستند اور تاریخی طور پر ثابت شدہ ہیں جن کو آج لوگ مذہبی کتابیں مانتے ہیں۔ اس سے آپ ہمارے اور ان کے معیار کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

موضوع ہونے کا پتہ اس طرح بھی چلتا تھا کہ بعض اوقات لوگ خود اعتراف کر لیتے تھے۔ ایک شخص تھا، غالباً اس کا نام عبدالکریم بن ابی العوجا تھا۔ یہ شخص خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں گرفتار ہوا۔ اس کے بارے میں شکایت تھی کہ یہ شخص جھوٹی حدیثیں گھڑ گھڑ کر لوگوں سے بیان کرتا ہے۔ تحقیق سے ثابت ہوا کہ واقعی ایسا ہی کرتا ہے۔ عدالت میں اس کے لئے سزائے موت کا حکم ہوا۔ اس زمانے میں طریقہ یہ تھا کہ سزائے موت خلیفہ کے ہاں سے کنفرم ہوا کرتی تھی ، آج بھی سزائے موت کو سربراہ مملکت کنفرم کرتا ہے۔ خلیفہ ہارون رشید نے اس کو بلایا اور خود بھی مزید تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ واقعی اس نے چار ہزار حدیثیں گھڑی ہیں۔ اس نے اعتراف بھی کر لیا۔ جب سزائے موت کے لئے لے جانے لگے تو اس نے خلیفہ سے کہا کہ آپ مجھے مروا تو رہے ہیں لیکن ان چار ہزار حدیثوں کا کیا کریں گے جو میں نے گھڑ کر پھیلا دی ہیں۔ ان جعلی حدیثوں میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دے دیا گیا ہے۔ ہارون نے کہا کہ تم ان چار ہزار کی فکر نہ کرو، اگر چالیس ہزار بھی پھیلا دیتے تو ہمارے ہاں شعبہ بن الحجاج جیسے لوگ موجود ہیں، الذی ینخله نخلاً ، جو چھلنی میں سے چھان کر نکال دیتے ہیں کہ کیا چیز صحیح ہے کیا غلط ہے۔ گویا ایسے ماہر فن محدثین موجود تھے جن کا ہارون الرشید نے ذکر کیا مثلاً شعبہ بن الحجاج جیسے لوگ موجود ہیں جو چھان کر نکال دیں گے اور کھوٹے اور کھرے کو الگ الگ کر دیں گے، تم اس کی فکر نہ کرو۔ چنانچہ انہوں نے کھوٹے اور کھرے کو الگ الگ کر دیا، اور آج سب کے سامنے ہے کہ کیا چیز حضورؐ کا ارشاد ہے اور کیا آپ کا ارشاد نہیں ہے۔

یہ تو مثال اس کی ہے کہ جہاں وضع کرنے والے اور گھڑنے والے نے خود اعتراف کیا ہو کہ میں نے گھڑا ہے۔ لیکن اکثر وہ اعتراف نہیں کرتا تھا، یا پتہ نہیں چلتا تھا کہ کس نے سب سے پہلے گھڑی، یا گھڑنے کے بعد پھیلا دی اور مر گیا یا کسی فرضی نام سے پھیلا دی۔ اس کی کچھ

نشانیاں اور کچھ پہچان علماء حدیث نے مقرر کی ہیں جو اکثر و بیشتر موضوعات کی کتابوں میں بھی موجود ہیں۔ موضوعات پر جن لوگوں نے کتابیں تیار کی ہیں اور موضوع احادیث کو الگ جمع کیا ہے ان کے شروع میں وہ اصول بیان کئے ہیں جن کے نتیجہ میں کسی حدیث کے موضوع ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

اس میں سب سے بڑی پہچان تو الفاظ کا جھول ہے یا غیر معیاری عبارت یا غیر معیاری الفاظ ہوں، رکاکة العبارة یا رکاکة اللفظ ۔رسول اللہ ﷺ فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ ترین معیار پر فائز تھے۔حضورؐ افصح العرب ہیں اور دنیا نے تسلیم کیا ہے کہ حضورؐ افصح العرب ہیں۔اس لئے کوئی ایسا جملہ جو گھٹیا قسم کا ہو، یا گھٹیا عبارت پر مبنی ہو یا عبارت جھول رکھتی ہو، اور فصاحت و بلاغت کے معیار سے گری ہوئی ہو وہ قطعاً رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نہیں ہوسکتی۔جن حضرات نے پوری زندگی علم حدیث میں گزاری اور سالہاسال انہوں نے شب و روز حدیث کا مطالعہ رکھا ان کو ایک بصیرت اور ایک ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ یہ حدیث حضورؐ کا ارشاد نہیں ہوسکتی۔اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کوئی شخص اپنی ذاتی **Subjective Opinion** سے رائے دے دیتا تھا، ایسا نہیں تھا۔بلکہ ماہرین حدیث کو محسوس ہو جاتا تھا کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہے، پھر تحقیق سے بھی ثابت ہو جاتا تھا کہ یہاں واقعی گڑبڑ تھی۔

ایک محدث نے صحیح حدیث کے بارے میں لکھا ہے کہ لہ ضوء کضوء النهار، حدیث صحیح میں سے ایسی روشنی نکلتی معلوم ہوتی ہے جیسے سورج سے روشنی نکلتی ہے۔اور حدیث موضوع کے بارے میں لکھا ہے لہ ظلمة کظلمة اللیل، حدیث موضوع میں ایسی تاریکی ہوتی ہے جیسے رات کی تاریکی ہوتی ہے۔جب تحقیق کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ واقعی اس میں یہ جھول ہے۔

بعض چیزیں ایسی حضورؐ سے منسوب کر دی گئیں جو عام عقل اور مشاہدہ کے خلاف ہیں۔اور بعض بڑی مضحکہ خیز قسم کی چیزیں مشہور کر دی گئی ہیں مثلاً ایک کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ کہ مرغا جب بولتا ہے تو فرشتہ کو دیکھ کر بولتا ہے۔بھئی مرغے کا فرشتہ سے کیا تعلق ہے۔بالبداہت غلط بات ہے۔اس طرح کی اور بہت سی چیزیں جو بہت فضول قسم کی ہیں لیکن مشہور کر دی گئی ہیں۔

بعض چیزیں جو غیر اخلاقی اور بے حیائی کی چیزوں پر مشتمل ہوں وہ بھی موضوع ہیں۔رسول اللہؐ کی زبان مبارک سے نعوذ باللہ کوئی ایسا لفظ نہیں نکل سکتا جو بے حیائی اور غیر اخلاقیات

پرمبنی ہوں۔ایسی بہت سی بے ہودہ اور بے حیا قسم کی چیزیں حضورؐ سے منسوب کردی گئی ہیں۔کس لئے یہ بے ہودہ چیزیں حضورؐ سے منسوب کردیں؟ بعض لوگ خود بدکردار تھے،بعض نے محض کھیل میں کردیں،شرارتاً کردیں، کچھ نے ویسے ہی کردیں،مختلف اسباب ہوسکتے ہیں جن کا ابھی ذکر آئے گا۔

ایک اور چیز ہے،اور محدثین کے ہاں یہ اصول ہے کہ کسی چھوٹے عمل پر اتنے بڑے ثواب کا وعدہ ہو کہ جو غیر معمولی طور پر بڑا معلوم ہو تو اسے قبول نہیں کیا جائے گا، اگر آپ موضوعات پر نظر ڈالیں تو آپ کو اس کی مثالیں مل جائیں گی۔مثلاً ایک جگہ ملتا ہے کہ اگر کوئی شخص صبح اٹھنے کے بعد ایک مرتبہ کلمہ کہے تو اس کے ہر حرف سے ستر ہزار فرشتے پیدا ہوں گے۔وہ ستر ہزار فرشتے اس کے لئے روزانہ دعا کریں گے اور ہر دعا سے ستر ہزار فرشتے نکلیں گے وہ دعا کریں گے اور قیامت تک اس کے لئے دعا کریں گے، یہ فضول سی بات ہے۔مطلب یہ کہ آدمی کلمہ شہادت پڑھے، لا الہ الا اللہ پڑھے تو اس کا اجر وثواب اپنی جگہ۔لیکن یہ بات کہ اس سے اتنے فرشتے پیدا ہوں گے وغیرہ وغیرہ ، اس طرح کا کلام رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نہیں نکلتا تھا۔صحیح بخاری پوری پڑھ لیں آپ کو اس طرح کی کوئی فضول چیز نظر نہیں آئے گی، صحیح مسلم میں نظر نہیں آئے گی، موطاء امام مالکؒ میں نہیں ملے گی۔اس طرح کی فضول باتیں اور قصے کہانیوں میں ، واعظوں کے بیانوں میں اور گاؤں اور دیہاتوں میں بڑی جلدی مقبول ہو جاتی ہیں۔کم علم لوگ اس طرح کی چیزیں بیان کرتے ہیں، اس لئے وہاں اس طرح کی چیز ملے گی، حدیث کی صحیح کتابوں میں نہیں ملے گی۔ایسی ہی کمزور باتوں میں جنت کی کیفیات اور جہنم کی کیفیات اور ان کی اتنی تفصیلات کہ جیسے کسی نے فلم بنائی ہو اس طرح کی تفصیلات حدیث میں نہیں آئیں۔یہ بھی موضوع حدیث کی ایک علامت ہے۔

موضوع احادیث کی تخلیق کے اسباب

موضوع حدیث کیوں ہمارے سامنے آئی اور کیسے وضع ہوئی؟ اس کے مختلف اسباب ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ جنہوں نے موضوع حدیث بیان کی وہ سارے کے سارے بددیانت لوگ تھے۔بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ ایک صحابیؓ کا قول ہے، صحابیؓ نے بیان کیا اور سننے والے

نے یہ سمجھا کہ شاید رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہوگا۔ انہوں نے غلط فہمی میں اس کو رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے طور پر بیان کر دیا۔ حالانکہ وہ ارشاد کسی صحابیؓ کا تھا۔ اس لئے محدث تو اپنی اصطلاح میں اس کو موضوع حدیث قرار دے گا۔ اس لئے کہ وہ حضورؐ کا ارشاد نہیں ہے لیکن اصل میں وہ کسی صحابیؓ کا ارشاد ہوگا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ کسی بہت نیک اور اللہ والے انسان نے جو بڑے جذبہ والے اور مخلص آدمی تھے لیکن عقل میں ذرا کم تھے، انہوں نے کسی کو کوئی اچھی بات بیان کرتے ہوئے سنا اور سمجھے کہ یہ اتنی اچھی بات شاید حضورؐ نے فرمائی ہو اور اس کو حدیث کے طور پر بیان کرنا شروع کر دیا۔ بعض اوقات یہ بھی ہوا کہ کچھ لوگوں نے کسی سیاسی مصلحت سے اپنے اپنے سیاسی موقف کے حق میں احادیث بیان کرنی شروع کر دیں۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد اور پہلی صدی ہجری میں بہت سے ایسے واقعات پیش آئے۔ کچھ لوگوں نے بدنیتی کی بنیاد پر حضورؐ سے ارشادات منسوب کر دئے تا کہ اس کے ذریعے اپنے سیاسی موقف کے لئے حمایت حاصل کر سکیں۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ حدیث حضورؐ کا ارشاد ہو سکتی ہے کہ نہیں۔

اسی طرح سے بعد میں جب فقہ یا کلام یا عقائد میں اختلافات ہوئے تو بعض حضرات نے اپنی اپنی پسندیدہ شخصیات کے بارے میں احادیث گھڑ کر حضورؐ کی ذات سے منسوب کر دیں۔ مثلاً ایک شخص نے امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں حدیث گھڑ دی کہ 'میرے بعد ایک شخص ہوگا جس کا نام ابوحنیفہ ہوگا ھو سراج امتی، سراج امتی سراج امتی'، یعنی وہ میری امت کا چراغ ہوگا، میری امت کا چراغ ہوگا، میری امت کا چراغ ہوگا۔ حضورؐ کا ایسا کوئی ارشاد نہیں ہے یہ بالکل جھوٹ اور فضول بات ہے۔

اسی طرح شاید کسی حنفی نے جو بڑا متشدد تھا اس نے امام شافعی کے خلاف حدیث گھڑ دی کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میری امت میں ایک شخص آئے گا کہ یقال لہ محمد بن ادریس ھو اشد علی امتی من ابلیس، کہ نعوذ باللہ وہ میری امت کے لئے ابلیس سے زیادہ نقصان دہ ہوگا۔ امام شافعیؒ جیسے انتہائی متقی، مخلص بزرگ اور مجتہد کے بارے میں یہ فضول بات پھیلا دی۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے۔

موضوع حدیث کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعد آنے والے کسی انسان کا نام لے کر کوئی پیشین گوئی نہیں کی۔ جس حدیث میں نام کے ساتھ کوئی پیشین گوئی

بیان ہوئی ہے وہ ساری کی ساری احادیث موضوع ہیں۔اس طرح رسول اللہ ﷺ نے کسی خاص قوم یا پیشہ کے لوگوں کی برائی بیان نہیں کی۔ کہ مثلاً بصرہ کے لوگ برے ہیں، اور کوفہ کے اچھے ہیں، یا خراسان کے برے ہیں اور مصر کے اچھے ہیں۔ جہاں کسی علاقہ کی برائی حضورؐ سے منسوب ہوئی ہے وہ حضورؐ کی زبان مبارک کے الفاظ نہیں ہیں۔رسول اللہ ﷺ کا یہ طریقہ نہیں تھا۔قرآن پاک میں ہے 'لا یسخر قوم من قوم'، کوئی قوم کسی دوسری قوم کے ساتھ استہزا نہ کرے۔حضورؐ ایسا کیسے کر سکتے تھے۔کسی قبیلہ کا نام لے کر برائی کہ فلاں قبیلہ کے لوگوں میں یہ برائی ہے یا فلاں علاقہ کے لوگوں میں یہ برائی ہے، حضورؐ نہیں فرماتے تھے۔اس طرح کی جتنی احادیث ہیں وہ سب کی سب موضوع ہیں۔یہ کچھ علامات اور پہچانیں ہیں جو علم حدیث کے ماہرین نے مقرر کی ہیں اور جن سے موضوع احادیث کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

محدث جب حدیث بیان کیا کرتے تھے تو اس کے بہت سے انداز ہوتے تھے۔ان سب کے درجات الگ الگ ہیں۔سماع یعنی استاد کی زبان سے براہ راست سننا اور اس کی تصریح کرنا تحمل کا سب سے اونچا درجہ ہے۔محدث سے براہ راست سننا۔ پھر سننے کے بعد جب شاگرد آگے بیان کرتا ہے تو بیان کرنے کے جو الفاظ ہیں اس کے مختلف درجات ہیں۔سب سے اونچا درجہ ہے سمعته يقول، کہ میں نے ان کو سنا وہ یہ بیان فرما رہے تھے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے براہ راست سنا اور وہ اپنی زبان سے بیان فرما رہے تھے۔اس کی ایک مثال صحیح بخاری کی پہلی روایت ہے۔کتاب شروع ہوتی ہے 'کتاب بدألوحی' اور پہلا باب ہے 'کیف كان بدألوحي على رسول الله ﷺ'، پھر آگے بیان کرتے ہیں 'حدثنا الحميدی قال حدثنا سفيان عن يحي بن سعيد انصاری قال اخبرنی محمد بن ابراهم الطيبی انه سمع علقمة بن الوقاص الليثي يقول'، کہ انہوں نے علقمہ بن وقاص اللیثی کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا، سمعت عمر بن الخطاب على المنبر يقول، کہ میں نے حضرت عمر فاروق کو یہ ارشاد فرماتے سنا، قال سمعت رسول الله ﷺ يقول، وہ یہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ 'انما الاعمال بالنيات'۔یہ سب سے اونچا درجہ ہے جس میں محدث یہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے شیخ اور استاذ کو سنا اور وہ یہ بیان فرما رہے تھے۔

دوسرا درجہ ہے حدثنی، کہ انہوں نے مجھ سے بیان کیا۔اس کے بعد ہے حدثنا کہ

انہوں نے ہم سے بیان کیا۔ حدثنا سے پتہ چلتا ہے کہ سننے والے بہت سارے لوگ تھے۔ ایک سننے والا ہو تو توجہ کا مرکز وہ ہوتا ہے۔ سننے والے بہت سارے ہوں تو کوئی ایک آدمی توجہ کا مرکز نہیں ہوتا۔ اس لئے جس جگہ توجہ کا مرکز ایک ہوگا وہ افضل ہوگا بہ نسبت اس کے جہاں توجہ کا مرکز بہت سے لوگ ہوں۔ پھر اخبــرنــی کا درجہ ہے جس میں شاگرد نے پڑھا اور استاد نے سنا۔ پھر اخبرنا کا درجہ ہے جس میں بہت سے شاگردوں نے پڑھا اور سب نے سنا۔ پھر ہے اخبرنی قرأۃً علیـہ وانااسمع کہ ان کے روبرو قرات دوسرے لوگ کررہے تھے اور میں بھی سن رہا تھا۔ نہ میں پڑھنے والا تھا نہ سنانے والا، لیکن میں سننے والا تھا۔ پھر ہے انبانی، پھر انبأنا عن فلان اور قال فلان۔

عـن فـلان یعنی فلاں سے روایت ہے۔ اس اسلوب کو عنعنہ کہا جاتا تھا۔ اس میں یہ صراحت نہیں ہوتی تھی کہ شیخ سے روایت کا طریقہ کیا تھا۔ عـن فـلان فلاں سے روایت میں اس کا امکان ہے، اب ضروری نہیں کہ انہوں نے براہ راست سنا ہو، ممکن ہے کہ براہ راست خود ان کی زبان سے نہ سنا ہو، یا قال فلان، فلاں نے یہ فرمایا۔ اس میں بھی دونوں امکان موجود ہیں۔

امام بخاری کی جن تعلیقات کا میں نے ذکر کیا تھا یہ تعلیقات وہ ہیں کہ جن میں امام بخاری کوئی سند بیان کئے بغیر قال فلان کہہ کر کوئی چیز درج کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال میں آپ کے سامنے عرض کردیتا ہوں۔ یہ مثال آخری باب سے ہے۔ آخری باب میں بخاری کی آخری حدیث ہے، باب کا عنوان ہے بـاب قـول الله تعالیٰ و نضع الموازین القسط لیوم الـقیـامة، باب اس بات کے بیان میں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم روز قیامت برابر تولنے والی ترازوئیں رکھیں گے وانّ اعـمـال بنی آدم وقولهـم یوزنون اور اس باب کے بیان میں کہ بنی آدم کے اعمال اور اقوال کو تولا جائے گا۔ یہ امام بخاری نے باب کا عنوان رکھا ہے اور پھر کہتے ہیں کہ وقـال مـجـاهد اور مجاہد کہتے ہیں، (یہ تابعی ہیں اور عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد ہیں۔ امام بخاری کی پیدائش سے ڈیڑھ دوسو سال پہلے انتقال کرچکے تھے۔ یہاں امام بخاری کوئی سند نہیں لارہے ہیں۔) وقـال مجاهد القسطاس العدل بالرومیة، یہ جو قسط کا ذکر آیا ہے تو مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ القسطاص العدل بالرومیة، رومی زبان میں قسطاس انصاف کو کہتے ہیں ویقال الـقسط مصدر المقسط ، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قسط مقسط کا مصدر ہے وهـو العادل۔ یہاں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد مجاہد بن جبر کا قول امام بخاری نے بغیر کسی سند کے نقل کیا ہے۔

اس کو تعلیق کہتے ہیں۔ اس طرح کی تعلیقات صحیح بخاری میں کوئی ساڑھے تین سو کے قریب ہیں اور صحیح مسلم میں چودہ ہیں۔ ظاہر ہے تعلیقات کا وہ درجہ نہیں ہے جو صحیح بخاری کی اصل روایات کا ہے۔ انہوں نے باب کے عنوان کی وضاحت کے طور پر اس کو نقل کیا ہے اصل حدیث کے طور پر نقل نہیں کیا۔ تو یہ تعلیق اور تعلیقات کا مفہوم ہے۔ یاد رہے کہ یہ قسطاس وہی لفظ ہے جس کو انگریزی میں **Justice** کہتے ہیں۔

وآخر دعوٰنا ان الحمدلله رب العلمین

☆☆☆☆☆☆

آج لوگوں میں یہ بات عام ہے کہ حدیث کی بہت سی کتابیں **authentic** نہیں ہیں اصل اور نقل میں فرق کرنا مشکل ہے۔ اس بات میں کس حد تک سچائی ہے خاص طور پر صحاح ستہ کے لئے یہی بات کہی جاتی ہے۔

میرے خیال میں آج کی ساری گفتگو اسی سوال کے جواب میں تھی۔ یہ جو حدیث صحیح کے اتنے مشکل معیارات میں نے بیان کئے۔ صحاح ستہ کی ساری کتابوں میں ساری احادیث انہی معیارات پر ہیں اور وہ بیشتر صحیح ہیں اور اگر صحیح نہیں ہیں تو حسن ہیں اور حسن بھی قابل قبول ہیں جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔

مودبانہ گزارش ہے کہ آپ اس بات کو واضح کریں کہ اخباروں اور ٹیلی ویژن پر موضوع احادیث کو جو نشر کیا جاتا ہے تو کیا علماء کی جماعت بیٹھ کر اس کی تحقیق کرتی ہے یا ایسے ہی بیان کر دی جاتی ہیں۔

ریڈیو اور ٹی وی وغیرہ پر جو احادیث نشر کی جاتی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حدیث تو وہ ہے جو خبرنامہ سے پہلے اسکرین پر لکھی ہوئی آتی ہے یا اور مواقع پر آتی ہے۔ وہ میں نے ہی دو سال پہلے ڈھائی تین سو احادیث کا اردو ترجمہ کر کے حوالوں کے ساتھ لکھ کے انہیں دیا تھا اور انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اُسی مجموعہ میں سے انتخاب کر کے بیان کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ مستند ہیں۔ لیکن اگر کوئی صاحب علم تقریر کرنے ٹی وی پر آئے ہیں اور اپنے طور پر حدیث بیان کرتے ہیں تو وہی اپنی تحقیق کے مطابق بیان کرتے ہیں اور وہی اس کے ذمہ

دار ہیں، اس کا ٹیلی ویژن والے یا کوئی اور ذمہ نہیں لے سکتا۔ اس لئے کہ پہلے سے تو معلوم نہیں ہوتا کہ کوئی شخص کونسی حدیث بیان کرے گا۔ اس لئے اس بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔

حضرت امیر معاویہؓ کے بیٹے حضرت یزید کے بارے میں جو حدیث ہے کہ میری امت کی وہ جماعت جو قسطنطنیہ یعنی موجودہ استنبول کو فتح کرے گی وہ جماعت جنت میں جائے گی اور اس جماعت کے سپہ سالار یزید تھے، تو کیا یہ حدیث صحیح ہے؟ کیونکہ آپؐ نے ایک خاص جماعت کو اس میں تعظیم دی ہے۔

اس موضوع پر مسند امام احمد میں دو حدیثیں آتی ہیں۔ پہلی حدیث میں استنبول کی فتح کا عمومی ذکر ہے۔ اس میں یزید میرے خیال میں شامل نہیں ہیں۔ میں حدیث کے الفاظ بیان کر دیتا ہوں: لتفتتحن مدينة قيصر، کہ تم ضرور بالضرور قیصر کے شہر کو فتح کرو گے، جو قسطنطنیہ کے نام سے مشہور تھا، فلنعم الامير اميرها و نعم الجيش ذالك الجيش ۔ وہ امیر کتنا ہی اچھا امیر ہوگا اور وہ لشکر کتنا ہی اچھا لشکر ہوگا۔ قسطنطنیہ کی فتح 1492ء میں ہوئی تھی۔ بہت سے لوگ قسطنطنیہ پر حملہ کرنے جاتے رہے ہیں کہ شاید ان کے ہاتھوں فتح ہو جائے اور وہ اس بشارت کے مصداق بن جائیں۔ یزید نے بھی کوشش کی لیکن یہ فتح یزید کے مقدر میں نہیں تھی، بلکہ محمد الفاتح کے ہاتھوں مقدر تھی جو عثمانی حکومت کا ایک بادشاہ تھا اور اسی لئے اس کو فاتح کہا جاتا ہے کیونکہ اس نے استنبول فتح کیا تھا۔ فتح کے بارے میں ایک روایت تو یہ ہے۔

مسند امام احمد ہی کی ایک دوسری روایت ہے جس میں ہے کہ اوّل جيش يغز و مدينة قيصر مغفور لهم ، یا اس طرح کے کچھ الفاظ ہیں، کہ وہ پہلا لشکر جو قیصر کے شہر پر حملہ کرے گا وہ مغفور لہم ہوگا۔ اب اس میں يغزو کا لفظ ہے، کیا اس سے مراد محض حملہ کرنا ہے یا فتح کر لینا مراد ہے۔ بعض روایات میں فتح کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے حملہ کرنا مراد ہے تو پہلا حملہ جس لشکر نے کیا اس کی سربراہی یزید کے ہاتھ میں تھی اور اس میں بڑے بڑے صحابہ کرامؓ بھی شامل تھے۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ اسّی سال کی عمر میں اسی لئے تشریف لے گئے تھے کہ اس بشارت کے مصداق بن سکیں۔ چنانچہ دوران محاصرہ وہیں ان کا انتقال ہوا اور وہیں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ استنبول میں ان کا مزار آج بھی ہے۔ اور آپ میں سے جو وہاں گئے ہیں انہوں نے دیکھا ہوگا، میں نے بھی کئی بار اس کی زیارت کی ہے۔ اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہاں يغزو سے مراد کیا ہے، محض حملہ یا مکمل فتح۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ کس کو اس کا مصداق

قرار دیتا ہے اور کس کو نہیں۔

آپ نے کہا ہے کہ حضورؐ نے اپنے بعد آنے والے کسی شخص کا نام لے کر کوئی بات نہیں فرمائی لیکن قیامت کی نشانیوں میں امام مہدی کا نام ملتا ہے؟

امام مہدی کے بارے میں جو احادیث ہیں ان کے بارے میں بڑی تفصیل سے بحث ہوئی ہے۔ اس میں وہی تواتر والی بات یاد رکھیں۔ یہ احادیث صحابہ کرام کی بڑی تعداد سے مروی ہیں اور صحابہ کے بعد بھی بڑی تعداد میں لوگوں سے مروی ہے۔ اگرچہ انفرادی طور پر یہ ساری احادیث اخبار آحاد ہیں لیکن ان میں کچھ باتیں قدر مشترک ہیں جن کو ہم تواتر قدر مشترک قرار دے سکتے ہیں۔ ان میں قدر مشترک کسی کا نام نہیں ہے۔ قدر مشترک یہ ہے کہ میرے بعد آخری زمانہ سے پہلے ایک ایسا قائد، ایک ایسا متدیّن اور ہدایت یافتہ امام مسلمانوں کو ملے گا جو میرے طریقے کو دوبارہ زندہ کردے گا۔ تواترِ قدرِ مشترک کے اصول پر اتنی بات مشترک ہے۔ باقی کوئی چیز قدر مشترک نہیں ہے۔ ان روایات میں بہت سی ضعیف بھی ہیں، بلکہ کچھ روایات ان میں سے موضوع بھی ہیں۔ اس لئے جہاں نام کے تعین کے ساتھ ذکر آیا ہے وہ بعض محدثین کے نزدیک موضوع ہے اور جو لوگ اس کو موضوع نہیں سمجھتے ان کے نزدیک وہ احادیث سب کی سب ضعیف یا زیادہ سے زیادہ حسن لغیرہ ہیں۔ اس لئے یہ اصول کہ نام کے ساتھ جو روایات آئی ہیں وہ قابل قبول نہیں ہیں، یہ اصول باقی رہتا ہے اور مہدی کی روایت سے ٹوٹتا نہیں ہے۔ مہدی کی احادیث تواتر قدر مشترک سے ثابت ہیں۔ ان میں نام والی احادیث کا وہ درجہ نہیں ہے۔

شب برات کے موقع پر اخبارات میں شب برات کی رات کو عبادت کی فضیلت کے بارے میں احادیث چھپی ہیں۔

نصف شعبان کے بارہ میں ایک حدیث آئی ہے جو کہ میرے خیال میں بہت ضعیف ہے اور ضعیف کے بھی بہت نچلے درجہ پر ہے۔ پندرہویں شعبان کی کوئی فضیلت حدیث کی مستند کتابوں میں نہیں آئی۔ اور قرآن پاک کی جس آیت کا لوگ حوالہ دیتے ہیں اس سے مراد کوئی اور رات نہیں ہے، بلکہ لیلۃ القدر ہے اور لیلۃ القدر ہی کا نام لیلۃ البرأۃ ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ اپنا جسم نماز میں کتے کی طرح نہ بچھاؤ، اس میں جسم خود بخود اوپر ہو جاتا ہے، اس کی وضاحت فرمائیں۔

کتے کی طرح بچھانے سے مراد یہ ہے کہ دونوں بازو زیادہ نہ پھیلائے جائیں بلکہ کہنیاں اوپر رکھی جائیں۔ کتا جب بیٹھتا ہے دونوں بازو پورے رکھ کر بیٹھتا ہے تو اس کی ممانعت ہے لیکن خواتین اگر جسم کو سمیٹ لیں اور کہنیاں زمین پر پھیلا کر نہ رکھیں تو دونوں پر عمل ہوجاتا ہے۔

اجازۃ اور مناولہ میں شیخ حدیث کی اجازت ضروری ہے تو قرآن پاک کی تفسیر یا اس کے علاوہ جو احادیث ہم پڑھ کر سناتے ہیں......

میں نے عرض کیا تھا شاید آپ کو یاد نہیں رہا، کہ اجازۃ اور مناولہ کے یہ طریقے اس وقت تک زیر بحث تھے جب تک کتب حدیث مرتب اور مدون ہو کر شائع نہیں ہوئی تھیں۔ اب ہر چیز مرتب ہو کر شائع ہو چکی ہے اب اس میں کسی کمی بیشی، ملاوٹ یا غلط بیانی کا امکان نہیں ہے، لہٰذا اجازۃ بھی درست ہے اور مناولہ بھی درست ہے۔ اگر آپ کسی شیخ حدیث کے پاس جائیں اور وہ واقعی آپ کا امتحان لے کر محسوس کریں کہ آپ حدیث بیان کرسکتی ہیں تو پوری صحاح ستہ آپ کو دے کر اجازت دے کر آپ سے کہہ سکتے ہیں کہ آپ روایت کریجئے یا کاغذ پر لکھ کر اجازت دے دیں۔ مجھے بھی ایک بزرگ نے یہ جاننے کے بعد لکھ کر اجازت دی تھی کہ میں علم حدیث پڑھ سکتا ہوں۔ میرے پاس وہ تحریری اجازت موجود ہے اس لئے آج کی کیفیت اور ہے۔ یہ گفتگو جو مناولہ کے بارے میں میں نے کی ہے یہ اس زمانے کی بات ہے جب حدیث مرتب کر اس طرح سے یقینی طور پر سامنے نہیں آئی تھی۔

آپ نے فرمایا کہ وحی چوبیس ہزار مرتبہ نازل ہوئی۔

یہ جو چوبیس ہزار مرتبہ کا ذکر ہے یہ کئی کتابوں میں آیا ہے۔ علامہ سیوطی نے الاتقان میں بھی لکھا ہے اور علامہ زرکشی نے البرہان میں بھی لکھا ہے اور جہاں جہاں وحی سے متعلق مباحث مفسرین قرآن نے بیان کئے ہیں وہاں چوبیس ہزار مرتبہ کا ذکر آیا ہے۔ اس لئے چوبیس ہزار مرتبہ کا ذکر اگر درست ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ سنت بھی وحی کے ذریعے نازل ہوئی ہے اور یقیناً وحی کے ذریعے نازل ہوئی ہے، لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ سنت وحی کے کس خاص طریقے سے نازل ہوئی؟ کیا اس طریقہ سے جس سے قرآن پاک نازل ہوا؟ اس بارہ میں ہمارے لئے قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا دشوار ہے۔

میں نے تعریف کا لفظ نہیں کہا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ اگر کسی روایت میں کسی قوم کی برائی ہوئی ہے تو وہ روایت صحیح نہیں، اس لئے کہ کسی فرد یا گروہ کی برائی حضورؐ نے نہیں کی، تعریفیں تو بہت سوں کی کی ہیں۔ انصار کی تعریف کی ہے۔ یمنیوں کی تعریف کی ہے۔ الایمان یمان والحکمة یمانية ،قریش کی تعریف بھی کی ہے، تعریفیں بہت سوں کی کی ہیں، لیکن اگر برائی کسی قوم کی کی ہو کہ فلاں قبیلہ کے لوگ بڑے برے ہیں، فلاں قوم کے لوگ بڑے چور ہوتے ہیں یا حبشی بڑے لالچی ہوتے ہیں، اس طرح کی بات کبھی حضورؐ نے نہیں کی ہے۔ البتہ تعریفیں بہت سوں کی کی ہیں۔

سوال.....................(سوال پڑھا نہیں گیا ہے اس لئے کیسٹ میں موجود نہیں ہے۔)

لیکچر کے شروع میں قطعی الدلالت اور قطعی الثبوت تو کل میں نے بتا دیا تھا۔ کل میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن مجید یا حدیث یا سنت میں جو کچھ لکھا ہوا ہے اس کو اصطلاح میں نص کہتے ہیں۔ مثلاً یہ ایک حدیث کی عبارت ہے، حضورؐ نے فرمایا کہ 'انما لاعمال بالنيات'۔ یہ ایک نص ہے۔ قرآن کریم کی کوئی آیت بھی نص ہے۔ 'يوصيكم الله في اولادكم للذكر مثل حظ الأنثيين' بھی نص ہے۔ جتنی نصوص ہیں وہ قرآن پاک میں آئی ہوں یا احادیث میں آئی ہوں ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم ہے قطعی الثبوت، جس کا ثبوت قطعی اور یقینی طور پر ہمارے پاس موجود ہے کہ یہ نص قطعی ہے۔ پورا قرآن پاک قطعی الثبوت ہے۔ اور احادیث متواترہ اور سنن ثابتہ قطعی الثبوت ہیں۔ تواتر کی پانچوں قسموں کے ساتھ ان کے ثابت ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس کے علاوہ جو احادیث ہیں جو خبر واحد ہیں وہ ظنی الثبوت ہیں۔ یعنی اس بات کا اگر ایک فی ہزار بھی امکان ہے کہ بیان کرنے میں کسی سے کوئی بھول چوک ہوگئی ہو، تو قطعیت ختم ہوگئی اور ظنیت آگئی۔ تو کچھ احادیث ظنی الثبوت ہیں اور کچھ احادیث اور پورا قرآن مجید قطعی الثبوت ہے۔

اس کے بعد یہ جو ساری احادیث اور آیات قرآن ہیں، ان دونوں قسموں کے ساتھ ملا کر ان کے معانی اور مطالب میں کچھ آیات اور احادیث ہیں جن کے معانی اور مطالب قطعی ہیں اور یقینی ہیں۔ قرآن مجید میں ہے کہ اهدنا الصراط المستقيم، ہر ایک کو پتہ ہے کہ صراط مستقیم سے کیا مراد ہے۔ شریعت کا بتایا ہوا راستہ صراط مستقیم ہے۔ اس میں کوئی دو راستے مراد نہیں ہو سکتے

۔اگرکوئی کہے کہ جدّہ سے مکہ کو جو سڑک جاتی ہے وہ صراط مستقیم ہے، تو یہ گمراہی ہوگی، اس لئے کہ سب کو پتہ ہے کہ صراط مستقیم کیا ہے۔اسی طرح احادیث میں، مثلاً ان الشیطان یحضر احدکم ، کہ شیطان تم میں سے ہرایک کے پاس جاتا ہے اور گمراہ کرتا ہے۔شیطان سے کیا مراد ہے ہرایک کو معلوم ہے۔اگرکوئی کہے کہ نہیں شیطان سے مرادتو فلاں آدمی ہے جو امریکہ یا فلاں ملک میں بیٹھا ہوا ہے،تو یہ غلط ہوگا۔سب کو پتہ ہے کہ شیطان سے کیا مراد ہے۔یہ جو دلالت ہے، یہ قطعی کہلاتی ہے۔اس لئے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ شیطان اور صراط مستقیم سے کیا مراد ہے۔اس میں کوئی دوسری رائے نہیں ہوسکتی۔جو دوسری رائے پیش کرے گا وہ گمراہی پھیلائے گا اور غلط کرے گا۔لیکن کچھ آیات قرآنی اور احادیث ایسی ہیں کہ جن کے ایک سے زائد مفہوم نکل سکتے ہیں۔مثلاً الماأ الکثیر لاینجس ،زیادہ پانی ناپاک نہیں ہوتا۔اب ایک مطلب یہ ہے کہ اتنا بڑا تالاب ہو جتنا یہ کمرہ ہے، دوسرا مطلب یہ ہے کہ دو بڑے مٹکے مراد ہیں، ایک مطلب یہ کہ اتنا زیادہ پانی ہو جتنا راول ڈیم میں بھرا ہوا ہے۔یہ سارے مفہوم ممکن ہیں، لیکن ان میں سے کوئی ایک مفہوم قطعی نہیں ہے۔آپ کہیں کہ میرا بیان کردہ یہ ایک سو فیصد درست ہے اور باقی سب غلط ہیں تو ایسا نہیں ہے۔یہ بھی صحیح ہوسکتا ہے، وہ بھی صحیح ہوسکتا ہے۔اس طرح کے مفہوم کو ظنی الثبوت کہتے ہیں۔

قرآن پاک میں کئی جگہ ایسے الفاظ آئے ہیں کہ ایک مفسر نے اس کا ایک مطلب لیا ہے، اور دوسرے نے دوسرا مفہوم سمجھا، اس لئے کہ قرآن پاک کے الفاظ میں دونوں کی گنجائش ہے۔یہ ظنی الثبوت ہے۔ اس لئے کسی ایک مفہوم کے بارے میں قطعیت کا وہ معیار اختیار نہیں کیا جاسکتا جو مثلاً صراط مستقیم کے بارے میں ہے، جو مثلاً صلوٰۃ، زکوٰۃ اور حج کے بارے میں ہے۔ تو یہ چیزیں ظنی الثبوت کہلاتی ہیں۔تو نصوص کی چار قسمیں ہیں۔سب سے اونچا درجہ ان نصوص کا ہے جو قطعی الدلالت اور قطعی الثبوت دونوں ہیں۔دوسرا درجہ وہ ہے جو قطعی الثبوت اور ظنی الدلالت ہیں۔تیسرا درجہ ان کا ہے جو ظنی الثبوت اور قطعی الدلالت ہے اور آخری درجہ اس نص کا ہے جو ظنی الدلالت ہیں اور ظنی الثبوت ہے۔

وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العلمین

☆☆☆☆☆☆☆

پانچواں خطبہ

علم اِسناد و رِجال

جمعۃ المبارک، 10 اکتوبر 2003

علم اِسناد و رِجال

آج کی گفتگو کا عنوان ہے علم اِسناد اور علم رِجال۔ ان دونوں کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ اسناد سے مراد ہے کسی حدیث کی سند بیان کرنا۔ جبکہ سند سے مراد ہے راویوں کا وہ سلسلہ جو حدیث کے ابتدائی راوی یا جامع لے کر رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی تک پہنچتا ہے۔ راوی کون لوگ ہوں، ان کا علمی درجہ کیا ہو، ان کی ذہنی اور فکری صلاحیت کیا ہو، اس کی جو شرائط ہیں ان پر کل کسی قدر تفصیل سے اظہار خیال ہوا ہے۔ لیکن ابھی یہ گفتگو باقی ہے کہ راویوں کے حالات جمع کرنے کا کام کب سے شروع ہوا، کس طرح یہ حالات جمع کئے گئے، اور کسی راوی کے قابل قبول یا نا قابل قبول یا ضابط یا عدم ضابط ہونے کا فیصلہ کس بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ یہ وہ علم ہے جس کو علم اسماء الرجال یا علم رجال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

علم اسناد اس وقت تک صحیح طور پر سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک علم رجال یا اسماء الرجال کی تفصیلات سامنے نہ ہوں۔ علم حدیث میں یہ مشکل ترین علوم وفنون میں شامل ہے۔ علم درایت میں علل کا موضوع سب سے مشکل ہے اور علم روایت میں رجال کا موضوع سب سے مشکل ہے۔ رجال سے متعلق دو پہلو زیر بحث آتے ہیں۔ ایک معاملہ خود رجال کے بارے میں معلومات، رجال کی شخصیت اور کردار کے بارے میں تفصیلات سے متعلق ہے، جس پر آج گفتگو ہوگی۔ رجال کا دوسرا پہلو، کسی راوی حدیث کے قابل قبول یا نا قابل قبول ہونے کا فیصلہ، اس کے اصول اور قواعد اور ان اصول وقواعد کی روشنی میں بالآخر کسی راوی کے قابل قبول یا نا قابل قبول ہونے کا حتمی فیصلہ جس فن کی روشنی میں کیا جاتا ہے، اس فن کو علم جرح وتعدیل کہتے ہیں۔ اس پر گفتگو کل ہوگی۔

ابتدا میں جب صحابہ کرام کا زمانہ تھا تو نہ روایت کی ان تفصیلی قواعد وضوابط کی ضرورت تھی نہ اسناد کی ضرورت تھی۔ صحابہ کرام نے جس اہتمام اور جس محبت سے رسول اللہ ﷺ کے ارشادات، اقوال وافعال اور آپ کے حالات کو جمع کیا، یاد رکھا اور محفوظ کیا، وہ ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ خود صحابہ کرام ایک دوسرے سے کسب فیض کیا کرتے تھے اور معلومات جمع کیا کرتے تھے۔

صحابہ کرام اور سند کا اہتمام

حضرت عبداللہ بن عباسؓ، جو صحابہ میں علم وفضل میں بڑا اونچا مقام رکھتے ہیں، انہوں نے اپنی زندگی کے آخری تین سالوں میں رسول اللہ ﷺ سے براہ راست کسب فیض کیا۔ جب حضورؐ دنیا سے تشریف لے گئے تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی عمر تقریباً تیرہ سال تھی۔ انہوں نے اپنی عمر کے بقیہ کافی سال کبارِ صحابہ سے کسب فیض میں گزارے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے کسب فیض کے انداز سے یہ پتہ چلایا جاسکتا ہے کہ صحابہ کرام کا اسلوب اور رنگ ڈھنگ کیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو جب پتہ چلتا کہ کسی خاص صحابیؓ کے پاس کوئی حدیث یا رسول اللہ ﷺ کا کوئی ارشاد گرامی ہے تو وہ ان صحابی رسول کے دولت خانے پر حاضر ہوتے۔ ایک مرتبہ وہ ایک انصاری صحابیؓ کے مکان پر پہنچے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اندر سے ملازمہ نے شاید پہچانا نہیں اور اگر پہچانا تو شاید بتانا مناسب نہیں سمجھا اور یہ کہہ دیا کہ وہ اس وقت آرام کر رہے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ ان کی ڈیوڑھی پر بیٹھ گئے۔ گرمی کا موسم تھا، ظاہر ہے ہوا کے تھپیڑے آرہے ہوں گے، ان کو اس میں نیند آگئی اور وہ اس گرمی میں سو گئے۔ چہرے اور لباس پر گرد بھی پڑی۔ جب وہ صحابیؓ عصر کی نماز کے لئے نکلے۔ تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ گھر سے باہر موجود تھے۔ انہوں نے پریشانی سے کہا کہ اے رسول اللہ ﷺ کے بھائی! آپ یہاں تشریف لائے اور مجھے اطلاع نہیں کی۔ آپ حکم دیتے تو میں آپ کے پاس حاضر ہوتا۔ آپؐ نے فرمایا کہ العلم یوتیٰ ولا یاتی، علم کے پاس آیا جاتا ہے علم کسی کے پاس نہیں جاتا۔ یہ صحابہ کرام کا انداز تھا جو صحابہ کرام کے تذکروں اور سوانح سے پتہ چلتا ہے۔

مشہور صحابیؓ حضرت عبادہ بن صامتؓ، جن کے آخری ایام دمشق میں گزر رہے تھے، ان

کو پتہ چلا کہ ایک اور صحابیؓ حضرت عقبہ بن عامر الجہنی، جو رسول اللہ ﷺ کے خاص خدام میں شامل رہے، ان کے پاس کوئی خاص حدیث ہے، جو پہلے سے حضرت عبادہ بن صامت کے پاس پہنچ چکی تھی، لیکن وہ اس کو کنفرم کرنا چاہتے تھے۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر ایک قافلہ کے ساتھ کئی ماہ کی مسافت طے کر کے حضرت عقبہ الجہنی کے پاس پہنچے۔ ان کے مکان پر پہنچے تو شور مچ گیا کہ صحابیٔ رسولؐ حضرت عبادہ بن صامت تشریف لائے ہیں لوگ جمع ہو گئے۔ وہ سیدھے حضرت عقبہ کے مکان پر پہنچے، دروازہ کھٹکٹایا، وہ باہر نکلے، وہیں کھڑے کھڑے سلام دعا کی اور پوچھا کہ اس حدیث کے اصل الفاظ کیا ہیں؟ انہوں نے حدیث کے الفاظ سنائے، جو ان کی یادداشت کے مطابق تھے تو انہوں نے کہا کہ الحمدللہ مجھ تک جس ذریعے سے یہ حدیث پہنچی تھی وہ بالکل درست ہے، اب میں جارہا ہوں اور یہ کہہ کر اجازت لی اور رخصت ہو گئے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خود صحابہ کرام نے کس محنت سے اور کس محبت اور احترام سے احادیث رسول کے بارے میں معلومات جمع کرنی شروع کیں۔

جس کو خارجی نقد حدیث کہا جاتا ہے، جس پر کل ذرا تفصیل سے گفتگو ہوئی تھی۔ اس کی اساس علم روایت پر اور علم روایت کی اساس سند پر اور سند کی اساس رجال پر ہے۔ گویا رجال وہ بنیادی مضمون ہے جس کی بنیاد پر اِسناد کا تعین ہوتا ہے اور اسناد کی بنیاد پر کسی حدیث کی خارجی نقد پر بات ہوتی ہے۔ اور خارجی نقد پر بات کرنے کے بعد گویا تحقیق کا ایک پہلو مکمل ہو جاتا ہے اور یہ طے ہو جاتا ہے کہ خارجی وسائل اور نقد کے اعتبار سے اس حدیث کا کیا درجہ ہے۔ یہ ضرورت صحابہ کرام کے دور کے بعد پیش آئی جب صحابہ کرام دنیا سے اٹھ گئے اور بہت تھوڑی تعداد میں رہ گئے۔ کبار تابعین کا زمانہ بھی تقریباً ختم ہو گیا اور صغار تابعین کا زمانہ آ گیا۔ کبار تابعین کے زمانے تک بھی یہ امکان نہیں تھا کہ کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے کوئی کچی بات منسوب کر دے، غلط بات منسوب کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اس کا امکان بہر حال موجود رہتا تھا کہ یادداشت میں کوئی کمزوری آ جائے، کوئی دو احادیث کا مضمون ایک دوسرے میں مل جائے یا ایک حدیث کا مضمون دو الگ الگ مضامین کے طور پر بیان ہو جائے۔ اس طرح کا امکان موجود تھا۔ صحابہ کرام کی حد تک تو اس امکان کی بھی گنجائش نہیں تھی اس لئے کہ ان کے ہاں حدیث رسول کو حاصل کرنے اور محفوظ رکھنے کا جو اہتمام تھا اس کا اندازہ آپ کو ان دو واقعات سے

ہو گیا ہو گا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے جب کوئی پوچھتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا فرمایا تو وہ براہ راست جواب نہیں دیا کرتے تھے، بلکہ اپنی فہم اور دانست کو بیان کر دیا کرتے تھے، اور جواباً یہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ حدیث میں آیا ہے کہ من کذب علیّ متعمداً فالیتبوّا مقعده من النار، جو شخص جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں کرلے۔ اس لئے وہ حتی الامکان حدیث بیان کرنے سے ہی احتراز کیا کرتے تھے، کہ اس میں اگر ایک فی ہزار بھی غلطی کا امکان ہو تو اس وعید کے مستحق نہ بن جائیں۔ ایک مرتبہ ضرورت پڑ گئی اور وہ حدیث کے الفاظ بیان کرنے لگے، تو پریشانی اور گھبراہٹ کے عالم میں کھڑے ہو گئے اور حدیث بیان کرنے کے بعد کہا کہ 'او قریباً من ذالك او شبیهاً من ذالك'۔ تقریباً ایسی بات فرمائی تھی، اس سے ملتی جلتی بات فرمائی تھی یا اس سے مشابہ بات فرمائی تھی اور پھر بہت ہی پریشانی کا اظہار کیا کہ ہوسکتا ہے کہ میری یادداشت میں کوئی کمزوری رہ گئی ہو۔ غرض انتہائی غیر معمولی اہتمام کے ساتھ انہوں نے یہ چیز بیان فرمائی۔

کبار تابعین کا بھی یہی رویہ تھا۔ لیکن جب صغار تابعین کا دور آیا۔ اور یہ زمانہ پہلی صدی ہجری کا نصف دوم ہے، اس وقت اس کا احساس ہونے لگا کہ بعض لوگ احادیث بیان کرنے میں اخلاق اور تقویٰ کا وہ معیار برقرار نہیں رکھ پا رہے ہیں جو معیار صحابہ کرام نے رکھا تھا۔ اس وقت اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ تابعین سے یہ پوچھا جائے کہ آپ نے کس صحابیؓ سے یہ روایت سنی۔ تابعین میں بھی جو کبار تابعین تھے جن کا علم اور تقویٰ غیر معمولی طور پر ضرب المثل تھا ان سے یہ پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ لیکن صغار تابعین سے، جو صحابہ کرام اور حضور ﷺ کے زمانہ سے دور ہونے کی وجہ سے جن کے بارے میں یہ امکان موجود تھا کہ شاید ان کے ہاں مطلوبہ احتیاط برقرار نہ رہے۔ ان سے یہ پوچھا جاتا تھا کہ آپ نے یہ حدیث کس صحابیؓ سے یا کس تابعی سے سنی ہے۔

سند کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟

حضرت سفیان ثوریؒ جن کا شمار صغار تابعین میں ہوتا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ پہلے حدیث کی سند پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، لیکن لما استعمل الروا ۃ الکذب استعملنا

لهم التاریخ'۔ جب حدیث کے راویوں نے غلط بیانیوں سے کام لینا شروع کیا تو ہم نے ان کے لئے تاریخ کا وسیلہ اور تاریخ کا ہتھیار استعمال کرنا شروع کردیا۔ تاریخ کے ہتھیار سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی صاحب کوئی حدیث بیان کرتے تھے۔ وہ زمانہ تابعین یا تبع تابعینؒ کا تھا۔ تو ان سے پوچھا جاتا تھا کہ انہوں نے یہ حدیث کس صحابیؓ سے سنی۔ صحابیؓ کا نام لینے کے بعد وہ یہ تیقن کرتے تھے کہ ان صحابیؓ کی وفات کس سن میں ہوئی، وہ صحابیؓ کس علاقہ میں قیام پذیر تھے۔ اور اس طرح سے یہ اندازہ ہوجاتا تھا کہ بیان کرنے والے نے حدیث صحیح بیان کی ہے یا اس میں کوئی جھول رہ گیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک صاحب نے، جن کا تعلق تبع تابعینؒ سے تھا، انہوں نے کوئی حدیث بیان کی۔ سننے والوں نے پوچھا کہ آپ نے یہ حدیث کس سے سنی ہے؟ انہوں نے بیان کیا کہ فلاں تابعی سے سنی ہے۔ پوچھا گیا کہ کس سن میں سنی ہے تو انہوں نے کہا کہ سن ۱۰۸ھ میں سنی ہے۔ پوچھا گیا کہ سن ۱۰۸ھ میں کہاں سنی تھی تو انہوں نے کہا کہ آرمینیا میں سنی تھی۔ سوال ہوا کہ آرمینیا میں وہ کیا کرنے گئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ جہاد کرنے گئے تھے۔ پوچھنے والے بزرگ نے کہا کہ تم غلط بیان کررہے ہو، جھوٹ بول رہے ہو۔ ان تابعی کا انتقال ۱۰۴ھ میں ہوگیا تھا اور ۱۰۸ھ میں وہ زندہ نہیں تھے۔ اور وہ جہاد کرنے کے لئے آرمینیا نہیں بلکہ روم تشریف لے گئے تھے۔ اب یہ معلومات کہ ان تابعی کا انتقال ۱۰۴ھ میں ہوا تھا اور انہوں نے جس جہاد میں حصہ لیا تھا وہ روم کی جہادی مہم تھی، آرمینیا کی نہیں تھی اور ان دونوں کے درمیان تقریباً دوڈھائی ہزار میل کا فرق ہے۔ اس سوال وجواب بلکہ جرح سے یہ پتہ چلا کہ ان صاحب کو بیان کرنے میں یا تو یادداشت میں التباس ہورہا ہے یا کوئی غلط فہمی ہورہی ہے، یا ممکن ہے انہوں نے دانستہ غلط بیانی کی ہو، اس بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اس جھول کی وجہ سے ان کی یہ روایت تبع تابعینؒ نے قبول نہیں کی۔

اس طرح سے جب یہ واقعات کثرت سے پیش آنے شروع ہوئے اور اس کا امکان وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جارہا تھا، تو پھر یہ معلومات جمع کرنے کا عمل شروع ہوا کہ صحابہ کرام کہاں کہاں تشریف لے گئے تھے، کس کس علاقہ میں مقیم رہے، انہوں نے وہاں جاکر کیا کیا اور کس علاقہ میں کس طرح کی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ مثلاً جہاد کا معاملہ تھا۔ اب یہ بات کہ کسی خاص تابعی نے آرمینیا کے جہاد میں حصہ لیا یا روم کے جہاد میں حصہ لیا، اس کا براہ راست علم

حدیث سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن چونکہ روایت میں اس کا حوالہ دیا گیا کہ آرمینیا کے جہاد کے دوران ان سے یہ بات سنی، جب کہ انہوں نے آرمینیا میں جہاد نہیں کیا تھا۔ اس سے یہ معاملہ واضح ہوگیا، کہ کم سے کم اس تابعی کی حد تک یہ تیقن ہوگیا کہ ان کے ذریعے سے یہ روایت نہیں آئی، کسی اور کے ذریعے سے آئی ہوگی۔

اس طرح سے علم حدیث میں ایک نئے شعبہ کا آغاز ہوا جس کو علم اسناد بھی کہتے ہیں اور علم اسناد کی بنیاد چونکہ سند پر ہے اور سند میں راویوں کا تذکرہ ہوتا ہے، راویوں کے حالات جمع کرنے کو علم رجال کہا گیا۔ علم رجال سے یہ نہ سمجھئے گا کہ اس سے صرف مرد مراد ہیں۔ یہ صرف ایک اصطلاح ہے اور میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ لامشاحۃ فی الاصطلاح، اصطلاح میں کوئی اختلاف نہیں۔ علم رجال میں خواتین کا بھی تذکرہ ہوتا ہے۔ علم رجال کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں خواتین راویوں کے تذکرے نہ ہوں۔ اس لئے رجال کے لفظ سے کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے۔ اس میں ان تمام روایوں اور راویات کا تذکرہ ہوتا ہے جنہوں نے علم حدیث کی روایت کی ہے۔ جیسے جیسے علم حدیث، روایات اور رجال کا دائرہ بڑھتا گیا، علم حدیث میں اختصاص (specialization) بھی پیدا ہوتا گیا۔ کچھ لوگ وہ تھے جو رجال کے فن میں زیادہ ماہر تھے۔ پھر رجال سے متعلقہ علوم وفنون جن میں جرح وتعدیل بھی ہے جس پر آگے چل کر بات ہوگی، کچھ لوگ اس کے متخصص ہوئے، کچھ لوگ علم درایت کے متخصص ہوئے کہ حدیث کی داخلی شہادت سے اندازہ لگائیں کہ حدیث کی داخلی شہادت سے اس کے کمزور ہونے یا نہ ہونے کا پتہ چلتا ہے یا نہیں چلتا۔ کچھ حضرات تھے جو خارجی نقد وروایت اور رجال میں زیادہ مشہور تھے، کچھ حضرات تھے جو داخلی نقد اور درایت میں زیادہ مشہور تھے۔ یعنی حدیث کی داخلی شہادت اور داخلی مطالعہ نقد میں، کچھ حضرات تھے جو دونوں میں زیادہ مشہور تھے۔ جو دونوں میں زیادہ مشہور تھے ان میں حضرت امام مالکؒ کا نام نامی بھی شامل ہے۔ جو حضرات داخلی نقد ودرایت میں زیادہ مشہور تھے ان میں امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا نام زیادہ مشہور ہے۔ جو نقل وروایت میں مشہور ہیں ان میں محدثین کی بڑی تعداد شامل ہے۔ لیکن محدثین میں ایسے حضرات بھی شامل تھے مثلاً امام بخاری، امام ترمذی، جو دونوں میدانوں کے شہسوار تھے۔ جو روایت اور رجال کے بھی ماہر تھے اور نقد ودرایت کے بھی ماہر تھے۔ حدیث کی داخلی شہادت سے بھی ان کو بہت کچھ اندازہ ہو جایا کرتا تھا۔

رجال اور سند کی ضرورت پیش آنے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ جہاں تک رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کا تعلق ہے صحابہ کرام اس کی روایت باللفظ کیا کرتے تھے۔ جو بات رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمائی اس کو اسی طرح یاد فرماتے تھے۔ اسی طرح لکھتے تھے اور آپس میں اپنے تحریری ذخائر کا ایک دوسرے سے تبادلہ اور تقابل کرتے رہتے تھے اور اپنی یادداشتوں کو ایک دوسرے سے چیک بھی کروایا کرتے تھے۔ صحابہ کرام کی یادداشت تک تو یہ التزام موجود تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کی روایت باللفظ ہو۔ لیکن جو معاملات رسول اللہ ﷺ کے عمل یا سنت تقریری سے تعلق رکھتے تھے، کہ حضورؐ کے سامنے کوئی کام ہوا اور آپ نے اس کی اجازت دے دی یا منع نہیں فرمایا، اس کی روایت ہر صحابیؓ اپنے الفاظ میں کیا کرتے تھے۔ گویا ایک واقعہ کی تعبیریں مختلف صحابہ کرام نے مختلف انداز سے کیں۔ جس نے جس طرح سے دیکھا اور سمجھا اور جس پہلو کو زیادہ اہم سمجھا اس پہلو کو بیان فرما دیا۔

جب یہ چیز تابعین تک پہنچی تو انہوں نے اس بات کا اہتمام کیا کہ جس صحابیؓ نے جو چیز جن الفاظ میں بیان کی اس کو انہی الفاظ میں آگے تک پہنچایا جائے اور اس کے الفاظ میں ردوبدل نہ کی جائے۔ روایت باللفظ کا یہ سلسلہ اہتمام کے ساتھ جاری رہا۔ اس میں اس حدیث نبویؐ سے بھی صحابہ کرام کو مدد ملی جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ 'نضر الله امرأ، اللہ تعالیٰ اس شخص کو سرسبز و شاداب رکھے، سمع مقالتی، جس نے میری کوئی بات سنی، فاداها کما سمعها، اور جیسا اس کو سنا تھا ویسے ہی اس کو روایت کر دیا۔ اس سے روایت باللفظ کی اہمیت واضح ہوتی ہے کہ اگر جیسا سنا تھا ویسا ہی ادا کرو گے تو تروتازگی کی یہ بشارت ملے گی اور اگر اس کے الفاظ یا مفہوم میں کوئی تبدیلی ہوگئی تو بظاہر مفہوم یہ نکلتا ہے کہ یہ بشارت اس طرح سے حاصل نہیں ہوگی۔

احادیث کی روایت باللفظ کا اہتمام

رسول اللہ ﷺ جب صحابہ کرام کو بذات خود کوئی چیز بتاتے یا پڑھاتے یا یاد کروایا کرتے تھے تو اس بات کا اہتمام کرتے تھے کہ جو الفاظ آپ نے یاد کروائے ہوں، صحابہ کرام انہی الفاظ میں اس کو یاد کریں۔ چنانچہ حضرت براء بن عازبؓ کا مشہور واقعہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک

مرتبہ ان سے پوچھا کہ اے برا! جب رات کو سونے کے لئے لیٹتے ہو تو کوئی دعا کرتے ہو؟ انہوںؓ نے فرمایا کہ یارسول اللہ آپ بتائیں، جو آپ فرمائیں گے میں وہ دعا پڑھا کروں گا۔ اس پر حضورؐ نے ان کو یہ دعاء سکھائی جو مشہور ہے کہ 'اللھم اسلمت وجھی الیك وفوّضت امری الیك والجات ظھری الیك رغبتی و رھبتی الیك، لاملجیٰ ولا منجی منك الا الیك امنت بکتابك الذی انزلت و نبیك الذی ارسلتَ' جب حضرت براء بن عازبؓ نے دوبارہ یہ دعا رسول اللہ ﷺ کو سنائی تو آپؐ نے نبیك کی بجائے رسولك الذی ارسلت کہا تو رسول اللہ ﷺ نے مزاحاً ہاتھ سے مُکّا بنا کر اشارہ کیا اور فرمایا کہ میں نے و نبیك الذی ارسلت کہا تھا۔ تو حضرت براء بن عازبؓ کو یہ ہمیشہ یاد رہا اور وہ انتہائی محبت سے بیان کیا کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہاں مُکّہ سے اشارہ کر کے بتایا کہ ونبیک الذی ارسلت۔ اس سے اس بات کی بھی تائید ہوتی ہے کہ جو بات حضورؐ نے ارشاد فرمائی ہو اس کو انہی الفاظ میں بیان کرنا چاہئے اس کا ہم معنی کوئی لفظ استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ نبی اور رسول قریب قریب ایک ہی معنی کے حامل ہیں لیکن رسول ﷺ نے یہاں نبی کا لفظ استعمال فرمایا تھا اسی کی آپ نے تاکید فرمائی کہ اسی لفظ کو استعمال کیا جائے۔ چنانچہ صحابہ کرام کے زمانے سے اس کا التزام رہا اور رسول اللہ ﷺ کے قولی ارشادات تو تقریباً ۹۹ فیصد روایت باللفظ کے ساتھ منقول ہیں۔ البتہ حضورؐ کے اعمال، تقریرات یا افعال کا معاملہ ذرا مختلف ہے، جن کو ہر صحابیؓ نے اپنے انداز میں بیان کیا، جس صحابیؓ نے جس طرح دیکھا اور جس طرح سے مناسب سمجھا بیان کیا۔ پھر تابعین نے صحابہ کرام کی اس روایت کو انہی کے الفاظ میں بیان کیا اور ہر صحابیؓ کی روایت ان کے اپنے مقدس الفاظ کے ساتھ کتب حدیث میں موجود ہے۔

اس بات کی تائید اس مثال سے بھی ہوتی ہے کہ ایک حدیث میں کوئی صحابیؓ ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے دو قبیلوں کا ذکر کرتے ہیں، واسلم وغفار ،قبیلہ اسلم اور قبیلہ غفار نے یہ کیا، ان کے ساتھ یہ معاملہ ہوا یا کسی بھی سیاق وسباق میں ان کا ذکر ہے۔ اب جن تابعی نے ان سے سنا ان کو یہ التباس ہوا کہ صحابی رسول نے غفار کا لفظ پہلے بولا تھا یا اسلم کا پہلے بولا تھا۔ حالانکہ اس بات کی اتنی اہمیت نہیں ہے۔ اس سے معنی میں، مفہوم میں، پیغام میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن وہ تابعی جب بیان کرتے تھے تو یہ وضاحت ضرور کرتے تھے کہ انہوں نے غفار اور اسلم یا اسلم اور غفار

فرمایا تھا۔ یہ میں بھول گیا ہوں کہ پہلے کیا فرمایا تھا اور ہر روایت میں یہ ذکر آتا ہے کہ وہ تابعی بہت اہتمام سے اس بات کی صراحت کرتے تھے کہ یہ ترتیب میرے ذہن میں نہیں رہی، انہوںؒ نے ان میں سے کوئی ایک بات فرمائی تھی۔ اس کی مثالیں کتب حدیث میں بہت ملتی ہیں۔

اگر آپ صحیح بخاری، صحیح مسلم یا حدیث کی کسی بھی اور کتاب کی ورق گردانی کریں، تو کہیں نہ کہیں آپ کو ایسی مثالیں ضرور ملیں گی۔ موجودہ نسخوں میں تو بریکٹس میں خوبصورت طریقے سے اس کی نشاندہی کر دی گئی ہے، لیکن پرانے نسخوں میں بھی لکھا ہوا ہے اور یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ کس راوی سے ہے اور یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ کس راوی سے جلدی میں نقل کرنے کی وجہ سے یہ بھول چوک ہوئی۔

آپ سے میں نے عرض کیا تھا کہ حضرت عبداللہ بن مبارک جب حدیث پڑھایا کرتے تھے تو سننے کے لئے اتنے لوگ جمع ہوتے تھے کہ ایک بار ۶۳ ہزار دواتیں استعمال ہوئیں۔ وہاں جب کئی کئی سو مستملی کسی حدیث کو زور سے بولتے تھے تو ایسا ہو سکتا ہے کہ ہزاروں لکھنے والوں میں سے کسی ایک کے لکھنے میں ایک آدھ لفظ آگے پیچھے ہو جائے۔ کسی نے غِفار کا لفظ پہلے لکھ دیا اور اسلم کا بعد میں لکھ دیا۔ کسی نے اسلم کا پہلے لکھ دیا غفار کا بعد میں لکھ دیا۔ ساری احتیاط کے باوجود اس کا امکان رہ سکتا تھا اس لئے تابعین اور تبع تابعینؒ اس فرق کی وضاحت کر دیا کرتے تھے۔

یہاں تک کہ روایت باللفظ کا اس قدر اہتمام ہوتا تھا کہ آپ حدیث کی کوئی کتاب کھول کر سندیں پڑھنا شروع کر دیں تو اس طرح کی مثالیں آپ کو مل جائیں گی کہ محدث حدیث بیان کرتا ہے اور مثال کے طور پر کہتا ہے کہ 'حدثني هنّاد بن السري قال حدثني سفيان قال حدثني فلان ......'۔ اب ھنّاد نے کہا تھا کہ حدثنی سفیان۔ اور یہ تعین نہیں کیا تھا کہ سفیان ثوری مراد ہیں یا سفیان بن عیینہ مراد ہیں۔ اب بعد والے جو بیان کریں گے وہ اپنی طرف سے نہیں کہیں گے کہ سفیان ثوری۔ یہ نہیں کہیں گے کہ حدثني هناد قال حدثني سفيان الثوري اس لئے کہ ھناد نے سفیان ثوری نہیں کہا تھا صرف سفیان کہا تھا۔ اب بعد والے کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ سفیان ثوری یا ابن عیینہ کا لفظ لگا دے اور وہ ھناد سے منسوب ہو جائے۔ ھناد نے جب بولا تھا تو اتنا ہی بولا تھا۔ تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ حدثني هناد قال حدثني سفيان، يقول الترمذي

وهو ابن عيينه ۔یعنی ترمذی کہتا ہے کہ وہ ابن عیینہ ہیں یا ثوری ہیں، تا کہ واضح ہو جائے کہ یہ وضاحت میرے استاد ھناد کی زبان مبارک سے نہیں ہے بلکہ میری زبان سے ہے۔ یہ گویا ایک مثال ہے کہ روایت باللفظ میں کس قدر باریکی اور نزاکت کا اہتمام رکھا گیا۔

کیا رِوایت بالمعنی جائز ہے؟

کچھ وقت گزرنے کے بعد محدثین کے درمیان یہ سوال پیدا ہوا کہ روایت باللفظ سے ہٹ کر اگر روایت بالمعنی کی جائے تو جائز ہے یا نہیں؟ لیکن روایت بالمعنی کا سوال تدوین کے سلسلہ میں نہیں پیدا ہوا تھا۔ تدوین کی حد تک بخاری، مسلم، ترمذی اور باقی سب کتابوں میں جب روایتیں جمع کی گئیں تو جس طرح سے آئی تھیں اسی طرح سے لکھی گئیں۔ روایت باللفظ ہی کے انداز میں جمع ہوئیں۔

سوال وہاں پیدا ہوا جہاں کسی مجلس درس یا مجلس وعظ میں یا تبلیغ دعوت کے کسی عمل میں کوئی حدیث بیان کرنے کی ضرورت پیش آئے تو کیا وہاں بھی روایت باللفظ کی پابندی ضروری ہے یا روایت بالمعنی بھی ہو سکتی ہے۔ یہ سوال وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اہمیت اختیار کرنے لگا اور ہم ان تمام محدثین اور علماء کرام کے شکرگزار ہیں جنہوں نے یہ سوال اٹھایا اور اس معاملہ میں یہ گنجائش پیدا کی۔ اگر وہ حضرات روایت بالمعنی کی یہ گنجائش پیدا نہ کرتے تو آج دنیائے اسلام کے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کے لئے حدیث رسول کا حوالہ دینا ناممکن ہو جاتا۔ اس لئے کہ ہم میں سے کتنے ہیں جو حدیث کے حافظ ہیں اور ایک ایک لفظ زیر زبر کی پابندی کے ساتھ اور ایک ایک شوشے کی پابندی کے ساتھ اسی طرح بیان کر سکتے ہیں جس طرح کی میں نے مثالیں دیں کہ وہ استاد کے نام کا اضافہ بھی ان سے منسوب نہیں کرتے۔ ایسا ہوتا تو پھر لوگ حدیث کا حوالہ دینا چھوڑ دیتے اور ہمارے لئے اس سے استفادہ کرنا عملاً مشکل ہو جاتا بلکہ ناممکن ہو جاتا۔ اس لئے محدثین نے یہ سوال اٹھایا کہ کیا روایت بالمعنی جائز ہے؟ کچھ لوگوں کا پھر بھی یہی خیال رہا کہ روایت بالمعنی کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے۔ بلکہ جو لوگ بیان کرنا چاہیں وہ پہلے یاد کریں پھر اس کے بعد بیان کریں۔ لیکن علماء کرام کی اکثریت نے بعد کے سالوں میں تیسری، چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کے سالوں میں کچھ شرائط کے ساتھ روایت بالمعنی کی اجازت دے دی۔

ایک شرط تو یہ ہے کہ جو راوی اس کو روایت کرے وہ صرف ونحو اور علوم لغت کا عالم ہو۔ یعنی جب وہ روایت بالمعنی کرے تو اس کو پتہ ہو کہ جس لفظ کو وہ جن معنوں میں بیان کر رہا ہے وہ لفظ ان معنی میں استعمال ہوتا ہے کہ نہیں۔ اگر وہ اس معنی ہی میں نہ ہو اور بیان کرنے والا صرف و لغت کا عالم نہ ہو تو وہ کچھ کا کچھ بیان کر دے گا۔

ایک صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے ایک حدیث کا ترجمہ پڑھا 'من امّ قوماً فلیخفف' کہ جو شخص کسی کی امامت کرے وہ ہلکی نماز پڑھائے۔ تو یہ ترجمہ لکھا ہوا دیکھ کر وہ سمجھے کہ شاید ہل کے پڑھائے اور نماز میں حرکت کرتا رہے۔ چنانچہ جب وہ امامت کرتے تو ہلتے رہتے تھے۔ کسی نے پوچھا کہ آپ نماز پڑھاتے ہوئے ہلتے کیوں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے۔ پوچھا کہ حدیث میں کہاں لکھا ہوا ہے کہ نماز میں ہلا کرو۔ ان امام صاحب نے ترجمہ لا کر دکھایا تو لکھا ہوا تھا کہ نماز ہلکے پڑھائے۔ انہوں نے ہَلکے کو ہِلکے پڑھا۔ یعنی اگر آدمی صرف ونحو اور لغت کا عالم نہ ہو تو اس طرح کی غلطیاں ہو سکتی ہیں۔

دوسری شرط یہ ہے کہ وہ الفاظ جو احادیث میں استعمال ہوئے ہیں اور ان کا جو معنی اور مفہوم رسول اللہ ﷺ کا مقصود تھا اس سے واقف ہو۔ اور دونوں الفاظ کے درمیان جو تفاوت ہے یعنی جو الفاظ وہ استعمال کر رہا ہے اور جو اصل میں استعمال ہوئے ہیں ان دونوں کے درمیان فرق سے واقف ہو۔ اور حدیث رسول کو غلطی کے بغیر بیان کرنے کی استطاعت رکھتا ہو۔ یہ شرائط تو ہر اس شخص کے لئے ہیں جو حدیث کا مفہوم بیان کرے گا۔

امام مالکؒ کی ایک بات مجھے بہت پسند آئی ہے۔ امام مالکؒ کا ارشاد یہ ہے کہ احادیث مرفوعہ میں تو روایت بالمعنی جائز نہیں ہے۔ یعنی کوئی چیز جو رسول اللہ ﷺ سے منسوب ہے اس میں تو روایت بالمعنی جائز نہیں ہے اور وہ راویت باللفظ ہی ہونی چاہئے۔ لیکن جو بقیہ احادیث ہیں جن میں صحابہ کرام میں سے کسی کی رائے یا کسی کا مشاہدہ یا کسی کا فتویٰ یا کسی کی روایت بیان ہوئی ہے وہ روایت بالمعنیٰ ہو سکتی ہے کیونکہ اس کے بارے میں یہ وعید نہیں آئی ہے کہ من کذب علی متعمدا فالیتبوأ مقعده من النار۔ یہ حدیث صرف حضورؐ کے ارشادات کے بارے میں آئی ہے۔ یہ امام مالکؒ کی رائے ہے جو بہت وزنی معلوم ہوتی ہے۔

اس سے ملتی جلتی ایک دوسری رائے یہ ہے کہ روایت بالمعنی صحابیؓ کے لئے تو جائز تھی

لیکن غیر صحابیؓ کے لئے جائز نہیں ہے۔اب اگر صحابہ کے لئے جائز تھی اور غیر صحابہ کے لئے جائز نہیں تو پھر ہمارے لئے تو پھر یہ اجازت بے کار ہے اور ہمارے لئے اس اجازت کا ہونا یا نہ ہونا بے معنی ہے۔ یہ تو ایک نظری یا تھیوریٹکل بات ہوگئی۔لیکن جو عام محدثین ہیں ان کا یہی کہنا ہے کہ روایت بالمعنی ان شرائط کے ساتھ جائز ہے اور بعد میں لوگوں نے روایت بالمعنی ہی کے طریقے کو اختیار کیا۔آج کل آپ نے سنا ہوگا لوگ اپنی گفتگو میں ،تقریروں اور مضامین میں کثرت سے احادیث کا حوالہ مفہوم کے ساتھ دیتے ہیں۔لیکن کوشش کرنی چاہئے کہ مفہوم کا حوالہ صحیح ہو اور کسی حدیث کا حوالہ بغیر تحقیق کے نہ دیا جائے۔بعض اوقات گفتگو کے دوران زور بیان میں ایک چیز زبان پر آجاتی ہے اور آدمی اس کو حدیث کہہ کر بیان کر دیتا ہے اور بعد میں یاد آجاتا ہے یا تحقیق سے پتہ چل جاتا ہے کہ حدیث نہیں تھی بلکہ کسی اور کا قول تھا ایسا کرنا احتیاط کے خلاف ہے۔ یہ چیز بڑی ذمہ داری کا تقاضا کرتی ہے اور اس معاملہ میں احتیاط کرنی چاہئے۔

علم روایت میں، جس میں روایت باللفظ اصل ہے اور روایت بالمعنی کی بعد میں اجازت دی گئی ہے، یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود متعدد مواقع پر اپنے ارشادات کو دوسروں تک پہنچانے کا حکم دیا۔ایک جگہ آپؐ نے فرمایا کہ بلغوا عنی و لو آیة کہ اگر میری طرف سے ایک آیت بھی تم تک پہنچی ہے تو اس کو دوسروں تک پہنچاؤ۔اب جس شخص کے علم میں بھی رسول اللہ ﷺ کے ارشادات یا سنت کا علم آیا ہے وہ مکلّف ہے کہ جہاں تک اس کے بس میں ہو اور جہاں تک اس کے لئے آسان ہو اسے دوسروں تک پہنچائے۔اسی طرح خطبہ حجۃ الوداع دینے کے بعد آپ نے فرمایا کہ 'اَلا ھَلْ بَلَّغْتُ؟کیا میں نے پہنچا دیا،لوگوں نے جواب دیا 'بلی'،ہاں آپ نے پہنچا دیا۔اس پر آپؐ نے فرمایا کہ فلیبلغ الشاھد الغائب' کہ جو موجود ہے وہ یہ بات ان تک پہنچا دے جو موجود نہیں ہیں۔اس لئے بہت بڑی تعداد میں ان صحابہ کرام نے خطبہ حجۃ الوداع کی روایت کی اور انہیں ان صحابہ تک پہنچایا جو وہاں موجود نہیں تھے اور ان تابعین تک جو بعد میں آئے کیونکہ فلیبلغ الشاھد الغائب کا اطلاق علماء لغت کے نزدیک ہر اس شخص پر ہوتا ہے جس تک یہ حدیث پہنچے۔اس لئے جس مجلس میں یہ حدیث بیان کی جائے گی تو جو شخص وہاں موجود ہوگا وہ شاہد ہوگا اور جو وہاں موجود نہیں ہوگا،وہ غائب ہوگا۔تو موجود رہنے والا موجود نہ رہنے والے تک پہنچائے۔اور جب کوئی شخص پہنچائے گا تو وہ ایک طرح سے راوی حدیث ہوگا۔

اس کا کردار اور اس کی شخصیت زیر بحث آئیں گے۔ جب زیر بحث آئیں گے تو علم رجال وجود میں آئے گا۔ اس لئے ان احادیث کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ راویوں پر رواۃ کے بارے میں بحث ہو۔ چونکہ رواۃ اور راویان حدیث اس ارشاد نبویؐ پر عمل درآمد کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر راویان حدیث نہ ہوتے تو آج ہم ان ارشادات گرامی سے محروم رہتے اور ان پر عمل نہ کر سکتے۔ راویان حدیث ہی کے وسیلہ سے اور انہی کے واسطہ سے یہ ہدایت اور رہنمائی ہم تک پہنچی ہے۔ اس لئے وہ اس عمل کا ایک لازمی حصہ ہیں۔ اور اس عمل کا حصہ ہونے کی وجہ سے ان کی شخصیت کا مطالعہ بھی علم حدیث ہی کا مطالعہ ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ وہ تمام مسلمان خواتین وحضرات جو روایت حدیث، نقل حدیث، کتابت حدیث، شرح حدیث اور درس حدیث میں مصروف ہیں وہ سب کے سب اس عمل کا حصہ ہیں۔ کہ فلیبلغ الشاهد الغائب پر وہ سب عمل کر رہے ہیں اور فلیبلغ الشاهد الغائب کے حکم پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ وہ راویان حدیث اور علم حدیث کا بھی حصہ بنتے جا رہے ہیں۔

چنانچہ اس طرح سے ایک ایک کر کے یہ نام سامنے آتے رہے اور یہ تحقیق شروع ہوتی گئی۔ سب سے پہلے تحقیق اور راویان حدیث کی چھان بین کا یہ عمل حضرت حسن بصریؒ نے شروع کیا۔ حضرت حسن بصریؒ اور محمد بن سیرین تابعین میں بڑا نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ تین تابعین کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سیّد التابعین ہیں۔ ایک سعید المسیّب، جو حضرت ابو ہریرہؓ کے شاگرد خاص اور داماد تھے اور طویل عرصہ ان کے ساتھ رہے۔ دوسرے حضرت حسن بصریؒ جن کے بارے میں کہا گیا کہ وہ سید التابعین ہیں۔ اور تیسرے حضرت محمد بن سیرین جو تابعین میں بڑا نمایاں مقام رکھتے تھے۔

علم طبقات اور علم رجال

ان موخر الذکر دو حضرات نے، یعنی حسن بصری اور محمد بن سیرین نے رجال کے کام کا آغاز کیا۔ اور ایک طرح سے یہ دونوں حضرات علم رجال کے بانی اور موسس ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے یہ معلومات جمع کیں کہ صحابہ کرام کہاں کہاں تشریف لے گئے۔ اس ضمن میں پہلا کام یہ تھا کہ صحابہ کرام کے بارے میں مکمل معلومات جمع کی جائیں، مشاہیر صحابہ کے بارے میں تو

سب کو معلوم ہے۔ ان کے بارہ میں زیادہ تحقیق کی ضرورت نہیں پڑی۔ لیکن خطبہ حجۃ الوداع میں ایک لاکھ چوبیس یا چالیس ہزار صحابہ کرام موجود تھے، ان کے علاوہ بھی بہت سے صحابہ تھے جو اس موقع پر حج کے لئے تشریف نہیں لائے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کو ہر شخص نہیں جانتا تھا۔ پہلا کام تو یہ تھا کہ صحابہ کرام کے حالات کو جمع کیا جائے اور ان کے تذکروں پر مبنی کتابیں تیار کی جائیں تاکہ پتہ چل جائے کہ کون لوگ صحابیؓ تھے اور کون نہیں تھے۔

لہٰذا سب سے پہلے صحابہ کرام کا تذکرہ کی جمع وتدوین کا کام شروع ہوگیا جن میں بعض کی مثالیں میں ابھی دیتا ہوں، آگے چل کر جب صحابہ کرام مدینہ منورہ سے نکل کر کوفہ، بصرہ، دمشق، مصر اور دیگر مختلف جگہوں میں آباد ہوئے تو اس بات کی بھی ضرورت پیش آئی کہ جو صحابیؓ جہاں جا کر بسے ہیں وہاں جا کر ان کا تذکرہ لکھا جائے۔ چنانچہ ان صحابہ پر الگ الگ کتابیں لکھی گئیں جو کوفہ میں جا کر بسے، جو بصرہ میں جا کر بسے، جو دمشق اور قاہرہ میں جا کر بسے اور اُن صحابہ کے بارے میں ایک کتاب ہماری اردو زبان میں بھی ہے (اور عربی میں بھی) جو سندھ میں آ کر بسے۔ ہندوستان کے ایک بزرگ تھے قاضی اطہر مبارکپوری، انہوں نے ایک کتاب لکھی جس میں انہوں نے ان صحابہ کے حالات لکھے جو سندھ میں تشریف لائے، اور سندھ میں آباد ہوئے اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔ اس طرح سے ہر شہر اور علاقہ کے صحابہ پر الگ الگ کتابیں آگئیں جس کے بعد یہ ممکن نہیں رہا کہ کوئی شخص غلط طور پر یہ دعویٰ کرے کہ فلاں صحابیؓ نے مجھ سے یہ بیان کیا۔ اسی طرح یہ امکان بھی نہیں رہا کہ ایک صاحب صحابیؓ نہ ہوں اور بعد میں یہ دعویٰ کریں کہ میں صحابیؓ ہوں۔ مثال کے طور پر کوئی شخص سمرقند جائے اور یہ دعویٰ کرے کہ میں صحابیؓ رسولؐ ہوں اور حضورؐ نے یہ فرمایا ہے۔ اگرچہ ایسا نہیں ہوا۔ لیکن چونکہ امکان موجود تھا اس لئے اس امکان کا سد باب کرنے کے لئے ان تابعین حضرات نے صحابہ کرام کے تذکرے الگ الگ بھی جمع کئے، شہروار بھی جمع کئے، قبیلہ وار بھی جمع کئے اور مختلف جنگوں کے حساب سے بھی جمع کئے کہ کس جنگ میں کون کون سے صحابیؓ شریک ہوئے۔ تاکہ یہ پتہ چلے کہ کون سے صحابیؓ سمرقند تشریف لے گئے تھے اور کون سے صحابیؓ آرمینیا تشریف لے گئے تھے، تاکہ وہاں اگر کوئی روایت ان کے نام سے آئے تو تحقیق کی جا سکے کہ وہ وہاں تشریف لے بھی گئے تھے یا نہیں۔

ہندوستان میں ایک شخص تھا غالباً جنوبی ہندوستان میں، بمبئی یا حیدرآباد دکن کا رہنے

والا تھا۔ اس کا نام بابا رتن تھا۔ چھٹی صدی ہجری میں تھا اور اس نے طویل عمر پائی تھی۔ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کتنا معمر تھا، لیکن غالباً دوسوا دوسو سال اس کی عمر تھی۔ اس نے دعویٰ کیا کہ میری عمر سات سو سال ہے اور میں رسول ﷺ کے زمانہ میں موجود تھا۔ چنانچہ معجزہ شق القمر کے بعد جب میں نے دیکھا کہ چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے تو میں عرب پہنچا۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ آ چکے تھے۔ میں مدینہ پہنچا، وہاں جا کر مسلمان ہوا اور آپؐ کے پاس تین چار مہینے رہا، پھر آپؐ نے مجھ سے کہا کہ اپنے علاقہ میں جا کر تبلیغ کرو تو میں واپس ہندوستان آ گیا۔ بہت سے لوگوں نے اس کی باتیں مان لیں اور اس کا بہت چرچا ہوا۔ لوگ دور دور سے اس کے پاس آنا شروع ہوئے۔ اس کی خوب پیری مریدی چلی اور بڑی شہرت ہوئی۔ اس پر علماء حدیث کے سامنے سوال پیدا ہوا کہ اس شخص کے دعویٰ کی کیا حیثیت ہے۔ محدثین نے لکھا کہ یہ بالکل جھوٹ ہے، ایسا کوئی آدمی صحابی رسول قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن اس کے نام سے روایات مشہور ہونی شروع ہو گئیں۔ ہمارے برصغیر کے لوگ ویسے بھی بڑے خوش عقیدہ ہوتے ہیں اور مذہب کے نام پر بہت جلد لوگوں کی باتوں میں آ جاتے ہیں۔ علامہ اقبال نے ایک جگہ کہا ہے کہ

تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے
یہ شاخ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد

کہ ہندوستان کے مسلمان تاویل کے پھندے میں بہت جلدی پھنس جاتے ہیں۔ یہ ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک کمزور پہلو ہے۔ لیکن بابا رتن کے علاوہ ایک دوسرے شخص نے بھی ایسا ہی دعویٰ کیا لیکن علماء حدیث نے بڑی صراحت اور قطعیت کے ساتھ کہا کہ دونوں جھوٹے ہیں اور ان دونوں کو دجّال اور کذّاب قرار دیا۔ ان کی کوئی بات نہ سنی جائے۔ چنانچہ بہت جلد وہ فتنہ ختم ہو گیا۔

صحابہ کرامؓ کے بعد جیسے جیسے زمانہ بڑھتا گیا علماء حدیث علم رجال پر معلومات جمع کرتے رہے اور بالآخر پانچویں صدی ہجری تک کی معلومات مکمل طور پر جمع ہو گئیں۔ اس لئے کہ پانچویں صدی ہجری کے بارے میں میں نے عرض کیا تھا کہ امام بیہقی آخری محدث ہیں جن کی وفات ۴۵۸ھ میں ہوئی ہے اور جنہوں نے براہ راست احادیث کی روایت کر کے اپنا مجموعہ مرتب کیا۔ اس کے بعد کے جو مجموعے ہیں وہ براہ راست روایت شدہ مجموعے نہیں ہیں۔ بلکہ سابقہ

مجموعوں کی بنیاد پر مرتب ہونے والے نئے مجموعے ہیں جن کو ثانوی مجموعے کہا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد علم رجال کی اس طرح ضرورت نہیں رہی جیسے روایت حدیث کے ضمن میں پیش آتی تھی۔ لیکن علماء حدیث کے تذکرے ہمیشہ مرتب کئے گئے اس لئے کہ علم حدیث کا درس زبانی بھی ہوا کرتا تھا اور تحریری بھی ہوا کرتا تھا۔ یہ تیقن کرنے کے لئے کہ کس شخص نے کتنے بڑے محدث سے حدیث پڑھی ہے اور صاحب علم کا درجہ اپنے استادوں کے لحاظ سے کیا ہے، یہ جاننے کے لئے محدثین کے تذکرے جمع کئے جاتے تھے۔ اور آج تک جمع کئے جارہے ہیں۔ پندرھویں صدی ہجری کے اوائل اور چودھویں صدی ہجری کے اواخر تک تمام محدثین کے تذکرے مطبوعہ شکل میں موجود ہیں اور ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ علم حدیث کی خدمت کن کن لوگوں نے کی ہے۔ اس میں برصغیر کے محدثین کا تذکرہ غالبًا گیارھویں خطبہ میں ہوگا۔ یہ ساری شخصیات جن کے نام جمع ہوئے، ان کا مطالعہ مسلمانوں نے بھی کیا اور غیر مسلموں نے بھی کیا۔ ایک مشہور مغربی مستشرق ڈاکٹر سپرنگر، جس نے امام ابن حجر عسقلانی کی جو حافظ ابن حجر عسقلانی کے نام سے زیادہ مشہور ہیں، الاصابہ فی تمیز الصحابہ ایڈٹ کی ہے اور اس پر انگریزی زبان میں ایک مقدمہ لکھا ہے۔ اس مقدمہ میں اس نے یہ لکھا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم اس باب میں مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی کہ رجال جیسا فن اس کے ہاں ہو۔ نہ ماضی میں کسی قوم میں ایسا فن ہوا ہے نہ آئندہ اس کا کوئی امکان ہے کہ رجال جیسا فن، جیسا کہ مسلمانوں میں ہے، کسی اور قوم میں وجود میں آئے۔

یہ ایسا علم ہے کہ پانچ چھ لاکھ شخصیات کا تذکرہ ہمارے سامنے آجاتا ہے اور ان پانچ چھ لاکھ شخصیات کی بنیاد پر ہم تیقن کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ کسی شخص نے حضورؐ کے بارے میں جو بیان دیا اس کی تاریخی حیثیت کیا ہے۔

ایک اور انگریز مصنف باس ورتھ نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ علم رجال کی مدد سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی کا ہر گوشہ اور آپؐ کا ہر ارشاد مبارک اور آپ کا ہر فعل روز روشن کی طرح ایسے واضح ہے جیسے کوئی چیز سورج کی روشنی کے سامنے ہوتی ہے اور اس میں کوئی التباس نہیں ہوتا کہ یہ کیا چیز ہے۔ بہرحال یہ وہ چیز ہے جس کا اعتراف غیر مسلموں نے بھی کیا ہے۔

جب رجال پر باقاعدہ کتابیں لکھنے کا کام شروع ہوا تو حسن بصری کے زمانہ میں شروع ہوا لیکن حسن بصری کی لکھی ہوئی کوئی کتاب آج ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ ان کے بعد

جن لوگوں نے لکھا وہ کتابیں ہمارے سامنے ہیں اور ان کی بنیاد پر ہم بتا سکتے ہیں کہ اس کا آغاز کب ہوا۔

طبقات پر اہم کتابیں

سب سے پہلے طبقات ابن سعد کے نام سے بارہ تیرہ جلدوں میں ایک کتاب تیار ہوئی، کوئی ایڈیشن بارہ جلدوں میں ہے، کوئی تیرہ میں اور کوئی چودہ جلدوں میں ہے۔ یہ ایک بڑے مشہور محدث اور مورخ تھے۔ انہوں نے طبقات ابن سعد کے نام سے ایک کتاب لکھی اور اپنے زمانے تک صحابہ سمیت جتنے بھی راویان حدیث تھے، ان سب کے حالات جمع کئے۔ تبرکاً پہلی دو جلدیں سیرت پر ہیں۔ انہوں نے سوچا کہ جس شخصیت کے راویوں کے حالات بیان کرنے ہیں پہلے اس شخصیت کا تذکرہ ہونا چاہئے۔ اس لئے پہلی دو جلدوں میں انہوں نے سیرت بیان کی اور بقیہ دس یا بارہ یا چودہ جتنی بھی جلدیں ہیں ان میں انہوں نے صحابہ کرام سے لے کر اپنے زمانہ تک کے تمام راویوں کے حالات بیان کئے۔

میں آپ سے یہ بھی عرض کردوں کہ محدثین کی نظر میں ابن سعد کا درجہ اتنا زیادہ اونچا نہیں ہے۔ اس لئے نہیں کہ ابن سعد پر کوئی اعتراض تھا، لیکن یہ بات میں اس لئے عرض کرنا چاہ رہا ہوں کہ محدثین کے مشکل اور سخت معیار کا اندازہ ہو جائے جو انہوں نے راویوں کے لئے رکھا۔ وہ ابن سعد کو کم معیار کا اس لئے قرار دیتے ہیں کہ ابن سعد واقدی کے شاگرد تھے اور واقدی محدثین کی نظر میں قابل قبول نہیں تھے۔ کوئی محدث واقدی کی روایت قبول نہیں کرتا۔ کسی محدث نے، نہ بخاری نے، نہ مسلم نے، نہ ترمذی نے، نہ ابوداؤد نے، کسی نے ان کی روایت قبول نہیں کی۔

مجھے حیرت ہوتی تھی کہ جب ہم واقدی کی کتابیں پڑھتے ہیں تو وہ بڑے صاحب علم، فقیہ اور متدیّن انسان معلوم ہوتے ہیں تو آخر یہ محدثین ان کی روایت کیوں قبول نہیں کرتے؟ ان کا کردار کس درجہ کا تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی جتنی آمدنی تھی وہ ساری آمدنی اور اپنے وقت کا سارا حصہ مطالعہ اور علم کے حصول میں لگایا کرتے تھے۔ علم حدیث کے بارے میں معلومات اور سیرت کے واقعات جمع کرنا ان کے مشاغل تھے۔ سیرت کے بڑے

امام تھے۔ مغازی یعنی حضورؐ کے غزوات کے واقعات جمع کرتے تھے۔ ہر اس قبیلہ میں جاتے تھے جس نے کسی جنگ میں حصہ لیا ہو یا اس قبیلہ کے کسی آدمی نے حضورؐ کے ساتھ مل کر کسی جنگ میں شرکت کی ہو اور وہاں سے واقعات سنا کرتے تھے کہ کیا ہوا اور کیسے ہوا اور آپ کے بزرگوں میں کیا چیز مشہور ہے اور پھر اس کو لکھا کرتے تھے۔ ایک ایسا آدمی جس نے پوری زندگی اس کام میں گزاری ہو تو آخر محدثین نے اس کو ناقابل قبول کیوں سمجھا؟

واقدی اپنی دولت کا بیشتر حصہ علم حدیث اور علم سیرت کے حصول کی خاطر دور دراز کے سفر کرنے میں خرچ کرتے تھے۔ اس لئے وہ اکثر تنگ دستی کے شکار رہا کرتے تھے۔ ان کے پاس پیسے نہیں ہوا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ عید کے موقع پر ان کی اہلیہ نے ان سے شکایت کی کہ نہ گھر میں پیسے ہیں، نہ کسی کے پاس کپڑے ہیں اور نہ گھر میں عید کا اہتمام کرنے کے لئے کچھ ہے، آپ کہیں سے پیسوں کا کوئی بندوبست کریں۔ آپ کو معلوم ہے کہ خواتین اس معاملہ میں زیادہ حساس ہوتی ہیں۔ لیکن واقدی نے کوئی توجہ نہیں دی۔ اس پر بیگم نے رونا دھونا شروع کر کے ایک ہنگامہ مچادیا۔ یہ بچارے کسی سے پیسے مانگنے کے لئے گئے۔ ان کے ایک دوست تھے، ان سے جا کر پیسے مانگے۔ انہوں نے دو ہزار درہم کی تھیلی لاکر دے دی۔ اب تھیلی لے کر بڑے خوش خوش گھر آئے کہ آدھے کا یہ کریں گے اور آدھے کا یہ کریں گے۔ ان کے ایک ہاشمی دوست تھے جو سادات میں سے تھے، وہ آئے، تو انہوں نے گھر میں آ کے بیان کیا کہ میرے ایک ہاشمی دوست ہیں سادات میں سے ہیں وہ کچھ پیسے قرض لینا چاہتے ہیں۔ بیگم نے پوچھا کیا ارادہ ہے؟ واقدی نے کہا کہ آدھے ان کو دے دوں اور آدھے میں رکھ لوں گا۔ ایک ہزار میں ہم کام چلالیں گے اور ایک ہزار ان کو دے دیں گے۔ بیگم نے کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ تمہاری ساری عمر سیرت پر مطالعہ کرنے میں گزری ہے، خود کو حدیث کا طالب علم کہتے ہو، حضورؐ کے خاندان کا ایک آدمی آیا ہے اور تم آدھی رقم خود رکھو گے؟ پوری رقم اس کو نہیں دو گے؟ پوری دو ہزار کی تھیلی اس کو دے دو۔ انہوں نے پوری تھیلی ہاشمی صاحب کو دے دی۔ اب ہاشمی اس تھیلی کو دیکھ کر حیران ہوئے کہ یہ کہاں سے آئی؟۔ دراصل وہ پیسے انہی ہاشمی بزرگ کے تھے۔ ان سے ان کے کسی اور دوست نے مانگے تھے جو واقدی کے بھی دوست تھے۔ انہوں نے ہاشمی بزرگ سے شکایت کی تھی کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں، عید کے لئے مجھے کچھ دے دیں، انہوں نے وہ تھیلی واقدی کے دوست کو دے

دی، واقدی نے جب اپنے دوست سے پیسے مانگے تو انہوں نے وہی تھیلی اٹھا کے جوں کی توں واقدی کو دے دی۔ واقدی سے ہاشمی نے مانگی انہوں نے جوں کی توں اٹھا کے ان کو دے دی۔ یہ بنی عباس کے زمانہ کا ذکر ہے۔ جب یہ واقعہ وہاں کے وزیر یحیٰی بن خالد برمکی کو معلوم ہوا تو وہ بڑا خوش ہوا۔ اس نے کہا کہ یہ تو بڑی زبردست بات ہے۔ اس نے دو ہزار درہم واقدی کو دیئے، دو ہزار درہم ہاشمی دوست کو دیئے اور دو ہزار درہم غیر ہاشمی دوست کو دیئے۔ اور کہا کہ یہ پیسے چونکہ واقدی کی بیوی کی وجہ سے ہاشمی کو واپس ہوئے اس لئے بیوی چار ہزار درہم کی مستحق ہے۔ دس ہزار درہم اس نے دیئے اور اس طرح یہ قصہ ختم ہوا۔

واقدی اس درجہ کے انسان تھے لیکن محدثین ان کو قابل اعتماد نہیں سمجھتے۔ ان کی کتاب 'کتاب المغازی' تین جلدوں میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے غزوات کے بارے میں بڑی مستند اور معلومات افزا کتاب ہے۔ محدثین کا طریقہ یہ تھا کہ جس نے جو روایت بیان کی انہوں نے اسی طرح باللفظ بیان کر دی۔ مجھ سے بیان کیا فلاں نے، ان سے فلاں نے، ان سے فلاں نے کہ غزوہ بدر میں مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھی۔ پھر مجھ سے فلاں نے بیان کیا، فلاں سے فلاں نے کہ اونٹوں کی تعداد ۷۳ تھی۔ پھر مجھ سے بیان کیا فلاں نے، کہ گھوڑے دو تھے، تلواریں اتنی تھیں۔ مجھ سے بیان کیا فلاں نے، ان سے فلاں نے کہ ہمارے پاس نیزے اتنے تھے۔ اس طرح کی معلومات وہ جمع کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہی طریقہ درست ہے۔

اس کے برعکس واقدی نے یہ کیا کہ ان ساری معلومات کو جمع کیا اور عنوان رکھا، غزوہ بدر کے حالات۔ پھر یہ لکھا کہ غزوہ بدر کی یہ معلومات میں نے ان ان حضرات سے جمع کی ہیں، ان سب کے نام دیئے ہیں اور نام دینے کے بعد اس پورے واقعہ کو ایک مربوط انداز میں بیان کیا۔ الگ الگ یہ نہیں بتایا کہ ان سب مجموعی معلومات میں سے کس سے کتنا حصہ معلوم ہوا ہے۔ محدثین کے ہاں تو یہ بڑا جرم تھا کہ یہ نہ پتہ چلے کہ کس نے کیا بات روایت کی ہے۔ اس لئے محدثین نے واقدی کے اس اسلوب سے شدید اختلاف کیا اور ان کو ساری عمر کے لئے نا قابل قبول قرار دے دیا۔ اس سے صرف یہ اندازہ کرنا مقصود ہے کہ محدثین کا معیار کتنا کڑا تھا کہ انہوں نے ایک ایسے زبردست اور جید عالم کو اور ایسے طالب علم کو جس نے پوری زندگی عرب کے ریگستانوں میں گھوم پھر کر گزاری تھی اور سیرت کی ساری معلومات جمع کی تھیں، محض اس لئے نا قابل قبول قرار دے دیا

کہ ان کے ہاں احتیاط کا وہ اونچا اور غیر معمولی معیار موجود نہیں جس کی پابندی محدثین کر رہے تھے۔ حالانکہ واقدی کی کتاب غزوات رسول کے سب سے بڑے ماخذوں میں شمار ہوتی ہے لیکن محدثین نے کہا کہ آپ نے یہ بے احتیاطی کی ہے اس لئے ہم آپ کی بات کو قابل قبول نہیں سمجھتے۔ بہر حال محدثین کے ہاں واقدی کا ذکر ہمیشہ منفی انداز میں آتا ہے۔

ابن سعد انہی واقدی کے شاگرد تھے۔ ابن سعد پر ایسا کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن چونکہ واقدی کے ساتھ رہے تھے اس لئے محدثین نے کہا کہ جب تک کسی اور ذریعہ سے تصدیق نہ ہو ابن سعد کی بات بھی زیادہ قابل اعتماد نہیں۔ میری ذاتی رائے میں تو بطور مورخ دونوں قابل اعتماد ہیں اور تاریخی واقعات کی حد تک دونوں کی بات قابل قبول ہے۔ لیکن حدیث کی روایت کے بارے میں ان دونوں حضرات کی بات محدثین نے قبول نہیں فرمائی۔

طبقات ابن سعد کے بعد جن حضرات نے کتابیں لکھیں ان میں سب سے پہلی کتاب جو آج ہمارے پاس موجود ہے وہ امام بخاری کے استاد یحیٰ بن معین کی ہے۔ یحیٰ بن معین اتنے بڑے محدث تھے کہ اپنے زمانے میں امیر المومنین فی الحدیث کہلاتے تھے۔ امام بخاریؒ کے اساتذہ میں سے تھے اور امام احمد بن حنبل کے دوستوں میں سے تھے۔ انہوں نے فن رجال پر کتاب لکھی ہے۔ ان کے بعد امام بخاری کے ایک اور استاد علی بن المدینی نے ایک کتاب لکھی۔

لیکن جس شخصیت نے علم رجال پر سب سے زیادہ کام کیا وہ خود امام بخاری تھے۔ امام بخاری کی کئی کتابیں ہیں جن میں سے کتاب التاریخ الکبیر اور کتاب التاریخ الصغیر یہ دونوں دستیاب ہیں۔ یہ اس طرح سے ہسٹری کی کتابیں نہیں ہیں جس طرح آج ہسٹری کی کتابیں ہوتی ہیں۔ بلکہ یہ کتابیں اسماء الرجال پر ہیں۔ یعنی ان رجال کے حالات پر ہیں جن کا علم حدیث میں ذکر آتا ہے اور یہ کہ کب ان کی پیدائش ہوئی اور کب وفات ہوئی۔ وفات کا تذکرہ اس لئے ضروری ہے کہ یہ تعین کیا جائے کہ ان کی ملاقات اپنے شاگرد سے، جو ان سے منسوب کر کے بیان کرتا ہے ہوسکتی تھی کہ نہیں ہوسکتی تھی۔ جب تک تاریخ وفات کا پتہ نہ ہو اس وقت تک یہ تعین بڑا دشوار ہے۔ پھر امام بخاری کی شرط تو اس سے بھی بہت آگے ہے کہ نہ صرف معاصرت یعنی ہم عصری ہو بلکہ یہ بھی ثابت ہو کہ ان کی ملاقات ہوئی ہے تو اس لئے امام بخاری یہ بھی تحقیق کرتے تھے کہ ان کے کن کن شاگردوں کی ان سے ملاقات ثابت ہے اور ان کی اپنے کن کن اساتذہ سے

ملاقات ثابت ہے۔ یہ معلومات امام بخاری نے جمع کی ہیں۔

امام بخاری نے ایک اور کتاب بھی لکھی ہے۔ یہ علم رجال کا ایک شعبہ ہے جس پر کم از کم ایک درجن کے قریب کتب آج دستیاب ہیں۔ وہ یہ کہ جب رجال پر معلومات کا یہ عمل شروع ہوا تو یہ بھی پتہ چلا کہ اب ایسے لوگ بھی سامنے آرہے ہیں جو کمزور ہیں یا اس معیار کے نہیں ہیں جس معیار کی لوگوں کی روایت قبول کی جاتی ہے۔ ان راویوں کو ضعفاء یا متروکین کہا جاتا ہے۔ جب ضعفاء اور متروکین کی تعداد بڑھ گئی تو محدثین اور علماء رجال نے ان پر الگ کتابیں تیار کیں۔ امام بخاری نے سب سے پہلے ایک کتاب لکھی 'کتاب الضعفا الصغیر' یعنی چھوٹی کتاب جو ضعیف راویوں پر مشتمل ہے۔ اس میں انہوں نے ضعیف راویوں کی معلومات اور فہرست الگ سے دے دی ہے تاکہ لوگ کتاب کی مدد سے یہ تحقیق کرلیں کہ اگر ان میں سے کوئی راوی آیا ہے تو وہ راوی ضعیف ہے اور اس کی روایت میں تامل کرنا چاہئے۔ جن لوگوں نے اس موضوع پر لکھا ہے ان میں امام مسلم بھی شامل ہیں۔ لیکن بعد کے محدثین میں جن کا کام اس میدان میں سب سے نمایاں ہے وہ امام دارقطنی ہیں۔ امام دارقطنی کی کتاب کئی سنن مشہور ہے۔ ان کی کئی کتابیں علم رجال اور جرح وتعدیل پر ہیں۔ جرح وتعدیل پر کتابوں کا آئندہ ذکر کریں گے۔

امام دارقطنی کے ایک معاصر اور امام مسلم کے ایک جونیئر معاصر ابوبکر بزار تھے جن کی مسند بزار مشہور ہے، انہوں نے بھی علم رجال پر ایک کتاب لکھی اور اس کتاب میں ان معلومات کو جمع کیا۔ امام نسائی جو صحاح ستہ میں سے ایک کتاب کے مصنف ہیں، ان کی کتاب ہے 'کتاب الضعفاء والمتروکین'۔ یہ کتاب بھی مطبوعہ شکل میں موجود ہے اور ملتی ہے۔ اس میں ان راویوں کے حالات ہیں جو ضعیف ہیں یا جن کی روایت کو ترک کردیا جاتا ہے اور قبول نہیں کیا جاتا۔

مزید برآں اس فن کے دو اور بڑے امام علامہ ابن ابی حاتم اور حافظ ابن عبدالبر ہیں۔ ابن عبدالبر اسپین کے رہنے والے تھے۔ ان کا تعلق چوتھی پانچویں صدی ہجری سے ہے اور یہ احفظ اہل المغرب کہلاتے ہیں۔ یعنی سپین، مراکش، اندلس، قیروان اور تیونس کے سب سے بڑے حافظ حدیث۔ ان سے بڑا محدث ان کے زمانے میں اور کوئی نہیں تھا۔ ان سے بڑے متعدد محدثین ان کے بعد پیدا ہوئے۔ لیکن ان کے اپنے زمانے میں ان سے بڑا کوئی محدث نہیں تھا۔ حافظ ابن عبدالبر نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ ان میں موطا کے رجال پر ان کی کتاب بہت

مشہور ہے، موطا کی شرح پر بھی ان کی کتاب ہے، التمہید ان کی ایک بڑی کتاب ہے جس میں موطا کے اسانید (سندوں) پر انہوں نے بحث کی ہے۔ موطا امام مالکؒ دراصل اس علاقہ کی بہت مقبول کتاب تھی اور بہت مشہور تھی اس لئے مغرب کے علماء نے موطا امام مالکؒ کی خدمت زیادہ کی ہے۔ ایک تو وہ خود مالکی ہیں اور یہ فقہ مالکی۔ کے بانی کی کتاب ہے۔ اس لئے اس کو بڑا احترام اور تقدس حاصل تھا۔

پانچویں چھٹی صدی ہجری کے بعد رجال کی ساری معلومات جمع ہوگئیں۔ اور پانچویں صدی کے بعد پھر براہ راست روایت حدیث نہیں ہوئی اس لئے کہ جتنے راویان تھے ان سب کی معلومات جمع ہوگئیں۔ اور یوں علم رجال کی تدوین کا ایک اہم مرحلہ تکمیل کو پہنچا۔ اب ان معلومات کو جمع کر کے اور ان کا تقابل کر کے جامع مجموعے تیار کرنے کا عمل شروع ہوا۔ پانچویں صدی ہجری کے بعد کی جو کتابیں رجال پر تیار ہوئیں وہ بڑی جامع کتابیں ہیں اور ان پر ایک نئے انداز سے کام کرنے کا آغاز ہوا۔ ان میں سب سے پہلی کتاب علامہ عبدالغنی مقدسی کی ہے جو بیت المقدس کے رہنے والے تھے۔ یہ کتاب بڑی تاریخ ساز کتاب ہے۔ 'الکمال فی اسماء رجال'۔ انہوں نے کوشش کی کہ اسماء رجال پر اب تک جو مواد آیا ہے اس سب کو جمع کر کے ایک بڑی اور مکمل کتاب تیار کر دیں۔ اس لئے انہوں نے اس کا نام 'الکمال فی اسماء الرجال' رکھا۔ اس کتاب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ بعد کے آنے والے محدثین نے اس پر اور کام کیا۔ اس پر جب کام کرنے کا آغاز ہوا تو علامہ یوسف المزی نام کے ایک اور بزرگ تھے جو حافظ مزی کہلاتے ہیں اور حدیث کی کتابوں میں ان کا نام حافظ مزی آتا ہے۔ حافظ مزی نے جب کام شروع کیا تو ان کو پتہ چلا کہ بہت سی معلومات علامہ مقدسی کو نہیں ملیں اور اس پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے اس لئے انہوں نے اس کتاب کی تہذیب کی اس میں اضافے کئے، جن معلومات کو انہوں نے غیر ضروری سمجھا یا مکرر پایا، ان کو نکال دیا، جہاں کمی تھی اس میں اضافہ کیا اور بارہ جلدوں میں ایک اور کتاب تیار کی جس کا نام رکھا 'تہذیب الکمال فی اسماء الرجال' یہ چھپی ہوئی ہر جگہ ملتی ہے۔

لیکن کمال صرف اللہ کی ذات کے لئے ہے، انسان کمال کا جتنا بھی دعویٰ کرے، وہ ناقص ہی ہے۔ حافظ مزی کے انتقال کے فوراً بعد یعنی پچیس تیس یا چالیس سال بعد ایک اور بزرگ سامنے آئے جو علامہ علاؤالدین مغلطائی کہلاتے ہیں۔ ان کا تذکرہ بھی کتابوں میں حافظ مغلطائی

کے نام سے ملتا ہے۔انہوں نے جب حافظ مزی کی کتاب کو دیکھا تو ان کو پتہ چلا کہ اس میں تو بہت کچھ کمی ہے۔انہوں نے اس کو مکمل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کا تکملہ لکھا۔یعنی اس کتاب کا ایک ضمیمہ تیار کیا۔اصل کتاب بارہ جلدوں میں ہے جو تتمہ ہے وہ تیرہ جلدوں میں تیار ہوا۔اس طرح سے یہ کتاب 'اکمال الکمال لتھذیب الکمال فی اسماء الرجال' کے نام سے حافظ مغلطائی نے لکھی۔اب یہ کتاب اتنی طویل اور ضخیم ہوگئی کہ اس سے استفادہ مشکل ہوگیا۔اس پر علامہ ذہبی نے جو حافظ مغلطائی کے ہم عصر تھے،اس کی تہذیب تیار کی اور 'تھذیب تھذیب الکمال فی اسماء الرجال' یعنی تہذیب الکمال کی تہذیب۔انہوں نے ایک نیا نسخہ تیار کیا،وہ بڑا مقبول ہوا اور ہر جگہ ملتا ہے۔اس کے بعد اس کتاب کو بے شمار لوگوں نے،کم وبیش ایک درجن حضرات نے اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔اس پر مزید تحقیق کی،اس کی شرحیں لکھیں،اس کے حواشی لکھے اور اس کو مزید بہتر بنایا تا آنکہ ان کے تقریباً سو سال کے بعد یہی حافظ ابن حجر ہیں جن کا نام ہر حدیث کے حوالہ میں آتا ہے،ایسے کم لوگ ہیں جن کا ذکر حدیث کی ہر گفتگو میں آئے اور حافظ ابن حجر ان میں سے ایک ہیں۔انہوں نے تہذیب التہذیب کے نام سے ایک کتاب لکھی۔یہ بھی ہر جگہ ملتی ہے۔پھر تہذیب التہذیب کا انہوں نے دو جلدوں میں خلاصہ لکھا 'تقریب التہذیب' یعنی لوگوں کے لئے تہذیب کو قریب بنانا۔

یہ علم حدیث میں علم رجال پر کام تھا جو وقتاً فوقتاً ہوا۔اس پر مزید گفتگو بھی کرنی ہے لیکن چونکہ آج وقت ختم ہوگیا اس لئے رجال پر بقیہ گفتگو جرح وتعدیل کے سیاق وسباق میں ہوگی۔

صحابہ کرام پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔صحابہ کرام کے تذکرہ پر ہی آج کی گفتگو ختم کرتے ہیں۔جیسا کہ میں نے عرض کیا صحابہ کرام پر اس تحقیق کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ غیر صحابیؓ کو کسی غلط فہمی یا کسی بد نیتی کی وجہ سے صحابیؓ نہ سمجھ لیا جائے۔تو پہلے صحابہ کرام پر الگ الگ تذکرے تیار ہوئے۔ان میں سب سے قدیم تذکرہ جو آج بھی دستیاب ہے وہ انہی علامہ ابن عبدالبر کا ہے جن کو احفظ اہل المغرب کہا جاتا ہے۔علامہ ابن عبدالبر کی وفات ۴۶۳ھ میں ہوئی تھی۔پانچویں صدی ہجری کے آدمی ہیں۔انہوں نے کتاب لکھی تھی 'الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب' یعنی صحابہ کی پہچان کی ایک جامع کوشش۔الاستیعاب کے معنی ہیں **comprehesive sarvey** اس کتاب میں انہوں نے کم وبیش سات ساڑھے سات ہزار صحابہ کا تذکرہ کیا ہے۔

اس کے بعد علامہ ابن حجر عسقلانی نے ایک کتاب لکھی 'الاصابہ فی تمییز الصحابہ'۔ اس میں تقریباً بارہ ہزار صحابہ کا تذکرہ ہے۔ ان سے پہلے ایک کتاب علامہ ابن اثیر جزری نے لکھی تھی 'اسد الغابہ فی معرفة الصحابہ'۔ صحابہ کے تذکرے پر یہ تین بڑی بڑی کتابیں ہیں جو آج ہر جگہ دستیاب ہیں اور صحابہ کے بارے میں براہ راست معلومات کا مستند ترین، جامع ترین اور بہترین ذخیرہ تین کتابیں یہ، چوتھی کتاب طبقات ابن سعد جس کا میں نے ذکر کیا۔ ان چار کتابوں سے صحابہ کرام کی زندگی کا پورا نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اب کسی کے لئے یہ ممکن نہیں رہا کہ کسی غیر صحابی کو صحابیؓ کہہ کر کوئی غلط بات اس کے حوالہ سے حضورؐ کی ذات گرامی سے منسوب کردے۔ وہ کتابیں ان کے علاوہ ہیں جو مختلف شہروں یا مختلف علاقوں کے لحاظ سے لکھی گئیں، دمشق کے صحابہ کرام، فلاں جگہ کے صحابہ کرام وغیرہ۔

ایک آخری کتاب کا ذکر کرکے بات ختم کردیتا ہوں۔ ایک بزرگ تھے علامہ ابن عساکر جو بڑے محدث تھے۔ ابن عساکر کی کتاب تاریخ دمشق فن تاریخ کی چند عجائب روزگار کتابوں میں سے ایک ہے۔ میں مبالغہ نہیں کررہا، بلکہ کوئی کتب خانہ ہو تو میں آپ کو دکھا بھی سکتا ہوں، انہوں نے پوری زندگی اس کام میں لگائی کہ دمشق شہر میں کون کون سے محدثین آئے۔ دمشق میں کس کس حدیث کی روایت ہوئی، یہاں کون کون سے صحابہ کرام آئے، یہاں حدیث پر کتنا کام ہوا۔ علم حدیث سے متعلق دمشق میں کتنا کام ہوا۔ علم حدیث کی زبان پر کیا کام ہوا، لغات پر کیا کام ہوا، انہوں نے یہ لکھی تھی تاریخ دمشق کے نام سے۔ دمشق میں ایک بڑی فاضل اور معمر خاتون ہیں میری ان سے ملاقات ہوئی ہے، وہاں ایک 'مجمع اللغہ العربیۃ' ہے جو ۱۹۲۶ء سے قائم ہے، عرب دنیا کا قدیم ترین علمی ادارہ ہے، میں بھی الحمدللہ اس کا رکن ہوں۔ عربی زبان کے مشہور ماہر مولانا عبدالعزیز میمن بھی اس کے رکن تھے۔ میرے استاد مولانا محمد یوسف بنوری جو بڑے مشہور محدث تھے وہ بھی اس کے رکن تھے، وہاں وہ کتاب شائع ہورہی ہے۔ اس کی اسّی (80) جلدیں اب تک چھپ چکی ہیں اور ہر جلد خاصی ضخیم ہے۔ ابھی وہ کتاب مکمل نہیں ہوئی ہے۔ ان خاتون کا کہنا تھا کہ اگر یہی رفتار رہی تو شاید ۱۲۰ جلدوں میں یہ کتاب مرتب ہوجائے گی۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ محدثین نے کتنی معلومات جمع کی ہیں۔ یہ ایک کتاب صرف دمشق شہر کے بارے میں ہے۔

خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد لکھی تھی جو متعدد جلدوں میں کئی بار چھپی ہے اور اب ایک اور جگہ تحقیق کے ساتھ چھپ رہی ہے۔ اس کی بھی درجنوں جلدیں ہوں گی اور اس میں یہی معلومات بغداد کے بارے میں ہیں۔ بغداد میں جتنے تابعین گزرے ہیں، صحابہ تو وہاں نہیں گئے، صحابہ کے بعد بغداد بنا، لیکن تابعین، اور زیادہ تر تبع تابعینؒ گئے، تبع تابعینؒ کے دور سے وہاں علم حدیث کا زیادہ چرچا شروع ہوا، تابعین کے دور سے معمولی، جو تابعین یا تبع تابعینؒ وہاں گئے، ان سے لے کر پانچویں صدی ہجری میں خطیب بغدادی کے زمانہ تک بغداد میں آنے والے ہر محدث ہر خادم حدیث اور ہر عالم کا تذکرہ اس میں موجود ہے۔

سوالات کل کریں گے اس لئے کہ آج جمعہ کا دن ہے اور وقت تنگ ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

چھٹا خطبہ

جرح وتعدیل

ہفتہ، 11 اکتوبر 2003

جرح وتعدیل

جرح وتعدیل کی قرآنی اساس

اس سے پہلے علم اسناد اور اس سے متعلق چند ضروری مسائل پر گفتگو ہوئی تھی اور اس میں یہ عرض کیا گیا تھا کہ خود قرآن مجید اور سنت رسول کی رو سے یہ بات ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جو چیز منسوب کی جائے وہ ہر لحاظ سے قطعی اور یقینی ہو۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ ہو اور ہر مسلمان جو تا قیام قیامت روئے زمین پر آئے اس کو پورے اطمینان اور شرح صدر کے ساتھ یہ بات معلوم ہو جائے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے لئے کیا بات ارشاد فرمائی ہے۔ کیا چیز جائز قرار دی ہے، کیا ناجائز ٹھہرائی ہے، کن چیزوں پر ایمان لانا اس کے لئے ناگزیر قرار دیا گیا ہے اور کن چیزوں کے بارے میں اس کو آزادی دی گئی ہے۔ اس اصول کی بنیاد تو قرآن مجید کی وہ آیات ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب بھی کوئی اطلاع یا خبر تم تک پہنچے تو اس کی تحقیق کرو' اِذا جاء کم فاسق بنباءٍ فتبیّنوا ' جب کوئی فاسق شخص تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کرو۔ اس لئے کہ اگر بغیر تحقیق کے اس خبر کو قبول کرلو گے تو ہو سکتا ہے کہ کسی ایسی قوم کے خلاف تم کوئی کارروائی کر گزرو جس کے خلاف کاروائی کرنے میں تم حق بجانب نہ ہو۔

اگر چہ اس آیت مبارکہ کا براہ راست تعلق روایت حدیث سے نہیں ہے، لیکن اس سے یہ اصول ضرور نکلتا ہے کہ ہر خبر کی تحقیق ضرور کر لینی چاہئے۔ جب دنیاوی معاملات میں تحقیق کی یہ اہمیت ہے تو وہ خبر جو رسول اللہ ﷺ کے قول، فعل یا تقریر کے بارے میں دی گئی ہو اس کی اہمیت

چونکہ بہت زیادہ ہے، اس لئے اس کی تحقیق کرنا اور پہلے سے اس بات کو یقینی بنانا کہ یہ حضورؐ ہی کا ارشاد ہے، انتہائی ضروری ہو جاتا ہے۔

ایک اور جگہ قرآن حکیم کی سورۃ ممتحنہ میں آیا ہے، ممتحنہ کا نام بھی اسی لئے ممتحنہ ہے اس میں امتحان لینے یا آزمانے کا ذکر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ 'اذا جاء کم المومنات المهاجرات فامتحنوهن'۔ جب تمہارے پاس مومن عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کو آزما کر دیکھو۔ یہ آیت صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہوئی تھی جب بڑی تعداد میں مکہ مکرمہ سے خواتین نے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آنا شروع کیا اور ہر آنے والی خاتون نے یہ کہا کہ چونکہ اس نے اسلام قبول کر لیا ہے، لہٰذا اس کو مدینہ منورہ میں شہریت دے دی جائے اور یہاں بسنے کی اجازت عطا فرما دی جائے۔ اس وقت یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا ہر آنے والی خاتون کے اس دعویٰ کو قبول کر لیا جائے یا اس کی تحقیق اور تصدیق کی جائے۔ ایک اعتبار سے یہ معاملہ بڑا اہم تھا اس لئے کہ آنے والی خاتون یہ بیان کر رہی تھی کہ اس نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اور حالت اسلام میں جب رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی تو وہ صحابیہ ہو گئی۔ گویا ایک صحابیہ کی طرف سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اس نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اس کے باوجود فامتحنوهن کا حکم دیا جا رہا ہے کہ ان کا امتحان لو اور آزمائش کر کے دیکھ لو کہ کیا انہوں نے واقعی اسلام قبول کیا ہے یا نہیں۔ اس سے بجا طور پر یہ سبق نکلتا ہے کہ اگر کسی شخص کا یہ دعویٰ ہو کہ وہ صحابیؓ ہے تو اس دعویٰ کی تحقیق کرنی چاہئے، اگر کسی شک وشبہ کا امکان ہو۔

کل میں نے آپ میں سے کسی کے سوال کے جواب میں بابا رتن ہندی کی مثال دی تھی جس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس کی عمر چھ سو سال ہے اور اس نے رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی تھی۔ اہل علم نے اس کی تحقیق کی اور ثابت کیا کہ دعویٰ جھوٹا ہے۔ اور بابا رتن کے بارے میں تمام اوہام وخرافات اور روایات کی تردید کر دی۔ قرآن مجید کی ان دونوں آیات سے اسناد اور اسناد کی تحقیق کا اصول ملتا ہے۔

مزید برآں، جیسا کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا، جس کا کئی بار حوالہ دیا جا چکا ہے، 'کفیٰ بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع'، کہ کسی شخص کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ جو بات سنے اس کو آگے بیان کر دے۔ اس میں بھی اس بات کی تلقین ملتی ہے کہ جب کوئی بات

سنو تو پہلے اس کی تحقیق کرو اور اگر سچی ثابت ہو جائے تو پھر آگے بیان کرو، ورنہ سنی سنائی بات کو بغیر تحقیق کے آگے بیان نہ کرو۔ جب عام باتوں کے بارے میں یہ حکم ہے تو پھر روایت حدیث تو انتہائی اہمیت رکھنے والا معاملہ ہے۔ اس میں تحقیق کرنے کا حکم کیوں نہیں دیا جائے گا۔ لازماً دیا جائے گا اور یقینی طور پر تحقیق کرنا ناگزیر ہوگا۔

صحابہ کرام اور جرح کی روایت

جب تک معاملہ صحابہ کرام کے ہاتھ میں رہا تو اس کی تحقیق کی جاتی تھی کہ ایک صحابی جو روایت بیان کر رہے ہیں وہ ان کو صحیح طور پر یاد بھی ہے کہ نہیں۔ لیکن بعض اوقات صحابہ کرامؓ تحقیق وتصدیق کے اس عمل نظر انداز بھی کر دیا کرتے تھے۔ نظر انداز وہاں کر دیا کرتے تھے جہاں سو فیصد یقینی ہوتا تھا کہ صحابیؓ رسول جو بات بیان کر رہے ہیں وہ اپنے قطعی یقین اور مشاہدہ کی بنیاد پر بیان کر رہے ہیں۔ اس میں کسی بھول چوک کا امکان نہیں۔ نعوذ باللہ صحابہ کرام کے بارے میں غلط بیانی کا امکان تو تھا نہیں، لیکن بھول چوک یا کسی ایک چیز کو کسی دوسرے سیاق وسباق میں سمجھ لینے کا امکان بہرحال بتقاضائے بشری موجود تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، جن کے بارے میں تمام اہل علم نے تصدیق کی ہے کہ وہ سب سے پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے سندوں اور راویوں کے بارے میں تحقیق کرنے کی روش اختیار کی۔ ظاہر ہے جناب صدیق اکبرؓ کا زمانہ تو سارا ہی صحابہ کا زمانہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے کوئی دوسوا دو سال بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا، اس لئے جو لوگ ان سے احادیث بیان کر رہے تھے وہ تو سارے کے سارے صحابہ ہی تھے۔ لیکن اس کے باوجود جناب صدیق اکبرؓ نے ان سے بھی تصدیق وتحقیق کی روش اپنائی، اور ہمیشہ یہ چاہا کہ اس بات کو لوگوں کے ذہن نشین کر دیں کہ کوئی چیز رسول اللہ ﷺ کی ذات سے غلط منسوب نہ ہو۔ سیّدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی میں ایسے کئی واقعات ملتے ہیں کہ ان کے سامنے کسی صحابیؓ نے کوئی حدیث بیان کی لیکن انہوں نے اس حدیث کو فوراً ہی قبول نہیں کیا۔ صحابیؓ سے کہا کہ اس کے لئے مزید سند اور ثبوت پیش کریں اور اس مزید سند اور ثبوت کے بعد ہی حدیث کو قبول کیا۔

چنانچہ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دربار میں ایک خاتون نے حاضر ہو کر کہا کہ اے امیر المومنین میرے ایک عزیز کا انتقال ہو گیا ہے جو میرا پوتا یا پوتی تھی۔ بقیہ رشتہ داروں میں فلاں فلاں لوگ شامل ہیں، تو میرا حصہ اس کی وراثت میں کتنا ہے؟ اور میرا جتنا حصہ بنتا ہو آپ وہ مجھے دلا دیں۔ اس پر حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے صحابہ سے معلوم کرتا ہوں، کہ آپؐ نے دادی کا حصہ کتنا رکھا تھا۔ اس پر حضرت مغیرہ بن شعبہؓ، جو صحابہ کرام میں بڑا نمایاں مقام رکھتے ہیں اور عقل و فہم کے ایسے درجہ پر فائز تھے کہ عرب میں اسلام سے پہلے بھی چار آدمی، جو 'دہاۃ العرب'، یعنی عرب کے سب سے ذہین ترین انسان مشہور تھے، اُن میں اِن کا شمار تھا۔ یعنی عرب کے چار ذہین ترین انسانوں میں سے ایک حضرت مغیرہ بن شعبہ تھے۔ انہوں نے گواہی دی کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے ہی ایک معاملہ میں فیصلہ فرمایا تھا کہ دادی کا حصہ چھٹا ہوگا۔ لیکن سیّدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ حدیث سن کر فیصلہ نہیں کیا۔ بلکہ ان سے پوچھا کہ 'هل معك غيرك؟'۔ کیا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے جو اس واقعہ کا گواہ ہو؟ اس پر ایک اور صحابیؓ، حضرت محمد بن مسلمہ انصاریؓ نے گواہی دی کہ میں اس کا گواہ ہوں، اور میرے سامنے یہ واقعہ پیش آیا تھا اور واقعتاً رسول اللہ ﷺ نے دادی کو چھٹا حصہ دلوایا تھا۔ اس پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فیصلہ کر دیا اور اس وقت سے یہ ایک طے شدہ روایت اور اصول بن گیا کہ دادی کا حصہ بعض حالات میں چھٹا ہوگا۔

اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ بھی ہے۔ جس میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ کسی سے ملنے کے لئے گئے۔ غالباً حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے پاس ملنے گئے۔ وہاں جا کر انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا، لیکن کسی نے جواب نہیں دیا۔ دوسری مرتبہ دروازہ کھٹکھٹایا، کوئی جواب نہیں آیا۔ پھر تیسری مرتبہ دروازہ کھٹکھٹایا اور جب کوئی جواب نہیں آیا تو انہوں نے کچھ ناخوشگواری یا ناراضگی کا اظہار کیا۔ اس پر اندر سے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ برآمد ہوئے، جن کا مکان تھا، انہوں نے کہا کہ ناراض ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی سے ملنے جائے اور تین مرتبہ آواز دینے اور دروازہ کھٹکھٹانے کے باوجود وہ شخص جواب نہ دے تو آنے والے کو واپس چلے جانا چاہئے اور اس کو محسوس نہیں کرنا چاہئے۔ یہ آنے والے کا لازمی حق نہیں ہے کہ جب بھی کوئی شخص

کسی سے ملنے کے لئے جائے تو دوسرا آدمی ہر وقت اس سے ملنے کے لئے تیار ہو۔ اس کی مصروفیات بھی ہوسکتی ہیں، اس کے آرام کا وقت بھی ہوسکتا ہے، وہ کسی ایسے کام میں مصروف ہوسکتا ہے جو زیادہ اہم ہو۔ اس پر حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے کہا جو بات آپ نے حضور علیہ السلام کے حوالہ سے بیان کی ہے اس پر کوئی گواہ ہے؟ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بڑے سینئر صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ مکہ مکرمہ کے بالکل ابتدائی دور میں مسلمان ہوئے تھے۔ انہوں نے اس کو محسوس کیا کہ میں نے ایک حدیث بیان کی اور حضرت عمر فاروقؓ اس کو قبول کرنے میں تامل کررہے ہیں۔ لیکن ان کے حکم پر انہوں نے ایک دوسرے صحابیؓ، جو اتفاق سے اس وقت موجود تھے، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ چلیں حضرت عمرؓ کے دربار میں گواہی دیں کہ اس ارشاد کے موقع پر آپ بھی موجود تھے۔ چنانچہ حضرت ابوسعید خدریؓ نے گواہی دی اور فرمایا کہ جب رسول اللہ ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی تو میں بھی موجود تھا اور میں اس کا گواہ ہوں۔

اب حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے شکایت کی 'واللہ کنتُ اميناً علیٰ حديث رسول الله ﷺ'۔ خدا کی قسم میں رسول اللہ ﷺ کی احادیث کے معاملہ میں بڑا امانت دار ہوں اور میں پوری ذمہ داری سے یہ بات بیان کررہا تھا۔ اس کے باوجود آپ نے گویا میری بات قبول نہیں کی اور ایک گواہ طلب کرلیا۔ اس پر حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ 'اجل'۔ یقیناً ایسا ہی ہے۔ میں آپ کو بہت دیانت دار سمجھتا ہوں، 'ولكنني احببتُ ان اثبت!'۔ لیکن میں یہ چاہتا تھا کہ میں مزید تحقیق اور مزید تصدیق کرلوں۔

ایسے ہی ایک موقع پر جب حضرت عمر فاروقؓ نے دوسری گواہی طلب کی۔ تو آپ نے فرمایا کہ 'اما انی لم اتهمك'۔ دیکھئے میں نے آپ پر کوئی الزام نہیں لگایا، میں آپ پر تہمت نہیں لگا رہا کہ خدانخواستہ آپ غلط بیانی کررہے ہیں، 'ولكن خشيتُ ان يقول الناس علی رسول الله ﷺ'، لیکن مجھے یہ ڈر ہوا کہ آپ لوگوں کو بار بار احادیث بیان کرتے دیکھ کر اور ہمیں آسانی سے قبول کرتے دیکھ کر لوگوں میں یہ جرات پیدا نہ ہوجائے کہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں جو چاہیں ہر وقت بیان کردیں۔ لوگوں کو اس طرح کی تربیت دینے کے لئے، کہ جو بات بیان کریں بہت اہتمام اور تحقیق کے ساتھ بیان کریں، میں نے آپ سے گواہی کا مطالبہ کیا۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں روایت میں آتا ہے کہ ان کے سامنے

جب کوئی حضورﷺ کی حدیث بیان کرتا تھا تو وہ اس سے قسم لیا کرتے تھے کہ قسم کھاؤ کہ تم نے ایسے ہی سنا ہے۔ حالانکہ وہ بیان کرنے والے بھی صحابیؓ ہی ہوتے تھے۔ دراصل حضرت علیؓ، یا حضرت عمر فاروقؓ یا حضرت ابوبکر صدیقؓ، دوسرے صحابہ پر شک نہیں کر رہے تھے۔ لیکن دوسرے لوگوں کو تربیت دینے اور غیر صحابہ کو اس بات کی مشق کرانے کے لئے کہ ارشاد رسولؐ کی روایت کی کتنی اہمیت ہے، وہ صحابہ کرام سے بھی قسم لیا کرتے تھے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ صحابہ کرامؓ کی یہ سنت ہے کہ راوی کے بارے میں تحقیق کی جائے اور جب کوئی راوی روایت بیان کرے تو اس کی تحقیق میں حتی الامکان جو بھی تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں وہ اختیار کی جائیں۔

صحابہ کرام تحریری شہادت قبول نہیں کیا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ الخط یشبہ الخط، ایک تحریر دوسری تحریر کے مشابہ ہوسکتی ہے۔ اب اگر مدینہ منورہ سے کوفہ میں کسی صحابیؓ کے نام کوئی خط گیا ہے کہ رسول اللہﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی تو کوفہ میں بیٹھے ہوئے صحابیؓ کو کیسے پتہ چلے گا کہ یہ خط مدینہ منورہ میں فلاں صحابیؓ ہی نے بھیجا ہے۔ یا کوفہ میں اگر کوئی صحابیؓ بیٹھے ہوں اور مصر میں کسی کے نام خط لکھیں کہ رسول اللہﷺ نے یہ بات فرمائی تھی اور مجھ سے فلاں صحابیؓ نے بیان کی تو اس کی تصدیق کون کرے گا کہ یہ خط انہی صحابی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جن سے منسوب کیا جارہا ہے۔ اس میں کسی غلط فہمی، ملاوٹ یا الجھن کا ایک امکان بہرحال موجود تھا۔ اِس لئے اُس وقت یہ طے کیا گیا تھا کہ صرف تحریری دستاویز یا محض نوشتہ کی بنیاد پر کوئی حدیث قبول نہیں کی جائے گی، جب تک اس کے حق میں کوئی زبانی گواہی موجود نہ ہو۔ یا تو کوئی ایسا زبانی گواہ موجود ہو جو جاکر اس بات کی گواہی دے کہ یہ تحریر میرے سامنے فلاں صاحب نے لکھی تھی، پھر ان کی گواہی بھی سند میں شامل ہوگی کہ فلاں صاحب نے یہ گواہی دی۔ مثلاً فلاں صحابیؓ نے میری موجودگی میں میرے روبرو یہ حدیث لکھی اور یہ لکھا کہ یہ بات رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمائی۔ اس طرح سے تحریری اور زبانی دونوں گواہیاں مل کر ایک گواہی بن جاتی تھی۔

یہ سلسلہ صحابہ کرامؓ کے زمانے تک جاری رہا۔ اور صحابہ کرامؓ نے اس سے زیادہ کسی اہتمام کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس لئے کہ روایت کرنے والے سب صحابیؓ تھے۔ صحابہ ایک دوسرے کو جانتے تھے، بڑے بڑے صحابہ جو مدینہ منورہ میں رہتے تھے، مکہ مکرمہ میں رہتے تھے یا کوفہ اور دمشق جاکر بس گئے تھے، وہ سب ایک دوسرے سے واقف تھے۔ ایک ہی برادری اور ایک

خاندان کے لوگ تھے۔ ان کا تعلق یا تو قبیلہ قریش سے تھا یا دوسرے ایسے قبائل سے تھا جو مدینہ منورہ میں آکر بس گئے تھے یا انصار کے ان قبائل سے جن کے ساتھ مواخاۃ قائم ہوگئی تھی اور ایک دوسرے کے بھائی بن گئے تھے، رشتہ داریاں قائم ہوگئی تھیں۔ اس لئے وہاں اس شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ روایت بیان کرنے والا صحابیؓ ہے یا نہیں ہے۔ کوئی غیر صحابیؓ تو صحابیؓ ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا تھا۔ اس لئے سوائے اس کے کہ حلفیہ بیان لے لیا جائے یا ایک دوسرے صحابیؓ کی گواہی شامل کرلی جائے یا تحریری بیان ہو تو کسی اور کی زبانی گواہی لے لی جائے۔ اس کے علاوہ کسی اور چیز کی ضرورت نہیں تھی۔

لیکن صحابہ کرام کا ایک وقت مقرر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مقررہ وقت پر انہیں اٹھالیا اور وہ زمانہ تیزی سے آنے لگا کہ وہ آنکھیں ایک ایک کرکے بند ہونے لگیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے چہرہ مبارک کا دیدار کیا تھا۔ اب بڑی تعداد ان حضرات کی آگئی جو صحابیؓ نہیں تھے بلکہ تابعی تھے۔ تابعین میں غالب ترین اکثریت صحابہ کرام کے تربیت یافتہ لوگوں کی تھی۔ وہ اخلاق، کردار اور تقویٰ کے انتہائی بلند معیار پر فائز تھے۔ لیکن ہر عام تابعی کا وہ معیار نہیں تھا جو صحابہ کرام کے تربیت یافتہ خاص تابعین کو حاصل تھا۔ پھر حافظہ اور ضبط میں اور بات کو سمجھنے اور محفوظ رکھنے میں ہر شخص کا معیار ایک نہیں ہوسکتا۔ اس لئے اس بات کا امکان پیدا ہو چلا کہ تابعین میں سے کوئی بزرگ کسی بات کو اس کے سیاق وسباق میں نہ سمجھ سکیں۔ بات کو اس کے اصل مفہوم اور پس منظر سے ہٹ کر کسی اور مفہوم میں بیان کردیں۔

ایسی مثالیں عملاً بھی سامنے آئیں۔ اس لئے سند کا مطالبہ کیا جانے لگا اور کہنے والوں نے یہ کہا کہ 'الاسناد من الدین' کہ اسناد یعنی سند بیان کرنے کا عمل دین کا ایک حصہ ہے۔ اب یہ دین کا حصہ قرار دے دیا گیا اس لئے کہ اسناد کے بغیر رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کی تصدیق اور تحقیق مشکل تھی اور فقہ اسلامی کا اصول ہے 'مالایتم الواجب الا بہ فھو واجب'، کہ جس چیز پر کسی واجب کا دارومدار ہو وہ چیز بھی واجب ہوجاتی ہے۔ کوئی چیز فی نفسہٖ واجب نہ ہو، لیکن کسی اور واجب پر اس کے بغیر عمل درآمد ممکن نہ ہو تو وہ چیز بھی واجب ہوجائے گی۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات پر عمل درآمد فرض ہے اس لئے ان ارشادات کو جاننا بھی فرض ہے اور جانا نہیں جاسکتا تھا جب تک سند کا معاملہ صاف نہ ہو، اس لئے اسناد کا عمل دین کا حصہ بن گیا۔ لولا الاسناد، اگر

اسناد کا عمل نہ ہوتا'لقال من شاء ماشاء'، یہ جملہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا ہے جو امیر المومنین فی الحدیث کہلاتے ہیں، کہ اسناد دین کا حصہ ہے، اگر اسناد کا عمل نہ ہوتا تو دین کے بارے میں جس کا جو جی چاہتا وہ کہہ دیا کرتا اور کوئی پوچھنے والا نہ ہوتا۔ اس لئے اس بات کو یقینی بنانے کے لئے کہ رسول اللہ ﷺ سے کوئی غلط بات منسوب نہ ہو جائے اسناد کے عمل کو لازم قرار دیا گیا۔ اور یہ بات مسلمانوں کے علمی مزاج کا حصہ بن گئی کہ جو علمی بات کسی کے سامنے کہی جائے وہ پوری سند کے ساتھ کہی جائے۔ یہ روایت مسلمانوں کے علاوہ کسی قوم میں موجود نہیں۔ بلا استثنا اور بلا خوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ سند کا یہ تصور صرف اور صرف مسلمانوں کی روایت میں پایا جاتا ہے کسی اور قوم کی مذہبی یا غیر مذہبی روایت میں سند کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔

اسناد کی پابندی کی اسلامی روایت

مسلمانوں کے ہاں نہ صرف علم حدیث میں، بلکہ تمام علوم وفنون میں اسناد کی پابندی لازمی سمجھی گئی۔ آپ تفسیر کی پرانی کتابیں اٹھا کر دیکھ لیجئے، آج ہی جا کر تفسیر طبری دیکھیں۔ اس میں ہر بات اور تفسیر سے متعلق ہر جملہ پوری سند کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ ابن جریر طبری نے یہ جملہ یا قول کس سے سنا، انہوں نے کس سے سنا، انہوں نے کس سے سنا؟ بالآخر یہ بات یا صحابہ کرام تک یا رسول اللہ ﷺ تک یا جہاں تک وہ بیان کرنے والا بیان کرنا چاہے، وہاں تک پہنچتی ہے۔ طبری کی تفسیر میں بغیر حوالہ اور بغیر سند کے ایک جملہ بھی نقل نہیں کیا گیا، الا یہ کہ وہ بات ابن جریر طبری کی اپنی رائے ہو۔ ایک سے زائد احادیث پر جہاں وہ تبصرہ کرتے ہیں وہاں لکھتے ہیں 'وقال ابن جریر'، اور ابن جریر کا کہنا یہ ہے، یا 'وقلتُ' میں نے کہا، یا اقول یعنی میں یہ کہتا ہوں۔ گویا جہاں ان کی اپنی رائے ہے وہاں اپنا حوالہ ہے اور جہاں ان کی اپنی رائے نہیں ہے تو مکمل حوالہ اور سند کے ساتھ وہ بات کرتے ہیں۔

سیرت کی پرانی کتابیں اٹھا کر دیکھیں۔ سیرت کی ساری پرانی کتابوں میں، ابن اسحاق کی سیرت ہو، جو اب چھپ گئی ہے یا عروہ بن زبیر کی کتاب المغازی ہو، حتیٰ کہ واقدی ہوں جو اتنے مستند نہیں سمجھے جاتے، یا ابن سعد ہوں، ان میں سے ہر کتاب میں ہر واقعہ کی پوری سند موجود ہے۔ ایک ایک جملہ کی مکمل سند بیان کی گئی ہے۔ حتیٰ کہ ادب، شعر، فصاحت، بلاغت،

صرف، نحو اور لغت ان سب کی سندیں موجود ہیں۔

حتیٰ کہ یہ بات کہ امرؤالقیس نے کوئی شعر کس طرح کہا تھا اور کیا کہا تھا اس کی بھی پوری سند بیان ہوئی ہے۔ ایک شاعر اور ادیب تھے المفضل الضبی، انہوں نے عربی شاعری کے بہت سے قصائد جمع کیے اور اپنی زندگی کے سالہا سال اس میں لگائے کہ عرب قبائل میں پھر پھر کے لوگوں سے پرانے اشعار سنے، اور جمع کیے اور پھر پوری سند کے ساتھ بیان کیے کہ انہوں نے کس سے سنا، جس سے سنا اس نے کس سے سنا؟ حالانکہ شعر و ادب میں اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ اگر آپ سے کوئی کہے کہ موجودہ دیوان غالب کی سند کیا ہے تو پوچھنے والا بھی اس سوال کو مضحکہ خیز سمجھے گا اور جس سے پوچھا جائے گا وہ بھی اس کو فضول بات سمجھے گا، حالانکہ مرزا غالب اتنے پرانے نہیں ہیں۔ ڈیڑھ سو سال پہلے کے ہیں۔ لیکن ان کے دیوان کی کوئی سند ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ ہمیں کوئی پتہ نہیں کہ مرزا غالب کے نام سے جو دیوان مشہور ہے یہ واقعی پورا کا پورا انہی کا دیوان ہے کہ نہیں۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخئ تحریر کا
کاغذی ہے پیراہن ہر پیکر تصویر کا

واقعی انہوں نے ہی کہا تھا یا کسی اور نے کہا تھا۔ اس کا بہرحال عقلی طور پر بڑا امکان موجود ہے کہ کسی نے غلط چھاپ دیا ہو اور یہ مطلع مرزا صاحب سے غلط طور پر منسوب کر دیا ہو۔ اب کوئی ایک ایسا آدمی موجود نہیں ہے جو چشم دید گواہی دے کہ مرزا غالب نے میرے سامنے یہ غزل کہی تھی اور پھر انہوں نے آگے بیان کی ہو، پھر کسی اور نے بیان کی ہو۔ یہ چیز مسلمانوں کے علاوہ کسی اور قوم کے پاس موجود نہیں ہے۔

یہ صرف علم حدیث کی دین ہے کہ علم حدیث نے مسلمانوں میں ایک ایسا ذوق پیدا کر دیا کہ انہوں نے نہ صرف دینی علوم بلکہ شعر، ادب، بلاغت اور صرف و نحو کی، ایک ایک واقعہ کی، ایک ایک قاعدہ کلیہ کی، ایک ایک شعر کی، ایک ایک ضرب المثل کی سند کے ساتھ حفاظت کی اور وہ کتابیں آج ہمارے پاس موجود ہیں۔ پڑھنے والوں کو بعض اوقات الجھن بھی ہوتی ہے کہ ادب کی کتاب میں تو روانی تب آتی ہے جب مسلسل عبارت ہو۔ ادب کی کتاب میں درمیان میں سندیں آ رہی ہوں تو پڑھنے والوں کو الجھن ہوتی ہے۔ لیکن اس مواد کی تاریخی حیثیت اور اس کے

استناد اور authenticity کو محفوظ رکھنے کے لئے سند کا التزام وہاں بھی کیا گیا۔

جیسا کہ آپ میں سے ہر ایک کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ وقت گزرنے کے ساتھ سند لمبی بھی ہوتی گئی۔ رسول اللہ ﷺ سے زمانہ جتنا دور ہو گا سند اتنی ہی لمبی ہو گی۔ سب سے مختصر سندیں موطا امام مالکؒ میں ہیں جو اکثر و بیشتر دو ناموں پر مشتمل ہیں۔ امام مالکؒ، ان کے استاد اور ایک صحابیؓ۔ مثلاً مالک عن نافع عن ابن عمرؓ، حضرت نافع اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ دو آدمی ہیں۔ کہیں کہیں موطا امام مالکؒ میں تین راوی بھی آتے ہیں لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اسی طرح سے جیسے جیسے زمانہ بڑھتا گیا راویوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ سب سے لمبی سند امام بیہقی کی ہے جو آخری محدث ہیں۔ ۴۵۸ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے۔ اس لئے ان کی سند لمبی ہوتی ہے۔ کبھی سات نام ہوتے ہیں، کبھی آٹھ ہوتے ہیں اور کبھی کبھی نو ہوتے ہیں۔

راویوں کے طبقات

جب یہ سلسلہ آگے بڑھا، تو جو علماء رجال تھے اور جنہوں نے روایوں کے حالات پر کتابیں لکھیں تھیں، انہوں نے راویوں کے طبقات مقرر کئے اور بتایا کہ روایوں کے طبقات کونسے ہیں۔ تاکہ ہر طبقہ کے حالات الگ الگ بیان کئے جا سکیں اور یہ پتہ چل سکے کہ کونسا طبقہ کس طبقہ کے اساتذہ میں شمار ہوتا ہے۔ اب مثلاً اگر کسی غیر محدث سے، جو حدیث کا طالب علم نہ ہو، یہ کہا جائے کہ امام بیہقی نے امام مالکؒ سے روایت کی ہے اور وہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ یہ میں فرضی بات کر رہا ہوں، مثلاً اگر کوئی ایسی سند سے کوئی بات بیان کرے تو غیر محدث یا ایسا آدمی جو حدیث کا طالب علم نہ ہو، اس کو پتہ نہیں چلے گا کہ امام بیہقی اور امام مالکؒ کے درمیان بڑا طویل زمانہ گزرا ہے، ان دونوں کے درمیان کم و بیش پانچ چھ واسطے ہوں گے۔ امام بیہقی امام مالکؒ سے براہ راست روایت کر ہی نہیں سکتے۔ امام مالکؒ تو تبع تابعینؒ میں شامل ہیں اس لئے وہ براہ راست رسول اللہ ﷺ سے روایت ہی نہیں کر سکتے۔ صحابہ سے بھی روایت نہیں کر سکتے۔

اب جو شخص علم حدیث کو جانتا ہے وہ سمجھ لے گا کہ یہ روایت کمزور ہے۔ جو علم حدیث کو نہیں جانتا اس کو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کو نہ امام بیہقی کے سن وفات کا پتہ ہے، نہ امام مالکؒ کے سن وفات کا پتہ ہے، نہ صحابہ کرامؓ کے دور کا پتہ ہے۔ اس لئے

سہولت کی خاطر طبقات مقرر کر دیئے گئے کہ صحابہ کرام کا ایک طبقہ ہے جس سے اس بات کا واضح طور پر اندازہ ہو جائے گا کہ صحابہ کرام کس دور سے کس دور تک رہے۔ آخری صحابیؓ بھی حضرت محمود بن لبید جو میرے ہم نام تھے، ان کی وفات ۱۱۰ھ میں ہوئی ہے۔ وہ آخری صحابیؓ ہیں۔ وہ حضورﷺ کے انتقال سے چند ماہ پہلے خدمت اقدس میں لائے گئے، ان کی عمر چار پانچ سال تھی۔ وہ صرف ایک واقعہ بیان کرتے ہیں اس کے علاوہ کوئی روایت ان سے نہیں ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں بچہ تھا، میرے والد یا دادا مجھے حضورؐ کی خدمت میں لائے، رسول اللہﷺ نے مجھے گود میں بٹھایا اور پانی لے کر خود پیا اور پھر مجھے پلایا اور کھجور تھوڑی سی کھا کر پھر مجھے کھلائی اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر مجھے دعا دی۔ بس، اس کے علاوہ اور کوئی روایت ان سے منقول نہیں ہے۔ یہ آخری صحابہؓ میں سے ہیں جن کے بعد صحابہ کرام دنیا سے رخصت ہو گئے، پھر کوئی ایسا آدمی روئے زمین پر باقی نہیں رہا جس نے رسول اللہﷺ کی زیارت کی ہو۔

اب یہ بات کہ صحابہ کرام کا دور کب تک ہے اور بڑے صحابہ کا زمانہ کب تک ہے، درمیانی عمر کے صحابہ کا زمانہ کب تک ہے، صغار صحابہ کا زمانہ کب تک ہے۔ یہ تمام باتیں جاننا ضروری ہے۔ صغار صحابہ سے مراد وہ صحابہ ہیں جو رسول اللہﷺ کے مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد بچے تھے اور ان کا شمار بچوں میں ہوتا تھا۔ پھر یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ جب انہوں نے پہلی بار حضورؐ کی زیارت کی تو وہ کس عمر میں تھے اور انہوں نے رسول اللہﷺ کو آخری بار کس عمر میں دیکھا، یہ جاننا اس لئے ضروری ہے کہ اگر کوئی شخص، مثال کے طور پر، محمود بن لبیدؓ سے کوئی حدیث بیان کرے، اور یہ دعویٰ کرے کہ ان کا نام صحابہ میں شامل ہے اور الاستیعاب فی معرفت الاصحاب میں لکھا ہوا ہے کہ یہ صحابیؓ تھے، اب اس بنیاد پر ان سے کوئی لمبی چوڑی حدیث روایت کر دے، تو جو آدمی طبقات صحابہ کے علم کو نہیں جانتا وہ دھوکے میں پڑ سکتا ہے کہ واقعی محمود بن لبید صحابیؓ تھے اور ان سے یہ بات منسوب ہے۔ لیکن جو جانتا ہے وہ کہے گا کہ جتنی بھی روایات ان سے منسوب ہیں وہ غلط منسوب ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے رسول اللہﷺ کو پانچ چھ سال کی عمر میں دیکھا تھا یا شاید اس سے بھی کم عمر میں۔ اور اس واقعہ کے علاوہ کوئی روایت ان سے مروی نہیں ہے۔ اس بات کو جاننے کے لئے صحابہ کے طبقات کو جاننا ضروری ہے۔ اس لئے پہلا طبقہ صحابہ کرام کا ہے جس پر الگ بہت سی چھوٹی بڑی سے کتابیں موجود ہیں۔

کبار تابعین کا زمانہ

طبقہ صحابہ کے بعد کبار تابعین کا طبقہ ہے۔ کبار تابعین وہ ہیں کہ جو صحابہ کرام کے ابتدائی دور میں، یعنی سیدنا صدیق اکبرؓ یا سیدنا عمر بن الخطابؓ کے دور میں ہوش وحواس کی حالت میں تھے، صحابہ کا زمانہ انہوں نے طویل عرصہ تک دیکھا، بڑے بڑے صحابہ کرام کی تربیت اور تعلیم میں رہے اور انہوں نے بڑے پیمانے پر صحابہ کرامؓ سے احادیث کو سیکھا۔ جیسے حضرت سعید بن المسیبؒ، جن کو کم وبیش پینتیس چالیس سال تک صحابہ کرام کا زمانہ دیکھنے کا موقع ملا اور صحابیؓ جلیل حضرت ابو ہریرہؓ کے ساتھ انہوں نے پچیس تیس سال گزارے۔ دن رات ان کے ساتھ رہے۔ یہ طبقہ کبار تابعین کا ہے جن کا زمانہ پینسٹھ یا ستر ہجری میں ختم ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد متوسط تابعین کا زمانہ آتا ہے۔ وہ تابعین جنہوں نے کبار صحابہ کو نہیں دیکھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنی، حضرت علیؓ کو اور حضرت ابوعبید بن الجراحؓ کو نہیں دیکھا لیکن متوسط صحابہ کرام کو دیکھا۔ ان کا زمانہ سن نوّے یا سو ہجری کے لگ بھگ آتا ہے اس کے بعد ان کا زمانہ بھی ختم ہو گیا۔ تابعین کے اس طبقہ میں حضرت حسن بصری، محمد بن سیرین وغیرہ شامل ہیں۔

اس کے بعد زمانہ آتا ہے صغار تابعین کا، جنہوں نے صغار صحابہ کو دیکھا۔ صغار صحابہ سے مراد وہ صحابہ ہیں جو حضورﷺ کے زمانے میں بچے تھے۔ بعد میں ان کی عمر طویل ہوئی، سن اسّی میں، نوے میں پچانوے ہجری میں انتقال ہوا۔ ان صحابہ میں حضرت عبداللہ بن اوفی، حضرت انس، حضرت زید بن ثابت، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عمر بن العاص شامل ہیں، یہ وہ صحابہ ہیں جو طویل عرصہ تک زندہ رہے، صغار تابعین نے ان صغار صحابہ کو دیکھا یا ان سے روایت کی۔

صغار تابعین میں وہ لوگ شامل ہیں جنہوں نے صحابہ کرامؓ سے روایت نہیں کی ہے لیکن انہیں دیکھا ہے۔ اتنے بچے تھے کہ انہوں نے صحابہ کرامؓ کو دیکھنے کی سعادت تو حاصل کی لیکن کم سنی کی وجہ سے صحابہ کرام کی کوئی بات ان کو یاد نہیں اور وہ روایت نہیں کر سکے۔ مثلاً امام اعمش، بڑے مشہور محدث ہیں۔ بڑے بڑے محدثین نے ان کی روایات اپنی کتب میں نقل کی ہیں۔ انہوں نے اپنے بچپن میں حج کے موقع پر بعض صحابہ کو دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ روایت ان سے ثابت نہیں

ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا شمار بھی، بہ اختلاف روایات، صغار تابعین کی اس دوسری کیٹیگری میں ہوتا ہے، بعض لوگوں کی تحقیق کے مطابق امام ابوحنیفہ کا شمار صغار تابعین کی اس کیٹیگری میں ہے۔ جنہوں نے کچھ صحابہ سے روایت بھی کی ہے۔ انہوں نے بعض اصحاب رسولؐ کو دیکھا ضرور ہے۔ وہ اپنے لڑکپن میں اپنے والد کے ساتھ حج کے لئے گئے۔ خود بیان کرتے ہیں کہ میری عمر بارہ تیرہ سال تھی۔ مکہ مکرمہ میں ایک جگہ دیکھا کہ بڑا ہجوم لگا ہوا ہے اور لوگ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش میں ہیں۔ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ انہوں نے کہا کہ صحابی جلیلؓ حضرت انس بن مالک حج کے لئے تشریف لائے ہیں، لوگ ان کو دیکھنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ میں اپنے والد سے انگلی چھڑا کر ہجوم میں گھسا اور دیکھا کہ حضرت انس کھڑے تھے اور لوگ ان سے سوالات کر رہے تھے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ انہوں نے بھی کوئی سوال پوچھا، بعض روایات میں آتا ہے کہ انہوں نے کچھ نہیں پوچھا، بعض روایات میں آتا ہے کہ انہوں نے کوئی بات سنی اور آگے نقل کی، بعض روایات میں آتا ہے کہ سنی تو تھی لیکن یاد نہیں رہی۔ لیکن دیکھنا ثابت ہے۔ بہر حال یہ وہ صغار تابعین ہیں جو تابعین کے سب سے چھوٹے طبقہ میں آتے ہیں۔

اس کے بعد اتباع تابعین میں یعنی تبع تابعینؒ میں سب سے بڑا طبقہ ہے ان اتباع تابعین کا جنہوں نے بڑے تابعین کو دیکھا۔ پھر اسی طرح سے تبع تابعینؒ کا طبقہ وسطیٰ یعنی درمیانی طبقہ۔ پھر تبع تابعینؒ کا سب سے چھوٹا طبقہ، جنہوں نے چھوٹے تابعین کو دیکھا مثلاً امام شافعیؒ۔ اس کے بعد وہ طبقہ جس نے تبع تابعینؒ کو دیکھا اور ان سے روایت لی۔ پھر وہ طبقہ جس نے متوسطین تبع تابعینؒ کو دیکھا اور اخیر میں جس نے آخری عمر میں، جب تبع تابعینؒ تھوڑے رہ گئے، ان کو دیکھا۔ یہ رواۃ کے بارہ طبقات ہیں۔

طبقات رواۃ کی افادیت

بظاہر کسی حدیث کے سلسلہ میں ان طبقات کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ لیکن اس سے اس بات میں مدد مل جاتی ہے کہ کسی راوی کے طبقہ کا تعین کیا جاسکے کہ اس کا تعلق کس طبقہ سے ہے۔ جب طبقہ کا تعین ہو جائے گا تو زمانے کا تعین آسان ہو جائے گا۔ جب زمانہ کا تعین آسان

ہوگا تو پھر یہ بات طے کرنا آسان ہو جائے گا کہ ان تابعی یا ان راوی نے جس طبقہ کے راوی سے روایت کی ہے وہ روایت ممکن بھی ہے یا نہیں ہے۔ مثال کے طور پر تبع تابعین کے چھوٹے طبقہ کا کوئی آدمی تابعین کے بڑے طبقہ سے روایت کرے تو یہ ممکن نہیں ہے۔ اس لئے فوری طور پر آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ اس روایت میں کہیں کوئی جھول ہے۔ مثال کے طور پر امام بخاری امام زہری سے روایت کریں، تو یہ روایت درست نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ امام بخاری نے امام زہری کا زمانہ نہیں پایا۔ امام زہری کی وفات غالباً ۱۲۴ھ میں ہوئی جبکہ امام بخاری کی ولادت ہی ۱۹۴ھ میں ہوئی ہے۔ اب ۱۹۴ھ کی ولادت اور ۱۲۴ھ کی وفات میں تو ستر اسی سال کا فرق ہے۔ اس لئے ان چیزوں سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ روایت میں کوئی جھول ہے اور فوراً اس کا تعین ہو جاتا ہے۔

یہ طبقے تو تھے راویوں کے، جس سے گویا زمانی اعتبار سے تعین کیا جاسکتا ہے کہ کس خاص طبقہ کے راوی نے کس زمانے میں وقت گزارا ہوگا اور کس زمانے میں وہ زندہ ہوں گے۔ اس کے بعد بارہ طبقات یعنی درجات راویوں کے آتے ہیں۔ ان میں ایک تو طبقات یعنی Classes ہیں، یا جیسا میں نے اردو میں کہا پیڑھی، ایک پیڑھی، پھر دوسری پیڑھی، زمانے کے اعتبار سے۔ ایک درجہ ہے درجہ مستند یا غیر مستند ہونے کے اعتبار سے۔ کچھ راوی ہیں جو بڑے اونچے درجے کے ہیں جن کا نام سنتے ہی ہر شخص گردن جھکا دے گا کہ یہ انتہائی اونچے درجے کے روای ہیں۔ عبداللہ بن مبارک کا میں کئی بار نام لے چکا ہوں، ان کا جب نام آئے گا تو کسی تحقیق کی ضرورت نہیں کہ کس درجہ کے راوی ہیں۔ امام بخاری، امام ترمذی، امام احمد بن حنبل کا نام آئے گا تو ہر شخص بلا تامل اس کی روایت کو قبول کرے گا۔ لیکن اس درجہ کے راویوں کا تعین کیسے ہوگا؟ اس کام کے لئے علم جرح وتعدیل کے قواعد مقرر کئے گئے۔

اس ضمن میں سب سے پہلا اصول تو یہ ہے کہ صحابہ کرام سب کے سب عدول ہیں۔ الصحابة کلھم عدول، وہ سب ایک درجہ میں ہیں۔ یہ تحقیق تو ہوسکتی ہے کہ فلاں صاحب صحابیؓ ہیں کہ نہیں ہیں۔ لیکن یہ تحقیق ہونے کے بعد کہ وہ صحابیؓ تھے، پھر مزید تحقیق نہیں ہوگی کہ وہ عادل تھے کہ نہیں، اس لئے کہ صحابہ کے بارے میں یہ بات متفق علیہ ہے کہ وہ سب کے سب عادل تھے۔ صحابہ کرام میں بھی یقیناً درجات ہیں اور اس سے کوئی مسلمان انکار نہیں کرتا۔ مثلاً جو درجہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کا ہے وہ اور صحابہ کا نہیں ہے، جو درجہ حضرت عمر فاروقؓ کا تھا وہ بقیہ صحابہ

کا نہیں ہے۔ جو درجہ عشرہ مبشرہ کا تھا وہ دوسرے صحابہ کا نہیں ہے۔لیکن علم حدیث کی روایت کی حد تک سب کا درجہ برابر مانا جاتا ہے۔

صحابہ کرامؓ کے بعد بقیہ راویوں کا جو سب سے اونچا درجہ ہے، وہ ان لوگوں کا درجہ ہے جن کے لئے اصطلاح استعمال کی جاتی ہے یا تو الحجہ، یا الثقہ ، یا اتفقوا علی جلالتہ قدرہ وشانہ، رجال کی اکثر کتابوں میں آتا ہے، مثلاً یحیٰ بن معین اوران کے درجہ کےلوگوں کے بارہ میں ملے گا اتفقوا علیٰ جلالتہ قدرہ وشانہ، کہ تمام محدثین ان کے مرتبہ کی بلندی پر اور ان کی اعلیٰ شان پر متفق ہیں۔ گویا یہ سب سے اونچے درجہ کے راوی ہیں۔اگر میں الفاظ کی مثالیں دینے پر آؤں گا تو بات بہت لمبی ہو جائے گی اس لئے اس کو یہیں پر چھوڑ دیتا ہوں۔ ہر درجہ کے لئے الگ الفاظ ہیں جو راوی کا درجہ بیان کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں اور جن سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ راوی کا کیا درجہ ہے۔ میں صرف دو تین درجات کے حوالے دوں گا باقی میں چھوڑ دیتا ہوں۔

اس کے بعد تیسرا درجہ ان راویوں کا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ثقہ متقن ۔ یعنی یہ ثقہ اور قابل اعتماد راوی ہیں۔ اس بعد چوتھا درجہ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ لا بأس به ،کوئی حرج نہیں ہے۔یعنی جسے انگریزی میں not bad کہیں گے۔گویا اب کمزوری شروع ہوگئی۔ کمزور تو نہیں ہیں لیکن کمزوری سے اوپر جو درجات ہیں ان میں سے یہ آخری درجہ ہے۔اس کے بعد جو درجہ آتا ہے وہ ہے صدوق، ہاں سچی بات کہا کرتے تھے، بات صحیح کہا کرتے تھے۔یعنی گویا ان کی سچائی کے بارے میں تو گواہی ہے لیکن یادداشت اور حافظہ کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا۔اس کے بعد اگلا درجہ ہے کہ صدوق سئی الحفظ ،یعنی نیت کے اعتبار سے خود تو سچے تھے لیکن حافظہ برا تھا۔اس طرح سے ایک ایک کر کے بارہ درجات ہیں جن میں سے آخری چار درجے کمزور اور ضعیف راویوں کے ہیں ۔آخری درجہ اس جھوٹے راوی کا ہے جو جھوٹی احادیث وضع کرتا تھا، جس کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ یہ جھوٹا راوی تھا۔ان لوگوں کے الگ سے تذکرے موجود ہیں۔

یہ جو بارہ درجات یا بارہ طبقات ہیں یہ تقریباً تمام علماء رجال کے متفق علیہ ہیں ۔ یہ تفصیل جو میں نے بیان کی ہے یہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب 'تقریب التہذیب' میں دی ہے۔تقریب التہذیب بہت اہم لیکن انتہائی مختصر کتاب ہے جو ایک جلد میں بھی چھپی ہے، دو

جلدوں میں بھی چھپی ہے اور تین جلدوں میں بھی چھپی ہے۔ میرے پاس لاہور کا چھپا ہوا ایک جلد کا نسخہ ہے، اس میں ایک جلد میں انہوں نے تمام کتب رجال کا گویا ملخص دے دیا ہے۔ جس سے آپ کو ایک سرسری اندازہ ہو جائے گا کہ کسی راوی کی حیثیت کیا ہے۔ لیکن رجال پر مواد کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے کہ اگر اس کو جمع کیا جائے تو پوری لائبریری اس سے تیار ہو سکتی ہے۔ درجنوں جلدوں میں، بیس بیس اور پچیس پچیس جلدوں میں رجال پر کتابیں لکھی گئیں۔ یہ کتابیں دوسری صدی ہجری سے لکھی جانی شروع ہو گئیں۔ اور تقریباً آٹھویں نویں صدی ہجری تک لکھی گئیں اور اس کے بعد بھی لوگوں نے ان کو مرتب کیا۔ یہ کتابیں مختلف انداز اور مختلف سطحوں کی ہیں۔ ان میں سے بعض مصنفین وہ ہیں کہ جو بڑے متشدد تھے اور جن کا معیار بہت اونچا تھا جیسے امام بخاری اور امام مسلم کا معیار بہت کڑا تھا۔ انہوں نے جب رجال پر کتاب لکھی تو بہت اونچے معیار کے ساتھ لوگوں کو جانچا۔ ماہرین علم رجال میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ جنہوں نے بڑی نرمی سے کام لیا اور ان کا تساہل مشہور ہے۔ انہوں نے بعض کمزور راویوں کو بھی صحیح قرار دے دیا۔ اور ان میں کچھ لوگ تھے جو معتدل تھے اور ابھی ہم ان سب کا تذکرہ اختصار کے ساتھ کریں گے۔

علم رجال کی شاخیں

رجال پر شروع میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ مختلف علاقوں پر الگ الگ کتابیں تھیں۔ مثلاً سمرقند کے راویوں پر، دمشق کے راویوں پر، کوفہ کے راویوں پر یا کسی خاص قبیلہ کے راویوں پر۔ جیسے جیسے یہ مواد جمع ہوتا گیا زیادہ جامع اور زیادہ مکمل کتابیں سامنے آتی گئیں۔ جن لوگوں نے زیادہ مکمل کام کیا ان میں دو نام بڑے نمایاں ہیں؛ ایک نام حافظ ابن حجر عسقلانی کا ہے اور دوسرا نام امام ذہبی کا ہے۔ امام ذہبی کی چار کتابیں ہیں؛ تذکرۃ الحفاظ، طبقات الحفاظ، میزان الاعتدال فی نقد الرجال اور المجتبیٰ فی اسماء الرجال۔ یہ چاروں کتابیں عام ملتی ہیں اور ان میں سے ہر کتاب کا الگ الگ مقصد ہے اور ہر کتاب کے قاری اور مستفیدین الگ الگ ہیں۔ مختلف لوگوں کی ضروریات کے لحاظ سے انہوں نے یہ چار کتابیں تیار کیں۔

امام نووی، اپنے زمانے کے مشہور محدثین میں سے تھے، صحیح مسلم کے شارح ہیں، ان کی کتاب ریاض الصالحین کا نام آپ نے سنا ہوگا، پڑھی بھی ہوگی، ان کی اربعین نووی بھی

مشہور ہے اور سب سے زیادہ مقبول اربعین وہی ہے، انہوں نے علم رجال پر دو کتابیں لکھیں۔ تهذيب الاسماء اور المبهمات من رجال الحديث۔

رجال میں پھر مزید ذیلی فنون پیدا ہوئے، جن کا ابھی تذکرہ ہوگا۔ حافظ ابن حجر نے کم وبیش نصف درجن کتابیں لکھیں۔ جن کے الگ الگ مقاصد تھے۔ کچھ بطور جامع کتابوں کے، کچھ سابقہ کتب پر استدراکات کے اور کچھ اپنی کتابوں کی تلخیص اور انڈیکس یا ڈائجسٹ کے طور پر۔ آج کل جو کتابیں مروج ہیں وہ حافظ ابن حجر عسقلانی اور امام ذہبی کی کتابیں ہیں۔ اس لئے کہ ان کتابوں کی ترتیب، ان کی خوبصورتی اور جامعیت، ان کے مواد کے بھرپور ہونے نے بقیہ کتابوں سے لوگوں کو مستغنی کر دیا۔ اگر چہ امام بخاری نے جو کتابیں لکھیں وہ آج موجود ہیں، امام ابو حاتم رازی کی کتابیں موجود ہیں، امام ابو زرعہ رازی کی کتابیں موجود ہیں، لیکن چونکہ وہ سارا مواد حافظ ابن حجر اور علامہ ذہبی کے ہاں آ گیا ہے، اس لئے اب لوگوں کو براہ راست امام بخاری اور دوسرے متقدمین کی کتابیں دیکھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اگر چہ وہ دستیاب ہیں۔ تحقیق کرنے والے تحقیق کی ضرورت پڑنے پر ان سے رجوع کرتے ہیں۔

آج کل ایک اچھا کام یہ ہو رہا ہے، جس کی تفصیل آخری خطبہ میں آ رہی ہے، کہ رجال کا یہ سارا مواد کمپیوٹرائز ہونا شروع ہو گیا۔ یہ اتنا بڑا کام ہے کہ چھ لاکھ آدمیوں کے حالات اگر کمپیوٹرائز ہو جائیں اور اس طرح کمپیوٹرائز ہوں کہ اس کا ایک سافٹ ویئر ایسا بن جائے کہ آپ حسب ضرورت آسانی کے ساتھ مدد حاصل کر سکیں، تو یہ کام بہت آسان ہو جائے گا۔ لیکن یہ اتنا لمبا کام ہے اور اتنا مشکل کام ہے کہ جو شخص اس سافٹ ویر کو بنائے گا وہ ایک تو اتنا بڑا محدث ہو کہ کم از کم پانچ دس سال اس نے علم رجال کے مطالعہ میں لگائے ہوں۔ پھر کمپیوٹر کا اتنا بڑا ماہر ہو کہ ایک سافٹ ویئر بنا سکتا ہو۔ اگر دونوں پہلوؤں میں سے ایک پہلو میں بھی مہارت کی کمی ہوگی تو وہ مطلوبہ سافٹ ویئر نہیں بنا سکے گا، اسی لئے اس میں دیر لگ رہی ہے۔ جو حدیث کے ماہرین ہیں وہ کہتے ہیں کمپیوٹر فضول چیز ہے اس میں کیوں وقت ضائع کریں۔ جو کمپیوٹر کے ماہرین ہیں ان کے پاس اتنا وقت نہیں کہ دس بیس سال حدیث کے مطالعہ میں لگائیں۔ اس لئے ایک دو دن میں یہ آنے کی چیز نہیں۔ اس پر تو سو پچاس افراد مل کر وقت لگائیں گے تب یہ چیز آئے گی۔ اس لئے مشکل پیدا ہو رہی ہے۔

رجال کی ان کتابوں کے ساتھ ساتھ، جن کی تعداد سینکڑوں میں ہے، جن میں کم وبیش ایک درجن کتابوں کا میں نے آپ کے سامنے ذکر کیا، ان کے ساتھ ساتھ کچھ کتابیں اور بھی ہیں جو براہ راست رجال، یعنی رجال حدیث پر تو نہیں ہیں، لیکن حدیث سے ملتے جلتے موضوعات پر ہیں۔ حدیث کا جو فیڈنگ میٹیریل (Feeding material) ہے، یعنی جس سے علم حدیث میں مدد ملتی ہے یا اس کو علم حدیث سے مدد ملتی ہے، اس سے متعلق بھی کچھ کتابیں ہیں، مثال کے طور پر طبقات المفسرین کے نام سے کتابیں ہیں۔ مختلف ادوار میں کون کونسے مفسرین رہے۔ کس کس نے تفسیر پر کتابیں لکھیں۔ اس مواد سے بھی علم رجال میں مدد ملتی ہے۔ اس لئے کہ بہت سے مفسرین وہ ہیں جو محدثین بھی ہیں، مثلاً امام ابن جریر طبری جنہوں نے تفسیر پر بھی کتاب لکھی اور وہ بیک وقت حدیث کے عالم بھی ہیں اور حدیث کی روایات بھی بیان کرتے ہیں۔ یہ جو تفسیری روایات ہیں یہ علم حدیث میں بھی آتی ہیں۔ اس لئے طبقات مفسرین میں جو تذکرے ملیں گے ان میں بہت سے لوگ علم حدیث میں بھی relevant ہوں گے۔ طبقات القراء، قرآن پاک کے قراء کے طبقات ہیں۔ قراء جو روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فلاں لفظ کو اِس طرح پڑھا، یا اُس طرح پڑھا، یہ بھی علم حدیث کا حصہ ہے۔ تجوید اور قرات سے متعلق بہت سی روایات علم حدیث میں شامل ہیں۔ اس طرح طبقات قراء میں بہت سے لوگ علم حدیث سے متعلق ہوں گے۔ اسی طرح سے طبقات صوفیا ہے، مثال کے طور پر تابعین میں بہت سے لوگوں کا بطور صوفیا کے ذکر ہوتا ہے۔ طبقات صوفیا کی ہر کتاب میں بعض صحابہ کا ذکر ملے گا مثلاً حضرت ابوذر غفاریؓ کا ذکر ہوگا، حضرت علیؓ کا ذکر ہوگا جو ترک دنیا میں ذرا نمایاں تھے۔ اب ظاہر ہے تابعین کا ذکر آئے گا جن میں سے بعض نے احادیث بھی بیان کی ہیں۔ حضرت حسن بصری کا ذکر ہر تذکرہ صوفیا میں آئے گا، وہ بیک وقت محدث بھی تھے اور صوفی بھی۔ اس لئے طبقات کی ان کتابوں میں جن میں طبقات قراء، طبقات مفسرین، طبقات صوفیا، طبقات اُدبا، طبقات حکما سب شامل ہیں، یہ بھی علم رجال کو جزوی طور پر مواد فراہم کرتے ہیں۔

پھر ان کے ساتھ فقہائے اسلام کے الگ الگ طبقات ہیں۔ طبقات حنفیہ، طبقات مالکیہ، طبقات شافعیہ۔ اب طبقات مالکیہ میں امام مالکؒ کا ذکر ہوگا تو امام مالکؒ کے ذکر کے بغیر کونسا علم رجال مکمل ہوگا۔ ان کا ذکر طبقات مالکیہ میں بھی ہے، اور علم حدیث کی ہر کتاب میں ان کا

ذکر ہوگا۔علم حدیث کی کوئی کتاب امام مالکؒ کے تذکرہ سے خالی نہیں ہوسکتی۔امام اوزاعی کا ذکر فقہ کی ہر کتاب میں ہوگا۔لیکن علم حدیث میں بھی ان کا ذکر ہوگا۔اس لئے طبقات اور علم رجال کی کتابوں میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔

علم رجال کی کتابوں کی ایک اور صنف ہے جس کو مشیخہ کہتے ہیں۔اس سے مراد وہ کتابیں ہیں جن میں کسی ایک محدث نے اپنے شیوخ کا تذکرہ لکھا ہو۔اُس زمانے میں لوگ ایک یا دو یا تین یا دس آدمیوں سے علم حدیث حاصل نہیں کرتے تھے بلکہ ایک ایک آدمی سینکڑوں محدثین کے پاس علم حدیث حاصل کرنے کے لئے جاتا تھا۔کیوں؟ اس کا ذکر میں آگے کروں گا۔اب ایک شخص نے اگر سو آدمیوں سے حدیث سیکھی ہے تو ان سو کا تذکرہ اس نے مرتب کرلیا۔اس تذکرہ کو مشیخہ کہتے تھے۔اس طرح کے مشیخے بڑی تعداد میں ہیں۔امام سخاوی جن کا تعلق دسویں صدی ہجری سے تھا اور اپنے زمانے کے بڑے محدث تھے،انہوں نے لکھا کہ میں نے مشیخہ پر جو کتابیں دیکھی ہیں وہ ایک ہزار سے زیادہ ہیں جو مختلف محدثین نے اپنے اپنے شیوخ کے بارے میں لکھیں۔یہ ساری کی ساری کتابیں فن رجال کا جز ہیں۔پھر جیسے جیسے فن رجال پھیلتا گیا اس کی شاخیں بنتی گئیں۔

اس کے علاوہ فن رجال کی کئی شاخیں تھیں،مثلاً آپ کو معلوم ہے کہ عربی زبان میں لوگوں کا نام الگ ہوتا ہے،لقب الگ ہوتا ہے اور کنیت الگ ہوتی ہے،مثلاً امام بخاری کو بخاری کے لقب سے تو ہم سب جانتے ہیں،لیکن بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ ان کا نام محمد بن اسماعیل تھا۔اگر آپ کسی کتاب میں یہ لکھا ہوا دیکھیں کہ قال محمد بن اسماعیل ،تو شاید بہت کم لوگوں کو یہ پتہ چلے کہ اس سے مراد امام بخاری ہیں۔اسی طرح سے کچھ لوگ اپنی کنیت سے مشہور ہوتے تھے۔مثلاً اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ حضرت عبداللہ بن عثمان نے یہ فرمایا،تو شاید آپ میں سے بہت سے لوگوں کو یہ پتہ نہ چلے کہ میری مراد کیا ہے،عبداللہ بن عثمان حضرت ابوبکر صدیقؓ کا نام تھا۔حضرت ابوبکر صدیقؓ کا نام عبداللہ اور ان کے والد ابوقحافہ کا نام عثمان تھا۔لیکن دونوں اپنی اپنی کنیت سے اتنے مشہور ہوئے کہ اصل نام بہت کم لوگوں کو معلوم ہوسکا۔اس لئے راویوں میں یہ مسئلہ بہت پیدا ہوتا ہے کہ ایک راوی نے ایک جگہ جب حدیث بیان کی تو ایک شاگرد نے اس کو کنیت سے لکھ دیا۔مثلاً حدثنی البخاری،دوسرے نے لکھ دیا کہ حدثنی محمد،تیسرے نے لکھ دیا حدثنی

محمد بن اسماعیل، چوتھے نے لکھ دیا کہ حدثنی ابوعبداللہ۔ اب یہ سب ایک شخصیت کے حوالے ہیں، لیکن جو شخص نہیں جانتا کہ امام بخاری کی کنیت ابوعبداللہ تھی، لیکن وہ مشہور تھے بخاری کے لقب سے، نام ان کا محمد تھا، والد کا نام اسماعیل تھا اس لئے محمد بن اسماعیل بھی کہلاتے تھے، وہ زبردست التباس اور الجھن کا شکار ہوگا۔ لہٰذا کوئی ایسی کتاب ہونی چاہئے جس کی مدد سے یہ پتہ چل جائے کہ کس کی کنیت کیا ہے۔ یہ فن 'موضح' کہلایا۔ موضح الرجال یعنی رجال کی وضاحت کرنے والا، جس میں ان لوگوں کا تذکرہ جمع کیا گیا جن کا نام کچھ اور ہو لیکن وہ اپنی کنیت سے مشہور ہوں۔ یا نام سے مشہور ہوں کنیت کچھ اور ہو۔ تو کہیں کنیت اور نام میں فرق کی وجہ سے التباس نہ ہو۔ اس پر بہت سی کتابیں ہیں۔

اسی طرح سے ایک خاص صنف یا میدان ہے جس کو 'المؤتلف والمختلف' کہتے ہیں۔ المؤتلف والمختلف پر کم از کم ایک درجن کتابیں موجود ہیں۔ یعنی ملتے جلتے ناموں کی تحقیق۔ بعض نام ملتے جلتے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے التباس پیدا ہوسکتا ہے۔ یہاں اتنی خواتین بیٹھی ہوئی ہیں۔ اگر پتہ کریں تو آپ میں سے کم وبیش ایک درجن نام مشترک نکلیں گے۔ ثریا ایک کا نام بھی ہے، دوسری کا بھی نام ہے، تیسری کا بھی نام ہے۔ محدثین اور رواویوں بھی میں اشتراک اسم ہوسکتا تھا اور ہوتا تھا۔ اب یہ بات کہ اگر ایک دور میں ایک سے زیادہ محمد بن اسماعیل ہیں تو کون سے محمد بن اسماعیل مراد ہیں۔ خود صحابہ کرام میں عبداللہ نام کے کم وبیش ایک درجن صحابہ ہیں۔ ان میں سے جو چار مشہور عبداللہ ہیں وہ 'عبادلہ اربعہ' کہلاتے ہیں۔ ان عبادلہ اربعہ میں راوی بیان کرتا ہے حدثنی عبداللہ، مجھ سے عبداللہ نے بیان کیا۔ اب کون سے عبداللہ نے بیان کیا؟ یہ اس وقت تک پتہ نہیں چل سکتا جب تک ان میں سے ہر عبداللہ کے شاگردوں کی فہرست آپ کے پاس موجود نہ ہو۔ عبداللہ بن مسعودؓ سے کسب فیض کرنے والے کون کون ہیں۔ ان کے نمایاں ترین شاگر مثلاً علقمہ ہیں۔ علقمہ کے شاگردوں میں نخعی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ جو ایک اور مشہور عبداللہ تھے ان سے ان کے پوتے شعیب بن عبداللہ روایت کرتے ہیں۔ شعیب بن عبداللہ سے ان کے بیٹے عمر بن شعیب روایت کرتے ہیں، اب اگر آپ سے کوئی حدیث بیان کرے کہ مجھ سے ابراہیم نخعی نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ میرے استاد نے عبداللہ سے یہ پوچھا کہ فلاں معاملہ کس طرح ہوا۔ اب آپ کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ یہاں عبداللہ سے عبداللہ بن مسعود

مراد ہیں، عبداللہ بن عمرو بن العاص مراد نہیں ہوں گے۔آپ کو آسانی سے ایک ابتدائی presumption قائم ہوجائے گی۔اور اگر یہ کہا جائے کہ عمرو بن شعیب نے بیان کیا، وہ روایت کرتے ہیں عبداللہ سے، تو یہاں آپ کو فوراً معلوم ہوجائے گا کہ یہاں عبداللہ سے مراد عبداللہ بن عمرو بن العاص ہیں۔ اس طرح حضرت عبداللہ بن عباسؓ ایک اور عبداللہ ہیں۔ مثلاً کوئی کہے کہ مجاہد نے بیان کیا، مجاہد عبداللہ سے نقل کرتے ہیں، تو جاننے والوں کو اندازہ ہوجائے گا کہ چونکہ مجاہد عبداللہ بن عباس کے شاگرد ہیں اس لئے یہاں عبداللہ سے مراد عبداللہ بن عباس ہوں گے۔ اس لئے مؤتلف والمختلف کے نام سے جو فن ہے، یہ اس کی ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ صحابہ میں یہ التباس زیادہ نہیں ہوتا، لیکن باقی لوگوں میں بہت ہوتا ہے۔ تابعین میں کم، تبع تابعینؒ میں اس سے بھی زیادہ اور اس کے بعد اس سے بھی زیادہ۔ جیسے جیسے راویوں کی تعداد بڑھتی جائے گی اس التباس کے امکانات بڑھتے جائیں گے۔ اس التباس کو دور کرنے کے لئے کچھ حضرات نے پوری زندگی اس کام میں لگائی کہ ایسے راویوں کے حالات جمع کریں جن کے نام اور کنیتیں ملتی جلتی ہیں۔ بعض جگہ ایسا ہے کہ نہ صرف اپنا نام بلکہ والد کا نام اور دادا تک کے نام ایک جیسے ہیں۔ اب تین ناموں سے بھی پتہ نہیں چلتا کہ کون مراد ہے۔ پھر یہاں کنیت سے پتہ چلے گا۔ کہیں وطن کی نسبت سے پتہ چلے گا جیسے نیشاپوری، الکوفی، البصری یا استاد سے پتہ چلے گا۔ اس پر قدیم ترین کتاب امام دارقطنی کی ہے جو مشہور محدث ہیں۔ حضرت خطیب بغدادی جن کا میں نے ذکر کیا ہے، بغداد کے ہیں۔ ان کی بھی اس موضوع پر کتابیں ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ کچھ کتابیں ایسی ہیں جو الگ الگ کتابوں کے راویوں پر مشتمل ہیں۔ مثلاً صحیح بخاری میں جتنے راوی ہیں ان پر الگ کتابیں ہیں۔ اسماء رجال صحیح البخاری۔ صحیح بخاری کے جتنے رجال ہیں وہ کون کون ہیں۔ صحیح مسلم کے رجال پر کتابیں ہیں۔ موطا امام مالکؒ کے رجال پر کتابیں ہیں، مسند امام احمد کے رجال پر کتابیں ہیں، امام ابوداؤد کی سنن پر کتابیں ہے۔ حدیث کی تقریباً تمام کتابوں کے راویوں پر الگ الگ کتابیں موجود ہیں جن میں وہ سارا مواد یکجا مل جاتا ہے۔ اس میں تلاش کرنے میں آسانی ہوجاتی ہے۔ اب اگر رجال کی ساری کتابیں ایک جگہ ہوتیں اور الگ الگ کتابوں کے رجال پر مواد نہ ہوتا تو تلاش کرنا مشکل ہوجاتا۔ اگر ابوداؤد کا راوی آپ کو معلوم ہے تو رجال ابوداؤد میں تلاش کرلیں آسانی سے مل جائے گا۔

اس طرح سے کچھ راوی وہ ہوتے تھے جن کا حافظہ شروع میں اچھا تھا۔ بعد میں عمر زیادہ ہوگئی۔نوے سال،سوسال ہوگئی اور حافظہ جواب دے گیا۔اب کس سن سے حافظہ کمزور ہوا؟ کس سن میں تھوڑا کمزور ہوا کس سن میں زیادہ کمزور ہوا۔ جب تک یہ معلومات نہ ہوں تو یہ تعین دشوار ہے کہ یہ روایت کس دور کی ہے۔اس پر الگ سے کتابیں ہیں۔امام دارقطنی کی ایک کتاب ہے 'کتاب من حدث ونسی'۔ان لوگوں کے تذکرہ کے بارے میں جنہوں نے پہلے حدیثیں بیان کیں اور بعد میں بھول گئے۔وہ سارے نام ایک ساتھ معلوم ہوجائیں گے جن کی یادداشت اخیر میں جواب دے گئی تھی۔اس کتاب میں سنوں کے تعین کے ساتھ بتادیا گیا ہے کہ فلاں سن سے فلاں سن تک ان کا حافظہ ٹھیک تھا،فلاں سن میں کمزور ہونا شروع ہوگیا اور فلاں سن میں بالکل جواب دے گیا۔

کل یا پرسوں میں نے عرض کیا تھا کہ ضعیف حدیث کی ایک قسم ہے مدلس،اس سے مراد وہ حدیث ہے جس میں راوی نے اپنے شیخ کے بارہ میں کوئی **misrepresentation** کی ہو۔غلطی سے یا جان بوجھ کر، کہ جس سے سننے والوں نے یہ سمجھا کہ روای وہ نہیں ہے جس سے انہوں نے روایت لی ہے بلکہ کوئی اور ہے۔میں نے اس سلسلہ میں ایک فرضی مثال دی تھی کہ مثال کے طور پر امام مالکؒ کے زمانے میں مدینہ منورہ میں کوئی راوی ہے جو کمزور ہے۔اب دو شخص جا کر کوفہ یا دمشق میں حدیث بیان کررہے ہیں۔ایک وہ شخص ہے جو امام مالکؒ سے براہ راست روایت کرتا ہے اور دوسرا وہ شخص ہے جس کو امام مالکؒ سے پڑھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ یہ دوسرا شخص اگر کمزور آدمی کے حوالہ سے بیان کرے گا تو لوگ متنفر ہوجائیں گے۔اس سے بچنے کے لئے وہ یہ کہنے لگے کہ حدثنی الامام العادل، الامام الکبیر فی المدینة المنورہ۔اب سننے والے کا ذہن فوراً امام مالکؒ کی طرف جائے گا۔حالانکہ امام مالکؒ مراد نہیں کوئی اور مراد ہے۔اس سے التباس ہوسکتا ہے۔اس لئے ایسی حدیث کو مدلس کہتے ہیں۔مدلسین پر یعنی تدلیس کرنے والوں پر الگ سے کتابیں موجود ہیں۔اس موضوع کو مراتب المدلسین اور طبقات المدلسین کہا جاتا ہے۔

بعض اوقات نام کا حوالہ دینے میں بھی ایک عجیب وغریب لذت معلوم ہوتی ہے۔مثلاً امام محمد بن حسن شیبانی جو بڑے مشہور محدث ہیں، بڑے فقیہ ہیں اور امام ابوحنیفہ کے

شاگردوں میں بڑا نمایاں مقام رکھتے ہیں اور امام ابوحنیفہ کے نوے فیصد اجتہادات انہوں نے ہی مدوّن کیئے ہیں، آج فقہ حنفی امام محمد کی کتابوں کی بنیاد پر قائم ہے۔ امام محمد نے ابتدائی کسب فیض اپنے ہم سبق امام ابو یوسف سے کیا تھا۔ امام یوسف کی عمر زیادہ تھی امام محمد کی عمر کم تھی۔ جب امام ابوحنیفہ کا انتقال ہوا تو امام محمد کی عمر کوئی اٹھارہ انیس سال تھی۔ بقیہ تکمیل انہوں نے امام ابو یوسف سے کی اور چند سال انہوں نے مدینہ منورہ میں امام مالکؒ سے بھی کسب فیض کیا اور مکہ مکرمہ میں حدیث کی تکمیل کرنے کے بعد وہ کوفہ آ گئے۔ جب وہ کوفہ آئے تو امام ابو یوسف اس وقت چیف جسٹس بن چکے تھے۔ امام محمد اور ان کے درمیان تھوڑی سی غلط فہمی ہوگئی جو عام طور پر انسانوں میں ہو جاتی ہے۔ جس دور میں ان دونوں کے درمیان غلط فہمی ہوئی اس دوران امام محمد جب کسی روایت میں امام ابو یوسف کا حوالہ دیتے ہیں تو اس میں اس غلط فہمی یا بدمزگی کے باوجود امام ابو یوسف کا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہیں اگر چہ اس بشری بدمزگی کی وجہ سے وہ امام ابو یوسف کا نام نہیں لیتے، لیکن جو بات بیان کرتے ہیں اس سے ان کے اعلیٰ ترین اخلاقی معیار اور اعلیٰ ترین ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ حدثنی من اثق فی دینه و امانته' مجھ سے اس شخص نے بیان کیا جس کے دین اور امانت پر مجھے پورا اعتماد ہے۔ ناراضگی کی وجہ سے نام نہیں لکھتے، لیکن ناراضگی کے باوجود یہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے ان کے دین اور امانت پر پورا اعتماد ہے۔ حدثنی من اثق فی دینه و امانته' حدثنی الثقه، حدثنی الثبت، حدثنی الحجة الثقه 'مجھ سے ایک ایسے راوی نے بیان کیا جو حجت ہے، ثبت ہے اور ثقہ ہے۔ اور سب کو معلوم ہوتا تھا کہ اس سے امام ابو یوسف مراد ہیں اس لئے یہ حدیث مبہم یا مدلس نہیں ہے۔ لیکن اس سے یہ اندازہ کر لیں کہ اعتماد اور ذمہ داری کتنی غیر معمولی تھی۔ اس طرح کی ایک اور مثال بھی میں عرض کرنے والا ہوں جس سے اُس غیر معمولی اور عظیم ذمہ داری کا احساس ہوگا جو راویان حدیث نے ملحوظ رکھی اور اس ذمہ داری کا ثبوت دیا جو آج ناقابل تصور ہے۔

ایک کتاب اعلام النساء پر بھی ہے اس سے مراد وہ خواتین ہیں جو روایت حدیث سے متعلق رہی ہیں اور ان کا سارا تذکرہ پانچ جلدوں پر مشتمل ایک کتاب میں دستیاب ہے۔ بقیہ تذکروں میں بھی ہے۔ رجال کی ہر کتاب میں مرد راویوں کے ساتھ خواتین راویوں کا تذکرہ بھی موجود ہے۔

جیسے جیسے یہ مواد سامنے آتا گیا۔ وہ مرتب ہوتا گیا، یہاں تک کہ چوتھی پانچویں صدی ہجری تک سارا کام مکمل ہوگیا۔ یہ تحقیق عمل کہ ان میں سے کس راوی پر کیا اعتراض ہے یا کس راوی پر کوئی اعتراض نہیں ہے، اس پر الگ کتابیں لکھی جانی شروع ہوئیں۔ یہ وہ علم ہے جس کو علم جرح تعدیل کہتے ہیں۔ جَرح کے معنی زخمی کردینا اور جُرح کے معنی بھی زخمی کردینا ہیں۔ لیکن عربی زبان میں زخمی کردینا دو مفاہیم میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک مفہوم تو کسی چھری یا ہتھیار سے جسم پر زخم لگا دینے کا ہے اس کے لئے عربی زبان میں جُرح کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ایک زخم لگانا دل پر ہے کہ کوئی ایسی بات کہہ دی جو دل کو زخمی کرگئی اس کے لئے جَرح کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

جـراحـات الـسـنـان لهـا التيـام

ولا يـلـتـام مـا جـرح الـلـسـان

کہ تلوار کا زخم تو اچھا ہوجاتا ہے لیکن زبان اور الفاظ کا جو زخم ہوتا ہے وہ مندمل نہیں ہوتا، وہ دیر تک باقی رہتا ہے۔ لہٰذا جرح کے ہیں معنی کسی کے بارے میں ایسی بات کہنا کہ وہ سنے تو اس کو بری لگے۔ لیکن اصطلاحی اعتبار سے اس سے مراد یہ ہے کہ حدیث کے کسی راوی کا کوئی ایسا عیب بیان کرنا جس کی وجہ سے وہ عدالت کے مرتبہ سے ساقط ہوجائے اور اس کی بیان کردہ روایات ضعیف حدیث شمار ہوجائیں یا کسی راوی کی کسی ایسی کمزوری کو بیان کرنا جس کی وجہ سے اس راوی کی عدالت ختم ہوجائے یا عدالت کا درجہ کم ہوجائے، اور اس کی بیان کردہ راویات ضعیف حدیث شمار ہوجائیں۔ یہ ہے جرح کی تعریف۔ علامہ ابن اثیر جو ایک اور مشہور محدث ہیں اور لغت حدیث پر ان کی کتاب 'النهايه في غريب الحديث' بڑی مشہور ہے اور پانچ جلدوں میں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جرح سے مراد وہ وصف ہے کہ جس کی کسی راوی سے جب نسبت کردی جائے تو اس کا اعتبار گھٹ جائے اور اس کی بات پر عمل کرنا لازمی نہ رہے۔ اس عمل کو جرح کہتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ دوسرا عمل ہے تعدیل کا، کہ کسی راوی کے بارے میں یہ تحقیق کرکے بتادیا جائے کہ یہ راوی عادل ہے۔ یہ راوی ان چار شرائط کو، جن میں سے ایک شرط کی تین ذیلی قسمیں ہیں، یعنی سات شرائط کو پورا کرتا ہو، کہ یہ راوی مسلمان تھا، عادل تھا، یعنی ان تمام اخلاقی اور روحانی خوبیوں اور اچھائیوں کا حامل تھا جو ایک راوی حدیث کے لئے ضروری ہیں، اس

کا حافظہ اچھا تھا، اس کا ضبط اچھا تھا، اس کی بیان کردہ روایت میں کوئی علت نہیں ہے، اس کی سند کے راستہ میں کوئی رکاوٹ اور بیچ میں کوئی خلا نہیں ہے اور یہ اونچے کردار کا انسان تھا۔ جب ان ساری چیزوں کی تحقیق ہو جائے تو تحقیق کے اس عمل کو تعدیل کہتے ہیں۔ جرح کے معنی کمزوری بیان کرنا اور تعدیل کے معنی عدالت بیان کرنا۔ گویا جرح اور تعدیل کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔

ایک راوی اگر لوگوں کے مفروضہ میں عادل ہے اور آپ نے یہ بتایا کہ یہ راوی جھوٹا ہے تو اس کی عدالت سلب ہوگئی۔ یا آپ نے کہا کہ جھوٹا تو نہیں لیکن بعض لوگوں نے اس پر جھوٹا ہونے کا الزام لگایا ہے تو وہ مشکوک ہوگیا۔ یا آپ نے اس کے بارے میں تحقیق کر کے پتہ چلایا کہ فاسق ہے اور بعض ایسے اعمال میں مبتلا ہے جن کا کرنے والا فاسق ہو جاتا ہے، نعوذ باللہ شراب پیتا ہے، یا جھوٹی گواہی دی ہے یا کسی ایسی بڑی بدعت میں مبتلا ہے جس کے بدعت ہونے پر اتفاق ہے۔ ایک تو وہ بدعت ہے جس کے بدعت ہونے میں اختلاف ہے، بعض لوگ اس کو بدعت سمجھتے ہیں بعض نہیں سمجھتے، بعض ایک عمل کو سنت سمجھتے ہیں بعض بدعت سمجھتے ہیں، ایسا نہیں بلکہ بدعت کے کسی ایسے عمل میں شریک ہے جس کے بدعت ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ یا یہ مجہول ہے، غیر معلوم ہے، پتہ نہیں کون ہے، کس زمانے کا ہے کس جگہ کا ہے، اس کا استاد کون ہے، علم حدیث کس سے حاصل کیا، یعنی مجہول الکیفیت اور مجہول الحال ہے۔ یا ذات تو معلوم ہے کہ فلاں آدمی ہے، فلاں کا بیٹا ہے فلاں شہر کا ہے۔ لیکن اس کی صفات کا پتہ نہیں کہ کس قسم کا آدمی ہے۔ اچھا ہے کہ برا ہے۔ ان میں سے اگر کوئی چیز اس میں کم ہو تو اس کی عدالت ختم ہو جاتی ہے۔ اور عدالت ختم ہو جائے گی تو وہ راوی مستند نہیں رہے گا۔ اس طرح اگر تعدیل ختم ہوگئی تو جرح ہوگئی۔ اس عمل کو جرح کہتے ہیں۔

اسی طرح ضبط کا معاملہ ہے کہ آپ کی تحقیق میں اس کا حافظہ اچھا تھا، تحمل اور ادا دونوں کے وقت اور اخیر تک اچھا رہا، تحمل سے لے کر ادا تک سب باتیں ٹھیک یاد رہیں، لیکن بعد میں تحقیق سے پتہ چلا کہ اس کا حافظہ ختم ہو چکا تھا۔ شروع سے ختم ہو گیا تھا یا بعد میں ختم ہوگیا، شروع سے خراب تھا یا بعد میں خراب ہو گیا تھا یہ مسئلہ تحقیق سے ثابت ہوگا۔ یا مثلاً کسی راوی کے بارہ میں تحقیق سے پتا چلا کہ ان کا حافظہ تو ٹھیک تھا، لیکن بعض اوقات وہ ایک آدمی اور دوسرے آدمی میں اختلاط کر دیا کرتے تھے یا ایک بات اور دوسری بات میں اختلاط کر دیتے تھے۔ یا یہ ثابت ہوا کہ حافظہ تو ٹھیک ہے لیکن جو روایتیں بیان کرتے ہیں وہ عام ثقہ اور مستند راویوں سے مختلف کوئی

چیز بیان کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر کوئی ایسی بات بیان کرے جو سب راویوں کے بیان سے مختلف ہو۔

مثلاً اکثر راوی یہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز پڑھا کرتے تھے تو یہاں (ناف پر) ہاتھ باندھا کرتے تھے، کچھ لوگوں نے بیان کیا کہ یہاں (ناف کے اوپر) باندھا کرتے تھے، کچھ نے یہ بیان کیا کہ یہاں (سینہ کے اوپر) باندھا کرتے تھے، کچھ نے یہ بیان کیا کہ ہاتھ چھوڑ کر پڑھا کرتے تھے۔ اب یہ چار روایتیں مستند راویوں کے ذریعے آئی ہیں۔ ان چاروں کے بارہ میں یہ اختلاف تو ہوسکتا ہے کہ ان میں بہتر عمل کونسا ہے۔ کچھ کے خیال میں یہاں افضل ہے، کچھ کے خیال میں یہاں افضل ہے، کچھ کے خیال میں چھوڑنا افضل ہے۔ جو مستند اور ثقہ راوی ہیں وہ ان چار میں محدود ہیں۔ اب اس کے علاوہ کوئی شخص کچھ اور بیان کرے مثلاً یہ کہ رسول اللہ ﷺ (نعوذ باللہ) یہاں (گردن پر) ہاتھ باندھا کرتے تھے، بالفرض اگر ایسی روایت ہو تو یہ ثقات کے خلاف ہے، راوی کا درجہ جو بھی ہو لیکن روایت قابل قبول نہیں ہوگی۔ ایسا غیر ثقہ بیان بھی راوی کی عدالت کو ساقط کر دیتا ہے اور اس سے راوی مجروح ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اگر سچا ہوتا تو ایسی بات کیوں بیان کرتا جو عام طور پر کسی نے بیان نہیں کی۔ یا کسی راوی کے بارے میں یہ ثابت ہو کہ اخیر میں کثرت سے ان کو ایسی کیفیت پیش آنے لگی تھی جس میں وہ بات کو بھول جایا کرتے تھے۔ بڑھاپے میں کثرت سے ایسا ہوتا ہے کہ بعض اوقات حافظہ اچھا ہوتا ہے اور بعض اوقات کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ آپ نے اسی نوے سال کی عمر کے بزرگوں میں دیکھا ہوگا کہ پورے پورے ہفتے ایسے گزرتے ہیں کہ یادداشت ٹھیک رہتی ہے اور بعض اوقات اچانک ایسی کیفیت ہو جاتی ہے کہ کچھ یاد نہیں رہتا۔ اپنے گھر والوں کو بھی نہیں پہچانتا۔ تو یہ تحقیق ہونی چاہئے کہ کسی راوی کی یہ کیفیت تھی کہ نہیں تھی۔ بعض اوقات ایک راوی کوئی فاش غلطی کرتا ہے اور وہ ایسی غلطیاں ہوتی ہیں جن سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس طرح کی چند غلطیاں ثابت ہو جائیں تو اس کو بھی عدم تعدیل یا جرح قرار دیں گے اور وہ راوی غیر مستند اور مجروح ہو جائے گا۔

یہ ساری کی ساری اہمیت علم اسناد اور علم جرح و تعدیل کی ہے۔ ذخیرۂ حدیث کا بیش تر دارومدار ان حضرات کی تحقیق اور علم رجال کی تفصیلات پر ہے۔ علم حدیث کے دو بڑے ستون ہیں، ان میں سب سے بڑا اور مرکزی ستون، اگر کسی خیمہ کے درمیانی ستون سے مثال دیں تو وہ علم

اسناد، علم روایت اور علم جرح وتعدیل ہے۔ اسی لئے محدثین کرام نے اس کی طرف زیادہ توجہ دلادی۔ حضرت عبداللہ بن مبارک کا قول میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں۔ انہوں نے فرمایا کہ اسناد دین کا ایک حصہ ہے۔ اگر اسناد نہ ہوتا تو جس کا جو جی چاہتا بیان کر دیا کرتا۔ امام شعبہ بن الحجاج، جن کے بارے میں ہارون الرشید نے کہا تھا کہ وہ پچھوڑ کر اور چھان کر کھوٹے اور کھرے کو الگ الگ کر دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے کھرا اور کھوٹا الگ الگ کر کے ثابت کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ علم حدیث اور جرح وتعدیل کے بہت بڑے امام تھے۔

امام اوزاعی جو فقیہ بھی ہیں اور محدث بھی ہیں، ان کا کہنا یہ تھا کہ علم حدیث اسی وقت زائل ہوگا جب علم اسناد اور علم روایت زائل ہو جائے گا۔ علم اسناد کی بقا علم حدیث کی بقا کے مترادف ہے۔ امام مالکؒ نے فرمایا کہ یہ علم جو تم حاصل کرتے ہو یہ سراپا دین ہے، لہٰذا اس بات کو یقینی بناؤ کہ تم یہ علم کس سے حاصل کر رہے ہو۔ لہٰذا اس علم کو مستند راوی سے حاصل کرو۔ غیر مستند راوی سے حاصل نہ کرو۔ اب سوال یہ ہے کہ مستند اور غیر مستند کا تعین کیسے ہوگا؟ ظاہر بات ہے کہ وہ علم رجال اور علم جرح وتعدیل سے ہوگا۔ سب پہلے جس محدث نے جرح وتعدیل سے کام لیا وہ امام شعبی تھے۔ امام عامر بن شراحیل الشعبی جن کی وفات ۱۰۴ یا ۱۰۲ھ میں ہوئی اور تابعین میں ان کا بڑا اونچا درجہ ہے۔ وہ اپنے زمانے کے بڑے فقیہ اور بڑے محدث تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے اس علم یعنی اسناد اور جرح وتعدیل سے کام لینا شروع کیا۔ حضرت محمد بن سیرین جو تابعین میں ہیں اور علم اسناد میں بڑے مشہور ہیں۔ اسی طرح حضرت حسن بصری، سعید بن جبیر اور ابراہیم نخعی اور ان کے ہم پلہ دیگر حضرات نے سب سے پہلے اس کام کی بنا ڈالی۔ یہ تابعین میں درمیانہ درجہ کے تابعین ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب صحابہ خال خال رہ گئے تھے اور بیشتر کبار تابعین کا زمانہ تھا۔ ان حضرات نے اس فن کو باقاعدہ استعمال کرنا شروع کیا اور سب سے پہلے راویوں کی جرح وتعدیل سے کام لیا۔

جرح وتعدیل اور حسن ظن

جرح وتعدیل کے بارے میں حسن ظن سے کام نہیں چلتا۔ محدثین کا کہنا ہے کہ یہ قرآن پاک میں جو آیا ہے کہ 'ان الظن لایغنی من الحق شیئا' اور حسن ظن سے کام لو، سوئے ظن سے کام مت لو، 'ان بعض الظن اثم'۔ ان اصولوں کا اطلاق علم حدیث پر نہیں ہوتا۔ یہ رسول اللہ ﷺ

کی حدیث کا معاملہ ہے، یہ دین کی ثقاہت اور authenticity کا معاملہ ہے۔ اس میں یہ خطرہ مول نہیں لیا جاسکتا کہ ہم خوش گمانی سے کسی کو باکردار، نکوکار اور راستباز سمجھ لیں اور محض خوش گمانی سے کام لے کر کسی کو سچا سمجھ لیں۔ اس میں تو انتہائی تحقیق سے کام لینا پڑے گا۔ اس میں ذرہ برابر مداہنت یا کمزوری کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ امام مسلم نے اپنی کتاب 'صحیح مسلم' کے مقدمہ میں اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ ان سے کسی نے کہا کہ آپ جرح وتعدیل سے کام لیتے ہیں۔ یہ تو غیبت ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں امام مسلم نے اپنے مقدمہ میں گفتگو کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک پہلو سے اس میں غیبت تو یقیناً ہوتی ہے۔ کسی کو کہیں کہ وہ جھوٹا ہے یا یہ کہیں کہ اس کا حافظہ جواب دے گیا ہے، تو یہ یقیناً اس کی ذات پر ایک منفی تبصرہ ہے۔ لیکن تمام محدثین اور فقہا نے بالاتفاق یہ قرار دیا ہے کہ یہ وہ غیبت نہیں ہے جو شریعت میں ناجائز اور حرام ہے۔ بلکہ یہ تو دین کے تحفظ اور بقا کی خاطر لازمی ہے۔ حدیث رسول بیان کرنے والے راوی دین کی خاطر گواہی دینے والے لوگ ہیں۔ اور اس گواہی کی اسی طرح چھان پھٹک کی جائے گی جس طرح عدالت میں گواہوں کی چھان بین کی جاتی ہے۔

محدثین نے جب گواہوں کی اس چھان پھٹک کے تذکرہ سے آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا ہوگا کہ جرح وتعدیل کا یہ سارا عمل ہوا کیسے؟ یہ پتہ کیسے چلا کہ یہ راوی بھولتا ہے یا نہیں بھولتا؟ یہ راوی سچا ہے کہ جھوٹا ہے؟ اب تو یہ کام بڑا آسان ہے۔ درجنوں بلکہ سینکڑوں کتابیں ہر جگہ دستیاب ہیں۔ کتابوں میں جاکر دیکھ لیں۔ لیکن لوگوں نے اس کام کو کیسے کیا، میں اس کو عرض کرتا ہوں۔

کچھ حضرات نے اپنی پوری زندگی اس کام میں لگائی کہ ان تمام احادیث کو جمع کیا جو ایک راوی سے مروی ہیں۔ مثلاً حضرت عمر فاروق کا ارشاد ہے کہ انما الاعمال بالنیات وانما لکل امرء ما نوی 'یہ بات حضورﷺ نے بیان کی تھی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے منبر پر خطبہ کے دوران بیان کیا کہ میں نے خود یہ ارشاد حضورﷺ سے سنا ہے۔ پھر حضرت عمرؓ سے فلاں نے سنا، پھر فلاں سے فلاں نے سنا۔ اس روایت کو بیان کرنے والے ایک مرحلہ پر جاکر بہت سارے حضرات ہو جاتے ہیں۔ اب ان بہت سارے حضرات کے جو شیخ ہیں وہ ایک ہی ہیں۔ فرض کیجئے شیخ الف سے بیس آدمیوں نے اس کو روایت کیا۔ اب ایک محدث یہ چیک کرنا

چاہتے ہیں کہ ان بیس راویوں کا درجہ جرح وتعدیل کی میزان میں کیا ہے۔ اب وہ یہ کریں گے کہ ایک ایک آدمی کے پاس جا کر ملاقات کریں گے۔ کوئی مدینہ میں ہے تو کوئی مکہ میں ہے، کوئی کوفہ میں ہے تو کوئی بصرہ میں ہے۔ چھ چھ مہینے سفر کر کے ان کے پاس پہنچیں گے۔ اور جا کر ان شاگردوں کے شاگرد بن کر بیٹھیں گے۔ ان سے ان احادیث کی روایت کریں گے۔ بیس آدمیوں سے روایت کا یہ عمل ظاہر ہے کہ ایک دو سال میں مکمل نہیں ہوا ہوگا۔ اس میں بہت وقت لگا ہوگا۔ دس دس سال میں کہیں جا کر مکمل ہوا ہوگا، بیس سال میں ہوا ہوگا، ہم نہیں کہہ سکتے کہ کتنا وقت لگا ہوگا۔ جب یہ عمل مکمل ہو جائے گا تو پھر وہ ان روایات کا باہم مقابلہ کر کے دیکھیں گے۔ اگر وہ یہ دیکھیں کہ انیس راویوں کی روایت ایک جیسی ہے اور بیسواں راوی مختلف بات کہتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بیسویں راوی سے یا تو بھول چوک ہوگئی یا اس کا حافظہ اس میں کام نہیں کرتا تھا، یا اس نے نعوذ باللہ جان بوجھ کر کوئی چیز ملاوٹ کی ہے۔ اب اگر وہ اختلاف یا تبدیلی سنجیدہ قسم کی ہے یعنی ایسی ہے جس سے معنی ومفہوم میں فرق پڑتا ہے، تو یہ اس راوی کے خلاف جائے گا اور اس کی عدالت کمزور ہو جائے گی۔ اور اگر اس اضافہ یا تبدیلی سے معنی اور مفہوم میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، صرف لغت یا الفاظ کا فرق ہے، تو اِس سے اُس راوی کے حافظہ کے بارہ میں رائے پر اثر پڑے گا۔ اور کہا جائے گا کہ گویا اس کا حافظہ اتنا اچھا نہیں تھا، ورنہ جب انیس راوی ایک طرح سے بیان کر رہے ہیں تو پھر بیسواں دوسری طرح کیوں بیان کر رہا ہے؛ اب یا تو اس کے حافظہ میں کمی ہے یا پھر اس کی نیت میں فتور ہے۔ اگر معنی میں فرق پڑتا ہے تو نیت میں اور اگر صرف الفاظ میں فرق ہے تو حافظہ میں فتور ہے۔ اب گویا یہ ایک مفروضہ ہے کہ اس راوی کے حافظہ یا نیت میں سے کسی ایک چیز میں فتور ہے۔ اب وہ محقق اس راوی کی بقیہ روایات کی تحقیق کریں گے۔ ان راویوں کے ساتھ بیٹھ کر وہ پانچ دس سال کسب فیض کریں گے۔ پانچ سال میں ان کی ساری احادیث جمع کرنے کے بعد، ان کے جو اساتذہ ہیں، ان کے پاس جائیں گے۔ اُن سے اِن کی تصدیق کریں گے تو اس میں بھی پچیس تیس سال لگیں گے۔ ان پچیس تیس سالوں میں کہیں جا کر یہ ثابت ہوگا کہ واقعی ان صاحب کے حافظہ میں کمزوری تھی یا نیت میں فتور تھا۔ پھر ان کی جرح کی باری آئے گی اور یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ یہ راوی مجروح ہے۔ یہ کام آسان نہیں تھا۔ اس پر لوگوں کی نسلوں کی نسلوں نے کام کیا اور اس طرح سے مختلف روایات کی **veriations** جمع کیں۔ ان

veriations کو طریق بھی کہتے ہیں۔ وجہ بھی کہتے ہیں اور حدیث بھی کہتے ہیں۔

احادیث کی گنتی کا مسئلہ

یہاں ضمناً ایک اور بات بھی سن لیجئے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ امام بخاری نے چھ لاکھ احادیث میں سے اپنی یہ کتاب صحیح بخاری مرتب کی۔ امام احمد بن حنبل نے سات لاکھ احادیث سے مرتب کی۔ اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ صحیح بخاری میں تو کل دو ہزار اور کچھ سو احادیث ہیں، چھبیس سو کے قریب ہیں تو یہ بقیہ چار پانچ لاکھ احادیث کہاں گئیں؟ منکرین حدیث اس بات کو بہت اچھالتے ہیں کہ دو ہزار حدیثیں لے کر باقی لاکھوں احادیث کو جھوٹی قرار دے کر پھینک دیا گیا ہے۔ یا امام احمد نے ساڑھے سات لاکھ میں سے تیس چالیس ہزار بیان کیں باقی سب جھوٹی تھیں۔ یاد رکھئے یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے۔ یا تو منکرین حدیث علم حدیث سے واقف نہیں ہیں، یا بد نیتی سے ایسا کہتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ اس کی اصل حقیقت کیا ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

جب کوئی محدث یہ کہتا ہے کہ میرے پاس ایک لاکھ احادیث ہیں تو ایک لاکھ احادیث سے ایک لاکھ متن مراد نہیں ہوتے، بلکہ ان کی مراد یہ variation ہوتی ہے کہ بیس آدمیوں کے پاس گئے ان سے جا کر ایک روایت کی تحقیق کی اور حدیث کا متن سنا۔ یوں یہ بیس حدیثیں ان کے پاس ہو گئیں۔ اب وہ کہتے ہیں کہ میں نے شعبہ سے بیس احادیث حاصل کیں۔ وہی ایک روایت بیس اور آدمیوں سے حاصل کی، تو وہ کہیں گے کہ میں نے مزید بیس احادیث حاصل کیں۔ بیس یہ ہو گئیں، بیس شعبہ کی ہو گئیں، تو کل چالیس ہو گئیں۔ حالانکہ وہ بہت کم ہوں گی، ممکن ہے چار ہوں، ممکن ہے پانچ ہوں۔ حضور ﷺ کے بعض ارشادات ایسے ہیں کہ اگر ان کے سارے طُرُق اور ساری روایات کو جمع کیا جائے تو ان کی تعداد کئی کئی سو بنتی ہے۔ مشہور حدیث ہے انما الاعمال بالنیات، اس کے سارے طرق ملا کر سات سو ساڑھے سات سو ہیں۔ ساڑھے سات سو طرق سے یہ روایت آئی ہے۔ اب محدث کہے گا کہ میرے پاس ساڑھے سات سو طرق یا ساڑھے سات سو احادیث ہیں۔ لیکن اصل میں حدیث ایک ہی ہے۔ امام بخاری نے یہ کام کیا کہ وہ ایک ایک حدیث کو کنفرم اور ری کنفرم اور ویریفائی اور ری ویریفائی اور ری ری ری ویریفائی کرنے کے لئے درجنوں آدمیوں کے پاس گئے۔ سینکڑوں اساتذہ کے پاس جا کر ایک ہی حدیث مختلف سندوں

سے حاصل کی۔ایک دوسرے سے کولیٹ (Collate) کیا۔ پھران میں سے جو بہترین سند تھی اس کو انہوں نے اپنی کتاب میں نقل کیا۔ ساری روایتیں اور ساری سندیں نقل کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اگر وہ ایک ایک حدیث کی ساری سندیں نقل کرتے تو شاید پوری صحیح بخاری اس ایک حدیث، انما الاعمال بالنیات کی سند سے بھر جاتی۔ انہوں نے تمام اساتذہ سے تصدیق کرنے کے بعد سب سے بہترین سند کا انتخاب کر کے نقل کر دی اور باقی کو نقل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ لہٰذا جب امام بخاری یہ کہتے ہیں کہ میں نے چار لاکھ احادیث میں سے صحیح بخاری منتخب کی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک ایک حدیث کو میں نے سینکڑوں مرتبہ ویریفائی کیا، درجنوں شیوخ اور صحابہ کی روایات کو جمع کیا اور پھران میں سے جو سند مجھے سب سے زیادہ بہترین لگی میں نے اس کو اختیار کر لیا اور باقی سندوں کو نظر انداز کر دیا لہٰذا جب تعداد بیان کی جاتی ہے تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے۔

امام یحیٰ بن معین جو صحابہ کے بعد محدثین کے سب سے اونچے درجے میں شمار ہوتے ہیں۔ اور اپنے زمانے میں امیر المومنین فی الحدیث کہلاتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب تک مجھے کوئی حدیث تیس طُرُق سے نہ مل جائے، میں اپنے کو یتیم سمجھتا ہوں۔ میں اس حدیث کے بارے میں یتیم ہوں جس کے تیس طرق یا تیس سندیں میرے پاس موجود نہ ہوں، زیادہ ہوں تو اچھا ہے اور جتنی زیادہ ہوں اتنا اچھا ہے۔

ایک بزرگ تھے حضرت ابراہیم بن سعید، جو امام مسلم کے اساتذہ میں سے تھے۔ امام مسلم نے ان سے روایات لی ہیں۔ ان سے ایک محدث ملنے کے لئے گئے اور ان سے کہا کہ میں آپ سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی فلاں روایت سننا چاہتا ہوں۔ آپ کی سند سے وہ کیسے پہنچی۔ گویا یہ ویریفیکیشن اور ری ویریفیکیشن کی ایک قسم تھی۔ انہوں نے اپنی ملازمہ سے کہا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی جو روایات ہیں ان کی 23 ویں جلد لے آؤ۔ اب ان صاحب نے حیرت کے ساتھ سوچا کہ حضرت ابوبکرؓ کی ساری روایات ملا کر بھی شاید چالیس اور پچاس سے زیادہ نہیں بنتیں۔ جو زیادہ سے زیادہ دس پندرہ صفحات کے ایک کتابچہ میں سما سکتی ہیں، تو یہ تیئسویں جلد کہاں سے آ گئی؟ انہوں نے پوچھا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تو ساری روایات مل کر چالیس پچاس کے لگ بھگ بنتی ہیں، ان کی مرویات کی تیئسویں جلد کہاں سے آئی؟ انہوں نے کہا کہ جب تک میرے

پاس کسی ایک روایت کے سو طرق جمع نہ ہو جائیں اس وقت تک نہ میں اس کو مستند نہیں سمجھتا ہوں اور نہ آگے بیان کرتا ہوں۔ میں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ہر روایت کے کم از کم سو سو طرق جمع کر کے ایک ایک جلد میں مرتب کر رکھے ہیں۔ یہ حدیث جو آپ بیان کر رہے ہیں یہ تیئسویں جلد میں ہے۔ حدیث ایک ہے باقی ساری اس کی سندیں ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق سے کس کس نے سنا اور انہوں نے کہاں کہاں بیان کیا۔

اب سو سو سندیں اس طرح بنیں۔ کہ ایک صاحب سن کر کوفہ چلے گئے۔ جب انہوں نے وہاں اس روایت کو بیان کیا۔ وہاں سینکڑوں شاگردوں نے اس ایک حدیث کو سنا۔ تو کوفہ میں الگ سندیں وجود میں آ گئیں۔ ایک دوسرے صاحب سن کر بصرہ چلے گئے تو بصرہ میں الگ سندیں ہو گئیں۔ اب یہ بزرگ پہلے بصرہ گئے، وہاں سے سن کر پھر کوفہ گئے۔ اس طرح سے انہوں نے کئی کئی جلدوں میں اس پورے سلسلہ اسناد کو جمع کیا۔ اس طرح اس مسلسل عمل کے ذریعے روایات اور متون کا باہمی مقابلہ (Collate) کیا گیا۔ یہ کوئی آسان عمل نہیں تھا۔ لیکن اس کے نتیجہ میں راویوں کی بھول چوک کا اور اگر ان کی کوئی کمزوری ہے اس کا پورا پورا اندازہ ہو جایا کرتا تھا۔

اس باب میں سب سے زیادہ سخت امام شعبہ بن الحجاج تھے، جن کے بارے میں چھاننے کی بات ہارون رشید نے کہی تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی کے کئی عشرے اس کام میں لگائے۔ کتنے عشرے لگائے ہم نہیں جانتے۔ لیکن کئی عشرے اس کام میں لگائے کہ مختلف راویوں سے جو احادیث آئی ہیں ان میں ویریئشنز کون کون سی ہیں، اس کی وجہ کیا ہے، کیا حافظہ میں کمی ہے یا کسی اور وجہ سے ویریئشن ہے۔ پھر انہوں نے انتہائی سختی کے ساتھ چھان بین کا یہ کام کیا۔ ان کا معیار بڑا اونچا تھا، انہوں نے اپنے اس معیار سے لوگوں کی جرح و تعدیل کی۔

جرح و تعدیل کے اس عمل میں جن لوگوں نے اپنی زندگی کھپائی۔ پچاس پچاس، ساٹھ ساٹھ اور ستر ستر سال کھپائے، ان کے اندر ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جایا کرتا تھا کہ وہ آسانی سے پتہ چلا لیا کرتے تھے کہ اس روایت میں یہ یہ کمزوریاں ہیں، الفاظ میں یہ ہونا چاہئے اور یہ ہونا چاہئے۔

ایک مشہور محدث ہیں۔ وہ اپنے زمانہ کے صف اول کے محدثین میں سے ہیں، جرح و تعدیل کے امام بھی ہیں، امام ابن ابی حاتم الرازی، جرح و تعدیل پر ان کی آٹھ جلدوں پر مشتمل ایک مفصل کتاب بھی ہے۔ امام ابن ابی حاتم کے پاس ایک صاحب آئے اور کہا کہ میرے استاد

نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی ہے اور پوری سند کے بعد حدیث بیان کی۔ امام ابن ابی حاتم نے خاموشی سے پوری حدیث سنی اور پھر کہا کہ اس میں یہ کمزوری ہے، یہ کمزوری ہے اور یہ کمزوری ہے۔ فلاں کی روایت فلاں سے ثابت نہیں ہے، فلاں کی روایت فلاں واسطہ سے ہے اور فلاں کی فلاں واسطہ کے بغیر ہے۔ کوئی آٹھ دس کمزوریاں بتائیں۔ ان صاحب نے کہا کہ آپ نے تو چیک کئے بغیر یہ سب کمزوریاں بیان کر دیں۔ آخر آپ نے یہ سب کچھ کس بنیاد پر بتادیا؟ غالباً ان صاحب کو شبہ ہوا کہ شاید ایسے ہی کہہ دیا ہو۔ اس پر امام ابن ابی حاتم نے کہا کہ اگر آپ کو میری بات میں کوئی شک یا شبہ ہے تو امام ابوزرعہ رازی، جو ایک اور امام تھے، وہ بھی اسی درجہ کے امام ہیں اور انہوں نے بھی جرح وتعدیل پر ایک کتاب لکھی ہے، ان کے پاس چلے جائیں اور جاکر پوچھ لیں۔ وہ امام ابوزرعہ کے پاس چلے گئے۔ ان سے وہی حدیث بیان کی۔ انہوں نے بھی فوراً ہی کوئی حوالہ یا کتاب چیک کئے بغیر زبانی وہی ساری دس بارہ باتیں دوبارہ بتائیں جو اس سے قبل امام ابن ابی حاتم نے بتائی تھیں۔ اب ان صاحب کو بڑی حیرت ہوئی کہ انہوں نے بھی وہی کچھ بتایا جو ابن ابی ابوحاتم نے بتایا تھا۔ انہوں نے حیرت سے پوچھا کہ آخر آپ یہ سب باتیں کس بنیاد پر بتارہے ہیں، آپ کی دلیل کیا ہے۔ انہوں کہا کہ جب تم کسی سنار کے پاس کوئی کھوٹا دینار لے کر جاتے ہو، اور وہ اس کو دیکھ کر کہے کہ یہ کھوٹا ہے تو کیا اس سے دلیل پوچھتے ہو؟ جیسے سنار کو کھوٹے کھرے کا اندازہ ہو جاتا ہے کیا ہمیں نہیں ہوتا؟ سنار سکہ کو ایک بار ہاتھ میں لے کر ذرا اچھالتا ہے اور اس کو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ سونا کھوٹا ہے کہ کھرا ہے۔ محدث کو، جس کی عمر اس میدان میں گزری ہو، اس کو بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کیا کھرا ہے اور کیا کھوٹا۔

جرح وتعدیل کے مشہور ائمہ

وہ حضرات جنہوں نے جرح وتعدیل میں اپنا مقام پیدا کیا ان کے نام الگ الگ بیان کئے جائیں تو بات بڑی لمبی ہو جائے گی۔ اور اگر جرح وتعدیل میں ان کا اسلوب بھی بیان کیا جائے تو بات بہت زیادہ لمبی ہو جائے گی۔ لیکن میں مختصراً، صرف برکت کے لئے اس نیت سے کہ اللہ تعالیٰ روز قیامت جب ان کا حشر کرے تو ہمیں بھی ان کے ساتھ شامل کر لے، صرف اس وجہ سے میں ان کے نام دہرا دیتا ہوں۔

(۱) امام سفیان ثوریؒ،

(۲) امام مالکؒ،

(۳) امام شعبہ بن الحجاجؒ،

(۴) امام لیث بن سعدؒ،

(۵) سفیان بن عیینہؒ،

(۶) عبداللہ بن مبارکؒ،

(۷) یحییٰ بن سعید قطانؒ،

(۸) یحییٰ بن سعید انصاریؒ۔ (یاد رہے کہ روایت میں یحییٰ بن سعید قطان اور یحییٰ بن سعید انصاری کا درجہ ایک ہے۔ لیکن جرح وتعدیل میں یحییٰ بن سعید قطان کا درجہ اونچا ہے۔)

(۹) وکیع بن الجراحؒ، یہ امام شافعیؒ کے استاد، امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد اور اپنے زمانہ کے صف اول کے محدثین میں سے تھے۔ آپ نے امام شافعی کا شعر سنا ہوگا، وہ انہی وکیع کے بارے میں ہے۔ امام شافعی کہتے ہیں ۔

شَکَوتُ الی وکیعٍ سوء حفظی — فاوصانی الی ترك المعاصی

فان العلم نور من الہٖ — و نور اللہ لایعطیٰ لعاصی

کہ میں نے وکیع سے اپنی یادداشت کی کمزوری کی شکایت کی۔ انہوں نے مجھے گناہ چھوڑنے کی نصیحت کی۔ اس لئے کہ علم اللہ تعالیٰ کا نور ہے اور اللہ تعالیٰ کا نور کسی گناہ گار کو عطا نہیں ہوتا۔

(۱۰) اس کے بعد امام شافعی اور ان کے شاگرد،

(۱۱) پھر امام شافعی کے شاگرد احمد بن حنبلؒ،

(۱۲) احمد بن حنبل کے ہم عصر یحییٰ بن معینؒ،

(۱۳) ان کے شاگرد علی بن المدینیؒ، جو امام بخاری کے استاد ہیں۔

یہ جرح وتعدیل کے بڑے بڑے ائمہ ہیں جو دوسری صدی ہجری کے اواخر اور تیسری صدی ہجری کے اوائل کے ہیں۔ تیسری صدی ہجری کے اوائل میں بھی بڑے بڑے محدثین ہیں

جو جرح وتعدیل کے فن میں اونچا مقام رکھتے ہیں۔ مثلاً امام دارمی جن کی سنن دارمی مشہور ہے۔ ابوزرعہ رازیؒ جن کا ذکر ابھی کیا گیا، امام ابوحاتم رازیؒ، امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ابوداؤدؒ اور ان کے بعد والے طبقہ میں امام دارقطنیؒ۔ یہ سب وہ حضرات ہیں جو علم حدیث اور جرح وتعدیل کے بڑے بڑے امام مانے جاتے ہیں۔ ان کا متفقہ فیصلہ جرح وتعدیل کے باب میں حتمی اور آخری فیصلہ سمجھا جاتا ہے۔ کسی راوی کی جرح تعدیل کے بارہ میں اگر ان حضرات میں اختلاف ہو تو اس کو دور کرنے کے تفصیلی قواعد ہیں جو جرح وتعدیل کی تفصیلات میں آتے ہیں۔

ان حضرات نے جرح وتعدیل کے کام کو کتنی دیانت داری سے کیا اس کی دو مثالیں عرض کرتا ہوں۔ دو مثالیں اس لئے کہ پہلی مثال میں شاید کوئی شبہ ہو جائے۔ ایک بزرگ تھے محمد بن ابی السَّری، جو جرح وتعدیل کے بڑے امام تھے۔ انہوں نے اپنے بھائی حسین بن ابی السری کے بارے میں کہا، کہ 'لا تکتبوا عن اخی فانہ کذاب' میرے بھائی سے روایت نہ کریں اس لئے کہ وہ جھوٹا ہے۔ ممکن ہے کسی کے دل میں خیال آئے کہ بھائی سے لڑائی ہوگئی ہوگی، مکان کی تقسیم پر جھگڑا ہو گیا ہوگا یا باپ کی میراث پر اختلاف ہو گیا ہوگا اس لئے بھائی کی روایت کو قبول نہ کرنے کا مشورہ ہوگا۔ یہ سب باتیں کہنے والے کہہ سکتے ہیں۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر امام علی بن المدینی کی مثال لیجئے جو امام بخاری کے استاد تھے اور اپنے زمانے میں امیر المومنین فی الحدیث کہلاتے تھے، ان کا کہنا ہے کہ 'لا تکتبوا عن ابی، فان ابی ضعیف'، میرے والد کی روایت مت لینا، وہ ضعیف راوی ہیں۔ اپنے والد کو انہوں نے ضعیف قرار دیا اور ان کی روایات کو صحیح قرار نہیں دیا۔ باپ کے بارے میں کسی کا یہ کہنا کہ وہ علم حدیث کی رو سے ضعیف ہے یہ بہت بڑی بات ہے اور یہ بات صرف وہی آدمی کہہ سکتا ہے جو صرف اللہ سے ڈرتا ہو اور دنیا میں کسی اور کا خوف اس کو نہ ہو۔ ورنہ ممکن نہیں کہ کوئی آدمی اپنے باپ کی زندگی میں یہ کہے کہ میرے باپ کی روایت قابل قبول نہیں ہے۔ اور باپ بھی وہ جو متقی مسلمان ہو، عالم ہو، علم حدیث کا استاد اور شارح ہو، لوگ اس سے حدیث پڑھنے کے لئے جاتے ہوں، اس کے بارے میں یہ کہنا آسان نہیں ہے۔

ائمہ جرح وتعدیل کے درجات

علم حدیث اور جرح وتعدیل میں ائمہ فن کا ایک طبقہ بڑا متشدد اور سخت مشہور ہے۔ وہ ذرا سی بات میں راوی کو مجروح قرار دے دیتے ہیں۔ وہ جب کسی راوی کو عادل قرار دیتے ہیں تو بڑی مشکل سے عادل قرار دیتے ہیں۔ وہ کسی کو آسانی سے عادل قرار نہیں دیتے۔ ان متشددین میں یحیٰ بن معینؒ اور ابن ابی حاتم رازیؒ نمایاں ہیں۔ یحیٰ بن معین اور ابو حاتم رازی کے بارے میں لوگوں نے لکھا ہے کہ اگر یہ کسی کو عادل قرار دے دیں تو اس راوی کو دانت سے پکڑ لو، فعضوا علیه بالنواجذ، جس طرح دانت سے مضبوطی سے پکڑا جا سکتا ہے اس طرح پکڑ لو، اس لئے کہ وہ بہت پکا راوی ہے۔ جب ان جیسے لوگ کسی کو عادل قرار دے دیں تو پھر اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اور یہ طبقہ اگر کسی کو مجروح قرار دے تو دیکھو کہ دوسرے لوگ بھی اس کو مجروح قرار دے رہے ہیں یا نہیں۔ اگر دوسرے لوگ بھی اس کو مجروح قرار دے رہے ہیں تو پھر ان کی جرح قابل اعتماد ہے۔ اور اگر دوسرے لوگ مجروح قرار نہیں دے رہے اور صرف یہی متشدد حضرات اس کو مجروح قرار دے رہے ہیں تو پھر دیکھو کہ ان کی جرح کی بنیاد کیا ہے۔ اگر وہ جرح کی کوئی پکی بنیاد اور وجہ بتا رہے ہیں تو پھر ان کی جرح قابل قبول ہے، راوی کو مجروح قرار دے دینا چاہئے۔ لیکن اگر یہ لوگ اپنی جرح کی کوئی بنیاد یا وجہ نہیں بتا رہے ہیں تو ہم یہ سمجھیں گے کہ ان کے معیار کی سختی کی وجہ سے وہ راوی ان کے پیمانے پر پورا نہیں اترا ہوگا۔ اب ایسا پیمانہ کہ کوئی آدمی اپنے باپ کو کمزور قرار دے، یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لئے اتنے اونچے پیمانے پر نہیں ناپنا چاہئے۔ لیکن اگر یہ حضرت اپنی جرح کی کوئی وجہ بتا رہے ہیں کہ میں نے اس کو فلاں کام میں مبتلا دیکھا یا فلاں جگہ غلطی کی یا جان بوجھ کر غلط بیانی کی تو پھر ٹھیک ہے۔ وہ جرح جس کی وجہ نہ بیان کی گئی ہو اس کو جرح غیر مفسر کہتے ہیں یعنی وہ جرح جس کی تفسیر بیان نہیں کی گئی ہو۔ ان حضرات کے جرح غیر مفسر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ معتبر نہیں ہے۔ جرح مفسر معتبر ہے۔

ایک طبقہ ہے متساہلین کا جو تساہل سے کام لیتے ہیں۔ ان حضرات کا انداز یہ ہے کہ انہوں نے اپنے انتہائی تقویٰ کی نظر سے سب کو دیکھا، جو بظاہر نیک اور متقی نظر آیا انہوں اس کو اپنے پر قیاس کیا اور کہا کہ یہ بھی قابل اعتماد ہے۔ ان کی جرح غیر مفسر معتبر ہے، تعدیل غیر مفسر معتبر

نہیں ہے۔ جب وہ کسی کو عادل قرار دیں تو وہ معتبر نہیں ہوگی جب تک وجہ نہ بتائیں کہ ان کو کیوں عادل قرار دے رہے ہیں۔ ان سب متساہلین میں یہ حضرات شامل ہیں: امام حاکم، امام بیہقی اور کسی حد تک امام ترمذی۔ امام ترمذی کے ہاں بھی بڑی حد تک نرمی ہے۔ اور کئی ایسے کمزور راویوں کو انہوں نے عادل قرار دے دیا ہے جو دوسرے محققین کی تحقیق میں مجروح تھے۔

ایک رویہ ہے معتدلین کا جو میانہ روی اور اعتدال سے کام لیتے ہیں۔ ان کی دونوں آراء معتبر ہیں جرح بھی اور تعدیل بھی۔ ان میں امام احمد، امام بخاری اور امام ابوزرعہ شامل ہیں۔

جرح وتعدیل پر جو کتابیں ہیں ان کی تعداد بہت بڑی ہے۔ ثقہ راویوں پر الگ کتابیں ہیں۔ ضعفا پر الگ کتابیں ہیں۔ امام بخاری کی کتاب الضعفاء ہے، امام نسائی کی کتاب ہے کتاب الضعفاء والمتروکین۔ امام دارقطنی کی کتاب ہے۔ ابن عدی کی کتاب ہے الکامل فی الضعفا۔ ان سب کتابوں کا مقصد یہ تھا کہ ایک جگہ الگ سے ضعیف راویوں کی تفصیل بیان کردی جائے تاکہ تلاش کرنے میں آسانی ہو، اور علم حدیث کے راویوں کی تحقیق کرنے والے آسانی سے ان کی تحقیق کرسکیں۔ علم جرح وتعدیل بھی علم رجال کی ایک شاخ ہے۔ اور جس طرح علم رجال ایک بے مثال علم ہے اسی طرح سے علم جرح تعدیل بھی ایک بے مثال علم ہے۔

وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العلمین

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ہمارے اسلاف نے دین کو درست انداز میں پہنچانے کے لئے کتنی کوشش کی ، انہوں نے اپنی ساری زندگیاں اس میں کھپائیں، ذہن میں سوال آتا ہے کہ زندگی کی دیگر ذمہ داریاں، رزق حلال کا حصول، گھریلو اور خانگی ذمہ داریوں کی ادائیگی کس طرح ہوتی تھی؟

واقعی یہ ایک بنیادی سوال ہے۔ اس سلسلہ میں ایک مثال میں آپ کو دیتا ہوں۔ امام ربیعۃ الرائے، یعنی امام ربیعہ بن عبدالرحمٰن ایک بڑے مشہور امام ہیں، امام مالکؒ کے استاد ہیں، علم حدیث اور علم فقہ دونوں میں بڑا اونچا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے والد بہت بڑے تاجر تھے۔ انہوں نے بہت دولت اپنے گھر والوں کو دی اور تجارت کی خاطر کسی دوسرے ملک میں چلے گئے۔ وہاں حالات کچھ ایسے رہے کہ وہ وقت پر واپس نہ آسکے اور آنے میں پندرہ بیس سال لگ گئے۔ جب جارہے تھے تو ایک ننھا بچہ چھوڑ کر گئے تھے جو گھر میں رہتا تھا اور ابھی پڑھنا شروع نہیں کیا تھا۔ ان کی اہلیہ نے ان کے جانے کے بعد اس پیسے کو کسی کاروبار میں لگانے یا محفوظ رکھنے کے بجائے بچے کو جگہ جگہ بھیجا جہاں سے اس نے علم حاصل کیا اور اتنا علم حاصل کیا کہ مدینہ منورہ کے سب سے بڑے امام اور سب سے بڑے عالم ہو گئے۔ ان کی رائے اتنی قابل احترام تھی کہ لوگ دور دور سے سننے کے لئے آتے تھے اور ان کا لقب ہی ہو گیا، ربیعۃ الرائے۔ بیس پچیس سال کے بعد ان کے والد واپس آئے۔ پرانے زمانے میں دستور تھا اور سنت بھی ہے کہ جب آدمی سفر سے واپس آئے تو پہلے مسجد میں جا کر دو رکعت نفل ادا کر کے پھر گھر میں آئے۔ صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں یہ سنت رائج تھی۔ افسوس ہے کہ اب لوگوں نے چھوڑ دی ہے۔ چنانچہ امام ربیعۃ الرائے کے والد پہلے مسجد میں گئے اور نوافل ادا کئے۔ وہاں دیکھا کہ ایک بڑا خوبصورت اور صحت مند نوجوان بیٹھا ہوا ہے اور علم حدیث بیان کر رہا ہے اور لوگ سن رہے ہیں۔ یہ بڑے متاثر ہوئے کہ بڑا خوبصورت نوجوان ہے اور عالم فاضل ہے۔ جب گھر واپس آئے، گھر والوں سے ملے، بیٹے کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ کہیں گیا ہوا ہے، تھوڑی دیر میں آئے گا۔ انہوں نے کہا اچھا۔ پھر پوچھا تو یہی کہا کہ تھوڑی دیر میں آجائے گا۔ اس دوران انہوں نے اپنے پیسوں کے بارے میں پوچھا تو اہلیہ نے بتایا کہ وہ تو میں نے بڑے مفید کاروبار اور بڑی اچھی تجارت میں لگا دیئے ہیں۔ اسی اثنا میں والد صاحب اس منظر کی کئی بار تعریف کر چکے تھے جو وہ مسجد میں دیکھ کر آرہے تھے کہ مسجد میں ایک نوجوان حدیث کا درس دے رہے ہیں۔ جب انہوں نے تھوڑی دیر میں رقم کا حساب پوچھا تو پتہ

چلا کہ گھر میں تو کچھ بھی نہیں ہے سب ختم ہوگیا ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ وہ پیسہ کہاں خرچ ہوگیا تو انہیں بتایا گیا کہ ایسے کاروبار میں لگادیا گیا ہے جو بڑا مفید کاروبار تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ مفید کاروبار کہاں ہے، اس کے اثرات تو کہیں نظر نہیں آرہے ہیں۔ گھر میں تو فقر وفاقہ کا منظر نظر آرہا ہے تو جواب دیا کہ وہ آپ ہی کا بیٹا ہے جو مسجد میں درس دے رہا ہے۔ وہ آپ ہی کا صاحبزادہ ہے اور میں نے سارا پیسہ اس کی تعلیم پر خرچ کردیا ہے۔

اس طرح سے لوگ اپنی عمر بھر کی کمائی علم پر خرچ کردیا کرتے تھے۔ لیکن ایسے حضرات بھی تھے جو ایک سال تجارت کرتے تھے اور ایک سال علم حدیث کے لئے سفر کیا کرتے تھے۔ کچھ لوگ یہ کرتے تھے کہ ایک بھائی نے کاروبار کیا اور دوسرے بھائی کو حدیث کی خدمت کے لئے وقف کردیا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ ابتدائی دس بارہ سال علم حدیث میں لگائے پھر چند سال کاروبار میں لگائے، پھر علم حدیث میں میں چند سال لگائے۔ اس لئے کہ علم حدیث میں کے لئے طویل طویل سفر کرنے پڑتے تھے، اور یہ کام پیسے کے بغیر نہیں ہوسکتا تھا۔ پیسہ حاصل کرنے کے لئے محنت کرنی پڑتی تھی۔

اگر ہم علم حدیث حاصل کرنا چاہیں تو ایسے ادارے کہاں کہاں موجود ہیں براہ مہربانی مزید علم کے لئے رہنمائی کردیں۔

علم حدیث کے الگ اداروں کے بارے میں تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ البتہ دینی اداروں میں ہر جگہ حدیث پڑھائی جاتی ہے۔ بعض جگہ اچھی، بعض جگہ کمزور، لیکن اُس کے لئے آپ کو پہلے آٹھ سال ابتدائی علوم پڑھنے پڑیں گے۔ پھر علم حدیث کا نمبر آئے گا۔ اس لئے آپ عربی سیکھ کر پہلے یہاں خود پڑھنا شروع کردیں۔ یہ تو عمر بھر کا کام ہے۔

حضرات کو آپ اپنے ساتھ ایک ضخیم کتاب لائے تھے اس کا نام بتادیں۔

وہ صحاح ستہ یعنی بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور نسائی کا مجموعہ تھا۔

بخاری کی احادیث کے عنوانات میں کوئی خاص جوڑ نظر نہیں آتا......

یہ بات بظاہر صحیح معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے 'اوصانی خلیلی بثلاث'۔ اس کو بخاری میں دو عنوانات کے تحت بیان کیا گیا ہے باقی کہیں بیان نہیں کیا گیا۔ یہ بڑی غور وخوض کی بات ہے۔ اس موضوع پر لوگوں نے الگ سے کتابیں لکھی ہیں۔ امام بخاری جب

کوئی عنوان بیان کرتے ہیں تو وہ عنوان بڑی گہری بصیرت پر دلالت کرتا ہے۔ بعض اوقات حدیث کے الفاظ میں وہ چیز نہیں ہوتی، لیکن حدیث کے معانی پر غور کریں تو وہ چیز سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً میں نے صحیح بخاری کی آخری حدیث پڑھی تھی جس کا عنوان امام بخاری نے دیا ہے 'باب قول الله عزوجل و نضع موازين القسط ليوم القيامة وان اعمال بنى آدم توزن'۔ یہ اس باب کا عنوان ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے باب میں کہ ہم روز قیامت برابر کا ایک ترازو رکھیں گے اور اس اعلان میں کہ بنی آدم کے اعمال تولے جائیں گے، یہ عنوان ہے اور حدیث ہے كلمتان خفيفتان على اللسان حبيبتان الى الرحمن ثقيلتان فى الميزان سبحان الله وبحمده سبحان الله العظيم، گویا وہ زبان سے نکلنے والا عمل میزان میں بھاری کیسے ہوگا؟ یہ ہلکا سا جملہ جو زبان سے نکلا تو اس کو کیسے تولا جائے گا۔ کیا اس کے تولے جانے کی کوئی شکل ہے؟ جب اس کے تولے جانے کی کوئی شکل ہے تو اعمال کے تولے جانے کی بھی یقیناً کوئی نہ کوئی شکل ممکن ہے۔ جب اعمال کے تولے جانے کا ذکر ہے تو موازین قسط کے معنی معلوم ہو گئے۔ اس طرح سے امام بخاری بالواسطہ طور پر بتاتے ہیں کہ ان کی مراد کیا ہے۔ صحیح بخاری کے عنوانات پر لوگوں نے الگ سے کتابیں لکھی ہیں اور درجنوں جلدوں میں، بعض اوقات بیس بیس جلدوں میں کتابیں لکھی گئی ہیں اور بخاری کے ترجمۃ الباب کی تفسیر کی گئی ہے۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی لاہور کے ایک مشہور محدث تھے، انہوں نے 'تحفۃ القاری فی حل تراجم البخاری' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو ابھی تک چھپی نہیں ہے، لیکن ان کے صاحبزادگان، جن کے پاس وہ کتاب ہے، ان کا کہنا ہے کہ اگر وہ چھپے گی تو پچیس تیس جلدوں میں آئے گی۔ اس میں صرف بخاری کے عنوانات کی تشریح ہے۔ اصل کتاب کی تشریح نہیں بلکہ صرف عنوانات کی تشریح ہے۔

شب برات کے حوالہ سے لوگوں کے جو عقائد ہیں ان کو کیسے درست کیا جائے؟

لوگوں سے ان کے عقائد کے بارے میں لڑنا جھگڑنا نہیں چاہئے۔ لوگ عقائد کے معاملہ میں خاصے متشدد ہوتے ہیں، ایک مرتبہ اختلاف میں شدت پیدا ہو جائے تو پھر کوئی آپ کی بات نہیں سنتا۔ آپ آہستہ آہستہ نرمی سے بیان کریں۔ جو لوگ شب برات پر کچھ عبادت وغیرہ کرتے ہیں وہ بھی یہ سمجھ کر کرتے ہیں کہ حدیث میں شب برات کی عبادت کا ذکر آیا ہے۔ حالانکہ کسی صحیح حدیث میں تو نہیں آیا ہے۔ اس لئے آہستہ آہستہ ان کو قائل کریں۔ اگر پہلے ہی دن تنقید

میں شدت آگئی تو پھر مناسب نہیں ہوگا۔

حدیث میں مردوں کے لئے سونا، چاندی اور پلاٹینیم کی انگوٹھیاں استعمال کرنے کا کیا بیان ہے؟

مردوں کے لئے صرف سونے کی انگوٹھی کی ممانعت ہے۔ چاندی کی انگوٹھی اگر کسی مقصد کی خاطر ہو تو جائز ہے اور بقیہ چیزوں کی انگوٹھی پہننا مردوں کے لئے حرام نہیں ہے جائز ہے، صرف سونے کی انگوٹھی جائز نہیں ہے۔

کیا ہم حضور ﷺ کو بانئ اسلام کہہ سکتے ہیں؟

میرے خیال میں تو نہیں کہنا چاہئے۔ دین تو اللہ تعالیٰ کا ہے، ان الدین عنداللہ الاسلام ، رسول اللہ ﷺ اس کے پہنچانے والے اور داعی ہیں۔ میرے خیال میں بانی کہنا درست نہیں ہے۔

بیہقی اور ترمذی کے حوالہ سے شعبان کی پندرھویں کی روایت کا بیان ہے۔

محدثین میں جو ذمہ دار حضرات ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اس لئے اس سے کوئی چیز ثابت نہیں ہوتی۔ لیکن چونکہ حدیث ترمذی اور بیہقی میں آئی ہے اس لئے اگر کچھ لوگ اس پر عمل کرتے ہیں تو ان سے نہ اختلاف کرنا چاہئے اور نہ خواہ مخواہ الجھنا چاہئے۔ کیونکہ وہ اپنی دانست میں تو حدیث پر ہی عمل کر رہے ہیں، چاہے وہ ضعیف ہی ہو۔ اور حدیث ضعیف کی تحقیق میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ ایک محقق کے نزدیک وہ ضعیف ہوگی تو دوسرے کے نزدیک وہ حسن لغیرہ ہوگی، تیسرے کے نزدیک حسن لعینہ ہوگی۔ تو چونکہ اس طرح کا اختلاف ہوسکتا ہے اس لئے اس میں زیادہ سختی سے کام نہیں لینا چاہئے۔ امام بیہقی کا مقام بہت ہی اونچا ہے۔ ان کا مقام اتنا اونچا ہے کہ وہ سند کے ساتھ احادیث بیان کرنے والوں کے سلسلہ کے آخری محدث ہیں۔ لیکن ان کی کتابوں میں بعض احادیث ضعاف بھی ہیں، بعض کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ موضوعات بھی ہیں۔ لیکن کسی کی غلطی سے اس کے مقام پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ غلطی سے مبرا ذات تو بس ایک ہی ہے وہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اس رات بانٹ دیا جاتا ہے ہر حکمت والا کام......،

اکثر علماء کے نزدیک اس سے لیلۃ القدر ہی مراد ہے۔

شب برات کے متعلق وضاحت کریں۔

بھی لوگوں کو شب برات کرنے دیجئے۔ اگر لوگ آپ سے پوچھیں تو آپ صرف اتنا بتادیجئے کہ شب برات کی کوئی با قاعدہ عبادت صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ لٹھ لے کر پیچھے پڑ جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ جا کر ریڈیو اور ٹی وی والوں سے لڑیں، یہ صحیح نہیں ہے۔ اس سے مسائل بگڑتے ہیں اور خیالات میں شدت پیدا ہوتی ہے۔ نرمی سے کام لیں۔ سختی وہاں کرنی چاہئے جہاں واضح طور پر کوئی چیز دین میں حرام اور ممنوع ہو، اور منکر کی حیثیت رکھتی ہو۔ جہاں اختلافی چیز ہو وہاں شدت نہیں کرنی چاہئے۔ صحابہ کرامؓ میں بھی اختلاف تھا۔ ایک کے نزدیک ایک عمل سنت تھا۔ دوسرے کے نزدیک دوسرا عمل سنت تھا۔ ایک صحابیؓ نے بیان کیا کہ اگر آگ پر پکی ہوئی کوئی چیز کھالی جائے تو اس سے وضوٹوٹ جاتا ہے۔ یہ بات حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے سامنے بیان ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ اگر میں سر میں گرم تیل لگاؤں تو کیا مجھے دوبارہ وضو کرنا پڑے گا؟ کیا اگر میں گرم پانی سے وضو کروں تو دوبارہ وضو کرنا پڑے گا؟ گویا انہوں نے اس کو قبول نہیں کیا۔ اگر صحابہ میں اختلاف ہوسکتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے خلاف لٹھ لے کر نہیں نکلے تو ہم کیوں نکلیں؟ آپ شب برات پر عبادت کرنے والوں کو عبادت کرنے دیجئے۔ اس طرح کے معاملات میں زیادہ سختی نہیں کرنی چاہئے۔

ایک عالم اور محدث جو یہ جانتے ہیں کہ جو شخص حضور ﷺ سے جھوٹ بات منسوب کرے وہ دوزخ میں اپنا ٹھکانہ بنالے، پھر وہ ضعیف حدیث کیوں بیان کرتے ہیں؟

دیکھئے ضعیف حدیث ایک درجہ میں تو حدیث ہے۔ محدثین کا کہنا ہے کہ اس کو بیان کرتے وقت اس کے ضعف کا حوالہ دے دینا چاہئے کہ ایک ضعیف حدیث میں یہ بات آئی ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر ضعیف حدیث میں کوئی ایسی بات آئی ہو کہ جو ویسے خود اپنی جگہ ٹھیک ہو اور ثابت ہو، اس کو بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ایک ضعیف حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا کو صلوٰۃ التسبیح سکھائی۔ اس کا ضعف بھی کم درجے کا ہے اور اس میں ایک نماز کی تلقین ہے۔ اب اگر کوئی اس پر عمل کرنا چاہے تو کرلے، اچھی بات ہے اور اگر نہ کرنا چاہے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ کسی ضعیف حدیث کی بنیاد پر مسلمانوں میں کوئی اختلاف پیدا کرنا میرے خیال میں مناسب نہیں ہے۔

حضرت ابوبکرؓ حضور ﷺ کے بہت قریب تھے اور ہر وقت ساتھ رہتے تھے پھر ان سے اتنی

کم روایات کیوں ہیں؟

یہ بڑا اچھا سوال ہے۔ بات یہ ہے کہ روایات کی ضرورت اس وقت محسوس کی گئی جب صحابہ کرامؓ کی تعداد کم ہوتی گئی۔ چونکہ عام طور پر صحابہ کرام کو معلوم تھا کہ فلاں معاملہ میں حضور ﷺ کا فیصلہ کیا تھا اس لئے صحابہ کو آپس میں حدیث بیان کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ حدیثیں بیان کرنے کی ضرورت اس وقت پیش آئی جب تابعینؒ کا دور آیا اور تابعین کو رہنمائی کی ضرورت پیش آئی۔ صحابہ کرامؓ نے ان سے بیان کیا کہ کس معاملہ میں حضورؐ کی راہنمائی اور تعلیم کیا تھی۔ جب تک رہنمائی کی ضرورت پیش نہیں آئی تو صحابہ کرام نے روایات بیان نہیں کیں۔ ان حالات میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کس سے روایات کو بیان کرتے۔ اس لئے جو صحابیؓ جتنے متقدم ہیں یعنی جن کا زمانہ جتنا قدیم ہے ان سے روایات اتنی ہی کم ہیں۔ اور جن صحابہ کا زمانہ جتنا بعد کا ہے ان سے روایات اتنی ہی زیادہ ہیں۔ آپ دیکھیں کہ زیادہ روایات کرنے والے صحابہ وہ ہیں جن کی وفات سن اسّی، پچاسی، نوے ہجری یا اس کے بعد ہوئی، اس لئے کہ ان کو زیادہ ضرورت پڑی، لوگوں نے زیادہ رجوع کیا۔ حضرت عمرؓ سے اسی لئے روایات کم ہیں۔

کیا جرح و تعدیل کے بھی درجات ہیں؟

جی ہاں جرح وتعدیل کے بھی درجات اور طبقات ہیں۔ جن بارہ طبقات کا میں نے حوالہ دیا وہ مراتب رواۃ کہلاتے ہیں۔ ان میں پہلے چھ طبقات تو مقبول راویوں کے ہیں اور بقیہ چھ طبقات کمزور راویوں کے ہیں جن میں سے آخری چار متروک راوی ہیں اور ان کی روایت قبول نہیں کی جاتی۔ یہ خلاصہ آپ علامہ حافظ ابن حجر کی تقریب التہذیب کے مقدمہ میں دیکھ لیں اس میں لکھا ہوا ہے۔

حدیث میں مرغے کے بولنے کے وقت کی دعا کیوں سکھائی گئی ہے؟

میرے خیال میں یہ جو دعا سکھائی گئی ہے یہ بھی ایک ضعیف یا موضوع حدیث ہے۔ مجھے اس کی تحقیق نہیں ہے اس لئے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

اگر علم حدیث کے شعبہ کو اپنانا چاہوں تو کیا پہلے عربی میں ماسٹر کرنا ہوگا؟

اگر آپ علم حدیث میں ماسٹر کرنا چاہیں تو ہمارے ہاں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں داخلہ لے لیں، یہاں اصول الدین میں ایم اے ہوتا ہے، حدیث اور تفسیر میں ایک

سپیشلائزیشن ہے جس میں حدیث کے بنیادی کورسز پڑھائے جاتے ہیں۔ پہلے بی اے آنرز میں اصول الدین کرنا ہوگا جو کہ انٹرمیڈیٹ کے بعد چار سال کا کورس ہے۔ اس میں بھی علم حدیث کے کورسز لازمی ہیں۔ اس کے بعد دو سال کا سپیشل کورس ورک ہے پھر ایک سال کا تھیسس ہے اس میں آپ علم حدیث کے **Intensive** کورسز کر سکتے ہیں۔

کیا آج حدیث کی جو کتابیں شائع کی جاتی ہیں ان میں اتنی ہی احتیاط کی جاتی ہے جتنی پہلے کی جاتی تھی؟

میرے علم کی حد تک واقعی اتنی ہی احتیاط کی جاتی ہے جتنی ہونی چاہئے۔ اتنی احتیاط کی جاتی ہے کہ صحیح بخاری کا جو نسخہ اس وقت ہندوستان اور پاکستان میں رائج ہے اس کی پروف ریڈنگ مولانا احمد علی سہارنپوری جیسے جید اور بالغ النظر عالم نے کی تھی، جو اپنے زمانہ کے صف اول کے محدثین میں سے تھے۔ برصغیر کے محدثین، وہ اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھتے ہوں یا علماء دیوبند کے مسلک سے یا کسی اور مسلک سے، لیکن ان میں بہت سے بالواسطہ یا بلاواسطہ مولانا احمد علی سہارنپوری کے شاگرد ہیں۔ انہوں نے صحیح بخاری کی پروف ریڈنگ کی تھی۔ اسی طرح سے ہمارے ایک دوست، جن کی ایک کتاب کا حوالہ میں اگلے کسی دن کی گفتگو میں دوں گا، ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی، وہ تقریباً بیس سال سے ابن ماجہ کے متن پر کام کر رہے تھے اور ابن ماجہ کا متن اب انہوں نے شائع کر دیا ہے اور تصحیح کا جو زیادہ سے زیادہ امکان ہو سکتا ہے اس امکان کی حد تک انہوں نے کام کیا ہے۔ اسی طرح سے بعض کتابوں پر، جن میں ابوداؤد اور غالباً ابن ماجہ اور ترمذی شامل ہیں اور شاید باقی بھی ہوں گی ان پر علامہ ناصر الدین البانی نے طویل عرصہ تک کام کیا ہے اور بہت عرصہ تک کام کرنے کے بعد اب انہوں نے ان کتابوں کے صحیح ایڈیشن چھپوائے ہیں۔ ان سب کتابوں پر کم وبیش بارہ سو سال سے مسلسل تحقیق کا کام ہو رہا ہے۔ اس لئے آپ اعتماد کے ساتھ ان کتابوں پر بھروسہ کر سکتی ہیں۔

میں حج پر جانا چاہتی ہوں میرا محرم نہیں ہے......

جب محرم نہیں ہے تو آپ پر حج بھی فرض نہیں ہے۔ آپ محرم کے ساتھ حج کریں تو زیادہ بہتر ہے۔ میرا مشورہ یہی ہے۔ آپ کسی کے مشورہ پر نہ جائیں اور اسی مسلک پر عمل کریں کہ بغیر محرم کے حج نہیں ہوتا۔

☆☆☆☆☆☆☆

ساتواں خطبہ

تدوین حدیث

پیر، 13 اکتوبر 2003

تدوین حدیث

تدوین حدیث کے موضوع پر گفتگو کا مقصد اس پورے عمل کا ایک خلاصہ بیان کرنا ہے جس کے نتیجہ میں احادیث نبوی کو جمع کیا گیا، مرتب کیا گیا اور کتابی صورت میں مدون کر کے ہم تک پہنچایا گیا۔ ممکن ہے آپ میں سے بعض کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ تدوین حدیث کا موضوع تو گفتگو کے آغاز میں ہونا چاہئے تھا اور سب سے پہلے یہ بتانا چاہئے تھا کہ احادیث کیسے مدون ہوئیں اور ان کی تدوین کی تاریخ کیا تھی۔

لیکن یہ موضوع میں نے نسبتاً آخر میں اس لئے رکھا ہے کہ ابتدائی چھ دن کی گفتگو سے اس بات کا ایک عمومی اور سرسری سا اندازہ ہو جائے کہ علم حدیث کی تدوین کن مضبوط علمی بنیادوں پر ہوئی ہے۔ جو لوگ علم حدیث کی تدوین کے نقطۂ نظر سے شبہات کا اظہار کرتے ہیں ان کے شبہات کتنے بے بنیاد اور کتنے کمزور ہیں۔ اس کا کچھ اندازہ گزشتہ ہفتہ کی گفتگو سے ہو گیا ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ علم حدیث کے بارے میں محدثین کرام نے جس باریک بینی اور دقت نظر سے کام لیا ہے، جتنی محنت، محبت، عقیدت اور کاوش سے علم حدیث کو آئندہ نسلوں تک پہنچایا گیا اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کو محفوظ کیا گیا وہ پوری انسانی تاریخ کا ایک منفرد، عجیب وغریب اور بے مثال کارنامہ ہے۔ اس کارنامہ سے جو لوگ واقف ہیں اور جن کو اس کارنامہ کی عظمت کا اور اس کے **magnitude** کا تھوڑا سا بھی اندازہ ہے وہ یہ بات سمجھ لیں گے کہ علم حدیث کی تدوین کے بارے میں جو شکوک وشبہات ظاہر کئے جاتے ہیں وہ بالکل بے بنیاد، نہایت کمزور اور بڑے **flimzy** قسم کے ہیں۔ اگر یہ شبہات ناواقفیت پر مبنی ہیں، تو ان سے کسی حد تک صرف نظر کیا

جاسکتا ہے۔ لیکن اگر یہ شبہات کسی بدنیتی پر مبنی ہیں اور اسلام کے بارے میں کسی بدگمانی کو پیدا کرنے کی کوشش کا ایک حصہ ہیں تو پھر یہ ایک بہت بڑا جرم ہے۔ انسانی جرم بھی ہے، علمی جرم بھی ہے اور دینی اور مذہبی جرم بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اس جرم کے اثرات سے محفوظ رکھے جو اس غلط فہمی کا کسی وجہ سے شکار ہو گئے ہیں۔

کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ حدیث کے نام سے آج جو ذخیرۂ علم وہدایت مسلمانوں کے پاس موجود ہے وہ تاریخی اعتبار سے استناد کا وہ درجہ نہیں رکھتا جو کسی مذہبی روایت کے لئے ضروری ہے۔ یہ بات سب سے پہلے مسلمانوں میں سے کسی نے نہیں کہی بلکہ اس کا آغاز مغربی مستشرقین نے کیا۔ مغربی مستشرقین یعنی یورپ اور دنیائے مغرب کے اُن اہل علم نے جنہوں نے اسلامیات اور اسلامی علوم وفنون کا مطالعہ کیا، سب سے پہلے ذات رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نشانہ بنایا۔ سترھویں اور اٹھارویں صدی عیسوی میں اور کسی حد تک انیسویں صدی کے آغاز میں جو کتابیں لکھی گئیں ان میں بیشتر حملے رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی پر ہوتے تھے۔ ایک مسلمان ان بے بنیاد اور غلیظ باتوں کو نہیں دہرا سکتا جو مغربی مصنفین ذات رسالت مآب ﷺ کے بارے میں اپنی کتابوں میں لکھا کرتے تھے۔ لیکن بہت جلد ان کو اندازہ ہو گیا کہ یہ الزامات اتنے بودے، اتنے کمزور، اتنے غیر علمی اور اتنے غیر عقلی ہیں کہ کوئی سنجیدہ اور منصف مزاج شخص ان الزامات سے متاثر نہیں ہو سکتا۔

یا تو یہ وجہ ہو گی یا پھر خود ان کو احساس ہو گیا ہو گا کہ جو باتیں وہ کہہ رہے ہیں وہ غلط ہیں اس لئے انہوں نے اس بے کار مہم کو چھوڑ دیا اور حملہ کا رخ قرآن پاک کی طرف کر دیا۔ یعنی اب توپوں کا رخ قرآن مجید کی طرف موڑ دیا۔ قرآن مجید کے بارے میں بہت سی الجھنیں اور غلط فہمیاں پیدا کی گئیں اور انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے شروع میں قرآن پر انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور بہت سی دوسری زبانوں میں بہت کچھ لکھا گیا۔ ان تحریروں میں قرآن پاک کے بارے میں ہر طرح کی غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ چالیس پچاس سال کے بعد ان کو اندازہ ہو گیا کہ یہ چیز بھی بہت کمزور ہے اور قرآن پاک اتنی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے کہ ان بنیادوں کو اس طرح کے کمزور الزامات کی بنیاد پر ہلانا ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے قرآن مجید کو بھی چھوڑ دیا اور اپنی توپوں کا رخ حدیث نبوی کی طرف کر دیا۔ اب بڑے زور وشور

سے اس موضوع پر دنیائے مغرب میں کتابیں آنی شروع ہوئیں جن سے مشرق میں بھی بڑی تعداد میں لوگ متاثر ہونے لگے۔

میں نام نہیں لوں گا، ان میں بہت سے لوگ دنیا سے چلے گئے ہیں، لیکن مغربی محققین کو جو لوگ حرف آخر سمجھتے ہیں اور کسی انگریز یا کسی مغربی مصنف کے قلم سے نکلی ہوئی کسی بھی کمزور سے کمزور بات کو تحقیق کا سب سے اونچا معیار قرار دیتے ہیں، وہ لوگ بڑی تعداد میں مستشرقین کی تحریروں سے متاثر ہوئے اور انہوں نے حدیث کے بارے میں وہ غلط فہمیاں دہرانا شروع کر دیں جو مغربی مصنفین دہرایا کرتے تھے۔ الحمدللہ یہ دور بھی گزر گیا اور اب مغربی مصنفین نے بھی تسلیم کر لیا کہ علم حدیث کی بنیاد اتنے مضبوط اور گہرے ستونوں پر قائم ہے کہ کوئی اس کو ہلا نہیں سکتا۔ اب ان کا نشانہ دوسری چیزیں ہیں۔

علم حدیث کے بارے میں ان حضرات کا دعویٰ یہ تھا کہ پہلے نہ سنت کا کوئی تصور تھا نہ حدیث کو رسول اللہ ﷺ نے بطور ماخذ شریعت اور ماخذ قانون کے کبھی بیان کیا، نہ حدیث کے نام سے کوئی فن موجود تھا، نہ حدیث اور سنت کی حفاظت کے لئے وہ سب کچھ کیا گیا جو بتایا جاتا ہے، بلکہ یہ سب پروپیگنڈا ہے۔ یہ میں مغربی مصنفین کی بات کر رہا ہوں ذرا غور سے سن لیجئے گا۔

ان کا مفروضہ یہ تھا کہ تیسری چوتھی صدی ہجری میں مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے مختلف اقوام سے کچھ اچھی اچھی چیزیں حاصل کیں، دوسروں سے سیکھ کر اچھے اچھے اصول اپنائے۔ اور ان کو ایک مذہبی تقدس دینے کے لئے رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے منسوب کر دیا۔ یہ ساری سندیں اور ساری چیزیں جعل سازی سے گھڑی گئیں اور انہیں سابقہ لوگوں سے منسوب کر دیا گیا۔

جو آدمی علم حدیث کے بارے میں اتنا بھی جانتا ہو جتنا سمندر میں انگلی ڈال کر پانی حاصل کیا جا سکتا ہے، تو وہ اس بات کے بے بنیاد ہونے کا اتنا ہی قائل ہوگا جتنا کسی بھی بداہت کا انکار کیا جائے تو آدمی اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ جن لوگوں کو علم حدیث سے واقفیت نہیں تھی یا مغرب سے بہت زیادہ متاثر اور مرعوب تھے انہوں نے اس بات کو اس طرح دہرانا شروع کیا کہ بڑی تعداد میں مسلمان اس سے متاثر ہونا شروع ہو گئے۔ کہا جانے لگا کہ احادیث کی بنیاد محض زبانی طور پر کہی سنی باتوں پر ہے۔ امام بخاری نے اپنے زمانے میں جو اِدھر اُدھر کی باتیں سنیں وہ جمع کر دیں جو سب فضول ہیں اور ان کا کوئی اعتبار نہیں۔

جب احادیث کے بارہ میں یہ بے بنیاد اور غیر علمی بات کہی گئی تو محدثین اور علماء تاریخ نے ایک نئے انداز سے علم حدیث پر غور وخوض شروع کر دیا۔ پچھلی چھ نشستوں میں جو گفتگو ہوئی ہے ان کو سننے کے بعد آپ کو یہ بات ویسے بھی بے بنیاد معلوم ہوگی اور یہ خیال ہوگا کہ یہ اتنی کمزور اور غلط بات ہے کہ جس کا جواب ہی نہیں دینا چاہئے۔ چنانچہ شروع میں مسلمان علماء کا یہی رویّہ رہا، اس لئے کہ وہ حدیث سے واقف تھے اور علم حدیث پر ان کی نظر تھی۔ ان کو یہ چیز اتنی کمزور، اتنی سطحی اور مضحکہ خیز معلوم ہوئی کہ انہوں نے اس کا جواب دینا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں میں جو لوگ علم حدیث سے واقف نہیں ہیں یا مغربی تعلیم یافتہ ہیں اور اسلامی علوم وفنون سے ان کو مس نہیں ہے وہ ان باتوں سے متاثر ہو رہے ہیں۔ اس احساس کے بعد مسلمان علماء نے علم حدیث کے ذخائر اور تاریخ کی شہادتوں سے وہ معلومات جمع کیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ علم حدیث کا تحفظ کیسے ہوا۔ ان میں سے بعض کا ذکر پچھلی گفتگو میں آچکا ہے اور بعض کچھ کا ذکر میں آج کی گفتگو میں کر رہا ہوں۔

پہلی بات تو مغربی مصنفین کی طرف سے یہ کہی گئی تھی کہ علم حدیث کا سارا ذخیرہ زبانی روایات کی بنیاد پر منتقل ہوا ہے۔ اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے اور تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیا جائے کہ زبانی روایات کی بنیاد پر علم حدیث مرتب ہوا ہے تو پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا زبانی روایت کی بنیاد پر کوئی چیز منتقل نہیں ہوسکتی؟ کیا ماضی میں زبانی روایات کی بنیاد پر علوم وفنون کے ذخائر منتقل نہیں ہوئے؟ کیا اگر ماضی میں کچھ ذخائر زبانی روایات کی بنیاد پر منتقل ہوئے ہوں تو کیا ان کے بارے میں بھی اسی طرح کے شک وشبہ کا اظہار کیا گیا؟ ان تینوں سوالات کے جوابات نفی میں ہیں۔ دنیا میں بہت سی اقوام کی تاریخ اور دنیا کے بہت سے اقوام کے علمی ذخائر زبانی روایات کی بنیاد پر منتقل ہوئے۔ آج اگر مسلمانوں کی حد تک اس اصول کو مان لیا جائے کہ جو چیز زبانی روایات کی بنیاد پر منتقل ہوئی ہے وہ ناقابل قبول اور ناقابل بھروسہ ہے، تو پھر مسلمانوں کے علاوہ دنیا کی ہر قوم کی روایات دریا برد کرنے کے قابل ہیں۔ اس لئے کہ دنیا کی ہر قوم میں جو روایات مذہبی اور غیر مذہبی، ادبی اور غیر ادبی اور علمی اور غیر علمی منتقل ہوئی ہیں وہ آغاز میں ساری کی ساری زبانی بنیادوں پر ہی منتقل ہوئی ہیں۔ چونکہ پوری دنیا کے تمام تحریری اور غیر تحریری ذخائر بھی زبانی روایات کے ذریعہ منتقل ہوئے ہیں۔ اس لئے پھر ان سب کو دریا برد کر دینا چاہئے۔ ظاہر ہے اس

کے لئے کوئی تیار نہیں ہوگا۔ یونانیوں کا سارا ذخیرہ آج آپ تک کیسے پہنچا؟ جو لوگ یونانیوں کے علوم وفنون پر اظہار تعجب کرتے ہیں ان سب کو اس ذخیرہ سے ہاتھ دھو لینے چاہئیں اور اس سارے ذخیرہ کو دریا برد کر دینا چاہئے۔ کیا آج افلاطون کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مکالمات کا کوئی نسخہ موجود ہے؟ کیا آج منطق پر ارسطو کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی کوئی کتاب دستیاب ہے؟ کیا اس کی تحریریں بوطبقا وغیرہ موجود ہیں؟ کیا حکیم افلاطون اور جالینوس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخے آج موجود ہیں؟ اگر یہ سب چیزیں آج موجود نہیں ہیں تو جس بنیاد پر علم حدیث پر شک وشبہ کا اظہار کیا جا رہا ہے انہی بنیادوں پر ان تمام علوم وفنون کا انکار کر دینا چاہئے؟ اور کہنا چاہئے کہ یہ نسخے افلاطون اور جالینوس نے نہیں بلکہ بعد کے کسی آدمی نے مرتب کئے تھے اور پچھلے لوگوں سے غلط منسوب کر دیئے گئے؟ یہ بات تو بڑی عجیب ہے کہ جو بات اہل مغرب سے منسوب کی جائے وہ چاہے کتنی ہی کمزور ہو ہر صورت میں قابل قبول ہے۔ اور جو چیز مسلمانوں سے نسبت رکھتی ہو اور رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے منسوب ہو، وہ کتنی ہی روز روشن کی طرح ہو کتنے ہی آہنی سلسلہ سے منسلک ہو اس کا انکار کر دیا جائے یہ بات قابل قبول نہیں ہے۔

پھر مزید برآں جو چیز تاریخی طور پر ثابت ہے اور نہ صرف ثابت ہے بلکہ بارہ تیرہ سو سال سے بھی زیادہ مدت تک لوگ اس سے اتفاق کرتے رہے ہیں، وہ عربوں کے حافظہ کا معاملہ ہے۔ عربوں کا حافظہ ضرب المثل تھا۔ عربوں نے اپنے حافظہ کی بنیاد پر جو ذخائر محفوظ رکھے، اسلام سے پہلے کے ذخائر، جن کی بنیاد پر مغربی مصنفین اسلام پر بہت سے اعتراضات کرتے چلے آئے ہیں، جن کی بنیاد پر ان کو یہ پتہ چلا کہ کفار مکہ اسلام پر کس قسم کے اعتراضات کیا کرتے تھے وہ ذخائر آج ہم تک کس ذریعے سے پہنچے ہیں؟ اب یہ بات کہ اگر کفار مکہ نے اسلام پر کوئی اعتراض کیا ہے تو وہ اعتراض تو پتھر کی لکیر ہے اور آہنی دلیل ہے کہ کفار مکہ نے اعتراض کیا تھا اس لئے کہ وہ انہی محدثین کی مرتب کردہ تاریخ میں موجود ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کونسی تاریخ میں موجود ہے؟ انہی تاریخوں میں تو موجود ہے جو بقول مغربی محققین محض زبانی روایات کی بنیاد پر ہم نے آپ تک پہنچائیں۔ مسلمانوں نے دنیا کے سامنے رکھیں۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ وہ روایت تو قابل قبول ہے جس میں کہا گیا ہو کہ ابوجہل نے یہ کہا اور ابولہب نے وہ کہا اور عبداللہ بن ابیؓ نے یہ کہا، لیکن وہ روایت مشکوک ہے جس میں کہا گیا ہو کہ سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے اس طرح

سے فدائیت کا مظاہرہ کیا اور سیدنا عمر فاروقؓ نے اس طرح سے اسلام کی خدمت کی۔ اگر قابل قبول ہیں تو سب قابل قبول ہونی چاہئیں اور اگر نا قابل قبول ہیں تو سب نا قابل قبول ہیں۔ ان دونوں میں فرق اور امتیاز کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

پھر اسلام سے پہلے کے جو ذخائر عربوں نے محفوظ کئے ہیں، عرب شاعری اور خطابت کے نمونے، جاہلیت کے ادب کے نمونے، جن کو گزشتہ ڈیڑھ ہزار سال سے اہل علم وتحقیق پڑھتے چلے آرہے ہیں ان سے عربوں کے اس مزاج کا اندازہ ہو جاتا ہے جو وہ چیزوں کے محفوظ رکھنے کے بارہ میں رکھتے تھے۔ جن لوگوں نے جاہلی ادب کے نمونے جمع کر کے محفوظ کرنے میں اپنی عمریں کھپائی ہیں، جن لوگوں کو سینکڑوں اشعار پر مشتمل قصائد زبانی یاد ہوا کرتے تھے ان کے حافظہ کی مثالیں ضرب المثل ہیں۔ وہ اتنے تواتر کے ساتھ اور اتنی کثرت کے ساتھ منقول ہیں کہ کوئی ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی شخص آج اس بات کا انکار کرے کہ امرأ القیس نام کا کوئی شاعر تھا جس نے فلاں مشہور قصیدہ لکھا تھا تو وہ اس بات کا بھی انکار کر سکتا ہے کہ ہٹلر نام کا کوئی فرمانروا بھی تھا جو جرمنی میں گزرا ہے۔ یا وہ تاریخ کی ہر چیز کا انکار کر سکتا ہے۔

جن لوگوں نے یہ سینکڑوں قصائد محفوظ رکھے جو تسلسل اور تواتر کے ساتھ اسلام سے پہلے سے مشہور چلے آرہے ہیں، جو قوم ان چیزوں کو صرف ادبی ذوق اور دلچسپی کی وجہ سے محفوظ رکھتی ہے، وہ اس غیر معمولی دینی جذبہ اور حمیت کی وجہ سے، جو صحابہ کرام میں موجزن تھا، اس غیر معمولی محبت اور عقیدت کی وجہ سے جو رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کے لئے ان کے دلوں میں موجود تھی، کیوں وہ اس پورے ذخیرہ رشد وہدایت کو محفوظ نہیں رکھ سکتے جن پر احادیث نبوی مشتمل تھیں۔

عربوں کے حافظہ کی مثالیں دیکھنی ہوں تو جاہلی ادب اور شاعری کا مطالعہ کریں کہ رسول اللہ ﷺ کی ولادت مبارکہ سے کئی کئی سو سال پہلے کے قصائد لوگوں نے نقل کئے ہیں اور آج تک اسی طرح محفوظ ہیں۔ آج زمانہ جاہلیت کے درجنوں نہیں سینکڑوں قصائد موجود ہیں۔ معلقات، اصمعیات، مفضلیات اور ایسے ہی دوسرے مجموعوں میں موجود یہ قصائد اسلام سے کئی کئی سو سال پہلے کے ہیں۔ ابھی چند سال قبل ایک معاصر عرب محقق نے تیسری صدی عیسوی کے عربی اشعار کا پتا چلایا ہے جو رسول اللہ ﷺ کی ولادت سے تین ساڑھے تین سو سال پہلے کئے گئے تھے۔

جو قوم ان اشعار کو محفوظ رکھ سکتی ہے، جن کو چودہ سو چوبیس میں آج میں آپ کو پڑھ کر

سکتا ہوں، وہ قوم احادیث اور قرآن پاک کو کیوں محفوظ نہیں رکھ سکتی؟

پھر یہ مفروضہ بھی اپنی جگہ غلط ہے کہ کسی چیز کو محفوظ رکھنے کے لئے جب تک تحریری شہادتیں نہ ہوں وہ محفوظ نہیں رہ سکتی۔ حالانکہ اگر کسی تاریخی حقیقت یا واقعہ کی بنیاد صرف تحریری شہادت ہو تو وہ بھی مشکوک ہے۔ خود تحریری شہادت کے بارے میں یہ کیسے پتہ چلے گا کہ یہ وہی تحریر ہے جو فلاں سن میں لکھی گئی۔ فرض کیجئے کہ آج رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کا کوئی مجموعہ جو سیدنا ابو ہریرہؓ نے لکھا، موجود ہوتا، تو جن لوگوں کے مقدر میں ہدایت نہیں ہے وہ اس مجموعہ کے بارہ میں بھی اسی طرح شکوک وشبہات کا اظہار کرتے جیسے آج کر رہے ہیں۔ مستشرقین کہتے کہ نہیں یہ وہ مجموعہ نہیں ہے جو حضرت ابو ہریرہؓ سے منسوب کیا جاتا ہے، بلکہ یہ تو بعد میں کسی نے لکھ کر آپؓ سے منسوب کر دیا ہے۔ پھر کیا ہوتا؟ انکار کرنے والا اس کا بھی انکار کرتا۔ ماننے والے اس کے بغیر بھی مانتے ہیں، انکار کرنے والے اس کے باوجود ہر چیز کا انکار کر سکتے ہیں۔ انکار کرنے والے تو قرآن کا بھی انکار کرتے ہیں جو ہر طرح سے تواتر کے ساتھ پہنچا ہے۔ اس لئے کسی موافق یا مخالف کے انکار سے بات نہیں بنتی، بات اور دلیل اس بنیاد پر قائم ہوتی ہے کہ جو چیز پہنچائی گئی وہ کتنے استناد کے ساتھ پہنچائی گئی۔ کتنی قوت اور اہتمام کے ساتھ اس کو محفوظ رکھا گیا۔ اس کے متن کی جو اصالت یعنی **purity** اور **pristine character** ہے، اس کو آگے کس طرح سے منتقل کیا گیا۔

جس طرح سے اللہ نے عربوں کو حافظہ سے نوازا، اسی طرح سے یہ اللہ تعالیٰ کی عجیب وغریب سنت ہے اور میں اس کی بابت اپنا مشاہدہ آپ سے بیان کر سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی یہ عجیب وغریب حکمت رہی ہے کہ جو شخص علم حدیث میں دلچسپی لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے حافظہ میں برکت عطاء کر دیتا ہے۔ اس دور میں بھی جن لوگوں کا آپ نے بہترین حافظہ دیکھا ہوگا یا آئندہ دیکھنے کا موقع ملے گا وہ علم حدیث سے وابستہ ہوں گے اور جن کا علم حدیث کے ساتھ اختصاص کا تعلق ہوگا وہ حافظہ اور یادداشت میں دوسروں سے نمایاں طور پر ممتاز نظر آئے گا۔ محدث جلیل مولانا انور شاہ کشمیری کے حافظہ کے واقعات ہم سب نے کثرت سے سنے ہیں۔ ماضی قریب میں شیخ عبدالعزیز بن باز اور شیخ ناصرالدین البانی کے حیرت انگیز حافظہ کا مشاہدہ کرنے والے کثرت سے موجود ہیں۔

خود میرے ایک استاد، جن کی سند سے میں آخری دن ایک حدیث آپ کو سناؤں گا، مولانا عبدالرحمٰن صاحب مینوی، مردان کے قریب کسی علاقہ کے رہنے والے تھے، پٹھان تھے، اردو بہت کم جانتے تھے، جب میں ان سے حدیث پڑھتا تو وہ عربی، اردو پشتو کو ملا جلا کر بولا کرتے تھے۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ فجر کی نماز کے بعد درس کا آغاز کرتے تھے اور ظہر تک مسلسل پڑھایا کرتے تھے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر آرام کیا کرتے تھے، عصر کے بعد واک کرنے جایا کرتے تھے۔ مغرب کے بعد کچھ طلبہ کو ایک اور کتاب پڑھایا کرتے، عشاء کے بعد سو جایا کرتے تھے اور پھر تہجد کے لئے اٹھتے تھے۔ میں نے ان کے کمرے میں کوئی کتاب، کوئی نوٹس، کوئی یادداشتیں، کوئی اس طرح کے پوائنٹس بھی لکھے ہوئے نہیں دیکھے جس طرح کہ میں نے اس کاغذ کے پرزہ پر لکھے ہوئے ہیں۔ وہ فجر کی نماز کے بعد بیٹھتے تھے اور زبانی بیان کرنا شروع کر دیتے تھے۔ پڑھنے والا طالب علم ایک ایک حدیث پڑھتا جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ اس حدیث پر زبانی گفتگو کیا کرتے تھے، اور بتایا کرتے تھے کہ اس حدیث میں دس مسائل ہیں، اس میں گیارہ مسائل ہیں، اس میں پندرہ مسائل ہیں، پہلا مسئلہ یہ ہے، دوسرا یہ ہے، تیسرا یہ ہے۔ اس کے بعد فرماتے آگے چلو، درمیان میں ہر راوی پر ایک ایک کر کے جرح یا تعدیل کرتے تھے کہ اس راوی کے بارے میں فلاں نے یہ لکھا ہے، فلاں نے یہ لکھا ہے اور ہر راوی کی پوری تفصیل بیان کیا کرتے تھے، اس حدیث میں جتنی روایات، طرق یا variations ہوتی تھیں وہ سب بیان کیا کرتے تھے۔ میں نے کبھی ان کو کوئی کتاب چیک کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اگر میں ان کو نہ دیکھتا تو شاید میں بھی کبھی کبھی اس شبہ میں پڑ جایا کرتا کہ جو کچھ محدثین کی یادداشت کے بارے میں سنا ہے وہ شاید مبالغہ آمیز ہو، لیکن چونکہ ان کو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا، اس لئے میرے ذہن میں کسی مبالغہ آمیزی کا وسوسہ نہیں آتا۔ میں نے کئی اور لوگوں کو بھی دیکھا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ علم حدیث سے وابستہ رہنے والے افراد کے حافظہ میں ایک خاص برکت عطا فرما دیتا ہے جو باقی لوگوں کے حافظہ میں اکثر نہیں ہوتی۔

امام احمد بن حنبلؒ جن کے نام سے ہر مسلمان واقف ہے، جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے بارے میں یہ روایت ہے کہ ان کے پاس علم حدیث کے بارے میں اپنی یادداشتوں کے جو تحریری ذخائر تھے، وہ بارہ اونٹوں کے بوجھ کے برابر تھے۔ عربی زبان میں ایک لفظ آتا ہے

'حِمْل'۔قرآن مجید میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے' حِمْل بعیر و انا به زعیم' ایک اونٹ کا بوجھ۔تو حمل اس وزن کو کہتے ہیں جو ایک اونٹ پر لادا جاسکے۔ اور ایک اونٹ پر دونوں طرف لادا جاتا ہے۔ امام احمد کے پاس جو تحریری ذخائر تھے وہ بارہ اونٹوں کے بوجھ کے برابر تھے۔ کتنے ذخائر تھے، یہ تو کوئی اہم بات نہیں ہے۔اس سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔لیکن اصل اور اہم بات یہ ہے کہ امام احمد نے خود کئی مرتبہ یہ بات ارشاد فرمائی اور ان کے جاننے والوں نے اس کی تصدیق کی ہے کہ یہ سارے ذخائر ان کو زبانی یاد تھے۔

یحیٰ بن مَعین نے لکھا ہے کہ میں نے اپنے اس ہاتھ سے چھ لاکھ روایات لکھی ہیں۔ روایات سے مراد ہے کہ ایک حدیث مختلف روایات سے آئے تو حدیث ایک ہی رہے گی۔لیکن روایات بہت سی ہوں گی۔ اس کو حدیث بھی کہتے ہیں، روایت بھی کہتے ہیں اور طریق بھی کہتے ہیں۔تو یحیٰ بن مَعین نے چھ لاکھ روایات اپنے ہاتھ سے لکھی ہیں اور یہ سب کی سب ان کو زبانی یاد تھیں اور ان میں سے کوئی چیز انہیں بھولی نہیں تھی۔

ابوزرعہ رازی نے لکھا ہے، کہ میں نے سفید پر سیاہ رنگ سے کوئی ایسی چیز نہیں لکھی الا واحفظه ، جو مجھے یاد نہیں ہے۔کاغذ پر جو بھی لکھا وہ میں نے یاد کرلیا اور مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یاد ہو گیا۔امام شعبی ، امام ابوحنیفہ کے اساتذہ میں سے ہیں، انہوں نے بھی یہی بات لکھی ہے کہ میں نے کسی سفید چیز پر سیاہ رنگ سے ایسی کوئی چیز نہیں لکھی، اور کسی شخص نے مجھے کوئی ایسی حدیث روایت نہیں کی جو مجھے زبانی یاد نہ ہو، ہر چیز کو میں نے زبانی یاد کیا۔

اسلام کے ابتدائی ادوار میں لکھنا کوئی کارنامہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لکھنے پر تو اب زور دیا جانے لگا ہے۔ ان کے ہاں اصل کارنامہ یہ تھا کہ یاد کتنا ہے۔آپ نے بچپن میں شاید امام غزالیؒ کا قصہ پڑھا ہوگا۔ایک زمانہ میں تیسری چوتھی جماعت کے کورس کی کتاب میں لکھا ہوتا تھا، کہ امام غزالی کئی سال تک طلب علم کر کے کہیں سے اپنے وطن واپس آرہے تھے۔اپنی یادداشتیں، نوٹس اور کتابیں وغیرہ ایک گٹھڑی میں باندھ کر ساتھ لئے ہوئے تھے۔قافلہ پر ڈاکہ پڑا۔ڈاکو دوسری چیزوں سمیت ان کی گٹھڑی بھی اٹھا کر لے گئے۔امام غزالیؒ جو اس وقت نوجوان تھے اور عالم فاضل ہو چکے تھے، ڈاکوؤں کے سردار کے پاس گئے اور کہا کہ میری گٹھڑی میں تو کوئی مال و دولت نہیں تھی، وہ تمہارے کسی کام کی نہیں۔اس لئے وہ مجھے واپس کر دو۔ڈاکوؤں کے سردار نے

کہا کہ اس میں کیا تھا؟ امام غزالی نے کہا کہ میں طلب علم کے لئے گیا تھا اور دس بارہ سال میں جو علم سیکھ کر آرہا ہوں وہ تحریری یادداشتوں کی صورت میں اس گٹھڑی میں موجود ہے۔ میری یادداشتیں اس گٹھڑی میں ہیں، وہ مجھے واپس کردو۔ اس زمانے میں ڈاکو بھی بڑے 'عالم فاضل' ہوتے تھے۔ ڈاکوؤں کا سردار ہنسا اور اس نے کہا کہ اچھا تمہارا علم اس گٹھڑی میں ہے؟ یہ کیا علم ہوا کہ اگر ڈاکو تمہاری کتابیں لوٹ لیں تو تم جاہل؟ اور تمہاری گٹھڑی واپس کردیں تو تم عالم؟ وہ کیا علم ہے جو گٹھڑی میں رکھا ہوا ہو اور اگر گٹھڑی لٹ گئی تو تم جاہل ہو گئے، اور اگر واپس مل گئی تو عالم ہو گئے۔ امام غزالی پر اس کا بڑا اثر ہوا، کہنے لگے کہ واقعی ڈاکو ٹھیک کہتا ہے۔ چنانچہ دوبارہ واپس گئے، دوبارہ کسب فیض کیا اور جو پڑھا تھا سارا زبانی یاد کیا اور کہا کہ اب میں کسی چیز کا محتاج نہیں ہوں، مجھے سب زبانی یاد ہے۔

آپ نے ڈاکٹر حمید اللہ کا نام سنا ہوگا، میں نے ان کو دیکھا ہے۔ ان کا موضوع بھی علم حدیث تھا۔ اور آج ان کے ایک دو حوالوں سے بات بھی ہوگی۔ انہوں نے علم حدیث پر بڑا کام کیا۔ وہ پوری دنیا میں جایا کرتے تھے۔ میں نے بھی ان کے ساتھ بعض سفر کئے ہیں۔ ان کے پاس کوئی ساز وسامان نہیں ہوتا تھا۔ ان کی جیب میں ایک قلم ہوتا تھا، دوسری جیب میں چند لفافے اور ایروگرام ہوتے تھے۔ جب بھی کہیں سفر پر جانا ہوتا تھا خالی ہاتھ گھر سے نکل کر جہاز میں سوار ہوکر روانہ ہوجاتے تھے۔ نہ ان کے پاس کپڑے ہوتے تھے نہ کتابیں نہ کاغذ۔ رات کو اوپر کا جولباس ہوتا تھا اس کو اتار دیا کرتے تھے اندر سے ایک اور لباس کرتا پاجامہ نکلتا تھا، اس کو پہن کر سوجایا کرتے تھے۔ ہفتہ دو ہفتے تو اسی طرح گزار دیتے تھے۔ زیادہ عرصہ کے لئے جانا ہوتا تھا تو کپڑوں کے ایک دو جوڑے چھوٹے سے بیگ میں ساتھ لے لیتے تھے۔ علم ان کے دماغ میں اور قلم ان کی جیب میں ہوا کرتا تھا۔ دنیا کے ہر موضوع پر گفتگو اور تقریر کرتے تھے، خطبات بہاولپور کے نام سے ان کے لیکچر آپ نے سنے ہوں گے۔ جب خطبات بہاولپور دینے کے لئے آئے تھے تو ان کے پاس کوئی یادداشت یا کوئی کتاب نہیں تھی سب زبانی دیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کا یہ منظر تو میں نے بھی دیکھا ہے اور لوگوں نے بھی دیکھا ہوگا۔

محدثین کے ہاں بھی مسلمانوں کی روایت کے عین مطابق کاغذ پر لکھا ہونا کوئی کارنامہ نہیں تھا، بلکہ یادداشت اصل کارنامہ تھی۔ محدثین میں ایسے حضرات بھی تھے جو پہلے حدیث کو لکھتے

تھے، لکھنے کے بعد یاد کرتے تھے، یاد کرنے کے بعد ضائع کر دیا کرتے تھے۔ حضرت سفیان ثوری نے اپنے تمام ذخائر لکھے، لکھ کر ان کو یاد کیا، یاد کرنے کے بعد ان تحریروں کو مٹا کر ضائع کر دیا۔ وجہ یہ ارشاد فرمائی کہ 'خوفا من ان یتکل القلب علیه' یعنی اس خوف سے ضائع کر رہا ہوں کہ میرا دل اس پر مطمئن نہ ہو جائے، بھروسہ نہ کر لے کہ لکھا ہوا تو موجود ہے اس لئے یاد رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر چیز لکھی ہوئی ہو اور کتاب آپ کے پاس رکھی ہو تو خیال ہو گا کہ جب ضرورت ہو گی دیکھ لیں گے۔ یاد کرنے کو دل نہیں چاہے گا۔ لیکن اگر کوئی آپ کو ایک تحریر دے کر کہے کہ کل واپس کر دیں اور آئندہ کبھی آپ کو نہیں ملے گی تو آپ اس کو یاد کرنے پر توجہ دیں گے اور وہ جلدی آپ کو یاد ہو جائے گی۔ اس لئے محدثین نے یاد کرنے پر بھی زور دیا اور تحریری ذخائر پر بھی زور دیا۔

کیا رسول اللہ ﷺ نے احادیث لکھنے سے منع فرمایا؟

کتب حدیث کی جمع اور تدوین کا کام رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارک میں شروع ہو گیا تھا جس میں سے بعض مثالیں میں آپ کے سامنے عرض کر دیتا ہوں۔ لیکن مثالیں دینے سے پہلے ایک مسئلہ کو صاف کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے احادیث کو لکھنے سے منع فرمایا۔ اسی طرح سے بعض واقعات میں یہ بھی آتا ہے کہ خلفائے راشدین میں سیدنا ابوبکر صدیقؓ اور سیدنا عمر فاروقؓ نے پہلے احادیث کے مجموعے مرتب کرائے یا مرتب کرانے کا ارادہ ظاہر کیا، اور بعد میں یا تو ارادہ بدل دیا، یا اس تیار شدہ مجموعہ کو ضائع کر دیا۔ ان روایات کی بنیاد پر منکرین حدیث نے بہت کچھ حاشیہ آرائی کی ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چونکہ احادیث کو لکھنے سے منع کر دیا تھا اس لئے علم حدیث کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ نہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی سنت کو واجب التعمیل قرار دیا ہے اور نہ قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے سنت ضروری ہے۔ اگر سنت واجب التعمیل اور تدوین حدیث ضروری ہوتی تو رسول اللہ ﷺ احادیث کو بھی اسی طرح لکھواتے جس طرح قرآن مجید کو لکھوایا۔ یہ بظاہر ایسی مضبوط دلیل معلوم ہوتی ہے کہ جو شخص اس کو پڑھتا ہے وہ متاثر ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ تصویر کے بہت سے پہلوؤں میں سے ایک چھوٹا سا رخ ہے۔ آپ نے ممانعت کیوں فرمائی؟ کن لوگوں کے لئے ممانعت فرمائی؟ کس زمانے

میں ممانعت فرمائی؟ اس پر کوئی منکر حدیث اظہار خیال نہیں کرتا۔ اسی طرح وہ احادیث بھی موجود ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ نے احادیث لکھنے کی اجازت دی، احادیث کو لکھوایا، اپنے حکم سے اپنے بعض ارشادات کو ضبط تحریر میں منتقل کروایا اور صحابہ کرام کو تحریری طور پر منتقل کیا۔ کوئی منکر حدیث کبھی اس کا ذکر نہیں کرتا۔ اس لئے کہ یہ ان کے نقطۂ نظر کے خلاف ہے۔ عدل وانصاف اور Objectivity کا تقاضہ تو یہ ہے کہ تصویر کے دونوں رخ دکھائے جائیں اور پھر دلیل سے ثابت کیا جائے کہ اصل بات کیا ہے۔

مثال کے طور ایک جگہ حدیث میں آتا ہے 'لاتکتبوا عنی'، میری طرف سے مت لکھو، ومن کتب عنی غیر القرآن، اور جو شخص مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ لکھے، فلیمحه، اس کو مٹادے، وحدثوا عنی، ہاں میری طرف سے روایت کرو، ولا حرج، اس میں کوئی حرج نہیں، ومن كذب علي متعمداً فليتبوّأ مقعده من النار ۔ یہ ہے وہ حدیث جس کے بارے میں منکرین حدیث کا کہنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے احادیث کو لکھنے سے منع فرمایا تھا۔ اس لئے ان لوگوں کے دعوے کے مطابق آپؐ کے زمانے میں احادیث نہیں لکھی گئیں۔ صحابہ کرام نے نہیں لکھیں اور جب صحابہ کرام نے نہیں لکھیں تو بعد میں لکھے جانے کا کوئی اعتبار نہیں۔ لیکن اس مذکورہ بالا حدیث سے مراد کیا ہے، یہ رسول اللہ ﷺ نے کس کو منع کیا تھا اور کیوں منع کیا تھا؟ یہ ایسی چیز ہے جس پر منکرین حدیث زور نہیں دیتے۔ لیکن خود اس روایت میں دو لفظ بڑے قابل غور ہیں۔ ایک آپ نے یہ فرمایا کہ حدثوا عنی، مجھ سے احادیث بیان کرو، اس میں علم حدیث اور آپؐ کے ارشادات سن کر روایت کرنے کا حکم واضح طور پر موجود ہے، گویا اس حدیث سے کم سے کم اتنا تو ثابت ہوا کہ آپ نے زبانی روایت کرنے کا حکم دیا اور احادیث کو زبانی منتقل کرنے کا حکم دیا۔ لکھنے کی ممانعت کی، لیکن زبانی بیان کرنے کا حکم دیا۔ دوسرا اہم لفظ ہے کہ جو کوئی قرآن کے علاوہ کچھ لکھے اس کو مٹادے، آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ اس کو ضائع کردے، پھاڑ دے یا پھینک دے۔ یا اس کو جلادے و یا زمین میں دفن کردے، مٹادینے کا لفظ ذرا غور سے یاد رکھئے گا اس پر آگے بات آئے گی۔

تدوین حدیث حضورؐ کی حیات مبارکہ میں

اس کے ساتھ ساتھ ایسے بہت سے واقعات ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف صحابہ

کرام کو لکھنے کی اجازت دی بلکہ آپ کی موجودگی میں اور آپ کی مجلس میں صحابہ کرامؓ آپؐ کے ارشادات کو لکھا کرتے تھے اور ان کے مجموعے مرتب کیا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی روایت سنن دارمی میں منقول ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں بیٹھا ہوتا تھا اور جو کچھ آپؐ ارشاد فرمایا کرتے تھے وہ لکھا کرتا تھا۔ مجھ سے قریش کے بعض ذمہ دار حضرات نے یہ کہا کہ تم رسول اللہ ﷺ کی ہر بات لکھتے ہو۔ ممکن ہے بعض اوقات آپؐ غصہ میں ہوں، بعض اوقات مزاح کا موڈ ہو سکتا ہے اور وہ کوئی بات مزاح کے طور پر ارشاد فرما سکتے ہیں، تو تم ہر بات کیوں لکھتے ہو؟ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ لوگ ایسا کہتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ نہیں جو سنو وہ لکھو، فَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ مَاخَرَجَ مِنْهُ اِلّاحق '۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے میری زبان سے حق کے علاوہ کوئی اور بات نہیں نکلتی۔ اب دیکھئے کہ آپؐ نے قسم کھا کر فرمایا کہ جو میں کہتا ہوں وہ حق کہتا ہوں لہٰذا لکھو۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ جو بات سنتے تھے وہ لکھا کرتے تھے۔ ایک روایت کے مطابق انہوں نے ڈیڑھ ہزار احادیث اس مجموعے میں لکھیں۔ یہ مجموعہ صحیفہ صادقہ کہلاتا ہے۔ اس مجموعہ کی اپنی ایک تاریخ ہے، اس مجموعہ کی تاریخ پر اگر بات شروع کی جائے تو گفتگو بہت لمبی ہو جائے گی۔ یہ مجموعہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کے بعد ان کے صاحبزادے کے حصہ میں آیا۔ انہوں نے اپنے والد سے پڑھنے کے بعد اس کو روایت کرنے کی اجازت حاصل کی۔ وہ آگے اس کو بیان کیا کرتے تھے۔ ان کے بعد یہ مجموعہ ان کے پوتے کے حصہ میں آیا جن کا نام شعیب تھا۔ اس کے بعد ان کے پڑپوتے عمرو کے حصہ میں آیا، اور وہ اس کی روایت کیا کرتے تھے۔ کتب حدیث میں آپؐ نے یہ روایت بارہا پڑھی ہوگی، مسند امام احمد اور ترمذی کے ساتھ ساتھ اور بھی کئی کتابوں میں ہے۔ عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده عن النبی علیه الصلوٰة والسلام، عمر بن شعیب اپنے والد سے، وہ اپنے دادا سے، یعنی والد اپنے دادا سے، جدہ کی نسبت عمرو کی طرف نہیں ہے، شعیب کی طرف ہے کہ شعیب اپنے داد سے روایت کرتے ہیں، یعنی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے یہ بات اس طرح فرمائی۔ یہ ایک ذخیرہ تھا جو صحابہ کے زمانہ سے پہلے ایک صحابیؓ نے حضورؐ کی مجلس میں مرتب کیا،

اس کو زبانی یاد کیا، زبانی یاد کرنے کے بعد اپنے بیٹے کو پہنچایا، بیٹے نے آگے لوگوں تک پہنچایا اور ان کے شاگردوں نے آگے تک پہنچایا، اور یوں یہ ذخیرہ امام احمد بن حنبلؒ تک پہنچا۔ امام احمد بن حنبل نے اس ذخیرہ کا بیشتر حصہ اپنی مسند میں محفوظ کرلیا۔ (سارا اس لئے نہیں کیا کہ احادیث کے انتخاب میں ان کا اپنا ایک معیار تھا۔) اب مسند امام احمد میں بعض تخفیفات کے ساتھ تقریباً پورا کا پورا موجود ہے۔ مسند امام احمد تیسری صدی ہجری میں لکھی گئی۔ لہٰذا یہ کہنا کہ تیسری صدی ہجری میں لکھے جانے والے مجموعوں میں لوگوں نے یادداشت سے سنی سنائی باتیں لکھ دیں، اس کی ایک تردید تو آپ کے سامنے آگئی کہ مسند امام احمد میں ایک ایسا ذخیرہ موجود ہے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارک میں لکھا گیا اور منتقل ہوتے ہوتے امام احمد تک آ گیا۔ زبانی یادداشت بھی رہی، تحریری روایت بھی رہی، اجتماعی روایت بھی رہی انفرادی روایت بھی رہی۔ اور امام احمد نے اس کو جوں کا توں شامل کردیا۔ لہٰذا امام احمد کے بارے میں یہ اعتراض تو بے بنیاد اور کمزور ثابت ہوگیا کہ انہوں نے سنی سنائی باتیں لکھی تھیں۔ اس ایک مجموعے سے یہ بات ثابت ہوگئی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے۔ میں پہلے بھی عرض کرچکا ہوں کہ انہوں نے بتایا کہ میں اور عبداللہ بن عمرو بن العاص ہم دونوں حضورؐ کی مجلس میں بیٹھے ہوتے تھے، ان کے پاس حدیثیں زیادہ ہوتی تھیں اور میرے پاس کم ہوتی تھیں۔ فانہ کان یکتب و لا اکتب' اس لئے وہ لکھتے رہتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا۔ اس لئے ان کا مجموعہ زیادہ تھا۔ میرا تھوڑا تھا۔ پھر ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ میں نے حضورؐ سے شکایت کی کہ مجھے اکثر یاد نہیں رہتا تو آپؐ نے فرمایا کہ لکھ لیا کرو، مجھے لکھنے کی ہدایت کی تو اس وقت سے میں بھی لکھنے لگا۔ حافظہ کی کمزوری کی شکایت کے حوالہ سے آپؐ نے فرمایا؛ ایک چادر لاؤ، میں نے ایک چادر یا رومال میں نے لاکر پیش کردیا۔ اس میں آپؐ نے کچھ پڑھ کر پھونکا۔ اس کو باندھ کر مجھے دے دیا کہ اس کو سینے سے لگالو۔ جب سے میں نے ... سے لگایا اس وقت سے میں کوئی بات بھولتا نہیں ہوں۔ مجھے ہر چیز یاد رہتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی طرح سے میری یادداشت بھی تیز ہوگئی۔

یہ مجموعہ جیسا کہ میں پہلے ایک مثال میں بیان کرچکا ہوں، حضرت ابوہریرہؓ کے پاس موجود تھا۔ حضرت ابوہریرہؓ اس مجموعہ سے روزانہ اپنی یادداشت کو چیک کیا کرتے تھے۔ اور اس مجموعے میں جو چیزیں لکھی ہوئی تھیں ان کو روایت کیا کرتے تھے۔ لوگ وقتاً فوقتاً چیک کرتے

رہتے تھے۔ جیسا کہ مروان بن حکم خلیفہ نے ایک مرتبہ چیک کیا تھا، اور چیک کرنے کے بعد بعینہ وہی نکلا تھا جو پہلے سے لکھا ہوا تھا۔ لہٰذا حضرت ابو ہریرہؓ، جو حضورؐ کے انتقال کے بعد پچاس سال تک زندہ رہے، اور اپنی زندگی کے اگلے پچاس سال تک جو بھی روایات بیان فرماتے رہے اس میں کسی ایک رو' ت اور ان کے تحریری ذخیرہ میں التباس نہیں ہوا۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ 'قَیِّدوا العلم بالکتاب'، کہ جو علم تم مجھ سے حاصل کرتے ہو اس کو تحریر میں قید کرو، ضبط تحریر میں لاؤ۔ یہ تیسری مثال ہے کہ حضورؐ نے لکھنے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ حکم ارشاد فرمایا۔ حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے، امام سیوطی نے تدریب الراوی میں نقل کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ ہم آپ سے بہت سی اشیا سنتے ہیں تو کیا ان کو لکھ لیا کریں؟ آپؐ نے فرمایا 'اکتبوا و لا حرج' لکھ لیا کرو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس کے بعد رافع بن خدیج بھی لکھنے لگے۔ یہ ایک اور صحابیؓ کی مثال آپ کے سامنے آئی۔ کہ صحابہ حضورؐ کے ارشادات حضورؐ کے زمانہ ہی میں حضورؐ کی اجازت سے لکھا کرتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ جب فتح مکہ کے موقع پر مکہ میں داخل ہوئے تو آپ کو معلوم ہے کہ تمام کفار مکہ آپؐ کے سامنے موجود تھے۔ آپؐ نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ جب آپؐ یہ خطبہ ارشاد فرما چکے، تو یمن سے آنے والے ایک صحابیؓ تھے جن کا نام ابوشاہ تھا، انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ آپ نے خطبہ میں بہت اچھی باتیں ارشاد فرمائیں یہ خطبہ اگر کوئی مجھ کو لکھ کر دے دے تو بڑا ہی اچھا ہوگا۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا 'اکتبوا لابی شاہ' ابوشاہ کو لکھ کے دے دو۔ لوگوں نے ابوشاہ کو خطبہ کا مکمل متن لکھ کر دے دیا جو ان کے پاس لکھا ہوا موجود تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے حکم سے آپؐ کا پورا خطبہ لکھ کر ایک صحابیؓ کو دے دیا گیا۔

یہ کہنا کہ حضورؐ نے تمام احادیث کو لکھنے کی ممانعت کردی تھی یہ ایک بالکل بے بنیاد اور غلط بات ہے۔ جامع ترمذی کی روایت ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، جو ایک بڑے صحابیؓ ہیں، ہجرت سے پہلے مدینہ کے سرداروں میں شمار ہوتے تھے، قبیلہ خزرج کے بڑے سرداروں میں سے تھے اور اتنے بڑے سردار تھے، اتنے بڑے سردار تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا جب انتقال ہوا تو انصار کو یہ خیال ہوا کہ ان کو رسول اللہ ﷺ کا جانشین ہونا چاہئے۔ اگر رسول اللہ ﷺ

کا جانشین انصار میں سے ہوتا تو یقیناً سعد بن عبادہؓ ہی ہوتے، ان کے پاس ایک تحریری ذخیرہ احادیث موجود تھا۔ کان یملك صحیفة، ان کی ملکیت میں ایک صحیفہ یعنی ایک کتاب تھی، جمع فیھا طائفة من احادیث الرسول علیه الصلوٰة والسلام وسننه' جس میں انہوں نے احادیث رسول اور سنتوں کی ایک بڑی تعداد محفوظ کر رکھی تھی۔ یعنی ان کے پاس احادیث رسول اور سنن پر مشتمل ایک ایک لکھا ہوا مجموعہ موجود تھا۔ ان کے بعد وہ صحیفہ ان کے صاحبزادے کے پاس گیا۔ ان کے صاحبزادے لوگوں کو اس کی روایت کر کے اور پڑھ کر سنایا کرتے تھے اور لوگ اس کی نقلیں ان سے حاصل کیا کرتے تھے۔ وہ ذخیرہ حضرت سعد بن عبادہؓ کے صاحبزادے کے بعد ان کے شاگردوں کے پاس گیا۔ پہلے تو ایک ہی نسخہ تھا، اب اس کے سینکڑوں نسخے تیار ہو گئے۔ ہر شاگرد نے اپنا نسخہ تیار کر لیا۔ جیسا کہ طریقہ تھا کہ استاد اپنا نسخہ سامنے رکھ کر بولتے تھے اور شاگرد لکھتے جاتے تھے۔ ہر شاگرد کے پاس ایک نسخہ تیار ہو جاتا تھا۔ یہ ایک اور اہم مثال ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں صحابہ کرامؓ نے احادیث کے نسخے تیار کئے اور لکھ کر ان کو محفوظ رکھا۔

اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ نے کم وبیش، بعض روایات میں آتا ہے **104**، بعض میں آتا ہے **105** تبلیغی خطوط مختلف حکمرانوں کے نام لکھے۔ اگر حضورؐ کا ہر ارشاد حدیث ہے تو ہر نامہ مبارک بھی ایک حدیث ہے۔ تبرکاً ایک نامہ مبارک سنا دیتا ہوں:

بسم الله الرحمن الرحیم

من محمد عبدالله ورسوله الی هرقل عظیم الروم۔ سلام علیٰ من اتبع الهدیٰ

اما بعد فانی ادعوك بدعایة الاسلام۔ اسلم تسلم یوتك الله اجرك مرتین۔ فان تولیت فانما علیك اثم الیریسیین۔ والسلام علی من اتبع الهدیٰ ۔

محمد رسول الله

یہ نامہ مبارک بلاشک وشبہ حدیث تھی، حضورؐ نے لکھوائی۔ **104** اس طرح کی احادیث آپ نے لکھوائیں۔ مختلف لوگوں کو آپؐ نے بھیجیں۔ ان میں سے چھ آج بھی اپنی اصلی صورت میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہؒ نے فرانسیسی زبان میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا مضمون یہی چھ اصل نامہ ہائے مبارک ہیں جو مختلف مقامات پر موجود ہیں۔ انہوں نے ان کی پوری تفصیل اور

تاریخ اس کتاب میں بیان کی ہے۔ایک بڑی اہم چیز یہ ہے کہ یہ متن جو میں نے آپ کے سامنے پڑھا ہے آپ نے بعض کیلینڈروں میں بھی اس کو چھپا ہوا دیکھا ہوگا، بعض نقشوں میں بھی چھپا ہوا دیکھا ہوگا، یہ متن بارہا چھپا ہے۔لوگ اس کو نقل کرتے ہیں۔ یہ متن اور صحیح بخاری میں دیا ہوا متن بالکل ایک ہے۔ دونوں میں سوفیصد یکسانیت ہے۔ یہ مکتوب نبوی **1864**ء میں ایک عیسائی کے پاس دریافت ہوا تھا۔اس کی تاریخ بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔لیکن جب یہ دریافت ہوا اور اس کی یہ عبارت پڑھی گئی تو پتہ چلا تو اس کا متن بعینہ وہی ہے جو صحیح بخاری میں لکھا ہوا ہے۔ گویا صحیح بخاری کے ایک ماخذ کی تصدیق ہوگئی۔ کہ آج جس چیز کا اصل نسخہ دریافت ہوا ہے وہ صحیح بخاری میں تیسری صدی ہجری میں اسی طرح لکھی گئی تھی۔اب اس بات کی گویا ایک اور تصدیق ہوگئی کہ صحیح بخاری مرتب کرتے وقت امام بخاری کے پاس جو ماخذ تھے وہ بالکل صحیح ترین ماخذ تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے صرف ان نامہ ہائے مبارک پر اکتفا نہیں فرمایا تھا۔آپ نے پڑھا ہوگا کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپؐ نے مدینہ کے قبائل اور یہودیوں کے درمیان ایک معاہدہ فرمایا جو میثاق مدینہ کہلاتا ہے۔ یہ **52** دفعات پر مشتمل دنیا کا پہلا تحریری دستور ہے۔اس سے پہلے کوئی دستور تحریری طور پر مرتب نہیں ہوا۔ دنیا کی کسی قوم میں اس طرح کی کسی تحریری اور مدون دستوری قانون کی اس سے پہلے کوئی مثال نہیں ملتی، یہ دستاویز کسی مدوّن دستور کی پہلی مثال ہے۔ یہ حضورؐ نے لکھا، لوگوں نے اپنے پاس محفوظ رکھا۔آج اس کا متن کتب حدیث میں موجود ہے۔ صحیح بخاری میں اس کا بالواسطہ حوالہ ہے، سنن ابوداؤد میں اس کے بعض حوالے اور سیرت ابن ہشام میں اس کا پورے کا پورا متن نقل ہوا ہے۔ یہ اس بات کی ایک اور مثال ہے کہ عہد نبوی میں حدیثیں لکھی گئیں اور رسول اللہ ﷺ کے حکم سے لکھی گئیں۔

ان کے علاوہ حضورؐ نے مختلف قبائل سے معاہدے فرمائے ، ہر معاہدہ ایک حدیث ہے۔اس لئے کہ کس معاہدہ میں کس قبیلہ کے ساتھ آپؐ نے کیا شرائط طے فرمائیں؟ کس قبیلہ کو کونسی مراعات عطا فرمائیں، غیر مسلموں کو کیا حقوق دیئے؟ یہ سب ان معاہدوں سے ثابت ہوتا ہے۔تو یہ سب معاہدے احادیث ہیں۔اس طرح کے جو معاہدے رسول اللہ ﷺ نے فرمائے ان کی تعداد کم وبیش چار ساڑھے چار سو کے قریب ہے۔ ان میں سے بیشتر معاہدے آج بھی موجود ہیں اور مکاتیب نبوی اور وثائق نبوی کا اہم حصہ ہیں۔اس موضوع پر درجنوں کی تعداد میں

الگ سے کتابیں موجود ہیں جو صدر اسلام سے آج تک لکھی جا رہی ہیں۔ لوگ ان پر کام کر رہے ہیں۔ اس لئے ان مثالوں کے بعد یہ کہنا کہ رسول اللہ ﷺ نے حدیث لکھنے کی ممانعت کی تھی یہ بات فضول اور بے بنیاد ہے۔

ایک سوال پھر بھی پیدا ہوتا ہے کہ جو ممانعت والی احادیث آئی ہیں ان کا کیا مفہوم ہے۔ ان کے تین مختلف مفاہیم ہیں۔ سب سے پہلے تو رسول اللہ ﷺ نے اسلام کے بالکل آغاز کے دور میں ممانعت فرمائی۔ جب حضورؐ ایسے ماحول میں تھے جہاں لکھنے والے بہت تھوڑے تھے۔ آغاز اسلام میں مکہ مکرمہ میں تمام لکھنے والوں کی تعداد سترہ تھی جیسا کہ بلاذری نے لکھا ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تو بارہ تیرہ آدمیوں کے سوا کوئی لکھنا نہیں جانتا تھا۔ ان لکھنے والوں میں سے جن لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا وہ تعداد میں اور بھی تھوڑے تھے۔ سب نے تو اسلام قبول نہیں کیا۔ مثلاً ابوجہل لکھنا پڑھنا جانتا تھا لیکن اس نے تو اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ ابولہب لکھنا جانتا تھا، عبداللہ بن ابئ بھی لکھنا جانتا تھا، لیکن انہوں نے تو اسلام قبول نہیں کیا۔

اس لئے اسلام قبول کرنے والوں میں جو لکھنا جانتے تھے ان کی تعداد اور بھی کم تھی اور رسول اللہ ﷺ انہی سے قرآن پاک لکھوانے کا کام لیا کرتے تھے۔ اس لئے اگر شروع میں قرآن پاک اور احادیث دونوں چیزیں یہی حضرات لکھا کرتے تو اس بات کا بڑا امکان تھا کہ قرآن اور احادیث کے مضامین آپس میں مخلوط ہو جائیں اور کسی کو آگے چل کر یہ شبہ ہو جائے کہ یہ قرآن پاک کی آیت ہے یا حدیث ہے۔ مثلاً حضرت عمر فاروقؓ لکھنا جانتے تھے۔ لیکن اگر رسول اللہ ﷺ شروع میں حضرت عمر فاروقؓ کو اس کی اجازت دیتے کہ ایک کاغذ کے ایک سرے پر قرآن پاک لکھیں، جو تھوڑا تھوڑا نازل ہو رہا تھا۔ اور دوسرے سرے پر حدیث لکھیں اور یہ ذخیرہ حضرت عمر فاروقؓ کے خاندان میں چلا آتا تو سو پچاس سال کے بعد اس بات کا امکان تھا کہ وہ دونوں کاغذ کسی ایسے آدمی کو ملیں جو قرآن کا حافظ نہیں ہے اور وہ حدیث کو بھی قرآن کا حصہ سمجھ لے۔ اس کا امکان تو بہرحال موجود رہتا۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے شروع میں قرآن پاک کے علاوہ کوئی اور چیز لکھنے کی ممانعت فرمائی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ صحابہ کی یہ تربیت فرما رہے تھے کہ جو حضورؐ کو کرتا ہوا دیکھیں اس پر خود بخود عمل درآمد شروع کر دیں، بجائے صحیفہ پر لکھنے کے اس کو سینوں میں اتار لیں

تاکہ وہ عمل کے ذریعے محفوظ ہو جائے۔ قرآن پاک الفاظ کے ذریعے محفوظ ہو جائے، سنت آپ کے عمل کے ذریعے محفوظ ہو جائے، اور لوگوں کے رگ و پے میں سما جائے، لوگوں کے طرز عمل اور شب وروز کی نشست و برخواست کا حصہ بن جائے۔ اس لئے شروع میں رسول اللہ ﷺ نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں فرمائی کہ حدیث اور سنت کو لکھا جائے۔

اس کے بعد دوسری ممانعت آپ نے کاتبان وحی کے لئے فرمائی۔ جو لوگ خاص کاتبین وحی تھے ان کے لئے فرمایا کہ وہ قرآن پاک کے علاوہ کوئی اور چیز نہ لکھیں۔ اس لئے کہ اگر کاتبان وحی کوئی اور چیز لکھیں گے تو ان کے بارے میں التباس کا زیادہ امکان ہے۔ اگر دوسرے حضرات لکھیں، مثلاً حضرت ابوشاہؓ کے پاس لکھی ہوئی چیز موجود تھی اور ابوشاہؓ کاتبان وحی میں سے نہیں تھے۔ اس لئے ابوشاہؓ کے ذخیرے میں کوئی چیز نکلے تو اس میں یہ غلط فہمی نہیں ہوسکتی تھی کہ یہ قرآن پاک کی آیت ہے کہ نہیں ہے۔ ایک فی لاکھ بھی اس کا امکان نہیں تھا۔ لیکن مثلاً حضرت زید بن ثابتؓ کے پاس اگر کوئی ایسی چیز ہوتی تو مغالطہ کا امکان تھا اس لئے حضورؐ نے کاتبان وحی کو منع فرمایا۔

تیسری چیز جو بڑی اہم ہے وہ یہ کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ جس نے قرآن کے علاوہ کوئی چیز لکھی ہے فلیمحہ، وہ اس کو مٹا دے۔ بعض صحابہ یہ کرتے تھے، اور ایک مرتبہ حضورؐ نے دیکھا کہ وہؓ ایسا کر رہے تھے کہ قرآن پاک کے اپنے نسخہ میں تفسیری حواشی لکھ لیتے تھے یا اسی کاغذ پر جو جگہ بچتی اس پر آپؐ کے ارشادات گرامی لکھ لیا کرتے تھے۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ قرآن کے علاوہ کوئی چیز لکھی ہے تو مٹا دو۔ اس لئے کہ اگر ایک ہی کاغذ پر ایک ہی چیز ہوگی تو اس سے آگے چل کر بڑی الجھن پیدا ہوسکتی ہے۔ اس لئے آپ نے مٹانے کا حکم دیا، ضائع کرنے کا حکم نہیں دیا۔

یہ وہ چیز ہے جس کے بارے میں لوگ جان بوجھ کر یا غلط فہمی کی بنیاد پر شبہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ حضورؐ نے لکھنے کی ممانعت فرمائی تھی۔ لکھنے کی ممانعت بہت آغاز کے سالوں میں تھی، کاتبین وحی کے لئے تھی اور قرآن پاک جن چیزوں پر لکھا ہوتا تھا ان پر حدیث لکھنے سے منع کرنے کی ہدایت تھی۔ اس ایک پہلو کے علاوہ حضورؐ نے خود احادیث لکھنے کی اجازت دی، آپؐ کی محفل میں احادیث لکھی گئیں، آپؐ کی اجازت سے لکھی گئیں، آپؐ نے خود لکھوا کر لوگوں کو دیں، بہت سی دستاویزات اور وثائق آپؐ نے تیار کروائے جو آج کتب حدیث میں موجود ہیں اور ان

سے اسی طرح احکام نکلتے ہیں جیسے سنت کی باقی چیزوں سے احکام نکلتے ہیں۔ یہ طریقہ صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں بھی جاری رہا۔

تدوین حدیث صحابہ کرامؓ کے دور میں

مشہور صحابیؓ حضرت انس بن مالک کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کسی ذمہ داری پر بھیجا۔ صدقہ اور زکوٰۃ کی وصولی کے لئے محصل بنا کر بھیجا۔ مسند امام احمد کی روایت ہے کہ 'کتب ابو بکر لانس بن مالك فرائض الصدقه التی سنها رسول الله ﷺ'، کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت انس بن مالک کو وہ تمام احکام جو زکوٰۃ کے بارے میں ہیں اور حضورﷺ سے ثابت ہیں وہ سب لکھ کر دیئے۔ یہ واضح طور پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف سے حدیث کو تحریری طور پر مرتب کرنے کا ایک نمونہ ہے۔ ایک صحابیؓ دوسرے صحابیؓ کو ارشادات رسولؐ لکھ کر دے رہے ہیں۔ مسند امام احمد ہی کی دوسری روایت ہے کہ 'کتب عمر لعقبه بن فرقد بعض السنن'، کہ عقبہ بن فرقد جو ایک تابعی ہیں، ان کو حضرت عمرؓ نے بعض سنتیں لکھ کر دیں۔ یہ دوسرے صحابیؓ اور خلیفہ راشد کی طرف سے سنت کو تحریری طور پر مرتب کرنے کی ایک مثال ہے۔

بعض جاہلوں اور بدوؤں میں مشہور تھا کہ حضرت علیؓ کو حضورؐ نے کوئی خاص قسم کا علم دیا تھا جو باقی صحابہ کو نہیں دیا تھا۔ یہ بات حضرت علیؓ کی حیات مبارکہ ہی میں لوگوں نے پھیلا دی تھی حالانکہ رسول اللہ ﷺ کو تو حکم تھا کہ 'یاایھاالرسول بلغ ماانزل الیك' جو تم پر نازل کیا گیا ہے لوگوں تک پہنچا دو۔ تو حضورؐ کے بارے میں یہ کہنا نعوذ باللہ کہ خاص خاص چیزیں صرف اپنے اہل خاندان کو پہنچائیں اور عام چیزیں باقی لوگوں تک پہنچائیں، یہ بڑی بدگمانی کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے۔ لیکن بعض لوگوں نے یہ بات پھیلا دی کہ حضورؐ نے کوئی خاص قسم کا علم حضرت علیؓ کو دیا تھا جو باقی صحابہ کو نہیں دیا۔ کسی نے اس پس منظر میں حضرت علیؓ سے ان کے زمانہ خلافت میں پوچھا کہ آپ کو رسول اللہ ﷺ سے کوئی خاص علم ملا ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں، حضورؐ سے ہمیں صرف تین چیزیں ملی ہیں۔ ایک قرآن مجید، ایک وہ خاص فہم جو اللہ تعالیٰ کسی انسان کو عطا کرتا ہے اور ایک وہ ہدایات جو اس صحیفے میں لکھی ہوئی ہیں۔ لوگوں نے پوچھا کہ اس صحیفہ میں کیا لکھا ہے؟ تو آپؓ نے فرمایا کہ اس میں دیت اور قیدیوں کو آزاد کرانے کے احکام لکھے ہوئے ہیں اور یہ حکم لکھا

ہوا ہے کہ کسی مسلمان کو کافر کے بدلے میں قتل نہ کیا جائے۔ یہ بعض خاص حالات میں حضورؐ نے ہدایت فرمائی تھی۔ یہ تین قسم کے مسائل اس صحیفہ میں لکھے ہوئے جو حضورؐ کے زمانہ میں لکھے ہوئے مجھے دیئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ کوئی اور چیز خاص طور پر مجھے نہیں دی گئی جو بقیہ صحابہ کو ملی وہ مجھے بھی ملی۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ ایک صحیفہ حضورؐ کے زمانے کا لکھا ہوا حضرت علیؓ کے پاس بھی موجود تھا جس میں دیت، قیدیوں کی رہائی کے احکام اور یہ بات کہ مسلمان اور کافر کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں قتل کیا جا سکتا ہے کہ نہیں، اس کے بارے میں بعض ہدایات دی گئی تھیں۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیؓ ایک صحابیؓ تھے جو سب سے آخر میں انتقال کرنے والے صحابہ میں سے تھے۔ مجھے صحیح سن یاد نہیں لیکن سن اٹھاسی نواسی ہجری کے لگ بھگ ان کا انتقال ہوا۔ چند آخری صحابہ میں سے ہیں۔ ان کے پاس ایک صحیفہ، یعنی احادیث کا لکھا ہوا مجموعہ، موجود تھا جس میں سے وہ روایت کیا کرتے تھے۔ حضرت سمرہ بن جندب مشہور صحابیؓ ہیں، آپ نے ان کا نام سنا ہوگا، ان کے بارے میں حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ 'جمع فیہا احادیث کثیرۃ' اس رسالہ یا کتاب میں انہوں نے بہت سی احادیث جمع کی تھیں۔ حافظ ابن حجر نے تعداد نہیں بتائی۔ لیکن احادیث کثیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑی تعداد میں احادیث جمع کی تھیں۔ حضرت ابو رافعؓ رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے اور آپؐ کے ساتھ بہت طویل عرصہ تک رہے۔ ان کے پاس ایک تحریری ذخیرہ موجود تھا جس میں نماز کے بعض احکام لکھے ہوئے تھے۔ یہ بھی ایک صحابیؓ کا لکھا ہوا ذخیرہ ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا مرتب کیا ہوا ایک مجموعہ آج بھی دستیاب ہے اور استنبول کے کتب خانہ سعید علی پاشا میں اس کا مخطوطہ موجود ہے۔ مشہور صحابیؓ حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ کے دست مبارک کا لکھا ہوا ایک اور مجموعہ اسی کتب خانہ سعید علی پاشا میں موجود ہے جس میں حج کے احکام لکھے ہوئے ہیں۔ یہ وہ چند نمونے ہیں جو صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں لکھے گئے۔ ایک اور نمونہ حضرت ابو سلمہ اشجعیؓ کا مرتب کیا ہوا مجموعہ بھی آج موجود ہے۔ استنبول میں ایک اور کتب خانہ ہے جو کتب خانہ فیض اللہ کہلاتا ہے وہاں موجود ہے۔ دمشق کا ایک کتب خانہ 'دار الکتب الظاہریہ' ہے جو بہت بڑا اور نفیس کتب خانہ ہے اور اب اس کی ایک جدید ترین عمارت بنائی گئی ہے، اس میں یہ کتب خانہ موجود ہے۔ الملک الظاہر البیبرس ایک حکمران تھا جس نے یہ کتب خانہ بنایا تھا اور قدیم

کتابیں اس میں جمع کی تھیں۔ اس میں یہ مجموعہ موجود ہے۔ ایک اور مجموعہ ہے جو حضرت ابو ہریرہؓ کے شاگرد رشید ہمام بن منبہ، جو ایک تابعی تھے، ان کا مرتب کیا ہوا ہے، لیکن اس طرح مرتب کیا ہوا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے ان کو جو احادیث املا کرائیں وہ انہوں نے اس مجموعہ میں مرتب کر دیں۔ اصل مجموعہ حضرت ابو ہریرہؓ کا تھا، لیکن ہمام کے نام سے اس لئے مشہور ہے کہ تحریر ہمام بن منبہ کی تھی۔ یہ دستیاب صحائف میں قدیم ترین ہے جو مطبوعہ شکل میں موجود ہے، غیر مطبوعہ تو اور بھی ہیں جن کا میں نے حوالہ دیا ہے۔ یہ مجموعہ بارہا چھپا ہے جس کا اردو، انگریزی، فرانسیسی، ترکی اور کئی دوسری زبانوں میں ترجمہ موجود ہے۔ اصل مجموعہ عربی میں ہے جس کو ڈاکٹر حمید اللہ نے آج سے کوئی پچاس یا ساٹھ سال پہلے ایڈٹ کیا تھا۔ یہ چند مجموعے ہیں جو صحابہ کے زمانہ میں تیار ہوئے۔ یہ مثال کے طور پر میں نے ذکر کئے ہیں۔

تدوین حدیث تابعین کے دور میں

ہمارے ایک بہت محترم اور فاضل دوست ڈاکٹر محمد مصطفےٰ اعظمی نے ایک کتاب انگریزی میں لکھی ہے آپ ضرور پڑھئے گا۔ اس کا نام ہے Studies in the Early Hadith Literature۔ اس کتاب میں انہوں نے صحابہ کے مرتب کئے ہوئے 48 مجموعوں کا تذکرہ کیا ہے جن میں یہ چند مجموعے بھی شامل ہیں جن کا میں نے ذکر کیا۔ ان 48 مجموعوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے تابعین کے زمانہ کے کم وبیش 250 مجموعوں کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے تاریخ سے ڈھائی سو مجموعوں کی شہادت جمع کر کے مرتب کی ہے جس سے پتہ چلا کہ ڈھائی سو تابعین کے مجموعوں کا تذکرہ حدیث کی کتابوں میں ملتا ہے۔ ان میں سے چند مجموعے جو بہت اہم ہیں وہ میں آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں۔

لیکن ان کا ذکر کرنے سے پہلے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا نام لینا بڑا ضروری ہے جن کا انتقال غالباً 101 ہجری میں ہوا۔ ہجرت کے تقریباً نوے سال کے بعد کا ان کا زمانہ ہے۔ لیکن اپنے زمانہ خلافت سے پہلے وہ کچھ عرصہ مدینہ منورہ کے گورنر رہے۔ مدینہ منورہ کی گورنری کے زمانے میں جو غالباً ساٹھ یا ستر ہجری کے لگ بھگ کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ میں انہوں نے مدینہ منورہ کے ایک محدث حضرت محمد بن مسلم بن شہاب زہری سے جو امام مالکؒ کے استاد ہیں، یہ کہا کہ آپ

مدینہ منورہ کے شیوخ حدیث سے احادیث کا ایک مجموعہ جمع کر کے مرتب کریں۔ چنانچہ مدینہ منورہ میں جتنے راویان حدیث اور شیوخ حدیث تھے، ان سب کے پاس جا کر انہوں نے کسب فیض کیا اور ان سب احادیث کا ایک مجموعہ سرکاری اہتمام میں مرتب کیا۔

جب سن 99-98 ھ کے لگ بھگ حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو انہوں نے ایک سرکلر جاری کیا اور مختلف علاقوں میں لوگوں کو خطوط لکھے کہ احادیث کے مجموعے مرتب کر کے مجھے بھیجے جائیں۔ انظروا الی حدیث رسول الله ﷺ فاجمعوه' رسول اللہ ﷺ کی احادیث کا جائزہ لو اور ان کا پتہ چلا کر ان کو مجموعوں کی شکل میں مرتب کرو۔ یہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا منشور تھا، ایک سرکلر تھا جو انہوں نے صوبوں کے گورنروں کے نام لکھا تھا۔ مختلف لوگوں نے یہ مجموعے تیار کر کے بھیجے جن میں تین مجموعوں کا تذکرہ صراحت سے محدثین نے کیا ہے۔ ایک تھے قاضی ابوبکر محمد بن عمرو بن حزم، انہوں نے ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جو آج بھی موجود ہے۔ اور کتب حدیث میں جابجا اس کے حوالے ملتے ہیں اور بعض محدثین نے ان کو یکجا بھی بیان کیا ہے۔ ایک مجموعہ تو یہ ہے۔

دوسرا مجموعہ ایک خاتون محدثہ کا تھا۔ حضرت عمرہ بنت عبدالرحمٰن انصاریہ، مدینہ منورہ کی ایک صاحبہ علم خاتون تھیں جو اپنے زمانہ کی بہت بڑی محدثہ تھیں۔ انصار سے تعلق تھا۔ بڑے بڑے محدثین ان کی خدمت میں جا کر حدیث پڑھا کرتے تھے۔ اور کسب فیض کیا کرتے تھے۔ انہوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے کہنے پر اپنا مجموعہ مرتب کیا اور ان کو بھجوایا۔ ایک تیسرا مجموعہ جو حضرت عمر بن عبدالعزیز کے منشور کے جواب میں لکھا گیا وہ سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے پوتے قاسم بن محمد بن ابی بکرؒ کا مرتب کردہ تھا جو تابعین میں سے تھے، ان کے والد محمد بھی تابعین میں سے تھے۔ ان کے والد کی ولادت اس سن میں ہوئی تھی جس میں رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا تھا۔ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتقال ہوا تو ان محمد بن ابی بکر کی عمر دو سال تھی۔ اس لئے ان کا شمار صحابہ میں نہیں بلکہ تابعین میں ہوتا ہے۔ ان کے بیٹے قاسم بھی تابعین میں سے تھے، قاسم بن محمد۔ آپ نے مدینہ کے فقہائے سبعہ کا نام سنا ہوگا۔ مدینہ منورہ میں سات فقہا بڑے مشہور تھے جن کو فقہائے سبعہ کہا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک قاسم بن محمد بھی ہیں۔ یہ گویا سرکاری طور پر تین بڑے محدثین کی طرف سے تین بڑے مجموعے تیار کئے گئے۔ ان کے علاوہ حضرت امام محمد بن شہاب زہری نے

بھی ایک مجموعہ مرتب کیا اور اس کو لے کر حضرت عمر بن عبدالعزیز کے پاس آئے، 'وقدمه الى عمر بن عبدالعزیز'، عمر بن عبدالعزیز نے وہ مجموعہ دیکھا، انتہائی جامع مجموعہ تھا، امام زہری صف اول کے محدثین میں سے ہیں، بہت سے محدثین ان کے شاگرد ہیں۔ امام مالکؒ جیسے محدث کا تعلق ان کے تلامذہ سے ہے۔ ان کا مجموعہ بہت جامع قسم کا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے 'بعث الى كل ارض دفتراً من دفاتره'، ہر علاقہ میں اس کا ایک نسخہ یا نقل تیار کرا کے بھیجی تا کہ لوگوں کے پاس یہ مجموعے مرتب ہو جائیں۔ یہ مجموعے صحابہ کرام کے بعد تابعین کے دور میں مرتب ہوئے۔

تدوین حدیث تبع تابعینؒ کے دور میں

تبع تابعینؒ کے ابتدائی دور میں اور صغار تابعین کے دور میں کتنے مجموعے مرتب ہوئے، ان کی تعداد بیان کرنا بڑا دشوار ہے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی نے صرف تابعین دور کے ڈھائی سو مجموعوں کا پتہ چلایا ہے۔ وقتاً فوقتاً دوسرے محققین بھی ان کا پتہ چلاتے رہے ہیں۔ دو تین کی مثالیں دینے پر میں اکتفا کرتا ہوں۔

محمد بن اسحاق جن کا تعلق تبع تابعینؒ کی بڑی نسل سے ہے۔ اور بعض لوگوں نے ان کو صغار تابعین میں بھی شمار کیا ہے۔ ان کا مجموعہ آج مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔ انہوں نے ان احادیث کو جمع کیا جن کا تعلق سیرت سے، رسول اللہ ﷺ کے غزوات اور آپؐ کی ذات گرامی سے ہے۔ وہ ساری احادیث محمد بن اسحاق کے مجموعے میں آج مطبوعہ شکل میں موجود ہیں اور اردو اور انگریزی زبانوں میں اس مجموعہ کا ترجمہ بھی دستیاب ہے۔

ایک اور تابعی حضرت معمر بن راشد تھے، یمن کے ایک بڑے محدث تھے۔ انہوں نے ایک کتاب الجامع المسند کے نام سے لکھی تھی۔ الجامع اس لئے کہ اس میں حدیث کے آٹھوں ابواب کا تذکرہ تھا اور المسند اس لئے کہ وہ صحابہ کی ترتیب پر تھی۔ انہوں نے اس کتاب کو دس جلدوں میں مرتب کیا تھا جس کی آخری پانچ جلدیں آج بھی مخطوطہ کی شکل میں ترکی کے ایک کتب خانہ میں موجود ہیں۔ معمر بن راشد کا تعلق تابعین کے متوسط دور سے ہے۔ معمر بن راشد کے براہ راست شاگرد عبدالرزاق بن ہمام تھے۔ عبدالرزاق بن ہمام نے ان سے احادیث روایت کیں۔

معمر کے مجموعے کی جو آخری پانچ جلدیں آج دستیاب ہیں ان میں جو احادیث ہیں وہ ساری کی ساری مسند عبدالرزاق میں بھی موجود ہیں۔ مسند عبدالرزاق آج مطبوعہ موجود ہے۔ گویا مسند عبدالرزاق کی حد تک ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ معمر بن راشد نے جو احادیث تحریری طور پر مرتب کیں جن کا تعلق صغار تابعین کے طبقہ سے تھا، وہ ساری احادیث تحریری اور زبانی طور پر عبدالرزاق کو منتقل ہوئیں۔ عبدالرزاق بڑے بڑے محدثین کے استاد ہیں۔ امام بخاری کے بھی استاد ہیں، امام مسلم کے بھی استاد ہیں۔ اور اس زمانہ کے بہت سے محدثین بشمول امام احمد بن حنبل ان کے تلامذہ میں شامل ہیں۔ ان کو جو احادیث ملیں ان کا بہت بڑا حصہ عبدالرزاق کے ذریعہ ملا۔ ان میں وہ احادیث بھی شامل ہیں جو معمر بن راشد کے مجموعہ میں شامل تھیں۔

تدوین حدیث تیسری صدی ہجری میں

صحیح بخاری، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ تیسری صدی ہجری میں لکھی گئی، ایک بزرگ نے صحیح بخاری کی ان روایات کو جمع کیا، وہ آج کل جرمنی میں رہتے ہیں، بہت فاضل انسان ہیں، بیسویں اور اکیسویں صدی کے غالباً اس وقت فاضل ترین اہل علم میں سے ہیں، اگر مجھ سے کہا جائے کہ اس دور کی تین فاضل ترین شخصیات کے نام بتاؤ، تو میں سب سے پہلے ان کا نام بتاؤں گا۔ ڈاکٹر فواد سیزگن، انہوں نے پندرہ بیس جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے اور ہر جلد بہت ضخیم اور ہزار ہزار صفحات پر مشتمل ہے، یہ کتاب انہوں نے جرمن زبان میں لکھی ہے جس میں انہوں نے صدر اسلام، یعنی پہلی چار صدیوں میں تمام اسلامی علوم وفنون کی تاریخ بیان کی ہے۔ قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ، کلام، تصوف اور عربی ادب غرض ہر فن کی تاریخ بتائی ہے۔ اس موضوع پر اس سے زیادہ جامع کتاب کوئی نہیں ہے۔ اس کتاب کی چوتھی جلد پوری حدیث پر ہے۔ حدیث کی تاریخ پر جتنا مواد اس کتاب میں ہے کسی اور کتاب میں نہیں ہے، یا بہت کم کتابوں میں ہے۔ ان کے پی ایچ ڈی کے تھیسس کا موضوع تھا کہ صحیح بخاری کے مآخذ کیا تھے۔ اس میں انہوں نے اور بھی بہت سی مثالیں دیں اور عبدالرزاق کا بھی حوالہ دیا۔ انہوں نے کہا کہ امام بخاری کی وہ روایات جو انہوں نے عبدالرزاق سے لی ہیں، وہ ساری کی ساری عبدالرزاق کی مسند میں موجود ہیں۔ مسند عبدالرزاق کی وہ تمام احادیث جو معمر بن راشد سے لی ہیں وہ ساری کی ساری معمر کی جامع میں

موجود ہیں۔ انہوں نے ایک ایک کر کے بتایا کہ بغیر کسی حرف یا لفظ کے اختلاف کے، زبر زیر کا بھی اس میں فرق نہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ یہ سارا سلسلہ زبانی یادداشت کی بنیاد پر چل رہا تھا یہ بالکل بے بنیاد ہے۔ انہوں نے اس پر پوری کتاب لکھی ہے۔ میں نے اصل کتاب نہیں پڑھی، وہ جرمن اور ترکی زبان میں ہے، لیکن اس کے خلاصے دیکھے ہیں، اور خود ان سے ملاقات کا موقع ملا تو ان سے یہ باتیں معلوم ہوئیں۔

اس بات کی تردید کرنے کے لئے یہ چند مثالیں کافی ہیں کہ احادیث زبانی روایت پر چل رہی تھیں، سنی سنائی باتیں تھیں اور تیسری صدی ہجری کے محدثین نے ان کو جوں کا توں نقل کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ جن کا تعلق تبع تابعینؒ کے اونچے طبقہ سے ہے، ان کے اپنے دست مبارک کی مرتب کی ہوئی دو مطبوعہ کتابیں آج موجود ہیں۔ ایک 'کتاب الزہد' ہے جس میں زہد سے متعلق احادیث ہیں اور ایک 'کتاب الجہاد' ہے جس میں جہاد سے متعلق احادیث ہیں۔ امام مالکؒ جن کا تعلق کچھ روایات کے مطابق صغار تابعین سے ہے اور اکثر روایات کے مطابق ان کا تعلق تبع تابعینؒ کے اونچے طبقہ سے ہے۔ ان کی کتاب موطا سے تو ہم سب واقف ہیں۔ جن حضرات نے تابعین میں سے کتابیں لکھیں اور وہ آج ہمارے پاس موجود ہیں ان میں حضرت ہشام بن عروہ بن زبیر بھی شامل ہیں جو حضرت عائشہ کے بھانجے کے بیٹے تھے۔ حضرت عائشہ سے بہت سی روایات عروہ بن زبیر کرتے ہیں۔ ان کا مرتب کیا ہوا مجموعہ ترکی کے شہید علی کتب خانہ میں موجود ہے۔

حضرت ابوبردہ، حضرت ابوموسیٰ اشعری کے پوتے تھے، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا مجموعہ ان کو ملا اور بہت سی کتابیں ان کو ملیں جن کی بنیاد پر وہ روایت کیا کرتے تھے۔ ان کا مرتب کیا ہوا مجموعہ دمشق کے کتب خانہ ظاہریہ میں موجود ہے۔ اسامہ بن مالک، ابوعدی الہمدانی، ابوزبیر محمد بن مسلم الاسدی۔ یہ وہ چند صغار تابعین ہیں جن کے مجموعے آج کتب خانوں میں موجود ہیں۔

ان حضرات کے علاوہ تبع تابعینؒ میں سے صغار تبع تابعینؒ کا طبقہ تھا، یعنی مشہور محدثین سے پہلے کا طبقہ، ان کی جو کتابیں آج ہمارے پاس موجود ہیں، ان میں قدیم ترین کتب میں سے امام ابوداؤد طیالسی کی مسند ہے جو مسند ابوداؤد طیالسی کے نام سے ہر جگہ ملتی ہے۔ ان کا انتقال 204

ہجری میں ہوا تھا۔ان کی کتاب دوسری صدی ہجری کے اواخر میں لکھی گئی۔وہ آج چار جلدوں میں مطبوعہ موجود ہے اور ہر جگہ دستیاب ہے۔امام بخاری کے استاد حمیدی کی کتاب مسند الحمیدی بھی دوسری صدی ہجری کے اواخر میں لکھی گئی ہے۔امام حمیدی کا انتقال 219ھ میں ہوا۔انہوں نے انتقال سے خاصا پہلے یہ کتاب شروع کی تھی۔تیسری صدی ہجری کے بالکل شروع میں یا دوسری صدی ہجری کے بالکل اواخر میں یہ کتاب لکھی گئی ہے۔اسی طرح سے نعیم بن حماد الخزاعی ہیں جنہوں نے 'کتاب الفتن' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی تھی۔اس میں انہوں نے فتن سے متعلق احادیث کو جمع کیا تھا۔اس کا مخطوطہ برٹش میوزیم میں آج بھی موجود ہے۔یہ کتاب تیسری صدی ہجری کے بالکل شروع میں مرتب کی ہوئی ہے۔

جو مجموعے آج دستیاب ہیں ان میں امام ابوبکر بن ابی شیبہ، جو مشہور محدثین اور فقہا میں سے ہیں ان کی کتاب المصنف پاکستان سمیت ہر جگہ چھپی ہوئی موجود ہے اور کئی بار چھپی ہے، ان کا انتقال 235ھ میں ہوا تھا۔تیسری صدی ہجری کے اوائل میں ان کی کتاب مرتب ہوئی اور المصنف کے نام سے آج بھی موجود ہے۔ایک اور محدث عبد بن حمید ہیں جن کی مسند کا نسخہ 'فاس' یعنی مراکش کے جامعہ قرویئین میں موجود ہے، ان کا انتقال بھی تیسری صدی ہجری کے نصف اول میں ہوا۔خود امام دارمی، جن کا میں پہلے حوالہ دے چکا ہوں اور جن کی مسند مشہور ہے، ان کا تعلق بھی تیسری صدی ہجری کے نصف اول سے ہے۔یہ مثالیں اس بات کی دلیل ہیں کہ ہر دور میں علم حدیث کے مجموعے مرتب ہوتے رہے ہیں۔صحابہ کے دور کی مثالیں آپ کے سامنے آگئیں، تابعین کے پہلے، درمیانی اور آخری دور کی آگئیں۔تبع تابعینؒ کے بھی شروع دور کی، درمیانی دور اور آخری دور کی مثالیں آگئیں اور تبع تابعینؒ کے آخری دور کے فوراً بعد کی جو مثالیں ہیں وہ ان صحاح ستہ کے ان مصنفین کی ہیں، جن کے بارے میں انشاءاللہ آگے گفتگو ہوگی۔

واخر دعوانا ان الحمدللہ رب العلمین

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ایک دن آپ نے کہا تھا کہ قرآن تمام کا تمام قطعی الثبوت ہے لیکن دوسرے دن ایک سوال کے جواب میں آپ نے کہا کہ قرآن کی بعض آیات ایسی ہیں جن کا ایک سے زیادہ مفہوم نکل سکتا ہے۔

نہیں، آپ کو سمجھنے میں غلطی ہو رہی ہے۔ جہاں کسی ایک لفظ میں ایک سے زیادہ مفہوم نکل رہے ہوں، وہ ظنی الدلالت کہلاتے ہیں۔ میں نے دو چیزیں بتائی تھیں ایک یہ کہ قرآن پاک سارا کا سارا قطعی الثبوت ہے اور اس کا قرآن ہونا ثابت ہے، اس باب میں تو پورا قرآن الحمد سے لے کر والناس تک ایک ایک حرف، ایک ایک شوشہ اور ایک ایک زبر زیر قطعی الثبوت ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ احادیث کا بھی بہت بڑا حصہ قطعی الثبوت ہے اور اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لیکن قرآن مجید کی بعض آیات ہیں جن کا ایک سے زیادہ مفہوم نکل سکتا ہے، وہ ظنی الدلالت ہیں، یعنی جن کے مفہوم میں ایک سے زائد معانی اور مطالب کی گنجائش ہے اور علماء حدیث یا علماء تفسیر نے ان کے ایک سے زائد مطلب قرار دیئے ہیں۔ وہ سارے مطالب ظنی الدلالت ہیں۔ ان میں سے ہر مطلب بیک وقت صحیح ہوسکتا ہے، اس لئے میں نے ظنی الدلالت لفظ بولا تھا، ظنی الثبوت کا نہیں بولا تھا۔ قرآن پاک پورے کا پورا قطعی الثبوت ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے احادیث کیوں روایت نہیں کی گئیں؟

میں یہ بات پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ احادیث کو بیان کرنے کا زیادہ موقع اس وقت ملا جب صحابہ کرام ایک ایک کر کے دنیا سے اٹھتے جا رہے تھے۔ صحابہ کرام کو آپس میں احادیث بیان کرنے کا بہت کم موقع ملتا تھا، اس لئے کہ انہیں اس کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ احادیث بیان کرنے کی زیادہ ضرورت اس وقت پیش آئی جب تابعین کی تعداد بڑھتی گئی اور صحابہ کرام کی تعداد کم ہوتی گئی۔ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کا انتقال رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے چھ ماہ کے اندر اندر ہو گیا تھا اور ان چھ مہینوں میں انہوںؓ نے جس پریشانی اور کرب میں اپنا وقت گزارا وہ سب کو معلوم ہے۔ وہ چھ ماہ کے اس زمانے میں جو اشعار وقتاً فوقتاً پڑھا کرتی تھیں ان میں سے ایک یہ تھا ۔

صبت علی مصائب لو انھا

صبت علی الایام صرن لیا لیا

مجھ پر جو مصائب آن پڑے ہیں اگر وہ دنوں پر پڑتے تو دن راتوں میں تبدیل ہو جاتے۔

حضرت فاطمہؓ کسی سے ملتی جلتی نہیں تھیں۔ دن رات اپنے گھر میں رہا کرتی تھیں۔اور چھ ماہ کے بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا۔اس لئے ان کو احادیث بیان کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔

تدوین حدیث میں خواتین کا ذکر نہیں آیا؟

ابھی میں نے آپ کے سامنے عمرہ انصاریہ کا ذکر اسی لئے تو کیا ہے کہ جب خواتین کا ذکر ہو رہا ہے تو خواتین کی کم از کم ایک مثال سامنے آجائے۔خواتین سے بہت سی احادیث روایت ہوئی ہیں۔مسند عائشہؓ الگ سے چھپی ہوئی موجود ہے، وہ احادیث جو حضرت عائشہؓ نے روایت کیں وہ الگ مجموعہ کی شکل میں مرتب ہیں اور پاکستان کی ایک قابل احترام خاتون محدثہ ڈاکٹر جمیلہ شوکت نے نے ان کو ایڈٹ کیا ہے، وہ ایک عرصہ تک پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ اسلامیات کی چیئر پرسن رہی ہیں۔اسلامی نظریاتی کونسل میں ہم دونوں رکن کی حیثیت سے کولیگ رہے ہیں۔ انہوں نے مسند عائشہؓ کے نام سے کتاب مرتب کی ہے، جو چھپی ہوئی موجود ہے۔میرے خیال میں یہ کہنا درست نہیں کہ خواتین کا ذکر نہیں ہے۔خواتین کا ذکر ملتا ہے۔

آپ نے علم رجال کے تین گروہ بتائے تھے، متشددین، معتدلین اور......

تیسرا گروپ تھا متساہلین کا، جو تساہل سے کام لیتے ہیں، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اگر کسی کو عادل قرار دیں تو وہ تساہل سے کام لیتے ہیں اس لئے اس میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ان میں سے ایک امام ترمذیؒ ہیں اور ایک امام حاکم ہیں جو مستدرک کے مصنف ہیں۔امام حاکم اگر کسی راوی کو عادل قرار دیں تو اس کے بارے میں عام اصول یہ ہے کہ دوسری کتابوں سے بھی اس کو چیک کرنا چاہئے۔اگر دوسرے ائمہ جرح وتعدیل بھی اس راوی کو عادل قرار دے رہے ہیں تو پھر واقعی وہ راوی عادل ہے اور اگر دوسرے ائمہ نے اس کو عادل قرار نہیں دیا تو پھر امام حاکم یا امام ترمذی کی تعدیل پر زیادہ بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔یہ تیسرے گروہ یعنی متساہلین کے گروہ سے مثالیں ہیں۔

ہمیں بتایا گیا ہے کہ مرغ کی آواز پر کوئی دعا نہیں، لیکن 'پیارے رسولؐ کی پیاری دعائیں' میں یہ دعا موجود ہے۔

مجھ سے غلطی ہوئی ہوگی، جہاں تک مجھے یاد ہے وہ یہی ہے کہ مرغ کی بانگ اور دعا کے بارے میں جتنی احادیث ہیں وہ ساری کی ساری ضعیف ہیں۔لیکن اگر یہ روایت موجود ہے تو صحیح ہوگی میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے اس خاص روایت کی تحقیق نہیں۔لیکن میں نے موضوعات کی کسی کتاب میں اس کو پڑھا تھا، کہ مرغ کو دیکھنے اور دعا کرنے کے بارے میں جتنی احادیث ہیں وہ ساری کی ساری ضعیف ہیں۔ میں دوبارہ چیک کروں گا ممکن ہے میری یادداشت سے غلطی ہوئی ہو۔

احادیث تو بہت سے صحابہ کرام سے روایت ہوئیں لیکن کیا وجہ ہے کہ منکرین حدیث زیادہ تر حضرت ابوہریرہؓ کو نشانہ بناتے ہیں۔

ہمارے منکرین حدیث میں بہت زیادہ اوریجنلٹی نہیں ہے۔وہ تمام باتیں مغربی لوگوں کی ہی دہراتے رہتے ہیں۔ ہمارا کوئی منکر حدیث ایسا نہیں ہے جس نے کوئی نئی بات اپنی طرف سے نکالی ہو۔جرمنی کا ایک شخص تھا جو پچھلی صدی کے اواخر میں اور موجودہ صدی کے اوائل میں تھا گولڈتسیہر،سب سے پہلے اس نے حدیث پر کام کا آغاز کیا تھا۔اور اس کا ایک شاگرد تھا جوزف شخت ، یہ بھی جرمن تھا، دونوں یہودی اور دونوں جرمن تھے۔انہوں نے سب سے پہلے حدیث کے بارے میں بدگمانی پھیلائی۔ایک بدگمانی یہ پھیلائی کہ حضرت ابوہریرہؓ نے تو سن سات ہجری میں اسلام قبول کیا، اور سات ہجری کے بعد گویا صرف تین سال ان کو حضورؐ اکرم کے ساتھ رہنے کا موقع ملا، ان سے جو روایات ہیں وہ ساڑھے پانچ ہزار بتائی جاتی ہیں اور ان صحابہ کی روایات تھوڑی ہیں جو طویل طویل عرصہ حضورؐ کے ساتھ رہے۔جو آدمی صرف تین سال ساتھ رہا اس نے تو ساڑے پانچ ہزار روایات بیان کیں اور جو بیس بیس،پچیس پچیس سال اور پوری زندگی ساتھ رہے ان سے مروی احادیث بہت تھوڑی ہیں۔ یہ گویا اس بات کا ثبوت ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نعوذ باللہ غلط بیانی کیا کرتے تھے۔انہی الزامات کو ان لوگوں نے دہرایا۔ہمارے لوگوں نے بھی انہی کو دہرایا۔

ہمارے ایک اور دوست ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت دے، بڑے عالم فاضل انسان ہیں، علم حدیث پر انہوں نے بہت کام کیا ہے۔ وہ بھی مدینہ منورہ کے رہنے والے ہیں، اور مصطفیٰ اعظمی کی طرح اعظمی ہیں لیکن ان کا نام ہے ضیاء الرحمٰن اعظمی۔ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ پندرہ سال کی عمر تک ہندو تھے اور پھر اسلام میں داخل ہوئے تو ان کے رشتہ داروں نے

ان پر غیر معمولی مظالم ڈھائے اور اتنے مظالم کئے کہ ان کی تفصیل سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔اس کے باوجود وہ نہ صرف اسلام پر قائم رہے، بلکہ علم دین حاصل کیا، علم حدیث میں تخصص پیدا کیا۔سعودی عرب چلے گئے اور اب گزشتہ تقریباً پچیس تیس سال سے مدینہ منورہ میں قیام پذیر ہیں۔سعودی عرب کی شہریت ان کو ملی ہوئی ہے۔مدینہ منورہ میں جامعہ اسلامیہ میں حدیث کے استاد ہیں اور حدیث پر انہوں نے بہت سی کتابیں لکھیں۔انہوں نے علم حدیث پر جو کام کیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ انہوں نے حضرت ابو ہریرہؓ کی احادیث پر کام کیا۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی احادیث پر جو اعتراضات جوزف شخت اور گولڈ تسیہر نے اٹھائے تھے وہی اعتراضات مصر کے ایک منکر حدیث محمود ابوریہ نے بھی اٹھائے ہیں۔محمود ابوریہ نے ایک کتاب لکھی 'ابو ھریرۃؓ و مرویاتہ'، ابو ہریرہؓ اور ان کی روایات، اور اس میں وہی باتیں دہرائیں جو وہ لوگ کہتے تھے۔ ہمارے ہاں بھی کچھ لوگوں نے یہی باتیں بار بار دہرائیں۔ ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی نے کمپیوٹر کی مدد سے حضرت ابو ہریرہؓ کی ساری روایات کو جمع کیا۔ان کے تمام طرق کو جمع کیا اور یہ ثابت کیا کہ جو متون ہیں وہ کل پندرہ سو کے قریب ہیں، باقی سارے طرق ہیں۔پندرہ سو متون کا ایسے آدمی کے لئے یاد رکھنا جو لکھتا بھی ہو تین سال میں کوئی مشکل بات نہیں۔روزانہ اوسطاً دو تین حدیثیں بھی نہیں بنتیں۔تو ایک آدمی تین چار پانچ احادیث تو روزانہ لکھ سکتا ہے اور یاد بھی کر سکتا ہے اس میں ایسی کوئی بڑی بات نہیں۔یہ ضیاء الرحمٰن اعظمی کی کتاب میں تمام تفصیل موجود ہے۔اس کتاب کا نام بھی 'ابو ھریرہ و مرویاتہ' ہے۔مستشرقین اور منکرین حدیث کو چونکہ حضرت ابو ہریرہؓ کے راستہ سے حدیث پر اعتراض کا موقع ملتا ہے اس لئے حضرت ابو ہریرہؓ کو زیادہ نشانہ بناتے ہیں۔

احادیث کے ضعف کے بھی درجے ہوتے ہیں؟

یقیناً ہوتے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ضعیف احادیث کی بیالیس قسمیں ہیں جن میں سے چند میں پہلے بیان کر چکا ہوں ان سب کے الگ الگ درجات ہیں۔ضعیف احادیث کو بالکل مسترد نہیں کیا جاتا۔بعض شرائط کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے لیکن اس قبولیت کا دارومدار ضعف پر ہے۔زیادہ ضعف ہو تو قبول نہیں کی جاتی، جو کم ضعف والی ہو اس کو پہلے دیکھا جاتا ہے کہ آیا دوسری ضعیف احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے؟ اگر دوسری ضعیف احادیث سے تائید ہوتی ہو تو

بعض معاملات میں ضعف کے باوجود اس کو قبول کرلیا جاتا ہے، بعض معاملات میں قبول نہیں کیا جاتا۔ احکام اور عقائد میں ضعیف حدیث کو قبول نہیں کیا جاتا۔ فضائل میں قبول کرلیا جاتا ہے۔ مثلاً حدیث میں آیا ہو کہ فلاں دن کا روزہ رکھنا افضل ہے تو روزہ رکھنا ویسے بھی افضل ہے۔ اگر دو تین ضعیف احادیث سے ایک بات کا پتہ چلتا ہو تو عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ محدثین کی بڑی تعداد کی رائے ہے۔ بعض لوگوں کی رائے یہ بھی ہے کہ اسے حضورؐ سے منسوب نہیں کرنا چاہئے اور اس پر عمل نہیں کرنا چاہئے۔

یادداشت کو بڑھانے کے لئے کوئی ایکسر سائز یا دعا بتادیجئے......شاہ ولی اللہ کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ گیارہ بارہ بادام روزانہ کھایا کرتے تھے......

مجھے تو ایسا کوئی نسخہ نہیں معلوم، اگر آپ کے علم میں آئے تو مجھے بھی بتایئے گا۔ میرے علم میں تو کوئی ایسی ایکسر سائز نہیں ہے جس کے کرنے سے حافظہ بڑھتا ہو۔ اگر بادام کھانے سے یادداشت بڑھتی ہو تو آپ ضرور کھائیں۔ میں نے وید کی ایک کتاب میں پڑھا تھا۔ آیورویدک جو ہندوؤں کی تقریباً تین ہزار سال پرانی میڈیکل سائنس ہے۔ اس میں لکھا ہوا ہے کہ ہندوؤں کے ہاں ایک دوا ہے جو مہا سرسوتی چورن کہلاتی ہے، اس کے کھانے سے آدمی کا حافظہ بہت بڑھ جاتا ہے اور وہ مہا سرسوتی یعنی بہت بڑا علامہ بن جاتا ہے تو میں نے ہندوستان میں رہنے والے ایک عزیز کو فون کیا جو وہاں سے آرہے تھے، اب ان کا انتقال ہو گیا ہے اللہ تعالیٰ جنت نصیب کرے، میں نے ان سے کہا کہ پاکستان آتے وقت کسی وید کی دکان پر جا کر مہا سرسوتی چورن لے کر آئیں تاکہ آزمائش ہو جائے کہ یادداشت اس سے بڑھتی ہے کہ نہیں بڑھتی۔

البتہ ایک دعا ہے رب زدنی علماً یہ دعا پڑھیں۔ ایک اور دعا میں نے کسی کتاب میں پڑھی تھی اللھم انی اسئلك علماً لا ینسیٰ، اے اللہ میں تجھ سے ایسے علم کا سوال کرتا ہوں جو بھلایا نہ جا سکے۔

یہ دعائیں بھی پڑھا کریں۔ لیکن ایک گر جو میں نے دیکھا ہے لیکن اس پر خود مجھے عمل کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا، وہ یہ کہ علم حدیث سے زیادہ اعتنا رکھیں۔ جو آدمی علم حدیث زیادہ پڑھتا پڑھاتا ہے اس کا حافظہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ تو یہ تینوں کام کریں، بادام بھی کھائیں، یہ دعا بھی پڑھیں اور علم حدیث کا بھی مطالعہ رکھیں اور اگر وہ مہا سرسوتی چورن ملتا ہے تو اس کو بھی آزمالیں۔

☆☆☆☆☆☆

آٹھواں خطبہ

رحلۃ اور محدثین کی خدمات

منگل، 14 اکتوبر 2003

رحلۃ اور محدثین کی خدمات

آج کی گفتگو کا عنوان ہے: رحلۃ فی طلب الحدیث ،یعنی علم حدیث کے حصول اور تدوین کی غرض سے سفر۔ یوں تو حصول علم کے لئے دور دراز علاقوں کا سفر کرنا مسلمانوں کی روایات کا ہمیشہ ہی ایک اہم حصہ رہا،لیکن علم حدیث کے حصول کی خاطر سفر کا اپنا ایک منفرد مقام ہے۔ محدثین کرام نے علم حدیث کے حصول، احادیث کی تحقیق، راویوں کی جرح وتعدیل اور رجال کے بارے میں معلومات جمع کرنے کی خاطر جو طویل اور مشقت انگیز سفر اختیار فرمائے ان سب کی داستان نہ صرف دلچسپ اور حیرت انگیز ہے، بلکہ علم حدیث کی تاریخ کا ایک بڑا نمایاں اور منفرد باب ہے۔ محدثین میں جس شخصیت نے جتنے زیادہ سفر کئے ہوں، تذکرہ حدیث اور تذکرہ محدثین میں اسی اہتمام سے اس محدث کا ذکر کیا جاتا ہے۔ محدثین کے تذکرے میں رَحّال، یعنی بہت زیادہ سفر کرنے والا اور جوّال، بہت زیادہ پھرنے والا، یہ صفات بہت کثرت سے نظر آتی ہیں۔ بعض محدثین کے بارے میں تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ طاف البلاد، انہوں نے مختلف ملکوں کا چکر لگایا تھا۔ جاب الآفاق انہوں نے چار دانگ عالم میں سفر کئے تھے۔ انہوں نے مشرق ومغرب کے شہر اور علاقے علم حدیث کی تلاش میں چھان مارے۔ یہ عبارتیں اور الفاظ تذکرہ محدثین میں عام ہیں۔

القاب محدثین

علم حدیث میں محدثین کے لئے جو القاب استعمال ہوتے ہیں ان میں سے ایک لقب رُحلہ بھی ہے۔ مثال کے طور پر حدیث کی کسی کتاب میں آپ کو ملے گا، مثلاً یہ سنن نسائی کے شروع

میں ہے،قال الامام العالم الربانی المحدث الحافظ الثبت الرُّحله ،یعنی امام نسائی کا جب ذکر ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے: فرمایا امام نسائی نے جو بہت بڑے حجت تھے،ثبت تھے،علم حدیث میں اونچا مقام رکھتے تھے اور رُحلہ تھے۔ رُحلہ سے مراد وہ محدث ہے جس کی طرف سفر کر کے آنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہو اور روئے زمین کے ہر گوشے سے طلبہ اس کے پاس آتے ہوں۔ ایسے مرجع خلائق محدث کو علم حدیث کی اصطلاح میں رُحلہ کہا جاتا ہے۔

ایک اور محدث ہیں ابن المقری، جو غالبًا پانچویں صدی ہجری کے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے روئے زمین میں مشرق و مغرب سے لے کر چار مرتبہ سفر کیا۔ طفت الشرق والغرب اربع مرّات ، جب وہ شرق اور غرب کہتے ہیں تو شرق سے ان کی مراد وسط ایشیا کے وہ علاقے ہوتے ہیں جو مسلمانوں میں علوم و فنون کا مرکز تھے،سمرقند اور بخارا۔ اور غرب سے ان کی مراد ہوتی ہے اسپین، اندلس،غرناطہ، فاس، قیروان، رباط، گویا اندلس سے لے کر سمرقند اور بخارا تک اور شمال میں آذربائیجان اور آرمینیا سے لے کر جنوب میں مصر اور یمن تک۔ انہوں نے علم حدیث کی تلاش میں اس پورے علاقے کا چار مرتبہ چکر لگایا۔

محدثین میں ان لوگوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے جو علم حدیث کی تلاش اور جستجو میں سفر پر نکلے،سفر کے دوران مفلس ہو گئے، پیسے ختم ہو گئے اور ان کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مفلسین فی طلب الحدیث کا تذکرہ الگ سے ملتا ہے،یعنی راہ حدیث میں سفر پر نکلنے والے اور اس سفر کی وجہ سے افلاس کا شکار ہو جانے والے جان نثارانِ علم۔ ظاہر ہے یہ سفر آسان نہیں تھے، ان اسفار میں پیسہ بھی خرچ ہوتا تھا، دولت بھی خرچ ہوتی تھی، پریشانیاں اور مشکلات بھی پیش آتی تھیں۔ ان سب چیزوں کے تذکرہ اور تاریخ پر الگ سے کتابیں ہیں۔

خود علم حدیث کے راستے میں سفر کیسے کیا جائے،سفر کے آداب کیا ہیں،فوائد کیا ہیں، ان پر الگ سے کتابیں ہیں۔ ان میں سے یہ ایک کتاب میں آج ساتھ لایا ہوں 'الرحلة فی طلب الحدیث '، یہ خطیب بغدادی کی کتاب ہے۔ گفتگو کے آخر میں اس کتاب سے دو واقعات پڑھ کر سناؤں گا۔

امام یحیٰ بن مَعین جن کا میں کئی بار ذکر کر چکا ہوں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ علم حدیث کا کوئی بھی تذکرہ ان کے نام نامی کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ ان کے والد نے دس لاکھ پچاس ہزار درہم

ترکے میں چھوڑے جو یحیٰ بن مَعین کو ملے۔ یحیٰ بن مَعین نے یہ ساری کی ساری رقم علم حدیث کے حصول اور اس کی خاطر سفر کرنے میں صرف کردی۔ لما توسع فی طلبه و رحلته من اجله، انہوں نے وسیع پیمانے پر سفروں کا سلسلہ اختیار کیا اور علم حدیث کے حصول میں جو توسُّع وہ اپنا سکتے تھے وہ انہوں نے اپنایا۔

یحیٰ بن مَعین نے ایک مرتبہ امام احمد کے ساتھ مل کر ایک علمی سفر کیا۔ طویل سفر طے کر کے یمن پہنچے اور وہاں امام عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی، جن کا ذکر آچکا ہے، ان سے ان دونوں بزرگوں نے بعض احادیث کی تحقیق وتحصیل نے کی۔ یہ دونوں بزرگ بغداد سے سفر کر کے یمن پہنچے تھے۔ امام عبدالرزاق کی خدمت میں رہے اور جن احادیث کی تحقیق کرنی تھی ان احادیث کی تحقیق کی۔

ایک مرتبہ یہ دونوں بزرگ کوفہ گئے۔ وہاں ایک محدث ابونعیم فضل بن دکین تھے۔ امام احمد نے یحیٰ بن مَعین سے کہا کہ یہ ایک بہت مستند راوی ہیں۔ اطمینان رکھو، میں نے تحقیق کر لی ہے۔ امام یحیٰ بن مَعین نے کہا کہ جب تک میں خود تحقیق نہ کرلوں میں ان کے عادل اور حجت ہونے کی گواہی نہیں دے سکتا۔ چنانچہ یہ دونوں بزرگ ان کی خدمت میں پہنچے۔ اپنا تعارف نہیں کروایا اور نہ ہی اپنا نام بتایا۔ جا کر صرف یہ بتایا کہ دور دراز کے ایک علاقہ سے آپ کے پاس علم حدیث سیکھنے آئے ہیں۔

جیسا کہ میں نے بتایا کہ محدثین میں سے بعض کا طریقہ یہ تھا کہ طالب علم پڑھے اور استاد سنے۔ چنانچہ ابونعیم نے یحیٰ بن مَعین سے کہا کہ سنائیں۔ یحیٰ بن مَعین نے پہلے سے ان کی احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کرلیا تھا جو انہوں نے پہلے سے سنا ہوا تھا اور روایت سے ان تک پہنچ چکا تھا۔ اس سفر سے ان کے پیش نظر اسی مجموعہ کی احادیث کی تحقیق اور تصدیق تھی اور اس بات کا یقین کرنا مقصود تھا کہ کیا واقعتاً ان کی یادداشت اور حافظہ میں یہ روایات اسی طرح محفوظ ہیں کہ نہیں۔ یحیٰ بن مَعین نے وہ روایات پڑھنی شروع کیں اور ہر دسویں روایت کے بعد ایک روایت کا انہوں نے اپنی طرف سے اضافہ کیا جو اس محدث یعنی ابونعیم بن دکین کی روایت نہیں تھی۔ جب وہ روایت آتی تو ابن دکین اشارہ کرتے کہ اس کو نکالو۔ پھر آگے گیارویں سے شروع کرتے اور جب دوسری دس پوری ہوتیں تو وہ پھر ایک روایت کا اپنی طرف سے اضافہ کر دیتے۔ اب پھر ابونعیم ہاتھ

سے اشارہ کرتے اور کہتے کہ اس کو نکالو۔ جب چوتھی پانچویں مرتبہ ایسا ہوا تو ابونعیم مسکرائے اور کہا کہ کتنا امتحان لینا چاہتے ہو۔ پھر کہا کہ تمہارے اس دوست نے تو یہ شرارت میرے ساتھ نہیں کی۔ تم کیوں ایسا کرنا چاہتے ہو۔ یعنی ان کو اپنی روایت اور حافظہ پر اتنا اعتماد تھا کہ ایک دو مرتبہ ہی میں ان کو اندازہ ہو گیا کہ یہ محض غلطی نہیں بلکہ مجھے آزمانا مقصود ہے۔ چنانچہ دونوں بزرگوں، امام احمد اور یحییٰ بن مَعین نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ان سے اجازت لے کر واپس آگئے۔ امام احمد نے کہا کہ میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ یہ بہت قابل اعتماد ہیں اور ان کو چیک کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس ذاتی تحقیق کے بعد ہی یحییٰ بن مَعین نے اپنی کتاب میں درج کیا کہ ابونعیم مستند راوی ہیں۔

رحلہ

رحلہ ایک اصطلاح ہے جس کے لفظی معنی تو سفر کے ہیں لیکن یہاں علم حدیث کی اصطلاح میں علم حدیث حاصل کرنے کے لئے سفر کرنا رحلہ کہلاتا ہے۔ رَحّال اس محدث کو کہتے ہیں جو بہت زیادہ سفر کرے اور رُحلہ وہ محدث جس کے پاس سفر کر کے جایا جائے۔ بعض حضرات نے قرآن مجید میں سورۃ التوبہ میں جو آیت آئی ہے 'السائحون' یعنی سفر کرنے والے سے طلب علم کا سفر مراد لیا ہے۔ اس لفظ کے بارے میں بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہاں سفر کرنے والے سے مراد وہ سفر کرنے والے ہیں جو کسی نیک مقصد کی خاطر سفر کریں۔ مثلاً جہاد کے لئے، یا دعوت دین کے لئے یا پھر مثلاً طلب علم کے لئے۔ اور یہ آخری قول جن لوگوں کا ہے ان میں حضرت عکرمہؓ، (حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد) بھی شامل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ 'ھم طلبة الحدیث' اس سے مراد حدیث کے طلبہ ہیں۔ گویا اگر حدیث کے طلبہ اس سے مراد ہوں، جیسے کہ حضرت عکرمہؓ کی رائے ہے، تو طلب حدیث کے لئے گھر سے نکلنا اور سفر اختیار کرنا قرآن مجید سے براہ راست بھی ثابت ہے۔

لیکن بالواسطہ طور پر قرآن مجید کی ایک آیت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شریعت میں طلب علم کے لئے گھر سے نکلنے اور سفر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ سورۃ توبہ ہی کی آیت ہے' فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا فی الدين ولينذروا قومهم اذا رجعوا اليهم

لعلهم يحذرون '، پھر ایسا کیوں نہ ہو کہ ہر گروہ میں سے ایک چھوٹی جماعت اس کام کے لئے نکلے تا کہ وہ دین میں گہری بصیرت حاصل کرے اور جب واپس آئے تو اپنی قوم کو ڈرائے اور اپنی قوم کو اس کی اطلاع دے۔ اس سے بھی یہ بات نکلتی ہے کہ طلب علم کے لئے گھر سے نکلنا اور سفر اختیار کرنا قرآن مجید کا ایک حکم ہے۔

بعض حضرات نے حضرت موسیٰ کے واقعہ سے بھی استدلال کیا ہے۔ کہ حضرت موسیٰ نے ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ آپ کا سب سے مقرب بندہ کون سا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ جس کے پاس علم زیادہ ہے اور وہ اس علم کے مطابق عمل بھی کرتا ہے۔ پھر حضرت موسیٰ نے مزید تفصیلات پوچھیں اور نام پوچھا تو بتایا گیا کہ اس بندے کا نام 'خِضر' یا 'خَضِر' ہے جو فلاں جگہ پائے جاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ نے وہ سفر اختیار کیا جس کا قرآن مجید کی سورۃ کہف میں تذکرہ ہے۔ گویا ایک پیغمبر نے طلب علم کے لئے ایک طویل علاقے کا سفر اختیار فرمایا اور راستے میں جو مشکلات پیش آئیں ان کو بھی برداشت کیا۔

صحیح مسلم کی ایک روایت ہے: حضورؑ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ ' من سلك طريقا يلتمس فيه علماً سهل الله به طريقه الى الجنة '۔ کہ جو شخص کسی راستے پر چلا اور اس کا مقصد علم حاصل کرنا تھا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان کر دیتے ہیں۔ اس سے بھی علم حدیث اور علم دین اختیار کرنے کے لئے سفر کرنا پسندیدہ معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسولؐ نے اس کو ایک پسندیدہ چیز اور جنت کا ایک ذریعہ قرار دیا ہے۔

علو اسناد اور نزول اسناد

جن مقاصد کے لئے محدثین کرام سفر اختیار فرماتے تھے، ان میں سے بعض کا تذکرہ آگے آئے گا۔ ان میں سے ایک اہم مقصد یہ بھی ہوتا تھا کہ اپنی سند کو بہتر سے بہتر بنایا جائے۔ کل علوم حدیث کے عنوان سے اس موضوع پر بھی اس پر بات ہوگی کہ علو اسناد اور نزول اسناد سے کیا مراد ہے۔

علو اسناد سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور محدث کے درمیان کم سے کم واسطے ہوں۔ جیسا کہ امام مالکؒ کی موطا میں اعلیٰ ترین احادیث وہ ہیں جو ثنائی ہیں اور جن میں امام مالکؒ

اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان صرف دو واسطے ہیں، مالک عن نافع عن بن عمرؓ۔ امام بخاری کی عالی اسناد کے بارے میں ایک دو روز قبل مجھ سے غلطی ہوگئی تھی۔ میں اس کی اصلاح کر دیتا ہوں۔ آپ بھی اپنی یادداشتوں میں اصلاح کرلیں۔ امام بخاری کے ہاں جو سندیں سب سے اعلیٰ ہیں وہ ثلاثیات کہلاتی ہیں جن میں امام بخاری اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان تین واسطے ہیں۔ میں نے غالباً یہ کہا تھا کہ ثلاثیات کا بیش تر حصہ علی بن مدینی سے منقول ہے۔ یہ غلطی ہوئی۔ علی بن مدینی سے نہیں، بلکہ امام بخاری کی بیشتر ثلاثیات مکی بن ابراہیم سے منقول ہیں۔ مکی بن ابراہیم اور علی بن مدینی دونوں امام بخاری کے اساتذہ ہیں۔ لیکن ثلاثیات کی بڑی تعداد مکی بن ابراہم سے منقول ہے۔ علی بن مدینی سے منقول نہیں ہے۔

اس علو اسناد کے بارے میں امام احمد کا ارشاد ہے کہ 'طلب علو الاسناد من الدین' کہ علو اسناد کو حاصل کرنا بھی دین کا ایک حصہ ہے، یہ چیز دین کا حصہ اس لئے ہے کہ سندیں اور واسطے جتنے کم ہوں گے بات اتنی یقینی ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات جتنے یقینی انداز میں کسی تک پہنچیں گے اتنا ہی زیادہ اس پر عمل درآمد کے لئے جذبہ پیدا ہوگا۔ جتنا عمل درآمد کا جذبہ پیدا ہوگا اتنی ہی دقت نظر کے ساتھ انسان عمل کرے گا۔ اس لئے علو اسناد کا حصول بھی دین کا ایک حصہ ہے۔ جب علو اسناد کے لئے انسان سفر اختیار کرے گا تو وہ بھی دین کا ایک حصہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے اس کا اجر ملے گا۔

آپ نے مشہور بزرگ اور صوفی ابراہیم بن ادھمؒ کا قصہ سنا ہوگا۔ ان کا زمانہ وہی ہے جب محدثین کرام طویل اور مسلسل سفر اختیار فرمایا کرتے تھے اور علم حدیث کے بارے میں معلومات جمع کیا کرتے تھے۔ ایک موقع پر حضرت ابراہیم بن ادھم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت سے جو بلائیں اور آزمائشیں اٹھائی ہیں اس کی ایک وجہ محدثین کرام کے طویل سفر بھی ہیں، یعنی محدثین جو طویل سفر اختیار فرماتے ہیں اور جو مشقت برداشت کرتے ہیں اس کی برکت سے اور اس کی پسندیدگی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس امت کی بہت سی بلائیں ہٹادی ہیں اور ختم کردی ہیں۔

علم حدیث کے لئے صحابہؓ کے سفر

علم حدیث کے لئے سفر کرنے کا طریقہ سب سے پہلے خود صحابہ کرامؓ نے شروع کیا۔ صحابہ کرامؓ نے کئی مواقع پر طویل سفر اختیار فرمائے، جن کا مقصد یہ تھا کہ حدیث کے بارے میں جو معلومات کسی اور صحابیؓ کے پاس ہیں ان کو حاصل کیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جو عبادلہ اربعہ میں سب سے پہلے درجہ پر فائز ہیں۔ یعنی عبداللہ نام کے چار مشہور صحابیوں میں جن کا درجہ سب سے پہلا ہے اور صحابہ کرامؓ میں جو فقہ اور افتا میں سب سے نمایاں صحابہ میں سے تھے، ان کا ارشاد ہے کہ قرآن مجید کی کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کے بارے میں مجھے یہ معلوم نہ ہو کہ یہ کب نازل ہوئی ہے اور کہاں نازل ہوئی ہے۔ میں ہر آیت کے بارے میں جانتا ہوں، اور الحمدللہ ہر سورۃ کے بارے میں مجھے علم ہے۔ اگر کوئی آیت ایسی ہوتی جس کے بارے میں میں نہ جانتا کہ وہ کہاں نازل ہوئی اور کب نازل ہوئی، یا جس کے بارے میں مجھ سے زیادہ کوئی جاننے والا موجود ہوتا تو میں اس کے پاس سفر کر کے جاتا اور جہاں تک سواریاں اور اونٹنیاں پہنچا سکتی ہیں میں وہاں پہنچتا اور اس آیت کے بارے میں معلومات حاصل کرتا۔ یہ متفق علیہ حدیث ہے اور بخاری و مسلم دونوں نے اس کو نقل کیا ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ ایک مشہور صحابیؓ ہیں۔ ان کو اطلاع ملی کہ رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابیؓ شام میں مقیم ہیں جن کا نام عبداللہ بن اُنَیس ہے۔ ان کے پاس کوئی ایسی حدیث ہے جو جابر بن عبداللہؓ نے نہیں سنی۔ جابر بن عبداللہؓ نے سفر کے مصارف اور زادِ راہ کا انتظام کیا، اونٹ خریدا اور ایک مہینے کا سفر کر کے شام پہنچے۔ دمشق گئے، عبداللہ بن انیس کے مکان کا پتہ کیا۔ دروازے پر کھٹکھٹایا، ملازم نکلا، اس نے اندر جا کر بتایا کہ کوئی بدو آیا ہے، پرانے کپڑے پہنے ہوئے ہے، گرد آلود ہے، معلوم ہوتا ہے کہ دور سے سفر کر کے آیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن انیس نے کہا کہ جا کر نام معلوم کرو۔ انہوں نے کہا کہ 'جابر'۔ عبداللہ بن انیس نے ملازم سے مزید وضاحت کروائی کہ کون جابر؟ باہر سے جواب لایا گیا کہ 'جابر بن عبداللہؓ'۔ یہ نام سنتے ہی عبداللہ بن انیس تڑپ اٹھے۔ اندر سے دوڑتے ہوئے نکلے، حضرت جابر کو گلے لگایا، پیشانی پر بوسہ دیا اور پوچھا کہ کیسے تشریف لائے؟ انہوں نے کہا 'بس اتنا معلوم کرنا تھا کہ فلاں حدیث کے بارے میں پتہ چلا

تھا کہ وہ آپ کے پاس ہے۔اس کے الفاظ کیا ہیں اور آپ نے رسول اللہ ﷺ سے کن الفاظ میں اس حدیث کو سنا تھا؟' انہوں نے دوہرایا کہ ان الفاظ میں سنا تھا۔انہوں نے کہا الحمد للہ، صرف اس غرض کے لئے آیا تھا اس کے علاوہ اور کوئی غرض نہیں ہے۔اونٹ کی باگ موڑ دی اور واپس مدینہ منورہ کی طرف چل پڑے۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ کو ایک مرتبہ ایک اور حدیث کے حصول کے لئے مصر جانے کا موقع ملا۔مصر میں ایک صحابی کے بارے میں انہوں نے سنا کہ ان صحابی کے علم میں کوئی حدیث ہے اور ان کے علاوہ کوئی اور صحابیؓ اس وقت ایسے نہیں ہیں جو اس حدیث کا علم رکھتے ہوں۔وہ اونٹ پر سوار ہوئے اور مدینہ منورہ سے سفر کر کے مصر پہنچے۔وہ صحابیؓ مصر کے گورنر تھے۔دروازہ کھٹکھٹایا۔ملازم نکلا تو بولے کہ گورنر سے کہو کہ باہر آئے۔ملازم کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ کون شخص ہے، اس لئے کہ اس طرح تو کوئی نہیں کہتا۔لوگ تو درخواست لے کر آتے ہیں کہ میں گورنر سے ملنا چاہتا ہوں، کس وقت ملاقات کا موقع مل سکتا ہے وغیرہ۔یہ کون شخص ہے جو گورنر سے باہر آنے کا کہہ رہا ہے۔اس نے جا کر کہا کہ باہر ایک بدو آیا ہے اور کہتا ہے کہ گورنر سے کہو کہ باہر آئے۔وہ بھی اپنے ساتھیوں کے مزاج شناس تھے، سمجھ گئے کہ کوئی صحابیؓ ہوں گے۔کہا کہ جا کر نام پوچھ کر آؤ۔ اِنہوں نے کہا 'جابر'۔اُنہوں نے کہا کہ ہو نہ ہو یہ جابر بن عبداللہ ہیں، دوڑتے ہوئے باہر آئے، گلے ملے اور پوچھا کہ کیسے آنا ہوا۔انہوں نے کہا کہ آپ کے پاس ایک حدیث ہے جس کے الفاظ ہیں کہ من ستر عورۃ مسلم فکانما احیاموؤدۃ، یعنی جس نے کسی مسلمان کی کسی کمزوری کو چھپایا وہ ایسا ہی ہے جیسا کسی نے زندہ درگور کی جانے والی بچی کو زندگی بخشی۔کسی مسلمان کی کسی کمزوری کو چھپانا ایسا ہی کار ثواب ہے جیسا کسی ایسی جان کو بچا لینا جس کو اس کے رشتہ دار زندہ درگور کرنے کے لئے آمادہ ہوں۔گورنر صاحب نے تصدیق کی اور دوبارہ حدیث کے الفاظ دہرا دیئے۔انہوں نے یہ الفاظ سنے۔نعرہ تکبیر بلند کیا، اللہ اکبر کہا اور واپس تشریف لے گئے۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ کو پتہ چلا کہ یہی حدیث دوسرے الفاظ میں ایک صحابیؓ کے پاس ہے۔انہوں نے بھی مدینہ منورہ سے مصر کا سفر اختیار کیا۔ان صحابیؓ کے مکان پر دستک دی اور یہ حدیث ان الفاظ میں سنی کہ من ستر مومنا فی الدنیا سترہ اللہ فی یوم القیامۃ، جو شخص اس دنیا میں کسی مومن کی پردہ پوشی کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی کرے گا۔انہوں

نے اللہ اکبر کہا، الحمد للہ کہا اور اپنی سواری کی باگ موڑ کر واپس تشریف لے گئے۔

ایک صحابیؓ جن کا نام عبید اللہ بن عدیؓ ہے۔ ان کا تعلق رسول اللہ ﷺ کے قبیلہ بنی عبد مناف سے تھا۔ ان کو پتہ چلا کہ حضرت علیؓ کے پاس کوئی حدیث ہے جو ان تک نہیں پہنچی۔ یہ مدینہ منورہ سے چلے، کوفہ پہنچے، حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے حدیث سنی، سیکھی، یاد کی، نوٹ کر لی اور واپس چلے گئے۔

حضرت جابر بن عبد اللہؓ نے دو سفر کئے۔ ایک شام کا اور ایک مصر کا۔ دونوں سفروں میں صرف دو احادیث سن کر واپس آ گئے۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ نے بھی ایک سفر مصر کے لئے اختیار کیا۔ حضرت عقبہ بن عامر الجہنی جو مصر میں تھے، ان سے علم حدیث کے بارے میں کوئی روایت معلوم کی اور واپس آ گئے۔ صحابہ کرامؓ کے اور بھی واقعات ہیں جن میں انہوں نے کسی حدیث کی تحقیق کے لئے سفر اختیار کئے۔ ان چند واقعات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہوں نے ایک ایک روایت کی تحقیق کی خاطر کتنے سفر اختیار کئے۔

علم حدیث کے لئے تابعین کے سفر

جب تابعین کا زمانہ آیا تو یہ روایت اور بھی زیادہ عام ہو گئی۔ اتنی عام ہو گئی کہ ایک ایک لفظ اور ایک ایک بات سیکھنے کے لئے تابعین طویل سفر اختیار فرمایا کرتے تھے۔ امام شعبی جن کی وفات **104** ھ میں ہوئی اور وہ امام ابوحنیفہ کے اساتذہ میں سے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص شام کے انتہائی شمالی علاقہ سے سفر کرے اور یمن کے انتہائی جنوبی علاقہ تک جائے اور کسی حدیث کا ایک لفظ یاد کر کے واپس آ جائے، فحفظ کلمۃ، کوئی ایک کلمہ سن کر آ جائے، تنفع فی مایستقبلہ، جو مستقبل میں اس کے لئے مفید اور کارآمد ہو، تو میرا یہ خیال ہے کہ اس کا یہ سفر ضائع نہیں ہوا۔ یہ سفر کامیاب اور کامران و مفید ہے۔

حضرت علقمہ اور اسود دو مشہور اور بڑے تابعین میں سے ہیں اور ان کا درجہ تفقہ میں اور شریعت کے فہم اور بصیرت میں بہت اونچا مانا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ امام ابوحنیفہ نے ایک بار ارشاد فرمایا کہ اگر شرف صحابیت اور احترام صحابیت مانع نہ ہوتا تو میں یہ کہتا کہ علقمہ کا تفقہ عبد اللہ بن عمرؓ سے بڑھ کر ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں کوفہ میں تھے۔ وہ اور اسود نخعی دونوں حضرت

عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگرد تھے اور بقیہ لوگوں سے بھی احادیث اور روایات سیکھتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے حضرت عمر فاروقؓ کے حوالہ سے لوگوں سے بعض روایات سنیں۔ حضرت عمر فاروقؓ مدینہ منورہ میں حیات تھے۔ ان دونوں حضرات نے ایک دو مرتبہ نہیں بارہا کوفہ سے مدینہ منورہ کا سفر اختیار کیا اور وہ روایات براہ راست حضرت عمر فاروقؓ کی زبان سے سنیں جو وہ پہلے تابعین کے ذریعے بالواسطہ سنتے تھے۔ اس میں علو اسناد بھی ہے اور روایت کا مزید تحقق اور تثبت بھی ہے۔

ایک مشہور تابعی ہیں ابوالعالیہ، وہ کہتے ہیں کہ ہم اصحاب رسول ﷺ کے بارے میں روایات سنتے رہتے تھے۔ ان سے وہ روایات جو تابعین روایت کرتے تھے وہ بصرہ میں ہم تک پہنچتی تھیں۔ فما نرضیٰ حتیٰ نرکب الی المدینه، ہم اس پر راضی نہ ہوتے تھے جب تک مدینہ جا کر براہ راست ان صحابہ کرامؓ کی زبان مبارک سے نہ سنیں۔ فنسمع من افواههم، ان کی زبان مبارک سے براہ راست سننے کے لئے ہم مدینہ کا سفر اختیار کرتے تھے۔ اِس وقت اگر سڑک کے راستہ بصرہ سے مدینہ منورہ آئیں، اور یاد رہے کہ سعودی عرب کی سڑکوں پر سو ڈیڑھ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنا معمول کی بات ہے۔ آج بھی بصرہ سے مدینہ منورہ تک پہنچنے میں کم ازکم تیس بتیس گھنٹے لگیں گے۔ اس زمانے میں یہ کم وبیش ایک ڈیڑھ مہینے کا سفر ہوا کرتا تھا۔

حضرت ابوعثمان النہدی ایک اور تابعی ہیں۔ ان کو پتہ چلا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کے پاس ایک ایسی روایت ہے جو براہ راست انہی سے مل سکتی ہے کسی اور صحابیؓ کے پاس وہ روایت نہیں ہے، یا کم ازکم ان صحابہ کے پاس نہیں ہے جن تک ان کی رسائی تھی۔ انہوں نے مدینہ منورہ کا سفر اختیار کیا۔ مدینہ منورہ پہنچتے پہنچتے حج کا زمانہ آ گیا۔ معلوم ہوا کہ حضرت ابو ہریرہؓ حج کے لئے تشریف لے گئے۔ یہ بھی حج کے لئے چلے گئے۔ حج سے فارغ ہو کر حضرت ابو ہریرہؓ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا کہ ہمارا ارادہ تو حج کرنے کا نہیں تھا، لیکن یہ سنا تھا کہ آپ کے پاس ایک روایت ہے جو کسی ذریعہ سے مجھ تک پہنچی ہے۔ میں اس کے بارے میں براہ راست آپ سے تحقیق کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے پوچھا: وہ کیا روایت ہے۔ انہوں نے کہا کہ روایت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ان الله ليكتب لعبده المومن بالحسنة الواحدة الفَ الفِ حسنة ' اللہ تعالیٰ بعض اوقات اپنے مومن بندے کے لئے ایک نیکی کے بدلے میں دس لاکھ

نیکیاں لکھ دیتے ہیں۔حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ سننے والے سے غلطی ہوئی۔صحیح الفاظ یہ نہیں ہیں۔اب ان کو بڑی مایوسی ہوئی کہ میرے پاس ایک بہت حوصلہ افزا اور ایمان افروز حدیث تھی جس کی تصدیق حضرت ابو ہریرہؓ نے نہیں کی۔فوراً ان کے دل میں مایوسی کی ایک کیفیت طاری ہوگئی۔حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا: اصل الفاظ یہ ہیں: ' ان الله ليعطي لعبده المومن بالحسنة الواحدة الفى الف حسنة ' اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے کو ایک نیکی کے مقابلہ میں بیس لاکھ نیکیاں دیتے ہیں۔اب انہوں نے حیرت سے دیکھا کہ ایک نیکی کے مقابلہ میں بیس لاکھ نیکیاں کیسے ہوسکتی ہیں۔اس پر حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ جو لوگ اللہ کو قرض دیں گے، قرضا حسناً فيضعفه له اضعافا كثيرا تو اللہ تعالیٰ ان کے لئے اس کو بہت گنا بڑھا دیں گے۔تو انہوں نے کہا کہ ہمارے تمہارے لئے دس بیس لاکھ تھوڑی رقم ہے۔ اللہ کے لئے تو اضعافاً کثیراً ہے، بہت گنا۔تو اللہ تعالیٰ کے لئے دس لاکھ بیس لاکھ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔وہ اس اضافہ اور ترمیم کے ساتھ خوشی خوشی واپس آئے اور یہ حدیث انہوں نے ایک واسطہ کم کر کے براہ راست صحابیؓ رسولؐ سے سن لی۔

ایک تابعی تھے ابن الدیلمی، فلسطین میں رہتے تھے۔ان کو پتہ چلا کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، جو صحیفہ صادقہ کے مصنف ہیں، مدینہ منورہ آئے ہوئے ہیں اور ان کے پاس ایک ایسی روایت ہے جس سے شراب خور کے بارے میں کوئی وعید ثابت ہوتی ہے۔وہ فلسطین سے سفر کر کے مدینہ منورہ پہنچے۔مدینہ میں لوگوں نے بتایا کہ وہ تو مکہ مکرمہ چلے گئے ہیں۔وہ سفر کر کے مکہ مکرمہ چلے گئے۔وہاں پہنچے تو کسی نے بتایا کہ حضرت عبداللہ طائف میں اپنے باغ کی دیکھ بال کے لئے گئے ہیں اور وہیں پر مقیم ہیں۔ چنانچہ یہ طائف پہنچے۔اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے پوچھا کہ کیا آپ نے رسول اللہ ﷺ سے کوئی حدیث شراب خور کی وعید کے بارے میں سنی ہے۔آپ نے فرمایا ہاں، سمعت رسول الله ﷺ يقول، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا 'من شرب الخمر، جس نے شراب پی، لم تقبل له صلوٰة اربعين صباحاً، تو چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہیں ہوگی۔

ایک صاحب امام اوزاعی کے پاس علم حدیث سیکھنے کے لئے تشریف لائے۔چار پانچ دن امام اوزاعی کے پاس رہے۔صبح سویرے امام کی خدمت میں حاضر ہو جاتے تھے اور رات تک

ان کی خدمت میں رہتے تھے۔ امام اوزاعی ایک دن میں ایک ہی حدیث سنانے پر اکتفا کرتے تھے۔ چار پانچ دن کے بعد انہوں نے قدرے ناگواری سے عرض کیا کہ میں چار دن سے آپ کے ساتھ ہوں اور آپ نے چار دنوں میں مجھے چار ہی حدیثیں سنائی ہیں۔ امام اوزاعی غالباً یہی بات ان سے کہلوانا چاہتے تھے۔ انہوں نے حضرت جابرؓ کا وہ قصہ سنایا جس میں انہوں نے ایک اونٹ خریدا اور پہلے دمشق جا کر ایک روایت کی تصدیق (confirmation) کی۔ پھر ایک دوسرے موقعہ پر سفر کر کے مصر گئے اور ایک وہاں ایک دوسری روایت verify کرائی۔ انہوں نے کہا کہ صحابہ کرامؓ ایک ایک روایت کے حصول کے لئے نہیں، کیونکہ روایت تو ان کو پہلے سے حاصل ہوتی تھی، محض صحابیؓ سے براہ راست سننے کے لئے ایک ایک اور دو دو مہینے کا سفر اختیار کیا کرتے تھے۔ تم چار دن میں چار احادیث کے ملنے پر ناخوش ہو۔ غالباً اس کام کی اہمیت ان کو جتانا مقصود تھا۔ اس لئے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا اور ان کو یاد دلایا۔

ایک اور تابعی ہیں حضرت ابوعلی بغدادی الاسدی۔ ان کو یہ پتہ چلا کہ خراسان میں کوئی تابعی ہیں۔ خراسان بہت بڑا صوبہ سمجھا جاتا تھا جس کی حدود موجودہ ایران میں مشہد سے لے کر پورے افغانستان کے شمالی حصہ اور وسط ایشا کے جنوبی حصہ اور موجودہ تاجکستان کے حدود تک پھیلی ہوئی تھیں، اور یہ پورا علاقہ خراسان کہلاتا تھا۔ آج وسط ایشیا میں جو علاقہ فارسی بان ہے یہ خراسان کہلاتا تھا۔ امام ابوعلی بغدادی کو یہ پتہ چلا کہ خراسان میں کسی صاحب کے پاس ایک حدیث ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے حضرت معاویہؓ کو ایک خط لکھا تھا اور اس میں یہ لکھا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا سکھائی ہے کہ لا الہ الا اللہ وحدہ لہ الملک ولہ الحمدو ھوعلی کل شئی قدیر اللھم لامانع لما اعطیت ولامعطی لما منعت ولا ینفع ذالجدمنك الجد 'انہوں نے کہا کہ یہ دعا رسول اللہ ﷺ نے مجھے سکھائی تھی تم بھی پڑھا کرو۔ حضرت معاویہؓ سے پھر بقیہ تابعین نے اس دعا کو یاد کیا۔ یہ روایت ان تابعی سے براہ راست سننے کی غرض سے انہوں نے بغداد سے خراسان کا طویل سفر اختیار کیا۔

ایسی روایات بھی ہیں جن میں دو صحابیؓ ایک دوسرے سے روایت کرتے ہیں۔ عموماً ایک صحابیؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کر کے تابعین کو بتاتے ہیں۔ لیکن ایسی مثالیں بھی ہیں کہ ایک صحابیؓ نے دوسرے صحابیؓ سے حدیث روایت کی ہے اور یہ حدیث اس کی ایک مثال ہے کہ

حضرت معاویہؓ حضرت مغیرہ بن شعبہ سے روایت کرتے ہیں۔ اس حدیث کو براہ راست ان تابعی کی زبان سے سننے کے لئے جنہوں نے حضرت معاویہؓ کی زبان مبارک سے سنا تھا انہوں نے بغداد سے خراسان کا سفر اختیار کیا اور خراسان جا کر اس حدیث کا ایک واسطہ کم ہوگیا اور یہ حدیث انہوں نے اختیار کی۔

آپ نے حضرت زِر بن حُبَیش کا نام سنا ہوگا۔ زر بن حبیش ایک مشہور تابعی ہیں۔ قرات کے فن میں بہت بڑے امام ہیں۔ حضرت اُبیؓ بن کعبؓ کے خصوصی تلامذہ میں سے ہیں۔ حضرت اُبیؓ بن کعبؓ وہ صحابیؓ ہیں جن کو حضورؐ نے یہ اعزاز عطا فرمایا کہ آپؐ کے بارے میں یہ گواہی دی کہ اقرئهم ابی ، میرے صحابہ میں سب سے اچھے قاری اور سب سے اچھا قرآن پڑھنے والے ابیؓ بن کعبؓ ہیں۔ حضرت ابیؓ بن کعبؓ قرآن فہمی اور قرآن خوانی میں سب صحابہ کرامؓ میں ممتاز تھے۔ جتنے قرات اور تجوید کے سلسلے ہیں وہ سارے کے سارے یا اکثر و بیشتر حضرت ابیؓ بن کعبؓ تک پہنچتے ہیں۔ جو بڑے بڑے قرّا ہیں، جو قرا سبعہ کہلاتے ہیں ان میں سے بیشتر کی روایت حضرت ابیؓ بن کعب تک پہنچتی ہے۔ ان کے شاگردوں میں بڑا نمایاں نام حضرت زر بن حبیش کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں حضرت عثمان بن عفانؓ کی خلافت کے زمانے میں کوفہ سے مدینہ منورہ آیا اور اس پورے سفر کا مقصد صرف حضرت ابیؓ بن کعبؓ سے ملاقات اور دوسرے صحابہ کرامؓ کی زیارت تھی۔ وانما حملني على الافادة ، اور مجھے اس لمبے علمی سفر پر آمادہ کیا، لقى ابئى بن كعب ، ابیؓ بن کعب کی ملاقات نے۔ اس کے علاوہ میرا کوئی اور مقصد نہیں تھا۔

حضرت ابوالعالیہ جن کا ابھی میں نے ذکر کیا، وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ، یعنی تابعی حضرات کسی شیخِ حدیث سے ملاقات کے لئے کئی کئی روز کا سفر کر کے پہنچتے تھے، یا تو کسی حدیث کی تحقیق کی خاطر یا سابقہ حدیث کی سند کو مزید بہتر بنانے کی خاطر، یا ایک نئے طریقے کا اضافہ کرنے کی خاطر، یا کسی راوی کے کردار اور حافظہ کی تحقیق کی خاطر۔ سفر کرنے کے بعد جب ہم منزل پر پہنچتے تھے تو سب سے پہلے ہم یہ دیکھتے تھے کہ ان کے ہاں نماز کا اہتمام کتنا ہے۔ اگر وہ نماز کا اہتمام مکمل طور پر کرتے تھے تو ہم وہاں ٹھہر کر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور حدیث کے بارے میں جو سیکھنا ہوتا تھا وہ سیکھ لیتے تھے۔ اور اگر یہ دیکھتے تھے کہ نماز میں کمزوری پائی جاتی ہے تو ہم الٹے پاؤں واپس آجاتے تھے اور ان سے نہیں ملتے تھے اور ہمارا کہنا یہ ہوتا تھا کہ جو نماز کے

بارے میں اہتمام نہیں کرتا اور نمازوں کو ضائع کرتا ہے وہ باقی چیزوں کو بھی ضائع کرتا ہوگا۔

ایک اور تابعی ہیں جن کا شمار غالباً صغار تابعین میں ہے، زید بن الحباب، یا تبع تابعینؒ میں سے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ مجھے ایک روایت ملی، جس کے بارے میں پتہ چلا کہ اس کو تین بزرگوں نے روایت کیا ہے۔ ایک روایت کے راوی کوفہ میں، دوسری روایت کے راوی مدینہ میں اور تیسری روایت کے راوی مصر میں ہیں۔ میں پہلے کوفہ گیا۔ وہاں شیخ سے مل کر اس کی تصدیق کی اور اس روایت کو حاصل کیا۔ اس کے بعد دوسرا سفر میں نے مدینہ منورہ کا اختیار کیا۔ مدینہ منورہ میں جو شیخ تھے ان سے اس روایت کو لیا اور وہاں سے مصر پہنچا تو معلوم ہوا کہ جن سے ملنے آیا ہوں ان سے ملاقات کے اوقات مقرر ہیں اور ان مقرر اوقات کے علاوہ وہ کسی سے نہیں ملتے۔ فجلست علی بابہ، میں ان کے دروازے پر بیٹھا رہا۔ جب وہ باہر نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک بدو دروازے پر بیٹھا ہوا ہے۔ پوچھا کہ کس لئے آئے ہو، بتایا کہ اس غرض سے آیا ہوں۔ انہوں نے حدیث پڑھ کر بتائی اور حدیث کے الفاظ کو verify کیا کہ یہی الفاظ تھے: فرق مابين صيامنا و صيام اهل الكتاب اكلة السحر۔ کہ ہمارے اور اہل کتاب کے روزوں میں ایک اہم فرق ہے وہ سحری کا ہے۔ اہل کتاب جب روزہ رکھتے ہیں تو سحری نہیں کھاتے اور ہم جب روزہ رکھتے ہیں تو سحری کھا کر رکھتے ہیں۔

اس روایت کے ان الفاظ کے تحقق اور تیقن کے لئے انہوں نے تین بڑے شہروں کا سفر اختیار کیا۔ اس میں کتنا وقت لگا ہوگا، کتنے پیسے لگے ہوں گے، کتنے وسائل خرچ ہوئے ہوں گے، اس کا ہم صرف اندازہ ہی کر سکتے ہیں، یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ افسوس کہ کسی محدث نے اپنا حساب کتاب لکھ کے نہیں چھوڑا، ورنہ ہمیں شاید یہ بھی پتہ چلتا کہ راستے میں کتنا خرچ ہوا، کتنی منزلیں آئیں اور کہاں کہاں ٹھہرے۔ وہ اس کام کو صرف اللہ کے لئے کرنا چاہتے تھے، اس لئے انہوں نے شاید اپنا حساب نہیں لکھا۔ اگر حساب کسی نے لکھا ہوتا تو آج شاید اس بہن کے سوال کا جواب بھی مل جاتا جنہوں نے پوچھا تھا کہ ان کے اخراجات کیسے اور کہاں سے پورے ہوتے تھے۔

علم حدیث کے لئے تبع تابعین کے سفر

عبدالرحمٰن بن مندہ ایک اور محدث ہیں جن کا شمار تبع تابعینؒ کے بعد کی نسل میں ہوتا ہے۔ غالباً 395 ان کا سن وفات ہے۔ یہ ایک طویل سفر پر نکلے۔ مختلف شہروں، علاقوں اور براعظموں میں گھومے اور جہاں جہاں محدثین پائے جاتے تھے، (اور یاد رہے کہ محدثین کرام تین براعظموں میں پائے جاتے تھے؛ یورپ، افریقہ اور ایشیا۔) وہاں وہاں انہوں نے علم حدیث حاصل کیا اور جب واپس آئے تو چالیس اونٹوں پر ان کی کتابیں اور یادداشتیں لدی ہوئی تھیں۔ وہ یہ سارا ذخیرہ لے کر وہ واپس لے کر آئے۔

یہ چند مثالیں ہیں جو حدیث کی کتابوں سے سرسری طور پر میں نے نوٹ کی ہیں وہ میں نے آپ کے سامنے رکھ دی ہیں۔ تذکرۃ الحفاظ جو امام ذہبی کی مشہور کتاب ہے، آپ میں سے جو لوگ عربی جانتے ہیں وہ ایک سرسری نظر اس کتاب پر ڈالیں، تو اس طرح کے بہت سے واقعات نظر آئیں گے۔ علامہ خطیب بغدادی کی یہ کتاب جس کا عنوان ہے: 'الرحلہ فی طلب الحدیث'۔ اس میں بھی اس طرح کے سفروں کے واقعات اور مثالیں بیان ہوئی ہیں۔

اسفار محدثین کے مقاصد

یہ سفر کیوں اختیار کیا جاتا تھا؟ اس کے فوائد کیا تھے اور اس کے آداب کیا تھے؟ اب میں اس بارہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

سب سے پہلا فائدہ تو یہ تھا کہ وہ مختلف سندیں جو مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے راویوں کے ذریعے مرتب ہوئی تھیں ان میں یکسانیت اور وحدت پیدا ہو جاتی تھی۔ مدینہ منورہ میں رہنے والے ایک راوی خراسان کے رہنے والے ایک شیخ سے روایت کرتے تھے، خراسان کے اس راوی نے دمشق میں رہنے والے راوی سے روایت کی اور دمشق میں رہنے والے راوی نے قاہرہ میں رہنے والے راوی سے روایت کی۔ اس طرح یہ دو براعظموں میں رہنے والے راوی اور مختلف ملکوں میں رہنے والے محدثین ایک سلسلہ سند سے وابستہ ہو جاتے تھے۔ وحدت اسناد ایک ایسا بڑا فائدہ تھا جو رحلہ کے ذریعے حاصل ہوا اور اس کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

دوسرا بڑا فائدہ تھا اشتراک روایات، کہ وہ روایات جو بعض خاص صحابہ کرامؓ کی وجہ

سے ان خاص علاقوں میں محدود ہوسکتی تھیں وہ پوری دنیائے اسلام میں پھیل گئیں۔ مثلاً حضرت علیؓ مدینہ منورہ سے ہجرت فرما کر کوفہ تشریف لے گئے۔ اب اگر تابعین بڑی کثرت سے کوفہ تشریف نہ لے گئے ہوتے اور کوفہ کے تابعین دوسرے شہروں میں تشریف نہ لے گئے ہوتے تو حضرت علیؓ کے پاس جو علم تھا وہ سارے کا سارا کوفے میں محدود ہو جاتا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ قاہرہ تشریف لے گئے تو ان کے علوم وفنون قاہرہ میں محدود ہو جاتے۔ حضرت عبادہ بن صامت دمشق تشریف لے گئے۔ حضرت معاویہؓ دمشق تشریف لے گئے۔ ان سب صحابہ کرامؓ کا علم قاہرہ اور دمشق وغیرہ تک محدود ہو جاتا۔ رحلہ اور پے در پے سفروں کی وجہ سے روایات ایک دوسرے کے ساتھ مشترک ہوگئیں۔ یعنی انہوں نے اس ذخیرے کو ایک دوسرے کے ساتھ شریک کرلیا۔ تمام صحابہ کرامؓ کے ذریعے فراہم ہونے والی رہنمائی باقی علاقوں کے لوگوں کے لئے عام ہوگئی۔

رحلہ کا تیسرا فائدہ تھا وحدت فکر۔ اس طرح کہ مختلف احادیث اور آیات قرانی کی تعبیر و تشریح میں جو ایک خاص نکتہ نظر ایک خاص علاقے کے صحابیؓ کا تھا اس سے باقی لوگوں نے استفادہ کیا۔ یوں ایک وحدت فکر پیدا ہوتی چلی گئی جس نے پوری دنیائے اسلام کے اتنے بڑے علاقے کو متحد رکھا جس کی حدود منگولیا سے لے کر اسپین بلکہ فرانس کی حدود تک پھیلی ہوئی تھیں۔ تین براعظموں پر مشتمل یہ وسیع دنیائے اسلام ایک ایسی غیر معمولی وحدت فکر کا نمونہ پیش کر رہی تھی جس کی مثال نہ پہلے ملتی تھی نہ اب ملتی ہے۔ یہ صرف رحلہ کے ذریعے ممکن ہوا۔

وحدت فکر و علم کے ساتھ ساتھ وحدت عمل بھی پیدا ہوئی۔ وحدت عمل اس طرح پیدا ہوئی کہ دین کے احکام پر عمل کرنے کا جو طریقہ صحابہ کرامؓ کے پاس تھا وہ ان کے ذریعے تابعین تک اور پھر تابعین کے ذریعے تبع تابعینؒ تک اور پھر ان کے ذریعے پوری دنیائے اسلام میں عام ہوتا گیا۔ جب کسی تابعی کو پتہ چلتا کہ کوئی صحابیؓ کسی علاقہ میں تشریف لائے ہیں تو وہ کثرت سے ان کے قریب جمع ہوتے تھے۔

جب تابعین کا زمانہ ختم ہونے لگا تو تبع تابعینؒ اسی طرح تابعین کے پاس جمع ہوتے تھے جب تبع تابعینؒ کا زمانہ ختم ہونے لگا تو بقیہ لوگ ان کے پاس جمع ہوتے تھے اور یوں وحدت کا ایک عمل پوری دنیائے اسلام میں ان سفروں کی وجہ سے پیدا ہوا۔

پانچواں بڑا فائدہ تھا علوِ اسناد، جس کا میں ذکر کر چکا ہوں کہ جو سندیں محدثین کے پاس جمع ہو جایا کرتی تھیں ان کا درجہ مزید اونچا ہو جاتا تھا۔ کبھی دو درجے کبھی تین درجے۔ وہ روایت جو دو یا تین واسطوں سے ان تک پہنچی ہوتی تھی ان میں ایک یا دو واسطے کم ہو جاتے تھے اور براہ راست کسی صحابیؓ یا تابعی یا تبع تابعی یا بڑے محدث کی زبان سے ان کو احادیث سننے کا موقع ملتا تھا۔

روایات اور طرق کی تحقیق کا ایک فائدہ اور بھی تھا، ایک روایت یا طریق یعنی variation جس چینل سے آئی ہے اس کے بارے میں یہ بات confirm ہو جائے کہ واقعی یہ روایت یا سند درست ہے۔ ایک اور فائدہ یہ تھا کہ جن لوگوں کے بارے میں یہ شبہ تھا کہ یہ تدلیس سے کام لیتے ہیں۔ ان کے بارہ میں یہ یقین ہو جائے کہ انہوں نے سند میں تدلیس کی ہے یا نہیں۔ تدلیس سے مراد misrepresentation ہے۔ یعنی کوئی راوی جس حدیث یا محدث سے روایت کرنا بتاتے ہیں واقعتاً اس سے روایت کرتے بھی ہیں یا نہیں کرتے۔ مثلاً کسی شخص نے مدینہ سے واپسی پر کہا کہ عن قاسم بن محمد، قاسم بن محمد سے منقول ہے، اب ان الفاظ میں دونوں کی گنجائش موجود ہے کہ کیا براہ راست آپ نے سنا ہے یا ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ یہ روایت کیا کرتے ہیں اور آپ نے کہیں اور سے سن سنا کر بیان کر دیا۔ اس کا امکان موجود تھا کہ انہوں نے خود نہ سنا ہو بلکہ کسی اور سے سنا ہو تو عن کے ذریعے یہ بات کہی جا سکتی ہے تاکہ بعد میں اگر کوئی سوال کرے تو کہیں کہ میں نے تو کہا تھا کہ عن قاسم بن محمد۔ تو اگر کوئی شخص براہ راست قاسم بن محمد سے حدیث نقل کرے اور براہ راست ان کے اصحاب سے سنے تو اندازہ ہو جاتا تھا کہ تدلیس کرتے ہیں یا نہیں۔ پتہ چل جاتا تھا کہ ان کی قاسم سے ملاقات ہوئی تھی یا نہیں۔ اور جب یہ صاحب مدینہ منورہ آئے تھے تو قاسم بن محمد وہاں تشریف فرما تھے کہ نہیں تھے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہو جاتا تھا کہ تدلیس یا ضعف کے جو دوسرے اسباب ہیں وہ حدیث میں موجود ہیں کہ نہیں ہیں، اور اگر ہیں تو کس حد تک ہیں۔

ایک فائدہ یہ تھا کہ راویوں کے حالات کی تحقیق ہو جاتی تھی۔ جب محدثین دوسرے شہروں میں جاتے تھے تو ان کے پاس پہلے سے راویوں کی فہرست ہوا کرتی تھی کہ فلاں شہر میں کون کون سے راوی مشہور ہیں۔ کون کون سے شیوخ حدیث ہیں جو معروف ہیں۔ پھر وہاں جا کر وہ یہ تحقیق کرتے تھے کہ یہاں کے مشہور شیوخ کون کون ہیں اور کس درجہ کے انسان ہیں۔ ان

کا کردار کیسا ہے، اخلاق کیسے ہیں ان کی تعلیم کہاں ہوئی، انہوں نے کن اساتذہ سے سیکھا، ان کا عمل کیسا ہے، انہوں نے جن مشائخ سے سیکھا ہے واقعتاً اِن کی اُن سے ملاقات بھی ہوئی ہے کہ نہیں ہوئی ہے۔ یہ ساری معلومات جو آج فن رجال اور رواۃ کی کتابوں میں ملتی ہیں وہ اس طرح کے سفروں کے ذریعے جمع کی گئی تھیں۔ مزید برآں ایک اور فائدہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے عام حالات سے واقف ہونے کا موقع ملتا تھا جس سے امت مسلمہ میں مزید وحدت اور یکجہتی پیدا ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ علما سے مذاکرہ اور تبادلہ خیال کا موقع بھی مل جاتا تھا۔

یہ وہ فوائد تھے جو لوگوں نے خاص علم حدیث کے حوالے سے بیان کئے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور فوائد جو خالص علمی ہیں اور صرف علم حدیث کے ساتھ خاص نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر علمی پختگی پیدا ہوتی تھی۔ فارسی میں کہتے ہیں کہ بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے، بہت سفر کرنے کے بعد ہی ایک خام آدمی پختہ ہوتا ہے۔ کچے آدمی میں پے در پے سفر اختیار کرنے سے پختگی پیدا ہو جاتی ہے۔ جب مختلف پس منظر رکھنے والے اہل علم سے تبادلہ خیال کا اور ان کی باتیں سننے کا موقع ملتا ہے تو اس سے علم کی نشر و اشاعت میں مدد ملتی تھی اور یوں سب کو علمی فائدہ ہوتا تھا۔ اسلامی ثقافت میں وسعت پیدا ہوتی تھی۔ مکارم اخلاق و کردار اور صبر و ہمت اور بلند حوصلگی پیدا ہوتی تھیں۔ یہ فوائد تھے جو رحلہ کے ذریعے ایک خالص علمی انداز میں سامنے آ رہے تھے۔

علم حدیث کے لئے سفر کرنے کا طریقہ

ابن خلدون نے مقدمہ میں جہاں علم حدیث کی تاریخ پر بحث کی ہے اور مسلمانوں کی علمی روایات کا تذکرہ کیا ہے وہاں ایک خاص فصل اس مفہوم کی رکھی ہے کہ علم حدیث کے لئے سفر کا کیا طریقہ تھا۔ اس فصل کا عنوان ابن خلدون نے یہ باندھا ہے: 'فصل فی ان الرحلة فی طلب العلوم و لقاء المشیخه مزید کمال فی التعلم'۔ فصل اس امر کے بیان میں کہ طلب علم کے لئے سفر اور مشائخ کی ملاقات سے تعلم میں مزید کمال پیدا ہوتا ہے۔ علم میں اور علم حاصل کرنے کی اس مہم میں مزید پختگی آتی ہے۔ اس لئے یہ روایت مسلمانوں میں طویل زمانے تک جاری رہی۔ برصغیر کے علما بھی اس سے خالی نہیں تھے۔ ان کے بارے میں گفتگو 'برصغیر میں علم حدیث' کے موضوع پر ہونے والے خطبہ میں آئے گی۔

جن حضرات نے علم حدیث سیکھنے اور سکھانے کے آداب پر کتابیں لکھی ہیں ان میں رحلہ کے آداب پر بھی کتابیں لکھی ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا تھا کہ جب منہ اٹھا چل پڑے اور جب جی چاہا واپس آ گئے بلکہ کچھ آداب اور قواعد کی پابندی لازمی سمجھی جاتی تھی۔

خطیب بغدادی کی ایک کتاب ہے' الکفایہ فی علم الروایۃ' اور ایک دوسری کتاب ہے' الرحلۃ فی طلب الحدیث'۔ اس میں خطیب بغدادی نے یہ سارے قواعد وضوابط بیان کئے ہیں کہ علم حدیث کے طالب علم کو کن آداب اور قواعد کی پابندی کرنی چاہئے۔ ایک اور کتاب ہے 'الجامع فی اخلاق الراوی وآداب السامع' یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ راوی کے اخلاق کیسے ہونے چاہئیں اور جو حدیث سننے والا ہے یعنی روایت کرنے والا ہے اس کو کن آداب کی پیروی کرنی چاہئے۔ یہ کتاب دو ضخیم جلدوں میں ہے جس میں ایک ایک مرحلہ کے آداب الگ الگ ترتیب وار بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں بعض کا ذکر علوم حدیث کے باب میں ہوگا۔ اسی طرح سے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جب راوی شیخ کی خدمت میں جا کر بیٹھے تو املا لینے کے آداب کیا ہوں۔ اس پر ایک الگ کتاب بھی ہے جس کا نام ہے: 'آداب الاملاء والاستملاء' املا اور استملا کے آداب۔

جیسا کہ میں نے بتایا کہ جب حاضرین زیادہ تعداد میں ہوتے تھے تو شیخ کسی حدیث کا ایک جملہ پڑھتے تھے، آگے ایک مستملی بیٹھا ہوتا تھا وہ اس کو بلند آواز سے دہراتا تھا، پھر آگے ایک اور مستملی بیٹھا ہوتا تھا وہ مزید بلند آواز سے دہراتا تھا، یہاں تک کہ تمام حاضرین تک بات پہنچ جائے۔ اس کے آداب کیا تھے؟ اس بارے میں علوم حدیث میں بات ہوگی۔

علم حدیث کے لئے سفر کے آداب

اختصار کے ساتھ رحلہ کے جو آداب بیان کئے گئے ہیں وہ پانچ ہیں۔

(۱) سب سے پہلا ادب یہ بیان کیا گیا ہے کہ سفر اختیار کرنے سے پہلے اپنے وطن کے علمائے حدیث سے علم حدیث حاصل کیا جائے۔ اس لئے کہ ان کے پاس جو ذخیرہ علم ہے، اس کو چھوڑ کر دور کا سفر اختیار کرنا اس دستیاب نعمت کی قدر ناشناسی ہوگی۔ علم حدیث اگر اپنے شہر میں دستیاب ہے تو جتنا ذخیرہ وہاں دستیاب ہے پہلے اس کو حاصل کیا جائے۔ اس کے بعد دور کا

سفر اختیار کیا جائے۔ یہ حدیث رسولؐ کے ادب اور احترام کے خلاف سمجھا گیا کہ قریب کے دستیاب ذخیرہ کو نظر انداز کر کے دوسرے کسی علاقے میں دستیاب ذخیرہ کو حاصل کرنے کے لئے سفر اختیار کیا جائے۔

(۲) دوسرا ادب یہ تھا کہ جب اپنے علاقے میں حدیث کے ذخائر اور حدیث کے مشائخ سے پورے کا پورا علم حاصل کر لیا جائے اور دوسرے کسی علاقے کا سفر اختیار کیا جائے تو جگہ کے تعین اور انتخاب میں اہتمام سے کام لیا جائے۔ یہ دیکھا جائے کہ زیادہ بڑا ذخیرہ کہاں دستیاب ہے۔ مشائخ کس علاقہ میں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ حدیث کے تحریری ذخائر جس علاقہ کے مشائخ کے پاس زیادہ ہیں، پہلے اس کو منتخب کیا جائے۔ اس کے بعد بتدریج جس علاقہ میں حدیث کی روایات جتنی زیادہ ہوں اس علاقہ کا سفر پہلے اختیار کیا جائے۔

(۳) تیسرا ادب بڑا دلچسپ اور اہم ہے کہ جب سفر اختیار کیا جائے اور کسی علاقہ میں جا کر وہاں کے مشائخ کی خدمت میں حاضری دی جائے تو تکثیر روایات پر زور دیا جائے، تکثیر مشائخ پر زور نہ دیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس راوی کے اساتذہ کی تعداد زیادہ ہوتی تھی اس کو زیادہ پذیرائی ملتی تھی اور اس کی شہرت زیادہ ہوتی تھی کہ فلاں نے ایک ہزار اساتذہ سے علم سیکھا ہے، فلاں محدث نے دو ہزار اساتذہ سے علم سیکھا ہے۔ تو یہ شہرت اپنے بارے میں ایک خوش گمانی اور نفس میں ایک جذبہ تفاخر پیدا کرتی تھی۔ یہ تواضع کے خلاف تھا اور اس رویہ کے خلاف تھا جو ایک ایسے صاحب علم میں ہونا چاہئے جو صرف اللہ کی رضا کی خاطر علم دین کو حاصل کرتا ہو اور اس کا مقصد دنیاوی شہرت حاصل کرنا نہ ہو۔ اس لئے روایات کی تعداد بڑھانے پر زیادہ زور دیا گیا بہ نسبت شیوخ کی تعداد بڑھانے کے۔ مثلاً اگر ایک حدیث کے بارے میں بیس روایات ایک شیخ کے پاس ہیں تو بہتر یہ ہے کہ بیس روایات اسی شیخ سے حاصل کی جائیں بہ نسبت اس کے کہ بیس شیوخ سے ایک ایک روایت حاصل کی جائے۔

(۴) چوتھا ادب یہ تھا کہ روایات یا علم حاصل ہو جائے تو اس کا مذاکرہ اس علاقہ کے محقق اہل علم کے ساتھ مسلسل کیا جائے۔ جو احادیث آپ نے سیکھی ہیں اور جو کسی اور راوی نے سیکھی ہیں تو اب دونوں راوی مل کر ان کا مذاکرہ کریں۔ وہ آپ کو پڑھ کر سنائیں آپ انہیں پڑھ کر سنائیں۔ جو مطلب انہوں نے سمجھا وہ آپ سے بیان کریں اور جو آپ نے سمجھا ہے آپ ان سے

بیان کریں۔ راویوں کے بارے میں جو معلومات آپ کو ملی ہیں وہ آپ ان سے بیان کریں اور جو اُن کو ملی ہیں وہ آپ سے بیان کریں تا کہ ایک دوسرے کا علم پختہ ہو اور اس میں مزید علم اور نکتے سامنے آئیں اور دونوں کا علم کمال تک پہنچ جائے۔

(۵) پانچواں ادب یہ تھا کہ جب سفر اختیار کیا جائے تو شریعت میں سفر کے جو آداب بیان ہوئے ہیں ان کا لحاظ رکھا جائے۔ سفر کے بہت سے آداب ہیں جن کا علم حدیث کے موضوع سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن ان آداب کی پابندی جب ہر سفر میں ضروری ہے تو طلب حدیث کے لئے کئے جانے والے سفر میں بطریق اولیٰ ان آداب کی پابندی ہونی چاہئے۔ چنانچہ جب سفر اختیار کیا جائے تو اللہ کی رضا مقصود ہونی چاہئے۔ دنیاوی شہرت مقصود نہیں ہونی چاہئے۔ صرف رسول اللہ کی احادیث کا تحفظ اور بقا مقصود ہو، کوئی مادی منفعت مقصود نہ ہو۔ جس پیسے سے سفر اختیار کیا جائے وہ جائز پیسہ ہو اور اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ ہو۔ جو ہمراہی اختیار کئے جائیں وہ متقی اور پرہیزگار لوگ ہوں۔ اگر ایک سے زیادہ آدمی سفر کر رہے ہیں تو ایک کو اپنا امیر مقرر کر لیا جائے اور باقی اس کی امارت میں سفر کریں۔ جہاں ٹھہرنا ہو وہ جگہ صاف ستھری ہونی چاہئے۔ حلال وحرام کا خیال رکھیں۔ یہ وہ آداب ہیں جو ہر سفر پر منطبق ہوتے ہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ شریعت میں سفر کے جتنے بھی آداب بیان ہوئے ہیں ان سب کا لحاظ رکھا جائے۔

یہ وہ آداب تھے جن کا تمام راویان حدیث اور محدثین کرام لحاظ رکھتے تھے۔ انہوں نے دور دور کے سفر اختیار کئے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ ایک محدث طویل سفر اختیار کر کے ایک جگہ پہنچے اور پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ جن کی خدمت میں حاضر ہونے آئے ہیں وہ تو انتقال فرما گئے ہیں۔

اس طرح کے حوصلہ شکن واقعات کی ایک بڑی مثال ایک صحابیؓ عبدالرحمٰن الصنابحیؒ کی ہے۔ وہ صحابیؓ تو نہیں ہیں، تابعی ہیں۔ صحابہ کے تذکرہ میں ان کا نام تشرفاً لکھا جاتا ہے۔ وہ بہت دور سے، یمن سے، رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ نیا نیا اسلام قبول کیا تھا۔ بڑے اشتیاق اور دردمندی کے ساتھ تیز رفتاری سے یمن سے مدینہ کی طرف آ رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری دیں گے۔ جب مدینہ منورہ تک ایک رات کی مسافت رہ گئی تو کہیں پڑاؤ کیا۔ صبح سویرے اٹھ کر دربار رسالت میں حاضری کی غرض سے نہانے دھونے کا اہتمام کر رہے تھے۔ اپنے پاس موجود کپڑوں میں سے بہترین لباس پہن لیا۔ خوشبو لگائی اور دربار رسالت میں حاضری

کے خیال سے خوش ہو رہے تھے۔ ابھی سفر شروع کر ہی رہے تھے کہ مدینہ کی سمت سے کچھ لوگ آتے دکھائی دیئے۔ انہوں نے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو۔ بتایا کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جا رہا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ انا للہ وانا الیہ راجعون، ہم تو آج ہی رسول اللہ ﷺ کی تدفین سے فارغ ہو کر آرہے ہیں۔ اب ان پر جو گزری ہوگی اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ اس کی ایک بڑی مثال ہے کہ علم حدیث کے حصول کے لئے کسی بڑے شیخ کی خدمت میں حاضر ہونے والے تھے اور عین وقت پر جا کر پتہ چلا کہ جب لب بام ایک ہاتھ رہ گئی تو کمند ٹوٹ گئی۔

حصول علم حدیث کے لئے محدثین کی قربانیاں

امام اوزاعی جو امام اہل شام کہلاتے ہیں۔ اتنے بڑے امام ہیں کہ ان کا درجہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے برابر قرار دیا جاتا ہے۔ علم حدیث میں امام مالک کے برابر کا درجہ رکھتے تھے۔ بیروت میں رہتے تھے، جہاں آج بھی ان کا مزار موجود ہے اور جس علاقہ میں ان کا مزار ہے وہ محلّہ امام اوزاعی کہلاتا ہے۔ یہ کوفہ اور بصرہ کے سفر کے لئے روانہ ہوئے۔ ارادہ یہ تھا کہ حضرت حسن بصری اور محمد بن سیرین سے علم حدیث کی روایت حاصل کریں گے۔ جب وہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ حسن بصری کا تو انتقال ہو گیا ہے اور محمد بن سیرین بیمار ہیں۔ ان کے ہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ بستر پر لیٹے ہوئے ہیں۔ طبیبوں نے آرام کا مشورہ دیا ہے اور لوگوں سے ملنے کی ممانعت کر دی ہے۔ انہوں نے جا کر دیکھا، کھڑے کھڑے سلام کیا، مزاج پرسی کی، چند روز مقیم رہے، ہر روز جا کر دیکھتے رہے، چند دن بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا اور یہ بغیر کچھ حاصل کئے بیروت واپس چل پڑے۔ یہ اس طرح کی بے شمار مثالوں میں سے صرف چند ایک ہیں۔ ایک تابعی کی مثال ہے جو صحابیؓ بنتے بنتے رہ گئے اور ایک بڑے مشہور تابعی کی جو بیک وقت محدث اور فقیہ دونوں تھے۔

ابن ابی حاتم رازی، جو بہت مشہور ہیں اور جن کا میں پہلے بھی کئی بار تذکرہ کر چکا ہوں، ان کی کتاب علل الحدیث پر بڑی مشہور ہے۔ یہ رے کے رہنے والے تھے جو موجودہ تہران کے قرب و جوار میں تھا جو اب یا تو مٹ گیا یا تہران کا حصہ بن گیا۔ وہاں سے یہ سفر کر کے بصرہ پہنچے اور وہاں کے کچھ شیوخ حدیث سے کسب فیض کے لئے وہاں کچھ دن مقیم رہے۔ ایک سال کی نیت سے بصرہ پہنچے تھے۔ آٹھ ماہ میں جمع پونجی ختم ہو گئی۔ اب کسی سے مانگنا انہوں نے اپنی شان

خودداری اور استغنا کے خلاف سمجھا۔ حدیث رسولؐ کا طالب علم دست سوال نہیں پھیلا سکتا تھا۔ انہوں نے بھی دست سوال نہیں پھیلایا اور یہ طے کیا کہ جب تک رہ سکتے ہیں رہیں گے۔ چنانچہ پانی پی پی کر گزارہ کرتے رہے۔ جب چار پانچ دن بعد ہمت جواب دینے لگی تو خیال کیا کہ واپس چلے جائیں لیکن کیسے۔ پھر سوچا کہ واپسی میں اگر راستہ ہی میں مرنا ہے تو یہاں کیوں نہ مریں۔ جس شیخ کے پاس جایا کرتے تھے ان کے پاس جانا جاری رکھا۔ آٹھ دس دن کے بعد جب بالکل ہی ہمت نہیں رہی اور کمزوری سے گر گئے تو ایک دوست نے پوچھا کہ اصل بات کیا ہے؟ انہوں نے سب کچھ بتا دیا۔ دوست نے کہا کہ میرے پاس ایک دینار ہے۔ دینار سونے کا ایک سکہ ہوتا تھا جو ہمارے حساب سے ساڑھے چار یا پانچ ماشہ کا ہوتا تھا۔ پانچ گرام سونے کی قیمت اب بھی غالباً کافی ہوتی ہے۔ اس نے کہا کہ چلو اس کو بیچ دیتے ہیں آدھا دینار آپ لے لیں آدھا میں رکھ لیتا ہوں۔ اس سے اتنے پیسے ہو جائیں گے کہ خراسان واپس چلے جائیں۔ چنانچہ وہ رے واپس چلے گئے۔

ابن مندہ کے بارے میں لکھا ہوا ہے کہ طوف الاقالیم، انہوں نے اقلیموں کے طواف کئے تھے۔ طواف کرنا ایک سفر کو نہیں کہتے۔ جب بار بار کسی علاقہ کا سفر کیا جائے اس کو طواف کہا جاتا ہے۔ طواف کرنا چکر لگانے کو کہتے ہیں۔ سات چکر اسلام کی روایت ہے تو کم از کم کئی سفر کئے ہوں تب کہا جا سکتا ہے کہ فلاں علاقے کا طواف کیا ہے۔ یہ چالیس سال سفر میں رہے۔ نیشاپور، بغداد، مکہ، قاہرہ، بخارا، مرو، بلخ ان سب علاقوں کا انہوں نے سفر کیا۔ یہاں کے محدثین نے جو روایات ان کو دیں وہ سب انہوں نے حاصل کیں۔ چالیس اونٹوں کا وزن لے کر اپنے وطن اصفہان واپس پہنچے۔ کل سترہ سو شیوخ سے انہوں نے روایت کی۔ سترہ سو شیوخ حدیث سے روایات لے کر اس علاقہ میں پہنچے۔

ایک اور محدث ہیں محمد بن طاہر المقدسی، بیت المقدس کے رہنے والے تھے۔ محمد بن طاہر نام تھا۔ ایک مرتبہ بغداد کے سفر پر روانہ ہوئے۔ راستے میں پیسے ختم ہو گئے۔ جس طرح آج کل ٹریول ایجنٹ یا ٹور ایجنٹ یا ٹور آپریٹرز ہوتے ہیں اس زمانے میں بھی ٹور ایجنٹ ہوتے تھے، اور وہ بڑے بڑے شہروں کے درمیان اونٹوں کے قافلے چلایا کرتے تھے۔ راستے میں پڑاؤ، خیمے، حفاظت اور کھانے پینے کا انتظام بھی کرتے تھے۔ ٹور آپریٹرز کو لوگ پیشگی پیسے دے دیتے تھے اور

وہ مسافروں کو اپنے قافلے میں لے جایا کرتے تھے۔علامہ مقدسی نے پیسے دیئے جو راستے میں ختم ہو گئے۔جس منزل تک انہوں نے پیسے دیئے تھے وہ منزل آ گئی تو انہوں نے کہا کہ اب ہم آپ کو آگے نہیں لے جاتے اور انہیں راستہ میں چھوڑ دیا۔محمد بن طاہر نے سوچا کہ بغداد تو ہر صورت جانا ہے، پیدل ہی روانہ ہو گئے۔اگر بیت المقدس اور بغداد کے درمیان کا راستہ آپ کے سامنے ہو تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک بہت بڑا صحرا راستے میں آتا ہے جو بڑا مشکل اور دشوار گزار ہے۔ گھوڑے اور اونٹ کی پشت پر بھی بہت کم لوگ اس کو عبور کر پاتے ہیں۔انہوں نے کہا کہ میں نے اپنی پشت پر کتابیں لادیں اور پیدل چل پڑا۔ چلتے چلتے جوتے گھس کر پھٹ گئے تو میں ننگے پاؤں چل پڑا۔گرمی کا زمانہ تھا،اوپر سے جلتی ہوئی دھوپ اور نیچے سے تپتا ہوا صحرا۔ پیسے نہیں تھے تو کھانے پینے کا انتظام بھی ختم ہو گیا۔ پشت پر کتابوں اور کاغذات کا بوجھ،طبیعت اتنی خراب ہوئی کہ خون کا پیشاب آنے لگا۔ان تمام تکالیف کے باجود بغداد پہنچ گئے۔اپنا وقت گزارا،مزدوری کر کے کچھ پیسے کمائے اور مکہ مکرمہ آ گئے۔مکہ مکرمہ میں بھی یہی کیفیت ہوئی، وہاں بھی مزدوری کر کے کچھ پیسے کمائے اور پھر اپنے وطن واپس پہنچ گئے۔

امام ابونصر عبداللہ سجستانی ایک اور محدث ہیں۔ان کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ 'طوّف الافاق 'انہوں نے کائنات کے چکر لگائے۔آفاق زمین یعنی زمین کے گوشوں کے چکر لگائے اور اسی چکر میں وہ مختلف جگہوں پر گئے تھے۔ہوتے ہوتے کسی شہر میں جا نکلے۔وہاں جا کر ٹھہرے،شہرت ہوئی کہ علم حدیث کے بڑے ماہر آئے ہیں۔لوگ ان سے علم حدیث حاصل کرتے تھے۔یہ اوروں سے حاصل کرتے تھے۔ رات کو مزدوری کرتے تھے اور دن میں کسب علم کرتے تھے۔کوئی خاتون بچاری بہت نیک دل تھی اور بڑے اچھے جذبہ والی تھی۔اس نے دیکھا کہ یہ عالم ہیں، محدث ہیں، جذبہ والے ہیں، رات کو مزدوری کرتے ہیں۔صبح فیض حاصل بھی کرتے ہیں اور پہنچاتے بھی ہیں۔وہ ایک مرتبہ ان کے گھر آئی،ان کے شاگرد موجود تھے۔خاتون نے دروازہ پر دستک دی۔شاگرد نے دروازہ کھول کر دیکھا تو اطلاع دی کہ ایک خاتون آئی ہوئی ہے۔انہوں نے پوچھا بی بی کیا کام ہے؟ اس نے ایک تھیلی دی کہ یہ میں آپ کے لئے لے کر آئی ہوں۔اس میں ایک ہزار دینار ہیں۔کہا کہ میں آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں، اور صرف آپ کی خدمت کرنے کے لئے ایسا کرنا چاہتی ہوں۔ میرا اور کوئی مقصد یا کوئی ضرورت نہیں ہے۔آپ کی محرم

بن کرآپ کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔اس پیسے سے آپ اپنا گزارہ کریں اور علم حدیث کے لئے اپنا وقت لگائیں۔ یہ پیسہ اور میری خدمات آپ کے لئے حاضر ہیں۔انہوں نے کہا کہ بی بی تمہارا بہت بہت شکریہ،لیکن میں نے یہ طے کیا تھا کہ میں صرف اللہ کے لئے علم حاصل کروں گا۔صرف اللہ ہی سے اس کا اجر مقصود ہے۔میں دنیا میں کوئی اجر نہیں چاہتا ،لہٰذا مجھے تمہاری خدمت اور پیسوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے،تمہاری اس پیشکش کا بہت شکریہ۔ جو مجھ پر گزرتی ہے یہ گزر جائے گی اور مجھے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اجر ملے گا۔

علامہ ابو حاتم الرازی علم حدیث کے بہت بڑے امام تھے۔ان کے صاحبزادے بھی علم حدیث اور خاص طور پر جرح وتعدیل کے بہت بڑے امام ہیں جو ابن ابی حاتم الرازی کہلاتے ہیں اور نام ان کا عبدالرحمٰن ہے۔ ان کا یہ واقعہ میں خطیب بغدادی کی اس کتاب 'الرحلۃ فی طلب الحدیث' سے پڑھ کر سناتا ہوں۔وہ کہتے ہیں میں نے اپنے والد کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ جب میں پہلی مرتبہ طلب حدیث کے لئے نکلا تو میں سات سال سفر میں رہا۔میں جتنا پیدل چلتا تھا میں اس کو گنتا رہتا تھا، جب ایک ہزار فرسخ سے زیادہ ہو گیا،(اور جن صاحب نے یہ کتاب ایڈٹ کی ہے وہ بھی بڑے عالم ہیں،انہوں نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ ایک فرسخ موجودہ پانچ کلومیٹر سے تھوڑا زیادہ ہوتا تھا۔) جب میں نے ایک ہزار فرسخ کا سفر پیدل طے کرلیا،یعنی ساڑھے پانچ ہزار کلومیٹر کے لگ بھگ چل لیا تو اس کے بعد میں نے گننا چھوڑ دیا۔لیکن جو میں چلا وہ یہ تھا کہ کوفہ اور بغداد کے درمیان جو سفر میں نے کیا مجھے یاد نہیں کہ کتنی مرتبہ کیا۔ جب کوفہ میں سنا کہ کوئی محدث آیا ہے تو کوفہ چلا گیا، پھر سنا کہ کوئی محدث بغداد آگیا ہے تو میں بھی بغداد چلا گیا۔اور مکہ اور مدینہ کے درمیان بہت مرتبہ اور بحرین (جو مشرقی سعودی عرب کے قریب ہے وہاں) سے جوسلا شہر کے قریب تھا مصر گیا۔ اِس وقت ہوائی جہاز میں تین گھنٹے لگتے ہیں۔اور مصر سے رملہ،موجودہ فلسطین کی جو اتھارٹی ہے اس کے دارالحکومت رملہ میں،جس کو اخبار والے رام اللہ کہتے ہیں۔اور رملہ سے بیت المقدس پیدل گیا اور بیت المقدس سے عسقلان اور رملہ سے طبریہ جو وہیں کا ایک شہر ہے اور طبریہ سے دمشق اور دمشق سے حمص اور حمص سے انطاکیہ اور انطاکیہ سے طرسوس، یہ بھی شام کا ایک شہر ہے، پھر طرسوس سے حمص واپس آیا اور ابوالیمان جو ایک مشہور محدث تھے ان کی احادیث میں سے کچھ چیزیں رہ گئیں تھیں وہ میں نے حمص سے حاصل کیں، پھر حمص سے بیسان پیدل آیا، جو

موجودہ عراق اور شام کی سرحد کے قریب ہے۔ بیسان سے رقہ آیا، جو بغداد کے قریب ایک شہر ہے' اور رقہ سے دریائے فرات میں کشتی میں سوار ہوا اور بغداد آیا۔ اور شام کے اس سفر سے پہلے میں واسط سے نیل کا سفر اور دریائے نیل سے کوفہ تک ایک سفر کر چکا تھا۔ یہ سارے سفر پیدل تھے۔ یہ میرے پہلے سفر کی تفصیل ہے اس وقت میری عمر بیس سال تھی اور سات سال میں نے اس پورے سفر میں گزارے۔ رے سے جو میرا وطن تھا، 213ھ میں نکلا، رمضان کے مہینے میں گھر سے چلا تھا اور 221ھ میں واپس آیا۔ یہ مختصر سی تفصیل ہے اس سفر کی جو ابوحاتم رازی نے کیا۔

ایک اور روایت میں وہ بیان کرتے ہیں کہ جب ہم مدینہ منورہ سے نکلے، داؤد جعفری وہاں کے کوئی بزرگ تھے ان کے ہاں سے ہم بندرگاہ پر گئے اور کشتی میں سوار ہو گئے، ہم تین آدمی تھے، مرو کے نام پر دو شہر ہیں۔ ایک مرو کہلاتا ہے، صرف مرو، اور ایک مروالروذ یعنی مرو کا وہ علاقہ جو دریا کے کنارے ہے۔ میرے ساتھ ابوزہیر مروالروذی تھے اور ایک اور نیشاپوری بزرگ تھے۔ ہم تینوں سوار ہوئے لیکن سفر ہوا کے مخالف سمت میں تھا اس لئے ہماری کشتیاں تین ماہ تک سمندر میں لنگر انداز رہیں۔ ہم بہت پریشان ہو گئے اور ہمارے پاس جو زاد راہ تھا وہ ختم ہو گیا اور ہم صرف تن تنہا رہ گئے۔ ہم خشکی میں اتر گئے، اور پیدل ہی خشکی میں چلتے رہے، یہاں تک کہ جو تھوڑا بہت پانی اور زادہ راہ تھا وہ سب ختم ہو گیا، ہم ایک رات چلتے رہے اور ہم میں سے کسی نے ایک دن رات نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ دوسرا دن بھی اسی طرح رہا۔ تیسرا دن بھی اسی طرح تمام دن ہر روز رات تک چلتے اور جب شام آتی نمازیں پڑھتے، اور اپنے آپ کو اسی طرح زمین پر ڈالتے، جہاں بھی ہوتے، بھوک، پیاس اور تھکن سے ہمارے جسم کمزور ہو چکے تھے، جب تیسرے دن صبح ہوئی تو بقدر طاقت ہم نے چلنا چاہا مروالروذ کے جو بوڑھے ساتھی ہمارے ساتھ تھے وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے، ہم نے ان کو حرکت دی لیکن ان میں کوئی سمجھ بوجھ اور عقل نہیں رہی تھی، ہم نے ان کو وہیں چھوڑ دیا۔ میں اور میرے نیشاپوری ساتھی چل پڑے، ایک فرسنگ یا دو فرسنگ یعنی ساڑھے پانچ یا گیارہ کلومیٹر چلنے کے بعد میں بھی بے ہوش ہو کر گر گیا، میرا ساتھی چل پڑا اور مجھے چھوڑ دیا، وہ چلتے رہے' انہوں نے دور سے ایک گروہ کو دیکھا جنہوں نے اپنی کشتی خشکی سے قریب کر رکھی تھی حضرت موسی علیہ السلام کا جو کنواں کوہ سینا میں ہے اس کے قریب اترے جب انہوں نے کشتی والوں کو دیکھا تو اپنا کپڑا ان کی طرف کر کے لہرایا۔ وہ لوگ پانی لے کر آئے انہوں نے

اس کو پلایا اور ہاتھ پکڑ کر کھڑا کیا، انہوں نے کہا میرے دو ساتھی ہیں ان کو بھی لاؤ، وہ وہاں بے ہوش پڑے ہوئے ہیں، مجھے اس وقت پتہ چلا جب ایک شخص میرے چہرے پر پانی چھڑک رہا تھا تو میں نے آنکھیں کھولیں اور کہا کہ پانی پلاؤ، اس نے کسی مشک یا کسی گلاس وغیرہ سے مجھے پانی پلایا میں نے پانی پیا تو مجھ ہوش آیا اور جتنا میں پیاسا تھا اتنا نہیں پلایا۔ اس پر میں نے کہا کہ اور پلاؤ، اس نے تھوڑا سا اور پلایا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ میں نے کہا میرے پیچھے ایک اور بڑے میاں بھی پڑے ہیں ان کے پاس جاؤ۔ ایک گروہ ان کے پاس گیا اس نے میرا ہاتھ بھی پکڑا، میں پاؤں کھینچتا اور گھسیٹتا ہوا ان کے ساتھ چلا۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں وہ لوگ مجھے پانی پلاتے رہے۔ جب میں ان کی کشتی تک پہنچا تو وہ ہمارے تیسرے ساتھی کو بھی لے آئے۔ کشتی والوں نے ہمارے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا۔ ہم چند دن ان کے پاس رہے۔ یہاں تک کہ ہمارے اندر ہمت آگئی اور جان میں جان آگئی۔ پھر انہوں نے ہمیں ایک شہر کے لوگوں کے نام جس کا نام رایہ تھا، ایک تحریر لکھ کر دے دی۔ اس شہر کے گورنر کے نام، اور ہمیں کیک، ستو اور پانی بھی دے دیا۔ ہم مسلسل چلتے رہے۔ ہمارے پاس جو پانی، کیک اور ستو تھے وہ ختم ہو گئے۔ ہم سمندر کے کنارے بھوکے پیاسے چلتے رہے حتی کہ ہمیں ایک بڑا کچھوا ملا جس کو سمندر نے ساحل پر پھینک دیا تھا۔ اتنا بڑا تھا جتنی بڑی ایک ڈھال ہوتی ہے۔ ہم نے ایک بڑا پتھر لیا اس کی پشت پر مارا تو وہ ٹوٹ گئی، اس میں ایسے بہت سے انڈے تھے جیسے انڈے کی زردی ہوتی ہے۔ ہم نے ایک سیپی اٹھائی جو دریا کے کنارے پڑی ہوئی تھی۔ اس سے ہم اس زردی کو اس طرح کھانے لگے جیسے کوئی چیز چمچی سے کھائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ہماری بھوک کچھ قابو میں آئی اور پیاس بجھی، پھر ہم چل پڑے، اور یہ برداشت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ہم رایہ شہر میں داخل ہو گئے اور وہاں کے عامل یا گورنر کو وہ خط پہنچایا اس نے ہمیں اپنے گھر میں ٹھہرایا اور ہمارے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ روزانہ ہمیں کدو کھلاتا تھا، اور اپنے ملازم سے کہا کرتا تھا کہ ان کے لئے چھوٹے اور نرم کدو لاؤ اور روزانہ ہمیں وہ کدو روٹی کے ساتھ کھلاتا تھا۔ ہم تینوں میں سے ایک نے فارسی میں کہا: کیا یہ بھنا ہوا گوشت نہیں کھلاتے اور اس طرح کہا کہ گھر والا بھی سن لے۔ وہ بولا: میں بھی فارسی جانتا ہوں۔ میری دادی ہرات کی رہنے والی تھی۔ اس کے بعد وہ ہمیں گوشت بھی کھلانے لگا۔ پھر وہاں سے ہم نکلے، اور اس نے ہمیں مزید زادراہ دیا یہاں تک کہ ہم مصر آگئے۔

ایک اور طویل واقعہ امام حاکم کا ہے جو خطیب نے اسی کتاب میں بیان کیا ہے، لیکن وقت کم ہے اس لئے اس کو چھوڑ دیتا ہوں۔ اس میں بھی اسی طرح کی قربانیوں کا ذکر ہے۔ ان واقعات سے اندازہ ہو جائے گا کہ محدثین نے کن مصائب اور مشکلات کے ساتھ یہ ذخیرہ ہم تک پہنچایا ہے۔ اب آج اگر کوئی اٹھ کر یہ کہے کہ یہ سب سنی سنائی باتیں ہیں اور غیر حقیقی اور غیر علمی ہیں تو انسان کو حیرت ہوتی ہے کہ اس بارے میں اب کیا کہے۔ یا تو ایسی بے بنیاد بات کہنا سراسر بدنیتی ہے، بددیانتی ہے یا جہالت ہے، اس کے علاوہ اور کیا سبب ہو سکتا ہے۔

یہ رحلہ کے بارے میں چند مثالیں تھیں جو میں نے آپ کے سامنے رکھیں۔

وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العلمین

☆☆☆☆☆☆☆

کہتے ہیں شب برات کی فضیلت میں چالیس ضعیف احادیث ہیں؟

بھئی شب برات کو چھوڑ دیجئے، جو آپ کا جی چاہے وہ کر لیجئے۔ ایک اصولی بات میں عرض کر دیتا ہوں اس کو آئندہ بھی یاد رکھیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ کچھ احادیث ہیں جو قطعی الثبوت ہیں۔ کچھ احادیث ظنی الثبوت ہیں۔ ظنی الثبوت وہ ہیں جن کے حدیث صحیح ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ وہ اکثر خبر واحد یا اخبار آحاد ہیں۔ ان میں شروع سے علما اور محدثین کے درمیان اختلاف رہا ہے۔ ایک محدث ایک حدیث کو ثابت شدہ مانتے ہیں، ان کی نظر میں وہ صحیح ہے۔ دوسرے محدث اپنی تحقیق میں اس کو ضعیف مانتے ہیں۔ ان کی نظر میں وہ ضعیف ہے۔ جو ضعیف مانتے ہیں وہ اس پر عمل نہیں کرتے، کیونکہ ان کی تحقیق کے مطابق وہ ضعیف ہے۔ جو اپنی تحقیق میں اس کو صحیح سمجھتے ہیں وہ اس پر عمل کرتے ہیں۔ اس لئے اگر کوئی کسی ضعیف حدیث پر عمل کر رہا ہے تو یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ اور جو کوئی اس پر عمل نہیں کر رہا ہے تو یہ بھی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔

اعتراض یا نکیر صرف وہاں کرنا چاہئے جہاں شریعت کے کسی واضح، قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت حکم کی خلاف ورزی ہو رہی ہو۔ اس لئے اگر کوئی شب براۃ کی احادیث پر عمل کرتا ہے تو آپ کا کیا لیتا ہے، کرنے دیجئے۔ اگر آپ کی تحقیق میں وہ احادیث کمزور ہیں یا ان لوگوں کی تحقیق میں کمزور ہیں جن کے علم پر آپ کو اعتماد ہے تو آپ ان پر عمل نہ کیجئے۔ لیکن اگر کچھ اور لوگ ایسے ہیں جن کی تحقیق پر آپ کو اعتماد نہیں ہے لیکن وہ ان احادیث کو ثابت شدہ سمجھ کر ان پر عمل کر رہے ہیں تو آپ ان پر اعتراض مت کیجئے۔ یہ ایک جزوی سی چیز ہے اس پر زیادہ بحث اور اختلاف کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے کہا کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے وہ بتایا کہ اگر میں اس وقت باہر نکل کر لوگوں کے سامنے سچ کہہ دوں تو میرا قتل مسلمانوں پر واجب ہو جاتا اور وہ مجھے قتل کر دیتے۔

یہ نہیں کہا کہ میرا قتل مسلمانوں پر واجب ہو جاتا۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ بہت سی چیزیں میرے علم میں ایسی ہیں کہ اگر میں ان کو کھلم کھلا بیان کروں تو شاید لوگ مجھے قتل کر دیں۔ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جب علم حدیث یا علم دین بیان کیا جائے تو تدریج اور ترتیب کے ساتھ بیان

کیا جائے۔ اس طرح بیان نہ کیا جائے کہ سننے والے لوگ پہلے ہی مرحلے میں اس کا انکار کر دیں۔ آپ پہلے اسلام کے عقائد پھر اخلاق پھر تربیت اور تعلیم اور پھر احکام بتائیں۔ یہ وہی چیز ہے جو حضرت عائشہؓ نے فرمائی کہ رسول اللہ ﷺ اگر پہلے ہی دن یہ کہتے کہ شراب نوشی چھوڑ دو تو شاید عرب میں بہت کم لوگ آپؐ کی بات مانتے۔ آپ نے تدریج کے ساتھ پہلے ان کو مکارم اخلاق سکھائے، پھر نماز سکھائی پھر ایک ایک کر کے باقی چیزیں سکھائیں۔ آخر میں کہا کہ شراب نوشی اور فلاں فلاں قسم کے گناہ چھوڑ دو تو لوگوں نے چھوڑ دیئے کیونکہ تربیت ہو چکی تھی۔ یہی بات حضرت ابو ہریرہؓ نے کہی کہ میں ایسا علم بھی رکھتا ہوں کہ اگر میں بیان کروں تو شاید لوگ مجھے قتل کر دیں اس لئے کہ ابھی ان کی وہ تربیت نہیں ہوئی اور شائد وہ ان کو سننے کے لئے تیار نہ ہوں۔ اس کے علاوہ اس کا کوئی اور مطلب نہیں ہے اور منکرین حدیث اس سے جو مطلب نکالنا چاہتے ہیں وہ درست نہیں ہے۔

کل آپ نے ڈاکٹر حمید اللہ کی کتاب خطبات بہاولپور کا ذکر کیا، اس کا کچھ حصہ میں پڑھ چکی ہوں۔ اس میں انہوں نے بارہ لیکچرز کو بارہ چشموں سے تشبیہ دی ہے جن کا ذکر قرآن پاک میں ہے۔ میں بھی ان خطبات کو براہ راست ڈاکٹر حمید اللہ سے سننے کی خواہش رکھتی تھی۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ بہت دل چاہ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ان بارہ خطبوں سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ مجھے بھی ایسا ہی اخلاص عطا فرمادے جو ڈاکٹر حمید اللہ کو عطا فرمایا تھا۔ ان خطبات کا علمی درجہ وہ نہیں ہے جو ڈاکٹر حمید اللہ صاحبؒ کے خطبات کا تھا۔ ان خطبات کے دینے والے کا نہ وہ علمی مقام ہے نہ روحانی نہ اخلاقی جو ڈاکٹر صاحب کا تھا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ان خطبات اور ڈاکٹر صاحب کے خطبات بہاولپور میں ایک اور ایک ہزار کی نسبت بھی نہیں ہے۔ لیکن ایک ادنیٰ مشابہت ضرور ہے کہ وہ بھی بارہ تھے یہ بھی بارہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو قبول فرمائے۔ آمین

کیا آپ انگریزی میں کسی ایسی اچھی کتاب کا نام بتا سکتے ہیں جو علم حدیث کے اہم موضوعات سے متعلق ہو اور اس بارے میں ہماری رہنمائی کر سکے۔

افسوس کہ اس وقت انگریزی میں کوئی ایسی کتاب میرے ذہن میں نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ نے ان خطبات کے کچھ نوٹس انگریزی میں بنائے ہوں تو ان کو ایک ترتیب دے کر ایک نقل

مجھے بھی دیجئے گا۔ میں بڑی خوشی سے ان کی ایڈیٹنگ کروں گا اور ان میں ضرور کچھ اضافہ بھی کروں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کے بارے میں یہ اعتراض ہے کہ حضرت عمرؓ کے دور میں کسی وجہ سے ان کو جیل میں بند کر دیا گیا تھا۔

یہ بات میرے علم میں نہیں ہے، میں نہیں جانتا کہ حضرت عمرؓ کے دور میں حضرت ابو ہریرہؓ کو جیل میں بند کر دیا گیا تھا یا گورنری سے معطل کر دیا گیا تھا۔ میرے علم میں نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں تو لوگ گورنری سے معطل ہوتے رہتے تھے۔ ایک صاحب آج مقرر ہوئے ہیں کل دوسرے ہوں گے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ بصرہ کے گورنر تھے، بعد میں وہاں سے ہٹا دیئے گئے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ مصر کے گورنر تھے، ان کو بھی بعد میں ہٹا دیا گیا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ کمانڈر انچیف تھے ان کو بھی ہٹایا گیا۔ یہ تو انتظامی معاملات ہوتے ہیں ان کا کوئی تعلق حدیث کی روایت سے نہیں ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ حضرت ابو ہریرہؓ گورنر تھے کہ نہیں تھے۔

شش کلمات یا چھ کلموں کی سند کیا ہے جو ہمارے معاشرہ میں گویا ایک جزو ایمان بن گئے ہیں؟

مجھے ان چھ کلموں کی سند کے بارے میں تو کوئی علم نہیں، تاہم مختلف احادیث میں مختلف طریقوں سے ان کلمات کا تذکرہ ملتا ہے۔ قرآن وحدیث میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جس کے مطابق یہ کلمے پڑھنا یا ان کو یاد کرنا ایمان یا عقیدہ کا کوئی جز ہو۔ میرے خیال میں یہ بعض علما نے عام لوگوں کی سہولت کے لئے ترتیب دیئے ہیں، تاکہ ایمان سے متعلق بنیادی چیزوں کا حفظ کرنا آسان ہو جائے۔ اس کے علاوہ ان کی کوئی سند نہیں ہے۔ یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ اگر کسی نے یہ چھ کلمے یاد کر لئے تو وہ اچھا مسلمان ہوگا اور جس نے یاد نہیں کئے اس کے ایمان پر کوئی حرف آئے گا۔ یہ صرف سہولت کے لئے ہیں، فرض عین قسم کی کوئی چیز نہیں ہے۔

حصول علم حدیث کے لئے سفر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں مسلمانوں کے عروج اور ترقی کی وجہ کیا تھی۔ ان کے اندر علم طلب اور تڑپ تھی۔ بدقسمتی سے آج یہ طلب اور تڑپ برائے نام رہ گئی ہے۔ اس لئے عروج بھی ختم ہو گیا۔

ہاں واقعی ختم ہو گیا۔ مسلمانوں میں علمی ذوق ختم ہو گیا ہے اس لئے مسلمانوں کا عروج زوال میں بدل گیا۔ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لئے ان کی علمی زندگی کا احیا ضروری ہے۔ سب

سے پہلے علوم دین میں اس کے بعد باقی علوم میں جب تک علمی اور فکری نشأت الثانیہ نہیں ہوگی، اس وقت تک مسلمانوں کا عروج دوبارہ نہیں آسکتا۔

ہمارے علاقے میں بڑے زمیندار اپنی اجاڑ اور بے کار زمین کو چھوٹے کسانوں کو دو یا پانچ سال کے لئے ٹھیکے پر دیتے ہیں اور اس پر سالانہ ایک مخصوص رقم وصول کرتے ہیں، مثلاً سو کنال پر سالانہ پچاس ہزار عام ریٹ ہے۔ مدت اور رقم کا تعین زمین کی حالت پر مختلف ہو سکتا ہے جبکہ زمین پر محنت اور بیج کسان کا ہوتا ہے۔ اس مدت کے دوران اگر زمیندار یہ سمجھتا ہے کہ اس کی زمین اس کی توقع سے زیادہ نفع مند ہے تو مقررہ مدت ختم ہونے پر وہ اپنی زمین کسان سے واپس لے سکتا ہے یا اسی کسان کو زیادہ رقم پر دے دیتا ہے۔ مقررہ مدت کے دوران وہ کسان سے اپنی زمین واپس نہیں لیتا۔ یہ سارا معاملہ دونوں فریقوں کی باہمی رضامندی سے ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ سود ہی کی کوئی قسم ہے یا شرعی طور جائز ہے؟

یہ جائز ہے اور سود کی کوئی قسم نہیں ہے۔

آج کل بینکوں سے لیز پر جو گاڑیاں لی جاتی ہیں کیا درست ہیں؟

لیز میں بہت سی چیزیں ہیں جو دیکھنے کی ہیں۔ ایک بنیادی چیز یہ ہے کہ لیز کے بارے میں کوئی عمومی بات اس وقت تک نہیں کہی جاسکتی جب تک کسی متعین لیز کی دستاویزات نہ دیکھی جائیں۔ گاڑیوں کی لیز کا جو کام میزان بینک والے کرتے ہیں وہ جائز ہے۔ میں نے اس کی دستاویزات دیکھی ہیں اس کے مطابق لیز شرعاً درست ہے۔ بقیہ بینک بھی لیزنگ کا کاروبار کرتے ہیں، لیکن میں ان کی دستاویزات دیکھے بغیر کچھ کہہ نہیں سکتا۔ باقی چیزیں چھوٹی ہیں۔ البتہ ایک بڑی بنیادی چیز ہے کہ جو لیزڈ پراپرٹی ہے اس کا رسک اور اس کا encumberance لیسور کے پاس ہونا چاہئے۔

If the lessor undertakes to pay the encumberance and the risk of the leased property, then the lease is parmissible.

ایسی لیز جائز ہے اور اگر سارا رسک لیسی پر ہے تو وہ جائز نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اور تفصیلات بھی ہیں جو دستاویزات دیکھ کر معلوم کی جاسکتی ہیں۔

کیا کوئی ایسی کتاب ہے جو منکرین حدیث کو دی جائے یا اس میں ان کے سوالات کے

جوابات ہوں جو آپ نے ذکر کئے ہیں تا کہ بحث کی جائے اور ان کو کتاب دی جائے۔

منکرین حدیث میں دو طرح کے لوگ ہیں۔ کچھ وہ ہیں جن کو واقعی کوئی غلط فہمی ہے۔ ان کو تو کئی کتابیں دی جاسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر شام کے ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کی ایک عربی کتاب ہے 'السنة ومكانتها في التشريع الاسلامي'۔ اس کے دو اردو تراجم ہیں۔ ایک پروفیسر غلام احمد حریری کا کیا ہوا اور دوسر ڈاکٹر احمد حسن کا کیا ہوا ہے۔ یہ دونوں کتابیں آپ ان کو دے سکتی ہیں۔ ایک ہمارے دوست اور میرے بزرگ اور فاضل رجل مولانا محمد تقی عثمانی کی انگریزی کتاب ہے **The Authority of Sunnah**، وہ آپ منکرین حدیث سے متاثرہ افراد کو دے سکتی ہیں۔ اسی طرح سے ایک چھوٹی سی کتاب ہے مولانا بدر عالم مہاجر مدنی کی، ان کی کتاب کا نام ہے 'حجیت حدیث' وہ بھی اس سلسلہ میں مفید ہے۔ لیکن بہترین کتاب **Studies in the Early Hadith Literture** ہے جو ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی کی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

نواں خطبہ

علوم حدیث

بدھ، 15 اکتوبر 2003

علوم حدیث

علم حدیث کا آغاز اور ارتقا

آج کی گفتگو کا عنوان ہے علوم حدیث۔ آج تک جتنی بحث ہوئی ہے اس سب کا تعلق ایک اعتبار سے علوم حدیث ہی سے ہے۔ یہ سب موضوعات علوم حدیث ہی کے موضوعات تھے ۔لیکن علوم حدیث پر الگ سے گفتگو کرنے کی ضرورت اس بات پر زور دینے کے لئے پیش آئی کہ جن موضوعات کو علوم حدیث کہتے ہیں وہ ایک بہت بڑی، ایک منفرد اور نئی علمی روایت کے مختلف حصے ہیں۔ یہ روایت مسلمانوں کے علاوہ کسی اور قوم میں نہیں پائی جاتی۔ علوم وفنون کے اس مجموعہ کو لاتعداد اہل علم نے اپنی زندگیاں قربان کر کے مرتب کیا۔ اور ان تمام موضوعات سے متعلق مواد جمع کیا جس کا تعلق بالواسطہ یا بلا واسطہ حضورؐ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے احوال، اقوال اور شخصیت مبارکہ سے تھا۔ انہوں نے اس مواد کی تحقیق کی اور اس کو مرتب انداز اور نت نئے اسالیب میں پیش کیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ موضوعات پھیلتے گئے۔ ان میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان میں سے ہر جزوی موضوع پر الگ الگ کتابیں لکھی گئیں۔ پھر ان کتابوں کی شرحیں لکھی گئیں، شرحوں کے حواشی لکھے گئے، پھر ان کتابوں کی تلخیصیں تیار ہوئیں۔ مختلف اہل علم نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق ان کتابوں کے ایڈیشنز تیار کیے۔ اس طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ سب علوم نئے نئے عنوانات کے تحت مرتب ہوتے گئے۔ ان سب موضوعات کے مجموعہ کو علوم حدیث کہا جاتا ہے۔ گویا علوم حدیث سے مراد علم وفن کی وہ پوری روایت ہے جس کا محدثین کرام نے

اہتمام کیا اور اہل علم کی ایک بہت بڑی تعداد، بلکہ اہل علم کی درجنوں نسلوں نے اس مواد کو فراہم کر کے مرتب و منظم کیا، کئی سو سال کے تسلسل کے ساتھ اس کی تہذیب و تنقیح کی۔

علم حدیث کے موضوعات

ان میں سے بعض موضوعات جو نسبتاً زیادہ اہم تھے ان پر گزارشات پیش کی گئیں۔ کچھ اور موضوعات اس اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں کہ ان پر الگ سے ایک دو نہیں بلکہ درجنوں کتابیں لکھی گئیں۔ بعض محدثین نے ان میں اختصاص پیدا کیا اور یوں یہ موضوعات اس اختصاص کا موضوع قرار پائے۔ علم حدیث میں مختلف پہلوؤں سے اس اختصاص سے کام لیا گیا۔ بعض ایسے موضوعات کا ابتدائی، مختصر اور سرسری تعارف آج مقصود ہے۔

معرفت صحابہ

ان میں سب سے اولین موضوع جس کا اختصار کے ساتھ پہلے بھی تذکرہ کیا جا چکا ہے، وہ معرفت الصحابہ ہے۔ سب سے پہلے صحابہ کرامؓ کی نشاندہی، پھر ان کی سیرت و سوانح کی تدوین ایک ایسا بڑا موضوع ہے جس سے واقفیت کسی بھی حدیث کا درجہ متعین کرنے کے لئے ضروری ہے۔ کسی حدیث کا کیا مقام و مرتبہ ہے، اس کا تعین کرنے میں علم معرفت صحابہ کا بنیادی کردار ہے۔ اگر کوئی روایت کسی صحابیؓ سے مروی ہے اور صحابیؓ تک سند مکمل اتصال اور تسلسل کے ساتھ پہنچ جاتی ہے تو پھر اس حدیث کا درجہ یقیناً اونچا ہوگا۔ لیکن اگر اس حدیث کی سند اُس صحابیؓ تک نہیں پہنچتی تو پھر ظاہر ہے کہ اس کا درجہ وہ نہیں ہوگا جو صحابیؓ کی روایت کا ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے جس سے حدیث کا ہر طالب علم فوری طور پر اتفاق کرے گا۔ مشکل وہاں پیش آتی ہے جہاں کسی شخصیت کے صحابیؓ ہونے یا نہ ہونے میں اختلاف ہو، یا اس کے صحابیؓ ہونے یا تابعی ہونے کے بارے میں دو مختلف رائے پائی جاتی ہوں۔ دوسری مشکل وہاں پیش آئے گی جب کسی صحابیؓ کے سن وفات میں اختلاف ہوگا۔

اس تعین کی ضرورت اس لئے پیش آتی ہے کہ اگر کوئی تابعی یہ بیان کریں کہ انہوں نے فلاں صحابیؓ سے یہ حدیث سنی اور صحابیؓ کا انتقال ایک خاص سن میں ہو جانا متعین ہو چکا ہو تو پھر یہ تعین کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ ان تابعی کی ملاقات ان صحابیؓ سے ہوئی تھی کہ نہیں۔ مثال کے طور پر

ایک صاحب نے سن 195ھ میں ایک حدیث بیان کی اور دعویٰ کیا کہ انہوں نے ایک صحابیؓ سے اس حدیث کو سنا ہے۔ وہاں ایک بڑے محدث بھی موجود تھے۔ انہوں نے پوچھا کہ حضرت آپ کی عمر کیا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ میری عمر 115 یا 120 سال ہے۔ ان محدث نے فوراً بتادیا کہ آپ کے دعویٰ کے مطابق اگر آپ کی عمر 120 سال بھی مان لی جائے تو بھی آپ کی پیدائش سے پانچ سال پہلے ان صحابیؓ کا انتقال ہو چکا تھا جن سے آپ روایت بیان کر رہے ہیں۔

یہ جو فوری ردعمل اور فوری طور پر اس بات کا تیقن حاصل کرنا ہے کہ کسی تابعی کو کسی صحابیؓ سے تلمذ حاصل ہے کہ نہیں، یا کسی تابعی نے کسی صحابیؓ سے کسب فیض کیا ہے کہ نہیں، اس کا دارومدار بڑی حد تک اس بات پر ہے کہ صحابہ کرامؓ کے بارے میں معلومات مکمل، یقینی اور واضح طور پر ہمارے پاس موجود ہوں۔

صحابی کی تعریف

ائمہ حدیث کے نزدیک صحابیؓ کی بالاتفاق تعریف یہ ہے کہ صحابیؓ وہ خوش نصیب شخصیت ہیں جنہوں نے حالت ایمان میں حضورؐ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت کی ہو اور آپ کو دیکھا ہو۔ چاہے یہ سعادت کتنے ہی محدود اور مختصر لمحہ کے لئے حاصل ہوئی ہو، لیکن اگر یہ سعادت حالت ایمان میں حاصل ہوگئی اور وہ صاحب حالت ایمان میں زندہ رہے اور اسی حالت ایمان میں وفات پا گئے تو وہ صحابیؓ شمار ہوں گے۔ اس میں چھوٹا سا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے بدنصیب بھی تھے جو رسول ﷺ کے زمانہ مبارک میں اسلام لائے اور آپؐ کی زیارت سے مشرف ہوئے، لیکن آپؐ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد کسی قبائلی عصبیت یا کسی غلط فہمی یا کسی دوسری گمراہی کی وجہ سے اسلام سے پھر گئے، کسی مدعیٔ نبوت کے ساتھ ہو گئے اور خدانخواستہ اسی حالت میں مر گئے۔ ایسے لوگوں کے صحابی ہونے کا تو کوئی سوال نہیں۔ کیونکہ مسلمان کی حیثیت سے اور اسلام کی حالت میں وفات نہیں ہوئی۔ لیکن ان لوگوں میں بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو بعد میں اللہ کی توفیق سے دوبارہ مسلمان ہو گئے، وہ بھی صحابیؓ نہیں کہلائیں گے۔ اگرچہ انہوں نے حالت ایمان میں حضورؐ کی زیارت کی اور حالت ایمان ہی میں وفات پائی، لیکن چونکہ حالت ایمان تسلسل سے قائم نہیں رہی اس لئے وہ صحابیت کے شرف سے خارج ہو گئے۔

کچھ اہل علم کا خیال ہے کہ ایسے لوگوں کو تبرکاً صحابیؓ کہا جائے گا۔ کچھ کا خیال ہے کہ نہیں کہا جائے گا۔ محدثین کا عام رجحان یہ ہے کہ ایسا کوئی شخص صحابیؓ نہیں کہلا سکے گا جو حالت ایمان پر قائم نہ رہا ہو اور درمیان میں کسی گمراہی، کفر یا شرک کا وقفہ آ گیا ہو۔

شرف صحابیت کے حصول میں نہ تو بالغ ہونا شرط ہے، اور نہ روایت کرنا شرط ہے۔ کسی نے رسول اللہ ﷺ سے کوئی روایت نہ کی ہو، صرف آپ کو دیکھا ہو تو ان کو بھی شرف صحابیت حاصل ہے اور اگر وہ اتنے بچے ہوں کہ ان کو معاملات، احادیث، احکام اور شریعت کی بہت زیادہ سمجھ بوجھ نہ بھی ہو، لیکن ان کو یہ یاد ہو کہ انہوں نے بچپن میں حضورؐ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت کی تھی، تو وہ بھی شرف صحابیت سے مشرف مانے جائیں گے۔ ایسے بہت سے حضرات ہیں جو حضور ﷺ کی رحلت کے وقت بہت کم عمر تھے۔ حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت محمود بن لبیدؓ، حضرت ابو طفیل عامر بن واثلہؓ اور ان کے علاوہ بھی ایسے کئی حضرات ہیں جو بہت بچے تھے اور پانچ، چھ یا سات سال کی عمر میں انہوں نے حضورؐ کو دیکھا اور بعد میں وہی یادداشتیں جو ان کے ذہن میں مبہم سی تھیں، ان کو بیان کرنے لگے۔ یہ شرف صحابیت کے لئے کافی ہے۔

صحابیؓ کی تعریف اور تعین کے بارے میں محدثین اور علمائے اصول میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ علمائے اصول یعنی اصول فقہ کے علما صحابیؓ کی تعریف کچھ اور کرتے ہیں۔ میں اس کو چھوڑ دیتا ہوں البتہ محدثین کے نزدیک صحابی کی تعریف وہ ہے جو میں نے ابھی بیان کر دی۔

صحابہ کرامؓ کی اس تعریف میں یکسانیت کے باوجود صحابہ کے درجات میں فرق ہے۔ بعض صحابہ کو بعض صحابہ پر فضیلت حاصل ہے جس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ صحابہ پر بات کرتے وقت دو چیزیں الگ الگ شمار ہوں گی۔ ایک صحابہ کے طبقات ہوں گے اور دوسری صحابہ کی فضیلت کے معیارات ہوں گے۔ طبقات صحابہ سے مراد ہے صحابہ کرامؓ کی زمانی اعتبار سے تقسیم کہ کن صحابیؓ کی کتنی عمر ہوئی اور محدثین نے زمانوں کے لحاظ سے ان کو کتنے طبقات میں تقسیم کیا۔ یہ ایک الگ چیز ہے جو ابھی آئے گی۔

فضیلت کے لحاظ صحابہ کے درجات

جہاں تک صحابہ کے فضائل کا تعلق ہے تو اس اعتبار سے صحابہ کرامؓ کے مختلف درجات

ہیں۔سب سے پہلا درجہ جس کی قرآن مجید سے تائید ہوتی ہے اور قرآن مجید میں کئی مرتبہ اس کا ذکر بھی آیا ہے وہ السابقون الاولون ہے۔اس سے مراد وہ صحابہ ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی تبلیغ دین کے ابتدائی تین سالوں کے دوران اسلام میں داخل ہوئے۔ابتدائی تین یا چار سال میں جب رسول اللہ ﷺ نے صرف مکہ مکرمہ تک دعوت کو محدود رکھا اور مکہ مکرمہ میں بھی اپنے قریبی رشتہ دار قبائل تک اپنی دعوت کو پہنچایا، اور وہ لوگ اسلام میں داخل ہوئے جو حضور ﷺ سے بالواسطہ یا بلا واسطہ قبائلی رشتہ کی وجہ سے یا خونی رشتہ داری کی وجہ سے وابستہ تھے۔یہ حضرات السابقون الاولون کہلاتے ہیں۔ان میں خلفاء اربعہ، سیدنا زید بن حارثہؓ، حضرت خدیجہ الکبریٰؓ اور وہ تمام صحابہ جو ابتدائے اسلام کے چند سالوں میں اسلام میں داخل ہوئے، شامل ہیں۔یہ تقسیم امام حاکم نے کی ہے جن کی کتاب معرفت علوم الحدیث بڑی مشہور ہے۔بقیہ محدثین بھی قریب قریب اس سے اتفاق کرتے ہیں۔جب رسول اللہ ﷺ نے اسلام کی دعوت شروع کی اس وقت سے لے کر جب تک آپ نے کھلم کھلا دارالندوۃ میں، جو قریش کا ایک طرح سے اسمبلی ہال تھا، وہاں جا کر علی الاعلان دعوت نہیں دی، اس وقت تک جو لوگ اسلام میں داخل ہوئے وہ السابقون الاولون کہلاتے ہیں۔

جب سیدنا عمر فاروقؓ نے اسلام قبول کرلیا اور ان کے قبول اسلام کے ذریعے اللہ نے اسلام اور مسلمانوں کو قوت عطا فرمائی تو حضرت عمر فاروقؓ کی تجویز پر رسول اللہ ﷺ صحابہ کرامؓ کو لے کر نکلے اور دارالندوہ میں عین قریش کے مرکز میں جا کر علی الاعلان اسلام کا کلمہ بلند کیا۔اس مرحلہ پر بہت سے لوگ جو مسلمان ہوئے وہ اور جو بعد میں مسلمان ہوئے، وہ صحابیت کے دوسرے درجہ پر فائز کہلاتے ہیں اور ان کے لئے امام حاکم نے 'اصحاب دارالندوہ' کی اصطلاح رکھی ہے۔یعنی وہ صحابہ کرامؓ جو دارالندوہ میں دعوت کے نتیجہ میں یا اس کے بعد مسلمان ہوئے۔

صحابہ کرامؓ میں تیسرا درجہ ان حضرات کا ہے جنہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی یا اس ہجرت کے دوران اسلام میں داخل ہوئے۔یہ زمانہ ہجرت حبشہ سے لے کر ہجرت مدینہ تک چلتا ہے جب رسول اللہ ﷺ نے خود مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔

اس کے بعد انصار مدینہ میں ان خوش نصیبوں کا درجہ ہے جو بیعت عقبہ اولیٰ میں شامل رہے۔یہ گویا انصار کے سابقون الاولون ہیں۔انصار میں سابقین الاولین وہ حضرات ہیں جو پہلی

بیعت عقبہ میں شامل رہے۔ اس کے بعد وہ حضرات جو دوسری بیعت عقبہ میں شامل رہے۔ بیعت عقبہ کے بارے میں بعض سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ دو مرتبہ ہوئی اور بعض نے لکھا ہے کہ تین مرتبہ ہوئی۔ ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ یہ صرف اصطلاح کا فرق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عقبہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ سے مدینہ منورہ کے تین مختلف وفود کی ملاقات تین مرتبہ ہوئی۔ پہلی مرتبہ چھ حضرات سے ملاقات ہوئی۔ اس میں کوئی باقاعدہ معاہدہ یا اتفاق رائے نہیں ہوا کہ رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے جائیں، یا مدینہ منورہ میں اسلام کی دعوت کے کام کو باقاعدہ کیسے مرتب کیا جائے۔ بعض سیرت نگار حضرات نے اس کو بیعت کا نام نہیں دیا۔ لہٰذا وہ اس کو بیعت عقبہ اولیٰ قرار نہیں دیتے۔ وہ دوسری بیعت عقبہ کو بیعت عقبہ اولیٰ اور تیسری کو بیعت عقبہ ثانیہ قرار دیتے ہیں۔ کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ اس موقع پر عقبہ کے مقام پر رسول اللہ ﷺ اور مدینہ کے چھ رکنی وفد کے درمیان باقاعدہ ملاقات ہوئی تھی۔ چھ صحابہ کرامؓ مدینہ منورہ سے وہاں تشریف لائے تھے اور انہی سے مدینہ منورہ میں دعوت اسلامی کا آغاز ہوا، اس لئے یہ پہلی بیعت عقبہ ہے، اور جو بیعت دوسرے اہل علم کے نزدیک پہلی بیعت کہلاتی ہے وہ ان حضرات کے نزدیک دوسری ہے اور جو دوسری ہے وہ دراصل تیسری ہے۔ یہ محض گنتی اور شمار کا فرق ہے ورنہ واقعات کی اس ترتیب میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ تو گویا پہلی یا دوسری یا جو بھی تقسیم آپ پسند کریں، ان میں جو حضرات شریک ہوئے ان کا درجہ چوتھا ہے اور جو دوسری یا تیسری بیعت میں شریک ہوئے ان کا درجہ پانچواں ہے۔

اس کے بعد وہ حضرات ہیں جو مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے گئے یا مدینہ کے قرب وجوار کے رہنے والے یا مدینہ منورہ میں رہنے والے حضرات جو رسول اللہ ﷺ کے قیام قبا کے دوران اسلام میں داخل ہوئے۔ حضورؐ نے پندرہ دن قبا میں قیام فرمایا جہاں بہت سے حضرات نے اسلام قبول کیا۔ بہت سے مہاجرین ہجرت کر کے حضورؐ کے ساتھ مدینہ میں جا کر مل گئے۔ ان کا طبقہ وہ ہے جو امام حاکم کے نزدیک درجہ اور فضیلت کے اعتبار سے صحابہ کرامؓ کا چھٹا طبقہ ہے۔ ابھی بطور ماخذ حدیث یا مصدر حدیث کے بات نہیں ہو رہی ہے بلکہ ابھی صرف صحابہ میں درجات اور فضیلت کی بات ہو رہی ہے۔

پھر ساتواں درجہ ان کا ہے جو اصحاب بدر ہیں۔ ممکن ہے آپ کے ذہن میں یہ سوال

پیدا ہو کہ ہم تو ابھی تک یہ پڑھتے آرہے ہیں کہ اصحاب بدر کا درجہ سب سے اونچا ہے۔ یہ ساتواں درجہ کیوں بتایا جارہا ہے۔ اس سوال پر میرا پہلا جواب تو یہ ہے کہ یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ امام حاکم بتارہے ہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ جو پہلے تمام درجات ہیں اصحاب بدران میں شامل ہیں۔ سابقون اولون میں سے کوئی نہیں جو غزوہ بدر میں شامل نہ ہو۔ اصحاب دارالندوہ میں کوئی نہیں جو بدر میں شامل نہ ہوا ہو۔ یہ سارے کے سارے اصحاب بدر میں شامل ہیں۔ اس لئے جب ہم اصحاب بدر کے درجہ کا ذکر کریں گے تو ایک آدھ کے استثنا کے ساتھ یہ سارے کے سارے اس میں شامل ہوں گے۔

اصحاب بدر کے بعد صلح حدیبیہ سے پہلے اسلام میں داخل ہونے والے ان خوش نصیبوں کا درجہ ہے جو ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ ان کا درجہ اس لئے اونچا ہے کہ صلح حدیبیہ سے پہلے پہلے مکہ مکرمہ کے لوگوں اور مسلمانوں کے درمیان شدید جنگ اور کشمکش کی کیفیت تھی اور تمام اہل مکہ اور ان کی وجہ سے بقیہ قبائل کے بہت سے لوگ مسلمانوں کے شدید دشمن تھے۔ لہٰذا جو شخص مکہ مکرمہ یا کسی اور قبیلہ سے اپنا وطن چھوڑ کر اسلام قبول کرتا ہے اور مدینہ منورہ آکر گویا اپنی سابقہ شہریت کو منسوخ کر کے مسلمانوں کی برادری میں شامل ہو جاتا ہے وہ پوری برادری اور گھر بار چھوڑ کر پورے عرب سے دشمنی مول لے کر مدینہ منورہ کی بستی میں آتا ہے تو اس کا درجہ بعد والوں سے بلاشبہ اونچا ہونا چاہئے۔

صلح حدیبیہ کے بعد صورت حال بدل گئی۔ کفار مکہ سے جنگ بندی کا معاہدہ ہوا۔ دوسرے قبائل سے بھی معاہدات ہوئے، کچھ قبائل سے دوستی کے عہد و پیمان ہوئے۔ مسلمانوں کے لئے حالات نسبتاً بہتر ہو گئے اور اب دشمنی کی وہ کیفیت نہیں رہی۔ ان حالات میں جو اصحاب تشریف لائے ان کی قربانی پہلے آنے والے حضرات کے مقابلہ میں نسبتہً کم درجے کی ہے۔ اس لئے آٹھواں درجہ ان کا ہے جو صلح حدیبیہ کے بعد اور بیعت رضوان سے پہلے پہلے تشریف لائے۔ پھر بیعت رضوان میں جو لوگ شریک ہوئے قرآن مجید میں ان کا ذکر موجود ہے 'لقد رضی الله عن المومنین اذیبایعونك تحت الشجره 'اللہ تعالیٰ راضی ہو گیا ان لوگوں سے جو درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے۔ اب قرآن مجید کی اس گواہی کے بعد تو کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ ان کا درجہ کیا ہے۔

پھر وہ حضرات ہیں جو بیعت رضوان کے اس واقعہ کے بعد اور فتح مکہ سے پہلے اسلام میں داخل ہوئے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت ابو ہریرۃؓ اور ان صحابہ کرامؓ کی خاصی تعداد ہے جو بیعت رضوان کے بعد اور فتح مکہ سے پہلے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آ گئے اور اسلام میں داخل ہو گئے۔

گیارھواں درجہ ان حضرات کا ہے جن کو کہا جاتا ہے 'مسلمۃ الفتح'، جو فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے۔ مثلاً حضرت ابوسفیانؓ۔

بارھواں درجہ ان حضرات کا ہے جو بہت بچے تھے جب رسول اللہ ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے۔ اس لئے ان کو تبرکاً اور تیمناً صحابیؓ کہا جاتا ہے، جن کو یہ شرف حاصل ہے کہ ان کی آنکھوں نے حضور ﷺ کے چہرہ انور کا دیدار کیا۔ اس کے علاوہ کوئی اور ایسی بات نہیں جس سے وہ صحابہ کرامؓ کے کسی اور طبقہ میں شامل ہو سکیں۔

یہ بارہ درجات امام حاکم کے بیان کردہ ہیں۔ ان میں سے کہیں کہیں تھوڑی سی اوورلیپنگ اور تداخل بھی ہے۔ لیکن عمومی طور پر سمجھنے کے لئے امام حاکم نے یہ درجات بتائے ہیں۔ یہ صحابہ کرامؓ کے آپس میں فضیلت کے اعتبار سے درجات کا ایک عام یا مبہم اندازہ ہے۔ اصل درجہ تو اللہ کو معلوم ہے۔ اگرچہ بعض صحابہ کے بارے میں ہمیں یقین سے معلوم ہے کہ ان کا درجہ کیا ہے، مثلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ کا درجہ یا عشرہ مبشرہ کا درجہ باقی اصحاب رسولؐ سے اونچا ہے۔ لیکن بقیہ ایک لاکھ سے زیادہ جو صحابہ کرامؓ ہیں ان کے درجات کا یہ ایک مبہم سا اندازہ ہے۔ اور ایک ظنی بات ہے۔ اس میں تیقن یا قطعیت کے ساتھ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کو کرنا ہے۔

طبقات صحابہ کرام

اس درجہ بندی کے علاوہ محدثین نے صحابہ کرامؓ کے طبقات بھی بتائے ہیں۔ طبقات سے مراد زمانی اعتبار سے صحابہ کرامؓ کی عمروں کو سامنے رکھ کر اس بات کا تعین کرنا کہ کون سے صحابہ کرامؓ وہ ہیں جن سے کبار تابعین کو کسب فیض کرنے کا موقع ملا۔ کون سے صحابہ کرامؓ وہ ہیں جن سے اوساط تابعین کو کسب فیض کا موقع ملا اور کون سے صحابہ وہ ہیں جن سے صغار تابعین کو کسب فیض

کا موقع ملا۔ظاہر ہے کہ جن تابعین کو اکابر صحابہ سے کسب فیض کا موقع ملا، مثلاً اگر کسی تابعی نے سیدنا عمر فاروقؓ سے روایت نقل کی یا کسی تابعی نے صدیق اکبرؓ سے روایت نقل کی تو ان کے تابعی ہونے کا درجہ بھی بڑا ہوگا۔اس اعتبار سے صحابہ کرامؓ کے تین طبقات علماء حدیث نے بیان کیے ہیں۔

کبار صحابہ

سب سے پہلا یا سب سے اونچا اور بڑا درجہ کبار صحابہ کا ہے۔ان میں وہ صحابہ کرامؓ شامل ہیں جن کو ایک طویل عرصہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں گزارنے، آپؐ کی سنت کا مشاہدہ کرنے، آپ سے حدیث کو حاصل کرنے اور آپ کے زیر سایہ براہ راست اور مکمل تربیت حاصل کرنے کا موقع ملا۔ یہ کبار صحابہ ہیں جن میں خلفائے اربعہ، عشرہ مبشرہ اور امہات المومنین کے علاوہ مہاجرین کی بڑی تعداد شامل ہے۔ان میں انصار اور مہاجرین دونوں گروہوں سے حضورؐ کے قریب ترین وہ اصحاب شامل ہیں جو شب و روز آپؐ کے ساتھ رہے۔ظاہر ہے کہ ان کی تعداد تھوڑی ہے لیکن تیقن کے ساتھ گنتی کر کے بتانا دشوار ہے کہ کون سے صحابہ کبار صحابہ میں سے ہیں اور کون سے نہیں۔آخر میں کبار صحابہ اور اوساط صحابہ کے درمیان جو **Dividing Line** آئے گی وہاں تھوڑا سا اختلاف ہوگا اور وہاں حتمی اور قطعی طور پر یہ تعین کرنا دشوار ہوگا کہ یہ وہ لکیر ہے جو کبار صحابہ کو باقی صحابہ سے الگ کرتی ہے تو یہ لکیر کھینچنا بہت مشکل ہے۔البتہ اس تقسیم سے کبار صحابہ کے بارے میں ایک عمومی اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔

اوساط صحابہ

اس کے بعد اوساط صحابہ کا درجہ ہے۔ یہ وہ صحابہ ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی حیات ارضی میں اپنے ہوش وحواس میں تھے، نوجوان تھے، جن کو حضور ﷺ کو دیکھنے کے خاصے مواقع ملے، لیکن نوجوان اور کم سن ہونے کی وجہ سے اتنے قریبی اور خصوصی مواقع نہیں ملے جتنے مثلاً حضرت عمر فاروقؓ یا حضرت علیؓ کو ملے یا امہات المومنین کو ملے۔مثال کے طور پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا شمار مدینہ منورہ کے ابتدائی سالوں میں کم سن بچوں میں ہوتا تھا۔جب حضورؐ دنیا سے تشریف لے گئے تو ان کی عمر اکیس بائیس سال کے لگ بھگ تھی۔اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضورؐ

کے پاس دس سال کی عمر میں تشریف لائے، اس لئے ان جیسے نوعمر صحابہ کرام کا شمار کبار صحابہ میں تو نہیں ہوسکتا۔ لیکن دس سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر معمولی فہم، سمجھ بوجھ اور عقل و دانش سے نوازا تھا۔ انہوں نے تین سالوں میں اتنا کچھ حاصل کرلیا جتنا کہ بہت سے اور حضرات حاصل نہیں کر سکے۔ اس لئے ان کا شمار اوساط صحابہ میں ہے۔ جب حضورؐ کا انتقال ہوا تو حضرت عبداللہ بن عباس کی عمر تیرہ یا ساڑے تیرہ سال تھی۔ ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہیں، جب غزوہ احد ہوا تو جو صحابہ کرامؓ غزوہ احد میں شرکت کے لئے ہتھیار اور سامان جنگ لے کر نکلے۔ حضورؐ نے مدینہ سے باہر جا کر فوج کا معائنہ فرمایا۔ اس وقت ایک ہزار کے قریب شرکا تھے۔ بعض لوگوں کو آپؐ نے کم سن قرار دے کر واپس بھیج دیا۔ ان میں حضرات عبداللہ بن عمرؓ، ابوسعید خدریؓ اور چند اور حضرات شامل تھے۔ آپؐ نے ان سے کہا کہ تم ابھی کم سن ہو، جنگ میں شریک نہیں ہوسکتے اس لئے چلے جاؤ۔ وہ بہت بوجھل دل اور افسوس کے ساتھ واپس چلے گئے کہ حضورؐ کے ساتھ جہاد میں شرکت کی اس سعادت عظمیٰ کے حصول کا موقع نہیں ملا۔ اس وقت ان کی عمر کیا ہوگی؟ ظاہر ہے بارہ تیرہ یا چودہ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ ایسی عمر تھی کہ نہ ان کا شمار بچوں میں تھا نہ بڑوں میں۔ خود اپنی دانست میں یہ جنگ میں حصہ لینے کے اہل تھے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے از راہ شفقت اور از راہ مہربانی اور از راہ بزرگی ان کو اس کا اہل نہیں سمجھا کہ وہ جنگ میں شرکت جیسی اہم ذمہ داری انجام دے سکیں۔

یہ سارے حضرات جو غزوہ احد میں نو جوان تھے ان کو غزوہ خندق میں آپؐ نے شرکت کا موقع عطا فرمایا اور وہ اس میں شریک ہوئے۔ یہ اوساط صحابہ کہلاتے ہیں۔ ان میں سے متعدد حضرات نے لمبی عمر پائی اور جن کی عمر زیادہ طویل ہوئی زیادہ تر روایات انہی سے ہیں۔ تابعین نے زیادہ تر انہی حضرات سے استفادہ کیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، یہ اور ان کے ہم عمر حضرات اوساط صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔

صغار صحابہ

تیسرا طبقہ صحابہ کرامؓ میں صغار صحابہ کا ہے جو حضور ﷺ کی حیات کے زمانہ میں بہت بچے تھے اور ان کی جوانی کا زمانہ آپؐ کی حیات کے بعد شروع ہوا۔ مثلاً حضرات حسنینؓ سے کوئی

روایت منقول نہیں ہے۔ بہت عام قسم کی دو ایک باتیں ان سے منقول ہیں۔ مثلاً حضورؐ کے حلیہ مبارک کے بارے میں، آپؐ کے کسی عام طرز عمل کے بارے میں اکادکا روایت ہوگی۔ ورنہ عام طور پر ان حضرات سے کوئی روایت نہیں ہے۔ حضرت محمود بن لبیدؓ جن کا ذکر ہو چکا ہے، ابوالطفیل عامر بن واثلہ، یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا تو سہی لیکن روایت کرنے یا صحبت میں رہنے یا کوئی طویل استفادہ کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ ان کی اکثر روایتیں دوسرے صحابہ کرامؓ سے ہیں۔ یہ صحابیؓ ہوتے ہوئے بھی صحابہ سے روایت کرنے والے لوگ ہیں۔

ان طبقات سے یا زمانے کے اس تعین سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس صحابیؓ کا زمانہ کس زمانے تک آتا ہے۔ چونکہ صحابہ کے طبقات پر الگ الگ کتابیں بھی ہیں اور طبقات صحابہ میں مورخین اور محدثین نے زمانے کا تعین بھی کیا ہے اس لئے اس بات کا پتہ چلانا بہت آسان ہے کہ اگر کسی تابعی نے کسی صحابیؓ سے روایت کی ہو تو اس روایت کا درجہ کیا ہے اور وہ روایت ممکن بھی ہے کہ نہیں۔

صحابہ کرام کی کل تعداد

صحابہ کرامؓ کی تعداد ایک لاکھ سے اوپر ہے۔ بعض لوگوں نے یہ تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی ہے۔ بعض لوگوں نے کم وبیش بتائی ہے۔ ان تمام حضرات کی تعداد جن کو شرف صحابیت حاصل تھا وہ بہت زیادہ تھی۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار تو وہ تھے جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ 9 ذی الحجہ سن 10ھ کو میدان عرفات میں موجود تھے۔ بہت سے حضرات ایسے بھی ہوں گے جو اس موقع پر حج کے لئے حاضر نہیں ہو سکے ہوں گے، انہوں نے بھی اس سے پہلے یا بعد میں حضورؐ کو دیکھا ہوگا لہٰذا وہ بھی صحابیؓ ہیں۔ اس لئے صحابہ کی تعداد کے بارے میں قطعی طور پر کچھ کہنا تو بہت مشکل ہے۔ البتہ وہ صحابہ کرامؓ جن کے اسمائے گرامی معلوم ہوئے اور کسی نہ کسی اعتبار سے محدثین کے علم میں آئے ان کی تعداد امام ابوزرعہ رازی نے ایک لاکھ چودہ ہزار بتائی ہے۔ صحابہ کے جو تذکرے آج موجود ہیں، مثلاً 'الاستیعاب فی معرفة الاصحاب'، 'الاصابہ فی تمییز الصحابہ'، 'اسد الغابہ' اور 'طبقات ابن سعد' ان سب کتابوں میں جن صحابہ کرامؓ کا ذکر ہے ان کی مجموعی تعداد پندرہ بیس ہزار کے درمیان ہے۔ یہ وہ حضرات ہیں جن سے یا تو کوئی نہ کوئی

روایت منقول ہے یا سیرت سے متعلق کسی واقعہ میں ان کا ذکر آتا ہے۔ باقی صحابہ سے کوئی روایت منقول نہیں ہے۔ انہوں نے حضورؐ کو دیکھا ضرور لیکن ایسا کوئی موقع نہیں آیا کہ وہ کوئی روایت بیان کرسکیں۔

علم حدیث کا ایک طے شدہ اصول ہے کہ صحابہ کرامؓ سب کے سب عادل ہیں۔ لہٰذا کسی صحابیؓ کے عادل یا غیر عادل ہونے کے بارے میں بحث غیر ضروری ہے۔ یہ بحث تحصیل حاصل ہے۔ امام ابوزرعہ رازی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ 'اذا رأیت الرجل ینتقص احداً من اصحاب رسول اللہ ﷺ' جب تم کسی کو دیکھو کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں سے کسی کی تنقیص کررہا ہے، 'فاعلم انہ زندیق' تو جان لو کہ وہ زندیق ہے۔ یعنی بے دین اور دہریہ ہے۔ اس لئے کہ قرآن مجید صحابہ کرامؓ کے واسطے سے ہی ہم تک پہنچا۔ سنت کے ذخائر صحابہ کرامؓ ہی کے واسطے سے آئے۔ اگر صحابہ کرامؓ کا ایمان نعوذ باللہ مشکوک ٹھرا دیا جائے، صحابہ کرامؓ کے کردار اور عدالت پر چھینٹے اڑا دیئے جائیں تو پھر قرآن مجید بھی مشکوک ہے، حدیث بھی مشکوک ہے اور پورا دین مشکوک ہے۔ اس وجہ سے بالاتفاق محدثین، فقہائے اسلام اور مفسرین قرآن تمام صحابہ کرامؓ کو عادل قرار دیتے ہیں۔

صحابہ کرامؓ سے جو روایات آئی ہیں ان صحابہ اور ان روایات کے نقطہ نظر سے بھی صحابہ کرامؓ کے یہ تین طبقات ہیں۔

۱۔ ایک طبقہ وہ ہے جو کبار صحابہ سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن ان سے کوئی روایت منقول نہیں ہے۔ مثلاً حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جن کا تعلق صحابہ کے طبقہ اول کے بھی طبقہ اول سے ہے۔ لیکن ان سے کوئی روایت منقول نہیں ہے۔ ان کا انتقال مکہ مکرمہ میں ہوا اور ان کو کسی تابعی نے دیکھا ہی نہیں۔ ان کا سارا رابطہ صحابہ سے ہی رہا۔ ان صحابہ کرامؓ میں سے کسی کو سرورت ہی پیش نہیں آئی کہ سیّدہؓ سے کوئی روایت معلوم کرتا۔ صحابہ کرامؓ کا جو طبقہ زمانی اعتبار سے جتنا زیادہ متقدم تھا ان سے روایتیں اتنی ہی کم ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے روایتیں بہت ہی کم ہیں۔ مسند امام احمد کو آپ کھول کر دیکھ لیں، غالباً بیس پچیس صفحات سے زیادہ کی روایات نہیں ہوں گی۔

۲۔ زیادہ روایتیں ان صحابہ کرامؓ سے ہیں جن کا تعلق اوساط صحابہ یعنی متوسط طبقہ

سے ہے۔ یہ وہ حضرات ہیں جن کو حضورﷺ کے بعد طویل عرصہ تک زندگی گزارنے کا موقع ملا۔ ان میں چھ صحابہ کرامؓ سب سے نمایاں ہیں۔ جو مکثرین یعنی کثرت سے روایت بیان کرنے والے کہلاتے ہیں۔ سیدنا ابو ہریرہؓ، سیدنا عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت انس بن مالکؓ۔ ان صحابہ کرامؓ سے جو احادیث مروی ہیں وہ ہزاروں میں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی مرویات کی تعداد ایک ہزار یا اس سے اوپر ہے۔

۳۔ ان کے بعد درجہ آتا ہے ان چار صحابہ کرام کا جن کو عبادلہ کہا جاتا ہے۔ ان میں سے دو پہلے طبقہ میں بھی شامل ہیں۔ لیکن عبادلہ یعنی عبداللہ ہونے کی وجہ سے ان کو اس تیسرے طبقہ میں بھی شامل کیا گیا ہے۔ یہ بھی مکثرین کہلاتے ہیں۔ عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ۔ یہ عبادلہ اربعہ کہلاتے ہیں۔ بعض لوگ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو بھی ان میں شامل کرتے ہیں اور یوں یہ حضرات عبادلہ خمسہ کہلاتے ہیں۔ بہرحال یہ ایک اصطلاح ہے عبادلہ خمسہ اور اربعہ کی۔ یہ پانچ یا چار عبداللہ ہیں جو مکثرین میں سے ہیں جن سے بڑی تعداد روایات کی منقول ہے۔

۴۔ ان صحابہ کے علاوہ بھی کچھ صحابہ کرامؓ ہیں جن سے بڑی تعداد میں روایات منقول ہیں۔ لیکن ان کی روایات ایک ہزار سے کم ہیں۔ ان کے بارے میں حضرت مسروق جو صف اول کے تابعی ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ میں نے صحابہ کرامؓ کے علوم وفنون کا مطالعہ کیا اور ان پر غور کیا تو مجھے یہ پتہ چلا کہ صحابہ کرامؓ کے پاس قرآن پاک، سنت اور شریعت کا جو بھی علم تھا وہ سارے کا سارا سمٹ سمٹا کر چھ صحابہ میں جمع ہو گیا تھا۔ 'انتھیٰ علم الصحابه الی سته'، صحابہ کا علم سمٹ کر چھ صحابہ میں آ گیا، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت علی بن ابی طالبؓ، حضرت ابیؓ بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابو درداؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ۔ پھر ان چھ صحابہ کا علم جب میں نے دیکھا اور اس پر غور کیا تو وہ سمٹ کر دو حضرات کے پاس آ گیا۔ ایک حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور دوسرے حضرت علی بن ابی طالبؓ۔

امام مسروق کی یہ بات بڑی وزنی معلوم ہوتی ہے اور بڑے گہرے مطالعہ اور مشاہدہ پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ بعد میں جتنے محدثین ہمیں ملتے ہیں اور خاص طور پر جتنے فقہا ہمارے سامنے آتے ہیں، بالخصوص وہ فقہا جنہوں نے اپنے اپنے مکتب فکر مرتب فرمائے۔ جن کے اجتہادات اور

خیالات کو ان کے شاگردوں نے با قاعدہ طور پر علم کی شکل میں مرتب کر دیا اور جس کے نتیجہ میں مکاتب فکر وجود میں آئے، ان میں سے اکثر وبیشتر کے علم کا زیادہ تر دارومدار انہی دو صحابہ کے علم پر ہے۔ حضرت علی بن ابی طالبؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، یا تو براہ راست ان دو صحابہ پر یا کسی واسطے سے ان صحابہ پر جن پر ان سے پہلے علم جمع ہوا تھا یعنی چھ صحابہ۔

مثال کے طور پر امام مالک مدینہ منورہ میں قیام فرماتے تھے۔ ان کی پوری زندگی مدینہ منورہ میں گزری۔ مدینہ منورہ میں ان کو کسب فیض کرنے کا سب سے زیادہ موقع ان تابعین سے ملا جن تابعین نے مدینہ منورہ کے صحابہ کرامؓ سے کسب فیض کیا تھا۔ مدینہ منورہ میں تابعین نے جن صحابہ سے کسب فیض کیا ان میں دو نام بڑے نمایاں ہیں، ایک حضرت عمر فاروقؓ اور دوسرے حضرت علی بن ابی طالبؓ۔ حضرت علیؓ کوفہ میں گزارے ہوئے زندگی کے آخری چار پانچ سالوں کے علاوہ پوری زندگی مدینہ منورہ میں رہے۔ امام مالک کی روایات آپ دیکھیں تو اکثر روایات میں ہے مالك عن نافع عن ابن عمرؓ، یا مالك عن ابن شهاب اور ابن شہاب کے اساتذہ اور پھر مدینہ منورہ کے صحابہ کرامؓ، مالك عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی هريرةؓ، امام مالک کے استاد تھے ابوزناد، امام مالک روایت کرتے ہیں مالك عن ابی الزناد عن الاعرج ۔عبدالرحمٰن بن الاعرج ان کے ایک استاد تھے غالباً پاؤں میں کوئی تکلیف تھی تو عرف عام میں اعرج کہلاتے تھے۔ اس طرح سے مدینہ کا جتنا علم تھا وہ حضرت علیؓ، حضرت عمر فاروقؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ کے ذریعہ سمٹ کر امام مالکؒ تک پہنچا اور امام مالک کا مکتب فکر وجود میں آ گیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ایک طویل عرصہ تک کوفہ میں رہے۔ حضرت علیؓ بھی کوفہ تشریف لے گئے۔ انؓ کا اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا علم جو کوفہ میں سمٹا وہ ان تابعین تک پہنچا جنہوں نے ان دو شخصیات سے کسب فیض کیا۔ ان تابعین میں پھر دو نامور حضرات بہت نمایاں ہیں: حضرت علقمہ اور حضرت اسود نخعی۔ ان دونوں کا علم سمٹ سمٹا کر حضرت امام ابوحنیفہؒ تک آ گیا۔ عبداللہ بن مسعودؓ کا علم علقمہ تک، علقمہ کا علم ابراہیم نخعی تک، ابراہیم نخعی کا علم حماد بن سلیمان تک، حماد بن سلیمان کا علم امام ابوحنیفہ تک۔ پھر امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ نے اس پر کتابیں مرتب کر دیں، پوری پوری لائبریریاں لکھ کر پیش کر دیں اور یوں ایک مکتب فکر بن گیا۔

پھر وہ حضرات ہیں جنہوں نے کوفہ اور مدینہ منورہ دونوں کے اہل علم سے استفادہ کیا اوران دو روایتوں یعنی مدینہ اور کوفہ کی روایات کو جمع کیا۔ مدینہ اور کوفہ یعنی عراق کی روایت کو جس شخصیت نے جمع کیا وہ امام شافعی تھے۔ امام شافعی کے ہاں یہ دونوں روایتیں جمع ہوگئیں۔ امام شافعی نے طویل عرصہ تک مکہ مکرمہ میں رہ کر وہاں کے علما سے کسب فیض کیا۔ اس کے بعد وہ مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ مدینہ منورہ میں انہوں نے امام مالکؒ سے کسب فیض کیا۔ امام مالکؒ سے کسب فیض کرنے کے بعد وہ عراق گئے اور وہاں امام محمدؒ اور عراق کے بقیہ علماء سے سے کسب فیض کیا جن کے پاس حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا علم تھا۔ اس طرح سے وہ دو روایتوں کے جامع بن گئے تو ایک تیسرا مکتب فکر وجود میں آ گیا۔

پھر امام شافعیؒ سے جن حضرات نے کسب فیض کیا ان میں بعض لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کی طرف سے ان دونوں روایتوں کے جمع کرنے سے اہل علم کا ایک طبقہ سامنے آیا ہے جس کا زیادہ زور عقلیات اور رائے پر ہے۔ لہٰذا عقلیات اور رائے کے ساتھ ساتھ احادیث اور سنت پر دوبارہ سے زور دینے کی ضرورت ہے۔ دوبارہ زور دینے کی اس ضرورت کا احساس جب پیدا ہوا تو امام احمد بن حنبلؒ کا مکتب فکر وجود میں آیا۔ ان چار مثالوں سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ جو مکاتب فکر وجود میں آئے ہیں یہ ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور نہ صرف یہ کہ الگ نہیں کیا جاسکتا بلکہ جن صحابہ کرامؓ کے علمی اثرات اور اجتہادی بصیرت اور غور وفکر کے نتیجہ میں یہ مکاتب فکر وجود میں آئے وہ آپس میں اس طرح مربوط ہیں کہ ایک دوسرے سے کسب فیض کرتے ہیں اور سب کا علم چھن چھن کر ایک جگہ پہنچتا ہے۔

صحابہ کرامؓ پر یہ مباحث ایک پورے فن کا موضوع ہے۔ اس پر کتابیں ہیں۔ درجنوں کتابیں کئی کئی جلدوں میں لکھی گئیں جن کا انتہائی مختصر ترین خلاصہ بلکہ خلاصہ کا خلاصہ یہ ہے جو میں نے آپ کے سامنے رکھا۔

تابعی کی تعریف

جس طرح صحابہ کرامؓ پر بحث ہوئی اسی طرح سے تابعین پر بھی بحث ہوئی۔ تابعین

کے طبقات اور مراتب پر بھی بات ہوئی۔ جو درجہ صحابہ کرامؓ کا بعد والوں کے لئے ہے وہی درجہ تابعین کا بھی بعد والوں کے لئے ہے۔ تابعی کی تعریف وہی ہے جو صحابیؓ کی تعریف ہے۔ تابعی سے مراد وہ خوش نصیب شخصیت ہے جس نے حالت ایمان میں کسی صحابیؓ رسول کی زیارت کی ہو، اسی حالت ایمان پر زندہ رہے ہوں اور اسی حالت ایمان پر انتقال کر گئے ہوں، ایسے خوش نصیب حضرات تابعی کہلاتے ہیں۔ لہٰذا ایسے لوگ اس تعریف سے نکل جاتے ہیں جو پہلے تابعی ہوئے اور بعد میں خدانخواستہ اسلام سے پھر گئے اور پھر دوبارہ اسلام قبول کیا۔ اگرچہ ایسے لوگ ہیں نہیں، لیکن ایسے کسی شخص کے وجود کا کم از کم ایک نظری امکان موجود ہے، اگر کوئی ایسا آدمی رہا ہو جو بعد میں اسلام سے پھر گیا ہو اور اسی پھرنے کی حالت میں انتقال کر گیا ہو یا ایسے وقت میں مسلمان ہو گیا ہو جب تابعین دنیا سے اٹھ گئے تھے تو اس کا شمار تابعین میں نہیں ہوگا۔ حدیث کے راویوں کی حد تک ایسا کوئی آدمی غالباً موجود نہیں ہے۔

طبقات تابعین

امام حاکم نے تابعین کے پندرہ طبقات بتائے ہیں۔ اس لئے کہ تابعین کا زمانہ خاصا طویل ہے۔ صحابہ کرامؓ میں تو ایک یا دو نسلیں ہیں جبکہ تابعین میں بہت سی نسلیں ہیں۔ ایک نسل وہ جو حضور ﷺ کے زمانے میں خاصی پختہ عمر کو پہنچ گئی تھی لیکن اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ بعض لوگ ایسے بھی تھے جو اسلام میں تو داخل ہو گئے تھے لیکن مدینہ منورہ سے باہر رہنے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی زیارت کا موقع نہیں ملا، جیسے حضرت صنابحی کا میں نے ذکر کیا۔ وہ طویل عرصہ پہلے اسلام قبول کر چکے تھے اور کوشاں تھے کہ جلد از جلد مدینہ منورہ حاضری ہو اور حضور ﷺ کی خدمت میں کچھ دن گزاریں۔ جب بندوبست کر کے نکلے اور بڑے اہتمام سے مدینہ منورہ میں داخل ہو رہے تھے تو اطلاع ملی کہ رسول اللہ ﷺ انتقال فرما چکے ہیں اور آپ کی تدفین بھی مکمل ہو گئی ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت عمر فاروقؓ کی ایک روایت ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ خواجہ اویس قرنی ایک تابعی تھے جن کو حضور ﷺ سے دلی محبت تھی اور ان کی اس محبت اور جذبہ صادق کا حضور ﷺ کو علم تھا۔ آپؐ نے حضرت عمر فاروقؓ کو بتایا۔ یہ وہ تابعین ہیں جو عمر کے اعتبار سے اس درجہ کے تھے کہ اگر وہ صحابیؓ ہوتے تو شاید ان کا شمار اوساط صحابہ میں یا ممکن ہے کہ کبار صحابہ میں بھی

ہوتا۔لیکن کسی وجہ سے ان کو قبول اسلام کا موقع نہیں ملا، اس لئے تابعین میں شمار ہو گئے۔ ان کا انتقال ظاہر ہے جلد ہو گیا۔ یہ تابعین کی پہلی نسل تھی اور آخری نسل وہ تھی جنہوں نے کم سنی میں صغار صحابہ کو دیکھا۔ آخری صحابیؓ جن کی وفات 110ھ میں ہوئی ان کو اگر کسی تابعی نے پانچ چھ سال کی عمر میں دیکھا ہو اور ان کی عمر سو سال یا ایک سو پانچ سال ہوئی ہو، جو کہیں کہیں ہو جاتی ہے۔ ہر قوم اور ہر علاقے میں دو چار فی ہزار ایسے لوگ تو ہوتے ہیں جن کی عمر سو سال یا زیادہ ہو۔ تو اگر ایسے کچھ لوگ ہوں تو وہ تابعی ہو جائیں گے۔اس طرح تابعین کا زمانہ کم وبیش 210ھ تک آجاتا ہے۔ یہ زمانہ نسبتاً لمبا ہے اور صحابہ کا زمانہ نسبتاً چھوٹا ہے۔تابعین کا زمانہ کم وبیش 110 سال طویل ہے۔صحابہ کا زمانہ سو سال کے لگ بھگ طویل ہوگا۔اس لئے تابعین کے طبقات زیادہ ہیں اور صحابہ کے طبقات کم ہیں۔تابعین کے یہ پندرہ طبقات ان کے درجات کے حساب سے ہیں۔

تابعین کے درجات

فن روایت کے نقطہ نظر سے صحابہ کی طرح تابعین کے بھی تین درجات ہیں۔سب سے بڑا درجہ کبار تابعین کا ہے۔ کبار تابعین سے مراد وہ لوگ ہیں 'الذین یروون عن کبار الصحابه' جو کبار صحابہ سے روایت کرتے ہیں، وہ کبار تابعین کہلاتے ہیں۔کبار تابعین میں ایک شخصیت ایسی بھی ہے جس کو ایسا شرف حاصل ہے جو کسی اور تابعی کو حاصل نہیں ہے۔شاید کسی صحابیؓ کو بھی حاصل نہ ہو۔ وہ ہیں حضرت قیس بن ابی حازمؒ، یہ تمام عشرہ مبشرہ سے روایت کرتے ہیں۔اگر کوئی ایک شخص ایسا ہے جس کے اساتذہ میں عشرہ مبشرہ کے تمام کے تمام صحابہ شامل ہوں تو وہ قیس بن حازمؒ ہیں۔ یہ واحد تابعی ہیں جو تمام عشرہ مبشرہ سے روایت کرتے ہیں۔ یہ بات امام حاکم نے اپنی کتاب میں لکھی ہے۔

اس کے بعد اوساط تابعین ہیں جو بقیہ صحابہ سے روایت کرتے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ ان کی روایت کبار تابعین سے بھی ہے۔ جن کی روایت اکثر وبیشتر کبار تابعین سے ہے اور کبار صحابہ کے علاوہ جو بقیہ صحابہ کرامؓ ہیں ان سے بھی روایت کرتے ہیں۔

صغار تابعین وہ ہیں جنہوں نے صغار صحابہ کو دیکھا ہے اور اوساط تابعین سے روایت کی ہے۔ان میں سے بعض حضرات کی اکا دکا روایت بھی صغار صحابہ سے منقول ہے اور ثابت ہے۔ان

میں امام ابوحنیفہ بھی شامل ہیں جنہوں نے صغار صحابہ کو دیکھا تو ہے اور اس پر سب محدثین متفق ہیں، لیکن کیا روایت بھی کی ہے؟ اس کے بارے میں اختلاف ہے کہ ان کو صغار صحابہ سے روایت حاصل ہے کہ نہیں ہے۔

یہ زمانہ ایک سو اسی سال سے دو سو دس سال تک کے لگ بھگ بنتا ہے۔ تابعین کو بھی بڑا درجہ حاصل ہے۔ ان کا درجہ ایک حدیث سے بھی ثابت ہے اور قرآن مجید سے بھی ثابت ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ سورۃ التوبہ میں آتا ہے 'السابقون الاولون من المهاجرين والانصار والذين اتبعوا هم باحسان'، سب سے اونچا درجہ ان السابقون الاولون کا ہے جو مہاجرین اور انصار میں سے ہوں اور پھر ان لوگوں کا جنہوں نے ان کی پیروی کی اچھائی اور احسان کے ساتھ۔ اگر چہ یہاں اصطلاحی تابعین مراد نہیں ہیں۔ ان وہ میں صحابہ بھی شامل ہیں جو سابقون الاولون کے بعد آئے۔ لیکن چونکہ آیت میں اتبعوهم کا لفظ ہے تو لغتاً اس میں تابعین بھی شامل ہیں۔ ایک عمومی معنی کے اعتبار سے اس میں تابعین شامل ہو جاتے ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بالواسطہ طور پر قرآن مجید میں تابعین کا ذکر موجود ہے۔ غیر تابعین بھی جزواً اور مجازاً اس میں شامل ہو جائیں گے۔ ہر وہ شخص جس نے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کا اتباع کیا وہ اس میں شامل ہے۔ لیکن چونکہ لفظ اتبعوهم آیا ہے اس لئے بہت سے لوگوں نے اس میں تابعین کو بھی شامل کیا ہے۔

تابعین کی فضیلت اور شرف کا ذکر ایک حدیث میں بھی ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ 'خير القرون قرني ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم' بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر وہ زمانہ جو میرے بعد آئے پھر وہ زمانہ جو اس کے بعد آئے۔ اس حدیث کی تعبیر مین تھوڑا سا اختلاف ہے۔ ایک تو یہ کہ جو پہلا ثم الذين يلونهم ہے، یہ دور صحابہ ہے اور جو دوسرا ثم الذين يلونهم ہے یہ دور تابعین ہے۔ مجھے ذاتی طور پر اس کی دوسری تشریح بہتر معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ خير القرون قرني سے مراد صحابہ کرامؓ کا زمانہ ہے۔ بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے۔ اس لئے کہ صحابہ کا زمانہ حضورؐ ہی کے زمانہ مبارک کی توسیع ہے۔ صحابہ نے حضورؐ کے زمانہ میں تربیت پائی، آپؐ کے تلامذہ تھے، آپؐ ہی سے کسب فیض کیا، حضورؐ کی سنتوں کو آگے پہنچایا، رسول اللہ ﷺ نے جو بہت سے کام شروع فرمائے صحابہ نے ان کی تکمیل فرمائی۔ جن کاموں کا حضورؐ نے حکم دیا، یا

قرآن پاک میں پیشین گوئی آئی ان کی تکمیل صحابہ کرامؓ کے ہاتھوں ہوئی۔اس لئے 'قرنی' جس کو حضورؐ نے اپنا زمانہ کہا وہ دراصل صحابہ کرامؓ کا زمانہ ہے۔ ثم الذین یلونھم پھران کا زمانہ جوان کے بعد آئیں گے۔ یلونھم میں ضمیر جمع کی ہے جس سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔اگر حضورؐ کا اپنا زمانہ مراد ہوتا تو آپؐ فرماتے کہ ثم الذین یلونی، پھر وہ لوگ جو میرے بعد آئیں گے۔ لیکن آپؐ نے ایسا نہیں فرمایا بلکہ فرمایا: ثم الذین یلونھم۔گویا اس میں قرنی سے مراد صحابہ کا زمانہ ہے، اسی لئے آپ نے جمع کی ضمیر کا استعمال فرمایا ہے۔ ثم الذین یلونھم پھران کا زمانہ جو ان کے بعد آئیں گے یعنی تبع تابعین۔تو پہلا یلونھم تابعین اور دوسرا یلونھم تبع تابعین کے متعلق ہوا۔

ایک بزرگ نے ایک لطیف نکتہ کے طور پر لکھا کہ قرنی سے دور صحابہ مراد ہے۔اس کے شواہد میں سے ایک چیز یہ بھی ہے کہ چاروں خلفائے راشدین کے ناموں کا مخفف بھی آگیا ہے۔ق سے صدیق، ر سے عمر، ن سے عثمان، ی سے علی۔خلفائے راشدین کے ناموں کے آخری حروف لیں تو قرنی بنتا ہے۔یہ محض ایک نکتہ ہے۔اگر آپ کا جی چاہے تو اتفاق کریں اور نہ چاہے تو نہ کریں۔لیکن خود حدیث کے الفاظ یلونہم سے بھی یہ اشارہ ملتا ہے کہ اس سے مراد صحابہ کا دور ہے۔اس لئے کہ وہ حضورؐ ہی کے دور کی ایک توسیع اور تکملہ ہے۔

اس پر بڑی بحث ہوئی ہے کہ تابعین میں سب سے افضل شخصیت کون ہیں۔اگر کسی ایک شخصیت کو منتخب کرنا ہو تو سب سے افضل تابعی کس کو قرار دیا جائے گا۔اصل بات تو یہ ہے کہ اس بارہ میں ہم قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔اللہ تعالیٰ ہی اس کا فیصلہ کرے گا۔کچھ حضرات نے کہا کہ افضل ترین تابعی حضرت قیس بن ابی حازمؒ ہیں جنہوں نے عشرہ مبشرہ سے روایت کی ہے۔ تاہم بہت بڑی تعداد میں علمائے حدیث کا کہنا ہے کہ افضل التابعین حضرت سعید بن المسیب ہیں جنہوں نے طویل عرصہ تک حضرت ابو ہریرۃؓ سے اور دیگر بہت سے صحابہ کرامؓ سے کسب فیض کیا۔ بعض کا خیال ہے کہ افضل التابعین یا سید التابعین حضرت اویس قرنی ہیں جن کا ذکر صحیح مسلم میں ہے اور رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے ان کا نام آیا ہے۔کچھ کا خیال ہے کہ حضرت عطا بن ابی رباحؒ افضل التابعین ہیں جو مکہ مکرمہ میں سالہا سال قرآن اور حدیث کا درس دیتے رہے اور مکہ مکرمہ میں رہنے والے صحابہ کرامؓ کی بڑی تعداد سے انہوں نے کسب فیض کیا۔کچھ کا خیال ہے

کہ افضل ترین تابعی حضرت قاسم بن محمدؒ ہیں جو سیدنا صدیق اکبرؓ کے پوتے اور ان کے بیٹے حضرت محمد بن ابوبکرؓ کے صاحبزادے ہیں۔ کچھ کا کہنا ہے کہ افضل ترین تابعی حضرت عروہ بن زبیرؒ ہیں جو حضرت عائشہؓ کے بھانجے ہیں جنہوں نے حضرت عائشہؓ سے بہت کسب فیض کیا اور جنہوں نے اسلام کی تاریخ میں سب سے پہلے سیرت پر کتاب لکھی ہے۔ سیرت پر سب سے پہلا علمی کام انہوں نے کیا جس میں انہوں نے اپنی خالہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایات سن کر جمع کیں اور ان کو ایک کتاب کی صورت میں مرتب کیا۔ وہ اپنی خالہ کے پاس جایا کرتے تھے، ان کے ہاں رہا کرتے تھے، خالہ نے ان کو بچپن سے رکھا اور ان کی تربیت کی اس لئے ان کے پاس جو علم تھا وہ بہت کم لوگوں کے پاس ہوسکتا ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ حضرت حسن بصریؒ افضل التابعین ہیں کچھ کا خیال ہے کہ محمد بن سیرینؒ افضل التابعین ہیں۔ کچھ کا خیال ہے کہ حضرت ابو ادریس الخولانیؒ ہیں۔ ابوادریس الخولانی کا معاملہ بھی بالکل اسی طرح کا ہے جو حضرت عبدالرحمٰن الصنابحیؒ کا ہے۔ وہ حضورؐ کے زمانے میں اسلام لا چکے تھے لیکن مدینہ منورہ آنے کا موقع نہیں ملا۔ جب مدینہ منورہ آنے کا موقع ملا تو حضورؐ دنیا سے تشریف لے جا چکے تھے۔ اس لئے عمر کے اعتبار سے تو وہ صحابہ کرامؓ کے ہم سن تھے، البتہ منصب اور درجہ کے اعتبار سے وہ تابعین کے ہم سر ہیں۔

تابعی اور تبع تابعی کا تعین

یہ سارے معاملات کہ تابعین اور تبع تابعین کا تعین کیسے ہو۔ ان کا دارومدار اکثر و بیشتر ایک خاص فن پر ہے، جس پر علمائے حدیث نے بہت کام کیا۔ وہ ہے تواریخ الرواۃ، یہ ویسے تو ایک ہلکا اور مختصر موضوع معلوم ہوتا ہے لیکن یہ موضوع جلد ہی اتنا پھیل گیا اور اس پر اتنا مواد جمع ہو گیا کہ محدثین نے اس پر الگ الگ کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب کے بعد دوسری، پھر تیسری، پھر چوتھی۔ ایک بہت اہم کتاب اس موضوع پر امام بخاری کی کتاب التاریخ الکبیر ہے جو غالباً آٹھ جلدوں میں ہے۔ اس کے علاوہ اور لوگوں کی بھی اس پر کتابیں ہیں جن میں انہوں نے یہ پتہ چلانے کی کوشش کی کہ کن تابعی کا انتقال کس سن میں ہوا، کن تبع تابعی کا انتقال کس سن میں ہوا اور تبع تابعین کے شاگردوں میں کس کا انتقال کس سن میں ہوا۔ یہ بات جاننا اس لئے ضروری ہے کہ احادیث اور سندوں کی تحقیق میں بہت سے معاملات ایسے پیش آئے کہ اس تعین سے کسی

حدیث کے قابل قبول یا ناقابل قبول ہونے کا اندازہ ہوگیا۔

غالباً علامہ ابن الجوزی کے زمانے میں جو چھٹی صدی ہجری کا زمانہ ہے، شام کے کچھ یہودی کوئی دستاویز لے کر عباسی خلیفہ کے پاس آئے۔ دستاویز کافی پرانی معلوم ہوتی تھی۔ قدیم خط میں لکھی ہوئی تھی۔ انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ وہ دستاویز ہے جو رسول اللہ ﷺ نے فتح خیبر کے موقع پر ہمیں دی تھی۔ اس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ ہمیں فلاں فلاں معاملات سے مستثنیٰ کردیا جائے گا۔ بہت سی مراعات کا اس میں ذکر تھا اور دعویٰ کیا گیا تھا کہ حضورؐ نے یہ یہ مراعات ہمیں دی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ مراعات حضورؐ کے زمانے تک ہمیں حاصل رہیں۔ لیکن بعد میں جب ہمیں خیبر سے جلاوطن کرکے شام بھیجا گیا تو یہ مراعات بھی ہم سے لے لی گئیں۔ لہٰذا آپ یہ مراعات ہمیں دوبارہ دیں۔ خلیفہ وقت نے وہ دستاویز اس زمانے کے سب سے بڑے محدث علامہ عبدالرحمٰن ابن الجوزی (جو صف اول کے محدثین میں سے تھے۔) کو بھیجی کہ بتائیں اس دستاویز کے بارے میں کیا فیصلہ کیا جائے؟ انہوں نے دستاویز سامنے رکھی اور اسے دیکھا تو پہلی ہی نظر میں معلوم ہوگیا کہ جعلی ہے۔ انہوں نے خلیفہ کو خط لکھا کہ یہ دستاویز جعلی ہے۔ لوگوں نے بڑی حیرت کا اظہار کیا کہ حضور ﷺ سے منسوب ایک دستاویز آئی ہے، خاصی پرانی ہے جس پر صحابہ کرامؓ کی گواہیاں ہیں اور آپ نے ایک ہی نظر دیکھنے کے بعد کہہ دیا کہ جعلی ہے۔ خلیفہ نے علامہ ابن الجوزی کو بلایا کہ ذرا تشریف لائیے۔ وہ آئے تو پوچھا کہ آپ کس بنیاد پر یہ بات کہہ رہے ہیں کہ دستاویز جعلی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس دستاویز میں لکھا ہوا ہے کہ اس کے گواہان میں حضرت معاویہؓ اور حضرت سعد بن معاذؓ بھی شامل ہیں اور دعویٰ یہ کیا جارہا ہے کہ یہ دستاویز رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کو فتح خیبر کے موقع پر عطا کی۔ غزوہ خیبر سن 6ھ میں ہوا تھا۔ سن 6ھ تک حضرت معاویہؓ اسلام قبول کرکے مدینہ منورہ نہیں آئے تھے۔ وہ فتح مکہ سے پہلے اور صلح حدیبیہ کے بعد اسلام لانے والے صحابہ میں سے ہیں۔ غزوہ خیبر کے وقت حضرت معاویہؓ مسلمان ہی نہیں ہوئے تھے لہٰذا اس وقت ان کا خیبر جانا اور اس معاہدہ پر بطور صحابی رسول مسلمانوں کی طرف سے دستخط کرنا خارج از امکان ہے۔ اسی طرح حضرت سعد بن معاذؓ کا انتقال غزوہ احد کے وقت ہوگیا تھا۔ وہ غزوہ احد میں شدید زخمی ہوگئے تھے اور اس کے فوراً بعد انہی زخموں کی وجہ سے کچھ ہی دن میں ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ وہ بھی غزوہ خیبر کے موقع پر اس وقت دنیا میں موجود نہیں تھے، لہٰذا ان

دو جعلی گواہیوں سے پتہ چلا کہ دستاویز جعلی ہے۔ یہ فائدہ ہے صحابہ کرامؓ، تابعین اور تبع تابعین اور بقیہ راویوں کے سن پیدائش اور سن وفات کا تعین کرنے کا۔

امام سفیان ثوری جو بڑے مشہور محدث ہیں وہ یہ کہتے ہیں (اور یہ قول کئی کتابوں میں نقل ہوا ہے) کہ 'لما استعمل الرواۃ الکذب' جب راویوں نے جھوٹ سے کام لینا شروع کیا 'استعملنا لھم التاریخ' تو ہم نے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے تاریخ کا استعمال شروع کر دیا۔ یعنی ہمیں تاریخ کے استعمال سے پتہ چل جاتا ہے کہ کون کس زمانے میں زندہ تھا اور اس سے کس کی روایت ممکن ہے اور کس کی روایت ممکن نہیں ہے۔

حضرت خالد بن معدان مشہور تابعی ہیں، ان کی وفات 104ھ میں ہوئی تھی، ان سے ایک صاحب نے کوئی حدیث روایت کی اور دعویٰ کیا کہ سن 108ھ میں آرمینیا کی جنگ میں میں نے ان سے یہ حدیث لی تھی۔ ایک مجلس میں ایک صاحب احادیث بیان کررہے تھے۔ دوران روایت انہوں نے بیان کیا کہ مجھ سے ایک بڑے ثقہ راوی نے یہ اور یہ بیان کیا ہے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ یہ ثقہ راوی کون ہیں۔ انہوں نے پھر کہا کہ ثقہ راوی نے بیان کیا ہے۔ بار بار اصرار کیا گیا کہ اس ثقہ راوی کا نام بتائیں۔ تو انہوں نے کہا کہ خالد بن معدان نے بیان کیا تھا۔ پوچھنے والے نے پوچھا کہ آپ نے کس سن میں ان سے یہ روایت لی تھی؟ انہوں نے بتایا کہ 108ھ میں۔ پوچھا گیا: کس جگہ؟ تو انہوں نے بتایا کہ وہ آرمینیا کی جنگ میں شریک تھے۔ جو محدث یہ سوالات کررہے تھے انہوں نے کہا کہ یہ روایت سراسر جعلی ہے، اس لئے کہ خالد بن معدان کا انتقال 104ھ میں ہوگیا تھا اور وہ آرمینیا کی جنگ میں نہیں بلکہ روم کی جنگ میں شریک ہوئے تھے۔

ایک اور راوی تھے ابوخالد السقاء، انہوں نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے حضرت انسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے۔ یہ دعویٰ انہوں نے سن 209ھ میں کیا۔ امام ابُونعیم اصفہانی جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے، وہ وہاں موجود تھے۔ انہوں نے پوچھا کہ آپ کی عمر کیا ہے۔ ابوخالد انہوں نے جواب دیا کہ 125 سال ہے۔ حضرت ابونعیم نے کہا کہ پھر آپ کی پیدائش سے پانچ سال پہلے حضرت عبداللہ بن عمرؓ وفات پا چکے تھے۔ ویسے بھی 209ھ بہت ہی صغار تابعین کا زمانہ ہے۔ یہ اوساط تابعین کا زمانہ نہیں ہے۔ تابعین کا زمانہ صحابہ کرامؓ کے زمانے سے کم وبیش اسی نوے سال کے بعد تک کا ہے۔ صحابہ کا آخری دور 110ھ تک ہے۔ اس کے بعد اسی یا نوے سال

لگائیں تو تقریباً 190 یا 200 ھ کے لگ بھگ بیشتر تابعین کا زمانہ ختم ہو گیا۔

ان معلومات کا بیشتر ذخیرہ امام بخاری، حضرت علی بن المدینی، ابوحاتم رازی اور امام نسائی کی کتابیں ہیں۔ان میں سب سے بڑا ماخذ حضرت امام بخاری کی کتاب التاریخ الکبیر ہے جو آٹھ جلدوں میں ہے۔

ان راویوں کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کا تعین کرنے کے ساتھ ساتھ اور ان کے ضبط، حافظہ، عدالت اور کردار کا تعین کرنے کے ساتھ ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی پیدا ہوا کہ ان کی رشتہ داریوں پر بھی بحث کی جائے اور یہ پتہ چلایا جائے کہ کون کس کا بھائی تھا اور کون کسی کی بہن تھی وغیرہ وغیرہ۔اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اگر ایک راوی، مثلاً ایک تابعی راوی کے دو بیٹے ہوں۔ایک بیٹا بہت باکردار اور سچا راوی ہو اور دوسرا بیٹا اس درجہ کا نہ ہو، اور روایت اس طرح کی جائے کہ ابن فلاں نے روایت کی تو یہ جاننا بہت ضروری ہوگا کہ یہاں ابن فلاں سے کون سا بیٹا مراد ہے۔ پہلا بیٹا مراد ہے کہ دوسرا بیٹا مراد ہے۔اگر ایک ہی بیٹا ہے تو پھر تو ابن فلاں کی روایت قبول کرنے میں کوئی شک اور تامل نہیں ہے۔لیکن اگر دو بیٹے ہیں تو پھر تحقیق کرنی پڑے گی کہ کون سے بیٹے کی روایت ہے اور اس بیٹے کا درجہ کیا تھا۔اس تحقیق کی ضرورت وہاں ہوگی جہاں یہ ثابت ہو جائے کہ کسی راوی کے دو یا تین یا چار بیٹے تھے۔ یہی حال بہنوں کا ہے۔ مثلاً عمرہ بنت عبدالرحمٰن ایک انتہائی مستند راویہ ہیں۔انہوں نے احادیث کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا تھا۔عمرہ بنت عبدالرحمٰن سے روایت کرنے والی ان کی صاحبزادی ہوں، مثال کے طور پر فرض کریں کہ ان کی دو بیٹیاں ہوں اور آپ کے پاس آکر کوئی کہے کہ بنت عمرہ نے یہ روایت کی ہے۔اب بنت عمرہ سے مراد کون سی بیٹی ہے؟ وہ بیٹی جس کا حافظہ اور کردار اچھا تھا یا وہ بیٹی جس کا حافظہ اچھا نہیں تھا۔اس تحقیق کی ضرورت تب پیش آئے گی جب یہ پتہ ہو کہ عمرہ کی دو صاحبزادیاں راویات تھیں۔اس موضوع پر امام مسلم نے ایک کتاب لکھی تھی علم الاخوہ و الاخوات۔امام ابوداؤد نے، امام نسائی نے اور امام بخاری کے استاد علی بن المدینی نے بھی اس موضوع پر الگ سے کتابیں لکھیں۔

ایک اور چیز جس کا مختصر تذکرہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔ وہ حدیث ضعیف کی تفصیل، واقفیت اور معرفت ہے۔علم حدیث میں جو مشکل ترین میدان ہے وہ حدیث ضعیف کا تعین ہے۔

محدثین نے حدیث ضعیف کے بہت سے درجات بتائے ہیں۔ بعض حضرات بیالیس یا تنتالیس درجات بتاتے ہیں۔ بعض نے چونسٹھ پینسٹھ اور بعض نے اس سے بھی زیادہ بتائے ہیں۔ چالیس سے لے کر سو کے قریب قسمیں حدیث ضعیف کی بتائی گئی ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کے الگ احکام ہیں اور ہر ایک کا الگ درجہ ہے۔ لیکن ایک بات پر سب متفق ہیں کہ 'مراتب الضعف متفاوتة' کہ ضعف کے درجات متفاوت ہیں۔ یعنی ان احادیث میں ضعف کے اعتبار سے کمی بیشی ہوسکتی ہے۔ ایک ضعف کم درجہ کا ہوگا، دوسرا ضعف زیادہ درجہ کا ہوگا۔ زیادہ ضعف میں بھی پھر کئی درجات ہوسکتے ہیں۔ بعض اوقات کسی حدیث میں ضعف کا ایک سبب ہوگا، بعض اوقات ایک سے زائد اسباب ہوں گے۔ کچھ اسباب ہلکے ہوں گے اور کچھ سنجیدہ قسم کے ہوں گے۔ اس لئے اسباب ضعف اور مراتب پر بھی بحث ضروری ہے۔ ان میں سے بعض پہلوؤں کا اختصار کے ساتھ بیان میں کر چکا ہوں۔ اب دوہرانے کی ضرورت نہیں۔

ضعیف حدیث پر عمل

کیا حدیث ضعیف پر عمل کیا جانا چاہئے؟ یا نہیں کیا جانا چاہئے۔ اس کے بارے میں اہل علم میں تین نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ یہاں جب میں اہل علم کا لفظ استعمال کررہا ہوں تو اس سے مراد محدثین بھی ہیں، فقہائے کرام بھی ہیں اور وہ حضرات بھی ہیں جو بیک وقت محدثین بھی ہیں اور فقہا بھی ہیں۔ مثلاً امام شافعی اور امام مالک وغیرہ۔ وہ حضرات بھی مراد ہیں جو صرف محدث ہیں مثلاً امام نسائی یا امام علی بن المدینی یا امام ابوحاتم رازی۔ اسی طرح وہ حضرات بھی یہاں مراد ہیں جن کی شہرت صرف فقیہ کی ہے، مثلاً امام ابوحنیفہ۔ ان سب نقطہ ہائے نظر کو تین اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

ا۔ ایک نقطۂ نظر وہ ہے جو اکثر و بیشتر ان حضرات کا ہے جو صرف محدث ہیں۔ یا علم حدیث میں زیادہ نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ 'لایعمل بہ مطلقاً' کہ حدیث ضعیف پر مطلقاً عمل نہیں کرنا چاہئے، نہ احکام میں نہ فضائل میں نہ کسی اور چیز میں۔ اس لئے کہ جس بات یا قول کے بارے میں یہ ثابت ہوجائے کہ اس کی نسبت رسول اللہ ﷺ سے کمزور ہے۔ ایسی بات کی نسبت حضورؐ سے کرنا ایک اعتبار سے رسول اللہ ﷺ سے غلط چیز منسوب کرنے کے

مترادف ہے۔ جب اس کی نسبت ہی کچی ہے تو حضورؐ سے آپ کیسے اس کو منسوب کر سکتے ہیں اور بطور حدیث رسول اس پر کس طرح عمل کر سکتے ہیں۔ یہ نقطۂ نظر امام یحییٰ بن معین، امام بخاری، امام مسلم اور امام ابن حزم کا ہے۔ ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ اگر کسی حدیث کا ضعیف ہونا ثابت ہو گیا تو اس پر عمل درآمد نہیں ہوگا۔

۲۔ ایک دوسرا نقطۂ نظر درمیانہ درجہ کے کچھ لوگوں کا ہے یعنی ان حضرات کا جو حدیث اور فقہ دونوں میں دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ضعیف حدیث پر عمل کیا جائے گا 'یعمل بہ مطلقاً' ہر حال میں عمل کیا جائے گا۔ یہ رائے امام ابوداؤد اور امام احمد بن حنبل سے منسوب ہے۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ حدیث ضعیف بھی اگر مل جائے تو وہ ہماری تمہاری رائے سے زیادہ بہتر ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اپنی یا کسی انسان کی رائے پر عمل کریں اس سے بہتر ہے کہ حدیث ضعیف پر عمل کر لیں۔ اگر رسول اللہ ﷺ سے منسوب ایک چیز موجود ہے اگر چہ اس کی نسبت کمزور ہے، لیکن پھر بھی اس پر عمل کیا جانا چاہئے۔ یہ ایک طرح سے عاشقانہ اور ایک والہانہ قسم کی بات ہے۔

۳۔ تیسرا نقطۂ نظر جو اکثر ائمہ فقہا کا نقطۂ نظر ہے اور محدثین میں سے بھی بعض حضرات کا یہی نقطۂ نظر ہے۔ وہ یہ ہے کہ فضائل کے باب میں حدیث ضعیف پر کچھ شرائط کے ساتھ عمل کیا جائے گا۔ یہ شرائط اگر موجود ہوں تو فضائل، مناقب اور دعاؤں کے باب میں اس پر عمل کیا جائے گا۔ پہلی شرط یہ ہے کہ اس حدیث ضعیف سے نہ کوئی حلال حرام ثابت ہوتا ہو نہ کوئی حرام حلال ثابت ہوتا ہو اور نہ اس سے شریعت کا کوئی حکم ثابت ہوتا ہو۔ یعنی حکم شرعی اور حلال و حرام جیسے معاملات حدیث ضعیف کی بنیاد پر طے نہیں ہو سکتے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ حدیث ترہیب یا ترغیب کے موضوع پر ہو۔ یعنی اس میں کسی نیک کام کی ترغیب دلائی گئی ہو یا کسی برے کام کے انجام سے ڈرایا گیا ہو۔ اس میں ایک بات یاد رکھئے گا کہ کسی فعل کا اچھا فعل ہونا اس سے ثابت نہیں ہوگا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی ضعیف حدیث میں یہ بتایا گیا ہو کہ فلاں فعل اچھا ہے اس کو اختیار کرو اور آپ اس ضعیف حدیث کی بنیاد پر اس فعل کو اچھا فعل قرار دے دیں۔ بلکہ وہ فعل جس کا اچھا ہونا پہلے سے ثابت ہو اس فعل کی ترغیب دلائی گئی ہو اور کسی ایسے فعل کے انجام سے ڈرایا گیا ہو جس کا برا ہونا پہلے سے ثابت ہو۔ اس کا انجام بتایا گیا ہو۔ تیسری شرط یہ ہے کہ اس کا

ضعف بہت سخت درجہ کا نہ ہو۔ شدید درجہ کا نہ ہو۔ یہ تین شرائط تو وہ ہیں جو ان تمام محدثین کے نزدیک ضروری ہیں جو حدیث ضعیف پر عمل کرنے کو جائز سمجھتے ہیں۔ بقیہ دو شرائط حافظ ابن حجر عسقلانی نے اضافہ کی ہیں۔ وہ بھی اس کے قائل ہیں کہ حدیث ضعیف پر عمل کیا جانا چاہئے۔ ان کے نزدیک ایک شرط یہ ہے کہ اس حدیث میں کسی عمل کی جو فضیلت ثابت ہو رہی ہو وہ شریعت کے کسی طے شدہ اصول کے تحت آتی ہو تو پھر اس پر عمل درآمد کیا جائے گا۔ مثال کے طور پر شریعت میں نفل نمازوں کی کثرت کو پسند کیا گیا ہے، اور ہر مشکل اور پریشانی کے موقعہ پر نماز کی تلقین کی گئی ہے۔ حضورﷺ نے فرمایا کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔ صحیحین کی روایات میں آیا ہے کہ 'کان رسول اللہ ﷺ اذا حزبہ امر بادر الی الصلوٰۃ' جب کوئی مشکل مرحلہ پیش آتا تھا تو رسول اللہﷺ فوراً نماز کی طرف رجوع فرماتے تھے۔ لہٰذا نوافل ادا کرنا اور ایسے خاص مواقع پر نماز پڑھنا یہ اسلام کا ایک اصل اور طے شدہ اصول ہے۔ اب اگر کوئی حدیث ضعیف ہے جو کسی خاص موقع پر نماز کی تلقین کرتی ہے تو اس پر عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اس لئے کہ ایسا کرنا دوسری عمومی روایات سے ثابت ہے۔

دوسرا اصول جو حافظ ابن حجر بتاتے ہیں وہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی ضعیف حدیث پر عمل کر رہا ہو تو یہ سمجھ کر کرے کہ یہ ثابت شدہ حدیث نہیں ہے، بلکہ احتیاطاً اس پر عمل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ احتیاط کا تقاضا ہے کہ اس پر عمل کرلیا جائے، تاکہ حضورﷺ کا کوئی ارشاد بغیر عمل کے باقی نہ رہے۔ یہ شرط حافظ ابن حجر عسقلانی نے بیان کی ہے جو حدیث ضعیف پر عمل کرنے کو لازمی سمجھتے ہیں۔ گویا حدیث ضعیف پر عمل کرنے کے بارے میں تین نقطۂ نظر ہیں اور یہ تینوں امت میں ہر دور میں پائے جاتے رہے ہیں۔

یہ جو بعض بہنیں بار بار شب برات کے بارے میں پوچھتی ہیں تو اس تفصیل میں اس سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے۔ شب براۃ کی راویت ضعیف ہے۔ جو حضرات سمجھتے ہیں کہ ضعیف حدیث پر عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ نوافل ادا کرنا اور تلاوت کلام پاک کرنا ویسے بھی افضل ہے لہٰذا اگر کسی خاص موقع پر تلاوت کلام پاک کرلی جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ روزہ اگر نفلی رکھا جائے تو ویسے بھی سنت ہے اور اچھی بات ہے۔ لہٰذا اگر کوئی پندرہ شعبان کو روزہ رکھ لے تو کوئی حرج نہیں۔ گویا وہ تمام شرائط جو حافظ ابن حجر اور باقی محدثین بتاتے ہیں وہ ساری اس میں شامل

ہیں۔اس لئے اگر کوئی شخص عمل کرتا ہو تو اس پر اعتراض نہ کریں۔

جو حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ حدیث ضعیف پر عمل نہیں کرنا چاہئے مثلاً علی بن المدینی اور اس طرح ان کے ہم مسلک دوسرے حضرات اس پر متفق ہیں کہ اس پر عمل نہ کریں۔ جو حضرات سمجھتے ہیں کہ حدیث ضعیف پر ہر صورت میں عمل کرنا چاہئے ان میں سے بہت سے عمل کررہے ہیں۔آپ کا نقطۂ نظر کوئی پوچھے تو آپ بیان کردیجئے کہ ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے۔ اس کے دلائل پوچھے تو وہ بھی بیان کردیجئے۔لیکن ان معاملات میں جن میں صحابہ کرامؓ اور تابعین کے زمانہ سے امت میں ایک سے زائد آرا چلی آرہی ہیں امت میں تفریق پیدا نہیں کرنی چاہئے۔ امت کی وحدت اور اتفاق قرآن پاک کی نص قطعی سے ثابت ہے۔قطعی الدلالت اور قطعی الثبوت ہے کہ'ان هذه امتكم امة واحدة'۔سنت کے قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت نصوص سے ثابت ہے کہ امت کی وحدت کا تحفظ کرنا چاہئے۔لہٰذا اس طرح کے اختلافی معاملہ میں جہاں تابعین کے زمانہ سے متعدد آرا چلی آرہی ہوں،اور بڑے بڑے محدثین اور بڑے بڑے علما کے نقطہ ہائے نظر تین طرح کے پائے جاتے ہیں تو ایسے معاملات میں نکیر نہیں کرنی چاہئے۔آج بھی اگر وہ تین آراء موجود ہوں تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ اس کی بنیاد پر اگر کوئی اختلاف ایسا پیدا نہیں ہونا چاہئے کہ جس سے امت میں کوئی تفریق ہو جائے۔

ضعیف حدیث سے متعلق ایک دو مسائل اور ہیں جو علم حدیث کے طلبہ کو خاص طور پر یاد رکھنے چاہئیں۔مثال کے طور پر اگر آپ کوئی کتاب پڑھ رہی ہوں۔فرض کریں کہ آپ جامع ترمذی پڑھ رہی ہوں یا ابوداؤد کی سنن کا مطالعہ کررہی ہوں۔اور پڑھتے پڑھتے آپ کو حاشیہ میں کسی کی تعلیق یا حاشیہ نظر آئے کہ'ضعیف' کہ یہ حدیث ضعیف ہے تو اس کے بارے میں فوراً یہ فیصلہ نہ کیجئے کہ یہ حدیث ہر اعتبار سے اور کلیۃً ضعیف ہے۔اس لئے کہ جب محدثین یہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے تو ان کی مراد وہ طریقہ یا وہ روایت یا وہ راستہ ہوتی ہے جس سے وہ بیان ہوئی ہے۔اس روایت میں طریقہ بھی شامل ہے اور متن بھی شامل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس روایت یا اس سند کو کمزور کہہ رہے ہوں اور متن کمزور نہ ہو۔بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث ایک سند سے قوی اور صحیح ہے اور دوسری سند سے ضعیف ہے۔اب اگر محدث ایک سند کو ضعیف قرار دے رہا ہے تو ضروری نہیں کہ متن بھی ضعیف ہے۔یہ تحقیق کرنی چاہئے کہ بقیہ طرق

سے بھی یہ متن جو پہنچا ہے تو سارے طرق ضعیف ہیں یا بعض طرق ضعیف ہیں اور بعض قوی ہیں۔ پھر اگر سارے کے سارے طرق ضعیف ثابت ہوں تو پھر اس کا حتمی درجہ مقرر کیا جائے گا۔ اگر بہت سارے طرق ضعیف مل جائیں اور ان سب میں ضعف الگ الگ قسم کا ہو تو پھر اس حدیث کا درجہ عام ضعیف سے مختلف ہوگا۔

یہ ایک لمبی بحث ہے۔ میں اگر مثالیں دوں گا تو بات اور بھی لمبی ہو جائے گی۔ ضعف الگ الگ قسم کا ہو اور مختلف درجات اور مراتب میں ضعف ہو تو وہ ایک دوسرے کو منجبر کر دیتا ہے یعنی یہ دو قسم کا ضعف ایک دوسرے کو compensate کر دیتا ہے۔ پھر وہ حدیث حسن کے درجہ پر پہنچ جاتی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ سب جگہ پر ایک ہی درجہ اور ایک ہی قسم کا ضعف ہے تو وہ حدیث ضعیف ہے۔ فرض کریں ایک حدیث روایت ہوئی جس میں راوی الف نے بیان کیا کہ انہوں نے راوی ب سے یہ حدیث سنی، راوی ب نے بیان کیا کہ انہوں نے راوی ج سے سنی، راوی ج بیان کرے کہ انہوں نے راوی د سے سنی، راوی د بیان کرتا ہے کہ انہوں نے فلاں صحابیؓ سے سنی اور فلاں صحابیؓ نے رسول اللہ ﷺ سے سنی۔ اب راوی د جو ہیں ان کی روایت یا سماع کسی صحابیؓ سے ثابت نہیں ہے اور وہ مثال کے طور پر تابعین میں سے نہیں ہیں۔ اب اگر بعد میں کوئی اور سند ایسی دستیاب ہو جائے جس میں ایک تابعی اسی حدیث کو کسی اور صحابیؓ سے روایت کرتے ہیں جن سے ان کی ملاقات ثابت ہے تو پھر یہ حدیث صحیح ہوگی اور جو کمزوری تھی وہ دور ہوگئی۔ گویا وہ خاص سند کمزور تھی، لیکن چونکہ متن دوسری صحیح سندوں سے بھی آیا ہے اس لئے متن اپنی جگہ درست قرار پا گیا۔ اس کے بارہ میں سمجھا جائے گا کہ اس کمزور روایت سے جو متن آیا ہے وہ حسن لغیرہ ہے۔ لیکن دوسری روایت سے جو آیا ہے وہ صحیح ہے۔

اگر تحقیق سے یہ پتہ چلے کہ جہاں جہاں تابعی سے صحابیؓ کا سلسلہ جڑنا بیان کیا جاتا ہے وہاں یہ خلا پایا جاتا ہے۔ یا تو یہی ایک راوی ہو جو مختلف صحابہ سے بیان کرتا ہے اور اس کی ملاقات کسی صحابیؓ سے ثابت نہیں تو اس کا درجہ بہت نیچے چلا جائے گا۔ اس کو متہم بالکذب کہا جائے گا، جو موضوع سے ایک درجہ اونچا ہے اور جو ضعف کی سب سے نچلی قسم ہے۔ اگر کچھ تابعین ایسے ہیں جن کی روایت صحابہ کرامؓ سے ممکن ہے یا ثابت ہے تو پھر سمجھا جائے گا کہ ضعف ذرا اونچے درجے کا ہے۔ اس لئے کسی حدیث کو حتمی طور پر ضعیف قرار دینے میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہئے۔

یہ بات بتانا میں نے اس لئے ضروری سمجھی کہ بعض محدثین نے علم حدیث کی الگ الگ کتابوں کا جائزہ لے کران کی روایات کو بالکل ایک ایک کر کے یہ تعین کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کا درجہ صحیح کا ہے، ضعیف کا ہے یا موضوع کا ہے۔ کسی حدیث کا موضوع ہونا تو واضح ہے۔ لیکن جب وہ کسی روایت کو صحیح یا حسن یا ضعیف قرار دیتے ہیں تو وہ صرف اس روایت کو ضعیف وغیرہ قرار دے رہے ہوتے ہیں جو اس طریق سے اس کتاب میں بیان ہوئی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ متن اگر مثلاً صحیح بخاری میں کسی اور طریق سے آیا ہو تو وہ بھی ضعیف ہو، وہ طریق ظاہر ہے ضعیف نہیں ہوگا۔ یہ وضاحت میں نے اس لئے کی کہ میں نے بہت سے لوگوں کو خود سنا ہے کہ ان کے سامنے ایک حدیث بیان ہوئی اور انہوں نے فوراً چھوٹتے ہی کہہ دیا کہ یہ حدیث ضعیف ہے، اس لئے کہ فلاں بزرگ نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ وہ دراصل بھول جاتے ہیں کہ جو ضعیف ہے وہ اس روایت کے ساتھ اس کتاب میں ضعیف ہے۔ لیکن اگر وہی روایت کسی اور روایت اور سند سے کسی اور کتاب میں آئی ہے تو ضروری نہیں کہ وہ بھی ضعیف ہو، ہوسکتا ہے کہ صحیح ہو، ہوسکتا ہے کہ حسن ہو، حسن لعینہ ہو یا حسن لغیرہ ہو، بہرحال حتمی رائے دینے سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہئے۔

چنانچہ حدیث کی وہ قسم جو ضعیف سند سے لوگوں تک پہنچی ہو لیکن اس کا ضعف ذرا ہلکی قسم کا ہو۔ جب آپ اس حدیث کو کسی جگہ بیان کریں اور آپ کے علم میں ہو کہ یہ حدیث ضعیف ہے تو بہترین طریقہ یہ ہے اور ذمہ داری کا تقاضا بھی ہے کہ یہ بیان کردیں کہ یہ ضعیف حدیث ہے۔ لیکن اس ضعیف حدیث میں فلاں بات ارشاد فرمائی گئی ہے جو بظاہر درست ہے اس لئے اس پر عمل کرنا چاہئے۔ بہت سے لوگ اس بات کا اہتمام نہیں کرتے، کیوں نہیں کرتے، اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے ان کو کم از کم اتنا ضرور کرنا چاہئے اور اس پر محدثین نے زور دیا ہے کہ وہ یہ نہ کہیں کہ قال رسول اللہ ﷺ، رسول اللہ ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی۔ بلکہ اگر اس کو بیان کرنا ہی ہو تو صرف یہ کہنے پر اکتفا کریں کہ روایت میں آتا ہے کہ یہ بات ارشاد فرمائی گئی۔ یا بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ حضورؐ نے یہ بات ارشاد فرمائی، یا حضورؐ سے یہ منسوب ہے کہ آپؐ نے یہ بات ارشاد فرمائی، یا فلاں کتاب میں اس طرح آیا ہے، ترمذی شریف میں آیا ہے کہ فلاں کام اس طرح ہے۔ اس طرح آپ براہ راست رسول اللہ ﷺ سے نسبت کرنے سے بچ جاتے ہیں اور یوں ایک کمزور چیز کی نسبت حضورؐ سے نہیں ہوسکے گی۔

بعض محدثین اتنے اونچے درجے کے ہیں کہ ان سے اونچا درجہ علم حدیث میں اللہ نے بہت کم لوگوں کو عطا فرمایا۔ ان میں سے ایک امام یحیٰ بن معین ہیں۔ امام احمد بن حنبل ہیں، امام ابوزرعہ ہیں، امام بخاری ہیں۔ یہ لوگ بڑے اونچے درجہ کے ائمہ حدیث ہیں۔ جب اتنے اونچے درجہ کے محدث یہ کہیں کہ لا اعرف ھذا الحدیث' کہ میں اس حدیث سے واقف نہیں، یا مجھے نہیں پتہ کہ یہ حدیث کیا ہے، تو پھر اس بات کے باور کرنے کے قوی امکانات ہیں کہ یہ حدیث صحیح یا حسن نہیں ہے، یا تو بالکل ہی ضعیف ہے یا موضوع ہے۔ لیکن کیا محض کسی ایک محدث کے کہنے سے ہم یہ کہہ دیں کہ حدیث موضوع ہے؟ یہ بھی احتیاط کے خلاف ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں بڑے محدث نے اس حدیث کے جاننے سے انکار کر دیا ہے، لہٰذا یہ کمزور روایت معلوم ہوتی ہے، اس میں احتیاط سے کام لینا چاہئے اور از سرِ نو تحقیق کر لینی چاہئے۔

علل حدیث

یہ علم حدیث کا ایک اور اہم میدان ہے جو بڑا مشکل ہے، میں اس کی تفصیلی مثالیں دینا چاہتا تھا۔ لیکن ایک مثال دینے کے لئے بھی بڑی تفصیلی گفتگو چاہئے، امام ابو حاتم رازی کی کتاب 'علل الحدیث' دو جلدوں میں چھپی ہوئی موجود ہے میں آج وہ ہمراہ لانا چاہتا تھا لیکن پھر اس لئے نہیں لایا کہ کتاب سامنے رکھ کر علل پر گفتگو شروع کی تو بات بہت لمبی ہو جائے گی اور باقی موضوعات رہ جائیں گے، علل الحدیث سے مراد کسی حدیث میں متن یا سند کے اعتبار سے وہ کمزوری ہے جس کا عام طالب حدیث یا عالم حدیث کو پتہ نہ چلے اور جس کا پتہ چلانے کے لئے بڑی گہری بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ہے خلاصہ علل الحدیث کا اور سب سے مشکل فن علم حدیث میں یہی ہے۔ یہاں ایک بات یاد رکھنی چاہئے۔ محدثین نے لکھا ہے کہ 'الحدیث الصحیح لا یعلل بالضعیف' یعنی ایک حدیث جو ویسے تو حدیث صحیح ہے، روایت کے اعتبار سے بھی صحیح ہے، سند اور متن کے اعتبار سے بھی صحیح ہے، درایت کے اعتبار سے بھی صحیح ہے اور آپ نے ان سب پہلوؤں سے تحقیق کرنے کے بعد یہ حتمی نتیجہ نکال لیا کہ یہ صحیح حدیث ہے۔ اب اسی موضوع پر کوئی کمزور یا معلل حدیث آپ کے سامنے آئی تو اس حدیث کے معلل ہونے کی وجہ سے پہلے سے صحیح ثابت شدہ اُس حدیث پر اثر نہیں پڑے گا، بلکہ اُس کے صحیح ہونے کی وجہ سے اس

معلل یا ضعیف حدیث کی علت دور ہو جائے گی۔ کمزور قوی کو متاثر نہیں کرسکتا، البتہ قوی کمزور کو متاثر کرسکتا ہے۔ یہ بدیہی اور ایک عقلی بات ہے۔

علم حدیث کے آداب

علم حدیث پر جن حضرات نے کتابیں لکھی ہیں ان میں علامہ خطیب بغدادی کی دو کتابیں بھی شامل ہیں۔ آپ میں سے جو لوگ عربی جانتے ہیں وہ ضرور یہ دونوں کتابیں پڑھیں۔ ان میں یہ بتایا گیا ہے کہ حدیث پڑھنے والوں کو کن آداب کی پیروی کرنی چاہئے۔ کل میں نے سفر یعنی رحلہ کے آداب کا ذکر کیا تھا۔ لیکن خود علم حدیث کے پڑھنے میں کن آداب کی پیروی کرنی چاہئے، محدث کے آداب کیا ہیں، طالب حدیث کے آداب کیا ہیں، لکھنے والے کے آداب کیا ہیں، املا کے آداب کیا ہیں، املا لینے اور دوسروں کو املا دینے کے آداب کیا ہیں۔ ایک تو مستملی وہ ہے جو شیخ سے املا لے کر آگے لوگوں کو بتا رہا ہے، اور دوسرا مستملی وہ ہے جو خود اپنے لئے لکھ رہا ہے، دونوں کے الگ الگ آداب ہیں اور اس پر الگ الگ کتابیں ہیں۔ امام خطیب بغدادی کی دو کتابیں اہم ہیں 'الکفایہ فی علم الروایۃ' اور 'الجامع فی آداب الراوی و اخلاق السامع' ان میں انہوں نے راوی اور سامع کے آداب بتائے ہیں۔ الجامع دو جلدوں میں ہے اور الکفایہ ایک ضخیم جلد میں ہے۔ ان دونوں کتابوں میں انہوں نے جو آداب بتائے ہیں ان کی تلخیص امام غزالی نے احیاء العلوم میں کی ہے جس کے اردو اور انگریزی دونوں تراجم ملتے ہیں۔ انگریزی ترجمہ جو ہمارے ملک میں چھپا ہے، بڑا ناقص ہے اس کو بھی آپ دیکھنا چاہیں تو دیکھ لیں، اس میں آپ کو آداب مل جائیں گے۔ اس لئے میں اس کا حوالہ دے کر اس بات کو یہیں چھوڑ دیتا ہوں۔ اسی طرح کی ایک کتاب علامہ سمعانی کی ہے جس میں انہوں نے 'آداب الاملاء و الاستملاء' بیان کئے ہیں، کہ املا کے آداب کیا ہیں اور استملا کے آداب کیا ہیں اور جو شخص املا لے کر آگے بیان کرے گا، یعنی مستملی، اس کے آداب کیا ہیں۔ اس کے علاوہ طالب حدیث کے آداب کیا ہیں ان کا خلاصہ بھی امام غزالی نے دیا ہے وہاں سے دیکھ لیں۔

درس حدیث کی اقسام

ابتدا ہی سے حدیث پڑھانے کے تین انداز اور اسالیب مروج رہے ہیں۔ اور یہ بڑی

عجیب بات ہے۔ جب میں نے پہلی مرتبہ ان کے بارے میں پڑھا تو مجھے بہت حیرت ہوئی اور کسی حد تک وہ حیرت آج بھی موجود ہے۔ان تینوں طریقوں کا بہت سے اہل علم نے ذکر کیا ہے۔حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے استاد تھے شیخ ابو طاہر الکردی، جب آخر میں اپنی سند بیان کروں گا تو ان کا بھی نام آئے گا۔اس لئے بالواسطہ طور پر وہ میرے بھی استاد ہیں۔ انہوں نے بھی ان تین طریقوں کی تفصیل بیان کی ہے۔

ان ایک طریقہ ہے السرد کا۔سرد کے معنی ہیں بیان کرنا یعنی **simple naration** ۔یہ طریقہ اہل علم کے لئے ہے، یعنی وہ لوگ جو حدیث کا اچھا علم رکھتے ہیں۔اس طریقہ کے تحت شیخ کا کام یہ ہے کہ وہ حدیث کو بیان کرتا جائے، خود پڑھ کر سنائے یا طالب علم سے پڑھوا کر سنے، یا ایک طالب علم پڑھے اور بقیہ طلبہ سنیں، یا ایک ایک کر کے سب سنائیں، یہ طریقہ سرد کہلاتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر شیخ کا اور کوئی کام نہیں ہوتا۔اس نے ایک کتاب پڑھ کر سنائی اور آپ کو اجازت دے دی۔یا آپ نے پڑھ کر سنائی۔اس نے سن کر آپ کو اجازت دے دی۔یا ایک ایک کر کے سب نے پڑھ کر سنائی اور سب کو اجازت دے دی۔یہ حضرات کہتے ہیں کہ یہ طریقہ علما اور خواص کے ساتھ مخصوص ہے اس لئے کہ وہ پہلے سے علم حدیث پڑھ چکے ہیں۔علم حدیث کے معانی اور مطالب کو جانتے ہیں۔علمی سطح پر اس درجہ کے لوگ ہیں کہ علم حدیث کے سارے مباحث ان کے سامنے ہیں۔

۲۔ دوسرا طریقہ کہلاتا ہے طریق الحل والبحث۔یعنی حدیث کی مشکلات حل کرنے اور مسائل پر بحث کرنے کا طریقہ۔کہتے ہیں کہ یہ طریقہ حدیث کے طلبہ کے لئے ہے اور جو حدیث کے طلبہ ہوں ان کے لئے یہی طریقہ ہونا چاہئے۔یہاں علم حدیث کے لغوی، فنی اور فقہی مباحث کا ذکر ہوگا۔فنی مباحث سے مراد علم روایت اور علوم حدیث سے متعلق مباحث ہیں اور فقہی مباحث سے مراد ہے ان احادیث کی خصوصی تحقیق جہاں فقہ سے متعلق مسائل کا ذکر ہو، کلامی مباحث یعنی عقیدہ سے متعلق اور لغوی مباحث یعنی جہاں کوئی مشکل لفظ آگیا ہے اس پر بحث۔یہ طریقہ طلبہ کے لئے ہے۔ان اہل علم نے لکھا ہے کہ اس میں اعتدال اور توازن سے کام لینا چاہئے، زیادہ تفصیلی بحث نہیں کرنی چاہئے۔

۳۔ تیسرا طریقہ امعان کا ہے۔امعان یعنی گہرائی سے کوئی کام کرنا۔امعان کی

جو وضاحت محدثین نے کی ہے شیخ ابو طاہر کردی بھی اس سے اتفاق فرماتے ہیں۔ یہ سب حضرات کہتے ہیں کہ امعان سے مراد یہ ہے کہ حدیث میں جو مسائل بیان ہوئے ہیں ان سب پر بہت تفصیل سے گفتگو کی جائے اور جو مسائل براہ راست حدیث سے متعلق نہ ہوں بلکہ جن کا بالواسطہ تعلق ہو ان پر بھی تفصیل سے بات کی جائے۔ یہ طریقہ امعان کہلاتا ہے۔ طریقہ امعان کے بارہ میں ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ یہ سنجیدہ لوگوں کا طریقہ نہیں ہے۔ بلکہ قصہ گو قسم کے لوگوں کا طریقہ ہے، دنیا پرست لوگوں کا طریقہ ہے۔

اس پر مجھے حیرت ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں لکھا۔ یہ حیرت ابھی تک قائم ہے۔ انہوں نے لکھا کہ یہ طریقہ محدثین کا طریقہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ دنیا پرست اور قصہ گو اور جاہ پرست لوگوں کا طریقہ ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں ڈالا کہ انہوں نے یہ تین طریقے بیان فرمائے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ میری رائے ممکن ہے کہ غلط ہو۔ لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید کچھ لوگ اس میدان میں ایسے آگئے ہوں گے جنہوں نے اپنا علم ظاہر کرنے اور اپنے کو بڑا علامہ ثابت کرنے کے لئے بڑی لمبی چوڑی تقریریں شروع کردی ہوں گی اور لمبے لمبے مباحث بیان کئے ہوں گے تو مخلص اور متقی محدثین نے ان کے اس عمل کو تقویٰ اور اخلاص کے خلاف سمجھا ہوگا، اس لئے یہ بات ارشاد فرمائی ہوگی۔ ممکن ہے کہ میری یہ رائے غلط ہو۔ لیکن شاید درست بھی ہو۔ بہر حال طریقۂ امعان پر اتنے بڑے اور جید ائمہ حدیث کے اس منفی بلکہ خاصے جارحانہ تبصرہ کی اصل وجہ معلوم نہیں۔ اس لئے اب تک حیرت ہے۔

احادیث میں تعارض

ایک آخری چیز جو بڑی لمبی ہے لیکن اختصار کے ساتھ میں صرف اصولی بات بیان کر کے ختم کر دیتا ہوں۔ وہ یہ کہ بعض اوقات بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ دو حدیثوں میں تعارض یعنی Conflict ہے۔ یہ تعارض بظاہر تو نظر آتا ہے لیکن درحقیقت نہیں ہوتا۔ یہ ایک بڑی لمبی بحث ہے۔ ایک بڑے محدث سے اپنے زمانے میں کسی نے پوچھا کہ اگر دو احادیث میں تعارض ہو تو اس کو کیسے دور کیا جائے۔ انہوں نے بہت ناگواری سے فرمایا کہ اگر ایسی کوئی دو حدیثیں ہیں جو دونوں مکمل طور پر صحیح ہیں، سند، روایت، درایت اور ہر اعتبار سے صحیح ہیں، برابر درجہ کی ہیں اور ان

میں تعارض ہے تو لے کر آجاؤ۔ گویا ان کی رائے میں ایسی کوئی احادیث نہیں پائی جاتیں جو ہر لحاظ سے ایک درجہ کی ہوں او صحیح کے بہت اونچے درجہ کی ہوں اور ان میں تعارض ہو۔

لیکن بظاہر بعض احادیث میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔ یہ تعارض جو معلوم ہوتا ہے اس کو کیسے دور کیا جائے؟ اس کے لئے بڑی لمبی بحثیں ہوئی ہیں۔ کچھ وجوہ ترجیح یعنی **grounds of preferance** محدثین نے بیان کئے ہیں، اہل علم نے تلاش کر کے ان کا پتہ چلایا پھر ان کی شناخت کی کہ وہ وجوہ ترجیح یعنی **grounds of preferance** کیا ہیں جو ائمہ حدیث اور فقہائے مجتہدین نے اختیار کئے ہیں۔ ان میں سے کچھ اسباب ترجیح تو وہ ہیں جو اسناد کے اعتبار سے ہیں، کچھ اسباب وہ ہیں جو متن کے اعتبار سے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو مدلول کے اعتبار سے ہیں یعنی اس متن سے کیا بات ظاہر ہوتی ہے، اور کچھ حدیث سے متعلق دیگر پہلوؤں کے اعتبار سے ہیں۔ گویا وجوہ ترجیح یا اسباب ترجیح کی چار قسمیں ہیں۔

سند کے اعتبار سے ترجیح کی وجوہ تیرہ ہیں۔ متن کے اعتبار سے چھ ہیں۔ مدلول یعنی مفہوم کے اعتبار سے چار ہیں اور خارجی اسباب کے اعتبار سے سات ہیں۔ نمونہ کے طور پر ایک ایک دو دو مثالیں دے دیتا ہوں۔

سند کے اعتبار سے وجوہ ترجیح سے مراد کیا ہے اور وہ وجوہ کیا ہیں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر دو حدیثیں صحیح ہوں، سند اور متن ہر اعتبار سے اس درجہ کی ہوں جس پر کوئی صحیح حدیث ہوتی ہے۔ دونوں کے مندرجات سے یہ پتہ نہ چلتا ہو کہ دونوں حدیثیں کس زمانہ کی ہیں۔ دونوں حدیثوں میں کوئی اندرونی شہادت ایسی نہ جس سے کوئی اور مفہوم یا میدان تطبیق ظاہر ہوتا ہو تو پھر یہ دیکھا جائے گا کہ سند کس کی زیادہ قوی ہے۔ زیادہ راوی کس کے ہیں، سینئر راوی کس حدیث میں زیادہ ہیں اور جونیئر راوی کس حدیث میں ہیں۔ کبار صحابہ سے کونسی حدیث مروی ہے اور صغار صحابہ سے کون سی ہے۔ کبار تابعین سے کون سی حدیث مروی ہے اور صغار تابعین سے کون سی مروی ہے۔ اس اعتبار سے تقریباً تیرہ وجوہ ترجیح بنتی ہیں جن کی بنیاد پر ان دونوں میں ایک کو ترجیح دی جائے گی اور دوسری پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک اجتہادی فیصلہ ہی ہوسکتا ہے، جس کی بنیاد پر محدث یا فقیہ کو کوئی فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔

ضروری نہیں کہ یہ فیصلہ ہر صورت میں بالکل موضوعی یا سو فیصد **objective** ہو۔ اس

میں ایک سے زیادہ آرا ممکن ہوں گی۔ اس میں اختلاف رائے بھی ہوگا۔ ایک محدث کی نظر میں ایک حدیث کو ترجیح حاصل ہوگی تو دوسرے کی نظر میں دوسری حدیث کو ترجیح حاصل ہوگی۔ اس لئے ان مسائل پر زندگی میں کبھی بھی لڑیئے گا نہیں۔

مثال کے طور پر وجوہ ترجیح میں سے بعض کبار فقہا کے نزدیک ایک اہم وجہ ترجیح یہ ہے کہ اگر دونوں روایتیں برابر درجہ کی ہوں تو اس صحابیؓ کی روایت کو زیادہ ترجیح دی جائے گی جن کو رسول اللہ ﷺ کی قربت زیادہ حاصل رہی ہوگی، بہ نسبت ان صحابی کی راویت کے جو حضور ﷺ کے اتنے قریب نہیں رہے۔ یہ بڑی معقول بات معلوم ہوتی ہے اور اس سے اختلاف کرنا بہت مشکل ہے۔

ایک اور وجہ ترجیح جو ایک معقول رائے پر مبنی ہے کہ جو بعد کا طرز عمل ہے اس کو ترجیح دی جائے گی، بہ نسبت پہلے کے طرز عمل کے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک عمل پہلے اختیار فرمایا، دوسرا عمل بعد میں اختیار فرمایا۔ دونوں احادیث بظاہر متعارض معلوم ہوں تو ایسے میں بعد والی حدیث کو ترجیح دی جائے گی، پہلی والی کو چھوڑ دیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں جہاں دونوں احادیث کے زمانۂ صدور کی تعیین ممکن نہ ہو وہاں ان صحابیؓ کی رائے کو ترجیح دی جائے گی جو حضور ﷺ کے زیادہ قریب رہے ہیں۔ جو صحابی حضور ﷺ سے زیادہ قریب نہیں رہے یا کم عرصہ قریب رہے ان کی روایت کو ترجیح نہیں دی جائے گی۔ چنانچہ رفع یدین کے مسئلہ پر لوگ بہت جھگڑتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ رفع یدین کی روایت نہیں کیا کرتے تھے اور بغیر ہاتھ اٹھائے رکوع میں جایا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنا دست مبارک اٹھا کر رکوع میں جایا کرتے تھے اور گویا رفع یدین کے ساتھ نماز پڑھا کرتے تھے۔ دونوں صحابیؓ ہیں، دونوں کا درجہ بہت اونچا ہے، دونوں کی روایت کا درجہ بالکل برابر ہے۔ امام ابوحنیفہ کا ارشاد گرامی یہ ہے کہ یہاں ان صحابی کی روایت کو ترجیح دی جائے گی جو حضورؐ کے زیادہ قریب رہے۔ وہ صحابی جو مکہ مکرمہ کے چوتھے یا پانچویں سال اسلام میں داخل ہوگئے اور حضورؐ کے اتنے قریب تھے کہ باہر سے آنے والے ان کو اہل بیت میں سے سمجھتے تھے ان کی روایت کو ترجیح دی جائے گی، بہ نسبت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کے جو غزوہ احد میں اس لئے واپس کر دیئے گئے کہ کم سن ہیں اور ابھی بچے ہیں۔

یہ بہرحال امام ابوحنیفہؒ کی ایک رائے ہے جس کی ایک مضبوط عقلی بنیاد بھی موجود ہے۔ اس معاملہ میں ہر محدث اور ہر فقیہ کو ایک دلیل کی بنیاد پر رائے قائم کرنے کا اختیار ہے۔ اس بارے میں یہ کہنا کہ فلاں فقیہ کا طرز عمل سنت کے خلاف ہے، یا یہ عمل سنت سے متعارض ہے اور بدعت ہے، ایسا کہنا درست نہیں۔ یہ بھی سنت ہے اور وہ بھی سنت ہے۔ محدثین اپنے غیر معمولی علم وبصیرت اور اپنے غیر معمولی اخلاص وتقویٰ اور فقہا اپنے غیر معمولی تعمق کی وجہ سے ایک رائے کو زیادہ قوی اور دوسری رائے کو نسبتاً کم قوی سمجھتے ہیں اور ان میں سے جس نے جس رائے کو قوی تر سمجھا اس کو اختیار کرلیا۔

اسی طرح سے کچھ وجوہ ترجیح متن کے اعتبار سے ہیں کہ ایک حدیث کے متن میں کوئی عام اصول بیان ہوا ہے۔ اور ایک دوسری حدیث میں کسی خاص **specific situation** کے بارے میں کوئی بات بیان ہوئی ہے۔ یہاں یہ کہا جائے گا کہ ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ جہاں خاص صورت حال ہے وہاں یہ خاص حدیث قابل عمل ہوگی اور جہاں عمومی صورت حال ہوگی وہاں وہ عمومی حدیث قابل عمل ہوگی۔ دونوں مدلول کے اعتبار سے ایک دوسرے کو **compensate** کریں گی۔ مثال کے طور پر ایک حدیث وہ ہے جس میں احتیاط کا پہلو زیادہ سامنے آتا ہے اور ایک وہ ہے جس میں احتیاط کا پہلو نسبتاً کم ہے۔ مثلاً ایک حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ فلاں عمل جائز ہے اور ایک اور حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عمل جائز نہیں ہے۔ اب احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو نہ کیا جائے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ آیا ہے کہ شیشہ کے گلاس میں پانی پینا مکروہ ہے، جبکہ ایک دوسری حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ مکروہ نہیں ہے۔ اب اس میں یہ تو نہیں کہا گیا ہے کہ شیشہ کے گلاس میں پانی ضرور پیا کرو۔ اس لئے احتیاط یہ ہے کہ نہ پیا جائے، ہوسکتا ہے کہ مکروہ ہو، تو احتیاط کا تقاضا ہے کہ بلاضرورت شیشہ کے قیمتی گلاس میں پانی نہ پیا جائے۔ یہ بعض لوگوں کی رائے ہے یہ ہے کہ یہاں اس حدیث پر عمل کیا جائے گا جس مین احتیاط زیادہ ہے بہ نسبت اس کے جس میں احتیاط کم ہے۔ اس طرح مدلول یا مفہوم کے اعتبار سے بھی کچھ اصول ہیں۔

کچھ اصول ہیں جو خارجی ہیں۔ یعنی حدیث کے الفاظ میں نہیں لیکن خارجی شواہد کی بنیاد پر اس سے ان اسباب کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً دو حدیثیں ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث میں

جو بات ارشاد فرمائی گئی ہے وہ ائمہ اربعہ یا خلفائے اربعہ کا نقطۂ نظر بھی ہے تو خلفائے راشدین کا نقطۂ نظر اس کے ساتھ شامل ہو گیا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی حدیث نسبۃً زیادہ قوی ہے، اس پر عمل کیا جائے گا۔ یا مثلاً ایک وہ روایت ہے جس پر عمل اہل مدینہ بھی موجود ہے اور دوسری روایت ایسی ہے جس کی تائید کسی ایسے اجتماعی عمل سے نہیں ہوتی۔ اب یہاں دو روایتیں ہیں۔ دونوں اصول روایت، سند وغیرہ کے اعتبار سے برابر ہیں تو عمل اہل مدینہ والی روایت کو ترجیح دی جائے گی۔ میں نے اذان میں ترجیع سے متعلق امام ابو یوسف کی مثال دی تھی، امام ابو یوسف نے اپنی روایت کو چھوڑ کر اس کو قبول کیا، حالانکہ دونوں روایتیں صحیح تھیں۔ لیکن انہوں نے عمل اہل مدینہ کی وجہ سے اپنی روایت کو ترک کر دیا۔ اب یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ امام مالک اور امام ابو یوسف نعوذ باللہ حدیث کے تارک ہو گئے۔ نہیں حدیث کے تارک نہیں ہوئے، بلکہ دو برابر کی حدیثوں میں ترجیح اس کو دی جس کے حق میں عمل اہل مدینہ کی تائید بھی حاصل ہو رہی تھی۔

علم ناسخ اور منسوخ

علم حدیث میں آخری چیز علم ناسخ اور منسوخ ہے۔ رسول اللہ ﷺ جب دنیا میں بطور نبی اور پیغمبر کے تشریف لائے تو آپ کی چار ذمہ داریاں تھیں، یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ' یہ جو تزکیہ کا عمل تھا کہ لوگوں کا تزکیہ فرماتے تھے تو یہ افراد کا تزکیہ بھی تھا، خاندانوں کا تزکیہ بھی تھا، مال اور متاع کا تزکیہ بھی تھا، لوگوں کے اوقات کا تزکیہ بھی تھا، نظام اور معاشرہ کا تزکیہ بھی تھا، ہر چیز کا تزکیہ تھا۔ کوئی چیز آپؐ نے تزکیہ کے بغیر نہیں چھوڑی، ہر چیز کو پاکیزہ اور ستھرا بنایا۔

اس ستھرا بنانے کے عمل میں ایک تدریج اور اعتدال حضورؐ نے پیش نظر رکھا۔ جو چیزیں بنیادی تھیں وہ پہلے بیان فرمائیں، جن کا انداز عمارت کی بنیادوں کے اوپر اٹھنے والی دیواروں کا تھا وہ آپ نے بعد میں بیان فرمائیں۔ جو دیواروں سے آگے بڑھ کر چھت کی نوعیت کی تھیں وہ آپ نے اس کے بعد بیان فرمائیں۔ جو بات ستون کی حیثیت رکھتی تھی وہ اپنے مقام پر بیان فرمائی۔ جو اس انداز کی تھی کہ مکان بننے کے بعد اس کی تکمیل کیسے ہو وہ آخر میں بیان فرمائی۔ یہ ایک منطقی ترتیب حضورؐ نے پیش نظر رکھی۔ جیسے ایک طبیب جب کسی پیچیدہ مرض کا علاج کرتا ہے تو پہلے ایک

دوا دیتا ہے، پھر دوسری پھر تیسری، پھر چوتھی اور بقیہ دواؤں کو ایک ایک کر کے چھڑا دیتا ہے۔ کچھ پرہیز بتا دیتا ہے اور بعد میں اس پرہیز کو ختم کر دیتا ہے کہ ٹھیک ہے اب کھاؤ۔

اسی طرح سے رسول اللہ ﷺ کے ارشادات میں یہ تدریج پائی جاتی ہے۔ اس تدریج میں جب کسی عمل کی ضرورت نہیں رہی تو وہ عمل ختم ہوگیا، وہ حدیث گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ منسوخ ہوگئی۔ مثال کے طور پر جب اسلام آیا تو عرب میں شراب نوشی بڑی کثرت سے رائج تھی۔ ہر جگہ شراب نوش اور مئے خوار پائے جاتے تھے۔ شراب کی حرمت کا ذکر قرآن پاک میں تدریج کے ساتھ آیا اور جب مکمل حرمت آ گئی تو رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو شراب نوشی سے بالکل پاک اور صاف کرنے کے لئے بعض دوسری چیزوں کی بھی ممانعت کر دی۔ لیکن حضورؐ یہ ممانعت نے وقتی طور پر کی تھی۔ صحیح مسلم میں ایک روایت ہے جو صحیح بخاری میں بھی ہے۔ ایک صحابیؓ بیان کرتے ہیں کہ ہمارے قبیلے کا وفد جب حضورؐ کی خدمت میں آیا تو آپ نے ہمیں فلاں فلاں چیزوں کا حکم دیا اور ان چیزوں سے روکا۔ 'و نھانا عن النقير والمزفت والدباء' ہمیں چار چیزوں سے روکا، یہ چار قسم کے برتن ہوا کرتے تھے جن میں شراب رکھی جاتی تھی اور بنائی جاتی تھی۔ کسی برتن میں فی نفسہ کوئی اچھائی یا برائی نہیں ہے۔ لیکن ایک برتن ہوتا تھا جو کدو سے بنتا تھا۔ اس زمانے میں یہ پراسیسنگ مشینیں تو نہیں ہوتی تھیں، اس کے بجائے ایک بڑا کدو لے کر اس کو خشک کر دیا کرتے تھے۔ وہ کدو خشک ہونے کے بعد لکڑی کی طرح سخت ہو جاتا تھا۔ اندر سے اس کا ریشہ نکال کر اس کو کھوکھلا کرتے تھے۔ اس میں کھجور یا انگور کا رس بھر کے اس کو اوپر سے بند کر کے درخت سے لٹکا دیتے تھے۔ وہ کئی دن تک لٹکا رہتا تھا۔ ہوا کی ٹھنڈک اور دھوپ کی گرمی سے اس میں خمیر پیدا ہو جاتا تھا اور وہ شراب بن جاتی تھی۔ بعد میں اس برتن کو دیگر مقاصد کے لئے بھی استعمال کرتے تھے۔ اس کو دباء کہتے تھے۔ اب بظاہر اس میں کوئی قباحت نہیں کہ آپ کدو لیں اور اس کو خشک کر کے برتن بنالیں، لیکن چونکہ یہ برتن خاص شراب نوشی اور شراب سازی کے لئے استعمال ہوتا تھا اس لئے حضور ﷺ نے اس کی بھی ممانعت فرمادی۔ جب شراب کا بالکل خاتمہ ہوگیا اور لوگوں نے مکمل طور پر شراب چھوڑ دی پھر ان برتنوں کی ممانعت کی ضرورت نہیں رہی۔ آج اگر کوئی شخص کدو کا برتن بنانا چاہے تو بنا سکتا ہے۔

اسی طرح سے ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا کہ 'کنت نھیتکم عن زیارۃ

القبور الافزوروھا'۔ میں نے تم کو قبروں پر جانے سے منع کیا تھا، اب تم جاسکتے ہو۔ ایک زمانے میں عرب میں قبر پرستی زور وشور سے ہوا کرتی تھی، قبروں پر طرح طرح کے چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے، طرح طرح کے مشرکانہ اعمال ہوا کرتے تھے تو آپؐ نے فرمایا کہ قبروں پر مت جایا کرو۔ جب صحابہ کرامؓ کی تربیت ہوگئی اور یہ خطرہ ٹل گیا کہ ان سے قبروں پر کوئی مشرکانہ عمل سرزد ہوگا تو آپؐ نے فرمایا کہ 'الافزوروھا' اب تم جاسکتے ہو۔ ان دو مثالوں سے اندازہ ہو جائے گا کہ احادیث میں یہ تدریج پائی جاتی ہے۔

صحابہ کرامؓ میں جو صف اول کے صحابہ کرامؓ ہیں، طبقہ اولیٰ کے صحابہ یا فقیہ صحابہ ہیں ان سے ایسی کوئی روایت منقول نہیں ہے جس میں اس تدریج کا لحاظ نہ رکھا گیا ہو۔ لیکن طبقہ متوسط اور صغار صحابہ میں خاص طور پر وہ صحابہ جن کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رہنے کا زیادہ موقع نہیں ملا ان سے ایسی روایات بھی منقول ہیں جو اس تدریج کے کسی خاص مرحلہ کے بارہ میں ان کے مشاہدہ پر مبنی ہیں۔ فرض کریں کوئی صاحب یمن میں رہتے تھے، وہ ایک قافلہ کے ساتھ آئے، چند دن مدینہ منورہ میں رہے اور چلے گئے۔ انہوں نے جو دیکھا وہی بیان کر دیا۔ وہ آخر تک وہی بات بیان کرتے رہے اور بعد میں بھی وہی بیان کرتے رہے، کیونکہ ان کو یہ پتہ نہیں چلا کہ بعد میں یہ چیز تبدیل ہوگئی تھی یا حضورؐ نے کوئی اور بات ارشاد فرمائی تھی۔ تابعین کو وہ چیز بھی مل گئی اور یہ بھی مل گئی۔ اب یہ پتہ لگانا تابعین کا کام تھا کہ کون سی چیز پہلے کی ہے اور کون سی بعد کی ہے۔ یہ علم ناسخ و منسوخ کہلاتا ہے۔

اسباب ورود الحدیث

آخری چیز یہ ہے کہ جس طرح سے قرآن پاک کی آیات میں شان نزول ہوتا ہے جس سے اس آیت کا سیاق وسباق سمجھنے میں مدد مل جاتی ہے، یہ پتہ چل جاتا ہے کہ جب کوئی آیت نازل ہوئی تھی تو کیا حالات تھے، اس سے اس آیت کا مفہوم اور اس کا اندازہ کرنے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ جن حالات میں وہ آیت نازل ہوئی اور جن حالات سے عہدہ برا ہونے کے لئے وہ نازل ہوئی ان کو اسباب نزول کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ علوم القرآن کا ایک اہم باب ہے۔ اسی سے ملتا جلتا ایک فن ہے اسباب ورود الحدیث یعنی کوئی حدیث جو رسول اللہ ﷺ نے

ارشاد فرمائی وہ کن حالات میں فرمائی اور اس وقت آپؐ کے پیش نظر کیا مسئلہ تھا۔ اگر اس حدیث کو اس سیاق وسباق میں سمجھ لیں جس میں آپؐ نے وہ بات ارشاد فرمائی تو آسانی ہو جاتی ہے۔ اس سیاق وسباق سے ہٹا کر اس کو دیکھیں تو بعض اوقات مشکل پیش آتی ہے۔ یہ ایک فن ہے، جس پر الگ سے کتابیں ہیں۔

علوم حدیث میں اور بھی بہت سے شعبے ہیں، اور بھی فنون ہیں جن کا ذکر میں وقت کی تنگی کے باعث چھوڑ رہا ہوں۔

اگر آپ پسند کریں تو سوالات کل کر لیں گے اور اگر آپ اصرار کرتی ہیں تو میں ابھی جواب دے دیتا ہوں۔ چونکہ بات لمبی ہوگئی یہ موضوع بہت لمبا تھا، اب بھی تقریباً آدھے کے قریب رہ گیا۔ اس آدھے میں جو چیزیں زیادہ اہم تھیں وہ میں نے بیان کر دیں اور جو بیان نہیں کیں تو جب اللہ تعالیٰ آپ کو موقع عطا فرمائے گا آپ باقی موضوعات کا بھی مطالعہ فرمالیجئے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆

دسواں خطبہ

کتب حدیث - شروح حدیث

جمعرات، 16 اکتوبر 2003ء

کتب حدیث - شروح حدیث

آج کی گفتگو میں حدیث کی چند مشہور کتابوں اور ان کی شرحوں کا تعارف مقصود ہے۔ یہ تعارف دو حصوں پر مشتمل ہوگا۔ حدیث کی وہ بنیادی کتابیں اور ان کی وہ شرحیں جو برصغیر سے باہر لکھی گئیں ان پر آج کی نشست میں گفتگو ہوگی۔ وہ کتب حدیث اور شرحیں جن کی تصنیف کا کام برصغیر میں ہوا ان میں سے چند ایک کے بارہ میں کل بات ہوگی۔

علم حدیث جس کی تدوین، تاریخ اور علوم وفنون کا تذکرہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ گزشتہ نو دنوں میں ہوا ہے اس سے بخوبی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ محدثین کرام نے جو بے مثال کام کیا اس پر وہ امت کی طرف سے کتنے شکر اور کتنے غیر معمولی امتنان واحترام کے مستحق ہیں۔ اللہ رب العزت نے ان کو جس اہم اور عظیم الشان کام کے لئے منتخب فرمایا وہ نہ صرف اسلام کی تاریخ میں بلکہ پوری انسانیت کی تاریخ میں ایک نہایت منفرد نوعیت کا کام ہے۔ انہوں نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا جس کی مثال انسانوں کی فکری، علمی، مذہبی اور تہذیبی تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ سارا کام جو دراصل ملت مسلمہ کی فکری اور تہذیبی بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے، آج ہم میں سے بہت سے لوگوں کے سامنے نہیں ہے۔

جن حضرات نے یہ قربانیاں دیں وہ قربانیاں دے کر دنیا سے تشریف لے گئے۔ جن حضرات نے یہ مشقتیں برداشت کیں وہ مشقتیں اللہ کی بارگاہ میں یقیناً مقبول ہوئی ہوں گی۔ ان سب مشقتوں کی تفصیل ان سب حضرات کے نامہ اعمال میں لکھی ہوئی ہے۔ ان بے پناہ مشقتوں کا علم یا صرف اللہ کو ہے یا ان حضرات کو ہے جنہوں نے یہ مشقتیں برداشت کیں۔ ہمارے سامنے

ان ساری مشقتوں کے جو نتائج ہیں اور ان کے جو کارنامے اور ثمرات ہیں وہ ان کتابوں کی شکل میں موجود ہیں جن میں آج احادیث لکھی ہوئی ہیں۔ یہ مجموعے ان کی کاوشوں کے نتیجہ میں مرتب ہوئے۔

احادیث کے یہ مجموعے عام کتابوں سے مختلف ہیں۔ عام کتاب جب ایک شخص لکھتا ہے تو اس کا عام طریقہ یہ ہے کہ وہ کسی کتب خانہ میں بیٹھ کر بہت سی کتابیں سامنے رکھ لیتا ہے، تحقیق کرتا ہے اور چند سال یا چند مہینے کی محنت کرکے، کم یا زیادہ مدت میں تحقیق کرکے، کتاب تیار کر لیتا ہے۔ احادیث کے مجموعے اس طرح تیار نہیں ہوئے۔ وہ جس غیر معمولی مشقت اور جن غیر معمولی سفروں کے نتیجے میں تیار ہوئے وہ آپ کے سامنے ہیں۔ اس لئے جب ان کتابوں کا تعارف کرایا جائے اور ان پر لکھی جانے والی شروح کا تعارف کرایا جائے تو یہ ساری کاوش اور کوشش جو ابتدائی تین چار صدیوں میں ہوئی وہ ہمارے سامنے رہنی چاہئے۔ حدیث کی کوئی کتاب بظاہر چھوٹی سی ہوگی۔ اس میں احادیث کی تعداد بھی چند ہزار یا چند سو ہوگی لیکن ان چند ہزار یا چند سو احادیث کا مجموعہ ہم تک پہنچانے کے لئے ان حضرات کو کیا کچھ کرنا پڑا، اس کا اندازہ آپ کو گزشتہ نو خطبات کے دوران ہو چکا ہوگا۔

یوں تو احادیث کے بے شمار مجموعے مرتب ہوئے۔ صحابہ کرامؓ کے مجموعوں کا میں نے ذکر کیا۔ صحابہ کرامؓ کے براہ راست مرتب کئے ہوئے کئی مجموعے آج ہمارے پاس موجود ہیں جن میں صحیفہ ہمام بن منبہؒ بہت مشہور ہے جو حضرت ابو ہریرہؓ نے اپنے شاگرد ہمام بن منبہؒ کو املا کرایا تھا۔ یہ مجموعہ آج مطبوعہ شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ اسی طرح سے کچھ اور چھوٹے چھوٹے مجموعے صحابہ کرامؓ اور تابعین کے مرتب کئے ہوئے ہم تک پہنچے ہیں۔ جن میں سے بعض مطبوعہ ہیں اور بعض ابھی تک کتب خانوں کی زینت ہیں۔

ایسا ہی ایک مجموعہ 'کتاب السرد والفرد' کے نام سے ڈاکٹر حمید اللہؒ نے ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں ایک بزرگ نے صحابہ اور تابعین کے مرتب کئے ہوئے کئی چھوٹے چھوٹے مجموعے یکجا کئے ہیں اور اس اعتبار سے یہ کتاب احادیث نبوی کے قدیم ترین مجموعوں کا ایک مجموعہ ہے۔ لیکن یہ مجموعے عام طور پر متداول نہیں ہیں اور صرف ان حضرات کی دلچسپی کا ہدف ہیں جن کو علم حدیث کی تاریخ اور اس پر ہونے والے اعتراضات کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ عام

قارئین کے لئے یا علم حدیث کے عام طلبہ کے لئے وہ مجموعے زیادہ دلچسپی اور زیادہ اہمیت رکھتے ہیں جو عام طور پر کتب خانوں میں دستیاب ہیں، جو اپنی ترتیب کی خوبی اور جامعیت کی وجہ سے دوسرے قدیم تر مجموعوں سے زیادہ مفید اور مقبول ہیں۔

موطا امام مالکؒ

ان میں معروف اور متداول ہونے کے اعتبار سے قدیم ترین مجموعہ امام مالک کی موطا ہے۔ موطا سے پہلے بھی مجموعے تیار ہوئے اور ان میں سے بعض آج بھی موجود ہیں لیکن وہ مقبول اور متداول مجموعے نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ذکر عام طور پر علم حدیث کے سیاق وسباق میں کم ہوتا ہے۔ متداول اور معروف ومقبول اور مشہور مجموعوں میں قدیم ترین مجموعہ امام مالک کی موطا ہے۔ موطا کے لفظی معنی تو ہیں: Beaent Track یعنی وہ راستہ جس کو لوگوں نے پے در پے چل کر اتنا ہموار کر دیا ہو کہ بعد والوں کے لئے اس پر چلنا آسان ہو گیا ہو۔ امام مالک نے جب موطا مرتب کی تو انہوں نے کوشش کی کہ وہ تمام احادیث، صحابہ کرامؓ کے آثار، تابعین کے اجتہادات اور عمل اہل مدینہ پر معلومات وتحقیقات کے ذخائر ان میں جمع کر دئے جائیں جن پر مسلسل عمل درآمد ہو رہا ہے اور جو ایک لمحہ کے لئے بھی عمل سے خالی نہیں رہے۔ پھر امام مالک نے اس کتاب کو مرتب کرنے کے بعد اپنے ہم عصر جید ترین اہل علم کی بڑی تعداد کو، جن کے بارے میں بعض حضرات کا خیال ہے کہ ان کی تعداد ستر تھی، ان کو دکھایا اور ان کی منظوری اور پسند کے بعد امام مالک نے اس مجموعے کو مشتہر کیا۔

یہ بات کہ امام مالک کو یہ مجموعہ مرتب کرنے کا خیال کیوں آیا۔ اس کے بارے میں بعض روایات کتب حدیث اور کتب تاریخ میں بیان ہوئی ہیں۔ ایک بات جو عام طور سے مشہور ہے جو بظاہر درست معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ امام مالک نے یہ مجموعہ عباسی خلیفہ منصور کے کہنے پر مرتب کیا تھا۔ منصور عباسی خاندان کا ایک نہایت نامور، ذہین اور صاحب علم فرد تھا۔ اس نے خود ایک طویل عرصہ مدینہ منورہ میں گزارا تھا۔ امام مالک کا ہم درس تھا اور امام مالک کے ساتھ مل کر بہت سے اہل علم سے اور بہت سے محدثین اور فقہا سے اس نے کسب فیض کیا تھا۔ اس نے خلیفہ بننے کے بعد امام مالک سے یہ درخواست کی کہ اس وقت دنیائے اسلام میں، جو اس وقت

ایک ہی مملکت پر مشتمل تھی، ایسی کتاب کی ضرورت ہے جس کی تمام عدالتیں، مفتی صاحبان اور فقہ اسلامی پر کام کرنے والے تمام لوگ پیروی کریں۔ اتنی مختصر ہو کہ ہر شخص اس سے استفادہ کر سکے۔ اتنی چھوٹی بھی نہ ہو کہ لوگ اس سے استفادہ نہ کر سکیں اور اتنی ضخیم بھی نہ ہو کہ اس کو پڑھنا وقت طلب ہو جائے۔ اس میں ان تمام سنتوں اور احادیث کو جمع کیا جائے جن پر حضورؐ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے سے عمل ہوتا آیا ہے۔ صحابہ کرامؓ اور تابعین کے وہ اقوال بھی اس میں شامل ہوں جن سے قرآن پاک اور احادیث کے مفہوم کو سمجھنے میں مدد ملے۔ نہ اس میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے شواذ ہوں، نہ عبداللہ بن عباسؓ کی رخص ہوں اور نہ عبداللہ بن عمرؓ کی سختیاں ہوں بلکہ وہ ایک درمیانی راستہ کو بیان کرتی ہو۔

امام مالک نے اس تجویز کے مطابق موطا لکھنی شروع کی اور ایک طویل عرصہ تک اس کے لئے مواد جمع کرتے رہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ انہوں نے چالیس سال اس کام میں لگائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ چالیس سال منصور کے کہنے کے بعد نہیں لگے ہوں گے۔ وہ پہلے سے علم حدیث پر جو کام کر رہے تھے اور جو یادداشتیں وہ مرتب کر رہے تھے، امام مالک نے انہی کو سامنے رکھا اور منصور کی تجویز کے مطابق مجوزہ کتاب پر کام شروع کر دیا۔

امام مالک اس کام کے لئے یقیناً اپنے زمانے میں موزون ترین شخصیت تھے۔ علم حدیث میں بھی ان کو بڑا نمایاں مقام حاصل تھا اور علم فقہ میں بھی وہ اتنا نمایاں مقام رکھتے ہیں کہ چار بڑے مسالک فقہ میں سے ایک کے بانی ہیں۔ امام مالک نے مدینہ منورہ میں جن اصحاب علم سے کسب فیض کیا وہ تمام جید صحابہ کرامؓ کے علوم وفنون کے جامع تھے۔ حضرات شیخین، حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت علی بن ابی طالبؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، کہ صحابہ کرامؓ میں ان سے زیادہ احادیث اور سنت کی سختی سے پیروی کرنے والا مشکل سے ملے گا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ جو ترجمان القرآن اور حبر الامہ یعنی امت کے سب سے بڑے عالم کہلاتے تھے، حضرت ابو ہریرہؓ جو ایک طویل عرصہ مدینہ منورہ میں حدیث کی روایت کرتے رہے اور جو سب سے بڑی تعداد میں احادیث کے راوی ہیں۔ حضرت زید بن ثابتؓ جو کاتب وحی اور دربار رسالت کے سیکریٹری تھے۔ ان سب کے علوم وفنون مدینہ منورہ میں موجود تابعین تک پہنچے۔ امام مالک نے ان سب تابعین سے کسب فیض کیا اور یہ سارے علوم ان تک منتقل ہوئے۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے مدینہ منورہ میں صحابہ کرامؓ کے بعد جو نسل بہت نمایاں ہوئی ان میں فقہائے سبعہ کا مقام بہت بلند ہے۔ فقہائے سبعہ وہ حضرات ہیں جو مدینہ منورہ میں علم حدیث اور علم فقہ میں سب سے نمایاں تھے۔ دنیا بھر سے لوگ ان کے پاس استفادہ اور رہنمائی کے لئے آیا کرتے تھے۔ یہ حضرات مدینہ منورہ کے صحابہ کرامؓ کے علوم وفنون کے امین اور جامع تھے۔ امام مالک کو ان حضرات کا علم بھی پہنچا۔ انہوں نے ان حضرات کے تلامذہ سے اور ان کی تحریروں سے استفادہ کیا۔ ان کے اساتذہ میں امام نافع بھی شامل تھے جو تیس سال حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ شب وروز رہے۔ سفر میں بھی ساتھ رہے اور حضر میں بھی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے علاوہ انہوں نے دوسرے مدنی صحابہ سے بھی کسب فیض کیا۔ دنیائے اسلام کے دوسرے شہروں میں بھی گئے۔

امام مالک نے بہت بچپن میں، کم سنی میں امام نافع کی صحبت اختیار کر لی تھی اور ایک طویل عرصہ جس کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چوبیس سال یا اس کے لگ بھگ ہے وہ امام نافع کے پاس رہے۔ امام نافع کے انتقال کے بعد ہی امام مالک نے اپنا حلقہ درس قائم کیا۔ اس کے علاوہ امام مالک نے اپنے زمانے کے بڑے بڑے اساتذہ اور مدینہ منورہ کے صف اول کے محدثین اور فقہا سے علم حاصل کیا۔ امام زہری، امام جعفر صادق، یحیٰ بن سعید الانصاری، امام لیث بن سعد جو امام شافعی کے بھی استاد ہیں اور جن کا مزار مصر میں ہے، اور ربیعۃ الرائے جو امام مالک کے اساتذہ میں بڑا نمایاں مقام رکھتے ہیں، ان سب کے علوم وفنون سے استفادہ کرنے کے بعد امام مالک نے موطا امام مالک لکھی۔

امام مالک کے بارے میں ایک چیز بڑی نمایاں ہے اور وہ یہ کہ ان کے شیوخ کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ بقیہ محدثین کے تذکروں میں آپ نے سنا ہوگا کہ کسی نے سترہ سو محدثین سے استفادہ کیا، کسی نے اٹھارہ سو سے کسی نے ہزار سے۔ امام مالک کے شیوخ کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ان کے شیوخ کی تعداد چورانوے ہے۔ کسی نے کہا کہ تریسٹھ ہے۔ کسی نے اس کے کم وبیش بیان کی ہے۔ یعنی ساٹھ اور نوے کے درمیان ان کے شیوخ کی تعداد بیان کی جاتی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ امام مالک نے پہلے دن سے یہ طے کیا تھا کہ میں صرف اس شیخ سے

کسب فیض کروں گا جو علم حدیث کے ساتھ ساتھ تفقہ میں بھی بڑا اونچا مقام رکھتے ہوں اور حدیث کے فہم اور عملی انطباق اور اس سے نکلنے والے مسائل پر بھی ان کی گرفت مضبوط ہو۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں کہ میں کسی غیر فقیہ کی محفل میں نہیں بیٹھا اور جن کی محفل میں بیٹھ کر استفادہ کیا وہ سب کے سب جید فقہا تھے۔ خود ایک جگہ فرمایا کہ میں نے محض کسی کے زہد و اتقا کی بنیاد پر اس کی شاگردی اختیار نہیں کی بلکہ صرف ان حضرات کی شاگردی اختیار کی جو زہد و اتقا کے ساتھ ساتھ علم حدیث اور روایت میں اونچا مقام رکھتے تھے، اور تفقہ اور بصیرت میں بہت آگے تھے۔ میں نے صرف ایسے ہی لوگوں سے کسب فیض کیا۔ ایک جگہ لکھا کہ میں نے مدینہ منورہ میں ایسے ایسے لوگ دیکھے کہ اگر ان کا نام لے کر دعا کی جاتی تو شاید اللہ تعالیٰ بارش برسا دیتا، گویا دین، تقویٰ اور روحانیات میں وہ اس درجہ کے لوگ تھے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ ان میں سے کچھ تفقہ میں اونچا مقام نہیں رکھتے تھے اس لئے میں ان کے حلقہ درس میں نہیں بیٹھا۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالک کے اساتذہ کی تعداد نسبتاً تھوڑی ہے۔ لیکن وہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے کہ جب ایک مرتبہ یہ ثابت ہو جاتا تھا کہ فلاں شیخ امام مالک کے استاد ہیں تو پھر محدثین ان کے حفظ وضبط اور عدالت وغیرہ کی مزید تحقیق نہیں کرتے تھے۔ امام یحیٰ بن معین کہتے ہیں کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی راوی امام مالک کے اساتذہ میں شامل ہیں تو میں اس راوی کی مزید تحقیق نہیں کرتا۔ امام احمد بن حنبل کا کہنا ہے کہ اگر کسی شیخ سے امام مالک نے روایت لی ہو تو پھر اس شیخ کی روایت قبول کرنے میں مجھے کوئی تامل نہیں۔

ایسے برگزیدہ شیوخ سے روایتیں لے کر امام مالک نے موطا مرتب فرمائی جو ایک لاکھ احادیث میں سے انتخاب ہے۔ ایک لاکھ احادیث میں متون تھوڑے ہیں روایات اور سندیں زیادہ ہیں۔ ایک لاکھ طریقوں سے جو روایات پہنچی تھیں ان میں سے امام مالک نے انتخاب کیا جن میں کم وبیش ایک ہزار سے کچھ کم احادیث ہیں اور دو ہزار کے قریب صحابہ اور تابعین کے اقوال، ارشادات اور آثار ہیں۔ یہ سارے کے سارے اندراجات وہ ہیں جو خالص عملی مسائل سے متعلق ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں انسانی کو ذاتی، انفرادی اور اجتماعی معاملات میں جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے وہ سارے کے سارے معاملات امام مالک کی موطا میں موجود ہیں۔ اس میں جتنی بھی احادیث ہیں جو ایک ہزار کے لگ بھگ ہیں وہ ساری کی ساری صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں موجود ہیں۔ محدثین نے تحقیق کر کے اس بات کی تصدیق کی ہے وہ سب کی سب صحیح اور مرفوع

روایات ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی صحت کے اعلیٰ درجہ سے نیچے نہیں ہے۔ اسی لئے صحیحین سے پہلے کے زمانے میں جب صحیح مسلم اور صحیح بخاری مرتب نہیں ہوئی تھیں عام طور پر لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ موطا امام مالک اصح کتب بعد کتاب اللہ ہے۔ امام شافعی کا یہ ارشاد بہت سی کتابوں میں منقول ہے کہ کتاب اللہ کے بعد صحیح ترین کتاب موطا امام مالک ہے، اس لئے کہ اس وقت صحیح بخاری اور صحیح مسلم موجود نہیں تھیں۔ بعد میں چونکہ یہ سارا ذخیرہ بخاری اور مسلم میں شامل ہو گیا، اس میں مزید صحیح احادیث بھی شامل ہو گئیں اور صحابہ اور تابعین کے اقوال جو موطا امام مالک میں تعلیقات یا بلاغات کے طور پر آئے تھے ان کتابوں میں براہ راست سند کے ذریعے بیان ہو گئے اس لئے ان دونوں کتابوں میں سے کسی ایک کتاب کو (زیادہ تر حضرات نے صحیح بخاری کو) اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیا ہے۔

امام مالک ایک طویل عرصہ تک موطا پڑھاتے رہے۔ طلبہ دور دور سے ان کے پاس آیا کرتے تھے اور موطا امام مالک کا درس لیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے امام مالک کو جو مرتبہ عطا فرمایا اس کا اندازہ دو چیزوں سے ہوتا ہے۔ ایک حدیث ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ عنقریب ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگ اونٹ کی پشت کو کستے ہوئے دور دور کا سفر کریں گے اور علم دین کی تلاش میں نکلیں گے لیکن مدینہ کے عالم سے بڑا کوئی عالم انہیں نہیں ملے گا۔ اکثر محدثین اور علمائے حدیث کی بڑی تعداد کے نزدیک اس حدیث کا مصداق امام مالک ہیں۔ اس لئے کہ ان کے زمانے میں ایسا کوئی عالم نہیں تھا جس کی خدمت میں لوگ دور دور سے آئیں۔ تین براعظموں سے لوگ امام مالک کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ افریقہ، ایشیا اور یورپ۔ چنانچہ اسپین سے امام یحیٰ بن یحیٰ المصمودی جو ان کے شاگردوں میں سب سے نمایاں مقام رکھتے ہیں اور موطا امام مالک کے سب سے مقبول نسخہ کے راوی ہیں، ان کا تعلق یورپ سے تھا۔ ایشیا میں خراسان اور سمرقند جیسے دور دراز علاقوں سے لوگ ان کی خدمت میں آئے اور موطا امام مالک کا درس لے کر گئے۔

اللہ تعالیٰ نے امام مالک کو غیر معمولی عزت اور بڑے مال و دولت سے نوازا تھا۔ وہ جس مکان میں رہتے تھے وہ ایک زمانہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مکان رہ چکا تھا اور جس مکان میں درس حدیث کی محفل لگتی تھی وہ حضرت عمر فاروقؓ کا مکان تھا۔ درس حدیث کے لئے

وہاں بڑا پر تکلف اہتمام ہوتا تھا۔ صفائی خاص اہتمام سے کرائی جاتی تھی۔ عود اور لوبان کی خوشبو جلائی جاتی تھی۔ امام مالک غسل کر کے اور عمدہ لباس پہن کر آتے تھے اور تمام حاضرین مودب ہو کر بیٹھتے تھے۔ ایک مرتبہ امام ابوحنیفہ حاضر ہوئے اور بقیہ عام طلبہ کی طرح مودب ہو کر بیٹھ گئے۔ اسی طرح جو بھی آتا تھا وہ چھوٹا ہو یا بڑا، اسی طرح مودب ہو کر بیٹھ جاتا تھا۔ امام شافعی بھی طالب علم کی حیثیت سے اس درس میں شریک ہوئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ کتاب کا ورق بھی اتنا آہستہ پلٹتے تھے کہ ورق پلٹنے کی آواز نہ ہو۔ آواز ہوگی تو محفل کے سکون اور کیفیت میں خلل پڑے گا۔

ایک دیکھنے والے نے بیان کیا کہ وہاں دربار شاہی جیسا رعب داب ہوا کرتا تھا۔ جب پڑھنے والے پڑھ کر نکلتے تھے تو دروازے پر سواریوں کا ہجوم ایسا ہوتا تھا جیسے شاہی دربار برخواست ہو گیا ہو اور سواریاں نکل نکل کر جا رہی ہوں۔ کسی بھی آدمی کو وہاں کوئی خصوصی یا نمایاں مقام حاصل کرنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ خلفائے وقت مہدی، ہارون اور منصور تینوں کو اپنے اپنے زمانے میں امام مالک کے درس میں بیٹھنے کا موقع ملا۔ یہ لوگ اس درس میں آئے تو عام آدمی کی طرح طالب علم کی حیثیت سے بیٹھے اور اسی طرح مودب ہو کر بیٹھے رہنے کے بعد چلے گئے۔ خلیفہ مہدی نے ایک مرتبہ گزارش کی کہ میں مدینہ منورہ آیا ہوں۔ میری تین گزارشات ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ مجھے موطا امام مالک کی اجازت عطا فرمائیں، دوسری یہ کہ میرے دونوں بیٹوں کو درس میں حاضری کا موقع دیں، اور تیسری یہ کہ میرے بیٹوں کے لئے خصوصی محفل کا اہتمام فرمائیں۔ امام مالک نے کہا کہ پہلی دونوں درخواستیں قبول ہیں تیسری قابل قبول نہیں ہے۔ صاحبزادے محفل میں آئیں جہاں جگہ ملے بیٹھ جائیں اور درس لے کر چلے جائیں۔ چنانچہ مہدی کے دونوں بیٹے، اس فرمانروا کے بیٹے جس کی حکومت اسپین سے لے کر سمرقند اور بخارا تک اور آرمیپا اور آذربائیجان سے لے کر سوڈان تک پھیلی ہوئی تھی، اس کے بیٹے امام مالک کے درس میں عام لوگوں کی طرح بیٹھے اور درس لے کر چلے گئے۔ آپ نے فرمایا اور یہ جملہ مشہور ہے کہ العلم یؤتیٰ ولا یأتی، علم کی خدمت میں حاضر ہوا جاتا ہے، علم کسی کی خدمت میں حاضر نہیں ہوتا۔

کچھ زمانہ کے بعد خلیفہ ہارون ان کے دربار میں آیا اور گزارش کی کہ امام مالک کوئی حدیث پڑھ کر سنا دیں تا کہ میں سنوں اور حدثنا کی اسلوب پر مجھے حدیث پڑھنے کی اجازت دے دیں۔ امام مالک نے کہا کہ میرا اسلوب حدثنا کا نہیں بلکہ اخبرنا کا ہے۔ موطا کا نسخہ کہیں سے لے

لیجئے، پڑھ کر سنائیے میں سن کر اجازت دے دوں گا۔ میرا طریقہ یہ ہے جس کو میں خلیفہ سمیت کسی کے کہنے پر بھی بدل نہیں سکتا۔ چنانچہ ہارون الرشید نے بیٹھ کر موطا امام مالک پڑھی اور پڑھ کر اجازت لی جیسے کہ باقی شاگرد اجازت لیا کرتے تھے۔

امام شافعی جب امام مالک کی خدمت میں حاضر ہوئے تو امام مالک کا آخری زمانہ تھا۔ امام مالک ان دنوں صرف مخصوص طلبہ کو موطا کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ عام درس انہوں نے بند کر دیا تھا۔ امام مالک کی عمر پچانوے برس کے قریب ہوئی تھی۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب ان کی عمر بانوے یا ترانوے سال تھی۔ صحت اجازت نہیں دیتی تھی کہ بڑے پیمانے پر طلبہ کو درس دیں۔ امام مالک کی خدمت میں حاضری سے پہلے امام شافعی نے مکہ مکرمہ کے گورنر سے مدینہ منورہ کے گورنر کے نام سفارشی خط لیا کہ نوجوان محمد بن ادریس شافعی کو امام مالک کے دربار میں پہنچا دیا جائے اور اجازت دلائی جائے کہ یہ موطا کے درس میں شریک ہوں۔ امام شافعی گورنر مدینہ کے پاس گورنر مکہ کا وہ خط لے کر گئے، اپنا تعارف کروایا، خط پیش کیا اور امام مالک کے درس میں شریک ہونے کے لئے سفارش چاہی، گورنر نے کہا کہ چلیں میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔

جب دونوں امام مالک کے در دولت پر پہنچے تو ملازمہ نے کہا کہ یہ ان کے آرام کا وقت ہے۔ آپ کو ملنا ہو تو فلاں وقت پر آسکتے ہیں۔ گورنر صاحب واپس چلے گئے۔ امام مالک کے اٹھنے کا وقت ہوا تو یہ دونوں دوبارہ پہنچے۔ وہاں جا کر گورنر نے بہت ادب اور احترام سے درخواست کی اور اپنی شرمندگی دور کرنے کی غرض سے مکہ کے گورنر کا خط بھی پیش کر دیا کہ میں اس سفارش کے سلسلہ میں حاضر ہوا ہوں۔ امام مالک نے خط دیکھ کر پھینک دیا اور کہا کہ اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث گورنروں کی سفارشوں پر پڑھائی جایا کرے گی اور ناخوشی کا اظہار کیا۔ گورنر نے معذرت کی۔ امام شافعی نے عرض کیا کہ میرا تعلق رسول اللہ ﷺ کے خاندان سے ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ امام شافعی مُطّلِبی تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے پردادا جناب ہاشم کے بھائی مطلب کی اولاد میں سے تھے۔ مُطّلِب جناب ہاشم کے بھائی تھے اور امام شافعی ان کی اولاد میں سے تھے۔ یہ نسبت سن کر امام مالک نے اجازت دے دی۔ مکہ اور مدینہ کے گورنروں کی سفارش کو تو انہوں نے درخور اعتنا نہیں سمجھا لیکن رسول اللہ ﷺ کے خاندان کی نسبت کا حوالہ سن کر اجازت دے دی۔

اس سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ وہ کس شان کا درس ہوتا ہوگا اور کیسے لوگ موطا کا درس لیتے ہوں گے۔ موطا کا درس کتنے لوگوں نے لیا اس کا تعین کرنا بہت دشوار ہے۔ بلاشبہ وہ ہزاروں لوگ ہوں گے۔ جن لوگوں کو تحریری طور پر باقاعدہ اجازت عطا ہوئی ان کی تعداد بھی سینکڑوں میں ہے، ایک ڈیڑھ ہزار کے قریب ہے۔ ہر علاقہ میں یہ حضرات موجود تھے۔ تمام بڑے بڑے محدثین بالواسطہ یا بلاواسطہ امام مالک کے شاگرد ہیں۔ امام احمد، امام بخاری، امام ابوداود، امام ترمذی اور امام نسائی یہ سب حضرات ایک ایک واسطہ سے امام مالک کے شاگرد تھے۔ ائمہ فقہ میں سے امام شافعی اور امام محمد بن حسن شیبانی براہ راست امام مالک کے شاگرد تھے۔ اتنا غیر معمولی مقام ومرتبہ جس شخص کو حاصل ہو جائے پھر اللہ تعالیٰ اس کے تواضع اور اس کے کردار کو اور جواب دہی کے احساس کو برقرار رکھے، یہ بہت بڑی بات ہے۔

ایک مرتبہ ایک بڑی محفل میں مکہ مکرمہ تشریف فرما تھے۔ غالباً حج کے لئے تشریف لے گئے تھے، مکہ مکرمہ میں جس طرح اور جس پیمانے پر تشنگان علم کا رجوع ہوا ہوگا اس کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ بڑی تعداد میں لوگ جمع ہوئے۔ اس محفل میں جہاں بڑے بڑے لوگ موجود تھے، امام مالک سے چالیس سوالات کئے گئے۔ اڑتیس سوالات کے جواب میں فرمایا 'لاادری، مجھے نہیں پتہ، صرف دو سوالات کا جواب دیا کہ ہاں ان کا جواب میں جانتا ہوں۔

ایک مرتبہ ایک شخص چھ ماہ کی مسافت کا طویل سفر کرکے پہنچا۔ غالباً اسپین سے آیا تھا اور کوئی مسئلہ پوچھا۔ امام مالک نے بتایا کہ میں نہیں جانتا۔ یہ بات میرے علم میں نہیں ہے۔ اس نے تھوڑا سا ناخوشی کا اظہار کرکے کہا کہ میں چھ مہینے کا سفر کرکے آیا ہوں، لوگوں نے آپ سے یہ مسئلہ پوچھنے کے لئے مجھے بھیجا ہے۔ میں جب واپس جاؤں گا تو ان لوگوں کو کیا جواب دوں گا۔ آپ نے کہا کہ ان سے کہنا کہ مالک نے کہا ہے کہ مجھے معلوم نہیں۔ جس چیز کے بارے میں مکمل اور سو فیصد تحقیق نہیں ہوا کرتی تھی اس کا جواب نہیں دیا کرتے تھے۔

موطا امام مالک کم وبیش **140**ھ کے لگ بھگ مرتب ہوئی۔ جب موطا امام مالک مرتب ہوئی اور اس کو مقبولیت حاصل ہوئی تو اور بھی کئی لوگوں نے، جن میں کئی حضرات استناد اور ثقاہت کے اعتبار سے زیادہ بلند معیار کے نہیں تھے، کتابیں لکھنی شروع کردیں۔ لوگوں نے امام مالک سے کہا کہ فلاں بھی کتاب لکھ رہا ہے، فلاں بھی لکھ رہا ہے، فلاں بھی لکھ رہا ہے۔ آپ نے

ایک بات ایسی فرمائی کہ آج اس کی تصدیق سب کے سامنے ہے۔ آپ نے فرمایا کہ 'حسن نیت کو بقا ہے'۔ جس نے اچھی نیت سے لکھی ہوگی اس کی کتاب کو بقا ہوگی۔ آج کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کتابیں کہاں گئیں۔ تذکروں میں ذکر ملتا ہے کہ لوگوں نے امام مالک کے مقابلہ میں کتابیں لکھیں تھیں۔ لیکن وہ سب کتابیں فنا کا شکار ہوئیں۔ لیکن بقا موطا امام مالک کو حاصل ہوئی۔

امام مالک کی کتاب میں چالیس ثنائیات ہیں۔ ثنائیات سے مراد وہ احادیث ہیں جن میں حضورؐ اور امام مالک کے درمیان صرف دو واسطے ہوں۔ ایک امام مالک کے استاد اور دوسرے کوئی صحابی رسول ﷺ۔ ان میں سے ایک سند وہ بھی ہے جس کا میں کئی بار ذکر کر چکا ہوں، مالك عن نافع عن ابن عمر، امام مالک امام نافع سے روایت کرتے ہیں اور وہ عبداللہ بن عمر سے، صرف دو واسطے ہیں۔

امام مالک سے موطا کا املا لینے والوں میں ہزاروں حضرات شامل تھے۔ سننے والے اور عمومی استفادہ کرنے والے تو پتہ نہیں کتنے ہوں گے، شاید لاکھوں ہوں گے۔ لیکن جن لوگوں نے پوری موطا امام مالک پڑھ کر اس کی باقاعدہ اجازت لی اور سند حاصل کی ان کی تعداد چودہ سو کے قریب ہے۔ ان چودہ سو میں سے تیس حضرات جو اپنی اپنی جگہ بڑے نامور صاحب علم ہوئے۔ حدیث اور فقہ کے امام ہوئے۔ انہوں نے اپنے اپنے لئے موطا کے نسخے تیار کئے۔ ان تیس نسخوں میں سے سترہ نسخے مشہور ہیں۔ ان سترہ نسخوں میں سے جو سب سے متداول اور معروف نسخہ ہے وہ امام مالک کے شاگرد خاص یحیٰ بن یحیٰ کا ہے۔

یحیٰ بن یحیٰ اسپین سے تشریف لائے تھے۔ طویل عرصہ امام مالک کی خدمت میں رہے۔ موطا امام مالک کے اصل نسخہ کے راوی وہی ہیں۔ انہی کے نسخہ کو موطا کہا جاتا ہے۔ جب کہا جاتا ہے کہ موطا امام مالک میں یہ ہے تو مراد ہوتی ہے یحیٰ بن یحیٰ کا نسخہ۔ باقی نسخے ان کے مرتبین کی طرف منسوب ہوتے ہیں، مثلاً موطا امام محمد۔ تو یہ موطا، امام محمد کی کتاب نہیں ہے بلکہ یہ امام مالک کی موطا کا وہ نسخہ ہے جو امام محمد نے تیار کیا۔ اسی طرح موطا قعنبی بھی ہے۔ قعنبی نے خود کوئی موطا تیار نہیں کی تھی بلکہ یہ موطا امام مالک کا وہ نسخہ ہے جو قعنبی نے تیار کیا۔ اسی طرح باقی نسخے ان کے تیار کرنے والوں کے ناموں سے مشہور ہوئے۔ یحیٰ بن یحیٰ کا نسخہ امام مالک کے نام سے منسوب ہوا۔

ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں درس ہو رہا تھا۔ یحییٰ بن یحییٰ بھی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کہیں سے شور مچا کہ ہاتھی آیا ہوا ہے۔ عرب میں ہاتھی نہیں ہوتا۔ لوگوں کے لئے ایک عجیب چیز تھی۔ تمام حاضرین نکل کر ہاتھی دیکھنے چلے گئے۔ یحییٰ بن یحییٰ بیٹھے رہے۔ امام مالک نے پوچھا: یحییٰ! تم ہاتھی دیکھنے نہیں گئے؟ یحییٰ نے جواب دیا کہ میں اسپین سے آپ کو دیکھنے کے لئے آیا ہوں، ہاتھی کو دیکھنے کے لئے نہیں آیا ہوں۔

امام مالک کی اس کتاب کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں۔ برصغیر میں بھی لکھی گئیں اور برصغیر سے باہر بھی لکھی گئیں۔ دو شرحوں کا ذکر کل برصغیر کے سیاق وسباق میں ہوگا۔ دو شرحیں جو بڑی مشہور ہیں وہ برصغیر سے باہر لکھی گئیں۔ اتفاق سے دونوں اسپین میں لکھی گئیں۔ ایک پرتگال کے ایک عالم نے لکھی اور دوسری اسپین کے ایک عالم نے لکھی۔ اسپین کے عالم تھے علامہ ابن عبدالبر، ان کی کتاب التمھید لما فی الموطامن المعانی والاسانید' ہے۔ اس کے دو تین ایڈیشن چھپے ہیں۔ ایک ایڈیشن جو میں نے دیکھا ہے وہ مراکش کی وزارت اوقاف نے شائع کروایا ہے۔ غالباً تیس بتیس جلدوں میں ہے۔ التمھید بڑی طویل اور مفصل شرح ہے۔ اس کے مصنف علامہ ابن عبدالبر، جن کا ذکر میں پہلے بھی غالباً تذکرہ صحابہ کے ضمن میں کرچکا ہوں، پانچویں صدی ھجری کے بڑے مشہور محدث اور عالم تھے۔ ان کی اور بھی بہت سی کتابیں ہیں۔ اس شرح کا زیادہ زور علم روایت اور علوم حدیث پر ہے۔ موطا امام مالک میں صحابہ کے جتنے اقوال آئے ہیں انہوں نے ان کی سندیں معلوم کی ہیں اور ان کا درجہ متعین کیا ہے جو سب کا سب صحت کو پہنچتا ہے۔ اسی طرح سے وہ اقوال اور فتاویٰ جو امام مالک نے بغیر سند کے بیان کئے ہیں ان کی بھی سندیں انہوں نے بیان کی ہیں اور یہ بتایا ہے کہ کس کس سند سے یہ فتاویٰ اور اور یہ ارشادات پہنچے ہیں۔ جہاں امام مالک نے بتایا ہے کہ اہل مدینہ کا طرز عمل یا سنت کیا ہے۔ اس کے سنت ہونے کے شواہد علامہ ابن عبدالبر نے حدیث کی بقیہ کتابوں سے جمع کئے ہیں۔ اس لئے یہ اس اعتبار سے بڑی غیر معمولی شرح ہے کہ علم روایت اور علوم حدیث کے نقطۂ نظر سے موطا امام مالک کی تشریح اور تائید میں جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ کم وبیش انہوں نے سارے کا سارا کہہ دیا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ کہنا اب تقریباً ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ کوئی انسان خاتم العلما نہیں ہے، لیکن عام اسباب اور شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ موطا امام مالک کی احادیث پر روایتی اور اسنادی نقطہ نظر سے اس کتاب سے

آگے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

دوسری شرح جس شخصیت کی ہے وہ پرتگال کے ایک مشہور عالم اور اپنے زمانہ کے فقیہ تھے، یعنی علامہ ابوالولید الباجی، جب کتب حدیث میں یہ الفاظ آئیں وقال الباجی تو اس سے مراد علامہ ابوالولید الباجی ہوتے ہیں۔ انہوں نے موطا امام مالک کی شرح لکھی جو بڑی ضخیم سائز کی ہے اور باریک حروف کی پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلا ایڈیشن پانچ جلدوں میں نے دیکھا تھا۔ اب سنا ہے کہ دوسرا ایڈیشن چھپا ہے جو غالباً پندرہ سولہ جلدوں میں ہے۔ میں نے دیکھا نہیں ہے۔ لیکن پانچ جلدوں والا ایڈیشن میں نے دیکھا ہے۔ اس میں علامہ ابوالولید الباجی نے موطا امام مالک کے فقہی مباحث پر زیادہ زور دیا ہے۔ گویا یہ دونوں شرحیں مل کر ایک دوسری کی تکمیل کرتی ہیں۔ ایک موطا امام مالک کی حدیثیات کی تکمیل کرتی ہے دوسری فقہیات کی تکمیل کرتی ہے۔ اور یہ دونوں مل کر موطا امام مالک کے دونوں پہلوؤں کو بیان کرتی ہیں۔ اس لئے کہ موطا امام مالک حدیث کی کتاب بھی ہے اور فقہ کی کتاب بھی ہے۔ حدیث کی کتاب اس لئے کہ وہ احادیث کا مجموعہ ہے اور فقہ کی کتاب اس لئے کہ اس میں امام مالک کے اپنے فتاویٰ، صحابہ اور تابعین کے فتاویٰ بھی ہیں اور تمام عملی مسائل میں صحابہ کرامؓ کی جو سنت ہے اس کا بھی تذکرہ ہے۔ اس طرح یہ فقہ کی کتاب بھی ہے، فقہ الحدیث بھی ہے اور حدیث کا مجموعہ بھی ہے۔ ان دونوں کتابوں میں ان تینوں نقطہ ہائے نظر سے بحث ہوئی ہے اور یوں یہ دونوں کتابیں ایک دوسری کی تکمیل کرتی ہیں۔

موطا امام مالک کی کل شرحیں جو لکھی گئیں ان کی تعداد تیس کے قریب ہے۔ یعنی یہ تیس شرحیں وہ ہیں جو آج لکھی ہوئی موجود ہیں، کتابوں میں ان تذکرہ ہے اور کتب خانوں میں پائی جاتی ہیں۔ موطا امام مالک کی براہ راست شروح کے علاوہ موطا امام مالک پر لوگوں نے کتابیں بھی لکھی ہیں۔ مثلاً موطا امام مالک میں جو احادیث ہیں ان کے رجال پر لوگوں نے کتابیں لکھی ہیں۔ اس کی احادیث میں جو مشکل الفاظ ہیں ان کے حل لغات پر کتابیں آئی ہیں۔ جو غریب الفاظ آئے ہیں ان کی غرابت پر کتابیں ہیں۔ یہ کتابیں کم وبیش ستر کی تعداد میں ہیں۔

مُصَنَّف عبدالرزاق

موطا امام مالک کے بعد دوسری صدی ہجری کے اواخر میں مرتب اور مدوّن ہونے والا سب سے بڑا مجموعہ مُصَنَّف عبدالرزاق ہے۔ مصنف عبدالرزاق بارہ جلدوں میں چھپی ہے۔ اب

اس کا دوسرا ایڈیشن بھی آیا ہے۔ یہ بارہ جلدیں مصنّف کے نام سے مشہور ہیں۔ مصنّف اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں احادیث کے ساتھ ساتھ صحابہ اور تابعین کے اقوال اور فتاویٰ بھی موجود ہوں۔ اس لئے مصنف عبدالرزاق صحابہ اور تابعین کے فتاویٰ کا ایک بہت بڑا ماخذ ہے۔ اس میں تابعین کے فتاویٰ کے ساتھ ساتھ جو نمایاں تبع تابعین ہیں اور ان میں بھی جو بڑے فقہا ہیں جن میں خود امام عبدالرزاق بھی شامل ہیں، ان کے فتاویٰ کا ایک بڑا مجموعہ شامل ہے۔ امام عبدالرّزاق بہت سے محدثین کے استاد ہیں۔ بہت سے محدثین نے ان سے کسب فیض کیا۔ علم حدیث اور علم فقہ دونوں میں ان کا بہت اونچا مقام ہے۔

امام عبدالرّزاق کے بعد ایک اور مُصَنَّف، (مُصَنِّف سے مراد تو وہ آدمی ہے جس نے کوئی کتاب تصنیف کی ہو۔ لیکن مصنَّف ن کے زبر کے ساتھ، کا مطلب ہے وہ کتاب جو تصنیف کی گئی ہو۔ علم حدیث کی اصطلاح میں مصنَّف سے مراد حدیث کی ایک خاص انداز والی کتاب ہے جس میں تمام ابواب پر حدیثیں مرتب کی گئی ہوں اور صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے اجتہادات اور اقوال سب موجود ہوں۔) ابوبکر بن ابی شیبہ کی مصنَّف بھی ہے جس کے کئی ایڈیشن نکلے ہیں کوئی بارہ جلدوں میں ہے کوئی دس میں ہے کوئی پندرہ میں ہے کوئی سولہ میں ہے۔ ابوبکر بن ابی شیبہ کی وفات 235ھ میں ہوئی۔ اس لئے یہ دوسری صدی ہجری کے اواخر اور تیسری صدی ہجری کے اوائل کے محدث ہیں۔ ان کے اساتذہ میں امام سفیان بن عیینہ، عبداللہ بن مبارک، وکیع بن الجراح، امام شافعی کے استاد اور یحییٰ بن سعید قطان جیسے جید ترین محدثین شامل ہیں۔ ان کے براہ راست تلامذہ میں امام احمد، امام بخاری، امام مسلم، ابن ماجہ، ابوزرعہ اور ابوحاتم رازی جیسے لوگ شامل ہیں۔ مصنف ابی بکر بن ابی شیبہ کی ترتیب فقہی ابواب پر ہے۔ یعنی وہ مسائل جو فقہی نوعیت کے ہیں۔ مثلاً پہلے طہارت کے ابواب ہیں، پھر وضو کے ابواب ہیں، پھر نماز کے، پھر روزے کے، پھر حج کے پھر نکاح وطلاق وغیرہ کے ابواب ترتیب سے موجود ہیں۔ عملی مسائل کے متعلق ابواب کی ترتیب کے ساتھ یہ کتاب فقہیات حدیث کا بہت بڑا ماخذ ہے اور احادیث احکام کا سب سے بڑا اور جامع مجموعہ ہے اور اتنا ضخیم ہے کہ پندرہ سولہ جلدوں میں آیا ہے۔ اس لئے احادیث احکام ساری کی ساری اس میں آ گئی ہیں۔

مسند امام احمد بن حنبلؒ

اس کے بعد مشہور ترین مجموعہ 'مسند امام احمد بن حنبلؒ ' ہے۔ امام احمد بن حنبل کی وفات **241**ھ میں ہوئی۔ اس میں جو احادیث ہیں وہ غالباً اور یجنل مجموعوں میں تعداد کے اعتبار سے سب سے زیادہ ہیں۔ کم از کم اس بارہ میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ کتاب احادیث کے چند ضخیم ترین اور جامع ترین والے مجموعوں میں سے ایک ہے۔ اس مجموعہ کی اہمیت کے اظہار کے لئے امام احمد کا نام نامی کافی ہے۔ امام احمد کے بارے میں غالباً علامہ ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ انسان کے متبع سنت اور محبّ سنت ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ اس کو امام احمد سے محبت ہو۔ یعنی جس کو امام احمد سے محبت ہوگی اس کو سنت رسول سے محبت ہوگی۔ جس کو سنت رسول سے محبت ہے اس کو لازماً امام احمد بن حنبل سے محبت ہوگی۔ ایک اور بزرگ کا قول ہے 'لا یحبه الا مومن تقی' ان سے محبت نہیں رکھ سکتا سوائے اس شخص کے جو متقی مومن ہو، 'و لا یبغضه الا منافق شقی ' اور ان سے نفرت نہیں رکھ سکتا سوائے اس شخص کے جو بدبخت منافق ہو۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ کس درجہ کے انسان ہیں۔

امام احمد کے اساتذہ کا بھی بیان کرنے کی ضرورت نہیں اور ان کے تلامذہ کا بھی بیان کرنے کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ وہ اس درجہ کے انسان ہیں کہ ان کے اساتذہ کا نام لینے سے ان کی عظمت میں اضافہ نہیں ہوسکتا۔ اور نہ ہی ان کے تلامذہ کا نام لینے سے ان کی بڑائی میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ امام احمد کا نام لے کر ان کے اساتذہ کی عظمت میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ اسی طرح ان کے تلامذہ کی عظمت میں بھی امام احمد کی نسبت کی وجہ سے اضافہ ہوسکتا ہے۔ امام احمد کے سب سے نمایاں استاد امام شافعی ہیں۔ جن کا انہوں نے انتہائی اہتمام سے ہر جگہ ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ میں نے تیس سال سے کوئی نماز ایسی نہیں پڑھی جس کے بعد میں نے امام شافعی کے لئے دعا نہ کی ہو۔ امام شافعی سے کتنا کسب فیض کیا ہوگا، کتنا کچھ ان سے سیکھا ہوگا جس کے اعتراف کے میں تیس سال انہوں نے امام شافعی کے لئے دعا کی۔ بقیہ اساتذہ سے بھی یقیناً سیکھا ہوگا، لیکن امام شافعی سے بہت زیادہ سیکھا۔

امام احمد بن حنبل جب درس دیا کرتے تھے تو ایک ایک وقت میں پانچ پانچ ہزار طلبہ

درس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ امام بخاری، امام مسلم اور امام ابوداؤد براہ راست ان کے شاگردوں میں شامل ہیں۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان کے شاگرد بھی کس شان کے ہیں۔

امام احمد نے جب یہ کتاب مرتب کی تو اس میں تیس ہزار احادیث شامل کیں۔ یہ تیس ہزار احادیث وہ تھیں جن پر امام احمد مسلسل نظر ثانی کرتے رہتے تھے۔ اور ہر تھوڑے وقفہ کے بعد اس کا نیا نسخہ (version) تیار کیا کرتے تھے۔ پھر رکھ دیا کرتے تھے کہ ابھی مزید غور وخوض کرنا ہے۔ اس طرح پوری زندگی اس ایک کتاب پر غور وخوض کرتے رہے۔ اس کے الگ الگ اجزا گویا پمفلٹس کی شکل میں یا الگ الگ ابواب کی شکل میں ان کے پاس موجود تھے، اس لئے کہ ہر نظر ثانی کے بعد ایک نیا ورژن تیار ہوتا تھا۔

جب امام احمد کا انتقال ہوگیا تو ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن احمد نے (جو ان کے شاگرد اور خود بھی بہت بڑے محدث تھے) اس کتاب کی تہذیب وتکمیل کی۔ انہوں نے اس کتاب میں تقریباً دس ہزار احادیث کا مزید اضافہ کیا۔ یہ دس ہزار نئی احادیث پانچ اقسام میں تقسیم ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جس کی روایت عبداللہ بن احمد بن حنبل براہ راست اپنے والد سے کرتے ہیں۔ یہ تو اسی درجہ کی مستند ہیں جس درجہ کی امام احمد کی اصل مرویات ہیں۔ بقیہ جو چار درجے ہیں ان کے بارے میں محدثین میں مختلف انداز کے تبصرے اور خیالات کا اظہار ہوتا رہا۔ کچھ احادیث وہ ہیں جو عبداللہ بن احمد نے اپنے والد کے علاوہ دوسرے اساتذہ سے حاصل کیں، وہ بھی انہوں نے اس میں شامل کردیں۔ پھر عبداللہ کے ایک رفیق کار تھے جن کا لقب قطیعی تھا (پورا نام مجھے اس وقت یاد نہیں آرہا) انہوں نے کچھ احادیث کا اضافہ کیا۔ قطیعی کی احادیث کا درجہ نسبتاً کم ہے اور گرا ہوا ہے۔ لیکن مسند میں پتہ چل جاتا ہے اور معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ براہ راست امام احمد کی مرویات ہیں، یہ عبداللہ بن احمد بن حنبل کے اضافے ہیں اور ان کے اضافوں میں یہ امام احمد سے لئے ہوئے ہیں اور یہ بقیہ اساتذہ سے۔ اس لئے مسند امام احمد کی مرویات میں کوئی التباس نہیں ہوتا کہ ان میں امام احمد کی روایات کون سی ہیں اور باقی کون سی ہیں۔ آج جو مسند امام احمد ہمارے پاس موجود ہے، جس میں کم وبیش چالیس ہزار احادیث ہیں ان میں تیس ہزار براہ راست امام احمد کی مرتب کی ہوئی ہیں اور دس ہزار عبداللہ کی اضافہ کی ہوئی ہیں جن کی پانچ قسمیں ہیں اور ہر قسم کی احادیث کی الگ الگ شناخت ہوسکتی ہے۔

امام احمد کی یہ کتاب غیر معمولی علمی مقام رکھتی ہے۔ لیکن اس سے استفادہ بڑا مشکل تھا۔ آج بھی اس کتاب سے براہ راست استفادہ بڑا مشکل ہے۔ اس لئے کہ یہ مسند ہے اور مسند حدیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں جس کی ترتیب صحابہ کرامؓ کی بنیاد پر ہو۔ اس کتاب میں سب سے پہلے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی مرویات ہیں، پھر حضرت عمر فاروقؓ کی اور بقیہ عشرہ مبشرہ کی، پھر بقیہ صحابہ کرامؓ کی۔ اب کوئی آدمی جو علم حدیث سے زیادہ واقف نہیں ہے، وہ مسند امام احمد میں کوئی حدیث تلاش کرنا چاہے تو پہلے اس کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس حدیث کے اصل راوی کون سے صحابیؓ ہیں۔ جب تک یہ معلوم نہ ہو مسند امام احمد میں کسی حدیث کا تلاش کرنا بڑا دشوار کام ہے۔ لیکن الحمد للہ اب یہ کام بہت آسان ہو گیا۔ اس لئے کہ ایک تو وینسنک کی انڈیکس آ گئی ہے۔ وینسنک کی انڈیکس ضرور دیکھ لیجئے گا۔ وینسنک ایک ڈچ مستشرق تھا جس نے مستشرقین کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ مل کر صحاح ستہ سمیت بڑی حدیث کی نو بڑی کتابوں کا ایک انڈکس تیار کیا جس میں صحاح ستہ، مسند امام احمد اور موطا امام مالک اور سنن دارمی شامل ہیں۔ ان نو کتابوں کا اس نے ایک **Word Index** تیار کیا ہے۔ حدیث کا کوئی ایک لفظ بھی آپ کو یاد ہو تو حروف تہجی کی ترتیب سے وہ اس میں شامل ہے۔ آپ اس انڈکس کی مدد سے اسے تلاش کر سکتی ہیں۔

اس انڈکس میں ان نو کتابوں کے ایک ایک مخصوص ایڈیشن کا حوالہ دیا گیا ہے۔ وہ ایڈیشن جن کا حوالہ ونسنک نے دیا ہے وہ پچھلی صدی کے چھپے ہوئے ایڈیشن تھے، تیرھویں صدی کے اواخر یا چودھویں صدی کے بہت شروع کے چھپے ہوئے تھے۔ آج وہ ایڈیشن نہیں ملتے۔ حال ہی میں کسی ادارہ نے، غالباً کسی عرب ملک میں اس پرانے ایڈیشن کا ایک نیا ایڈیشن فوٹو کاپی سے چھاپ دیا ہے اور وہ ساری کی ساری نو کتابیں پچیس تیس جلدوں میں ایک ساتھ چھاپ دی ہیں تاکہ اگر اس انڈکس سے استفادہ کرنا ہو تو اس نئے ایڈیشن کی مدد سے آپ استفادہ کر سکیں۔ اس نئے ایڈیشن سے کام نسبتاً آسان ہو گیا ہے۔

لیکن ایک اور بڑا کام مسند امام احمد پر بیسویں صدی کے وسط میں ہوا۔ یہ کام مشہور مجاہد اسلام، داعئ اسلام اور شہید اسلام شیخ حسن البنا کے والد احمد عبدالرحمٰن البنا نے کیا۔ حسن البنا شہید کے والد احمد عبدالرحمٰن البنا الساعاتی جو اپنی روزی کے لئے گھڑی سازی کا کام کرتے تھے۔ (ایک بہن نے پوچھا تھا کہ محدثین کماتے کہاں سے تھے تو حسن البنا کے والد نے پوری زندگی علم حدیث

کی خدمت کا کام کیا۔لیکن گھڑیوں کی ایک دکان تھی جس سے ان کی آمدنی ہوتی تھی۔ چند گھنٹے وہاں بیٹھا کرتے تھے اس کے بعد بقیہ وقت علم حدیث کی خدمت میں صرف کرتے تھے۔اسی وجہ سے ان کا لقب الساعاتی پڑ گیا۔) انہوں نے مسند امام احمد کوایک نئی ترتیب سے مرتب کیا جس کا نام ہے 'الفتح الربانی فی ترتیب المسند الامام احمدبن حنبل الشیبانی '۔الفتح الربانی میں انہوں نے ان تمام احادیث کوایک نئے موضوعاتی انداز میں مرتب کردیا۔اب آپ اس میں سبجیکٹ وائز احادیث تلاش کرسکتی ہیں۔اسی طرح سے انہوں نے ان احادیث کی ایک شرح بھی لکھی جس کا نام انہوں نے رکھا' بلوغ الامانی '۔یہ بلوغ الامانی اور فتح الربانی دونوں ایک ساتھ بہت ساری جلدوں میں چھپی ہیں اور کتب خانوں میں عام طور پر مل جاتی ہیں۔

امام احمد ابن حنبل کی مسند کے ساتھ ساتھ ایک اور مسند کا حوالہ اور تذکرہ بھی ملتا ہے۔ لیکن افسوس کہ وہ مسند آج موجود نہیں ہے اور صرف تاریخ کی کتابوں میں اس کا تذکرہ ملتا ہے، وہ مسند امام بقی بن مخلد نے مرتب کی تھی۔بقی بن مخلد کا تعلق اسپین سے تھا۔قرطبہ کے رہنے والے تھے۔ان کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ انہوں نے چھ مرتبہ مشرق ومغرب کا سفر کیا۔مشرق ومغرب سے مراد یہ ہے کہ سپین سے نکلے اور سمرقند وبخارا تک گئے۔اس طرح انہوں نے پوری دنیائے اسلام کا چھ مرتبہ سفر کیا اور احادیث کا سب سے بڑا مجموعہ مرتب کیا۔وہ مجموعہ افسوس کہ ضائع ہوگیا اور ہم تک نہیں پہنچا۔لیکن اس کے بارے میں جوتفصیلات احادیث کی کتابوں میں ملتی ہیں وہ بڑی عجیب وغریب ہیں۔اس کتاب کی ضخامت کا اندازہ ہم اس بات سے کرسکتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل نے جن صحابہ کی احادیث اپنی مسند میں جمع کیں ان کی تعداد 695 ہے۔جبکہ امام بقی بن مخلد نے اپنی مسند میں سولہ سو صحابہ سے احادیث جمع کی تھیں۔تقریباً دوگنی سے زیادہ اس کی جلدیں ہوں گی اور احادیث کی تعداد بھی اسی حساب سے دوگنے سے زائد ہوگی۔

الجامع الصحیح ،امام بخاری

امام احمد بن حنبلؒ کی مسند کے بعد جو اہم ترین،مقبول ترین اوراعلیٰ ترین مجموعہ ہے وہ امام بخاری کی الجامع الصحیح ہے۔امام بخاری کی وفات 256ھ میں ہوئی۔ایک مصرعہ یاد رکھئے گا۔ کسی نے لکھا ہے۔

میلادہ صدق، ان کی ولادت صدق ہے،
وعاش حمیداً، وہ قابل تعریف ہوکر زندہ رہے،
وانقضیٰ فی نور، اورنور میں ان کی وفات ہوئی۔

ابجدی تعداد کے حساب سے نور کا عدد 256ھ ہے۔ 256ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ ولادت ان کی صدق یعنی 194ھ ہے اور حمید کے جتنے نمبر بنتے ہیں اتنی ان کی عمر ہے۔ کتاب کا پورا نام ہے 'الجامع الصحیح المسند المختصر من حدیث رسول اللہ ﷺ و امورہٗ۔

امام بخاری نے جن لوگوں سے کسب فیض کیا ان میں خود امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، علی بن المدینی، یحییٰ بن معین، قتیبہ بن سعید اور مکی بن ابرہیم شامل ہیں۔ مکی بن ابراہم وہ محدث ہیں جن سے ثلاثیات روایت ہوئی ہیں۔ مکی بن ابراہیم کے ذریعے جو احادیث روایت ہوئی ہیں ان کا بڑا حصہ ثلاثیات ہے۔ امام بخاری اور رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کے درمیان صرف تین واسطے ہیں۔ امام بخاری نے سولہ سال اس کتاب کی ترتیب میں لگائے اور چھ لاکھ احادیث میں سے ان کو منتخب کیا۔

امام بخاری سے پہلے جتنے مجموعے کتب حدیث کے تھے، باستثنا مسند امام احمد کے، وہ اکثر و بیشتر امام بخاری نے اس کتاب میں سمو دیئے ہیں۔ امام بخاری نے کُل احادیث جو اس میں لکھی ہیں ان کی تعداد دس ہزار سے کچھ کم ہے۔ لیکن اس میں تکرار بھی شامل ہے۔ اس میں ایک حدیث کی مختلف روایات اور سندیں بھی شامل ہیں، ان سب کو نکال کر جو احادیث بنتی ہیں وہ دو ہزار چھ سو دو کے قریب ہیں۔

امام بخاری کی اس کتاب کو غیر معمولی مقبولیت اور غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ غالباً حدیث کی کسی کتاب یا کسی محدث کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جتنی امام بخاری کی کتاب کو حاصل ہوئی۔ امام بخاری نے ابھی اس کتاب کو مرتب کرنے کا عمل شروع کیا تھا اور اس ترتیب کے کام میں مشغول تھے کہ وہ جہاں جاتے تھے ان کی شہرت ان سے پہلے پہنچ جاتی تھی۔ امام مسلم نے بیان کیا ہے کہ جب وہ نیشاپور تشریف لائے تو ان کا ایسا استقبال ہوا جیسا بادشاہوں اور فرمانرواؤں کا ہوتا ہے۔ بڑے پیمانے پر لوگ ان کی طرف رجوع ہوئے۔ بڑے بڑے محدثین اور فقہا کے حلقے سُونے پڑ گئے، لوگ اُمڈ اُمڈ کر امام بخاری کے حلقہ میں آتے تھے۔ لوگوں نے ان پر

اپنی جانیں نچھاور کیں۔ جب امام بخاری ایک طویل سفر کے بعد آخری مرتبہ اپنے وطن بخارا واپس تشریف لے گئے تو پورے شہر نے ان کا استقبال کیا۔شہر کے لوگوں کو اس کا اندازہ تھا کہ انہیں کیسا اعزاز حاصل ہوا ہے کہ امت کی طرف سے ان کے شہر کے ایک فرزند کو امیر المومنین فی الحدیث کا لقب دیا گیا اور ان کی مرتب کی ہوئی کتاب اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار پائی۔اس لئے پورا شہر بشمول حاکم وقت کے ان کے استقبال کے لئے نکل آیا۔لوگوں نے فرط مسرت سے ان کے قافلے پر درہم اور دینا نچھاور کئے اور اس طرح امام بخاری اپنے وطن واپس تشریف لے آئے۔

ایک محفل میں، جہاں امام بخاری احادیث بیان فرمارہے تھے، امام مسلم بھی حاضر تھے ۔امام مسلم کا درجہ بھی کم نہیں ہے۔امام مسلم درس کے دوران خوشی سے اتنے بے تاب ہو گئے کہ بے اختیار کہا اے امیر المومنین مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کے پاؤں چوم لوں۔اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ امام بخاری کس درجہ کے انسان ہوں گے۔ان کے استاد امام احمد بن حنبل کا کہنا ہے۔اور یہ گواہی کسی کچے انسان کی نہیں بلکہ امام احمد بن حنبل کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ارض خراسان نے محمد بن اسماعیل سے بہتر کوئی انسان پیدا نہیں کیا۔یہ محمد بن اسماعیل امام بخاری تھے۔

آپ کو معلوم ہے کہ پرانے زمانے میں ہر بڑی کتاب میں کتاب کے نام سے موضوع کا عنوان ہوتا تھا: کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ وغیرہ۔اس طرح صحیح بخاری میں جو کتابیں ہیں ان کی تعداد 160 ہے۔کتاب الایمان، کتاب العلم، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ وغیرہ وغیرہ، یہ کتابیں 160 ہیں۔ ہر کتاب میں کئی کئی ابواب ہیں۔ مجموعی طور پر کل تین ہزار چار سو پچاس (3450) ابواب ہیں۔احادیث کی کل تعداد مکررات کو نکال کر دو ہزار چھ سو دو ہے۔جن میں سے بائیس ثلاثیات ہیں۔

کتاب کی ترتیب کے ضمن میں امام بخاری نے پہلے یہ کیا کہ اس کتاب کے ابواب کا ایک نقشہ مرتب کیا کہ اس کے ابواب کیا کیا ہوں گے۔ان تمام ابواب کا نقشہ مرتب کرنے کے بعد مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔مسجد نبوی میں گئے اور روضہ رسول ﷺ پر حاضری دی۔ وہاں دو رکعات نماز پڑھ کر انہوں نے اس کتاب کو لکھنے کا آغاز کیا اور سولہ سال اس کتاب کو لکھتے رہے اور احادیث کی چھان پھٹک کرتے رہے۔بعض ابواب ایسے ہیں کہ جو صرف عنوان ہی سے عبارت ہیں، ان میں کوئی حدیث نہیں ہے۔آپ صحیح بخاری دیکھیں تو دس بارہ جگہیں ایسی ملیں گی

جہاں امام بخاری نے صرف باب کا لفظ لکھا ہے یا صرف عنوان دیا ہے لیکن حدیث کوئی نہیں لکھی۔ وجہ یہ ہے کہ جس درجہ کی سند اور جس معیار کی روایت وہ دینا چاہتے تھے اس معیار کی کوئی روایت نہیں ملی، اس لئے انہوں نے باب کا عنوان خالی چھوڑ دیا اور حدیث نہیں لکھی۔

امام بخاری نے جتنی احادیث نقل کی ہیں وہ سب کی سب صحیح لعینہٖ ہیں۔ اس میں صحیح لغیرہٖ بھی کوئی نہیں ہے۔ اکثر احادیث مستفیض ہیں۔ مستفیض صحیح لعینہ کی اس قسم کو کہتے ہیں جس کو ہر درجہ میں کم سے کم تین راویوں نے روایت کیا ہو۔ تین صحابیوں نے لفظاً یا معناً روایت کیا ہو، پھر تین تابعین نے پھر تین تبع تابعین نے۔ اس لئے اس کی بیشتر احادیث بڑی تعداد میں مستفیض ہیں۔ صحیح بخاری کی کچھ احادیث عزیز ہیں۔ عزیز ان احادیث کو کہا جاتا ہے جن کو ہر درجہ میں دو راویوں نے روایت کیا ہو اور بہت تھوڑی احادیث ہیں جو اخبار آحاد ہیں۔ خبر واحد یا اخبار آحاد ان احادیث کو کہتے ہیں جن کو کسی ایک یا دو درجوں میں صرف ایک راوی نے روایت کیا ہو۔

صحیح بخاری میں مکررات وغیرہ کو ملا کر کل احادیث نو ہزار بیاسی 9082 ہیں۔ ان مکررات وغیرہ کو نکال کر کل احادیث کی کل تعداد دو ہزار چھ سو دو 2602 ہے اور جو تعلیقات ہیں ان کی تعداد بھی کئی سو ہے۔ موقوفات علی الصحابہ کا بعض لوگ شمار کرتے ہیں بعض نہیں کرتے۔

صحیح بخاری کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کی کوئی مثال امت مسلمہ کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ دیگر اقوام کا میں نہیں کہہ سکتا، لیکن بظاہر اور اقوام میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسانی تاریخ میں کسی انسان کی علمی کاوش کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جتنی امام بخاری کی کتاب کو حاصل ہوئی۔ اس کی سینکڑوں شرحیں لکھی گئیں جن میں سے 53 شرحیں وہ ہیں جن کا ذکر حاجی خلیفہ نے کشف الظنون نے میں کیا ہے۔ حاجی خلیفہ ڈیڑھ دو سو سال پہلے ایک ترکی عالم گزرے ہیں۔ انہوں نے اسلامی علوم وفنون کی تاریخ اور ببلیوگرافیکل ہسٹری پر ایک کتاب کئی جلدوں پر مشتمل لکھی ہے جس کا نام کشف الظنون ہے۔ اس میں انہوں نے 53 شرحوں کا ذکر کیا ہے۔ امام بخاری کے ایک شارح ہیں مولانا عبدالسلام مبارکپوری جن کی ایک کتاب 'سیرت البخاری' مشہور ہے، اس میں انہوں نے 143 شرحوں کا ذکر کیا ہے۔ میں نے اس کتاب کو کچھ دن پہلے دیکھا۔ بعض اردو کی شرحیں جو ان کے زمانے میں لکھی جا چکی تھیں اس کتاب میں ان کا ذکر نہیں ہے اور یہ کتاب 'سیرت البخاری' بھی کم وبیش ستر سال پہلے لکھی گئی تھی۔ اس دوران بھی کئی شرحیں لکھی

گئیں جن کا ذکر بھی اس کتاب میں نہیں ہے۔ اس لئے ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ آج امام بخاری کی اس کتاب کی کم وبیش دوسو شرحیں موجود ہوں گی۔ ایک محتاط اور محفوظ اندازہ دو سو کا کیا جا سکتا ہے۔ یہ شرحیں عربی، فارسی، اردو، انگریزی، فرانسیسی اور ترکی زبانوں میں لکھی گئی ہیں۔ ان چھ زبانوں میں تو بہت سی شرحیں میرے علم میں ہیں اور ان میں سے بیشتر کو میں نے خود دیکھا ہے اس لئے میں کہہ سکتا ہوں۔ ممکن ہے دوسری زبانوں میں بھی صحیح بخاری کی شرحیں موجود ہوں جن کا مجھے علم نہیں۔

صحیح بخاری کی عربی زبان میں چار شرحیں مشہور ہیں۔ جو چار مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں۔ سب سے مشہور شرح، جس کے بارے میں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ **The Commentry** ***par excellance*** ہے وہ حافظ ابن حجر کی فتح الباری ہے۔ ابن خلدون نے لکھا تھا۔ ابن خلدون کا زمانہ حافظ ابن حجر سے ذرا پہلے کا ہے۔ انہوں نے جہاں یہ بحث کی کہ صحیح بخاری افضل ہے یا صحیح مسلم افضل ہے، اور یہ رائے دی کہ صحیح بخاری افضل ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ یہ کتاب جس درجہ کی ہے اس درجہ کی شرح ابھی تک نہیں لکھی گئی اور یہ امت مسلمہ کے ذمہ ایک فرض کفایہ ہے کہ اس کتاب کی ایک شرح لکھے۔ جب ابن خلدون کے کم وبیش نصف صدی بعد فتح الباری لکھی گئی تو لوگوں نے بالاتفاق کہا کہ جس قرض کا ذکر ابن خلدون نے کیا تھا وہ حافظ ابن حجر نے امت کی طرف سے چکا دیا۔ حدیث کی کسی شرح میں جو معیارات ہونے چاہئیں، جس معیار اور پائے کی شرح ہونی چاہئے اس معیار اور پیمانہ کی شرح حافظ ابن حجر نے فتح الباری کی شکل میں لکھ دی اور صحیح بخاری کی شرح کا حق ادا کر دیا۔ علم روایت، علم درایت، طرق اور علوم حدیث کی جتنی قسمیں میں نے آپ کے سامنے ان گزارشات کے دوران بیان کی ہیں اور جتنی بیان نہیں کیں، وہ سب کی سب صحیح بخاری کی شرح فتح الباری میں استعمال ہوئی ہیں۔

آج سے چند سال پہلے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں یہ تجویز آئی تھی کہ اس کا شرح اردو ترجمہ کرایا جائے۔ چنانچہ ہم نے بہت غور وخوض کے بعد اس ترجمہ کا ایک فارمیٹ تیار کیا اور اس کے بعض اجزا کا ترجمہ کرایا جو آج کل ایڈٹ ہو رہا ہے اور ان شاء اللہ جلد شائع ہوگا۔ اس طرح اردو میں وہ مواد یا اس کا ایک نمونہ ہمارے سامنے آجائے گا جو حافظ ابن حجر نے صحیح بخاری کی شرح میں امت کے سامنے رکھا ہے۔

فتح الباری کے درجنوں ایڈیشن دنیائے اسلام میں نکلے ہیں اور شاید دنیا میں اسلامیات کا کوئی ایسا کتب خانہ نہیں ہے جو فتح الباری سے خالی ہو۔ حافظ ابن حجر جامعہ ازہر میں پڑھاتے تھے اور یہ جامعہ ازہر کے لئے بڑی فضیلت کی بات ہے کہ حافظ ابن حجر وہاں استاد رہے ہیں۔ حافظ ابن حجر کے رفیق کار، ان کے معاصر اور اُتنے ہی درجہ کے فقیہ اور محدث علامہ حافظ بدرالدین عینی تھے۔ انہوں نے بھی صحیح بخاری کی شرح لکھی عمدۃ القاری۔ وہ بھی جامعہ ازہر میں استاد تھے۔ ان کی شرح بھی بڑی غیر معمولی اور بہت مقبول ہے۔ لیکن اللہ نے جو درجہ حافظ ابن حجر کی فتح الباری کو عطا فرمایا وہ غالباً عمدۃ القاری کو حاصل نہیں ہوا۔

عمدۃ القاری میں فقہی مباحث پر زیادہ زور دیا گیا اور صحیح بخاری کے ابواب کے جو عنوانات ہیں جنہیں تراجم ابواب کہتے ہیں علامہ بدرالدین عینی نے ان پر غیر معمولی توجہ دی۔ بدرالدین عینی خود ایک بہت بڑے محدث تھے۔ انہوں نے صحیح بخاری کی اس شرح کے ساتھ ساتھ سنن ابی داؤد بھی شرح لکھی اور بھی بہت سا علمی کام کیا۔ لیکن ان کی کتاب عمدۃ القاری بہت مشہور ہے۔ ضخامت کے اعتبار سے عمدۃ القاری زیادہ بڑی کتاب ہے، لیکن معیار اور کیفیت کے لحاظ سے فتح الباری کا درجہ بہت اونچا ہے۔ ایک حدیث ہے 'لاھجرۃ بعدالفتح'۔ 'فتح مکہ کے بعد ہجرت کی ضرورت نہیں'۔ اس پر بعض لوگوں نے کہا کہ 'لاھجرۃ بعدالفتح' یعنی فتح الباری کے بعد علم حدیث کے لئے اب ہجرت کرنے کی ضرورت نہیں۔ فتح الباری کا یہ مقام و مرتبہ ہے۔

صحیح مسلم

صحیح بخاری کے بعد صحیح مسلم کا درجہ آتا ہے۔ امام مسلمؒ کے اساتذہ میں خود امام بخاری، امام احمد بن حنبل اور امام شافعی کے ایک براہ راست شاگرد حرملہ بن یحییٰ بھی شامل ہیں۔ اس لئے امام مسلم کو دو بڑے محدثین سے براہ راست اور ایک بڑے فقیہ سے بالواسطہ کسب فیض کا موقع ملا۔ امام شافعی سے ان کے شاگرد کے ذریعے اور امام احمد سے براہ راست۔ امام صاحب نے امام اسحاق بن راہویہ سے بھی براہ راست کسب فیض کیا۔ لیکن ان کے خاص اساتذہ قتیبہ بن سعید اور ابوعبداللہ القعنبی تھے۔ مسلم میں ان دونوں کی روایات کثرت سے ملیں گی۔ آپ دیکھیں گے حدثنی القعنبی، اخبرنی القعنبی، حدثنا قتیبة بن سعید۔ ان دونوں شیوخ کی بہت

احادیث آپ کو صحیح مسلم میں کثرت سے ملیں گی۔ یہ امام مسلم کے خاص اساتذہ میں سے تھے۔ امام مسلم کی صحیح میں بلاتکرار چار ہزار احادیث ہیں۔ صحیح مسلم کے بعض خصائص کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے موازنہ کے بارے میں بھی بات ہوگئی ہے۔

صحیح مسلم کی دو شرحیں مشہور ہیں۔ ایک کا ذکر کل کریں گے۔ دوسری مشہور شرح امام نوودی کی ہے جو بہت مشہور اور مقبول ہے۔ چھپی ہوئی ہے اور ہر جگہ دستیاب ہے اور مسلم کی شرحوں میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ امام مسلم کی کتاب صحیح بخاری کے بعد بلند ترین درجہ رکھتی ہے۔ بعض علما کا کہنا ہے کہ وہ صحیح بخاری سے بھی افضل ہے، چنانچہ مغرب کے بعض علما کا یہی خیال تھا کہ وہ صحیح بخاری سے افضل ہے۔

صحیح مسلم کے بعد جو چار کتابیں ہیں ان میں مختلف حضرات نے مختلف کتابوں کا درجہ مختلف رکھا ہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ سب سے اونچا درجہ سنن ابوداؤد کا ہے، بعض کا کہنا ہے کہ جامع ترمذی کا ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ سنن نسائی کا درجہ اونچا ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ مختلف خصوصیات کے باعث ان تینوں کتابوں کا درجہ اپنی اپنی جگہ اونچا ہے۔ سنن ابوداؤد اس اعتبار سے خاص مقام رکھتی ہے کہ وہ احادیث احکام کا ایک بڑا مجموعہ ہے جو ایک جگہ دستیاب ہے اور احادیث احکام میں صحیح ترین احادیث کا مجموعہ ہے، سنن ابوداؤد کا اس لحاظ سے درجہ بہت اونچا ہے۔ علم حدیث کے مختلف علوم وفنون کو ایک ساتھ سمو دینے کے اعتبار سے جامع ترمذی کا درجہ اونچا ہے اور صحت متن اور صحت نقل کے اعتبار سے سنن نسائی کا درجہ ہے۔ اس لئے جس ترتیب سے بھی بیان کریں ان تینوں میں سے کوئی نہ کوئی کتاب اس کی مستحق ہوگی کہ صحیحین کے بعد اس کا درجہ ہو۔ امام ابوداؤد صف اول کے محدثین میں سے ہیں۔ ہمارے بلوچستان کے غالباً ضلع قلات یا خضدار سے ان کا تعلق ہے اس لئے پاکستانی ہیں۔ ان کے اساتذہ میں امام احمد، یحیٰ بن معین، قتیبہ بن سعید (جو امام مسلم کے بھی استاد ہیں)، ابوبکر بن ابی شیبہ اور اسحاق بن راہویہ شامل ہیں اور بڑے محدثین میں سے امام نسائی ان کے شاگرد ہیں۔ کچھ لوگ امام ابوداؤد کو پہلے لکھتے ہیں کہ ترمذی اور نسائی ان کے شاگردوں میں ہیں۔ اس لئے استاد کا ذکر پہلے اور شاگرد کا ذکر بعد میں کیا جاتا ہے۔

سنن ابوداؤد

امام ابوداؤد اس کتاب کے علاوہ بھی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ان کا علمی مقام اس کتاب سے پہلے بھی بہت غیر معمولی اور مشہور و معروف تھا۔ جب وہ بصرہ تشریف لائے تو بصرہ کا گورنر ان سے ملنے کے لئے حاضر ہوا اور کہا کہ میری تین گزارشات اگر آپ قبول کر لیں تو میں بہت شکر گزار رہوں گا۔ ایک یہ کہ آپ بصرہ میں کچھ دن قیام فرمائیں تا کہ اہل بصرہ آپ سے استفادہ کر سکیں۔ دوسرا یہ کہ آپ اہل بصرہ کے لئے خاص طور پر علم حدیث کی درس و تدریس کا کوئی حلقہ قائم کریں۔ اور تیسری گزارش یہ ہے کہ میرے دو بچوں کو الگ سے کوئی وقت دے دیں کہ جس میں آکر وہ آپ سے علم حدیث پڑھا کریں۔ آپ نے فرمایا کہ پہلی دو گزارشات قبول ہیں۔ تیسری گزارش مسترد۔ بچوں کو چاہئے کہ بقیہ لوگوں کے ساتھ آکر حدیث پڑھیں۔

سنن ابوداؤد میں پانچ لاکھ احادیث میں سے چار ہزار آٹھ سو 4800 کا انتخاب کیا گیا۔ یہ احادیث صرف سنن اور احکام سے متعلق ہیں۔ صحاح ستہ میں فقہی احادیث کا سب سے بڑ ماخذ یہی کتاب ہے۔ صحاح ستہ کی کسی اور کتاب میں فقہی احادیث اتنی بڑی تعداد میں موجود نہیں ہیں۔ اس میں تکرار برائے نام ہے۔ کہیں کہیں کوئی حدیث دوبارہ نقل ہوگئی ہے ورنہ ایک حدیث دوبارہ نقل نہیں کی گئی ہے۔ اس لئے چار ہزار آٹھ سو احادیث میں اکثر و بیشتر وہ ہیں جو ایک ہی بار بیان ہوئی ہیں۔

یہ کتاب جب سے لکھی گئی ہے ہمیشہ مقبول رہی ہے۔ علما اور طلبہ نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایک محدث نے کہا کہ جس کے پاس سنن ابوداؤد ہے اس کے پاس گویا ایک ایسا پیغمبر ہے جو ہر وقت اس کی رہنمائی کر رہا ہے۔ یوں تو یہ بات حدیث کی ہر کتاب کے بارے میں صحیح ہے۔ لیکن جس نے پہلی بار سنن ابوداؤد کے بارے میں کہی اس نے سنن ابوداؤد کے خاص مقام کو سامنے رکھ کر کہی۔

سنن ابوداؤد کی بھی بہت سی شرحیں لکھی گئیں جن میں سے ایک قدیم شرح امام خطابی کی ہے جو معالم السنن کے نام سے مشہور ہے۔ امام خطابی کا زمانہ امام ابوداؤد سے کم و بیش سو سال بعد کا ہے۔ امام ابوداؤد کا انتقال 275ھ میں ہوا، امام خطابی کا انتقال 388ھ میں ہوا۔ پھر ایک امام منذری تھے جنہوں نے اس کتاب کی تلخیص کی اور اس تلخیص کی شرح علامہ ابن قیم نے

لکھی۔ایک شرح علامہ بدرالدین عینی کی ہے جو نامکمل ہے۔ یہ نامکمل شرح بھی چھ یا سات جلدوں میں ہے۔ابھی حال ہی میں عرب دنیااور پاکستان میں چھپی ہےاور ہر جگہ ملتی ہے۔

علامہ سیوطی نے بھی سنن ابوداؤد کی شرح میں ایک کتاب لکھی 'مرقاة الصعود فی شرح ابی داؤد 'مرقاة الصعود سے مراد وہ سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر آدمی بلندی کی طرف جاتا ہے۔ بارھویں صدی ہجری میں ایک عالم علامہ ابوالحسن سندھی تھے، ہمارے ٹھٹھہ کے رہنے والے۔انہوں نے ایک مختصر شرح لکھی تھی جو فتح الودود کے نام سے مشہور ہےاور کئی بار چھپ چکی ہے۔ ابوداؤد کی چار مشہور شرحیں برصغیر میں لکھی گئیں جن کے بارے میں کل تفصیل سے بات ہوگی۔اس کا انگریزی ترجمہ بھی ہے جو ہمارے ایک سابق رفیق کار اور محترم دوست ڈاکٹر احمد حسن مرحوم نے کیا تھا، کئی بار چھپ چکا ہے اس پر انگریزی میں حواشی بھی ہیں اور مختصر شرح بھی ہے۔امام مسلم کی صحیح کا بھی انگریزی ترجمہ ہو چکا ہے جس کی تفصیل کل آئے گی۔یہ ترجمہ پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم نے کیا تھا۔

جامع ترمذی

سنن ابواداؤد کے بعد جامع ترمذی کا درجہ آتا ہے۔امام ترمذی امام بخاری اور امام مسلم دونوں کے براہ راست شاگرد ہیں۔امام ابوداؤد کے بھی شاگرد ہیں۔قتیبہ بن سعید جو امام مسلم کے استاد ہیں وہ امام ترمذی کے بھی استاد ہیں۔ جامع ترمذی جامع ہے۔یعنی حدیث کے آٹھوں ابواب اس میں شامل ہیں۔اس میں عقائد، اخلاق، احکام، تفسیر، فضائل، فتن، اشراط قیامت، علامات قیامت یہ سب موضوعات شامل ہیں۔اس لئے اس کا درجہ جامع کا ہےاور اس طرح سے وہ امام بخاری کی جامع کے برابر ہے۔صحاح ستہ میں امام بخاری اور ترمذی دونوں کی کتابیں جامع ہیں۔

جامع ترمذی کے جو اہم خصائص یا مباحث ہیں ان میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ حدیث کے درجہ کا تعین بھی کرتے ہیں۔وہ پہلے حدیث بیان کرتے ہیں اور پھر اس کا درجہ بیان کرتے ہیں جیسے۔ھذا حدیث حسن، ھذا حدیث صحیح، ھذا حدیث غریب۔اس میں امام ترمذی اپنی اصطلاحات بھی استعمال کرتے ہیں اور کچھ اصطلاحات بقیہ محدثین کی لیتے ہیں۔اس طرح سے ہر حدیث کے بعد پڑھنے والوں کو پتہ چل جاتا ہے کہ امام ترمذی نے اس

حدیث کو کس درجہ پر رکھا ہے۔ پھر امام ترمذی یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اس حدیث سے جو احکام نکلتے ہیں ان احکام میں بقیہ محدثین اور فقہا کی رائے کیا ہے، مثلاً اس بارے میں امام شافعی کیا کہتے ہیں، امام مسلم کیا کہتے ہیں، امام احمد بن حنبل کیا کہتے ہیں، امام مالک کیا کہتے ہیں اور امام ابوحنیفہ کیا کہتے ہیں گویا تمام فقہا کی آراء بھی قاری کے سامنے آجاتی ہیں۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو حدیث کی کسی اور کتاب میں نہیں پائی جاتی۔

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ امام ترمذی ایک باب میں جو احادیث بیان کرتے ہیں وہ بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ 'وفی الباب عن فلان وفلان وفلان، کہ اس موضوع پر فلاں فلاں صحابہ کی احادیث بھی ہیں۔ ان احادیث کو انہوں نے اپنی کتاب میں شامل نہیں کیا۔ یا تو اس کی سند جو امام ترمذی تک پہنچی وہ اس درجہ کی نہیں تھی یا امام ترمذی نے محسوس کیا کہ جو مضمون تھا وہ بقیہ احادیث میں آگیا، یا کسی اور وجہ سے انہوں نے ان احادیث کو شامل نہیں کیا لیکن حوالہ دے دیا کہ اس موضوع پر فلاں احادیث بھی موجود ہیں۔ تلاش کرنے والے تلاش کر سکتے ہیں۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تکرار برائے نام ہے۔ جو حدیث ایک بار آگئی امام ترمذی اس کو دوبارہ نہیں دوہراتے۔ پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ امام ترمذی نے راویوں کے نام اور کنیت پر بڑی بحث کی ہے۔ اس لئے کہ بعض راوی کنیت سے بہت مشہور ہیں اور بعض نام سے مشہور ہیں۔ اگر ایک جگہ کنیت آئی ہو اور دوسری جگہ نام آیا ہو تو یہ التباس ہو سکتا ہے کہ دو آدمی ہیں یا ایک ہی آدمی ہے۔ تو امام ترمذی وضاحت کر دیتے ہیں کہ یہ نام جن بزرگ کا ہے یہ وہی شخصیت ہیں جن کی کنیت یہ ہے۔ مثلاً ابوثور، ابوثور کا نام کچھ اور تھا، یا امام اوزاعی، کہیں اوزاعی آتا ہے کہیں عبدالرحمٰن آتا ہے۔ اب جہاں عبدالرحمٰن آیا ہے وہاں یہ پتہ چلانا کہ یہ امام اوزاعی ہیں ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ امام ترمذی اس کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔

جامع ترمذی کے ضمن میں ایک بات خاص طور پر قابل غور ہے۔ وہ یہ کہ امام ترمذی ان محدثین میں سے ہیں کہ جن کا تساہل جرح وتعدیل میں مشہور ہے۔ امام ترمذی راوی کو عادل قرار دینے میں نرمی سے کام لیا کرتے تھے۔ محدثین نے امام ترمذی اور امام حاکم دونوں کی تعدیل کے بارے میں یہ کہا ہے کہ ان کی رائے قبول کرنے میں احتیاط سے کام لینا چاہئے اور جس راوی کو امام ترمذی اور امام حاکم عادل قرار دیں اس کی عدالت کی دوسری جگہ سے بھی تحقیق کر لینی چاہئے۔

اگر دوسرے محدثین بھی اس کو عادل قرار دیتے ہیں تو وہ عادل ہیں اور اگر دوسرے محدثین اسے مجروح قرار دے رہے ہیں تو پھر محض امام ترمذی کی تعدیل پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔ اگر یہ بات ہے تو امام ترمذی نے جن راویوں کو عادل قرار دے کران سے احادیث نقل کی ہیں ان احادیث میں بھی کلام ہوسکتا ہے۔ اس لئے امام ترمذی کی صحیح یا حسن قرار دی ہوئی احادیث میں سے بھی کئی احادیث کے بارے میں کلام ہوا ہے۔ تیئیس (23) روایات وہ ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ شدید درجہ کی ضعیف ہیں۔ اس موضوع پر لوگوں نے کام کیا ہے۔ کئی لوگوں نے زمانہ حال میں جامع ترمذی کے کئی ایسے ایڈیشن بھی شائع کئے ہیں جس میں ہر حدیث کی الگ سے نشاندہی کردی گئی ہے۔

لیکن بہر حال یہ ایک اختلافی رائے رہے گی۔ اگر آج کا کوئی آدمی امام ترمذی جیسے عظیم امام حدیث کی رائے اور ان کی تجریح وتعدیل سے اختلاف کرسکتا ہے تو آج کے آدمی سے بھی اختلاف ہوسکتا ہے۔ امام ترمذی جیسا انسان اگر اپنے زمانے میں کسی حدیث کو ضعیف یا حسن قرار دیں اور آج کا کوئی آدمی یہ کہے کہ اسے امام ترمذی کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے اور وہ حدیث حسن یا صحیح نہیں بلکہ ضعیف ہے۔ تو پھر آج کے آدمی سے بھی کل کے آدمی اختلاف کرسکتے ہیں۔

یہ بات میں اس لئے کررہا ہوں کہ میں نے بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ زمانہ حال کے ایک بزرگ جن کا چند سال قبل انتقال ہوا ہے ان کے شاگردوں میں بڑی شدت پائی جاتی ہے۔ جس حدیث کو ان کے استاد نے ضعیف قرار دیا ہے تو ان کے شاگرد اس کو ضعیف منوانے کے لئے لڑنے مرنے پر تیار ہوجاتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک عرب ملک میں کسی جگہ میری گفتگو یا تقریر تھی۔ میں نے کوئی حدیث بیان کی، تو وہاں ایک صاحب علم جو چالیس بیالیس سال کی عمر کے تھے، وہ ان بزرگ سے کسب فیض کرچکے تھے، انہوں نے محفل میں ایک ہنگامہ برپا کردیا کہ یہ حدیث تو ضعیف ہے اور ہمارے فلاں استاد نے فلاں تحقیق کی ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں آپ کے استاد کی تحقیق کے بارے میں کوئی منفی بات نہیں کہتا۔ سرآنکھوں پر، ظاہر ہے ان کا علم ومرتبہ اور مقام ایسا ہے کہ جو بات وہ کہیں گے وہ قابل احترام ہے۔ لیکن اگر آپ کے استاد کو امام ترمذی سے اختلاف کرنے کا حق پہنچتا ہے تو بقیہ حضرات کو آپ کے استاد سے بھی اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ ان کی اس تحقیق پر بھی لوگوں نے کتابیں لکھی ہیں۔ ابھی حال ہی میں ایک کتاب دمشق

کے ایک عالم نے لکھی ہے جو غالباً چار پانچ جلدوں میں ہے جس میں انہوں نے ان بزرگ کی تصحیح یا تضعیف سے اختلاف کیا ہے۔

میں نام لے ہی دیتا ہوں: علامہ شیخ ناصر الدین البانی، بڑے مشہور اور صف اول کے محدثین میں سے تھے۔ چند سال پہلے ان کا انتقال ہوا ہے۔ اگر بیسویں صدی میں عالم اسلام کے چند عظیم ترین علمائے حدیث کے نام چننے ہوں تو یقیناً ایک نام ان کا ہوگا۔ انہوں نے تمام کتب حدیث کا از سر نو جائزہ لیا اور اپنی تحقیق میں جہاں جہاں جس حدیث کو صحیح یا ضعیف یا حسن قرار دیا اس کی نشاندہی کر دی۔ اب اگر علامہ ناصر الدین البانی امام ترمذی سے اختلاف کر سکتے ہیں تو آج کے اہل علم کو علامہ البانی سے اختلاف کا حق ہونا چاہئے۔ ہمارے لئے تو دونوں سر آنکھوں پر، ہمارے لئے تو دونوں ایسے ہیں کہ وہ آئیں تو بقول امام مسلم کے ہم ان کے پاؤں چوم لیں۔ لیکن اگر علامہ ناصر الدین البانی امام ترمذی سے اختلاف کر سکتے ہیں تو کوئی اور آنے والا علامہ ناصر الدین البانی سے بھی اختلاف کر سکتا ہے۔ اس سے احترام میں کمی یا خدانخواستہ مقام و مرتبہ میں کمی کا سوال نہیں۔ مقام اپنی جگہ، اختلاف رائے اپنی جگہ۔

جامع ترمذی کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں۔ برصغیر کی شرحوں کا کل ذکر کریں گے۔ برصغیر سے باہر کی شرحوں میں دو شرحیں مشہور ہیں۔ ایک علامہ ابوبکر بن العربی کی جو ایک مشہور مالکی فقیہ ہیں۔ ان کی کتاب ہے 'عارضة الاحوذی'، یہ مختصر شرح ہے لیکن اچھی شرح ہے۔ دوسری شرح علامہ سراج الدین بلقینی کی ہے۔ یہ مصر کے رہنے والے تھے۔ مسلکاً شافعی تھے۔ ابوبکر بن العربی مالکی تھے۔ گویا ایک شرح مالکی عالم نے کی ہے اور دوسری شرح شافعی عالم نے کی ہے۔ حنفی عالم کی شرح کا ذکر کل کریں گے۔ یہ دونوں شرحیں بڑی مشہور ہیں۔ علامہ سراج الدین بلقینی کی شرح ہے 'العرف الشذی'، علامہ بلقینی قاہرہ کے رہنے والے تھے۔ وہیں ان کا مزار ہے اور وہیں دفن ہوئے۔ امام ترمذی کی اور بھی کئی کتابیں علم حدیث پر ہیں جن کا تذکرہ میں چھوڑ دیتا ہوں۔ ان کی ایک مشہور کتاب 'شمائل ترمذی' ہے جس میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے شمائل کو بیان فرمایا ہے۔ یہ جامع ترمذی ہی کا ایک باب ہے جو الگ سے چھپا ہے۔ گویا ترمذی ہی کی کتاب کا ایک حصہ ہے۔ بعض حضرات نے اس کو الگ بھی چھاپا ہے، اس کی شرحیں بھی لکھی گئیں ہیں اور بہت سی شرحوں کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔

سنن نسائی

ترمذی کے بعد درجہ ہے امام نسائی کی کتاب کا۔ امام نسائی نے دراصل 'السنن الکبریٰ' کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی تھی۔ امام نسائی کی وفات 303ھ میں ہوئی ہے۔ یہ صحاح ستہ کے مصنفین میں زمانہ کے اعتبار سے سب سے آخری آدمی ہیں۔ یعنی ترتیب زمانی میں سب سے آخر میں آتے ہیں۔ لیکن کتاب کی اہمیت اور صحت کی ترتیب میں پانچویں نمبر پر یا تیسرے یا چوتھے نمبر پر آتے ہیں، اس بارے میں میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ تیسرے، چوتھے اور پانچویں میں سے ایک پر آتے ہیں۔ ان کی کتاب 'السنن الکبریٰ' دراصل بڑی کتاب تھی۔ جب وہ لکھی جا چکی اور شائع ہوئی تو رملہ جو فلسطین کا شہر ہے جس کو آج کل رام اللہ کہا جاتا ہے وہاں کا گورنر ایک بہت صاحب علم آدمی تھا۔ امام صاحب کے پاس کسب فیض کے لئے آیا کرتا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ آپ سے گزارش کی کہ لوگوں کے لئے اتنی بڑی کتاب کا پڑھنا اور اس کا نقل کرانا تو بہت دشوار ہوگا، پھر اس میں بعض احادیث ضعاف بھی آگئی ہیں اور بعض حسن لغیرہ ہیں۔ اس لئے آپ اس کا ایک مختصر نسخہ تیار کریں جس میں صرف صحیح احادیث ہوں اور جو تکرار ہے یا جو احادیث فوری حوالہ کی نہیں ہیں وہ آپ نکال دیں۔ آپ نے 'السنن المجتبیٰ' کے نام سے اس کتاب کا خلاصہ تیار کیا۔ یہی وہ کتاب ہے جو آج کل مروج ہے اور سنن نسائی کہلاتی ہے۔

سنن نسائی اس اعتبار سے بڑی ممتاز ہے کہ صحیحین کے بعد سب سے کم ضعیف حدیثیں اس میں ہیں۔ صحیحین میں تو کوئی نہیں ہے، بقیہ دونوں کتابوں، ابوداؤد اور ترمذی میں ضعاف کی تعداد سنن نسائی کی نسبت زیادہ ہے۔ اس کے رجال یا راوی سنن کی بقیہ کتابوں کے مقابلہ میں زیادہ ہیں۔ بقیہ چار کتابوں میں، ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی اور نسائی میں، نسائی کے رجال سب سے قوی ہیں، اس کے راوی سب سے مستند ہیں اور اس کی شرائط بخاری اور مسلم کی شرائط کے بہت قریب ہیں۔

امام نسائی کو علل الحدیث میں بڑی مہارت تھی۔ انہوں نے علل الحدیث کی جابجا نشاندہی کی ہے۔ امام ترمذی نے بھی علل کی نشاندہی کی ہے لیکن امام نسائی اس میں زیادہ نمایاں ہیں۔ امام ترمذی کی طرح وہ اسماء اور کنیٰ (کنیتوں) کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ اس طرح سے

وہ امام ترمذی سے ملتے جلتے ہیں۔ انہوں نے غریب الاحادیث کی بھی شرح کی ہے۔ جہاں مشکل لفظ آئے ہیں ان کی شرح کی ہے۔ گویا یہ وہ کتاب ہے جو ابوداؤد اور ترمذی دونوں کی خصوصیات اپنے اندر رکھتی ہے اور ایک اعتبار سے صحیحین کے بعد اسی کا درجہ آتا ہے۔ اس لئے کہ ضعیف حدیثیں اس میں سب سے کم ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض حضرات نے اس کو صحیحین کے بعد کا درجہ دیا ہے۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس کتاب کی اس کے شایان شان کوئی شرح نہیں لکھی گئی۔ میں نے بہت تلاش کیا لیکن کسی قدیم شرح کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ آج سے نہیں بلکہ تیس پینتیس سال پہلے مجھے خیال ہوا کہ اس کتاب کی کوئی با قاعدہ اور مفصل شرح نہیں ہے۔ کسی نے ایک فقیر قسم کے آدمی سے پوچھا کہ آج کل کیا کر رہے ہو۔ اس نے کہا کہ بادشاہ کی لڑکی سے شادی کی فکر میں ہوں۔ پوچھنے والے نے کہا اچھا، کتنا کام ہوگیا۔ اس نے جواب دیا کہ آدھا کام ہوگیا ہے اور آدھا باقی ہے۔ اس نے کہا کہ آدھا کیا کام ہوگیا ہے؟ فقیر نے جواب دیا کہ میں تو راضی ہوں اور شہزادی کا راضی ہونا ابھی باقی ہے۔ میرا آج سے پینتیس سال پہلے سے یہ خیال ہے کہ مجھے اگر موقع ملا تو سنن نسائی کی شرح لکھوں گا۔ اس میں آدھا کام تو ہوگیا کہ میں تیار ہوں۔ بقیہ آدھا ہونا ابھی باقی ہے، یعنی شرح لکھی نہیں گئی ہے۔

اس کی جو شرحیں مشہور ہیں وہ صرف دو ہیں۔ ایک علامہ محمد بن عبدالہادی سندھی تھے، جن کی وفات **1138**ھ میں ہوئی ہے، ان کا ایک حاشیہ ہے جو عام چھپی ہوئی کتابوں میں ملتا ہے۔ اس وقت پاکستان میں سنن نسائی کے جو نسخے ملتے ہیں وہ علامہ سندھی کی اس شرح کے ساتھ ملتے ہیں۔ یہ بڑی مختصر شرح ہے جو صرف حاشیہ پر آئی ہے۔ دوسری شرح 'زھر الربیٰ' علامہ سیوطی نے لکھی ہے۔ وہ بھی بڑی مختصر ہے اور کہیں کہیں حاشیوں پر چھپی ہوئی ملتی ہے۔ ان دو کتابوں کے علاوہ کوئی شرح ایسی قابل ذکر مجھے نہیں ملی جو مخطوطہ کی شکل میں ہو یا مطبوعہ شکل میں موجود ہو۔ اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ اس کی شرح لکھی جائے جو اسی انداز کی ہو جس انداز کی حدیث کی بقیہ کتابوں کی شرحیں ہیں۔ جن میں سے بعض کا تذکرہ کل ہوگا۔

سنن ابن ماجہ

صحاح ستہ کی آخری کتاب امام ابن ماجہ کی ہے۔ محمد بن یزید بن ماجہ کی وفات **273**ھ میں ہوئی۔ اس لئے یہ امام ابوداؤد کے قریب قریب ہم عصر ہیں۔ امام ابوداؤد کی وفات **275**ھ

میں ہوئی۔ ان کی وفات 273ھ میں ہوئی۔ زمانہ اگرچہ دونوں کا قریب قریب ایک ہے۔ لیکن امام ابن ماجہ کی کتاب کا درجہ سب سے آخر میں ہے۔ اس لئے کہ اس میں کمزوری کے اعتبار سے بعض ایسی چیزیں ہیں جو حدیث کی بقیہ کتابوں میں نہیں پائی جاتیں۔ اس میں جو ترتیب اختیار کی گئی ہے وہ احادیث احکام یعنی سنن کی ترتیب ہے۔ اس میں بتیس کتابیں، تین سو پندرہ ابواب اور چار ہزار احادیث ہیں۔ حسن ترتیب کے اعتبار سے یہ تمام صحاح ستہ میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ اس کی ترتیب بہت اچھی ہے۔ تکرار بہت کم ہے۔ اس میں سندیں کم اور متون زیادہ ہیں۔ انہوں نے سندیں صرف متون کے برابر رکھی ہیں اور بعض جگہ ایک سند سے ایک سے زائد متن بھی بیان کئے ہیں۔ ایک سند بیان کی ہے اور کہا ہے کہ اسی سند سے میں نے فلاں فلاں روایات فلاں استاد سے سنی ہیں۔

اس کتاب کے آنے سے پہلے اور اس کے بعد بھی یہ بحث جاری رہی کہ صحاح ستہ کی چھٹی کتاب کون سی ہے۔ اگرچہ محدثین کی اکثریت سنن ابن ماجہ کو ہی صحاح ستہ کا حصہ سمجھتی ہے، لیکن بعض حضرات نے سنن ابن ماجہ کو صحاح ستہ میں شامل نہیں کیا۔ کچھ حضرات کا خیال ہے کہ سنن دارمی صحاح ستہ میں شامل ہے۔ کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ موطا امام مالک صحاح ستہ میں شامل ہے۔ لیکن علما کی غالب اکثریت سنن ابن ماجہ کو صحاح ستہ میں شامل سمجھتی ہے۔

سنن ابن ماجہ میں حدیث کی بقیہ کتابوں کے مقابلہ میں ضعیف احادیث زیادہ ہیں۔ ان کی ٹھیک ٹھیک تعداد کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا بڑا دشوار ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ ان کی تعداد چونتیس ہے، کچھ کا خیال ہے کہ ایک سو کے قریب ہے، کچھ کا خیال ہے کہ ایک سو بتیس یا ایک سو پینتیس کے قریب ہے۔ پھر ضعیف کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا ویسے بھی بہت مشکل ہوتا ہے۔ ایک محدث کی رائے میں ایک حدیث ضعیف ہے دوسرے کی رائے میں وہ ضعیف نہیں ہے یا اتنی ضعیف نہیں ہے۔ پھر ضعاف کے بھی مختلف درجات ہیں، بہرحال اس کتاب میں ضعاف کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے، بعض وہ ہیں جن کا ضعف بہت شدید ہے۔ وہ تقریباً تیس پینتیس کے قریب ہیں۔ بقیہ وہ ہیں جو ضعف کے ہلکے درجے پر ہیں۔

اس کتاب کی شرحیں بھی نسبتاً کم لکھی گئیں۔ برصغیر میں اس کی ایک دو شرحیں لکھی گئیں جن کا ذکر آگے کیا جائے گا۔ برصغیر سے باہر جو شرحیں لکھی گئیں ان میں ایک کتاب ہے علامہ سیوطی

کی 'مصباح الزجاجه فی شرح سنن ابن ماجه'، اور ایک ہے 'ماتمس الیه الحاجة لمن یطالع سنن ابن ماجه'۔

یہ علم حدیث کی بنیادی کتابوں کا مختصر تعارف تھا جس میں صحاح ستہ بھی آگئیں اور ان کے علاوہ بقیہ کچھ کتابیں بھی آگئیں۔ آج کی گفتگو میں یہیں ختم کرتا ہوں۔ ہمارے پاس پندرہ منٹ ہیں سوال جواب کے لئے۔ کل کے سوالات بھی آپ پوچھنا چاہیں تو پوچھ سکتی ہیں۔ کل جمعہ کا دن ہے نسبتاً وقت کم ہوگا، لیکن علم حدیث پر برصغیر میں جو کام ہوا ہے اس کا تذکرہ ہوگا۔ اور ان شاء اللہ برصغیر میں اسلام کے آنے سے لے کر 2003 تک علم حدیث پر جو کام ہوا ہے اس کا تذکرہ اختصار کے ساتھ کروں گا، جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ علم حدیث کی خدمت میں برصغیر کے لوگ دنیائے اسلام کے دوسرے علاقوں سے پیچھے نہیں رہے۔ برصغیر میں علم حدیث اور اس کے متعلقات پر خاصا کام ہوا ہے بلکہ برصغیر کے لوگوں نے ایک زمانے میں دنیائے اسلام کے دوسرے علاقوں کے لوگوں کے مقابلہ میں علم حدیث پر زیادہ کام کیا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

زمانہ کے اعتبار سے صحابہ کرامؓ کے جو طبقات ہیں اس کا علم تو ان لوگوں کے پاس بھی ہوسکتا ہے جو جھوٹی حدیثیں روایت کرتے ہیں۔ تو ایسے میں اگر وہ زمانے کا صحیح تعین کردیں تو اس میں کیا طریقہ اختیار کیا جاتا تھا؟

ضعیف یا موضوع حدیث کو معلوم کرنے کے تو درجنوں طریقے تھے۔ صرف یہی ایک طریقہ نہیں تھا کہ صحابہ کے زمانہ سے طے کرلیا جائے۔ یہ تو اس کام کے لئے ایک ابتدائی قدم تھا۔ اس کے بعد ایک پورا سفر ہوتا تھا، فرد کا ذاتی کردار، اس کا علمی اور دینی مقام، اس کی شخصیت کے بارہ میں عام تصور، لوگ اس راوی کے بارے میں کیا کہتے ہیں، اس نے علم حدیث کہاں سے حاصل کیا، اس کے استاد سے تحقیق، پھر علم رجال کے بارے میں تفصیلات، اس کے لئے اتنی کاوش کی جاتی تھی کہ لوگوں کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ جعل سازی کرسکیں۔ اگرچہ کچھ لوگوں نے اس کی کوشش کی کہ جعلی حدیثیں گھڑ گھڑ کر مسلمانوں میں پھیلادیں لیکن علما اسلام نے اس فتنہ کو روکنے کا اہتمام پہلے سے کیا ہوا تھا۔

آپ نے کہا کہ امام ترمذی راویوں کے بارے میں نرمی سے کام لیتے تھے۔ اس وجہ سے باقی اماموں نے کہا کہ کسی راوی کو امام ترمذی نے ٹھیک کہا ہے تو اس بارے میں مزید پڑتال کرلینی چاہئے۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ جو حدیث امام ترمذی کی سند سے ہے اس کو نہیں ماننا چاہئے؟

نہیں نہیں۔ امام ترمذی نے اپنی کتاب میں ہر حدیث کا درجہ بیان کردیا ہے۔ اس لئے امام ترمذی کے ہاں جو احادیث ہیں وہ ساری کی ساری قابل قبول ہیں۔ اس میں کوئی پینتیس چھتیس احادیث کے بارے میں اختلاف ہے جس کی وضاحت موجود ہے۔ ان پینتیس چھتیس کی مزید تحقیق کرلیں۔ باقی کے بارے میں اکثر و بیشتر تحقیق ہوچکی ہے آپ کو اب نئے سرے سے تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ علمائے حدیث نے اتنا کام کردیا ہے کہ ہمارے لئے پکی پکائی چیز موجود ہے، آپ جو کتاب چاہیں اٹھا کر دیکھ لیں اور کوئی بھی شرح اٹھا کر دیکھ لیں اس میں ساری بحث آپ کو مل جائے گی آپ اس کے مطابق عمل کریں۔

کیا وہ لوگ بھی صحابہ ہوں گے جنہوں نے نبی کو تو دیکھا لیکن اس وقت ایمان نہیں لائے تھے۔

یہ بات تو میں کہہ چکا ہوں کہ جو بعد میں ایمان لائے اور انہوں نے حالت ایمان میں

رسول اللہ ﷺ کی زیارت نہیں کی وہ صحابیؓ شمار نہیں ہوتے۔ صحابیؓ وہ خوش نصیب حضرات شمار ہوتے ہیں۔ جنہوں نے حضورؐ کو حالت ایمان میں دیکھا اور بعد میں اسلام نہیں لائے بلکہ حضورؐ کے زمانے ہی میں اسلام لائے۔ ایک مشہور بزرگ تھے کعب الاحبار، یہ حضورؐ کے زمانہ میں مدینہ میں موجود تھے۔ یہودی تھے انہوں نے حضورؐ کے زمانے میں اسلام قبول نہیں کیا۔ حضورؐ کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ یا حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں اسلام لائے۔ اس لئے ان کا شمار تابعین میں ہوتا ہے، صحابہ میں نہیں۔ حالانکہ وہ مدینہ میں رہتے تھے اس لئے حضورؐ کو بارہا دیکھا۔

آپ کی اتنی اچھی آرزو ہے شرح نسائی لکھنے کے بارے میں کہ دل سے آواز اٹھی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو امام نسائی کی سنن کی شرح لکھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

آپ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ توفیق دے۔ بہرحال یہ ایجنڈے پر موجود ہے۔ بہت ساری چیزیں جو **Wish list** میں ہیں اس میں یہ بھی شامل ہے۔ میں نے ایک بڑا لفافہ بنا رکھا ہے، اس پر امام نسائی کا نام لکھا ہوا ہے۔ جب بھی امام نسائی سے متعلق کوئی چیز ملتی ہے تو اس لفافے میں اس کی فوٹو کاپی ڈال دیتا ہوں اس خیال سے کہ جب موقع ملے گا تو اس سے کام لیں گے۔

صغار تابعین کی روایت کس طبقہ کے صحابہ سے ہیں؟

صغار تابعین کی روایات کبار تابعین اور صغار صحابہ سے ہیں۔ صحابہ میں جن کا انتقال بہت بعد میں ہوا، وہ پہلی صدی ہجری کے اواخر تک زندہ رہے۔ ان سے روایتیں صغار تابعین کی ہیں اور بقیہ روایات کبار تابعین سے ہیں۔

شرح کی **Term** کو واضح کریں۔

شرح سے مراد ہے **Commentary**، یا تشریح۔ یعنی **Commentary of the Hadith.**

There are many commentaries of the Ahadith and almost right from the begining, from the days the Ahadith were compiled in book form, the process of writing commentaries and explainations on those Ahadith had been started. There are thousands of commentries of the Ahadith writen during the course of last one thousand years.

امام ابن ماجہ کی کتاب میں ضعیف احادیث کی کثرت کی کیا وجہ ہے؟

وجہ یہ ہے کہ وہ احادیث امام ابن ماجہ کے نزدیک ضعیف نہیں تھیں۔ امام ابن ماجہ ایک راوی کو صحیح سمجھتے تھے، ضعیف نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے وہ احادیث نقل کر دیں۔ لیکن بقیہ اہل علم نے مزید تحقیق کی تو انہوں نے امام ابن ماجہ کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔

ابھی تک سنے گئے لیکچرز سے میں نے اندازہ لگایا کہ استاد اور شاگرد کی رائے میں بھی فرق ہو سکتا ہے۔ confusion پیدا ہوتی ہے کہ کس کی رائے پر عمل کیا جائے، کیونکہ دونوں نے تحقیق کے بعد ہی بات کی ہو گی۔

اصل اور آئیڈیل بات تو یہ تھی کہ ہر شخص اپنی تحقیق پر عمل کرے۔ آئیڈیل بات تو یہی ہے۔ لیکن ہر شخص کے پاس اتنا وقت نہیں کہ خود تحقیق کرے۔ اس لئے مسلمانوں میں رواج یہ پیدا ہو گیا کہ یا تو آپ خود تحقیق کریں اور خود ہی اس درجہ پر پہنچ جائیں کہ حدیث کی ہر روایت کی تحقیق کر کے خود فیصلہ کریں۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو اور ہر شخص کے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا تو پھر قرآن پاک نے نہایت مفید، آسان اور عملی اصول عطا کیا ہے کہ 'فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون'، اگر تم نہیں جانتے تو جو جاننے والے ہیں ان سے پوچھو ان کی رائے پر عمل کرو۔ اس لئے مسلمانوں میں پہلے دن سے یہ طریقہ ہے کہ جس شخص کی دو باتوں پر اعتماد ہو، صرف دو، بقیہ کچھ نہیں۔ جس کی ان دو چیزوں پر آپ کو اعتماد ہو، اس کی رائے پر عمل کریں، اس اعتماد کے ساتھ کہ یہ رائے صحیح ہوگی اور اللہ تعالیٰ آپ سے باز پرس نہیں کرے گا۔ ایک اعتماد اس کے علم پر اور دوسرا اعتماد اس کے تقویٰ پر ہو۔ علم کے بغیر صرف تقویٰ کافی نہیں اور تقویٰ کے بغیر علم کافی نہیں۔ ابھی میں امام مالکؒ کا ذکر کر چکا ہوں کہ انہوں نے ایسے لوگوں کی احادیث قبول نہیں کیں جو تقویٰ میں تو اونچے درجہ کے تھے لیکن ان کی علمی پختگی میں امام مالک کو تامل تھا۔ اس لئے علم بھی اونچے درجہ کا ہونا چاہئے اور تقویٰ بھی کامل ہونا چاہئے جس کی رائے اور اجتہاد پر آپ عمل کرنے کا فیصلہ کریں تو پہلے یہ یقین کر لیں کہ اس کا تقویٰ بھی اونچے درجہ کا ہو اور علم بھی راسخ ہو۔ یہ فیصلہ آپ کو خود ہی کرنا پڑے گا اس میں کوئی اور آپ کا ساتھ نہیں دے گا کہ آپ کو کس کے علم اور تقویٰ پر اعتماد ہے۔ تقویٰ آپ خود جج کریں، کوئی آدمی نہیں بتا سکتا۔ میں اپنے بارے میں فیصلہ کروں گا، آپ اپنے بارے میں فیصلہ کریں گے۔ اگر آپ میری رائے جاننا چاہیں کہ فلاں فلاں معاملہ میں میں کس کے علم و

تقویٰ کو بھروسہ کے قابل سمجھتا ہوں تو میں انفرادی طور پر آپ کو بتا سکتا ہوں۔

پلیز کوئی ایک شرح پڑھ کر سنادیں۔ سنن سے کیا مراد ہے لفظی اور اصطلاحی دونوں معنی بتادیں۔

سنن سنت کی جمع ہے۔ اس کے دو معنی ہیں۔ ایک تو ان احادیث کا مجموعہ جن سے کوئی سنت ثابت ہوتی ہو۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے سنن سے مراد حدیث کی وہ کتاب ہے جس کی ترتیب فقہی احکام پر ہو۔ اور سنن کے ایک اور معنی ہیں سنتوں کا مجموعہ، وہ کتاب یا وہ کتاب حدیث جس میں بہت ساری احادیث لکھی ہوئی ہوں۔ اس اعتبار سے حدیث کی ہر کتاب سنن کا مجموعہ ہے اس لئے کہ ہر کتاب میں حدیثیں لکھی ہوئی ہیں۔ لیکن خاص طور پر علمائے حدیث کی اصطلاح میں حدیث کی وہ کتاب جس کی ترتیب فقہی احکام پر ہو وہ سنن کہلاتی ہے۔

جب تمام احادیث آپ ﷺ کی ہیں اور سب مانتے ہیں تو پھر مسلکوں کی بنیاد کیسے پڑی؟ لوگ صرف ایک ہی منتخب کردہ امام کی بات مانتے ہیں اور باقیوں کی بات نہیں مانتے حالانکہ ساری احادیث آپؐ کی ہیں۔

میں کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ بعض احادیث کی تعبیر وتشریح میں اور قرآن پاک کی آیات کی تعبیر وتشریح میں بھی ایک سے زائد رائے کا امکان موجود ہے جس کی مثال میں نے صحابہ کے زمانے سے دی کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کی ایک سے زائد تعبیروں اور ایک سے زائد توضیحات کو درست بتایا اور دونوں کو بیک وقت قابل قبول قرار دیا۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ اسلام میں بعض احکام ایسے دیئے گئے ہیں، قرآن پاک میں بھی اور احادیث میں بھی، جن کی مختلف تفسیریں اور تشریحات کی جاسکتی ہیں۔ یہ اجازت اس لئے دی گئی کہ مختلف حالات کے لحاظ سے، مختلف زمانے کے متنوع تقاضوں اور لوگوں کی ضروریات کے لحاظ سے علما اور فقہا اور محدثین اس کی نئے نئے انداز سے تشریح کرسکیں۔

میں نے مثال دی تھی قرآن پاک کی آیات میں کہ 'علی الموسع قدرہ وعلی المقتر قدرہ'، کہ جب شوہر بیوی کا نفقہ ادا کرے گا تو دولت مند اپنی استطاعت کے لحاظ سے اور غریب اور نادار اپنی استطاعت کے لحاظ سے ادا کرے گا۔ حالانکہ مثال کے طور پر قرآن پاک کہہ سکتا تھا کہ شوہر سو درہم نفقہ دیا کرے گا، یا ایک من گندم دیا کرے گا، اس حکم کو بیان کرنے کا ایک

طریقہ یہ بھی ہوسکتا تھا۔لیکن قرآن مجید میں اس طرح سے کوئی معین مقدار یا quantify کر کے نہیں بتایا بلکہ ایک عمومی بات بتائی جس کو اپنے اپنے زمانے کے لحاظ سے لوگ سمجھیں اور اس کی تعبیر کر دیں۔ چونکہ تعبیروں کا اختلاف اسلام کی بنیادی خصوصیات میں شامل ہے اس لئے حضورؐ نے اس کی اجازت دی۔قرآن پاک میں اس کی گنجائش رکھی گئی۔مختلف اہل علم نے مختلف تعبیریں کیں اور جو شخص جس فقیہ کے علم اور تقویٰ پر اعتماد کرتا ہے اس کی بات مان لیتا ہے۔ اُس زمانے میں جب یہ سارے محدثین اور فقہا موجود تھے اس وقت جن حضرات کو امام شافعیؒ کے علم اور تقویٰ پر اعتماد تھا وہ امام شافعی کے اجتہادات کو سر آنکھوں پر تسلیم کرتے تھے۔امام شافعی اتنے اونچے درجہ کے انسان تھے کہ اگر آج وہ آئیں اور ہم میں سے کوئی ان کے پاؤں چومنے کی کوشش نہ کرے تو بڑا بد بخت ہوگا۔

امام احمد بن حنبلؒ سے ہر مسلمان کو محبت اور عقیدت ہے۔لیکن امام احمد بن حنبل کے اجتہادات کو دنیائے اسلام میں بہت تھوڑے لوگ قبول کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں مشکل سے ایک فیصد لوگ ہوں گے جو فقہی معاملات میں امام احمد کی رائے اور اجتہاد پر عمل کرتے ہیں۔ بقیہ ننانوے فیصد دوسرے فقہا کی پیروی کرتے ہیں۔لیکن امام احمد کے احترام میں وہ کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔تقلید سے مراد صرف یہ ہے کہ کسی شخص کے علم اور تقویٰ کی بنیاد پر اس کی بات کو مان کر اس پر عمل کرلیا جائے۔ اس کو تقلید کہتے ہیں۔امام احمد کی تقلید تو تھوڑے لوگوں نے کی۔لیکن احترام سب کرتے ہیں۔تقلید کا تعلق احترام سے نہیں ہے۔ احترام تو ہر صاحب علم کا ہوتا ہے۔صحیح بخاری دنیائے اسلام میں ہر جگہ پڑھائی جاتی ہے۔اس وقت دنیائے اسلام میں امام ابوحنیفہ کی پیروی کرنے والے کم وبیش پینسٹھ فیصد مسلمان ہیں۔ پورا وسط ایشیا، پورا افغانستان، پورا ترکی، پورا مشرقی یورپ، پورا ہندوستان، پورا پاکستان، پورا بنگلہ دیش، پورا چین۔ یہ دنیائے اسلام کے تقریباً ساٹھ پینسٹھ فیصد بنتے ہیں اور امام ابوحنیفہ کی تقلید کرتے ہیں۔لیکن ان میں سے کوئی بھی امام بخاری کے احترام اور عقیدت میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔امام بخاری نے کم سے کم بیس مقامات پر امام ابوحنیفہ پر تنقید کی ہے جو بعض مقامات پر خاصی سخت ہے۔سر آنکھوں پر۔اگر باپ اور چچا میں اختلاف ہو تو بچوں کا یہ حق نہیں کہ وہ باپ کا ساتھ دے کر چچا کے خلاف کچھ آواز اٹھائیں۔ دادا اور دادا کے بھائی میں اختلاف ہو تو پوتوں اور نواسوں کا یہ کام نہیں کہ وہ ایک کی

حمایت میں اٹھیں اور دوسرے کی مخالفت کریں۔ ہم امام بخاری کا بھی احترام کرتے ہیں اور امام ابوحنیفہ کا بھی احترام کرتے ہیں۔ ان کا ایک علمی اختلاف ہے۔ جس کو امام بخاری کے دلائل زیادہ مضبوط معلوم ہوں وہ ان کی پیروی کرے اور جس کو امام ابوحنیفہ کے دلائل مضبوط معلوم ہوتے ہیں وہ ان کی پیروی کرے اور احترام دونوں کا کرے۔

کیا صحیح بخاری میں ایک ہی باب کے اندر آنے والی دو قولی احادیث کے الفاظ ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں؟

ایسا ہو سکتا ہے، اس کا امکان موجود ہے کہ ایک باب میں ایک ہی صحابیؓ سے آنے والی روایت کے الفاظ مختلف ہوں۔ اس کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک سبب تو یہ ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہی ایک بات کو کئی بار بیان فرمایا ہو۔ دو صحابہ نے دو مختلف اوقات میں اس کو سنا اور دونوں الفاظ نوٹ کر کے یاد کر لئے اور آگے بیان کر دیا۔ لیکن زیادہ ایسا ہوا ہے کہ کسی فعلی معاملہ کو، یعنی حضورؐ کے قولی ارشاد کو نہیں بلکہ کسی طرز عمل کو صحابہ نے دیکھا اور ایک صحابیؓ نے اپنے الفاظ میں بیان کر دیا اور دوسرے نے اپنے الفاظ میں۔ تو واقعہ تو ایک ہے لیکن دیکھنے والے صحابیؓ اس کو ایک سے زیادہ قسم کے الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں۔ صحابیؓ کے لئے ضروری نہیں ہے کہ جو واقعہ وہ دیکھے اس کے لئے بھی ایک ہی طرز بیان اختیار کرے۔ مثلاً عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں غزوہ بدر میں گیا تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے اور میرے ساتھ کئی لوگوں کو کمسنی کی بنیاد پر واپس کر دیا۔ اب اس واقعہ کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ جب بھی بیان کریں گے ضروری نہیں کہ ایک ہی طرح کے الفاظ میں بیان کریں۔ لیکن ان سے جو تابعی سنیں گے وہ انہی الفاظ میں لکھیں گے جن الفاظ میں ان سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بیان کیا ہے۔ ان الفاظ میں وہ تابعی اپنی طرف سے کوئی ردوبدل نہیں کریں گے۔ البتہ جس صحابیؓ نے اپنی آنکھوں سے ایک واقعہ دیکھا ہے اس کے الفاظ میں ردوبدل ہو سکتا ہے۔ اس طرح ایک ہی واقعہ کے الفاظ میں فرق ہو سکتا ہے۔

امام بخاری کی کتاب کا مکمل نام کیا ہے؟

امام بخاری کی کتاب کا مکمل نام ہے 'الجامع الصحیح المسند المختصر من امور رسول اللہ ﷺ وسننه وایامه'

کیا موطا امام مالک بھی دوسری کتابوں کی طرح مختلف جلدوں میں ہے؟

موطاامام مالک کی ایک ہی جلد ہے۔ بعض لوگوں نے دوجلدوں میں بھی چھاپی ہے۔ لیکن زیادہ تر ایک ہی جلد میں ملتی ہے۔ اگر حواشی زیادہ ہیں تو کتاب دوجلدوں میں ہوگی۔ اور اگر حواشی نہیں ہیں یا مختصر ہیں تو ایک ہی جلد میں آجائے گی۔ میرے پاس موطاامام مالک کے تین نسخے ہیں۔ ایک نسخہ جس میں حواشی بہت ہیں دوجلدوں میں ہےاور دو نسخے ایک ایک جلد میں ہیں۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم اہل حدیث ہیں تو اس سے کیا مراد ہے؟

ایک اعتبار سے تو ہر مسلمان اہل حدیث ہے۔ کیا ہم سب مسلمان جو ایک ارب بیس کروڑ کی تعداد میں دنیا میں بستے ہیں کیا ہم حدیث رسول پر عمل نہیں کرتے؟ سب حدیث پر عمل کرتے ہیں۔ اس لئے ہم سب اس مفہوم میں اہل حدیث ہیں۔ لیکن اہل حدیث کے نام سے جو حضرات برصغیر میں مشہور ومعروف ہیں، یہ اصل میں وہ حضرات ہیں، (اس پر تفصیل سے بات تو کل ہوگی)، جو حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے زمانے میں، اوران کے بعض فتاویٰ کی روشنی میں کچھ احادیث پر عمل کرنے لگے تھےاوران احادیث پر عمل کرنے کی وجہ سے باقی لوگوں سے ان کا تھوڑا اختلاف پیدا ہوگیا تھا۔ یہ لوگ شروع میں تو کسی خاص نام سے مشہور نہیں تھے۔ لیکن جب حضرت سید احمد شہید کی سربراہی میں تحریک جہاد شروع ہوئی اور مولانا شاہ اسمٰعیل شہید اس میں شریک ہوئے تو وہ سارے کے سارے لوگ انگریزوں کی تحریروں میں وہابی کہلانے لگے۔ انگریزوں نے ان کو وہابی کے نام سے مشہور کردیا اور ایک طرح سے ان کا نِک نام وہابی پڑ گیا۔ وہابی کے لفظ کو انگریزوں اور کچھ دوسرے لوگوں نے غلط معنوں میں استعمال کیا تو جب یہ لوگ وہابی کے نام سے مشہور ہوئے تو ان کو بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزوں نے ان کو بڑا **persecute** کیا اور اس **persecution** کے بہت قصے مشہور ہیں اور بڑے دردناک اور سبق آموز ہیں۔ جب یہ سلسلہ بہت آگے بڑھا تو کچھ لوگوں نے یہ چاہا کہ ہم وہابی کی بجائے کسی اور نام سے جانے جائیں تو شاید اچھا ہو۔ انہوں نے یہ طے کیا کہ ہمارا نام اہل حدیث ہونا چاہئے۔ انہوں نے اہل حدیث کے لفظ کو رواج دے دیا تو وہ اہل حدیث کے نام سے مشہور ہوگئے۔ اس میں وہ حضرات بھی شامل ہیں جو مولانا شاہ اسمٰعیل شہید کے فتاویٰ پر عمل کرتے تھے اور زیادہ تر وہ حضرات شامل ہیں جن کا سلسلہ تلمذ حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی سے ملتا ہے، جو بعد میں حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلویؒ کے ارشادات اور طریقہ کار پر چلتے تھے۔ میاں صاحب

اتنے بڑے انسان ہیں کہ اپنے زمانے میں وہ شیخ الکل کہلاتے تھے، یعنی سب کے استاد، پورے ہندوستان کے استاد۔ اور واقعی وہ علم حدیث میں شیخ الکل تھے۔

علوم الحدیث کی کسی جامع کتاب کا نام بیان کر دیں۔

اس موضوع پر سب سے جامع کتاب ڈاکٹر خالد علوی کی ہے جس کا نام علوم الحدیث ہے اور دو جلدوں میں چھپنی ہے۔ ایک جلد اس کی چھپ چکی ہے۔

حدیث کے تعارض میں جو ترجیحی وجوہ تلاش ہوئے اس میں مفہوم کے اعتبار سے جو ہیں اس کی وضاحت کر دیں۔

اگر دو احادیث میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہو تو اس کو دور کرنے کے چار وجوہ یا چار طریقے ہیں۔ ان میں سے ایک سند ہے، دوسرا متن ہے، تیسرا مفہوم ہے اور چوتھا خارجی امور ہیں۔ مفہوم میں بھی چار پانچ چیزیں شامل ہیں۔ مفہوم کا ایک اصول یہ ہے جو سب سے پہلے محدثین نے وضع کیا بعد میں دنیا کے سب لوگ اس کو ماننے لگے۔ وہ یہ ہے کہ ایک حدیث میں کوئی چیز عمومی انداز میں بیان ہوئی ہے، جنرل مفہوم ہے جس کو اصطلاح میں 'حدیث عام' کہا جاتا ہے۔ اور ایک دوسری حدیث خاص ہے اور وہ کسی خاص حالت کو بیان کرتی ہو۔ تو بظاہر ان میں تعارض ہوگا لیکن دراصل ان میں تعارض نہیں ہے۔ جو عام کو بیان کرتی ہے وہ عام مسائل کو بیان کرتی ہے جو خاص ہے وہ اس خاص particular categary کو regulate کرتی ہے۔ تو ہم یہ کہیں گے کہ یہ جو خاص حدیث ہے یہ اِس عام کے اُس پہلو کو مستثنیٰ کر دیتی ہے جس کا ذکر اس حدیث میں کیا گیا ہے۔ یہ دو احادیث کے درمیان تعارض دور کرنے کا ایک طریقہ ہے۔

اس سلسلہ میں ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ 'لاتبع ما لیس عندك' یہ سنن کی اکثر کتابوں میں موجود ہے۔ کہ وہ چیز مت بیچو جو تمہارے پاس موجود نہیں ہے۔ یہ ایک عام حدیث ہے۔ آپ گندم بیچیں اور آپ کے پاس موجود نہ ہو تو مت بیچیں۔ آپ کے پاس جوتا نہیں ہے تو جوتا مت بیچیں، میز نہیں ہے تو میز مت بیچیں، گلاس نہیں ہے تو گلاس مت بیچیں۔ یہ ایک عام چیز ہے۔ لیکن ایک خاص چیز ہے کہ کسی کے پاس فیکٹری لگی ہوئی ہے۔ وہ مثلاً فرنیچر بناتا ہے اور آپ پیسے دیں کہ یہ پیسے لیجئے اور مجھے سو تپائیاں بنا کر دے دیں۔ پیسے آپ نے دے دیئے، خرید و فروخت مکمل ہوگئی اور تپائیاں اس شخص کے پاس موجود نہیں ہیں۔ تو اس حدیث کی رو

سے وہ آپ کو تپائیاں نہیں بیچ سکتا۔ نہ آپ سے پیسے لے سکتا ہے۔ پہلے وہ تپائیاں بنائے، جب بن جائیں تو پھر آپ کو فروخت کرے۔ لیکن ایک طریقہ شروع سے یہ رائج رہا ہے کہ جو لوگ سپلائرز ہیں یا مینوفیکچررز ہیں، اسلام سے پہلے بھی ایسا ہوتا تھا آج بھی ہوتا ہے۔ آپ مینوفیکچرر یا سپلائیر سے کوئی معاملہ کرلیں اور پہلے اس کو پیسے دے دیں۔ وہ جس طریقے سے سپلائی کرتا ہے آپ کو سپلائی کردے گا۔ اس وقت تو وہ چیز موجود نہیں ہے لیکن بعد میں موجود ہو جائے گی۔ وہ آپ کو دے دے گا۔ یہ ایک خاص حکم ہے جو اس خاص صورت حال کے لئے ہے۔ یہ اس عام حکم سے مستثنیٰ ہے۔ اب آپ کہیں کہ بظاہر تو تعارض ہے۔ وہ چیز موجود نہیں ہے تو وہ کیسے بیچے گا۔ لیکن یہ ایک خاص حدیث ہے ایک خاص صورت حال کو بیان کرتی ہے۔ مینوفیکچرر یا **Grower** کو آپ کہیں کہ فلاں تاریخ کو آپ مجھے دس من گندم دے دیں۔ یا قصائی ہے جانور خرید کرلاتا ہے اور گوشت سپلائی کرتا ہے۔ آپ کے ہاں کوئی تقریب ہے اور آپ اس سے کہیں کہ فلاں تاریخ کو دو من گوشت سپلائی کردو تو وہ کردے گا اس لئے کہ وہ سپلائر ہے۔ تو سپلائیر، مینوفیکچرر یا **Grower** کے لئے حضورؐ نے اجازت دی ہے اس لئے کہ یہ طریقہ چلا آرہا تھا۔ یہ مخصوص صورت حال ہے اور اس کو اسی پر محدود رکھا جائے گا اور بقیہ عام حدیث بقیہ معاملات پر منطبق ہوگی۔ ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں رہا۔ یہ ہے مفہوم کے لحاظ سے تعارض کو دور کرنا۔

وآخر دعوٰنا ان الحمد لله رب العلمین۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

گیارھواں خطبہ

برصغیر میں علم حدیث

جمعۃ المبارک، 17 اکتوبر 2003

برصغیر میں علم حدیث

برصغیر میں علم حدیث پر گفتگو کی ضرورت دو وجوہات کی بنا پر ہے۔ ایک بڑی وجہ تو یہ ہے کہ برصغیر میں ایک خاص دور میں علم حدیث پر بہت کام ہوا۔ یہ کام اتنے وسیع پیمانے پر اور اتنی جامعیت کے ساتھ ہوا کہ عرب دنیا میں بہت سے حضرات نے اس کا اعتراف کیا اور اس کے اثرات وسیع پیمانے پر عرب دنیا میں بھی محسوس کئے گئے۔ مصر کے ایک نامور عالم اور دانشور علامہ سید رشید رضا نے یہ لکھا کہ اگر ہمارے بھائی، برصغیر کے مسلمان، نہ ہوتے تو شاید علم حدیث دنیا سے اٹھ جاتا۔ یہ اٹھارویں انیسویں صدی کی صورت حال کا تذکرہ ہے۔ برصغیر کے علماء کرام نے اس دور میں علم حدیث کا پرچم بلند کیا جب دنیائے اسلام اپنے مختلف مسائل میں الجھی ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی علمی اور تہذیبی روایتیں ایک ایک کر کے ختم ہو رہی تھی۔ مسلمانوں کے تعلیمی ادارے ایک ایک کر کے بند کئے جا رہے تھے۔ اس لئے جہاں اور بہت سی روایات ختم ہو رہی تھی وہاں علم حدیث کی روایت بھی کمزور پڑ رہی تھی۔ اس دور میں برصغیر کے اہل علم نے اس روایت کا پرچم تھاما اور اس کو اس طرح زندہ کر دیا کہ اس کے اثرات پوری دنیا میں ہر جگہ محسوس کئے گئے۔

دوسری وجہ برصغیر میں خاص علم حدیث پر گفتگو کرنے کی یہ ہے کہ برصغیر میں علم حدیث کی تاریخ کا موضوعی مطالعہ یعنی **objective study** کم ہوئی ہے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ برصغیر میں صف اول کے اہل علم کو، ایسے اہل علم کو، جن کے علمی کارناموں کو عرب دنیا کے صف اول کے اہل علم و تحقیق نے اور عجمی دنیا کے اکابر علماء نے تسلیم کیا ہمارے ہاں مسلکی تقسیم کا نشانہ بنا دیا گیا۔ میں نے ایسے بہت سے حضرات کو دیکھا ہے جو صف اول کے بعض محدثین کے

کام سے اس لئے واقف نہیں ہیں کہ ان محدثین کا تعلق اس مسلک سے نہیں تھا جس مسلک کا علمبردار یہ حضرات خود کو کہتے تھے۔ اس مسلکیت نے مسلمانوں کو علم کی ایک بہت بڑی دولت سے محروم کیا ہوا ہے۔ اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک موضوعی انداز میں ان تمام محدثین کے علمی کام کا جائزہ لیا جائے جنہوں نے برصغیر میں اس شمع کو روشن کیا۔ برصغیر میں علم حدیث مسلمانوں کی علمی تاریخ سے کوئی الگ چیز نہیں ہے بلکہ جنوبی ایشیا کی علمی تاریخ ہی کا ایک نہایت روشن، تابناک اور شاندار باب ہے۔ آج بھی مسلمانوں کی عمومی علمی تاریخ کے اثرات برصغیر میں علم حدیث پر کی جانے والی تحقیق اور کاوشوں پر بھی پڑ رہے ہیں۔

برصغیر میں اسلام خلفائے راشدین کے زمانے میں ہی آ گیا تھا۔ سیدنا عمر فاروقؓ کے زمانے میں مغربی ہندوستان میں، بمبئی اور تھانہ میں مسلمانوں کی آبادیاں وجود میں آ چکی تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب حضرات تابعین تھے جو ہندوستان میں آئے اور جن کی آبادیاں برصغیر میں قائم ہوئیں۔ انہی تابعین کے ہاتھوں برصغیر میں اسلام باقاعدہ طور پر داخل ہوا۔ سیدنا عمر فاروقؓ اور سیدنا عثمان غنیؓ کے زمانے میں مسلمانوں کے قافلے یہاں آنے جانے شروع ہوئے۔ سیدنا عثمان غنیؓ کے زمانے میں یہاں **Fact finding missions** بڑے پیمانے پر آئے۔ اور برصغیر کا تذکرہ اسلامی ادب میں تیزی کے ساتھ ہونے لگا۔

پھر جب سن 92ھ میں محمد بن قاسمؒ کے ہاتھوں سندھ اور موجودہ پاکستان کا بیشتر حصہ فتح ہوا تو ان کے ساتھ بڑی تعداد میں تابعین اور بعض صحابہ کرامؓ بھی تشریف لائے۔ برصغیر کے ایک مشہور مورخ اور محقق قاضی اطہر مبارک پوری نے برصغیر کی تاریخ پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں ایک کتاب انہوں نے خاص طور پر ان صحابہ کے تذکرے پر بھی لکھی ہے جو برصغیر میں آئے، یہاں رہے اور یہیں پر دفن ہوئے۔ خاص طور پر صحابہ کرامؓ کی یہ آمد سندھ، ملتان اور ان کے قرب و جوار کے علاقوں میں زیادہ کثرت سے ہوئی۔ ظاہر ہے ان میں کوئی نامور صحابیؓ تو شامل نہیں تھے۔ یہ صغار صحابہ ہی تھے جو یہاں تشریف لائے ہوں گے، کیونکہ سن 92ھ میں یہ علاقہ فتح ہوا اور صحابہ کا زمانہ **110**ھ تک کا ہے۔ اس لئے صحابہ میں سے بعض شخصیات یہاں تشریف لائیں۔ لیکن صحابہ کرام سے کہیں زیادہ علمائے تابعین بڑی تعداد میں یہاں آئے۔ ان میں علم حدیث کے ماہرین بھی شامل تھے۔

علم حدیث میں برصغیر کا contribution تابعین اور تبع تابعین کے زمانے سے شروع ہوگیا تھا۔ ایک بزرگ تھے ابومعشر نجیح السندی، ان کے لقب کے ساتھ سندی یا سندھی لگا ہوا ہے۔ ان کی روایات اور ان کی بیان کردہ احادیث اور سیرت کا مواد کتب حدیث اور کتب سیرت میں کثرت سے ملتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ برصغیر میں اس روایت نے اتنی تیزی سے جڑیں پکڑیں کہ یہاں کے ایک نامور صاحب علم کا تذکرہ عراق، حجاز اور مصر کے نامور اصحاب علم کے ساتھ ہونے لگا۔

علم حدیث کے ارتقاء اور برصغیر میں علم حدیث پر ہونے والے کام کی رفتار اور اسلوب وانداز کے اعتبار سے دیکھا جائے تو برصغیر کی علمی تاریخ کے سات دور بنتے ہیں۔

برصغیر میں علم حدیث کا پہلا دور

سب سے پہلا دور وہ ہے جو محمد بن قاسمؒ کی فتح سندھ کے ساتھ شروع ہوا اور اس وقت تک جاری رہا جب دہلی میں مسلمانوں کی خودمختار اور مستقل بالذات سلطنت کا دارالحکومت قائم ہوا۔ یہ وہ دور ہے جس میں مسلمانوں کے علمی روابط دنیائے عرب کے ساتھ بالعموم اور عراق کے ساتھ بالخصوص قائم ہوئے۔ عراق کے لوگ بڑی تعداد میں یہاں آئے۔ اسی طرح دوسرے عرب ممالک سے بھی لوگ بڑی تعداد میں یہاں برصغیر میں آکر بسے۔ ان میں اہل علم بھی شامل تھے، محدثین بھی شامل تھے۔ ان محدثین کے جزوی تذکرے تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ یہ محدثین بڑی تعداد میں آتے رہے اور یہاں علم حدیث کی نشر واشاعت اپنی مقدور بھر کوششوں کے ذریعہ تصنیفی اور تحقیقی کام کرتے رہے۔ لیکن ان میں سے بیشتر کا کوئی مفصل تذکرہ نہیں ملتا۔ اُس دور کے اہل علم کے بارہ میں اگر کوئی مواد ملتا بھی ہے تو وہ انتہائی مختصر اور محدود ہے۔ اس قلت معلومات کی ایک بڑی اور اہم وجہ یہ بھی ہے کہ کوئی بڑا اور نمایاں تصنیفی اور تحقیقی کام اس دور میں ایسا نہیں ہوا کہ جو کسی قابل ذکر کتاب کی شکل میں یا تصنیف کی شکل میں ہوتا اور ہم تک پہنچتا۔

برصغیر میں علم حدیث کا دوسرا دور

اس کے بعد جب دہلی میں مسلمانوں کی سلطنت قائم ہوئی۔ اور وہ دور شروع ہوا جس کو دور سلطنت کہتے ہیں۔ اس وقت بڑی تعداد میں علمائے کرام برصغیر میں آئے جن میں علم

حدیث کے ماہرین بھی شامل تھے۔ لیکن اس دور میں ایک نئی خصوصیت یہ سامنے آئی کہ برصغیر کے مسلمانوں کے علمی روابط دنیائے عرب سے کمزور ہوکر بلکہ بڑی حد تک کٹ کر دنیائے عجم سے قائم ہوگئے۔ اس لئے کہ محمد بن قاسمؒ اور ان کے ساتھی حجاز، عراق اور باقی عرب دنیا سے آئے تھے اور ان کے روابط عرب دنیا کے علمی مراکز کے ساتھ تھے۔ بعد میں دور سلطنت میں جو لوگ افغانستان اور سنٹرل ایشیا سے آئے ان کے روابط افغانستان اور سنٹرل ایشیا کے علمی مراکز سے قائم رہے اور سنٹرل ایشیا ہی کی علمی اور دینی روایت کو انہوں نے فروغ دیا۔ سنٹرل ایشیا اور افغانستان کی مذہبی روایت میں منطق، کلام، عقلیات اور اصول فقہ کا زیادہ زور تھا۔ اس لئے اس دور میں علم حدیث پر زور نسبتاً کم ہوگیا۔ کم ہوتے ہوتے ایک وقت ایسا بھی آیا جس میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید برصغیر کے مرکزی علمی مقامات پر علم حدیث تقریباً ختم ہوگیا ہے اور ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ علم حدیث ہندوستان سے اٹھتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

انہی دنوں ایک بزرگ جو علامہ ابن تیمیہؒ کے شاگرد تھے، وہ ہندوستان آئے اور اپنے ساتھ علم حدیث کے ذخائر بھی لے کر آئے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد وہ ہندوستان سے واپس چلے گئے۔ ایک اور بزرگ جو بڑے نامور محدث تھے یہاں تشریف لائے اور اس خیال سے آئے کہ برصغیر میں درس حدیث کا سلسلہ شروع کریں گے۔ لیکن جب ہندوستان کی سرحد کے قریب پہنچے تو یہ سن کر واپس چلے گئے کہ اس ملک کا بادشاہ بے نماز ہے اور بعض ایسے اعمال میں مبتلا ہے جو شرعاً قابل اعتراض ہیں۔ اس لئے انہوں نے فرمایا کہ میں ایسے ملک میں نہیں رہ سکتا جہاں حکمران اس سطح کے لوگ ہوں۔ اس لئے اس دور میں علمی اعتبار سے کسی بڑے کارنامے کا ذکر نہیں ملتا۔

البتہ دو چیزیں ایسی ہیں جو بڑی نمایاں اور قابل توجہ ہیں۔ اس زمانے میں بھی جب پورے برصغیر میں علمی اعتبار سے علم حدیث کا میدان خشک سالی کا شکار تھا اور گلستان حدیث میں خزاں کا دور دورہ تھا۔ اس زمانے میں بھی دو کام بڑے نمایاں ہوئے۔ ایک کام تو ہمارے موجودہ پاکستان میں ہوا۔ اور دوسرا کام مغربی ہندوستان کے صوبہ گجرات میں ہوا۔ جہاں آج بھی مسلمانوں کی بڑی آبادیاں اور تعلیمی ادارے موجود ہیں۔ ہمارے اسی پنجاب کے دارالحکومت لاہور میں ایک بہت بڑے محدث نے، جو اس زمانے میں دنیائے اسلام میں صف اول کے چند محدثین میں سے ایک تھے، انہوں نے اس علاقہ کو اپنا وطن بنایا اور لاہوری کہلائے۔ انہوں نے علم

حدیث پر جو کام کیا وہ کئی سو سال تک پوری دنیائے اسلام میں بہت مشہور ومعروف اور مقبول رہا۔ ان کا اسم گرامی تھا امام حسن بن محمد صغانی لاہوری۔ امام صغانی لاہوری کے نام سے مشہور ہیں۔ لاہور میں طویل عرصہ تک قیام کرنے کی وجہ سے وہ لاہوری کہلائے۔ اگرچہ ان کے بارے میں یہ بات مختلف فیہ ہے کہ وہ اصل میں کہاں کے رہنے والے تھے۔ بعض بزرگوں کا کہنا ہے کہ ان کا تعلق بدایون سے تھا جو یوپی کا ایک شہر ہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ان کا تعلق پنجاب ہی کے کسی علاقے سے تھا۔ تاہم اس پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ لاہور ہی میں قیام فرما رہے۔ لاہور ہی کو انہوں نے اپنا وطن بنایا۔ پھر ایک طویل عرصہ کے بعد وہ لاہور سے دنیائے عرب چلے گئے اور حجاز میں سکونت اختیار فرمائی، اور حرمین ہی میں ان کا انتقال ہو۔ حدیث پر ان کی کتاب ہے 'مشارق الانوار النبویه فی صحاح الاخبار المصطفویه'۔ جس کو مختصراً مشارق الانوار کہا جاتا ہے۔

مشارق الانوار برصغیر میں کئی سو سال تک حدیث کی ایک مستند کتاب کے طور پر مروج رہی ہے۔ درسگاہوں میں پڑھائی جاتی رہی ہے۔ بہت سے حضرات نے اس کے ترجمے کئے اور اس کی شرحیں لکھیں۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ایک قدیم ترین کتاب کے طور پر موجود ہے۔ جب برصغیر میں طباعت اور نشرواشاعت کا سلسلہ شروع ہوا اسی وقت یعنی بارھویں صدی ہجری کے اواخر میں یا تیرھویں صدی ہجری کے شروع میں مشارق الانوار کا یہ اردو ترجمہ شائع ہوا تھا۔

مشارق الانوار ایک ضخیم کتاب ہے جس میں صحیحین کی قولی احادیث کا انتخاب ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں جتنی احادیث ہیں، ان میں فعلی اور تقریری احادیث کو انہوں نے نکال دیا ہے اور قولی احادیث، یعنی رسول اللہ ﷺ کے قولی ارشادات گرامی کو منتخب کر کے اور سند حذف کر کے انہوں نے جمع کر دیا ہے۔ گویا وہ یہ چاہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی روایت اور سند کے فنی مباحث سے ہٹ کر عام قارئین تک پہنچ جائیں تاکہ عام لوگ اس کا مطالعہ کر سکیں۔

یہ مشکوٰۃ سے پہلے لکھی جانے والی ایک کتاب تھی۔ امام صغانی لاہوری کی وفات 650ھ میں ہوئی تھی۔ ظاہر ہے انہوں نے اس سے پہلے یہ کتاب لکھی ہوگی۔ ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں لکھی جانے والی یہ کتاب برصغیر میں طویل عرصہ تک مروج رہی۔ اس کی شرحیں بھی لکھی گئیں۔ بعد میں استنبول میں جو کم وبیش سات سو برس تک دنیائے اسلام کا سیاسی مرکز اور

خلافت عثمانیہ کا دارالحکومت رہا۔ وہاں کے ایک بزرگ نے اس کی شرح لکھی جو مطبوعہ موجود ہے اور استنبول سے 1328ھ/ء میں شائع ہوئی تھی اور جس کا نام ہے 'مبارق الاظہار فی شرح مشارق الانوار'۔

پنجاب کے اس غیر معمولی کارنامے کے علاوہ مغربی ہندوستان میں گجرات کے صوبے میں بڑے بڑے محدثین پیدا ہوئے۔ انہوں نے علم حدیث پر جو کام کیا وہ دور سلطنت کا ایک نمایاں کام ہے۔ اس میں ایک بہت بڑے اور مشہور بزرگ شیخ محمد طاہر پٹنی تھے۔ ان کو عربی میں فتنی کہا جاتا ہے اس لئے کہ 'پ' کو معرب کر کے 'ف' کر دیتے ہیں اور 'ٹ' کو معرب کر کے 'ط' یا 'ت' کر دیتے ہیں۔ شیخ محمد طاہر فتنی کا تعلق صوبہ گجرات سے تھا۔ انہوں نے علم حدیث میں دو بڑے کارنامے کئے۔ ان میں سے ایک کارنامہ تو اپنی نوعیت کا بالکل منفرد ہے اور اتنا منفرد ہے کہ شاید دنیائے اسلام میں اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ دوسرا کارنامہ وہ ہے جس میں اور لوگ بھی ان کے ہمسر ہیں۔ ایک کام تو انہوں نے یہ کیا کہ 'تذکرۃ الموضوعات' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں موضوع احادیث کو جمع کر دیا۔ موضوع احادیث پر کام کرنے والے بعد میں بھی بہت ہوئے۔ شیخ طاہر پٹنی سے پہلے بھی لوگ ہیں، اگر چہ کم ہیں۔ شیخ طاہر وہ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے برصغیر میں موضوعات پر ایک جامع کام کرنے کا ارادہ کیا اور تذکرۃ الموضوعات پر ایک ضخیم کتاب تیار کی جس کے کئی ایڈیشن پاکستان، ہندوستان اور عرب دنیا میں شائع ہوئے اور عام طور پر مشہور و معروف ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے ان تمام احادیث کو مضامین کے لحاظ سے جمع کر دیا ہے جو ان کے خیال میں موضوع اور نا قابل قبول ہیں۔ یہ تو ایسا کام ہے جو اور جگہ بھی ہوا ہے۔ لیکن ان کا وہ کام جس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی وہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک ضخیم کتاب لکھی جس کا عنوان ہے 'مجمع بحار الانوار'۔ یہ کتاب اسی نام سے مشہور ہے اور کتب خانوں میں موجود ہے۔ اس کتاب کا مکمل نام ہے 'مجمع بحار الانوار فی غرائب التنزیل و لطائف الاخبار'۔

اس کتاب میں انہوں نے یہ کیا ہے کہ پوری صحاح ستہ کا جائزہ لے کر مکررات کو نکالا اور بقیہ احادیث کو جمع کر کے ان کے غریب اور مشکل الفاظ کے معانی بیان کئے اور اہم نکات کی شرح لکھی۔ اس طرح سے یہ گویا پوری صحاح ستہ کی شرح ہے۔ اس میں بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ سب کی شرح موجود ہے۔ چھ کی چھ کتابوں میں مکررات نکال کر جو چیزیں

پہنچتی ہیں یہ کتاب ایک اعتبار سے ان کی شرح ہے۔ تو اس کتاب کو سامنے رکھ کر گویا علم حدیث کی ساری کتابوں کے بارے میں پڑھنے والے کو کچھ نہ کچھ واقفیت ہو سکتی ہے۔ بہت سے اہل علم نے اس کی تعریف کی ہے اور اس کا ذکر مختلف تذکروں میں ملتا ہے۔ یہ ایک ایسا اچھوتا کام ہے جو اس انداز میں برصغیر کے علاوہ کسی اور ملک میں نہیں ہوا۔

صوبہ گجرات کے دو بڑے محدثین اور تھے جن میں ایک محدث سے ہم سب اور علم حدیث کا ہر طالب علم اور پوری دنیائے اسلام واقف ہے۔ وہ ہیں شیخ علی المتقی الہندی۔ اگر کہا جائے کہ شیخ علی متقی دنیائے اسلام میں اپنے زمانے کے سب سے بڑے محدث تھے تو شاید غلط نہیں ہوگا۔ وہ گجرات سے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ چلے گئے تھے اور زندگی بھر وہیں رہے۔ انہوں نے ایک ایسا کام کیا جو اپنی نوعیت کا ایک بہت بڑا اور منفرد کام تھا۔ انہوں نے یہ چاہا کہ تمام احادیث رسول کو، جو تمام دستیاب مجموعوں میں موجود ہیں، حروف تہجی کے اعتبار سے جمع کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے 'کنز العمال' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ کنز العمال میں تمام صحاح ستہ، مسند امام احمد، معجم طبرانی، مسند ابوداؤد طیالیسی اور حدیث کی جتنی کتابیں اُن کو دستیاب ہوئیں، ان سب کی احادیث کو انہوں نے حروف تہجی کے حساب سے جمع کر دیا ہے۔

یہ کتاب کئی بار چھپی ہے۔ پہلی بار تو قدیم انداز میں چھپی تھی۔ کتاب کے قدیم ایڈیشنوں میں احادیث کی تعداد کا کوئی بندوبست نہیں تھا کہ ان کو ترتیب وار، نمبر شمار لگا کر شائع کیا جائے۔ لوگوں نے انفرادی طور پر **manually** اس کی گنتی کی تو بعض لوگوں کے مطابق اس میں **52,000** احادیث ہیں، کچھ اور لوگوں کے اندازہ کے مطابق اس سے کم اور کچھ کے اندازہ کے مطابق اس سے زیادہ ہیں۔

چند سال پہلے یہ کتاب عرب دنیا میں بڑی تحقیق اور اہتمام کے ساتھ چھپنی شروع ہوئی اور کتاب کے مرتب و محقق نے ہر حدیث کا نمبر بھی ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بات میرے علم میں نہیں کہ پوری کتاب مکمل ہوئی کہ نہیں ہوئی۔ اس کے بعض اجزا آنے شروع ہوئے تھے اور میں نے دیکھے تھے۔ اگر مکمل ہوگئی ہے تو صحیح تعداد کا اندازہ ہو گیا ہوگا جس کا مجھے پتہ نہیں ہے۔ لیکن یہ ایک بڑی اہم کتاب ہے جو ایک طویل عرصہ تک طلبہ حدیث کے مطالعہ کا موضوع رہی، اس لئے کہ اس میں حدیث کو تلاش کرنا اور اس کا حوالہ دینا بڑا آسان ہے۔ اگر حدیث کے شروع کا حصہ

آپ کو یاد ہو تو حروف تہجی کی ترتیب سے کتاب شروع کردیں۔ نہ یہ جاننے کے ضرورت ہے کہ اس کے راوی کون ہیں، نہ یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ دراصل یہ حدیث کس کتاب میں ہے اور نہ یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ اصل اور ابتدائی راوی کون ہیں۔ اگر پہلا لفظ آپ کو یاد ہے تو مزید کچھ بھی جاننے کی ضرورت نہیں۔ اس حساب سے یہ کتاب طلبہ اور محققین، واعظین، مقررین اور عام مسلمانوں کے لئے بڑی مفید ہے۔ سب نے اس سے استفادہ کیا اور بہت جلد یہ مقبول ہوئی۔

شیخ علی المتقی کے بعد علم حدیث میں نمایاں کام کرنے والے انہی کے شاگرد تھے 'شیخ عبدالوہاب المتقی'، جو ایک بہت بڑے محدث تھے۔ وہ بھی ہجرت کر کے ہندوستان سے مکہ مکرمہ چلے گئے تھے۔ انہوں نے مکہ مکرمہ میں علم حدیث کو بڑے پیمانے پر عام کیا۔ گجرات اور برصغیر کا نام ان کی وجہ سے ہر جگہ روشن ہوا۔ دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں سے آنے والوں نے ان سے کسب فیض کیا۔ ان سے استفادہ کرنے والوں میں برصغیر کے لوگ بھی شامل تھے اور باہر کے لوگ بھی۔ یہ تین شخصیات تو ان لوگوں میں انتہائی نامور حیثیت رکھتی ہیں جن کا تعلق برصغیر سے ہے اور جنہوں نے اس کام کو اس طرح سے انجام دیا کہ پوری دنیا میں اس کے اثرات محسوس کئے گئے۔

برصغیر میں علم حدیث کا تیسرا دور

دور مغلیہ جو دور سلطنت کے بعد آیا اس کو ہم علم حدیث کے اعتبار سے ایک نئے دور کا آغاز کہہ سکتے ہیں۔ علم حدیث پر ایک نئے انداز سے اور نئے جوش وخروش سے دور مغلیہ میں کام کا آغاز ہوا۔ اگرچہ اس نئے جوش وخروش کا مغل حکمرانوں سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس کا اعزاز ان کو نہیں جاتا، لیکن چونکہ یہ کام مغل حکمرانوں کے زمانے میں ہوا اس لئے ان کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ یہ دور دو بڑی شخصیات سے عبارت ہے۔ وہ دو بڑی شخصیات جن کے تذکرے کے بغیر برصغیر میں علم حدیث کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان میں ایک شخصیت تو ایسی ہے کہ دنیائے اسلام میں حدیث کی تاریخ ان کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہے تو درست ہے۔ ان میں سے پہلی شخصیت تو شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی ہے اور دوسری شخصیت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے تذکرہ کے بغیر علم حدیث کی کوئی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ برصغیر کے مسلمانوں کے امیر المومنین فی الحدیث ہیں تو غلط نہیں ہوگا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا تعلق دہلی سے تھا۔علم حدیث سے ان کی دلچسپی اور علم حدیث میں ان کی خدمات اس درجہ کی ہیں کہ محدث دہلوی کا لفظ ان کے نام کا حصہ بن گیا ہے۔ آپ نے دہلی کے رہنے والے بہت سے لوگوں کے نام کے ساتھ حقی کا لفظ سنا ہوگا، وہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی اولاد میں سے ہیں اس لئے حقی کہلاتے ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے خاصی طویل عمر پائی۔ یہ اکبر کے زمانے میں پیدا ہوئے۔اور شاہجہان کے زمانے میں ان کا انتقال ہوا۔ جہانگیر ان سے متاثر تھا۔اس نے انہیں اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی۔ وہ جہانگیر سے ملنے کے لئے اس کے دربار میں تشریف لے گئے اور جہانگیر سے ملے۔ جہانگیر ان کی شخصیت سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اپنے روز نامچے میں، جو 'تزک جہانگیری' کے نام سے مطبوعہ موجود ہے، ان کا ذکر کیا اور بڑے تعریفی انداز میں لکھا ہے کہ ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ میں ان کی شخصیت اور کردار سے بڑا متاثر ہوا ہوں۔یعنی ایسی شخصیت کہ جن کا بادشاہوں نے نوٹس لیا اور بادشاہوں نے اپنی تحریروں میں جن کا ذکر کیا ان میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ شامل ہیں۔

شیخ عبدالحق نے حرمین کا سفر کیا اور تین سال وہاں بسر کئے۔ حرمین کے بہت سے مشائخ سے بھی کسب فیض کیا، سندیں اور اجازت حاصل کی اور اس کے بعد واپس ہندوستان آگئے۔

یہاں آنے سے پہلے اور آنے کے بعد انہوں نے یہ محسوس کیا کہ برصغیر کی بہت سی خرابیوں اور گمراہیوں کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ یہاں براہ راست قرآن مجید، حدیث اور سیرت کا مطالعہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ عقلیات اور معقولات پر زیادہ زور ہے جس کی وجہ سے لوگوں میں تدین، خشیت الٰہی اور تعلق مع اللہ کی وہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی جو براہ راست قرآن مجید، حدیث اور سیرت کے مطالعہ سے پیدا ہوسکتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں اکبر کی گمراہی عام تھی۔ علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ

تخم الحادے کہ اکبر پرورید
باز اندر فطرت دارا دمید

الحاد کا وہ بیج جو اکبر نے بویا تھا وہ دوبارہ دارا کی فطرت میں اگ کر سامنے آ گیا تھا۔ گویا اکبر کا الحادی دور ضرب المثل ہے۔ اس کی وضاحت یا تشریح کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ بہت ہی بد دینی اور الحاد کا زمانہ تھا جس کے منفی اثرات مسلم معاشرہ پر مرتب ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اس دور میں اور ان حالات میں جن حضرات نے اس صورت حال کو بدلنے کے لئے قدم اٹھایا ان میں سے ایک بڑا نمایاں نام حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا بھی ہے۔

حضرت شیخ محدث دہلوی نے تین بڑے کام کیے۔ ایک بڑا کام تو یہ کیا کہ دہلی میں علم حدیث کا ایک بہت بڑا حلقہ شروع کیا جہاں سے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں طلبہ اور اہل علم نے ان سے کسب فیض کیا اور علم حدیث کا ایک نیا رجحان دار الحکومت دہلی میں شروع ہوا جس کے اثرات باقی معاشرہ پر بھی ہوئے۔ ان کے تلامذہ ان سے پڑھ کر دوسرے شہروں میں گئے۔ دوسرے شہروں میں علم حدیث کے حلقے قائم ہوئے اور علم حدیث کی ایک نئی خوشبو، ایک تازہ ہوا اور ایک نئی نسیم جاں فزا ہندوستان میں پھیلنا شروع ہوئی جس کے محرک اول شیخ عبدالحق محدث دہلوی تھے۔

شیخ عبدالحق نے دوسرا کام یہ کیا کہ علوم نبوت پر چھوٹے چھوٹے رسالے اور کتابیں لکھنا شروع کیں جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں ذات رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام سے تعلق استوار ہو۔ رسول اللہ ﷺ کی ذات سے محبت پیدا ہو۔ حضورؐ کی شخصیت پر، آپؐ کے شمائل پر، نبوت پر اور مدینہ منورہ کے فضائل جیسے موضوعات پر انہوں نے فارسی میں مختلف چھوٹے بڑے رسائل لکھے جو بہت مقبول بھی ہوئے اور ان کے بھی بہت اچھے اثرات مرتب ہوئے۔

اس کے ساتھ ساتھ ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے برصغیر میں حدیث کی تعلیم کی ایک باقاعدہ روایت پیدا کی، اس روایت کو مضبوط علمی بنیادوں پر قائم کیا اور اس طرح قائم کیا کہ ان کے انتقال کے کئی سو سال بعد تک بھی وہ جاری رہی۔ انہوں نے حدیث کی مشہور کتاب 'مشکوٰۃ المصابیح' کی شرحیں تیار کیں جو فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں تیار ہوئیں۔ مشکوٰۃ المصابیح آٹھویں صدی میں لکھی گئی تھی اور یہ حدیث کا ایک ایسا مجموعہ ہے، جس کی اپنی ایک حیثیت ہے۔ ایک طویل عرصہ مشکوٰۃ درسی کتاب کی حیثیت سے رائج رہی ہے اور آج بھی بہت سے اداروں کے نصاب میں شامل ہے۔ اس کتاب کو برصغیر میں متعارف کرانے والے اور بطور نصابی کتاب کے اختیار کرنے والے شیخ عبدالحق محدث دہلوی ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اس

کتاب کو اپنے ادارے میں متعارف کرایا۔ ان کی وجہ سے یہ کتاب بقیہ ہندوستان میں متعارف ہوئی اور اس کو پڑھ کر بہت سے لوگ حدیث رسول سے پہلی مرتبہ واقف ہوئے۔ انہوں نے اس کتاب کی دو شرحیں لکھیں۔ ایک فارسی میں 'اشعة اللمعات فی شرح المشکوٰة' لکھی جو نسبتاً مختصر ہے اور عام تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے ہے۔ اس میں انہوں نے احادیث کا فارسی ترجمہ بھی کیا، مختصر تشریح بھی کی، مشکل الفاظ کے معانی بھی بیان کئے اور جہاں جہاں ضرورت ہوئی کچھ تفصیلی مباحث بھی بیان کئے جو برصغیر کے حالات کو پیش نظر رکھ کر مرتب کئے گئے تھے۔

دوسری کتاب شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے عربی زبان میں 'لمعات التنقیح' کے نام سے لکھی جو کئی بار چھپی ہے اور کئی جلدوں میں ہے۔ یہ علمائے حدیث اور متخصصین کے لئے ہے۔ اس میں لغوی، فقہی اور کلامی مباحث خاصی تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ علمائے کرام جو دینی علوم کے متخصص ہیں وہ علم حدیث کے متخصص بھی ہو جائیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا یہ کام اپنی جگہ ایک تاریخ ساز کام تھا۔ اس تاریخ ساز کام کے انتہائی دیرپا اثرات ہوئے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے انتقال کے بعد وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ روایت کمزور پڑ گئی۔ ان کا انتقال گیارھویں صدی ہجری کے وسط میں غالباً 1052ھ وغیرہ میں ہوا۔ ان کو طویل عمر ملی، تقریباً پچانوے یا چھیانوے سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا اور کم وبیش پچاس سال وہ مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ سے واپسی پر درس حدیث دیتے رہے۔ سفر حرمین سے پہلے بھی وہ درس حدیث دیتے رہے تھے۔ لیکن اب پچاس سال مسلسل درس دینے کی وجہ سے پورے ہندوستان پر ان کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ روایت کمزور پڑ گئی۔

ہندوستان میں وسط ایشیا کے اثرات کی وجہ سے عقلیات کو غیر معمولی پذیرائی ملی تھی، اور منطق اور فلسفہ کی گہری اور طویل تعلیم کے ساتھ ساتھ فقہ اور اصول فقہ بھی منطق اور فلسفہ کے رنگ میں پڑھائے جاتے تھے۔ اصول فقہ کی جو کتابیں برصغیر میں لکھی گئیں وہ ساری کی ساری منطق اور فلسفہ کے انداز میں لکھی گئی ہیں۔ اگر آپ اصول فقہ کے طالب علم ہوں اور یہاں کی لکھی ہوئی کوئی درسی کتاب اٹھا کر دیکھیں تو اس اسلوب کا اندازہ ہو جائے گا جو برصغیر میں رائج تھا۔۔ ملا محب اللہ بہاری برصغیر کے ایک مشہور اصولی تھے۔ ان کی ایک کتاب ہے 'مُسلَّم الثبوت'۔ اسے اگر آپ دیکھیں تو یہ اتنی مشکل کتاب ہے کہ اصول فقہ کی تاریخ میں اس سے مشکل کتاب شاید اور

کوئی نہ ہو۔ اگر اصول فقہ کے موضوع پر چار پانچ مشکل ترین کتابوں کا نام لیا جائے تو ان میں سے ایک ملا محب اللہ کی یہ کتاب ہوگی۔ ایک بزرگ کہا کرتے تھے کہ اس کتاب کے پڑھنے سے دانتوں کو پسینہ آجاتا ہے۔ اس سے اندازہ کرلیں کہ عقلیات اصول فقہ پر بھی اتنی اثر انداز ہوئیں کہ اصول فقہ کی کتابیں بھی خالص منطق اور عقلیات کی بنیاد پر لکھی جانے لگیں۔ اس لئے علم حدیث پر توجہ پھر کمزور پڑ گئی۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

اس کے بعد دوبارہ علم حدیث کی طرف توجہ دلانے کا کارنامہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے انجام دیا اور اتنے غیر معمولی اخلاص سے انجام دیا کہ ان کا جاری کردہ سلسلہ آج تک چلا آرہا ہے اور برصغیر کا ہر وہ طالب علم جو حدیث پڑھتا ہو، اور ہر وہ استاد جو حدیث پڑھاتا ہو وہ شاہ صاحب کا ممنون احسان ہے۔ شاید برصغیر کے وابستگان حدیث میں **99** فیصد لوگ براہ راست اس روایت سے وابستہ ہیں۔ ننانوے بھی میں نے صرف احتیاطاً کہہ دیا ورنہ ممکن ہے کہ ایک آدھ ہی اس روایت سے باہر ہوں ورنہ شاید برصغیر میں علم حدیث سے اعتنا کرنے والے سو فیصد علماء براہ راست شاہ ولی اللہ کی روایت سے وابستہ ہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ بھی حجاز تشریف لے گئے۔ ایک سال وہاں مقیم رہے۔ انہوں نے برصغیر میں سب سے پہلے اپنے والد شاہ عبدالرحیم سے علم حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ یہاں کے ایک مشہور محدث تھے حاجی شیخ محمد افضل، جو ہمارے پنجاب میں سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ سیالکوٹ میں انہوں نے علم حدیث کی شمع روشن کی تھی اور لوگ بڑی تعداد میں سیالکوٹ آکر ان سے علم حدیث حاصل کیا کرتے تھے۔ ان سے شاہ ولی اللہ کے والد نے علم حدیث پڑھا تھا۔ پھر ایک اور مشہور بزرگ تھے جو مکہ مکرمہ میں حدیث کی تعلیم دیا کرتے تھے شیخ ابو طاہر الکردیؒ۔ شاہ ولی اللہ نے ان سے بھی ایک سال تک علم حدیث کی تعلیم پائی اور تیرہ مہینے ان کے درس میں شریک رہے۔ شاہ صاحب کی شخصیت پر شیخ ابو طاہر کردیؒ کے انتہائی گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ یہاں تک کہ شاہ صاحب نے ہندوستان واپسی کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا اور شیخ ابو طاہر کردی کو بتایا کہ میں پوری زندگی آپ کے قدموں میں گزارنا چاہتا ہوں۔ جب شاہ ولی اللہ یہ بات ان سے کہہ رہے

تھے تو شاہ صاحب نے یہ شعر پڑھا۔

نسیت کل طریق کنت اعرفہ
الا طریقاً یودینی الی ربعکم

میں ہر راستہ بھول چکا ہوں سوائے اُس راستہ کے جو آپ کے گھر تک آتا ہے۔

لیکن شیخ ابوطاہر کردی نے کہا کہ جلدی میں کوئی فیصلہ نہ کرو، بلکہ ابھی غور کرلو۔ انہوں نے خود بھی چندروز غور کرنے کے بعد شاہ ولی اللہ سے کہا کہ تم یہاں نہ رہو اور واپس ہندوستان چلے جاؤ۔ شیخ ابوطاہر نے بہ اصرار شاہ صاحب کو واپس بھیج دیا۔ اس وقت شاہ صاحب بڑے بوجھل دل کے ساتھ واپس تشریف لے آئے۔ لیکن واپس تشریف لانے کے بعد شاہ صاحب نے جو کارنامے انجام دیئے اور جن کا سلسلہ آج تک چلا آرہا ہے، ان کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ ابوطاہر کردی نے کسی خاص نیت سے ان کو بھیجا تھا اور شاہ صاحب کو بھی اس کا اندازہ ہوگیا تھا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے برصغیر میں علم حدیث اور علوم حدیث کی ایسی نئی روایت کو پروان چڑھایا جو اتنی مضبوط تھی اور اخلاص کی ایسی مضبوط بنیادوں پر استوار تھی کہ آج بھی ان کی رکھی ہوئی بنیادیں موجود ہیں۔ ان کے لگائے ہوئے چمنستان حدیث کے گلہائے معطر گزشتہ ڈھائی سو سال سے برصغیر کو معطر کیے ہوئے ہیں۔ ان کے جاری کیے ہوئے کام کے ثمرات آج بھی پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہیں جن سے آج تک لوگ مستفید ہورہے ہیں۔

شاہ صاحب نے علم حدیث کی تدریس کا ایک حلقہ قائم کیا اور اعلیٰ ترین سطح پر علم حدیث کی تعلیم دی۔ اپنی خاص نگرانی میں ماہرین حدیث کی ایک جماعت تیار کی، ان کو ہندوستان کے مختلف گوشوں میں متعین کیا اور جگہ جگہ حدیث کی تعلیم کے ادارے قائم کیے۔ خود انہوں نے علوم حدیث پر متعدد کتابیں تصنیف کیں جو فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے علوم حدیث میں ایک نئے فن کی بناڈالی، بناڈالنے کا یہ لفظ شاید درست نہ ہو، اس لئے کہ ان سے پہلے بھی کئی حضرات نے اس موضوع پر قلم اٹھایا تھا، لیکن جس انداز سے شاہ صاحب نے قلم اٹھایا تھا، اس کی مثال نہیں ملتی۔

شاہ صاحب نے علم حدیث کی تاریخ کا ایک قابل ذکر کام یہ کیا کہ حدیث نبوی کے پورے ذخائر کو جمع کرکے اور ان کا مطالعہ کرکے ان میں جو اسرار دین اور شریعت کے بنیادی اصول

بیان ہوئے ہیں، ان کو اس طرح اجاگر کیا کہ پورے علوم حدیث اور علوم نبوت کی روح پڑھنے والے کے سامنے آجاتی ہے۔ یہ کارنامہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی جس کتاب میں ہے اس کا نام 'حجۃ اللہ البالغہ' ہے، جس کا اردو اور انگریزی ترجمہ دونوں دستیاب ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہؒ نے فرانسیسی زبان میں بھی ترجمہ کیا تھا لیکن وہ شائع نہیں ہوا ہے۔ عربی میں اصل کتاب دنیائے عرب اور عجم میں درجنوں مرتبہ چھپی ہے اور دنیا کے ہر گوشے کے اہل علم نے مراکش سے لے کر انڈونیشیا اور جنوبی افریقہ سے لے کر انتہائی شمال تک جہاں جہاں مسلمان بستے ہیں، اس سے استفادہ کیا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے موطا امام مالک کو علم حدیث کی بنیادی کتاب کے طور پر اختیار کیا۔ وہ موطا امام مالک کے بڑے مداح تھے۔ وہ اس کو صحیحین سے افضل اور اصح تر سمجھتے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو موطا امام مالک کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ جتنے مکاتب فقہ ہیں وہ سارے کے سارے بالواسطہ اور بلاواسطہ موطا امام مالک سے متاثر ہیں اور موطا امام مالک میں ان تمام مکاتب فکر کی جڑ موجود ہے جن کی بنیاد پر فقہی مکاتب اور حدیثی اسکول مرتب ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ تمام بڑے بڑے محدثین بالواسطہ اور بلاواسطہ امام مالک کے شاگرد ہیں۔ اس لئے ان کے حدیثی کام پر امام مالک کے اثرات نمایاں ہیں۔

امام شافعی، براہ راست ان کے شاگرد ہیں، امام محمد ابن حسن شیبانی جو فقہ حنفی کے مدون اول ہیں، وہ ان کے براہ راست شاگرد ہیں اور امام احمد بن حنبل ایک واسطہ سے ان کے شاگرد ہیں۔ اس لئے چاروں مکاتب فکر امام مالک سے سے بالواسطہ یا بلاواسطہ متعلق اور متاثر ہیں۔ لہٰذا موطا امام مالک کو دین و شریعت کی ساری تعلیم کی بنیاد ہونا چاہئے تا کہ سب مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جا سکے۔ اہل فقہ، اہل حدیث اور تمام اہل علم سب امام مالک کی ذات کے گرد ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو سکتے ہیں۔ یہ شاہ صاحب کا نقطہ نظر تھا جو انہوں کئی جگہ بڑی تفصیل سے لکھا بھی ہے۔ اس لئے شاہ صاحب نے موطا امام مالک کا درس دینا شروع کیا۔ برصغیر میں پہلی مرتبہ موطا امام مالک کا درس انہوں نے ہی شروع کیا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے موطا امام مالک کی دو شرحیں لکھیں۔ جیسے شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مشکوٰۃ کی دو شرحیں لکھی تھیں اسی طرح شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے موطا امام مالک کی دو شرحیں لکھیں۔ ایک فارسی میں اور ایک عربی میں لکھی۔ عربی میں 'المسوی' ہے جو

مفصل ہے اور فارسی میں 'المصفیٰ' لکھی جو مختصر ہے۔ المسویٰ حدیث کے ماہرین اور طلبہ کے لئے ہے اور المصفیٰ عام تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لئے ہے۔

ان دو شرحوں کے ساتھ ساتھ شاہ صاحب نے علم حدیث پر اور بھی کتابیں لکھیں۔ ان میں سے ایک بڑی کتاب جو ہماری اس بہن کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگی جنہوں نے امام بخاری کے ابواب کے عنوانات کے بارے میں سوال کیا تھا۔ یہ تراجم ابواب بخاری کی شرح ہے 'شرح تراجم ابواب البخاری '۔ امام بخاری نے مختلف ابواب کے جو عنوانات بتائے ہیں ان میں کیا مفہوم اور حکمت پنہاں ہیں۔ اس پر بہت سے لوگوں نے کتابیں لکھیں جن میں ایک شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی بھی ہے۔

شاہ عبدالعزیزؒ

شاہ صاحب کے یوں تو بہت سے شاگرد اور طلبہ تھے، لیکن ان کے شاگردوں اور طلبہ میں جو سب سے نمایاں نام ہے وہ ان کے اپنے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کا ہے۔ شاہ ولی اللہ کی عمر تو شاید اسٹھ یا باسٹھ سال ہوئی۔ لیکن شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی عمر زیادہ ہوئی۔ قریباً اسی پچاسی سال ان کی عمر ہوئی اور انہوں نے کم وبیش پینسٹھ ستر سال تک ہندوستان میں درس حدیث دیا۔ جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو شاہ عبدالعزیز کی عمر اٹھارہ یا انیس سال تھی اور وہ اسی وقت فارغ التحصیل ہوکر نئے نئے مدرس ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے والد کی جگہ سنبھالی اور علم حدیث اور درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔ آج برصغیر میں عوامی سطح پر درس قرآن کے جو حلقے جاری ہیں ان کے بانی شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ہیں۔ ان سے پہلے اس طرح عوامی سطح پر درس قرآن نہیں ہوا کرتا تھا۔ محدود درس قرآن کا آغاز شاہ عبدالعزیز کے دادا شاہ عبدالرحیم صاحب نے کیا تھا، پھر شاہ ولی اللہ نے اس کو جاری رکھا، لیکن وہ محدود اہل علم کے لئے تھا۔ عوامی سطح پر جس میں ہزاروں لوگ شریک ہوتے ہوں وہ شاہ عبدالعزیز کا درس قرآن ہوا کرتا تھا جو ہفتہ میں دو مرتبہ ہوتا تھا۔ اس میں مغل حکمرانوں کے اہل خانہ، شہزادے اور اعلیٰ حکام بھی شریک بھی ہوتے تھے۔ ایک آدھ مرتبہ شاہ عبدالعزیز نے مغل بادشاہ کے ہاں جاکر بھی درس دیا اور مغل بادشاہوں نے بھی ان کے درس میں شرکت کی۔

شاہ عبدالعزیز نے کم وبیش ستر سال تک موطا امام مالک اور حدیث کی بعض دوسری کتابوں کا درس دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ شاہ صاحب نے علم حدیث پر دو بڑی کتابیں لکھیں۔ ان کی ایک کتاب 'بستان المحدثین' ہے۔ یہ کتاب دراصل فارسی میں ہے اور اس کا اردو ترجمہ بھی ملتا ہے۔ محدثین کے تذکرہ سے متعلق ہے جس میں محدثین کی خدمات اور تذکرہ پر پہلی مرتبہ برصغیر میں کتاب لکھی جس سے عام آدمی کو علم حدیث کے کارنامے اور محدثین کی خدمات کا پتہ چلا۔ ان کی دوسری کتاب 'عجالہ نافعہ' ہے جس کا اردو ترجمہ مکمل شرح کے ساتھ موجود ہے۔ اس میں انہوں نے اصول حدیث اور علوم حدیث پر اختصار کے ساتھ ایک درسی کتاب تیار کی جو بہت سے مدارس میں طویل عرصہ تک پڑھائی جاتی رہی۔

شاہ صاحب کے بہت سے شاگردوں نے علم حدیث کی شمع روشن کی اور ہندوستان کے ہر گوشے میں جا کر ہر علاقے میں علم حدیث کی تعلیم دی۔ ایک بڑے مشہور صاحب علم تھے مفتی عنایت احمد کاکوروی، جنہوں نے 1857ء کے جہاد میں حصہ لیا تھا اور انگریز کے خلاف جب پہلی بغاوت ہوئی تو اس میں وہ شریک تھے۔ انگریزوں نے ان کو عمر قید کی سزا دی تھی اور جزیرہ انڈیمان میں ان کو جلاوطن کیا تھا جہاں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ بڑے عالم، فقیہ اور مفتی تھے۔ ان کی پوری زندگی افتا میں گزری تھی اور وہ مجاہد بھی تھے۔ ان کو جزیرہ انڈیمان میں زندگی بھر کے لئے قید بامشقت دی گئی اور سزا یہ تھی کہ پورے جزیرے میں جو گندگی ہو اس کو صاف کیا کریں، اس زمانے میں ظاہر ہے کہ اٹیچ باتھ روم اور ٹائلٹ کا موجودہ سسٹم نہیں تھا اور بیت الخلا کو ہاتھوں سے صاف کیا جاتا تھا، تو مفتی عنایت احمد کاکوروی کو اس بستی کے تمام بیت الخلا صاف کرنے پر لگا دیا گیا تھا اور ان کی آخری عمر اسی کام میں صرف ہو گئی۔ انہی مفتی عنایت احمد کاکوروی کا کہنا ہے کہ شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی ذات ایک ایسا شجرہ طوبیٰ ہے جس کی شاخیں اور جس کے پھل اور ٹہنیاں ہندوستان کے ہر مسلمان کے گھر میں پہنچے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کا کوئی گھر ایسا نہیں ہے جو ان شجرہ ہائے طیبہ کے ثمرات سے مستفید نہ ہوا ہو۔ یہ بات بالکل درست ہے۔ برصغیر میں جتنی روایات علم حدیث کی ہیں وہ سب بالواسطہ اور بلاواسطہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ان کے واسطے سے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تک پہنچتی ہیں۔ کچھ حضرات براہ راست شاہ ولی اللہ تک پہنچتے ہیں اور بیشتر وہ ہیں جو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے واسطے سے ان تک پہنچتے ہیں۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے ستر سال تک درس حدیث دیا اور **1824**ء میں وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ چونکہ انہوں نے طویل عمر پائی تھی اس لئے جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے جتنے ہم سن رشتہ دار اور بھائی تھے وہ سب ان سے پہلے دنیا سے جا چکے تھے۔ اب ان کے جانشین ان کے نواسے حضرت شاہ محمد اسحاق تھے۔ انہوں نے بھی کم و بیش چالیس یا پچاس سال ہندوستان میں درس حدیث دیا اور ہزاروں تلامذہ ان سے درس حدیث پڑھ کر فارغ ہوئے۔ ان کے تلامذہ میں یہ کہنا کہ کون نمایاں ہیں اور کون نمایاں نہیں، یہ بڑا دشوار ہے۔ شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کے ہزاروں شاگرد تھے جنہوں نے ہندوستان کے گوشے گوشے میں علم حدیث کو عام کیا۔

حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلویؒ

ان کے شاگردوں میں تین حضرات بڑے نمایاں ہیں۔ اتنے نمایاں ہیں کہ ان سے وہ روایتیں آگے چلیں جو ہندوستان کے ہر علاقے میں پھیلیں۔ ان کے ایک شاگرد تھے جو شیخ الکل یعنی ہر فن کے استاد اور سب کے استاد کہلاتے تھے۔ وہ تھے حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی۔ شاہ محمد اسحاق **1857** کے ہنگامہ کے کچھ سال بعد بعد ہجرت کر کے مکہ مکرمہ چلے گئے۔ باقی زندگی وہیں گزاری اور وہیں ان کا انتقال بھی ہوگیا۔ ان کے بعد ان کی جانشینی ہندوستان میں جن حضرات نے کی ان میں ایک تو میاں نذیر حسین محدث دہلویؒ تھے جن سے تلامذہ کا ایک طویل سلسلہ چلا۔ میاں صاحب کے تلامذہ میں جو لوگ نمایاں ہیں ان میں سے دو تین نام میں عرض کر دیتا ہوں۔ ایک علامہ وحید الزمان تھے جنہوں نے علوم حدیث کی تقریباً تمام کتابوں کا اردو ترجمہ کیا اور اردو زبان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ صحیح بخاری، مسلم، ترمذی، موطا امام مالک اور حدیث کی بہت سی کتابیں اردو ترجمہ کے ساتھ سامنے آئیں۔ گویا اردو زبان میں حدیث کی کتابوں کے پہلے مترجم علامہ وحید الزمان ہیں جو حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلویؒ کے شاگرد ہیں۔ ظاہر ہے اردو میں ان کتب کے تراجم کی اشاعت سے علم حدیث جتنا عام ہوا ہوگا اس کا اندازہ ہم کر سکتے ہیں۔

میاں نذیر حسین کے دوسرے شاگرد تھے علامہ شمس الحق عظیم آبادی، یہ اتنے بڑے محدث ہیں کہ اگر یہ کہا جائے کہ ان کے زمانے میں ان سے بڑا محدث کوئی نہیں تھا، یا اگر تھے تو ایک دو ہی تھے۔ تو شاید یہ مبالغہ نہیں ہوگا۔ انہوں نے دو کارنامے انجام دیئے جو بہت غیر معمولی

تھے۔ان کا ایک کارنامہ تو یہ تھا کہ انہوں نے 'غایۃ المقصود' کے نام سے سنن ابوداؤد کی شرح لکھی جو بتیس جلدوں میں تھی۔ بہت افسوس کی بات ہے کہ یہ شرح چھپ نہیں سکی۔ انہوں نے اس کی جلد اول شائع کی تو بعض لوگوں نے کہا کہ اتنی طویل شرح کون پڑھے گا۔ اس کو کیسے چھاپیں گے، پتہ نہیں آپ کی زندگی میں چھپ سکے گی یا نہیں۔ انگریزوں کا دور تھا۔ مسلمانوں کے پاس وسائل نہیں تھے، فقر و فاقہ تھا، نہ چندہ دینے والے تھے اور نہ کوئی مسلمان بڑی رقم بطور چندہ دینے کی پوزیشن میں تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی اور ایک دو شاگردوں کو اس کی تلخیص کے کام پر لگا دیا۔ یہ تلخیص 'عون المعبود' کے نام سے شائع ہوئی اور آج چھپی ہوئی ہر جگہ ملتی ہے جو سنن ابوداؤد کی بہترین شرحوں میں سے ایک ہے۔ عون المعبود برصغیر، ایران، بیروت، مصر اور باقی عرب دنیا میں بھی چھپی ہے اور اس کے درجنوں ایڈیشن نکلے ہیں۔

علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوریؒ

علامہ شمس الحق عظیم آبادی کے ایک شاگرد اور ان کے سلسلہ کے ایک اور بزرگ علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری تھے۔ علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری صف اول کے محدث تھے۔ انہوں نے سنن ترمذی کی ایک شرح لکھی جس کا نام 'تحفۃ الاحوذی' ہے۔ اس کے بارے میں اگر میں یہ عرض کروں کہ یہ سنن ترمذی کی اتنی ہی بہترین شرح ہے جتنی بہترین شرح صحیح بخاری کی فتح الباری ہے، تو شاید یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ جامع ترمذی کی اس سے بہتر کوئی اور شرح موجود نہیں ہے اور یہ برصغیر کے ایک صاحب علم کا اتنا بڑا کارنامہ ہے جو دنیائے اسلام میں سمجھا بھی جاتا ہے اور اس کا اعتراف بھی کیا جاتا ہے۔ اس کتاب کا بیروت، تہران، مصر، ہندوستان، پاکستان اور کئی دوسری جگہوں پر بار ہا چھپنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کتاب کو دنیائے اسلام میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا ہے۔ برصغیر میں اس کا جو ایڈیشن شائع ہوا تھا وہ پانچ جلدوں میں ہے۔ عرب دنیا میں شائع ہونے والے ایڈیشنوں کی جلدیں مختلف ہیں۔ کوئی سولہ جلدوں میں ہے کوئی پندرہ میں اور کوئی بیس میں۔ لیکن یہ ترمذی کی بہترین شرح ہے اور اگر کوئی اس سے اتفاق نہ کرے کہ یہ جامع ترمذی کی سب سے بہتر شرح ہے، تو یہ تو بلا شک وشبہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب جامع ترمذی کی چند بہترین شرحوں میں یقیناً ہے اور اس سے کوئی اختلاف نہیں کرے گا۔

مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری کے تلامذہ بہت کثرت سے ہیں۔ میں نے بھی ایک بزرگ سے اجازت حدیث لی تھی جو براہ راست مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری کے شاگرد تھے اور گویا میں نے ایک واسطہ سے مولانا مبارکپوری سے اجازت حاصل کی ہے۔ وہ بزرگ درمیان میں ہیں اورانہوں نے مولانا مبارکپوری سے علم حدیث کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ہمارے برصغیر کے مشہور عالم اور مفسر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی بھی علم حدیث میں مولانا مبارکپوری کے شاگرد تھے۔

مبارکپور اعظم گڑھ کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ میں 1982 میں اس گاؤں کو دیکھنے کے لئے صرف اس وجہ سے گیا تھا کہ مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری کا گاؤں ہے اس لئے دیکھنا چاہیے۔ وہ مدرسہ اب بھی قائم ہے جہاں مولانا مبارکپوری حدیث پڑھایا کرتے تھے۔ وہ کچا سا مکان اب بھی موجود ہے جس میں بیٹھ کر اتنا بڑا کام ہوا جو پوری دنیائے اسلام میں جامع ترمذی کی تدوین کے بعد نہیں ہوا تھا۔

شاہ محمد اسحاق کے دوسرے شاگردوں کا ایک دوسرا سلسلہ ہے جن میں ایک بڑے مشہور بزرگ تھے شاہ ابوسعید مجددی۔ جو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں تھے اور شاہ محمد اسحاق کے شاگردوں میں تھے۔ ان سے ایک نیا سلسلہ شاہ اسحاق کے تلامذہ کا نکلا جن کے شاگرد تھے مولانا شاہ عبدالغنی۔ ان کے شاگرد تھے مولانا مملوک علی۔ مولانا مملوک علی طویل عرصہ تک علم حدیث کے استاد رہے۔ ان کے تلامذہ میں ایک گروہ وہ ہے جو علماء دیوبند کہلاتا ہے اور دوسرا وہ ہے جو سرسید احمد خان اور ان کے ہم راہی ہیں۔ سرسید احمد خان بھی مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے اور علماء دیوبند میں مولانا قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہی شامل ہیں۔

مولانا رشید احمد گنگوہی اور ان کے تلامذہ

مولانا رشید احمد گنگوہی زندگی بھر حدیث پڑھاتے رہے۔ ان کے امالی یعنی حدیث میں ان کی تقریروں اور دروس کو بہت سے لوگوں نے جمع کر کے مرتب کیا اور شائع کرایا۔ صحیح بخاری کی شرح 'لامع الدراری' کے نام سے ایڈٹ ہوئی۔ اور بھی متعدد کتابوں کی شرحیں ایڈٹ ہوئیں اور ان کے نام سے یہ چیزیں شائع ہوئیں جو آج موجود ہیں۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے شاگردوں میں دو شخصیات بہت نمایاں ہیں۔ ایک کا اسم گرامی تھا مولانا محمد یحییٰ اور دوسرے کا اسم گرامی تھا

مولانا خلیل احمد۔ مولانا خلیل احمد نے سنن ابوداؤد کی شرح 'بذل المجھود' کے نام سے لکھی۔ بذل المجھود بھی پندرہ بیس جلدوں میں ہے۔ عرب دنیا میں کئی بار چھپی ہے۔ مصر، ہندوستان، پاکستان اور کئی دوسری جگہوں پر چھپی ہے۔ یہ سنن ابوداؤد کی بہترین شرحوں میں سے ایک ہے۔ غایۃ المقصود کا درجہ تو بلاشبہ بہت اونچا ہے۔ پھر عون المعبود اور پھر بذل المجھود کا درجہ ہے۔ اور پھر باقی شرحوں کا درجہ ہے۔ یہ بڑی جامع شرح ہے۔ فقہی اعتبار سے اس میں مسائل پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ حدیثی اور روایتی مسائل پر عون المعبود میں زیادہ زور دیا گیا ہے اور اس طرح یہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔

مولانا انورشاہ کشمیری

مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے ایک شاگرد جنہوں نے دیگر علمائے دیوبند سے بھی کسب فیض کیا وہ خاتم المحدثین علامہ سید انورشاہ کشمیری ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ علماء دیوبند میں ان سے بڑا محدث پیدا نہیں ہوا۔ یقیناً علماء دیوبند میں حدیث کی جو روایت ہے اس کے سب سے بڑے ترجمان اور سب سے بڑے نمائندہ علامہ سید انورشاہ صاحب کشمیری ہیں جن کے تلامذہ کی ایک بہت بڑی تعداد پورے برصغیر میں پھیلی ہوئی ہے۔ برصغیر میں بیسویں صدی کے نصف اول بلکہ 1925 تک کی اس ابتدائی چوتھائی کو نکال کر جتنے بھی علماء حدیث مسلک دیوبند سے وابستہ ہیں وہ سب کے سب مولانا انورشاہ کشمیری کے شاگرد ہیں۔ ان سب حضرات نے مل کر علم حدیث کے ہر موضوع پر کام کیا ہے۔ علم حدیث کی ہر کتاب کی شرح لکھی ہے۔ یہ اتنا بڑا کام ہے جس کی مثال بیسویں صدی میں دنیائے اسلام کے کسی اور ملک میں نہیں ملتی۔ تفصیلات بیان کرنے کا موقع نہیں۔ مولانا انورشاہ کشمیری کے درس حدیث کی اپنی یادداشتیں فیض الباری کے نام سے قاہرہ میں شائع ہوئی ہیں جو ان کے شاگرد مولانا بدر عالم صاحب نے مرتب کی ہیں۔

مولانا انورشاہ کشمیری کے جو نوٹس جامع ترمذی پر تھے وہ ان کے شاگرد مولانا محمد یوسف بنوری نے جو میرے بھی استاد تھے، مرتب کئے جو معارف السنن کے نام سے شائع ہوئے۔ ترمذی پر ان کے ایک اور شاگرد مولانا محمد چراغ نے جن کا تعلق گجرانوالہ سے تھا، 'العرف الشذی' کے نام سے کام کیا جو شاہ صاحب ہی کے امالی پر مبنی ہے اور مطبوعہ موجود ہے۔ مولانا

انورشاہ کشمیری کے ایک اور شاگرد مولانا محمد اشفاق الرحمٰن تھے جو مولانا مودودیؒ کے بھی استاد تھے، ان کی دو کتابیں ہیں۔ ایک ترمذی کی شرح ہے جو غیر مطبوعہ ہے اور دوسرے موطا امام مالک کی شرح ہے جو پاکستان میں کئی بار چھپی ہے اور موطا امام مالک کی مختصر اور جامع شرحوں میں سے ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ مولانا انورشاہ کشمیری کے کئی شاگردوں نے علم حدیث کے مختلف موضوعات پر کام کیا اور علم حدیث کا ایک پورا ذخیرہ انہوں نے ہندوستان میں چھوڑا۔ خود مولانا کے داماد اور شاگرد مولانا احمد رضا بجنوری نے صحیح بخاری پر اپنے شیخ کے امالی کو اردو میں اٹھارہ جلدوں میں مرتب کیا۔ ان کی یہ کتاب 'انوار الباری' کے نام سے پاکستان اور ہندوستان میں کئی بار چھپ چکی ہے۔ علامہ انورشاہ کشمیری کا کام اتنا وسیع ہے کہ اگر اس کی تفصیل بیان کی جائے تو اتنا وقت درکار ہے کہ شاید پورا ایک دن بھی اس کے لئے کافی نہ ہوگا۔ مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری اور مولانا شمس الحق عظیم آبادی کے عظیم الشان کام کو میں نے اتنے اختصار کے ساتھ بیان کیا۔ اگر اس کی تفصیل بیان کی جائے تو بہت وقت درکار ہوگا۔

فرنگی محلی علماء

ایک اور بزرگ تھے بلکہ ایک اور روایت تھی جس کا میں دو تین جملوں میں ذکر کرتا ہوں۔ اس روایت سے وابستہ اہل علم کی بھی علم حدیث میں بڑی غیر معمولی خدمات ہیں۔ یہ روایت علماء فرنگی محل کی ہے۔ لکھنو میں ایک بہت بڑا امکان تھا۔ ایک حویلی تھی جو جہانگیر نے انگریز تاجروں کو دی تھی۔ انگریز تاجر جہانگیر کے زمانے میں آئے تھے انہوں نے تجارتی مرکز قائم کرنے کی اجازت مانگی۔ جہانگیر نے ان کو وہ تجارتی کوٹھی دے دی۔ ہندوستان میں جہاں جہاں انگریزوں نے اپنے مراکز قائم کئے ان میں سے ایک لکھنو میں بھی تھا۔ وہ حویلی فرنگی محل کہلاتی تھی کیونکہ فرنگی وہاں رہا کرتے تھے۔ جب ان کی سازشیں اور حرکتیں برداشت کی حدوں سے باہر ہوگئیں تو اورنگزیب عالمگیر نے ان کے خلاف ایکشن لیا۔ ان کو وہاں سے نکال دیا۔ وہ فرنگی محل کی عمارت ان سے خالی کرادی اور ملا نظام الدین سہالوی ایک عالم تھے، ان کو دے دی کہ اس میں کوئی دینی ادارہ قائم کردیں۔ اس طرح فرنگی محل میں ایک دینی ادارہ قائم ہوگیا اور جتنے بھی علما وہاں کے فارغ التحصیل ہیں وہ فرنگی محلی کے نام سے مشہور ہیں۔ ان میں کئی علماء پیدا ہوئے جن

میں ایک بہت نمایاں نام مولانا عبدالحیٔ لکھنوی کا ہے۔ مولانا عبدالحیٔ لکھنوی علم حدیث پر بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی ویسے تو کئی کتابیں قابل ذکر ہیں۔ لیکن علم حدیث پر اس وقت ان کی دو کتابیں میرے ذہن میں آرہی ہیں۔ ایک موطا امام محمد کی شرح ہے 'التعلیق الممجد علی موطا امام محمد' اور دوسری کتاب علم جرح وتعدیل پر ہے۔ جو جرح وتعدیل پر چند بہترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ 'الرفع و التکمیل فی الجرح و التعدیل'۔ یہ ہندوستان، پاکستان، بیروت، شام، دمشق، حلب، قاہرہ اور دوسری کئی جگہوں سے چھپ چکی ہے اور بہت مشہور کتاب ہے۔ ان کے علاوہ بھی فرنگی محل کے علماء میں سے کئی ایک ہیں جنہوں نے علم حدیث پر بہت کام کیا۔

نواب صدیق حسن خان

ایک اور بزرگ جن کا تذکرہ ضروری ہے۔ وسطی ہندوستان کے شہر بھوپال کے رہنے والے تھے۔ بنیادی طور پر وہ حدیث اور فقہ کے عالم تھے۔ تذکرہ اور رجال ان کا مضمون تھا۔ ان کا نام صدیق حسن خان تھا۔ ان کی شادی بیگم بھوپال سے ہوئی تھی جو بیوہ تھی۔ چونکہ بیگم بھوپال نے ان سے نکاح کر لیا تھا اس وجہ سے ان کو نواب کا لقب ملا اور نواب صدیق حسن خان کہلانے لگے۔ اصل حکمرانی ان کی بیگم کی تھی۔ لیکن چونکہ وہ ملکہ بھوپال کے شوہر تھے اس لئے ان کو بہت وسائل حاصل ہو گئے تھے۔ ان وسائل سے کام لے کر انہوں نے ایک بہت بڑا تحقیقی ادارہ قائم کیا۔ خود بھی کئی کتابیں لکھیں اور اپنی نگرانی میں اور بھی بہت سی کتابیں لکھوائیں۔ ان میں علوم حدیث پر درجنوں کتابیں شامل ہیں۔ درجنوں کتابیں سرکاری اہتمام سے شائع ہوئیں اور پورے ہندوستان میں تقسیم ہوئیں۔ علم حدیث کو ان کی کوششوں سے ایک نیا فروغ ملا جو برصغیر میں علم حدیث کی تاریخ میں ایک نمایاں باب ہے۔

بھوپال میں علم حدیث کو ان کی وجہ سے جو عروج حاصل ہوا اس کے اثرات طویل عرصہ تک محسوس کئے گئے۔ انہوں نے عرب دنیا سے ایک بڑے محدث علامہ علی بن محسن الیمانی کو بھوپال بلایا۔ یہ بزرگ علامہ شوکانی کے ایک واسطے سے شاگرد تھے۔ امام شوکانی ایک بہت مشہور محدث تھے اور اتنے بڑے محدث تھے کہ ان کو یمن کا آخری بڑا محدث کہا جاتا ہے۔ یہ علامہ علی بن محسن ایک واسطہ سے ان کے شاگرد تھے۔ وہ بھوپال میں آئے اور پھر طویل عرصہ تک یہاں

رہے۔ان کی اولاد پھر نسل در نسل بھوپال میں حدیث کا درس دیتی رہی اور علماء نے بڑے پیمانے پر ان سے کسب فیض کیا۔دارالعلوم ندوۃ العلما میں حدیث پڑھانے والے کئی بڑے بڑے علما ان کے براہ راست اور بالواسطہ شاگرد رہے جن میں سے ایک بڑا نمایاں نام مولانا حیدر حسن خان کا تھا۔ندوۃ العلما میں حدیث پڑھانے والے اکثر و بیشتر علما انہی مولانا حیدر حسن خان کے شاگرد تھے۔

دائرۃ المعارف العثمانیہ

یہ برصغیر میں خدمات حدیث کا ایک انتہائی مختصر ترین جائزہ ہے۔اس میں مناسب ہوگا کہ اگر ایک ادارہ کا بھی ذکر کیا جائے۔اگر چہ یہ ایک سرکاری ادارہ تھا لیکن اس نے علم حدیث پر بڑا کام کیا۔یہ حیدرآباد دکن میں قائم ہوا تھا جس کا نام تھا دائرۃ المعارف العثمانیہ۔سلطنت آصفیہ جو حیدرآباد میں قائم تھی اور اس کے فرمانروا میر عثمان علی خان نے ایک ادارہ دائرۃ المعارف العثمانیہ کے نام سے قائم کیا تھا۔اس میں علم حدیث پر کئی درجن کتابیں شائع ہوئیں جو دنیا کے سامنے پہلی مرتبہ اس ادارہ کی مدد سے سامنے آئیں۔میرے پاس وہ مکمل فہرست موجود نہیں ہے جس میں اس ادارہ سے شائع ہونے والی ان کتابوں کا تذکرہ ہو جن کا تعلق علم حدیث سے ہے۔لیکن میرے ذاتی مطالعہ یا علم میں جو کتابیں آئیں ان میں سے کئی کتابیں بڑی اہم ہیں۔الکفایہ فی علم الروایۃ، جو خطیب بغدادی کی بہت مشہور کتاب ہے، پہلی بار اسی ادارہ کے ذریعہ دنیا کے سامنے آئی۔لسان المیزان اور تھذیب التھذیب جو علم رجال پر حافظ ابن حجر عسقلانی کی انتہائی مشہور اور مستند کتابیں ہیں، پہلی بار اسی ادارہ نے شائع کیں۔الموتلف والمختلف حافظ ابن ماکولا کی ایک بڑی جامع کتاب ہے۔الموتلف والمختلف رجال کی وہ کتاب ہے جس میں ملتے جلتے ناموں کو جمع کیا گیا ہے تاکہ ایک جیسے ناموں والے راویوں میں التباس نہ ہو۔یہ کئی جلدوں میں ہے اور پہلی بار دائرۃ المعارف سے شائع ہوئی ہے۔

اسی طرح سے کتب حدیث کے رجال پر الگ الگ کتابیں تھیں۔رجال بخاری پر الگ، رجال مسلم پر الگ۔پھر بعد میں لوگوں نے مختلف کتابوں پر رجالوں میں مشترک رجال پر کتابیں لکھیں۔تو اس طرح کی ایک کتاب صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے مشترک رجال پر تھی 'کتاب الجمع بین کتابی ابی نصر الکلاباذی و ابی بکر الاصفھانی فی رجال البخاری و مسلم'۔یہ

پہلی مرتبہ وہاں سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ علم حدیث پر کم وبیش پچیس تیس کتابیں پہلی مرتبہ دائرۃ المعارف عثمانیہ سے شائع ہوئیں اور پوری دنیا میں تقسیم ہوئیں۔ گویا دنیا میں ان کتب کے اثرات اس ادارہ کے ذریعے پہنچے اس لئے اس ادارہ کو بھی علم حدیث کی تاریخ میں یاد رکھنا چاہئے۔

یہ مختصر ترین جائزہ ہے علم حدیث کے اس کام کا جو برصغیر میں ہوا۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ علم حدیث کے دور نو کا آغاز شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے ہوا جو آج تک چل رہا ہے اور جتنے بھی تلامذہ حدیث، اساتذہ حدیث یا علماء حدیث برصغیر میں آج نظر آتے ہیں وہ سب مختلف واسطوں سے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے شاگرد ہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے دو باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ ایک بات یہ کہ امت مسلمہ کو ایک پلیٹ فارم پر کیسے جمع کیا جائے اور لوگوں میں عدم وحدت کے رجحان کو کیسے ختم کیا جائے۔ یہ ان کی اولین کوشش ہوا کرتی تھی۔ ان کی دوسری کوشش یہ ہوا کرتی تھی کہ ان مسلکی اختلافات کو اور مسلمانوں میں جو متنوع آرا ہیں ان کو حدیث نبوی اور رسول اللہ ﷺ کی سنت سے کیسے ہم آہنگ کیا جائے اور کس طرح سے علم حدیث کو عام کیا جائے کہ اختلافات حدود کے اندر آجائیں۔

اس لئے حدیث کے تمام طلبہ سے میری گزارش یہ ہوتی ہے کہ شاہ ولی اللہ کی کتابیں اپنے مطالعہ میں رکھیں۔ خاص طور پر ان کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ۔ حجۃ اللہ البالغہ کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ شروع کا ہے جو نسبتاً مشکل ہے، اس کو بھی پڑھنا چاہئے۔ لیکن اگر وہ نہ پڑھ سکیں تو اس مشکل حصہ کو چھوڑ کر بقیہ حصہ جو سارے کا سارا علم حدیث پر مشتمل ہے اور علم حدیث سے نکالے گئے دروس اور حکمتوں پر مبنی ہے وہ حدیث کے تمام طلبہ کو پڑھنا چاہئے۔ اس سے وہ رجحان جسے آپ accomodative tendency کہہ سکتے ہیں، یعنی سب کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا رجحان شاہ ولی اللہ کی اس کتاب کے مطالعہ سے خود بخود پرورش پاتا ہے اور یہی حضرت شاہ ولی اللہ کی تمام کوششوں اور کاوشوں کا مقصود تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

برصغیر میں حدیث سے متعلق کام کے بارے میں سن کر بہت خوشی ہوئی۔ کیا اور ممالک میں بھی ایسا ہوا کہ نہیں؟

دوسرے ممالک میں انیسویں صدی میں ایسا نہیں ہوا۔ افسوس کہ بیسویں صدی کے نصف اول میں بھی نہیں ہوا اور اگر کچھ ہوا ہے تو وہ بہت کم ہے۔ یعنی جتنا کام برصغیر میں ہوا اتنا کام اٹھارویں اور انیسویں صدی میں اور ملکوں میں نہیں ہوا۔ اب اور ملکوں میں، خاص طور پر عرب ممالک میں بیسویں صدی کے اواخر یا نصف ثانی سے کام کی رفتار بہت تیز ہوگئی ہے اور اب وہ ہم سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ اس وقت جتنا کام عرب دنیا میں ہو رہا ہے، سعودی عرب، اردن، شام اور بعض دوسرے ممالک میں، وہ بڑا غیر معمولی ہے۔ اتنا بڑا کام ہے کہ اس کو دیکھا جائے تو دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔

کیا میں علامہ سیوطی کے بارے میں جان سکتی ہوں؟

علامہ سیوطی کے بارے میں دو تین جملے عرض کرتا ہوں۔ ان کا پورا نام جلال الدین سیوطی ہے۔ دسویں صدی ہجری کے اوائل میں ان کا انتقال ہوا۔ اپنے زمانہ کے ہر فن مولا امام تھے۔ پانچ سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ علم حدیث میں ان کی بڑی بنیادی کتابیں ہیں۔ علم حدیث سے متعلق انہوں نے کم و بیش پچاس ساٹھ کتابیں لکھیں اور ایک خاص بات ان میں اور برصغیر کے ایک اور بزرگ، جن کا نام لینا میں بھول گیا، ہمارے ٹھٹھہ کے ایک بزرگ تھے جو غالباً **1238**ھ میں فوت ہوئے ہیں، علامہ ابوالحسن محمد بن عبدالوہاب ٹھٹوی السندی، ان کا یہ ایک عجیب وغریب کارنامہ ہے کہ صحاح ستہ کی ہر کتاب پر ان دونوں کی ایک ایک شرح موجود ہے۔ صحیح بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ، ان چھ کی چھ کتابوں کی انہوں نے شرحیں لکھیں جو اکثر مطبوعہ موجود ہیں ایک دو غیر مطبوعہ ہیں۔ اسی طرح سے علامہ سیوطی نے بہت سی کتابوں کی شرحیں لکھیں جن میں صحاح ستہ کی ہر کتاب کی شرح بھی شامل ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ پر جو کتاب میرے پاس ہے اس کی اردو مشکل ہے۔

ظاہر ہے کتاب مشکل ہے تو اردو بھی مشکل ہوگی۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ ایک بزرگ تھے مولانا عبدالحق حقانی، ان کا ترجمہ نسبتاً آسان ہے۔ یہ ترجمہ دو جلدوں میں کراچی سے نور محمد کارخانہ تجارت سے غالباً **1955-56** میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ بھی شائع ہوا ہے

اگر مل جائے تو یہ آسان ہے۔ ابھی حال ہی میں ادارہ تحقیقات اسلامی (آئی آر آئی) نے اس کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے۔ اس کے ایک حصہ کا انگریزی ترجمہ میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر غزالی صاحب نے کیا تھا، وہ بھی مطبوعہ موجود ہے لیکن ایک مکمل ترجمہ دو جلدوں میں ایک امریکی نومسلم خاتون، جن کا اصل نام مارسیہ ہرمنسن ہے، انہوں نے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ وہ انگریزی ترجمہ بہت اچھا ہے اور یہاں ملتا ہے۔ اردو پڑھنا چاہیں تو مولانا عبدالحق حقانی کا ترجمہ پڑھ لیں۔

آج کے دور کے برصغیر کے محدثین کے بارے میں بیان کر دیں۔

وہ اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا تذکرہ کرنا بڑا دشوار ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی کاوشوں میں برکت دے۔ لیکن اس درجہ کا کوئی آدمی نہیں ہے جس درجہ کے علامہ انور شاہ کشمیری یا علامہ شمس الحق عظیم آبادی، یا مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری تھے۔ ابھی ایک بزرگ ہندوستان میں ہیں اور غالباً حیات ہیں اور بہت معمر ہوں گے۔ ان کی ایک شرح بخاری 'انوار الباری' کے نام سے چھپی ہے۔ کراچی میں بھی چھپی ہے۔ بہت اچھی کتاب ہے۔ یہ مولانا انور شاہ کشمیری کے داماد اور شاگرد تھے۔ انہوں نے ان کی تقریروں کے نوٹس مرتب کئے ہیں۔ جو مجھے بہت اچھے معلوم ہوئے۔ اگرچہ اس میں مسلکی چیزیں بہت ہیں جو نہیں ہونی چاہئے تھیں لیکن اس کے باوجود کتاب بہت اچھی ہے۔ ایک ہمارے دوست مولانا تقی عثمانی ہیں۔ انہوں نے مولانا شبیر احمد عثمانی کی شرح صحیح مسلم کی تکمیل کی ہے۔ فتح الملہم مولانا شبیر احمد عثمانی کے قلم سے صحیح مسلم کی شرح ہے۔ یہ نامکمل تھی اور کتاب الرضاع تک ہی لکھی جا سکی۔ اس کی بقیہ جلدیں مولانا محمد تقی عثمانی نے لکھی ہیں۔ اسی طرح اور حضرات کی کتابیں بھی ہیں جن کی تفصیل بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆☆

بارھواں خطبہ

علوم حدیث - دورجدید میں

ہفتہ 18 اکتوبر 2003

علوم حدیث - دور جدید میں

اس گفتگو سے دو چیزیں پیش کرنا مقصود ہیں۔ ایک تو اس غلط فہمی یا کم ہمتی کی تردید کہ علم حدیث پر جو کام ہونا تھا وہ ماضی کے سالوں میں ہو چکا۔ اور آج نہ علم حدیث پر کسی نئے کام کی ضرورت ہے اور نہ کوئی نیا کام ہو رہا ہے۔ محدثین کے یہ کارنامے سن کر ایک خیال یہ ذہن میں آسکتا ہے کہ جتنا کام ہونا تھا وہ ہو چکا۔ جو تحقیق ہونی تھی وہ ہو چکی۔ اب مزید نہ کسی کام کی ضرورت ہے اور نہ کسی تحقیق کی۔ یہ غلط فہمی دور ہو سکتی ہے اگر مختصر طور پر یہ دیکھ لیا جائے کہ آج کل حدیث پر کتنا کام ہو رہا ہے اور اس میں مزید کن کن کاموں کے کرنے کے امکانات ہیں اور کیا کیا کام آئندہ ہو سکتے ہیں۔

دوسری وجہ اس گفتگو کی یہ ہے کہ بہت سے ایسے اہل علم اور تحقیق کے طلبہ جو کوئی کام کرنا چاہتے ہیں اور علم حدیث کو اپنے مطالعہ کا موضوع بنانا چاہتے ہیں، ان میں سے بہت سے طلبہ کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اگر علم حدیث پر کوئی نئی تحقیقی کاوش شروع کی جائے تو وہ کیا ہو۔ کن موضوعات پر ہو اور کن خطوط پر ہو۔ آج کی گفتگو میں انہی دو اسباب کی وجہ سے بعض گزارشات پیش خدمت ہیں۔

بیسویں صدی کو اگر ہم دور حاضر یا دور جدید قرار دیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کے دوران علم حدیث میں ایک نئی سرگرمی پیدا ہوئی ہے اور علم حدیث پر کام کرنے کے نئے نئے میدان اور نئے نئے موضوعات سامنے آئے ہیں۔ خاص طور پر دنیائے عرب میں اہل علم کی ایک بہت بڑی تعداد نے علم حدیث پر ایک نئے انداز سے کام کا آغاز کیا ہے اور تحقیق اور علمی کاوش کے

ایسے ایسے نمونے دنیا کے سامنے رکھے ہیں جن کو علم حدیث کی تاریخ میں ایک نئے دور کا نقطۂ آغاز کہا جاسکتا ہے۔عرب دنیا میں بہت سی جامعات کے شعبہ ہائے اسلامیات نے اور بہت سی جامعات اسلامیہ نے علم حدیث کے موضوع پر ایسے نئے نئے مقالات تیار کرائے ہیں جنہوں نے علم حدیث کے ان تمام گوشوں کو از سر نو زندہ کر دیا ہے جن کو ایک طویل عرصہ سے لوگوں نے نظر انداز کر دیا تھا۔

ایک عام تاثر یہ تھا کہ رجال اور جرح وتعدیل پر جتنا کام ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ احادیث مرتب ہو چکیں، مدون ہو چکیں اور کتابی شکل میں ہم تک پہنچ چکیں۔اب از سر نو رجال پر غور کرنے یا جرح وتعدیل کے مباحث کو دوبارہ چھیڑنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور نہ اب اس کی ضرورت ہے۔جزوی طور پر یہ بات درست ہے اور ایک حد تک میں بھی اس سے اتفاق کرتا ہوں کہ احادیث مرتب ہو چکیں، کتابوں کی شکل میں مدون ہو چکیں، احادیث کا درجہ متعین کیا جا چکا ہے اور کم وبیش ننانوے فیصد احادیث کے بارے میں یہ تحقیق ہو چکی ہے کہ ان میں سے کس حدیث کا روایت کے اعتبار سے، فن رجال اور سند کے اعتبار سے کیا درجہ ہے۔اس لئے اس موضوع پر کسی نئی تحقیق یا کسی نئے نتیجہ کا سامنے آنا بہت بعید از امکان ہے۔لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خود علم رجال اپنی اہمیت کھو چکا ہے یا علم جرح وتعدیل کی اب کوئی اہمیت نہیں رہی اور یہ ماضی کا ایک بھولا بسرا علم ہے جس کو ایک آثار قدیمہ کے طور پر تو پڑھا جاسکتا ہے، ایک زندہ علم اور ایک مسلسل حرکت پذیر علم کے طور پر اب اس کی اہمیت نہیں رہی۔میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔علم رجال، علم روایت، علم سند اور علوم حدیث آج بھی ویسے ہی زندہ علوم ہیں جیسے آج سے ایک ہزار سال پہلے یا بارہ سو سال پہلے تھے۔ان علوم میں تحقیق کے ایسے ایسے گوشے اب بھی موجود ہیں جو اہل علم کی اور طلبہ حدیث کی توجہ کے مستحق ہیں۔علامہ اقبال کا ایک فارسی شعر ہے جو شاید انہوں نے ایسے ہی کسی موقع کے لئے کہا ہوگا۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں
ہزار بادہ ناخوردہ در رگ تاکست

یہ مت سمجھو کہ انگور کے خوشے سے شراب نچوڑنے والے کا کام ختم ہو چکا ہے۔ابھی تو انگور کے خوشوں میں ہزاروں شرابیں ہیں جو نچوڑی جانی ہیں اور جن کو نکال کر ابھی لوگوں کے

سامنے پیش کرنا ہے۔ یہی معاملہ علم حدیث کا ہے کہ علم حدیث کے تمام علوم وفنون میں تحقیق کے ایسے ایسے گوشے ابھی موجود ہیں جن پر کام کرنے کی ضرورت ہے اور اہل علم ان پر کام کر رہے ہیں۔

اس معاملہ میں دنیائے عرب کی جامعات نے، خاص طور پر جامعہ ازہر، سعودی عرب، شام اور مراکش کی جامعات میں علم حدیث کے موضوعات پر قابل ذکر ذخیرہ پیش کیا ہے اور علم حدیث کو ایک نئے انداز سے مرتب کرنے کی طرح ڈالی ہے۔ ان حضرات کے نام لئے جائیں تو گفتگو بڑی طویل ہو جائے گی جنہوں نے علم حدیث کو نئی جہتوں سے نوازا ہے۔ ایسے حضرات کی تعداد بھی درجنوں سے بڑھ کر سینکڑوں میں ہے جو آج عرب دنیا کے گوشے گوشے میں علم حدیث اور علوم حدیث پر نئے انداز سے کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض کا ذکر میں آج کی گفتگو میں کروں گا۔

مستشرقین کی خدمات

اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہاں مستشرقین کی مثبت علمی کاوشوں کا اعتراف بھی کرنا چاہئے۔ ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ اچھی بات کی تعریف کرے اور بری بات کی برائی کی نشاندہی کرے۔ ہم مستشرقین کے کاموں پر تنقید کرتے ہیں۔ مستشرقین کے جو کام تنقید کے قابل ہیں ان پر تنقید کرنی چاہئے۔ جہاں جہاں غلطیاں ہیں ان کی نشاندہی کرنی چاہئے۔ جہاں جہاں اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں یا پیدا کی گئی ہیں ان کا ازالہ کیا جانا چاہئے۔ اس کے ساتھ ساتھ جہاں مستشرقین نے کوئی اچھا کام کیا ہے اس کا اعتراف بھی کرنا چاہئے۔ مستشرقین کا کیا ہوا ایک غیر معمولی کام المعجم المفھرس لالفاظ الحدیث جیسے جامع انڈکس کی ترتیب ہے جس کا میں نے پہلے تذکرہ کیا ہے۔ یہ مستشرقین کی ایک جماعت نے سالہا سال کی کوششوں کے بعد تیار کی ہے۔ یہ بڑے سائز کی سات آٹھ جلدوں میں حدیث کی ایک انڈکس ہے جو ابجدی ترتیب کے حساب سے ہے۔ آپ کو کسی حدیث کا کوئی ایک لفظ بھی یاد ہو تو آپ اس سے نو کتابوں میں موجود کسی حدیث کا پتہ چلا سکتے ہیں۔ صحاح ستہ، موطا امام مالک، مسند امام احمد اور مسند دارمی۔ آپ کو مثال کے طور پر اگر یہ یاد ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت کردہ ایک حدیث ہے کہ انہوں نے ایک اونٹ خریدا اور وہ ان سے رسول اللہ ﷺ نے خرید لیا۔ اب آپ کو جمل کا لفظ معلوم

ہے اور باقی کوئی الفاظ یاد نہیں ہیں اور نہ یہ یاد ہے کہ صحابیؓ کون سے تھے۔ تو آپ ابجد کے حساب سے جمل میں تلاش کر لیں۔ جمل کی احادیث دیکھ لیں تو آپ کو وہ حدیث مل جائے گی جس میں حضرت جابر کے اونٹ خریدنے اور رسول اللہ ﷺ سے معاملہ کرنے کا ذکر ہے۔

یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اس کی جتنی قدر کی جائے کم ہے۔ جب کوئی شخص علم حدیث پر کام کر رہا ہو اور احادیث کے حوالے تلاش کر رہا ہو اور اس کتاب سے مدد لے اس وقت اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ ان چند کتابوں میں سے ہے جو حدیث کے طلبہ بہت کثرت سے استعمال کرتے ہیں اور علم حدیث کا کوئی استاد، کوئی محقق اور کوئی مصنف اس کتاب سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔ یہ مستشرقین کا ایک قابل قدر کارنامہ ہے اور ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہئے۔ انہوں نے اچھی کاوش کی ہے ہم اس کی قدر کرتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ مستشرقین کا ایک اور کام جو دور جدید میں ہمارے سامنے آیا ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں نے بھی اس طریق کار کو اختیار کیا، وہ کتابوں کی ایڈیٹنگ کا ایک نیا اسلوب ہے۔ ہمارے قدیم زمانے میں اسلامی دور میں جو کتابیں لکھی جاتی تھیں یا چھپتی تھیں۔ ان میں نہ کوئی پیراگراف ہوتا تھا، نہ گنتی ہوتی تھی، نہ انڈکس ہوتی تھی، نہ فہرست ہوتی تھی اور کتاب شروع سے لے کر آخر تک ایک ہی پیرے میں ہوتی تھی۔ میرے پاس ایک کتاب ہے جو بارہ پندرہ جلدوں میں ہے اور پوری کتاب ایک ہی پیرے پر مشتمل ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ نیا مضمون کہاں سے شروع ہوا ہے اور اس میں کیا بیان ہوا ہے۔ جس زمانے میں اہل علم اپنے حافظہ اور یادداشت میں بہت اونچے مقام پر فائز تھے ان کو شاید یہ یاد ہوتا ہوگا کہ کس کتاب میں کون سی بات کہاں لکھی ہوئی ہے۔

لیکن اب جب کہ ہمتیں کم ہوگئیں اور حوصلے پست ہوگئے تو اب یہ دشوار ہوگیا کہ اتنی بڑی کتاب میں کوئی چیز تلاش کرنی ہو تو کس طرح تلاش کی جائے۔ اس میں مستشرقین کے اسلوب سے بڑی مدد ملی۔ انہوں نے کتابوں کو ایڈیٹ کرنے کا اور شائع کرنے کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا جس پر اب دنیائے اسلام میں بھی عمل ہو رہا ہے۔ اب نئی نئی کتابیں تحقیق ہو کر سامنے آرہی ہیں جن میں کتاب کو پیراگراف کے انداز میں تقسیم کیا گیا۔ اس کے مندرجات کو انڈکس کیا گیا، ان کے اشاریئے مرتب کیے گئے، فہرستیں تیار کی گئیں، اس کتاب کے پرانے نسخوں سے اس کا موازنہ

کیا گیا اور صحیح ترین نسخہ کے تعین کا اہتمام کیا گیا۔ یہ اہتمام کسی حد تک پہلے بھی ہوا کرتا تھا لیکن اب زیادہ سائنسی اور علمی انداز میں ہونے لگا ہے۔

اسی طرح سے اگر کتاب میں کسی سابقہ کتاب کا حوالہ ہے تو اس کتاب سے تلاش کر کے اس حوالہ کی نشاندہی کی جائے تا کہ آسانی ہو جائے اور اصل کتاب سے موازنہ کر کے رجوع کیا جا سکے۔ یہ طریقہ مغرب میں رائج ہوا اور دنیائے اسلام نے اس کو اپنایا۔ بلاشبہ یہ ایک اچھا طریقہ ہے۔ اس کے مطابق حدیث کی بہت سی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن سے استفادہ کرنا بہت آسان ہو گیا ہے۔

تاریخ حدیث پر ہونے والا کام

بیسویں صدی میں تاریخ حدیث پر بھی ایک بڑا اہم کام ہوا جس کا ذکر میں اختصار کے ساتھ پہلے کر چکا ہوں۔ یہ کام جن صاحب علم بزرگ نے شروع کیا وہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی تھے جو حیدر آباد دکن میں جامعہ عثمانیہ میں اسلامیات کے استاد اور بڑے عالم اور مشہور مفکر تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے تاریخ تدوین حدیث کے نام سے ایک کتاب مرتب کی۔ تاریخ تدوین حدیث مرتب کرتے ہوئے انہوں نے مستشرقین کے ان اعتراضات کو سامنے رکھا جن میں یہ کہا گیا تھا کہ علم حدیث سارے کا سارا محض زبانی اور سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہے۔ اس کے پیچھے کوئی مضبوط، ٹھوس اور علمی روایت نہیں ہے۔ اس لئے جو ذخائر حدیث کے نام سے آج پیش کئے جاتے ہیں وہ سارے کے سارے مشکوک ہیں۔ یہ بات مستشرقین بیسویں صدی کے شروع میں کہا کرتے تھے۔ مولانا مناظر حسن گیلانی نے تدوین حدیث پر ایک بڑی ضخیم کتاب مرتب کی جو غالباً آٹھ نو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں انہوں نے اس اعتراض کو سامنے رکھ کر تدوین حدیث کی تاریخ کو ایسے نئے انداز سے مرتب کیا کہ یہ اعتراض خود بخود ختم ہو جاتا ہے اور وہ سارے شواہد سامنے آجاتے ہیں جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مستشرقین کا یہ اعتراض کتنا کمزور ہے، کتنا بے بنیاد ہے اور کتنا غیر علمی ہے۔

مولانا مناظر حسن گیلانیؒ کے اس کام کو ان کے شاگردوں نے آگے بڑھایا۔ ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم ان کے براہ راست شاگرد تھے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے صحیفہ ہمام بن منبہ کو ایڈٹ کیا۔ یہ

حضرت ابو ہریرہؓ کا ڈکٹیٹ کرایا ہوا اور ان کے تلمیذ خاص جناب ہمام بن منبہ کا مرتب کیا ہوا ذخیرہ تھا جس کے قلمی نسخے جرمنی اور کئی دوسرے ممالک کے کتب خانوں میں موجود تھے۔ وہاں سے انہوں نے یہ قلمی نسخہ حاصل کر کے اس کو ایڈٹ کیا اور اس پر ایک بڑا بھر پور مقدمہ لکھا۔ انہوں نے اس مقدمہ میں یہ بات ثابت کی کہ یہ مجموعہ جو حضرت ابو ہریرہؓ کی نگرانی میں تیار ہوا تھا اس کو حضرت ابو ہریرہؓ نے تحریری اور زبانی دونوں یادداشتوں کے ذریعے اپنے شاگردوں تک منتقل کیا۔ انؓ کے شاگردوں نے بھی دونوں طرح سے اس میں مندرج احادیث کو اپنے شاگردوں تک منتقل کیا۔ یہاں تک کہ یہ مجموعہ مرتبین کتب حدیث تک پہنچا۔ اس مثال سے یا گویا **Case Study** سے مستشرقین کا وہ اعتراض غلط ثابت ہو گیا جس کی بنیاد پر وہ حدیث پر اعتراض کیا کرتے تھے۔

اس طرز استدلال کو اور لوگوں نے بھی آگے بڑھایا۔ ڈاکٹر فواد سیزگین بھی ان اہل علم میں سے جنہوں نے دفاع حدیث میں قابل قدر کام کیا ہے۔ انہوں نے اسلامی علوم کی تاریخ پر ایک انتہائی بھر پور اور تاریخ ساز کام کیا ہے جو آئندہ کئی سو سال تک لوگوں کے لئے مشعل ہدایت اور رہنمائی کا ذریعہ بنے گا۔ ان کی یہ کتاب جرمن زبان میں ہے۔ اس میں ایک پوری جلد علم حدیث کی تاریخ اور مخطوطات کی فہرست پر مشتمل ہے۔ ان کا اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ صحیح بخاری کے مآخذ پر تھا۔ اس میں انہوں نے صحیح بخاری کے تمام مآخذ کا جائزہ لیا، اور ایک ایک ماخذ کا جائزہ لے کر اور تجزیہ کر کے بتایا کہ صحیح بخاری میں جو مواد ہے یہ آج کی دنیا کے نزدیک تاریخ کے جو مستند ترین تاریخی مآخذ ہو سکتے ہیں، ان کے ذریعے منتقل ہوا ہے۔ اس میں ایک لفظ اور ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جو علمی اعتبار سے ثابت نہ کی جا سکتی ہو۔ ڈاکٹر فواد سیزگین کا یہ کارنامہ غیر معمولی ہے۔ اب کوئی مستشرق یہ اعتراض نہیں کرتا کہ صحیح بخاری یا صحیح مسلم یا حدیث کی کسی اور کتاب کا مواد غیر مستند ہے۔ انہوں نے دلائل سے یہ بات بالکل روز روشن کی طرح واضح کر دی ہے۔

یہی بات ڈاکٹر مصطفٰے اعظمی، ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی اور ان جیسے کئی دوسرے حضرات نے واضح فرمائی ہے۔ یہ سارے کا سارا کام بیسویں صدی میں ہوا ہے۔ بیسویں صدی ہجری نے گویا ایک نیا اسلوب تاریخ حدیث کے مطالعہ کا دیا جس کے نتیجہ میں وہ رجحان ساز کام ہوا جس کی نمائندہ ترین شخصیات یہ پانچ چھ حضرات ہیں، جن کے میں نے نام لئے۔

مخطوطات

قدیم مخطوطات کی جتنی اشاعت بیسویں صدی میں ہوئی اتنی ماضی کے شاید پورے دور میں نہ ہوئی ہو۔ بعض کتابیں ایسی تھیں کہ علم حدیث میں ان کا بڑا مقام تھا۔ لیکن وہ کسی وجہ سے عوامی سطح پر مقبول نہیں ہوسکیں۔ ان کے مخطوطات بھی بہت کم دستیاب ہوتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ جو نسبۃً زیادہ بہتر کتابیں تھیں، زیادہ جامع اور زیادہ مکمل کتابیں تھیں اور ترتیب کے اعتبار سے زیادہ اچھی کتابیں تھیں، انہوں نے بقیہ کتابوں سے لوگوں کو مستغنی کر دیا۔ عام طلبہ کو ان کتابوں کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ چونکہ طباعت کا زمانہ نہیں تھا اس لئے وہ کتابیں زیادہ رائج نہیں ہوسکیں اور قدیم مخطوطات ہی کی صورت میں رہیں یا چند اہل علم تک محدود رہیں۔ عام طور پر اہل علم ان کتابوں سے واقف نہیں ہوتے تھے۔

مثلاً مصنف عبدالرزاق کا میں نے ذکر کیا۔ مصنف عبدالرزاق ایک بڑی جامع کتاب ہے۔ اتنی جامع کہ حدیث کے چند جامع ترین مجموعوں میں سے ایک ہے۔ صحابہ اور تابعین کے اقوال اور فتاویٰ کا بہت بڑا ماخذ ہے۔ لیکن اس کے مخطوطے بڑے محدود تھے، کہیں کہیں پائے جاتے تھے اور عام طور پر ملتے نہیں تھے۔ مصنف عبدالرزاق کوئی درسی کتاب نہیں تھی کہ ہر جگہ آسانی سے اس کے نسخے مل جائیں۔ علماء حدیث کو عام طور پر اس کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، اس لئے کہ طلبا کو پڑھانے کے لئے صحاح ستہ اور ان کی شرحیں کافی تھیں۔ اب بیسویں صدی اور اس کے وسط میں ایک بڑے مشہور بزرگ جن کا تعلق ہندوستان سے تھا، حیدرآباد دکن میں رہے، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، انہوں نے حدیث کی درجنوں کتابیں ایڈٹ کیں اور عرب دنیا میں چھپوائیں جو آج عام ہیں۔ ہندوستان میں گجرات کے صوبہ کے ایک بزرگ مولانا احمد میاں سملکی تھے۔ سملک بھارت کے صوبہ گجرات کا کوئی شہر تھا جہاں کے وہ رہنے والے تھے۔ وہ بڑے صاحب علم آدمی تھے اور اللہ تعالیٰ نے دولت بھی بہت دی تھی۔ جنوبی افریقہ میں ان کے خاندان کا ایک حصہ آباد ہے، کچھ گجرات میں اور کچھ کراچی میں آباد ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی دولت دی ہے اور میں نے خود ان کی دولت مندی کے بہت سے نمونے دیکھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو توفیق دی کہ وہ ایک بہت بڑا ادارہ قائم کریں جس سے یہ ساری کتابیں شائع

ہوئیں۔مُصنَف عبدالرزاق انہوں نے اپنے خرچہ سے شائع کی اور پوری دنیا میں مفت تقسیم کرادی۔آج مصنف عبدالرزاق کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور یہ کتاب دنیا کے ہر کتب خانہ میں موجود ہے۔

اسی طرح سے امام حمیدی جو امام بخاری کے استاد تھے، ان کی ایک کتاب تھی جو مسند الحمیدی کے نام سے بڑی مشہور تھی۔وہ عام طور پر نہیں ملتی تھی۔کہیں کہیں اس کے مخطوطے اور نسخے موجود تھے۔مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے اس کو بھی ایڈٹ کیا اور انہی بزرگ نے اپنے خرچ پر اس کو بھی شائع کرادیا۔آج وہ دنیا کی ہر لائبریری میں موجود ہے۔

امام ابوبکر بزّار جو ایک بڑے مشہور محدث تھے۔ان کی کتاب 'مسند بزار' ہے۔ان کے زوائد پر ایک پرانی کتاب چلی آرہی تھی جس کا نام تھا 'کشف الاستار عن زوائد البزار'۔وہ بھی مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے ایڈٹ کر کے شائع کروادی۔اس طرح حدیث اور علوم حدیث کی درجنوں پرانی اور بیش قیمت کتابیں ہیں جس پر اتنی بڑی تعداد میں اہل علم نے کام کیا ہے کہ اگر میں ان کے صرف نام ہی لینے لگوں تو گفتگو بہت لمبی ہوجائے گی۔اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر دے۔

بیسویں صدی اس اعتبار سے علم حدیث کی تاریخ میں نمایاں ہے کہ وہ مواد جو ابتدائی دو تین صدیوں میں جمع ہوا تھا۔تیسری چوتھی صدی ہجری تک آگیا تھا، وہ بعد کے سالوں میں یعنی پانچویں چھٹی صدی سے لے کر تیرھویں صدی تک لوگوں کے لئے اکثر و بیشتر دستیاب نہیں رہا اور عام لوگوں کو ملتا نہیں تھا۔بعض بعض کتب خانوں میں موجود تھا اور اہل علم جا کر استفادہ بھی کیا کرتے تھے لیکن بیسویں صدی میں یہ سب کتابیں چھپ کر عام ہوگئیں اور لوگوں تک پہنچ گئیں۔

شام کے ایک بزرگ 'ڈاکٹر نورالدین عتر' ہیں۔انہوں نے علم حدیث پر بڑا قابل قدر کام کیا ہے اور کئی پرانی کتابیں ایڈٹ کر کے شائع کردی ہیں۔خطیب بغدادی کی کتابیں بیسویں صدی میں شائع ہوئیں۔اسی طرح سے ہمارے سابقہ مشرقی پاکستان مرحوم (بنگلہ دیش) کے ایک بزرگ ڈاکٹر معظم حسین تھے، جو وہاں شعبہ عربی کے صدر تھے۔انہوں نے امام حاکم کی معرفت علوم الحدیث ایڈٹ کر کے شائع کرائی تھی اور قاہرہ سے شائع ہوئی تھی۔وہ اب دنیا میں ہر جگہ عام ہے۔

علم حدیث پر نئے علوم کی روشنی میں کام

بیسویں صدی میں بعض نئے موضوعات پر لوگوں نے کام کیا اور علم حدیث کا ایک نئے انداز سے مطالعہ کیا۔ اس میں سے ایک مثال بہت دلچسپ ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ علم حدیث پر اس نئے انداز سے بھی کام شروع ہوا ہے۔ آپ نے مشہور فرانسیسی مصنف ڈاکٹر مورس بکائی کا نام سنا ہوگا۔ وہ ایک زمانہ میں غالباً پورے فرانس کی میڈیکل ایسوسی ایشن کے صدر تھے۔ سائنسدان ہیں اور بہت بڑے ہارٹ سپیشلسٹ ہیں۔ وہ شاہ فیصل مرحوم کے ذاتی معالج تھے اور شاہ فیصل مرحوم کا علاج کرنے کے لئے ان کو وقتاً فوقتاً ریاض بلایا جاتا تھا۔

ایک مرتبہ ان کو ریاض بلایا گیا تو یہ سرکاری مہمان کے طور پر ہوٹل میں ٹھہرے اور کئی روز تک شاہ فیصل سے ملاقات کا انتظار کرتے رہے۔ ظاہر ہے کسی بھی وقت بادشاہ کی طرف سے ملاقات کا بلاوا آسکتا تھا اس لئے کہیں آ جا بھی نہیں سکتے تھے۔ ہر وقت اپنے کمرے میں رہتے تھے کہ اچانک کوئی فون کال آئے گی تو چلے جائیں گے۔ وہاں ہوٹل کے کمرے میں قرآن پاک کا ایک نسخہ انگریزی ترجمہ کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے وقت گزاری کے لئے اس کی ورق گردانی شروع کردی۔ عیسائی تھے اس لئے ظاہر ہے کبھی قرآن پاک پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس انگریزی ترجمہ کی ورق گردانی کے دوران خیال ہوا کہ قرآن پاک میں بعض ایسے بیانات پائے جاتے ہیں جو سائنسی نوعیت کے ہیں۔ مثلاً بارش کیسے برستی ہے، انسان کی ولادت کن مراحل سے گزر کر ہوتی ہے۔ اس طرح اور بھی کئی چیزوں کی تفصیلات کا تذکرہ تھا۔

چونکہ وہ خود میڈیکل سائنس کے ماہر تھے اور سائنس ہی ان کا مضمون تھا اس لئے انہوں نے ان بیانات کو زیادہ دلچسپی کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ ایک بار پڑھنے کے بعد قرآن پاک کو انہوں نے دوبارہ پڑھا تو ان مقامات پر نشان لگاتے گئے جہاں سائنس سے متعلق کوئی بیان تھا۔ چند دن وہاں رہے تو پورے قرآن پاک کا ترجمہ کئی بار پڑھا اور اس طرح کے بیانات نوٹ کرتے گئے۔ اس سے ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر اسی طرح کے بیانات بائبل میں بھی ہوں اور ان کے ساتھ قرآن پاک کے بیانات کا تقابل کیا جائے تو دلچسپ چیز سامنے آسکتی ہے

انہوں نے واپس جانے کے بعد اس مشغلہ کو جاری رکھا اور بائبل میں جو اس طرح کے

بیانات تھی ان کی نشاندہی کی اور پھر ان دونوں بیانات کا تقابلی مطالعہ کیا اور اس میں انہوں نے خالص سائنسی معیار سے کام لیا۔ ظاہر ہے کہ وہ مسلمان نہیں تھے اور قرآن کے ساتھ کوئی عقیدت مندی نہیں تھی۔ انہوں نے خالص Objectively اور خالص سائنسی تحقیق کے پیمانے سے قرآن پاک اور بائبل کے بیانات کو دیکھا۔ اور اس نتیجے پر پہنچے کہ قرآن پاک میں سائنسی نوعیت کے جتنے بیانات ہیں وہ سب کے سب درست ہیں اور بائبل میں سائنسی نوعیت کے جتنے بیانات ہیں وہ سب کے سب غلط ہیں۔ انہوں نے ان نتائج پر مشتمل ایک کتاب شائع کی The Bible, Quran and Science جس کا اردو اور انگریزی سمیت بہت سی زبانوں میں ترجمہ ملتا ہے۔

اس کتاب کے بعد اسلامیات میں ان کی دلچسپی مزید بڑھ گئی اور انہوں نے تھوڑی سی عربی بھی سیکھ لی۔ ڈاکٹر حمید اللہ سے ان کے مراسم اور روابط بڑھ گئے۔ دونوں پیرس میں رہتے تھے۔ بعد میں ان کو خیال ہوا کہ اسی طرح کا مطالعہ صحیح بخاری کا بھی کرنا چاہئے۔ انہوں نے صحیح بخاری کا مطالعہ بھی شروع کر دیا۔ صحیح بخاری میں سائنسی نوعیت کے جتنے بیانات تھے ان کی الگ سے فہرست بنائی۔ انہوں نے اس طرح کے غالباً سو بیانات منتخب کئے۔ ان سو بیانات کا ایک ایک کر کے جائزہ لینا شروع کیا۔ اور یہ دیکھا کہ کس بیان کے نتائج سائنسی تحقیق میں کیا نکلتے ہیں۔ یہ سب بیانات جمع کرنے اور ان پر غور کرنے کے بعد انہوں نے ایک مقالہ لکھا جو ڈاکٹر حمید اللہ صاحبؒ کو دکھایا۔ یہ واقعہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے مجھے خود سنایا۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا کہنا تھا کہ جب میں نے اس مقالہ کو پڑھا تو اس میں لکھا ہوا تھا کہ صحیح بخاری کے جو سو بیانات میں نے منتخب کئے ہیں ان میں سے اٹھانوے بیانات تو سائنسی تحقیق میں صحیح ثابت ہوتے ہیں۔ البتہ دو بیانات غلط ہیں۔ ڈاکٹر مورس بکائی نے جن دو بیانات کو غلط قرار دیا تھا، ان میں سے ایک تو صحیح بخاری میں درج حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے جس میں آپؐ نے فرمایا کہ جب کھانے میں کوئی مکھی گر جائے تو اس کو اندر پورا ڈبو کر پھر نکالو۔ اس لئے کہ مکھی کے ایک پر میں بیماری اور دوسرے میں شفا ہوتی ہے۔ تم دونوں پروں کو اس میں ڈبو دو تا کہ شفا والا حصہ بھی کھانے میں ڈوب جائے۔ جب وہ گرتی ہے تو بیماری والا حصہ کھانے میں پہلے ڈالتی ہے۔ ڈاکٹر بکائی کا خیال تھا کہ یہ غلط ہے۔ مکھی کے کسی پر میں شفا نہیں ہوتی، مکھی تو

گندی چیز ہے۔ اگر کھانے میں مکھی گر جائے تو کھانے کو ضائع کر دینا چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ بات سائنسی طور پر غلط ہے۔

دوسری بات جو انہوں نے غلط قرار دی وہ بھی صحیح بخاری ہی کی روایت ہے۔ عرب میں ایک قبیلہ تھا عرنیین کا، بنی عرینہ کہلاتے تھے۔ یہ لوگ مشہور ڈاکو تھے اور پورے عرب میں ڈاکے ڈالا کرتے تھے۔ اس قبیلہ کے کچھ لوگ مدینہ آئے اور اسلام قبول کیا یا اسلام قبول کرنے کا دعویٰ کیا اور رسول اللہ ﷺ سے کچھ مراعات اور مدد مانگی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو مدینہ میں ٹھہرنے کے لئے ٹھکانہ دیا اور کچھ صحابہ کو ان کی مہمان داری کے لئے مقرر کیا۔ مدینہ منورہ کی آب و ہوا ان کو موافق نہیں آئی اور وہ بیمار ہو گئے۔ بیماری کی تفصیل یہ بتائی کہ ان کے رنگ زرد ہو گئے، پیٹ پھول گئے اور ایک خاص انداز کا بخار جس کو آج کل **yellow fever** کہتے ہیں، ان کو ہو گیا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے یہ بیماری دیکھی تو آپؐ نے ان سے فرمایا کہ تم مدینہ کے باہر فلاں جگہ چلے جاؤ۔ مدینہ منورہ سے کچھ فاصلہ پر ایک جگہ تھی جہاں بیت المال کے سرکاری اونٹ رکھے جاتے تھے۔ وہاں جا کر رہو۔ اونٹ کا دودھ بھی پیو اور پیشاب بھی پیو۔ بات عجیب سی ہے۔ لیکن بخاری میں یہی درج ہے۔ چنانچہ انہوں نے یہ علاج کیا اور چند روز وہاں رہنے کے بعد ان کو شفا ہو گئی۔ جب طبعیت ٹھیک ہو گئی تو انہوں نے اونٹوں کے باڑے میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے مامور چوکیدار کو شہید کر دیا اور بیت المال کے اونٹ لے کر فرار ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ کو پتہ چلا کہ یہ لوگ نہ صرف اونٹ لے کر فرار ہو گئے ہیں بلکہ وہاں پر متعین صحابیؓ کو بھی اتنی بے دردی سے شہید کیا ہے کہ انؓ کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے ہیں۔ گرم سلاخ ٹھونس کر آنکھیں پھوڑ دیں اور صحابیؓ کو ریگستان کی گرم دھوپ میں زندہ تڑپتا ہوا چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور وہ بچارے وہیں تڑپ تڑپ کر شہید ہو گئے ہیں۔ تو حضورؐ کو یہ سب کچھ سن کر بہت دکھ ہوا اور صحابہ کرامؓ کو بھی اس پر بہت زیادہ غصہ آیا۔ حضورؐ نے صحابہ کو ان کا پیچھا کرنے کے لئے بھیجا اور وہ لوگ گرفتار کر کے قصاص میں قتل کر دیئے گئے۔

اس پر مورس بکائی نے ڈاکٹر حمید اللہ سے کہا کہ یہ بھی درست نہیں ہے۔ سائنسی اعتبار سے یہ غلط ہے۔ کیونکہ پیشاب تو جسم کا **refuse** ہے۔ انسانی جسم خوراک کا جو حصہ قبول نہیں کر سکتا اسے جسم سے خارج کر دیتا ہے۔ ہر مشروب کا وہ حصہ جو انسانی جسم کے لئے نا قابل قبول

ہے تو وہ جسم سے خارج ہو جاتا ہے اور وہ انسانی جسم کے لئے قابل قبول نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس سے علاج کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے اس کے جواب میں ڈاکٹر مورس بکائی سے کہا کہ میں نہ تو سائنسدان ہوں نہ میڈیکل ڈاکٹر ہوں، اس لئے میں آپ کے ان دلائل کے بارے میں سائنسی اعتبار سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ایک عام آدمی کے طور پر میرے کچھ شبہات ہیں جن کا آپ جواب دیں تو پھر اس تحقیق کو اپنے اعتراضات کے ساتھ ضرور شائع کر دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں نے میٹرک میں سائنس کی ایک دو کتابیں پڑھی تھیں۔ اس وقت مجھے کسی نے بتایا تھا کہ سائنسدان جب تجربات کرتے ہیں تو اگر ایک تجربہ دو مرتبہ صحیح ثابت ہو جائے تو سائنسدان اس کو پچاس فیصد درجہ دیتا ہے اور جب تین چار مرتبہ صحیح ثابت ہو جائے تو اس کا درجہ اور بھی بڑھ جاتا ہے اور چار پانچ مرتبہ کے تجربات میں بھی اگر کوئی چیز صحیح ثابت ہو جائے تو آپ کہتے ہیں کہ فلاں بات سو فیصد صحیح ثابت ہو گئی۔ حالانکہ آپ نے سو مرتبہ تجربہ نہیں کیا ہوتا۔ ایک تجربہ تین چار مرتبہ کرنے کے بعد آپ اس کو درست مان لیتے ہیں۔ ڈاکٹر مورس نے کہا کہ ہاں واقعی ایسا ہی ہے۔ اگر چار پانچ تجربات کا ایک ہی نتیجہ نکل آئے تو ہم کہتے ہیں کہ سو فیصد یہی نتیجہ ہے۔ اس پر ڈاکٹر حمید اللہ نے کہا کہ جب آپ نے صحیح بخاری کے سو بیانات میں سے اٹھانوے تجربہ کر کے درست قرار دے دیئے ہیں تو پھر ان دو نتائج کو بغیر تجربات کے درست کیوں نہیں مان لیتے؟ جب کہ پانچ تجربات کر کے آپ سو فیصد مان لیتے ہیں۔ یہ بات تو خود آپ کے معیار کے مطابق غلط ہے۔ ڈاکٹر مورس بکائی نے اس کو تسلیم کیا کہ واقعی ان کا یہ نتیجہ اور یہ اعتراض غلط ہے۔

دوسری بات ڈاکٹر حمید اللہ نے یہ کہی کہ میرے علم کے مطابق آپ میڈیکل سائنس کے ماہر ہیں۔ انسانوں کا علاج کرتے ہیں۔ آپ جانوروں کے ماہر تو نہیں ہیں، تو آپ کو پتہ نہیں کہ دنیا میں کتنے قسم کے جانور پائے جاتے ہیں۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں نہیں جانتا کہ علم حیوانات میں کیا کیا شعبے اور کون کون سی ذیلی شاخیں ہیں اور ان میں کیا کیا چیزیں پڑھائی جاتی ہیں لیکن اگر علم حیوانات میں 'مکھیات' کا کوئی شعبہ ہے تو آپ اس شعبہ کے ماہر نہیں ہیں۔ کیا آپ کو پتہ ہے کہ دنیا میں کتنی اقسام کی مکھیاں ہوتی ہیں۔ کیا آپ نے کوئی سروے کیا ہے کہ دنیا میں کس موسم میں کس قسم کی مکھیاں پائی جاتی ہیں۔ جب تک آپ عرب میں ہر موسم میں پائی جانے والی

مکھیوں کا تجربہ کرکے اوران کے ایک ایک جز کا معائنہ کرکے، لیبارٹری میں چالیس پچاس سال لگا کر نہ بتائیں کہ ان میں کسی مکھی کے پَر میں کسی بھی قسم کی شفانہیں ہے اس وقت تک آپ یہ مفروضہ کیسے قائم کرسکتے ہیں کہ مکھی کے پر میں بیماری یا شفانہیں ہوتی۔ ڈاکٹر مورس بکائی نے اس سے بھی اتفاق کیا کہ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اگر آپ تحقیق کرکے یہ ثابت بھی کردیں کہ مکھی کے پر میں شفانہیں ہوتی تو یہ کیسے پتہ چلے گا کہ چودہ سوسال پہلے ایسی مکھیاں نہیں ہوتی تھیں۔ ہوسکتا ہے ہوتی ہوں، ممکن ہے ان کی نسل ختم ہوگئی ہو۔ جانوروں کی نسلیں تو آتی ہیں اور ختم بھی ہوجاتی ہیں۔ روز کا تجربہ ہے کہ جانوروں کی ایک نسل آئی اور بعد میں وہ ختم ہوگئی۔ تاریخ میں ذکر ملتا ہے اور خود سائنسدان بتاتے ہیں کہ فلاں جانور اِس شکل کا اور فلاں اُس شکل کا ہوتا تھا۔ ڈاکٹر مورس نے اس کو بھی درست تسلیم کیا۔

پھر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے کہا کہ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ حضورؐ نے اونٹ کا پیشاب پینے کا حکم دیا، حالانکہ شریعت نے پیشاب کو ناپاک کہا ہے۔ بالکل صحیح ہے۔ یہ حیوانی بدن کا مسترد کردہ مواد ہے۔ یہ بھی درست ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں بطور ایک عام آدمی (layman) کے یہ سمجھتا ہوں کہ بعض بیماریوں کا علاج تیزاب سے بھی ہوتا ہے۔ دواؤں میں کیا ایسیڈ شامل نہیں ہوتے۔ جانوروں کے پیشاب میں کیا ایسیڈ شامل نہیں ہوتا۔ ہوسکتا ہے کہ بعض علاج جو آج خالص اور آپ کے بقول پاک ایسیڈ سے ہوتا ہے تو اگر عرب میں اس کا رواج ہو کہ کسی نیچرل طریقے سے لیا ہوا کوئی ایسا لیکویڈ جس میں تیزاب کی ایک خاص مقدار پائی جاتی ہو، وہ بطور علاج کے استعمال ہوتا ہو تو اس میں کونسی بات بعید از امکان اور غیر سائنسی ہے۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آج سے کچھ سال پہلے میں نے ایک کتاب پڑھی تھی۔ ایک انگریز سیاح تھا جو پورے جزیرہ عرب کی سیاحت کرکے گیا تھا۔ اس کا نام تھا ڈاوٹی۔ 1924 -25 -26 میں اس نے پورے عرب کا دورہ کیا تھا اور دو کتابیں لکھی تھیں جو بہت زبردست کتابیں ہیں اور جزیرہ عرب کے جغرافیہ پر بڑی بہترین کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ ایک کا نام **Arabia Deserta** اور دوسرے کا نام **Arabia Petra** ہے۔ یعنی جزیرہ عرب کا صحرائی حصہ اور جزیرہ عرب کا پہاڑی حصہ۔ انہوں نے کہا کہ اس شخص نے اتنی کثرت سے یہاں سفر کیا

ہے۔ یہ اپنی ایک یادداشت میں لکھتا ہے کہ جزیرہ عرب کے سفر کے دوران ایک موقع پر میں بیمار پڑ گیا۔ پیٹ پھول گیا، رنگ زرد پڑ گیا اور مجھے زرد بخار کی طرح کی ایک بیماری ہو گئی جس کا میں نے دنیا میں جگہ جگہ علاج کروایا لیکن کچھ افاقہ نہیں ہوا۔ آخر کار جرمنی میں کسی بڑے ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ جہاں تمہیں یہ بیماری لگی ہے وہاں جاؤ۔ ممکن ہے کہ وہاں کوئی مقامی طریقہ علاج ہو یا کوئی عوامی انداز کا کوئی دیسی علاج ہو۔ کہتے ہیں کہ جب میں واپس آیا تو جس بدو کو میں نے خادم کے طور پر رکھا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا تو پوچھا کہ یہ بیماری آپ کو کب سے ہے۔ میں نے بتایا کہ کئی مہینے ہو گئے اور میں بہت پریشان ہوں۔ اس نے کہا کہ ابھی میرے ساتھ چلئے۔ مجھے اپنے ساتھ لے کر گیا اور ایک ریگستان میں اونٹوں کے باڑے میں لے جا کر کہا کہ آپ کچھ دن یہاں رہیں اور یہاں اونٹ کے دودھ اور پیشاب کے علاوہ کچھ نہ پئیں۔ چنانچہ ایک ہفتہ تک یہ علاج کرنے کے بعد میں بالکل ٹھیک ہو گیا۔ مجھے بہت حیرت ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے ڈاکٹر مورس سے کہا یہ دیکھئے کہ **1925 - 26** میں ایک مغربی مصنف کا لکھا ہوا ہے۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ یہ سابق طریقہ علاج ہو۔ مورس بکائی نے اپنے دونوں اعتراضات واپس لے لئے اور اس مقالہ کو انہوں نے اپنے دونوں اعتراضات کے بغیر ہی شائع کر دیا۔

یہ واقعہ میں نے اتنی تفصیل سے اس لئے بیان کیا کہ علم حدیث میں ایک نیا پہلو ایسا ہے جو اس کے سائنسی مطالعہ سے عبارت ہے۔ حدیث کی کتابیں سائنسی کتابیں نہیں ہیں۔ حدیث رسول ﷺ کی کتابوں کو سائنس یا طب کی کتاب قرار دینا ان کا درجہ گھٹانے کے برابر ہے۔ حدیث پاک کا درجہ ان تجرباتی انسانی علوم سے بہت اونچا ہے۔ حدیث میں جو بیانات ہیں یہ سارے کے سارے زبان رسالت سے نکلے ہوئے ہیں۔ اس لئے ان کو سائنس یا طب کی قرار دینا تو بے ادبی ہے۔ البتہ ان کتابوں میں جو بیانات سائنسی اہمیت رکھتے ہیں ان کی روشنی میں سائنس کا مطالعہ مفید ہوگا۔ سائنسدان اگر اس پر تحقیق کریں گے تو سائنس کے نئے گوشے ان کے سامنے آئیں گے۔ یا کم از کم ان کے ایمان اور عقیدہ میں پختگی آسکتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آج سے چودہ سو سال پہلے جو بات فرمائی تھی وہ آج بھی سائنس کے میزان پر پوری اترتی ہے۔ اگر سائنس کے طلبہ اس نقطہ نظر سے علم حدیث کا مطالعہ کریں گے تو بہت سی نئی چیزیں ان کے سامنے آئیں گی۔

احادیث میں سابقہ کتب کا ذکر

علم حدیث کا کچھ اور لوگوں نے نئے انداز سے مطالعہ شروع کیا ہے جس پر ابھی کام کا آغاز بھی صحیح معنوں میں نہیں ہوا۔ وہ یہ کہ بہت سی احادیث میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ سابقہ کتابوں کے حوالے ہیں کہ توراۃ میں یہ آیا ہے، انجیل میں یہ آیا ہے، فلاں کتاب میں یہ آیا ہے، سابقہ کتابوں میں یہ آیا ہے۔ آج ان کتابوں میں وہ حوالہ نہیں ملتا۔ اس سے مطالعہ مذاہب کا اور مذاہب کی تاریخ پر کام کرنے کا ایک نیا راستہ کھلتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے وحی کی بنیاد پر سابقہ کتابوں کے مندرجات پر جو باتیں ارشاد فرمائیں وہ کس حد تک آج کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں اور نہیں پائی جاتیں تو اس کے اسباب کیا ہیں۔ اس سے پتہ چل جاتا ہے کہ ان کتابوں میں انحراف یا تبدیلی ہوئی تو کہاں کہاں ہوئی اور کن راستوں سے ہوئی۔ اس سے سابقہ کتابوں کے مطالعہ کی ایک نئی جہت ہمارے سامنے آتی ہے۔

اسی طرح سے مطالعہ مذاہب میں حدیث کے ذریعے وہ گوشے بھی سامنے آتے ہیں جن میں مذاہب کی وہ تعلیمات جو اللہ تعالیٰ اور انبیاؑ کی طرف سے تھیں، مذاہب کے ماننے والوں کی تحریفات اور ملاوٹوں سے پہلے جو تعلیمات تھیں، ان کا واضح پتہ احادیث سے چلتا ہے۔ مثلاً توراۃ میں یہ تھا، بائبل میں یہ تھا، فلاں پیغمبر کی تعلیم میں یہ تھا، فلاں پیغمبر کی تعلیم میں یہ تھا۔ اس سے دنیا کی دوسری اقوام کے سامنے بھی مطالعہ کی ایک نئی جہت روشن ہوتی ہے۔ جس سے وہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

مسلمانوں میں جو اجتماعی علوم پیدا ہوئے۔ سوشل سائنسز پیدا ہوئے، تاریخ کا فن پیدا ہوا، ریاست اور معاشرت کے مطالعہ کا فن پیدا ہوا۔ اس میں بہت بڑی مدد علم حدیث سے آج مل سکتی ہے۔ علم حدیث ایک نئی تہذیب کا منادہ ہے۔ علم حدیث نے ایک نئی تہذیب کو جنم دیا جس کی بنیاد تعلیم، فکر اور مطالعہ پر تھی جس کے کچھ نمونے آپ نے دیکھے۔ علم حدیث نے علم تاریخ کو ایک نئی جہت سے نوازا۔ اسلام سے پہلے ہسٹوریوگرافی یا تاریخ نویسی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اسلام نے پہلی مرتبہ علم حدیث کے ذریعے انسان کو یہ پیغام دیا کہ سابقہ اقوام کے بارے میں معلومات او رتاریخ کو جمع کرنے کے لئے کتنی احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ یہ وہ چیز ہے جس کی بنیاد پر

مسلمانوں نے ایک نیا فن تاریخ مرتب کیا۔ ابن خلدون اور امام سخاوی کا میں نے ذکر کیا تھا جو ہسٹوریوگرافی میں ایک نئی جہت اور ایک نئے اسلوب کو شروع کرنے والے ہیں۔ یہ وہ نئے میدان ہیں جو علم حدیث کے مطالعہ کے راستے ہمارے سامنے کھولتے ہیں۔

بیسویں صدی میں علم حدیث کے نئے مجموعے بھی مرتب ہوئے۔ نئے مجموعے ہر دور میں مرتب ہوتے رہے ہیں۔ جیسے جیسے انسانوں کے مسائل بڑھتے جائیں گے، نئے نئے مسائل پیش آتے جائیں گے، ان کو علم حدیث کے موضوعات کو نت نئے طریقوں سے مرتب کرنے کی ضرورت پیش آتی جائے گی۔

ان میں سے کون سے مجموعے قابل ذکر ہیں ان کا حوالہ دینا بھی بڑا دشوار ہے۔ اس لئے کہ وہ لاتعداد ہیں۔ ان کی فہرست بھی بیان کرنا مشکل ہے۔ بیسویں صدی میں مختلف زبانوں میں انگریزی، اردو، فارسی، فرانسیسی، عربی، ترکی اور جرمن زبانوں میں مرتب ہوئے اور انہوں نے ہزاروں لاکھوں انسانوں تک علم حدیث کے ذخائر اور معلومات کو پہنچایا۔

نئے انداز سے کام کرنے کی راہیں

آج جو نئے اور قابل ذکر مجموعے مرتب ہو رہے ہیں اور جن پر کام کرنے کی ضرورت ہے وہ نئے مسائل کے بارے میں ہیں۔ مثال کے طور پر آج معیشت نئے انداز سے مرتب ہو رہی ہے۔ حدیث نبوی کی بنیادی کتابوں میں اور احادیث نبوی کے ذخائر میں ہزاروں ایسے ارشادات اور ہدایات موجود ہیں جن کا انسان کی انفرادی اور اجتماعی معاشی زندگی سے، یعنی **Micro Economics** اور **Macro Economics** پہلو سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ بعض حضرات نے بعض ایسے مجموعے مرتب کئے ہیں۔ محمد اکرم خان صاحب ہمارے ایک دوست ہیں۔ انہوں نے علم حدیث کے ذخائر کو تلاش کر کے وہ احادیث دو جلدوں میں یکجا کی ہیں جو معاشیات سے متعلق ہیں۔ لیکن ابھی اس پر طویل کام کی ضرورت ہے۔ نئے نئے مجموعے جو اب شائع ہوئے ہیں ان کو کنگھال کر اس مواد کو ایک ساتھ کرنے کی ضرورت ہے۔

آج سے کچھ سال پہلے ایک شخص نے یہ کام کیا تھا کہ علم حدیث کے تمام بنیادی مآخذ سے کام لے کر وہ تمام احادیث جمع کی تھیں جن کا تعلق ریاست اور حکومت سے ہے۔ تو اتنا

بڑا ذخیرہ تیار ہوا کہ جس میں سینکڑوں بلکہ شاید ہزاروں احادیث موجود ہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ ریاست اور ریاستی اداروں سے متعلق ہیں۔ بظاہر علم حدیث کی کتابیں آپ پڑھیں تو سو سو احادیث میں مشکل سے ایسی حدیث ملے گی جس کا تعلق حکومت اور ریاست سے ہو۔ لیکن ان سارے مجموعوں کا جائزہ لیا گیا تو اتنی تعداد میں احادیث دستیاب ہوئیں جن سے کئی جلدیں مرتب ہوسکتی ہیں۔ بقیہ موضوعات کا آپ خود اندازہ کرلیں۔

تہذیب وتمدن کی اساس کس بنیاد پر بنتی ہے۔ قوموں کا عروج وزوال کیسے ہوتا ہے۔ سابقہ محدثین نے اپنی کتابیں مرتب کرتے وقت اپنے سامنے یہ موضوعات نہیں رکھے۔ انہوں نے اپنے زمانہ اور اپنی ضروریات کے لحاظ سے عنوانات تجویز کئے اور موضوعات رکھے۔ لیکن سارے موضوعات کو اس طرح سے **Re-arrange** کریں تو نئے نئے علوم وفنون سامنے آئیں گے۔ اس لئے نئے انداز سے علم حدیث کے مجموعے مرتب کرنے کی ضرورت ہے جن میں آج کے دور کے تہذیبی، تمدنی، سیاسی، معاشی، اجتماعی، اخلاقی اور روحانی ضروریات کے مطابق ابواب کی ترتیب اور مضامین کی تقسیم کی جائے اور یوں مجموعے مرتب کئے جائیں۔

ابتدائی صدیوں میں جب اسلام کے عقائد پر فقہائے اسلام اور متکلمین اسلام کام کررہے تھے، تو اسلام کے عقائد پر جو اعتراضات یا حملے یونانیوں کی طرف سے ہورہے تھے یا جو شبہات ایرانی اور ہندوستانی فلاسفہ سے آگاہ لوگ بیان کررہے تھے، ان اعتراضات کا جواب علما اور متکلمین نے احادیث کی روشنی میں دیا۔ آج اسلام اور اسلام کے عقائد پر وہ اعتراضات نہیں ہورہے ہیں۔ قدیم یونانی فلسفہ ختم ہوگیا، قدیم ایرانی اور ہندوستانی تصورات دنیا سے مٹ گئے۔ آج نئے انداز سے حملے ہورہے ہیں۔ آج اسلامی عقائد اور تعلیمات پر مغربی نظریہ علم کے حوالہ سے اسلام پر اور ہی انداز کے اعتراضات ہورہے ہیں۔ آج مغربی نفسیات نبوت پر اعتراض کررہی ہے۔ آج کی سائکالوجی نبوت کو بطور ماخذ علم نہیں مانتی۔ وحی کو بطور مصدر علم نہیں مانتی۔ لہٰذا آج علم حدیث کے ذخائر کو اس انداز سے مرتب کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلام کا فلسفہ علم اور نظریہ معرفت مکمل طور پر ہمارے سامنے آجائے۔ جو اعتراضات اسلام کے عقائد پر ہورہے ہیں ان کا جواب ان احادیث کے ذریعے سامنے آجائے۔

اسی طرح سے علم حدیث میں آپ نے دیکھا ہوگا۔ حدیث کی کوئی بھی کتاب آپ

اٹھا کر دیکھ لیں اس میں سابقہ انبیاؑ اور ان کے واقعات کا ذکر ہے۔ سابقہ اقوام کا ذکر ہے۔ انبیاءؑ کے معاصر، ان کے ماننے والے اور انکار کرنے والے دونوں کے تذکرے ملتے ہیں۔ آج کل کے مستشرقین فن تاریخ کے نقطۂ نظر سے، آرکیالوجی کے نقطۂ نظر سے اور آثار قدیمہ کے نقطۂ نظر سے ان پر اعتراضات کر رہے ہیں۔ ان اعتراضات کا جواب بھی حدیث کی کتابوں میں مل جاتا ہے۔ لیکن ان احادیث میں ان جوابات کو سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے نئی ترتیب درکار ہے۔ نئے مجموعے مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ وہ چند مثالیں ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ نئے انداز سے احادیث کے نئے مجموعوں کی ضرورت پیش آتی رہے گی۔ مآخذ یہی قدیم کتابیں اور یہی ذخائر رہیں گے جو ائمہ اسلام نے 458ھ تک مرتب کر کے ہمیں دے دیئے تھے۔ پانچویں صدی ہجری تک جو مجموعے مرتب ہو گئے وہ تو بنیادی ماخذ ہیں، وہ تو ایک طرح سے **Power Houses** ہیں جہاں سے آپ کو **Connection** ملتا رہے گا۔ لیکن اس کنکشن سے آپ نئی نئی مشینیں چلائیں، نئے نئے کام کریں، نئے نئے انداز سے روشنی پیدا کریں، نئے نئے راستے روشن کریں۔ یہ کام ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ وہ پاور ہاؤس اپنی جگہ موجود رہیں گے۔

جس طرح سے متن حدیث کو نئے انداز سے مرتب کرنے کی ضرورت ہے اسی طرح علم حدیث کی نئی شرحیں لکھنے کی بھی ضرورت ہے۔ پرانی شرحیں پرانے سیاق وسباق میں ہیں۔ نئی شرحیں نئے سیاق وسباق میں ہوں گی۔ ان میں جو پرانی شرحیں ہیں ان کو نئے انداز سے پیش کرنے کا کام بھی ہوگا اور نئے مسائل کی نئی شرحیں اور نئے اعتراضات کے نئے جواب بھی ہوں گے۔ پرانے اعتراضات کے پرانے جواب بھی ہوں گے اور پرانے اعتراضات کے نئے جواب بھی ہوں گے۔ یہ ایک نئی دنیا ہے جس پر ابھی کام کا شاید آغاز بھی نہیں ہوا ہے اور اگر آغاز ہوا ہے تو محض آغاز ہی ہے۔ ابھی تو محض پہلا قدم اٹھایا گیا ہے۔ کتنے دن اور کتنے سال یہ عمل چلے گا ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔

تدوین حدیث غیر مسلموں کے لئے

پھر ایک نئی چیز جو علم حدیث میں کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے تمام سابقہ مآخذ جو

حدیث کی شرحوں اور تفاسیر سے متعلق ہیں ان میں جو خطاب ہے وہ مسلمانوں سے ہے اور ان مسلمانوں سے ہے جو دین کو جانتے اور مانتے ہیں، ان مسلمانوں سے ہے جو حدیث اور سنت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس لئے شرح لکھنے والا بہت سی چیزوں کے بارے میں یہ فرض کر کے لکھتا ہے کہ یہ پڑھنے والے مانتے ہیں۔ آج کا پڑھنے والا بہت سی چیزوں کو نہیں مانتا۔ بہت سی چیزوں کے بارے میں وہ شک رکھتا ہے۔ نبوت کے ماننے میں اس کو تامل ہے، وحی بطور ذریعہ علم کے قابل قبول ہے کہ نہیں، ابھی اس کو ماننے میں بھی آج کے انسان کو تردد ہے۔ لہٰذا جب آج کے دور میں حدیث کی کوئی شرح بیان کی جائے گی تو ان سوالات کا جواب پہلے دیا جائے گا۔ ماضی کے شارحین جزئیات کا جواب دیا کرتے تھے اس لئے کہ کلیات لوگوں کی نظر میں پہلے سے قابل قبول تھیں۔ اسلامی ادوار میں کلیات کے بارے میں سوالات نہیں ہوتے تھے، صرف جزئیات کے بارے میں سوالات سامنے آتے تھے۔ ان کا جواب قدیم کتابوں میں مل جاتا ہے۔ آج اسلام کے کلیات کو ماننے والے بھی نہیں ہیں جزئیات کو ماننے والے بھی نہیں ہیں۔ تو پہلے کلیات کا جواب دیا جائے گا اور کلیات کے بعد پھر جزئیات کا جواب دیا جائے گا۔ اس طرح سے نئے انداز کی شرحیں، نئے مخاطبین کو سامنے رکھ کر اور نئے مسائل کے لحاظ سے درکار ہوں گی۔

علم حدیث کی کمپیوٹرائزیشن

ایک نیا میدان جو علم حدیث کے باب میں سامنے آیا ہے اور جس پر بڑا کام ہوا ہے لیکن ابھی نامکمل ہے۔ وہ حدیث کی کمپیوٹرائزیشن ہے۔ حدیث کی کمپیوٹرائزیشن پر کئی جگہ کام ہو رہا ہے۔ آج سے بیس سال پہلے لندن میں ایک ادارہ قائم ہوا تھا **Islamic Computing Centre** کے نام سے بنا تھا۔ میں نے بھی اس کا دورہ کیا۔ وہاں کے ایک صاحب یہاں پاکستان بھی آئے تھے۔ اس زمانے میں صدر ضیاء الحق صاحب سے ملے۔ اس کے بعد سعودی عرب میں یہ کام شروع ہوا۔ اس دور کے ایک فاضل رجل ڈاکٹر مصطفےٰ اعظمی بھی یہ کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح سے مصر اور کئی دوسرے علاقوں میں یہ کام شروع ہوا اور بڑے پیمانے پر اس کام کے نمونے سامنے آئے ہیں، سی ڈیز سامنے آئی ہیں۔

میرے اپنے استعمال میں ایک ایسی سی ڈی ہے جس میں حدیث کی پندرہ بیس کتابوں

کوسمو دیا گیا ہے۔ اس میں تمام صحاح ستہ، مسند امام احمد اور حدیث کی دوسری بڑی کتابیں موجود ہیں اور کمپیوٹر کے ذریعے چند منٹ میں آپ کے سامنے آسکتی ہیں۔ چھوٹی سی سی ڈی جیب میں رکھیں اور کہیں بھی کمپیوٹر کے ذریعے اس کو دیکھیں۔ یہ ایک مفید چیز ہے۔ لیکن ابھی حدیث کے متون بھی سارے کے سارے کمپیوٹرائز نہیں ہوئے۔ حدیث کی چند کتابیں ہی کمپیوٹرائز ہوئی ہیں۔ یہ سارے بنیادی مآخذ جو بیسویں صدی میں شائع ہوئے یا اس سے پہلے شائع ہوئے لیکن زیادہ متداول نہیں تھے وہ سارے کے سارے کمپیوٹرائز ہونے باقی ہیں۔

لیکن اس سے بھی زیادہ جو مشکل کام ہے وہ رجال کی کمپیوٹرائزیشن کا کام ہے۔ چھ لاکھ افراد کے بارے میں تفصیلات، معلومات کے اس تمام ذخیرے کے ساتھ جو علمائے رجال اور جرح وتعدیل کے ائمہ نے جمع کیا ہے. اس کو کمپیوٹرائز کرنا انتہائی اہم، مشکل اور لمبا کام ہے۔ اس کے لئے ایک نئے سافٹ وئر کی ضرورت ہے۔ وہ سافٹ وئیر وہ آدمی بنا سکتا ہے جو خود بھی محدث ہو۔ علم حدیث بھی جانتا ہو اور پروگرامنگ بھی جانتا ہو۔ اگر علم حدیث نہ جانتا ہو تو شاید اس کے لئے سافٹ وئیر بنانا بہت مشکل ہوگا۔ مثال کے طور پر میں نے عرض کیا تھا کہ بعض محدثین تعدیل اور تجریح میں متشدد ہیں۔ بعض متساہل ہیں اور بعض معتدل ہیں۔ تو ان تینوں کو الگ الگ نمبر دینا ہوگا۔ متساہل کا کوڈ الگ ہوگا، متشدد کا الگ اور معتدل کا الگ ہوگا۔ پھر متشددین میں لوگوں کے درجات ہیں ان کو اسی سطح پر رکھنا ہوگا۔ اس کے لئے کمپیوٹر میں سافٹ وئیر کی تیاری کی ضرورت ہے۔ جب یہ سارا کام ہو جائے تو پھر اس کی مدد سے رجال کے سارے ذخیرے کو ایک نئے انداز سے دیکھنا پڑے گا۔ مثلاً علم حدیث میں رجال میں ایک اصطلاح 'مدار سند' استعمال ہوتی ہے۔ مدار سند اس کو کہتے ہیں کہ ایک محدث تک ایک حدیث مختلف راویوں اور مختلف سندوں سے پہنچی لیکن اوپر جا کر درمیان میں راوی ایک ہی ہے۔ پھر آگے چل کر اسی ایک راوی سے آگے بات بنتی ہے۔ اس کو مدار سند کہتے ہیں۔ مدار سند اگر کمزور ہیں تو سند کے بقیہ حصوں میں اگر اونچے سے اونچے راوی بھی موجود ہوں تو وہ irrelevant ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ مدار سند سے آگے بات کمزور ہے تو اگر نیچے کی سطح پر لوگ بہت مستند بھی ہیں تو بھی ان کا مستند ہونا کوئی خاص فائدہ نہیں رکھتا۔ مدار سند اگر مضبوط ہے تو پھر ان لوگوں کی مضبوطی بہت فائدہ دے گی۔ اس لئے مدار سند کی بہت اہمیت ہے۔ مدار سند کا پتہ غیر معمولی یادداشت اور طویل مطالعہ سے ہی چل سکتا ہے۔

میرا کافی عرصہ سے یہ خیال ہے کہ کمپیوٹرائزیشن سے مدار سند کا تعین کرنا شائد آسان ہو جائے۔ اس لئے کہ کمپیوٹر میں آپ حدیث کی ہر سند کو فیڈ کر دیں گے اور فیڈ کرنے کے بعد یہ معلوم ہو جائے گا کہ وہ نام کہاں کہاں مشترک ہے۔ کمپیوٹر سے پتہ چل جائے گا کہ مدار سند کون ہے اور کہاں کہاں وہ مدار سند ہے۔ یہ تو کمپیوٹر والے ہی بتا سکتے ہیں کہ مدار سند کے لئے کیا کچھ کرنا پڑے گا، اس کا سافٹ وئیر کیسے بنایا جاسکتا ہے۔

اسی طرح سے جرح وتعدیل کا مواد جو لاکھوں صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں سے انتخاب کرنا، اس کا درجہ متعین کرنا، پھر اس کو فیڈ کر کے اس کے نتائج کمپیوٹر سے معلوم کئے جائیں۔ پھر حدیث کا ضعف، صحت اور حسن میں جو درجہ ہے، یہ سارا کام کمپیوٹرائزیشن کے ساتھ ابھی ہونا باقی ہے اور اس میں وقت لگے گا۔ جب ایسے ماہرین سامنے آئیں گے جو حدیث کے علوم سے بھی اچھی طرح واقفیت رکھتے ہوں اور کمپیوٹر میں کم از کم سافٹ وئیر بنانے کے بھی ماہر ہوں تو وہ اس کام کو کر سکتے ہیں۔

انکار حدیث کا مقابلہ

علم حدیث پر بیسویں صدی میں جو کام ہوئے ہیں ان میں ایک بڑا موضوع فتنہ انکار حدیث کی تردید کا رہا ہے۔ انکار حدیث پر منکرین حدیث نے زور وشور سے جو کچھ لکھا ہے وہ بیسویں صدی ہی میں لکھا ہے۔ اس سے پہلے اکا دکا لوگوں کی طرف سے بہت تھوڑا سا لکھا گیا ہے جس کا زیادہ اثر نہیں تھا۔ بیسویں صدی میں لوگوں نے اتنے زور وشور سے انکار حدیث پر لکھا کہ بہت سے لوگ اس سے متاثر ہو گئے۔ اور مسلمانوں کی بھی ایک بڑی تعداد اس گمراہی سے متاثر ہو گئی۔ اس لئے علم حدیث پر لکھنے والوں کا ایک میدان یہ بھی تھا کہ منکرین حدیث اور مخالفین حدیث کے اعتراضات کو دور کیا جائے۔ لیکن حدیث کے مخالفین بھی بڑے باہمت لوگ ہیں اور بڑے حوصلے والے ہیں۔ ایک اعتراض کا جواب ملتا ہے تو دوسرا داغ دیتے ہیں، اس کا جواب ملتا ہے تو پھر تیسرا پھر چوتھا اور پانچواں۔ اس حوصلہ مندی کے ساتھ تھوڑے سے بے حیا اور ڈھیٹ بھی معلوم ہوتے ہیں۔ بہت سے ایسے اعتراضات جن کا جواب دیا جا چکا، ان کو اس خیال سے دوبارہ ناواقف لوگوں کے سامنے دہراتے رہتے ہیں کہ شاید اس شخص کو وہ جواب معلوم نہ ہو۔ اگر

آپ کو وہ جواب معلوم ہو اور آپ متاثر نہ ہوں تو وہ کسی اور کے سامنے وہی بات دوہرا دیتے ہیں۔ وہ تسلسل کے ساتھ ایک ہی بات کو بار بار دہراتے رہتے ہیں۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان جوابات کو بھی بار بار بیان کیا جائے۔ اور ان غلط فہمیوں کی بار بار تردید کی جائے۔

علم حدیث پر انیسویں صدی کے وسط میں جو بنیادی اعتراض کئے گئے تھے ان سب کی اصل بنیاد یہ غلط فہمی تھی کہ ذخیرہ احادیث تاریخی طور پر ثابت شدہ نہیں ہے اور غیر مستند ہے۔ اس غلط فہمی کی تو اچھی طرح وضاحت ہوگئی۔ اب اس اعتراض کو نہیں دوہرایا جاتا اور جو لوگ اس اعتراض کو دوہراتے ہیں وہ کم پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ کوئی ذمہ دار مستشرق یا پڑھا لکھا منکر حدیث اب حدیث کی تاریخی سندوں کو نشانہ نہیں بناتا۔ لیکن ہمارے یہاں بعض کم علم لوگ ابھی تک اسی لکیر کو پیٹ رہے ہیں۔

اب دوسرے اعتراضات جو بعض لوگ آج کل علم حدیث پر کرتے ہیں، وہ حدیث کے مندرجات پر ہو رہے ہیں۔ کچھ لوگ نیک نیتی سے کرتے ہیں جس کی دو مثالیں میں نے مورس بکائی کی دیں۔ کچھ لوگ کم فہمی سے اور کچھ ویسے ہی کرتے ہیں۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان سب اعتراضات کا علمی انداز میں جائزہ لے کر ان کا جواب دیا جائے۔ میں اعتراضات کا جواب دینے کے اس طریقے کو صحیح نہیں سمجھتا کہ پہلے آپ اعتراض نقل کریں اور پھر اس کا جواب دیں۔ آپ اصل بات کو اس طرح بیان کریں کہ اعتراض پیدا ہی نہ ہو۔ یہ زیادہ دیرپا اور زیادہ موثر طریقہ ہے۔ اعتراضات بیان کر کے ان کا جواب دینا صحیح طریقہ نہیں ہے۔

علم حدیث پر بعض اعتراضات ایسے ہیں جو کم فہمی یا علم حدیث کی اہمیت سے ناواقفیت کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ اس طرح کے اعتراضات آج سے نہیں بلکہ شروع سے ہو رہے ہیں۔ سنن ابوداؤد میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک روایت ہے۔ کہ ان ؓ سے کسی یہودی نے بڑے طنز و استہزا اور مذاق سے پوچھا کہ کیا تمہارے رسول تمہیں ہگنے موتنے کا طریقہ بھی بتاتے ہیں۔ انہوں ؓ نے کہا کہ ہاں، بتاتے ہیں۔ آپ ؐ نے بتایا کہ استنجا کرو تو اس طرح کرو وغیرہ۔ انہوں ؓ نے اس پر کوئی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا، نہ ناپسندیدگی ظاہر کی اور اس کے طنز کو طنز کے طور پر نہیں لیا اور کہا کہ ہمارے پیغمبر ہمیں ہر اچھی بات سکھاتے ہیں۔ حدیث رسول پر اعتراض کرنے کی جو ذہنیت ہے یہ یہودی ذہنیت ہے۔ یہ حضرت سلمان فارسی ؓ کے زمانے سے آج تک

چلی آرہی ہےاور ہر زمانے میں یہودی اس طرح کے سوالات کرتے رہے ہیں۔ یہ ان تمام لوگوں کی ذمہ داری ہے جو حدیث کا علم رکھتے ہیں یا اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو علم حدیث سے دلچسپی عطا فرمائی ہےاور جن کواللہ تعالیٰ نےعلم حدیث کادفاع کرنے کی توفیق عطافرمائی ہے۔

یہ چند باتیں تھیں جن کو میں آج کہنا چاہتا تھا۔ میں آپ کاشکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے یہ موقع عنایت فرمایا۔ دعا کریں کہ جوکچھ میں نے یہاں کہااللہ تعالیٰ اس کواخلاص سے کہنے کی توفیق کے ساتھ ساتھ اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ جوکچھ کہااس پر مجھے بھی عمل کرنے کی توفیق عطافرمائے اور آپ کوبھی عمل کرنے کی توفیق عطافرمائے۔ جوغلطیاں ہوئی ہوں ان کواللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔ جوصحیح بات ہوئی ہواس کوقائم ودائم رکھے۔

☆☆☆☆☆

چہرے کا پردہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک نہیں ہے۔ باقی ائمہ کرام کا اس بارے میں کیا خیال ہے۔

دیکھئے، چہرے کے پردے کے بارے میں شروع سے ایک گفتگو چلی آرہی ہے جس میں صحابہ اور تابعین کے زمانے سے یہ بحث ہورہی ہے۔قرآن پاک کی جس آیت میں آیا ہے کہ پردہ کرو، اس میں آیا ہے کہ 'الاماظھر منھا' سوائے اس کے کہ جو ظاہر ہو۔ فقہا، محدثین، صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کی ایک بہت بڑی تعداد کا کہنا یہ ہے کہ الاماظھر منھا یعنی سوائے اس کے کہ جو ظاہر ہوجائے، اس میں جسم کی ساخت اور قد وقامت شامل ہے جس کو نہیں چھپایا جاسکتا۔ جب ایک خاتون نکل کر کہیں جائے گی تو لوگ دیکھ لیں گے کہ دبلی ہے، پتلی ہے، موٹی ہے بھاری ہے تو یہ ظاہر ہوجائے گا اور جسم کی ساخت کا بھی اندازہ ہوجائے گا تو یہ تو نہیں چھپایا جاسکتا۔ اس لئے اس میں یہ شامل ہے باقی سب چیزیں چھپانی چاہئیں۔

کچھ اور حضرات کا کہنا ہے کہ اِس میں جسم کے وہ اعضاء بھی شامل ہیں جن کو بعض اوقات کھولنا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً کسی کام کے لئے خاتون جارہی ہے، سفر پر جارہی ہے تو ہاتھ کھلا ہوگا، پاؤں کھلے ہوں گے، کسی مزدوری کے لئے ضرورت پڑگئی تو ہاتھ کھولنا پڑے گا۔ اس میں کچھ لوگ چہرہ کھولنے کو بھی شامل سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ چہرہ کا پردہ واجب ہے کہ نہیں اس میں تو اختلاف شروع سے چلا آرہا ہے۔ اس لئے کچھ لوگ جو چہرے کے پردے کو لازمی سمجھتے ہیں ان میں ہمارے امام احمد بن حنبل اور سعودی علما شامل ہیں۔ وہ ہر حال میں چہرے کے پردے کو لازمی سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ چہرے کا پردہ عام حالات میں تو کرنا چاہئے لیکن اگر کسی خاتون کو کوئی ناگزیر ضرورت ایسی پیش آجائے جس میں اسے وقتی یا مستقل طور پر چہرہ کھولنے پر مجبور ہو تو چہرہ، ہاتھ اور پاؤں کھولنے کی اجازت ہے۔

تیسرا نقطۂ نظر یہ ہے جو مجھے بھی ذاتی طور پر دلائل وغیرہ دیکھ کر درست معلوم ہوتا ہے لیکن آپ کا جو جی چاہے وہ آپ اختیار کریں۔ وہ ہے کہ چہرے کا ڈھکنا تو افضل اور عزیمت ہے لیکن کھولنے کی اجازت ہے۔ چہرہ کھولنا رخصت ہے۔ اگر وہ خاتون یہ سمجھتی ہیں کہ چہرہ نہ کھولنے سے اس کے لئے مشکلات ہیں تو وہ کھول سکتی ہیں۔ اور یہ مسائل بعض اوقات یورپ اور دیگر مغربی ممالک میں پیش آتے ہیں۔ جہاں ہماری بہت سی بہنوں کی نوکری کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اور باہر جانا پڑتا ہے۔ وہاں کے ماحول میں ان کو سر ڈھانکنے کی اجازت بھی بڑی مشکل سے ملتی ہے تو

چہرے کے ڈھانکنے کی پابندی بھی اگر لازم کردی جائے تو ان کے لئے شاید مشکل ہو جائے۔اس لئے جہاں حالات ناگزیر یا مشکل ہوں تو وہ میرے خیال میں چہرہ کھول سکتی ہیں۔

آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا..................

میں اسلامی یونیورسٹی میں پڑھاتا ہوں۔وہاں استاد ہوں۔

کیامارٹ گیج (رہن) پر گھر لیناسود کے زمرے میں آتا ہے۔

مارٹ گیج کی بھی بعض شکلیں جائز ہیں بعض ناجائز ہیں۔جب تک اس کی تفصیلات کا مجھے پتہ نہ ہو کہ اس کی شرائط اور تفصیلات کیا ہیں، اس وقت تک کچھ کہنا مشکل ہے۔بعض چیزیں اس میں جائز ہوتی ہیں بعض ناجائز ہوتی ہیں۔

مسلکوں کے حوالہ سے کئی سوالات ایک ساتھ آئے ہیں۔

ہم لوگ اپنے آپ کو حنفی، مالکی یا شافعی کہتے ہیں۔تو یہ امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی اپنے آپ کو کیا کہتے تھے۔مسلم کہتے تھے یا کچھ اور۔

لوگ ایک حدیث بیان کرتے ہیں کہ جو جماعت سے باہر ہو وہ دین سے باہر ہوا۔کیا اس کا مطلب کسی امام کی پیروی کرنے کے حوالے سے ہے۔ہمارے معاشرہ میں کسی امام کی پیروی کے حوالے جو رویہ پایا جاتا ہے اس کا سبب کیا چیز بنی؟ کیا یہ کہنا کہ جس کو صحیح سمجھیں اس کی پیروی کریں' درست رویہ ہوگا۔

کیا ہم ایک ہی کام کے حوالہ سے کئی طریقے اپنا سکتے ہیں۔اگر نہیں تو پھر کیا کریں۔کیا کسی ایک ہی امام کی پیروی ضروری ہے؟

اماموں کے درمیان احادیث کے حوالہ سے جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ اختلافات ہمارے روزمرہ کے معاملات میں ہمارے اعمال کو کس حد تک متاثر کر سکتے ہیں۔

دراصل ہم جس چیز کے پابند ہیں وہ تو اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول کی سنت ہے۔اور یہی شریعت کہلاتی ہے۔اس کے علاوہ قرآن اور سنت نے کسی اور شخص یا کسی اور چیز کی پیروی کرنے کی پابندی نہیں لگائی ہے۔لہٰذا شرعاً نہ امام ابوحنیفہ کی پیروی لازم ہے نہ امام بخاری کی، نہ امام مسلم کی، نہ کسی اہل حدیث کے فقہ کی پیروی شرعاً لازم نہیں ہے۔قرآن وسنت کی پیروی لازم ہے۔لیکن ہر شخص قرآن وحدیث کا اتنا علم نہیں رکھتا کہ وہ ان کی صحیح پیروی کر سکے۔اس لئے جو شخص

علم نہیں رکھتا وہ مجبور ہے کہ وہ جاننے والوں سے پوچھے۔ علم جاننے والوں میں جس کے علم اور تقویٰ پر سب سے زیادہ اعتماد ہو، جس کا علم اور تقویٰ اس درجے کا ہو کہ آپ آنکھیں بند کر کے اس کی بات آپ مان لیں۔ جب یہ ائمہ فقہ اور ائمہ حدیث نے اپنے اپنے یہ اجتہادات مرتب کیے تو بعض حضرات کے ارشادات کتابی شکل میں مرتب ہو گئے۔ ان کے شاگردوں نے بڑی تعداد میں ان کے ارشادات اور فتاویٰ کو پھیلا دیا۔ اس لئے ان کی بات پر عمل کرنا آسان ہو گیا۔ بقیہ فقہا کے اجتہادات اور اقوال مرتب نہیں ہوئے اس لئے ہم تک نہیں آئے۔ مثلاً امام بقی بن مخلد بہت بڑے محدث تھے۔ ان کے خیالات کیا تھے وہ حدیث کی کیسے تعبیر کرتے تھے، وہ آج ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں۔ اس لئے ہم آج امام بقی بن مخلد کے اجتہادات پر عمل نہیں کر سکتے کہ وہ کیا مفہوم بیان کرتے تھے۔ لیکن امام مالک کے اقوال ہمارے سامنے ہیں۔ امام بخاری کے فتاویٰ ہمارے سامنے ہیں۔ اس لئے ان کے بارے میں یقین سے یہ کہنا آسان ہے کہ وہ کس حدیث کی کیا تعبیر کرتے تھے۔ اس لئے جس کے علم اور تقویٰ پر آپ کو اعتماد ہو آپ اس کو اختیار کر لیں۔ لیکن یہ بات کہ ہر آدمی کو یہ حق ہو کہ جزوی مسائل میں پہلے یہ دیکھے کہ کیا چیز میرے لئے آسان ہے۔ اس سے گمراہی اور افراتفری کا راستہ کھلتا ہے۔ اگر صاحب علم دلائل کی بنیاد پر ثابت کرے تو وہ جائز ہے اور ہمیشہ ہوتا رہا ہے اور آج بھی ہو رہا ہے۔ آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ لیکن جو عام آدمی قرآن و حدیث کا علم نہیں رکھتا وہ صرف آسانیاں تلاش کرنا چاہتا ہے تو کتاب کھول کر جو چیز آسان لگے اس کو اختیار کر لے۔ اس سے شریعت کے تقاضے ٹوٹتے ہیں اور متاثر ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر صاحب علم دلائل سامنے لا کر ایسا کرتا ہے تو وہ واقعی ایسا کر سکتا ہے۔ ایک عام آدمی جس کو نہیں معلوم کہ حدیث ضعیف کیا ہے، حدیث موضوع کیا ہے۔ جس کو یہ نہیں معلوم کہ قرآن مجید کی کس آیت کا کیا مفہوم ہے۔ کون سی آیت پہلے نازل ہوئی کونسی بعد میں نازل ہوئی۔ وہ اگر عمل کرنا شروع کر دے تو شائد غلطی کا شکار ہو جائے۔ اس لئے غلطی سے بچنے کے لئے معتبر اور معتمد اصحاب علم پر اعتماد کرنا چاہئے۔

آج علوم حدیث کی آخری کلاس ہے دعا نکلتی ہے دل سے آپ کے لئے۔

اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

المعجم المفہرس جو مستشرقین نے لکھی اس کا محرک کیا تھا۔

میرے خیال میں علمی فائدہ (Academic interest) ان کا محرک تھا۔ بہت سے لوگ خالص علمی جذبہ سے بھی کام کرتے تھے۔ انہوں نے علمی سہولت کے لئے یہ کام کیا۔ یہ ایک اچھا ٹول ہے، ایک اچھا وسیلہ ہے جس سے کام لے کر حدیث کی کتابوں سے استفادہ آسان ہو جاتا ہے۔

ایک اور بہن نے دعا کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے مواقع اور بھی دے۔ آمین

یہ کیسٹ کہاں دستیاب ہو گی؟

مجھے نہیں معلوم۔ اگر الہدیٰ کے لوگوں نے کوئی کیسٹ بنائی ہے تو آپ ان سے پوچھ لیجئے۔

پوچھنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی تقاریر کی اور کیسٹس کہاں دستیاب ہوں گی؟

میری تو ایسی کوئی کیسٹس کسی خاص پتہ پر دستیاب نہیں ہیں۔ نہ میں نے کبھی بنوائی ہیں۔ کسی پروگرام میں اگر کوئی خود ہی بنالے تو میں کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ میری تقریریں اور مواعظ جمع ہوں اور لوگ پڑھیں۔ لیکن اگر اس پروگرام کے کیسٹس بن گئے ہیں تو میری طرف سے آپ کے لئے ہدیہ ہے۔ کوئی نقل کرنا چاہے تو ضرور کرے۔

ابھی علوم حدیث کی بہت سی جہتیں باقی ہیں۔ آپ ضرور رابطہ کریں۔ میں اسلامی یونیورسٹی میں بیٹھتا ہوں جس کا جی چاہے رابطہ کرے۔

آپ نے جو سند بیان کی، کیا اس سند کی ایک کاپی مل سکتی ہے۔

بالکل مل سکتی ہے۔ میں ایک کاپی الہدیٰ میں دے دوں گا۔

ایک اور بہن نے دعا کی ہے، جزاک اللہ

صحیح بخاری کے ابواب میں جو احادیث بیان ہوئی ہیں کیا وہ سب صحیح ہیں؟

جی ہاں وہ سب صحیح ہیں۔ اس میں کوئی حدیث ضعیف یا حسن کے درجہ کی نہیں ہے وہ سب کی سب صحیح ہیں۔

اس بات کی کیا دلیل ہے کہ مثلاً صحیح بخاری وغیرہ کے یہ مجموعے ہم تک بغیر تحریر کے پہنچے ہیں؟

یہ جو بارہ دنوں میں اتنی داستان بیان کی یہی تو بتانے کے لئے بیان کی۔ ہر دور میں ہزاروں انسانوں نے ان کو زبانی یاد کیا، لاکھوں انسانوں نے ایک ایک آدمی کا نام محفوظ کیا جس کے ذریعے یہ ان تک پہنچا ہے۔ ان میں سے ہر آدمی کی تاریخ محفوظ ہے۔ ہر دور کے تحریری

مجموعے موجود ہیں۔ ہر دور کے مخطوطات موجود ہیں۔اس کے بعد اگر یہ ہو کہ یہ مستند نہیں ہیں تو پھر یہ بھی مستند نہیں ہے کہ ہم اسلام آباد میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ممکن ہے یہ ٹوکیو ہو، غلط فہمی سے کسی نے اس کو اسلام آباد کہہ دیا ہو۔

امام بخاری کی مختلف تصانیف مثلاً تاریخ کبیر ،تاریخ......

امام بخاری کی تاریخ کبیر کا اردو ترجمہ موجود نہیں ہے۔اس لئے کہ وہ کتابیں ہیں جن کی ضرورت ماہرین علم اور علما حدیث کو پڑتی ہے سب عربی جانتے ہیں۔علوم حدیث کی وہ کتابیں جو بڑی تکنیکی ہیں مثلاً جرح وتعدیل پر کتابیں، راویوں کے حالات کے بارے میں کتابیں اردو میں زیادہ نہیں، اس لئے کہ ضرورت نہیں پڑتی۔جو لوگ اس سطح تک علم حاصل کر لیتے ہیں وہ عربی جان لیتے ہیں۔تو عربی میں یہ ساری کتابیں ہیں۔کسی اور زبان میں ان کا ترجمہ نہیں ہوا۔

ایک اور بہن نے دعا کی ہے، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

ایک حدیث میں آتا ہے ح

ہاں یہ میں بتانا بھول گیا۔یہ امام مسلم کی اصطلاح ہے۔وہ جب کوئی سند بیان کرتے ہیں تو آگے جا کر وہ سند دو حصوں میں تقسیم ہو جائے، یا آغاز میں دو سندیں ہوں اور اوپر جا کر ایک ہو جائیں تو وہاں امام مسلم تحویل کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں جس کا مخفف ہے 'ح'۔ابھی میں نے عرض کیا تھا کہ مدار سند کسی حدیث کی سند میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔مثلاً چار سندیں امام مسلم سے جا رہی ہیں۔اور ان سب کا ایک مدار سند ہے۔تو امام مسلم جب مدار تک پہنچ جائیں گے تو پھر کہیں گے 'ح'، یعنی تحویل، یعنی میں دوبارہ دہراتا ہوں، و حدثنا سے پھر سند شروع کریں گے، پھر مدار تک آئیں گے، ح، تحویل یعنی **Reversion**، پھر دوبارہ۔یعنی پہلے کے جو چار حصے ہیں وہ بیان کرنے بعد مدار سے آگے چلیں گے۔یہ ح اور تحویل کا مطلب ہے۔اس کو جب پڑھتے ہیں تو ح یا تحویل بھی پڑھ سکتے ہیں۔

اگر ہم میں سے کوئی محدثہ بننا چاہے تو اسے کیا کرنا ہو گا۔

آپ علم حدیث کا مطالعہ شروع کر دیجئے۔جو علم حدیث کا کماحقہ مطالعہ کرتا ہے وہ محدث بن جاتا ہے۔

کیا سیرت البخاری پر کوئی کتابیں لکھی گئی ہیں؟

امام بخاری پر بہت ساری کتابیں لکھی گئی ہیں۔ دو کتابوں کا میں ذکر کروں گا جو مجھے اچھی لگیں۔ ایک کتاب تو 'تذکرۃ المحدثین' دو جلدوں میں ہے۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی ہندوستان کے ایک بزرگ تھے، ان کی لکھی ہوئی ہے۔ ہندوستان میں چھپی تھی۔ وہ آپ دیکھ لیں اس میں بڑے محدثین کا تذکرہ ہے۔ دوسری کتاب ہے جو مدینہ یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے ایک بزرگ ڈاکٹر تقی الدین مظاہری کی لکھی ہوئی ہے۔ اردو میں ہے۔ کتاب کا نام ہے 'محدثین کرام اوران کے کارنامے'۔

ایک اور ہیں ڈاکٹر محمد لقمان السّلفی۔ ہندوستان کے، ان کی بھی تذکرہ محدثین پر ایک کتاب ہے۔

مورس بکائی مسلمان ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنے قبول اسلام کا کوئی بیس سال پہلے اعلان کر دیا تھا۔

کیاامام ابوحنیفہ نے براہ راست حضرت انس کو دیکھا تھا؟

جی ہاں امام صاحب نے حضرت انس کو دیکھا تھا۔ امام ابوحنیفہ اپنے والد کے ساتھ حج کے لئے گئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر تیرہ یا چودہ سال تھی۔ حضرت انسؓ مکہ مکرمہ میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ اور امام ابوحنیفہ بیان کرتے ہیں کہ جب میں حج کے لئے گیا تو مسجد حرام کے باہر ہجوم تھا۔ بہت سے لوگ جمع تھے۔ ہر شخص لپک کر اس ہجوم کے مرکز تک پہنچنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ انہوں نے کسی سے پوچھ کر بتایا کہ صحابئ رسول حضرت انسؓ آئے ہوئے ہیں اور لوگ ان کو دیکھنے کے لئے جمع ہو رہے ہیں۔ تو امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ میں بھی لوگوں کے درمیان سے نکل کر ان تک پہنچ گیا اور میں نے ان کی زیارت کی۔

کیااستخارے میں خواب کا آنا ضروری ہے؟

نہیں استخارے میں خواب کا آنا ضروری نہیں ہے۔ استخارے کے معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے طلب خیر کیا جائے۔ استخارہ کا مطلب ہے خیر طلب کرنا۔ جب آپ کے سامنے دو کام ہوں، دونوں جائز ہوں، یہ نہیں کہ ایک جائز ہو اور ایک ناجائز کہ سود کھاؤں کہ نہ کھاؤں، اور استخارہ کرنے لگے، یہ استخارہ نہیں ہوگا۔ استخارہ وہاں ہوگا جہاں دو جائز کام درپیش ہوں اور انتخاب میں مشکل پیش آ رہی ہو۔ مثلاً مکان خریدنے کا پروگرام ہے۔ دو مکان مل رہے ہیں اور آپ کے لئے

دونوں میں سے ایک منتخب کرنا ہے کہ اچھا کونسا ہے تو استخارہ کرلیں۔ تو پھر اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کریں کہ میرے لئے جو اچھا ہو میرے لئے اس کو آسان کردے۔ تو جو خیر ہوگی اللہ تعالیٰ اس کو آسان کردے گا۔ خواب واب کا آنا کوئی ضروری نہیں ہے۔

شرح بیان کرنے کا طریقہ کب اور کیوں شروع ہوا؟

شرح بیان کرنے کا طریقہ اسی وقت سے شروع ہوا جب احادیث کی تدوین کا کام مکمل ہوا۔ ابھی میں نے امام ابوعیسیٰ ترمذی کی تعلیق آپ کو پڑھ کر سنائی۔ امام ترمذی جب یہ کتاب مرتب کررہے تھے اسی کے ساتھ انہوں نے بعض پہلوؤں کی تشریح کا کام بھی شروع کردیا تھا۔ اسی طرح سے بقیہ محدثین نے بھی تشریح کا کام شروع کردیا۔ پھر جب محدثین اس کام سے فارغ ہوئے تو باقی حضرات نے شرح کا کام بیان کردیا تھا۔ ضرورت اس لئے نہیں پڑی کہ لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ حدیث کا مفہوم کیسے نکالا جائے۔ اس کی تعبیر وتشریح کیسے کریں۔ غلط تعبیر کے راستے کو کیسے روکیں۔ اس لئے ضرورت پیش آئی کہ کتب حدیث کی مستند شرحیں تیار کی جائیں۔

جو شخص علم حدیث کو جانتا ہو، شریعت کا علم رکھتا ہو وہی شرح کرسکتا ہے اس میں رسمی طور پر اجازت دینے یا نہ دینے کا کوئی سوال نہیں۔ مسلمانوں کا مزاج ایسا ہونا چاہئے کہ وہ مستند آدمی ہی کی شرح سے استفادہ کریں اور غیر مستند آدمی کی شرح کو قبول نہ کریں۔ جب غیر مستند آدمی کی شرح کو پذیرائی نہیں ہوگی تو وہ شرح نہیں لکھے گا۔

اللہ تعالیٰ اس ایمان کو تازہ رکھے،

نام تو بیان کرنا دشوار ہے لیکن ویسے اسلامی یونیورسٹی کے نیو کیمپس H-10 میں آپ جائیں تو وہاں ٹینکی کے ساتھ کتابوں کی ایک دکان ہے، اس کے پاس سی ڈی ز ہیں وہاں سے جا کر لے لیں۔

آپ نے بیان کیا کہ اگر ضعیف احادیث پر عمل کرنے والوں کا عمل غیر شرعی نہیں ہے تو ان کو کرنے دیا جائے، مثلاً کسی رات کو نفل پڑھنا جیسے شب معراج اور شب برات کو، تو براہ مہربانی اس بات کو واضح کریں کہ پھر بدعت کی شناخت کیسے کی جائے؟

دیکھئے بدعت وہ ہے جس کی کسی حدیث یا سنت یا حدیث میں یا حدیث کی تعبیر وتشریح میں کوئی اساس نہ ہو۔ لیکن اگر کوئی عمل کسی حدیث کی تعبیر کی وجہ سے ہے وہ تعبیر تو کمزور ہوسکتی ہے اور آپ اس تعبیر کو غلط بھی کہہ سکتے ہیں لیکن اس عمل کو بدعت نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے اگر کوئی حدیث

ایسی ہے جو کمزور ہے، مثلاً اسی ترمذی میں ہے جو میرے سامنے ہے جس میں پندرہ شعبان کو عبادت کرنے کا ذکر ہے لیکن ضعیف حدیث ہے۔ اکثر محدثین اس کو ضعیف سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ حدیث ضعیف ہے اور اس کا ضعف بڑے کمزور درجہ کا ہے۔ جو حضرات سمجھتے ہیں کہ اس کا ضعف کمزور درجہ کا نہیں وہ اس پر عمل کرنے کو جائز سمجھتے ہیں۔ اس لئے جو حدیث پر عمل کرنے کی نیت سے اس کام کو کر رہے ہیں، وہ بدعت نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کوئی پندرہ شعبان کی رات کو عبادت کرتا ہے یا دن کو روزہ رکھتا ہے تو وہ نعوذ باللہ بدعت نہیں ہے۔ لیکن جو پندرہ شعبان کو پھلجڑی چلاتا ہے وہ یقیناً بدعت ہے۔ جو سمجھتا ہے کہ پندرہ شعبان کو حلوہ بنانا ضروری ہے وہ یقیناً بدعت ہے، جو پندرہ شعبان کو چراغاں کرتا ہے وہ یقیناً بدعت ہے کیونکہ اس کو کوئی براہ راست یا بالواسطہ کسی حدیث میں، کسی ضعیف میں بھی کہیں نہیں آیا۔ یہ فرق ہے بدعت اور غیر بدعت میں۔ کسی چیز کا صحیح ہونا، سنت ہونا یا نہ ہونا یہ الگ چیز ہے اور اس کا بدعت ہونا یا نہ ہونا الگ چیز ہے۔

آپ نے کہا جس کے دلائل بہتر ہوں اور جس کو صحیح سمجھتے ہوں اس کی پیروی کریں۔ کیا ہم لوگ، جو ابھی تعلیمی میدان میں مبتدی ہیں، اس قابل ہیں کہ ہم خود فیصلہ کر سکیں کہ فلاں عمل کرنا چاہئے اور فلاں نہیں......

اسی لئے میں نے کہا کہ جواب تک کرتے آئے ہیں وہی کرتے رہیں۔ جواب تک کرتی رہی ہیں وہ کرتی رہئے۔

یہ اسلام کی بڑی خدمت ہوگی اگر آپ سائیکالوجی پڑھ کر اس کی روشنی میں دلائل سے اسلامی عقائد اور نظریات کی تشریح کریں اور بتائیں کہ ان دلائل سے بھی یہ عقائد درست ہیں تو یہ بہت بڑی خدمت ہوگی، آپ ضرور کریں۔

آج کل دم یا قرآن پڑھ کر جادو یا سحر کا علاج کیا جاتا ہے اور اس کے پیسے وصل کئے جاتے ہیں اس بارے میں کچھ بتادیں۔ سورۃ فاتحہ سے ایک سردار کے علاج وغیرہ کا سن کر رقم لینے کی اجازت ہے؟ اگر اس کی اجازت واقعی ہے تو کیا ہم اپنی کلاس سے پیسے وصول کر کے لوگوں کے لئے اس طرح کی کلینک کھول سکتے ہیں؟

میرے خیال میں تو کلینک کھولنے کا راستہ تو بڑا خطرناک ہوگا۔ نہ کلینک کھولیں نہ پیسے

لیں۔صحابہ نے کوئی کلینک نہیں کھولا تھا وہ بعد میں بھی سوسال تک رہے۔110ھ تک صحابہ کرامؓ کا زمانہ ہے کسینے کلینک نہیں کھولا، اس لئے کلینک کھولنا صحابہ کے مزاج کے خلاف ہوگا۔کلینک تو میڈیکل سائنس کی بنیاد پر کھولتے ہیں۔یہ تو ایک صحابیؓ نے اس یقین سے کہ اللہ کی کتاب میں شفا ہے،قرآن پاک میں اس کو شفا کہا گیا کہ فیه شفاء لمافي الصدور،تو اس یقین سے اس کو پڑھ کر پھونک دیا اور اس قبیلہ کے سردار نے ہدیہ کے طور پر کچھ پیسے بھی دے دیئے اور انہوں نے لے لئے۔وہ معاوضہ کی بات نہیں تھی کہ انہوں نے پہلے فیس مقرر کی ہو کہ پانچ سو روپے لیں گے اور پانچ سو روپے لے کر پھونک دیا۔یہ کسی صحابیؓ یا تابعی نے نہیں کیا اس لئے دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

دی بائبل ؛ قرآن اینڈ سائنس کے رائٹر موریس بُکائی Maourice اس کو فرنچ میں موریس پڑھتے ہیں اور بُکائی کے ہجے ہیں Bucaille یہ فرنچ میں بکائی پڑھا جاتا ہے فرنچ میں جہاں بھی ڈبل ایل ای آئے اس کو 'ی' پڑھتے ہیں۔

شوق پیدا ہوا ہے مطالعہ کو جاری رکھنا چاہتی ہوں، کوئی ٹپ بتادیں......

میرے علم میں تو کوئی ایسی ٹپ نہیں ہے لیکن ایک بزرگ تھے آپ نے نام سنا ہوگا مولانا ابوالخیر مودودی، مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کے بڑے بھائی تھے، ان کے پاس میں بہت جایا کرتا تھا اور کتابوں پر تبادلہ خیال ہوتا تھا۔ایک مرتبہ میں ان کے پاس گیا۔میں نے ان سے ایک سوال کیا جو شاید آپ کی دلچسپی کا بھی ہو، اگرچہ اس کا جواب نہیں ملا۔میں نے ان سے پوچھا تھا کہ اب بھی لوگوں سے پوچھتا رہتا ہوں، تلاش بھی کرتا رہتا ہوں، جب یہ پوچھا تھا تو اس کو کوئی بتیس سال ہو گئے ہیں۔1971 میں پوچھا تھا کہ رسول اللہ ﷺ تو جنوں اور انسانوں دونوں کے لئے بھیجے گئے تھے اور جنوں اور انسانوں دونوں کے لئے حضورؐ کے نبی ہونے کا ذکر قرآن پاک میں آتا ہے۔تو انسانوں تو حدیث کے یہ سارے ذخائر جمع کئے، فقہ مرتب کی، اصول حدیث اور اصول فقہ پر کتابیں لکھیں تو کیا جنوں نے بھی ایسا کوئی کام کیا کہ حضورؐ کے سارے ارشادات جمع کئے ہوں؟ یا وہ بھی انسانوں کے کئے ہوئے کے پابند ہیں؟ اگر انسانوں کے کئے ہوئے کے پابند ہیں تو اس کی دلیل کیا ہے؟ یعنی کیوں جنات انسانوں کے فقہ، علم حدیث اور علم جرح وتعدیل کی پیروی کریں؟ یا ان کے اپنے بھی کچھ لوگ ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ بھئی میں نے تو کبھی نہیں

سوچا لیکن کتابوں میں تلاش کرتے ہیں۔ تو انہوں نے مجھے کچھ کتابوں کے نام بتائے جو میں نے دیکھے اور نہیں ملے تو کئی سال بعد جب ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے پوچھا کہ فلاں فلاں کتابیں دیکھی تھیں؟ میں نے کہا جی دیکھی تھیں لیکن ملی نہیں۔ کہنے لگے انڈکس میں دیکھا تھا؟ میں نے کہا کہ جی انڈیکس میں اور فہرست میں۔ تو انہوں نے ایک مشورہ دیا جو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ جب کوئی کتاب پڑھو تو بسم اللہ کی ب سے لے تمت کی ت تک پڑھو۔ تو پہلی ٹپ تو یہ ہے کہ بسم اللہ کی ب سے لے کر تمت کی ت تک پڑھیں۔ دوسری ٹپ یہ ہے کہ روزانہ مطالعہ کے لئے کوئی نہ کوئی وقت ضرور رکھیں۔ ایک دو، تین گھنٹہ، جتنا آپ سہولت سے کرسکیں۔

نماز عصر کا وقت کیسے معلوم کر سکتے ہیں؟ حدیث میں تو ہے جب کسی چیز کا سایہ برابر ہو جائے تو اس کے عصر کا وقت ممکن ہو جاتا ہے۔

کچھ لوگوں نے اس کی مستقل جنتریاں بنا رکھی ہیں جس میں ہر علاقہ کے اوقات درج ہیں کہ سورج کا سایہ دوگنا کب ہوتا ہے اور ایک گنا کب ہوتا ہے۔ میرے پاس ایک ایسی جنتری ہے جس میں ہر شہر کی الگ الگ بنی ہوئی ہے۔ اس طرح کی کوئی جنتری آپ کو مل جائے تو اس سے آسان ہو جائے گا۔

کیا آپ کا کوئی شاگرد آپ سے حدیث......

نہیں میرا کوئی شاگرد نہیں ہے نہ میں حدیث بیان کرنے والا استاد ہوں۔ اس لئے میرے حوالہ سے کوئی حدیث بیان نہ کریں۔ مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ میں علم حدیث کی سند اس طرح بیان کروں جسطرح سے باقی لوگ بیان کرتے ہیں۔ آپ کسی اچھے اور مستند صاحب علم سے اجازت لیں اور اسی کی سند سے حدیث بیان کریں۔

حدیث میں آیا ہے کہ اسلام میں عورت ولی کے بغیر شادی نہیں کر سکتی، لیکن علماء نے گھر والوں نے راضی نہ ہونے کی صورت میں کورٹ میں شادی کو جائز قرار دیا ہے۔

دیکھئے کچھ احادیث ایسی ہیں جن میں حضورؐ نے فرمایا کہ اپنی اولاد سے پوچھے بغیر اس کا نکاح نہ کرو۔ الفاظ مجھے یاد نہیں لیکن مفہوم یہ ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ جب تم کسی بیٹی کی شادی کرو تو اس سے اجازت لے لو۔ واذنھا سماتھا، اس کی خاموشی اس کی اجازت ہے۔ اور

ایک ایسی مثال ہے کہ کسی صاحب نے اپنی زیر کفالت خاتون یا بیٹی کا نکاح کر دیا اور اس نے اعتراض کیا تو حضورؐ نے اس نکاح کو ختم کروادیا۔ اور ان سے پوچھ کے ان کا نکاح کروایا۔ اور ایسی بھی مثالیں ہیں کہ 'ایھا امرت نکحت بغیر اذن ولیھا فنکاحھا باطل باطل باطل'، کہ جو کوئی خاتون اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے تو وہ باطل ہے باطل ہے باطل ہے۔ اب بظاہر یہ دو احادیث ہیں اور ان میں تعارض ہے۔ میں نے اس سے پہلے بتایا تھا کہ علماء نے تعارض کو حل کرنے کے کم سے کم پچاس اصول مقرر کئے ہیں۔ ان میں سے ان اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ جن احادیث میں ولی کی اجازت کے بغیر نکاح نہ کرنے کا ذکر ہے، ان احادیث کو ترجیح دی جائے گی اور ولی کی اجازت کے بغیر جو نکاح ہوگا وہ باطل ہوگا۔

امام ابوحنیفہ نے ان دونوں کو ایک دوسرے سے تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ جہاں ولی کی اجازت کے بغیر نکاح نہ کرنے کا ذکر ہے وہاں اس کے اخلاقی پہلو کو حضورؐ نے بیان کیا ہے کہ اخلاقی طور پر ایک مسلمان خاتون کو یہ زیب نہیں دیتا کہ باپ سے پوچھے بغیر جہاں چاہے نکاح کر لے اور باپ کو بعد میں پتہ چلے وہ بیچارہ پریشان ہو۔ اس طرح نہیں کرنا چاہئے۔ یہ بہت مضبوط اخلاقی ہدایت ہے۔ لیکن کیا اگر کوئی خاتون نکاح کرے تو کیا وہ نکاح **Valid Legally** ہوا کہ نہیں ہوا؟

یہ بڑا نازک سا معاملہ ہے۔ فرض کریں ایک خاتون نے نکاح کر لیا اور گھر والوں کو اطلاع نہیں دی۔ ان کو دس سال بعد پتہ چلا۔ میں ایک مثال دیتا ہوں۔ ایک لڑکی یہاں سے پڑھنے کے لئے انگلستان گئی۔ وہاں اپنے کسی کلاس فیلو سے شادی کر لی۔ ماں باپ کو پتہ نہیں چلا۔ دس سال بعد آئی تو شوہر صاحب بھی ساتھ آئے اور تین بچے بھی ساتھ تھے۔ اب بتائیے کہ جو فقہا کہتے ہیں کہ نکاح جائز نہیں ہے ان بچوں کو کیا کہیں گے؟

امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ یہ نکاح قانوناً جائز ہے لیکن ان کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ان کو آپ سزا دیں، جرمانہ کریں، قید میں بھی ڈال دیں، تھپڑ بھی لگا دیں اس لئے کہ اس نے ایک ایسا کام کیا ہے جس کی اجازت حدیث میں نہیں دی گئی ہے۔ لیکن قانوناً جو اس کا ٹکنیکلی لیگل حصہ ہے اس کو آپ منسوخ نہیں کر سکتے۔ یہ ایک لمبی بحث ہے لیکن دونوں کے بیانات کا خلاصہ یہ ہے۔ پاکستان میں عدالتیں اکثر امام ابوحنیفہ کے نکتہ نظر کے مطابق فیصلہ کرتی ہیں۔ اس میں بھی عدالتوں

کے بعض فیصلوں کے بارے میں مجھے بھی تامل ہے۔اس میں فیصلہ اس طرح نہیں ہوا جس طرح ہونا چاہئے تھا۔میرا کہنا یہ ہے کہ اس موضوع پر ایک مفصل مرتب قانون ہونا چاہئے۔

جب میں اسلامی نظریاتی کونسل کا رکن تھا تو وہاں میں نے یہ مسئلہ اٹھایا تھا اور اس ضرورت کا اظہار کیا تھا کہ ایک مکمل اور جامع مسلم فیملی لاء پاکستان میں تیار ہونا چاہئے جس میں اس طرح کے سارے مسائل کو مکمل طریقے سے بیان کر دیا جائے۔اور جو کمزور پہلو **(Loop holes)** ہیں یا چھوٹے چھوٹے راستے ہیں ان کو بند کر دیا جائے۔

صحیح اور ضعیف احادیث کو پڑھ کر ہم کو فرق کیسے کریں؟

آپ وہ مجموعے پڑھیں جن میں صحیح احادیث کا ذکر ہے۔صحیح بخاری، صحیح مسلم کا ترجمہ پڑھیں۔اردو میں ایک کتاب ہے جس کا انگریزی ترجمہ بھی ملتا ہے، اگرچہ بہت معیاری نہیں ہے، وہ 'الؤ لؤ والمرجان فی مااتفق علیہ الشیخان' ہے۔جس میں صحیح بخاری اور مسلم دونوں کے متفق علیہ احادیث کو بیان کیا گیا ہے۔وہ موجود ہے اس کو پڑھئے اس میں ضعیف ہونے کا انشاء اللہ امکان نہیں ہے۔

آپ سے درخواست ہے کہ آپ ہمیں اصول فقہ پڑھا دیں۔

اگر زندگی رہی تو میں ضرور پڑھاؤں گا لیکن میں اسلامی یونیورسٹی میں پڑھاتا ہوں آپ وہاں داخلہ لے لیں تو میں آپ کو پڑھا دوں گا۔

علوم حدیث کے اس تعارف کے بعد اندازہ ہوا کہ ایک مومن مسلمان کو کیا کرنا چاہئے۔ہمارے ہاں جو اختلافات ہیں ان کو ختم کرنا چاہئے......

اختلافات کو ختم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔اختلاف کوئی بری چیز نہیں ہے۔اس سے خیالات کا تنوع اور ورائٹی سامنے آتی ہے۔جتنی ورائٹی ہوگی اتنا خیالات اور افکار پھیلیں گے اور تعلیمی سطح بلند ہوگی۔لیکن ان خیالات کو ایک دوسرے سے جھگڑنے کا ذریعہ نہیں بنانا چاہئے۔امام بخاری اور امام مسلم میں کئی معاملات پر اختلاف ہے۔لیکن امام مسلم امام بخاری کا اتنا احترام کرتے ہیں کہ انہوں نے امام بخاری سے کہا کہ آپ اجازت دیں کہ میں آپ کے پاؤں چوم لوں۔لیکن امام مسلم نے خود اسی صحیح مسلم کے مقدمہ میں امام بخاری پر اتنے احترام کے باوجود تنقید کی ہے۔تو احترام اپنی جگہ اور اختلاف اپنی جگہ۔دونوں ہو سکتے ہیں۔

کیا عورت اور مرد کی نماز میں فرق ہے؟

یہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ نماز میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک ہی طرح کی ہے سارے احکام ایک جیسے ہیں۔ لیکن بعض فقہا کا کہنا یہ ہے کہ جب خاتون سجدہ یا رکوع کی حالت میں جائے تو سجدہ ایسے کرے کہ اس کے جسم کے لئے زیادہ سے زیادہ ساتر ہو، اور جسم کے جو خدوخال ہیں وہ نمایاں نہ ہوں۔ یہ بھی ایک حدیث سے استدلال کی بنیاد پر ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کوئی ضرورت نہیں اسی طرح کرنی چاہئے۔ جیسے آپ کا جی چاہے ویسے کرلیں۔

حضورؐ سے محبت میں کیسے اضافہ کیا جاسکتا ہے؟

آپ سیرت اور حدیث کا مطالعہ کریں حضورؐ سے محبت میں اضافہ ہو جائے گا۔

آپ نے ایک شرح پڑھ کر سنانے کا وعدہ کیا تھا

میں بھول گیا تھا، ابھی پڑھتا ہوں۔

اگر ہر ایک کو اپنی پسند کے امام کے مسلک پہ چلنے کی کھلی چھٹی دے دی جائے تو کیا اس سے فرقہ بننے کی گنجائش پیدا نہیں ہوتی؟

اس سے اور بھی بہت سی خرابیاں پیدا ہوں گی اس لئے ہر شخص کو جو علم نہ رکھتا ہو، اپنی پسند کے مطابق فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ یہ حکم بالشریعہ نہیں ہوگا بلکہ حکم بالتشہی ہوگی، اپنی شہوات کے مطابق آدمی پیروی کرے گا، جو چیز کاروبار میں مفید ہوگی تو تاجر کہے گا کہ یہ رائے اختیار کریں، جس کو کسی اور چیز میں فائدہ ہوگا تو وہ کہے گا اس چیز کو اختیار کریں۔ تو اس سے بڑی قباحت پیدا ہوگی۔

حواشی کا مطلب ہے حدیث کی کسی کتاب کے حاشیہ پر۔

یہ ۱۲ لکھا ہوتا ہے اس کا کیا مطلب ہے؟

جو ۱۲ لکھا ہوتا ہے یہ حد کے ابجدی عدد ہیں۔ حد کے معنی ہیں انتہا۔ حد کے ان ابجدی الفاظ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہاں حاشیہ ختم ہو گیا۔ یعنی unqoute جسے کہتے ہیں۔ انگریزی میں کہتے ہیں qout اور unqout تو پہلے لکھتے ہیں منہ، اس کے بعد لکھتے ہیں انتھی، تو انتھی کی تلخیص آہ ہے۔ انتہا کی بجائے اہ لکھ دیتے ہیں۔

کیا ہم اس بات کا یقین کرلیں کہ مستشرقین نے احادیث کو درست کر کے بغیر رد و بدل کی لکھی

ہوں گی۔

مستشرقین نے کم ازکم اس انڈیکس میں کوئی ردوبدل نہیں کی۔ میں اس انڈیکس کو کم وبیش تیس بتیس سال سے استعمال کررہاہوں۔ میں نے کوئی ایسا اندراج نہیں دیکھا جس میں انہوں نے ردوبدل کی ہو۔

گولڈن احادیث کتنی ہیں؟

گولڈن چین کے بارے میں مختلف لوگوں کی رائے مختلف ہیں۔ کہ کس کو گولڈن چین کہتے ہیں۔ عام طور پر ایک تو وہ روایت ہے جو موطاء امام مالک میں ہے اور جسے میں دہراچکا ہوں، مالک عن نافع عن ابن عمر، لوگ اس کو گولڈن چین کہتے ہیں۔ یعنی یہ سب سے مختصر ترین روایت ہے جو امام مالک کو دو واسطوں سے ملی۔

اس کے علاوہ بھی بعض روایات کے بارے میں لوگوں نے کہا ہے کہ یہ گولڈن چین ہے۔ ایک روایت ایسی ہے جو مجھے پوری یاد نہیں لیکن اس مین امام احمد، امام شافعی اور امام مالک تینوں کے نام آجاتے ہیں۔ تو تین فقہا کے نام ایک سند میں آئے ہیں اس کو بھی بعض لوگوں نے گولڈن چین کہا ہے۔ اس پر بڑی لمبی بحثیں ہیں اور ہر محدث نے اپنی رائے یا اپنے فہم کے مطابق گولڈ چین قرار دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو یہ دنیا بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

اللہ تعالیٰ سے یہ پوچھنے کا کسی میں یارا نہیں ہے کہ یہ دنیا آپ نے کیوں بنائی؟ اللہ تعالیٰ نے بنائی۔ لیکن ایک بات ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جو بہت سی صفات ہیں ان صفات کا پتہ تبھی چلے جب ان کا کوئی مظہر ہو۔ اللہ تعالیٰ علیم ہے تو اللہ کا علم ہوگا تو صفت علیم کے معنی ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ بصیر ہے وہ کائنات کو دیکھے گا تو صفت بصیر کا علم ہوگا۔ اللہ تعالیٰ خالق ہے تو خلق ہوگی تو اللہ تعالیٰ کی صفت خلق کا علم ہوگا ورنہ کیسے علم ہوگا؟

جب اللہ تعالیٰ کو ہماری عبادت کی ضرورت نہیں......

اللہ تعالیٰ کو ہماری عبادت کی ضرورت نہیں لیکن ہمیں اس کی عبادت کی ضرورت ہے۔ اسلام اللہ نے ہماری ضرورت کے لئے اتارا ہے اپنی ضرورت کے لئے نہیں اتارا۔

ہمارے شہر میں موجود کس عالم سے علم حدیث کے لئے کسب فیض کیا جائے؟

اس شہر میں کئی علماء ہیں جس سے آپ کسب فیض کے لئے جاسکتی ہیں۔ میں تو دو علماء کو جانتا ہوں۔ ایک ڈاکٹر سہیل حسن صاحب کو جانتا ہوں۔ ان کے والد مولانا عبدالغفار حسن بھی حیات ہیں، ان کی صحت اجازت دے تو ان سے بھی جا کر سند لیں۔ ان کی سند بڑی عالی ہے۔ وہ ایک واسطہ سے مولانا شیخ الکل میاں نذیر حسین کے شاگرد ہیں۔ غالباً جہاں تک میرے علم میں ہے۔ اور مولانا نذیر حسین مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب کے شاگرد ہیں، تو ان کی سند بڑی عالی اور مختصر ہے، ان سے سند لے لیں۔

حدیث کی جگہ جو فرق حدثنا اور اخبرنا میں ہے تو ان دونوں میں کیا فرق ہے؟

حدثنا یہ ہے کہ استاد نے حدیث پڑھی اور طالب علم نے سنی، تو جب طالب علم اس کو آگے بیان کرے گا تو حدثنا سے بیان کرے گا۔ اخبرنا یہ ہے کہ طالب علم نے حدیث پڑھی اور استاد نے سن لی اور سن کر اجازت دے دی، یہ اخبرنا ہے۔

یہ اصطلاح سب سے پہلے امام مسلم نے شروع کی تھی۔ امام بخاری کے ہاں یہ اصطلاح نہیں ہے۔

احادیث کے علم سے پتہ چلتا ہے کہ برصغیر میں زیادہ تر اسلام محدثین کی کوششوں سے پھیلا۔

ٹھیک ہے۔ محدثین کی کوششیں بھی شامل ہیں، صوفیا کی کوششیں بھی شامل ہیں۔ اس زمانے میں صوفیا اور محدثین الگ الگ نہیں ہوتے تھے۔ یہ کہنا نہیں تھا کہ یہ صوفیا ہیں اور یہ محدثین ہیں۔ محدثین صوفیا بھی ہوتے تھے اور صوفیا محدثین ہوتے تھے سب ملے جلے ہوتے تھے **All three in one** ہوا کرتا تھا۔ اس لئے کسی نے ان کو صوفی کے نکتہ نظر سے دیکھا تو صوفیا میں بیان کر دیا۔ کسی نے عالم کے نکتہ نظر سے دیکھا تو علما میں بیان کر دیا۔ کسی نے محدث کے نکتہ نظر سے دیکھا تو محدث بیان کر دیا۔ اب شاہ ولی اللہؒ صاحب تصوف کے بھی بڑے امام تھے، سب صوفیا ان کو مانتے ہیں، ان کے مریدین بھی تھے اور وہ محدث بھی تھے۔ شیخ احمد سرہندیؒ صوفی بھی تھے تصوف کے بڑے سلسلے ان سے چلے ہیں، لیکن انہوں نے سیالکوٹ جا کر شیخ افضل سیالکوٹی سے علم حدیث حاصل کیا۔

I would be gratful if you could reffer to some books or wbe sites relating to psycology and Islam, objections made by psycologists on

Islam.

I would reffer you to two books, one is by Dr. Rafiuddin, that is know by the Ideology of the Future. Ideology of the Future is a comment of some leading Western philosophers from Islamic point of view and the projectional formulation of an Islamic point of view with always with those philosophers. In that book he has intensively dealth with the question of psycology and prophethood. The other book is by Dr. Malik Badri from Sudan, in which he has tried to develop comments from Islamic point of view and modern western psycology.

عبد اللہ ابن عمر کے شاگرد نافع عبد اللہ ابن عمرو ابن العاص کے ہیں یا عبد اللہ ابن عمر ابن الخطاب کے؟

نافع عبداللہ بن عمر بن خطاب کے شاگرد ہیں عبداللہ بن عمرو بن العاص کے نہیں ہیں۔عبداللہ بن عَمرو بن العاص عین کے زبر کے ساتھ ہے اور پہچان کے لئے آخر میں واو لگایا جاتا ہے جس کی وجہ سے اردو دان لوگ اکثر اس کو عُمرو پڑھتے ہیں یہ عُمرو نہیں ہے اس کو عَمر پڑھا جاتا ہے۔اور اگر واو نہ ہوتو اس کو عُمر پڑھا جائے گا۔

کریڈٹ کارڈ کے بارے میں بتائیں کہ کیا ان کا استعمال کیا جاسکتا ہے کہ نہیں؟

کریڈٹ کارڈ میں بعض تفصیلات ہیں جس میں اگر سود نہ ہوتو استعمال جائز ہے۔اگر ادائیگی ایک خاص مدت کے بعد کی جائے اور اس پر سود ہوتو یہ جائز نہیں ہے۔اگر فوراً ادائیگی کر دیں اور بعض ادارے اس پر سود وصول نہیں کرتے تو یہ جائز ہے۔

امت کے لئے کچھ انتہائی متنازعہ امور پر رائے قائم کرنے کے لئے کیا......اس سے فرقے بھی نہ بنتے......

دیکھئے اللہ تعالیٰ کی منشا یہ نہیں تھی کہ تمام علما اور فقہا اور محدثین ایک جگہ جمع ہوکر ایک ہی رائے بنا دیتے اور ساری امت اس کی پیروی کرتی۔یہ اللہ تعالیٰ کا منشا نہیں تھا۔یہ رسول اللہ ﷺ کا منشا

بھی نہیں تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو خود تربیت دی کہ ایک سے زائد نکتہ نظر کو اپنائیں اور اختیار کریں۔ دو مثالیں میں نے آپ کو دی تھی۔ ایک مثال تھی بنی قریظہ کے محلّہ میں نماز عص پڑھنے کی۔ جس میں کچھ صحابہ نے نماز راستہ میں پڑھ لی کچھ نے وہاں پہنچ کر پڑھ لی تو مغرب ک وقت ہو گیا اور نماز قضا ہو گئی۔ حضورؐ نے دونوں کو پسند فرمایا اور فرمایا کہ لقد اصبتم لقد اصبتم دونوں سے کہا کہ تم نے ٹھیک کیا۔

ایک اور موقعہ پر دو صحابیؓ تھے۔ ان کو ایک سفر میں غسل کی ضرورت پیش آئی۔ پانی نہیں تھ انہوں نے تیمّم کر کے نماز پڑھ لی اور تیمّم اور نماز کے بعد ایک صاحب کو پانی مل گیا تو انہوں نے غسل دہرایا اور نماز بھی دہرائی جبکہ دوسرے صاحب نے کہا کہ دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو دونوں نے اپنی بات حضورؐ کی خدمت میں عرض کی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ان صاحب سے، جنہوں نے دوبارہ غسل کیا تھا کہ لك الاجر مرتين کہ تمہیں دہرا اجر ملے گا۔ جن صاحب نے غسل نہیں کی اور نماز نہیں دہرائی۔ آپؐ نے ان سے فرمایا لقد اصبت السنة، تمہیں سنت کے مطابق کام کرنے کی توفیق ہوئی۔ گویا دونوں کو حضورؐ نے بہت پسند فرمایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گویا بعض احکام کی ایک سے زائد تعبیریں ممکن ہیں۔

ایک اور بہن نے لکھا ہے کہ آپ حدیث کی تعلیم کا اہتمام کریں۔

دعا کریں اللہ تعالیٰ توفیق دے۔

☆☆☆☆☆☆☆